بِاسْمِہٖ تعالیٰ

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

جلد اوّل

دوسرا ایڈیشن

روزمرّہ کے اُن معاملات کے
متعلق جن کی تفصیل فہرست
میں درج ہے

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور ۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مشمولات

قرآنی فیصلے

(جلد اوّل)

مضمون	صفحہ
۱ ۔ نماز	
۱ ۔ نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے ۔	۵
۲ ۔ نماز کی رکعات ، اوقات ، ارکان وغیرہ کا تعین کیسے کیا جائے گا ۔	۸
(عبادات اور قوانین میں فرق)	۱۱
۳ ۔ نمازوں کی تعداد کیسے مقرر ہوئی تھی ۔	۱۲
بخاری کی روایت	۱۲
۴ ۔ نظامِ صلوٰۃ اور مؤقت فریضۂ صلوٰۃ میں باہمی تعلق کیا ہے ؟	۱۳
۵ ۔ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں ۔	۱۶
۶ ۔ انفرادی طور پہ نماز پڑھنے کا مقصد کیا ہے ۔	۱۸
تعلق باللہ سے کیا مراد ہے ۔	۲۱
موجودہ حالات میں کیا کیا جائے ۔	۲۱
ہمارے موجودہ مذہبی اعمال نے ملّی شعائر کی حیثیت اختیار کر لی ہے ۔ اُن زندہ رکھنا ضروری ہے ۔	۲۳

مضمون	صفحہ
۷۔ ارکانِ دین کے نتائج ـــ کتاب وحکمت کا مفہوم	۲۵
۸۔ نظام صلوٰۃ کے تصور کی وجہ سے مروجہ نماز کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔	۲۵
۹۔ رسولؐ اللہ کس طریق سے نماز پڑھتے تھے ؟)	۲۸
۱۰۔ عمل متواتر کی حیثیت کیا ہے۔	۳۳
۱۱۔ شیعہ حضرات کی نماز کی تفصیل	۳۵
۱۲۔ کیا اردو زبان میں نماز ہوسکتی ہے۔	۳۹
کیا قرآن کریم کے الفاظ بھی وحی ہیں یا اس کا صرف مفہوم وحی کی رُو سے نازل ہوا تھا۔	۴۰
قرآن کریم کا ترجمہ کسی زبان میں کماحقہٗ نہیں ہوسکتا۔	۴۲
بلا سمجھے الفاظ قرآنی دہرانے سے کچھ فائدہ نہیں۔	۴۵
نئی نماز نہ ایجاد کی جائے۔	۴۷
۲۔ روزہ	
۱۔ قرآن کریم کی رو سے روزے کے احکام۔	۵۳
۲۔ تراویح کی کتنی رکعت پڑھنی چاہئیں۔	۵۸
۳۔ اعتکاف کا کیا حکم ہے۔	۵۹
۴۔ لیلۃ القدر کونسی رات ہے اور اس کی فضیلت سے کیا مراد ہے ؟	۶۱
۵۔ عیدالفطر کس تقریب کی یاد میں منائی جاتی ہے۔	۶۳
۳۔ حج	
۱۔ دین کے نظام میں حج کا مقصد کیا ہے۔	۶۵
۲۔ حج کی اہمیّت	۶۹
۳۔ حج کا فلسفہ ـــ ایک بہت پڑھے لکھے صاحب قلم کے نزدیک !	۷۱

مضمون	صفحہ
۴۔ قربانی کی حقیقت	۷۲
۵۔ کیا قربانی کا منکر کافر ہے؟	۱۰۰
۴۔ زکوٰۃ	
۱۔ زکوٰۃ سے کیا مراد ہے کیا زکوٰۃ حکومت کا ٹیکس ہے؟	۱۱۴
۲۔ صدقہ اور خیرات کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے۔	۱۱۶
۳۔ صدقہ فطر کی شرعی حیثیت کیا ہے۔	۱۱۸
۵۔ معاشرتی اور عائلی مسائل	
۱۔ نکاح کا طریقہ کیا ہے۔	۱۲۰
۲۔ نابالغ کا نکاح	۱۲۱
۳۔ تعدد ازدواج	۱۲۴
۴۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت کس طرح دی جاسکتی ہے؟	۱۲۹
۵۔ کیا نکاح کے لئے مہر ضروری ہے، اس کی مقدار کیا ہونی چاہیئے "شرعی مہر" کیا ہے؟	۱۳۴
۶۔ طلاق کے قرآنی احکام کیا ہیں۔ کیا تین بار "طلاق" کہنے سے طلاق ہوجاتی ہے؟	۱۳۸
۷۔ عدّت سے کیا مطلب ہے۔ اس کے قرآنی احکام کیا ہیں۔	۱۴۲
۸۔ بچے کو کتنی مدت تک دودھ پلانا چاہیئے۔ طلاق کی صورت میں بچے کس کے پاس رہیں گے۔	۱۴۴
۹۔ کیا عورت سے غیر فطری مجامعت کی اجازت ہے؟	۱۴۶
۱۰۔ کیا عورت کچھ کما سکتی ہے یا کمائی کرنا صرف مردوں کے لئے مخصوص ہے۔	۱۵۰
۱۱۔ کیا مملکت میں عورتوں کو حق مشاورت دیا جاسکتا ہے اور انہیں شریک حکومت کیا جاسکتا ہے؟	۱۵۱

مضمون	صفحہ
۱۲۔ کیا ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔	۱۵۳
۱۳۔ نوجوانوں کے لئے بزرگوں کا احترام ضروری ہے۔ لیکن کیا ہر "بزرگ" کا احترام ضروری ہے یا اس کے لئے کچھ شرائط بھی ہیں۔	۱۵۵
۱۴۔ بچہ پیدا ہونے پر اس کے کان میں اذان دی جاتی ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔	۱۶۵
عقیقہ کرنا	،،
ختنہ کرنا	،،
مردہ کو غسل۔ کفن دینا۔ اور ایسے ہی دیگر امور کی بابت قرآن کا کیا حکم ہے۔	،،
۱۵۔ منگنی کی شریعت کی رُو سے کیا حیثیت ہے۔	،،
۱۶۔ نکاح اور رخصتی میں کیا فرق ہے۔	،،
۱۷۔ کیا یہ ضروری ہے کہ نکاح مُلّا ہی پڑھائے؟	۱۶۶
۱۸۔ قبر کے گرد بیٹھ کر "استقاط کرانے" کی رسم کی بابت قرآن کا کیا حکم ہے۔	،،
۱۹۔ ہفتہ میں ایک دن کے کاروباری ناغہ کی بابت کیا حکم ہے۔	،،
۲۰۔ رواج کی پابندی کس حد تک کرنی چاہیئے۔	۱۶۷
۲۱۔ غلط معاشرہ میں اصول پرستی سے کیا فائدہ؟	،،
۶۔ حلال وحرام	
۱۔ حرام اور حلال متعین کرنے کا اختیار کسے حاصل ہے؟	۱۶۹
۲۔ اسلام میں کون کون سی چیزیں حرام ہیں۔	۱۷۰
۳۔ کیا شراب حرام ہے۔	۱۸۱
۴۔ کیا شراب کا استعمال بطور دوائی کے جائز ہے۔	۱۸۲
۵۔ دواسازی میں الکحل کے استعمال کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے۔	۱۸۳
۶۔ گھوڑ دوڑ میں شرطیں لگانے کی بابت قرآن کا کیا حکم ہے۔	۱۸۴

مضمون	صفحہ
۷۔ لاٹری ڈالنے کے متعلق کیا حکم ہے۔	۱۸۴
۸۔ سینما دیکھنا کیسا ہے۔	۱۸۵
۹۔ موسیقی (گانا سننے) کے متعلق قرآن کا حکم کیا ہے۔	۱۸۶
۱۰۔ تصویر اتروانے کے متعلق کیا حکم ہے۔	۱۸۹
اسلام اور آرٹ۔	۱۹۲
۱۱۔ شبِ برات کس تقریب کی یاد میں منائی جاتی ہے۔	۱۹۵
تقدیر کا مسئلہ	۱۹۷
۷۔ خدا اور انسانی ذات	
خدا کے قانون اور خدا میں کیا فرق ہے۔	۱۹۹
(معاذ اللہ) بھینٹ لینے والا خدا۔	۲۰۱
کیا خدا کی معرفت ممکن ہے۔	۲۰۳
مست الست مجذوب کیسے بن جاتے ہیں۔	۲۰۴
انسانی ذات کیا ہے؟	۲۰۵
خدا نے انسان میں اپنی روح پھونک دی، اس کا مطلب کیا ہے۔	۲۱۴
۸۔ رسول اللہ (صلعم)	
حضورؐ ساری دنیا کے لئے رحمت کیسے تھے؟	۲۱۶
کیا اس میں انسانوں کے علاوہ دیگر مخلوق بھی شامل ہے۔	۲۲۱
کیا حضورؐ کا سایہ نہ تھا؟	
حضورؐ کی شان میں (معاذ اللہ) گستاخی اس کا اصل علاج کیا ہے؟	۲۲۲
کتب روایات و تفاسیر سے یہ باتیں نکال دی جائیں۔	۲۲۳

مضمون	صفحہ
کیا رسول اللہ غیب جانتے تھے ؟	۲۲۴
مقطوع الذکر والی روایت	۲۲۵
معراج نبوی	۲۲۶
روسی راکٹ سے استدلال !	
دلیل کا بودا پن	۲۲۷
کیا حضورؐ کا معراج جسمانی تھا ؟	۲۲۸
۹۔ قرآن کریم	
وحی اور الہام میں کیا فرق ہے۔	۲۲۹
"وحی" کے تین طریقے	۲۳۰
قرآن میں کشف والہام کا کہیں ذکر نہیں ، اُمِّ موسےٰ اور حواریوں کی طرف وحی کا مطلب	۲۳۱
وحی متلو اور وحی غیر متلو	
ہر نبی کو کتاب ملی تھی ، قرآن کے اندر اور قرآن کے باہر وحی کا عقیدہ	۲۳۲
رسول اللہ جو کچھ فرماتے تھے کیا وہ سب وحی ہوتا تھا ؟	۲۳۴
قرآنِ کریم کی تنزیلی ترتیب ، یعنی قرآن کی آیتیں اور سورتیں جس ترتیب سے نازل ہوئی تھیں اسی ترتیب سے جمع کیوں نہ کی گئیں۔	۲۳۵
یہ خیال غلط ہے کہ نزولی ترتیب کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔	۲۳۹
ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ	
کیا قرآنِ کریم محفوظ ہے۔	۲۴۱
تاریخ اور دین کا تعلق	۲۴۳
قرآن کا ایک ایک حرف محفوظ ہے۔	۲۴۴
مصحفِ عثمانی کے اصل نسخے کہاں کہاں ہیں۔	۲۴۵

مضمون	صفحہ
کیا زمانے کے تقاضوں سے قرآن کے احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے ؟	۲۵۱
قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے ؟	۲۵۴
اگر قرآن کی سائنٹفک تعبیر کی جائے تو سائنس کے نظریات بدل جانے سے قرآن پر اثر پڑے گا ؟	۲۵۵
قرآنِ کریم کے تراجم میں اختلاف کیوں ہے ؟۔	۲۵۷
کیا زنا کی سزا سنگسار کرنا بھی ہے ؟۔	۲۷۷
آیۂ رجم قرآن میں تھی ۔اب وہ کہاں چلی گئی ؟ ۔	۲۷۸
جو نصب العین قرآن نے تجویز کیا ہے ۔اس تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے ؟۔	۲۸۱
قرآنی اور اسلامی میں کیا فرق ہے ۔مثلاً قرآنی دستور۔ قرآنی نظام وغیرہ ۔	۲۸۳
کیا قرآنی قوانین سے معاشرہ کی اصلاح ہو جائے گی ؟	۲۸۵
قرآنی معاشرہ میں منتقل اقدار کو عملاً رائج کیا جائے گا ؟	۲۸۷
۱۰ ۔ احادیث	
کیا حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) جھوٹ بولا تھا ؟	۲۸۸
احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے ؟ وہی جو انجیل وغیرہ کتب سابقہ کی ہے ۔کیا جو بات تواتر سے چلی آ رہی ہو ۔ وہ دین میں سند ہو سکتی ہے ؟	۲۹۱
حضرت عائشہؓ کی عمر کی روایات تواتر سے چلی آ رہی ہیں اور غلط ہیں۔	۲۹۲
آپ صحیح احادیث کا مجموعہ مرتب کر دیں ۔	۲۹۳
یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے ۔	۲۹۵
اعتراض کہ طلوعِ اسلام احادیث کو اپنی تائید میں کیوں پیش کرتا ہے ۔	۲۹۶
یہ روایت کہ جس نے مرتے وقت کلمہ پڑھ لیا، اس کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے ۔	۲۹۸

مضمون	صفحہ
۱۱۔ تاریخ اور اسلام	
تاریخ کی اہمیت	۳۰۰
مسلمانوں کی تاریخ کے چار ادوار	۳۰۱
اسلامی تاریخ کی حیثیت کیا ہے؟ ہماری تاریخ کی چند مثالیں۔	۳۰۳
خلیفہ اوّل کا انتخاب کس طرح ہوا۔	۳۰۴
امام طبری کا بیان (معاذ اللہ)	
بخاری کی روایت کہ صحابہؓ (معاذ اللہ) اسلام سے پھر گئے تھے۔	۳۰۶
قرآن اور تاریخ کی باہمی حیثیت کیا ہے۔	
غلط روایات کی مثالیں۔	۳۰۸
امام حسنؓ کی کثرتِ طلاق کا ذکر تاریخ میں۔	۳۱۰
یزید کی بخشش کے متعلق حدیث۔	۳۱۱
صدر اوّل کی تاریخ کی غلط بیانیاں۔	
حضرت علیؓ اور مسئلہ خلافت۔	۳۱۲
صحیح مسلک کیا ہے۔	۳۲۱
یزید کے متعلق مزید سوالات	۳۲۲
یزید کی بیعت میں دو اڑھائی سو صحابہؓ شریک تھے۔	
۱۲۔ غلام اور لونڈیاں	
کیا اسلام میں غلاموں اور لونڈیوں کی اجازت ہے۔	۳۲۵
ہمارے قدامت پسند طبقہ کا اصرار کہ اس کی اجازت ہے۔	
اس کی طرف سے اس کے حق میں پیش کردہ دلائل۔	۳۲۶

مضمون	صفحہ
ان دلائل کی حقیقت اور جواب	۳۲۸
بعض وضعی روایات لونڈیوں سے مجامعت کے وقت عزل کر لیا جائے۔	۳۳۲
شرم گاہ کے علاوہ، دوسری جگہ مجامعت کر لی جائے۔	
عہدِ عباسیہ میں غلام اور لونڈیاں۔	۳۳۳
یہ ان کا ذاتی فعل تھا۔	۳۳۴
قیدیوں کو بطور احسان چھوڑ دینے کے خوشگوار نتائج۔	
۱۳۔ قرآن کا سیاسی نظام	
مرکزِ ملت کی اطاعت سے کیا مراد ہے؟	۳۳۵
قرآنی حکومت کی سنٹرل اتھارٹی کو مرکزِ ملت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔	
جب قرآنی حکومت دوبارہ قائم ہوگی تو اس کی سنٹرل اتھارٹی مرکزِ ملت ہوگی۔	۳۳۷
قرآن کی رو سے "خدا اور رسول" سے مراد اسلامی نظام ہے۔	
مختلف مفسرین کی آراء	۳۳۸
اس "مرکزِ ملت" کی خصوصیات اور سیرت و کردار کیسا ہوگا۔	۳۴۱
اِسے سیرتِ محمدیہؐ کے قالب میں ڈھلا ہونا چاہیئے۔	
مرکزِ ملت کے متعلق مزید سوالات۔	۳۴۲
رسولؐ اللہ کی اطاعت اور مرکزِ ملت کی اطاعت میں کیا فرق ہے۔	
اس اعتبار سے سُنتِ رسولؐ اللہ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔	
اِن سوالات کے جوابات	۳۴۳
اسلام اور جمہوریت کا باہمی تعلق کیا ہے؟	۳۴۵
اسلامی جمہوریت سے کیا مراد ہے؟	۳۴۶
اسلامی نظام کی خصوصیات کیا ہیں؟	

مضمون	صفحہ
وہ فرد کی انفرادیت کو قائم رکھتا اور نشو ونما دیتا ہے۔	۳۴۶
جرم اور سزا کا باہمی تعلق کیا ہے ؟	۳۴۷
کیا جرم کی دنیا میں سزا ملنے سے معاملہ ختم ہوجاتا ہے ؟	
اس کا تفصیلی جواب۔	۳۴۸
کیا شرعی سزاؤں میں کمی بیشی ہوسکتی ہے ؟ ہوسکتی ہے۔ اس کی سند۔	۳۵۲
زنا کا جرم ثابت کرنے کے لئے چار عینی شاہدوں کی ضرورت بتائی جاتی ہے۔ ایسا کس طرح ممکن ہوسکتا ہے ؟	۳۵۳
قدامت پسند طبقہ کی طرف سے جواب۔	۳۵۴
اس کا صحیح جواب ـــ یعنی گواہ زنا کے لئے نہیں، عام بے حیائی کی باتوں کے لئے ہیں۔	۳۵۸

۱۴۔ متفرقات

کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے ؟	۳۶۰
کیا صدقہ وخیرات سے بلا ٹل جاتی ہے ؟	۳۶۴
امام مہدی کا مذہب کیا ہوگا ؟ یعنی وہ شیعہ ہوں گے یا سُنّی۔	
کیا حضرت عیسےٰؑ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے ؟	۳۶۶
بہائیت اور مرزائیت کی تحریکیں کیوں پیدا ہوئیں ؟	۳۶۷
ان دونوں میں کیا فرق ہے ؟	
پاکستان میں پیری مریدی پھر سے زور پکڑ رہی ہے اس کی وجہ کیا ہے ؟	۳۶۹
اس کی وجہ یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کی محکمیت پر ایمان نہیں رہا۔	۳۷۰
اس کا علاج کیا ہے ؟	۳۷۲
سود کے متعلق کیا حکم ہے ؟ کیا حکومت کے ٹیکس زکوٰۃ کا بدل ہوسکتے ہیں ؟	
وقف علی الاولاد کی حقیقت کیا ہے ؟	

مضمون	صفحہ
کیا حقِ شفع کا قانون قرآن میں ہے ؟	۳۷۳
وارث کو پوری وصیت کا حق کیوں نہیں دیا جاتا ؟	
حلالہ کے متعلق کیا حکم ہے ؟	
لڑکیوں کو لڑکوں سے آدھا حصہ کیوں ملتا ہے ؟	۳۷۴
جہیز کے متعلق کیا حکم ہے ؟	
لونڈی رکھنے کی علت کیا ہے ؟	
ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت کیوں دی گئی ہے ؟	
نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہرات گیارہ تھیں۔ دوسرے مسلمانوں پہ چار کی حد کیوں عائد کی گئی ؟	
مُنہ بولی ماؤں سے حق نکاح کیوں چھین لیا گیا ؟	
قرآن اہلِ کتاب کی کتابوں کو محرف بھی قرار دیتا ہے اور ان کی تصدیق بھی کرتا ہے۔	
یہ کیا بات ہوئی ؟	
حج کے موقعہ پہ اس قدر جانوروں کی قربانی سے جو گوشت ضائع ہوتا ہے، کیا وہ اسراف میں داخل نہیں ؟	
ان سوالات کے جوابات۔	۳۷۵
۱۵۔ معاشی نظام	
کمیونزم اور اسلام کا مقابلہ۔	۳۸۰
اشتراکی نظریۂ زندگی اور اسلام۔	۳۸۵
کیا سود لینا جائز ہے ؟	۴۰۱
معاوضہ محنت کا لیا جا سکتا ہے نہ کہ سرمایہ کا۔	۴۰۲
قرآن کا معاشی نظام۔	۴۱۳
حضورؐ نے کچھ جمع نہیں کیا۔	۴۱۸

مضمون	صفحہ
کیا صحابہؓ کے پاس دولت کے انبار تھے ؟	۴۱۹
قومی ملکیت ۔	
نظامِ یوسفی ۔	۴۲۴
انفرادی مفاد پرستی ۔	۴۲۶
رہن یا قبضہ ۔	۴۲۸
قانون وصیت ۔	۴۳۰
ترکہ اور وصیت	۴۳۳
یتیم پوتے کا حصہ ۔	۴۳۷
اوقاف ۔	۴۴۳
کیا خدمتِ دین کا معاوضہ لینا جائز ہے ۔	۴۴۵
اورنگ زیب کی روزی کا مسئلہ ۔	۴۴۹
سربراہ مملکت کی ضروریات زندگی کیسے پوری ہوں ؟	۴۵۰
"آیات فروشی" سے مطلب کیا ہے ؟	۴۵۱
غلط معاشرہ میں بیماروں اور ناداروں کی کس مپرسی ۔	۴۵۴
بھوک سے مجبوری کی وجہ سے ارتکابِ جرم !	۴۵۵
اسلامک سوشلزم ۔	۴۵۷
بعض امور میں غیروں کی اطاعت کرنے والا بھی مرتد ہے ۔	۴۶۰
روس میں سزائیں ۔	۴۶۱
کیا محض معاشی نظام کی تبدیلی سے جرائم رک سکتے ہیں ؟	
سویڈن کی رفاہی مملکت میں خودکشی کے واقعات ۔	۴۶۲
کیا خدا عادل ہے !	۴۶۳
اگر وہ عادل ہے تو غریبوں پر ظلم کیوں ہوتا ہے ۔	

مضمون	صفحہ
نیک کسے کہتے ہیں ۔	۴۶۸
۱۶۔ متفرقات	
شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ ۔	۴۷۱
قرآنی طریقِ علاج کے خلاف قدامت پرست طبقہ کا ردِ عمل ۔	۴۷۶
مسلمانوں کے حرم ۔	۴۷۸
مسلمانوں میں جنسی جذبہ کی اس قدر شدت کیوں ہے؟ قرآن نے اس کا کیا علاج تجویز کیا تھا ۔	۴۷۹
اور مسلمانوں نے اس کے خلاف کیا کیا ۔	۴۸۰
امتناعِ شراب کا حکم ۔	۴۸۱
اس کی وضاحت ضروری ہے کہ شراب کہتے کسے ہیں ۔	۴۸۲
اس حکم کو بتدریج نافذ کیا جائے ۔	۴۸۴
مسلم اور مومن میں فرق ۔	۴۸۷
موجودہ مسلمانوں کی پوزیشن ۔	۴۹۰
کیا غیر مسلموں کے نیک اعمال کا اجر ملے گا ؟	۴۹۲
نیک اعمال کہتے کسے ہیں ؟	۴۹۳
غلط نظام میں انفرادی نیکیوں کی حیثیت ۔	۴۹۶
اخلاقی اور روحانی ترقی ۔ روحانی ترقی سے کیا مراد ہے ؟	۴۹۷
نبی اکرم کے لئے اخلاقی بلندی ہی کا ذکر آیا ہے ۔	۴۹۸
روحانیت کا تصور عیسائیوں سے لیا گیا ہے ۔	
حقوق اللہ اور حقوق العباد ۔	۴۹۹
درحقیقت دین حقوق العباد ہی کا ضابطہ ہے ۔	۵۰۰
تعلق باللہ سے کیا مراد ہے ۔	۵۰۱

مضمون	صفحہ
خدا سے ہمارا تعلق قرآن کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔	۵۰۱
اظہار خیال کا حق۔	۵۰۲
"زمانے کے تقاضے" سے کیا مراد ہے۔	۵۰۳
وہ حالات جن کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی جزئیات مرتب کی جاتی ہیں۔	۵۰۴
عالم کسے کہتے ہیں؟	۵۰۶
جو عقل و فکر سے کام لے کر کسی نتیجہ پر پہنچے۔	
ہمارے علمائے کرام "لغت ہائے حجازی کے قارون" ہوتے ہیں۔	
عالم نہیں ہوتے۔	۵۰۷
کیا مذہبی فرقوں کے اختلافات محض فروعی ہیں!	
الیکشن کی وبا۔	۵۰۹
یہ وبا۔ درحقیقت سیاسی پارٹیوں کی پیدا کردہ ہے۔	۵۱۰
قومی یادگاریں۔ ایسی ہونی چاہئیں جو منفعت بخش ہوں۔	۵۱۱
کیا اقوام مغرب کو وحی کی ضرورت ہے۔	۵۱۲
قرآن کریم اور عقل انسانی۔	۵۱۴
چار اہم سوالات۔	۵۱۵
۱۔ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل کیا ہے۔	
۲۔ کیا قرآن وجدانی تخلیق ہے؟	
۳۔ اگر عقل نے اب وحی کا احاطہ کر لیا ہے تو پھر وحی کی ضرورت کیا باقی رہتی ہے۔	
۴۔ اگر عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکی تو کیا کسی مامور من اللہ کی ضرورت باقی ہے۔	

مضمون	صفحہ
تلاعب بالدین۔	۵۱۹
طلاق کے مسائل میں مضحکہ انگیز صورتیں۔ "مسلم نیشنلزم"	۵۲۰
موجودہ حالات میں کیسے قائم ہو؟	۵۲۱
نوجوانوں کے دل کی دھڑکن۔	۵۲۳

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب ---------- قرآنی فیصلے جلد اول

مصنف ---------- غلام احمد پرویزؒ

ناشر ---------- طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

---------- 25-B گلبرگ II لاہور 54660

---------- فون: 576 4484

ایڈیشن ---------- دوم- اپریل 1987ء

---------- سوم- مارچ 1992ء (بلا ترمیم)

---------- چہارم مئی 1997ء (بلا ترمیم)

طلوع اسلام ٹرسٹ سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

پیش لفظ

آپ اپنی زندگی پر غور کیجئے اور سوچئے کہ صبح سے شام تک کتنے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق آپ خود سوچ کر کسی فیصلے پر پہنچتے ہیں اور کتنے ایسے جن کے متعلق آپ بلا سوچے سمجھے، وہ کچھ کہہ دیتے ہیں یا کرتے ہیں جو کچھ آپ بچپن سے سنتے یا دیکھتے چلے آتے ہیں۔ مثلاً شبِ برات کا تیوہار آتا ہے اور آپ اُسے بڑی دھوم سے مناتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی اتنا سوچنے کی بھی زحمت گوارا کی ہے کہ یہ تیوہار کس تقریب کی یاد میں ہے؟ ہم اسے کیوں مناتے ہیں؟ اس کے منانے میں جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ کیوں کیا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ نے کبھی یہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آپ بچپن سے دیکھ رہے ہیں کہ ایسا کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، وہی کچھ آپ کر دیتے ہیں۔ لیکن زندگی میں کوئی وقت تو ایسا آنا چاہیئے۔ جب آپ ذرا تھم کر سوچیں کہ ہم جو کچھ کہتے یا کرتے چلے آرہے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کے اجرائے کراچی (۱۹۴۸ء) سے ہم نے قارئین سے کہا کہ روزمرہ کے مسائل پر غور کریں اور جن کی بابت انہیں الجھن پیش آئے، وہ ہم سے پوچھ لیں۔ چنانچہ قارئین کی طرف سے مختلف مسائل کے متعلق استفسارات آنے شروع ہوئے اور ہم نے ان کے جوابات لکھے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ زندگی کے مسائل کا حل قرآن کریم سے دریافت کیا جائے۔ اس لئے ہم نے ان استفسارات کے متعلق بھی جو کچھ لکھا وہ اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم ہی کی روشنی میں لکھا۔ پانچ چھ سال کے عرصے میں ان استفسارات اور ان کے جوابات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا، تو قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے کہ انہیں الگ مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے کیونکہ ان میں ایسے ایسے امور کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم پیش کی گئی ہے، جن سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے اور عند الضرورت یہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ فلاں سوال کے متعلق طلوعِ اسلام کی کونسی اشاعت میں جواب لکھا گیا تھا۔

اس تقاضا کی معقولیت کے پیشِ نظر "قرآنی فیصلے" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا گیا۔ جس میں ۱۹۵۳ء تک کے اہم استفسارات اور ان کے جوابات شامل کیے گئے۔ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ چنانچہ ایک عرصہ ہوا کہ اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اس کے جدید ایڈیشن کے لئے مدت سے تقاضا ہو رہا تھا۔ لیکن اس دوران میں نئے استفسارات موصول اور ان کے جوابات طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہے۔ چنانچہ اب جو ہم نے اس سلسلہ کو یکجا کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ذخیرہ بہت وافر ہوگیا ہے اور اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو اس کے احاطہ سے باہر رہ گیا ہو۔ چنانچہ اس تمام ذخیرے کو از سرِ نو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ تین یا کم از کم دو جلدوں میں سما سکے گا۔ چنانچہ اس کی جلد اوّل پیشِ خدمت ہے۔

نام تو اس جلد کا وہی ہے جو ۵۳ء میں تجویز کیا گیا تھا یعنی 'قرآنی فیصلے' لیکن مشمولات کے اعتبار سے یہ ایک بالکل نئی تالیف ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشن کے بھی کچھ استفسارات ہیں لیکن بیشتر ایسے ہیں جو اس ایڈیشن میں شامل نہیں تھے۔ جب یہ پورا مجموعہ مکمل ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے گا تو آپ محسوس کریں گے کہ قرآنی معلومات کی کس قدر بیش بہا متاع ان میں جمع اور محفوظ ہے اور آپ کے لئے یہ معلوم کرنا کس قدر آسان ہوگیا ہے کہ فلاں معاملہ کی اصل و حقیقت کیا ہے اور قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔

۲۔ ہم نے استفسارات کے جواب میں یہ انداز کبھی نہیں رکھا کہ محض قرآن کریم کی متعلقہ آیت نقل کر دی جائے یا اس کا حوالہ دے دیا جائے۔ اس کے برعکس ہم اس باب میں قرآن کریم کی تعلیم اور اس کا مفہوم اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ یہ انداز زیادہ مفید ہے

۳۔ ہم نے ان جوابات میں فقہی موشگافیوں یا منطقی (اور مناظرانہ) نکات آفرینیوں کو بھی دخیل نہیں ہونے دیا ہر سوال کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں سیدھے سادے الفاظ اور دل نشین پیرایہ میں دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض سوالات اور ان کے جوابات ایک سے زیادہ بار آپ کے سامنے آئیں گے۔ اس سے مقصد تکرار نہیں ایسا وہیں کیا گیا ہے جہاں یہ دیکھا گیا کہ مزید جواب میں بات اور واضح ہوگئی ہے۔

۴۔ بعض جوابات میں صیغہ واحد متکلم (مَیں) استعمال ہوا ہے۔ وہ استفسارات پرویز صاحب کو موصول ہوئے اور انہوں نے ہی اس کے جواب دیئے تھے۔ ویسے تو طلوعِ اسلام میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بالعموم انہی کی قرآنی فکر سے مستنیر ہوتا ہے۔ لیکن صیغہ واحد متکلم سے قارئین کے دل میں جو سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اُس کے لئے اس وضاحت کو ضروری سمجھا گیا ہے۔

۵۔ جوابات کے اخیر پر بالعموم سنِ تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض مقامات پر سن کا اندراج خود جواب کے کسی گوشے کی وضاحت کے لئے ضروری تھا۔ (۵۳ء سے بالعموم مراد یہ ہے کہ یہ سوال کتاب کے پہلے ایڈیشن میں آگیا تھا۔)

۶۔ آخر میں ہم ان جوابات کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں آپ کو اکثر باتیں ایسی ملیں گی جو ہمارے عام معتقدات اور رسوم کے خلاف ہیں۔ ایسے مواقع پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ اعتقادات اور رسوم و اعمال صدیوں سے ہمارے ہاں مروّج چلے آرہے ہیں۔ اگر یہ اسلام کے مطابق نہیں تھے تو اُن کے خلاف کسی نے آواز کیوں نہ اٹھائی اور یہ ہمارے معاشرہ میں اس طرح متوارث کیسے چلے آئے۔ اِس قسم کے اعتراضات اکثر (سطح بیں) طبائع کے لئے پریشانی کا موجب بن جاتے ہیں۔ لیکن اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جب کوئی قوم اپنے آپ پر تحقیق کا دروازہ بند کر لیتی ہے۔ تو تقلید اس کے معاشرہ کی عام روش قرار پاجاتی ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اُسے اُسی طرح ہوتا رہنے دیا جائے اور قوم اُسی کے مطابق عمل کرتی رہے۔ اور اس کی سند میں صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ یہ ہمارے اسلاف کی روش ہے، اور اسلاف کی روش کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن بادنیٰ تعمق اس دلیل کا بودا پن واضح ہو جائے گا سوال یہ ہے کہ کیا کوئی غلط بات اس لئے صحیح قرار پا سکتی ہے کہ وہ مدتوں سے اسی طرح متوارث چلی آرہی ہے؟ ظاہر ہے کہ غلط بہر حال غلط ہے، خواہ اس پر صدیوں سے عمل کیوں نہ ہو رہا ہو۔ کسی بات کے صحیح ہونے کے لئے یہ دلیل ہی غلط ہے۔ کہ وہ صدیوں سے اِسی طرح چلی آرہی ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پھر غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے؟ مسلمانوں کے لئے اس کا جواب نہایت آسان اور واضح ہے اور وُہ یہ کہ ہمارے لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے کی کسوٹی خُدا کی آخری کتاب (قرآن کریم) ہے جو بات اِس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وُہ غلط ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس کے مطابق ہم اُن تمام معتقدات اور رسوم کو پرکھتے ہیں۔ جو ہمارے معاشرہ میں مروّج ہیں اور اُسی کے مطابق ہم استفسارات کا جواب دیتے ہیں۔ اِس بات کا البتہ ہمیں اعتراف ہے کہ انسانی کوشش بہر حال انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں سہو و خطا کا امکان ہے۔ اِس لئے ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اُس میں کوئی غلطی نہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اگر آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو اُس سے ہمیں مطلع فرمایئے۔ لیکن

اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ آپ اس کی وضاحت فرمائیں کہ وہ بات کس طرح قرآن کریم کے خلاف ہے ۔ اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے ۔

۷۔ ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں مختلف سائزوں میں تھی ۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمام کتابوں کو طباعتِ جدید کے وقت ایک ہی سائز میں کر دیا جائے ۔ لہٰذا اس جلد میں سابقہ جلدیں اوّل ، دوم اور سوم یکجا کر دی گئیں ہیں اور ان کا سائز بھی بڑا کر دیا گیا ہے ۔

۸ ۔ اس کے بعد جب جلد چہارم اور پنجم کی طباعتِ جدید سامنے آئے گی تو انہیں بھی یکجا کر کے اسی سائز پر چھاپنے کا پروگرام ہے ۔ انشاء اللہ ۔

اُمید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے ۔

والسلام

انتظامی سربراہ : طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

لاہور

اپریل ۱۹۸۷ء

یہ نیا ایڈیشن بلا ترمیم شائع کیا جا رہا ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی فیصلے

①

نماز

سوال :

ایک صاحب نے مجھ سے حسب ذیل سوالات دریافت کئے ہیں ۔

۱۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام قوانینِ خداوندی کا نام ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت اور مقام کیا ہے ؟

۲۔ نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے ؟۔ آپ نے کہیں اس کی صراحت کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد نماز ہے ؟

۳۔ کیا آپ نماز کی موجودہ شکل کے علاوہ کوئی اور شکل تجویز کرتے ہیں ؟

جواب :

اسلام نام ہے زندگی کے ہر شعبے میں احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا۔ اُن کی پوری پوری اطاعت کرنے کا، نماز اِس طرح سرِ تسلیم خم کرنے کا عملی اعتراف اور محسوس مظاہرہ ہے۔ خدا کے سامنے سر جھکا دینے (سجدہ ریز ہو جانے) سے انسان اس امر کا اقرار (یا اظہار) کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر ارادے فیصلے اور عمل میں اُس کے احکام کی اطاعت کرے گا جس کا دل، جذباتِ فرماں پذیری اور اطاعت گذاری سے لبریز ہو، اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جائے گا اور جو خدا کے حضور سر جھکانے میں عار یا ہتک محسوس کرتا ہے وُہ اس کی اطاعت کیا کرے گا ؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص زندگی کے مختلف شعبوں میں قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے، اُس کا نماز میں رسمی طور پر سر جھکا دینا، مقصدِ صلوٰۃ کو پورا نہیں کر سکتا۔

اسلام سے مفہوم

۲۔ نماز، فارسی (بلکہ پہلوی) زبان کا لفظ ہے جو اہلِ ایران کے قدیم طریق پرستش کے لئے استعمال ہوتا تھا بعد میں یہ لفظ اجتماعات صلوٰۃ کے لئے استعمال کر لیا گیا اور اب ہمارے ہاں یہی لفظ مروّج ہے۔ (میں سمجھتا ہوں کہ جو اصطلاحات قرآنِ کریم نے مقرر کی ہیں۔ انہیں اسی طرح استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے) قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔ اِس کے بُنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت و محکومیت اختیار کرنا ہیں۔ قرآن کریم نے اِس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم نماز کا لفظ بولیں گے تو اس کا مطلب صرف نماز ہوگا۔ لیکن جب صلوٰۃ کا لفظ استعمال کریں گے تو اُس میں نماز بھی آجائے گی اور اس کے علاوہ اور مفہوم بھی۔ مَیں نے اکثر مقامات پر اس کی صراحت کر دی ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ مثلاً لغات القرآن میں لفظ صلوٰۃ (مادہ ص۔ ل۔ و) کے تحت آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

نماز کا لفظ

صلوٰۃ کے مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبدِ مومن زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتا ہے وُہ فریضۂ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اِس کے لئے وقت، مقام، یا شکل کا تعیّن ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

صلوٰۃ

اِس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات دی گئی ہیں۔ جن میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لئے آیا ہے۔ اِس کے بعد لکھا ہے:

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔

(نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے۔)

اِس کے بعد ارکانِ صلوٰۃ کی اہمیّت کے سلسلے میں لکھا ہے:۔

انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اُس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصّہ، خوشی، تعجّب

عزم وارادہ، ہاں اور نہ، وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار انسان کی طبیعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزم و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے "سرِ تسلیم" خم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور محض ——— (FORMALISM) کو کوئی وزن نہیں دیتا۔ لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (FORM) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس (FORM) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہو تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام و عظمت انقیاد و اطاعت اور فرماں پذیری و خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا بجائے خویش بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔

ارکان صلوٰۃ

مفہوم القرآن میں قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں لکھا گیا ہے:-

قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح "اقامتِ صلوٰۃ" ہے جس کے عام معانی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا لئے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں، اس لئے صلوٰۃ میں قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنابریں اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا۔ ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا تصور، محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامتِ صلوٰۃ سے مراد اجتماعاتِ نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ میں نے صلوٰۃ کے معنی نماز اور اقامتِ صلوٰۃ کے معنی اجتماعاتِ صلوٰۃ کا قیام

واضح الفاظ میں دیئے ہیں اور اِس سے مراد وہی نماز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔

۳۔ ایک مقام پر نہیں، متعدد مقامات پر اور ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں

ردّوبدل کسی قسم کے ردّوبدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اِسی وجہ سے میں فرقہ اہلِ قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنہوں نے اپنے لئے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہو جائے اور وہ تمام اُمت کے لئے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کر دے تو یہ اُمت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑا مؤثر اقدام ہوگا۔ یہ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہدِ رسالت مآب اور خلافتِ راشدہ میں امت ایک ہی طریق پر نماز ادا کرتی ہوگی۔ اس وقت اُمت میں وحدت تھی۔ اِس لئے جب ہم پھر سے اسی عہد سعادت مہد کی طرف رُخ کریں گے تو اُمت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضرور کرنی ہوگی اور نماز اس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب اُمت میں وحدت پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں، تو میں اس سے بحث نہیں کرتا۔ (نومبر ۱۹۶۱ء)

دُوسرا سوال پچھلے کسی پرچہ میں زکوٰۃ کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن نے چونکہ اس کے نصاب کی مقدار متعین نہیں کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں وہ حکومت جو قرآنی اصولوں کے مطابق اور اسلامی سیرت کے حامل حکمرانوں سے بنے گی وہ اپنا نصاب مقرر کرنے میں آزاد ہوگی جس چیز کی حد قرآن مجید نے مقرر نہیں کی، اس پر صرف اس لئے مصر ہونا کہ آں حضرت (صلعم) کے زمانے سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کی حکومتوں میں ایسا ہی دستور رہا ہے۔ یا فقیہوں نے ایسا ہی فیصلہ صادر کیا ہے ـــــ آپ کے نزدیک غلط ہے۔

لیکن اِس کے ساتھ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(ا)۔ قرآن مجید میں نماز کی تاکید موجود ہے۔ لیکن اس کے اوقات، تعداد، ارکان اور ادائیگی کی تفصیل موجود نہیں۔ جماعت اہلِ قرآن نے اِسی بنا پر کوشش کی کہ نماز پنجگانہ کا جواز قرآن سے نکالا جائے۔ ان کے دلائل کی کمزوری کی ایک صریح علامت یہ ہے کہ ان میں ہی کا ایک گروہ صرف تین نمازوں کا قائل ہو سکا۔

(ب)۔ رکعات نماز کا بھی یہی معاملہ ہے۔

(ج)۔ نماز کے ارکان اور اس کی ادائیگی کی تفصیل بھی بڑا وقت طلب معاملہ ہے۔ اگر حدیث صرف تاریخ دین ہے،

اور دین نہیں جو قابلِ پیروی یا اطاعت ہو تو رکوع و سجود کی ترتیب بدلی جا سکتی ہے، سجدہ ایک بھی کافی ہو سکتا ہے رکعتوں کا تعین بھی انفرادی یا مجموعی فیصلے پر ہر زمانے میں بدلا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ جو کچھ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے، اس کی جگہ جو چیز قرآن سے مناسب سمجھی جائے، تلاوت کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ اہل قرآن کے ایک گروہ نے موجودہ طریقۂ نماز کو بدل کر مولوی عبداللہ مرحوم کے قائم کردہ طریقہ کو ترجیح دی ہے۔

(اہل قرآن کا ذکر بار بار کرنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کا مسلک اُن کا سا ہے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ آپ نے اپنی کتابوں میں اس مسلک سے علیحدگی کا اظہار کیا ہے۔ مفہوم صرف یہ ہے کہ صرف قرآن مجید تک محدود رہنے سے یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے۔)

کافی عرصہ ہُوا کہ مَیں نے آپ کا پمفلٹ شخصیت پرستی پڑھا تھا۔ اب اُن شکوک کو لکھتے ہوئے مَیں نے وہ رسالہ تلاش کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وُہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ اِس لئے میں حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہُوں۔

اِس رسالہ میں آپ نے کہا تھا کہ نماز کا معاملہ تواتر سے حل ہو سکتا ہے۔ چونکہ ساڑھے تیرہ سو سال سے نماز اسی نہج پر پڑھی جاتی رہی ہے۔ اس لئے آج بھی ہمیں اسی طرح پڑھنی چاہیئے۔

اگر نماز کے معاملہ میں تواتر کی دلیل صحیح ہے تو زکوٰۃ میں کیوں نہ ہو؟ براہِ مہربانی اس تضاد کو رفع کرنے میں مدد دیجئے۔

جواب

مَیں نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن قوانین کا صرف اصولی ذکر فرمایا ہے اور ان کی جزئیات کو متعین نہیں کیا۔ ان جُزئیات میں زمانہ کے بدلنے والے تقاضوں کے ماتحت ردّ و بدل ہو سکتا ہے لیکن اس تغیّر و تبدل کا مجاز کوئی فرد یا افراد کی جماعت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ حق صرف جانشینان رسولؐ اللہ کو حاصل ہے اور جانشینِ رسولؐ اللہ سے مراد ہے وہ حکومت جو قرآن کا حکم چلانے کے لئے قرآنی اصُولوں کے مطابق عمل میں آئی ہو۔

جُزئیات میں تبدیلی

سب سے اوّل تو یہ دیکھئے کہ اس میں بحث قوانین سے ہے، جزئیات سے نہیں۔ کسی قانون کی جُزئیات میں زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں

کے ماتحت ردّوبدل کی ضرورت بالکل واضح ہے لیکن عبادات میں یہ ضرورت بالکل شاذ ہے۔ مثلاً نماز، اور زکوٰۃ کو لیجئے۔ زکوٰۃ (یعنی حکومت کے ٹیکس) کی شرح میں تغیر و تبدل کی ضرورت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس نماز کو لیجئے تو زمانے کے تقاضے (ذاتی رجحانات نہیں بلکہ زمانے کے تقاضے) اس کی جزئیات پر کہاں اثر انداز ہوں گے۔ وہ کون سی ضرورت ہوگی جو اس کی مقتضی ہو کہ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کی جگہ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ کہا جائے۔ یا سجدہ دو کی بجائے ایک ہی ہو۔

اختلافات

لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ نماز کی موجودہ جزئیات میں بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے مطابق اسلامی حکومت کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان اختلافات کو بتدریج مٹاتی چلی جائے جو مسلمانوں میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کی دیواریں بن کر کھڑے ہیں۔ اگر رسولؐ اللہ کے بعد آپ کی جانشینی کا سلسلہ قائم رہتا تو یہ فرقے وجود ہی میں نہ آتے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ نے ملتِ واحدہ کو چھوڑا تھا۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی قوم نہیں چھوڑی تھی۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اگر قرآنی حکومت نماز کی ایک متفقہ علیہ شکل متعین کرے گی تو اس میں موجودہ اختلافی جزئیات میں ردّوبدل ناگزیر ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ جو شکل اس حکومتِ قرآنی کی طرف سے متعین ہوگی وہ شرعی نماز ہوگی۔

تواتر

لیکن جس حالت میں ہمارے ہاں قرآنی حکومت نہ ہو، تو اس میں تشتّت و انتشار کو روکنے یا کم کرنے کے لئے یہی صورت ہو سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر فرد اور ہر جماعت اپنی اپنی مرضی کے مطابق طریقے وضع کرتی جائے۔ جس حد تک ہم مطمئن ہو سکیں کہ فلاں عمل عہد رَسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ سے ہم تک علی التواتر چلا آرہا ہے، اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے ماتحت میں ہندوستان میں (اور یہاں بھی جب تک قرآنی حکومت کا قیام نہ ہو) مسلمانوں کے لئے یہی راہ سلامتی کی سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں کہ جو اعمال ملت میں تواتر سے چلے آرہے ہیں۔ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی واضح حکم سے ٹکرا نہ رہے ہوں۔ اس سے قوم مزید انتشار و خلفشار سے بچ سکتی ہے۔

اہلِ قرآن کی بنیادی غلطی میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ان احکام کی جزئیات بھی قرآن سے متعین کرنے

اہلِ قرآن کی غلطی

لگ گئے جن کا صرف اصولی حکم قرآن نے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے قیاس آرائیوں کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر جن قیاسات پر یہ لوگ اس طرح سے پہنچے۔ وُہ قوم کے لئے فیصلہ کی حیثیت تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ حق جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے، صرف حکومتِ قرآنی کو حاصل ہے مَیں دینی لامرکزیت کے دور میں اعمال متواترہ کو ایسے انفرادی قیاسات سے انسب سمجھتا ہُوں۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے قوانین اور عبادات میں جو اوپر فرق بیان کیا ہے تو وہ محض اس بات کو سمجھانے کے لئے کیا ہے کہ مؤخر الذکر میں زمانہ کے تغیرات سے ردّ و بدل کی ضرورت شاذ ہی

عبادات اور قوانین

ہوتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوانین کا تعلق ہماری دنیاوی زندگی سے ہے اور عبادات کا تعلق آخرت سے یا قوانین مادی دُنیا سے متعلق ہیں اور عبادات روحانی سے۔ اسلام میں دُنیا اور آخرت اور مادہ اور رُوح میں کوئی امتیازی خطوط نہیں۔ اِس کے قوانین، اور اس کے تمام اعمال اس کی عبادات ہیں۔ ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت زندگی کے لئے خود ایک قانون کا درجہ لئے ہوئے ہے۔ اس نہج سے آپ سمجھنا چاہیں تو جس اصول کا مَیں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے۔ قانون اور عبادات دونوں پر منطبق ہو گا۔ یعنی اگر جانشینِ رسولؐ اللہ (یعنی قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ ردّ و بدل ناگزیر سمجھے۔ تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہو گی۔

ہماری دشواری یہ ہے کہ جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ردّ و بدل کا تصور کرتے وقت ہماری موجودہ حکومتوں کے ارباب حل و عقد ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اِس تصور سے ہماری رُوح کانپ اٹھتی ہے کہ ان لوگوں کو یہ حق کیسے دے دیا جائے کہ یہ ان احکام میں تغیر و تبدل کر دیں جو رسولؐ اللہ نے متعین فرمائے تھے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حق صرف رسولؐ اللہ کے جانشینوں کو پہنچتا ہے اور کسی کو نہیں، اور جانشینِ رسولؐ اللہ جب رسولؐ اللہ کے کسی حکم میں تبدیلی کا خیال کریں گے، تو ظاہر ہے کہ وہ اُسی وقت ایسا کریں گے جب وہ دل کے پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ..... اگر اس وقت رسولؐ اللہ موجود ہوتے تو وہ خود اپنے اس حکم میں ایسی تبدیلی فرما دیتے۔ یہ تمام الجھاؤ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے

(۱۹۵۳ء)

سوال: نمازوں کی تعداد یہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ ان سے ذکر آیا کہ وحی صرف قرآن شریف ہے اور کوئی وحی نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم وحی خفی (یعنی غیر متلو) کے منکر ہو تو بتاؤ کہ پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر قرآن کریم میں کہاں ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ یہ وقت رسُول اللہ نے وحی خفی کی بنا پر مقرر فرمائے تھے۔

جواب :

یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن کریم میں کیا کچھ ہے۔ سردست آپ اتنا دیکھئے کہ اس وحی خفی (غیر متلو) کی کیفیت کیا ہے جس کی رُو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ نمازیں شبِ معراج میں فرض ہوئی تھیں۔ اس کی تفصیل خود بخاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

نمازیں کیسے فرض ہوئیں انس بن مالک کا قول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی تھیں لیکن جب میں (واپس ہو کر) موسیٰؑ کی طرف سے گزرا تو انہوں نے دریافت کیا کہ خدا تعالےٰ نے آپ کی اُمت پر کیا فرض کیا ہے؟ مَیں نے کہا کہ پچاس وقت کی نمازیں۔ وُہ کہنے لگے۔ اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ۔ کیونکہ تمہاری اُمت میں اس کی طاقت نہ ہوگی۔ مَیں نے جا کر اپنے رَبّ سے کمی کرائی تو خدا تعالےٰ نے آدھی ساقط کر دیں۔ جب میں موسیٰؑ کے پاس آیا تو ان سے کہا کہ آدھی ساقط کر دی گئیں تو انہوں نے کہا کہ دوبارہ اپنے رب کے پاس جاؤ۔ تمہاری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ مَیں نے خدا سے اور کمی کرائی۔ خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض رہیں اور وہ ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ میرے ہاں حکم میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب میں موسیٰؑ کی طرف لوٹا تو انہوں نے کہا کہ اب کے پھر اپنے رب کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ)

غور فرمایا آپ نے کہ پانچ نمازیں کس طرح فرض ہوئیں؟ اللہ میاں حکم دینے والے اور حضور نبی اکرمؐ اس حکم کو امت کی طرف لانے والے۔ خدا نے پچاس نمازوں کا حکم دے دیا اور رسول اللہؐ اس حکم کو لے کر چلے آئے۔ نہ خدا کو (معاذ اللہ) اس کا احساس ہُوا کہ میں کیسا ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں، نہ رسولِ اکرمؐ کو اس کا خیال گزرا کہ میری اُمت اس بوجھ کو کیسے اٹھائے گی۔ اگر اس کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو۔ اُن کے

کہنے پر رسولؐ اللہ کو بھی خیال ہوا کہ واقعی بات ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ واپس تشریف لے گئے تو اللہ تعالےٰ کو بھی اس کا احساس ہوا کہ حکم میں واقعی زیادتی تھی۔ چنانچہ ایک دو بھی نہیں، اکٹھی آدھی نمازیں ساقط ہوگئیں۔ اللہ نے سمجھ لیا کہ اب حکم مناسب ہے اور رسولؐ اللہ بھی مطمئن ہو گئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ یہ سُن کر رسولؐ اللہ پھر اللہ میاں کے پاس تشریف لے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ کو پھر اپنے حکم کی زیادتی کا احساس ہُوا تو پچیس سے پانچ رہ گئیں۔ چنانچہ حضورؐ پھر مُطمئن ہو کر واپس تشریف لے آئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر فرمایا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ اس پر رسولؐ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اب حکم ٹھیک ہے، بلکہ فرمایا یہ کہ (آپ کہتے تو ٹھیک ہیں لیکن میں کیا کروں) مجھے بار بار جاتے شرم آتی ہے۔ اس لئے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔

غور فرمایا آپ نے کہ دین کے محکم احکام کس طرح متعین ہوتے تھے؟ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ کسی وقت ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ اس قسم کی باتیں جب غیر مسلموں کے سامنے آتی ہوں گی تو وہ ہمارے خدا اور خدا کے رسول (علیہ التحیۃ والسلام) کے متعلق کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے۔ اس روایت سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ اس سے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت ثابت ہو جائے اور مسلمانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ (معاذ اللہ) یہ ہے ہمارے پیغمبر کے سامنے تمہارے رسول کی حیثیت۔ لیکن اس یہودی کا کیا گلہ! اُس کا تو یہ کام ہی تھا۔ مسلمانوں سے پوچھیے جو ان چیزوں کو ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور جب کوئی ان کی طرف اس طرح توجہ دلاتا ہے تو اس پر بُری طرح برس پڑتے ہیں۔

لیکن اب یہ چیزیں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتیں۔ اگر مسلمانوں نے انہیں اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے رکھا تو یہ چکی کے پاٹ کی طرح انہیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے اور اس کے بعد وہ قوم آئے گی جو قرآن کی مشعلِ ہدایت کی روشنی میں تمام انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لے جائے گی۔

بہرحال یہ ہے نمونہ اس "وحی خفی" کا جس کی رُو سے ہمارے مولوی صاحبان کے مطابق وہ احکام متعین ہوا کرتے تھے جن کا ذکر انہیں وحی جلی (قرآن کریم) میں نہیں ملتا۔ (۱۹۵۳ء)

(س): نظامِ صلوٰۃ اور نماز

آپ نے نظامِ صلوٰۃ کے متعلق جستہ جستہ جو کچھ آج تک لکھا ہے اُس کا بظاہر مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ نے دین کے ایک اہم اور بنیادی گوشے

پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ایک بات ہنوز وضاحت طلب ہے اور وہ یہ کہ اس نظام صلوٰۃ میں اس صلوٰۃ کا کیا مقام ہوگا جسے مؤقت فریضہ کہا گیا ہے۔

اگر جرأت عرض معاف ہو تو کیا میں یہ بھی دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟

جواب:

اگر آپ میری تحریروں کا مسلسل اور بالاستیعاب مطالعہ کرتے چلے آ رہے ہیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ جہاں تک میں قرآن کو سمجھ سکا ہوں۔ قیام صلوٰۃ قرآن کی ایک نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح ہے۔ جس سے

قیام صلوٰۃ

درحقیقت مقصود اس معاشرے کا قیام ہے۔ جس میں قانونِ خداوندی عملاً نافذ ہو اور اس طرح ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں میں پوری پوری نشوونما ہوتی جائے۔ تاکہ وہ اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی کی سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوتا ہوا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے۔ لہٰذا نظام الصلوٰۃ ایک مردِ مومن (یا جماعتِ مومنین) کی پوری پوری زندگی کو محیط ہوگا۔ ان کا ایک ایک سانس اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہوگا کہ وہ مصلّے (یعنی خدا کے پیچھے پیچھے جانے والے کارواں کے افراد) ہیں۔ اُن کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک شعبۂ عبادت (یعنی قانونِ خداوندی کی محکومیت) کا مظہر ہوگا۔ اُن کے کاروبارِ حیات کا فلم سامنے آجائے تو وہ منشائے خداوندی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دے گا۔ اس اجتماعی نظام سے وابستگی کی بنا پر ان کی حیاتِ ارضی۔ از ابتدا تا انتہا الاسلام کی جامع تفسیر ہوگی۔ (ولا تموتن إلا وأنتم مسلمون۔) اس نظام کے اجزاء یہ ہیں:-

(۱) - قرآن۔ یعنی ضابطۂ آئینِ اسلام۔

(۲) - مرکز۔ یعنی ضابطۂ خداوندی کی قوتِ نافذہ۔

(۳) - جماعت۔ افرادِ معاشرہ جن سے یہ نظام مشکل ہوگا۔

اور اس کی عملی تشکیل کے اصول ومبانی یہ ہیں:-

(ا) - افرادِ معاشرہ میں کامل ائتلاف۔ یعنی یک دلی و یک نگہی و یک قدمی۔ اور

(ب) - مرکز کی اطاعت

ہمہ وقتی پروگرام

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ نظام جماعتِ مومنین کی پوری کی پوری زندگی پر چھایا ہوتا ہے اور دن اور رات میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اُس کے

احاطے سے باہر ہوں۔ یہ ان کی "حیاتِ انسانی" کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو اُن کی "حیاتِ طبعی" کے لئے ہوا کی حیثیت ہے۔ ہوا پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں جو اس کی ضرورت اور اہمیت کا معترف نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ ڈاکٹروں کو اکثر و بیشتر یہ فقرہ دہرانا پڑتا ہے کہ صحت اور زندگی کے لئے کھلی اور تازہ ہوا کی اشد ضرورت ہے۔ دہرانا اس لئے پڑتا ہے کہ اس کی یاد دہانی (ذکر) سے اس کی اہمیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آئینِ خداوندی نے بھی اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ اِس نظام کی یاد دہانی کرائی جائے

صلوٰۃ

تاکہ اس کے اصول و مبانی اُجاگر ہوتے جائیں اور اس کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس یاد دہانی کا نام صلوٰۃ کا فریضہ مؤقت ہے۔ یعنی خاص اوقات کا اجتماعِ صلوٰۃ۔

دین کے نظام (اسلامی معاشرہ) کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فوز و فلاح کی زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ کی ابتدا اسی اصول سے ہوتی ہے یعنی ایک آواز پر بکھرے ہوئے افراد کا ایک مقام پر جمع ہو جانا۔

دین کے نظام میں اگلا قدم اطاعتِ مرکز ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ میں اس کا مظاہرہ عملی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ جب یہ اجتماع اپنے میں سے سب سے بہتر فرد کو بہ حیثیت امام چن لیتا ہے (اور بہتر ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہے) یہی امام اس اجتماع کا نمائندہ ہوتا ہے اس ایک کی آواز پر سب کو اُٹھنا ہوتا ہے اور اسی کی آواز پر جھکنا۔ اور یہ جھکنا اور اُٹھنا ایک ساتھ ہوتا ہے جو شہادت دیتا ہے اس حقیقت کبریٰ کی کہ اس جماعت کے افراد میں کامل ہم آہنگی فکر و عمل ہے۔ اس سے معاشرے کی ناہمواریاں مٹتی ہیں۔

امام

("امام"، اس تاگے کو کہتے ہیں جس سے معمار یہ دیکھا کرتا ہے کہ دیوار بالکل سیدھی اُٹھ رہی ہے۔ اس کی اینٹیں آگے پیچھے تو نہیں ہیں۔)

دین کے نظام کا اگلا اصول یہ ہے کہ یہ نظام عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور اُس کا مرکزِ محسوس بیت اللہ ہے۔ لہٰذا اجتماعِ صلوٰۃ میں اس حقیقت کی یاد دہانی کے لئے جماعت کا رُخ قبلے کی طرف رکھا جاتا ہے یعنی ساری دُنیا کے مسلمانوں کا مطمحِ نگاہ اور نصب العین ایک ہوگا۔

اسلامی معاشرے کا قیام قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے اور اجتماعِ صلوٰۃ سے مقصود اُسی اصل الاصول کی یاد دہانی ہے۔ اس لئے قرآن کے بغیر صلوٰۃ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کی غایت ہی

افرادِ معاشرہ کی توجہات کو قرآن پر مرکوز کرتا ہے۔ اسی مقصد کی یاد دہانی کے لئے یہ اجتماعات رکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں قرآن دہرایا جاتا ہے تاکہ اس ایمان (نصب العین حیات) کی تجدید ہوتی رہے کہ ہم نے ہر غیر قرآنی نظام کی مخالفت میں سینہ سپر ہو کر قائم رہنا ہے اور جھکنا ہے تو صرف اسی کے فیصلوں کے سامنے جھکنا ہے۔

صلوٰۃ اور معاشرت

یہ بھی واضح رہے کہ صلوٰۃ کے اجتماعات محض اس یاد دہانی کے لئے نہیں۔ ان اجتماعات میں اُمت کے معاملات کے متعلق باہمی مشورہ کیا جاتا ہے یہ درحقیقت قرآنی حکومت کی "مجلس مشاورت" کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ میں مومنین کی صفات یہ بتائی گئی ہیں کہ وَالَّذِیْنَ ..... اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۸) یہ لوگ اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور انکے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں"۔ یہاں اقامت صلوٰۃ اور باہمی مشاورت کا یکجا حکم صلوٰۃ کے اجتماعات کی غرض وغایت کو واضح کرتا ہے۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو خلیفہ کی طرف سے منادی کرائی جاتی کہ "الصلوٰۃ الجامعہ" لوگ مسجد نبوی میں جمع ہوتے۔ پہلے دو رکعت نماز ادا ہوتی۔ پھر خلیفہ معاملہ پیش نظر کی وضاحت کرتا اور مجلس کے باہمی مشورہ سے اُس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا۔

مَیں کس طرح نماز پڑھتا ہُوں

اَب آپ کے سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ مَیں نماز کس طرح پڑھتا ہُوں۔ آپ کو اس سوال کے پوچھنے میں کسی معذرت طلبی کی ضرورت نہ تھی۔ اگر آپ میرے پاس ہوتے تو از خود دیکھ لیتے کہ مَیں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ یہاں سے دُور ہیں اس لئے آپ کو لکھ کر پوچھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مُسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اگر کہیں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو (اور مجھے وہ طریق آتا ہو) تو اُن کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں بھی توقف نہیں کرتا۔ (۱۹۵۳ء)

صلوٰۃ سے متعلق مختلف گوشے

نومبر ۱۹۵۳ء کے طلوعِ اسلام میں ایک صاحب کا مقالہ شائع ہوا، جس میں انہوں نے ہماری پیش کردہ اس حقیقت کی تائید کی تھی کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم فی الواقعہ ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں تمام افراد معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں اور یوں افراد کی ذات کی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی زندگی

بھی سرفرازیوں اور خوشگواریوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ اس مقالہ کے بعد طلوعِ اسلام کی طرف سے اس پر ایک استدراک شائع ہوا تھا جو اس کے بعض مقامات کی وضاحت کرتا تھا اور دو ایک نکات سے اختلاف۔ اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

استدراک

ہمیں خوشی ہوئی کہ طلوعِ اسلام نے جو یہ آواز اٹھائی تھی کہ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" کے معنی فقط "نماز پڑھنا" نہیں بلکہ اس سے مفہوم ہے قرآنی معاشرہ کا قیام جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو۔ اس کا چرچا اب دور دور تک ہونے لگ گیا ہے۔ فالحمد للہ علٰی ذالک۔ محترم..... صاحب اس باب میں ہمارے ہم صفیر ہیں اور اُن کا زیرِ نظر مقالہ اسی دعوت کی تبلیغ ہمارے محترم نے اپنے مقالہ کے اخیر میں البتہ ایک ایسی بات کہی ہے جس سے ہمیں بصد احترام تھوڑا سا اختلاف ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ہمارے نزدیک وہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے مضمون میں بصراحت لکھا ہے۔ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ ایک اجتماعی عمل ہے۔ جس سے صحیح قرآنی معاشرہ قائم ہوتا ہے صلوٰۃ کے معنی ہی متوازن اور پیہم حرکت اور قانونِ خداوندی کا مسلسل اتباع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز اجتماعی ہے انفرادی نہیں۔ جہاں تک ہماری بصیرت یاوری کرتی ہے، ہمیں

انفرادی نماز

قرآن سے انفرادی صلوٰۃ کی طرف راہ نمائی کہیں نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اور انفرادی صلوٰۃ میں یہی فرق نہیں کہ جب صلوٰۃ کو بہت سے لوگ مل کر ادا کرلیں تو وہ اجتماعی کہلاتی ہے اور جب اُسے ایک فرد تنہائی میں ادا کرے تو وہ انفرادی صلوٰۃ ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ اور انفرادی صلوٰۃ (اگر انفرادی صلوٰۃ کو بھی صلوٰۃ کہا جا سکے تو) دو الگ الگ تصورات کی ترجمان ہیں۔ اجتماعی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصوّر پر ہے کہ قرآن کی رُو سے فرد کی تربیت ذات معاشرے کے اندر (اور اُس کا جزو بننے) ہی سے ہو سکتی ہے اور عبادت سے مفہوم ہے۔ قوانینِ خداوندی کی بے لاگ اور بے لوث اطاعت جو (پھر) معاشرہ کے اندر ہی ممکن ہے، انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ اس کے برعکس، انفرادی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصوّر پر ہے کہ ایک فرد اپنا "تزکیۂ نفس" معاشرہ سے الگ ہٹ کر، انفرادی طور پر کر سکتا ہے، اور عبادت سے مقصود ہے۔ خُدا کی پرستش، جو انفرادی طور پر بھی کی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تصوّرات، اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے، ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ قرآن انفرادی تصورِ حیات کے خلاف صدائے احتجاج ہے اور اجتماعی تصورِ حیات کا داعی۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ قرآن، جو اجتماعی صلوٰۃ کا نقیب ہو، ساتھ ہی انفرادی صلوٰۃ کی

بھی راہنمائی کرے اور اس کے فوائد بتائے۔ جسے انفرادی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت دعا ہے۔ (قرآنی صلوٰۃ نہیں جسے قائم کیا جاتا ہے) اور خود حضرت زکریاؑ کا واقعہ جس سے محترم ..... صاحب انفرادی صلوٰۃ کی دلیل لائے ہیں اس کی تاکید کرتا ہے۔ قصۂ حضرت زکریاؑ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ (ھنالک دعا زکریا ربہ (۳/۳۸) زکریاؑ نے اپنے رب سے دعا مانگی اور کہا کہ تو مجھے اپنا ہاں سے اولاد عطا فرما دے۔ (انک سمیع الدعاء) اس کے بعد ہے کہ وہ ہنوز قربان گاہ میں کھڑا دعا مانگ رہا تھا کہ خدا نے اُسے بیٹے کی بشارت دے دی۔ (فنادتہ الملئکۃ وھو قائم یصلی فی المحراب۔ (۳/۳۸) قرآن نے ان الفاظ (وھو قائم یصلی فی المحراب) کا اضافہ یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے ابھی اپنی دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ خدا نے اسے استجابت سے نواز دیا۔ سورۂ مریم میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے۔ کہ زکریاؑ کا دعا مانگنا، اُس کی دعا کا قبول ہو جانا اور اسے اپنے بیٹے کی بشارت مل جانا، سب ایک ہی وقت میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب یہ کچھ ہو گیا تو ——— (فخرج علی قومہ من المحراب (۱۹/۱۱) زکریاؑ قربان گاہ سے نکل کر اپنے لوگوں کی طرف آیا۔) لہٰذا حضرت زکریاؑ کے قصہ میں (یصلی فی المحراب) کے معنی قرآن کی مصطلحہ صلوٰۃ ادا کرنا نہیں۔ بلکہ بیٹے کی دعا مانگنا ہے۔ صلوٰۃ کا لفظ دعا کے معنوں میں قرآن میں متعدد مقامات پہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً (صلوٰتک سکن لھم (۹/۱۰۳) تیری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوتی ہے) لہٰذا یہ کہنا تو درست ہے کہ دعا انفرادی طور پہ مانگی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ قرآنی صلوٰۃ، اجتماعی طور پہ بھی ادا ہو سکتی ہے اور انفرادی طور پہ بھی واضح رہے کہ جو نمازیں اس وقت ہم باجماعت (یعنی بزعم خویش اجتماعی) بھی پڑھتے ہیں وہ بھی درحقیقت انفرادی صلوٰۃ ہے۔ اس لئے کہ اس میں بنیادی تصور خدا کی پرستش اور انفرادی تزکیہ کا ہے۔ لہٰذا اس وقت نہ تو کسی ایک فرد کی الگ ادا کردہ نماز ہی قرآنی صلوٰۃ ہے اور نہ ہی نماز باجماعت مقصود کے اعتبار سے قرآنی۔

حضرت زکریاؑ کی صلوٰۃ

وقتی اجتماعات

قرآن نے تشکیل معاشرہ کا جو پروگرام دیا ہے، اس میں اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اس مقصد کے لئے وقتی اجتماعات بھی ضروری ہیں۔ جن میں خدا کی حمد و ستائش اور

مسلہ: قرآن کی رو سے دعا مفہوم کیا ہے؟ اس کی تشریح کسی دوسرے مقام پہ کی جائے گی۔

اقرار اطاعت و انقیاد کے بعد، اہم معاملات کے متعلق باہمی مشاورت کی جائے۔ انہی کو موقف اجتماعاتِ صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں باہمی مشاورت اور قیامِ صلوٰۃ کا حکم اکٹھا آیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے۔ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ (۴۲/۳۸) یعنی یہ ان لوگوں کی جماعت ہے جو اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت پر لبیک کہتے ہوئے نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اُسے ربوبیتِ عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ عہدِ نبی اکرمؐ اور صحابہؓ میں جب کبھی کوئی ایسا اہم واقعہ پیش آیا جس کے لئے فوری اجتماع کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے جو اعلان کیا جاتا تھا اس میں کہا جاتا تھا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" چنانچہ اس اعلان کو سُن کر لوگ جمع ہو جاتے اور مسئلہ پیشِ نظر پر غور و خوض کر لیا جاتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس دور میں الصلوٰۃ کا مفہوم کیا تھا۔

انفرادی صلوٰۃ کی درستگی

اس کے بعد محترم ..... صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر ہم انفرادی صلوٰۃ کو درست کر سکیں جو زیادہ مشکل نہیں تو جماعتی صلوٰۃ کے لئے تدریجاً راستہ ہموار ہو سکتا ہے"۔ ان صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ "انفرادی صلوٰۃ کی درستگی" سے اُن کا مقصود کیا ہے؟ یہ آواز ہزار برس سے (اور قریب قریب ہر نماز کے وقت ہر مسجد سے) ہمارے کانوں میں آ رہی ہے کہ تم اپنی نمازوں کو درست کرو۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ مسجد میں آواز دینے والے کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ تم نماز کے فرائض و واجبات، سنن، مستحبات وغیرہ کا نہایت احتیاط سے خیال رکھو۔ اس کے ارکان کو ٹھیک ٹھیک طور پر ادا کرو۔ کھڑے ہو تو دونوں پاؤں میں اتنا فاصلہ ہو۔ تکبیر کے لئے ہاتھ اُٹھیں تو کانوں کی لَو تک پہنچیں۔ قیام میں ہاتھ فلاں مقام پر رہیں۔ رکوع میں جھکنے کی یہ شکل ہو، سجدہ میں یہ صورت وغیرہ وغیرہ۔ خلوت میں ایسی تاکید کرنے والے سے پوچھو تو وہ کہہ دے گا کہ نماز خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرو۔ اس میں حضورِ قلب نہایت ضروری ہے۔ انسان کو عاجزی اور ناتوانی سے خدا کے حضور رونا اور گڑگڑانا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ہزار برس میں کروڑوں انسان ایسے گزر چکے ہیں (اور آج بھی کروڑوں نہیں تو لاکھوں ایسے ہوں گے) جو اپنی نمازوں میں تعدیلِ ارکان کا بھی خیال رکھتے تھے۔ (اور رکھتے ہیں) اور اُن کے دل میں خشوع و خضوع بھی تھا (اور ہوتا ہے) لیکن اس کے باوجود یہ نمازیں وہ نتائج

تو مرتب نہ کر سکیں (نہ آج کر رہی ہیں) جنہیں قرآن نے صلوٰۃ کا لازمی ثمرہ قرار دیا ہے اور جن کا ذکر محترم موصوف نے اپنے مقالہ میں اس حسن و ایجاز سے کیا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ کہ ہماری اصلی خرابی یہ تھی کہ ہم نے سمجھ لیا کہ انفرادی صلوٰۃ کو درست کرنے سے قرآنی صلوٰۃ کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب انفرادی صلوٰۃ، قرآنی صلوٰۃ ہے ہی نہیں تو اس کی درستگی سے قرآنی صلوٰۃ کے ثمرات کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں؟ آپ انفرادی نماز میں "خشوع و خضوع اور حضورِ قلب" پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی دعائیں اور رقّت پیدا کر لیں اور خدا کی پرستش پوری توجہ کے ساتھ کر لیں۔ انفرادی نماز کی درستگی سے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سے وہ ثمرات تو حاصل نہیں ہو جائیں گے۔ جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ جماعتِ مومنین جب نظامِ صلوٰۃ سے قوانین و احکامِ خداوندی کا اتباع کرے گی تو وہ اتباع محض مشینی طور پر نہیں ہوگا۔ اس میں پورا پورا سوز و گداز اور عجز و نیاز شامل ہوگا۔ یعنی وہ اتباع، دل کی گہرائیوں سے اُبھرے گی اور خون کے ذرہ ذرہ میں حلول کر جائے گی اور اس اتباع سے جو درخشندہ نتائج مرتب ہوں گے وہ انسان کے لئے حقیقی مسرت اور سچی طمانیت کا موجب بن جائیں گے۔ اس طرح اسی نظامِ صلوٰۃ میں انسان کی عقل و بصیرت اور جذبات دونوں حقیقی تسکین حاصل کر لیں گے۔ لیکن جب نظامِ صلوٰۃ باقی نہ رہے تو "دنیا پرست" عقلی حیلہ جوئیوں سے ساز و سامانِ زندگی حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اور "دیندار" انفرادی پرستش سے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ قرآن نے جب یہ کہا تھا کہ (فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ و اتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا (۱۹/۵۹) یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے متبعین نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے سو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی تھا تو اس میں اتباعِ شہوات سے مراد یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے جذبات کی تسکین قوانینِ خداوندی کے بجائے دوسرے طریقوں سے چاہتے تھے۔ یہ تھی ان کی غلطی۔ واضح رہے کہ قرآن کی رُو سے جذبات کی تسکین بُری بات نہیں۔ بُری بات یہ ہے کہ جذبات کی تسکین غیر خدائی طریقوں سے کی جائے۔ جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ قیامِ صلوٰۃ ہے جس میں دنیاوی خوشگواریوں کے حصول اور انسانی ذات کی تربیت و استحکام سے انسانی جذبات کی صحیح صحیح تسکین ہو جاتی ہے

رہبانیّت

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صلوٰۃ ضائع کر کے اپنے طور پر جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا، یہ طریق غلط ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی جذبات صرف "حیوانی جذبات" تک ہی

محدود نہیں، ان میں وہ "مقدس جذبات" بھی شامل ہیں جن کی تسکین مذہب پرست طبقہ انفرادی پرستش کی رُو سے حاصل کر لیتا ہے (اور جسے قرآن نے رہبانیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے) لہٰذا، اگر رہبانیت میں "انفرادی صلوٰۃ" (یعنی خدا کی پرستش سے سکون حاصل کر لینے کا طریقہ) خُدا کے مقرر کردہ خوشگوار نتائج کا حامل نہیں بن سکتا تھا (اور اسی لئے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ اس نے اس طریق کا حکم نہیں دیا) تو ہمارے ہاں وہی چیز کس طرح حسنِ نتائج کی کفیل ہو سکتی ہے خواہ اُسے کتنا ہی درست کیوں نہ کر لیا جائے۔

تعلق باللہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انفرادی پرستش، تعلق باللہ کا ذریعہ بنتی ہے، سو، سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعلق باللہ سے مفہوم کیا ہے؟ اگر مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کا خدا سے تعلق پیدا ہو رہا ہے تو اس انفرادی احساس کو نماز ہی کے ساتھ کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ ہر مذہب کا پیرو اس کا مدعی ہے کہ خدا کی عبادت یا ایشور کی بھگتی سے اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارا تعلق خدا یا ایشور یا ماتما سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس سے بھی نزدیک آیئے تو ہمارے ہاں ہر پیر پرست اس کا مدعی ہوتا ہے کہ ان اوراد و وظائف سے جو اس کا پیر باطنی طور پر بتاتا ہے، تعلق باللہ پیدا ہو جاتا ہے تو آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تعلق باللہ کے متعلق اُن کا دعوےٰ غلط ہے اور آپ کا دعوےٰ صحیح ہے۔ جب دعویٰ کا ثبوت اپنے اپنے دل کا احساس ٹھہرا تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کے احساسِ قلب کے متعلق فیصلہ کر دیں کہ وہ باطل کا احساس ہے لہٰذا تعلق باللہ کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے اور اسی سے دُنیا میں باطل مذہب پرستی کا وجود قائم ہے۔ انسان اور خُدا کے تعلق کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ ہے وحی کا ذریعہ۔ یہ وحی آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے تعلق باللہ کا ذریعہ فقط قرآن ہے۔ جب ہم قرآن کا اتباع کرتے ہیں تو ہمارا تعلق خُدا سے قائم ہو جاتا ہے۔ اب رہا یہ کہ ہم قرآن کا اتباع بھی صحیح طور پر کر رہے ہیں یا نہیں تو اس کا معیار وہ نتائج ہیں جو خود قرآن نے اپنی اتباع کا لازمی ثمرہ بتائے ہیں۔ یہ ہے صحیح تعلق باللہ! اگر قرآن درمیان میں نہ رہے تو کوئی انسان خُدا سے اپنا تعلق پیدا نہیں کر سکتا۔ (خدا سے براہِ راست تعلق کا ذریعہ نبوت تھی جس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔)

اب کیا کیا جائے اب اس کے بعد وہ سوال سامنے آتا ہے جو ہر اس شخص کے لئے ایک دشوار مرحلہ بن جاتا ہے۔ جو مسلمانوں کی موجودہ روش میں صحیح تبدیلی کا آرزومند ہوتا ہے

وہ سوال یہ ہے کہ مسلمان میں جو کچھ مذہب کے نام پر ہو رہا ہے وہ ان نتائج کا حامل نہیں، جنہیں قرآن، اسلامی زندگی کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے اور جو کچھ از روئے قرآن ہونا چاہیئے وہ اس وقت موجود نہیں (اگر اس کے لئے آج سے کوشش بھی شروع کر دی جائے تو بھی اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے) لہٰذا اس درمیانی عرصہ میں کیا کیا جائے؟ کیا جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہونے دیا جائے یا اسے چھوڑ دیا جائے اور قرآنی نظامِ زندگی کے قیام کی کوشش کی جائے۔ یہ سوال فی الواقعہ ایسا ہے جو ہر اس شخص کے ذہن میں پریشانیاں پیدا کر دیتا ہے جس کا دل صحیح قرآنی انقلاب کا متمنی ہو۔ دُنیا میں انقلاب کی آرزو رکھنے والوں میں اکثر ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کا ماضی اُس ماحول سے وابستہ ہوتا ہے جس سے وہ خود نکلنا اور دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کی توقعات اس مستقبل سے وابستہ ہوتی ہیں جس کی تعمیر کے لئے وہ کوشاں ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ایک مدت تک اس برزخی کشمکش میں رہنا پڑتا ہے۔ یعنی ان کے دامن کا ایک سرا ماضی سے بندھا رہتا ہے اور دوسرا مستقبل سے منوط۔ ان میں سے اکثر تو اس جگر سوز اور جانکاہ کشمکش کی تاب نہ لا کر پھر سے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ توفیق ارزانی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کٹ کر کافتہً اس مستقبل کے ساتھ وابستہ ہو جائیں جو ان کی امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اس برزخی مقام میں بالعموم جی یہ چاہتا ہے کہ ماضی سے تعلق بھی یکسر منقطع نہ ہو اور مستقبل بھی قریب آتا چلا جائے۔ لیکن انقلاب کا فرشتہ بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے۔ وہ مفاہمت (COMPROMISE) تو جانتا ہی نہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کا اعلان کر دو کہ:

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ - (۶/۷۹)

میں نے ہر طرف سے اپنا تعلق منقطع کر کے اپنا رُخ خالصتہً اُس خدا کے قانون کی طرف پھیر لیا جو فاطر السمٰوٰت والارض ہے اور اس طرح میں نے شرک کی رگِ حیات کو کاٹ دیا۔

وہ اس اعلان سے ورے اور کسی اعلان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک:

اگر باین نہ رسیدی تمام بولہبی است

لہٰذا جو لوگ آج ہم میں قرآنی نظامِ زندگی کو بار دیگر متشکل دیکھنے کے آرزومند ہیں اور اس انقلاب کے داعی ہیں انہیں اس اہم سوال کے متعلق ایک ہی مرتبہ فیصلہ کر لینا ہوگا اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے

وہ قرآن نہیں ہے تو انہیں بے لاگ لپیٹ، کھلے کھلے الفاظ میں اس کا اعلان کرنا ہوگا خواہ اس میں (اور تو اور) خود اپنے ذاتی جذبات بھی کیسے ہی مجروح کیوں نہ ہوں۔ اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کتر بیونت سے قرآنی نظامِ زندگی پیدا ہو جائے گا تو (کم از کم) ہم تو اپنی حقیر سی بصیرت کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سے قرآنی انقلاب کبھی نہیں آسکے گا۔

ملّی شعار

لیکن اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام ایک اور بات بھی کہتا ہے۔ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر ہو رہا ہے اس نے اپنی دینی حیثیت تو کھو دی ہے لیکن وہ ہمارا ملّی شعار بن چکا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے اس کلمہ کو لیجئے جو دین کی بنیاد ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ "دین کی رُو سے اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کرتا ہوں کہ کائنات میں خدا کے قانون و اقتدار کے علاوہ اور کسی کا قانون و اقتدار کارفرما نہیں۔ اس لئے میری زندگی بھی اسی قانون کے تابع رہے گی۔ میں اس کے سوا کسی اور قانون اور اقتدار کو تسلیم نہیں کروں گا اور یہ قانون ہمیں رسالتِ محمدیہ کی وساطت سے ملا ہے جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔" یہ ہے کلمہ کا مفہوم دین کی رُو سے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں یہ کلمہ اپنا دینی مفہوم کھو چکا ہے لیکن یہ ہمارا اس قسم کا ملّی شعار بن چکا ہے کہ جو شخص اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے۔ اسے ہم مسلمانوں کے گروہ کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتا ہے اسے ہم اس گروہ سے باہر قرار دیتے ہیں۔ اسی کلمہ کا اشتراک ہے کہ (اگرچہ غیر قرآنی تصورِ حیات کے ماتحت، دُنیا کے مسلمان قوموں، نسلوں، جغرافیائی حد بندیوں اور سیاسی تقسیموں کے مطابق الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ چکے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ) دُنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمان اپنے اندر ایک غیر مرئی سی وحدت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کلمہ ہمارا ملّی شعار بن چکا ہے۔ یہی حیثیت دینی ارکان مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی ہے۔ یہ سب اپنی دینی معنویت سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے ملّی شعار بن گئے ہیں۔ چونکہ ملّی شعائر بھی ایک حد تک افراد میں احساسِ یگانگت کے زندہ رکھنے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے طلوعِ اسلام کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ (اس دوران میں جب ہم صحیح قرآنی معاشرہ کی تشکیل کے لئے جدوجہد کریں) یہ ملّی شعائر اسی طرح آگے منتقل ہوتے رہیں۔ (بجز ان کے جو قرآن کے خلاف ہوں) اس سے (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) مختلف افراد میں کچھ نہ کچھ احساسِ یگانگت تو باقی رہے گا۔ اگر ہم قرآنی معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب ہو گئے تو یہی ملّی شعائر دینی ارکان بن جائیں گے اور ان سے وہی نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے، جن کی وضاحت

قرآن نے کی ہے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام ان شعائر کو باقی رکھنے کے حق میں ہے اور انہیں مٹانے اور ان میں ردّ و بدل کر کے قوم میں تشتّت و انتشار پیدا کرنے کو سختی سے روکتا ہے۔ ہم سے پہلے جن حضرات نے قرآن کی طرف دعوت دینے کی جدوجہد کی (خدا انہیں ان کی نیک نیتوں اور حسنِ مساعی کا اجر دے) ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر قرآنی معاشرہ کی تشکیل نہیں تھی وہ صرف موجودہ (غیر قرآنی) فقہ کو قرآنی فقہ سے بدلنا چاہتے تھے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا (جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا) کہ معاشرہ میں کوئی تبدیلی تو واقع ہوئی نہ، اور قوم میں مزید تفرقہ پڑ گیا۔ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر قرآنی معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اگر قرآنی معاشرہ قائم ہو گیا تو وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فقہی جزئیات میں خود بخود ضروری تبدیلیاں کر لے گا۔

ارکانِ اسلام کی صحیح حیثیت

یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام موجودہ مذہبی ارکان کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی دہرائے جاتا ہے کہ ان کی حیثیت محض ہمارے ملّی شعائر کی ہے۔ انہیں دینی حیثیت اس وقت حاصل ہو گی جب ان سے وہ نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے جن کی صراحت قرآن نے کر دی ہے اور یہ چیزیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشرہ کی تشکیل قرآنی خطوط پر نہ ہو جائے۔ قرآن نے جب کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی منزل من اللہ قرار دیا ہے (یعنی اللہ نے قرآن میں کتاب اور حکمت دونوں کو نازل کیا ہے) تو اس سے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کتاب کے معنی قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غایت (THE WHY OF IT) یعنی اس نے کہا ہے کہ "یہ کرو تاکہ یہ ہو جائے"۔ "یہ کرو" قانون ہے اور "تاکہ یہ ہو جائے" اس قانون کی حکمت ہے۔ اسی کو قانون کے نتائج کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن نے جہاں قانون کو خدا کی طرف سے دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان نتائج کو بھی خود ہی بیان کر دیا ہے جن کا حامل وہ قانون ہے۔ یہ اس لئے کیا ہے تاکہ ہم ایک ایک قدم پر اس کا جائزہ لیتے رہیں کہ ہم قانون کی صحیح صحیح پیروی کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر اس قانون کے اتباع سے وہی نتائج مرتب ہو رہے ہیں جن کی صراحت قرآن نے کر دی ہے تو سمجھ لیجئے کہ قانون کی ٹھیک ٹھیک اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر یقین کر لیجئے کہ اس کی اطاعت ٹھیک ٹھیک نہیں ہو رہی۔ (خواہ آپ بزعم خویش

نتائج معیار ہیں

اس کی اطاعت کیسی ہی عمدگی سے کیوں نہ کر رہے ہوں اور اس سے آپ کے جذبات کی تسکین کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہو جاتی ہو) پہلی قومیں اس لئے تباہ نہیں ہوئی تھیں کہ انہوں نے اپنے دینی احکام سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس لئے تباہ ہوئی تھیں کہ وہ جس انداز سے ان احکام کی اتباع کرتے تھے اس سے وہ نتائج مرتب ہوتے نہیں تھے جن کے لئے وہ احکام دیئے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے یہ تھے کہ ہم ان احکام کی اطاعت ٹھیک ٹھیک کر رہے ہیں۔ مثلاً (قرآن اس پر شاہد ہے کہ) انبیائے بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو "قیام صلوٰۃ" کا حکم دیا۔ یہودی آج تک برابر نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ عیسائی بھی نماز پڑھتے ہیں۔ یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کی موجودہ نماز کی شکل بھی وہی ہو جو ان کے اس ابتدائی معاشرہ میں رائج تھی۔ جب یہ کتاب اللہ پر ٹھیک عمل کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے "صلوٰۃ کو ضائع کر دیا" (اضاعوا الصلوٰۃ) اور اس طرح تباہ و برباد ہو گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی شکل قائم رکھنے کے باوجود ان سے کیا غلطی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کا جائزہ نہیں لیا کہ ان کی صلوٰۃ وہ نتائج مرتب کر رہی ہے یا نہیں جن کی صراحت خدا نے کی تھی۔ ان کی صلوٰۃ نے وہ نتائج اس وقت سے مرتب کرنے چھوڑ دیئے تھے جب سے انہوں نے صلوٰۃ کو دینی معاشرہ کے بجائے انفرادی دعا (یا پرستش) سمجھ لیا۔ چنانچہ ان کے ہاں صلوٰۃ کے لئے لفظ بھی دعا (PRAYER) یا پرستش (WORSHIP) کا استعمال ہوتا ہے (بعینہٖ یہی پوزیشن ہماری نماز کی ہو چکی ہے جسے ہم "انفرادی صلوٰۃ" کہتے ہیں۔)

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارے مذہبی ارکان، دین کے اجزا بن چکے ہیں یا نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ان سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جن کی تفصیل قرآن نے خود دے دی ہے، جب تک وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے ان ارکان کی دینی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ یہ صرف قومی شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں

مروّجہ نماز کی اہمیت کم ہو گئی ہے

اب آیئے اس سوال کی طرف جو ہم سے اکثر (اعتراضاً اور بعض اوقات طعناً) پوچھا جاتا ہے وہ سوال یہ

ہے کہ طلوع اسلام نے جب سے "نظامِ صلوٰۃ" کی آواز بلند کی ہے لوگوں کے دلوں میں مروجہ نماز کی اہمیت کم ہوگئی ہے حتیٰ کہ مسجدوں میں نمازی کم ہوتے جارہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں طلوعِ اسلام کی آواز کو حقیقت سے زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ اگر ان حضرات کے نزدیک طلوعِ اسلام کی آواز کا اثر ہی ہے کہ اس سے مروجہ نماز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو بھی یہ کہنا مبالغہ ہے کہ یہ اس آواز کا اثر ہے کہ مسجدوں میں نمازی کم ہوتے جارہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اربابِ مذہب کا شروع سے یہ انداز چلا آرہا ہے کہ اگر لوگ ان کے کسی عقیدہ یا مسلک سے بے اعتنائی برتنا یا برگشتہ ہونا شروع ہوتے ہیں تو یہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ اس عقیدہ یا مسلک میں کیا خرابی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنی جاذبیت کھو دی ہے، ان کی نگاہ ہمیشہ اس طرف جاتی ہے کہ اس کا الزام کس کے سر تھوپا جائے؟ چنانچہ وہ آسانی سے "شریعتِ حقہ" کے اس مخالف کو تلاش کر لیتے ہیں اور اسے ملحد و بے دین قرار دے کر عوام کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور بزعمِ خویش مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے اس عقیدہ یا مسلک کی گرتی ہوئی عمارت کی روک تھام ہوگئی ہے۔ یہی کچھ آج کل ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ، ہمارے فرسودہ (اور انسانوں کے خود ساختہ) مذہب سے بیزار اور اس مذہب کے حاملین کے کردار سے متنفر ہوتا جارہا ہے اور یہ حضرات بجائے اس کے کہ اپنے مزعومات و اعمال کا جائزہ لیں، یہ کہہ کر دوسروں کو (اور شاید اپنے آپ کو بھی) فریب دے لیتے ہیں کہ ان میں کوئی نقص نہیں۔ یہ سب کچھ طلوعِ اسلام کی "فتنہ پردازی" کا اثر ہے۔

بات یہ ہے کہ مذہب ہو یا زندگی کا کوئی اور گوشہ، انسان ان اعمال پر جن کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آتا ہو، صرف اسی وقت تک کاربند رہ سکتا ہے جب تک اس کے دل میں یہ کاوش پیدا نہ ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس کا بالآخر نتیجہ کیا ہے۔ ہمارے اس دور میں (متعدد وجوہات کی بنا پر) یہ سوال اُبھر کر سامنے آنا شروع ہوگیا ہے کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہونا ضروری ہے ایک تو سائنس کی بڑھتی ہوئی تحقیقات جس نے قدم قدم پر یہ بتانا شروع کر دیا کہ کائنات میں ایک پتہ کی جنبش بھی بلا نتیجہ نہیں رہتی۔ دوسرے اقوامِ مغرب کی فتوحات جن سے مغلوب اقوام یہ سوچنے پر مجبور ہوگئیں کہ اقوامِ مغرب کی طاقت کا راز کیا ہے۔ جہاں تک پاکستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، ان اسباب میں ایک اور سبب کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کی زندگی میں مسلمانوں کے سامنے اپنی حفاظت کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہاں ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان

اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری انگریز کے سر ہے۔ اس لئے ہمیں اس کی کاوش ہی نہیں ہوتی تھی کہ زمانہ کا رُخ کس طرف کو ہے اور ہمارے سامنے کون کون سے خطرات ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ صورت حالات یکسر بدل گئی۔ اب کیفیت یہ ہے کہ کہیں پتہ بھی کھڑکے تو ہمیں خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی زد ہم پر ہی نہ ہو۔ ان حالات میں ہر وہ شخص جس کے دل میں تحفظِ ذات کا ذرا سا بھی احساس ہے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

نتیجہ کیا نکلتا ہے

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اب لوگوں کو لیڈروں کی تقریریں، بیانات، وعدے یا مختلف جماعتوں کے ریزولیوشن حتیٰ کہ حکومت کی منصوبہ بندیاں (PLANS) بالکل مطمئن نہیں کر سکتے۔ ہر شخص یہ پوچھتا ہے کہ ہمیں بتاؤ کہ جو کچھ تم کہتے یا کرتے ہو، اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب تمام فضا اس قسم کے خیالات سے معمور ہو جائے تو پھر مذہبی اعمال کے متعلق بھی ضرور یہ خیال پیدا ہوگا۔ بالآخر ان کا نتیجہ کیا ہے؟ مُلّا کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ ملتا ہے کہ ان اعمال سے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس جواب سے اس زمانے کے انسان کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اوّل تو اس کے نزدیک اس طرح کا خدا کا تصور جیسا کہ مُلّا پیش کرتا ہے، ایک مستبد حاکم کا تصور ہوتا ہے جو محض اپنی خوشنودی کے لئے لوگوں سے ایسے کام کرائے جن کا نتیجہ بجز اس کی خوشی کے اور کچھ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سے اس دور کا نوجوان یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ عجیب تماشا ہے کہ جو لوگ خدا کی خوشنودی حاصل کر رہے ہیں وہ دنیا میں سب سے زیادہ پست اور ذلیل ہیں اور جو اقوام خدا کی ہستی تک کی بھی قائل نہیں وہ دن بدن قوت اور سطوت حاصل کئے جا رہی ہیں۔ چونکہ ہمارے نوجوان طبقہ کو مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا، وہ مذہبی اعمال کو چھوڑتا جا رہا ہے۔ یہ ہے اصل وجہ اس حقیقت کی کہ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں۔ کہ نمازی نہ رہے۔ اس کی وجہ طلوعِ اسلام نہیں۔ آپ کو لاکھوں کی تعداد میں وہ نوجوان ملیں گے جنہوں نے آج تک طلوعِ اسلام کا نام تک بھی نہیں سُنا۔ لیکن وہ بھی ان مذہبی اعمال سے برگشتہ ہو چکے ہیں۔ طلوعِ اسلام کا اتنا ہی قصور ہے کہ اس نے قوم کے سامنے قرآن کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ انہیں قرآن کے ایک ایک صفحہ پر لکھا ملتا ہے کہ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال ان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جنہیں مذہبی اعمال کہا جاتا ہے۔ ان کا نتیجہ بھی اسی طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح

دیگر اعمال کا۔ ذلت اور رسوائی خدا کا عذاب ہے۔ عزت اور قوت، دولت اور حشمت اس کی نعمت ہے۔ انسانی اعمال کے نتائج اس دنیا کی زندگی میں بھی سامنے آتے ہیں اور انہی اثرات کا سلسلہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی مسلسل قائم رہتا ہے۔ طلوع اسلام نے اتنا ہی کہا ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر طلوع اسلام قرآن کو اس طرح کھول کر سامنے نہ رکھ دیتا تو لوگوں کے دل میں یہ تجسس اور کاوش پیدا نہ ہوتی تو طلوعِ اسلام بے شک اپنے اس جرم کا اقبالی ہے۔ اس کے بعد سوچنے کی بات یہی رہ جاتی ہے کہ کیا قرآن کو بند کر دیا جائے تاکہ مسلمان بدستور (قرآن کی طرف سے جہالت کی بنا پر) بے نتیجہ مذہبی اعمال پر کاربند رہے یا قرآن کو اور وضاحت سے پھیلایا جائے تاکہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان بے نتیجہ اعمال میں قرآنی نتائج کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں؟ اس باب میں ہم صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہم نے قرآن کو بند کر دیا تو جو طبقہ زمانہ کے تقاضوں سے موجودہ بے نتیجہ مذہبی اعمال سے برگشتہ ہو چکا ہے، ان سے برگشتہ ہی رہے گا اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے چلے جائیں گے (کیونکہ آپ اپنی خوش فہمیوں سے زمانے کے دھارے کو موڑ نہیں سکتے) لیکن اس کے ساتھ یہ طبقہ قرآن سے بھی برگشتہ ہو جائے گا (جیسا کہ اس وقت بھی ایک طبقہ موجود ہے جو موجودہ نماز روزہ ہی سے برگشتہ نہیں بلکہ خدا اور وحی تک سے برگشتہ ہو رہا ہے) لیکن اگر آپ نے ان کے سامنے قرآن کو کھول کر رکھ دیا تو اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ قرآن میں اتنی قوت ہے کہ وہ اس قسم کے برگشتہ ہونے والوں کو تھام لے۔ اس نازک دور میں طلوعِ اسلام کی یہی کوشش ہے۔ باقی اگر کوئی کہتا ہے کہ میں نے موجودہ مذہبی اعمال (نماز روزہ وغیرہ) کو اس لئے چھوڑا ہے کہ طلوعِ اسلام ایسا کہتا ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود ہی ان اعمال کو چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی ہے کہ وہ اس کا کھلے بندوں اقرار نہیں کرتا، اور طلوعِ اسلام کی آڑ میں چھپنا چاہتا ہے۔ (نومبر ۱۹۵۳ء)

رسول اللہؐ کی نماز

قرآن کریم میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ صلوٰۃ (نماز) کا طریقہ نہیں آیا۔ یہ طریقہ نبی کریمؐ نے تجویز فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے عمر بھر نماز پڑھی۔ صحابہؓ کو پڑھائی۔ اُس وقت سے اس وقت تک یہ عمل

امت میں متواتر چلا آرہا ہے۔ اس سے لازماً یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ساری امت میں نماز کا طریقہ ایک ہی ہوتا۔ لیکن ہم دیکھ یہ رہے ہیں کہ اُمت کے مختلف فرقوں میں نماز کی جزئیات میں اختلاف ہے اور ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ جس طریق سے وہ نماز ادا کرتا ہے رسول اللہؐ کا وہی طریق تھا۔ آپ سوچیئے کہ کیا یہ بات باور کی جانے کے قابل ہے کہ مروجہ مختلف طریقوں میں سے ہر طریقہ رسول اللہؐ کا ہو! کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے پہلے ایک طریق سے نماز پڑھی۔ پھر دوسرے طریق سے۔ اس طرح مختلف طریقے سب رسول اللہؐ ہی کے ہیں۔ اوّل تو اس بات کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جب رسول اللہؐ نے اپنے پہلے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ کو اختیار فرمایا تو اُمت کے لئے اس دوسرے طریقہ کا اتباع اتباعِ سُنت ہوگا۔ پہلا طریقہ منسوخ ہوگیا۔ پھر کسی فرقے کا پہلے طریقہ پر کاربند رہنا اور اُسے اتباعِ سُنت کہنا غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر مختلف فرقوں کے یہاں مروجہ طریقے سب رسول اللہؐ کے ہیں۔ تو پھر ان طریقوں کے اختلاف پر مختلف فرقے آپس میں سر پھٹول کیوں کرتے ہیں۔ اُن کے اس "سر پھٹول" کی شدت یہاں تک ہے کہ اگر ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقے کے مسلمانوں کی مسجد میں جاکر اپنے طریق پہ نماز ادا کرتا ہے تو یہ لوگ اپنی مسجد کے فرش کو صاف کرتے (اور بعض مقامات میں تو کہا جاتا ہے کہ وہ فرش کو اکھیڑ دیتے ہیں) اس سے واضح ہے کہ ان فرقوں کے نزدیک ہر فرقہ کی نماز رسول اللہؐ کی نماز نہیں ہے۔ طریق نماز کے سلسلہ میں فرقہ اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن سے متعلق

اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن

حضرات کی باہمی چپقلش بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف قرآن کو مانیں اور حدیث کو نہ مانیں تو بتایئے کہ ہم نماز کیسے پڑھیں۔ کیونکہ قرآن میں نماز کی تفاصیل درج نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں اہلِ قرآن حضرات کہتے ہیں کہ آپ یہ فرمایئے کہ احادیث کی موجودگی میں ہم نماز کس طرح پڑھیں۔ کیونکہ احادیث سے نماز کی کوئی ایک شکل متعین نہیں ہوتی۔ پوری نماز کی ایک شکل تو کجا، ایک ایک تفصیل کے لئے اختلافی احادیث ملتی ہیں۔

ہمیں ایک مختصر سا پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نماز" لکھنے والے ہیں "فیض رحمانی" صاحب۔ شائع ہوا ہے مکتبہ رحمانی بہاولپور سے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ صاحب کس فرقے سے متعلق ہیں۔ لیکن وہ شروع میں لکھتے ہیں کہ:

جاننا چاہیئے کہ اہلِ سنت والجماعت کا طریقہ نماز عمل متواتر سے ثابت ہے اور قرآن حکیم و سنت صحیحہ

سے تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

نماز کے اختلافات

لیکن اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ احادیث میں (جن کا سلسلہ جلیل القدر صحابہؓ اور واجب الاحترام صحابیاتؓ تک منتہی ہوتا ہے اور جن کے سب راوی ثقہ اور معتبر بیان کیے جاتے ہیں) نماز کے متعلق ایسی تفاصیل ملتی ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ مثلاً :

۱۔ ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے وقت شانوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

۲۔ مسلم میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ الخ دعا پڑھتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے۔ رسول اللہ تکبیر کے بعد فاتحہ سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ پڑھتے تھے۔ نسائی میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ الآیہ پڑھتے تھے۔ نسائی میں دوسری روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ الآیہ۔ پڑھتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ ثنا پڑھتے تھے۔

۳۔ ترمذی، ابوداؤد۔ نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھائے کانوں تک۔ پھر بار بار رفع الیدین نہیں کیا۔ ساری نماز میں بخاری اور مسلم میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے تھے اور رکوع کے بعد بھی رفع الیدین کرتے تھے۔

۴۔ سنن امام شافعیؒ اور مسند احمد بن حنبل میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نماز میں بحالت قیام سینہ پر ہاتھ باندھتے تھے۔ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے تھے۔

۵۔ ترمذی، نسائی، ابوداؤد میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس شخص کو قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہ ہو وہ نماز میں صرف سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ قیام میں پڑھ کر رکوع کرے۔ اس کے لئے یہ ہی کافی ہے۔ موطا، ابن ماجہ۔ بخاری مسلم میں روایت ہے۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ بغیر فاتحہ

نماز ناقص ہے۔

۶۔ مؤطا میں روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ناجائز ہے، خواہ نماز جہری ہو یا سرّی۔ مؤطا میں دوسری روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ جہری نماز میں ممنوع ہے اور سرّی میں جائز ہے۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ فرض ہے۔ خواہ نماز جہری ہو یا سرّی۔

۷۔ مؤطا میں روایت ہے آمین بالجہر ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر متروک و منسوخ ہوا۔ ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ بعد فاتحہ آمین بالسر آہستہ کہنا چاہیئے۔ خواہ نماز باجماعت ہو یا تنہا۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ جہری نماز میں بعد فاتحہ آمین بالجہر اور سرّی نماز میں بالسر کہنا چاہیئے خواہ جماعت ہو یا تنہا۔

۸۔ بخاری میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نے نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد تعلیم فرمایا۔ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ مسلم میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد سکھاتے تھے۔ اَلتَّحِیَّاتُ الزَّاکِیَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد تعلیم فرمایا۔ بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَسْئَلُ اللّٰہَ الْجَنَّۃَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ النَّارِ۔ مؤطا میں روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ یہ تشہد قعدہ میں پڑھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ اَلصَّلَوَاتُ لِلّٰہِ اَلزَّاکِیَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔ شَھِدْتُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ شَھِدْتُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ مؤطا میں تیسری روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نماز کے

قعدہ میں یہ تشہد پڑھتی تھیں۔ اَلتَّحِیَّاتُ الطَّیِّبَاتُ الصَّلَوَاتُ الزَّاکِیَاتُ لِلّٰہِ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔

ان اختلافی روایات کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

اب کون فیصلہ کرے کہ ان مختلف روایتوں میں صحیح کیا ہے۔ راویوں کی جرح و تعدیل اور سلسلہ سند کے اتصال وغیرہ پر بحث کرنے کی بجائے ان روایتوں کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

قرآن سے دلیل کی مثال

ان روایتوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں کس طرح دیکھا گیا ہے، اس کا اندازہ حسب ذیل مثال سے لگایئے۔ وہ فرماتے ہیں:

قرآن کریم میں ارکان و اذکار نماز کی آیات بھی ملتی ہیں۔ جن سے احادیث شریفہ کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ جو روایات قرآنی آیات کے خلاف مروی ہیں وہ سب یقیناً وضعی ہیں۔ مثلاً نماز کے قیام میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونے یا زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایات قرآنی ہدایات کے خلاف ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا گریبان میں ہاتھ ڈالو۔ "اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ" اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی تھا کہ ایک ہاتھ سے دوسرے کو پکڑو۔ "وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ۔" سینہ پر اس طرح ہاتھ باندھو کہ ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ پکڑے رہو با ادب ہو کر۔

آپ نے غور فرمایا کہ "نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے" کی تائید کون سی آیت قرآنی سے حاصل کی گئی ہے؟ اس آیت سے جس کا صلوٰۃ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ سورۂ قصص کی آیت ہے جس میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ۔ اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ فَذٰنِکَ بُرْھَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَائِہٖ۔ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ۔ (۲۸/۳۲) اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال۔ وہ بغیر کسی عیب کے سفید ہو کر نکلے گا اور خوف میں اپنا بازو اپنی طرف ملا لے۔ یہ دو روشن دلیلیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف ہیں۔ وہ نافرمان لوگ ہیں۔" اس آیت سے یہ

نتیجہ نکالنا کہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھا کرو (معاف فرمائیے) قرآن سے دل لگی کرنا ہے (یہ دلیل بالعموم فرقہ اہل قرآن کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اور اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو مولانا عبداللہ چکڑالوی مرحوم نے اسی کو بطور دلیل پیش کیا ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو قرآن کریم نے صلوٰۃ کی ان تفاصیل کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی نماز کی کوئی واحد شکل احادیث کی رُو سے متعین ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ہمارے مختلف فرقوں میں نماز کی تفاصیل میں اختلاف کیوں ہوتا درآنحالیکہ تمام فرقے اپنی اپنی تفاصیل کی سند میں احادیث پیش کرتے ہیں اور سب اپنی اپنی احادیث کو صحیح اور دوسروں کی احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ ان اختلافات کے رفع کرنے کی آج کوئی شکل نہیں۔ اس کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ اُمت میں پھر سے خلافت علی منہاج رسالت کا احیا ہو جائے جس کی بنیاد قرآن کریم کے محفوظ اور غیر متبدل آئین پر ہو۔ اس نظام کو اس کا حق پہنچے گا کہ وہ اُمت کے اختلافات کا فیصلہ کر کے اُن میں پھر سے اس قسم کی وحدتِ فکر و عمل پیدا کرے جیسی وحدت عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) میں تھی جب تک ایسا نہ ہو اُمت میں جو طریقے رائج چلے آ رہے ہیں۔ انہیں اعلیٰ حالہ رہنے دیا جائے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا امت میں مزید تفرقہ کا موجب ہوگا اور تفرقہ قرآن کی رُو سے شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کی یہی دعوت اور یہی پکار ہے۔ (۱۹۵۹ء)

عملِ متواتر

لاہور سے ایک دردمند مسلمان (جن کی ساری عمر ملت کی غمخواری میں گذری ہے) لکھتے ہیں:

"آپ کوشش کرتے ہیں (اور آپ کی یہ کوشش بڑی نیک ہے۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے) کہ مسلمان اپنے اختلافات اور فرقوں کو چھوڑ کر پھر سے ویسی امتِ واحدہ بن جائیں۔ جیسی رسول اللہ کے زمانہ میں تھی۔ لیکن میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آ سکی کہ یہ کیسے ممکن ہوگا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان اپنے ان اختلافات کو چھوڑ دیں گے جن سے ذرا ذرا سی بات پر وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ عقائد کو چھوڑ دیجئے۔ اعمال کو لیجئے۔ ہمیں یہ حضرات بتاتے ہیں کہ عملِ متواتر یقینی حیثیت رکھتا ہے۔

یعنی عملِ متواتر کے متعلق یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس لئے اس کا اتباع ہمارے لئے فرض ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے اعمالِ متواترہ میں نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اب اس نماز کو آپ دیکھئے کیا کسی ایک فرقے کی نماز دوسرے فرقے سے ملتی ہے؟ اور ہر فرقہ اپنی نماز کو رسولؐ اللہ کی نماز قرار دیتا ہے۔ سال بھر کی عام نمازوں کو چھوڑیئے۔ رمضان المبارک اور عید کی نمازوں کو لیجئے۔ رمضان میں ایک فریق آٹھ رکعت تراویح کو صحیح قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ بیس رکعت کو، اور دونوں عملِ متواتر ہیں۔ کیا یہ دونوں عمل یقینی طور پر رسولؐ اللہ کے ہیں؟ رمضان کے پورے مہینے کے اس بیّن اختلاف کے بعد عید کی صبح کو اُٹھیئے۔ آپ کو اخبارات میں ایک لمبی چوڑی فہرست اُن مسجدوں کی ملے گی (یعنی مختلف فرقوں کی مسجدوں کی) جن میں نمازِ عید ہوگی۔ اس میں پہلا فرق تو یہ نظر آئے گا

عید کی نماز

کہ بعض کے نزدیک عید کی نماز مسجد میں نہیں ہو سکتی کھلے میدان میں ہو سکتی ہے دوسروں کے نزدیک یہ مسجد میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد نماز کے وقت کا سوال آتا ہے۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ صبح چھ بجے سے لے کر دس بجے تک مختلف اوقات میں نمازِ عید پڑھی جائے گی۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنے وقت کو عملِ متواتر بتائے گا۔ آپ اب نمازِ عید میں شریک ہو جائیں۔ ایک جگہ آپ کو بارہ تکبیریں سنائی دیں گی۔ سات پہلی رکعت میں (نیت کی تکبیر کے علاوہ) اور پانچ دوسری میں (رکوع والی تکبیر کے علاوہ) دوسری جگہ آپ کو چھ تکبیریں ہی دکھائی دیں گی۔ تین پہلی رکعت میں (نیت کی تکبیر اور رکوع کی تکبیر کے علاوہ) اور تین دوسری رکعت میں (رکوع کی تکبیر کے علاوہ) یہ بھی ہر گروہ میں عملِ متواتر کے طور پر چلا آرہا ہے۔ تکبیروں کے بعد قرأت کی طرف آیئے۔ ایک گروہ پہلی رکعت میں الحمد شریف سے پہلے زائد تکبیریں کہے گا اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے۔ لیکن دوسرا گروہ دونوں رکعتوں میں قرأت سے پہلے تکبیریں کہے گا۔ یہ عمل بھی متواتر سے چلا آرہا ہے۔ تعداد کے بعد انداز کی طرف آیئے۔ ایک گروہ ان تکبیروں کے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھائے گا، دوسرا بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیریں کہے گا اور دونوں اپنے اپنے عمل کو متواتر کہیں گے۔

فرمایئے کہ جہاں عملِ متواتر میں بھی اختلافات کی حالت یہ ہو، وہاں وحدت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور یہ اختلافات ابھی صرف اہلِ سنت والجماعت کے دو فرقوں (حنفی اور اہلِ حدیث) کے ہیں۔ باقی

فرقوں کے ساتھ میں نے نماز نہیں پڑھی۔ اس لئے مجھے ان کا علم نہیں۔

آپ کی کوششوں کی خدا آپ کو جزا دے۔ لیکن مجھے تو وحدت پیدا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ابھی ابھی عید کی نماز پڑھ کر آیا ہوں اور یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی کہیں گے کہ یہ کس قسم کی عید مبارک کا خط ہے لیکن جب دل سے یہی آواز نکلے تو چھوٹی خوشی کا اظہار کیسے ہو؟

طلوعِ اسلام یہ درست ہے کہ جب تک غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے ہمارے معیار وہی رہیں گے جو اس وقت ہیں۔ اُمت میں وحدت پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہو سکے گی۔ لیکن معیار کے بدل دینے سے اختلافات کا مٹ جانا مشکل نہیں ہوگا۔ اور وہ معیار یہ ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اب رہیں وہ جزئیات جن کا ذکر قرآن میں نہیں۔ تو ان میں وحدت کی شکل صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی یہی کوشش ہے کہ صحیح اور غلط کے متعلق ہمارا معیار قرآنی ہو جائے اور پاکستان میں اسلامی نظام علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو جائے تاکہ وہ ہمارے ان اختلافات کو مٹا کر ہمیں پھر سے اُمتِ واحدہ بنا دے۔ ہمیں اس نظریہ کی صحت پر کامل یقین اور اس کی کامیابی کی پوری پوری اُمید ہے۔ اب رہا یہ کہ اس کی کامیابی کب سامنے آئے گی، سو اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے متعلق تو خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا تھا کہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳-۴۰) تمہارے ذمے اس پیغام کو پہنچاتے چلے جانا ہے۔ یہ چیز ہمارے ذمے ہے کہ اس کے نتائج کب مرتب ہو کر سامنے آئیں گے۔ لہٰذا ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ (۱۹۵۷ء)

شیعہ حضرات کی نماز کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"طلوعِ اسلام کے جون کے پرچہ[1] میں آپ کے ایک مکتوب نگار نے یہ بتایا ہے کہ اہل حدیث اور حنفی حضرات کے ہاں تراویح اور عید کی نماز میں کتنے اختلافات ہیں اور ہر فریق اپنے اپنے عمل کو تواتر سے

---

[1] :۔ مندرجہ بالا شذرہ

صحیح ثابت کرتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک حنفی فرقہ سے کہیں زیادہ اہم فرقہ شیعہ ہے۔ اس لئے کہ حنفی تو پھر بھی بعد میں پیدا ہوئے تھے، شیعہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں موجود تھے۔ اس لئے جس نماز کو شیعہ حضرات اپنا عمل متواتر قرار دیتے ہیں اس کا زمانہ رسول اللہ صلعم کے زمانے سے متصل ہے۔ دوسری طرف اہل سُنت والجماعت حضرات کا دعویٰ ہے کہ ان کی نماز بھی تواتر سے عہد رسالت مآب صلعم اور عہد خلافتِ راشدہ تک پہنچتی ہے۔ اب آپ ذرا شیعہ حضرات کی نماز کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا یہ نماز رسول اللہ صلعم کی نماز ہے یا سُنی حضرات کی نماز۔

۲۔ شیعہ حضرات کے ہاں نماز صرف فرضوں کی رکعات کا نام ہے۔ نیز وہ بجز زمین یا نباتات کے جو زمین سے اُگے اور کسی چیز پہ سجدہ جائز نہیں سمجھتے۔

۳۔ ان کے ہاں غالباً امام کی غیبت کی وجہ سے نماز انفرادی طور پہ پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اذان دینا ضروری ہے اور اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے بعد اَشْهَدُ اَنَّ اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَمَامَ الْمُتَّقِيْنَ عَلِيًّا وَلِيُّ اللّٰهِ وَ وَصِيُّ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَخَلِيْفَةُ بلافصل بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حیَّ علی الفلاح کے بعد حیَّ علی خیر العمل بھی دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ اذان کے بعد نمازی خود ہی اقامت کہتا ہے۔

۴۔ نماز شروع کرنے کے لئے سات تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ پھر یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔ اللھم انت الملك الحق المبين لا اله الا انت سُبحنك وبحمدك انى ظلمت نفسى فاغفرلى ذنبى انه لا يغفر الذنوب الا انت۔ اس کے بعد نمازی پھر اسی طرح دو مرتبہ اللہ اکبر کہے اور یہ دعا پڑھے۔ اللّٰهُم لبيك وسعديك والخير فى يديك والشر ليس اليك والمهدى من هديت عبدك وابن عبديك ذليل بين يديك لا ملجاء الا بك ولا مهرب منك الا اليك سبحنك وحنانيك تبارکت و تعاليت سُبحٰنك ربنا و رب البيت الحرام پھر ایک مرتبہ اللہ اکبر کہے اور رب اجعلنى مقيم الصلوٰة والی دعا پڑھے یہ ہوگئیں سات تکبیریں پھر تکبیر تحریمہ کہے اور یہ دعا پڑھے۔ وجهت وجهى للذى فطر السمٰوٰت والارض۔

قیام میں دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے۔ سورۂ فاتحہ اور ایک سورت کے بعد ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائے۔

دوسری رکعت میں الحمد اور سورت کے بعد کذالك اللہ ربی تین بار کہے پھر ہاتھوں کو دعا کے لئے اپنے منہ کے برابر اٹھائے اور یہ دُعا پڑھے۔ اللّٰھم اغفرلنا وارحمنا وعافنا واعف عنا فی الدنیا والاٰخرۃ انك علیٰ کل شیی قدیر۔ پھر پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت پوری کرے۔ اگر نماز دو رکعتی ہے تو پہلے تشہد پڑھے یعنی اَشھد ان لا اِلٰہَ ..... عبدہٗ ورسُولہٗ اس کے بعد اللّٰھم صلّ علےٰ محمّد واٰلِ محمّد پڑھے اور پھر کہے السلام علیك ایّھا النّبی ..... یہ پہلا سلام ہے پھر دوسرا سلام جانب قبلہ کہے اور گوشۂ چشم سے دائیں طرف اشارہ کرے۔

اگر نماز تین یا چار رکعت کی ہو تو تیسری رکعت میں الحمد کے بعد تین بار یہ تسبیح پڑھے سُبحٰن اللہ والحمد للہ و اللہ الّا اللہ واللہ اکبر استغفر اللہ۔ اس طرح رکعتیں پوری کرکے تشہد اور سلام کے بعد تین بار اللہ اکبر کہے۔ اس سے نماز ختم ہوجائے گی۔

واضح رہے کہ اگرچہ نماز اکیلے اکیلے پڑھی جاتی ہے لیکن قرأت باآواز بلند ہوتی ہے۔

جہاں تک اوقات صلوٰۃ کا تعلق ہے ظہر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جبکہ غروب آفتاب میں پانچ رکعتوں کا وقت باقی رہے۔ یعنی چار رکعتیں ظہر کی پڑھ لی جائیں اور ایک رکعت عصر کی۔ عصر کی باقی تین رکعتیں غروب آفتاب کے بعد بھی پڑھ لی جائیں تو جائز ہے۔ اسی طرح مغرب وعشاء کا وقت نصف شب تک ہے۔ بشرطیکہ نصف شب میں چار رکعتوں کا وقت باقی رہے، یعنی تین مغرب کی اور ایک رکعت عشاء کی پڑھی جاسکے۔ عشاء کی باقی تین رکعتیں نصف شب کے بعد بھی پڑھی جاسکتی ہیں۔

فرضوں کے علاوہ نماز نافلہ میں نماز ظہر سے پہلے آٹھ رکعتیں اور عصر سے پہلے آٹھ رکعتیں پڑھی جائیں۔

جمعہ کی نماز بوجہ غیبت امام علیہ السلام سے ساقط ہے لیکن بعض کے نزدیک نماز جمعہ کو نماز ظہر کے بدلے ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس میں رکوع میں جانے سے پہلے ہاتھوں کو دعا کے لئے اٹھا کر یہ پڑھنا چاہیئے۔ اللّٰھم ان عبید امن عبادك الصالحین قاموا بکتابك وسنۃ نبیك فاجزھم منا خیر الجزاء۔ اسی طرح دوسری رکعت میں پڑھنا چاہیئے۔

بعض کے نزدیک جمعہ کی نماز میں اوّل رکعت میں ایک مرتبہ الحمد اور سات مرتبہ قل ہو اللہ، اور

دوسری رکعت میں الحمد کے بعد سات مرتبہ تعوذ تین پڑھی جائیں۔ سلام کے بعد سات مرتبہ آیۃ الکرسی۔ اسی طرح آٹھ رکعتیں پوری کی جائیں۔

ان نمازوں کے علاوہ ہر مہینہ کی مختلف تاریخوں میں اور بھی کئی نمازیں آتی ہیں جس میں یوم نوروز کی نماز خاص اہمیت رکھتی ہے۔

آپ اگر دیکھنا چاہیں کہ شیعہ حضرات کی نماز میں اور سُنّی حضرات کی نمازیں کتنا مزق ہے تو آپ کسی صاحب سے کہیں کہ وہ اوپر کے طریق کے مطابق نماز پڑھے۔ صاف نظر آجائے گا کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا رسول اللہ صلعم اس طرح نماز پڑھتے تھے جس طرح شیعہ حضرات پڑھتے ہیں۔ یا اس طرح جس طرح سُنّی حضرات پڑھتے ہیں۔ دعویٰ دونوں کا یہی ہے کہ رسولؐ اللہ ان کی سی نماز پڑھتے تھے اور دونوں نمازیں مسلمانوں میں متواتر چلی آرہی ہیں۔ ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ ہمارے مختلف فرقے مختلف طور پر نماز پڑھتے ہیں اور کوئی دوسرے کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ اس نے ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رکھی ہے۔ اس کی نماز کو بھی وہی نماز سمجھا جاتا ہے جسے اللہ نے فرض قرار دیا ہے۔ یہ تمام حضرات ان مختلف نمازوں کو گوارہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر آج کوئی شخص نماز میں کوئی ایسی حرکت کرے گا جو ان فرقوں میں سے کسی کے ہاں نہ پائی جاتی ہو تو اُسے یہ حضرات الحاد اور بے دینی اور فتنہ قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، ہر وہ اختلاف جس سے ہمارے مولوی صاحبان مانوس ہو چکے ہیں، عین دین ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جس سے یہ مانوس نہیں وہ فتنہ ہے۔ مثلاً حنفی بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں، اور اہلِ حدیث آٹھ رکعت، شیعہ حضرات پڑھتے ہی نہیں۔ اگر آٹھ رکعت پہلے سے نہ چلی آتیں اور کوئی شخص آج آٹھ رکعت تراویح شروع کر دیتا تو آپ دیکھتے کہ حنفی حضرات اُسے کس طرح دین میں فتنہ قرار دے دیتے۔ لیکن اب یہ حضرات اسے فتنہ نہیں کہتے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک ہی عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہر گروہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے

طلوعِ اسلام کا مسلک بالکل صحیح نظر آتا ہے کہ اگر قرآن کریم کی بنیادوں پر خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہو جائے تو پھر یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ اس کے سوا امت کی وحدت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ اسلام اور فرقہ بندی ایک دوسرے کی نقیض ہیں، اس لئے اسلام وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں اُمت میں وحدت ہو۔ اگر آپ مجھے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ کے خلاف جانے

والا قرار نہ دیں تو میرے خیال میں اُمت واحدہ والا اسلام تو شائد کسی ایسی قوم ہی میں قائم ہو سکے جو صرف قرآن کی بنیادوں پہ اسلام لائے۔ ورنہ یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ہمارے موجودہ فرقے یہ اختلافات چھوڑ دیں۔ ہاں خلافت کے قیام کی بات اور ہے۔

طلوعِ اسلام | یہ خط بیشتر معلومات پر مبنی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی بنیادوں پہ جہاں بھی خلافت علی منہاج النبوت قائم ہو گئی وہاں اختلافات مٹ جائیں گے۔ ایسی خلافت کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔ جن میں سے کوئی بھی اپنے فرقہ کی نسبت سے بلند ہو کر اپنے آپ کو صرف مُسلمان کہنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر داعی الی القرآن کو ملحد اور بے دین اور نہ جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہے

(۱۹۵۷ء)

اُردو زبان میں نماز۔ (۱)

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کے بجائے) اُردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطہ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اُس کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آجاتا ہے کہ کیا قرآن عربی زبان کے بجائے اُردو زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر کیا قرآن کا ترجمہ (اُردو یا کسی اور زبان میں، حتیٰ کہ خود عربی زبان کے اور الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟ اس سوال کا کھُلا ہوا اور دو ٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے اور ان الفاظ کی جگہ اور الفاظ خواہ وہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے۔ لیکن اس ضمن میں بعض گوشوں سے مجھے جو خطوط موصُول ہوئے ہیں اُن سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں

ایک غلط خیال | کے دل میں یہ خیال ہے کہ خُدا کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہُوا تھا۔ الفاظ نہیں۔ چونکہ حضورؐ کے اوّلین مخاطب

عرب تھے۔ اِس لئے آپؐ نے اس مفہوم کو اُن لوگوں کی زبان میں بیان فرمادیا۔ لہٰذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر لیں تو یہی قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصور جس کے ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اُردو زبان میں پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے یعنی ـــــ نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ بحث کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبویؐ پر وحی ہوا تھا یا اس کے الفاظ بھی، ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ (مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں) بڑی شدید بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن ایک تو اُس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ دوسرے جن لوگوں نے اب سوال کو اٹھایا ہے وہ قدامت پرست طبقہ سے نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق ہیں۔ اِس لئے مناسب یہی ہے کہ اِن سے اِن کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ اُن کے سامنے حقیقت واضح طور پر آجائے۔

وحی کا انکار

ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم خود نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات اور تصورات کا مجموعہ ہے لیکن چونکہ آپؐ نابغہ (GENIUS) واقع ہوئے تھے اس لئے ایک (GENIUS) کی طرح آپؐ (معاذاللہ) یہی سمجھتے تھے کہ ـــ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں ـــــ ان لوگوں سے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس قسم کا خیال وحی اور قرآن کا کھلا ہوا انکار ہے۔ جس کے بعد کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ قرآن خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے جس میں نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا کوئی دخل نہیں۔

الفاظ اور خیالات کا باہمی تعلق

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خدا کی طرف سے القاء ہوتے تھے۔ لیکن ان خیالات کو حضورؐ بیان اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو سرِدست ہمارا مخاطب ہے۔ جنہیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں "جان و تن" کے عنوان کے ماتحت کہا ہے۔

ارتباطِ حرف و معنی ۔ اختلاط جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس شعر میں انہوں نے نہایت مختصر اور مرتکز انداز سے اُس فلسفیانہ بحث کو سمو دیا ہے جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس سوال کو انہوں نے اپنے خطبات (خطبۂ اوّل) میں بھی ضمنی طور پر چھیڑا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

مبہم اور بے زبان احساس (FEELING) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیل (IDEA) کی شکل اختیار کرتا ہے اور تخیل اپنا لباس آپ بُن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ دونوں، احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم (کا نقص) ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور تلفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر بک (R.M. BUCKE) اپنی مشہور کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں تصور (CONCEPT) اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نیا لفظ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ جب تک وہ کسی کے تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو۔ اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ (صـ۲۷)

پروفیسر اربن (W.M. URBAN) نے اپنی کتاب (HUMANITY AND DEITY) میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وجدان (INTUITION) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروچ (CROCH) کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شئے کا تصور کرے اور اس کے بعد اس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے۔ وہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ (صـ۵۳)

اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص۲۹۷)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ :۔

جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص۶۵)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (POETRY) کو بطور مثال پیش کیا ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کرکے وہ بات پیدا ہی نہیں کرسکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

عصر حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق قرآن کے اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظہٖ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزّل من اللہ کتاب ہے۔ یعنی اس کے الفاظ منزّل من اللہ ہیں۔ جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پہ ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

عربی زبان کی وُسعت

اوّل تو عربی زبان ہی ایسی گہری اور جامع ہے کہ (ماہرین علم السُنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ (حتےٰ کہ سائنٹیفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر بک کی جس کتاب کا اُوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں اس موضوع پہ بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ (یہ بحث اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میرے لغتِ قرآن میں آئے گی جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت وحکومت کے لئے منتخب کیا تھا، دوسری طرف بنی اسماعیل کے نسبی (گویا) یہ فریضہ عاید کردیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (DEVELOP) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے) یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا۔ قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہوسکتے ہیں ؛ بدل ہونا تو ایک طرف، قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہوسکتا جو اُس کے پورے مفہوم کو ادا کرسکے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گب (H·A·R·GIBB) اس باب میں لکھتے ہیں۔

قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا

جس طرح ایک بلند پایۂ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک ملہم اپنے الہام کو عام زبان میں ادا کر ہی نہیں سکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح کسی حسین و جمیل تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے پیچ و خم اور اس کے رنگوں کے لطیف و نازک فرق کا ایک طویل مدت تک نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے۔ لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط و الوان ہی کا نہیں۔ بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرنے میں اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اڑنے والے شاہین وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی اُن تراکیب کی جگہ جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں۔ ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے، قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو۔ اگرچہ جب ان حصوں کا ترجمہ لفظی بھی سامنے آئے گا تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی وقفوں کو بھی لے آئیے (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہو!) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگھم سا اثر ہوگا (مثلاً) قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (۵۰/۴۳) انگریزی کیا، دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اُس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو اِن چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔

(MODERN TRENDS IN ISLAM)

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام! آپ سوچیے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن کے اپنے الفاظ گبؔ جیسے غیر مسلم کے دل پر اثر و جذب کا ایک محشر برپا کر دیتے ہیں لیکن جب ہم مسلمان اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے۔ اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ قٓ کی اسی آیت کو لیجئے جسے گبؔ نے پیش کیا ہے وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے وجد میں آ رہا ہے۔ اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

ہمارے تراجم کا اثر

تحقیق ہم جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گبؔ نے ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے۔

VERILY WE GIVE LIFE AND DEATH AND UNTO US IS THE JOURNEYING

اسی قسم کے تراجم، مارما ڈیوک پکتھل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل آیت سے گبؔ کے دل پر ہوا ہے۔

اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے نخلِ طیبہ کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر میں نے "لغات القرآن" کے بعد جب "مفہوم القرآن" کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا۔ بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی نہ کسی طرح اصل کا بدل ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پا سکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا مگر کسی دور کے ترجمہ کو سندِ دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔

اسی باب میں (مشہور مؤرخ) ڈاکٹر ٹوئن بی اپنی کتاب (A HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION) میں لکھتا ہے:۔

عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفۂ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں۔ اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانۂ مابعد کی سائینٹیفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں۔ لہذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمان ان صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں زمان کی قید سے ماورا رہیں۔ (صـ۱۲۶)

لہذا قرآن کا مفہوم بھی جو کسی ایک دور میں بیان کیا جائے وہ وقتی ہو سکتا ہے ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ متن کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں) قرآن کی آیات آنی چاہئیں۔ وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ وہ عربی زبان کے ہی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جا سکتے اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لئے کسی اور زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آج کل پڑھی جا رہی ہے اس میں لوگ (باستثنائے چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور انہیں بغیر سمجھے یونہی دہرائے جاتے ہیں، اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے اس کی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں جن کا ہم مطلب سمجھ رہے ہوں؟

بلا سمجھے الفاظ کا دہرانا اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں وہ نماز بے مقصد اور بے رُوح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے روکا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (۴/۴۳) اے ایمان والو! تم نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ جب تک تم یہ نہ جان لو کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔

اس آیت میں حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ سے حکم کی علت ئی سامنے آجاتی ہے یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پہ نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اُس کا علم نہ رکھے۔ یا جہالت کی بنا پر ایسا ہو۔ تو حکم دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے۔ ان کے دہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔[1] یہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

سر درد کا علاج

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے تو پھر ان الفاظ کی جگہ اُردو کے الفاظ کیوں نہ بولیں؟ ایسا کہنے کے یہ معنی ہیں کہ درد سر کا علاج سر کا کاٹ ڈالنا ہے۔ سر درد کا علاج سر کا کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اُس علت کا ازالہ ہے جو سر درد کا موجب ہے۔ یعنی اس جہالت کا دُور کرنا جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معانی سمجھے نہیں جاتے۔ بنا بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ:۔

(۱)۔ ہم حکومت پر زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو۔[2]

(۲)۔ ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔

(۳)۔ ثانوی سے آخر تک، عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔

اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آجائے گا۔

---

[1] ۔ میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بے سمجھے بوجھے دہرانا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

[2] ۔ قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہوگی۔ لیکن آغازِ کار کے لئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اُٹھ جائے گا۔

عربی۔ اُردو نماز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ اُردو ترجمہ دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً:۔

(۱)۔ اس وقت نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی پڑھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ باجماعت نماز میں بھی فرضوں کے علاوہ باقی نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کریں گے کہ امام کی عربی قرأت کے ساتھ اُردو کے الفاظ بولتے جائیں۔ لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہوگی۔

(۲)۔ نیز جن نمازوں میں، یا فرضوں کی جن رکعتوں میں قرأت بلند آواز سے نہیں ہوتی۔ اُن میں اُردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا۔ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ایسا ہوگا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اُردو ترجمہ پکار کر کہے؟

(۳)۔ یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے اُمت میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ ایسا جرم ہوگا جو ان تمام (مزعومہ) فوائد

نئی نماز کو لے ڈوبے گا جس کے پیشِ نظر آپ اس بدعت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیئے! قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے اور شرک جرم عظیم ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے اور اپنی نماز کی جزئیات کو علی الحال قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے، تو خود اس فرقہ کا وجود معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ وہیں اس سے بچنے کے لئے وحدتِ صلوٰۃ کا ذکر کر دیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۱) تم صلوٰۃ قائم کرو، اور (مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی اُن میں سے جنھوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی الگ گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہو گئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

میرا مسلک یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ) اس کی شدت سے تلقین کرتا چلا آرہا ہوں کہ اس وقت جس جس

طریق سے نماز پڑھی جا رہی ہے اس میں کسی قسم کے رد و بدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اِس قسم کے رد و بدل سے مختلف فرقوں کی نماز میں وحدت تو پیدا ہو نہیں سکے گی۔ البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا[1]۔ وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ امت لازم و ملزوم ہیں۔ وحدتِ امت صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک اُمت میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ نماز میں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، اُمت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں حضرت ہارونؑ نے کچھ وقت کے لیے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا تھا۔ (دیکھئے پ ۱۶) لہٰذا جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نمازِ اُردو یا اردو۔عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں۔ وہ دین یا اُمت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے، الٹا اُسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ امت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو، اس کے پتوں پہ پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں تو اور کیا ہے!

یہ ہے اس تحریک کا خطرناک پہلو۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی قوم کی جہالت دور کرنے اور اُسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

(جون ۱۹۵۷ء)

اُردو زبان میں نماز

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں عنوان بالا سے ایک مقالہ شائع کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ جو

---

[1] آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس یقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے۔ لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔

ایک نئی جدت پیدا کی جارہی ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جائے یا امام جو کچھ عربی زبان میں پڑھے ایک مترجم ساتھ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بآواز بلند پکارتا چلا جائے۔ یہ مناسب نہیں۔ اس پر ہمیں اس جدت کے حامیوں کی طرف سے چند خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن میں انہوں نے اس پر زور دیا ہے کہ ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ ہم الگ الگ خطوط شائع کرنے کے بجائے ان کے اعتراضات کا جواب مجموعی طور پر عرض کرتے ہیں۔

(۲)۔ ان تمام خطوط کی بنیاد اس اعتراض پر ہے کہ مسلمان جو جہلاء نماز کے الفاظ کو طوطے کی طرح رٹتے رہتے ہیں۔ اگر ان حالات پر نہایت نیک نیتی سے ایک جماعت اس بات کی کوشش کرنے لگی ہے کہ یہاں کی ایک کثیر تعداد جماعت کو کم از کم عربی کی ان عبارتوں کے معانی و مطالب سے کچھ نہ کچھ آشنا کیا جائے، جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں تو جناب کے نزدیک یہ ایک ایسا جرم ہوگا جو ان تمام مزعومہ فوائد کو لے ڈوبے گا جن کے پیش نظر یہ جدت اختیار کی جارہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ یہ اعتراض طلوعِ اسلام کے مضمون کو بغور پڑھے بغیر محض غصہ میں آکر کر دیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام آج سے نہیں بیس برس سے مسلسل اور متواتر کہہ رہا ہے کہ قرآن کریم کو بے سمجھے بوجھے پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اس کی اس قسم کی تلاوت سے کوئی ثواب نہیں ملتا۔ الفاظ مطلب سمجھنے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ بے معنی دہرانے کے لئے۔ حتیٰ کہ وہ نماز بھی نماز نہیں ہوتی۔ جس میں انسان مفہوم کو نہ سمجھے۔ ہم نے اپنے سابقہ مضمون میں اس کی پوری پوری صراحت کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام اس کی مخالفت کر رہا ہے کہ جہلاء کو قرآن یا نماز کے معانی سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

طلوعِ اسلام اس کی مخالفت نہیں کر رہا کہ جہلاء کو نماز کا مفہوم کیوں بتایا جارہا ہے۔ وہ مخالفت کر رہا ہے۔ اس طریقہ کی جس کی رُو سے عوام کو نماز کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یعنی جو کچھ امام اونچی آواز سے کہے ایک شخص اس کا ترجمہ دہراتا چلا جائے۔ اس طریقہ کے نقائص کو ہم نے واضح طور پر بیان کیا تھا اب انہیں پھر دہرایا جارہا ہے۔ یعنی :

نقائص

۱۔ سب سے پہلے تو یہ کہ پانچ نمازوں میں دو رکعت صبح کی۔ دو مغرب کی اور دو عشاء کی ایسی ہیں جن میں قرأت بآواز بلند ہوتی ہے۔ باقی تمام رکعتوں میں امام اور

مقتدی پوری نماز چپکے چپکے پڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ افہام و تفہیم مطالب کا یہ طریقہ صرف چھ رکعتوں میں کارفرما ہو سکتا ہے۔

۲۔ نماز باجماعت میں بھی صرف سورۂ الحمد اور ایک اور سورۃ جہری پڑھی جاتی ہے، باقی ساری نماز خفی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طریقہ سے صرف سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک اور سورت کے مطالب ہی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ نماز میں جو کچھ اس کے علاوہ پڑھا جاتا ہے، اس کے مطالب بیان کرنے کا موقع کبھی نہیں آ سکتا۔

اس کے بجائے اگر نماز شروع ہونے سے پہلے نمازیوں کو نماز کے معانی بتا دیئے جائیں تو غور کیجئے کہ یہ طریقہ مندرجہ بالا طریقہ سے بہتر رہے گا یا نہیں۔

(۳)۔ اس جدت کے متعلق ہم نے سب سے بڑا خطرہ یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ایک اور فرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ نماز میں اختلاف مختلف فرقوں کا امتیازی نشان ہے۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ جب طلوعِ اسلام مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کو گوارا کر رہا ہے تو اُن میں اگر ایک اور فرقہ کا اضافہ ہو جائے گا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔

ان حضرات کو کون بتائے کہ طلوعِ اسلام موجودہ فرقوں کو اس لئے گوارا کر رہا ہے کہ اُسے ان فرقوں کے مٹانے پر قدرت حاصل نہیں۔ اس کے نزدیک فرقہ پرستی شرک ہے۔ لہٰذا جب وہ دیکھے کہ اس شرک میں ایک نیا اضافہ ہو رہا ہے تو کیا اس کا اس کے خلاف آواز اٹھانا جرم ہے؟ حیرت ہے کہ لوگ غصہ میں کس قسم کی باتیں کر جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے کہ مختلف فرقے جس جس انداز سے نماز پڑھتے ہیں پڑھتے رہیں تو پھر ایک اور قسم کی نماز پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام مختلف فرقوں سے یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو باہمی جنگ و قتال کا ذریعہ نہ بنائیں اگر اُن میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ خالص قرآن کی آواز کو اپنا کر اس فرقہ بندی کی لعنت سے بلند ہو جائیں تو کم از کم آپس میں امن چین سے تو رہیں تاآنکہ یہاں کبھی خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہو جائے تو ان فرقوں کی جگہ اسی طرح اُمت کو ملتِ واحدہ بنا دے جس طرح یہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ایک نئی نماز اور نئے فرقے کے تصور سے طلوعِ اسلام کا دل کانپ اُٹھا ہے۔

کے توانم دید زاہد جام صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

۴۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ عجیب بات لکھ دی ہے کہ قرآن کا ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا؟

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم کسی غیر مسلم کو جس کی زبان عربی نہ ہو قرآن سمجھا ہی نہیں سکتے۔ ہمارے اس بھائی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ جب ہم نے کہا تھا کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا (اور اُسے اب ہم دہراتے ہیں) کہ کسی ترجمہ میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو قرآن کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کا کوئی ترجمہ اصل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو بہت بلند چیز ہے۔ کسی شعر کا ترجمہ دوسری زبان میں کیجئے، اس سے قطعاً وہ بات پیدا نہیں ہو سکے گی جو اصل شعر میں ہوتی ہے۔ گوئٹے کا "فاسٹ" شیکسپیئر کے "ہملٹ" نیٹشے کی کتاب "بقول زردشت" (حالانکہ یہ نثر کی کتاب ہے) کے مختلف زبانوں میں متعدد تراجم ہو چکے ہیں لیکن جو لوگ ان کتابوں کی اصل زبان جانتے ہیں وہ ان ترجموں کے بعد بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ جو بات اصل میں ہے وہ ان ترجموں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی صورت کلام اقبالؒ کے انگریزی ترجموں کی ہے۔

یہ تھی وہ بات جو ہم نے کہی تھی اور اس کے لئے اس پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن کی زبان ضرور سیکھنا چاہیئے تاکہ وہ براہِ راست اُس تک پہنچ سکیں۔ البتہ دوسروں کے لئے قرآن کے تراجم ناگزیر ہیں۔ کیونکہ انہیں ہم مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ عربی زبان سیکھیں۔ ہم نے ان تک اسلام پہنچانا ہے۔ اس لئے ہمیں بہرحال ان کی زبان میں ہی گفتگو کرنی ہوگی۔ اسی طرح جو مسلمان ہنوز عربی سے نابلد ہیں انہیں بھی قرآن کریم ترجمہ ہی کے ذریعہ سمجھایا جا سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ بر سبیل تنزل ہی کیا جائے گا۔ یہ ترجمے نہ اصل کی جگہ لے سکتے ہیں نہ اُن سے وہ بات پیدا ہو سکتی ہے جو قرآن کے اصل الفاظ میں ہے۔

عربی زبان کا تقدس

(۵)۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ یہ بات ہم "عربی زبان کے جھوٹے تقدس" کی بنا پر کہی ہے۔

ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم کسی زبان کے تقدس کے قائل نہیں البتہ عربی زبان کی اہمیت کے ضرور قائل ہیں اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم (جسے ہم اپنی زندگی کا نصب العین کہتے ہیں) وہ عربی زبان میں ہے

اگر قرآن کریم چینی زبان میں ہوتا تو ہمارے نزدیک یہی اہمیت چینی زبان کو حاصل ہوتی۔

۶۔ ایک صاحب نے طنزاً کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جب ہم پنجابی زبان میں دعا مانگتے ہیں تو اللہ میاں ناراض ہو جاتا ہوگا۔

طنز کا تو ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ گذارش اتنی ہے کہ ہم نے کہیں نہیں لکھا کہ دعا بھی صرف عربی زبان میں مانگنی چاہیئے۔ ہمارے نزدیک دعا انسان کی شدت آرزو کے اظہار کا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اظہار اپنی زبان میں ہوگا (بجز اس کے کہ آپ عربی زبان یا کسی دوسری زبان پہ اس حد تک قادر ہوں کہ آپ سوچنا بھی اسی زبان میں شروع کر دیں)۔ اللہ میاں کے نزدیک ہر زبان برابر ہے۔ اس لئے وہ پنجابی زبان میں دعا مانگنے والے کو پھٹکارتا نہیں، نہ ہی قرآن کے اردو ترجمے پر اُسے غصہ آتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ قرآن کے الفاظ کا بدل کسی اور زبان کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔

۲

روزہ

قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ احکام سورۂ بقر میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں :۔

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا اُسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

۲۔ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

۳۔ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ۔

پھر جب کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

۴۔ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ۔

اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں۔ اُن کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

۵۔ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرلے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۶- شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ .....

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

۷- فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ۔ (۲/۱۸۳ - ۱۸۵)

لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اُسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

۸- وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ (۲/۱۸۷)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرے۔

۹- اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ (۲/۱۸۷)

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوگیا کہ:-

۱- روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے ہیں)۔

۲- روزے میں اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک، کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳- روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

۴- اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے، اُسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے

اور مریض بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمایئے، اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ۔ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں۔ کیا ہے حالانکہ اس کا عام ترجمہ ــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ــــ کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا یہ منشاء نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اُردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔

محیط المحیط۔ جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۳۰۱ جلد ۱۲ میں ہے کہ:

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ:

> اِطَاقَةٌ دراصل مَكُنَتْ اور قُدِرَتْ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّيْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں۔ جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی دشواری اُسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور

اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی اور وہ لوگ ہیں جو انہی کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:۔

طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں۔ جنہیں بتکلف یا بمشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔

(تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ:

عربی زبان میں اَلْوُسْعُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیہ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے "اور اُن لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے" (روح المعانی صفحہ ۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ صحیح نہیں ہوسکتا اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ــــ جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اُسے اُمت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے چنانچہ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہے اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۳۶۸ - ۳۶۹ جلد ۲) میں ہے کہ:

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ ابن عباسؓ، قیس بن السائبؓ اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے، قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ :-

اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے۔ ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں۔ جن کے اعذار کے دُور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی اُن کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وُہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی اُمید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ جلد ۲)

اِن تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

۲۔ حاملہ عورتیں

۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں۔

۴۔ اپاہج اور معذور لوگ

۵۔ پُرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ اُن کی وجہ سے روزہ بہ مشقت رکھ سکیں۔

۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی (CONSTITUTIONALLY) طور پر کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷۔ وہ مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

۸۔ وُہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸) ۱۹۶۳ء

تراویح

لکھنؤ (بھارت) سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"احناف کہتے ہیں کہ رمضان میں روزانہ بیس تراویح سُنت مؤکدہ ہیں اور اہلِ حدیث و شیعہ اس کے قائل نہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک تراویح اور تہجد ایک ہیں اور ان کی تعداد آٹھ رکعات ہیں۔ وہ بیس تراویح کو بدعت کہتے ہیں۔ اس مسئلہ پر احناف اور اہلِ حدیث میں لڑائیاں بھی ہوئی ہیں اور ہوتی ہیں۔ آپ کی تحقیق تراویح کے بارے میں کیا ہے؟ ..... احناف اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے قبل تراویح کا دستور ہی نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود تراویح کے تارک کو گنہگار بتاتے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

تراویح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ ان کی ابتداء رسول اللہؐ کے زمانے سے ہوئی تھی یا حضرت عمرؓ کے زمانہ سے، یہ تاریخ کا سوال ہے اور اس باب میں اہلِ تشیع اور اہلِ تسنن حضرات کا اختلاف ہے اور ان کی بحثیں سب کو معلوم ہیں۔ پھر یہ سوال کہ آیا

ان کی رکعتوں کی تعداد آٹھ ہے یا بیس۔ خود اہلِ سنت کے ہاں اختلاف ہے اور ان کی بحثیں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ طلوعِ اسلام ان بحثوں میں نہیں اُلجھا کرتا۔ جن امور کا ذکر قرآن میں نہیں، ان کے متعلق اس کا مسلک واضح ہے۔

اسلام قرآنی حدود کے اندر ضبطِ خویش کی زندگی کا نام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان (مسلمان) کو معلوم ہو کہ قرآنی حدود کیا ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ ضبطِ نفس کا خوگر ہو۔ رمضان کا مہینہ ان ہر دو امور کے پیدا اور مستحکم کرنے کا ایک خصوصی ذریعہ ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے ٹریننگ کیمپ یا (REFRESHER COURSE) کہیئے۔ روزہ انسان کو ضبطِ خویش سے مجاہدانہ زندگی کا خوگر بناتا ہے اور اس کے اس مہینے کا تعین جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی، اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ اس ٹریننگ کے کورس میں اس کا خاص انتظام ہونا چاہیئے کہ مجاہدین کے سامنے پورا قرآن آجائے۔ تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ دنیا میں "تلوار اور قرآن" کا رشتہ کیا ہے اور یہ کس طرح ایک دوسرے کے محافظ بنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورِ اوّل کے اسلامی نظام نے قرآن کو بیک وقت ذہنوں میں مستحضر کرنے کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا تھا جسے اب محض "حصولِ ثواب" کے لئے ادا کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح سے اب تراویح میں قرآن دہرایا جاتا ہے، اُسے نہ سنانے والا حافظ سمجھتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور نہ سننے والے مقتدی سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سن رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس قرآن کے الفاظ صرف دہرائے یا سُنے جائیں اور انہیں سمجھا نہ جائے، اس سے قرآن کا مفہوم سامنے نہیں آسکتا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے زندگی کا کون سا نقشہ متعین کرتا ہے۔ جب خلافت علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو گی تو یہ دیکھنا اس کا کام ہو گا کہ ہمارے ان مروجہ طریقوں میں کہاں کہاں اصلاح کی ضرورت ہے۔ "گناہ اور ثواب" کا صحیح مفہوم بھی اسی وقت سامنے آئے گا۔ (۱۹۵۶ء)

اعتکاف

کراچی سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ پچھلے دنوں نمازِ جمعہ کے سلسلہ میں ایک بڑے مولوی صاحب کے خطبہ کو سننے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے قرآن کریم سے اعتکاف کا حکم ثابت کیا اور بتایا کہ رمضان کے آخری دس دن کا اعتکاف کرنا بڑی ہی اہم عبادت ہے۔ اعتکاف کے احکام انہوں نے کچھ ایسے انداز سے بیان کئے جن سے خالص رہبانیت جھلکتی تھی کہ ایک آدمی کو کچھ عرصہ

کے لئے دنیا و ما فیہا سے کٹ کر مسجد میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ہمہ وقتی عبادت (پرستش) الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اسلام اور قرآن اس قسم کی رہبانیت کی تعلیم کیسے دے سکتے ہیں لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے اپنی ان باتوں کے لئے قرآن کا نام لیا اور سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ط کا حوالہ دے کر اپنی ساری باتیں قرآن کے سر تھوپ دیں۔ کیا مہربانی فرما کر آپ بتائیں گے کہ قرآن کی رُو سے اعتکاف کی کیا حقیقت ہے؟ اور محولہ بالا آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟

طلوعِ اسلام آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ اس قسم کا اعتکاف جو ہمارے ہاں رائج ہے جس میں اعتکاف کرنے والا کسی مسجد کے ایک کونہ میں چادر تان کر دس روز کے لئے آ کر پڑ رہتا ہے۔ اور دن رات قرآن کے الفاظ دہرانے یا سونے کے علاوہ اُسے اور کوئی کام نہیں رہتا۔ وہ قطعاً غیر قرآنی ہے اور اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام اس قسم کی رہبانیت یا پرستش کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے اعتکاف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "عاکفون" اور "عاکفین" قرآن کریم میں متعدد جگہ آئے ہیں جن کے معنی کسی کام پر مسلسل لگے رہنا اور جمے رہنا ہیں۔ کعبہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ طائفین اور عاکفین کے لئے ہے (۲/۱۲۵) وہاں عاکفین کے معنے ایسی جماعت کے ہیں جو نوعِ انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پرو کر اُن کے حالات کو درست رکھے اور مسلسل اسی دُھن میں لگی رہے (ان الفاظ کے معانی آپ کو لغات القرآن میں ملیں گے)۔

جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی مسلمانوں کو اعتکاف کرنے کا نہ کوئی حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ محولہ بالا آیت میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ ان کے لئے جو عاکفون فی المساجد ہوں، ایک ہدایت دی گئی ہے اور بس۔

عاکفون فی المساجد کے معنی ہیں ـــــ پابندی کے ساتھ مسجدوں میں رہنے والے، مسجدوں میں رُک جانے والے، مسجدوں میں جمے رہنے والے ـــــ یہ عاکفون فی المساجد جن کا تذکرہ ضمناً روزوں کے احکام میں کیا گیا ہے، کون لوگ ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے مختصراً اتنی بات ذہن میں رکھئے کہ روزے دراصل مسلمانوں میں ضبطِ نفس اور قوتِ برداشت پیدا کرنے کا ایک ٹریننگ کورس ہیں اور مسجدیں مسلمانوں کی حیاتِ ملّی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزوں کے ضمن میں یہاں مساجد سے مفہوم ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھئے کہ اس سالانہ ٹریننگ کورس میں کچھ لوگ لازماً ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کو رات کے اوقات

ہیں بھی کچھ ضروری امور کی تکمیل کے لئے ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ میں روک لیا جائے۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے، اِس ٹریننگ کورس میں جو لوگ حصہ لے رہے ہیں (یعنی عام روزہ دار) اُن کو جہاں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دن بھر کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے سے احتراز کریں، وہیں اس کی اجازت بھی دے دی گئی تھی کہ رات کے اوقات میں (جبکہ روزہ نہیں ہوتا) یہ لوگ اپنی بیویوں کے پاس جاسکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں کسی خاص ڈیوٹی پر لگایا گیا ہو اور رات کے اوقات میں انہیں ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپس میں روک لیا گیا ہو۔ ایسے لوگوں کو رات کے اوقات میں بھی (عام روزہ داروں کے برعکس) اپنی بیویوں سے جدا رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے نو سے دس دن کی قید ہے اور نہ رمضان کے آخری دنوں کی۔ اس کا مدار نظام پر ہے کہ وہ آدمی کو رات کے اوقات میں کتنے روز یا کتنے وقت کے لئے ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں روکتا ہے۔ بہرحال جب تک یہ لوگ ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں رہیں گے انہیں اتنے عرصے کے لئے جنسی تمتع سے محترز رہنا ہوگا۔ یہ ہے قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب اور محل۔ مگر چونکہ ہماری نگاہوں سے نظام اوجھل ہو چکا ہے اور تمام چیزیں رسمی پرستش کے طور پر کی جارہی ہیں۔ اس لئے اعتکاف بھی ایک رسمی پرستش کے طور پر ہمارے ہاں باقی رہ گیا ہے۔ (۱۹۵۶ء)

لیلۃ القدر

زندہ قوموں کے سامنے کیا کیا مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لئے وہ دن رات مصروفِ سعی و عمل رہتی ہیں اور مسلمانوں کے سامنے کون سے مسائل ہیں جن کے حل کی تلاش میں وہ مضطرب و بیقرار رہتے ہیں اور اُن کا حل ان کے پیشوایانِ دین بکمالِ عنایت عطا فرماتے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے لگایئے۔

ذیل کا استفسار اور اس کا جواب صدق (لکھنؤ) کی ۱۵ جولائی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے:۔

"شبِ قدر" کیا چیز ہے؟

اس کو تلاش کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور یہ کس طرح دکھائی دیتی ہے؟

اس کو کس طرح تلاش کیا جائے؟

یہ سوالات ہیں جو ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ایک روشنی ہوتی ہے جو بحالتِ عبادت

ریاضت دکھائی دیتی ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ جتنے واعظ اتنی ہی تاویلیں ہیں۔ ان سے ذہنی خلجان رفع ہونے کے بجائے بڑھ جاتا ہے۔ سورۃ اِنَّا اَنْزَلْنَاکی تفسیر مولانا محمود الحسن صاحب کے اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہا اللہ علیہما کے حواشی حوالے قرآن میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک خاص کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عبادت و ذکر میں کافی رغبت اور دلچسپی سی حاصل ہوتی ہے۔ تفسیر بیان القرآن میں اس سورۃ کے معنی و تفسیر کو دیکھنے سے بھی کوئی گرہ کشائی نہ ہوئی۔

بخاری کی احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معلوم ہوا کہ اس شب میں یعنی رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں "شب قدر" دکھائی دیتی ہے۔ کیا چیز ہے جو ان راتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ امید ہے کہ حضور عالی اس کی عقدہ کشائی فرمائیں گے۔ تاکہ ایک مدت کی یہ الجھن رفع ہو۔ اُمید کہ رہنمائی فرما کر عزت افزائی فرمائیں گے۔ (نیازمند)

صدق شب قدر کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ اس کی پوری تفصیلات حدیث میں وارد ہوئی ہی نہیں (اور جتنی بھی ہیں۔ ان میں کام کی چیز ہمارے آپ کے لئے بس اتنی ہے کہ ان شبوں میں کرنا کیا چاہیئے۔ یہ سال کی ایک بزرگ اور معزز ترین شب ہے (جیسے ہفتہ کا بزرگ دن جمعہ، اور سال کا بزرگ مہینہ رمضان ہوتا ہے) حدیث میں اس کا پتہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق تاریخوں میں بتلایا گیا ہے جو ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ پانچ راتیں ہوتی ہیں۔ اکثر علماء کا رجحان شب ۲۷ کی جانب ہے مبہم رکھ دینے سے ایک کھلی ہوئی مصلحت شریعت کی یہ معلوم ہوئی کہ پانچوں راتیں (بلکہ عادت پڑجانے پر پوری دسوں راتیں) عبادت ذکر الٰہی اور اصلاح نفس کی کوششوں میں بسر ہوں۔ یقیناً اس رات میں کچھ خصوصی انوار و تجلیات کا ظہور ہوتا ہوگا اور بعض اہل دل کو کچھ مادی آنکھوں سے بھی نظر آجاتا ہوگا۔ باقی اصل شے یہی ہے کہ اس شب میں بیداری روح و تزکیۂ نفس کی زیادہ سے زیادہ تیاریاں کی جائیں اور دعا و ابتہال کا کوئی موقعہ ضائع نہ ہونے دیا جائے۔

طلوع اسلام قرآن نے صرف اتنا کہا ہے کہ لیلۃ القدر وہ رات ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی اور نزول قرآن کی ابتداء رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی چونکہ نزول قرآن سے دنیا کو نئی اقدار ملی تھیں۔ اس لئے وہ رات جس میں اس کے نزول کا آغاز ہوا، یقیناً لیلۃ القدر تھی۔ اس سے زیادہ قرآن اس رات کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ (۱۹۵۵ء)

عید الفطر

متعدد مقامات سے استفسارات موصول ہوئے ہیں کہ عید الفطر کس تقریب کی یاد میں منائی جاتی ہے اور اس تیوہار کی غایت کیا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ رمضان المبارک اور اس کے خاتمہ پر عید الفطر درحقیقت نزولِ قرآن کی سالگرہ منانے کا مقدس جشن ہے۔ دُنیا میں عام طور پر جشن و مسرت کے تیوہار، موسموں کی تبدیلی یا کسی انسان کی یادگار قائم کرنے، یا کسی تاریخی واقعہ کو محفوظ رکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ موسموں کا تغیر خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں اور دنیاوی واقعات بھلائے جاسکتے ہیں۔ لیکن خدا کا وہ پیغام جو قرآن کریم کے اندر محفوظ کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے لی ہے۔ جو زندہ ہے اور مر نہیں سکتا۔ ایسا قائم ہے کہ اُسے فنا و زوال نہیں۔ یہ جشنِ عید اس خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب کے نزول کی یادگار ہے۔ اس جشن کو منانے کے لئے مہینہ بھر سے تیاریاں کی گئیں (وہ تیاریاں بھی درحقیقت اسی جشن کا ایک جزو تھیں) اسلام قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ زبردستی اطاعت نہیں بلکہ دل کی پوری رغبت سے اطاعت۔ یہ انہی قوانین کی اطاعت ہے کہ ایک عبدِ مؤمن حرام اور ناجائز شئے کو چھو نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھوں کسی شخص کے مال، جان، عزت و آبرو کو ناحق کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اُسی جذبۂ اطاعت کی تقویت کے لئے حکم دیا گیا کہ اس کے حکم کے ماتحت کچھ وقت کے لئے حلال اور طیب چیزوں کو بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ حرام اور ناجائز کی طرف کبھی نگاہ بھی نہ اُٹھنے پائے۔ انہیں دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کا خوگر بنایا گیا تاکہ یہ جہاد زندگی کے سخت مرحلوں سے ہنستے کھیلتے گزر جانے کے عادی ہو جائیں۔ گویا یہ ایک سالانہ ٹریننگ کیمپ تھا۔ جس میں زندگی میں تازہ ولولے پیدا کرنے کے سامان فراہم کئے گئے تھے۔ ایک یادداشت تازہ کرنے والا (REFRESHER COURSE) تھا۔ جس میں خدا اور بندے کے براہِ راست تعلقات کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ اپنا محاسبہ (STOCK TAKING) تھا جس میں سال بھر کے اعمال اور نتائج کی جانچ پڑتال کر کے جائزہ لینا تھا کہ ہم ایک سال میں کس حد تک آگے بڑھے ہیں۔ جب پورے ایک ماہ کی محنت اور اطاعت کے بعد دلوں میں تزکیہ، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جِلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہو گئی تو انہیں یکجا جمع ہونے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ انہیں اس زندگی کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے جو جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کے وعدے قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ پر پہلے موتیوں کی

طرح اُبھرے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ اس سوچ بچار کے بعد اپنے لئے ایک پروگرام تیار کرلیں جس کا اعلان ان کا منتخب امام اپنے خطبہ میں کرے۔ اس کے بعد ان کے نمائندے اس طے شدہ پروگرام کو لے کر ملت اسلامیہ کے مرکز محسوس یعنی بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو جائیں۔ جہاں ان مختلف مقامی پروگراموں کی روشنی میں تمام ملت کے لئے مشترک نظام تجویز کیا جائے۔ یہ ہیں اس جشنِ مسرت کے مختلف اجزا اور یہ ہے ان اجزا کی اجمالی تفصیل۔ انہیں سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہی تقریبیں، جن کے ہر گوشہ بساط پر کبھی زندہ آرزوئیں مچلتیں اور تازہ ولولے رقص کرتے تھے۔ ان کی روح کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے پر کس طرح رفتہ رفتہ رسمی اجتماعوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ بقول علامہ اقبالؒ علیہ الرحمۃ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(۱۹۵۵ء)

۳

حج

سوال

دین کے نظام میں حج کا مقصد کیا ہے اور وہ کس طرح پورا ہوتا ہے۔ موجودہ حج تو ایک انفرادی عبادت ہی سمجھا جاتا ہے۔

جواب

اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں ابھرتی ہیں جو اُن کے خرمنِ امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں، وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بیقرار رکھا ہے، یہ ہے کہ کونسی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اُسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔

ایک مشکل سوال

قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے ماحاصل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و کیف سے جھوم اُٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا۔ تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے۔ جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اُسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھیے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھیے کہ عبرت و موعظت کی کتنی

داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں، جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے۔ ان فلک بوس عمارات کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا ہے لیکن ابھی وہ عمارت تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیث الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا، مصر اور یونان، چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھئے اور سوچئے

عصر حاضر کا انسان

کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ادوار سابقہ کی طرح عصر حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوام مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوام عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخۂ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینہ فکر میں قومی محبت (PATRIOTISM) کو شرف انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے۔ لیکن جنگ اول نے بالعموم اور اس کے بعد جنگ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا۔ وہ انسانیت کے لئے زہر قاتل ہے۔ چنانچہ اب دانایان مغرب اپنی اس سوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر ہکسلے نے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے۔ کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے، باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں حتیٰ کہ

تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلسِ اقوامِ متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا وتدل وملکی کا (ONE - WORLD) کا تصور اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اقوامِ مغرب کے موجودہ تصورِ حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو، نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دُنیا کو ایک برادری تصور کر کے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر (GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں لکھتا ہے۔

اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہنِ انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جبکہ دُنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہو سکتے تھے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ۔ چونکہ تمام

قرآن کی تعلیم

نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ اُبھریں۔ خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ اس نے حضرات انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے، فرمایا کہ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔ کہ تمہاری اُمت، اُمتِ واحدہ ہے اور اس کی وجۂ جامعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے اور وحدتِ انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو۔ سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کی رُو سے انسانوں تک پہنچی۔ جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصور کر کے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی عملی تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلام کا آخری رکن ہے۔

حج سے مفہوم

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکزِ وحدتِ انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامر کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کریں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتیٔ انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادتِ آدمیت کا کفیل ہو۔ اُن کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان، مقامِ منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردِ عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی، جس کے لئے قربانی تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ، جو قرآن کریم نے تمام نوعِ انسانی کو ایک اُمتِ واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند، اور کوئی اندازِ بیان اس سے بلیغ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں اُن کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غایت کیا؟ قِيَامًا لِلنَّاسِ۔ یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

قیامِ انسانیت

غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمنٹ، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ قِيَامًا لِلنَّاسِ۔ کسی خاص

قوم، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے قیام کا باعث۔ یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد۔ یعنی قِیٰمًا لِّلنَّاسِ ۔ ۱۹۵۷ء

حج کی اہمیّت

سوال

آپ کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ حج کی اہمیت کے بھی قائل نہیں۔ براہِ کرم اس ضمن میں اپنی پوزیشن واضح کر دیجئے۔

جواب

میرے متعلق کیا کیا مشہور نہیں کیا جاتا اور میں کس کس باب میں اپنی پوزیشن واضح کروں؟ مشہور کرنے والوں کے پاس پراپیگنڈا کی وسیع مشینری ہے جس کی مدد سے وہ جو جی میں آئے اُسے پھیلا سکتے ہیں۔ کسی کے خلاف افترا پردازی اور کذب بیانی سے انسان کو صرف ایک چیز روک سکتی ہے اور وہ یہ کہ کہنے والے کو اس کا احساس ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے متعلق اُس سے خدا کے ہاں باز پُرس ہو گی۔ اگر اس خیال کو دل سے نکال دیا جائے تو پھر اُسے کوئی چیز تہمت تراشیوں اور کذب بافیوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔

حج کے متعلق میری متعدد شائع شدہ تحریریں موجود ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرے نزدیک اس عظیم اجتماع کی اہمیت کس قدر ہے۔ میں صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات اور حج کے عالمگیر اجتماع کو اسلامی نظامِ زندگی کی بنیادیں قرار دیتا ہوں۔ اور اسی لئے اس پر زور دیتا ہوں کہ ان اجتماعات کو رسمی طور پر منعقد نہ کیا جائے بلکہ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھا جائے جس کے لئے یہ اجتماعات مقرر کئے گئے ہیں مثلاً میری ایک ریڈیائی تقریر (مطبوعہ فردوسِ گم گشتہ) کے اخیر میں آپ یہ لکھا ہوا پائیں گے:

جمعیتِ آدم

حج سے مقصود اسی 'جمعیت آدم' کی تشکیل تھا۔ اس حج سے جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئینِ کہن میں آج بھی وہی رُوح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے

مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نشان نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں مقرر کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن کسی کی نگاہ اس طرزِ ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوامِ عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ماپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصہ میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشتِ حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانانِ عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ :

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

میں قوم کے نوجوانوں کو تلقین اور تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اگرچہ ان اجتماعات میں اس وقت ان کی حقیقی رُوح نہیں رہی لیکن اس کے باوجود ان کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے اس لئے کہ اگر کبھی ہماری قسمت نے پلٹا کھایا اور ہم میں اس انقلاب کا احساس پیدا ہُوا، جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے تو انہی بے جان پیکروں میں پھر سے رُوح آجائے گی اور یہ مناسک و شعائر جس نظام کی یادگار ہیں، اُس کے از سرِ نو قیام میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ (سلیم کے نام خطوط، حصہ اوّل صـ۲۶)

پچھلے سال میرے ہفتہ وار درس قرآن میں جب حج سے متعلق آیات سامنے آئی تھیں تو میں نے اس کی اہمیت کو کس انداز میں واضح کیا تھا۔ اس کا اندازہ وہ احباب کر سکتے ہیں جو ان درسوں میں شریک تھے۔ یا جنہوں نے انہیں بعد میں ٹیپ ریکارڈ سے سنا ہوگا۔ ۱۹۶۲ء

حج کا فلسفہ

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ذکر ان صفحات میں اس سے پہلے کئی بار آچکا ہے۔ وہ یورپ میں بیٹھے "اسلام" کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کراچی کے ہفتہ وار اخبار "الاسلام" (بابت یکم جولائی ۱۹۵۹ء) میں اُن کا ایک مضمون درج ہے جس میں حج کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں آپ فرماتے ہیں:

> جنت سے نکلنے کے بعد (حضرت) آدم اور (اماں) حوّا ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ (مدتوں) ایک دوسرے کی تلاش کرتے رہے اور بالآخر خدا کی رحمت سے عرفات کے میدان میں ان کی ملاقات ہوگئی۔ خدا کے اس احسان کے شکریہ کے لئے آدم و حوّا کی اولاد، خدا کی طرف رجوع کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اپنے آپ کو بھلا کر بحضور باری تعالےٰ جذب ہو جائیں اور خدا سے سابقہ لغزشوں کی معافی مانگیں اور آئندہ کے لئے اس کی تائید و نصرت کی التجا کریں۔ (ترجمہ از انگریزی)

یہ تو رہا اجتماعِ عرفات کا فلسفہ۔ "رمی الجمار" (پتھر مارنے) کے متعلق ارشاد ہے:۔

> جب (حضرت) ابراہیمؑ نے یہ دعویٰ کیا کہ انہیں خدا کی محبت ہر شے سے بڑھ کر ہے تو اس کے ثبوت میں خدا نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کر دے (یہی آزمائش کچھ کم نہ تھی)۔ اس پر طرّہ یہ کہ شیطان تین مرتبہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچا تاکہ انہیں اس قربانی سے باز رکھ سکے ـــــ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ہر مرتبہ شیطان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ لہٰذا ہر حاجی سنتِ ابراہیمیؑ کے اتباع میں استعارۃً شیطان کو پتھر مارتا ہے تاکہ وہ اس کے وساس سے محفوظ رہے (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے ہاں کے ایک "ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی" اہل مغرب کے سامنے اسلام کا فلسفہ کس انداز میں پیش فرما رہے ہیں! واضح رہے کہ قرآن میں نہ (حضرت) آدم اور (اماں) حوّا کے بچھڑنے اور ملنے کا تذکرہ ہے اور نہ ہی حضرت ابراہیمؑ کے شیطان کو پتھر مارنے کا ذکر۔ (۱۹۵۹ء)

قربانی

سوال:۔ براہ کرم مطلع فرمایئے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر جو قربانی دی جاتی ہے اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟ اس باب میں ذرا جرأت سے کام لوں، تو امید ہے کہ آپ بُرا نہیں مانیں گے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ قربانی حضرت خلیل اکبر کی یادگار ہے جسے قرآن نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ تم ہر سال اس طرح جانور ذبح کر کے اس یاد کو منایا کرو۔ پھر اس کی اصل کیا ہے؟ معاف فرمایئے، اب کیفیت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کا کم از کم پڑھا لکھا طبقہ اسے محسوس کرتا ہے کہ اس سے قوم کا بہت سا روپیہ بے کار جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس احساس کو باہر کہیں بیان نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی شعار ہے، اس لئے اس کے خلاف لب کشائی جائز نہیں۔ امسال کی عید پر ہمارے اقتصادی حالات پیچیدہ تر ہو چکے تھے۔ بیشتر افراد ملت کا اثاثہ غارت ہو چکا ہے۔ بے شمار گھروں میں بے خانماں اقربا اور یتامیٰ موجود ہیں۔ ان عوامل کا دباؤ لامحالہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر اس قسم کی سرگوشیاں اکثر سنی گئیں کہ "صاحب میرے ہاں تو اس قدر مہاجر پڑے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر کس طرح قربانی دے سکتا ہوں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو "چور" سا محسوس کرتے ہیں کہ قربانی نہ دینے سے وہ گنہگار ہو جائیں گے میں خود بھی انہی "مجرموں" میں سے ایک ہوں۔ اس لئے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قربانی کی دینی حیثیت کیا ہے؟

جواب:۔ ہمارے سامنے جب یہ سوال آتا ہے کہ فلاں معاملہ کی دینی حیثیت کیا ہے تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے ذہنوں میں کس طرح کشمکش پیدا ہو رہی ہے، اور ہمارے اقتصادی یا معاشرتی حالات پر اس سے کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب قرآن کا صحیح فیصلہ سامنے آجائے تو اس سے وہ تمام ذہنی کشمکش دور ہو جاتی ہے جو انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب سے ہر قلب سلیم میں پیدا ہوتی ہے اور اس فیصلہ سے ہمارے اقتصادی اور معاشرتی مسائل بھی خود بخود اعتدال پر آجاتے ہیں کہ اگر قرآن یہ کچھ نہ کرے، تو وہ دین حقہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قربانی کے سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔

پہلے یہ متعین کر لیجئے کہ مسئلہ زیر غور کیا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ :

۱۔ حج کے موقعہ پر حاجی مکہ معظمہ میں جانور ذبح کرتے ہیں۔ جسے قربانی کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایک ایک حاجی متعدد جانور ذبح کرتا ہے۔ ان جانوروں کو گڑھے کھود کھود کر دبانا پڑتا ہے۔

۳۔ عید کے موقعہ پر تمام دُنیا کے مسلمان اپنی اپنی جگہ پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ اسے بھی قربانی کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کا حکم قرآن سے بھی ملتا ہے یا یہ چیزیں یونہی رسماً چلی آرہی ہیں۔

سوال آپ کے سامنے آچکا۔ اب دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے کہیں "قربانی" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے اسے خاص طور پر قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہ تصور کہ جانوروں کے خون بہانے سے خدا خوش ہو جاتا ہے۔ اس لئے قربانی وجہِ تقربِ خداوندی ہوتی ہے، غیر قرآنی تصور ہے۔

قرآن جس تمدنی نظام (SOCIAL ORDER) کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز الصلوٰۃ ہے اور منتہیٰ حج۔ یعنی ملت کی محدود وحدتوں (UNITS) کی صحیح تعمیر سے شروع کر کے پوری کی پوری ملت کو ایک مرکزِ وحدانیت پر جمع کرنا، انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق چلانا اور اس کے بعد اس ضابطۂ حیات کو ساری دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ بنانا۔ حج، ملت کے اس عظیم القدر اجتماع کا نام ہے جس میں قرآنی نظامِ حیات کے پروگرام پر غور و خوض کر کے اسے نافذ العمل بنانے کی تراکیب کو سوچا جاتا ہے۔ اس اجتماع کا مرکز "بیت الحرام" (خانہ کعبہ) ہے جو ملتِ اسلامیہ کا مرکز محسوس ہے۔ اس عظیم الشان اجتماع کو کامیاب بنانے میں ہر کوشش مبارک اور ہر اقدام مسعود ہے۔

قرآن کریم میں جانوروں کے ذبح کرنے کا ذکر اسی اجتماع کے سلسلہ میں آیا ہے اور وہ آیات حسب ذیل ہیں۔ (ان آیات پر الگ الگ نمبر بھی دے دیئے گئے ہیں تاکہ آئندہ حوالہ میں سہولت ہو۔ نیز ان کا ترجمہ مروّجہ ترجموں کے مطابق ہی کر دیا گیا ہے تاکہ یہ اعتراض نہ پیدا کر دیا جائے کہ ہم نے (خدانخواستہ) اپنے مطلب کے مطابق معانی

قرآنی آیات

پیدا کرنے کے لئے ترجمہ کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ سورۂ الحج میں ہے:

۱۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ۔ (۲۲/۲۷-۲۸)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے۔ پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دُور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایامِ مقررہ میں ان چوپاؤں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں عطا کئے ہیں۔ سو جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔

اِن جانوروں کے متعلق آگے چل کر یوں ارشاد ہے۔

۲۔ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ۔ (۲۲/۳۲)

ان جانوروں میں تمہارے لئے ایک مُدّتِ معیّنہ تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اس کے بعد اُن کے حلال کرنے کی جگہ بیت عتیق (خانہ کعبہ) کے قریب ہے۔

اِس سے آگے ہے:۔

۳۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۲۲/۳۶)

اور قربانی کے اونٹوں[1] کو ہم نے اللہ کے دین کی یادگار[2] بنایا ہے۔ ان جانوروں میں تمہارے

---

[1] جس لفظ کا ترجمہ "قربانی کے اونٹ" کیا گیا ہے وہ لفظ بُدْن ہے بُدْن کے معنی ہیں موٹا۔ فربہ۔ بُدْن جمع بَدَنَۃٌ کی جس کے معنی فربہ اونٹ وغیرہ ہیں، جنہیں حج کے موقعہ پر مکّہ میں ذبح کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے انہیں فربہ کیا جاتا تھا۔

[2] شعائر کا ترجمہ یادگار کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر بیان ہوگا۔

لئے (اور بھی) فائدے ہیں۔ سو تم انہیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لیا کرو۔ پس جب وہ کسی کروٹ گر پڑیں تو تم خود بھی کھاؤ اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے محتاج کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔

اور اس کے بعد ہے :۔

۴۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۲۲/۳۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان جانوروں کو تمہارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو۔ اس پر جس کی اُس نے تمہیں ہدایت کی ہے اور محسنین کے لئے بشارت ہے۔

یہ سورۂ حج کی آیات ہیں۔ انہیں دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ یہ مسئلہ پیش نظر کے متعلق کس قدر صاف اور واضح ہیں۔

آیت (۱)۔ میں سلسلۂ کلام کا آغاز ہی اعلانِ حج سے ہوتا ہے اور اسی ضمن میں فرمایا ہے کہ جانوروں کو ذبح کرو اور ان میں سے خود بھی کھاؤ اور حاجت مندوں کو بھی کھلاؤ۔

آیت (۲)۔ سے واضح ہے کہ یہ وہ جانور ہیں جن سے پہلے عام جانوروں کا کام لیا جاتا ہے ان پر سواری کر کے یا بوجھ لاد کر، حج کے لئے آیا جاتا ہے اور پھر انہیں حج کی تقریب پر مکہ معظمہ میں ذبح کیا جاتا ہے۔

آیت (۳) بھی آیت (۲) کے مضمون کی تائید کر رہی ہے۔ یعنی ان جانوروں کے فوائد (خیر) اور اس کے بعد ذبح کر کے خود بھی کھانا اور محتاجوں کو کھلانا۔ (ان کے شعائر اللہ ہونے کا بیان آگے چل کر آئے گا)۔

آیت (۴) میں اس غلط تصور کا بطلان کیا گیا ہے جس کی رُو سے سمجھا جاتا تھا کہ قربانی کی حیثیت افادی نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی ہے۔ جو خون بہانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے قربانی کے جانور ذبح کر کے چھوڑ دینے چاہئیں۔ اس کے برعکس یہ واضح کر دیا گیا کہ ان جانوروں کے ذبح کرنے سے مقصود خون بہا کر خدا کو خوش کرنا نہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اُن کا گوشت تمہارے اور دیگر ضرورت مندوں

کے کام آئے۔ اللہ کے نزدیک قابلِ قدر چیز تمہارا تقویٰ ہے۔ تقویٰ کی تشریح اگلے الفاظ سے کردی جن میں بتایا گیا کہ تمہارا مقصودِ حیات یہ ہے کہ جس ضابطۂ حیات کی طرف تمہاری راہ نمائی کی گئی ہے، اُسے متشکل اور مستحکم کرو اور اس طرح دُنیا میں قانونِ خداوندی کی عظمت اور کبریائی کو ثبت کر کے دکھادو۔ اجتماعِ حج اسی مقصد کے حصول کی کڑی ہے اور یہ جانور اس اجتماع میں شامل ہونیوالوں کے خورونوش کا ذریعہ بنتے ہیں۔

قرآن کی رُو سے دُنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ ایک وہ جو ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (مُسلم) اور دوسری وہ جو اس کے علاوہ دیگر ضوابط زندگی کو اپنا مسلک بنائیں (غیر مسلم) قرآن اِن دونوں جماعتوں میں واضح اور غیر مبہم امتیازی خطوط قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں بآسانی پہچانے جاسکیں۔ چنانچہ ہر وہ عمل یا وہ شے جو اس قسم کی پہچان کرا سکے، شعائر اللہ کہلاتی ہے۔ شعار اس خاص نشان کو کہتے ہیں جو جنگ میں استعمال کیا جائے تاکہ اس سے اپنے رفیق اور دوست پہچانے جاسکیں۔ حج تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکزی اجتماع اور یک قلبی اور یک نگہی کا عملی مظاہرہ اور ایک ضابطۂ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کی تعارفی تقریب ہے۔ اس سے بڑا دوستوں اور رفیقوں کا اجتماع اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اِس لئے حج کے تلمعات (صفا و مروٰی اور بُدن وغیرہ) کو خصوصیت سے شعائر اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے:-

شعائر اللہ

۵۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ط (۵/۲)

اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو شعائر اللہ کی اور نہ حُرمت والے مہینے کی، نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں اور نہ اُن لوگوں کی جو بیت الحرام کے مقصد سے جارہے ہوں اور اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں۔

چونکہ حج سے مقصود، دُنیا میں قوانینِ خداوندی کا عملی نفاذ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نوعِ انسانی میں

صحیح توازن پیدا ہو جائے گا اور اس طرح انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے جہاں بیت الحرام کو وجۂ قیامِ انسانیت قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تضمنات کو بھی انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا:

۶۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ۔ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو، جو کہ حرمت والا مکان ہے، لوگوں کے قیام کا باعث قرار دیا ہے اور عزت والے مہینے کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں۔

آیات ۱ تا ۴ کو پھر سے سامنے لائیے۔ ان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے:

۱۔ قربانی صرف حج کے موقعہ پر ہے۔

۲۔ قربانی کا مقام مکہ معظمہ ہے جہاں حج ہوتا ہے۔

۳۔ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ان جانوروں کا گوشت کھایا جائے۔

۴۔ یہ سمجھنا کہ جانور ذبح کرنے سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے، غلط ہے،

ان حقائق سے یہ واضح ہو گیا کہ:

ا۔ حج کے علاوہ کسی اور تقریب پر قربانی کا ذکر نہیں۔

ب۔ مکہ معظمہ کے علاوہ اور کسی مقام پر قربانی نہیں۔

ج۔ جس جانور کا گوشت کھانے کے کام نہ آئے اُسے قربانی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا صرف خون بہایا گیا ہے اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا۔ لہٰذا ایسا کرنا اسراف ہے۔ یعنی بے نتیجہ اور بے مصرف ایک جانور کا ضائع کر دینا۔

فلھٰذا

۱۔ حج کی تقریب پر جانوروں کو ذبح کر کے مٹی میں دبائے جانا منشائے قرآن کے یکسر خلاف ہے اور

(ii)۔ یہ جو عید کی تقریب پر دُنیا بھر کے شہروں میں قربانیاں دی جاتی ہیں، اُن کا حکم تو ایک طرف، کہیں ذکر تک بھی قرآن میں نہیں بلکہ یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب قرآن نے قربانی کے مقام کو بالتصریح معیّن کر دیا ہے تو اس معیّن کو عام کر دینا قرآنی منشا کے خلاف ہے مثلاً قرآن نے نماز کے لیے سمت قبلہ کو معیّن کر دیا ہے اس کے بعد ہر طرف منہ کر کے نماز پڑھنا قرآنی حکم کے خلاف ہوگا۔

اَب دیگر آیات دیکھئے

سورۂ بقرہ میں ہے :۔

۷۔ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ
اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو۔ پھر اگر تم (کسی وجہ سے روک دیئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو بھی میسر آئے (خانہ کعبہ کو بھیج دیا کرو)

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔
اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈواؤ جب تک قربانی کا جانور اپنے موقع پر پہنچ نہ جائے (اور وہ موقع حرم ہے)

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔
اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو اس کا فدیہ روزے ہیں یا صدقہ یا نسک (قربانی)

فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ
پھر جب امن کی حالت ہو جائے تو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر دونوں سے متمتع ہو تو جو کچھ قربانی میسر ہو ذبح کرے۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ (۲/۱۹۶)

پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو اُس کے ذمے تین دن کے روزے ایامِ حج میں اور سات دن کے جب حج سے لوٹنے کا وقت ہو۔ یہ پورے دس ہوئے یہ اس کے لئے ہے جس کے اہل وعیال کعبہ کے قریب نہ رہتے ہوں۔

اِن آیات میں یہ ارشاد ہے کہ حج اور عمرہ[1] میں، عام حالات میں قربانی کا حکم نہیں۔ ضرورت کے مطابق، باہمی مشاورت سے خورد و نوش کے لئے جانور ذبح کئے جائیں گے۔

لیکن حسب ذیل اسباب میں سے کوئی سبب پیدا ہو جائے تو ھدی یا نُسک کا حکم ہے (ان الفاظ کے معانی آگے چل کر آتے ہیں)۔

۱۔ کسی شخص نے حج یا عمرہ کا ارادہ کر لیا لیکن وہ محصُور ہو گیا اور خانہ کعبہ تک نہیں پہنچ سکا تو اُسے چاہیئے کہ اپنے ھدی کو کسی کے ہاتھ بھیج دے۔ جب ھدی مکہ میں پہنچ جائے پھر حجامت بنوا کر احرام سے باہر نکل آئے۔ اس سے پہلے حجامت نہ بنوائے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ حالتِ احرام میں (جبکہ حجامت بنوانا منع ہے) کسی تکلیف کے سبب حجامت بنوانے کے لئے مجبور ہو جائے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا نُسک۔

۳۔ تیسرا یہ کہ حج اور عُمرہ ایک ساتھ کرے تو اس صورت میں ھدی دے اور اگر یہ میسّر نہ ہو تو دس دن کے روزے رکھے۔

آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان مقامات پر صرف قربانی کا حکم نہیں ہے۔ سبب اوّل کے ماتحت اتنا بتا دیا گیا ہے کہ عازمِ حج بحالتِ معذوری (محصور ہو جانے کی شکل میں) کیا کرے۔ اس صورت میں وہ اپنے ھدی کو کعبہ تک بھیج دے۔ سبب دوم میں روزے یا صدقہ یا نُسک کا حکم ہے اور سبب سوم میں ھدی کا حکم ہے بشرطیکہ وہ میسّر آجائے۔ اگر میسّر نہ آئے تو پھر روزے رکھ لے۔

---

[1] :- حج تمام دُنیا کے مسلمانوں کے نمائندگان کی سالانہ کانفرنس ہے اور سال بھر میں وقتاً فوقتاً جو کانفرنسیں کی جائیں وہ عمرہ ہیں۔

ھدیٰ کے معنی

ان آیات میں ھدیٰ اور نُسک کے الفاظ آئے ہیں۔ ھدیٰ جمع ہے ھَدِیَّۃ کی جس کے معنی ہیں تحفہ۔ خود قرآن میں ہے۔ بَل انتم بھدیتکم تفرحون۔ (۲۷/۳۶) اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ھدی صرف قربانی کے جانور ہی ہوں۔ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْھَدْیِ۔ نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی تحائف میں سے جو کچھ بھی میسر آجائے اُسے کعبہ بھیج دے تاکہ وہاں جمع ہونے والوں کے کام آئے۔ عربوں کے ہاں بہترین تحائف ان کے جانور تھے۔ اس لئے وہ جانوروں کو بطور تحائف پیش کرتے تھے۔ لیکن ضروری نہیں کہ تحائف صرف جانور ہی ہوں۔ لہٰذا آیاتِ بالا سے مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی عازم حج راستہ میں گھر جائے تو اپنے تحائف کعبہ بھیج دے۔ اسی طرح جو شخص حج اور عمرہ سے اکٹھا متمتع ہو اور اُسے کوئی تحفہ میسّر آسکے تو اُسے پیش کر دے، ورنہ روزہ رکھ لے۔

نُسک کے معنی

اسی طرح نُسک کے معنی بھی صرف قربانی نہیں نُسک چاندی کے خالص ٹکڑوں کو کہتے ہیں۔ اخلاص کی بنا پر اس سے مفہوم عام عبادات لیا جاتا ہے (تفصیل آگے چل کر آئے گی) پھر ذبیحہ کو بھی نُسک کہنے لگ گئے۔

لیکن قطع نظر اس کے، اگر ھدیٰ اور نُسک سے مراد قربانی کے جانور ہی لئے جائیں تو بھی آیاتِ بالا سے یہ واضح ہے کہ ان کا مقام کعبہ ہی ہے انہیں وہیں پہنچانا ہوگا۔ (حتّٰی یبلغ الھدی محلّہ) اور وہیں یہ ذبح ہوں گے تاکہ ان سے اجتماعِ حج میں شریک ہونیوالے خورونوش کا کام لیں۔ اس حقیقت کو دوسرے مقام پر اور بھی واضح کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ حالتِ احرام میں شکار جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص دانستہ کسی جان کا قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اس کی مثل ایک ایسا جانور دے جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کریں۔ ھَدْیًا بٰلِغَ الْکَعْبَۃِ (۵/۹۵)۔ اس ہدیہ[1] کو کعبہ تک پہنچایا جائے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ھدیہ کو کعبہ ہی پہنچانا ہوگا۔

آیاتِ بالا سے پھر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے۔ کعبہ کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں۔

---

[1] :- آیت ۹۵ میں اشرف علی صاحب تھانوی نے ھدیٰ کا ترجمہ قربانی کیا ہے۔ لیکن اس مقام پر انہوں نے ھدیاً کا ترجمہ نیاز کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "بشرطیکہ اُسے نیاز کے طور پر کعبہ پہنچایا جائے"۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ھدیٰ کے معنی صرف قربانی کے جانور نہیں، بلکہ ہر وہ تحفہ ہے جسے تقریب حج میں پیش کیا جائے۔

قربانی کا مقام

اب ایک آیت اور دیکھئے۔ جس سے اس حقیقت کی مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ قربانی کا مقام خانہ کعبہ ہی ہے۔ ۶ھ میں رسول اللہ عمرہ ادا کرنے کے ارادہ سے مدینہ سے عازم مکہ ہوئے لیکن قریش مکہ نے حضورؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ حدیبیہ کا مقام تھا جہاں وہ مشہور صلح نامہ لکھا گیا جسے قرآن نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں ہے:۔

۸۔ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ (۴۸/۲۵)

یہ (قریش مکہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا۔ نیز قربانی کے جانوروں (ھدی) کو روک دیا کہ وہ اپنے حلال ہونے کی جگہ تک نہ پہنچ سکیں۔

ہمارے پیش نظر سوال یہ تھا کہ کیا قرآن نے قربانی کے مقام کو معین کر دیا ہے یا اسے غیر معین چھوڑ دیا ہے کہ مسلمان جہاں چاہیں (اپنے اپنے مکانوں اور گلی کوچوں میں) قربانی دے دیا کریں۔ قرآن کی تمام متعلقہ آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ آپ انہیں ایک مرتبہ پھر دیکھ لیں اور خود فیصلہ کریں کہ اس باب میں قرآن کا حکم معین ہے یا اس نے اس چیز کو غیر معین چھوڑ دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ:

(i)۔ آیت ۲۲ میں قربانی کے جانوروں کے متعلق تصریح موجود ہے کہ

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔

ان کے حلال کرنے کی جگہ خانہ کعبہ ہے۔

(ii)۔ آیت ۲ میں (اگر ھدی سے مراد قربانی کے جانور لئے جائیں تو یہ صراحت فرما دیا کہ

حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ۔

جب تک قربانی کے جانور اپنے ذبح ہونے کے مقام پر نہ پہنچ جائیں۔

(iii)۔ آیت ۵/۹۵ میں فرمایا:۔

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ۔

قربانی کے جانوروں کو کعبہ تک پہنچایا جائے۔

(iv)۔ آیت ۲۸ میں ارشاد ہے کہ قریش مکہ نے قربانی کے جانوروں کو روک دیا۔

اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۔

کہ وہ اپنے ذبح ہونے کے مقام تک نہ پہنچ پائے ۔

(۷) ۔ باقی آیات میں قربانی کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے ۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں ۔

ان حقائق کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچیئے کہ قرآن کریم کی ایسی کھلی ہوئی صراحت کے بعد اس بات کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے کہ قربانی کا مقام کونسا ہے ؟ اگر قرآن صرف اتنا ہی کرتا کہ قربانی کے جانوروں کا ذکر حج کی تقریب کے ضمن میں کر دیتا تو بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی کہ قربانی مکہ ہی میں ہوتی ہے ۔ لیکن اس نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بار بار اس کی بھی تصریح فرمادی کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے ۔ اگر اس کے بعد بھی اس باب میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ نہیں ! قربانی ہر گلی کوچے میں ہو سکتی ہے تو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں ۔

وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو حضرات ، قرآن کی ان تصریحات کے باوجود قربانی کو ہر گلی کوچے میں عام کرتے ہیں ۔ ان کے دلائل اور قرآن کی مندرجہ صدر کھلی ہوئی حقیقت کے خلاف ان کے اعتراضات کیا ہیں ۔ اس بات میں اس وقت ہمارے سامنے سید ابوالاعلیٰ مودودی[1] صاحب کا وہ مضمون ہے جس میں انہوں نے سال گذشتہ قرآن کی مذکورہ صدر تصریحات کو "فتنہ" قرار دے کر ان کی تردید فرمائی تھی ۔ (جو روزنامہ انجام کراچی کے عید ایڈیشن مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا) اس مضمون میں انہوں نے خاص طور پر یہ احتیاط برتی ہے کہ اس میں ان آیات کا کوئی ذکر تک نہ آنے پائے جن میں قرآن کریم نے بہ صراحت قربانی کے مقام کو مکہ معظمہ کے ساتھ مخصص کیا ہے اور جنہیں ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے ۔ اس خصوصی احتیاط کے بعد وہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔

اعتراضات

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ قربانی کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے ۔ کیا وہ قربانی کو صرف حج اور متعلقات حج تک محدود رکھتا ہے یا دوسرے حالات

---

[1] ۔ ہم نے مودودی صاحب کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ انہوں نے ہی لکھا تھا اور انہی کے اعتراضات کے جواب سے صحیح پوزیشن واضح ہو سکتی ہے ۔

میں بھی اس کا حکم دیتا ہے۔ اس باب میں وہ آیتیں بالکل صاف ہیں جن کا حج سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلی آیت میں سورۂ انعام کے آخری رکوع میں ہے۔ اس کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے۔

اے نبیؐ کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اِسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت خم کرنے والا ہوں۔ یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی جب کہ نہ حج فرض ہوا تھا اور نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے اور اس میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے۔ نسک کا لفظ جو اس آیت میں استعمال کیا گیا ہے قرآن مجید میں دوسری جگہ قربانی ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ البقرہ ۲۳)

تم میں سے جو شخص سفرِ حج میں بیمار ہو جائے یا اُس کے سر میں تکلیف ہو، اور وہ سر منڈوالے تو صدقے میں روزے رکھے یا صدقہ یا قربانی کرے۔

(ملاحظہ ہو آیت ۲۳ جس میں لفظ نُسک آیا ہے۔ طلوع اسلام)

مودودی صاحب نے جس آیت کا ترجمہ لکھا ہے، وہ آیت سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے۔ فرمایا:۔

(۹)۔ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

کہہ دو۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ وہی درست اور صحیح دین ہے۔ ابراہیمؑ کا طریقہ کہ خدا ایک ہی کے لئے ہو جانا اور ابراہیمؑ ہرگز سرکشوں میں سے نہ تھا۔

"حَنِیْفًا" (ایک خدا کے لئے ہو جانا) کی تشریح اگلی آیت میں یوں ہے۔

(۱۰)۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

کہہ دو، میری نماز، میرا نُسک، میرا مرنا، میرا جینا، سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو

تمام جہان کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں (یعنی خدا کے فرمانبرداروں میں) پہلا مسلمان ہوں۔

اور اس "توحید" کی مزید تشریح اس طرح فرمادی کہ

(۱۱)۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ..... (۶/۱۶۲-۱۶۴)

کہیئے! کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور پروردگار ڈھونڈوں حالانکہ وہی ہر شے کا پرورش کرنے والا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں لفظ نُسُکی کا ترجمہ ہے "میری قربانی" اس لئے اس سے قربانی کا حکم ظاہر ہے ہم نے مندرجہ بالا ترجمہ میں (جو ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمہ ہے) لفظ نُسُک کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی "چاندی کے خالص کئے ہوئے ٹکڑے" ہیں۔ اس اخلاص کی جہت سے "عبادت گذار کو ناسک" کہنے لگے۔ کیونکہ وہ اپنے نفس کو چاندی کے ٹکڑے کی طرح گناہوں کی میل سے صاف کرتا ہے۔[1]

منسک کے معنی

قرآن کریم میں نُسُک، منسک، مناسک کے الفاظ (ان دو آیتوں کے علاوہ جن کا ترجمہ مودودی صاحب نے لکھا ہے) حسب ذیل مقامات پر آئے ہیں:۔

(۱۲)۔ سورۂ بقرہ میں دعائے ابراہیمی و اسماعیلی۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا۔ (۲/۱۲۹)

(۱۳)۔ سورۂ بقرہ میں حج کے ضمن میں۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ (۲/۲۰۰)

(۱۴-۱۵)۔ سورۂ حج میں۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ۔ (۲۲/۶۷، ۲۲/۳۴)

دیکھئے کہ ان آیات میں ان الفاظ کا ترجمہ مختلف مترجمین نے کیا کیا ہے۔ آیت ۱۲ "مَنَاسِكَنَا" کا

---

[1]:۔ نسک کے معنی زمین شور کو درست کر کے زراعت کے قابل بنانے کے ہیں۔ چنانچہ ارضِ ناسکہ اس سرسبز زمین کو کہتے ہیں جس پر تازہ بارش برسی ہو۔ صلاۃ کے معنی خدا کے پیچھے پیچھے رواں دواں چلنا ہے مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں اس انداز سے دوسرے نمبر پر آئے کہ اس کے کان اول نمبر کے گھوڑے کی پشت کے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ ان معانی کے پیش نظر آیت نمبر ۱ کا صحیح قرآنی مفہوم سامنے آجاتا ہے لیکن یہ موقعہ اس تفصیل کا نہیں یہ آیت بڑی اہم ہے۔

ترجمہ مختلف تراجم میں اس طرح آیا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ ..... عبادات کی طرح

شاہ رفیع الدینؒ ..... طرح عبادت کی

جلالین ..... شرائع عبادتنا۔ (یہ اردو ترجمہ نہیں۔ مفہوم واضح ہے)

ابوالکلام آزاد ..... عبادت کے سچے طور طریقے

آیت ۱۳۔ "مَنَاسِكَكُمْ"

شاہ عبدالقادرؒ ..... عبادتیں اپنی

شاہ رفیع الدینؒ ..... عبادتیں

جلالین ..... عبادت حج۔

ابوالکلام آزاد صاحب ..... حج کے تمام ارکان

آیات ۱۴، ۱۵ "منسك"

شاہ عبدالقادرؒ ..... طرح عبادت کی

شاہ رفیع الدینؒ ..... عبادت کی طرح

جلالین ..... شریعت (آیت ۲۲/۳۴ میں اس کے ساتھ "قربانی" کی جگہ بھی آیا ہے)

ابوالکلام صاحب آزاد ..... عبادت کا طور طریقہ

اس کے بعد وہ آیت لیجیے جسے مودودی صاحب نے بطور سند پیش کیا ہے۔ یعنی "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ"! اور جس میں انہوں نے نُسُکی کا ترجمہ "میری قربانی" کیا ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ مذکورہ صدر مترجمین نے حسب ذیل کیا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ ..... عبادتیں

شاہ رفیع الدینؒ ..... عبادتیں

جلالین ..... عبادات میں حج (حج کی عبادات)

ابوالکلام صاحب آزاد ..... میرا حج

یہیں لفظ نُسُکَ کے معانی اس آیت میں جسے مودودی صاحب نے وجوبِ قربانی میں بطورِ نص قرآنی پیش کیا ہے اور جس کا ترجمہ انہوں نے "قربانی" کیا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ اس کے معنی "عام عبادت" لیتے ہیں اور تفسیر جلالین اور ترجمان القرآن ابوالکلام صاحب آزاد میں اس کے معنی حج یا حج سے متعلقہ مراسم لکھے ہیں (اور وہ جو کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے) خود مودودی صاحب نُسُکَ کا ترجمہ "قربانی" لکھ کر ایک ہی سطر بعد "مناسک" کے معنی "حج کے مراسم" بیان فرماتے ہیں۔ ان کا جو اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے، اُسے ایک بار پھر پڑھیئے۔ اس میں آپ کو یہ الفاظ دکھائی دیں گے۔

یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ نہ حج فرض ہوا تھا نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے۔

"حج کے مراسم و مناسک" لکھ کر مودودی صاحب نے خود بتا دیا کہ "مناسک" کے معنی عام قربانی نہیں، حج کے طور طریقے ہیں۔ لہٰذا اگر "مناسک" کے معنی خود مودودی صاحب کے الفاظ میں "حج کے عام طور طریقے ہیں" تو آیت "اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ" میں نُسُک کے معنی عیدالاضحیٰ کی قربانی کس طرح کئے جاسکتے ہیں؟

اب مودودی صاحب کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے جس میں ارشاد ہے کہ:

نُسُک کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے اُسے قرآن مجید میں دوسری جگہ "قربانی" ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو البقرہ ع ۲۴

تم میں سے جو شخص سفرِ حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوا لے تو فدیہ میں روزے رکھے یا صدقہ یا قربانی کرے۔

اس آیت کے الفاظ آیت ۷ میں دیکھیئے۔

پہلے تو یہ دیکھیئے کہ مودودی صاحب نے نُسُک کے لفظ کے لئے قرآن کریم کی صرف وہی آیت نقل فرمائی ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ نُسُک سے مفہوم قربانی لیا جاسکتا ہے۔ دیگر مقامات کا (جہاں واضح ہے کہ نُسُک یا منسک یا مناسک کے معنی قربانی نہیں لئے جاسکتے) انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔

آیت ۷ میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ نُسُک کے معنی ضروری نہیں کہ قربانی ہی لئے جائیں۔ لہٰذا ایک ایسے مقام کو بطور سند پیش کرنا جس میں مختلف معانی کی گنجائش ہو، دلیل قطعی قرار نہیں دی جاسکتی۔ لیکن

آیت ۲ میں نُسُکَ کے معنی "قربانی" ہی لئے جائیں تو وہیں یہ بھی تو موجود ہے کہ یہ حج کے احکام ہیں۔ اس لئے اس "قربانی" سے مراد وہ قربانی ہے جو خانہ کعبہ میں حج کے موقعہ پر دی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر نُسُکَ کے معنی "قربانی" لئے جائیں تو اس کے صحیح معنی ہوں گے "وہ قربانی جو حج میں کی جائے۔" اس لئے کہ جب قرآن خود کسی مفہوم کو متعین کر دے تو اس مفہوم کو اسی طرح سے لینا چاہیئے جس طرح قرآن بیان کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ

(۱)۔ اِنَّ صلاتی ونُسکی "کے معنی "میری قربانی" نہیں۔ اس لئے یہ آیت قربانی کے حکم کے لئے بطور نصِ قرآنی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور

(۲)۔ اور اگر اس لفظ کا ترجمہ "قربانی" ہی کرنا ہو تو اس سے مراد ہوگی وہ قربانی جو حج میں کی جاتی ہے کیونکہ قرآن کی جس آیت (۲) میں نُسُکَ کے معنی "قربانی" لئے گئے ہیں وہاں نُسُکَ کے معنی وہ قربانی ہے جو حج میں کی جاتی ہے نہ کہ ہر گلی کوچے کی قربانی۔

چنانچہ علامہ حمید الدین فراہیؒ جنہوں نے اس آیت نُسُکی کے معنی "میری قربانی" کے ہیں، فرماتے ہیں:۔

> بالاتفاق تمام مفسرین کے نزدیک اس آیت میں نُسُک سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

باقی رہی مودودی صاحب کی یہ دلیل کہ چونکہ یہ آیت (اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ ...) مکہ میں نازل ہوئی تھی جب حج فرض نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سے مراد حج کی قربانی نہیں۔ سو اس کے متعلق پہلی چیز

قرآن کی نزولی ترتیب

قابلِ غور یہ ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب نزولی نہیں ہے اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی آیت کب نازل ہوئی تھی۔ خود یہ حقیقت کہ قرآن کی ترتیب نزولی نہیں، اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک ترتیب نزولی کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ نزول کی ترتیب سے ہم قرآنی تعلیم کے "تدریجی ارتقا" کو معلوم کر سکتے ہیں۔ سو اوّل تو یہ کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اگر یہ چیز ایسی اہم ہوتی تو خود اللہ تعالےٰ قرآن کی ترتیب نزولی رہنے دیتا۔ قرآنی تعلیم، زمان اور مکان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ وہ ہر زمانے اور ہر حالت میں زندگی بخش ہونے کے لئے دی گئی ہے۔ اس لئے وہ ترتیب نزول اور شانِ نزول وغیرہ کے اختصاصات

میں مقید نہیں رکھی جاسکتی۔ جو کچھ قرآن میں موجود ہے وہ ہر زمانے کے لئے صالح بطور حیات ہے۔ جس قسم کے حالات ہوں گے اسی قسم کے احکام نافذ ہو جائیں گے۔ لہٰذا ترتیب نزولی کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ دوسرے یہ کہ ترتیب نزولی کے متعلق جو روایات ملتی ہیں وہ باہمد گر مختلف ہوتی ہیں۔ چنانچہ آپ کتب تفاسیر اٹھا کر ان میں کسی سورت کے متعلق دیکھیے۔ آپ کو کئی مختلف روایات ملیں گی۔ کبھی پوری کی پوری سورت کے متعلق اختلافات ہوتے ہیں کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی یا مدینہ میں کبھی ایک سورت کی مختلف آیات کے متعلق اختلاف ہوتا ہے۔ کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض آیات ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئیں تو انہیں مکی لکھ دیا گیا اور خود سورۃ انعام (جس میں آیت " اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ .... ہے) کی بعض آیات کے متعلق اختلاف ہے کہ مکی ہیں یا مدنی۔ اس لئے اس سورت کو مکی قرار دے کر اس سے نتیجہ زیر نظر اخذ کرنا، محکم دلیل قرار نہیں پا سکتا۔ بہرحال یہ سورت مکی ہو یا مدنی، جو حضرات اس سے "قربانی" مراد لیتے ہیں، وہ (جیسا کہ علامہ فراہیؒ نے لکھا ہے) اس امر پر متفق ہیں کہ نُسُک سے مراد وہ قربانی ہے جو حج اور عمرہ میں کی جاتی ہے۔

لیکن قطع نظر اور دلائل کے، مودودی صاحب کا یہ بیان کہ یہ سورت مکی ہے، خود ہمارے دعوے کی تائید کر رہا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جیسا کہ قرآن نے بہ صراحت فرما دیا ہے، قربانی کا محل مکہ معظمہ ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ قربانی کا ذکر اس سورت میں آیا ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے اس سے مراد حج کی قربانی نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ مکہ میں تشریف فرما تھے اس لئے حضورؐ لا محالہ مکہ ہی میں قربانی کرتے ہوں گے اور یہی ہم کہتے ہیں۔

باقی رہا یہ کہ اس زمانہ میں ابھی حج فرض نہیں ہوا تھا تو اس سے مسئلہ زیر نظر پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حج فرض ہونے سے پہلے بھی حضورؐ سنت ابراہیمی کے اتباع میں اپنے طور پر حج کرتے تھے سارا عرب حج کیا کرتا تھا اگرچہ اس کا حقیقی مقصد ان کی نگاہوں سے فوت ہو چکا تھا اور اس کے مناسک میں مشرکانہ رسوم داخل ہو چکی تھیں۔ لہٰذا جب رسول اللہ حج کرتے ہیں تو قربانی بھی حج کی تقریب پر ہی ہوتی تھی۔ مشرکین، بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کرتے تھے۔ حضورؐ انہیں اللہ کے نام پر ذبح کر کے خود کھاتے اور محتاجوں کو کھلاتے ہوں گے۔

لہٰذا، اس دلیل سے بھی واضح ہے کہ قربانی مکہ میں ہی ہوتی تھی اور حج کی تقریب پر (اس باب

میں ابھی ایک نکتہ باقی ہے جو " وانحر " کے سلسلہ میں ذرا آگے چل کر بیان ہوگا)۔

اب وہ دوسری آیت دیکھئے جسے مودودی صاحب نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں پیش فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں۔

سورۂ کوثر کی آیت

دوسری آیت سورۂ کوثر میں ہے جس کا ترجمہ ہے :۔
" پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر "
یہ آیت بھی مکی ہے اور اس میں بھی کوئی اشارہ یا قرینہ ایسا نہیں کہ جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم حج کے لئے خاص ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اہل لغت نے نحر کے معنی سینے پر ہاتھ باندھنے، قبلہ رُخ ہونے اور اوّل وقت نماز پڑھنے کے بھی بیان کئے ہیں۔ لیکن یہ سب دُور کے معنی ہیں۔ عام فہم عربی میں اس لفظ کا مفہوم قربانی ہی لیا جاتا ہے۔ (اس کے بعد مودودی صاحب نے احکام القرآن کا حوالہ دیا ہے) ۔
یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام مترجمین شاہ ولیؒ اللہ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا اشرف علی صاحبؒ، ڈپٹی نذیر احمد صاحبؒ وغیرہم نے بالاتفاق اس لفظ کا ترجمہ قربانی ہی کیا ہے۔ [1]
یہ سورہ کوثر کی آیت ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں ؛

اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ ۔ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

اس میں لفظ نحر قابلِ غور ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ روایات سے قرآن

---

[1] "اِنَّ صلاتی ونُسکی" والی آیت میں شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے نسکی کا ترجمہ عبادات کیا تھا اور چونکہ یہ ترجمہ مودودی صاحب کے منشا کے خلاف تھا۔ اس لئے مودودی صاحب نے اس مقام پہ ان کے ترجموں کا ذکر نہیں فرمایا۔ چونکہ اب ان کا ترجمہ ان کے منشا کے موافق ہے۔ اس لئے ان کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔

کا صحیح صحیح مفہوم متعلق ہو جاتا ہے۔ اگر اُن سے مدد نہ لی جائے تو قرآن کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔

نحر کے معنی

نحر کا لفظ قرآن میں اسی مقام پر استعمال ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ روایات اس کا کیا مفہوم متعلق کرتی ہیں:

۱۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نحر سے مراد دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو نماز میں اپنے سینے پر رکھنا ہے۔

۲۔ حضرت علیؓ سے دوسری روایت ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو آں حضرتؐ نے جبریلؑ سے پوچھا کہ یہ نحیرہ کیا ہے جس کا میرے رب نے حکم دیا ہے۔ جبریلؑ نے کہا کہ نحیرہ نہیں۔ لیکن حکم یہ ہے کہ آپ نماز کی پہلی تکبیر، رکوع، بعد رکوع اور سجود کے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں۔ یہ ہماری نماز ہے اور ملائکہ کی نماز ہے جو سات آسمانوں میں رہتے ہیں، ہر ایک چیز کی ایک زینت ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے نزدیک رفع یدین کرنا ہے۔

۳۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ نحر کے معنی ہیں "اپنی گردن قبلہ کے مقابل کرو"

۴۔ امام باقرؒ کا ارشاد ہے کہ اس سے مراد نماز کے شروع کے وقت رفع یدین کرنا ہے۔

۵۔ حضرت عطا خراسانیؒ فرماتے ہیں کہ وانحر سے مراد یہ ہے کہ اپنی پیٹھ رکوع سے اٹھاؤ تو اعتدال کرو اور سینے کو ظاہر کرو۔ یعنی اطمینان حاصل کرو۔

اِن روایات کے علاوہ دیگر اقوال ملاحظہ فرمائیے:۔

ا۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے۔

ب۔ ضحاکؒ کا بیان ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ دونوں ہاتھ دعا کے بعد چھاتی کے اوپر کے حصہ تک بلند کرو۔

ج۔ امام راغبؒ (مفردات) میں لکھتے ہیں کہ نحر چھاتی کے اوپر گلوبند کے مقام کو کہتے ہیں۔ اس لئے وانحر میں حکم ہے۔ ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے شہوت کی بیخ کنی کر کے نفس کشی کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

آپ نے نحر کے لفظ کی تحقیق ملاحظہ فرمائی۔ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ذبح شتر ہے۔ اس لئے اس کے معنی قربانی ہو گئے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔

اَب اس آیت کے مقامِ نزول کے متعلق دیکھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ مکہ میں نازل ہوئی۔ محمد علی صاحب لاہوری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

اِس سورت کے نزول کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض اِسے مکی کہتے ہیں اور بعض مدنی اور بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ اس کا نزول دو دفعہ ہوا ہے۔ ایک مکہ میں اور ایک مدینہ میں۔ مگر صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔ [1]

لیکن علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ ارشاد ہے۔

یہ سورت صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبۂ اسلام اور کثرتِ اُمّت کا فتح باب ہے۔

ذرا آگے چل کر پوری کی پوری (سورۂ کوثر) کی حکمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

سادہ لفظوں میں گویا یوں کہا گیا کہ اللہ تعالےٰ نے تمہیں نماز پڑھنے والی، اور راہِ خدا میں خرچ کرنے والی ایک عظیم الشان اُمّت دی ہے جو بیت الحرام کا حج کرے گی۔

یعنی وانحر سے مراد "بیت الحرام کا حج" کرنا ہے۔

ابنِ جریرؒ نے اس باب میں لکھا ہے :۔

سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کر کے لوٹ جاؤ۔ آں حضرتؐ اُٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی اور قربانی دی۔ اس وقت جبریلؑ نے فصل لربك کا پیام دیا۔

یعنی جب کفارِ مکہ نے حضورؐ کے قافلہ کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور قربانی کے جانوروں کو بھی مکہ تک جانے سے روک دیا گیا (جیسا کہ سورۂ فتح میں مذکور ہے) تو سوال یہ پیدا ہوا کہ قربانی کے جانوروں کو کیا کیا جائے۔ اُس وقت جبریلؑ آئے اور کہا کہ ان کی یہیں قربانی دے کر دو رکعت نماز پڑھ لیجئے۔

---

[1] :۔ یہ نہیں بتایا کہ ان کا اپنا ذریعہ علم کیا ہے؟ محض قیاس

وانحر کے معنی بھی آپ نے دیکھ لئے اور مقامِ نزول کے متعلق بھی بیانات ملاحظہ کر لئے۔ ذرا غور کیجئے کہ ان سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وانحر سے مراد ہے دنیا کے ہر گلی کوچے میں قربانی کے جانور ذبح کرنا! اگر یہ سورت (سورۂ کوثر) مکہ میں نازل ہوئی تھی تو اندازہ یہ ہے کہ یہ ہجرت کے قریب کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ کیونکہ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ جن سورتوں کے درمیان رکھی گئی ہے ان کا تعلق ہجرت کے واقعہ سے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر شدائد و مصائب ہجوم کر کے آچکی تھیں۔ بظاہر، ہر طرف مایوسی دکھائی دیتی تھی۔ وقت وہ آچکا تھا کہ انہیں اپنے گھر بار کو بھی چھوڑنا تھا۔ مستقبل میں بھی کوئی اُمید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان یاس انگیز حالات میں اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ (یقیناً ہم تمہیں اپنے انعامات سے بڑی کثرت سے نوازا ہے) کا مژدہ درخشندہ بڑا حیات بخش (اور مخالفین کے لئے حیرت انگیز) تھا۔ اس کے لئے ارشاد یہ ہوا کہ یہ کثرتِ نعمار نتیجہ ہوں گی اس نظام کی تشکیل و تنفیذ کا جس کا آغاز صلوٰۃ سے ہوتا ہے اور انتہا حج کے اجتماع سے۔ (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) نحر کے معنی اگر قربانی لئے جائیں تو یہ اونٹ کی قربانی کے لئے مختص ہے۔ "اونٹ کے ذبیحہ" میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ مدینہ میں اس وقت یہودیوں کا غلبہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی کو خیال پیدا ہو جائے کہ اب "کمزور و ناتواں" مسلمانوں کا یہ قافلہ ہجرت کے بعد مدینہ کے یہودیوں سے مفاہمت (COMPROMISE) کر کے قریش مکہ کا مقابلہ کرے[1] وانحر کے لفظ سے اس شبہ کو بھی مٹا دیا۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ مسلمانوں کو اونٹ ذبح کرنے کے لئے کہا گیا۔ یعنی یہود کے علی الرغم۔ یوں سمجھئے جس طرح آج ہندوستان کے شکستہ حال مسلمانوں کو کوئی "اشارہ غیبی" یہ کہہ دے کہ اٹھو اور گائے ذبح کرو۔" اور اگر یہ سورت صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی تو اس وقت بھی حالات سخت نامساعد تھے۔ نظرِ بظاہر، وہ صلح شکست ہی کے مرادف تھی۔ لیکن قرآن نے عین اس وقت "عطائے کوثر" کا مژدہ حوصلہ افزا سنایا اور

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "معراج انسانیت" عنوان ہجرت

وانحر[1] سے یہ بتا دیا کہ اگر انہوں نے آج تمہیں مکہ تک پہنچنے سے روک دیا ہے اور تمہاری قربانیوں کو بھی ان کی قربان گاہ (کعبہ) تک نہیں پہنچنے دیا، تو اس کا کیا غم۔ تم عنقریب وہاں پہنچ کر قربانیاں کرو گے۔

ان تصریحات کے بعد آپ سوچیے کہ "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" میں وانحر سے عید کے دن ہر گلی کوچے میں قربانی کا وجوب کس طرح ثابت ہوتا ہے؟

لیکن اگر آپ کو اس پر اصرار ہے کہ وانحر سے مراد ہر گلی کوچے میں قربانی ہے تو ذرا حسب ذیل امور پر بھی غور کیجیے: فصل لربك وانحر میں فَصَلِّ (نماز پڑھ) امر کا صیغہ ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ نماز فرض ہے۔ اسی طرح وانحر بھی امر کا صیغہ ہے۔ لہٰذا انحر بھی فرض ہوئی۔ یعنی جو حیثیت نماز کی ہے وہی حیثیت قربانی کی ہوگی دونوں برابر کی فرض ہوگی۔ کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے۔ فصل (نماز) کے فرض ہونے کے متعلق تو کسی کو کلام نہیں۔ لیکن دیکھیے کہ وانحر (قربانی) کے متعلق کیا عقیدہ ہے۔ خود مودودی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

کیا قربانی فرض ہے

> قرآن و حدیث کے ان دلائل کی بنا پر فقہائے امت نے بقر کی قربانی کے متعلق بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ یہ ایک مشروع فعل ہے اور سنن اسلام میں سے ہے اختلاف اگر ہے تو اس میں کہ یہ واجب ہے یا نہیں مگر اس کا مشروع اور سنت ہونا متفق علیہ ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں مذاہب فقہاء کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

---

[1]:۔ نحر کے معنی کسی معاملہ پر پورا پورا قابو پا لینا بھی ہوتے ہیں۔ نحر الامور کے معنی ہیں، اس نے معاملات کو اپنے (CONTROL) میں کر لیا۔ "نحر العلم نحوا" کے معنی ہیں اس نے اپنے آپ کو علم پر (MASTER) کر لیا۔ اس لئے نعمائے کثیر حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ نظام صلوٰۃ قائم کیا جائے اور اس طرح تمام امور پر پورا پورا غلبہ و تسلط حاصل کر لیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مخالف قوتیں بیخ و بنیاد سے اکھڑ جائیں گی اور ان کی جڑ کٹ جائے گی۔ ان شانئك هو الابتر۔

اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ بقرعید کی قربانی شرائع دین میں سے ہے۔ شافعیہ اور جمہور کے نزدیک یہ سنت مؤکدہ بطریق کفایت اور شافعیوں میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ مقیم اور خوشحال آدمی پر واجب ہے۔ امام مالکؒ کی رائے بھی ایک روایت کی رُو سے یہی ہے مگر انہوں نے مقیم کی قید نہیں لگائی۔ اوزاعی اور بیعہ کی بھی یہی رائے ہے۔ حنفیوں میں سے ابو یوسفؒ اور مالکیوں میں سے اشہب نے جمہور کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ قدرت کے باوجود قربانی نہ کرنا مکروہ ہے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی ایک ایسی سنت ہے جسے چھوڑ دینے کی اجازت نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ عید کی قربانی کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں زیادہ سے زیادہ سُنت ہے اور وہ بھی ایسی کہ امام احمدؒ کے نزدیک اگر باوجود قدرت (استطاعت) کے قربانی نہ کی جائے تو یہ مکروہ ہوگا۔ آپ ذرا سوچئے کہ قرآن میں "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" کا حکم آتا ہے۔ صلّ (نماز پڑھا) کے متعلق ہر ایک کا اتفاق ہے کہ یہ فرض عین ہے۔ لیکن اسی حکم کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق یہ کیفیت ہے کہ اسے کوئی بھی فرض قرار نہیں دیتا۔ صلوٰۃ کا تارک دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ لیکن استطاعت کے باوجود قربانی نہ کرنے والا مکروہ فعل کا مرتکب گردانا جاتا ہے اور بس! اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ وانحر سے مراد عید کی قربانی لینا کس طرح قرآنی مفہوم کہلا سکتا ہے۔

پھر ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ اگر وانحر سے مراد قربانی ہے تو نحر صرف اونٹ کی قربانی کے لئے مخصوص ہے۔ گائے، بھیڑ، بکری کی قربانی اس میں قطعاً شامل نہیں۔

ایک قدم اور آگے۔ قرآن نے "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" فرمایا۔ صلّ کے معنی ہوئے "نماز پڑھ" اور وانحر کے ان کے نزدیک "قربانی کر"۔ اب ظاہر ہے کہ صلّ کے حکم کی ادائیگی اسی شکل میں اور انہی شرائط کے ساتھ ہوگی۔ جو قرآن میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں۔ مثلاً قرآن نے حکم دیا ہے کہ صلوٰۃ کے لئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ لہٰذا جب صلّ کہا جائے گا تو اس کے ساتھ یہ تمام شرائط مستلزم ہوں گی۔ جس طرح صلّ کے لئے یہ ضروری ہے، اسی طرح وانحر کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ صلّ کے لئے قرآن نے سمت قبلہ کا تعین فرمایا ہے۔ اسی طرح وانحر کے لئے

قرآن ہی نے کعبہ کے مقام کی تعیین کر دی ہے۔ لہٰذا، جس طرح صلٰوۃ (نماز) کے لئے سمتِ قبلہ ضروری ہے اسی طرح نحر (قربانی) کے لئے مقام کعبہ ضروری ہے۔ نہ سمتِ قبلہ کے بغیر (ہر طرف رُخ کر کے) صلٰوۃ ہو سکتی ہے نہ مقامِ کعبہ کے بغیر (ہر مقام) پر قربانی۔ صلٰوۃ (صلوٰۃ) کے متعلق قرآن کی تمام حدود و قیود کا التزام ضروری قرار دینا لیکن انحر (قربانی) کے متعلق قرآن کی متعین کردہ شرط کے یکسر خلاف۔ دُنیا کے ہر گلی کوچے کو قربان گاہ تصوّر کر لینا تو منون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (کتاب کے ایک حصہ پہ ایمان اور دوسرے حصہ سے انکار) کے مرادف نہیں تو اور کیا ہے۔

روایات آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ جب قرآن میں قربانی کے متعلق ایسی تصریحات موجود ہیں تو پھر وہ کونسی وجہ ہے جس کی بنا پر یہ تمام حضرات اس پر مُصر ہیں کہ قربانی کی جگہ مختص نہیں۔ ہر گلی کوچے میں ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو دین کے دوسرے شعبوں کو قرآن کے خلاف لے جانے کی وجہ بنی ہے۔ یعنی روایات! کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں مذکور ہے کہ نبی اکرمؐ نے عید قربان کے دن اپنے طور پہ قربانی کی۔ چونکہ ہمارے ہاں "دین" کی بنیاد قرآن نہیں بلکہ احادیث ہیں، اور احادیث قرآن کی ناسخ بھی ہو سکتی ہیں اور اس پہ قاضی بھی، اس لئے جس معاملہ میں قرآن اور احادیث میں اختلاف ہو گا، ان لوگوں کا عمل حدیث کے مطابق ہو گا قرآن کے مطابق نہیں۔ قرآن میں تصریح موجود ہے کہ قربانی حج کے موقعہ پر کعبہ میں کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ چند ایک روایات میں آچکا ہے کہ رسولؐ اللہ عید کے دن قربانی کیا کرتے تھے۔ اس لئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اُسے کہنے دیجئے، عمل حدیث پہ ہو گا۔

لیکن جیسا کہ روایات میں عام طور پہ ہوتا ہے، اس باب میں بھی دونوں قسم کی روایات موجود ہیں ایسی بھی جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن قربانی کی اور ایسی بھی جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود مکہ میں قربانی کی یا اپنے قربانی کے جانور مکہ معظمہ میں بھیجے۔

۱۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مالک، نسائی سب کے سب اس حدیث کے راوی ہیں۔ جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آں حضرت کا معمول تھا کہ آپؐ مدینہ سے ہدی کو مکہ روانہ فرماتے تھے تو آپ کے ہدی کے ہار میں بنایا کرتی تھی۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے حدیبیہ کے سال بہت سے اونٹ بطور ہدی مکہ کو روانہ کئے۔ ان میں ایک اونٹ چاندی کی نتھنی والا بھی تھا۔

۳۔ حضرت نافعؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی قربانی کے جانوروں کو قباطی، انماط اور حلل کی جھول پہناتے پھر کعبہ کی طرف روانہ کر دیتے۔

۴۔ زاد المعاد میں علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ حج ۹ھ میں فرض ہوا۔ اس سال غزوۂ تبوک سے واپسی پر رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو کم و بیش تین سو مسلمانوں کے ہمراہ حج کے لئے بھیجا اور اپنے قربانی کے بیس اونٹ جن کے گلوں میں خود اپنے ہاتھ سے قلاوے پہنائے تھے، اُن کے ساتھ کر دیئے۔ دوسرے سال (۱۰ھ میں) حضورِ اکرمؐ نے خود حج کیا اور مکہ میں سو جانوروں کی قربانی کی۔ الغرض حج کی فرضیت کے بعد دو سال آپ زندہ رہے اور دونوں سال آپؐ کی طرف سے قربانی مکہ میں ہوئی۔

باقی رہیں وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ میں قربانی دی۔ سو جب ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے قربانی کے لئے کعبہ کا تعین کر دیا ہے تو ہم بلا تأمل کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایات صحیح نہیں ہو سکتیں کیونکہ حضورؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا۔

سُنّتِ ابراہیمی

قربانی کو عام طور پر "سُنّتِ ابراہیمیؑ" کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ قرآن میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواب کو حقیقی سمجھا اور حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب انہیں لٹا دیا گیا تو خدا نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ ایک مینڈھا جنت سے بھیجا گیا۔ جس کی قربانی حضرت ابراہیمؑ نے کر دی۔ یہ بیان تورات کا ہے۔ قرآن کا نہیں۔ لہٰذا بکروں کی قربانی سُنّتِ ابراہیمیؑ بھی نہیں۔ اگر کسی کو سُنّتِ ابراہیمی پر عمل پیرا ہونا ہے تو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لٹائے۔ اس کے بعد اگر اُسے خدا کی طرف سے آواز آجائے کہ بیٹے کو چھوڑ دو تو چھوڑ دے اور اگر ایسی آواز نہ آئے تو اُسے ذبح کر ڈالے! بیٹے کی جگہ بکرا ذبح کر دینا اور اُسے سُنّتِ ابراہیمی قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے!

ذبحِ عظیم

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ خدا نے حضرت اسماعیلؑ کو "ذبحِ عظیم" کے فدیہ میں چھڑا لیا اور وہ "ذبحِ عظیم" یہی (بکروں اور مینڈھوں) کی قربانیاں ہیں جو ہر سال دی جاتی ہیں۔ یہ عقیدہ بھی خوب تراشیدہ ہے۔ اوّل تو اس منطق پر غور کیجئے کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے (حضرت) اسماعیلؑ کو چھُری سے ذبح ہونے سے بچا کر "ذبحِ عظیم" (بہت بڑی قربانی) کے لئے مختص کر لیا اور ہمارے ہاں اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے مقابلہ میں بھیڑوں، بکریوں کی قربانی "ذبحِ عظیم" ہے۔ غور کیجئے کہ اس سے کیسی بلند حقیقت کو کتنی پست سطح پر لایا جاتا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ باپ کے پہلو ٹھے بیٹے تھے (اور منصبِ سرداری کے مستحق) ہونے کی جہت سے شام کے سرسبز و شاداب وادیوں کے حکمران بننے والے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ انہیں اپنے خیال کے مطابق خدا کی راہ میں ذبح کر رہے تھے۔ چھُری گلے تک آ پہنچی تھی۔ بس ایک لمحہ میں یہ قربانی ختم ہو جانے والی تھی۔ اللہ نے انہیں چھُری سے بچا کر حکم دیا کہ مکّہ کی بے برگ و گیاہ وادی میں "ہمارا گھر" بناؤ۔ اور حضرت اسماعیلؑ کو اس کی پاسبانی کے لئے وقف کر دو۔ آپ غور کیجئے۔ سرزمینِ شام کی شادابیوں اور شگفتگیوں کی جگہ صحرائے عرب کا مسکن، اور منصبِ سرداری اور حکمرانی کے بجائے عبادت گاہ کی تولیت۔ یہ تھی وہ بڑی قربانی جس کے لئے حضرت اسماعیلؑ کو چھڑا لیا گیا تھا۔ وہ قربانی جسے ایک لمحہ میں ختم نہیں ہو جانا تھا بلکہ ساری عمر ساتھ رہنا تھا۔ یہ ایک ایک سانس کی قربانی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ قربانی تھی۔ مسلسل و متواتر قربانی تھی۔ عمر بھر کی قربانی تھی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ پشتوں تک کی قربانی تھی۔ حضرت اسحٰقؑ کی نسل کے حصہ شوکتِ سلیمانی اور دارائے داؤدی آگیا اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کے حصہ میں صحرائے عرب کی عبادت گاہ کی رکھوالی! کہیئے یہ قربانی بڑی تھی یا ایک لمحہ میں رگِ جان کا کٹ جانا! یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی، جس کے اثرات صدیوں تک تولیتِ کعبہ کی شکل میں متوارث آگے بڑھتے رہے، تا آنکہ شاخِ اسرائیل کے بے نم ہو جانے کے بعد، یہ شاخِ اسماعیلؑ اس حسن و شادابی کے ساتھ گلبار و ثمر ریز ہوئی کہ اس کی تازگی اور شگفتگی میں قیامت تک فرق نہیں آئے گا۔ یہ تھا ثمرہ اس "ذبحِ عظیم" کا جس کے لئے حضرت اسماعیلؑ کو خدا نے وقف کر لیا تھا۔ اس حقیقت کے بعد سوچیئے کہ "ذبحِ عظیم" سے مراد بھیڑوں، بکریوں کی قربانی لینا، قرآنی عظمتوں کو کن پستیوں تک لے جاتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے اُسے بغور پڑھیئے۔ یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ :-

۱۔ قرآن کریم نے قربانی کا ذکر حج کے سلسلہ میں کیا ہے۔

۲۔ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر اس کی تخصیص اور تعین کردی ہے کہ قربانیوں کا مقام خانہ کعبہ ہے۔

۳۔ قربانی کے متعلق واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس سے مقصود سامان خورونوش کا مہیا کرنا ہے

۴۔ قرآن میں کوئی ایک مقام ایسا نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ عید کے دن اپنی اپنی جگہ، ہر گلی کوچے میں قربانیاں دینے کا حکم ہے۔

اس سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے :-

(ا) قربانی حج کی تقریب پر کرنی چاہیئے اور وہ بھی صرف اسی قدر جس سے خورونوش کا سامان ہو جائے۔ لہذا

(ب)۔ نہ تو حج میں ایسی قربانیوں کی اجازت ہے جنہیں زمین میں دبا دیا جائے اور نہ ہی حج سے باہر قربانیوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہے قرآن کی کھُلی کھلی اور واضح تعلیم۔ باقی رہیں احادیث۔ سو

(ا)۔ ان میں دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔ وہ بھی جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن قربانی کی اور وہ بھی جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود مکہ معظمہ میں تقریب حج قربانی کی یا قربانی کے جانوروں کو مکہ معظمہ بھیجا۔

(ا)۔ لہذا قرآن کی تخصیص و تعین مقام و تقریب کے بعد، اوّل قسم کی احادیث کے متعلق یہی سمجھنا چاہیئے کہ وہ :

(ا)۔ یا تو اس زمانے سے متعلق ہیں جب قرآن میں ہنوز حج کی قربانی کے احکام نہیں آئے تھے۔

(ب)۔ اگر شق (ا) ناقابلِ تسلیم ہو تو پھر لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ یہ روایات وضعی ہیں۔ کیونکہ رسولؐ اللہ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

لیکن اگر اس کے باوجود آپ کو اس پر اصرار ہو کہ حج میں ہر حاجی کا ایک ایک، دو دو، چار چار، دس دس، سو سو جانور ذبح کرنے کی اجازت ہے اور ہر جانور کے ذبح کرنے کا ثواب ملتا ہے اور نیز یہ کہ

دنیا کے ہر گلی کوچے میں عید کے دن جانور ذبح کرنا امر شروع ہے تو ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا کام راستہ دکھانا ہے، راستہ پر لگا دینا نہیں۔

مشکل یہ ہے کہ جب انسان کے ذہن میں کوئی بات اندھی تقلید کی بنا پر بطور عقیدہ جم جائے تو اس میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر ان حضرات میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو ہم اُن سے کہتے کہ آپ ذرا تصور میں لائیے کہ کسی جگہ قریب ایک[1] لاکھ انسان جمع ہوں اور اُن میں سے ہر ایک دو دو، چار چار بھیڑوں، بکریوں کو ذبح کر کے زمین پر تڑپتا چھوڑ دے اور اس کے بعد ان تمام تین چار لاکھ لاشوں کو گڑھے کھود کھود کر دبا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا میں ہر مقام پر کروڑوں کی تعداد میں اسی طرح جانور ذبح کیے جائیں اور دن بھر ان جانوروں کا گوشت اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومتا پھرے اور اس کے بعد یہ قوم اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے ایک بہت بڑا کارنمایاں انجام دے دیا جس کا انہیں خدا کے ہاں بہت بڑا اجر ملے گا اور یہ جانور انہیں جہنم سے پار لگانے کا موجب بنیں گے۔ یہ منظر تصور میں لائیے اور پھر سوچیے کہ ان دو چار روایتوں نے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور کیا سے کیا بنا دیا۔ روایات نے کیا یہ ہے کہ اسلام جیسے زندگی بخش نظامِ حیات کو رسومات کا مجموعہ بنا دیا ہے اور یہی ان لوگوں کا مقصود تھا۔ جنہوں نے مسلمانوں کو قرآن سے ہٹا کر روایات میں الجھا دیا۔ یہ ہیں قرآن کی رُو سے قربانی کے احکام۔ یعنی

(۱)۔ قربانی، اجتماعِ حج کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا مقصد اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے خوراک بہم پہنچانا ہے۔ لہٰذا اس ضرورت سے زیادہ جس قدر جانور ذبح کیے جاتے ہیں وہ اہلاکِ نسل ہے جسے قرآن نے فساد سے تعبیر کیا ہے۔ (ویھلك الحرث والنسل) (۲/۲۰۵)

(۲)۔ حج کے علاوہ قربانی اور کہیں نہیں۔ لہٰذا یہ جو دنیا کے ہر قریہ اور ہر بستی کے گلی کوچے میں جانور ذبح کیے جاتے ہیں قرآن کی رُو سے اس کی شرعی حیثیت کچھ نہیں۔ ذالك الدین القیم ولكن اكثر الناس لا یعلمون۔ (۱۹۵۱ء)

---

[1] ۱۹۶۳ء میں حج کی تقریب پر قریب چودہ لاکھ کا اجتماع بتایا گیا تھا۔

کیا قربانی کا منکر کافر ہے؟

از: علامہ عیاض العقاد - مدیر الاسلام (مصر)

سوال

زید قربانی کا منکر ہے۔ بارہا اس نے اپنے منہ سے یہ الفاظ نکالے ہیں کہ ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں، اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کر دی جائے تو وہ اس سے سینکڑوں رفاہِ عامہ کے کام کر سکتی ہے بلکہ وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ اسی طرح امتِ مسلمہ کو ہر سال لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اگر یہ رقم کسی اچھے مصرف میں لگائی جاتی تو بہتر ہوتا۔ پوچھنے والی بات یہ ہے کہ کیا ایسے اعتقاد رکھنے کے بعد زید مسلمان رہ سکتا ہے کیا کہ وہ اس قابل ہے کہ موت کے بعد مسلمان اس کا جنازہ پڑھیں اور کیا مسلمان اس کے ساتھ رشتہ ناطہ کر سکتے ہیں؟ براہِ کرم جواب مفصل دیجئے۔

_____ سائل: غنم بن صفوان العلی۔ مقیم قاہرہ

الجواب

سب سے پہلے تو آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نہ اپنے آپ کو مفتی کہتا ہوں اور نہ ایسی مسند افتاء میں نے بچھا رکھی ہے کہ تکیہ سے بیٹھ ٹیک کر بیٹھوں اور لوگوں کے ایمان تولتا رہوں۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا محض علمی و تحقیقی انداز میں کہوں گا اور جہاں تک میری بصیرت میری رہنمائی کرے گی حق گوئی میں پوری بے باکی سے کام لوں گا۔

قربانی اور قرآنِ حکیم

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ آیا قربانی قرآن حکیم سے ثابت ہے یا نہیں؟ جب آپ اس امر پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں قطعیت

کے ساتھ یہ کہیں نہیں آیا کہ مسلمان خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشے میں بستے ہوں۔ ذی الحج کی فلاں تاریخ کو قربانی کیا کریں۔ عام مفسرین جن آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ مَیں انہیں بھی درج کئے دیتا ہوں۔

۱۔ قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ (انعام)

کہہ دیجئے کہ میری صلوٰۃ میری "نسک" میری زندگی اور میری موت رب العالمین کے لئے ہے۔ اس آیت میں "نسک" سے قربانی مراد لی جاتی ہے۔

آیئے۔ "نسک" کا فیصلہ ائمہ لغت سے کرائیں۔

علامہ بستانی لکھتے ہیں :۔

"اس مادہ کے اصل معانی دھو کر پاک صاف کرنا ہیں۔ اس کے بعد یہ ہر اس امر کے لئے استعمال ہونے لگا جو خدا کی طرف سے واجب قرار پایا ہو۔ اسی لئے مناسک کا لفظ ان طور طریقوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو واجباتِ خداوندی کی ادائیگی کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ (محیط المحیط۔ ملخصاً)

علامہ محب الدّین محمد مرتضیٰ لکھتے ہیں :۔

"نسك السبخة کے معنی ہیں۔ اس نے بنجر زمین کو درست کیا۔ نسك الی طریقة جمیلة۔ اس نے اچھا راستہ اختیار کر لیا۔ اسی لئے نسك اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ اکثر آتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر حج کے امور و مراسم کو بھی مناسک کہتے ہیں۔ نُسُكٌ یا نَسِیْكَةٌ۔ ذبیحہ یا خون کے معنوں میں بھی آتا ہے۔"

——————(تاج العروس۔ ملخصاً)

علامہ ابنِ قتیبہ کہتے ہیں :۔

"نسک ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کیا جائے۔" (کتاب القرطین)

غرض یہاں سے آپ نے معلوم کر لیا کہ اگرچہ بنیادی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ زندگی کے ہر اس طور طریقے پر استعمال ہوتا ہے جو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جائے۔ تاہم یہ ذبیحہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ذبیحہ بھی وہی جو حصولِ تقرب کے لئے ہو۔ آیہ زیرِ نظر میں اکثر مفسرین نے نسک سے مناسک حج مراد لئے ہیں۔ کیونکہ قرآن ان معانی میں بھی اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ دیکھئے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ ۔ (البقرہ)

جب تم مناسکِ حج سے فارغ ہو جاؤ۔

لیکن قرآن ہی میں یہ لفظ ذبیحہ کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۔ (بقرہ)

پس اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحہ ہوں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سورۂ انعام کی مذکورۃ الصدر آیت میں نُسُک ذبیحہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یا قربانی کے معنوں میں۔

صلوٰۃ کے ساتھ نُسُک اور حیات وممات کے الفاظ صراحتاً اس امر پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہاں لفظ اپنے بنیادی معنوں کے بغیر کسی اور معانی میں استعمال کیا جائے تو ان نئے معانی کے لئے کوئی واضح قرینہ ہونا چاہیئے۔ جیسے فدیہ والی آیت میں ہے کہ وہاں اور کچھ مراد ہی نہیں لے سکتے اور نہ اُسے بُنیادی معنوں پر محمول سمجھ سکتے ہیں۔ سورۂ حج میں ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۔ (الحج)

ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر اُسے چلنا تھا۔

دیکھیئے یہاں لفظ صاف طور پر اپنے بنیادی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

باندازِ دگر اچھا ایک لمحہ کے لئے ہم یہ بھی تسلیم کئے لیتے ہیں کہ سورۂ انعام کی آیت میں نسک سے مراد ذبیحہ ہے لیکن اس بات کی کسی کے پاس کیا دلیل ہے کہ اس سے وہ قربانی مراد ہے جو ہر سال حج کے مہینے میں ساری دنیا کے مسلمان کرتے ہیں۔ اس آیت سے بھی زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہوگا کہ مشرکین بتوں کے حضور اپنے جانوروں کو بھینٹ چڑھاتے تھے "میں اللہ کے لئے جانور ذبح کرتا ہوں"

خیال رکھیئے کہ میں اس قربانی پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں جو حاجی حج کے موقع پر دیتے ہیں اور جس قربانی کے جانور کو اللہ تعالےٰ "ھدی" کہتا ہے۔ نمائندگانِ ملتِ اسلامیہ کے عالمگیر اجتماع میں ہدی کی قربانی اس لئے ہے کہ وہاں وہ لوگ ایک دوسرے کی دعوت کریں اور مختلف ممالک کے نمائندوں میں باہم موانست پیدا ہو اور مل بیٹھ کر وہ لوگ اجتماعی مسائل پر سوچیں۔ دینِ اسلام میں ایسے اجتماعات

کے مواقع پر ہر امت کو نبی اکرمؐ سے پیشتر بھی یہ حکم تھا۔

۱۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۔ (الحج)

اور ہم نے ہر امت کے لئے یہ طریقہ مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ لوگ اللہ کے دیئے ہوئے جانوروں پر اللہ کا نام لیں (اور انہیں ذبح کریں)

یہ آیت "ہدی" کے سلسلہ میں سورۂ حج میں وارد ہوئی ہے۔

دوسری دلیل

اب ان لوگوں کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے جو قربانی کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

۲۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ (کوثر)

اپنے رب کے واسطے صلوٰۃ ادا کر اور نحر کر۔

وانحر کے معنی کئے جاتے ہیں "اور قربانی کر" حالانکہ نحر کئی معنوں میں آتا ہے۔

فراء نحوی کہتا ہے:۔

"وانحر کے معنی ہیں اپنا سینہ قبلہ رُخ کیجئے" (ابن ابی حاتم)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو میں نے جبریلؑ سے پوچھا۔ یہ نحر کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ ذبح نہیں بلکہ نماز میں پہلی تکبیر، رکوع اور رکوع سے اُٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ (ابنِ ابی حاتم - ابن مردویہ)

جعفد کا قول ہے کہ:۔

نحر کے معنی ہیں تکبیر اولیٰ کے وقت ہاتھ اٹھانا۔ (ابن جریر)

حضرت علیؓ کا ایک اور قول ہے کہ:۔

"نحر کے معنی ہیں بائیں کلائی پر دایاں ہاتھ رکھنا اور پھر انہیں سینے پر رکھ لینا۔"

(دار قطنی و تاریخ بخاری)

حضرت ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ:۔

نحر کے معنی ہیں دو سجدوں کے درمیان اتنا بیٹھنا کہ چھاتی نظر آئے۔ (روح المعانی)

ضحاک کا قول ہے کہ :۔

نحر کے معنی ہیں نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا۔ (ایضاً)

اِن تمام اقوال کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نحر کے وہ معنی ہیں جنہیں بنیادی معنی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سب اس وقت پیدا ہوئے۔ جب نماز کا تصور پیدا ہوا۔ رہی وہ روایت جو حضرت علیؓ کے واسطہ سے نبی صلعم کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ سو اس کا ضعف ظاہر ہے۔ جبریل اُس قوتِ غیبیہ کا نام ہے جو انبیاء کے قلوبِ مقدس پر القائے وحی کرتی ہے۔ وہ وحی کے معانی بتانے نہیں آتی۔ اسناد کے لحاظ سے بھی محدثین نے اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں :۔

ابن کثیر نے اِسے منکر قرار دیا ہے اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے

(روح المعانی - جزء ۳۰)

اب لغت کی طرف آیئے۔ علامہ محب الدین محمد مرتضیٰ لکھتے ہیں :۔

"نحر الصدر سینے کے اُوپر کا حصہ" جہاں ہار پہنایا جاتا ہے۔ نحر البعیر ینحرہ نحراً۔ اُس نے اُونٹ کے سینے سے متصل اس جگہ پر نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے

(تاج العروس ملخصاً)

اِس کے بعد علامہ مذکور نے وہ تمام اقوال نقل کئے ہیں جو میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ ان میں دو باتوں کا اضافہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اونٹوں کو ذبح کرنا، ۲۔ خواہشات کا قلع قمع کرنا۔ (ایضاً)

علامہ زمخشری کہتے ہیں :۔

نحر کے معنی ہیں کامل دست گاہ حاصل کرلینا۔ حاوی ہوجانا۔ نحرت الشئ علماً۔ مَیں علم کے ذریعہ اس پر حاوی ہوگیا۔ (اساس البلاغۃ)

علامہ بستانی لکھتے ہیں :۔

نحر کے معنی ہیں اچھی طرح علم حاصل کرلینا۔ نحر الامور علماءُ اس نے معاملات کو اچھی

طرح سمجھ لیا۔ النحر والنحریر کے معنی ہیں۔ ماہر، تجربہ کار، کامل دست گاہ رکھنے والا ہر چیز کو سوچ سمجھ کر اپنے" نے والا اور ڈٹ کر اس پر عمل پیرا ہونے والا۔" (محیط المحیط)

ہمارے زمانے کے مشہور ماہر لغت علامہ سعد الجیلانی لکھتے ہیں:۔

لفظ نحر بنیادی طور پر ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ کسی نظریہ کو، کسی علم کو یا کسی عقیدہ کو غور و تدبر کے بعد قبول کرنا اور پھر اس پر مستحکم ہو جانا۔ یا کسی علم پر پوری بصیرت سے حاوی ہو جانا اور پھر مستقل مزاجی کے ساتھ عمل پیرا ہونا، تو قرآنِ حکیم میں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا مفہوم ہو گا۔ پس نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مستقل مزاجی سے کوشش کرو۔ جب تیسری صدی ہجری میں قوی عمل مفلوج ہوئے اور صلوٰۃ کے مفہوم کو صرف ابتدائی ارکان پر منحصر سمجھا گیا تو نحر کے وہ عجیب معانی بھی پیدا کئے گئے کہ اس کے معنی ہیں نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا وغیرہ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجاہد اور اسماعیل بن ابی خالد وغیرہما نے یہ اُپج نکالی کہ نحر کے معنی ہیں قربانی کرنا اور اس قربانی سے گائے، بیل، بھیڑ، بکری، وغیرہ ہر چیز کا ذبح کرنا مراد لے لیا گیا۔ حالانکہ پہلے مجازاً یہ لفظ اونٹ کے ذبح کرنے پر بولا جاتا تھا کیونکہ اس میں بھی نحر کا بنیادی مفہوم پیشِ نظر تھا۔ اونٹ کو کھڑا کر کے اچھی طرح سے اس کا حلق تاک کر نیزہ اس طرح سے مارنا کہ وہ گر جائے بالکل ان معانی کے مشابہ ہے کہ ایک نظریہ کو نصب العین بنایا جائے۔ پھر اس کے ساتھ شعوری لگن پیدا کی جائے اور پھر اس طرح عمل کیا جائے کہ نصب العین حاصل ہو جائے۔

(مقدمہ لسان القرآن صہ ۴۲)

اِن تصریحات سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اوّل تو نحر سے ذبح کرنا مراد نہیں لیا جا سکتا، اور اگر یہ معانی لے بھی لئے جائیں تو پھر بھی صرف یہ ثابت ہو گا کہ "اونٹ ذبح کر" کیونکہ نحر کا لفظ اور کسی جانور کے لئے بولا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ علامہ رازی نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ بھی سُن لیجئے۔

چونکہ نماز بدنی عبادات میں سب سے افضل ہے، اس کے ساتھ قربانی کی قسموں میں

سب سے عظیم قربانی کا ذکر کیا گیا۔ (تفسیر کبیر ج ۸)

یعنی امام رازیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ قربانی تو تمام جانوروں کی ہوسکتی ہے لیکن نماز کے ساتھ افضل قربانی کا ذکر کیا گیا۔ گویا اونٹ کی قربانی باقی جانوروں کی قربانی سے افضل ہے۔ اس لئے "وانحر" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ ایک طرف تو قربانی کو سنتِ ابراہیمیؑ کہتے ہیں، یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے مینڈھا ذبح کیا تھا، دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اونٹ کی قربانی مینڈھے کی قربانی سے افضل ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ علامہ رازی جیسے معقول انسان کو یہ غیر معقول دلیل اس لئے تراشنا پڑی کہ روایات ان کے ذہن میں گھر کر چکی تھیں اور وہ قرآن کے منہ میں روایات کی زبان رکھ کر باتیں کرانا چاہتے تھے۔ اسی چیز کو تفسیر بالرائے کہنا چاہیئے

چلئے ہم نے ایک لمحہ کے لئے یہ بھی مان لیا کہ یہاں وانحر کے معنی ہیں "اونٹ، گائے، بکری بھیڑ ذبح کر۔" لیکن پھر وہی اعتراض ہے کہ آپ یہ کہاں سے ثابت کریں گے کہ اس سے وہی معروف قربانی مراد ہے جو ہر سال حج کے ایام میں دنیا کے ہر گوشے میں ہر مسلمان کرتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور اعتراض بھی ہے کہ معروف قول کے مطابق یہ سورۃ مکی ہے تو کیا آپ ثابت کر سکتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں نبی صلعم نے قربانی کی تھی۔ اگر نہیں کی تو کیا آپ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرتے رہے؟ (معاذ اللہ)

یہی دو آیتیں ہیں جن سے یہ لوگ قربانی کے حکم پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر آپ دیکھ چکے کہ ان حضرات کا استدلال کتنا کمزور ہے!

احادیث اور قربانی

اب آیئے احادیث کی طرف۔ پورے ذخیرہ روایات میں دو احادیث ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے قربانی کا حکم دیا۔ ایک نظر ان کو ملاحظہ فرمالیجئے۔

نبی صلعم نے عرفات کے میدان میں فرمایا کہ لوگو! گھر والے پر سال میں ایک مرتبہ قربانی ہے اور ایک مرتبہ عتیرہ[1]۔ (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔ نسائی)

---

[1]: قربانی سے تو ذوالحجہ کا ذبیحہ مراد ہے اور عتیرہ کہتے ہیں۔ دس رجب کے ذبیحہ کو (عیاض العقاد)

اس روایت میں قربانی اور عتیرہ دونوں کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن محدثین کہتے ہیں کہ عتیرہ بالاتفاق منسوخ ہے۔ رہی قربانی تو علامہ ابن حزم کا ارشاد سن لیجئے۔

اس روایت کی اسناد میں، بورملہ خامدی واقع ہوا ہے جو ماہرینِ فن کے نزدیک مجہول الحال اور گمنام قسم کا راوی ہے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

دوسری روایت جو بڑے طمطراق سے پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے۔

جناب ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو صاحبِ حیثیت ہو اور قربانی نہ کرے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔

(مستدرک حاکم - بخاری - ج ۲ - ابن ماجہ)

اس روایت پر بھی علامہ ابن حزم نے قلم اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"محدثین و محققین نے کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد بالآخر عبداللہ بن عیاش بن عباس پر منتہی ہوتی ہیں جو نہایت مجروح اور حد درجہ ناقابلِ اعتبار تھا۔

(المحلّٰی - ج ۷)

قائلین قربانی کی طرف سے اس سلسلہ میں، دو اور روایات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ہم انہیں بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتے۔

حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلعم مدینہ میں دس سال تک رہے اور قربانی کرتے رہے۔ (مسند احمد - ج ۷ - ترمذی)

اس روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ قربانی کب واجب ہوئی تھی۔ اگر وہ حج کے ساتھ واجب ہوئی تو دس سال کا عرصہ کہاں ہوا کیونکہ بالاتفاق ۶ھ کے بعد ہی حج فرض ہوا تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ انہی لوگوں کا ایک اصول بیان کر دیتے ہیں جو ان کے استدلال کی عنکبوتیت واضح کر رہا ہے۔ مشکوٰۃ کے مشہور شارح علامہ ابوالحسن عبیداللہ کہتے ہیں:۔

"کسی عمل پر نبی صلعم کے دوام اور مواظبت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل حقیقتاً بھی ضروری ہے۔ (شرح مشکوٰۃ - ج ۲)

اوّل تو یہ تسلیم کرنا کہ آپؐ نے دس سال تک قربانی کی، خلافِ حقیقت ہے اور اگر اسے مان بھی لیں تو

شارح مشکوٰۃ کے قول کے مطابق یہ کیسے لازم آیا کہ وہ عمل اُمت کے لئے شرعی طور پہ واجب ہے۔

ایک اور روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ بھی دیکھ لیجئے۔

جس نے ذوالحجہ کا چاند دیکھ کر قربانی کا ارادہ کیا اُسے چاہیئے کہ ذبح کرنے سے پہلے نہ تو بال ترشوائے نہ ناخن کاٹے۔ (ابو داؤد۔ نسائی)

اِس روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قربانی کی شرائط بالوں کو نہ ترشوانا اور ناخن نہ کاٹنا بتا رہی ہیں کہ جس طرح ان کی پابندی ضروری ہے اسی طرح قربانی بھی ضروری ہے۔ حالانکہ یہ استدلال بڑا ہی خام ہے۔ کیونکہ یہاں قربانی کو ارادے پر موقوف ٹھہرایا گیا ہے۔ رہا اس کی شرائط کی پابندی کا سوال تو وُہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص نفلی روزہ کا ارادہ کر کے روزہ رکھ لے تو اب اس پر وہ تمام پابندیاں عائد ہو جائیں گی جو فرضی روزوں پہ ہیں۔

غرض یہی کچھ ہیں وہ دلائل جن کی بنا پر قربانی کو ضروری ٹھہرایا جاتا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ ائمہ نے قربانی کی کیا حیثیت سمجھی ہے۔

قربانی اور فقہا

علامہ ابن ارشد لکھتے ہیں:۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خوشحال شہری جو حالتِ سفر میں نہ ہوں، ان پر قربانی واجب ہے، مسافروں پہ نہیں۔ لیکن امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قربانی واجب نہیں۔ (بدایۃ المجتہد۔ ج ۱)

فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے عبارت ہے کہیں کہیں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پہ فتویٰ دیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن نہ معلوم اس معاملہ میں کس دلیل کی بنا پہ امام اعظمؒ صاحب کے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اسے سُنتِ مؤکدہ قرار دیتے ہیں مگر وہ بھی ایسی کہ کرنے والے کو ثواب ملے گا اور تارک پر کوئی گرفت نہیں ہو گی۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ ہے۔ کرنے والا ثواب کا مستحق ہے

اور ترک کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)

قربانی واجب نہیں۔ اجماع صحابہ

اب ذرا اس امر پر غور کیجئے کہ کیا صحابہؓ بھی قربانی کو واجب سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا عمل ملاحظہ فرمایئے۔ امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ:

ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ قربانی نہیں کرتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں انہیں دیکھنے والے قربانی کو ضروری نہ سمجھیں۔

(کتاب الاُم۔ ج ۲)

حضرت ابومسعودؓ انصاری کے متعلق شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں کہ:۔

حضرت ابومسعود انصاریؓ نے فرمایا۔ میرے پاس صبح شام ایک ہزار بکریاں آتی جاتی تھیں اور میں نے اس خوف سے قربانی نہ کی کہ کہیں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔

(المبسوط۔ ج ۱۲)

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت بلالؓ کے متعلق علامہ ابن رشد نے لکھا ہے۔

ابن عباسؓ بھی اسے واجب خیال نہیں کرتے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت ابن عباسؓ نے دو درہم دے کر گوشت خریدنے کے لئے بھیجا اور کہا کہ جو ملے اُسے کہہ دینا کہ یہی ابن عباسؓ کی قربانی ہے اور بلالؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے مرغ ذبح کیا۔ (بدایۃ المجتہد۔ ج ۱)

اس روایت سے آپ کو معلوم ہوگیا کہ اس وقت قربانی کا رواج اس قدر کم تھا کہ قربانی کے روز گوشت فروخت ہو رہا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے تعامل کے متعلق امام ابن حزم نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ:۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ قربانی کو اس خیال سے مکروہ جانتے تھے کہ کہیں لوگ اس کی

اقتدا ضروری نہ سمجھ لیں۔ (المحلّٰی - ج ۷)

امام مذکور نے حضرت ابو مسعودؓ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں کی سہولت اور نُسیر کے خیال سے میں قربانی ترک کر دینے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسے ضروری سمجھ لیں گے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

شارحِ مشکوٰۃ علامہ ابو الحسن عبید اللہ نے امام بیہقی کی صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے کہ :-

حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، ابن عباسؓ، بلالؓ اور ابن عمر صرف اس اندیشہ سے قربانی کو مکروہ سمجھتے تھے کہ کہیں انہیں دیکھ کر لوگ اُسے ضروری نہ سمجھ بیٹھیں۔

(شرح مشکوٰۃ - ج ۲)

انہی شواہد کی بنا پر امام ابن حزم لکھتے ہیں۔

کسی ایک صحابیؓ سے بھی یہ بات ثابت نہیں کہ قربانی واجب ہے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

ابن حزم کی طرح ابن حجر اور شارح مشکوٰۃ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی بھی ذبیحۂ عید قربان کے وجوب کا قائل نہیں تھا۔

(شرح مشکوٰۃ - ج ۲)

علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں :-

جمہور کے نزدیک قربانی واجب نہیں۔ امام نووی نے کہا کہ ابو بکر صدیقؓ، عمرؓ، بلالؓ، ابو مسعود البدریؓ۔ سعید بن المسیب، علقمہ، اسود، عطاء، مالک، احمد، ابو یوسف، اسحٰق، ابو ثور، مزنی، ابن المنذر اور داؤد وغیرہم بھی اسے واجب نہیں سمجھتے۔ بحر میں ہے کہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ بھی اسے واجب نہیں سمجھتے تھے۔ (نیل الاوطار - ج ۵)

علامہ ابو الحسن عبید اللہ نے اس فہرست میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے۔

سعید بن جبیر، حسن بصری، طاؤس - ابو الشعثاء، جابر بن زید، محمد بن علی بن الحسین - سفیان بن عُیَیْنہ - عبید اللہ بن الحسن اور ابو سلیمان وغیرہم نے بھی قربانی کو واجب نہیں سمجھا۔ (المحلّٰی - ج ۷)

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں :۔

"قربانی کو واجب بتا کر حنفیہ نے جمہور علماء کی مخالفت کی ہے ۔" (ایضاً)

انہی شواہد و نظائر کی بنا پر امام موصوف نے فیصلہ دیا ہے کہ :۔

"جو شخص نیک نیتی سے قربانی نہیں کرنا چاہتا اس پر نہ کوئی عتاب ہے نہ شرعی قباحت ۔" (ایضاً)

قربانی کے متعلق بعض دیگر روایات

اب قربانی کے متعلق اور روایات بھی سن لیجئے جو اس کے وجوب کو ختم کرتی ہیں ۔

ابو رافع سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلعم نے عید الاضحیٰ کے روز ایک مینڈھا ذبح کیا اور فرمایا :۔ "میرے خدایا میری ساری اُمت کی طرف سے ہے جس نے توحید و رسالت کی گواہی دی ۔ پھر دوسرے مینڈھے کو ذبح کیا اور فرمایا :۔ "میرے اللہ یہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی طرف سے ہے ۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد بنو ہاشم میں سے کسی کو قربانی کرتے نہیں دیکھا ۔" (مسند احمد)

حضرت ابنِ عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اکرم صلعم نے فرمایا ۔

مجھے چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا ۔ مجھے قربانی کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا ۔ (مسند احمد)

یہی روایت ان الفاظ میں بھی بیان فرمائی ۔

تین چیزیں میرے لئے فرائض کا درجہ رکھتی ہیں اور تمہارے لئے نوافل کا ۔ قربانی، وتر اور چاشت کی نماز ۔ (بزاز، ابن عدی ۔ حاکم)

ایک اور جگہ ہے ۔

مجھ پر قربانی فرض ہے اور تم پر نہیں ۔ مجھے چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا ۔ (مسند ابو یعلی)

خلاصۂ مباحث

اب ذرا قطع کردہ منازل پر ایک نظر ڈال لیجئے ۔

۱۔ قرآن حکیم میں کہیں بھی قربانی کا حکم نہیں دیا گیا۔

۲۔ کوئی صحیح حدیث قربانی کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کو رسولِ اکرم صلعم نے اپنے لئے مختص کر لیا تھا۔

۳۔ صحابۂ کرامؓ اسے واجب نہیں سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ خصوصیت سے قربانی نہیں کرتے تھے۔ پس اگر وہ روایات صحیح ہوتیں۔ جن میں قربانی کو ضروری قرار دیا گیا ہے تو یہ حضرات کبھی ایسا نہ کرتے۔

۴۔ جمہور ائمہ اسے ضروری خیال نہیں کرتے۔

۵۔ صرف امام اعظمؒ ابوحنیفہ اسے واجب سمجھتے ہیں۔

کفر و ایمان کا فیصلہ آپ پر ہے

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا قربانی (جس کا حکم کہیں صراحت سے نہیں) کا منکر کافر ہے یا مسلمان! اگر اس معاملہ میں آپ امام اعظمؒ ہی کو برسرِ حق قرار دیں تب بھی آپ قربانی کے منکر کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک واجب کی تعریف یہ ہے۔

> واجب وہ ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ وہ عملاً لازم ہے اعتقاداً نہیں۔ چنانچہ اس کا منکر کافر نہیں کیونکہ ظنی دلیل سے ثابت شدہ حکم کی بنا پر کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)

قربانی یا نقد قیمت

اب رہا یہ سوال کہ زید کہتا ہے:۔

> "ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کر دی جائے تو سینکڑوں رفاہِ عامہ کے کام ہو سکتے ہیں۔"

تو میرے بھائی اس بات سے کسے انکار ہے۔ دینِ اسلام کے تمام احکام معقول مصالح پر مبنی ہیں۔ اگر ہر سال اتنے جانوروں کا ضیاع بھی کوئی منفعت بخش فعل ہے تو آپ منہ پر مہر لگائے کیوں بیٹھے ہیں۔ ذرا وہ مصلحت تو بتا دیجئے۔ اگر آپ غلط عقاید کی پیدا کردہ جذباتیت سے بلند ہو کر سوچیں تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر حکومتِ عادل کو یہ رقم اکٹھی کر کے دی جائے تو حکومت بڑے مفید کام کر سکتی ہے۔ اور صرف

آپ ہی نہیں، ہر شخص اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ بلکہ حضرت بلالؓ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے تھے۔ سُنیئے امام ابن حزم کیا کہتے ہیں :۔

سوید بن غفلہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے فرمایا: "میں اگر قربانی کرتا تو مجھے کوئی خوف نہ ہوتا کہ بکرے کی بجائے مرغالے کو ذبح کر دوں۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے کہ ذبیحہ کے نقد پیسے مسکین کو دے دوں جو انتہائی ضرورت مند اور محتاج ہو۔ میرے نزدیک جانور ذبح کرنے سے یہ فعل افضل ہے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

صاحبِ ہدایہ قربانی کرنے کو قیمت خیرات کرنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قیمت خیرات کرنے سے قربانی ادا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ:

قربانی کے دنوں میں قربانی کرنا، جانور کی قیمت خیرات کر دینے سے افضل ہے۔

(ہدایہ - ج ۴)

میں نے اپنی طرف سے جو حق سمجھا اُسے واضح کر دیا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

(۱۹۶۴ء)

۴

زکوٰۃ

سوال

اسلام کے پانچ ارکان میں سے زکوٰۃ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جس مال پر ایک سال گزر جائے، اس میں سے اڑھائی فیصد خدا کے نام پر دے دینا زکوٰۃ ہے۔ اگر زکوٰۃ یہی ہے تو اس میں اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ اور اگر زکوٰۃ حکومت کو دی جاتی تھی تو اس میں اور حکومت کے ٹیکس میں کیا فرق ہے۔ اسے وضاحت سے سمجھائیں تاکہ یہ خلش دُور ہو جائے۔

جواب

لفظ زکوٰۃ کا مادہ (ز۔ک۔و) ہے جس کے معنی ہیں بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ نشوونما پانا۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما۔ بالیدگی۔ پھولنا۔ پھلنا۔ بڑھنا۔ قرآن کریم میں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں اور بڑی تاکید کے ساتھ آئے ہیں۔ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے معنی ہوئے "زکوٰۃ دو"۔ لفظ زکوٰۃ کے جو معنی اوپر دیئے گئے ہیں۔ ان کی روشنی میں سوچئے کہ "زکوٰۃ دینے" سے مراد کیا ہوگی۔ یہی کہ دوسروں کی نشوونما اور بالیدگی کا سامان بہم پہنچاؤ۔ یعنی جماعتِ مومنین کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی نشوونما اور بالیدگی کا سامان بہم پہنچائے۔ وہ ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ نسلِ انسانی کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ اس میں ان کی طبعی زندگی کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی شامل ہے۔ اور انسانی زندگی کی نشوونما بھی۔ یعنی انسانی جسم کی پرورش بھی اور انسانی ذات کی بالیدگی اور ارتقا بھی۔ جماعتِ مومنین کی طرف سے یہ فریضہ ان کا نظامِ حکومت ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں آیا ہے

کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ۔ (۲۲/۴۱) یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کریں گے ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ایتائے زکوٰۃ کو حکومتِ اسلامی کا فریضہ قرار دیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ، خیرات کا نام نہیں ۔ خیرات ہم انفرادی طور پر ہر حالت میں دے سکتے ہیں ۔ اس کے لئے اپنی حکومت کی شرط نہیں ۔ ہم انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بھی خیرات دیتے تھے ۔ اب ہندوستان کے مسلمان، ہندوؤں کی حکومت میں بھی خیرات دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں ۔ ایتائے زکوٰۃ کے لئے اپنی حکومت کی شرط زکوٰۃ کی حقیقت کو واضح کر دیتی ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلامی حکومت اپنے اس عظیم فریضہ (یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کس طرح سے دے گی ؟ اس کے لئے ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ذرائع پیداوار حکومت کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ اس پیداوار (رزق) کو ضرورت مندوں کی نشوونما کے لئے صرف میں لائے ۔ دوسرے یہ کہ افرادِ معاشرہ جس قدر کمائیں وہ اس طرح کھلا رکھیں کہ (ان کی ضروریات پوری ہونے کے بعد) مملکت اس میں سے جس قدر ضرورت سمجھے، ایتائے زکوٰۃ (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے ۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب ۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے ۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ افراد کی اپنی ضروریات پوری ہونے کے بعد جس قدر فاضلہ ہو وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں جا سکتا ہے تاکہ وہ اس سے دوسروں کی نشوونما (زکوٰۃ) کا انتظام کرے ۔ (دیکھئے ۔ ۲/۲۱۹)

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام مملکت بتدریج قائم ہوگا ۔ جس عرصہ میں ایسا نظام ہنوز زیرِ تشکیل ہو، اس میں جماعتِ مومنین سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے جائیں گے ۔ اس کے لئے قرآن نے "صدقات" کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

یہ تھا زکوٰۃ سے مفہوم اسلامی نظامِ حکومت میں ۔ لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہا، دین اور سیاست میں جدائیگی پیدا ہو گئی ۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم (یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما دینا) نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ـــ حکومت نے اپنے ٹیکس وصول کرنے شروع کر دیئے اور مذہبی پیشوا بیت "زکوٰۃ" کے نام سے اپنا ٹیکس وصول کرنے لگ گئی ۔ باقی رہے غریب اور محتاج، سوائے کے لئے

امیر آدمیوں کو خیرات کی تلقین ہونے لگی۔ چنانچہ یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لوگ حکومت کے ٹیکس الگ دیتے ہیں۔ سالانہ زکوٰۃ الگ۔ اور خیرات ان دونوں سے الگ۔ حتیٰ کہ قرآن کریم نے جو باتیں "صدقات" کے متعلق کہی تھیں، وہ زکوٰۃ کے متعلق سمجھ لی گئی ہیں۔ مثلاً عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کئے ہیں۔ حالانکہ وہ مصارف "صدقات" کے ہیں۔ زکوٰۃ کے نہیں۔ (۶/۹)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اس وقت یا تو حکومت کے ٹیکس ہیں اور یا خیرات۔ خواہ اُسے متعین طور پر زکوٰۃ کا نام دے دیا جائے یا غیر متعین طور پر صدقہ اور خیرات۔ زکوٰۃ (یعنی افراد معاشرہ کو سامان نشوونما بہم پہنچانا) نہ حکومت کا فریضہ سمجھا جاتا ہے نہ عوام کا۔ اسلامی نظام حکومت میں "زکوٰۃ دینا"، حکومت کا فریضہ ہو گا اور اس مقصد کے لئے افراد جماعت مومنین اپنی ضروریات سے زاید سب کا سب دوسروں کے لئے کھلا رکھیں گے کہ اس میں سے جس قدر ضروری ہو اس مقصد کے لئے صرف کر دیا جائے۔ اس وقت انفرادی خیرات کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خیرات لینے والے کا شرفِ انسانیت کچلا جاتا ہے لیکن جب ایتائے زکوٰۃ اسلامی نظام کا فریضہ قرار پاتا ہے تو ہر شخص اُسے بطور اپنے حق کے لیتا ہے اور کسی کا کسی پر احسان نہیں ہوتا۔ قرآن، خیرات کو عبوری دور کی ضروریات کے لئے ہنگامی اور وقتی علاج بتاتا ہے اور زکوٰۃ کو اسلامی نظام کا بنیادی فریضہ اور لازمی شعار۔ یہ ہے زکوٰۃ کی حقیقت از روئے قرآن۔

صدقہ و خیرات

سوال ہے:۔ دریافت کیا گیا ہے کہ جس طرح ہم آج کل خیرات کے پیسے بانٹتے ہیں۔ اس سے کچھ فائدہ بھی ہے؟

جواب:۔ قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے کہ وہ پہلے اپنے اعزہ و اقربا کو غیروں کی اسیری میں دے دیتے تھے اور پھر ان کی طرف سے فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے چھڑا لیتے اور اُسے بہت بڑا کارِ خیر سمجھ کر اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیتے۔

بعینہٖ یہ حالت مسلمان سرمایہ داروں کی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کا خون چوس کر خود امیر بنتے اور انہیں غریب اور محتاج بنا دیتے ہیں اور پھر ان کی طرف خیرات کے چند پیسے پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کارِ ثواب سے ان کی عاقبت سنور جائے گی۔ یعنی جس طرح ہماری متصوفانہ شاعری میں گناہ کو اس لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر گنہگار نہ رہیں گے تو خدا کی صفتِ غفور رحیمی کا مظاہرہ کس طرح سے ہوگا۔ اسی طرح قوم میں غریبوں اور محتاجوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہیں گے تو پھر خیرات کے احکام کی تعمیل کس طرح ہوگی۔ غور کیجئے نظامِ سرمایہ داری کے جراثیم کا اثر کس قدر دور رس ہوتا ہے۔

اسلام جس نظام کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ہر شخص کی ضروریات زندگی کی کفالت حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا، اس نظام میں محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود تصور ہی میں نہیں آسکتا۔ البتہ بعض انفرادی اور مقامی صورتیں ایسی پیدا ہوسکتی ہیں کہ ان میں فوری امداد کی ضرورت پڑ جائے۔ یا بعض ہنگامی حوادث ایسے رونما ہوسکتے ہیں جن میں خود حکومت کو اس قسم کی ضرورت لاحق ہو جائے اور وہ رضاکارانہ طور پر کوئی فنڈ اکٹھا کرنے کی اپیل کردے۔ لیکن اس قسم کے واقعات شاذ ہوں گے۔ عام حالت یہی ہوگی کہ ملک میں حکومت کا نظام محتاجوں کی خود کفالت کرے گا۔ لہٰذا اسلام میں عام خیرات (CHARITY) کی ضرورت یا تو ایسے عبوری دور میں پڑے گی جب آپ کا نظام ہنوز بروئے کار نہ آیا ہو۔ یا بعض مقامی اور ہنگامی حوادث کے لئے غریبوں اور محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود اور پھر ان کی طرف خیرات کے ٹکڑے پھینک کر اُسے اپنے لئے ثواب کا کام تصور کرنا، اسلامی نظام میں بار نہیں پا سکتا۔ یہ سرمایہ داری نظام کا فریب نگاہ ہے جسے مذہبی تقدس کے خوش آئند غلاف میں چھپایا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ وہی حبطت اعمالھم کی تفسیر۔ یعنی اس تمام صدقہ و خیرات کے باوجود قوم میں محتاجوں اور غریبوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تعداد کے علاوہ غربت اور احتیاج کی شدت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ سب اس سرمایہ داری کے غیر قرآنی نظام کی بدولت ہے جو ہمارے ہاں ہر جگہ رائج ہے۔ اور جسے بدلنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اس لئے کہ اُسے "شریعت" کی سند عطا کر دی گئی ہے۔ (۱۹۵۳ء)

صدقۃ الفطر

سوال ہے :۔ ایک صاحب کا استفسار ہے کہ صدقۃ الفطر کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

جواب :۔ جیسا کہ طلوع اسلام میں لکھا جا چکا ہے۔ صدقات ان عطیات وغیرہ کا نام ہے جو حکومتِ اسلامیہ کی طرف سے ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے لئے جاتے ہیں۔ انہی میں صدقہ فطر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں عائد فرمایا۔ (یعنی ہجرت کے فوری بعد۔ روزے ۲ھ میں فرض ہوئے ہیں) جب ابھی اسلامی حکومت اپنی منظم شکل میں وجود میں نہیں آئی تھی اور مسلمانوں کو قدم قدم پر ہنگامی ضروریات پیش آ رہی تھیں۔ قرآن میں صدقۃ الفطر کا خصوصیت سے ذکر نہیں اس لئے کہ قرآن نے صدقات کا حکم اصولی طور پر دیا ہے۔ جزئیات متعین کرنے کا کام ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اگرچہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، صدقۂ فطر اس زمانے میں عائد کیا گیا جب ابھی مسلمانوں میں اجتماعی نظم، حکومت کی شکل میں متعین نہیں ہوا تھا، بایں ہمہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ امور انفرادی نہیں اجتماعی ہوا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین ہے۔ اور دین (آئینی نظامِ زندگی) ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں۔ خود صدقۂ فطر کے متعلق تاریخ میں ہے کہ لوگ صدقۂ فطر اپنے اپنے طور پر نہیں دیتے تھے بلکہ ان عاملین کے پاس جمع کرتے تھے جو اس مقصد کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد مرکز سے اس کی تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ طبری میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلعم نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس مقصد کے لئے عامل مقرر کیا تھا۔ چونکہ یہ طریقہ اسلام کی اجتماعی روح کے عین مطابق ہے اس لئے باور کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صدقۂ فطر کا یہی نظام رائج ہوگا۔ لیکن اب ہماری لامرکزیت کا یہ عالم ہے کہ صدقہ کے وجوب کی تاکید میں ہر محراب و منبر سے آوازیں بلند ہوں گی۔ لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہوگا کہ سنتِ رسول اللہ یہ ہے کہ اس صدقہ کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے اور پھر اس کی تقسیم مرکزِ ملت کی طرف سے ہو۔ اب سنت رسول اللہ کا صرف اتنا حصہ پیش کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے صدقۂ فطر نکالا جائے اور اسے اپنے اپنے طور پر غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو روزے معلق رہ جائیں گے۔

غور فرمایا آپ نے، کہ بات کیا تھی اور کیا بن گئی۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

آج سارے عالمِ اسلامیہ کو چھوڑیئے۔ ایک پاکستان کو لیجئے۔ یہاں کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے اگر چھ کروڑ بھی ایسے فرض کر لئے جائیں۔ جن کی طرف سے صدقۂ فطر دیا جاتا ہے۔ اور فی کس بارہ آنے کے حساب سے اس کا شمار کیا جائے تو عید کے دن دس بجے سے پہلے پہلے ساڑھے چار کروڑ کی رقم صرف اس فنڈ میں جمع ہو سکتی ہے جس سے اور کچھ نہیں تو خانماں برباد پناہ گزینوں کو چھت تو نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تک دین کی باگ مولوی کے ہاتھ میں ہے، صدقات نکلتے رہیں گے، زکوٰۃ دی جاتی رہے گی۔ قربانیاں ہوتی رہیں گی۔ لوگ حج بھی کرتے رہیں گے اور قوم بدستور بے گھر، بے در، بھوکی، ننگی، اسلام کے ماتھے پر کلنک کے ٹیکے کا موجب بنی رہے گی۔

کتنا بڑا ہے یہ انتقام جو ہزار برس سے اسلام سے لیا جا رہا ہے اور غور کیجئے کہ اس انتقام کے لئے آلۂ کار کن لوگوں کو بنایا جاتا ہے۔ (۱۹۵۳ء)

۵

معاشرتی اور عائلی مسائل

نکاح کا طریقہ

لاہور سے طلوع اسلام کے ایک بزرگ کرم فرما تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے ملک میں عام طور پہ نکاح کے موقعہ پہ لڑکی کی طرف سے دو وکلاء کے ذریعہ ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے۔ حالانکہ خود لڑکی مکان کے دوسرے کمرہ میں موجود ہوتی ہے۔ نکاح کا دوسرا نام اقرار نامہ یا عہد نامہ ہے۔ دنیا کے تمام معاملات میں معاہدہ کے وقت گواہوں کے روبرو فریقین کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بجز اس کے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی ایک فریق خود حاضر نہ ہو سکے۔ اور یہ کام (BY -ρρoxy) طے پا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نکاح کے معاملہ میں فریقین خود کیوں نہ شامل ہوں۔ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ قرآنی تعلیم کے مطابق نکاح کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب

قرآن کریم نے نکاح کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نکاح خوان کی ضرورت بھی نہیں بتائی۔ نکاح ایک معاشرتی رسم ہے۔ اس میں قرآنی حصہ اتنا ہی ہے کہ عاقل اور بالغ مرد اور عورت ان تمام حقوق و فرائض کو قبول کرتے ہوئے جو اللہ تعالےٰ نے اس باب میں عائد کئے ہیں، ازدواجی زندگی بسر کرنے کا باہمی معاہدہ کریں۔ اس میں گواہوں کی ضرورت کسی بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگی کے لئے احتیاطی تدبیر ہے۔ ہمارا موجودہ طریقۂ نکاح ہمارے اس غیر قرآنی تصور کی یادگار ہے کہ نکاح کے معاملہ میں لڑکی کچھ دخل نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ اس کے ولی کا ہے اور اسے ولی بشمولیت وکیل طے کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نکاح کے موقعہ پر لڑکی میں ایک خاص جھجک ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ (اسلامی پردہ ہی میں سہی) عام مجمع میں اس قسم کی موجودگی میں تامل کرے گی لیکن اس کے لئے اس کا عام مجمع میں آنا کیا ضروری ہے۔ اپنے چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے کے بالمواجہہ اس عہد نامہ کا اقرار کر لینا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ کسی حاجب و دربان کی ضرورت ہے نہ ولی اور وکیل کی۔ (۱۹۵۶ء)

نکاحِ نابالغاں ایک محترمہ خاتون راولپنڈی کے ایک صاحب کے توسط سے دریافت فرماتی ہیں:۔

آج سے تقریباً انیس سال قبل جبکہ میری عمر تقریباً ایک سال تھی۔ میرے والد ..... نے مسمی ..... نابالغ کے ساتھ جس کی عمر اس وقت تقریباً دو سال کی تھی میرا نکاح کر دیا۔ نکاح کی قبولیت ..... مذکور کے لئے اس کے بڑے بھائی ..... نے کی۔

اب جبکہ میری عمر تقریباً بیس سال ہو چکی ہے اور لڑکا تقریباً اکیس سال کا ہے تو ہمارے آپس کے حالات اس قسم کے ہیں کہ میں کسی شکل میں بھی ..... مذکور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ میں اُسے مطلق طور پر پسند نہیں کرتی۔ میری اور اس کی طبیعت اور خیالات بالکل متضاد ہیں۔

چنانچہ میرے والدین نے میری نارضامندی کو دیکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ یہ نکاح فسخ ہو جائے۔ مگر فریق ثانی ..... ہزار روپے کی رقم بعوض طلاق طلب کرتے ہیں۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ ..... ہزار تو بجائے خود رہے ..... روپے کی ادائیگی بھی مشکل ہے۔

مجھے بالغ ہوئے تقریباً سات آٹھ سال گذر گئے ہیں اور میری زندگی برباد ہو رہی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں اپنے چند ایک خیر خواہوں کی معرفت علاقے کے مولویوں سے مسئلہ پوچھا۔ بعض کے نزدیک چونکہ یہ نکاح والد کا کیا ہوا ہے، اور والد اولاد کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ نکاح تادمِ حیات بلا طلاق کے فسخ نہیں ہو سکتا۔ چاہے میں ساری عمر گھُٹ گھُٹ کر بالآخر جان دے دوں۔

لیکن کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو اس بنا پر اس مجوزہ نکاح کو نکاح ہی تسلیم نہیں کرتے کہ وہ بغیر

میرے ایجاب و قبول اور عدم علمیت میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے فیصلہ کے مطابق میں جب چاہوں، نکاح ثانی کر سکتی ہوں۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ ہر دو میں سے کون سا فیصلہ درست ہے جو احکام خداوندی کے مطابق ہو۔ اس صورت میں مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ آپ کی طرف رجوع کروں۔ براہ کرم آپ میری حالتِ زار پر رحم فرماتے ہوئے میری مشکلات کا حل تجویز فرمائیں، اور عنداللہ ماجور ہوں۔

(یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میرا..... کے ساتھ سوائے شناسائی کے قطعی طور پر کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہوا۔ نہ ہی میں اس کے گھر گئی۔ اور نہ ہی وہ کبھی ہمارے گھر آیا۔)

جواب

یہ خط ویسے تو صرف ایک خاتون کی طرف سے ہے لیکن ترجمانی کر رہا ہے ان لاکھوں مظلوم عورتوں کی جو بھیڑ بکریوں کی طرح قصابوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔ اور جہاں پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ جو تراضیٔ مابین (فریقین کی مرضی) سے طے پاتا ہے۔ وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۴/۲۱) دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ (CONTRACT) کے لئے بالغ ہونا شرط ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے بلوغت کو نکاح سے تعبیر کیا ہے یعنی بلوغت اُسے کہتے ہیں جب لڑکا یا لڑکی نکاح کی عمر کو پہنچ جائے۔ سورۂ النسأ کے شروع میں مذکور ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم اُن کے اموال و جائیداد کی حفاظت کرو اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (۴/۶) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اُس وقت اُن کے اموال و جائیداد ان کے سپرد کر دو۔ (بشرطیکہ وہ فاتر العقل نہ ہوں) یہاں یہ حقیقت بلاشک و شبہ سامنے آ گئی کہ قرآن کی رُو سے نکاح کی عمر بلوغت کی عمر ہے۔ بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی صراحت فرما دی کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (۴/۱۹) یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ یعنی مرد اس عورت سے شادی کرے جو اُسے پسند ہو۔ (مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳)

لیکن عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے نکاح نہیں کیا جاسکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ بلوغت سے قبل نہ لڑکے کا نکاح نکاح ہے اور نہ لڑکی کا عقد عقد۔ اور یہ تلاعب بالدین (دین سے مذاق) ہے اور دُنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب۔ نکاح کے لئے ایجاب و قبول ایک لاینفک شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بچہ کا ایجاب و قبول کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ "ایجاب و قبول" کی رسم اب بھی ہمارے ہاں رائج ہے۔ لیکن جس طرح آج کل اس کی مٹی پلید ہو رہی ہے (بالخصوص لڑکیوں کے معاملہ میں) وہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں نابالغ تو ایک طرف بالغ لڑکیوں سے بھی کون پوچھتا ہے کہ تمہارا نکاح کہاں کیا جائے۔ منوسمرتی (ہندوؤں کی معاشرت) میں لڑکی کے متعلق لکھا ہے کہ اُسے ساری عمر دوسروں کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ لڑکی ہے تو ماں باپ کی، بیوی ہے تو مرد کی، بیوہ ہے تو لڑکے کے رحم و کرم پر۔ وہ دُنیا میں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ نے حضرت عائشہ رضؓ سے شادی کی تو ان کی عمر چھ برس کی تھی۔ اس لئے بچپن کی شادی جائز ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کی رُو سے بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ اور نکاح کے لئے بہرحال فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن ہماری بدبختی کہ ہمارے ہاں نکاحِ نابالغ نہ کہ مروج ہی ہے، بلکہ اُسے "عین دین" سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہندوستان میں سارداایل پیش ہوا ہے جس کی رُو سے نکاح نابالغاں ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی تو اُس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہم نوائی میں مسلمان بھی نہایت شد و مد سے شریک ہوئے! اور اس انداز سے شریک کہ گویا وہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کر رہا تھا۔ ہمارے ارباب شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے۔ مختلف فرقے، مختلف مسائل میں اپنے اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اور آپس میں ہمیشہ مصروف جدل و پیکار۔ لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی کہ سارداایل کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے، اور اس باب میں جو وفدِ عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا۔ اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے۔ یہ تمام ارباب شریعت ایک عیسائی حکمران کے حضور یہ کہنے کے لئے جا رہے تھے کہ اس ہندو کے بل کو پاس نہ کیا جائے جو نابالغوں کا

نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے۔ ان کا وقدیہ کہنے جا رہا تھا اور آسمان ان کی اس حرکت پر روتا تھا اور دُنیا ہنستی تھی۔

بہرحال یہ ہے نکاح نابالغاں سے متعلق قرآن کا فیصلہ۔ ہمیں تفصیلاً معلوم نہیں کہ ملک کا حالیہ قانون اس باب میں کیا کہتا ہے[1] اور ہمارے ہاں جو شادیاں بچپن میں کر دی جاتی ہیں۔ وہ انہیں ازخود فسخ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا اس کے لئے کسی عدالت کے فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس باب میں کسی وکیل سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ (۱۹۵۳ء)

تعدّدِ ازدواج

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:۔

ایک شخص کی بیوی موجود ہے، بچے موجود ہیں۔ گھر میں امن چین سے رہتے ہیں۔ لیکن وہ یکایک اُٹھتے ہیں تو کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ سارا گھر جہنم بن جاتا ہے۔ جب پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ شریعت نے چار تک کی اجازت دی ہے تو اس پر اعتراض کرنے والا کون ہے۔ چونکہ اس میں "شریعت کی اجازت" کا بھی سوال آجاتا ہے اسی لئے شاید وہ لوگ جو شریعت کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ دو تین، چار بیویاں دھڑا دھڑ گھر میں لے آتے ہیں۔ کیا اسلام نے واقعی اس کو یوں کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے بیویاں کرتا جائے۔

جواب

تعدد ازدواج کا رواج مسلمانوں میں اس عمومیت سے چلا آرہا ہے کہ اسے اسلام کے مسلّمات میں سے سمجھ لیا گیا ہے۔ مخالفین اس پر اعتراض کرتے ہیں تو اور مسلمان اس کی مدافعت کرتے ہیں تو۔ دونوں صورتوں میں اسے ایسا مسلّمہ سمجھ لیا جاتا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

قرآن کریم میں صرف ایک مقام پر ایک سے زیادہ بیوی کا ذکر آتا ہے اور وہ ہے سورۂ نساء کی تیسری آیت۔ اس سورہ کی دوسری آیت میں ہے:۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ

---

[1] :۔ ہم نے یہ ۱۹۵۳ء سے پہلے لکھا تھا۔ اب عائلی قوانین کی رُو سے نکاح کے لئے بلوغت کی عمر مقرر کر دی گئی ہے۔ (۱۹۶۴ء)

وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۔ (۴/۲)

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو۔ اور اچھی چیز کو ردّی سے نہ بدلو، اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ بڑا گناہ ہے۔

یہ ہے ان یتیموں کے بارے میں حکم جو صاحب مال و جائیداد ہوں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے اموال کو بطور امانت رکھو اور ان میں تصرف بیجا نہ کرو۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ قوم میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ بہت سے یتیم رہ جائیں مثلاً جنگ میں مرد ضائع ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور ان کے ساتھ یتیم بچے رہ جائیں تو قوم کے سامنے ان کی حفاظت اور پرورش کا سوال بہت اہمیت رکھے گا۔ ایسی حالت میں جو قوم ان بیواؤں اور یتیموں کا مناسب انتظام نہیں کرتی وہ اپنے نظام معیشت اور معاشرے میں ایسی خرابیوں کی ذمہ دار بن جاتی ہیں جس سے تمام معاشرے میں فساد ہی فساد رونما ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اگر نوجوان بیوہ عورتوں کو بلا سرپرستی چھوڑ دیا جائے تو اس سے بہت سی خرابیوں کے جراثیم پھیل جانے کا احتمال ہوتا ہے اگر یتیم بچوں کی کفالت کا مناسب انتظام نہ کیا جائے تو وہ یا تو بھکاری بن جائیں گے یا عادی جرائم پیشہ۔ جب کسی قوم میں بعض ہنگامی حوادث کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس صورتِ حالات کا کیا علاج کیا جائے۔ قرآن نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ (۴/۳)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، نکاح کر لو۔ دو، تین، چار تک۔

سارے قرآن میں یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازواج کا ذکر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اجازت غیر مشروط و غیر مقید نہیں۔ بلکہ اس آیت کی ابتدا ہی ایک شرط سے ہوتی ہے۔ یعنی وَاِنْ خِفْتُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو) اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى ۔ (کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے) تو تمہیں اس امر کی اجازت ہے کہ چار کی حد تک بیویاں کر لو۔ اور اس طرح معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے بچا لو جو ان بیوگان کو

بلا سرپرست اور ان کے یتیم بچوں کو بلا وارث چھوڑنے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان سے نکاح کر لینے کی شکل میں یہ "محصنات" (قلعہ کے اندر محفوظ ہو گئیں) اور ان کے بچے بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہو گئے۔ اب وہ اپنے آپ کو "یتیم خانے" کی غیرت کش فضا میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے گھر میں خیال کریں گے۔ قرآن نے اس مصیبت کا یہ حل تجویز کیا ہے چونکہ یہ ایک قومی مسئلہ کا حل ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس امر کا فیصلہ بھی قوم ہی کر سکتی ہے کہ اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے ہیں یا نہیں جن میں ایک مرد کی کفالت میں ایک سے زیادہ عورتیں دیدینے کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے۔ اگر اسلامی نظام سمجھ لے کہ ایسا وقت آگیا ہے تو وہ اس قسم کا قانون نافذ کر دے گا اور اس وقت ایک ملی ضرورت کے پیش نظر تعدد ازواج جائز ہو جائے گا۔ جب وہ ہنگامی ضرورت ختم ہو جائے گی تو پھر وہی عام حالات عود کر آئیں گے۔ جن میں اصولی طور پر ایک ہی بیوی کی اجازت ہو گی۔

اِن ہنگامی حالات میں بھی ہر شخص کو اجازت نہیں ہو گی کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں اپنے نکاح میں لائے۔ یہ اجازت صرف اُسے دی جائے گی جو اس کا اہل ہو گا کہ سب بیویوں کی ضروریاتِ زندگی کا منصفانہ بوجھ اٹھا سکے۔ چنانچہ آیت مذکورہ کا اگلا ٹکڑہ یہ ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ (۴/۳) اور اگر تم کو ڈر ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عدل سے مفہوم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیوی سے لگاؤ کا تعلق جذبات سے ہے اور یہ مشکل ہے کہ انسان "جذبات کی تقسیم" بھی مساویانہ کر سکے۔ چنانچہ خلاقِ فطرت نے خود اس کی شہادت دی کہ :-

وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ۔ (۴/۱۲۹)

"تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہش مند کیوں نہ ہو۔ یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ تم عورتوں میں (ہر معاملہ میں) عدل کر سکو گے۔"

اب یہاں ایک الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے ہنگامی حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ تم ان میں عدل کر سکو اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکو گے۔ یہ تو عجیب بات ہوئی۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ایک طرف تو اجازت دی اور دوسری طرف اس اجازت کو ایک ناممکن شرط سے مشروط کر دیا۔ بھلا اس اجازت سے فائدہ کیا جو ناممکن العمل ہو؟ لیکن قرآن نے

اِسے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ جس عدل سے تعدد ازدواج مشروط ہے اس عدل سے مفہوم کیا ہے ؟ اس نے کہا ہے کہ یہ تو تمہارے بس کی بات نہیں کہ تم قلبی لگاؤ میں بھی میزان کے دونوں پلڑے برابر رکھ سکو۔ اس لئے تم سے جس عدل کا تقاضا ہے وہ یہ ہے کہ :۔

فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ (۴/۱۲۹)

پس ایسا نہ کرو کہ ایک طرف ایسا جھک جاؤ کہ دوسری "معلقہ" بن کر رہ جائے۔

"معلقہ" اس عورت کو کہتے ہیں کہ جو نہ تو بیوہ ہو، نہ مطلقہ ، نہ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر سکے اور نہ ہی اُس کا خاوند اس کا حق ادا کرے۔ اور اس طرح بین بین لٹکی رہے یعنی جن امور پر تم قدرت رکھتے ہو اُن میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کرو۔ اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تمہارا طبعی میلان تمہیں اس مساویانہ سلوک پر قادر نہ رکھ سکے گا تو پھر ایک سے زیادہ بیوی کو اپنے نکاح میں مت لاؤ۔

یہ ہیں تعدد ازدواج سے متعلقہ قرآنی احکام۔ ان سے واضح ہے کہ :۔

۱۔ اسلام میں تعدد ازدواج۔ اصولِ معاشرت نہیں بلکہ ایک استثناء ہے۔

۲۔ یہ استثناء ایسے ہنگامی حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ جن میں عورتوں اور لاوارث یتیموں کی تعداد بڑھ جائے اور وہ عام معاشرے کے لئے ایک مشکل بن جائے۔

۳۔ ایسے حالات میں اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ ان لوگوں کو جو ایک سے زیادہ خاندانوں کی کفالت کی استطاعت رکھتے ہوں، ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ معاشرہ کا یہ مشکل مسئلہ حل ہو جائے۔

۴۔ یہ اجازت بھی اس شرط سے مشروط ہوگی کہ (قلبی میلان کے علاوہ) وہ تمام بیویوں سے مساویانہ سلوک کر سکنے کا اہل ہو۔

۵۔ اس صورت میں اس ہنگامی قومی مسئلہ کا حل ہو جائے گا

یہ ہے قرآن کی رُو سے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت اور وہ ہے مسلمانوں کا عمل۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ان کے اس عمل کو جس کی رُو سے جس کا جی چاہے دھڑا دھڑ بیویاں کرتا چلا جائے قرآنی اجازت سے کیا نسبت ہے ؟ ظاہر ہے کہ قرآنی اجازت کو اپنی حوس رانیوں کی تسکین کے لئے ایک مقدس بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ چار کے بعد سب سے بڑی (یعنی پہلی) بیوی کو طلاق دیکر الگ کر دیا جاتا

ہے، اور اس کی (VACANCY) میں ایک اور دوشیزہ بھرتی کرلی جاتی ہے اور یہ تو محض "بیویوں" کا تذکرہ ہے لونڈیوں پر تو تعداد کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایک ایک محل سے ہزاروں کے قافلے برآمد ہو جاتے ہیں اور تماشہ یہ کہ انہیں بھی عین شریعت حقہ کے مطابق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے دور ملوکیت کی وہ خود ساختہ شریعت جس نے ہمیں کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا اور جسے خیر سے ہمارے "مدعیانِ شریعت" اب بھی دنیا میں رائج کرنے کے متمنی ہیں۔ تفصیل اس کی کسی دوسرے مقام پر ملے گی۔ جہاں غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔)

بہرحال اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف سورۂ النساء کی تیسری آیت میں ہے، اور اس آیت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی۔

اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت ہے۔

جو شخص ایک بیوی کی موجودگی میں اور شادی کرلے، اُس سے ذرا پوچھئے کہ اس نے اس شرط کو پورا کر لیا ہے اور پھر ساتھ ہی ذرا جائزہ لیجئے۔ ان "مقدس حرم سراؤں" کا جن میں ہر سال یوں بیویاں بدلتی رہتی ہیں۔ جیسے نئے سال کا کیلنڈر۔ اور پھر سوچئے کہ انہوں نے اپنی کامجوئیوں کے لئے کس طرح "مذہب" کو آڑ بنا رکھا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۱۹۵۳ء)

دُوسری بیوی

ایک محترمہ خاتون لکھتی ہیں کہ تعدد ازدواج کے سلسلہ میں جو کچھ عام طور پر لکھا گیا ہے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے میں نے عائلی قوانین کو بھی دیکھا ہے۔ طلوعِ اسلام میں اس ضمن میں جو کچھ شائع ہوا ہے وہ بھی میری نظر سے گذرا ہے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک عورت کے نقطۂ خیال سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی زحمت کسی نے نہیں اٹھائی۔ سوال یہ ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں جب دوسری بیوی لائی جاتی ہے تو پہلی بیوی پر اس سے کیا گذرتی ہے؟ ایک وفاشعار بیوی کے نزدیک دنیا کی سب سے قیمتی متاع اس کا خاوند ہوتا ہے اور وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ اس کی اس متاع میں کوئی دوسرا شریک ہو۔ آپ اِسے رقابت کہہ لیجئے، حسد کہہ لیجئے، اس کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورت اُسے قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ شاید آپ یہ کہہ دیں کہ دوسری بیوی اِسے کس طرح برداشت کر لیتی ہے؟ تو یہ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ میں اِس متاع کو اُس پہلی بیوی سے چھین کر اپنے قبضے میں کر رہی ہوں۔ نیز، وہ پہلی بیوی کے سر پر چڑھ کر آتی ہے۔ اِس لئے اس کا جذبۂ برتری بھی اس کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ پہلی بیوی سے اس کی متاع بھی چھنتی ہے اور اس کے جذبۂ برتری کو بھی سخت ٹھیس لگتی ہے۔ اس دوسری بیوی سے اُس وقت پوچھنا چاہیئے جب اُس کے اوپر ایک اور بیوی آجائے۔ اصل یہ ہے کہ دوسری بیوی کے آنے سے پہلی بیوی، اپنے آپ کو دھتکاری ہوئی اور پھینک دی ہوئی شے سمجھنے لگتی ہے اور اس کی پوزیشن بھی ایسی ہی رہ جاتی ہے۔ اس لئے یہ احساس اُسے ایک سیکنڈ کے لئے بھی چین نہیں لینے دیتا۔ وہ اُسے برداشت اس لئے کر لیتی ہے کہ وہ بے حد مجبور اور بے اُسرا ہوتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ

ایسی صورت میں طلاق لے سکتی ہے۔ لیکن آپ سوچیئے تو سہی کہ وہ طلاق لے کر کرے گی کیا اور جائے گی کہاں؟ دوسری بیویاں عام طور پر اس وقت لائی جاتی ہیں جب پہلی بیوی ادھیڑ عمر کی ہو چکی ہو۔ آپ سوچیئے کہ اس عمر کی عورت جس کے چار پانچ بچے بھی ہیں، طلاق لے کر کہاں جائے گی؟ اس لئے وہ اس جہنم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتی ہے۔ نیز طلاق کے لئے کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ یہ تھوڑا ہے کہ اچھی بھلی بیوی سے یہ کہا جائے کہ یا سوت قبول کرو یا طلاق لو۔

آپ کہتے ہیں کہ نکاح کی بنیادی شرط یہ ہے کہ میاں بیوی میں خیالات اور مزاج کی یکسانی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو گھر جہنم بن جائے گا۔ میں دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ جب ایک مرد، اپنی پہلی بیوی کے باوجود، دوسری بیوی لاتا ہے تو کیا اس پہلی بیوی اور اس کے خاوند میں خیالات اور مزاج کی یکسانی باقی رہ جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن ہے۔ سو اگر نکاح کی بنیادی شرط خیالات وغیرہ کی یکسانی ہے تو اس جوڑے کی باقی زندگی میں یہ شرط کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ کیا جس شرط کی ضرورت شادی کی ابتدا میں تھی۔ آگے جا کر اس شرط کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

آپ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کا حکم ہے کہ جب تمہیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو جانے کا اندیشہ محسوس ہو تو تم ثالث مقرر کر کے ان میں مصالحت کی کوشش کرو اور اگر دیکھو کہ ان میں مصالحت کا امکان نہیں تو انہیں علیحدہ کر دو۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسری بیوی لاتا ہے تو پہلی بیوی کے ساتھ اس کی ناچاقی میں کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے؟ ایسی صورت میں، یہ ثالث ان میں مصالحت کی شکل کیا پیدا کر سکتے ہیں۔ بس یہی کہ عورت کو سمجھایا (بلکہ ڈرایا) جائے کہ اپنے خاوند سے لڑائی مول لے کر تم کس طرح گزارہ کر سکتی ہو۔ اور طلاق لے کر کہاں جاؤ گی۔ لہٰذا تمہارے لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ تم "آرام و چین" سے اس گھر میں رہو۔ کیا مصالحت اسی کو کہتے ہیں؟ اور کیا اس سے یہ گھر واقعی جنت کا نمونہ بن جائے گا اور اس عورت کی زندگی واقعی آرام و چین سے گزرے گی؟

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض علاقوں میں ایک سے زیادہ بیویوں کا عام طور پر رواج ہوتا ہے۔ وہاں عورتیں اس کا خیال بھی نہیں کرتیں۔ اگر یہی دلیل ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے کہ بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں، اور مرد اس کا خیال تک بھی نہیں کرتے؟ تو کیا اس رواج سے آپ کے نزدیک یہ چیز درست قرار پا جائے گی؟ یہ بات تو آپ مجھ سے

بہتر جانتے ہیں کہ جو صورت افراد میں پختہ "عادت" کی ہوتی ہے۔ وہی شکل قوموں میں رواج کی ہوتی ہے۔ نہ "عادت" پوری کرنے میں سوچ بچار، عقل وفکر اور جذبات واحساسات کو کوئی دخل ہوتا ہے، وہ خود بخود سرزد ہوتی جاتی ہے، نہ رواج پر عمل کرنے میں غور وفکر کو کام میں لایا جاتا ہے۔ رواج تو ایک رَو ہوتی ہے۔ جس میں سب بہے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا رواج کوئی سند یا دلیل نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر پوزیشن یہ اختیار کر لی جائے کہ عورت کی اپنی حیثیت کچھ نہیں اور یہ مرد کی مرضی کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اُسے اس کا حق ہی نہیں کہ وہ اپنے احساسات اور جذبات کی رعایت طلب کرے یا اپنے کچھ حقوق سمجھے تو اس صورت میں مرد خواہ دوسری شادی کرے اور خواہ اُسے دھکے دے کر نکال باہر کرے۔ یہ سب ٹھیک ہوگا۔ لیکن اگر حقیقت یہ ہے کہ عورت کی بھی پوزیشن ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہے اور اس کے دل کا احترام بھی ضروری ہے تو پھر پہلی بیوی کے سر پہ دوسری بیوی لے آنا، ایک وفاشعار عورت پر اتنا بڑا ظلم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

یہ میرے دل کی ایک خلش ہے جسے میں نے اس طرح آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ کیا آپ میرے اطمینان کی کوئی صورت پیدا کر دیں گے؟ میں آپ کی شکر گذار ہوں گی۔

جواب

عزیزہ بہن! ہمیں عورت کے ان جذبات کا پورا پورا احساس ہے جن کی ترجمانی آپ نے اس عمدگی سے کی ہے۔ جن حالات میں قرآن کریم نے تعدد ازواج کا ذکر کیا ہے۔ انہیں سمجھ لینے اور پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس قسم کے خدشات کا امکان نہیں رہتا۔ یاد رکھیئے! جس خدا نے قرآن نازل کیا ہے وہ مردوں اور عورتوں دونوں کا یکساں خدا ہے۔ اس لئے اس میں (معاذاللہ) ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ وہ مردوں کی رعایت سے عورتوں کے جذبات کو کچل کر رکھ دے۔ اس نے مردوں اور عورتوں کو ایک ہی صف میں رکھا ہے۔

ہم لوگ جنگ کے حوادث سے محفوظ رہے ہیں (یہ غنیمت ہے) اس لئے ہمیں اس کا عملی تجربہ نہیں کہ جنگ میں حالات کس قدر غیر معمولی ہو جاتے ہیں اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے کس قسم کی غیر معمولی تدابیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ تدابیر ہی غیر معمولی نہیں ہوتیں بلکہ اس دوران میں،

قوم کے جذبات بھی عام جذبات سے ہٹ کر غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف نفرت اور انتقام کے جذبات آنہائی شدت اختیار کر جاتے ہیں تو دوسری طرف ایثار اور ہمدردی کی بھی ایسی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں جو عام حالات میں ناممکنات میں سے تصور کی جائیں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے انسانوں کی "فطرت" بدل گئی ہو۔

ایسے ہی حالات تھے وہ حالات جن سے صدر اول کے مسلمانوں (رضی اللہ عنہم) کو مدنی زندگی میں گذرنا پڑا، اور برسوں تک مسلسل اور پیہم گذرنا پڑا۔ مختصر سی جماعت اور پیہم لڑائیاں۔ نتیجہ یہ کہ قوم میں بیوگان اور یتیموں کی کثرت ہو گئی۔ ادھر مکہ سے مسلمان خواتین نے ہجرت کر کے ادھر آنا شروع کر دیا۔ اس طرح بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئیں اور مرد کم رہ گئے۔ یہ عورتیں نہ کفار اور مشرکین کے نکاح میں جا سکتی تھیں نہ اہل کتاب کے۔ یہ مسلمانوں کے گھروں ہی میں جا سکتی تھیں۔ یہ ایک ہنگامی مصیبت تھی جس سے قوم کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ بے شوہر کی عورتیں اور بچے قوم کا جزو تھے۔ اس لئے ان کی مصیبت قوم کی مصیبت تھی۔ اس قوم میں جس کی یہ مصیبت تھی مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں شامل تھے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی فکر جس قدر مردوں کو تھی اسی قدر عورتوں کو تھی۔ بلکہ عورتوں کی ہمدردیاں اپنی ان مظلوم اور بے آسرا بہنوں کے ساتھ اور بھی زیادہ ہوں گی۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان عورتوں اور بچوں کو مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا جائے۔ ان حالات میں قرآن کریم نے "ایک بیوی" (MONOGAMY) کے اصول میں، استثناء کی اجازت دی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں اکثر تو ایسا ہوا ہو گا کہ مومن عورتیں اپنی ان مظلوم بہنوں کو خود اپنے گھروں میں لے آئی ہوں گی اور جن گھروں کی عورتیں اس پر رضامند نہیں ہوئی ہوں گی وہاں ان کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ہو گا۔ اس لئے کہ جب قرآن نے یہ کہہ دیا کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھو ـــــ تو پہلی بیوی کی مرضی اور منشاء کے خلاف دوسری بیوی لانے میں عدل کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو عورتیں ان گھروں میں آئی ہوں گی ان کے دل میں بھی ان خیالات کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا جنہیں لے کر آج کل ہمارے ہاں دوسری بیوی آتی ہے۔ نہ ہی پہلی بیوی کے دل میں حسد و رقابت کے جذبات بیدار ہو سکتے ہیں یا احساس کمتری پیدا ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ تم عورتوں میں

قلبی یکسانیت (کے عدل) کا سلوک کرسکو۔ لیکن ایسا نہ کرنا کہ ایک بیوی کی طرف اتنا جھک جاؤ کہ دوسری (اُدھر) لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹) ہمارے ہاں تو، دوسری بیوی کی صورت میں پہلی بیوی کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ لیکن جن حالات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان میں اس تاکید کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہو گی کہ مبادا دوسری بیوی کی یہ حالت نہ ہو جائے۔

قرآن کریم نے ان حالات میں "ایک بیوی" کے قانون میں استثناء کی اجازت دی ہے۔ کہہ دیا جا سکتا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ ان خصوصی اور ہنگامی حالات میں، نہ پہلی بیوی کے دل میں جذبات حسد و رقابت بیدار ہو سکتے ہیں نہ دوسروں کے دل میں احساسِ برتری پیدا ہو سکتا ہے۔ تو یہ خوش فہمی ہے۔ لیکن یہ خوش فہمی نہیں۔ قرآن کریم، مومنین کی جو صفات بیان کرتا ہے آج ان میں سے ہمیں ایک ایک چیز اچنبھا نظر آتی ہے اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ محض شاعر کا خواب (UTOPIA) ہے انسانوں میں اس قسم کی قلبی ماہیئت ہو نہیں سکتی۔ لیکن قرآن کریم حقائق بیان کیا کرتا ہے، شاعروں کے خواب بیان نہیں کیا کرتا۔ ہمیں وہ باتیں اس لئے اچنبھا نظر آتی ہیں کہ ہم اس قلبی تبدیلی سے آشنا نہیں، جو ایمان کی رُو سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم مومنین کی یہ صفت بتاتا ہے کہ وہ خود تنگی میں گذارہ کرتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم یہ سُن کر فوراً کہہ اٹھیں گے (اور اگر ایسا کہنے کی جرأت نہ بھی کر سکے تو دل میں ضرور کہیں گے) کہ ایسا ہونا عملاً ناممکن ہے۔ یہ انسان کی "فطرت" کے خلاف ہے۔ لیکن قرآن، ناممکنات کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اس لئے یہ بالکل ممکن ہے یا (مثلاً) وہ کہتا ہے کہ تم ہمیشہ سچی گواہی دو، خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ ہمیں یہ بات ناممکن سی دکھائی دیتی ہے ہم باور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص خود اپنے خلاف بھی گواہی دے سکتا ہے۔ لیکن ایمان، انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ اندریں حالات جب ہم کہتے ہیں کہ ان مومن عورتوں نے، ایسے ہنگامی حالات میں اپنی مظلوم اور بے آسرا بہنوں کی باعزت حفاظت کا سامان خود کیا ہو گا اور اس سے گھروں میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی ہو گی۔ تو یہ محض "خوش فہمی" نہیں۔ ایمان ایسا کچھ کر سکتا ہے اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو کیا آپ باور کر سکتی ہیں کہ قرآن ایسی شکل پیدا کرنے کی اجازت دے دیتا جس میں بے آسرا عورتوں کی پناہ دہی کے لئے بستے رستے گھروں کو اجاڑ دیا جائے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ (خواہ ہنگامی حالات کیسے ہی کیوں نہ نمودار ہو جائیں) جس دوسری شادی میں پہلی بیوی کی دل آزاری ہوتی ہو، اُس

سے گھر کے اُجڑ جانے میں کوئی شُبہ نہیں رہتا۔

ایسی شادی جس میں پہلی بیوی کا دل دُکھے، کیا حیثیت رکھتی ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگ سکتا ہے کہ:

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آں حضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جس سے اُسے دُکھ پہنچے گا۔ مجھے بھی اذیت ہوگی۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہ کیا۔ (سیرۃ النبیؐ۔ مولانا شبلیؒ

جلد دوم۔ صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

امید ہے ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ آپ کے دل کی خلش ہمارے ہاں کے غلط رواج کی پیدا کردہ ہے جس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم (اور رسول اللہؐ کا مندرجہ بالا عمل) حقیقت کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ (۱۹۶۱ء)

مہر اور متعلقاتِ مہر

ایک صاحب صدر کراچی سے لکھتے ہیں:۔

۱۔ کیا نکاح کے لئے مہر ضروری چیز ہے؟

۲۔ کیا اس کی کوئی مقدار قرآن شریف یا حدیث کی رُو سے مقرر ہے؟

۳۔ اگر کوئی مقدار مقرر نہیں ہے تو کس بناء پر مقرر کیا جائے؟

۴۔ کیا یہ لڑکے یا لڑکی کی حیثیت پر مقرر کیا جاتا ہے؟

۵۔ مہر کا مقرر کرنا لڑکی یا لڑکی کے وارثوں کا حق ہے یا اس میں لڑکے یا لڑکے کے وارثوں کا بھی دخل ہے؟

۶۔ عام طور پر دیہات میں ملّا یہ کہتا ہے کہ بتیس روپے چار آنے شرعی مہر ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

۷۔ کیا نکاح کے وقت مہر مقرر کرنے کے بعد کم و بیش ہو سکتا ہے اور اس صورت میں نکاح قائم رہتا ہے یا نہیں، جبکہ نکاح (معاہدہ) کی یہ شرط توڑ دی جائے اور مہر مقرر کیا جائے۔ مہربانی فرما کر قرآن شریف کی رُو سے ارشاد فرمائیں۔ اگر کوئی حدیث اس کے موافق یا مخالف ہو تو اس کا بھی ذکر کریں۔

جواب

قرآن کریم کی رُو سے مہر نکاح کے لئے ضروری شرط ہے۔ مہر کا لفظ تو قرآن میں نہیں آیا۔ لیکن اُس نے اس کے لئے دوسرے الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً اجور، صدقۃ اور متاع اور اسے مال سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں جہاں نکاح کے احکام آئے ہیں وہاں کہا۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ (۴/۲۴)

تمہارے لئے ان عورتوں کے علاوہ (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) اور عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ بشرطیکہ تم انہیں اپنے مال سے مطلب کرو اور اس سے مقصد نکاح کی پابندیاں ہوں نہ کہ محض شہوت رانی۔

لیکن قرآن کریم کی ایک آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے مہر متعین نہ کیا جا سکا ہو تو اس سے نکاح میں خلل واقع نہیں ہوگا۔ یعنی نکاح بلا تعیین مہر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

۱۔ جن عورتوں کو تم نے چھوا نہیں اور نہ ہی ان کا مہر مقرر کیا ہے انہیں طلاق دو تو کچھ سامان دے دو۔ (۲/۲۳۶)

۲۔ یہ مہر کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ ایک تحفہ ہوتا ہے جسے خاوند بیوی کو پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نساء کے شروع میں ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (۴/۴) تم عورتوں کو ان کے مہر تحفۃً ادا کر دو۔ جس طرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے خیال کے چھتے میں شہد جمع کر دیتی ہے۔

۳- مہر کی کوئی مقدار قرآن نے متعیّن نہیں کی۔ جو رقم بھی لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی سے طے پاجائے وہی مہر ہے۔ لیکن چونکہ یہ رقم وہ ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے اس لئے یہ لامحالہ علیٰ قدرِ وسعت ہی ہوسکتی ہے اور وسعت کے لحاظ سے یہ دولت کا ڈھیر بھی ہوسکتا ہے۔

وَ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا۔ (۴/۲۰)

اگر تم نے اِسے ایک ڈھیر بھی دے دیا ہو تو اُس سے وہ بھی واپس نہ لو۔

۴- مہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہو جانی چاہیئے۔ لیکن قرآن کی ایک آیت سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس میں توقف ہوسکتا ہے۔ لیکن توقف کے معنی یہ ہیں کہ جب بھی عورت مطالبہ کرے اس کو ادا کرنا ہوگا۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس میں یہ آیا ہے کہ اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو، قبل اس کے تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو تو اس صورت میں مقررہ شدہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ (۲/۲۳۷)

۵- مہر عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ وہ اُسے اس ملکیت سے محروم کردے۔ البتہ باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے اور چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحۡلَةً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَكُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡهُ نَفۡسًا فَكُلُوۡهُ هَنِیۡٓـًٔا مَّرِیۡٓـًٔا۔ (۴/۴)

اور عورتوں کو اُن کے مہر بطور تحفہ ادا کر دیا کرو۔ لیکن اگر وہ بطیب خاطر اپنی طرف سے تمہیں کچھ چھوڑ دیں تو تم اُسے ہنسی خوشی لے سکتے ہو۔

اسی طرح (۴/۲۴) میں بھی باہمی رضامندی سے کمی بیشی کا ذکر ہے اور (۲/۲۳۷) میں معاف کر دینے کا بھی۔ لیکن یاد رہے کہ یہ کچھ عورت کے دل کی رضامندی سے ہوگا۔ کسی قسم کے جبر و اکراہ سے نہیں ہوسکتا۔

۶- اگر کوئی شاذ صورت ایسی پیش آجائے جس میں مہر مقرر نہ کیا جاسکا ہو تو اُسے بعد میں لڑکے کی وسعت اور معاشرہ کے عام رواج کے مطابق مقرر کر لینا چاہیئے۔ اس کیلئے آیت (۲/۲۳۶) میں تصریح موجود ہے۔

۷۔ جسے آج کل شرعی مہر (یعنی بتیس روپے کہا جاتا ہے) وہ محض ایک رواجی چیز ہے۔ بعض علاقوں میں اسے فاطمی مہر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کی رُو سے یہ بھی غلط ہے۔ تاریخی شہادت کے مطابق حضرت فاطمہؓ کا مہر قریب چار سو اسی درہم کے تھا جو بتیس ۳۲ روپے سے کہیں زیادہ بیٹھتا ہے۔

بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن نے اس کی کوئی مقدار متعین نہیں کی۔ باقی رہے وُہ لوگ جو نہایت فخر سے لاکھ روپے کا مہر باندھتے ہیں اور یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کہ اُسے دینا تو ہے ہی نہیں تو وہ لوگ خدائی حکم سے مذاق کرتے ہیں اور رسول اللہ (صلعم) کی ایک حدیث ہے کہ جو شخص مہر باندھے اور نیّت یہ رکھے کہ اُسے ادا نہیں کرنا تو وہ زانی ہے۔ (۱۹۵۵ء)

طلاق

سوال

طلاق کے قرآنی احکام کیا ہیں۔ براہ مہربانی تفصیل سے بیان فرمایئے یہ جو ہمارے ہاں طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر عورت کو میکے بھیج دیا جاتا ہے، اس کی اصلیت کیا ہے۔

جواب

طلاق کے معنی ہیں نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد و عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا، اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ جب جی چاہے اپنی مرضی سے طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو مابہ النزاع معاملات میں تصفیہ کے لئے قائم ہو۔ اُسے حکومت یا عدالت کہا جاتا ہے) چنانچہ اس باب میں اس نے کہا ہے کہ:۔

> اگر تم میاں بیوی میں باہمی اختلاف۔ جھگڑے۔ یا مخالفت و عداوت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۳۵)

اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس نظام یا عدالت کے پاس بھیجنی ہو گی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے اور اس کی شرائط کیا ہوں گی (ان شرائط کا ذکر آگے آتا ہے) چنانچہ سورۂ طلاق کی پہلی آیت یوں ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ ..... (۶۵/۱)

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ....

یہاں طلاق دینے کا حکم نبی کو دیا گیا ہے اور طَلَّقْتُمُ میں صیغہ جمع کا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کے طلاق کے مقدمات میں فیصلہ دینے کا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں حضور کو حاکم بنائیں (۴/۶۵) مرکز میں یہ فیصلے رسول اللہ خود کرتے تھے اور بیرونی مقدمات میں افسرانِ ماتحت جنہیں قرآن نے اولوالامر منکم کہا ہے (۴/۵۹) رسول اللہ کی وفات کے بعد یہی فریضہ حضورؐ کے جانشین (خلفاء) سرانجام دیتے تھے۔ لہذا طلاق کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ خاوند یا بیوی کا اپنے اپنے طور پر نہیں۔ عدالت کو یہ فیصلہ اس وقت دینا چاہیئے جب عورت ایامِ حیض سے فارغ ہو چکی ہو۔ کیونکہ اس وقت سے عدت کا شمار ہو گا (۶۵/۱) اور عدت عام حالات میں تین حیض تک ہوتی ہے (۲/۲۲۸)۔ (عدت کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)

جب ان دونوں میں اس طرح طلاق واقع ہو جائے تو عدت کے دوران میں عورت کسی اور مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر یہ دونوں باہمی صلح کا ارادہ کر لیں تو سابقہ مرد اس مدت کے اندر بھی اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ (۲/۲۲۸)۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ عدت کے دوران میں عورت پر تو اس کی پابندی ہے کہ وہ کسی اور مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی پابندی نہیں۔ وہ چاہے تو طلاق کے دوسرے ہی دن کسی اور عورت سے شادی کر لے۔ یہ ہے مطلب اس آیت کا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (۲/۲۲۸) کہ اور تمام باتوں میں عورتوں کے حقوق ان کے واجبات کے مطابق ہیں۔ البتہ اس ایک معاملہ میں مردوں کو ایک فوقیت حاصل ہے۔

اگر اس عدت کے دوران میں یہ آپس میں شادی نہ کریں تو عدت کی مدت گذرنے پر اس کا

اعلان کرنا ہوگا اور اس پر دو عادل گواہ بھی رکھنے ہوں گے (۶۵/۲) تاکہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے میں آزاد ہو جائے۔ واضح رہے کہ عدت کے بعد بھی یہ میاں بیوی چاہیں تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔

اگر اس میاں بیوی نے اس طلاق کے بعد پھر نکاح کر لیا تو یہ پہلی طلاق شمار ہوگی۔ اگر ان کی اس نئی ازدواجی زندگی میں پھر طلاق تک نوبت پہنچ جائے تو اُسے دوسری طلاق کہا جائے گا۔ اس دوسری طلاق کے بعد بھی انہیں اجازت ہوگی کہ یہ چاہیں تو پھر آپس میں نکاح کر لیں۔ اگر انہوں نے نکاح کر لیا۔ لیکن پھر طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔ تو یہ تیسری طلاق ہوگی۔ یعنی ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آگئی۔ اس طلاق کے بعد یہ (نہ عدت کے دوران میں، نہ ہی اس کے بعد) آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ مطلب ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم قاعدے کے مطابق عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو۔ یا حسن کارانہ انداز سے اُسے رخصت کر سکتے ہو۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

البتہ اگر تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد یہ عورت کسی اور مرد سے شادی کر لے اور ان میں بھی طلاق کی نوبت آجائے تو پھر یہ پہلے میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ (۲/۲۳۰)

یاد رہے کہ اگر مرد طلاق کے بعد اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو دل میں یہ نیت نہ رکھے کہ اس طرح اس عورت کو پھانس کر اُسے تنگ کروں گا۔ (۲/۲۳۰) اگر یہ عورت اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو دوسروں کو بھی نہیں چاہیئے کہ اُسے اس سے روکیں۔ (۲/۲۳۲) اسے اس کی آزادی ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے چاہے تو پھر سے اُس مرد سے نکاح کر لے۔

یہاں تک کشیدگی تعلقات کی اس قسم کا ذکر آیا ہے جس میں شکایت خاوند کو پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جب شکایت بیوی کو پیدا ہو تو پھر کیا صورت پیدا ہوگی۔ سورۂ نساء میں ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا رغبتی کا خدشہ ہو تو اس کے لئے پہلا قدم باہمی مصالحت کا ہونا چاہیئے۔ (۴/۱۲۸) ظاہر ہے کہ مصالحت کے لئے وہی طریق اختیار کرنا ہوگا جو بیوی کی طرف سے سرکشی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ (۴/۳۴) یعنی مصالحتی بورڈ کا تقرر۔

اگر ثالثوں کی یہ کوشش ناکام رہے تو پھر ان دونوں میں مفارقت (طلاق) کی شکل پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۱۳۰) جس کی تفصیلات پہلے گذر چکی ہیں اگر عدالت یہ دیکھے کہ مرد تو نباہ چاہتا ہے لیکن عورت کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو اس صورت میں عورت کو کچھ ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کی تصریح (۲/۲۲۹) میں کی گئی ہے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مہر اس مال کا نام ہے جسے مرد، بغیر کسی معاوضہ کے خیال کے عورت کو تحفتہً دیتا ہے۔ اسے عام طور پر نکاح کے وقت ہی ادا ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اگر عورت چاہے تو اس کی وصولی کو ملتوی بھی کر سکتی ہے۔ طلاق کے ساتھ چونکہ ازدواجی تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر مہر پہلے ادا نہ کیا گیا ہو تو اس کا فیصلہ اس مقام پر ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے قرآن کا حکم یہ ہے کہ:

ا۔ اگر عورت نباہ کرنا چاہتی ہے لیکن مرد طلاق پر مُصر ہے تو عورت کے مہر میں سے کچھ واپس نہیں لیا جا سکتا۔ (۴/۲۰)

ب۔ اگر طلاق عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل دی گئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت یا اس کا مختار کار اس میں سے کچھ چھوڑ دے، مرد پورا مہر ہی دے دے۔ (دیکھئے۔ ۲/۲۳۷)

ج۔ اگر طلاق "عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل" دی گئی ہے اور (کسی طرح) مہر مقرر نہیں ہو سکا تھا تو مرد کی وسعت کے مطابق مہر دلا دینا ہوگا۔ (۲/۲۳۶)

د۔ اگر مرد اس بنا پر طلاق دینا چاہے کہ عورت کسی بے حیائی کے کام کی مرتکب ہوئی ہے تو مہر کا کچھ حصہ روکا جا سکتا ہے (۴/۱۹) ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ عدالت کے کرنے کا ہوگا۔

ہ۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر مرد نباہ کرنا چاہتا ہے لیکن عورت علیحدگی پر مُصر ہے تو اُسے اپنے مہر میں سے کچھ رقم بطور ہرجانہ دینی ہوگی۔ (۲/۲۲۹)

عِدّت

سوال

عورت کے لئے عِدّت کیا ہوتی ہے۔ اس کی بابت قرآنی احکام سے مطلع فرمائیں۔

جواب

عِدّت اس مدّت کا نام ہے جس میں مطلقہ عورت یا بیوہ شادی نہیں کرسکتی۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے)۔ پہلی اور دوسری مرتبہ طلاق کی صورت میں عورت اپنے پہلے خاوند سے عدّت کے اندر بھی شادی کرسکتی ہے۔ یہ میعاد حسب ذیل ہے۔

ا۔ مطلقہ عورت کی عدّت تین حیض (ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ ۲/۲۲۸) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کا فیصلہ اس وقت کرنا چاہیئے، جب عورت حیض سے فارغ ہوچکی ہو تاکہ عِدّت کے شمار میں دِقت نہ ہو۔ (دیکھئے ۶۵/۱)

ب۔ جو عورتیں اتنی سن رسیدہ ہوچکی ہوں کہ وہ حیض کی طرف سے ناامید ہوں یا جنہیں کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، اُن کی عدّت (تین حیض کے بجائے) تین مہینے ہوگی۔ (۶۵/۴)

ج۔ جو عورت حمل سے ہو اس کی عدّت وضع حمل (بچے کی پیدائش) تک ہے (۶۵/۴)۔ انہیں چاہیئے کہ وہ طلاق کے وقت یہ بتادیں کہ وہ حمل سے ہیں۔ (۲/۲۲۸)

د۔ جس عورت کو "ہاتھ لگانے سے قبل" طلاق دی گئی اس کے لئے کوئی عدّت نہیں (۳۳/۴۹)

۲۔ بیوہ عورت کی عدّت چار مہینے اور دس دن کی ہے (۲/۲۳۴) اگرچہ بیوہ عورت کے لئے حمل کی صورت میں الگ حکم نہیں۔ لیکن چونکہ مطلقہ کے لئے عدت وضع حمل تک ہے (۶۵/۴) اس لئے

اس سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ بیوہ عورت کے لئے جو حاملہ ہو، عدت وضع حمل تک ہوگی۔

۳۔ عدت کے دوران میں مطلقہ عورت کے رہنے سہنے اور خورد و نوش وغیرہ کی ذمہ داری مرد پر ہوگی اور اس کا معیار وہی ہوگا جو ازدواجی حالت میں تھا، (۲/۲۴۱، ۶۵/۱، ۶۵/۶۰) لیکن اگر یہ کسی بے حیائی کے کام کی مرتکب ہو تو پھر اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ (۶۵)

۴۔ بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خورد و نوش کا انتظام ضروری ہے۔ جس کے لئے چاہیئے کہ مرد وصیت کر جائے (۲/۲۴۰) اگر وہ اس سے پہلے اپنی مرضی سے دوسری جگہ چلی جائے اور اپنا کچھ اور انتظام کر لے تو پھر یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ (۲/۲۴۰)

۵۔ عدت کے دوران میں نکاح تو نہیں کیا جا سکتا لیکن نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کی ممانعت نہیں۔ (۲/۲۳۵)

رضاعت

(دُودھ پلانا)

سوال

بچے کو کتنی مدت تک دودھ پلانا ضروری ہے۔ طلاق وغیرہ کی صورت میں بچے کس کے پاس رہنے چاہئیں؟

جواب

قرآن نے اس کے متعلق حکم نہیں دیا کہ بچوں کو اتنی مدت تک ضرور دودھ پلایا جائے۔ اس کا فیصلہ حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ اس نے سورۂ احقاف میں ضمنی طور پر کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے اسے اپنے پیٹ میں رکھتی ہے اور پھر دُودھ پلاتی ہے۔ جس میں اڑھائی سال کا عرصہ لگ جاتا ہے (۴۶/۱۵) لیکن بعض صورتیں ایسی بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن میں دودھ کی مدت کا تعلق قانونی طور پر ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور اس کی گود میں شیر خوار بچہ ہے۔ قرآن کی رُو سے اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے (اگر اس کا باپ مر جائے تو اس کے وارثوں پر (۲/۲۳۳)) وہ کہتا ہے کہ اگر وہ باہمی رضامندی سے چاہیں کہ بچے کی ماں ہی اسے دُودھ پلائے تو اُسے اس کا معاوضہ دینا ہوگا اور یہ مدت دو سال تک کی ہو سکتی ہے۔ (۲/۲۳۳) لیکن اگر وہ باہمی رضامندی سے اس سے قبل ہی دُودھ چھڑا دینا چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ (۲/۲۳۳) اور ایسا بھی کہ وہ اس کی ماں کے بجائے کسی اور سے دُودھ پلانے کا انتظام کر لے (۲/۲۳۳) نیز (۳۱/۱۴، ۶۵/۶)۔ (قانونی ضرورت کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص مر جائے اور اس کی بیوہ بچے کو دودھ پلاتی رہے تو وہ اس کے وارثوں سے اس کا

معاوضہ بذریعہ عدالت لے سکتی ہے لیکن صرف بچے کی دو سال کی عمر تک۔ اس سے زیادہ نہیں)۔

باقی رہا یہ کہ میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بچے کس کے پاس رہنے چاہئیں۔ اس کی بابت قرآن نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ حالات کے مطابق ہر انفرادی کیس میں عدالت دے گی۔ جس میں اصول یہ پیشِ نظر رکھا جائے گا کہ بچوں کی صحیح پرورش اور تعلیم کس کے پاس ہو سکتی ہے۔ نیز اس میں ماں باپ کے جذبات کا بھی لحاظ رکھنا ہو گا۔ کیونکہ میاں بیوی کے تعلقات کے منقطع ہو جانے سے اولاد کے ساتھ قلبی لگاؤ تو منقطع نہیں ہو جاتا۔

عورت سے غیر فطری مجامعت

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ بعض محدثین کے نزدیک عورت سے غیر فطری مجامعت بھی جائز ہے؟ کیا کسی جگہ اس کی تصریح مل سکتی ہے، یا یہ لغو بات ہے۔

یہ بات لغو نہیں، صحیح ہے۔ بخاری کی ایک حدیث ہے جس کی شرح بیان کرتے ہوئے علامہ بدرالدین عینی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ بحث بجنسہٖ نقل کردی جائے۔ بخاری میں ہے:-

باب قولہ تعالیٰ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ۔ الآیۃ[1]

حدثنا اسحٰق قال اخبرنا النضر بن شمیل قال اخبرنا ابن عون عن نافع قال کان ابن عمر اذا قرأ القرآن لم یتکلم حتی یفرغ منہ فاخذت علیہ یوما فقراء سورۃ البقرۃ حتی انتھیٰ الی مکان قال تدری فیما انزلت قلت لا قال نزلت فی کذا وکذا ثم مضیٰ وعن عبد الصمد قال حدثنی ابی قال حدثنی ایوب عن نافع عن ابن فأتوا حرثکم فی شئتم قال یاتیھا فی ..... رواہ محمد بن یحییٰ ابن سعید عن ابیہ عن عبید اللہ عن نافع عن ابن عمر:-

(بخاری کتاب التفسیر ج ۲ ص ۷۴۹ مطبوعہ مجتبائی)

---

[1] اس آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں پس تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہے آؤ" لیکن اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں جب چاہو آؤ"

حق تعالےٰ کے اس قول کا باب کہ ـــــ نساءکم حرث لکم فأتوا حرثکم انّی شئتم وقدموا لانفسکم۔ الآیۃ

ہم سے اسحٰق نے بیان کیا کہ ہمیں نضر بن شمیل نے خبر دی کہ ہمیں ابن عون نے نافع سے خبر دی کہ ابن عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے تو فارغ ہونے تک بولتے نہیں تھے۔ مَیں ایک روز قرآن کریم ہاتھ میں لے کر ان کے سامنے بیٹھا اور انہوں نے سورۂ بقرہ پڑھی حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے "جانتے بھی ہو کس بارہ میں نازل ہوئی تھی؟" مَیں نے جواب دیا کہ نہیں تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیئے اور عبدالصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (اسختیانی) نے بیان کیا کہ نافع سے انہوں نے ابن عمرؓ سے کہ فأتوا حرثکم انّی شئتم کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے ..... میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحییٰ ابن سعید نے بھی بیان کیا ہے۔ اپنے باپ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمرؓ سے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ حدیث کے متن اور ترجمہ دونوں میں اُس مقام پر (نقطے) دیئے گئے ہیں جہاں سے اصل بات واضح ہونی تھی۔ بخاری میں اس مقام پر جگہ خالی چھوڑی ہوئی ہے اور یہیں سے اِس بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں:۔

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوڑی ہوئی ہے۔ یعنی فی کے بعد۔ حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قبلہا یعنی اپنی بیوی کی شرمگاہ میں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابوقلابۃ الرقاشی سے انہوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انہوں نے یاتیہا فی الدبر (اپنی بیوی سے دُبر میں جماع کرے) کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری)

اِسی ضمن میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

ابن العربی نے سراج المریدین میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا

ہے اور کہا ہے یا تیجھا تی ..... اور خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔
اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث عورت سے دُبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارہ میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ جو جابر کی حدیث میں آرہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر رد کرنے کے لئے جیسا کہ دوسری حدیث میں آرہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ عموم جب کسی خاص سبب پر وارد ہوتا ہے تو بعض اصولیوں کے نزدیک وہ اسی پر محصور رہتا ہے۔ اگرچہ اکثر اصولیوں کے نزدیک عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ یہ اصول اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ آیت جواز میں حجت ہو۔ لیکن بہت سی حدیثیں اس کی ممانعت کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں۔ لہذا وہ حدیثیں آیت کے عموم کے لئے مخصص ہو جائیں گی۔ اگرچہ عموم آیت کی کسی خبر واحد سے تخصیص کرنے کے بارہ میں بھی علماء کے اندر اختلاف ہے اور آئمہ حدیث میں سے ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے جیسے امام بخاریؒ، ذہلی، بزار، نسائی اور ابو علی نیشاپوری وغیرہ کہ اس بارہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ (فتح الباری)

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک اس مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہے۔ بعض اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور بعض اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں۔ اب علامہ عینی کی مزید تشریح ملاحظہ کیجئے۔

ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ اس کو بہت بڑی جماعت نے جائز کہا ہے۔ ان سب اقوال کو ابن شعبان نے اپنی کتاب "جماع النسواں" میں جمع کر دیا ہے اور اس کے جواز کو صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کی طرف

منسوب کیا ہے اور بہت سی روایتوں سے امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی ہے۔
اور ابو بکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ امام مالکؒ سے اس کی اباحت مشہور ہے اور امام مالکؒ کے اصحاب اس کا انکار محض اس کی شناعت اور قبح کی وجہ سے کر دیتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ کی یہ بات اس قدر مشہور ہے کہ ان لوگوں کے انکار سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔

محمد بن سعد نے ابو سلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالکؒ بن انس کی خدمت میں حاضر تھا۔ ان سے مجامعت فی الدبر کے بارہ میں کہا گیا تو انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر مارا اور فرمایا کہ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ میں نے کسی آدمی کو نہیں پایا جس کی میں دین کے بارہ میں پیروی اور اقتدا کر سکوں اور وہ اس کے حلال ہونے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت سے اس کے دُبر میں جماع کرنے کے بارہ میں۔ اس کے بعد امام مالکؒ نے یہ آیت پڑھی۔ نساءکم حرث لکم فاتوا حرثکم انّٰی شئتم۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز واضح ہوگی اور میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب، اس بارہ میں تو امام طحاویؒ نے فرمایا ہے۔ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انہوں نے امام شافعیؒ کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ (عینی)

یعنی امام مالکؒ تو یقینی طور پر اس کے حلال ہونے کے قائل اور اس پر کاربند بھی تھے اور امام شافعیؒ کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے امام محمدؒ (شاگرد امام اعظمؒ) سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

امام حاکم نے مناقب شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارہ میں امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسن

کے درمیان ہوا۔ ابن الحسنؒ نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر سے استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام محمدؒ بن الحسنؒ نے اس کو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں وغیرہ کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہوگی؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں ان جگہوں پر کھیتی نہیں ہوگی۔ امام شافعیؒ نے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہوگا؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ پھر تم جس بات کے خود بھی قائل نہیں اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حکم نے کہا ہے کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قولِ قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں۔ کیونکہ اپنے قولِ جدید میں اس کے حرام ہونے کی انہوں نے تصریح کی ہے۔

(فتح الباری)

یہ ہے وہ بحث جو اس باب میں شروحِ بخاری میں وارد ہوئی ہے اور جسے ہم نے بادلِ ناخواستہ نقل کیا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ باتیں سچ مچ ان بزرگوں کی ہیں جن کی طرف انہیں منسوب کیا گیا ہے تو دنیا اُن کے متعلق کیا کہے گی اور اگر یہ چیزیں ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں تو ان کتابوں کو کیا کیا جائے جن میں یہ مذکور چلی آتی ہیں اور جن کے متعلق ہمارے "علمائے کرام" کا ارشاد ہے کہ ان کا علم حاصل کئے بغیر دین سمجھ میں نہیں آسکتا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کو چھوڑ دینے سے قوم کہاں جا پہنچی ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی! (۱۹۵۳ء)

عورتیں اور اکتسابِ رزق

سوال

کیا قرآن کی رُو سے عورتیں اکتسابِ رزق کر سکتی ہیں۔ یعنی (EARN) کر سکتی ہیں۔ یا یہ کام صرف

مردوں کے لئے مخصوص ہے؟

جواب

کیوں نہیں کر سکتیں۔ قرآن کریم کا فیصلہ اس باب میں واضح ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (۴/۳۲)۔ مرد جو کچھ کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کچھ کمائیں وہ اُن کا حصہ۔ علاوہ بریں، جو کچھ عورت کو ورثہ میں ملے، وہ اس کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ اس باب میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (۴/۷)

مردوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو ان کے والدین اور اقربا چھوڑیں اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو اُن کے والدین اور اقربا چھوڑیں خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ حصہ مقرر ہے۔

اسی طرح مہر بھی عورت کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ میاں بیوی کے باہمی تعاون اور رفاقت کی بات اور ہے ورنہ قرآن کریم عورت کو مرد کا معاشی محتاج نہیں بنانا چاہتا۔ (۱۹۶۱ء)

عورتوں کا حقِ مشاورت

سوال

اسلامی حکومت باہمی مشورے سے قائم ہوگی۔ لیکن اگر یہ مشورہ مردوں تک ہی محدود ہو تو ملک کی آدھی آبادی حقِ مشاورت سے محروم ہو جائے گی۔ کیا اسلام میں جمہوریت کا یہی تصور ہے؟

جواب

اسلامی حکومت میں عورتیں حقِ مشاورت سے محروم نہیں قرار دی جا سکتیں۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے

کہ وَ اَمۡرُھُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَھُمۡ (۴۲/۳۹) اُن کی حکومت مشاورت پر مبنی ہوگی۔ تو وہاں اس مشاورت کو مردوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا۔ وہاں تمام مومنوں کا ذکر ہے جن میں مرد اور عورت سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں قرآن نے تمکّن فی الارض۔ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کا ذکر کیا ہے، وہاں بھی یہ تخصیص نہیں کی کہ یہ جماعت مومنین میں سے صرف مردوں کا حق ہے۔ عورت کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ (۲۲/۴ - ۹/۷۱) (سنہ ۱۹۶۳ء)

ماں باپ کی اِطاعت

ایک نوجوان رقمطراز ہے :-

میرے ماں باپ نے میری شادی اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اب وہ میری بیوی سے ناراض ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں طلاق دے دوں۔ یا اس سے ناروا سلوک کروں۔ حالانکہ میری بیوی سے میرے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ میں اس پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو ماں باپ کا فرمانبردار نہیں، اس لئے تو خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جائے گا۔ براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ قرآن کی رُو سے اس باب میں کیا علم ہے۔

جواب

انسان کی حالت یہ ہے کہ خود ہی پتھر کے نیچے اپنا ہاتھ دے لیتا ہے اور پھر خود ہی چلّاتا ہے۔ قرآن نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے۔ وہ کہتا ہے انہوں نے تمہاری اس وقت پرورش کی تھی۔ جب تم دوسروں کے محتاج تھے۔ اب یہ کبرسنی کی وجہ سے تمہارے محتاج ہیں۔ اس لئے تم ان کی پرورش کرو۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن تم انہیں جھڑکو نہیں بلکہ ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ بس یہ ہے ماں باپ کے متعلق قرآن کا ارشاد، کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن جو ہر نئی نسل کو آزاد پیدا کرتا ہے اور انہیں اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق آپ راہیں تلاش کرے اور اپنے مقدّرات کے ستارے کو تراشے، وہ ابھرنے اور بڑھنے والی نسلوں کو ان کے فیصلوں کا متبع قرار دے گا جن کا زمانہ بدل چکا ہے؟ قرآن جو انسانیت کو حریتِ فکر و عمل کا درس دینے کے لئے آیا ہے۔ انسان کو کبھی گذرے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا۔ اس نے خود کہا ہے کہ عمر کی زیادتی سے انسان کی عقل معکوس (اوندھی) ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کیا وہ یہ حکم دے گا کہ

یصح الدماغ نوجوان اُن کے فیصلوں کے مطابق چلے جن کی عقل اوندھی ہو چکی ہے ؟ یقیناً یہ قرآن کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآنی تعلیم کا اسی ایک مسئلہ میں باقی مذاہب اور مکاتب اخلاق سے مقابلہ کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآنی تعلیم کس قدر شرفِ انسانی کے مطابق اور ارتقائے آدمیت کے لئے مؤید ہے۔ دُنیا کے تمام مذاہب اور اخلاق کے دبستانوں میں یہ چیز ایک ایسے مسلّمہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے جو کسی غور و فکر یا تنقید و تبصرہ کا محتاج ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے ہاں کبھی کسی نے اتنا خیال کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں! لیکن قرآن کو دیکھئے کہ اس نے دنیا میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی ہے کہ جو لوگ عقل کے انحطاط کے دَور میں پہنچ چکے ہوں ان کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسنِ سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس۔ جب تک بچہ بچہ ہے، وہ اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لئے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورۃً فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اسے ان کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ وحی کی حدود کے اندر نظامِ ملت کے متعین کردہ طرق و اسالیب کی ہم آہنگی میں اپنے لئے آپ فیصلے کرے گا۔

یہ تھی قرآن کی تعلیم۔ لیکن جب ملوکیت کے استبداد نے انسانی حرّیت و آزادی کا گلا گھونٹا تھا تو ہر "زیردست" کو "بالادست" کے فیصلوں کا پابند قرار دے دیا گیا۔ سیاسی زندگی میں بادشاہ کے فیصلوں، "روحانی زندگی" میں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے فیصلوں کا اور معاشرتی زندگی میں بزرگوں کے فیصلے کا۔ اب اگر ایک طرف یہ تعلیم بطور اخلاقی اساس انسانوں کے رگ و پے میں پیوست کر دی گئی کہ

اگر شہ روز را گوید شب ایں است
بباید گفت اینک ماہ و پروین

تو دوسری طرف اُن کی گھٹی میں یہ افیون بھی ڈال دی گئی کہ :

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہی وہ دور تھا کہ ماں باپ نے بھی اپنی "بزرگی" سے فائدہ اٹھایا۔ اور یہ عقیدہ عام کر دیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"! یعنی جب تک ماں باپ زندہ ہیں ان کا لڑکا خواہ خود ساٹھ ستر برس کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اُسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اُسے اُن

کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی جن کی عقل کے متعلق اس کے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اس عمر میں اوندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والے، ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ جاتے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت میں (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) عائلی زندگی کا تقاضا ہے کہ افراد خاندان متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی کی منازل طے کریں اور خودسر اور سرکش نہ بن جائیں۔ لیکن خودسری اور سرکشی اور شے ہے، اصابتِ رائے اور شے۔[1]

آپ غور کیجئے کہ قرآن ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے اور ہم اپنے وضع کردہ یا دوسروں سے مستعار اصولاتِ اخلاق اور تصوراتِ نیکوکاری کے ماتحت کہاں جا چکے ہیں اور کدھر چلے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام غیر قرآنی تصوراتِ حیات سے کٹ کر ایک مرتبہ پھر خالص قرآنی نظریۂ زندگی سے اپنے آپ کو پیوست کریں۔

اگر بشاخِ گل آویز و اب و تم دو کش
پریدہ رنگ زباد صبا چہ می جوئی! (۱۹۵۳ء)

اِحترام

..... صاحب کا ایک مقالہ جو عنوان "احترام" (REVERENCE) معاصر ڈان کی اشاعت بابت ۱۷، و ۱۸ فروری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کارلائل اور گوئٹے وغیرہ کی استاد، اور سقراط کی مثال سے بتایا ہے کہ نوجوانوں کا حقیقی جوہر یہ ہے کہ وہ اپنے اندر احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ بغاوت اور سرکشی کوئی قابلِ قدر جذبہ نہیں۔ تعلیم و تربیت کا ماحصل تعظیم و تکریم اور احترام و سپردگی کے جذبات ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ ہمارے زمانے میں تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے

---

[1] یاد رکھیے خود فیصلے کرنے کے لئے عقل کی پختگی اور رائے کی اصابت لاینفک شرط ہے۔ اس لئے جب تک بچہ اس منزل تک نہ پہنچ پائے۔ اس وقت تک اُسے لامحالہ بڑوں کے فیصلوں کے مطابق چلنا چاہیئے۔

کہ اس سے طالب علموں کے دل میں احترام و تعظیم کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ سرکشی اور بغاوت میں فخر محسوس کرتے ہیں اور

یہ مسلک ہمارے معاشرہ کے لئے بڑا خطرناک ہے اگر اس کی جلدی اصلاح نہ کی گئی تو اس کے نقصانات کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔

ہم..... صاحب سے حرفاً حرفاً متفق ہیں کہ احترام و تعظیم کے جذبات شرف انسانیت کے آئینہ دار ہیں اور جس معاشرہ کے نوجوانوں کے دل ان جذباتِ عالیہ سے عاری ہوں گے وہ معاشرہ کبھی مہذّب و متمدّن نہیں کہلا سکے گا۔ ہم اس سے بھی متفق ہیں کہ خود معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کے دل میں احترام و تکریم کے جذبات موجزن رہیں۔ بغاوت اور سرکشی کی بنیادوں پر کوئی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج ہماری قوم کے نوجوانوں کے دل سے احترام و تعظیم کے جذبات اٹھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ بغاوت و سرکشی کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں، جن کے مظاہرے آئے دن ہمارے اجتماعات میں ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احترام کس کا کیا جائے، تعظیم کا مستحق کون ہے؟ جذباتِ سپردگی کی عقیدت کس کی بارگاہ میں پیش کی جائے؟ کس شخص کو واجب التکریم اور کون سے حکم کو واجب التعمیل سمجھا جائے؟ اس ضمن میں..... صاحب فرماتے ہیں کہ

ماں باپ کے حکم کا احترام۔ استاد کے حکم کا احترام، معاشرہ کے احکام کا احترام جو اس کی اقدار و روایات و قوانین کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

ہمیں اس سے اختلاف ہے کہ ماں باپ، اُستاد، اسلاف کا ہر حکم (بلا مشروط) واجب الاحترام ہے، اور معاشرہ کی تمام اقدار، روایات اور ضوابط بلا استثناء واجب التعمیل۔ اگر..... صاحب کے نزدیک اسی کا نام جذباتِ احترام و تکریم ہے۔ تو ان جذبات سے دنیا کی کوئی قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس سے انسانیت کا ارتقاء رُک جاتا ہے اور شرفِ آدمیت پر جمود و خمود طاری ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے نوجوانوں کو یہ سبق دیا جائے کہ جو کچھ ماں باپ اور اساتذہ کہیں اسے بلا چون و چرا تسلیم کئے جاؤ۔ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اُسے کبھی تنقیدی نگاہ سے نہ پرکھو۔ اپنے معاشرہ کی روایات و ضوابط کی شدّت سے پابندی کرو اور ان کا کبھی جائزہ نہ لو۔ تو اس قوم میں کبھی ایسے انسان

پیدا نہیں ہوں گے جو اپنی ذہنی بالیدگی سے قوم کی سطح کو بلند کر سکیں اور کاروانِ انسانیت کو ایک قدم بھی آگے لے جا سکیں۔ یہ وہی کورانہ تقلید ہوگی جس کا نتیجہ انسان کو حیوان بنا دینا ہوتا ہے (بلکہ قرآن کے مطابق حیوان سے بھی بدتر۔ اولٰئک کالانعام بل ھم اضل) اس میں شبہہ نہیں کہ بادی النظر میں اس قسم کی تعلیم بڑی خوش آئند دکھائی دیتی ہے کہ ہر ایک کی تعظیم کرو، جو اپنے سے بڑا ہو اس کا حکم مانو۔ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ استاد کی فرمانبرداری کرو۔ اسلاف کے طریقے سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہ ہٹو۔ اپنے معاشرہ کی روایات کا احترام کرو اور اس کے ضوابط کی تعمیل۔ لیکن اگر بنگاہِ تعمق دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ تمام حسین و جمیل جذبات پیدا کردہ ہیں اُس دورِ استبداد کے جس میں سکھایا یہ جاتا تھا کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین[1]

اور پڑھایا یہ جاتا تھا کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است[2]

یہی وہ "اخلاقی ضوابط" تھے جن کی رُو سے ہر "بڑے" کا حکم واجب التعمیل قرار پاجاتا تھا۔ اس تعلیم کا آغاز "ماں باپ کی اطاعت" سے ہوتا تھا۔ اس سے آگے استاد کی اطاعت تھی۔ یہ استاد، پاٹھ شالاؤں میں برہمن اور مسجدوں اور مکتبوں میں ملّا ہوتے تھے۔ انہی سے پیشوائیت (PRIEST HOOD) کی اطاعت مسلّم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد اسلاف کی اطاعت، مُردوں کی پرستش (ANCESTORAL WORSHIP) پر منتج ہوتی تھی۔ اور اس سیڑھی کے ذریعے، آخر الامر بادشاہ کی اطاعت، جو ایشور کا اوتار یا ظلّ اللہ (خدا کا سایہ) بن جاتا تھا۔ "بزرگوں کی تعظیم" اور "روایات کے احترام" کے یہی وہ جذبات ہیں جنہیں (ROBERT BRIFFAULT) رابرٹ برفا، (CUSTOM THOUGHT) اور (POWER THOUGHT) کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

اس سے عقل و شعور کے صرافے میں جعلی سکّوں کی بھرمار ہو جاتی ہے اور انسان اُن افکار

---

[1] اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو اس کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ ہاں حضور! وہ دیکھئے آسمان پر چاند اور ستارے چمک رہے ہیں۔

[2] بزرگوں کی غلطی پکڑنا بہت بڑا جرم ہے۔

کی رُو سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن پر جعلی اقدار کی مہریں ثبت کر دی جاتی ہیں اور اس طرح وہ ہر گوشے کو زنگین چشمے سے دیکھتا ہے۔[1]

جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، یہ "اخلاقی ضوابط" بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں (جس طرح سینٹ پال کی یہ غلامانہ تعلیم کہ "دشمن سے بھی پیار کرو" اور "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دو")۔ لیکن قرآن اس قسم کے غلط جذبات کی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہ حقائق کو بے نقاب پیش کر دیتا ہے خواہ انہیں (FACE) کرنا بعض طبائع پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گذرتا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ واجب الاحترام صرف وہ حکم ہے جو حق پر مبنی ہے اور واجب التکریم وہ ہستی جو حق کا حکم دیتی ہے۔ جو حق کا حکم نہیں دیتا وہ قطعاً واجب الاحترام نہیں خواہ وہ باپ ہو یا استاد، اسلاف ہوں یا اخلاف، معاشرہ ہو یا حکم، روایات ہوں یا "مسلمات"۔ نہ صرف یہ کہ ایسا فیصلہ واجب الاحترام نہیں بلکہ اس کی مخالفت فرض ہے۔ قرآن کریم نے قصۂ حضرت ابراہیمؑ میں اس حقیقت کے مختلف گوشوں کو نہایت واضح انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے باپ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے۔ بیٹے کی نگہ حق شناس، باپ کی اس روش میں کھلی ہوئی گمراہی دیکھتی ہے۔ وہ باپ سے برملا کہتے ہیں کہ:

يَآبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا۔ (۱۹/۴۲)

اے میرے باپ! تو ان پتھروں کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی تیرے کسی کام آ سکتے ہیں۔

ایسا کہنے میں نہ تو باپ کا احترام ان کے عناں گیر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے معبودوں کی تعظیم دامن کش۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے خطاب کرتے ہیں کہ

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ۔ (۲۱/۵۲)

یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھ رہے ہو؟

"بزرگوں کا احترام" یہاں بھی (حضرت ابراہیمؑ کے گلوگیر نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں قوم اسلاف کی تعظیم کے جذبے کو اُبھارتی ہے اور ابراہیمؑ سے کہتی ہے کہ:

---

[1] (THE MAKING OF HUMANITY)

قَالُوْا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۵۲)

ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔

انہی کے اتباع میں ایسا کرتے ہیں۔ اسلاف کا احترام، بزرگوں کی عظمت، معاشرہ کی روایات کا یہی تقاضا ہے کہ ہم وہی کچھ کریں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کے خلاف دل میں خیال تک لانا بھی جرم ہے۔ غور کیجئے! قوم کے بڑے بوڑھوں نے کس طرح اسلاف کی عظمت اور روایات کے احترام کو بطور دلیل پیش کیا ہے لیکن حضرت ابراہیمؑ پر اس کا کیا اثر ہوا؟ کیا وہ "بڑوں کے احترام" اور معاشرہ کی روایات کی تعظیم سے مرعوب ہو گئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے کہا کہ:

لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۲۱/۵۴)

یقین کرو تم خود بھی اور تمہارے اسلاف بھی صریح گمراہی میں رہے۔

یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ تم معاشرہ کی روایات اور اسلاف کی روش کو بطور دلیل پیش کرتے ہو میں پوچھتا ہوں کہ:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ۔ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ۔ (۲۶/۷۵)

کیا تم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ تم اور تمہارے اسلاف جس روش کے پابند ہو، اس کی حقیقت کیا ہے؟

آپ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس مقام پر کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلاف سے چلی آتی ہے۔ نہ ہی کوئی دلیل اس لئے دلیلِ محکم بن سکتی ہے کہ اُسے متقدمین کی سند حاصل ہے۔ تمہیں خود غور کرنا چاہیئے کہ اسلاف کی جو روش ہم تک منتقل ہو کر آئی ہے، وہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو اسے جاری رکھو اور اگر غلط ہے تو اُسے ترک کر دو۔ یہ ہے صحیح مسلک۔

باپ اور عوام سے آگے بڑھ کر، حضرت ابراہیمؑ معبد کے پوجاریوں تک پہنچے۔ یہی لوگ اُس زمانے میں اُستاد، مرشد اور "خدا کے نمائندے" ہوتے تھے۔ (اور آج بھی ان کی یہی پوزیشن ہے) حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی تفصیل قرآن کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اِس نوجوان کی اس "بغاوت و سرکشی" کی بنا پر فیصلہ کیا کہ:۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۔ (۲۱/۶۸)

انہوں نے آپس میں کہا کہ اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس نوجوان کو آگ میں ڈال کر جلادیں، اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

یہاں تک، باپ، قوم کے عام بڑے بوڑھے، اسلاف، معاشرہ کی روایات، حتیٰ کہ اساتذہ، علماء، مرشدانِ طریقت، سب آگئے۔ لیکن ابھی اس سلسلۂ استبداد کی آخری کڑی باقی ہے۔ یعنی بادشاہ۔ حضرت ابراہیمؑ کی حق پرستی اور حق گوئی نے اس کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ۔ (۲/۲۵۸)

یہ ہے وہ روشِ ابراہیمیؑ جس کے متعلق قرآن نے ہم سے کہا ہے کہ

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء (کی روش) ایک عمدہ نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس روش کو قرآن نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے، وہ روش یہ نہیں کہ ماں باپ، اساتذہ، مذہبی راہنماؤں، اسلاف، معاشرہ کی روایات اور اربابِ اقتدار کے ہر حکم کا احترام اور ہر فرمان کی تعمیل کرتے جاؤ۔ "اسوۂ حسنہ" یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو وہ کہیں بھی ہو اور کسی کی طرف سے بھی ہو، اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی روشِ حیات کو بطور "اسوۂ حسنہ" پیش کیا ہے۔ (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱) حضورؐ کی روش کیا تھی؟ آپ کی پیدائش بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ایسے ہی معاشرہ میں ہوئی جہاں ہر طرف گمراہی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نے اس مروجہ مسلک کی مخالفت اس شدت سے کی کہ قوم کے بڑے بوڑھے۔ کعبے کے متولی، تمام بزرگ، اکٹھے ہو کر آپ کے چچا[1] کے پاس آئے کہ اس نوجوان کو ان حرکات سے روکا جائے۔ خود چچا نے بھی ان کی ہمنوائی میں آپ سے کہا کہ بزرگوں کا احترام اور اسلاف کی تعظیم بڑی ضروری ہے۔ اس لئے آپ ان کی مخالفت سے باز

---

[1] :۔ حضورؐ کے والد تو آپ کی پیدائش سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے۔ یہی چچا بمنزلہ والد کے تھے۔

آجائیں۔اس کے جواب میں حضورؐ نے بھی وہی کچھ کہا جو حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا۔آپؐ نے فرمایا "اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تو میں پھر بھی غلط بات کی مخالفت سے باز نہیں آؤں گا۔" اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں ایک طرف نبی اکرمؐ اور اُن کے ساتھی تھے اور دوسری طرف حضورؐ کے یہی بزرگ (چچے وغیرہ) اور ان کی اولاد۔حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی ایک مسلسل جہاد تھی، اپنے معاشرہ کے مسلّمات کے خلاف ایک انقلاب آفریں دعوت تھی، ان روایات کے خلاف جو ان کے اسلاف سے متوارث چلی آرہی تھیں اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرمؐ ہی پر موقوف نہیں، تمام انبیاء کرام کا مشن اُن روایات و تصوّرات کے خلاف مسلسل پیکار تھا جو اس معاشرہ میں عام ہوتے تھے جن میں وہ مبعوث ہوتے تھے۔اس میں نہ کسی زندہ کا احترام ان کی راہ میں حائل ہوتا تھا، نہ مردہ کا تقدّس۔یہ ہے اس باب میں قرآن کی تعلیم اور حضرات انبیاء کرامؑ کا اُسوہ۔

ہم نے کہا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو اُس کی مخالفت عین فریضۂ زندگی ہو جاتی ہے۔اب سوال یہ ہے کہ حق کسے کہتے ہیں ..... صاحب نے گوئٹے کا اقتباس دیا ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ:

احترام کیا جائے ان کا جو ہم سے بڑے (GREATER) اور بہتر (BETTER) ہیں۔

اور خود ..... صاحب نے لکھا ہے کہ:

زندگی میں جو کچھ بھلا (GOOD) اور (GREAT) ہے اس کا احترام کیا جائے۔

"بھلا اور بڑا" (GOOD AND GREAT) کے الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم متعین نہیں۔اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان الفاظ کا مفہوم متعین نہ ہو، ان کا واضح تصوّر سامنے نہیں آسکتا۔فلسفہ اور اخلاقیات آج تک خیر و شر (GOOD AND EVIL) کے متعلق کوئی حرفِ آخر نہیں کہہ سکے۔اس لئے ایسے الفاظ کو احترام اور عدمِ احترام کا معیار قرار دینا، قوم کو نظری بحث سے آگے نہیں لے جاسکتا۔ہمارا تخاطب مسلمانوں سے ہے (اور ظاہر ہے کہ ..... صاحب کے مخاطب بھی اسی قوم کے نوجوان ہیں) اور مسلمانوں کے لئے خیر و شر اور حق و باطل کا امتیاز بالکل واضح ہے۔حق وہ ہے جس کا حکم قرآن دیتا ہے اور باطل وہ جس سے وہ روکتا ہے۔لہٰذا، ایک مسلمان کے لئے احترام قرآنی احکام کا ہے اور اسی بنا پر، ان گوشوں کا جہاں سے قرآنی احکام صادر ہوں۔ماں باپ ہوں یا اُستاد، اسلاف ہوں یا اخلاف، بزرگ

ہوں یا خود معاشرہ ہو یا حکومت۔ احترام صرف اس کا ہے جو قرآن کے مطابق حکم دے۔ جو اس کے خلاف حکم دے، اس کی مخالفت ایک مسلم کا فریضۂ زندگی ہے اور اتباعِ اسوۂ رسول اللہ۔ لہٰذا صحیح مسلک یہ ہے کہ :

ماں باپ، اساتذہ، اسلاف کی روایات، معاشرہ کے ضوابط و
قوانین کا احترام نہایت ضروری ہے بشرطیکہ وہ حق، یعنی قرآن
کے مطابق ہوں۔

یہی وہ تعلیم ہے جس سے ذہنوں میں جلا، قلوب میں پاکیزگی، فکر میں بلندی، معاشرہ میں ہمواری، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسنِ توازن اور انسانیت میں ارتقاء پیدا ہوگا۔ یہی چیزیں اس احترام و تعظیم کا موجب بنتی ہیں۔ جس کی سوتیں دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی، احترام کے جذبات دل کے چشموں سے اُبھر کر باہر نکلتے ہیں۔ انہیں باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا۔ احترام پیدا ہوتا ہے عظمت کے احساس سے۔ آپ قوم کے نوجوانوں کو قرآن کی تعلیم دیجئے۔ جب قرآن کی عظمت ان کے سامنے بے نقاب ہوگی تو ان کی نگہ عقیدت خود بخود قرآن کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ آپ اپنے ہاں قرآنی معاشرہ پیدا کیجئے۔ جب اس کے درخشندہ نتائج قوم کے سامنے آئیں گے تو اس معاشرہ کی تعظیم و تکریم کے جذبات خود بخود قوم کے دل سے اُبھریں گے۔ آپ ان نوجوانوں کے سامنے ایسے افراد پیش کیجئے جو قرآنی سیرت کے پیکر ہوں پھر دیکھئے کہ انہی نوجوانوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے یا نہیں کہ

مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

آپ ان نوجوانوں کو تعلیم تو یہ دیتے ہیں کہ

جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو گرگٹ نے اس آگ کو پھونکنے کی
کوشش کی۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء صـ۱۱۵)

اور ان سے پھر توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے اس قسم کے مذہب اور روایات کا احترام کریں؟ آپ ان کے سامنے معاشرہ ایسا پیش کرتے ہیں جس کے متعلق افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اُسے "چار سو بیس" سے تعبیر کر کے بھی مطمئن نہیں ہوتے کہ ان الفاظ نے ان کے جذبات کا کماحقہٗ اظہار کر دیا ہے۔

اور اس کے بعد ان نوجوانوں سے اس معاشرہ اور اس کے لزوم و تضمنات کی تعظیم چاہتے ہیں ؟ آپ ان کے سامنے افراد ایسے پیش کرتے ہیں جن کے تصور سے انسان کو ہنسی آجائے اور ان نوجوانوں کو کہنیاں مار مار کر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں سعادت مآب کہہ کر پکاریں۔ احترام، اعترافِ عظمت کا نام ہے۔ جہاں عظمت نہ ہو وہاں احترام کس طرح پیدا ہو جائے۔ احترام از خود پیدا ہوتا ہے، پیدا کیا نہیں جا سکتا۔

حقیقت خود کو منواتی ہے ، منوائی نہیں جاتی

جو افراد، زمانے سے اپنا احترام کراتے ہیں ان کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ سارے زمانے سے لڑائی مول لیتے ہیں، مخالفین کا ہجوم ان سے پوچھتا ہے کہ تمہاری صداقت کی دلیل کیا ہے۔ وہ انہی مخالفین سے کہتے ہیں کہ :

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ ۱۰/۱۶

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی ؟

وہ یہ کہتے ہیں اور مخالفین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں اُٹھتا جو کہنے والے کے کیریکٹر کے متعلق ایک حرف بھی مخالفت میں کہہ سکے۔ یہی نہیں کہ اُن کے سامنے ایسا نہ کہہ سکے بلکہ یہ کہ اہل مکہ نے ابوسفیان کو اپنا نمائندہ بنا کر ہرقل کے پاس بھیجا کہ وہ اس سے مدد مانگے تاکہ اس تحریک (نبی اکرمؐ کی دعوت) کا خاتمہ کیا جائے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا کہ اس داعیٔ انقلابؐ کے کیریکٹر کا کیا حال ہے ؟ کیا وُہ جھوٹ بولتا ہے ؟ کیریکٹر کے احترام کی یہ کیفیت ہے کہ ابوسفیان نے وہاں بھی اعتراف کیا کہ اس داعیٔ انقلاب نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی بددیانتی نہیں کی۔ نگاہوں کے سجدے وقت ہوتے ہیں اِن افراد کے لئے، نہ اُن کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

احترام ہوتا ہے اس معاشرے کا جس کی حالت یہ ہو کہ جب ایک نومسلم اپنے ٹیکس کا روپیہ خزانے میں داخل کرانے کے لئے لایا تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس نئے (اسلامی) معاشرہ نے تمہارے لئے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ ابھی تک تو اس کا موقع نہیں آیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تم اپنا روپیہ واپس لے جاؤ۔ جب تک کوئی معاشرہ فرد کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ اُسے حق حاصل

نہیں ہوتا کہ وہ اس فرد کی کمائی سے کچھ لے۔ اُس معاشرے کا احترام کس طرح ہو سکتا ہے جس کا عالم یہ ہو کہ :

دانہ ایں می کارد ، آں حاصل بُرد

معاشرہ تو ایک طرف ، اس باپ کا احترام اولاد کے دل میں نہیں رہتا جو خود تو مُرغ پلاؤ اڑائے اور بچے بھوکے مریں۔

ہمارے نوجوانوں میں البتہ ایک بات ایسی پیدا ہو رہی ہے جو بڑی معیوب ہے اور جسے کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جا سکتا اور وہ ہے بدتمیزی۔ ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا نوجوان طبقہ بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ بدتمیزی کی اجازت کسی حالت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ وہی قرآن جو بت پرستی کی اس شدت سے مخالفت کرتا ہے، اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ان بتوں کو یا مشرکین کے دیگر معبودانِ باطل کو گالی دی جائے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (۶/۱۰۸)

جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو گالیاں مت دو کہ پھر وہ بھی حد سے تجاوز کر کے خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بدتمیزی پر اُتر آنا اپنی کمزوری کا اعتراف اور شکست کا اظہار ہے، اور وہ بھی بڑی کم ظرفی اور کمینگی کے ساتھ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی کھلے بندوں مخالفت کیجئے۔ لیکن بدتمیزی پر کبھی نہ اُتریئے۔ تقدیرِ اُمم کے مطالعہ سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جس قوم میں قوت باقی نہیں رہتی اُس کا عمر رسیدہ طبقہ شکوہ سنجی اور مرثیہ خوانی شروع کر دیتا ہے اور اس کا نوجوان طبقہ بدتمیزی پر اُتر آتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور اسی صورت حالات کا احساس ہے جو سنجیدہ طبقے کو یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ ،

یوں خدا کی خدائی برحق ہے پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

(۱۹۵۳ء)

مختلف معاشرتی مسائل

ایک صاحب حسب ذیل امور کے متعلق دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے ان کی پوزیشن کیا ہے :-

۱- بچہ پیدا ہوتے پر اس کے کان میں اذان دینا ؟

۲- عقیقہ کرنا ؟

۳- ختنہ کرنا ؟

۴- مُردہ کو غسل دینا۔ کفن پہنانا ۔

جواب

یہ امور معاشرتی ہیں نہ کہ دینی۔ کسی معاشرہ میں اگر بعض باتیں اس قسم کی رائج ہوں جو دین کے کسی حکم یا اس کی عام تعلیم کے خلاف نہ جاتی ہوں تو انہیں معاشرتی تقریبات کے طور پر منا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایسی تقریبات معاشرتی یک جہتی کے لئے مفید ہوتی ہیں اور خوشی کی تقریبات سے تو زندگی میں لوچ پیدا ہوتی ہے جو گدازِ حیات کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ لیکن جو قوم روٹی تک کو محتاج ہو رہی ہو اس میں زندگی کی لوچ اور گدازِ حیات کا تصور ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے ؟

۵ - نابالغ یا بالغ لڑکے لڑکی کی منگنی کرنا ؟

ج - نابالغ لڑکے یا لڑکی کی منگنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نکاح کے لئے زوجین کی رضامندی شرط ہے اور رضامندی کے لئے سنِ بلوغت ضروری ہے۔ باقی رہا بالغ لڑکے یا لڑکی کی منگنی۔ سو اگر بالغ لڑکا اور لڑکی اپنے نکاح پر رضامند ہو گئے ہیں لیکن کسی وجہ سے نکاح میں کچھ تاخیر ہے تو ان کا باہمی وعدہ منگنی کہلا سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی شکل میں بھی نکاح کا قائمقام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہو گی۔ قرآن صرف نکاح کا ذکر کرتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے وعدوں سے احتراز اچھا ہے کیونکہ اس سے بعض اوقات بڑی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ جو ہمارے ہاں آج کل عام رواج ہو رہا ہے کہ جوان لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر دیا اور پھر "رخصتی" کے لئے برسوں کی تاریخ ڈال دی تو یہ چیز قرآن کے

منشاءِ نکاح کے خلاف اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی خرابیوں کی موجب ہے۔ قرآن کی رُو سے نکاح کے بعد میاں اور بیوی کو آپس میں ازدواجی تعلقات پیدا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس لئے نکاح کے بعد لڑکے اور لڑکی کو آپس میں ملنے نہ دینا نکاح سے مذاق کرنا ہے۔

۶۔ کیا یہ ضروری ہے کہ نکاح مُلّا ہی پڑھائے؟

ج۔ جب قرآن نازل ہوا ہے تو مُلّا کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ حضرت بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا نہ صرف نکاح میں بلکہ دوسرے معاملات میں بھی مُلّا کی ضرورت غیر قرآنی ہے، یہ کام مسلمانوں کو خود کرنے چاہئیں۔

۷۔ ہمارے ہاں ایک رسم ہے کہ قبر کے اردگرد مُلّاؤں کا ایک دائرہ بیٹھ جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف قرآن کریم کو منتقل کرتا جاتا ہے اور پھر آخری مُلّا اُسے کچھ روپے کے عوض میت کے وارث کو دے دیتا ہے۔ اور اس کے عوض سمجھا جاتا ہے کہ میت کے گناہ ساقط ہو گئے۔ اسی طرح قرآن ختم کرا کر یا درود شریف پڑھوا کر میت کو ایصالِ ثواب کرایا جاتا ہے۔

ج۔ جب آپ ایسا گروہ پیدا کر دیں گے جس کا ذریعۂ معاش کچھ نہ ہو تو وہ اپنی روٹی کے لئے کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا کرے گا ہی۔ یہ سب رسومات اسی بے کار گروہ کے حصولِ معاش کی صورتیں ہیں جن کے تصور سے دین کانپ اٹھتا ہے۔

اور "ایصالِ ثواب" کے غیر قرآنی عقیدہ میں تو بڑے بڑے لوگ پھنسے چلے آرہے ہیں۔ یہ عقیدہ قانونِ مکافاتِ عمل کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ جو قرآنی تعلیم کا اصل الاصول ہے۔ (۱۹۵۴ء)

رواج کی پابندی

سوال:۔ ہمارے ہاں عام طور پر رواج ہے کہ مختلف تہواروں یا قومی یادگاروں کے دنوں میں کاروبار بند کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلمان کو کاروبار کبھی بند نہیں کرنا چاہیئے۔ دین کی رُو سے اس کی پوزیشن کیا ہے؟

جواب:۔ بعض امور، دین کی حد میں نہیں آتے۔ معاشرہ کے رسم و رواج سے متعلق ہوتے ہیں (اسے عُرف کہا جاتا ہے)۔ اگر عُرف، دین کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے تو اُس کے حسن و قبح کا فیصلہ اس کے مطابق کرنا چاہیئے کہ وہ معاشرہ کے لئے مفید ہے یا مُضر۔ مختلف تقاریب پر کاروبار بند کرنا، معاشرہ میں رواج سا ہو گیا ہے۔ یہ رواج، دین کے کسی اصول سے تو ٹکراتا نہیں۔ اِس لئے اسے معاشرتی مصالح کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس وقت پاکستان جن حالات سے دوچار ہے، اُن کے پیشِ نظر، ہمارے نزدیک، ہمیں دن کے علاوہ رات کو بھی کام کاج جاری رکھنا چاہیئے۔ لیکن کچھ وقت تفریح کے لئے نکالنا خود کاروبار کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اِس سے صَرف شدہ توانائیاں عُود کر آتی ہیں۔ بشرطیکہ تفریح صحت مندانہ ہو۔ ہمارے ہاں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے ہنگامی طور پر.. (HAPHAZARDLY) ہو رہا ہے۔ یہاں نہ کاروبار کسی طے شدہ قومی پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ نہ تفریح ہی کسی اجتماعی نظام کے تابع۔ اِس افراتفری، نفسا نفسی، اور بے ہنگامی کا نتیجہ ظاہر ہے۔

اِس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس رواج کو کوئی معاشرہ اختیار کر لے (بشرطیکہ وہ دین کے خلاف نہ ہو) تو افراد کو معاشرہ کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اِس سے معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس میں کسی اصلاح کی ضرورت ہو تو اُس کے لئے مناسب جدوجہد کرنی چاہیئے۔ معاشرہ کے مسلّمہ رواج کی (جو دین کے خلاف نہ ہوں) خلاف ورزی مستحسن نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے "سبت" کے تاعے کی خلاف ورزی کرنے والوں کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ اسی حقیقت کو سامنے لانے کے لئے ہے (۱۹۶۱ء)

غلط معاشرہ میں اُصول پرستی

لاہور سے ایک صاحب نے اپنے خط میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ آج کل ہمارے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اس میں سچ بولنا اور دیانتداری سے کام کرنا عام طور پر نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ اور جھوٹ اور بددیانتی سے بڑی کامیابی ہوتی ہے۔ کیا ایسی حالت میں یہی بہتر نہیں کہ انسان وہی کچھ کرے جو باقی دنیا کر رہی ہے اور اس طرح ناکامیوں سے پیچھا چھڑا لے۔

جواب:۔ یہ وہ سوال ہے جو آج کل قریب قریب ہر ایک دماغ کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ بعض جرأت کر کے اُسے زبان تک لے آتے ہیں۔ باقی اسے اپنے دل میں دہراتے رہتے ہیں۔

قرآن یہ بتاتا ہے کہ کچھ مستقل اقدار ہیں جن میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ کسی صورت میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑے۔ مثلاً معاملات میں دیانتداری۔ اگر ہم دیانتداری کو اسی حد تک اپنے ساتھ رکھیں جس حد تک اس کے ساتھ رکھنے سے فائدہ ہو اور جب ایسا کرنے سے نقصان ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے تو کھلے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُسے مستقل قدر نہیں سمجھتے۔ لہٰذا، پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہم ان چیزوں کو مستقل اقدار مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم ایسا مانتے ہیں (اور اسی کو ایمان کہتے ہیں) تو پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انہیں کس وقت ساتھ رکھا جائے اور کس وقت چھوڑ دیا جائے۔ انہیں بہرحال ساتھ رکھنا ہوگا۔ اور ہم اگر انہیں مستقل اقدار ہی نہیں سمجھتے تو پھر یہ پوچھنا اور سوچنا ہی بے کار ہے کہ نقصان کی صورت میں ہم کیا کریں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ اتنا ہی نہیں کہ تم نامساعد حالات میں اپنے طور پر ان اقدار سے متمسک رہتے ہوئے نقصان اٹھاتے چلے جاؤ، ان حالات کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے ان کی جگہ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ کا قیام بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے جسے کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کی رفاقت تلاش کی جائے، جو مستقل اقدار پر اپنا ایمان رکھتے ہوں۔ ان رفقاء کی ہم مرکزی سے ان کی قوت بہت بڑھ جائے گی۔ اور اس سے صحیح معاشرہ کے قیام میں ان کا قدم آگے بڑھتا جائے گا۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے ایک فرد کا اپنا ذاتی اطمینان، جنتی زندگی نہیں کہلاتا۔ جنتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی قسم کے افراد کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ قرآن نے نفسِ مطمئنہ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔ (۸۹-۲۹-۳۰) کہ "تو خدا کے بندوں کی جماعت میں شامل ہو اور اس طرح سے جنت میں داخل ہو"۔ لہٰذا جو شخص غلط معاشرہ میں مستقل اقدار کا ساتھ نہیں چھوڑتا وہ بڑی ہمت کا ثبوت دیتا ہے۔ لیکن جو اتنے ہی پر مطمئن ہو جاتا ہے وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جیسے افراد کے ساتھ مل کر غیر خداوندی معاشرہ کی جگہ قرآنی معاشرے کے قیام کی کوشش کرے۔ (۱۹۵۴ء)

۶

حلال و حرام

سوال

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ مذہب میں حرام اور حلال کے سوال کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اتنی اہمیت کہ اکثر اوقات ایک شے کا حرام ہونا ہی ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتا ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ واضح طور پر معلوم ہو کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے۔ لیکن ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ ایک مولوی صاحب ایک چیز کو حرام بتاتے ہیں تو دوسرے اُسے حلال قرار دیتے ہیں۔ ہم عامی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں۔

براہِ کرم واضح طور پر بتائیں کہ قرآن کی رُو سے کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار کسے حاصل ہے؟

جواب

اللہ تعالےٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم، ہر انسان محض اپنے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے۔ ۱۷/۷۰) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس پہ اپنی مرضی چلائے، اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ..... (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اللہ نے اسے ضابطۂ قوانین۔ یا حکومت یا نبوّت ہی کیوں نہ دی ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو۔" لہٰذا قرآن کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پہ کسی قسم کی پابندی لگائے۔

۲۔ لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہوتی

ہیں۔ مثلاً۔

ا۔ ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔

اُس کا ایک فنّی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا نہ ماننا ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے۔ اِسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اِسے بطیبِ خاطر مانتے ہیں۔ اِس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

ب۔ ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اُسے نافذ کرتی ہے۔ (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں۔ ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہٰذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر ایک سخت پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی اُمّتِ مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وُہ دُنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے واضح اور متعین سند (AUTHORITY) ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

۳۔ قرآن نے اِس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں، رسیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا، اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

بنیادی اصول

اُس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ - إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ... (۲/۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں)

کو کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔

اس نے تم پر صرف مردار، خون[1] اور سؤر کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے پکارا جائے۔ حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۂ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ..... (۷/۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیبست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ..... (۷/۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے، بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ

(i) - کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(ii) - خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(iii) - اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(iv) - اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

۴ - ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن خدا ہر شخص سے براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رُو سے دیئے جو رسولؐ اللہ پر نازل ہوئی تھی۔

قرآن ہی قولِ فیصل ہے۔

سورۂ انعام میں ہے۔

---

[1] - سورۂ انعام میں دَمًا مَسْفُوْحًا کہہ کر اس کی تصریح کر دی کہ صرف بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (۶/۱۴۵)

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ.... (۶/۱۴۶)

اے رسول (ان سے) کہہ دو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے۔ میں اس میں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے مردار۔ بہتے ہوئے خون لحم خنزیر اور اس کے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام و حلال کا فیصلہ اس وحی کی رُو سے کر دیا ہے جو نبی اکرمؐ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ..... (۲۲/۳۰)

اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں۔ بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رُو سے بتا دیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنایا) جاتا ہے۔

یہ "مَا یُتْلٰی" وہ وحی تھی جو "الکتاب" (۲۹/۴۵) "اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے"۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۂ آل عمران کی آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے۔ کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اس کے ذریعے اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو۔" سورۂ نمل میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنَّمَآ اُمِرْتُ..... اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (۲۷/۹۱-۹۲) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن تلاوت[1] کروں"۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i)۔ کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور

(ii)۔ اس نے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۂ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں۔ جس میں پوری تحدّی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ

---

[1] ۔ تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے بھی ہیں۔

حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) "ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے؟" اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دے دے۔ اس بارے میں، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

کسی اور کو حق حاصل نہیں

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ..... (۶۶/۱)

اے نبی! جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا، تو اُسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ اللہ تعالےٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا کہ دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

حلال وطیّب سے مفہوم

اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طَیِّبًا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ..... (۲/۱۶۸) ۔ اے نوعِ انسان! زمین کی پیداوار کو جسے ہم نے حلال قرار دیا ہے، طیّب انداز سے کھاؤ۔" طیّب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مقید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق میلانِ طبع۔ طبّی ضرورت اور دیگر تضمنات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اُسے ناپسند ہے۔ اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے، گویا اس نے اُسے اپنے اوپر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف یا عقیدت مندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں

کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح بالواسطہ (INDIRECTLY) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ ایسا ہو چکا تھا اس لئے نبی اکرمؐ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔

نبی کا ذاتی فیصلہ ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) "خدا نے حرام قرار دیا تھا" اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ۔ (۳/۹۳) "یہ تمام کھانے (جو اب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے۔ سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔" وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیشِ نظر، اللہ تعالےٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہو سکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی اُمت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کر لیں۔ اِس لئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث ناتمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۂ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس

سورۂ اعراف کی ایک آیت کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس آیت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیاتِ کبریٰ کے

ضمن میں فرمایا کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ - (۷/۱۵۷) "وہ ان کے لئے طیبات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھہرائے گا۔"

اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(۱)۔ اللہ تعالےٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت و حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(۲)۔ خود نبی اکرمؐ سے بہ نصِ صریح کہتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ - (۶۶/۱) "جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اُسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔"

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بُنیادی طور پر غلط ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رُو سے بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کبھی رسولؐ کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچے تھے) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ.... (۲/۸۹) جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں۔" اور دوسری جگہ ہے۔ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ (۲/۱۰۱) دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے۔ خدا، وحی، کتاب، رسول، ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔ الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد اب آیتِ زیرِ نظر کو دیکھئے جہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ - (۷/۱۵۷) - یعنی رسول ان کے لئے طیبات کو حلال کرتا ہے، اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورۂ مائدہ میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ - (۵/۸۷) اے ایمان والو! جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے، انہیں حرام مت کرو۔" یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ طیبات کو اللہ نے حلال قرار

دیا ہے۔ (اسی) سورۂ اعراف میں ہے۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ ..... (۷/۳۳) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے ان پر فواحش حرام کئے ہیں۔" یہاں خود رسولؐ اللہ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ (۲/۲۷۵) ۔ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام۔"

لہٰذا، قرآن نے جہاں حلّت و حُرمت کو رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کا مفہوم

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ..... (۹/۲۹)

(اہلِ کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے، ان سے جنگ کرو۔"

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسولؐ دونوں کو ہے۔ ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن میں جہاں "اللہ اور رسولؐ" کے الفاظ اکٹھے آتے ہیں۔ وہاں اس سے مُراد کیا ہوتی ہے۔ (اس حقیقت کو متعدد مقامات میں واضح کیا جا چکا ہے[1])۔ اس آیت میں یُحَرِّمُوْنَ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ عربی زبان میں اور قرآن کریم میں حَرَّمَ کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَاحَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ .... وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ ..... (۶/۱۵۲)

اس آیت میں حَرَّمَ کے معنی "حرام قرار دیا" کرنے سے سارا مطلب ہی اُلٹ جاتا ہے۔ (مثلاً یہ کہنا کہ

---

[1] ۔ اس سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے جو خدا کے احکام نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے اور جسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔

اللہ نے والدین پر احسان کرنا حرام قرار دیا ہے، بالکل غلط ہے) یہاں حَرَّمَ کے معنی واجب ٹھہرانے کے ہیں۔ اس اعتبار سے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ

"ان سے کہو کہ آؤ، میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا کیا واجب قرار دیا ہے۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور یہ کہ اولاد کو مفلسی کی وجہ سے تباہ نہ کرو۔ اور فواحش کے قریب مت جاؤ۔"

لہٰذا سورۂ توبہ کی (مندرجہ بالا) آیت (وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ) کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسولؐ واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تاآنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضامند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے

(۱)۔ حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲)۔ جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا۔ ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳)۔ خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

سنگین جُرم

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو اس نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھہرایا) انہیں حرام قرار دے دیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (۵/۸۷)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کے اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں

کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ..... (۱۶/۱۱۶)

اور جو تمہاری زبانیں یونہی بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پہ محض بہتان باندھو۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں (لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں، اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب "شریعتِ خداوندی" کے مطابق ہے) اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افترا ہے۔ کذب ہے۔ بہتانِ عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اِفْتَرٰی عَلَی اللّٰہ

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ۔ (۱۰/۵۹)

ان سے کہو کہ کیا تم اس پہ غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے۔ تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کہہ دو۔) یا تم اللہ پہ افترا باندھتے ہو۔

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پہ افترا باندھتا ہے۔

یہودیوں کو سزا

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پہ بطور سزا حرام قرار دے دی گئی تھیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ ..... ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ

بِبَغْيِهِمْ ..... (۶/۱۴۶)

اور ہم نے یہودیوں پر سب ناخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دے دیئے تھے اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی۔ بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔ (۶/۱۴۶)

سورۂ نساء میں ہے:

فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ ..... (۴/۱۶۰)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں حرام قرار دے دیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں) سورۂ نحل میں کہا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے (۱۶/۱۱۸) اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دے دینا، لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے۔

وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ..... (۳/۵۰)

تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دے دی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر لیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد یہی بتایا کہ:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ ..... (۷/۱۵۶)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرے گا۔ اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا۔ جن میں وہ اب تک ماخوذ ہیں۔

توہم پرستی

اہلِ کتاب نے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام و حلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں۔ جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکینِ عرب۔ سو ان کے ہاں حرام و حلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں۔ جو محض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مویشیوں میں سے فُلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے، سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۶/۱۳۸) فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۶/۱۳۹) اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے۔ گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں۔ (۶/۱۴۴) ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہاری یا تمہارے آباؤ و اجداد کی مرتب کردہ ہیں۔ (۶/۱۴۸) تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ہو۔ (۶/۱۴۱) اس کے لئے انہیں چیلنج دیا گیا۔ کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ۔ (۶/۱۵۰)

سند صرف قرآن کی ہے

اِن تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے حرام و حلال کے لئے سند صرف حکمِ خداوندی کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اور اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورۂ نساء کی آیات ۲۳-۲۲ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے حِلّت و حُرمت کی پوزیشن۔ جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

ہنگامی تقاضے

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے۔ مثلاً برسات (یا ہیضے) کے زمانہ میں ہیلتھ آفیسر حکم دے دیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے، یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے۔ کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے، وقس علی ذالک۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے اور کسی شے کو ابدی طور پر

حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ لِهٰذَا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ۔ (۱۶/۱۱۶) ۱۹۵۸ء

۳۔ حُرمتِ شراب

کینیڈا سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔ اس لئے اس کے استعمال میں کیا حرج ہے ؟

جواب :۔ قرآن کریم نے خمر (شراب) کے متعلق کہا ہے۔ کہ وہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ہے۔ یعنی ناپاک ہے اور شیطانی کام۔ اس کے بعد ہے فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۵/۹۰) اس سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اس کے بعد ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ خمر (اور میسر ۸) سے تمہارے اندر عداوت اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور صلوٰۃ سے روک دے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (۵/۹۱) سو بتاؤ کہ تم ان سے باز رہتے ہو یا نہیں ؟

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ خمر کے بارے میں خدا کا منشاء اور حکم معلوم کرنے کے لئے اس سے زیادہ وضاحت کی بھی ضرورت ہے ؟ قرآن کریم کی ان تصریحات کی موجودگی میں جو شخص اس کا استعمال کرتا ہے وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو اور کیا کرتا ہے ؟

قرآن کریم نے بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ بعض کے متعلق کہا ہے کہ وہ اِثْمٌ ہیں۔ عدوان ہیں۔ کہیں کہا ہے کہ ان چیزوں سے مجتنب رہو۔ ان کے قریب تک نہ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ قانون کی رُو سے مختلف جرموں کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ امتیازات قانونی سزاؤں کے متعلق ہیں۔ جب اسلامی ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے۔ تو اس وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ فلاں جرم کو قرآن کریم نے کس درجہ میں رکھا ہے، اس کے مطابق اس کی سزا مقرر کی جائے گی۔

لہٰذا اگر قرآن کریم نے خمر کے لئے حرام کا لفظ استعمال نہیں کیا تو اس سے یہ جائز نہیں قرار پا جاتی۔ یہ ممنوع ہے، اور جس چیز کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے اس کا استعمال حکمِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور اسے جائز سمجھنا قرآن سے انکار کے مترادف ہے۔

(۱۹۶۱ء)

شراب کا استعمال بطور دوائی

پچھلے دسمبر میں ہم نے بابُ المرسلات کے تحت امتناعِ شراب کے قرآنی حکم کی توضیح کی تھی۔ اس سلسلہ میں مقامی میڈیکل کالج کے ایک طالب علم نے لکھا ہے کہ شراب کئی دواؤں کا جزُ ہے، اور وہ دوائیں کئی امراض میں مُفید اور مجرّب ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا شراب کا یہ استعمال جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ اس قسم کے استفسارات ہمارے پاس اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں اور ہم اُن کا جواب دینے میں تأمّل برتتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے تصوّر کے مطابق دین کوئی ذاتی شے نہیں، یہ ایک اجتماعی نظام ہے، اور اجتماعی نظام سے متعلق امور کا فیصلہ مفتیانہ حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ قانونی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اسلامی حکومت میں ان کا استعمال قانونی جرم بھی ہوتا ہے۔ جب وہ حکومت اس کے متعلق قانون مرتب کرے گی تو وہ اس جرم سے متعلق تمام تفاصیل۔ اس کے تضمنات، اس کے عواقب اور مخصوص حالات میں مستثنیات وغیرہ سب کا ذکر کرے گی۔ اس کے بعد اس جرم کے متعلق ان تمام امور کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اضطراری حالت میں حرام اشیاء کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ اضطراری حالت کسے کہتے ہیں؟ اس حالت میں ممنوع اشیاء کا استعمال کس حد تک جائز ہوگا؟ وغیرہ۔ یہ تمام امور بھی قانون سے متعلق ہیں۔ اور قانون ہی اس کا صحیح صحیح تعین کرے گا۔ اس میں نہ کسی فرد سے فتوے مانگنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی کو فتوے دینے کا حق ہی ہوگا۔ بجز ان ذمہ دار لوگوں کے جن کو خود حکومت نے ان کاموں کے لئے مامور کیا ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں زیرِ نظر استفسار کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ البتہ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی جگہ اسلامی قانون رائج نہ ہو تو انفرادی طور پر ان احکام کی پابندی کس طرح کی جائے۔ شراب کی ممانعت کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس کی اجازت اضطراری حالت ہی میں دی جا سکتی ہے۔ بیماری کی حالت، اضطراری حالت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ کہ کس بیماری اور بیماری کی کس حالت میں شراب کا یا کسی ایسی دوائی کا جس میں شراب کی آمیزش ہو، استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔

(۱۹۵۳ء)

الکحل کا استعمال دواسازی میں

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ :-

میں انگریزی دواسازی کی صنعت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مگر درمیان میں ایک بزرگ نے یہ کہہ کر روک دیا ہے کہ ان ادویات میں الکحل استعمال ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کا بنانا اور بیچنا ناجائز ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ کیا الکحل (جبکہ اس کو نشہ کے علاوہ کسی دیگر ضرورت کے لئے استعمال کیا جائے) کا تیار کرنا۔ خریدنا اور بیچنا ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں اور جائز ہے تو کیوں؟

۲- اگر الکحل کی تجارت ناجائز ہے تو کیا جن چیزوں میں الکحل شامل ہے ان کی تجارت بھی ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ حالانکہ سرکہ میں بھی الکحل کے اجزاء موجود ہیں اور شریعت میں وہ متفقہ طور پر حلال ہے۔

۳- اگر ان ادویات کا تیار کرنا جن میں الکحل شامل ہے، ناجائز ہے، تو کیا اُن کا استعمال جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیوں، اور اگر جائز نہیں تو کیوں؟

طلوعِ اسلام

قرآن نے جن چیزوں سے منع کیا ہے۔ ان کے متعلق ضمنی قوانین مرتب کرنا قرآنی نظام کا کام ہوگا۔ وہی یہ متعین کرے گا۔ کہ اضطراری حالات کونسے ہیں۔ اور ان حالات میں ان چیزوں کے استعمال کی اجازت کس حد تک دی جا سکتی ہے۔ اس نظام کی عدم موجودگی میں افراد کے فتاویٰ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

قرآن نے خمر کے استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے۔ کہ اس میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ لیکن اس کے نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ لہٰذا (بجز ان اضطراری حالات کے جن میں قرآن نے حرام چیزوں کے کھانے پینے کی اجازت دی ہے) شراب پینا قطعاً ناجائز ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ دواسازی کے کام میں الکحل کے استعمال کے متعلق کیا سمجھنا چاہیئے۔ سو ظاہر ہے۔ کہ اگر ان دوائیوں کا استعمال جن میں الکحل پڑی ہو۔ جائز قرار پائے تو دواسازی کے لئے اس کا استعمال بھی جائز ہوگا۔ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی بیشتر دوائیاں الکحل میں بنتی ہیں، اور ان دوائیوں کا استعمال عام ہو رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلامی نظام ان دوائیوں کے استعمال کو ناجائز قرار نہیں دے گا۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے یہ ایسے سوالات ہیں۔ جن کے متعلق قرآنی نظام ہی فیصلہ کن حکم دے سکتا ہے۔ افراد کی آرا، شرعی فیصلہ کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتیں۔ (۱۹۵۵ء)

میسرہ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ گھوڑ دوڑ (RACES) میں جو لوگ بازی لگاتے ہیں۔ اس کی بابت کیا حکم ہے؟۔ ایک دوسرے صاحب پوچھتے ہیں کہ آج کل یہ عام رواج ہوتا جارہا ہے کہ انعامی طریق کے ٹکٹ پر لاٹری ڈالتے ہیں۔ اور پھر کسی بڑے معزز لیڈر سے لاٹری نکلوا کر اشیائے متعلقہ تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔ بازی لگانا۔ خواہ وہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہو، خواہ کھانے کی میز پر برج (BRIDGE) کے نام سے قمار بازی میں داخل ہیں۔ جسے قرآن میسرہ کہتا ہے اور (رجس من عمل الشیطان) قرار دے کر اس سے اجتناب کا حکم دیتا ہے (۵/۹۰) باقی رہا قرعہ اندازی کے ذریعہ لاٹری نکالنا۔ سو یہ بعینہٖ وہ شکل ہے، جسے ایام جاہلیت میں میسرہ کہتے تھے۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے گوشت کے حصے کر لیتے۔ پھر دس تیر لے کر انہیں اسی طرح مخلوط کر دیتے، جس طرح لاٹری کے ٹکٹوں کو باہم گڈمڈ ملا دیتے ہیں۔ پھر ایک حکم کے ذریعہ تیروں سے نمبر نکالتے، اور اس کے مطابق گوشت کی تقسیم کرتے، جس کا نمبر خالی نکلتا اُسے تمام گوشت کی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ سو یہ چیز نہ صرف اپنی اصل کے اعتبار سے، بلکہ ٹکنیک کی رُو سے بھی بالکل وہی ہے، جسے آج کل قرعہ اندازی سے لاٹری نکالنا کہتے ہیں۔ اسی قسم کے اور تیر، یا پانسے ہوتے تھے جنہیں ازلام کہا جاتا تھا، ان سے بھی چیزوں کی تقسیم کیا کرتے یا فال لیا کرتے تھے (دیکھئے ۵/۳ اور ۵/۹۰) لیکن آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ پانسوں سے پیسوں کا جوا کھیلنے والے سوسائٹی میں جواری کہلاتے ہیں، اور آئے دن پولیس ان کے جوئے خانوں پر چھاپے مارتی رہتی ہے لیکن گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں یا برج کی میز پر ہزاروں روپوں سے وہی کچھ کرنے والے سوسائٹی میں سب سے معتبر شمار کئے جاتے ہیں، اور قرعہ اندازی سے لاٹریاں نکالنا تو ایسا "مقدس" طریق قرار پا گیا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا "اسلامی" اجتماع ہوتا ہوگا جس میں لاٹری کے ذریعہ جاذبیت نہ پیدا کی جائے۔ اور یہ متبرک رسم مبارک ہاتھوں سے سرانجام نہ دلائی جائے، قمار بازی کے یہ تمام انداز ہماری مہذب سوسائٹی کے فیشن میں داخل ہیں، اور ان کے خلاف لب کشائی کرنے والا "دقیانوسی"۔ لیکن ان مہذب جواریوں کو یہ کون بتائے کہ

نام بدل دینے سے اشیاء کی حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ شراب، شراب ہی رہتی ہے۔ خواہ اُسے (DRINKS) کہہ کر ہی کیوں نہ پکارا جائے اور جوا، جوا ہی ہوتا ہے خواہ اسے بزنس یا لاٹری کے نام کیوں نہ دے دیئے جائیں۔

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ جس طرح قرآن نے شراب کے لئے خمر کا لفظ استعمال کرکے ہر اس چیز سے اجتناب کا حکم دے دیا۔ جس سے عقل پہ پردہ پڑ جائے (خمر کے معنی ڈھانپنے کا کپڑا یا اوڑھنی ہے) اسی طرح اس نے میسرہ کے لفظ سے ایک بہت بڑے اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میسرہ کا مادہ یُسر ہے اور یُسر کے معنی آسانی ہیں، لہٰذا میسرہ ہر وہ مال ہے جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ قمار بازی تو اس کی ایک شکل ہے، باقی تفصیل آپ خود سمجھ لیجئے۔ (۱۹۵۳ء)

سینما دیکھنا کیسا ہے؟

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں۔ کہ سینما دیکھنا جائز ہے یا ناجائز۔ اور اسے بہتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ سینما بجائے خویش نہ جائز ہے نہ ناجائز، سینما معلومات میں اضافہ کرنے، خیالات پھیلانے یا جذبات کو اُبھارنے کا ذریعہ ہے۔ اگر وہ معلومات مفید، خیالات نیک اور جذبات صالح ہوں تو سینما جائز ہی نہیں۔ بلکہ تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ چیزیں ایسی ہوں۔ جن سے قلبی اور ذہنی صلاحیتیں بگڑتی اور اخلاق خراب ہوتے ہوں، تو سینما بے حد مذموم اور مسموم ہے۔ اور یہ چیز سینما تک ہی محدود نہیں۔ جتنی چیزیں مقصود بالذات نہیں، بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، ان سب کی یہی کیفیت ہے۔ مثلاً دولت یا قوت، اگر تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف ہوتی ہے، تو بڑی مستحسن ہے۔ اگر اس کا نتیجہ تخریب ہے تو سخت معیوب ہے۔

جس قوم کے سامنے زندگی کا بلند مقصد ہو، وہاں سینما یا اس قسم کے نشر و اشاعت کے اور ذرائع، اس مقصد کے حصول کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں یہ شکل نہ ہو۔ وہاں یہ صرف کاروباری (کمرشل) جنس بن جاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز کاروباری سطح پہ آجائے، تو اس میں کسی بلند مقصد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کاروبار چلانے والے کے سامنے اپنے مفاد کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو نہیں سکتا۔ وہ وہی مال منڈی میں لائے گا۔ جس کے زیادہ خریدار ہوں۔ اس طرح سینما، عوام کے ذوق یا جذبات کی تسکین فراہم کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہی حالت پریس کی ہے جو سینما سے بھی زیادہ مؤثر ذریعۂ نشر و اشاعت ہے، قوم کے سامنے مقصد ہوگا تو پریس عوام کے ذہن کی سطح بلند کرتے ہوئے، انہیں اس مقصد کی طرف لے جائے گا۔ اگر اس کی حیثیت کاروباری

ہوگی۔ تو وہ عوام کے رجحانات کا ساتھ دے گا اور انہی کے جذبات کی ترجمانی کرے گا۔ خواہ وہ رجحانات و جذبات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ جو شخص اس مقصد کو لے کر میدان میں آئے گا۔ کہ وہ عوام کے غلط رجحانات و جذبات کی اصلاح کرے ان میں صحیح تبدیلی پیدا کرے۔ اور ان کی قلبی و ذہنی سطح بلند کرے، ان میں صحیح اور غلط کے پرکھنے کی صلاحیت پیدا کر دے، اسے قدم قدم پر سخت موانع درپیش ہوں گے۔ اسے ساتھی بہت کم ملیں گے اور مخالفت بڑی شدید ہوگی۔ اس لئے اکثر و بیشتر ہوگا یہ کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا۔

لہٰذا سینما ہو یا اسی قسم کے نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع۔ انہیں انفرادی کاروباری سطح پر نہیں ہونا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ ایک نومولود بچے کی پرورش کی طرح ایک نومولود قوم کی تربیت کے سلسلے میں کاروباری ذہنیت تباہ کن ہوتی ہے، اس میں لاگت اور بازیافت (RETURN) کا حساب ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں خرچ برابر کیا جائے گا۔ اور "آمدن" کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ اس بچے کی کس قدر پرورش اور اس قوم کی کس حد تک تربیت ہو رہی ہے، اس کے لئے ذہنیت مادرانہ ہونی چاہیئے۔ نہ کہ تاجرانہ، مادرانہ ذہنیت معاوضہ کے خیال کے بغیر، ایثار کی حامل ہوتی ہے۔ قرآن ایسا نظام (دین) تجویز کرتا ہے، جس میں معاشرہ کا افراد کے ساتھ اسی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ جس طرح افراد کی طبیعی پرورش کا بلا معاوضہ کفیل ہوتا ہے، اسی طرح ان کی تعلیم و تربیت کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ ذرائع رزق اور ذرائع تربیتِ قلب و دماغ کو تعمیرِ افراد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور چونکہ اس کے سامنے زندگی کا نصب العین خدا کا مقرر کردہ ہوتا ہے، اس لئے اس کی تمام جد و جہد کا رُخ اُسی نصب العین کی طرف ہوتا ہے، اس کا یہی نصب العین ہے جو اُسے دنیا کے دوسرے نظاموں سے منفرد اور الگ کرتا ہے۔ غیر خداوندی نظاموں میں جب ذرائع رزق، اور اسبابِ نشر و اشاعت معاشرہ کے کنٹرول میں ہوں۔ تو افراد کی آزادی کا گلا گھٹ جاتا ہے، لیکن اسلامی نظام کے نصب العین کی بلندی انہی ذرائع کو افراد کی فکر و نظر کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا ضامن بنا دیتی ہے۔ اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔ یعنی عالمگیر انسانیت کی طبیعی، اور انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کا ذمہ دار نظام۔ ان تمام خرابیوں کی اصلاح کا یہی واحد طریق ہے جو آج کل دُنیا میں ذرائع نشر و اشاعت کے غلط استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ (۱۹۶۱ء)

موسیقی کے متعلق فتوے

ہفتہ وار "صدقِ جدید" (لکھنؤ) کی ۲۷ فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت (کے باب المرسلات) میں ایک صاحب نے موسیقی اور مزامیر کے جواز اور عدمِ جواز کے متعلق چند سوالات کئے ہیں۔ جن کے جواب میں صدق نے حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:۔

"مراسلہ نگار بالآخر جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہی صحیح ہے، افراط و تفریط سے پاک یگانا جیسا کہ وہ مروج ہے شریعت اسلامی کے مزاج میں کوئی دخل نہیں رکھتا، وہ صرف مخرب اخلاق قسم کے لہو و لعب میں آتا ہے، اور بطور پیشہ اور فن کے اس کو استعمال کرنا تو بالکل ہی ناجائز ہے۔

البتہ جہاں مقصود محض اپنی تفریح اور دل بہلاؤ ہو۔ اور جو اخلاقی خرابیوں سے خالی ہو، یا شادی وغیرہ کے موقع پر محض وقتی طور پر ہو ایسی صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں، بہ قول مراسلہ نگار صاحب کے یہ مواقع توسع اور چشم پوشی کے ہیں۔

باجوں (مزامیر) میں دف کے مستثنیٰ کرنے کے کوئی معنی نہیں، ملک کا ہر سادہ مروج باجہ اس کے ذیل میں آسکتا ہے۔ البتہ باجوں میں بھی وہی احتیاط چاہیئے، جو باجہ جتنا زیادہ سادہ ہوگا۔ اباحت کے قریب ہوگا اور جتنا زیادہ مقتضیات فن و صناعت کے لحاظ سے آراستہ و پیراستہ ہوا اتنا ہی حدود اباحت سے دور ہوتا جائے گا۔"

طلوعِ اسلام اس ضمن میں دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ پوچھنے والے ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ فلاں بات کے متعلق اسلام کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں کہنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں خدا کا یہ حکم ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات اپنے جوابات میں کہیں خدا کے حکم کا ذکر نہیں کریں گے، ہمیشہ یہ کہیں گے کہ فلاں چیز جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے، سوال یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ اشیاء کے جائز و ناجائز ہونے کے فیصلے کرے، اور اس طرح لوگوں کو اپنے فیصلوں کا پابند بنائے؟ نہ صرف یہ بلکہ اپنے فیصلوں کو اسلام کا فیصلہ اور دین کا حکم قرار دے۔ جس خدا نے انسانوں کے لئے اسلام کو بطور دین تجویز کیا تھا۔ اُسی نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) "جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس میں فیصلہ کن حکم خدا کا ہوگا۔"

دوسری چیز خود اس "فتویٰ" سے متعلق ہے جسے محترم مدیر صدق نے صادر فرمایا ہے۔ یعنی یہ کہ

جو باجہ جتنا زیادہ سادہ ہوگا۔ اباحت کے قریب ہوگا۔ اور جو جتنا زیادہ مقتضیات

فن وصناعت کے لحاظ سے آراستہ وپیراستہ اتنا ہی حدودِ اباحت سے دُور ہوتا جائے گا۔

ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ اس مجتہدانہ بلندیٔ فکر ونظر کی داد کن الفاظ میں دی جائے۔ یعنی اس اجتہادی اصول کی داد کہ اگر کوئی شے سادہ شکل میں ہو تو اس کا استعمال جائز ہوگا۔ اور اگر اس میں فنی باریکیاں پیدا ہوجائیں، تو وہ ناجائز ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر، اِکّے کی سواری جائز ہوگی اور ہوائی جہاز کی ناجائز۔ دودھ میں شکر ملاکر پی لیا جائے تو جائز اور ان دونوں کے امتزاج سے قلاقند بنالیا جائے تو ناجائز۔ لٹھے کا تہبند باندھ لیا جائے تو جائز اور اگر تھوڑی سی صناعی سے اس کا پاجامہ بنالیا جائے تو ناجائز۔ اور چلون یکسر حرام۔ کیونکہ اس میں صنعت کاری، پاجامہ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے!

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا۔ کہ ان حضرات کے نزدیک فقہ کے اصول کس طرح متعین ہوتے ہیں۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں جائز و ناجائز کے فیصلے کس طرح! اسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ یہی حضرات ہماری آنے والی نسلوں کے لئے اسلاف بن جائیں گے، اور ان کے فیصلوں کو فقہائے سلف کے فیصلے قرار دے کر شریعت میں بطور سند پیش کیا جائے گا۔

اس کے بعد اصل سوال کی طرف آیئے۔ قرآن کریم میں موسیقی کو کہیں حرام، یا ناجائز قرار نہیں دیا گیا، غور کیجئے کہ موسیقی کہتے کسے ہیں؟ گلے سے آواز نکالئے یا کسی ساز میں پھونک مار کر، یا مضراب سے چھیڑ کر، اگر وہ آواز بے ہنگم ہوگی۔ تو اسے شور کہیں گے، (اسے کوئی حرام قرار نہیں دے گا) لیکن اگر اس میں توازن ہوگا۔ تو اسے موسیقی کہیں گے (جسے یہ حضرات حرام قرار دیتے ہیں) اس سے ظاہر ہے کہ یہ دراصل آواز کا توازن ہے جو ان لوگوں کے نزدیک حرام ہے، اب جو ذہنیت محض توازن کو حرام قرار دے۔ اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

اب رہا یہ کہ اسے اخلاقی خرابیوں سے پاک ہونا چاہیئے تو مجرّد آواز سے تو نہ اخلاقی خرابی پیدا ہوسکتی ہے نہ اخلاقی حسن، یہ تو ان اشعار یا ابیات پر مبنی ہوگا۔ جنہیں گایا جائے، اگر وہ اشعار مخرّبِ اخلاق ہیں تو ان کا لکھنا، پڑھنا، سننا، (بغیر گانے کے بھی) ناجائز ہوگا۔ اس میں موسیقی بے چاری کا کیا قصور ہے! اور اشعار پر ہی کیا موقوف ہے، مخرّبِ اخلاق نثر بھی ناجائز ہوگی (حالانکہ اسے کوئی نہیں گاتا)۔

اچھے لفظ، اچھے شعر، اچھی تصویر، فطرت کے کسی حسین شاہکار وغیرہ کی طرح اچھی موسیقی میں ایک اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے وہی لوگ متاثر ہوسکتے ہیں، جو حسن ذوق رکھتے ہوں ۔۔ بے حس انسان

اس سے اثر اندوز نہیں ہوسکتا۔ اس کے اثر کا تعلق انسان کے اعصاب سے ہے، جو لوگ دیکھیں کہ اس سے ان کے اعصاب پر خوشگوار اثر ہوتا ہے انہیں اس سے مستفید ہونا چاہیئے۔ جو دیکھیں کہ ان کے اعصاب پر اس کا اثر اچھا نہیں پڑتا، انہیں اس سے محتاط رہنا چاہیئے۔ جن لوگوں پر موسیقی سے وجد یا حال طاری ہوجاتا ہے ان کے اعصاب کمزور ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے محتاط رہنا چاہیئے۔

تصویر

شائد ہی کوئی ماہ ایسا گذرتا ہو۔ جس میں یہ استفسار موصول نہ ہوتا ہو کہ شریعت کی رُو سے تصویر کھینچوانا یا اس کا اپنے پاس رکھنا کیسا ہے، طلوع اسلام میں اس کے متعلق ایک دو مرتبہ لکھا جاچکا ہے، اب اسے پھر دہرایا جاتا ہے۔

قرآن میں تصویر کی ممانعت کہیں نہیں۔ بلکہ حضرت سلیمانؑ کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ان کے پاس دور دراز ملکوں کے اجنبی صناع جمع تھے۔ یعملون لہٗ ما یشاء من محاریب و تماثیل (۳۴/۱۳)۔ جو اُن کی منشاء کے مطابق بڑی بڑی محراب اور عمارتیں اور تماثیل تیار کرتے تھے۔ "تماثیل" تمثال کی جمع ہے۔ اور تمثال میں تصاویر اور مجسمے دونوں شامل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب (۱)۔ خدا کا ایک اولوالعزم رسول تصاویر اور مجسمے تیار کراتا ہو، اور (۱۱) قرآن اس کا ذکر کر رہا ہو اور (۱۱۱) اس کی ممانعت کہیں نہیں آئی ہو۔ تو پھر از روئے قرآن تصویر کی ممانعت کیسے ہوسکتی ہے؟ کہا یہ جاتا ہے کہ چونکہ تصویروں سے انسان دوسروں کی پرستش شروع کردیتا ہے، اس لئے یہ ناجائز ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ازمنۂ مظلمہ (زمانہ جہالت) میں انسان۔ مظاہر پرست اور انسان پرست واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ مجسمات اور تصاویر کی پرستش شروع کردیتا تھا۔ لیکن ہر مجسمہ اور ہر تصویر کی نہیں۔ بلکہ صرف انہی کے مجسموں اور تصویروں کی جن کی اسے پرستش مقصود تھی، اگر اس دلیل کو محکم تسلیم کرلیا جائے کہ انسان (اللہ کے سوا) جن چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ انہیں باقی نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ تاکہ دنیا سے شرک مٹ جائے تو غور فرمایئے کہ اس سلسلۂ کائنات میں کس کس چیز کو مٹانا نہیں پڑے گا۔ انسان پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کرتا ہے۔

درختوں اور حیوانوں کی پرستش کرتا ہے۔ زمین کی اور اجرامِ سماوی (چاند، سورج، ستاروں) کی پرستش کرتا ہے، وہ ان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں کرتا۔ بلکہ خود ان چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ تو کیا اس شرک کو مٹانے کے لئے ان تمام چیزوں کو مٹا دیا جائے گا جن کی یہ پرستش کرتا ہے۔ کیا ان کا مٹانا ممکن بھی ہے۔ انسان پرستی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے مٹا دینے سے ان کی پرستش نہیں ہوگی۔ لیکن ذرا گہرائیوں میں جا کر دیکھئے کہ کیا ان کے مٹانے سے واقعی شرک مٹ جاتا ہے۔ اگر آپ ان تصاویر کو مٹا بھی دیں گے تو ان تصاویر کو کیا کریں گے جو انسان نے اپنے قلب کے چوکھٹوں میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ اگر آپ "شیخ" کی تصویر کو سامنے نہیں رکھنے دیتے تو وہ مراقبہ میں "تصویرِ شیخ" سے اپنے سینے کو بت کدہ بنا لیتا ہے۔ سو اصل شے انسان کے دل و دماغ کے بت کدوں کو معبودِ باطل سے پاک کرنا ہے۔ اگر ان کی تطہیر ہو جائے تو خارجی معبود (تصاویر اور مجسمے بلکہ زندہ انسان) از خود فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں یہ بُت موجود ہوں تو محسوس و مشہود بتوں (تصویروں اور مجسموں) کے استیصال سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ کتنے مسلمان ہیں جو تصویر کشی، مجسمہ سازی، قبر پرستی کو حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے سینوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کتنے کتنے بڑے لات و منات اور ہبل و عزیٰ چھپے بیٹھے ہیں۔

رہ مدہ اقبالؔ را در کعبہ اے شیخِ حرم
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

لہٰذا اصل شے تو غیر اللہ کی عبودیت ہے۔ جس سے روکنا مقصود ہے نہ کہ نفسِ تصویر۔۔۔ "آغاخانیوں" میں چونکہ سر آغا خان کی پرستش کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کی ہر تصویر معبود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس فرقہ کا جاہل اور سمجھدار ہر شخص اس تصویر کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے برعکس، قائداعظمؒ مرحوم کی تصویر مسلمانوں کے قریب قریب ہر گھر میں موجود ہے۔ لیکن سمجھدار طبقہ تو ایک طرف جہلاء میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کی پرستش کرے۔ معہذا چونکہ قبر پرستی مسلمانوں میں عام ہے۔ اس لئے انہی قائداعظمؒ کی قبر کی پرستش کے آثار آہستہ آہستہ اُبھرتے چلے آ رہے ہیں[1]۔ لہٰذا تصویر بجائے خویش کوئی ایسی چیز نہیں جسے شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا جائے۔

شگفتگی سے نفرت

لیکن اگر آپ تاریخِ اسلام (مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) کا بہ تعمق نگاہ مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی، کہ مسلمانوں کے دلوں میں تصاویر کے متعلق جو نفرت پائی جاتی ہے اس کی وجہ وہ نہیں جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ بلکہ

---

[1] ۔۔ معلوم ہوا ہے کہ اب یہ رجحان باقی نہیں رہا۔ (۱۹۶۴ء)

اس کی تہہ میں کچھ اور ہے، ہو سکتا ہے یہ چیز شعوری طور پر مسلمان کے سامنے نہ ہو لیکن اس کا تحت الشعور اس سے متأثر ہے اور اس تأثر کو اس نے مذہب کا سہارا دے کر قائم رکھا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جو اسلام ہمارے ہاں مروّج ہے وہ عام طور پر وہ اسلام نہیں۔ جسے اللہ نے بوساطت نبی اکرمؐ ملت کو دیا تھا۔ ہمارا اسلام مجموعہ ہے ان غیر اسلامی نظریات و تصوّرات کا جو رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر اسلام کے اجزاء بنائے جاتے رہے۔ ان تصوّرات میں عیسائیت کی رہبانیت کو خاص دخل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ اسلام کا بیشتر حصہ اسی رہبانیت پر مشتمل ہے۔ عیسائی خانقاہیت میں اس دنیا کی ہر حسین شے سے نفرت سکھائی جاتی تھی۔ ان کے اولیاء (SAINTS) کے حالات پڑھیے۔ وہ اس قدر گھناؤنی زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کے تصوّر سے روحِ لطافت میں جھرجھری آجاتی ہے۔ ان میں سے جو ولی سب سے زیادہ کریہہ المنظر اور نفرت آگیں حالات میں رہتا تھا وہی سب سے بڑا قطب تصوّر کیا جاتا تھا۔ اگر کسی کو ساری عمر میں ایک مرتبہ ہنسی آگئی (یا تبسم سے لب کشائی ہو گئی ہے) تو اُسے سالہا سال تک اس کا کفّارہ دینا پڑتا تھا۔ جب حسنِ فطرت سے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا تو انسانی حسن کے متعلق ان کا جو تصوّر ہو گا وہ ظاہر ہے۔ چونکہ تجرّد کی زندگی اُن کے نزدیک "منہاجِ نبوت" کی زندگی تھی۔ اس لئے ان کے عقیدہ میں عورت دنیا کی بدترین جنس تھی، یہ تھی وُہ روحِ خانقاہیت جو آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اسلام کا جزوِ مذہب بن گئی۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ آپ اس زندگی کی تصویر کا مطالعہ کیجئے، جسے ہمارے ہاں ایک متقی، پرہیزگار، دیندار، مزکّی و مقدّس انسان کی زندگی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ فلاں بزرگ چالیس سال تک متواتر روتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے رخساروں کا گوشت بھی گل سڑ گیا۔ فلاں بزرگ بیس سال تک سوئے نہیں۔ فلاں نے عمر بھر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ فلاں صاحب کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ جونہی کوئی کیڑا زخموں سے نیچے گر جاتا تھا۔ وہ اسے اُٹھا کر پھر زخم پر رکھ لیتے تھے۔ فلاں بزرگ کی جوئیں "مگرمچھوں" جتنی بڑی تھیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سے آگے بڑھیے تو اس "مقدّس تصوّرِ زندگی" کو خود ذاتِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ کبار کی طرف منسوب کر دیا۔ کتبِ سیر و آثار کو دیکھئے۔ ان میں مقدّس زندگیوں کی تصویریں اسی قسم کی ملیں گی۔ حضورؐ ساری عمر اس طرح متبسّم نہیں ہوئے کہ کسی نے دانت مبارک دیکھ لیا ہو۔ گھر میں چالیس چالیس دن تک آگ نہیں جلتی تھی۔ گیہوں کا آٹا کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ چھلنی کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کپڑوں پر بیسیوں پیوند لگے رہتے تھے۔ ان کی مجالس و محافل میں کبھی شگفتگی و شادابی نے بار نہیں پایا تھا۔ زندگی کے لطیف و خوشگوار پہلوؤں سے وہ ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ تزئین و آرائش ان کے ہاں حرام تھی۔ دولت و ثروت

شجرِ ممنوعہ تھی۔ جس کے چھونے سے انسان جنت سے نکالا گیا تھا[1]۔ عورت وہ ٹیڑھی کمان ہے جس کو سیدھا کرنے کی کوشش کیجئے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ وقس علی ہذا۔

اس قسم کی زندگی کو مقدّس ترین زندگی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور ہر منبر و محراب سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ "دُنیا مردار ہے اور اس کا طالب کُتّا"۔ عیسائی خانقاہیت کا اثر اس حد تک ہو چکا ہے کہ آپ دیکھیں گے، کہ ہمارے ہاں کے اچھے اچھے سمجھ دار لوگ جب جنّت کا ذکر کریں گے تو وہ اس تصویر سے جھینپے جھینپے سے دکھائی دیں گے کہ اس میں ازواج کا ذکر کیوں آتا ہے۔ وہ اپنی انتہائی کوشش کریں گے، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہر چند وہاں ازواج ہوں گی۔ لیکن ان سے جنسی تعلقات قائم نہیں ہوں گے[2]۔ یعنی ان کے نزدیک جنسی تعلق ایک

جنسی تعلق

ایسی چیز ہے۔ جسے اس دنیا کی آلودگیوں میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بلند و بالا "روحانیت" کی زندگی میں اس کو بالکل دخل نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال میں اگر جنّت میں بھی جنسی تعلق باقی رہا تو ساری جنّت پلید ہو جائے گی۔ آپ نے غور فرمایا کہ جنسی تعلق کو روحانیت کی زندگی کے نقیض تصوّر کرنے کا خیال کہاں سے آیا؟ یہ اسی عیسائیت کا اثر ہے جس میں تجرّد کی زندگی کو روحانیت کی بلند ترین زندگی بتایا گیا ہے اور یہی اثرات ہمارے ہاں عین دین بن چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے "دین" میں احساسِ حُسن کہاں بار پا سکتا ہے، اور ظاہر ہے جہاں حسن (BEAUTY) کو اس درجہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہو وہاں حُسن کے مظاہر (فطری ہوں یا انسانی کوششوں کے نتائج) کس طرح قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں۔ یہ ہے اصل وجہ تصویر (اور دیگر فنونِ لطیفہ) کی مزعومہ "حُرمت" کی۔ "اسلام اور آرٹ" ایک وسیع موضوع ہے جس پر اس وقت تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت ہم صرف ان اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ حُسن کے متعلق یہ اس قوم کا زاویۂ نگاہ ہے۔ جس کے خدا نے نیکی کے لئے بھی حُسن کا

حُسن کیا ہے

لفظ استعمال کیا ہے اور جنت کے لئے بھی حُسنِ مآب۔ یعنی جس عمل میں حُسن نہیں، (یعنی زندگی کا جو کام حسین نہیں)۔ وہ اس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حُسن

---

[1] واضح رہے کہ بنا بر استغناء، سادہ زندگی بسر کرنا اور شے ہے اور دولت و ثروت اور زیبائش و آرائش کو قابلِ نفرت سمجھنا اور شے۔ ہمارے ہاں کے تصورِ دین میں ان چیزوں کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

[2] ہم اس وقت جنّت اور اس سے متعلق قرآنی تصریحات سے بحث نہیں کر رہے۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ "جنسی تعلق" کو ہمارے ہاں کس طرح روحانی زندگی کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

کیا ہے؛ توازن و تناسب جونہی کسی کا توازن (EQUILIBRIUM) بگڑا، اس میں فساد رونما ہوگیا۔ کائنات کا یہ تمام سلسلہ اسی حسن (توازن) پر قائم ہے۔ تخلیق کے ساتھ تحسین یہاں کا آئین محکم ہے۔ اشیائے کائنات صرف پیدا ہی نہیں کی جاتیں، بلکہ انہیں حسین ترین انداز میں پیدا کیا جاتا ہے۔ الذی احسن کل شیء خلقہ (۳۲/۷) اللہ وہ ہے کہ اس نے جو چیز بنائی حسین ترین (احسن) انداز میں بنائی (وانبتنا فیھا من کل شیٔ موزون (۱۵/۱۹) ہم نے زمین میں ہر چیز توازن و تناسب کو لئے ہوئے اگائی۔" خود انسانی صورت میں بھی اس اعتدال و تناسب کو ملحوظ رکھا، جس پر حسن کا مدار ہے۔ الذی خلقك فسواك فعدلك (۸۲/۷) وہ خدا جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر ٹھیک ٹھیک درست کیا۔ پھر تمہارے قویٰ اور صورت میں تناسب و اعتدال ملحوظ رکھا۔

جمالی پہلو

پھر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا گیا کہ موزونیت و تناسب اور تحسین و تزئین کا یہ انداز سلسلۂ تخلیق ہی کا ایک جزو ہے نہیں کہ اس کے سوا کچھ اور مقصد نہ ہو۔ بلکہ آرائش و جمال کی یہ تمام آئینہ گری انسان کی نظر افروزی اور ذوق لطیف کی تسکین کے لئے ہے۔ غور کیجئے! یہ تمام اجرام فلکی اس سلسلۂ کائنات میں جذب و کشش کے ثقیل الجثہ مظاہر ہے ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی فرمادیا کہ سقف سماوی کی یہ مرصع کاری تمہاری نگاہوں کے لئے سامان زینت ہے۔ افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینھا وزینھا (۵۰/۶) کیا ان لوگوں نے کبھی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے کس طرح بنایا ہے اور کس طرح اس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینھا للنٰظرین۔ (۱۵/۱۶) اور ہم نے (گردش سیارگان کے لئے) بروج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے باعث زینت بنا دیا۔ آسمان سے نیچے اتر کر زمین کی طرف دیکھئے۔ انبتنا فیھا من کل زوج بھیج (۵۰/۷) اس میں قسم قسم کی خوبصورت نباتات پیدا کر دی۔ حتیٰ کہ تمہارے مویشی جن سے تم نے باربرداری کا کام لینا تھا۔ ان کی یہ کیفیت ہے کہ ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون (۱۶/۶) جب تم انہیں شام کے وقت چراگاہوں سے واپس لاتے ہو اور صبح کے وقت لے جاتے ہو۔ تو تمہارے ان مویشیوں میں تمہارے لئے حسن و جمال کا سامان ہوتا ہے۔

آپ قرآن کے مختلف مقامات پر نگاہ ڈالئے۔ تخلیق و تعمیر کے ساتھ ساتھ تحسین و تزئین کی یہ تمام جمال آرائیاں آپ کے سامنے آجائیں گی، جن کی طرف آپ کو بار بار دعوت نظارہ دی گئی ہے اور وہ دعوت

بھی اِس انداز سے کہ

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ لا هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ۝ (۶۷/۳)

تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے ایک بار نہیں، بار بار دیکھو کیا تمہیں کوئی سلوٹ نظر آتی ہے۔ تم اسی طرح بار بار دیکھتے رہو۔ تمہاری نگاہ اکتائے گی اور اسی طرح خاسر و درماندہ کاشانۂ چشم میں واپس آجائے گی، لیکن صنعت گاہِ کائنات میں کوئی جھول نہ پا سکے گی۔

جس خدائے کائنات کی جمال آفرینیوں کا یہ عالم ہو کیا وہ آرائش و زیبائش اور حسن و جمال کی تمام راہیں اپنے بندوں پر حرام قرار دے دے گا۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰی عَمَّا تَصِفُوْنَ۔

قرآن اس نمائش گاہِ حسن و تزئین کی طرف بار بار دعوتِ نظارہ دے رہا ہے اس لئے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گویا اس کے صانع پر یہ تہمت دھرنا ہے کہ تم نے معاذ اللہ یہ سامانِ زیبائش و تحسین یونہی بے کار پیدا کیا۔ اور پھر جب یہ تمام جمال آفرینی بھی مقصدِ تخلیقِ کائنات میں سے ہے تو ظاہر ہے کہ خود انسانی ذات کی تعمیر و ارتقاء میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ جو آنکھ حسن و جمال کی نیرنگیوں سے کیف اندوز نہیں ہو سکتی وہ انسان کا دیدۂ بصیرت نہیں، حیوان کا آلۂ بینائی ہے اور جو قوم ذوقِ حسن و زیبائی سے بے بہرہ ہو جاتی ہے۔ اس پر رموزِ کائنات کی گرہ کشائیاں حرام ہو جاتی ہیں۔

ذوقِ حُسن

کائنات جمالیاتی (AESTHETIC) اور افادی (UTILITARIAN) گوشوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ انسان چونکہ ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھولتا چلا آیا ہے۔ اس لئے اس کا یہ مسلک رہا ہے کہ کبھی محض جمالیاتی رنگ میں ڈوب گیا اور کائنات کے افادی پہلو سے کنارہ کش ہو گیا۔ یہ یکسر جذباتی دنیا تھی، جس نے انسان کو دنیائے ممکنات میں بے کار کر کے رکھ دیا۔ اور کبھی یہ تفریط کی طرف آیا تو یکسر افادی پہلو کو مسلکِ حیات قرار دے لیا۔ اس سے یہ کائنات محض تجارت گاہ بن گئی۔ اسلام نے آکر بتایا کہ کائنات کے ان دونوں گوشوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ یعنی حمدیت (APPRECIATIVE) اور

حمدیت اور ربوبیت

ربوبیّت (UTILITARIAN) دونوں کا منبع اس کی ذات ہے۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ لہُ الملک ولہُ الحمد (۶۴/۱) غلبہ اور قوت اور دوسری طرف حمدیت دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ یہ ہے وہ خدا جس کے رنگ میں مسلمان کو رنگا جانا تھا۔ لیکن آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ قوت اور غلبہ میں یہ سب سے پست۔ جہاں تک ربوبیت کا تعلق ہے۔ یہ روٹی تک کے لئے دوسروں کا محتاج اور حمدیت (ذوقِ حُسن) کا ہر گوشہ اس پر حرام! یہ ہے قرآن کو چھوڑ دینے کا نتیجہ!

خسر الدنیا و الآخرۃ و ذالک الخسران المبین۔ (۱۹۵۳ء)

شبِ برات

شبِ برات کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے؟ یہ کیا تقریب ہے؟ اسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے کیا یہ ٹھیک ہے؟

جواب:۔ یہ تقریب کسی واقعہ کی یاد میں نہیں منائی جاتی۔ بعض روایات میں اس رات کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔ بس یہی اس کی سند ہے۔ لیکن مولوی صاحبان سے پوچھئے تو وہ اسے لیلۃ القدر بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک بہت بڑے مولانا ریڈیو پر اپنی تقریر میں شبِ برات کے متعلق قرآنی سند بیان فرما رہے تھے اور وہ سند تھی۔ سورۂ دخان کی یہ آیت فیھا یفرق کل امرٍ حکیم (۴۴/۴) اس رات میں ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔ اس "قرآنی سند" کے بعد انہوں نے تفصیلاً بتایا کہ اس رات کس طرح آنے والے سال کے لئے لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سورۂ دخان میں یہ آیات یوں ہیں:۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ ۝ فِیْھَا یُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ ۝ (۴۴/۳-۴)

ف:۔ ان روایات کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ وضعی یا ضعیف ہیں۔

ہم نے قرآن کو ایک بابرکت رات میں اُتارا ہے۔ ہم ہمیشہ (وحی کے ذریعہ قوموں کو)
اس سے آگاہ کرتے رہے ہیں کہ ان کی غلط روش ان کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔
(وہ بابرکت رات) جس میں ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ اس رات کا ذکر ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔
اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۔ اور قرآن کے نزول کی ابتداء رمضان میں ہوئی تھی ۔
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ لہٰذا اس سے واضح ہے کہ لیلۃ القدر رمضان
کے مہینے میں آئے گی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی۔ لیکن ہم ہیں کہ
پہلے شعبان کے مہینے میں لیلۃ القدر (شب برات) مناتے ہیں اور پھر رمضان کے آخری عشرہ میں اس
کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ غور کیجئے، ایک رسم کی گرفت کس قدر سخت ہوتی ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے
اس رسم کے ضمن میں صرف ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ بالآخر
یہ کچھ کیوں کیا جاتا ہے۔ البتہ اس سے اس حقیقت کی کھلی ہوئی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے خلاف
عجمی سازشیں کس قدر کامیاب رہیں اور پروپیگنڈا اگر منظم طریق پر کیا جائے تو وہ کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

عجمی سازش۔ اساورہ

جب ایرانیوں کو مسلمانوں سے شکست ہوئی تو وہ دانت پیس کر
رہ گئے۔ وہ مسلمانوں سے میدانِ جنگ میں شکست تو کھا گئے
لیکن انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس شکست کا انتقام اس طریق سے لیا جائے گا کہ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے۔
ایرانی فوجوں میں شاہی جیش کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ اس جیش کا نام اساورہ تھا۔ اپنی شکست کے بعد اس
جیش نے حضرت سعدؓ سے درخواست کی کہ اگر انہیں وہی مراعات دی جائیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں تو وہ
مسلمان ہو کر اسلامی آبادیوں میں بس جانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ شرط منظور کر لی گئی اور وہ اس طرح بصرہ اور
کوفہ وغیرہ بلادِ اسلامیہ میں آ بسے۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے اس انتقام کی سازش شروع کی، جس کی
آگ اُن کے دلوں میں سلگ رہی تھی۔ اس وقت اسلام اپنی اصلی شکل میں سیدھے سادھے ضابطۂ حیات
کی حیثیت سے موجود تھا۔ مسلمان اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے تھے اور اُسے دنیا میں عملاً نافذ کرنا اپنا

فریضہ سمجھتے تھے۔ کام کرنے والی قومیں باتیں کرنا نہیں جانتیں۔ اس لئے اس وقت تک مسلمان "باتوں" میں اُلجھے نہیں تھے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بُلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ان اساورہ نے یہی سوچا کہ اس "زندہ" قوم سے عمل چھڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں باتوں میں الجھاؤ۔ خیر و شر کا مسئلہ مجوسیت (ایران کا مذہب) کا بنیادی مسئلہ تھا۔ اسی مسئلہ پر تقدیر کے نظریہ کی عمارت متفرع ہوتی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اسی سوال کو چھیڑا۔ وہ جن مسلمانوں سے اسلام سیکھتے تھے۔ ان سے پوچھتے تھے کہ "اگر کائنات کا کوئی ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، تو انسان کے تمام اعمال بھی خدا کے حکم کے ماتحت ہی سرزد ہوں گے۔ اور اگر یہ سب کچھ خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے تو پھر جزاء اور سزا کا کیا سوال؟"۔ مسلمانوں کی عملی قوم نے اس قسم کے سوالات کو درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھا تھا[۱] اور یہ مجوسی معترضین اس فن میں طاق تھے۔ انہیں مجبوراً ان باتوں کے متعلق سوچنا پڑا، اور ان کے اعتراضات کے منطقی جوابات تلاش کرنے پڑے۔ ان سوالات اور جوابات نے عقائد کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے قدری فرقہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فرقہ کے بانی معبد بن خالد جہنی کا اپنا اعتراف ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو اساورہ کے ایک شخص ابو یونس سے اخذ کیا تھا۔ قدریہ کا ردِ عمل جبریہ کی صورت میں رونما ہوا۔ اس طرح جب ایک مرتبہ فرقہ بندی کی ابتداء ہو گئی تو اس کے بعد پھر چل سو چل۔ مجوسی اساورہ نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انہوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں میں جزوِ ایمان بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے ایمان میں (وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى) کا چھٹا جزو الٰہی کا داخل کیا ہوا ہے۔ اسی عقیدہ کو زیادہ گیرہ گیر بنانے کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ ہر سال ایک رات ایسی آتی ہے جس میں آنے والے تمام سال کے معاملات طے کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ فلاں شخص مرے گا اور فلاں کے ہاں بچہ پیدا ہو گا۔ فلاں کا رزق کھلے گا۔ فلاں کا بند ہو گا۔ یعنی محکمہ قضا و قدر ہر ایک کے حصے مقرر کر دے گا۔ اس رات کا نام "شبِ برات" رکھا گیا۔ برات کے معنی حصہ کے ہیں۔ یعنی "حصے بٹنے کی رات"۔ اب رہا اس کی سند کا سوال۔ سو اس کے لئے غلط

تقدیر کا مسئلہ

روایات وضع کرلی گئیں۔ چنانچہ تذکرۃ الموضوعات (شیخ محمد طاہر) میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیروں سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر کردیا۔ لوگوں نے صلوٰۃ الفیہ جاری کی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کردیں۔ اور عید سے بھی

مجوسیوں کی تقلید

۱؎ :- اس سے یہ مطلب نہیں کہ قرآن اوّل کے مسلمانوں نے قرآن کریم پر غور نہیں کیا تھا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ وہ ان بے کار منطقی مباحث میں نہیں اُلجھے تھے۔

۲؎ :- پرویز صاحب کی تازہ تصنیف "کتاب التقدیر" میں اب اس مشکل ترین مسئلہ (تقدیر) کو نہایت عمدگی سے حل کردیا گیا ہے۔ (۱۹۷۲ء)

زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کرلی جس میں اس قدر فسق و فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے۔ اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نازل ہو جائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس میں (۴۴۸ھ میں) ہوا پھر سارے شام و مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علماءِ مصلحین نے توجہ کی جن کی کوششوں سے یہ بدعت مٹ گئی۔ تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتداء برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے۔ انہوں نے دینِ اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم تازہ کی۔ اس نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کرلی۔ جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔ یوں شب برات وجود میں آگئی۔ اب مسلمان ہزار برس سے مجوسیوں کے "نوروز" کے اس مثنیٰ کو علن اسلام سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے اور اس کے بچے آتش بازی سے اُن کی آتش پرستی کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اتنا کہہ دے کہ خدا کے لئے ذرا سیلاب کی اس رَو سے ہٹ کر سوچو تو سہی کہ بالآخر اس کی دینی حیثیت ہے کیا؟ تو اس کے خلاف کفر کے فتاوے شائع کرائے جاتے ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار باد!
کہ اُفتاد است از بام بلندے

(۱۹۵۳ء)

۷

خُدا اور اِنسانی ذات

۱۔ خُدا کا قانون

لاہور سے ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ آج کل یہ شبہات عام کئے جارہے ہیں کہ :۔

۱۔ طلوعِ اسلام خدا کے قانون کا جو تصور پیش کرتا ہے اس میں خدا گم ہوتا جارہا ہے یعنی اشتراکیت میں خدا کا کھلا انکار ہے۔ یہاں ذرا سلیقہ سے انکار کی طرف اقدام ہے۔ میٹریل ازم کو آیاتِ قرآنی کا لباس پہنایا جارہا ہے۔ ذکر و دعا جس سے تسکین حاصل ہوتی تھی، ختم ہو رہی ہے۔ "دامانِ خیالِ یار" ہاتھ سے چھوٹا جارہا ہے۔ "سعیِ بے حاصل" کی لذت چھن رہی ہے اور وہ قانون و نظام جس کے لئے یہ قربانی دی وہ بھی حاصل ہونے کی اُمید نہیں۔ مسئلہ ختم ہوا۔

جواب :۔ جہاں تک خدا کے قانون کا تعلق ہے، طلوعِ اسلام کو قرآن کے ایک ایک صفحہ اور اس کی ایک ایک آیت میں اس کا وہ عظیم القدر قانون جلوہ بار نظر آرہا ہے۔ جس کی محکم زنجیر میں یہ تمام محیر العقول سلسلۂ کائنات جکڑا ہوا ہے۔ قرآن، انسان سے بھی اسی قانونِ خداوندی کی اطاعت چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قانونِ خداوندی کے اس تصور سے انسانوں کا وہ خود ساختہ "خدا" ختم ہو جاتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو۔ مصلّے پر بیٹھ کر دعا مانگتے رہو اور تسبیح کے دانوں پر خدا کے نام کا ورد کرتے رہو۔ باقی سب کچھ تمہارے لئے خود بخود ہو جائے گا لیکن اس سے اس خدائے حکیم و قدیر کا تصور نکھر کر سامنے آجاتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ لیس لِلانسان اِلاّ ما سعیٰ ۔ انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔" اس سے بے شک موہوم امیدوں کی جھوٹی لذت اور سعیِ بے حاصل کا دل فریب کیف چھن جاتا ہے لیکن اس سے خدا کے غیر متبدل وعدوں کا وہ محکم سررشتہ ہاتھ میں آجاتا ہے جس کے لئے اُس نے

خود کہا ہے کہ لا انفصام لھا۔ یعنی وہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ کتنا جاندار ہے یہ بھروسہ اور کیسا قوت بخش ہے یہ اعتماد! جس "دامن" کے متعلق، بعد از مرگ آنکھیں کھلنے پر نظر آئے کہ وہ "دامنِ یار" نہیں تھا بلکہ "اپنا ہی گریباں"[1] تھا، اس کی حقیقت اگر ابھی آنکھوں کے سامنے آجائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس لئے کہ ابھی تو وقت ہے کہ ہم خواب کی دنیا کے جھوٹے دامنوں کو چھوڑ کر، یار کے سچے دامن کو تھامنے کا سامان کر لیں۔ یہ وقت گذر جانے کے بعد اگر پتہ چلا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟

باقی رہا مٹیریل ازم کا شبہ، سو اصل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مٹیریل ازم کہتے کسے ہیں۔ ان کے خیال میں مٹیریل ازم کے معنی ہیں دنیاوی خوشگواریوں کا حصول۔ اگر مٹیریل ازم کے یہی معنی ہیں تو قرآن کی تعلیم خود مٹیریل ازم کی تعلیم ہے۔ وہ استخلاف فی الارض کو ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مال و دولت، ازواج و بنون، جاہ و حشمت خدا کی نعمتیں ہیں۔ وہ بھوک کو خدا کا عذاب اور مرفہ الحالی کو اس کا انعام قرار دیتا ہے۔ کہئے کہ یہ (مندرجہ بالا مفہوم کے اعتبار سے) "مٹیریل ازم" نہیں تو اور کیا ہے؟

مٹیریل ازم کے اصلی معنی یہ ہیں کہ انسانی رہنمائی کے لئے تنہا انسانی عقل کافی ہے اور زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے بعد حیات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کا ایک ایک لفظ اس باطل تصور کی تردید اور تکذیب کے لئے وقف ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشحالیاں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں ہیں۔ اور یہ چیز صرف قرآن کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ تنہا عقل کی رُو سے، اور نہ ہی انسانوں کے خود ساختہ مذاہب کے ذریعہ ـــــ طلوعِ اسلام کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کے خطۂ زمین میں قرآن کا قانون نافذ ہو اور اس کے خدا کا نظامِ ربوبیت متشکل ہو۔ اس کی اس کوشش کی کامیابی کا انحصار آپ حضرات کی تائید اور رفاقت میں مضمر ہے۔

قوانینِ فطرت

اور اگر مٹیریل ازم سے آپ کی مراد ہے قوانین فطرت کا اتباع، تو قوانینِ فطرت بھی خدا ہی کے قوانین ہیں۔ کسی انسان کے بنائے ہوئے قوانین نہیں، ان کا

---

[1] سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا — جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

اتباعِ طبعی زندگی کی خوشگواریاں عطا کرتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے انسان، فطرت کی قوتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قوانینِ فطرت کا اتباع بھی جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ تمام ملائکہ آدم کے سامنے جھک گئے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لے۔

لہٰذا :-

۱۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا مقامِ آدم ہے۔ اور

۲۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآنی راہنمائی کے مطابق صرف کرنا، مقامِ مومن۔

جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اُسے مقامِ آدمی بھی نصیب نہیں، چہ جائیکہ مقامِ مومن حاصل ہو۔ (۱۹۵۳ء)

۲۔ (معاذاللہ) بھینٹ لینے والا خُدا

عبدالماجد صاحب دریابادی کے اخبار "صدقِ جدید" لکھنؤ، کی ۲ مارچ ۱۹۵۹ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر "ایک مؤثر حکایت" کے عنوان سے حسب ذیل کہانی شائع ہوئی ہے۔

فتح پور (یو۔ پی) کے مولوی حاجی حکیم ظہور الاسلام کو گذرے ہوئے کچھ ایسا زمانہ نہیں گزرا ہے۔ ابھی ممدوح کے سینکڑوں دیکھنے والے موجود ہوں گے۔ ندوہ کے ایک اجلاس کے موقعہ پر ان سطور کے راقم کو بھی اپنے لڑکپن میں زیارت نصیب ہوئی تھی۔ بڑے صاحبِ علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے صاحبِ دل بھی تھے۔ اور تقوے اور خوفِ خدا کے ایک پیکرِ مجسم۔ شہر میں ایک بار ہیضہ پھیلا اور لوگ چٹ پٹ ہونا شروع ہو گئے۔ مدرسہ سے متعلق ایک دارالاقامہ بھی تھا۔ اس کا ایک غریب پردیسی لڑکا، دور دراز بنگالہ دیس کا رہنے والا بھی اس میں مبتلا ہوا، اور مولانا کو اس کی خبر ہوئی۔ بے قرار ہو گئے۔ اسپتال بھجوانے کے بجائے خود جا مریض کو چٹ اپنے گھر اٹھا لائے۔ ہیضہ کا مریض، اور وہ بھی کوئی اپنا عزیز نہیں۔ اُسے اپنے گھر اٹھا لانا کوئی معمولی بات نہ تھی! موت و ہلاکت کو اپنے ہاں دعوت دینا تھی!

اور اب خدمت و تیمارداری مولانا نے خود شروع کی ۔ ہیضہ کے مریض کی جو گندی حالتیں ہوسکتی ہیں، ان سب کو تصور میں لے آیئے اور پھر سوچیئے کہ مولانا اپنے ہاتھ سے اُسے دوا پلا رہے ہیں اور اس کی ایک ایک خدمت کرتے جاتے ہیں۔ گھر والے ایسے موقعہ پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اچھے اچھے عزیز دوست منہ چرا جاتے ہیں۔ یہ مولانا کیا بشر نہ تھے، کوئی فرشتہ تھے ؟

مریض کی حالت گرتی گئی، بگڑتی گئی۔ اور ادھر مولانا کی گریہ زاری بھی بڑھتی گئی۔ بار بار دعائیں اپنے رب اور زندگی و موت دونوں کے خالق سے کیں کہ "اے اللہ! اس پر رحم کر۔ غریب پردیسی ہے۔ اپنے باپ کا اکلوتا ہے۔" ساری رات دوسرے تیماردار کہاں تک ساتھ دیتے۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ اب تنہا، دنیا کا مالک و مولیٰ تھا اور اس کا یہ وفا شعار غلام اُس سے راز و نیاز میں مصروف۔ راوی کا بیان ہے کہ پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں۔ اور اپنے نازبردار خالق کے آگے مچل رہے ہیں۔ سرگوشی کے لہجہ میں، رات کے سناٹے میں، دعا کے الفاظ کچھ اس طرح سنائی دیئے۔

> "مالک ہو، جو چاہو سو کرو۔ قادر مطلق ہو جو چاہو کر ڈالو۔ قانونِ قدرت تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے جب چاہو اسے توڑ سکتے ہو۔ آخر مجھے تو سرخرو کرنا۔ یہ بچہ پردیسی ہے۔ میرے بھروسے پر آیا تھا۔ ماں باپ کا کیا حال ہوگا..... خیر اگر یوں مجھ گنہ گار کی دعا قبول نہیں کرتے تو میری نذر ہی قبول فرمالو۔ جان کے بدلے جان حاضر ہے۔ ایک میرا اپنا بچہ ہے اُسے اس کے عوض میں قبول فرماؤ۔ وہ بھی تمہارا، میں بھی تمہارا۔"

اور یہ بھی سن لیجئے۔ مولانا کے کئی بچے نہ تھے۔ کئی بچوں کے گذر جانے کے بعد یہی ایک سال کی عمر کا زندہ تھا۔ ماں باپ ہی نہیں، گھر بھر کے ارمانوں کا مرکز ——— ایک محض اجنبی کی خاطر نذر اسی جگر کے ٹکڑے کی پیش ہو رہی تھی !

امتحان۔ ابراہیمؑ کا نہیں، ایک ابراہیمی کے ظرف و تحمل کا درپیش تھا۔ اللہ اللہ ! سحر ہو رہی تھی کہ اچانک مکان کے اندر سے کنڈی کھٹکی۔ معلوم ہوا کہ بچہ پر وبا کا حملہ ہوگیا۔ مولانا اطمینان سے اُٹھ کر اندر گئے۔ دوا پلائی، نفع خاک نہ ہوا۔ مولیٰ نے بندہ کی نذر قبول کر لی تھی۔ عبدیت کی کمان سے چھٹا ہوا

نیرنشان پر پہنچ چکا تھا۔ اُدھر وہ پردیسی اچھا ہوتا گیا، اِدھر یہ نازوں کا پالا، اپنا بیٹا گرتا گیا۔ یہاں تک کہ مولانا اپنے ہاتھوں جاکر اِکلوتے جگر گوشہ کو پیوندِ خاک کر آئے۔

طلوعِ اِسلام

غور کیجئے کہ یہ حضرات خدا کے متعلق کس قسم کا تصور دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس خدا کا تصور جس کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۵۳/۳۸) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا" لیکن مولوی کی غرض تو اپنے وعظ کو دلچسپ بنانا ہوتی ہے۔ اسے اس سے کیا مطلب کہ اس زیب داستان سے خدا کا کیا تصور قائم ہوتا ہے۔ اور دین کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے،
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

۳۔ خُدا کی معرفت

ایک صاحب ملتان سے لکھتے ہیں کہ میں نے ماہ نامہ..... طلوعِ اسلام کے تعارف سے دیکھا۔ اس کی مارچ کی اشاعت میں دو چار باتیں ایسی نظر آئی ہیں جن کی وضاحت آپ سے کرانی ضروری سمجھی ہے۔ آپ شاید کہہ دیں گے کہ..... کے نکات کی وضاحت انہی سے کرانی چاہیئے۔ لیکن باتیں ایسی ہیں کہ جن کی وضاحت آپ سے ہی کرائی جا سکتی ہے۔ وہ نکات یہ ہیں:۔

۱۔ ..... صاحب نے "رومی کے تصورِ قوم" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے۔ اور دین کا مقصود آخری اور غایت، خدا کا عرفان ہے۔ لیکن خدا کا عرفان خود اپنے نفس کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ عارفوں کا مقولہ ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ۔

کیا یہ بات قرآن کے مطابق ہے ؟

طلوعِ اسلام

یہ خالص تصوّف کی تعلیم ہے جس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ۔ خدا کا عرفان تو خیر بہت بڑی بات ہے ۔ قرآن تو نفسِ انسانی کے عرفان کا بھی کہیں مطالبہ نہیں کرتا ۔ وہ نفسِ انسانی پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔ (جس طرح وہ کائناتی شواہد پر تدبّر و تفکّر کی دعوت دیتا ہے) لیکن "معرفت" اور غور و فکر کے بعد کسی شے کے متعلق علم حاصل کرنے میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہے ۔ باقی رہی خدا کی ذات، سو قرآن اس پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے ۔ اس کے عرفان کا نہیں ۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ انسان اس کی ذات کی حقیقت و ماہیّت جان اور پہچان سکے ۔ لہٰذا، دین کا مقصود "خدا کا عرفان" نہیں ۔ (۱۹۵۵ء)

---

۴ ۔ مَست اَلَست

گجرات سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ :-

جو شخص نماز روزہ ترک کر دے ۔ گالیاں دے اور ناجائز حرکات کرے، کیا وہ ولی اللہ ہو سکتا ہے ؟ نیز مست لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، وہ کس طرح مست ہو جاتے ہیں اور وہ ناجائز حرکات کیوں کرتے ہیں ؟

جواب :- ولی اللہ کسی خاص شخص کو نہیں کہتے، اور نہ ہی اولیاء اللہ کا کوئی خاص گروہ ہوتا ہے ۔ قرآن کی رُو سے ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے ۔ یعنی وہ اللہ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اس کا دوست اور کارساز ہوتا ہے ۔ اللہ کی دوستی کے معنی ہیں اس کے قانون کی پوری پوری اطاعت ۔ ہمارے ہاں جو اولیاء اللہ کا الگ گروہ سمجھا جاتا ہے، یہ عقیدہ عیسائیوں کی خانقاہیت سے لیا گیا ہے

جہالا (SAINTS) ہوتے ہیں۔

باقی رہے مست، سو اس کی صورت یہ ہے کہ قرآن علم وعقل، فہم وبصیرت، تدبر وتفکر، برہان ودانش کی تعلیم دینے آیا تھا۔ لہذا کوئی شخص جس قدر زیادہ علم وعقل سے کام لیتا تھا اسی قدر واجب العزت قرار پاتا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن چھوڑا تو عزت اور تقرب خداوندی کے معیار بھی اُلٹے ہو گئے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ کوئی شخص جس قدر جاہل اور بیوقوف ہوگا، اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب ہوگا۔ حتیٰ کہ اھل الجنۃ بُلہٌ کی حدیث بھی وضع کر لی گئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ جنتی لوگ بیوقوف ہوتے ہیں۔ لہذا جب خدا کے مقرب ہونے کا معیار عقل کی کمی قرار پا گیا تو جو شخص بالکل فاتر العقل ہو جائے وہ سب سے بڑا مقرب ہوگا۔ انہی کو ہمارے ہاں مست یا مجذوب کہتے ہیں۔ یعنی بالکل پہنچا ہوا۔ جس کے متعلق سعدی نے کہا تھا کہ :-

کانرا کہ خبر شد، خبرش باز نیاید

باقی رہا یہ کہ لوگ مست کیسے ہو جاتے ہیں تو یہ سوال کسی ڈاکٹر سے پوچھنا چاہیئے۔ جو بتا سکے گا کہ لوگ پاگل کس طرح ہو جاتے ہیں ؟

لیکن آپ کو یہ نہیں پوچھنا چاہیئے تھا کہ وہ پاگل کس طرح ہو جاتا ہے۔ پوچھنا یہ چاہیئے تھا کہ جو لوگ اس پاگل کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ انہیں کیا ہو جاتا ہے ؟۔ (۱۹۵۴ء)

۵۔ اِنسانی ذات کیا ہے ؟

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

"آپ جو قرآنی فکر پیش کرتے ہیں اس میں انسانی نفس یا انسانی ذات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ "نفس" کے متعلق کچھ دھندلے سے تصورات تو ہمارے ذہن میں آ گئے ہیں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ جس طرح آپ نے اپنی لغات میں قرآن مجید کے اور تصورات سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اسی طرح "نفس" کی بحث بھی سامنے آجاتی۔ غالباً یہ بحث لغات کی چوتھی جلد میں آئے گی۔ لیکن اس میں شاید ابھی

دیر لگ جائے اور میں اس کے معلوم کرنے کیلئے بہت بیقرار ہوں۔ اس لئے شکر گذار ہوں گا۔ اگر آپ اس کے متعلق طلوع اسلام کی آئندہ اشاعت میں تفصیل سے لکھ دیں۔"

جواب:۔ "نفس" سے متعلق تفصیل بحث لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد میں آگئی ہے۔ ذیل میں وہ عنوان درج کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے اس مادہ کی لغوی بحث ہے اور آخر میں نفسِ انسانی کے متعلق تصریحات۔ واضح رہے کہ اُخروی زندگی میں یقین، قرآن کی رُو سے اجزائے ایمان میں سے ہے اور اُس زندگی پر ایمان کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان صرف اس کے طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ جس کا موت کے ساتھ خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ اس میں جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، جو اس کے جملہ اعمال کی ذمہ دار اور ان کے نتائج کی حامل ہے اور جو طبعی موت سے فنا نہیں ہو جاتی اسی کو **انسانی ذات یا (نفس)** کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کے لئے "ذات" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اسے "نفس" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں اور بھی بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ متعلقہ عنوان حسب ذیل ہے۔

(ن - ف - س) صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نفس کے بہت سے معنی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ نیز وُہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت (شعور اور احساس کی قوت) پیدا ہوتی ہے۔ عقل، علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے اور عَیْنُ الشَّیْئِ کے معنوں میں بھی۔ جیسے جَآءَ فِیَ الْمُلْکُ بِنَفْسِہٖ۔ بادشاہ میرے پاس بنفسِ نفیس آیا۔ نیز عظمت اور بڑائی، ہمت، غیرت، ارادہ اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی۔ نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بند کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خون کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نِفَاس اُس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے۔ خود ولادت (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ نَفَسٌ سانس کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع انفاس آتی ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں۔ نَفَسٌ کے معنی وسعت اور کشادگی کے بھی ہیں۔ ایک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں اور طویل چیز کو بھی۔ نَفِیْسٌ مالِ کثیر کو کہتے ہیں اور شَیْئٌ نَفِیْسٌ۔ وہ عمدہ چیز جس کی طرف انسان لپک کر جائے۔ تَنَفَّسَ کے معنی ہیں سانس لینا۔ نیز تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنی ہیں صبح کا

واضح اور روشن ہو جانا۔ (۹۱/۱۸) نَافَسَ اور تَنَافَسَ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہیں۔ (۸۳/۲۶)

نیز اس کے معنی عِنْدِیْ (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں۔ تاج العروس نے اس کی مثال کے لئے سورۂ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ (۵/۱۱۶) لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب) جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (پاس) ہے میں اُسے نہیں جانتا۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں۔ مثلاً وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (۳/۲۸) اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانون مکافات کی رُو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

اَنْفُسٌ کے معنی بھائی بند بھی ہیں۔ (۲/۸۴) اور خود اپنا آپ بھی (۲/۴۴) اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (MYSELF) یا (YOURSELF) یا (HIMSELF) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں اس لفظ (نَفْسٌ) کو قرآن کریم نے اس "شے" کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ جسے ہم انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا (اقبالؒ کی اصطلاح میں) خودی (SELF) یا اَنَا (I AM-NESS) کہتے ہیں۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پر استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصوراتِ حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رُو سے یہ آخرالامر مر جاتا ہے اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریۂ حیات ——— (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ جسے عام طور پر "مغربی

تہذیب" کہا جاتا ہے۔ وہ اسی نظریۂ حیات کی مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رُو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کریں گے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور وہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں، یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس کے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ (دیکھئے مثلاً (۲۹/۶۴-۶۱ ، ۲۳/۸۸-۸۴ : ۳۹/۳۵ : ۳۹/۳۸ : ۴۳/۹)۔ اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اس طبیعی زندگی کا نام ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے، یا زیادہ سے زیادہ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہہ دے۔ اور شر وہ جس سے اُسے نقصان پہنچے، یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے اور بس۔ قرآنِ کریم اُسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورۂ الجاثیہ میں ہے۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنے علم کے باوجود غلط روشِ زندگی پر چلتا ہے۔ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً"۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اُس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۲۳) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے۔ اس کی صحیح راستے کی طرف بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (قوانین طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور مرورِ زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِذَالِكَ مِنْ عِلْمٍ - اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ - (۴۵/۲۴)۔ انہیں حقیقتِ حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لے کر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں۔

قرآنِ کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) جو لوگ اس (بلند سطح زندگی) سے انکار کرتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح کھاتے، پیتے اور سامانِ زیست سے فائدے اٹھاتے (اور پھر مر جاتے) ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور "شے" بھی ہے جسے اس کی ذات، یا نفس کہتے ہیں۔ یہ قوانین طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشوونما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ اور مرنے کے بعد، وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما ان قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں) اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر "ایمان" اور خدا، وحی، نبوت، اور آخرت پر ایمان کس طرح لازم و ملزوم ہیں۔

"انسانی ذات کیا ہے؟" یہ نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی "شے" ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے۔ اختیار و ارادہ (بصورتِ مطلق اور کلی طور پر) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ (محدود شکل میں) انسان کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔ اسی لئے اسے خدا نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY)۔ (دیکھئے عنوان (ر۔ و۔ ح) اگر انسان، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے، تو اس کی ذات میں (حد بشریت کے اندر) صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کو اس کی ذات کی نشوونما کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات (وہ خدا کی ہو یا انسان کی) ایک غیر منقسم وحدت (INDNISIBLE WHOLE) ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی (۴۰/۱۹) یہی اس کا "اعمال نامہ" ہے جو اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ (۱۷/۱۳) اسی کو وہ ظہور نتائج کے وقت پڑھے گا۔ اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (۱۷/۱۴) "تو آج اپنی کتاب پڑھ آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ (نیز ۵۰/۱۵-۱۴) اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ثابت ہوتی ہے۔ (۶/۹۴ ، ۱۹/۹۵) یعنی ہر انسانی ذات منفرد (UNIQUE) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (۶/۱۶۴) ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے۔ (۶/۱۰۴ ، ۱۰/۱۰۸ ، ۱۷/۷ ، ۱۷/۱۵ ، ۲۷/۹۲ ، ۲۹/۶ ، ۳۰/۴۴ ، ۳۱/۱۲ ، ۳۵/۱۸ ، ۳۹/۴۱ ، ۴۱/۴۶ ، ۴۵/۱۵ ، نیز ۳۹/۷ ، ۵۳/۳۸) جب اتباعِ قوانینِ خداوندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں۔ لیکن جس ذات کی نشوونما نہیں ہوتی۔ وہ آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے۔ (دیکھئے عنوانات[1] (ج ، ن - ن) ، (ج - ح - م) ، (جہنم) یوں تو انسانی ذات کی نشوونما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بن کر ہی کیا جا سکتا ہے) لیکن قرآنِ کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے۔ جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۔ (۹۲/۱۸-۱۷) جہنم سے اُسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو "دیتا" ہے۔ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵) "جو دیتا ہے اور (اس طرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے"۔ (نیز دیکھئے ۵۹/۹ ، ۶۴/۱۶)۔

---

[1] :- لغات القرآن - از پرویز میں

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد یا امکانی قوت ہے جو بجائے خود خیر ہے نہ شر۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (HIGHER VALUES) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے۔ تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے۔ (اسی سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے) اور جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو پست مفادِ خویش کی خاطر استعمال کرتا ہے (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو (EGO) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایغو، حیوانی سطح زندگی پر ہوتا ہے اور ذات، انسانی سطحِ زندگی پر۔ جب انسانی جذبات (EMOTIONS) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں "ھَوٰی" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (اس مادہ میں "پستی" کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھئے۔ عنوان ھ۔ و۔ ی) اور جب عقل (INTELLECT) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس جب جذباتِ انسانی انسانی ذات کے تابع رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل، انسانی ذات کے تابع فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہو جاتا ہے (اقبالؔ، اول الذکر عقل کو عقل خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں، یا خرد "ادب خوردہ دل" کہہ کر پکارتا ہے۔)

جب ایغو، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر، پست مفاد کی طرف جاتا ہے تو اُسے عام طور پر "نفسِ امارہ" کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآنِ کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے جس میں اس نے عزیزِ مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ۔ (۱۲/۵۳) یقیناً نفس، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفسِ انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا۔ بالکل نہیں۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ (۱۲/۵۳) بجز اس کے جس پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ نفس کی وہ سطح ہوگی جسے ہم نے "انسانی ذات" سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات نفسِ انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساسِ ندامت بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش..... کی حالت ہوتی ہے۔ اسے قرآنِ کریم نے نفسِ لوّامہ کہا ہے۔ (۷۵/۲) یعنی "ملامت کرنے

والا نفس"۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کر سکے۔ خیر اور شر کی تمیز صرف وحی کی رُو سے ہو سکتی ہے۔ نفسِ لوّامہ اُسی بات پر ملامت کرے گا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے۔ وہ درحقیقت معیوب ہو اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے، وہ درحقیقت ممدوح ہو۔ (تفصیل اس اجمال کی (ل۔ھ۔م) اور (ق۔ط۔ر) کے عنوانات میں ملے گی۔)

جب انسان خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے، تو ابغوا اور ذات کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے۔ ذات پست جاذبیتوں پر غالب آجاتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (۸۹/۲۷) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے۔ (۸۹/۲۹) اسے عصرِ حاضر کے علم النفس کی زبان میں (INTEGRATED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ اس کے برعکس (DISINTEGRATED PERSONALITY) ہوگی۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فَجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ (۹۱/۸-۹) سے تعبیر کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ل۔ھ۔م) اور ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے۔ (۹۱/۱۰)۔

چونکہ انسانی ذات، امکانی شکل (REALISABLE FORM) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے، اس لئے اس کی بنا پر ہر فرزند آدم، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام فرزندان آدم کو واجب التکریم بنایا ہے"۔ ذات کی تکریم کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے۔ انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کر لینا، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں) اُسے شرف انسانیت سے محروم کر دینا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اطاعت یا محکومی، صرف قوانینِ خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ (اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان (ع۔ب۔د)) یہ اطاعت کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ (اطاعت کے معنی ہی بطیبِ خاطر، برضا و رغبت، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲/۲۸۶) سے یہی مراد ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی انسان پر جو پابندیاں عاید کرتے ہیں تو اس سے مقصد، خود انسانی ذات

میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا۔ (دیکھئے عنوان ل۔ل۔ف) قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اسی طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنّتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں بھی جنّتی زندگی، خانقاہیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشوونما کبھی نہیں ہو سکتی۔ جنت کے لئے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ (۸۹/۲۹) پہلی شرط ہے۔

سورۂ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ (۳۹/۴۲) اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا حکم ہو جاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے۔ اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیج دیتا ہے۔" سوال یہ ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے کیا مطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے۔ اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اُسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بصورتِ موت اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک نیند کا تعلق ہے، ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے، بجز شعور (CONSCIOUSNESS) کے۔ (حتیٰ کہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے مراد اس کی شعوری حالت ہے۔ یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں اس کا شعور باقی نہیں رہتا۔ سونے والا جب جاگ اُٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر روبہ عمل ہو جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد، شعور کیسے روبہ عمل ہوتا ہے، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے روبہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے ہمارا مادی جسم۔ ہم اس وقت جسم کے توسط کے بغیر، شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا۔ نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا۔ اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے، اس کے بتانے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآنِ کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے۔

(۱۹۶۱ء)

۶۔ الُوہیاتی توانائی

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ آپ انسانی ذات کے لئے "الُوہیاتی توانائی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ "توانائی" ذاتِ خداوندی کا جزو ہے؟

جواب:۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب وعلل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہیئے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے "مادی توانائی" کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار وارادہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسم انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ طبیعی توانائی، اس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس "توانائی" کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ (یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں، خدا کی طرف سے براہِ راست ملی ہے۔ یہ "انسانی ذات" ہے۔ اسی کو میں "الوہیاتی توانائی" سے تعبیر کرتا ہوں۔ "الوہیاتی" ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں "اللہ کی طرف منسوب"۔ لہٰذا "الوہیاتی توانائی" سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی طرف منسوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی "غیر از خدا" کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ "انسانی توانائی" کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ "مادی توانائی" سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ "ذات" کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انسانی ذات یا الوہیاتی توانائی کے ساتھ یہ لکھ دیا کرتا ہوں کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہے، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ اسے ذاتِ خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالےٰ کی عطا کردہ "توانائی" ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے، نہ

اس کا منتہیٰ۔ اس کی ذات سے جا کر مل جاتا ہے۔ یہ توانائی ، غیر نشو ونما یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں ملتی ہے اور اسے نشو ونما دینا ، انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اسی لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور اُس کی ذات اس کے طبیعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی۔

(۱۹۶۰ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب دوم

رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ رحمۃ للعالمین

(محترم پرویز صاحب کی تقریر جو ۱۲ر دسمبر کی شام، بتقریب عید میلاد النبیؐ ریڈیو اسٹیشن کراچی سے نشر ہوئی اور جسے ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام)

یہ قرآن کا ارشاد ہے اور ہمارا ایمان کہ حضور نبی اکرم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تمام اقوام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین (۲۱/۱۰۷) غیر مسلم اقوام بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہیں کہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے متعلق جو عقیدہ چاہیں رکھیں، لیکن وہ یہ دعوے کس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کے پیغمبرؐ کا ظہور دوسری اقوام کے لئے بھی رحمت ہے؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اس کے جواب کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری کے علاوہ یہ دعوے اتنا بڑا ہے کہ خود اس کی اہمیت اس کے ثبوت کی متقاضی ہے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کی رسالت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷) وہ ان تمام بندشوں کو توڑ دے گا جو نوع انسان کی حریت و آزادی کی راہ میں حائل تھیں اور تمام زنجیروں کو کاٹ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسی زنجیریں تھیں جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور نبی اکرمؐ نے ان زنجیروں کو کس طرح توڑا۔

سب سے پہلے نظامِ حکومت کو لیجئے۔ انسانوں کو دنیا میں مل جل کر رہنا ہے۔ اس کے سوا ان کی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔ مل جل کر رہنے سے باہمی مفاد کا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس ٹکراؤ سے نزاع اور اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ فساد ہے۔ لہٰذا، انسان کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ مل جل کر رہنے کی کون سی شکل پیدا کی جائے جس سے اختلافات اور نزاعات پیدا نہ ہوں۔ اور اگر پیدا ہوں تو ان کا تصفیہ امن اور سلامتی سے ہو جایا کرے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے جو صورت تجویز کی اُسے نظامِ حکومت کہتے ہیں۔ حکومت کا وجود تو عمل میں آیا اس ضرورت کے ماتحت، لیکن ہوا یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آگیا، انہوں نے اُسے خود اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ انہیں خدشہ تھا کہ ان کی اس مستبدانہ روش کے خلاف لوگوں کے دل میں بغاوت کے خیالات پیدا ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے آہستہ آہستہ اس قسم کا عقیدہ پیدا کر دیا کہ بادشاہ خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے اور دوسرے انسان اس کی خدمت اور اطاعت کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ظہورِ نبی اکرمؐ کے وقت تمام مہذب دُنیا کی یہی حالت تھی۔ ہر ملک اور ہر قوم میں تمام اقتدارات بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔ جسے ایشور کا اوتار اور خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا اور باقی انسان اس کی خدمت گزاری اور فرماں پذیری کے لئے زندہ رکھے جاتے تھے۔ مدتوں کی غلامی سے دنیا اس نظامِ حکومت کی اس درجہ خوگر ہو چکی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور نظامِ حکومت ان کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔

نبی اکرمؐ تشریف لائے اور انہوں نے ساری دنیا کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو! کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی چلائے۔ انسانوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ ان کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیئے۔ یعنی نظامِ حکومت مشاورتی ہونا چاہیئے نہ کہ شخصی اور استبدادی۔ اس ایک آواز نے غلامی اور محکومی، زیردستی اور فرماں پذیری کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ آج ساری دنیا اس مشاورتی نظام کو بہترین نظامِ اجتماعیہ قرار دے رہی ہے۔ اگر آج سے تیرہ سو سال پہلے صحرائے حجاز سے یہ آواز نہ اٹھتی تو سوچئے کہ آج دنیا کی کیا حالت ہوتی؟ کیا یہ آواز تمام نوعِ انسانی کے لئے نشیدِ رحمت نہیں ثابت ہوئی؟

اب ایک اور سمت دیکھئے۔ ملوکیت کی غلامی انسان کے جسم کی غلامی تھی۔ لیکن اس سے بدتر ایک اور غلامی تھی جس کے طوق وسلاسل میں انسان کی روح جکڑی ہوئی تھی۔ یہ غلامی تھی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی غلامی۔ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی سے انسان کی یہی دنیا برباد ہوتی تھی۔ لیکن مذہبی پیشواؤں کے ارشاد کی تکمیل میں ذرا سی کوتاہی، دنیا اور آخرت دونوں میں ذلت ورسوائی کا موجب بن جاتی تھی، اس لئے ان کی حکومت انسان کی روح پر چھائی ہوئی تھی۔ اور ان کی ہیبت اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذرّوں میں حلول کر چکی تھی۔ نبی اکرمؐ آئے اور آپ نے ساری دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ یاد رکھو! خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ بارگاہِ خداوندی کا حاجب و دربان بن کر بیٹھ جائے۔ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ اس آوازۂ حریت سے باطل کی عقیدت مندیوں کی تمام زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑیں۔ اگرچہ وہ سو سال پہلے یہ آواز بلند نہ ہوتی تو آج روحِ انسانیت کن زنجیروں میں جکڑی ہوتی! کیا یہ آواز ساری دنیا کے لئے نویدِ رحمت نہیں بنی؟

ملوکیت اور پیشوائیت نے اپنے استبداد کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا کہ کچھ انسان پیدائشی طور پر حکومت اور پرستش کے حقوق لے کر آتے ہیں اور دوسرے انسان جنم ہی سے محکوم قوموں میں لیتے ہیں۔ انسانوں کی یہ تقسیم خود خدا کی متعین کردہ ہے، اس لئے اس کے خلاف لب کشائی خدا کے فیصلوں کے خلاف سرکشی ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ فریبِ ملوکیت و پیشوائیت ایک مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ احترامِ آدمیت کا پرچم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ساری دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یاد رکھو! پیدائش کے اعتبار سے چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں۔ عزت اور تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ خاندان کی نسبتیں۔ پیدائشی نسبتوں سے معاشرے میں امتیازی خطوط کھینچنے والے، فسادِ آدمیت کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس آواز نے تمام انسانوں کو ایک صف میں لا کھڑا کر دیا اور اس طرح پیدائشی امتیازات کے وہ تمام بندھن ٹوٹ گئے جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ پوچھئے تاریخ عمرانیت کے مبصرین سے کہ اگر دنیا میں یہ آواز نہ ہوتی تو آج دُنیا کس دور سے گذر رہی ہوتی۔!

اور آگے بڑھئے! انسانوں نے مختلف ملکوں اور خطوں میں بسنا شروع کیا اور یہی خطے ان کا وطن

قرار پا گئے۔ اِس سے زیادہ ان جغرافیائی حدود کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ لیکن ذہن انسانی کی تنگ نظری سے دریاؤں اور ندیوں کی یہی لکیریں قومی امتیازات کے سانپ بن گئیں اور اس کے بعد ہر خطے کا انسان دوسرے خطے کے انسانوں کے خون کا پیاسا ہوگیا۔ یہی وہ قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جو دُنیا میں اس قدر کشت وخون اور تباہی وبربادی کا موجب بن رہی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے تمام دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ تمہارے وطنوں کی لکیریں خود ساختہ ہیں۔ تمام انسان بلاتمیز رنگ ونسل وزبان ووطن ایک درخت کی شاخیں اور ایک کنبے کے افراد ہیں۔ ان سب کو ایک بن کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ ان سب کی حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ آج ساری دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی جو آوازیں اُٹھ رہی ہیں کیا وہ اِسی پیغامِ وحدتِ انسانیت کی صدائے بازگشت نہیں؟ سوچئے کہ اگر قضائے عالم اس آواز سے ناآشنا ہوتی تو کسی ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہوسکتا تھا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو ایک برادری کی طرح ایک عالمگیر نظام کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے؟

اب انسان کی زندگی کے ایک اور گوشے کو لیجئے۔ انسان کی حالت یہ تھی کہ مذہبی دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی نجات کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا اور معاشی دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی فکر میں سرگرداں وحیراں یعنی ساری دنیا میں محض افراد (INDIVIDUALS) بستے تھے۔ انسانیت (HUMANITY) کا کہیں وجود نہ تھا۔ سوچئے کہ جس دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی فکر میں مضطرب وبے چین پھر رہا ہو، اِس میں کس قدر نفسانفسی کی قیامت برپا ہوگی؟ اس تخم انفرادیت کا نتیجہ وہ شجرِ خبیثہ ہے جسے سرمایہ داری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں ہر انسان دوسرے کا خون پی جانے کی فکر میں رہتا ہے۔ دُنیا اِس جہنم سے گذر رہی تھی کہ نوعِ انسانی کا وہ محسنِ اعظمؐ آیا اور اس نے وحدتِ انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت کو اس طرح اجاگر کرکے دکھا دیا کہ ہر فرد کو دوسرے افراد کی پرورش اور تربیت میں خود اپنی ذات کی بالیدگی اور برومندی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ جو نظام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل اور ان کی مُضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے اسباب وذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار نہیں بنتا۔ اُسے دنیا میں قائم رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ پیغام نہ تھا، ایک زلزلہ تھا جس سے دنیا کا ہر قارون زمین میں دھنس گیا اور اُس کے تمام خزانوں اور دفینوں کے دروازے ہر حاجت مند کے لئے کھل گئے۔ کہئے کہ یہ زلزلہ انگیز پیغامِ انقلاب تمام نوعِ انسانی کے لئے مایۂ رحمت تھا یا نہیں؟

آپ ان چند اُبھرے ہوئے عنوانات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ پیغمبرِ اسلام کا ظہور تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت ہے یا نہیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ آپؐ کی ذاتِ گرامی، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، دُنیائے قدیم اور دُنیائے جدید کے درمیان ایک حدِ فاصل کے طور پر کھڑی ہے۔ اس مقام سے انسانیت کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑی ہے جس سے اس کے سامنے زندگی کی جدید راہیں کھل گئی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس تیرہ سو سال میں انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جس قدر ایسے انقلابات آئے ہیں جن کے نتائج تعمیرِ انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں، ان کا سرچشمہ وہی پیغام تھا جو **محمد رسول اللہ** کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ اس پیغام نے انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئی تعبیر عطا کی جس سے نبضِ کائنات باندازِ نوتپش آمادہ ہوگئی۔ کارلائل کے الفاظ میں،

> نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی۔
> وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور ساری
> دُنیا کو شعلہ صفت بنا گیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی اسی کو راستہ دکھا سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ بارش اسی کسان کی جھولی موتیوں سے بھر سکتی ہے جس نے اپنے کھیت کو سیرابی کے قابل بنا رکھا ہو، اسی طرح رسالتِ محمدیہ بھی اسی قوم کے لئے صحیح معنوں میں رحمت بن سکتی ہے جو اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کرے جو اس پیغامِ خداوندی نے نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے متعین کئے ہیں۔ اسی لئے دوسرے مقام پر ہے کہ و رحمۃ للذین امنوا منکم (۹/۶۱) یہ رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس نظامِ خداوندی کو اپنا نصب العین زندگی بنائیں۔ رحمت کہتے ہیں اس قالب (PATTERN) کو جس کے اندر کوئی شے اپنی تکمیل کو پہنچے۔ انسان کی صلاحیتیں صرف اس قالب کے اندر اپنی کامل نشوونما حاصل کر سکتی ہیں جو آئینِ خداوندی کی حدود سے متشکل ہوتا ہے۔ جب انسانی ہیئتِ اجتماعیہ اس نظام کے قالب میں ڈھل جائے گی۔ اس وقت انسان دیکھے گا کہ رسالتِ محمدیہ کس طرح فی الواقعہ رحمۃ للعالمین ہے۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

(جنوری ۱۹۵۲ء)

س:۔ رحمۃ للعالمین

"طلوعِ اسلام"، شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء میں آپ کا نشریہ بعنوان "رحمۃ للعالمین" شائع ہوا۔ اس میں آپ نے رسول مقبولؐ کو نوعِ انسان کے لئے تو کماحقہٗ رحمت للعالمین ثابت کیا۔ لیکن "رحمۃ للعالمین" میں "عالمین" کا لفظ صرف نوعِ انسانی تک ہی محدود ہے یا اس کا اطلاق تمام کائنات پر ہوا ہے؟ اگر اس میں انسان کے علاوہ دیگر جملہ موجودات و مخلوقات بھی شامل ہیں تو پھر براہِ کرم مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر اِس نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

جواب

رسولوں کی بعثت ہمیشہ انسانوں کی طرف ہوتی ہے۔ قرآن میں اس کی صراحت (متعدد مقامات پر) موجود ہے۔ خود نبی اکرمؐ کو بھی تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اندریں حالات، رسالتِ محمدؐ کی رحمت بھی انسانی دنیا کے لئے ہے۔ ($\frac{۲۵}{۱}$: $\frac{۳}{۹۶}$ - $\frac{۲۱}{۷۱}$ - $\frac{۲۱}{۹۱}$)

۲۔ کیا حضورؐ کا سایہ نہ تھا؟

سوال

روایت ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہ تھا۔ لیکن اس گنہ گار کو اس میں تأمل ہے۔ یعنی بشریت کے ساتھ سایہ نہ ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عہدِ نبویؐ میں منکرینِ رسالت کے لئے ایک حجت ہوتا یا پھر اس کی کوئی تاویل ہوگی کہ یہ صحابہ کرامؓ سے غائب اور غیر صحابہ کے سامنے موجود۔ بہرحال آپ کے نزدیک یہ روایت کہاں تک معتبر ہے؟

جواب

ہمارے نزدیک تو معتبر خدا کی کتاب ہے جس میں ایک بار نہیں متعدد بار یہ صراحت موجود ہے کہ رسولؐ اللہ کو

قرآن کے سوا کوئی اور معجزہ نہیں دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں کے ذوق اعجوبہ پسندی نے اس قسم کے ہزاروں معجزات حضورؐ کی طرف منسوب کر رکھے ہیں اور کتب روایات ان سے بھری پڑی ہیں۔ قرآن کی صراحت کے بعد کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

۳۔ حضورؐ کی شان میں (معاذاللہ) گستاخی

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ آئے دن اخبارات میں کوئی نہ کوئی خبر اس قسم کی شائع ہوتی رہتی ہے کہ فلاں عیسائی یا فلاں ہندو نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے کلمات لکھے ہیں۔ ایسی خبر کے بعد چند روز کے لئے ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا بدلہ خود لے لیا جاتا ہے اور کبھی قانون کے ذریعے ایسی کتابوں یا رسالوں کو ضبط کرا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے اور مسلمان کسی ایسی خبر پر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے۔ کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کی جا سکتی کہ اس قسم کی باتیں لکھی ہی نہ جائیں تاکہ آئے دن ہمارے جذبات مجروح نہ ہوں۔

جواب

حضور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف دریدہ دہنی ایک ایسی ننگِ انسانیت گستاخی بلکہ شرف و احترام آدمیت کے خلاف جرم ہے جسے ہم عالمِ تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن ان باتوں کا سدِ باب ہمارے اور آپ کے جذبات سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علاماتِ مرض کی بجائے علتِ مرض کی تشخیص کی جائے۔ اور اس کے بعد اس کا علاج۔

سوال یہ ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یعنی کیا یہ لوگ اس قسم کے قصے یونہی از خود وضع کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ یا انہیں کہیں سے لیا جاتا ہے۔ یورپ کے مستشرقین کی کتابیں اس قسم کی لغویات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ان لغویات کو از خود وضع کیا ہے یا کہیں سے نقل کیا ہے۔ آپ کے لئے شاید یہ چیز موجب استعجاب ہو کہ مستثنیات کے سوا اس قسم کی تمام لغویات و خرافات کا ماخذ خود ہمارے اپنے ہاں کی کتابیں ہیں۔ اور وہ کتابیں

بھی بازاری قصے کہانیوں کی نہیں بلکہ وہ کتابیں جنہیں ہم ہزار برس سے سر پہ اٹھائے اٹھائے، سینوں سے لگائے پھر رہے ہیں، یعنی ہمارے ہاں کی احادیث اور تفاسیر کی کتابیں۔ تفاسیر کے متعلق تو پھر بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی عام انسان کے خیالات ہیں۔ لیکن احادیث کے متعلق تو ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ وہ خود رسالت مآب صلعم کے اقوال و افعال کا مجموعہ ہیں۔ اگر آپ ان احادیث کے مجموعوں کو اٹھا کر دیکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان میں وہ سب کچھ موجود ہے جنہیں ہم عیسائیوں اور ہندوؤں کی کتابوں اور رسالوں میں نقل شدہ دیکھ کر اس طرح آتش در پیراہن ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارا خون کھولنا بجا ہے۔ لیکن ہماری بدبختی یہی ہے کہ ہم ان کتابوں کو جن سے یہ خرافات لی جاتی ہیں، اپنے ہاں کے مقدس ترین صحائف بلکہ من جانب اللہ وحی قرار دیتے ہیں، اور جب کوئی انہیں چیزوں کو اپنے ہاں نقل کر دیتا ہے تو اُسے گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ ہم اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اسے آپ کبھی صحیح باور نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ آپ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے ہاں کی ایسی برگزیدہ کتابوں میں اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہوئی ہوں گی۔ اس کے سمجھانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں کہ یا تو ہم اپنے ہاں ان چیزوں کو نقل کر کے دکھا دیں۔ لیکن اول تو ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ ان چیزوں کو جو حضور سرور کائنات صلعم کی ذات اقدس کے خلاف ایسا کچھ کہہ رہی ہوں طلوعِ اسلام میں شائع کر دیں۔ اور اگر محض اس مقصد کی خاطر ان چیزوں کو پیش بھی کر دیا تو ہمیں خود اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات نہایت شدت سے مشتعل کر دیئے جائیں گے۔ دوسرا طریقہ ہے کہ ان چیزوں کو آپ از خود پڑھیں۔ ہم آپ سے یہ التماس کرتے ہیں کہ آپ صرف ایک "بخاری شریف" ہی کو لیں۔ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر دیکھیں کہ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف کیا کیا کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرمالیں کہ دیگر کتب احادیث اور تفاسیر میں کیا کیا کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا، اس مرض کا علاج چور کی بجائے چور کی ماں کو مارنا ہے۔ جب تک آپ اپنے ہاں ان کتابوں کو علیٰ حالہٖ رائج رکھیں گے اور انہیں مستند، صحیح اور مقدس بیان کرتے رہیں گے، غیر مسلم اپنے ہاں ان چیزوں کو درج کر کے اسلام اور حضور رسالت مآب صلعم کے خلاف نفرت پھیلاتے رہیں گے۔ آپ اپنے گھر کو اس لغویت سے پاک کیجئے اور اس کے بعد ہر ایسے مصنف سے، جو اس قسم کی لغویات اپنے ہاں لکھے، پوچھئے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ماخذ کیا ہے۔ جب آپ کے ہاں کا مذہبی لٹریچر پاک اور صاف ہو جائے گا تو پھر ایک آدھ نسل کے بعد

اس قسم کے دریدہ دہن پیدا ہونے خود بخود بند ہو جائیں گے۔ مچھروں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ اپنے ماحول کی صفائی ہوتا ہے۔ خالی فلٹ چھڑکنا نہیں۔ یہ کام درحقیقت اسلامی حکومتوں کے کرنے کا ہے کہ وہ ہمارے ہاں کی ان کتابوں کو ان خرافات سے پاک کر دیں۔ جو دورِ اوّل کے یہود اور نصاریٰ اور مجوسیوں کی سازش کے ذریعے ہمارے ہاں بار پا چکی ہیں۔ اس کام کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ اور یہ جرأت وہی کر سکتا ہے جس کے اندر اتنی قوت ہو کہ وہ مذہبی پیشواؤں کے سہارے کے بغیر اپنے پاؤں پہ کھڑا رہ سکے۔ اس باب میں ہم سردست اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دیکھیں :۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکین و لکم ماندہ وریں کشمکش اندر

(۱۹۵۳ء)

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیب کا علم

ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے طلوع اسلام میں احادیث کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس سے آپ نے یہ نہیں سوچا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے کہ آپؐ کو غیب کا علم نہیں تھا۔ مثلاً ایک جگہ آپ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مقدمہ آتا اور فریق متعلقہ اس میں غلط بیانی سے کام لیتا تو حضورؐ اس کے بیان کو پیشِ نظر رکھ کر ہی فیصلہ فرما دیتے۔ گویا آپؐ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اس سے رسولؐ اللہ کی شان بہت گر جاتی ہے۔ یہ احادیث کو نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔

جواب

ہمارے یہ بھائی اپنے غصّے میں یہ بھی بھول گئے ہیں کہ وہ جس بات پہ اعتراض کر رہے ہیں وہ خود حدیث ہی میں ہے اور ہم نے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ یعنی یہ حدیث میں موجود ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جب تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو تو میں تمہارے بیانات کے مطابق ہی فیصلہ دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص

جھوٹ بول کر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیتا ہے تو وہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ حدیث ہمارے نزدیک اس لئے صحیح تسلیم کر لینے کے قابل ہے کہ اس کا مضمون قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن میں بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں بجز ان باتوں کے جو قرآن کے اندر درج ہیں[1]۔

باقی رہا یہ کہ رسول اللہ صلعم کی شانِ مبارک، احادیث کو حضورؐ کے ارشادات مان کر بڑھتی ہے یا گر جاتی ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے احادیث کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر آپ سُننے کی تاب رکھیں تو ہم اسی باب (یعنی رسول اللہ کے فیصلوں کے باب میں) صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس سے آپ خود جس نتیجہ پر پہنچیں ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم باب برأت حرم النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے اور اس کا متن یہ ہے۔

مقطوع الذکر والی روایت

ان رجلا کان یتہم بام ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی اذھب فاضرب عنقہ فاتاہ علی فاذا ھو فی رکیٍّ یتبرد فیھا فقال لہٗ علی اخرج فناولہٗ یدہٗ فاخرجہ فاذا ھو مجبوبٌ لیس لہٗ ذکرٌ فکف علیؓ عنہ ثم اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انہ لمجبوبٌ مالہٗ ذکرٌ۔ (عن انس)

ترجمہ اس کا یہ ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ام ولد سے زنا کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اور اس شخص کو قتل کر دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس پہنچے تو وہ کنوئیں میں نہا رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ باہر نکلو۔ اس نے اپنا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو نکال کر دیکھا تو وہ ہیجڑہ تھا اور اس کا عضو مخصوص ہی نہیں تھا۔

ہم نے سینے پر پتھر رکھ کر مسلم شریف کی اس حدیث مقدس کو نقل کیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی ہمارا بھائی یہ سمجھتا رہے کہ احادیث کو دین ماننے سے رسول اللہ صلعم کی شان بڑھتی ہے تو ہمارے پاس اس کا

---

[1] : $\frac{۶}{۵۰} - \frac{۷}{۱۸۸} + \frac{۳}{۴۴} - \frac{۱۱}{۴۹} + \frac{۱۲}{۱۰۲} - \frac{۳}{۱۷۹} + \frac{۷۲}{۲۶-۲۷}$

کوئی علاج نہیں۔ یہودیوں اور مجوسیوں کی یہ سازش بڑی گہری تھی۔ اور آج ہمارا مولوی صاحبان کا طبقہ اس سازش کو زندہ، پائندہ اور تابندہ رکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے پاس اسلاف کے نام کی نسبتیں بھی ہیں۔ وضع و قطع کا تقدس بھی ہے، عوام کی نجات کے لئے سرٹیفکیٹ بھی ہیں اور اس لئے ان کے جذبات کے سیلاب کی قوت بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اربابِ دولت و ثروت کی حمایت کی بھی، جو سمجھتے ہیں کہ علماء کی خدمت کرنے سے نجات مل جاتی ہے۔ اُن کے خلاف طلوعِ اسلام کے پاس ان حربوں میں سے کوئی حربہ بھی نہیں۔

گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں! (۱۹۵۳ء)

معراجِ نبویؐ

---

۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کے الاعتصام میں "ایک زبردست دلیل" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"علم و حکمت کی رُو سے اس سال کا یہ اہم واقعہ ہے کہ روس کا کائناتی راکٹ چاند کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ ڈھائی لاکھ میل ہے جو روسی راکٹ نے ۳۳ گھنٹے میں طے کیا۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ راکٹ کے چاند میں اترنے سے قبل ایک کالا دھبہ نمودار ہوا جو بعد میں کئی کالے دھبوں میں بدل گیا۔ یہ دھبے راکٹ کے چاند میں اترنے کے بعد ایک گھنٹہ تک نظر آتے رہے۔

روس کے اس سائنسی کارنامے نے ساری دنیا کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا ہے۔ اور مختلف نقطہ فکر کے لوگوں کے سامنے غور و فکر کے مختلف دروازے کھول دیئے ہیں۔

روس اور اس کے حلیف اس پر خوشی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کے حریف مثلاً امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ ممالک اس پر شرما بھی رہے ہیں اور ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی پوری دنیا اس سے متاثر ہے اور اس کا اور اس کے نتائج

کا گہری نگاہ سے مطالعہ کر رہی ہے۔

یہ اس دور کا واقعی ایک کارنامہ اور سائنسی فتوحات کا حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ سرزمین عرب کی ایک شخصیت چودہ سو برس ہوئے کہ چاند سے بھی آگے نکل گئی تھی اور ایک ہی رات میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ اور پھر زمین و آسمان کے درمیانی فاصلوں کو ناپتی ہوئی انتہائی بلندیوں تک پرواز کر گئی تھی اور وہ تھی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ۔ نہ زمین کا قانون کششِ ثقل آپ کے راستہ میں مزاحم ہو سکا اور نہ گرم و سرد کرّے آپ کی رفتارِ پرواز پر اثر انداز ہو سکے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں روسی راکٹ نے ڈھائی لاکھ میل کا سفر ۳۳ گھنٹے میں طے کیا ہے تو اُس زمانہ میں جب کہ علم و حکمت کی اس اسلوب سے ابھی صبح بھی طلوع نہیں ہوئی تھی۔ اللہ کے اس "عبد" نے صرف ایک رات میں اس سے بھی زیادہ سفر کر لیا تھا۔

سائنس کا یہ موجودہ کارنامہ ہمارے لئے ہرگز باعثِ حیرت و تعجب نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کی صداقت پر ایک زبردست دلیل ہے۔

اگر انسانی علم اتنی ترقی کر سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا راکٹ، چاند اور سورج کی دنیا میں داخل ہو سکے تو اللہ تعالےٰ کے علم و حکمت میں کیوں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی کہ اپنے ایک برگزیدہ پیغمبر کو ایک ہی شب میں ہفت افلاک کی سیر کرا دے اور وہاں کے واقعات آپ پر منکشف کر دے۔"

کس قدر مقامِ تأسف ہے کہ یہ حضرات اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس چیز کے متعلق یہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔ اس سے غیروں کی نظروں میں اسلام کیا بن کر رہ جاتا ہے! راکٹ کا چاند تک پہنچ جانا یا اس سے بھی آگے نکل جانا، مادی ذرائع سے ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ یہ جسدِ مبارک عالم افلاک کی سیر کے لئے تشریف لے گئے تھے تو اس کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ایسا مادی ذرائع سے ہوا تھا۔ لہٰذا جو بات مادی ذرائع (اور صرف مادی ذرائع) سے ممکن ہو اُسے کسی ایسی بات کی "زبردست دلیل" قرار دینا جس میں مادی ذرائع کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ علم کی دُنیا میں موجبِ خفت ہوگا۔

اس مقام پر اتنا عرض کر دینا غیر از محل نہ ہوگا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ عالم بالا پر بہ جسد مبارک تشریف نہیں لے گئے تھے (اور خود صحابہؓ کبار میں ایسے حضرات موجود تھے جو جسمانی معراج کے قائل نہ تھے۔ ابن کثیر) انہیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضورؐ بہ جسد عنصری آسمانوں پر تشریف لے جا کر، اللہ تعالےٰ سے ملے تھے تو اس سے یہ ماننا لازم ہو جائے گا کہ خدا کسی خاص مقام پر مقیم ہے جہاں جا کر اس سے ملا جاتا ہے۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق ایسا تصور قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ خدا مکان اور زمان کی نسبتوں سے بلند ہے، وہ تو ہر انسان سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے اور جہاں بھی کوئی ہو، وہیں اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ ($\frac{۸}{۲۴}$ - $\frac{۵۰}{۱۶}$ - $\frac{۵۷}{۳}$ - $\frac{۵۸}{۷}$)

(سنہ ۱۹۵۹ء)

۹

قرآنِ کریم

۱- وحی اور الہام

گوجرانوالہ سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ بعض "احمدی" حضرات کہتے ہیں کہ قرآن میں رسولوں کی طرف وحی کے علاوہ الہام کا بھی ذکر ہے اور اس کے لئے وہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۱ پیش کرتے ہیں۔ اس آیت کی تشریح کر دی جائے۔

طلوعِ اسلام | سورۂ شوریٰ کی متعلقہ آیت حسب ذیل ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ (۴۲/۵۱)

سادہ زبان میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس کے ساتھ کلام کرے بجز اس کے اس کی طرف وحی بھیجے یا پردہ کے پیچھے سے ہو یا کوئی رسول بھیجے اور اس طرح اپنے قانونِ مشیت کے مطابق وحی کر دے۔ یقیناً وہ بلند حکمت والا ہے" اب اس کا مفہوم سمجھئے جو بالکل صاف ہے۔ یہاں انسانوں تک خدا کا کلام پہنچنے کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ عام انسان۔ پہلے رسولوں کے

متعلق کہا گیا ہے کہ ان تک خدا کا کلام کس طرح پہنچتا ہے اِس کے دو طریقے بتائے گئے ہیں۔ایک اس وحی کے ذریعہ جو جبریلؑ کی وساطت سے بھیجی جاتی ہے جیسے رسولؐ اللہ پر وحی آتی تھی یعنی بذریعہ جبریلؑ، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (۲/۹۷) اور دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست۔ اس طرح کہ آواز سنائی دے لیکن بات کرنے والا (خدا) دکھائی نہ دے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کی طرف وحی (سورۂ طٰہٰ) میں نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی کہنے کے بعد فرمایا فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی (۲۰/۱۳)

یہ دونوں طریقے رسولوں کے ساتھ خدا کے کلام کے ہوئے۔ اب رہے وہ بشر جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ خدا نے اپنے کلام کا طریقہ یہ بتایا کہ وہ ان کی طرف اپنے رسول بھیجتا ہے اور ان رسولوں کی وساطت سے اپنا کلام ان تک پہنچاتا ہے۔ کسی غیر رسول سے خدا نہ براہ راست بات کرتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف فرشتے کے ذریعے سے اپنی وحی بھیجتا ہے۔ غیر رسول کو خدا کی وحی ہمیشہ رسول کی وساطت سے ملے گی۔

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس کی وضاحت خود اس متصل آیت نے کر دی ہے جہاں رسولؐ اللہ سے یہ فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ کہ ہم نے اس طرح (جس طرح اوپر کہا گیا ہے کہ ہم رسولوں کے ساتھ بذریعہ وحی کلام کرتے ہیں) تیری طرف عالم امر سے اپنے حکم کو وحی کیا۔ یعنی خدا سے یہ ہمکلامی حضرت موسیٰؑ کی طرح مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ نہیں ہوئی۔ بلکہ جبریلؑ کی لائی وحی کے ذریعے ہوئی۔ اس کے بعد کہا کہ تو اس سے پیشتر نہ یہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ لیکن ہم نے اس وحی کو ایک روشنی بنایا ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، صحیح راستہ دکھا دیتے ہیں۔

یہاں تک تو خدا کی اس ہمکلامی کا ذکر ہوا جو رسول اللہ صلعم کے ساتھ وحی کے ذریعہ ہوئی۔ اس کے بعد کہا کہ وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲/۵۲) اور تو (اے رسولؐ) یقیناً لوگوں کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ اس طرح غیر رسول انسانوں تک خدا کا کلام پہنچ جاتا ہے۔ یعنی رسول کی وساطت سے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس آیت میں کسی غیر رسول بشر کے ساتھ خدا کی ہمکلامی کا کوئی ذکر نہیں کیا نہ براہ راست (خواب میں یا الہام کے ذریعے) اور نہ ہی فرشتے کے ذریعے۔ لہٰذا اس

آیت سے غیر رسول کی طرف خدا کی وحی کا امکان ثابت کرنا قرآن کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔

قرآن کریم میں الہام یا کشف کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تصوّرات، بعد کے پیدا کردہ اور دوسروں سے مستعار لئے ہوئے ہیں۔ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی رُو سے خدا نے انسان سے جو باتیں کرنی تھیں وہ سب قرآن میں آگئیں۔ اس کے بعد وحی (یعنی خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے) کا دروازہ بند ہوگیا۔ قرآن محفوظ کر دیا گیا۔ الہام کا تصوّر درحقیقت باب نبوّت کو ازسرنو کھولنے کی نہایت لطیف اور "مقدس" تدبیر تھی جس نے امت کو قرآن سے بیگانہ کرکے، فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔

باقی رہا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی طرف وحی کی (اوحینا) یا حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی کی۔ تو عربی زبان میں "اوحینا" کے معنی یہ بھی ہیں کہ "ہم نے حکم بھیجا" ان مقامات میں مفہوم یہ ہے کہ خدا نے اپنے کسی بندے کی وساطت سے امّ موسیٰؑ کی طرف حکم بھیجا یا حضرت عیسیٰ کی وساطت سے حواریوں کی طرف حکم بھیجا۔ ان مقامات میں خدا کی طرف سے براہ راست وحی پانے کا سوال نہیں۔ وحی صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی تھی۔

(۱۹۵۴ء)

۲۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو

کراچی کے قارئین میں سے ایک صاحب نے وحی اور رسالت کے سلسلہ میں متعدد نکات کی وضاحت چاہی ہے انہیں سوال اور جواب کی شکل میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے استفسارات وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں آتے رہتے ہیں لیکن چونکہ اس مقام پر یہ سب یکجا سامنے آجائیں گے۔ اس لئے ان کی افادی حیثیت بڑھ جائے گی۔

۱:۔ سوال :۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو وحی دی۔ لیکن ہر نبی کو کتاب نہیں ملی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی کتاب کے ساتھ مختص نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وحی قرآن کے باہر بھی ہے۔

جواب :۔ یہ خیال یا عقیدہ کہ ہر نبی کو کتاب نہیں ملی، قرآن کریم کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ تمام انبیاءؑ کو کتاب دی گئی تھی۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔۔۔۔۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۔۔۔۔ (۲/۲۱۳) سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ خوشخبری دینے والے اور آگاہ کرنے والے۔ اور ان سب کے ساتھ (معھم) حق کے کتاب نازل کی۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی وحی اور ان کی کتاب ایک ہی چیز ہے۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو راہ نمائی (ہدایت) اس وحی کے ذریعے ملتی تھی جسے وہ انبیاء کی طرف بھیجتا تھا۔ یہی ان کی کتاب کہلاتی تھی

چونکہ ہم اپنی اصطلاح میں کتاب اس محسوس چیز کو کہتے ہیں جو (BOOK) کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہوتی ہے اس لئے ہم نے سمجھ لیا کہ نبی کی کتاب اس قسم کی کوئی چیز ہوگی جو اسے بنی بنائی آسمان سے ملتی ہوگی۔ اور جس نبی کو اس قسم کی کتاب نہیں ملتی ہوگی۔ اسے خالی وحی ملتی ہوگی۔ یہ تصور بالکل طفلانہ ہے۔ کسی نبی کو اس کی کتاب آسمان سے بنی بنائی نہیں ملتی تھی۔ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ یہی وحی اس کی کتاب تھی۔ جب وہ وحی ایک کتابی شکل میں لکھ دی جاتی تھی تو وہ ہماری اصطلاح میں کتاب بن جاتی تھی۔ جب قرآن نبی اکرمؐ پر نازل ہوتا تھا تو وہ آپ کی وحی بھی تھا اور آپ کی کتاب بھی۔ جب اس وحی کو حضورؐ نے لکھ کر امت کو دے دیا تو وہ ہماری اصطلاح میں کتاب بن گئی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم بھی جس چیز کو کتاب اللہ کہتے ہیں، وہ گتے اور کاغذ کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ کتاب اللہ درحقیقت وہ الفاظ ہوتے ہیں جو ان کاغذوں پر لکھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک حافظِ قرآن پڑھتا ہے تو (اگرچہ اس کے سامنے کوئی کتاب نہیں ہوتی) ہم یہی کہتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کی تلاوت کر رہا ہے۔ بہرحال، قرآن کی رُو سے ہر نبی کی وحی اس کی کتاب ہوتی تھی اور کوئی نبی بغیر کتاب کے نہیں آتا تھا۔

اس خیال کو کہ (نبی بغیر کتاب کے آتا ہے) مرزا غلام احمد قادیانی نے بڑی شد و مد سے عام کیا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ میں نبی ہوں، رسول نہیں ہوں۔ اور نبی اور رسول میں فرق یہ ہوتا ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی بلا کتاب کے آتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ

لگا لیجئے کہ مرزا صاحب قرآن سے کس قدر بے بہرہ تھے۔ اور اسی سے اس کا اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے آتا ہے ان کا قرآن کے متعلق علم کس حد تک ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور دلچسپ بات سامنے آتی ہے۔ جو لوگ (قرآن سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے) یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ نبی صاحبِ کتاب ہوتے ہیں اور کچھ بغیر کتاب کے۔ وہ انبیاء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک وہ گروہ جنہیں کتاب ملی۔ دوسرا وہ جنہیں وحی تو ملی لیکن کتاب نہیں ملی۔ جس گروہ کو کتاب نہیں ملی، ان کی وحی (ان کے خیال کے مطابق) کتاب سے باہر رہی لیکن جن انبیاء کو کتاب مل گئی ان کی وحی کتاب کے اندر آگئی۔ جیسے رسول اللہؐ کو کتاب ملی۔ لہٰذا ان کی وحی اس کتاب کے اندر آگئی۔ (وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ (۶/۱۹))۔ لیکن اس کے باوجود، یہ لوگ (خود اپنی تقسیم کے خلاف) یہ بھی مانتے ہیں کہ جن انبیاء کو کتاب ملی، ان کی وحی کا کچھ حصہ تو کتاب کے اندر آ گیا اور کچھ حصہ کتاب کے باہر رکھا گیا! اسی سے وہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی وحی کا ایک حصہ قرآن میں ہے اور دوسرا حصہ احادیث میں۔

ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کے متعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر تمام وحی قرآن کے اندر رکھ دی جاتی تو اس سے اس کی ضخامت بہت بڑھ جاتی۔ اور ان کی جماعت کے ایک اور صاحب نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اس زمانے میں سامانِ کتابت کی اتنی کمی تھی کہ قرآن کو تو کسی نہ کسی طرح (پتوں اور ہڈیوں وغیرہ پر) لکھ لیا گیا لیکن باقی وحی کے لکھنے کے لئے سامان میسر نہیں آ سکتا تھا۔

یا للعجب!

جو لوگ ان جوابات پر تو ہنستے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وحی کا کچھ قرآن کے اندر آ گیا ہے اور باقی باہر ہے، وہ بھی اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے کہ ایسی تقسیم کیوں کی گئی اور جو حصہ قرآن سے باہر رکھا گیا تھا۔ اس کی حفاظت کا رسول اللہؐ نے کیا انتظام فرمایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس دوسرے حصہ کی حفاظت بھی بالکل اسی طرح سے ہونی چاہیئے تھی جس طرح پہلے حصہ (قرآن) کی حفاظت کی گئی تھی۔ اور وہ بھی امت کے پاس حرفاً حرفاً یقینی اور حتمی طور پر محفوظ ہونا چاہیئے تھا۔

(۲) سوال :۔ قرآن میں رسولؐ اللہ کے متعلق ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (۵۳/۳) اس سے ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ جو کچھ اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کرتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا۔ اس لئے اقوال و افعال رسولؐ اللہ میں یہ فرق کرنا کہ اتنا حصّہ وحی کی رُو سے تھا، اور باقی حصہ وحی کی رُو سے نہیں تھا، قرآن کے خلاف ہے۔

جواب :۔ یہ صحیح نہیں کہ حضورؐ جو کچھ ارشاد فرماتے تھے وہ خدا کی طرف سے وحی ہوتا تھا۔ خود قرآن کریم میں کئی ایک مقامات ایسے ہیں جن میں رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اب ظاہر ہے کہ جو کچھ حضورؐ نے کیا یا کہا تھا وہ بھی وحی خداوندی تھا تو پھر خدا نے ایسا کیوں کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس باب میں حضرت زیدؓ کا واقعہ بھی ایک واضح دلیل ہے اس امر کی کہ حضورؐ کا ہر ارشاد وحی نہیں ہوتا تھا۔

قرآن کریم میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اور اس کے بعد ہے کہ حضرت زیدؓ نے اس کے باوجود اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دے دی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر نبی اکرمؐ کا ہر ارشاد وحی کی بنا پر اور رسول کی حیثیت سے تھا تو جو کچھ آپ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا تھا وہ بھی بربنائے وحی اور بحیثیت رسول تھا۔ اس صورت میں، اس حکم نبوی کی خلاف ورزی معصیتِ رسول ہو گی اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے معصیتِ رسول کیسا عظیم جُرم ہے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ حضرت زیدؓ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) معصیتِ رسول کے جُرم کے مرتکب ہوئے تھے؟ وہ حضرت زیدؓ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے۔ کہ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (۳۳/۳۷) اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ حضورؐ کا یہ ارشاد نہ بربنائے وحی تھا اور نہ ہی بحیثیت رسول۔ بلکہ ایک ذاتی مشورہ تھا جسے نہ ماننے کا حق حضرت زیدؓ کو حاصل تھا۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کی رُو سے نہیں ہوتی تھی مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو وحی کہا جاتا ہے وہ (جیسا کہ عام مفکرین کا خیال ہے) نبی کے اپنے خیالات نہیں ہوتے۔ وحی خدا کی طرف سے ملتی تھی جس میں نبی کے اپنے خیالات و جذبات اور تصورات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ آیت وحی

کی خارجیت (OBJECTIVITY) یعنی اس کے منزّل من اللہ ہونے کا اعلان ہے، اس بات کا بیان نہیں کہ نبی اکرمؐ جو بات بھی کرتے تھے وہ وحی ہوتی تھی۔ (۱۹۵۷ء)

۳۔ قرآنِ کریم کی تنزلی ترتیب

گذشتہ دنوں، پشاور میں "پاکستان ہسٹری کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے محترم مولانا..... صاحب نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس امر پر زور دیا کہ سب سے اہم کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور سور کے نزول کی تاریخ متعین کی جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے فرمایا۔

تاریخِ قرآن سے میرا منشا یہ ہے کہ اس کلام مقدس کی آیات اور سور کے ازمنہ و امکنۂ نزول کے تعین کی سعی کی جائے۔ اس سے پہلے بھی اس مبحث کے متعلق بعض صاحبانِ علم نے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کوششوں کا ماحصل صرف چند انفرادی اور متخالف آراء کی فراہمی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا، ان کتابوں کی مدد سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ہمارے لئے بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے، حالانکہ اسلام کے تمام اوامر و نواہی نیز سیاسی اور اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کی ترتیبِ نزول کا تعین ازحد ضروری ہے۔ اس لئے کہ

(۱) قرآن مسلمانوں کی حیاتِ ملی کا ایک مکمل نظام ہے۔ تئیس سال کی طویل مدت میں ضرورت اور حالات کے تقاضے کے مطابق اس کا ایک ایک حصہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا اور امت کی صلاحیت نیز صالحیت کی بنا پر اس میں تدریجی اضافہ ہوتا رہا۔ اوقاتِ نزول کے تعین سے ہمیں پتہ لگ سکے گا کہ اُس وقت امت کی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور معاشرتی حالت کیا تھی اور ہمارے کریم و حکیم ربّ نے ایک بگڑی ہوئی قوم کی تربیت و اصلاح کے لئے کن کن تعمیری مدارج کی وساطت

سے اسے منازلِ ارتقا کی طرف لے جانا چاہا۔ اس سے غافل رہنے کا نقصان یہ ہوگا کہ اللہ کے بندے اپنے مالک کی عطا کی ہوئی رخصتوں اور رعایتوں سے محروم ہو جائیں گے اور ان کی اصلاح عملاً ناممکن ہو جائے گی۔ عالم اسلامی کے موجودہ مجاہدۂ حیات کے دور میں خداوند کریم کی اس شانِ ربوبیت کی طرف متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔

(۲) قرآن مجید کی پانچ سو آیتوں کو ہمارے متقدمین نے منسوخ قرار دے رکھا تھا۔ اکثر فقہی اور تفسیری مباحث میں اب بھی علی العموم ناسخ و منسوخ کے دعاوی پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ناسخ حکم سے منسوخ حکم کا پہلے صادر ہونا ضروری ہے لیکن جب تک مختلف سورتوں کے نزول کی تاریخ متعین نہ ہو، اس وقت تک کسی سورۃ کی کسی آیت کو منسوخ قرار دینا درست نہ ہو سکے گا۔ اس لئے سورتوں کی ترتیب نزول کو دریافت کرنا ضروری ہے۔ دوسری طرف منکرین نسخ کے لئے بھی استدلال کے وقت اس تعین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ قائلین و منکرین نسخ کے مباحثہ کی ضمن میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں جہاں صرف دعوائے نسخ کو برقرار رکھنے کے لئے بعد کی نازل شدہ سورہ کی بعض آیات کو قبل کا نازل شدہ بتایا جاتا ہے۔

خطرناک تجویز اس تمام احترام کے باوجود جو..... صاحب کا ہمارے دل میں ہے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ اس باب میں روشِ عامہ میں بہہ گئے ہیں اور انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے، قرآن کے متعلق وہ کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کے دل میں قرآن کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو مذموم کوششیں کی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس خیال کو عام کر دیا گیا کہ جب تک قرآن کی آیات کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب نازل ہوئیں اور ان کا شانِ نزول کیا تھا، قرآن کی تعلیم سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کے ساتھ ہی اس خیال کو بھی عام کیا گیا کہ رسول اللہ صلعم قرآن کو مرتب کر کے امت کو دے کر نہیں گئے تھے۔ بلکہ یونہی منتشر حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کی وفات

کے بعد قرآن کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کوششوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ وغیرہ خلافت کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک گوشے میں بیٹھے قرآن کی جمع اور تدوین کے اہم کام میں مصروف تھے۔ چنانچہ، کہا یہ جاتا ہے کہ آپ نے نزول کی ترتیب کے مُطابق قرآن کو مرتب کیا۔ لیکن اس کے برعکس دوسرے صحابہؓ نے قرآن کو اس شکل میں مرتب کیا جس میں وہ آج ہمارے پاس ہے اور جس میں تنزیلی ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ قرآن حضرت علیؓ کے جمع کردہ صحیفہ ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ صحیفہ کہیں محفوظ ہے اور ایک دن باہر آئے گا، اس وقت صحیح قرآن سمجھ میں آسکے گا۔

اب ذرا سمجھئے کہ بات کیا ہوئی۔

۱:۔ کہا یہ گیا ہے کہ قرآن اسی صورت میں سمجھ آسکتا ہے جب اس کی ترتیبِ نزول ہمارے سامنے ہو۔

۲:۔ موجودہ قرآن، جسے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر دوسرے صحابہؓ نے مرتب کیا تھا، ترتیبِ نزول کے مطابق نہیں ہے۔ اور

۳:۔ ترتیبِ نزول کے مطابق وہ قرآن ہے جسے حضرت علیؓ نے مرتب فرمایا تھا۔

ان خیالات سے غیر شیعہ مسلمان کس حد تک متاثر ہوئے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود یہ بھی ایک ایک آیت کا زمانہ نزول اور شانِ نزول تلاش کرنے لگ گئے۔ چنانچہ آپ ان کی تفاسیر میں دیکھیں گے کہ ہر آیت کی تفسیر اس کی شانِ نزول کے ماتحت کی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے اس قرآن کو تو طوعاً و کرہاً تسلیم کر لیا جسے عام صحابہؓ نے مرتب کیا تھا لیکن اس کے قائل ہے کہ قرآن درحقیقت نزولی ترتیب کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو بدلائل و شواہد بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ یکسر باطل ہے کہ رسول اللہ صلعم قرآن کو ایک مرتب شکل میں نہیں دے گئے تھے۔ جو قرآن اس وقت ہمارے ہاں موجود ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسے اسی صورت میں مرتب کر کے امت کو دے کر گئے تھے۔ اس حقیقت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر، مولانا ..... صاحب کے الفاظ میں۔

اسلام کے تمام اوامر و نواہی نیز سیاسی و اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کی ترتیبِ نزول کا تعین از حد ضروری ہے۔

تو خود رسول اللہ صلعم نے قرآن کو نزولی ترتیب کے مطابق مرتب کیوں نہ فرمایا تاکہ قرآن آسانی سے سمجھ میں آسکتا؟ یہ عجیب بات ہوئی کہ رسول اللہ صلعم ایک نئی ترتیب کے مطابق قرآن کو مرتب کر کے دے گئے اور اس کے بعد اُمت کو کاوش کر کے تحقیق کرنا پڑا کہ ان آیات و سور کی ترتیبِ نزول کیا ہے۔ اُمت کی یہ کاوش اور تحقیق بھی جو نتیجہ پیدا کر سکی وہ (مولانا..... صاحب کے الفاظ میں) اس سے زیادہ نہیں کہ

ان کتابوں کی مدد سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ مولانا صاحب نے اس مشکل کا حل یہ بتایا ہے کہ اب امت کوشش کرے کہ آیات قرآنی کی نزولی ترتیب کا یقینی طور پر تعین ہو جائے۔

ہم دریافت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اُمت کے پاس وہ ذریعہ کون سا ہے جس سے وہ آیات قرآنی کی ترتیب کو یقینی طور پر متعین کر لے گی۔ اس کے پاس لے دے کے متقدمین کی کتابیں ہی تو ہیں جن کے متعلق خود مولانا ..... صاحب فرما چکے ہیں کہ ان کے ذریعہ ترتیب کا تعین مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لہٰذا صورتِ حال یوں ہوئی کہ

(۱) اسلام کے تمام اوامر و نواہی نیز سیاسی و اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآنِ کریم کی ترتیبِ نزول کا تعین از حد ضروری ہے۔

(۲) یہ تعین ان کتابوں کے ذریعے سے تو ہو نہیں سکتا جو اس موضوع پر متقدمین نے لکھی ہیں۔ اور

(۳) ان کتابوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا جس سے ہم آج چودہ سو سال کے بعد یہ طے کر سکیں کہ آیاتِ قرآنی کی نزولی ترتیب کیا تھی۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کی تعلیم اُمت کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔

اس کا نتیجہ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی دیوار کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دی جائے تو پھر وہ دیوار ثریّا تک ٹیڑھی ہی جاتی ہے۔ قرآن سمجھنے کی بنیادی اینٹ جو ٹیڑھی رکھ دی گئی ہے وہ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں شانِ نزول کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتیں اس عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کی حقیقتوں کو مکان اور زمان کی حدود میں مقیّد کر کے رکھ دیتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ قرآن تاریخ کے ایک خاص زمانہ میں، اور زمین کے ایک خاص خطّہ میں نازل ہوا۔ لیکن اس کے حقائق زمان اور مکان کی حدود سے بے نیاز ہیں۔ وہ دنیا کی ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے یکساں طور پر راہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ اور ان کے سمجھنے کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ متعین کیا جائے کہ ان کا شانِ نزول کیا تھا۔ ان کا شانِ نزول چودہ سو سال پہلے حجاز میں بسنے والی کسی قوم کے وقائع وحوادث نہیں تھے، بلکہ ان کا شانِ نزول انسانیت کے تقاضے ہیں۔

ناسخ ومنسوخ اس بنیاد کی دوسری ٹیڑھی اینٹ وہ ہے جسے مولانا صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس کے دوسرے پیراگراف میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی قرآن میں ناسخ اور منسوخ کا عقیدہ۔ یہ عقیدہ بھی ان ہی مذموم کوششوں میں سے ہے۔ جو قرآن کی عظمت اور حقیقت کو دلوں سے دور کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ زمانہ کا جس قسم کا تقاضا سامنے آئے اس سے ملتی جلتی آیت قرآنی اس وقت نافذ العمل ہو جائے گی۔ جب اس تقاضا کی جگہ کوئی دوسرا تقاضا سامنے آئے گا تو اس سے ملتا ہوا حکم نافذ العمل ہو جائے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر بھی قرآن فہمی کے لئے ترتیبِ نزول کے تعین کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آیاتِ قرآنی کے نزول کے امکنہ وازمنہ سے متعلق معلومات کا اگر کوئی فائدہ ہے تو محض تاریخی ہے، دینی نہیں۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور نے آیات یا سور قرآنی کی ترتیبِ نزول کے مطابق قرآن کو مرتب کیا تھا تو وہ ایک تاریخی دلچسپی کی چیز ہو سکتا ہے۔ دین پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

قرآن اور مسلمان آخر میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ سوچئے کہ "قرآن مظلوم کے ساتھ مسلمان کیا کچھ کر رہا ہے۔ دعویٰ اس

کا یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے خدا کی آخری وحی اس کے اندر ہے اور یہ قرآن قیامت تک کے لئے تمام نوعِ انسانی کے لئے زندگی کے ہر مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ ایسا حل جس کی مثل اور نظیر ساری دُنیا کے انسان مل کر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے اور اسی قرآن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ۔

(۱) جب رسول اللہ نے وفات پائی ہے تو قرآن کا کوئی مرتب مجموعہ اُمت کے پاس نہیں تھا۔ قرآن کھجوروں کے پتوں، اونٹوں کی ہڈیوں، پتھروں کے ٹکڑوں وغیرہ پر۔ کچھ کسی کے پاس، کچھ کسی کے پاس بکھرا پڑا تھا۔ ایک کمیٹی بیٹھی اور اس نے محنت کر کے اسے یکجا کیا۔ اس یکجا کردہ قرآن کی صورت یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی باصرار کہتے رہے کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فلاں آیت پڑھا کرتے تھے وہ اس قرآن میں نہیں ہے اور قرآن کا بعض حصہ جو کھجور وں کے پتوں پر لکھا ہوا تھا۔ ان پتوں کو حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی۔

(۲) اس مجموعہ کے علاوہ اور جلیل القدر صحابہؓ (مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) کے پاس ایسے قرآن تھے جن میں متعدد مقامات پر اس قرآن سے اختلاف تھا۔ یہ اختلافات حجاج بن یوسف کے زمانے تک جاری رہے اور اس نے جو مجموعہ مرتب کیا (جو اس وقت اُمت کے پاس ہے) وہ بھی متعدد مقامات پر سابقہ مجموعوں سے مختلف تھا۔

(۳) اس مجموعہ میں جو ترتیب ملحوظ رکھی گئی وہ تنزیلی ترتیب سے مختلف ہے اور قرآن سمجھ میں ہی نہیں آسکتا ہے تا وقتیکہ تنزیلی ترتیب معلوم نہ ہو۔ اس تنزیلی ترتیب کے متعین کرنے کا آج کوئی ذریعہ ہی نہیں۔

(۴) وحی وہی نہیں تھی جو قرآن کے اندر آگئی، اس کے ساتھ اس جیسی اور بھی وحی تھی جو رسول اللہ صلعم کی احادیث میں بیان ہوئی۔ اس وحی کے بغیر قرآن کی وحی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی۔ اس وحی کو نہ رسولؐ نے کہیں مرتب فرمایا نہ آپؐ کے صحابہؓ نے۔ یہ رسول اللہ صلعم سے قریب اڑھائی سو سال بعد انفرادی کوششوں سے جمع ہوئی اور انسانی کوششوں نے ہی اس کے متعلق فیصلہ کیا کہ اس میں فلاں بات صحیح ہے اور فلاں بات غلط ـــــ (اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ کہ ان میں سے کیا صحیح ہے اور کیا غلط ایک

"مزاج شناس رسول" کی نگاہ کر سکتی ہے)

(۵) قرآن نہ تو خود قرآن سے سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی ان احادیث سے۔ اس کے صحیح معنی (جسے مغزِ دین کہا جاتا ہے) اس کے ظاہری الفاظ میں نہیں بلکہ اس کے باطن میں ہیں اور یہ باطنی علم حضرت علیؓ کی وساطت سے سینہ بسینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

یہ ہیں قرآن کے سمجھنے کے متعلق مسلمانوں کے عقائد، جن میں سے ہر عقیدہ کی بنیاد ان روایات پر ہے جو معلوم نہیں کب وضع ہوئیں۔ لیکن جن کے متعلق آج اصرار کیا جاتا ہے کہ انہیں رسول اللہ صلعم کے سچے اقوال مانو، جو ایسا نہ مانے وہ منکرِ حدیث ہے، لہٰذا کافر۔

اس قرآن کو مسلمان ساری دنیا کے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس میں تمام انسانی مشکلات کا حل موجود ہے۔ اور پھر دنیا سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے مذہب ہی کو چھوڑ کر نہیں بلکہ عقل و شعور اور تجربات و شہادات سب کو چھوڑ کر ان کا پیش کردہ اسلام قبول کر لیں گے۔ اس سے بڑی اجتماعی خود فریبی کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکتی ہو۔ لیکن گروہ بندانہ مفاد پرستیاں ہیں کہ وہ قوم کو اس کی خود فریبی سے نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ بایں نمط کہ كُلَّمَا اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا۔ اگر ان کے اس جہنم سے نکلنے کی کوئی کوشش بھی ہوتی ہے تو انہیں پھر وہیں دھکیل دیا جاتا ہے۔

(۱۹۵۴ء)

۴۔ حفاظتِ قرآن کریم

ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

روایات و احادیث کے متعلق جو مسلک آپ نے اختیار فرمایا ہے اسے دیکھ کر چند سوالات دل میں پیدا ہو رہے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ امید ہے طلوعِ اسلام کے صفحات میں مدلل جوابات سے ممنون و مطمئن فرمائیں گے۔

احادیث و روایات کو ظنی تسلیم کر لینے کے بعد کون سے قطعی ذرائع ہیں جن کی بنا پر

ہم موجودہ قرآن کی قطعیت تسلیم کریں۔ جبکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ :۔

(۱) علمار حنفیہ و شافعیہ آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ بسم اللہ فاتحہ کا جز ہے یا نہیں حالانکہ یہ اختلاف انکارِ قرآن پر منتج ہوتا ہے۔

(۲) موجودہ مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مرتب کردہ ہے اور اعراب، حجاج جیسے خونخوار نے لگائے ہیں۔

(۳) ابن مسعودؓ سے سورۃ واللیل کے الفاظ وما خلق الذکر والانثیٰ کی جگہ دوسری طرح منقول ہیں۔

(۴) تلاوت کے سات مختلف طریقے مروّج ہیں۔ جن میں بسا اوقات مفہوم و معانی میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔

(۵) آیات منسوخ التلاوۃ کو آج تک علمارِ اسلام مانتے چلے آ رہے ہیں۔

ان وجوہات کے پیش نظر ہم کن وجوہ پر مصحفِ عثمانی کو قطعی اور کلام الٰہی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اشکال جس طرح قائلین حدیث پر وارد ہوتا ہے اسی طرح آپ بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ محض عقلی دلائل کافی نہیں ہیں۔ ورنہ کل کوئی دوسرا محقق آپ کے نظریات کو عقلی دلائل سے باطل ٹھہرائے گا۔ اور اسی طرح یہ ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہوگا۔ امید ہے کہ آپ مجھے کافی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

جواب

مستفسر صاحب کے اس خط میں چند ایک باتیں وضاحت طلب تھیں۔ اور ہم چاہتے تھے کہ اس کا جواب لکھنے سے پہلے ان باتوں کی وضاحت ان سے کرالی جائے۔ لیکن انہوں نے اپنے خط میں اپنا پتہ نہیں لکھا۔ اس لئے مجبور ہیں کہ ان کے استفسارات سے جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں اسی کے مطابق اس کا جواب لکھ دیا جائے۔

تاریخ کی اہمیت

اصل مقصود پر آنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی صحیح پوزیشن کے متعلق مختصراً کچھ عرض کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کسی خاص زمانہ کے احوال و کوائف اور واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ تاریخ کو قرآن نے بڑی اہمیت

دی ہے اس لئے کہ اس سے نوعِ انسانی کے فکری اور تمدنی ارتقار کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جب کسی قوم نے فلاں نہج کی زندگی اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور آج اگر ہم بھی اسی نہج کی زندگی گزاریں گے تو اسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آئے گا۔ لیکن تاریخ کی تدوین مختلف حالات اور اثرات کے ماتحت ہوتی چلی آئی ہے اور یہ حقیقت تاریخ کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں کہ تاریخ صحیح اور غلط دونوں قسم کے واقعات اور تاثرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ارباب تاریخ نے انسان کی تاریخی یادداشتوں کو پرکھنے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اور ان کی تحقیقی کاوشوں میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اربابِ تحقیق جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ کسی زمانہ کے متعلق جو دلائل و شواہد (HISTORICAL EVIDENCE) میسر آسکیں ان کی روشنی میں تاریخی یادداشتوں کو پرکھ کر اتنا کہہ سکیں کہ فلاں بات زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ان دلائل و شواہد میں بعض باتیں دوسروں کی نسبت زیادہ قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً مصریات میں جب کسی بادشاہ کی ممی مل جاتی ہے اور اُس کے ساتھ کچھ تختیاں بھی ہوتی ہیں جن پر اس بادشاہ اور اس کے عہد کے متعلق یادداشتیں منقوش ہوتی ہیں۔ تو اربابِ تاریخ اس عہد کی تاریخی یادداشتوں کو ان تختیوں کے نوشتوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور ان تختیوں کو زیادہ قابل اعتماد سمجھ کر انہی کو معیارِ تصدیق و تکذیب قرار دیتے ہیں۔

اس باب میں مسلمانوں کی کیفیت کچھ مختلف ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسی تختی (لوحِ محفوظ) موجود ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور اپنی محفوظ شکل میں، جس میں کسی ایک لفظ کا بھی رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ ہمارے پاس موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہمارے پاس اس قسم کا یقینی ذریعۂ علم موجود ہے تو تاریخ کا جس قدر حصہ اس یقینی معیار کے مطابق پرکھا جا سکتا ہے اس کے لئے اسے یقینی معیار قرار دینا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے ہم جب کہتے ہیں کہ روایات کو (جو ہمارے ایک دور کی تاریخی یادداشتیں ہیں) قرآن کے یقینی معیار پر پرکھنا ضروری ہے تو اس سے مفہوم یہی ہوتا ہے۔

تاریخ اور دین

دین کا معاملہ عام تاریخ سے بالکل مختلف ہے۔ عام تاریخ میں جس چیز کو آج صحیح مانا جاتا ہے وہ کل کو غلط ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن دین کیلئے

ہر وقت یقینی ہونا نہایت ضروری ہے۔ دین کی مشینری اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج مرتب کر سکتی ہے جبکہ اس کا ایک ایک پُرزہ اصلی (ORIGINAL) اور یقینی (GENUINE) ہو۔ اگر اس میں کوئی ایک پُرزہ بھی ایسا ہے جس کے متعلق ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ اصلی اور حقیقی ہے یا نہیں تو ہم مشینری کے صحیح نتائج پر کبھی پورا اعتماد نہیں کر سکتے۔ دین کی مشینری کے نتائج تو وہ ہیں جو پوری کی پوری جماعت بلکہ تمام نوعِ انسانی کی موجودہ اور آنے والی زندگی، دونوں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ ہے وہ وجہ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ دین میں حجت (یعنی دلیل واقعی) وہی چیز ہو سکتی ہے جو قطعی اور یقینی ہو۔ جو چیز قطعی اور یقینی نہ ہو اسے ظنی کہا جاتا ہے۔ اور کوئی ظنی شے دین میں حجت قرار نہیں پا سکتی۔

قرآن کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ یہ قطعی اور یقینی چیز ہے۔ ہمارے اس دعوے کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا ایمان ہے۔ اور اس ایمان کی بنیاد یہ ہے کہ خود

حفاظتِ قرآن

قرآن کریم میں یہ موجود ہے کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) ہم نے قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور اسی تفسیر میں دوسری جگہ ہے لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱/۴۲) باطل نہ اس کے آگے سے اس کے پاس پھٹکتا ہے نہ پیچھے سے۔" لہٰذا ایک مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ قرآن اپنی محفوظ شکل میں چلا آ رہا ہے اور اسی طرح سے محفوظ شکل میں آگے چلا جائے گا۔ اگر کوئی تاریخی یادداشت اس دعویٰ کے خلاف جاتی ہے یا اس میں شک و شبہ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے تو ایک مسلمان بلا ادنیٰ تامل اسے رد کر دے گا۔ کیونکہ قرآن کی محفوظیت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس ذمہ داری پر ہمارا ایمان ہے۔

لیکن ایک غیر مسلم ہمارے اس دعوے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے اطمینان کے لئے اور قسم کے دلائل چاہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اس دعویٰ کے اثبات میں اس قسم کے دلائل بھی پیش کریں جنہیں اربابِ تاریخ اپنے ہاں معیار قرار دیتے ہیں۔ اس باب میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے جو آج ہی سامنے آیا ہو۔ مغرب کے مؤرخین

ازخود صدیوں سے اس کی تحقیق کر رہے ہیں کہ جو قرآن اس وقت مسلمانوں کے پاس ہے، اس میں اور اُس قرآن میں جسے رسولؐ اللہ نے مسلمانوں کو دیا تھا، کوئی اختلاف ہے یا نہیں۔ اور وہ اپنی پوری تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "اگرچہ تمام مذہبی صحائف خدا کی طرف سے نازل ہوئے تاہم صرف قرآن کریم ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردو بدل نہیں ہوا۔ اور وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ (BARONESS M. STEIN).

غیر مسلم مؤرخین کا اعتراف

چنانچہ مسلمان مؤرخین کے علاوہ غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کی تحقیق کی کہ قرآن کے وہ اصلی نسخے جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں بھیجے گئے تھے، کب تک اور کہاں کہاں موجود تھے۔ اور اب تک موجود ہیں۔ دمشق کے نسخے کے متعلق یہ تحقیق ہے کہ وہ سلطان عبدالحمید کے زمانے تک جامع دمشق میں موجود تھا۔ لیکن جب وہ مسجد جل گئی تو اس میں یہ مصحف بھی جل گیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں اس مصحف کے نسخے آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھے۔ بصرہ یا کوفہ کا نسخہ مختلف مقامات میں پھرتا پھراتا ۱۹۲۳ء میں روس کے قدیم پایہ تخت ماسکو میں پہنچا۔ کہتے ہیں کہ یہ نسخہ امیر تیمور کے زمانے میں ابوبکر الشاشی کی طرف سے حضرت شیخ عبداللہ کے مرقد پر رکھ دیا گیا تھا۔ جہاں سے وہ بالشویکوں کے ہاتھ میں آیا۔ خلافت کے ترکی میں منتقل ہوتے وقت سلطان سلیم اول کے حوالے جو تبرکات کئے گئے تھے ان میں قرآن کا ایک نسخہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں کا۔ ایک حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا اور ایک حضرت زین العابدینؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی تھا۔ جو اب تک وہاں موجود ہے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا ایک نسخہ جس پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں، مشہد میں موجود ہے۔ ایران کے عجائب خانہ آثارِ قدیمہ میں ایک نسخہ حضرت ثابتؓ، ایک نسخہ حضرت عثمانؓ، ایک نسخہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا موجود ہے۔ نیز ایک نسخہ حضرت امام حسنؓ اور ایک نسخہ حضرت سجادؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی۔

کتابی شکل میں قرآن کے علاوہ، قرآن ہی سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کو لفظاً لفظاً حفظ کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹/۴۹) بلکہ یہ کھلی کھلی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔ اور تاریخ سے ہمیں

اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ رسولؐ اللہ حفاظ سے بار بار قرآن کو سنا کرتے تھے۔ اور خود بھی ان کو سناتے تھے۔ مکّہ میں حضرت ارقم مخزومی کا مکان اس مقصد کے لئے متعین تھا اور مدینہ میں مسجد نبویؐ کا صفہ عام طور پر حفاظ کا مرکز تھا۔ چنانچہ حضورؐ کی وفات کے وقت سینکڑوں حفاظ موجود تھے اور ان میں سے متعدد ایسے تھے جن کے حفظ کی سند خود رسولؐ اللہ نے عطا فرمائی تھی۔

یہ خیال جو عام طور پر مروج ہے کہ موجودہ مصحف حضرت عثمانؓ کا مرتب فرمودہ ہے اور آپ ہی جامع القرآن ہیں، صحیح نہیں ہے۔ قرآن اپنی کتابی شکل میں خود رسولؐ اللہ کے زمانے میں موجود تھا۔ قرآن اپنے آپ کو بار بار کتاب کہتا ہے۔ حتیٰ کہ سورہ بقرہ کی دوسری آیت ہی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ سے شروع ہوتی ہے اور عرب اس لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے تھے جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں موجود ہوتی تھی (اس دعوے کے تاریخی شواہد کہ قرآن موجودہ کتابی شکل میں خود رسولؐ اللہ کے سامنے موجود تھا۔ تفصیل چاہتے ہیں۔ اور انہیں تفصیلی طور پر کسی دوسرے وقت پیش کیا جائے گا[1])۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے متعدد نسخے لکھوائے اور انہیں مملکت کے مختلف صوبوں میں بھیجدیا تاکہ اس بارے میں مملکت کے دور دراز گوشوں میں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ اور اختلاف کی صورت میں ان مستند نسخوں کی طرف رجوع کر لیا جائے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ قرآن کے ناشر تھے نہ کہ جامع القرآن۔

سوال کا جواب

اس تمہیدی پس منظر کی روشنی میں مستفسر کے استفسارات پر غور کیجئے۔ ان کا حل خود بخود مل جائے گا۔ ہم مختصراً ان کا جواب ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" خود قرآن کے اندر موجود ہے (دیکھئے سورۂ نمل آیت ۳۰) اب یہ بحث کہ یہ سورۃ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں، ایک فنی بحث رہ جاتی ہے۔

---

[1] اس کے بعد (ستمبر ۱۹۵۱ء کے بعد) طلوع اسلام میں "جمع القرآن" سے متعلق نہایت تفصیلی مضامین شائع ہو چکے ہیں

(۲) ہم یہ بتا چکے ہیں کہ موجودہ مصحف حضرت عثمانؓ کا مرتب کردہ نہیں۔ باقی رہا اعراب کا سوال، سو عربوں کے لئے اعراب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بلا اعراب قرآن کو اس طرح پڑھتے تھے جیسے غیر عرب اعراب کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ اعراب غیر عربوں کی سہولت کے لئے لگا دیئے گئے۔ قرآن کی یہ خدمت اگر حجاج کے حق میں جاتی ہے تو اس کی "خونخواری" اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

(۳) قرآن کی حفاظت پر ایمان رکھنے کے بعد اس قسم کی روائتیں جن میں یہ پایا جاتا ہے کہ فلاں صحابی کی روایت کے مطابق فلاں سورۃ میں مختلف الفاظ منقول ہیں، اس سازش کی کھلی ہوئی غمازی کرتی ہیں جو دین میں فتنہ برپا کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی۔ اور جس کے لئے موثر حربہ روایات سازی تھا۔

(۴) "تلاوت" سے غالباً آپ کی مُراد قرأت ..... ہے۔ قرأت کے اختلاف کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ عربوں کے مختلف قبیلے بعض حروف کو مختلف طریق سے ادا کرتے تھے۔ مثلاً بعض قبیلے کؔ کو گؔ بولتے تھے۔ اسی طرح جیسے آج لاہور کے اصلی باشندے ڑؔ کو رؔ کہتے ہیں (یعنی پڑی کو پری) اور ہوشیار پور کے رہنے والے واہیاتؔ کو باہیاتؔ کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حیدرآبادی قرآنؔ کو خرآنؔ بولتے ہیں۔ اس اختلاف کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے۔

> قرأت کے اختلافات قرآن کے تواتر میں مطلق خلل انداز نہیں ہو سکے۔ کیونکہ ان اختلافات کا مرجع کیفیتِ ادائے حروف تھا۔

تجوید قرآن کے ان اختلافات کو بھی بعد میں روک دیا گیا۔ اور قاریوں کو اسی قرأت کا پابند کر دیا گیا جو رسول اللہ کی قرأت کے مطابق تھی۔ اس کے علاوہ روایات میں جو کچھ ملتا ہے وہ وضعی ہے اور اگر "تلاوت" سے مستفسر کی مُراد فن تجوید ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو کس لئے سے پڑھا جائے۔ اللہ نے قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ تجوید کی فنی موشگافیاں زمانہ بعد کی ایجادات ہیں۔ مثلاً ترعید (آواز میں لرزہ پیدا کر کے پڑھنا) ترقیص (جھٹکا دے کر پڑھنا) تحزین (اس طرح پڑھنا کہ معلوم ہو کہ پڑھنے والا روتا ہے) یہ قرآن پڑھنے کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں بعض اوقات الفاظ کی صحت کو فن کی پابندیوں پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ قرآن کی تجوید نہیں تحریف ہے۔

(۵) آیات منسوخ التلاوۃ کا عقیدہ (یعنی یہ عقیدہ کہ قرآن میں آیت تو موجود نہیں لیکن اس کا حکم موجود ہے) اسی سازش کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب نازل کرے جس کی کچھ آیتیں اس سے گر کر الگ ہو گئی ہوں اور وہ خدا ان آیتوں کو اس کتاب میں تو داخل نہ کرے۔ لیکن ان کا حکم بحال رکھے۔ علمائے اسلام اگر اس قسم کی باتوں کو تسلیم کرتے چلے آئے ہیں تو اس کی ذمہ داری قرآن پر عائد نہیں ہوتی۔

مزید وضاحت

اس کے بعد انہی صاحب کی طرف سے حسب ذیل خط موصول ہوا۔

آپ کے موقر مجلہ طلوع اسلام کے ماہ ستمبر کے پرچہ میں حفاظتِ قرآن کے سلسلہ میں اپنے سوالات کے جوابات نظر سے گذرے۔ آپ کی اس ذرہ نوازی کا ممنون ہوں لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ جوابات میرے سوالات سے متعلق ہونے کے باوجود غیر متعلق ہیں شاید آپ نے میری معروضات کو غور سے نہیں دیکھا یا میری تحریر اظہار مدعا کے لئے ناکافی تھی۔ بہرحال جوابات کے متعلق میری معروضات یہ ہیں۔ آپ نے تمہیدی سطور میں تاریخ کے متعلق جو رائے زنی فرمائی ہے اس سے مجھے کلی طور پر اتفاق ہے۔ لیکن حفاظتِ قرآن کے متعلق جن دو پہلو سے آپ نے بحث کی ہے وہ محل نظر ہے۔

میرا مطالبہ قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی اور قطعی دلیل کا تھا۔ لیکن آپ نے انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحافظون اور لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ الخ سے استشہاد فرمایا ہے جس چیز کی قطعیت اور ثبوت کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کیا ہے اس کو دلیل بنا کر پیش کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ آگے چل کر تاریخ کی روشنی میں آپ نے قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے حالانکہ انہی سطور میں تاریخ کے متعلق آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ ——— "لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک پہنچ سکتیں" اب آپ ہی فرمائیں کہ جو چیز خود غیر قطعی ہو وہ دوسری

چیز کی قطعیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے۔

جواب

ہم اس بحث کو دوبارہ چھیڑنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ قرآن کے محفوظ ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن محترم مستفسر نے اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا جواب ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآنی دعوے کا ثبوت تاریخ سے لیا ہے اور چونکہ تاریخ ایک ظنی چیز ہے اس لئے اس کی رُو سے قرآنی دعوے کو یقینی طور پر ثابت شدہ کیسے مان لیا جائے۔

دعویٰ زیر نظر کا ثبوت طلب کرنے والے یا مسلمان ہو سکتے ہیں یا غیر مسلم۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، قرآن اور تاریخ کے باہمی تعلق کی پوزیشن یہ ہے کہ

(۱) قرآن کا ہر دعویٰ یقینی ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔

(۲) اس ایمان کی بنا پر تاریخ کی وہ شہادتیں جو قرآن کے دعوؤں کی تائید کرتی ہیں، قابل قبول ہو سکتی ہیں۔

(۳) جو تاریخی شہادتیں قرآن کے خلاف جائیں گی وہ مسترد کر دی جائیں گی۔

مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں غرق ہوا تھا اس کی لاش محفوظ کر لی گئی تھی۔ ایک عرصہ تک تاریخ نہ صرف فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کے ہی خلاف تھی بلکہ اکثر مؤرخین ساری کی ساری داستان بنی اسرائیل ہی سے انکار کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اسے ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ حضرت یوسفؑ کبھی مصر گئے یا مصر میں قحط پڑا اور اس کا انسداد حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ ہم تاریخ کی ان تمام شہادتوں کو ناقابل قبول قرار دیتے تھے۔ اس لئے کہ یہ قرآن کے خلاف تھیں ہم کہتے تھے کہ ہنوز تاریخی انکشافات ناتمام ہیں۔ یقینی انکشافات قرآن کے دعوؤں کی تصدیق کریں گے۔ بعد میں مصر کی اخری تحقیقات کا زمانہ آیا۔ اور زمین نے اپنے سینہ میں دبی ہوئی یادگاروں کو اس انداز سے اُگلا کہ قرآن کے ایک ایک دعوے کی تصدیق مجسم پیکروں کی شکل میں سامنے آگئی۔ یہی حال ہماری اپنے ہاں کی تاریخ کا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ

خدا کے سچّے نبی تھے۔ اور کوئی نبی جھوٹا نہیں ہوتا۔ بخاری میں اس قسم کی حدیثیں ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا اور جھوٹ بھی ایسا کہ جس کے احساس سے وہ خدا کے سامنے جانے سے شرمائیں گے۔ ہم بحیثیت مسلمان ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا۔ یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا۔ ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ یہ تاریخی شہادت غیر یقینی ہے اور لہذا ناقابلِ قبول۔ اس کے برعکس جن احادیث میں حضرات انبیائے کرامؑ کی صداقت اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے واقعات مندرج ہیں وہ سب قابلِ قبول ہیں اور ہم انہیں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ اسی طرح چونکہ قرآن کریم میں یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی لہذا ہر وہ تاریخی شہادت جو حفاظتِ قرآن کی تائید میں ہوگی، ہمارے نزدیک قابل قبول ہوگی۔ اور ہر وہ شہادت جو اس کے خلاف جائے گی مسترد کر دینے کے قابل۔ خواہ اس کی نسبت کسی طرف ہی کیوں نہ کر دی جائے۔ اس لئے قرآن کا دعویٰ حقیقتِ ثابتہ ہے اور تاریخ ظنی۔ محترم مستفسر کے دل میں جو کھٹکا پیدا ہوا ہے کہ چونکہ تاریخ ظنی ہے اس لئے اس کی تائید سے قرآن کے دعوؤں کی صداقت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ تو یہ کھٹکا ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن کے دعوؤں کی صحت و سقم کا مدار تاریخی شہادت پر ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآن کا ہر دعویٰ اپنی جگہ سچّا ہے۔ اور اپنی سچائی کے لئے کسی تاریخی شہادت کا محتاج نہیں۔ اگر تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے تو اس سے وہ اپنی سچائی کی دلیل لا سکتی ہے اور اگر اس کے خلاف جاتی ہے تو قرآن کا دعویٰ اپنی جگہ پر سچّا رہے گا۔ تاریخی شہادت سے کہا جائے گا کہ اپنے آپ پر نظرِ ثانی کرے۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مسلک تو سائنٹفک اصول کے خلاف ہے کہ جو چیز قرآنی دعوے کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھ لیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے۔ لیکن جو چیزیں ایمانیات میں داخل ہیں ان کے لئے یہی اصول سچّا اور سائنٹیفک ہے۔ اس ایمان کی رُو سے تاریخی شہادتوں کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآنی دعوے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کا ایمان نہیں رکھتے وہ غیر مسلم ہیں اور ان کا معاملہ ہم سے الگ ہے۔ ان کے پاس چونکہ حق اور باطل کا کوئی بھی مستقل، محکم، غیر متبدل اور خارجی (OBJECTIVE) معیار نہیں اس لئے وہ تاریخی شہادت کو اپنے وضع کردہ اصولوں

کے مطابق ہی پرکھ سکتے ہیں۔ اگر ان کے اصولوں کے مطابق کوئی تاریخی شہادت معتبر سمجھی جاتی ہے اور وہ قرآن سے ٹکراتی ہے تو انہیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تاریخی شہادت کو معتبر سمجھیں۔ البتہ جب ہم ان سے گفتگو کریں گے تو ہم یا تو یہ ثابت کریں گے کہ ان کے اصولوں میں سقم ہے یا ان کی تحقیقات میں نقص۔

لیکن حفاظتِ قرآن کے بارے میں تو یہ صورت پیش نہیں آ رہی۔ اس کی تائید تو ان کے اصولوں کے مطابق مرتب کردہ تاریخی شہادات بھی کر رہی ہیں۔ (۱۹۵۰ء)

۵۔ قرآن کریم کے احکام میں تبدیلی

ایک صاحب نے ایک بڑا اہم سوال دریافت کیا ہے۔ سوال ذرا طویل ہے۔ لیکن چونکہ وہ سمجھ میں اسی صورت میں آسکتا ہے جب وہ تفصیلی طور پر سامنے آئے اس لئے ہم اسے اسی شکل میں درج کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماہ اگست کے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک اہم سوال اور جواب نظر سے گزرا ہے۔ ایک جرمن نومسلم نے دریافت کیا کہ فقہی احکام میں "اجتہاد" کے اصول کے تحت کہاں تک تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ اسلام کے بہت سے تفصیلی احکام فقہاء کے اخذ کردہ اور مرتب کردہ ہیں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض خاص جغرافیائی اور تمدنی حالات کی پیداوار ہیں۔ کئی صدیوں تک تو اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد اصولاً ضرورتِ اجتہاد کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اسے بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں یورپ کے مسلمانوں کو بعض احکام کی تعمیل میں دشواری پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضو کے مسئلے کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وضو میں ہر مرتبہ پاؤں دھونا اہل یورپ کو مشکل اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں صاحبِ ترجمان القرآن نے لکھا ہے۔

آپ کے جرمن دوست نے اپنے سوالات کا آغاز تو اس بات سے کیا ہے کہ فقہاء

کے بیان کردہ احکام میں حالات کے لحاظ سے کہاں تک ترمیم کی جاسکتی ہے۔ لیکن آگے چل کر جہاں وہ ایک متعین مثال پیش کرتے ہیں وہاں فقہا کے بیان کردہ احکام میں نہیں بلکہ خود قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ وضو میں منہ، کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے اور سر پر مسح کرنے کا حکم تو قرآن میں دیا گیا ہے۔

(المائدہ آیت ۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جس بات کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہو اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے بعد (وضو کی حکمت بیان کرنے کے بعد) وہ لکھتے ہیں:۔

جاڑے کے زمانے میں یا سرد علاقوں میں پاؤں دھونے کی زحمت سے بچنے کے لئے شریعت نے پہلے ہی سے یہ آسانی رکھ دی ہے کہ آدمی ایک دفعہ وضو میں پاؤں دھونے کے بعد موزے پہن لے پھر ۲۴ گھنٹے تک مقیم کے لئے اور ۷۲ گھنٹے تک مسافر کے لئے پاؤں دھونے کی حاجت نہیں بشرطیکہ اس دوران میں وہ موزے نہ اتارے۔

یعنی قرآن کریم نے تو یہ حکم دیا کہ جب نماز کے کھڑے ہو تو منہ ہاتھ، پاؤں دھو لو (وضو کرلو) اس نے کہیں نہیں کہا کہ ایک دفعہ پاؤں دھوکر موزے پہن تو پھر ۲۴ یا ۷۲ گھنٹے کے لئے پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن شریعت نے یہ آسانی رکھ دی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "شریعت" قرآن مجید سے الگ کوئی اور چیز ہے؟ اور ایسی چیز کہ وہ قرآن مجید کے احکام میں بھی تبدیلی پیدا کرسکتی ہے؟ جب جرمن نومسلم نے اپنی مشکل پیش کی تو اس سے کہا گیا کہ قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے بعد یہ کہا گیا کہ "شریعت" نے قرآن کی نصوص میں ترمیم کر دی ہے۔

آخر میں ترجمان القرآن میں لکھا ہے۔

ان جرمن دوست کو کہئے کہ حالات و ضروریات کے لحاظ سے اسلام کے فروعی احکام میں ضروری ردوبدل تو ہوسکتا ہے لیکن اس کا ردوبدل کرنے کے لئے شریعت کی گہری واقفیت درکار ہے۔ ہر شخص کو سطحی طور پر یہ اختیارات نہیں دیئے جاسکتے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے فروعی احکام ہیں جن میں رد و بدل ہوسکتا ہے؟ فروعی احکام تو قرآن مجید

میں بھی ہیں۔ کیا ان میں بھی رد و بدل ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اور امید ہے اس کی اہمیت کا بھی اندازہ لگا لیا ہو گا۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ

(ا) قرآن کریم کے احکام میں ـــ خواہ وہ اصولی ہوں یا فروعی ـــ کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لا تبدیل لکلمٰت اللہ۔

(اا) قرآن کریم نے جن احکام کو بطور اصول بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اسلامی نظامِ حکومت (جسے خلافتِ علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) ان جزئیات کو متعین کرے گا۔ ان جزئیات میں حالات کے بدلنے سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔ یہ تبدیلی بھی اسی نظام کی طرف سے ہو گی۔

لیکن اس کے برعکس ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام میں بھی رد و بدل ہو سکتا ہے۔ یہاں تک تو یہ تمام حضرات متفق ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ

(ا) ان احکام میں رد و بدل، احادیث نے کر دیا ہے (حتیٰ کہ احادیث نے قرآن کریم کی بعض آیات کو منسوخ بھی کر دیا ہے) لیکن جو کچھ احادیث کی رُو سے ہو چکا ہے۔ اس میں اب رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

(ب) بعض کا عقیدہ ہے کہ رد و بدل فقہ نے کیا ہے (حتیٰ کہ ائمہ فقہ کے اقوال، قرآن کریم کی آیات کو بھی منسوخ کر سکتے ہیں) لیکن جو رد و بدل فقہ کی رُو سے ہو چکا ہے۔ اس میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور۔

(ج) بعض کا خیال ہے کہ ان فقہی احکام میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اور یہ "علماء کرام" کر سکتے ہیں۔ یہ حضرات جب "شریعت" یا "اسلام" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد (ا) احادیث کی رو سے مرتب شدہ احکام۔ یا (اا) فقہ کی رُو سے مرتب شدہ احکام ہوتے ہیں۔ اور چونکہ احادیث اور فقہ ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے "شریعت" یا "اسلام" بھی ہر فرقہ کا الگ الگ ہے۔

اب رہا وہ تضاد جو آپ نے ترجمان القرآن کے بیان میں دیکھا ہے۔ یعنی ایک طرف یہ

کہا گیا ہے کہ قرآن کی نصوص میں ترمیم نہیں ہو سکتی اور دوسری طرف یہ کہ شریعت نے اس منصوص حکم میں تبدیلی کر دی ہے تو اس کا جواب تو یہی حضرات دے سکیں گے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، ان حضرات کا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن کے احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور اس پر ان کا عمل بھی ہے۔ اس کی ایک مثال تو وضو کے احکام کے سلسلے میں خود انہوں نے اپنے اس جواب میں دی ہے۔ اس کا نام ان کے نزدیک تبدیلی نہیں "تعبیر" ہوتا ہے۔ یہ وہی "تاویل" یا "تعبیر" ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

زمن بر صوفی و ملّا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

۱۹۶۲ء

۶۔ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت

سوال :۔ قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟

جواب :۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (۲/۲۳) و دیگر مقامات) ۔" اگر تمہیں اس کتاب میں جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے کسی قسم شبہ ہو۔ (کہ خدا کی طرف سے نہیں ہے) تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم اس کی کسی سورت کی مانند کوئی سورت بنا لاؤ! قرآن کا یہ دعویٰ اس کے یوم نزول سے لے کر آج تک ساری دنیا کے سامنے چلا آ رہا ہے۔ اور کسی کو اس چیلنج کے قبول کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ یہ چیلنج اس دور کے متشککین کے لئے بھی کھلا ہے۔

قرآن کی صداقت کا ثبوت

۷۔ قرآن کریم کی سائنٹیفک تعبیر

سوال :۔ اگر قرآن کریم کی تعبیر سائنس کے انکشافات کی رُو سے کی جائے تو اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ کل کو اگر سائنس کے موجودہ نظریات غلط ثابت ہو گئے تو اس سے قرآن پر حرف آئے گا۔ اس کی وضاحت کر دیجئے۔

جواب :۔ قرآن کریم کا ایک حصہ اس کے قوانین اور اصولوں پر مشتمل ہے۔ اسے وہ محکمات سے تعبیر کرتا ہے اور یہی ام الکتاب ہیں۔ یعنی وہ انسانوں کو جو راہ نمائی دینا چاہتا ہے اس کی اصل اور جڑ یہی ہے۔ اس حصہ کا مفہوم متعین اور مطالب واضح ہیں، اس لئے اس کی تعبیرات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں ان قوانین اور اصولات پر عمل کس طرح کیا جائے گا۔ انسانی علم کی وسعت، ان کی رفعت، ہمہ گیریت اور افادیت کے دلائل بہم پہنچائے گی۔

قرآن کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنے دعاوی کی صداقت پر خارجی کائنات سے شہادات پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ کارگہ کائنات کے نظم و نسق، قوانینِ خداوندی کی محکمیت، تخلیق ارض و سماء، تنویرِ شمس و قمر، تکویرِ لیل و نہار، غرضیکہ انفس و آفاق میں آیاتُ اللہ پر غور و فکر کی تاکید کرتا ہے۔ اسی میں وہ امور بھی آجاتے ہیں جن کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے۔ انہیں وہ تشبیہات و استعارات کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جس میں مختلف زمانوں میں مختلف تعبیرات سامنے آسکتی ہیں۔ اس لئے کہ ان امور پر انسان اسی حد تک غور و فکر کر سکتا ہے جس حد تک اس کے زمانے میں انسانی علم ترقی کر چکا ہے۔ اگر ایک دور کا انسانی علم مشاہدہ یا تجربہ کسی سابقہ دور سے مختلف ہوگا تو اس دور کی تعبیرات بھی سابقہ دور سے مختلف ہوں گی۔ مثلاً قرآن کریم نے فرعون (حضرت) موسیٰؑ کی لاش کے متعلق کہا کہ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (۱۰/۹۲) "پس ہم آج تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ تو ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، ایک نشان ہو"۔ اب ظاہر ہے کہ جس زمانے میں مصریات

کے متعلق تحقیق نہیں ہوئی تھی اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ اٹھارویں اور انیسوی صدی میں وہاں کے شاہی مقبروں کی کھدائی ہوئی تو ان سے بے شمار حنوط شدہ لاشیں (ممی) برآمد ہوئیں۔ انہی میں رعمسیس ثانی کی لاش بھی برآمد ہوئی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون تھا۔ اس انکشاف کے بعد قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت کی تعبیر بھی مختلف ہوگئی۔ اس مثال کا تعلق تاریخی انکشافات سے ہے۔ دوسری مثال فلکیات سے متعلق لیجئے۔ قرآن کریم میں اجرام سماوی کے متعلق ہے۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱/۳۳) تمام (کرے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ جب فلکیات کے متعلق قدیم تصور کارفرما تھا تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب جدید انکشافات کی رو سے فلکیات کے متعلق نئی آیات" (نشانیاں) سامنے آئیں تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور ہوگئی۔ تعبیرات کے ان اختلاف سے قرآنی حقائق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے زمانے کی کوئی علمی تحقیق سابقہ دور کی کسی تعبیر کو غلط ثابت کرتی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس زمانے کا انسانی علم ناقص تھا۔ اور اگر آج کی کوئی تعبیر بعد میں آنے والے زمانے نے غلط ثابت کر دی تو یہی بات آج کے انسانی علم کے متعلق کہی جائے گی۔ لہٰذا اس باب میں صحیح روش یہ ہے کہ ہم قرآنی حقائق کو علم انسانی کی موجودہ سطح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن اپنی فہم اور اس پر مبنی تعبیر کو حرفِ آخر قرار نہ دے لیں۔ اس لئے کہ حقائق کی لامتناہیت کا تو یہ عالم ہے کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۸/۱۰۹) " ان سے کہہ دے کہ اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ایسے ہی سمندر اور پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کر سکیں" حقائق کی یہی لامحدودیت ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کر اتھر نے کہا ہے کہ " ہمیں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہئے"

یاد رکھئے قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔ اگر ہم اس کے حقائق کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں تو یہ ہمارے تدبّر کا قصور ہے یا ہمارے زمانے کی علمی سطح کا نقص۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس خیال سے کہ ہم قرآنی حقائق کے سمجھنے میں کہیں غلطی نہ کر جائیں،

ہم ان حقائق پر غور و تدبر کرنا ہی چھوڑ دیں، جس خدا نے غور و تدبّر کا حکم دیا تھا اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ انسانی غور و فکر غلطی بھی کر سکتا ہے اور جس دور میں غور و فکر کرنے والا انسان پیدا ہوا ہے اس دور کی علمی سطح بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے خارجی کائنات پر غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے، اور قرآنی حقائق پر بھی، یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھائیں گے تاآنکہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ (قرآن) واقعی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔" اس باب میں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) بس اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ غور و فکر کرنے والا اپنی تعبیر کو حرفِ آخر نہ سمجھ لے۔

(۱۹۶۲ء)

۸۔ قرآن کریم کے تراجم میں اختلاف

رسالپور سے ایک صاحب کا حسب ذیل مکتوب موصول ہوا ہے۔

"تعداد ازدواج کے متعلق طلوعِ اسلام اور مدیر صدقِ جدید کے الگ الگ فتاویٰ نے یہاں عجیب سی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ ہر چند کہ قرآن کریم میں سورۃ النساء کی آیت مبارکہ ۳ کے معانی جو محترم پرویز صاحب نے کئے ہیں ایک ضابطہ حیات میں شادی کے متعلق ایک قانونی شق بالکل صاف اور واضح قابلِ فہم اور قابلِ عمل ہے۔ مگر صدقِ جدید ہی کا کیا قصور ہے جبکہ ..... نے قرآن مجید مترجم عکسی و رنگین کے جو متعدد نسخے بڑی محنت اور احتیاط سے طبع کئے ہیں۔ اور ان میں شاہ رفیع الدین مرحوم محدّث دہلوی کا مستند، مقبول عام اور مشہور و معروف ترجمہ تحت اللفظ کیا گیا ہے اور حاشیہ پر تفسیر شاہ عبدالقادر صاحب کی کی گئی ہے۔ آیت مذکور کا لفظی ترجمہ اور تفسیر موضح القرآن یوں کرتے ہیں۔

ترجمہ:۔ اور اگر ڈرو تم یہ کہ نہ انصاف کرو گے بیچ یتیم عورتوں کے پس نکاح کرو جو خوش لگے تم کو سوائے ان کے عورتوں سے دو دو، اور تین تین اور چار چار۔ پس اگر ڈرو تم یہ کہ نہ عدل کرو تم پس ایک ہے یا جس کے مالک ہوئے داہنے ہاتھ تمہارے یہ بہت نزدیک ہے اس سے کہ نہ بے انصافی کرو۔ (۴/۳)

موضح القرآن نمبر ۲۰ کا نوٹ

یعنی اگر جانو کہ یتیم لڑکی کو ہم نکاح کریں گے تو اس کا حق نہ ادا کریں گے — کیونکہ اس کا حق مانگنے والا نہیں، تو عورتیں بہت ہیں کچھ کمی نہیں۔ ایک مرد کو دو بھی اور تین بھی اور چار بھی روا ہیں۔ اس سے زیادہ جمع کوئی روا نہیں کیونکہ اتنے میں بھی انصاف کرنا مشکل ہے، زیادہ میں کب ہو سکے گا۔ سو اس قدر بھی جب کرو کہ جانو انصاف سے رہو گے نہیں تو ایک ہی بس ہے۔ یا اپنی لونڈی کفایت ہے۔ جس کو کئی عورتیں ہوں تو واجب ہے کھانے پینے میں اور دینے لینے میں برابر رکھے۔ اور رات رہنے میں باری برابر باندھے۔ اگر نہ کرے گا تو قیامت میں اس کا آدھا جسم گھسٹتا چلے گا۔ اور تاکیداً فرمایا کہ عورت سے مہر پورا خوشی سے ادا کرو۔ اگر وہ خوشی سے کچھ چھوڑ دے تو اور بات ہے۔

اور قرآن کریم کے ایک دوسرے نسخے میں جس کی طباعت اور ترجمہ مولانا فتح محمد خان صاحب جالندھری مرحوم نے کیا ہے، آیت مبارکہ کا لفظی ترجمہ یوں لکھتے ہیں:۔

ترجمہ:۔ اور تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کر لو۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔

ہاں اگر وہ اسی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں۔ تو اسے ذوق شوق سے کھا لو۔ (۴/۴)

چونکہ ہندوستان، پاکستان میں قرآن کریم کے یہ نسخے یا اس قسم کے دوسرے مترجم نسخے موجود ہیں۔ یہی تلاوت کئے جاتے ہیں، سمجھے اور سمجھائے جاتے ہیں تو آپ ہی غور فرمائیے کہ عوام جو عربی زبان نہیں جانتے وہ اس "ضابطۂ حیات" میں ایک شادی کے متعلق کیا، باقی اصول و احکام کو سمجھ کر کتنا صحیح یا غلط خود عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو فتوٰے اور نصیحت دے سکتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جیسے عربی سے ناواقف عوام قرآن کی صحیح تعلیم سے محروم ہیں۔ اس طرح اگر..... صاحب غلط معانی لے کر لکھنے لگ جائیں تو ان کا کیا قصور ہے۔ ہاں ظلم یہ ہے کہ ان کی تقلید ہوتی ہے۔ اور جو کچھ وہ کہہ دیں وہ صحیح سمجھ لیا جاتا ہے اور اس طرح دوسری قومیں کیا مسلمان خود صحیح اسلام سے دور کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔

جواب

اس میں شبہ نہیں کہ یہ چیز ہر صاحب فکر کے لئے موجب حیرت بن جاتی ہے کہ قرآن کے موجودہ ترجموں میں جہاں کسی کے ہاں کوئی غلطی ہوتی ہے۔ ہر ایک ترجمہ میں وہی غلطی کیوں ہوتی ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ قرآن کے کسی ترجمہ کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس کی کوئی تفسیر لکھی تھی۔ سب سے پہلی اور جامع تفسیر امام ابن جریر طبری نے تیسری صدی ہجری میں لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے التزام یہ کیا کہ جو کچھ لکھا اس کی تائید میں کوئی نہ کوئی روایت ضرور لکھ دی۔ لہٰذا ان کی تفسیر ان کی اپنی تفسیر نہ رہی بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ کی تفسیر سمجھی گئی۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب روایات سازی کا بازار گرم تھا اور ہر موضوع پر وضعی روایات آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔ امام طبری نے تفسیر کے علاوہ سب سے پہلی جامع تاریخ بھی لکھی (یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ امام طبری دراصل شیعہ تھے۔ لیکن انہوں نے یہ تفسیر اور تاریخ دونوں سنیوں کے امام کی حیثیت سے لکھیں) چنانچہ ان کی تفسیر ام التفاسیر اور ان کی تاریخ ام التواریخ کہلاتی ہے۔ ان کے بعد جو تفسیریں بھی لکھی گئیں وہ بالعموم امام طبری ہی کی تفسیر کے تتبع میں لکھی گئیں۔ اس لئے کہ ان کی تفسیر کی تائید میں روایات لکھی گئی تھیں لہٰذا ان کے خلاف تفسیر لکھنے کے معنیٰ یہ تھے کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی تفسیر کے خلاف جا رہے ہیں۔ جہاں جہاں کسی نے ان سے اختلاف کیا، وہ اسی بنا پر

کیا کہ ان کی فلاں روایت کمزور ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ روایت قوی ہے۔ بنا بریں (بجز ان مستثنیات کے جن میں کسی نے اختلاف کیا ہو) ہمارے ہاں قرآن کا وہی مفہوم صحیح سمجھا گیا ہے جسے امام طبری نے سمجھا دیا ہے۔ تفسیروں کے بعد جب ترجموں کی باری آئی تو ان میں بھی اسی مفہوم کو پیش نظر رکھا گیا جو تفسیر میں بیان ہوا تھا۔ لہٰذا ہمارے ترجمے قرآنی الفاظ کے ترجمے نہیں بلکہ قرآن کے اس مفہوم کے مظاہر ہیں جو ہماری تفسیروں میں بیان ہوا ہے۔ چونکہ یہ تفسیریں مصر اور بخارا، شام اور ہندوستان عرب و عجم ہر جگہ درس میں پڑھائی جاتی ہیں اس لئے قرآن کا ترجمہ خواہ وہ فارسی میں ہو یا ترکی میں۔ اردو میں ہو یا خود عربی میں ہر جگہ کم و بیش ایک جیسا ہوتا ہے۔ اب جو غلطی ایک میں پائی جائے گی وہ دوسروں میں بھی پائی جائے گی۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کی زیر نظر آیت کو لیجئے۔ آیت یہ ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ..... اس کا ترجمہ آپ کو یہ ملے گا کہ:

اور اگر ڈرو تم یہ کہ نہ انصاف کرو گے بیچ یتیم عورتوں کے پس نکاح کرو خوش لگے تم کو سوائے ان کے عورتوں سے۔

آپ دیکھیں گے کہ یہ الفاظ کہ تم ان کے سوائے اور عورتوں سے نکاح کرو، قرآن میں نہیں ہیں۔ اور اسی ٹکڑے نے (کہ تم ان کے سوا اور عورتوں سے نکاح کرو) سارے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ یعنی قرآن نے کہا تھا کہ انہی عورتوں میں سے (جو بلا شوہر کے رہ گئی ہوں) اپنی حسبِ پسند ایک سے زیادہ شادیاں کر لو۔ اور ترجمہ نے یہ کہا کہ ان عورتوں کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے شادیاں کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ الفاظ قرآن میں نہیں تو ترجمہ میں کیسے آ گئے؟ ترجموں میں یہ الفاظ تفسیر سے آئے۔ تفسیر میں ایک روایت کی سند سے آئے۔ چنانچہ بخاری میں ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے اس آیت کا مفہوم پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ لوگ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے ان کی حق تلفی کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ حکم آیا کہ تم ان لڑکیوں سے نکاح نہ کرو۔ اور عورتیں بہت ہیں۔ ان سے دو دو تین تین چار چار تک نکاح کر لیا کرو۔ یہ روایت تفسیر میں آئی اور اس تفسیری مفہوم کے ماتحت ترجمے ہوئے۔ اب جو شخص اس ترجمہ پر اعتراض کرے تو اسے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ مفہوم ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے اپنی حدیثوں کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا۔ اور تفسیریں اس زمانہ میں لکھی گئی تھیں جب خود محدثین کی تحقیق کے مطابق وضعی حدیثوں کا بازار گرم تھا۔ بہرحال یہ وجہ ہے کہ ہمارے ترجمے قرآن کے الفاظ سے مختلف ہو جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تفسیری احادیث کا کوئی مستند مجموعہ امت کو نہیں دیا تو قرآن کے سمجھنے کا صحیح اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ خارجی اثرات کو الگ رکھ کر قرآن کو خود قرآن ہی سے سمجھا جائے۔ یعنی عربی زبان کی رو سے اور قرآن نے تصریف آیات سے اپنا جو مفہوم خود واضح کر دیا ہے اس کی رُو سے۔

(سنہ ۱۹۵۵ء)

۹۔ بلا سمجھے قرآنِ کریم کی تلاوت

(س) تلاوتِ قرآنِ پاک ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو قرآنِ کریم کے الفاظ پڑھتے ہیں لیکن ان کے معنی بالکل نہیں سمجھتے۔ کیا اس سے کچھ فائدہ بھی ہے؟

جواب

طلوعِ اسلام میں اس سے پیشتر اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے لیکن سوال کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی تکرار بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگی۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی اور کتاب بھی ایسی ہے جسے آپ بلا سمجھے پڑھتے ہیں۔ کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب تو ایک طرف رہی جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں۔ اگر کتاب کی زبان آپ جانتے ہوں اور وہ، کتاب آپ کی استعداد سے زیادہ مشکل ہو تو بھی آپ اسے نہیں پڑھیں گے کہ جب کچھ پلے ہی نہیں پڑتا تو پھر اسے پڑھا کس لئے جائے۔

جب یہ کیفیت ہے تو پھر قرآن کو کیوں اس سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے؟ کتاب پڑھنے

سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کتاب کے مضامین (CONTENTS) کو سمجھ سکیں۔ اگر آپ اس کے مافیہ کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کا پڑھنا آپ کو کیا فائدہ دے گا۔ یہ ایک عام سمجھ کی بات ہے۔ پھر معلوم نہیں "مذہب" کے معاملہ میں سمجھ کو کیوں الگ رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآن ایک کتاب ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ تمہیں دنیا میں زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کتاب کو پڑھا اس لئے جائے گا کہ سمجھا جائے' اور سمجھا اس لئے جائے گا کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ کہیئے! اس کے الفاظ کو دہرا لینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ قرآن اپنے آپ کو "کتابِ مبین" (ایک واضح کتاب) کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری زبان "عربی مبین" (صاف اور سلیس واضح عربی زبان) ہے۔ وہ اپنے آپ کو "ہدایت" راہ نمائی اور نُور (روشنی) بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے بین اصول منضبط ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ اس میں ارتقاء شرفِ انسانیت کے قوانین و آئین مندرج ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر بار بار دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ وہ ہر صاحبِ فکر و نظر کو اس میں تدبر و تفکر کے لئے تاکید کرتا ہے۔ وہ اس میں تدبر نہ کرنے والوں کو سطح انسانیت سے گرا ہوا قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عقل کی آنکھ کے لئے سورج کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن کا یہ مقصد بلا سوچے سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ قرآن پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ اسے بلا سمجھے پڑھا جائے۔ آپ کسی مصنف سے یہ کہیئے کہ میں تمہاری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے باوجود ہر روز اسے پڑھتا ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے وہ زبان بھی نہیں آتی۔ جس میں تم نے کتاب لکھی ہے۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ کو دہراتا رہتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچیئے کہ وہ مصنف آپ کو کیا جواب دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اُمت کو قرآن سے دور لے جانے کا سب سے مؤثر حربہ یہ تھا کہ اس کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا جائے کہ قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے سے بھی "ثواب" حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان سازشوں میں سے بڑی سازش تھی۔ جو دنیا میں اس عظیم المرتبت قوم کو اس کے مقام سے گرانے کے لئے سوچی گئیں۔ (ہم جانتے ہیں کہ وہ مسلمان جن کی زبان عربی ہے یا جو عربی جانتے ہیں' وہ بھی دوسروں کے ساتھ ہی ذلیل ہیں۔ لیکن اس کے لئے اور وجوہات ہیں۔) جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ عقیدہ کہ بلا سمجھے قرآن کے الفاظ دہرانے سے "ثواب" ہوتا ہے۔ یکسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ

درحقیقت عہدِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ اپنے اندر تاثیر رکھتے ہیں (معانی نہیں بلکہ الفاظ) یہ قرآنی اعمال۔ تعویذ۔ نقوش۔ وظائف اوراد سب اسی عقیدہ کی مستعار شکلیں ہیں۔ قوم ہزار برس سے ان توہمات میں الجھی چلی آرہی ہے اور ان سے نجات کی اب بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے کہ قوم کو جہالت کی ان وادیوں میں گھیرے رکھنے سے ایک طبقہ کی روٹی وابستہ ہے۔ اس لئے وہ اسے ظلمات سے نور کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جب کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ تو بھوک کا تصوّر اس طبقہ کو ہر قسم کی مخالفت کے لئے کمربستہ کر دیتا ہے اور اس آواز کو "مذہب اور سلف صالحین کے طریقہ" کے خلاف قرار دے کر عوام کے جذبات مشتعل کر دیتا ہے۔ یہی ہے مترفین اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والوں کا وہ گروہ جو ہمیشہ حق کی آواز کے خلاف محاذ قائم کرتا رہا ہے، اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ قرآن (حضرت) موسیٰ کا وہ اژدہا ہے جو ان ساحرین کی نگاہ فریب رسیوں کو صاف نگل جائے گا۔ اس لئے وہ قرآن کریم کو قوم کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیں گے، اور اس کے لئے وہ اُن پڑھوں کو قرآنی الفاظ کے دہرانے کے "ثواب" اور لکھے پڑھوں کو اسرائیلی روایات پر مشتمل تفاسیر کے فریب میں مبتلا رکھیں گے تاکہ۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔

(۱۹۵۳ء)

۱۰۔ قرآن فہمی کا طریق

محترم عرشی صاحب کا مکتوب گرامی (پرویز صاحب کے نام)

"سلیم کے نام" خط (جون ۱۹۵۱ء) میں نے آج دوبارہ پڑھا۔ دراصل ان خطوط[1] میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے نئے راستے کھل رہے

---

[1] ان خطوط کا مجموعہ تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ہیں، جو بظاہر نئے ہیں اور حقیقتاً پرانے۔ یعنی ایں دآں سے صرفِ نظر کر کے صرف قرآن کو سامنے رکھنا۔ جیسا کہ قرن اول میں تھا۔ اس تازہ خط میں کئی باتیں ہیں۔ جن پر مفصل اظہارِ رائے کی ضرورت ہے۔ سردست صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

(۱) آپ کے قلم سے شاید روح القدس نے یہ فقرے لکھوا دیئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کر لیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کریں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق قرآن کا مفہوم از سرِ نو متعین کریں۔

آپ نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ فقہا و محدثین کی بے شمار اصطلاحات نے ہم کو اس قرآن سے بہت دور پھینک دیا ہے جو قدیم مخاطبین قرآن نے سمجھا اور سمجھتے ہی پیتل سے سونا اور کانچ سے الماس بن گئے۔ یعنی ابھی ابھی وہ لٹیرے، وحشی، لڑاکے، فاسق و فاجر، جواری، شرابی اور نہ جانے کیا کیا تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے۔ اور اس کے دوبارہ اٹھتے ہی وہی خونخوار چہرے مقدس و نورانی بن جاتے ہیں۔ ان کی ہر ادا میں دل نوازی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے ان کے سامنے سو پچاس بڑے بڑے فقہا و محدث اور قرآن کی بجائے صحاح ستہ و شرح وقایہ وغیرہ پیش کی جاتیں۔ تو یقیناً یہ نتیجہ نہ نکلتا جو تاریخ کے آسمان پر ستاروں سے زیادہ روشن نظر آ رہا ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کو انہی معنوں میں سمجھا جائے جن میں صحابہؓ نے سمجھا تھا اور یہ نکتہ بھی آپ نے خوب کہا کہ:

"اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق"

یہ بات نہایت اہم بھی ہے اور ہمارے موجودہ مریضانہ حالات میں نہایت مشکل بھی۔ وہ ذہن جو صدیوں سے اصطلاحی مفہوموں سے متاثر بلکہ مادّف ہو

چکے ہیں۔ اس وقت منڈی میں انہی کی درآمد برآمد ہو رہی ہے۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ" اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کرلیں" قطعاً ناممکن ہے۔ لے دے کے ایک طلوعِ اسلام ہے اور اس کے دو ایک لکھنے والے جن کا بحالت موجودہ اس امرِعظیم سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار نظر آتا ہے۔ (لیکن اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی بعید نہیں)

(۲) بات یہ ہے کہ" فطرت" کے مروجہ معانی کی تردید میں آپ نے معقول قدم اٹھایا ہے اور جو معنی اپنی طرف سے پیش کئے ہیں وہ قرآن مجید کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طریق پر سارے قرآن کے نہ سہی خاص خاص الفاظ کے معانی تلاش کرلئے جائیں تو آئندہ کے لئے راستہ تیار ہو جاتا ہے اور یہ کام کسی تنہا دماغ کے بس کی بات نہیں۔ مفکرین کی ایک جماعت ہو جو قرآن کے اندر غوطے لگا کر ان موتیوں کو برآمد کرے۔

جواب

میں نے محترم عرشی صاحب کا یہ خط اس لئے شائع کیا ہے کہ اس میں انہوں نے جس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ فی الواقعہ بڑی اہم ہے اور اس قابل کہ ملک کا سوچنے والا طبقہ اس پر غور و فکر کرے۔

میں عمر بھر ان اسباب و علل پر غور کرتا رہا جن کی وجہ سے مسلمان اس سرچشمۂ حیات (یعنی قرآن کریم) سے دور ہوتے گئے۔ جس نے انہیں ایک زمانہ میں زندگی اور اس کی تمام سعادتوں سے نوازا تھا مجھے منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی نظر آیا۔ (اور یہ سبب بڑا بنیادی تھا) کہ ہمارے قرآن کے الفاظ کا جو مفہوم مروج ہے وہ بیشتر غیر قرآنی ہے اس کے لئے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم چونکہ قرآن کو ترجموں کے ذریعے سمجھتے ہیں، اس لئے اس کی اصل سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن سمجھنے کے لئے عربی جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور جب تک ہم عربی نہ جانیں قرآن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ لیکن اس سے اس مشکل کا حل نہیں ہوتا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ جن حضرات نے قرآن کے ترجمے کئے ہیں وہ تو عربی جانتے تھے۔ اگر عربی جاننے سے صحیح قرآن سمجھ میں آجاتا تو ان کے ترجموں سے بھی قرآن

سمجھ میں آجانا چاہیئے تھا۔ تمام تر نہیں تو کم از کم قریب قریب ۔ دوسری چیز یہ (اور یہ پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے) کہ مسلمانانِ عالم کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جس کی مادری زبان عربی ہے۔ ان کے لئے صحیح قرآن سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی قریب قریب اسی قسم کا قرآن سمجھتے ہیں ۔ جس قسم کا قرآن ہمارے ہاں ترجموں سے سمجھا جاتا ہے۔ آپ عربی ممالک (یعنی عربی بولنے والے مصنفین) کی مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھئے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے ان میں اور اپنے ہاں کی مذہبی کتابوں میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ مجھے ایک عرب ادیب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ادب کا امام ۔ زبان پر اس قدر عبور کہ ایک ایک لفظ کی بیسیوں سندات مستحضر۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اسے بڑے بڑے عربی لغت، شعراء کے دواوین اور کتب محاضرات حفظ یاد ہیں مرادفات کے معانی میں ایسا لطیف فرق بتاتا ہے کہ سن کر لطف آجاتا تھا۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ یونہی قرآن کی کوئی آیت سامنے آتی وہ وہی مفہوم بیان کرتا جو ہمارے مکتبوں پڑھایا جاتا ہے ۔ اور جس میں قرآن کہیں نام کو نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں

قرآن کا مروّجہ مفہوم

بھی قرآن کو انہی تفاسیر کے ذریعے سمجھا جاتا ہے، جو عجم زدہ ذہنیتوں کی پیداوار ہیں اور اس ماحول کی تخلیق جس میں مسلمان قرآن سے دور جا چکا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں قرآن کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے۔ اور عرب ہوں یا غیر عرب ہر جگہ وہی متعین مفہوم رائج ہے۔ لہٰذا قرآن سے بُعد کا اصلی سبب عربی نہ جاننا نہیں۔ اس کا سبب وہ مصطلحہ مفہوم ہے جو ہمارے ہاں ایک مدت سے رائج چلا آرہا ہے اور یہ مفہوم عجمی ہے، قرآنی نہیں۔ ہم قرآن الفاظ کے معانی انہی اصطلاحات کی رُو سے سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ہماری عربی وہ عربی ہی نہیں رہی جو زمانہ نزول قرآن میں تھی۔ اس کے الفاظ تو بے شک وہی ہیں، لیکن ان الفاظ کا مفہوم عجمی تصورات کا پیدا کردہ ہے ۔ اور یہی مفہوم عرب اور عجم ہر جگہ رائج ہے۔ اس لئے قرآن کا صحیح مفہوم نہ عربی جاننے والے سمجھتے ہیں اور نہ وہ جو عربی نہیں جانتے اور قرآن کو ترجموں سے سمجھتے ہیں۔

جب قرآن نازل ہوا تو ان اصطلاحات میں سے کسی کا بھی وجود نہ تھا۔ جو بعد میں فقہ، روایات، تصوف، کلام وغیرہ کی رو سے پیدا ہوئیں اور آہستہ آہستہ دین کا جزو بنتی گئیں۔

اگر ان اصطلاحات سے مقصود وقتی مسائل کا حل ہوتا (اور ان کا دائرہ عمل وہیں تک محدود رہتا) تو اس میں کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن مصیبت یہ ہوگئی کہ ان چیزوں کو دین کا مستقل اور غیر متبدل جزو سمجھ لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود قرآن بھی انہی کی روشنی میں سمجھا جانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ یہ ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ قرآن متن اور اصل رہتا اور یہ چیزیں اس کی شرح اور جزئیات سمجھی جاتیں، یہ چیزیں اصل اور متن بن گئیں اور قرآن ان کا شارح ہو کر رہ گیا۔ اب قرآن کا سارا مفہوم انہی (بعد کے پیدا شدہ) تصورات کی تشریح ہے اور قرآن کا یہی مفہوم ہر جگہ پڑھایا اور سمجھایا جاتا ہے۔ خواہ عرب ہو یا عجم۔

عربی مبین

قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ "عربی مبین" میں نازل ہوا ہے۔ یعنی واضح اور سادہ زبان میں جو اس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی۔ اس زمانہ کے عربوں کی معاشرت بالکل سادہ تھی۔ وہ عجم کے تکلفات اور حضارت کے اثرات سے غیر متاثر تھے۔ صحرا کی کھلی فضا۔ کھجوروں کے خوشے متاعِ حیات، چند پالتو مویشی، ایک آدھ خیمہ، دن میں کوئی نخلستان منزل گاہ۔ راتوں کے ستارے۔ دلیل راہ۔ یہی چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں اور انہی کے گرد ان کی زبان کے مشتقات و مصادر گھومتے تھے۔ آپ ان مشتقات کو دیکھئے۔ ان کا بیشتر حصہ اونٹ، گھوڑے، بکریاں، خیمے، نخلستان، کھجوریں، تلوار، صحرا، چاند، سورج، ستاروں کے محسوس مشاہدات پر مبنی ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان میں وسعت بھی ایسی تھی کہ انہی مشتقات سے نکلے ہوئے الفاظ ایک دنیا کو محیط ہو جاتے تھے۔ ان کی زبان کی امکانی وسعتوں کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ مشہور معتزلی امام واصل بن عطاء حرف را (ر) کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ خطابت اس زمانے میں سب سے بڑا ہتھیار تھا اور اس کی سحر کاریاں فصاحت اور بلاغت کی رہین کرم تھیں۔ ایک نئے فرقے کے امام کی حیثیت سے واصل کو عمر بھر تقریریں کرنی پڑیں۔ مناظروں اور مباحثوں میں سرگرم تکلم رہنا پڑا۔ لیکن اس نے کہیں کسی جگہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس میں (ر) آتا ہو۔ اندازہ لگائیے کہ اس کے پاس کس قدر مرادفات کا ذخیرہ تھا۔ اور پھر غور فرمائیے کہ وہ زبان جس کے الفاظ کے سرمایہ کا یہ عالم تھا کہ کس قدر وسعت بداماں تھی۔

بہرحال جب قرآن نازل ہوا تو اس کے اوّلین مخاطبین نے اسے بغیر کسی دقّت کے سمجھ لیا۔

اس کے لئے نہ انہیں کسی تفسیر کی ضرورت تھی۔ نہ ان اٹھارہ علوم کی جنہیں اب قرآن سمجھنے کے لئے لازمی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ الفاظ جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ جانتے تھے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ تغیرِ احوال و کوائف سے زبان پر کیا کیا اثرات پڑتے ہیں۔ اس سے علم اللسان کا ہر طالب علم واقف ہے۔ عربی زبان ان تغیرات سے خاص طور پر متاثر ہوئی۔ اس کے لئے ہمارا علمی دور بالخصوص عباسیوں کا زمانہ تھا۔ جب عربی ذہنیت سمٹ کر پیچھے ہٹ چکی تھی اور عجمی اثرات پورے کے پورے اسلامی معاشرے پر چھا چکے تھے۔ ان عجمیوں نے زبان تو عربی اختیار کی، لیکن تصورات اپنے ہی رکھے۔ اس طرح عربی زبان عجمی تصورات کے اظہار کا ذریعہ (MEDIUM) بن گئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں ہماری تصنیفات کا آغاز ہوا۔ لہٰذا ہماری ان کتابوں کی زبان تو عربی تھی۔ لیکن ان عربی الفاظ کا مفہوم وہ نہ تھا۔ جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں کے ذہنوں میں ہوا کرتا تھا۔ یہ تو پھر بھی بعد کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب غیر عربوں سے خلا ملا کی ابتدا ہوئی تو آپؓ مدینہ کے رہنے والوں سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جاکر چند دن گزارا کرو۔ کیونکہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں غیر متاثر شکل میں باقی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جس عربی زبان میں ہمارے عجمی آئمہ مذہب نے کتب تفاسیر وغیرہ لکھی ہیں، وہ زبان معنوی اعتبار سے قرآن کی زبان سے کس قدر قریب ہو سکتی ہے؟ یہی وہ زبان ہے جس میں ہمیں قرآن سمجھایا جاتا ہے۔ لہٰذا جو کچھ سمجھایا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر قرآنی مفہوم ہوتا ہے جسے قرآنی الفاظ میں سمو دیا گیا۔

بعد کے تغیّرات

اندریں حالات قرآن سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس کے بعد کے مفہوم سے صرف نظر کرکے دیکھا جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت ان الفاظ کے معانی کیا تھے جو قرآن میں آئے ہیں۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے ہاں اتنا ذخیرہ موجود ہے جس سے ان کے الفاظ کے وہ معانی متعین کئے جا سکتے ہیں جو اس زمانے کے سیدھے سادے عربوں کے ہاں رائج تھے۔ یہ ذخیرہ مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، لیکن اسے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ فلہٰذا سب سے پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ ایک ایسا لغت مرتب کر دیا جائے جس میں یہ بتایا جائے کہ قرآن کے الفاظ کے اصلی مادے کیا ہیں

قرآن کا لغت

اور زمانہ نزول قرآن میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے (اگر ہو سکے تو یہ بھی بتایا جائے کہ بعد میں ان الفاظ کے معانی میں کیا تغیرات واقع ہوئے۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی کیا جا سکے تو چنداں مضائقہ نہیں) میری نگاہ سے قرآن کا کوئی لغت ایسا نہیں گزرا جس میں خصوصیت سے اس انداز سے قرآنی مفردات کے معانی متعین کئے گئے ہوں۔ متاخرین میں علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس ضمن میں کوشش شروع کی تھی۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یوں سمجھئے کہ وہ اس عظیم کام کو چھوڑ کر چلے گئے۔ انہیں عہد جاہلیہ کی زبان پر اتنا عبور اور قرآن کے ساتھ ایسا شغف تھا کہ وہ اگر کچھ مدت اور زندہ رہتے تو اس باب میں مفید کام کر جاتے۔

اس لغت کے مرتب کر لینے کے بعد دوسرا مرحلہ قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ہمارے دور کی علمی سطح کے مطابق سمجھانا ہوگا۔ اس کے لئے کرنا یہ ہوگا کہ ہر لفظ کی اس روح کو سامنے رکھا جائے، جو اس کی اصل کی رو سے بے نقاب ہوئی ہے اور پھر دیکھا جائے کہ اس روح کو موجودہ زمانے کے کن الفاظ میں ٹھیک ٹھیک ادا کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ایک لفظ میں، خواہ ایک فقرہ میں اور خواہ ایک مضمون میں۔ اس کے بعد یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن میں وہ لفظ کس کس جگہ استعمال ہوا ہے۔ کیوں کہ قرآن تصریف آیات سے اپنے معانی آپ سمجھاتا ہے۔ اس طرح قرآن کا صحیح صحیح مفہوم ہمارے سامنے آ جائے گا۔ میں نے اس طریق پر خود عمل کیا اور اس کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آئے ہیں جن سے روح وجد کرنے لگ جاتی ہے اور میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اگر قرآنی الفاظ کی اصل کو سامنے رکھ لیا جائے تو پھر قرآن کس طرح اپنے مشکل سے مشکل مقامات کو بھی نہایت آسانی سے سمجھاتا چلا جاتا ہے۔

یہ لغت اگر ایک مرتبہ صحیح طور پر مرتب[1] ہو گیا، تو ہمیشہ کے لئے کام آئے گا۔ لیکن قرآن کا جو مفہوم اس لغت کی روشنی میں متعین کیا جائے گا۔ وہ ہر آنے والے زمانے کی علمی سطح کے ساتھ ساتھ (IMPROVE) ہوتا جائے گا۔

---

[1] للہ الحمد کہ پرویز صاحب کا یہ لغت مرتب ہو کر چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور مفہوم القرآن بھی شائع ہو چکا ہے۔ (۱۹۶۴ء)

میں محترمی عرشی صاحب سے حرف بحرف متفق ہوں کہ یہ کام کسی فرد کا نہیں۔ جماعت کے کرنے کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت ہے کہاں جو اس کام کو ہاتھ میں لے، ہمارے ہاں مذہب کے نام پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ قرآن کا مصرف صرف اس کے الفاظ کی تلاوت ہے جس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ قرآن سے باہر ہے۔ لہٰذا مذہب کے نام پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے، وہ ان چیزوں کے لئے وقف ہوتا ہے جو خارج از قرآن ہیں۔ اگر کہیں سے رجعت الی القرآن کی آواز اٹھتی ہے تو مسلمانوں کو اس کی آواز سے اس طرح ڈرا دیا جاتا ہے گویا اس آواز کے کان میں پڑ جانے سے ان کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ اس لئے اگر مسلمان قرآن کی طرف آ جائیں تو ان کی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اندریں حالات وہ وسائل کہاں سے میسر آئیں جو اس قسم کا قرآنی لٹریچر مرتب کرنے کے لئے ضروری ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کام کے اہل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جب اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دیں تو ان کی ضروریات زندگی کا سامان کہاں سے آئے گا؟ یہ انگلستان نہیں کہ ایک لارڈ نارتھمبرلینڈ عربی لغت مرتب کرانے کے لئے اپنی ریاست وقف کر دے گا۔[1] ان حالات کے پیشِ نظر یہاں قرآن کے متعلق کسی کام کا ارادہ کرنے والوں کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ انہیں جو کچھ کرنا ہوگا، تنہا اپنے بھروسے پر کرنا ہوگا۔ جس نہج پر معارف القرآن لکھی گئی ہے اس کا خاکہ علامہ اقبالؒ کے ذہن کا رہین منت ہے۔ میں نے اس خاکہ کو ایک مفصل خط کی صورت میں ملک کے اربابِ علم و قلم کو بھیجا، اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس قسم کی کتاب کی افادیت سے متفق ہیں تو وہ ایسی کتاب تصنیف کریں۔ ان تمام حضرات نے کتاب کے خاکے کی بہت تعریف کی۔ لیکن ہر ایک نے یہ لکھ کر معذرت چاہی کہ ایسا کام افراد کا نہیں، جماعتوں کے کرنے کا ہے۔ میں نے حضرت علامہؒ کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ اس کام کے لئے کوئی

علامہ اقبالؒ کی ہدایت

---

[1] اس لارڈ نے تنہا اپنے خرچ سے (LANE'S LEXICON) مرتب کرایا تھا۔ جس کی تکمیل میں بیس برس صرف ہوئے تھے۔

آدمی تیار نہیں ہوتا۔ انہوں نے اسی خط کے حاشیئے پر لکھ کر خط واپس کر دیا کہ اگر کچھ وقت کے لئے تم ہی آدمی بن جاؤ تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس قسم کا قرآنی انسائیکلو پیڈیا لکھنے کے لئے وہ میری طرف اشارہ کریں گے۔ میں نے جب اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات لکھی جس نے میری زندگی کی رُخ بدل دیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ تم مسافت کی لمبائی اور راستہ کی تاریکی سے ڈرتے ہوئے قدم نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس جو چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے وہ صرف دو چار قدم تک راستہ روشن کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ خوف اسی وقت تک ہے جب تک تم اس دیئے کو لے کر ایک جگہ کھڑے ہو۔ تم اسے لے کر ..... چل پڑو اور پھر دیکھو کہ یہی چھوٹا سے دیا کس طرح سینکڑوں میل کا راستہ روشن کئے چلا جاتا ہے۔ نقص دیئے کا نہیں تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے چلنے کی دیر ہے۔ یہ روشنی تم سے چار قدم آگے آگے ہو گی۔ اور جہاں تک چلتے جاؤ گے آگے ہی رہے گی۔

میں نے بلا مزید استفسار و تامل اس ننھے سے دیئے کو ہاتھوں میں لے کر چلنا شروع کر دیا۔ اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ دیا فی الواقعہ میرے راستہ کو مسلسل روشن کرتا چلا گیا۔ معارف القرآن کی چار جلدیں (بتوفیق خداوندی) شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں زیر ترتیب ہے۔ میں جب اپنی قطع کردہ راہ پر نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ ساری مسافت میں نے ہی طے کی ہے؟ اگر اللہ نے مجھے اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے مہلت دی اور توفیق عطا کر دی تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری گوناگوں مصروفیات اور خرابیٔ صحت کے پیش نظر میرے لئے معارف القرآن کی تکمیل کا کام ہی کچھ کم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ قرآن کا ایک ایسا لغت مرتب کرنا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور اس کے مطابق قرآنی مفہوم کا تعین کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر یہ ہو گیا تو جو موانع اس وقت قرآن سمجھنے کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہیں وہ دور ہو جائیں گے اور اس طرح مسلمان ایک مرتبہ پھر اپنے سرچشمۂ حیات (قرآن) کے نزدیک آجائے گا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں جانتا ہوں کہ یہ کام ایک جماعت ہی کے کرنے کا ہے۔ لیکن میں جماعتوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں نے توفیقِ ایزدی کے بھروسے پر اس کام کو بھی از خود ہی شروع کر دیا ہے اور یہ سلسلہ بھی معارف القرآن کے

ساتھ ساتھ جاری ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس باب میں میں کس حد تک کامیاب ہو سکوں گا۔ نہ ہی میں اس چیز کو آغاز سفر کے وقت دل میں آنے دیا کرتا ہوں۔ جب تک مجھ میں ہمت ہو گی اور زندگی وفا کرے گی۔ میں ان کاموں کو کرتا جاؤں گا۔ جس مقام پر ہمت یا زندگی ختم ہو جائے گی۔ وہیں یہ بھی رُک جائیں گے۔ اگر اس دوران میں اللہ کے بندوں کو خیال آگیا اور اس طرح رفقائے کار کی کوئی جماعت پیدا ہو گئی، تو میں یہ سب کچھ ان کے سپرد کر کے بطور ایک رفیق کار ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری یہی متاعِ حیات شاید کسی بعد میں آنے والے کے کام آجائے گی مجھے اس کا احساس ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں غلطیوں کا بھی امکان ہے۔ اور خامیوں کا بھی۔ لیکن میں نے کام کی ابتدا کر دی ہے۔ میرے دوسرے رفقائے کار (اگر مجھے میسر آگئے تو) یا بعد میں آنے والے راہرو میری غلطیوں کو درست کر دیں گے اور خامیوں کو پورا۔ اگر یہ سب کچھ اور کسی کام نہ بھی آیا تو کم از کم میرے بعد انہی راستوں پر چلنے والے راہروؤں کو میرے نقوشِ قدم سے اتنی تسلی تو ہو جائے گی کہ اس راستہ سے پہلے بھی کوئی مسافر گذرا ہے۔ اس لئے یہ راہ غیر مانوس (UNFREQUENTED) نہیں۔ اتنی سی تسلی بظاہر کچھ قابلِ قدر دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن میں اس کی قیمت پہچانتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے یہ بھی میسّر نہیں آسکی۔

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں رفقائے کار کی تلاش یا فراہمی سے بے فکر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس مقصد میں کامیابی کا راز "تزمیل" میں ہے مجھے "زمیل" تو مل رہے ہیں۔ وسائل سفر نہیں مل رہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ جب وہ لوگ جن کے دِل شوقِ شہادت سے لبریز ہیں۔ لیکن ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری نہ ہے نہ وہ یہ کہ جس سے سواری کا جانور خرید سکیں۔ تمہارے پاس (اے رسولؐ) بایں مقصد آتے ہیں کہ ان کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا جائے اور سواری کا انتظام تمہارے پاس بھی نہیں ہوتا تو ان لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ (۹/۹۲) وہ اس طرح واپس جاتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور اس حسرت سے غم آلود کہ ان کے پاس اتنا بھی نہیں جس سے جہاد کا سامان بھی بہم پہنچا لیا جائے۔

لیکن ہمیں ان نامساعد حالات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کہ ہر تاریک رات ایک نورانی صبح

کی تمہید ہوتی ہے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔ (۱۹۵۳ء)

طلوعِ اسلام

جیسا کہ حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے پرویز صاحب نے یہ لغت بھی مکمل کر دیا اور مفہوم القرآن بھی۔ اور یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۹۷۶ء)

۱۱۔ ناسخ و منسوخ

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:۔

آیۂ رجم سے متعلق ایک صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی سینکڑوں آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہیں۔ یعنی وہ قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر ایک آیت ایسی بھی ہے جس کا حکم موجود ہے لیکن آیت کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے۔ تو اس میں کیا قباحت ہے! ان سے کہا کہ میں نے قرآن میں کہیں نہیں پڑھا کہ فلاں آیت فلاں سے منسوخ کر دی گئی ہے اور فلاں آیت فلاں سے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں قرآن میں اس طرح نہیں لکھا۔ لیکن ہمارے علماء کرام جانتے ہیں کہ کون سی آیت کس آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ قرآن کس قسم کا ہے جس میں اس طرح ناسخ و منسوخ احکام ہیں۔ حالانکہ اس طرح تو کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون میں بھی نہیں ہوتا تو انہوں نے فرمایا کہ جب خود قرآن میں یہ موجود ہے۔ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶) یعنی "جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ یا بھلا دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا اس جیسی

(آیت) اور لے آتے ہیں۔" تو پھر آپ اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں۔
کیا آپ تفصیلاً تحریر فرمائیں گے کہ یہ کیا معمہ ہے؟

جواب:۔

ہمارے موجودہ "مذہب" کی کون سی بات معمہ نہیں جو آپ کو اس معمہ پر اس قدر اچنبھا ہوا۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ ان صاحب کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس وقت سے چلا آرہا ہے۔ جب سے روایات وجود میں آئیں، اور اس وقت تک چلا جائے گا جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباءنا (پ۲) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا" اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی مسلک تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے بیشتر حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ سمجھی جاتی ہیں۔

نسخ کے ثبوت میں قرآن کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ اگر آپ اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لائیں، تو اس کے بعد آپ فی الواقع حیران ہوں گے کہ یہ آیت اس قسم کے عقیدہ کی دلیل کس طرح بن سکتی ہے؟ لیکن قرآن کے ساتھ تو مسلمانوں نے یہ کیا کہ پہلے غیر قرآنی عقائد وضع کئے اور پھر ان کی سند کے لئے قرآن کی کھینچا تانی کی گئی۔

بات بالکل واضح تھی۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنہیں وہ آسمانی کتابیں کہتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ سابقہ ادوار میں وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی منسوخ کر دیتی تھی۔ اور ان کی جگہ بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرامؑ کی وحی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں

رہتی تھی۔ ان میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا۔ اور ان کا بیشتر حصّہ حوادثِ ارضی و سماوی کی وجہ سے یا خود انسانی دسیسہ کاریوں کے باعث ذہنوں سے فراموش ہو جاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسولؑ اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کر کے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے ان تمام سابقہ احکام کو جو وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے منسوخ کر دیا۔ اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دے دیئے۔ جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ سابقہ انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا وہ حصہ جو فراموش کر دیا گیا تھا، لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا اسے قرآن دوبارہ لے آیا۔ اب اہلِ کتاب کی یہ حالت تھی کہ وہ قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں۔ (یعنی جنہیں قرآن نے منسوخ کر دیا تھا۔ اور ان کی جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی) یا ایسی باتیں جن کا ان کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا جو ان کے پاس اس وقت موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہو چکا تھا اور جسے قرآن دوبارہ لایا) چنانچہ وہ اس کیفیتِ حال کو بطورِ اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اسی خدا کی طرف سے ہے جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں تو پھر قرآن بعینہٖ اُن کتابوں جیسا کیوں نہیں۔ ان کے جواب میں قرآن نے بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے کہ :-

ماننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا۔ کہ ہم جن سابقہ احکام منسوخ کر دیتے ہیں انکی جگہ جدید نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں۔ اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کارفرما ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں منکرین قرآن کا یہ اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا بدلنا اٰیۃ مکان اٰیۃ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انّما انت مفتر۔ بل اکثرھم لا یعلمون۔ (۱۶/۱۰۱)

جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسول) تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے (کیونکہ یہ ان کتابوں سے الگ ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں کہ (وحی کا اسلوب کیا ہے)

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔

یہ تو ہوا پیغاماتِ سابقہ کی جگہ دوسرے پیغامات لانے کی بابت۔ یعنی تنسیخ احکاماتِ سابقہ۔ اب لیجئے آیت زیرِ نظر کا دوسرا حصّہ۔ یعنی او ننسھا (یعنی جو پیغامات فراموش کر دیئے جاتے ہیں اس کے متعلق خود قرآن شاہد ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں کا کتنا بڑا حصّہ فراموش کر رکھا تھا۔ سورۂ المائدہ میں پہلے یہود کے متعلق ہے کہ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا حظا مما ذکروا بہ (۵/۱۳) یعنی وہ ان الفاظ کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں۔ (تحریف) اور جو کچھ انہیں ذکر کے لئے دیا گیا تھا، اس کا ایک بڑا حصّہ انہوں نے فراموش کر دیا ہے۔ یہی الفاظ اس سے اگلی آیت میں نصاریٰ سے متعلق کہے گئے ہیں۔ یہ لوگ پیغاماتِ خداوندی میں اس طرح تحریف و الحاق کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ پھر ایک رسولؐ بھیج کر ان کی تحریف و الحاق کو چھانٹ پھٹک کر الگ کر دیتا۔ اور اپنے اصلی پیغام کو پھر اس کی جگہ رکھ دیتا ہے۔ سورۂ حج میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنّی القی الشیطٰن فی اُمنیّتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطٰن ثمّ یحکم اللہ اٰیتہ واللہ علیم حکیم[ص۱]۔ (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبیؑ اور رسولؐ نہیں بھیجا۔ جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گذرا ہو کہ اس کے تلاوت کردہ (پیغامِ خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ نہ ملا دیا ہو (شیاطین یہ کرتے تھے) اللہ شیطان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا۔ اور اپنے پیغام کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علم والا۔ محکم پیغامات رکھنے والا ہے۔"

ص۱ ہمارے مفسرین نے اس آیۃ جلیلہ کی تفسیر میں اس قسم کی رنگ آمیزیاں کی ہیں اور حضور نبی اکرمؐ کی طرف اس قسم کی لغو باتیں منسوب کی ہیں کہ جن کے تصوّر سے بھی روح کانپتی ہے اور ان سب خرافات کا منبع روایات ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔

امید ہے کہ ان اشارات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ۔ "ما ننسخ من اٰیۃ" الخ کی آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مُلّا بے چارے کو اس سے کیا واسطہ کہ خدا کے متعلق کیا تصوّر پیدا ہوتا ہے، اور رسولؐ اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں کہیں فرق نہ آجائے۔ خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات۔ مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات۔ مُلّا کے نزدیک جو کچھ کتاب میں "چھپا ہوا" ہے، سند ہے۔ باقی رہا قرآن تو وہ مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے ہے یا اس لئے کہ:۔

از یٰسین او آساں بمیری

(سنہ ۱۹۵۳ء)

۱۲- آیۂ رجم

قرآنِ کریم میں زنا کی سزا سو کوڑے مذکور ہیں۔ لونڈی اور غلام کے لئے اس سے نصف۔ لیکن شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے رجم (سنگسار) کی سزا بتائی جاتی ہے۔ رجم کا نصف کس طرح سے ہو گا؟

جواب

قرآن کریم میں زنا کی سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لئے۔ نہ غیر شادی شدہ کے لئے۔ یہ سزا یہودیوں کے ہاں رائج تھی۔ لیکن قرآن نے اسے تجویز نہیں کیا۔ ہمارے ہاں یہ سزا بعد کی

وضع کردہ ہے۔ اور اسے منسوب کیا جاتا ہے۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے۔ کیا عرض کیا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے دین میں کیا کیا کچھ داخل کر لیا ہے اور پھر ان چیزوں کو کس قدر مقدّس بنا دیا گیا ہے۔

مزید وضاحت

ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

نومبر کے طلوعِ اسلام میں آپ نے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن میں ایک آیت موجود تھی جس میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا۔ اور اس کے بعد وہ آیت قرآن میں نہیں رہی۔ اسے پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بات تو بہت دور تک پہنچ گئی ہے۔ کیا اس موضوع پر ہماری تفسیر کی کتابوں میں کوئی بحث ہوئی ہے۔ اسے ذرا تفصیل سے لکھئے، مجھے تو اس دن سے نیند نہیں آتی۔ !

جواب :۔

اس روایت کو پڑھ کر آپ کی نیند کا اچاٹ ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ ہر سعید روح پر یہی کیفیت گزرے گی۔ ابھی تو آپ نے صرف ایک روایت دیکھی ہے۔ اگر آپ کہیں روایات کی تمام کتابوں کو دیکھ لیں تو معلوم آپ پر کیا گزرے ؟ اس موضوع پر ہماری کتب تفسیر میں لمبی چوڑی بحثیں موجود ہیں۔ اور انہوں نے بڑے شد و مد سے ثابت کیا ہے کہ واقعی قرآن کریم میں اس قسم کی آیت موجود تھی۔ اور وہ اب قرآن میں نہیں۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں (جس کا شمار بلند پایہ تفاسیر میں ہوتا ہے۔) سورۂ نور کی آیت متعلقہ زنا کے ضمن میں حسب ذیل تصریحات موجود ہیں۔

"موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگوں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی۔ جسے ہم نے تلاوت کیا۔ یاد کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا، چھوڑ کر مر جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم

کا حکم مطلق حق ہے۔ اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ خواہ مرد ہو یا عورت۔ جبکہ اس کے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مبسوط موجود ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا۔ تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا۔ جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا۔ اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی۔ تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمرؓ بن خطاب۔ عبداللہ بن مناف، اور فلاں فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں۔ جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذابِ قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے۔ مسند احمد نے لکھا ہے کہ امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ رجم کے حکم کا انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا۔ الخ امام ترمذی بھی اسے لائے ہیں۔ اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابویعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کاری کریں۔ تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا.....؟ فرمایا سنو، ہم میں جب اس کا ذکر چلا۔ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں کہ ایک شخص نبی اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپؐ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا۔ یا رسول اللہؐ آپؐ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے نہیں لکھ سکتا۔ یا اسی کے مثل یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔

پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی یا پھر تلاوت میں منسوخ

ہوگئی، اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی بیوی کے رجم کا حکم دیا جس نے اپنے ملازم سے بدکاری کرائی تھی۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور ایک خامدیہ عورت کو رجم کرایا۔ ان سب واقعات میں یہ مذکور نہیں کہ رجم سے پہلے آپ نے انہیں کوڑے بھی لگوائے ہوں۔ بلکہ ان سب صحیح اور صاف حدیثوں میں صرف رجم کا ذکر ہے۔ کسی میں بھی کوڑوں کا بیان نہیں۔ اسی لئے جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے ابوحنیفہ، مالک، شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہیئے۔ تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے جیسے کہ حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ لائی گئی۔ جو شادی شدہ عورت تھی اور زنا کاری میں آئی تھی۔ تو آپ نے جمعرات کو کوڑے لگوائے اور جمعہ کے دن سنگسار کرا دیا۔ اور فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کر کے میں نے کوڑے پٹوائے اور سنت رسولؐ اللہ پر عمل کر کے سنگسار کرایا۔ مسند احمد، سنن اربعہ اور مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری بات لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے رستہ نکال دیا۔ کنوارا، کنواری کے ساتھ زنا کرے۔ تو سو کوڑے اور سال بھر کی جلا وطنی اور شادی شدہ کے ساتھ کرے تو رجم"

ملاحظہ فرمالیا آپ نے اسلاف کا تفسیری بیان؟ ——— آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ آیت جس میں زنا کی سزا سنگساری تھی کہاں چلی گئی اور جب آیت ہی نہیں رہی تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا۔ لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قرآن میں بیشتر آیات ایسی ہیں۔ جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے، لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ حکم بعض دوسری آیات سے منسوخ سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات احادیث بھی قرآن کا حکم منسوخ کر دیتی ہیں۔ اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جو قرآن میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یعنی ان کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے اور حکم باقی ہے[1]۔

---

[1] آیۂ رجم کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ وہ کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی تھی جنہیں حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی۔

آپ شاید ہنسیں گے کہ ہم یہ کس قسم کی باتیں لکھ رہے ہیں۔ لیکن ہنسیئے نہیں بلکہ رویئے اس قوم کی حالت پر جس میں ہزار برس سے یہ عقائد مسلسل چلے آرہے ہوں۔ اور جو شخص ان کے خلاف آواز اٹھائے، اسے خارج از اسلام ٹھہرا دیا جائے۔ باقی رہا یہ کہ بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔" سو مولوی کو اس سے کیا غرض کہ بات کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اشخاص کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اسے صرف اس سے غرض ہے کہ اس کے معبود محفوظ رہیں، خواہ ان کی حفاظت میں خدا، رسول، قرآن، دین، علم، عقل سب کے سب سیلاب کی نذر ہو جائیں۔ اور ان معبودوں کی حفاظت بھی وہ ان کے لئے نہیں کرتا۔ بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ ان کی حفاظت میں خود اس کی حفاظت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مندر میں بت باقی نہ رہے تو برہمن کو کوئی نہ پوچھے گا۔

کس قدر تلخ ہیں یہ حقیقتیں۔ لیکن انہیں بالآخر کب تک چھپایا جا سکے گا؟

۱۳۔ قرآنی نصب العین

سوال:۔ آپ اپنے درس میں جس اسلام کا نقشہ پیش کرتے ہیں اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں۔ اس کے ساتھ قرآن شریف کی سند ہوتی ہے۔ لیکن اس اسلام کا معیار اتنا بلند ہے کہ کم از کم ہم موجودہ مسلمان اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ اس صورت میں اس صحیح اسلام کو عمل میں لانے کی شکل کیا ہوگی؟

جواب:۔

ایک چیز ہوتی ہے نصب العین اور دوسری چیز ہوتی ہے، اس نصب العین تک پہنچنے کا طریق۔ قرآن کریم جس اسلام کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں (بلکہ یوں کہئے کہ نوعِ انسان) کی اس دنیا میں منزلِ مقصود ہے۔ اسلام کے قرنِ اوّل میں ہوا یہ کہ جوں جوں قرآن نازل ہوتا گیا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ساتھ کے ساتھ اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت فرماتے گئے۔ حتیٰ کہ جب تکمیلِ دین کا اعلان ہوا تو یہ جماعت بھی اس کے

پیش کردہ نصب العین تک پہنچ گئی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ قرآن اپنی مکمل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی اس کے مطابق نہیں۔ اس لئے جب ہم قرآن میں پیش کردہ اسلام کو سامنے لاتے ہیں تو ہماری زندگی اُس میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اس لئے ہمیں یہ مقام اپنی حدِ وسعت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ معیار محض مثالی (IDEAL) ہے۔ ممکن العمل نہیں۔ یہ غلط ہے۔ قرآن کا پیش کردہ اسلام ممکن العمل ہے۔ اس تک پہنچنے کا طریق یہ ہے کہ ہم اس اسلام کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور پھر بتدریج، قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھتے جائیں۔ اس کے لئے لائحہ عمل بھی وہی ہے جسے خود قرآن نے تجویز کیا اور نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے (۱۲ اگست کے درس میں) سیرتِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر تقریر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت کی تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لئے (بلکہ پوری انسانیت کے لئے) اُسوۂ حسنہ (بہترین ماڈل) ہے۔ دنیا کی مختلف مملکتوں کو بالعموم اور اسلامی ممالک کی حکومتوں کو بالخصوص اس ماڈل کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس نصب العین کا سامنے رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ جب تک کسی نصب العین کو سامنے نہ رکھا جائے۔ یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں۔ "ترقی" کے معنی ہی، اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے جانا ہیں۔ اگر نصب العین سامنے نہ ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں یا تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔

کیا کرنا چاہیئے

جن حالات میں ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں ان سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم قرآنِ کریم سے اسلام کا صحیح، واضح اور متعین نقشہ مرتب کریں۔ اور اس نقشے کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور پھر اس کا جائزہ لیتے جائیں کہ ہمارا قدم اس نصب العین کی طرف اُٹھ رہا ہے یا نہیں۔ اس وقت ہماری بنیادی دشواری یہ ہے کہ قوم کے سامنے اسلام کا واضح اور متعین تصور ہی نہیں۔ اسلام کے متعلق ہر گروہ بلکہ ہر فرد کا تصوّر جداگانہ ہے، اس لئے ہر ایک کا قدم مختلف سمتوں کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس سے جو ملّی انتشار پیدا ہو سکتا ہے اس کی زندہ شہادت ہماری موجودہ حالت ہے۔ جب تک اسلام کا متعین تصوّر سامنے نہیں رکھا جاتا، نہ ہمارا انتشار ختم ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا قدم صحیح منزل کی طرف اٹھ سکتا

ہے۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق اسلام کے اس تصوّر کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، جسے قرآنِ کریم نے متعین کیا ہے۔ مجھے اس پر اصرار نہیں کہ میرے پیش کردہ تصور ہی کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ میری دعوت یہ ہے کہ قوم کے اربابِ فکر و نظر سر جوڑ کر بیٹھیں اور قرآنِ کریم سے اسلام کا واضح اور متعین تصور متشکل کر کے اسے قوم کے سامنے بطور نصب العین رکھیں۔ اور پھر اس نصب العین کی طرف بڑھنے کے لئے عملی ذرائع اختیار کریں۔ قوم اس پر آمادہ نہیں ہونا چاہتی۔ ماڈرن طبقہ اس لئے آمادہ نہیں ہونا چاہتا کہ اسلام کا متعین نصب العین سامنے آجانے سے انہیں اپنی غیر اسلامی زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنا پڑے گا اور قدامت (مذہب) پرست طبقہ اس لئے اس کی مخالفت کرتا ہے کہ اسلام کے ایک متعین تصور سے ہر فرقہ کا اپنا اپنا "اسلام" چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ ہے اس مخالفت کی وجہ ——— لیکن ظاہر ہے کہ اس مخالفت سے اس مسئلہ کا حل نہیں مل سکتا۔ اگر ہمارا دعویٰ یہ ہے ——— اور یہ دعویٰ دیانتداری پر مبنی ہے کہ ہم نے یہاں اسلامی معاشرہ متشکل کرنا ہے تو ہمیں اسلام کا ایک واضح اور متعین تصور مرتب کر کے اسے بطور نصب العین سامنے رکھنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو موجودہ انتشار دن بدن بڑھتا جائے گا اور ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

۱۹۶۲ء

۱۴۔ قرآنی اور اسلامی

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ اپنی تحریروں میں اکثر "قرآنی نظام"۔ "قرآنی دستور"۔ "قرآنی معاشرہ" وغیرہ لکھتے ہیں۔ "اسلامی" نہیں لکھتے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب

نزولِ قرآن کے زمانے میں تو قرآنی اور اسلامی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جو بات قرآنی

تھی وہی اسلامی تھی اور جو اسلامی تھی وہی قرآنی تھی اس لئے کہ اس زمانے میں اسلام نام ہی قرآن کے مطابق چلنے کا تھا۔ لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی گاڑی نے پٹڑی بدل لی، تو رفتہ رفتہ قرآن اور اسلام میں بُعد ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اسلام میں اکثر و بیشتر ایسے تصورات، عقائد اور مسالک شامل ہو گئے جو قرآن کی ضد تھے۔ یہی اسلام اب تک مروّج چلا آرہا ہے۔ لہٰذا جس چیز کو "اسلامی" کہا جائے ضروری نہیں کہ وہ قرآنی بھی ہو۔ ہماری دعوت ہے کہ ہم اپنے تمام تصورات، عقائد و مسالک کو غیر قرآنی عناصر سے پاک کر کے پھر سے اپنی زندگی قرآن کے مطابق بنالیں۔ جب ایسا ہو جائے گا تو پھر قرآنی اور اسلامی ایک ہی بات ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت ان دونوں میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ہم "اسلامی" اس لئے نہیں کہتے کہ اس سے ذہن مروّجہ اسلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو کلیتہً قرآنی نہیں ہے۔

آپ صبح سے شام تک سنتے رہتے ہیں کہ "اسلام میں یوں آیا ہے"، "اسلام کی رُو سے فلاں بات یوں ہے"۔ "اسلام یہ کہتا ہے"۔ لیکن جب آپ ایسا کہنے والے سے پوچھیں کہ صاحب! جو کچھ آپ نے کہا ہے اس کی سند کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے جواب میں کسی طبری۔ کسی ابن کثیر۔ کسی رازی۔ کسی غزالی کا نام لے دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات دارشکوہ شاہ اور شاہ ولی اللہ تک کے بھی حوالے پیش کر دیئے جائیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لئے کسی انسان کی سند کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہیئے۔ جس دن ہم نے یہ اصول اختیار کر لیا کہ کسی بات کے اسلامی ہونے کے لئے قرآن کی سند درکار ہے۔ اس دن اسلامی اور قرآنی ایک ہی ہو جائے گا۔ آپ کو غالباً یاد ہو گا کہ ۱۹۵۷-۵۸ء کے "اسلامک کلوکیم" میں (جو لاہور میں منعقد ہوا تھا) پرویز صاحب نے یہی سوال اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں سب سے پہلے یہ اصول مقرر کر لینا چاہیئے کہ ہم میں سے جو شخص بھی یہ کہے کہ "اسلام نے یوں کہا ہے" اسے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیت پیش کرنی ہو گی۔ اور اگر اس کے پاس قرآن کی تائید نہ ہو تو اسے یہ کہنا نہیں چاہیئے کہ "اسلام نے یوں کہا ہے"! اسے یہ کہنا چاہیئے کہ فلاں صاحب کا یہ قول ہے۔ فلاں بزرگ نے یہ فرمایا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ اس سے بات واضح ہو جائے گی اور اسلام کے سر خواہ مخواہ وہ کچھ نہیں تھوپا جائے گا، جس سے اسلام کو کچھ واسطہ نہیں۔

آج جو کچھ ہمارے ہاں "اسلامیات" کے نام سے مکتبوں۔ دارالعلوموں۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے (یا جس کی ریسرچ کے لئے کئی ادارے قائم ہیں) اس میں قرآن کا بہت کم حصّہ ہوتا ہے اور بیشتر وہی کچھ ہوتا ہے جسے "قرآنی اسلام" سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کیخلاف ہوتا ہے۔ ان حالات میں "قرآنی" اور مروّجہ "اسلامی" میں فرق کرنا ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ کہیں (ضرورۃً) اسلام کہتا بھی ہے تو اس سے اس کی مراد قرآنی اسلام ہوتی ہے۔

۱۹۶۰ء

۱۵۔ قرآنی قوانین سے کیا ہوگا؟

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں؟

آپ اکثر و بیشتر لکھتے رہتے ہیں کہ جب قرآنی قوانین کا نفاذ ہوگا تو ان کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر، ایک دنیا اسلامی نظام کی طرف لپک کر آئے گی۔ اسلامی قوانین کے متعلق ہمیں تو اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ زانی کی سزا سو دُرّے ہوگی اور چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ کیا اتنی سی تبدیلی کے نتائج ایسے ہوں گے کہ دنیا اس نظام کی طرف کھنچ کر آجائے گی، اگر یہ نہیں تو آپ ایک دو مثالیں دے کر سمجھائیں کہ وہ قوانین کس قسم کے ہوں گے۔ نیز ایک آدھ مثال سے یہ بھی بتائیے کہ قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصول کس قسم کے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر دَور کا اسلامی نظام کس قسم کے قوانین بنانے کا مجاز ہے۔

طلوعِ اسلام | آپ نے جو مثالیں دی ہیں۔ وہ تعزیرات (سزاؤں) کی ہیں۔ اگرچہ سزائیں بھی قوانین کا ایک حصّہ ہوتی ہیں، لیکن جن قوانین کے عالمگیر، پُرکشش انسانیت ساز خوش گوار..... نتائج کا ہم ذکر کرتے رہتے ہیں، ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ اسی سے یہ حقیقت بھی سامنے

آجائے گی کہ غیر متبدّل اصول کسے کہتے ہیں اور ان کی روشنی میں قوانین کیسے مرتب ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بچے) ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔ یہ قرآن کا غیر متبدل اصول یا مستقل قدر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسانی بچہ ہونے کی حیثیت سے، یکساں طور پر عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ دنیا میں اس وقت، عزت اور تکریم کے معیار اضافی ہیں۔ امیر آدمی کے گھر پیدا ہونے والا بچہ، پیدائش کے ساتھ ہی ہزار عزتوں کا مستحق قرار پا جاتا ہے۔ غریب کے بچے کو کوئی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا اونچے محل میں پیدا ہونے والے بچہ کو پہلے ہی دن سینکڑوں مراعات حاصل ہوتی ہیں، جن سے جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ، یکسر محروم ہوتا ہے۔ عزت اور مراعات کی یہ تفریق و تقسیم، ساری عمر ان دونوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عزت، نہ انسانی ہونے کی جہت سے ہوتی ہے۔ نہ جوہر ذاتی کی بنا پر۔ اسی قسم کی تفریق، سیّد یا پٹھان کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے، اور جولاہے اور موچی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے ساتھ چپکی رہتی ہے اونچے اور امیر گھرانے کے بچوں کے لئے ہر قسم کے مواقع (OPPORTUNITIES) کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ غریب گھروں میں پیدا ہونے والے بچے، ان دروازوں کے پاس تک نہیں پھٹک سکتے۔

قرآنی مملکت میں کوئی ایسا قانون یا ضابطہ نافذ نہیں ہو سکتا جس میں، ایک بچے اور دوسرے بچے میں، اس قسم کی اضافی نسبتوں کی بنا پر، کسی قسم کی بھی تفریق کی جائے۔ اس میں ایسے قوانین نافذ ہوں گے، جن کی رُو سے۔

۱۔ ہر انسان کی عزت کی جائے۔ کسی کو، کسی اضافی نسبت کی بنا پر، نہ ذلیل سمجھا جائے۔ نہ ذلیل کیا جائے۔ ہر ایک کی عزّتِ نفس کو برقرار رکھا جائے اور سوسائٹی میں مدارج کا تعین، ذاتی جوہروں اور اعمال کی بنا پر کیا جائے۔

۲۔ ہر انسانی بچے کو، زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہونے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع میسر ہوں، اور کوئی اضافی نسبت، نہ کسی کو کوئی رعایت دے سکے۔ نہ کسی کے راستے میں رُوک بن سکے۔

ظاہر ہے کہ ان قوانین کا دائرہ زندگی کے کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں ہوگا مختلف شعبوں

سے متعلق جس قدر قوانین مرتب ہوں گے، ان میں قرآن کے اس غیر متبدل اصول کو مدِّنظر رکھا جائے گا اور جو قانون، کسی نوعیت سے بھی، اس اصول کے خلاف جائے گا، وہ کالعدم قرار پا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے۔ یہی صورت قرآنِ کریم کی تمام مستقل اقدار و قوانین کے ضمن میں ہوگی۔ مثلاً اس کا پیش کردہ اصول یہ ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) انسان صرف اس کا مستحق ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ یہ ایک بڑا وسیع۔ جامع اور عالمگیر اصول ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ اس اصول کے ماتحت اسلامی مملکت میں کوئی فرد، محنت کئے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔ البتہ جو شخص محنت سے معذور ہو، وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا۔ یا جس شخص کی ضروریات اس کی محنت سے پوری نہ ہوتی ہوں، اس کی کمی پوری کر دی جائے گی (اسے احسان کہتے ہیں) لیکن یہ نہیں ہو سکے گا کہ محنت کوئی کرے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جائے۔ اسی طرح قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ اصول بھی بڑا جامع ہے۔ اس کی رُو سے، ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داری کو خود سنبھالے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ذمہ داری ایک کی ہو اور اسے لاد دیا جائے کسی دوسرے کے اوپر۔ یا، کرے کوئی بھرے کوئی۔ لہٰذا اس مملکت میں ایسا قانون نہیں بن سکے گا۔ جس کی رُو سے، کسی نہج سے بھی، اس قسم کی صورت پیدا ہو سکے۔

زمانے کی ضرورتوں کے مطابق، قوانین بدلتے رہیں گے۔ منسوخ ہوتے رہیں گے۔ ان میں اضافے بھی ہوتے رہیں گے۔ لیکن جو قوانین بھی نافذ العمل ہوں گے ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوگی، جو ان اصولوں کے خلاف جائے۔

مقصد پیشِ نظر کے ماتحت، ہم صرف انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ہوں گے وہ قوانین جو قرآنی مملکت میں نافذ ہوں گے اور ان کے نتائج ایسے خوشگوار اور انسانیت کے لئے موجب فلاح و بہبود ہوں گے کہ انہیں دیکھ کر دنیا اس نظام کی طرف لپک آئے گی۔

(۱۹۶۱ء)

(۱۰)

حدیث

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) تین جھوٹ

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ پاکستان ٹائمز میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اس کے جواب میں مفتی ..... صاحب نے لکھا کہ اس کا ثبوت خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ یہ پڑھ کر میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ آپ کچھ اس پر روشنی ڈالیں گے؟

طلوع اسلام ہم اس (اور اس قسم کی کئی اور احادیث) کے متعلق کئی بار لکھ چکے ہیں اس لیے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اسی قسم کی حدیثوں کے صحیح ہونے کا تو انکار ہے، جس کی وجہ سے ہمیں منکرِ حدیث اور منکر شانِ رسالت قرار دیا جاتا ہے!

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (۱۹/۴۱) یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا" لیکن اگر قرآن کریم میں ان کے یا کسی اور نبیؑ کے متعلق اس صراحت سے یہ کچھ نہ بھی لکھا ہو تو بھی ایک نبیؑ کی صداقت میں ذرا سا شبہ بھی ایمان کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ نبیؑ کی صداقت ہی تو ہے جس کی بنا پر اس کے دعویٰ نبوت کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر (معاذ اللہ) یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا کے ایک جلیل القدر نبیؑ (حضرت ابراہیمؑ)

نے جھوٹ بولا تھا، اور اس کا ایک برگزیدہ نبیؑ (رسولؐ اللہ) اس کی تصدیق کرتا ہے تو اس آسمان کے نیچے، ہم صداقت کہاں ڈھونڈنے جائیں گے؟

اس قسم کی روایات کی حقیقت کیا ہے، اس کے متعلق، ہم ایک نامور اہل حدیث عالم کی رائے پیش کرتے ہیں. مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم (صفحہ ۶۶۹ پر) اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> اگرچہ صحیحین کی اس روایت کی توجیہہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھولی ہیں مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازیؒ نے بھی دہرایا ہے. یعنی ہمارے لیے یہ تسلیم کر لینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہو گئی۔ بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کریں۔ اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے، تو بہرحال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہو گی لیکن اگر ایک معصوم پیغمبرؑ کو بھی غلط تسلیم کر لیا گیا تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہو گئی۔
>
> بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویان حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے کسی روایت کے متعلق بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے وہ اس کی "صحت" ہے "عصمت" نہیں ہے اور "صحت" سے مقصود صحت مصطلح فن ہے، نہ کہ صحت قطعی اور یقینی مثل صحت قرآن. اس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں. بہرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے. ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے مفید حجت ہو سکتا ہے. مگر یقینات و قطعیات کے خلاف نہیں ہو سکتا جب بھی ایسا ہو گا کہ کسی راوی کی شہادت یقینات قطعیہ سے معارض ہو جائے گی تو یقینات اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے، غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی نبیؐ کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتایا ہے وہ اس کی سچائی ہے اور اس کی احتیاج تفضیل نہیں، نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے..... اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے ایک

نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا مگر اس بات سے کہ سچ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے خواہ کسی شکل اور کسی درجہ میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی۔ اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں ہے، پس انبیاءؑ کرام کی سچائی اور عصمت، یقینیات دینیہ و نقلیہ سے ہے۔ روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لیے بھی یقینیاتِ دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ تعالےٰ کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا۔ نہ زمین شق ہو جائے گی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

(صحیحین کے متعلق) جو کچھ ہے ان کی صحت کا اعتقاد ہے۔ یعنی ایسی صحت کا جیسی اور جس درجہ کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے۔ عصمت کا اعتقاد نہیں ہے اور اس لیے اگر کوئی روایت شاذ، یقینیات قطعیہ قرآنیہ سے معارض ہو جائے گی، تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس تضعیف میں تامل نہیں کرینگے کیونکہ اصل ہر حال میں قرآن ہے جس کا تواتر یقینی اور جس کی قطعیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہر انسانی شہادت اس پر کسی جائے گی۔ وہ کسی غیر معصوم شہادت اور رائے پر کسا نہیں جا سکتا کہ

غرض اندر میاں سلامت اوست

طلوع اسلام اگر آپ اس اقتباس کو کسی مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیں، یہ بتائے بغیر کہ اس کا مصنف کون ہے تو وہ جھٹ کہہ دیں گے کہ یہ وہی منکر حدیث طلوع اسلام ہے!

بہر حال حدیث اور قرآن کے باہم گر معارض ہونے کے سلسلہ میں جو اصول مولانا آزاد (مرحوم) نے بیان کیا ہے۔ اگر ہمارے علمائے کرام اسے تسلیم کر لیں، تو امت کی کتنی مشکلات حل ہو جائیں

دین سے متعلق کتنے جھگڑے چک جائیں۔ اور غیر مسلم آئے دن جو ناموسِ رسالتؐ مآب پر (معاذ اللہ) طعن کرتے ہیں۔ اس کا دروازہ کس حسن و خوبی سے بند ہو جائے لیکن ضد تعصب اور گروہ بندی کا کیا علاج!

(۱۹۶۲ء)

۲۔ احادیث کی صحیح پوزیشن

'صدقِ جدید' کی دس اپریل ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ مصر میں بعض کاشتکاروں کو انجیل کا ایک نیا نسخہ ملا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کے ۱۱۴ مقولے درج ہیں جن میں سے اکثر بالکل نئے ہیں۔ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے جریدہ مذکور رقم طراز ہے

نئی نئی انجیلوں کی دریافت کا سلسلہ تقریباً دو ہزار سال گزر جانے پر اب تک قائم ہے اور مسیحیت کی ابتدائی صدیوں کی جتنی انجیلیں مل چکی ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں! چار مشہور و متعارف انجیلیں جو ہیں یہ تو اس سارے ذخیرے کو مسترد کر کے مستند قرار دی گئی ہیں۔ کیا کوئی نسبت بھی استناد و محفوظیت کے معیار سے انجیلوں کے ذخیرے کو قرآن سے ہے؟ کیا قرآن بھی سو پچاس نہیں دس بیس کی تعداد میں کوئی اور دریافت ہوئے ہیں۔ کوئی ایک بھی دوسرا قرآن کہیں مل سکا ہے؟ انجیلیں جتنی بھی ہیں سب حضرت مسیحؑ کے ملفوظات و سوانح ہی کے دعویدار ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ہمارے ہاں کی صرف کتب حدیث و سیر کی ہم سطح ہو سکتی ہیں۔ کتنا بڑا ظلم ہے ایسی کتابوں کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا۔

دریابادی صاحب نے فرمایا یہ ہے۔

۱۔ اناجیل کی حیثیت ہمارے یہاں کی کتب احادیث و سیر کی سی ہے۔

۲۔ اناجیل کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا بہت بڑا ظلم ہے تو کیا کتب احادیث کو، جو اناجیل کی سطح پر ہیں۔ قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا اور انہیں مثلہ، معہ، قرار دینا ظلم نہیں؟

۱۹۵۹ء

۳- تواتر

سوال۔ میں آپ کے درس میں اکثر شریک ہوتا ہوں۔ آپ جو باتیں بیان کرتے ہیں، ان کے ساتھ قرآن کریم کی سند ہوتی ہے۔ ویسے بھی وہ جی کو لگتی ہیں لیکن ان میں سے کئی باتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اسلاف سے متواتر چلا آ رہا ہے وہ اس کے خلاف ہیں۔ تواتر کے متعلق علمی بحث زیادہ تر ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ کسی مثال سے بات سمجھا دیں گے؟

جواب۔ سب سے پہلے اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آتا ہے، وہ سب کا سب غلط ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ ہمارے پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ اسے محض اس لیے صحیح تسلیم نہیں کر لینا چاہیئے کہ وہ پیچھے سے چلا آ رہا ہے اس میں سہو اور غلطی کا امکان ہو سکتا ہے اس لیے اسے پرکھ لینا چاہیئے۔ جو کچھ اس میں صحیح ہو اسے قبول کر لینا چاہیئے جو غلط ہو اسے چھوڑ دینا چاہیئے اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک دینی امور کا تعلق ہے ان کے پرکھنے کی کسوٹی، قرآن کریم سے زیادہ قابل اعتماد اور کونسی ہو سکتی ہے؟

اب اس کی مثال دیکھیے۔ ہمارے ہاں شروع سے یہ بات بطور مسلمہ چلی آ رہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال کی اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔ مجھے اس بات کے صحیح تسلیم کرنے میں ہمیشہ تردد رہا۔ کیونکہ قرآن کریم نے نکاح کے لیے بالغ ہونا ضروری قرار دیا ہے اور اس بات کا تصور تک بھی نہیں کیا جا سکتا کہ نبی اکرمؐ کا کوئی عمل (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف ہو سکتا ہے چنانچہ میں نے اس باب میں تحقیق کی اور خود ہماری کتب تاریخ و سیر سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس برس یا کم از کم سترہ برس کی تھی صاف ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر کا واقعہ، ایک محسوس اور بدیہی بات ہے جس کے شاہد سینکڑوں، ہزاروں لوگ ہوں گے لیکن اس کے باوجود ہماری کتب روایات و سیر میں ان کی عمر صحیح درج نہ ہو سکی اور اس کے بعد آج تک اسی غلط عمر کو صحیح تسلیم کیا جاتا رہا جب اس قسم کے محسوس اور بدیہی

ف۔ نوٹ صفحہ ۲۹۳ پر دیکھیں

واقعات میں ایسی غلطی ہو سکتی ہے تو غیر محسوس اور غیر مرئی امور میں ایسی غلطیوں کا امکان اور بھی زیادہ ہے۔ اگر یہ باتیں عام تاریخ سے متعلق ہوں تو ان میں سہو یا خطا، ہمارے ایمان یا اسلام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا لیکن جو امور دین سے متعلق ہوں، یا ان کا تعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ کبار کی زندگی سے ہو اس میں اس قسم کے سہو یا خطا کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں ان امور میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے سامنے یہ اصول رکھیں کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلاف سے چلا آ رہا ہے اسے پرکھا جائے اور اگر اس میں کوئی ایسی بات ہو جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے یا اس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ یا صحابہ کبارؓ کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچی۔ ایسا کہہ دینے سے اسلاف کے احترام میں کوئی فرق نہیں آتا اس لیے کہ وہ بھی بالآخر انسان تھے اور انسان سے سہو یا خطا کا امکان ہے انہوں نے دین کی جو خدمات سرانجام دیں، وہ ہمارے سر آنکھوں پر لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ انہیں معصوم اور منزہ عن الخطا مانا جائے۔ یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی جب اسے سمجھ لیا جائے کہ جو حضرات اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے وہی آنے والوں کیلئے "اسلاف" ہو جائیں گے۔ سو جب ہم اپنے سامنے کے حضرات کو ان کی زندگی میں سہو و خطا سے منزہ نہیں مانتے تو یہی حضرات اپنی وفات کے بعد منزہ عن الخطا کیسے ہو سکتے ہیں؟

۱۹۶۲ء

۴۔ احادیث صحیحہ کا مجموعہ

ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"جس طرح امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث میں سے تقریباً چھ ہزار احادیث کو صحیح مان

ص۱ میرا یہ مقالہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا اور اب "طاہرہ کے نام خطوط" (جلد دوم) میں شامل ہو چکا ہے۔ (سابقہ صفحہ کا نوٹ)

کر مجموعہ بخاری شریف مرتب کر ڈالا تھا اسی طرح آپ بھی قرآن پاک اور شان رسالت سے مطابقت رکھنے والی احادیث کا ایک گراں قدر مجموعہ مرتب فرما کر شائع کریں ایسے مجموعہ کی موجودگی میں آئندہ کسی مولوی یا کسی جماعت کو آپ کے بارے میں منکر حدیث منکر سنت اور منکر شانِ رسالت ثابت کرنے کا پراپیگنڈہ کرنے کی جرأت نہ رہے گی یہ الزام جس کا سہارا لے کر یہ لوگ طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھولے ہوئے ہیں خود بخود ختم ہو جائے گا آپ کا یہ کارنامہ عامۃ المسلمین کو قرآنی تعلیمات کے زیادہ نزدیک لانے کا باعث بننے کے علاوہ سیدھے سادھے مسلمانوں کے دلوں میں طلوع اسلام کے خلاف بھرے ہوئے زہر کے لیے بھی ایک تریاق ثابت ہو گا۔"

طلوع اسلام

سب سے پہلے اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ طلوع اسلام کے سامنے ایک مقصد اور ایک نصب العین ہے۔ یعنی دینِ خالص کی تشہیر و اشاعت اور اس معاشرہ کی تشکیل جسے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا تھا۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسی مقصد کے حصول کے لیے کرتے ہیں، نہ اس لیے کہ مخالفین کو ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ ہمارا مسلک موافقین اور مخالفین سب کے سامنے کھلا ہے۔ مخالفین ہمارے خلاف اس لیے پراپیگنڈہ نہیں کرتے کہ ہمارا مسلک غلط ہے وہ اس لیے پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ قرآنی معاشرہ کی تشکیل سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی ہے۔

جہاں تک ہمارے مکتوب نگار کی تجویز کا تعلق ہے اس کا بنیادی جواب وہی ہے جو تاریخ کی تدوین نو کے سلسلہ میں ہم طلوع اسلام میں پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کام ہم ملی حیثیت سے کرتے کا ہے نہ کہ انفرادی حیثیت سے۔

جہاں تک احادیث کا مجموعہ مرتب کرنے کا تعلق ہے، یہ معاملہ عام تاریخ کی ترتیب جدید سے بھی زیادہ نازک ہے۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ مروج احادیث میں سے، اپنی صوابدید کے مطابق ایک مجموعہ مرتب کیا لیکن بعد میں ہوا یہ کہ اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کا ایک ایک لفظ قول یا عملِ رسولؐ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات خود امام موصوف کے ذہن میں بھی نہیں ہو گی کہ ان کی اس انفرادی کوشش کو بعد میں یہ حیثیت دے دی جائے گی نتیجہ اس کا یہ کہ اگر آج کوئی شخص اس

مجموعہ کی کسی حدیث کے متعلق یہ کہہ دے کہ قرآن کے خلاف ہے لہٰذا غلط ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ خود قولِ رسولؐ کا منکر ہے۔ یعنی امام بخاریؒ کے انتخابی فیصلے پر تنقید (معاذ اللہ) خود ذاتِ رسالت مآبؐ پر تنقید قرار دے دی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ مجموعہ قرآن کی مثل اور اس کا ہم پایہ (مثلہ، معہ) تصور کر لیا گیا ہے۔ یہی وہ خدشہ تھا جس کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ رسولؐ اللہ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کیا جائے۔ مختصر جامع بیان العلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ سننِ رسولؐ اللہ کو لکھوایا جائے آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد آپ ایک ماہ تک اس معاملہ کو سوچتے رہے اور بالآخر فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ دلیل یہ تھی کہ۔

> پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور انہی پر جھک پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ہو سکتا ہے کہ ہم آج ایک جدید مجموعہ احادیث مرتب کریں جسے ہم اپنی صوابدید کے مطابق صحیح سمجھیں اور کل کے لوگ اس مجموعہ کو خود اقوال رسولؐ اللہ سمجھنے لگ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو کسی قسم کی "شرعی حیثیت" حاصل ہو جاتی ہو اسے انفرادی کوششوں پر چھوڑنا ہی نہیں چاہیئے۔ زید بکر یا عمر کو کیا حق حاصل ہے کہ اپنے کسی فیصلہ کو اُمت کے لیے شریعت بنا دے۔ یہ کام اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے کرنے کا ہے۔ اسی کا کام ہے کہ وہ

(۱) ایک مستند تاریخ مرتب کرے اور اسے اُمت کے لیے بطور نصاب مقرر کر دے اور باقی کتب تاریخ کے متعلق فیصلہ کر دے کہ وہ غیر مستند ہیں اور

(۲) فقہ اور روایات کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کرے۔ اُمت کے لیے یہ قوانین شرعی حیثیت رکھیں گے۔ خلافت علیٰ منہاج رسالت کے زمانے میں یہی ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے مجموعۂ احادیث مرتب کرنے کی مخالفت کی تھی تاکہ وہ مجموعہ کہیں دین کی حیثیت اختیار نہ کر جائے اور اس طرح۔

اُمت اسی پر جھک پڑے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دے۔

۱۹۵۹ء

۵۔ حق و باطل کا معیار

جماعت اہل حدیث کے ترجمان، معاصر منہاج کی ۹/۱۱ نومبر کی اشاعت میں "یہ کیوں" کے عنوان سے، حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

اکتوبر کے "طلوع اسلام" کے صفحہ اوّل پر چوکھٹا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث نقل کی گئی ہے کہ،

حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ، کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے، جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے۔ اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا۔ ہلاک کرے گا، اس کو اللہ۔ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی، گمراہ کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

معلوم ہے آپ کو یہ حدیث کیوں نقل کی گئی ہے؟ یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے کہ اصل چیز کتاب اللہ (قرآن مجید) ہے۔ حدیث اور سنت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔!

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ "ادارہ طلوع اسلام" کے نزدیک جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث غیر معتمد علیہ، غیر مستند ناقابلِ استناد و حجت اور عجمی سازش کا فسانہ ہیں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان کیونکر لائق استناد اور قابلِ حجت و استدلال ہو سکتا ہے؟ ادارہ طلوع اسلام کے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ فرمان فی الواقع رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اس میں عجمی سازش کارفرما نہیں ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اصل چیز کتاب اللہ ہے اور باقی سب چیزیں ناقابل اعتماد اور غیر معتبر ہیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو نقل کرنے کا کیا مطلب؟ آپ کو چاہیے کہ ہر چیز میں کتاب اللہ ہی کو مقدم رکھیں اور اسی سے اپنے مسلک کی حقانیت اور صحت و استواری ثابت کریں۔

جب کتاب اللہ کے سوا باقی سب چیزیں غلط اور ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ تو کیا یہ حدیث اس میں نہیں آتی؟ یہ آخر کیوں مستثنیٰ ٹھہری؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو چیز اپنے مطلب کے مطابق سمجھی اس کو لے لیا اور جو اپنے ذہن کے قالب میں موزوں نہ ہوئی اس کو غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا؟

مشکل یہ ہے کہ تعصب کی وجہ سے انسان کے ماتھے کی آنکھیں تو ٹھیک رہتی ہیں۔ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲/۴۶)

طلوع اسلام

سر کے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اگر ہمارے معاصر کی دل کی آنکھیں روشن ہوتیں تو اسے اپنے سوالات کا جواب خود طلوع اسلام کے صفحات میں مل جاتا۔ طلوع اسلام پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ اس کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار (خواہ وہ احادیث ہوں یا کسی اور کے اقوال و اعمال و آراء و خیالات) قرآن کریم ہے۔ جو بات قرآن کے مطابق ہو اسے ہم صحیح مانتے ہیں، جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھتے ہیں اور اگر وہ حدیث ہے تو اس کی بابت کہہ دیتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ ہمارے نزدیک وہ احادیث "غیر معتمد علیہ۔ غیر مستند۔ ناقابل استناد و حجت اور عجمی سازش کا فسانہ" ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں اور اس لیے رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں۔ ہمارا مسلک یہ نہیں کہ

"جو چیز اپنے مطلب کے مطابق سمجھی اسے لے لیا اور جو اپنے ذہن کے قالب میں موزوں نہ ہوئی اس کو غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا"

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

رد و قبول کا معیار قرآن ہے جو اس کے مطابق ہے اسے ہم لیتے ہیں، جو اس کے خلاف

ہوا سے مسترد کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ہم اپنے اس مسلک کا اعلان پہلے دن سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ طلوع اسلام کے ٹائیٹل پر اور ادارہ کی طرف سے شائع کردہ اکثر تصانیف پر ایک بلاک شائع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "طلوع اسلام کا مقصد اور مسلک"

اس میں شق نمبر ۳ میں لکھا ہے۔

حق اور باطل کا معیار قرآن ہے ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اور اس سے اگلی شق میں لکھا ہے۔

حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآنِ کریم ہے۔

اسے بھی چھوڑیئے۔ اگر معاصرِ موصوف طلوع اسلام کی آخری اشاعت (یعنی نومبر ۱۹۵۸ء کا پرچہ) ہی ملاحظہ کر لیتا تو اس کے صفحہ ۳۹ پر اسے یہ عبارت نظر آجاتی۔

مختصر الفاظ میں۔ جو فیصلہ، جو عقیدہ، جو نظریہ یا سیرت طیبہ کے متعلق جو روایات قرآن کے خلاف ہو یا حضورؐ کی شان کے خلاف ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ نہ حضورؐ کا کوئی حکم قرآن کے خلاف ہو سکتا تھا نہ کوئی قول یا فعل اس کے خلاف

بالفاظ دیگر دینی امور اور کوائفِ سیرتِ مقدسہ میں غلط اور صحیح کا معیار قرآن ہے۔

کیا معاصر موصوف اتنی جرأت سے کام لے گا کہ ہمارے اس مسلک کو اپنے ہاں شائع کر دے۔

صرف ایک کلمہ آیئے! لگے ہاتھوں ہم معاصر موصوف کے سامنے اس کی ایک مثال بھی پیش کر دیں۔ منہاج کی ۲۵/۲۸ اکتوبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل روایت شائع ہوئی ہے۔

طلحہ بن عبید اللہؓ کے انتقال کے وقت حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے۔ دیکھا کہ چہرہ کا رنگ فق ہے اور بہت لاغر ہو گئے ہیں۔ فرمایا۔ آپ کا رنگ کیوں بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ کہنے لگے۔ ایک بات تھی جو میں نے سرکارِ مدینہ سے سنی تھی لیکن افسوس اس کی پوری تفصیل دریافت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ سب پریشانی اور رنج اسی وجہ سے ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ وہ کیا بات تھی۔ کہا میں نے حضور

صلے اللہ علیہ وسلم کو فرمانے سنا کہ مجھ کو ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر اس کو موت کے وقت پڑھا جائے تو تمام گناہ اور معاصی معاف ہو جاتے ہیں۔ خواہ مقدار و شمار میں وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ افسوس پھر یہ پوچھنا یاد نہ رہا کہ وہ کونسا کلمہ ہے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ وہ کلمہ میں بتائے دیتا ہوں وہ ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ہمارے نزدیک یہ روایت اس لیے صحیح نہیں کہ یہ قرآن کے بنیادی اصول (قانون مکافاتِ عمل) کے خلاف جاتی جس کا اعلان ہے کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۷-۸) جس نے ایک ذرہ برابر اچھا کام کیا، وہ اس (کا نتیجہ) اپنے سامنے دیکھے گا اور جس نے ایک ذرہ برابر کام کیا اس کا نتیجہ بھی"۔ اور ہم نے اسے "عجمی سازش" (یعنی ان لوگوں کی سازش جو مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ بنانے کے درپے تھے) اس لیے کہتے ہیں کہ ان مخالفینِ اسلام کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمانوں جیسی یکسر عملی قوم کو، حصول جنت کے ایسے آسان طریقے بتا دیئے جائیں جن سے یہ عمل سے یکسر بے گانہ ہو جائے۔

اب آپ نے اندازہ فرمایا کہ ہمارے نزدیک حق و باطل کا معیار کیا ہے؟

(۱۹۵۸ء)

نیز یہ روایت (۱۰/۹۰-۹۱ ، ۴/۱۷-۱۸ ، ۲۹/۲ ، ۳/۱۴۲ ، ۹/۱۶ وغیرہ) کے بھی خلاف ہے

(۱۹۸۶ء)

(۱۱)

تاریخ اور اسلام

۱۔ تاریخ کی اہمیت

کراچی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ۔

(۱) کسی قوم کی زندگی میں تاریخ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

(۲) مسلمانوں کی تاریخ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؟ اور

(۳) ہمارے ہاں تاریخ کی کونسی کتاب ایسی ہے جس کے مطالعہ کی ہم سفارش کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام

قرآن کریم تاریخ اقوام کے مطالعہ پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اس کے دور تک کا پورا علم اور اقوام سابقہ کے احوال و کوائف ہوں۔ ان اقوام کی تاریخ سے اس کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ اگر کوئی قوم فلاں قسم کی روش زندگی اختیار کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور فلاں انداز کے مطابق چلے تو اس کا حاصل یہ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے اس نے خود اقوام گذشتہ کی تاریخی سرگزشتوں کو بار بار دہرایا ہے۔

یہ تو رہا دوسری قوموں کی تاریخ کے متعلق، جہاں تک کسی قوم کی اپنی تاریخ کا تعلق ہے اقبال نے کہا ہے کہ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے، جیسی ایک فرد کے لیے حافظہ کی حیثیت ہوتی ہے اگر کسی شخص کا حافظہ جاتا رہے تو اس کی سابقہ شخصیت پوری کی پوری محو ہو جاتی ہے اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہو جائے تو اس کا قومی تشخص بھی ختم ہو جاتا ہے اور باقی صرف افسانے رہ جاتے ہیں۔ تاریخ ہی وہ رشتہ ہوتا ہے جس سے ایک دور کا انسان اپنے ماضی کے ساتھ وابستہ رہ سکتا ہے اگر یہ رشتہ منقطع ہو جائے تو ماضی کے ساتھ اس کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے

ایک قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ اہمیت تاریخ کو حاصل ہوتی ہے افسانوں کو نہیں۔ اگر کسی قوم کی تاریخ باقی نہ رہے صرف افسانے رہ جائیں یا اس کی تاریخ میں افسانوں کی آمیزش ہو جائے تو یہ چیز اس قوم کے حق میں نفع بخش ہونے کے بجائے ہلاکت آفریں بن جاتی ہے اس قسم کی افسانوی تاریخ کا وجود اس کے عدم سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے

مسلمانوں کی تاریخ بہ ہیئتِ مجموعی چار ادوار پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا دور محمد رسول اللہ والذین معہٗ کا دور ہے جس میں انہیں حکومت و مملکت ہی حاصل نہ تھی بلکہ نوعِ انسانی کے کاروانِ رشد و ہدایت کی قیادت بھی انہی کے حصے میں تھی اس سے انہیں دنیا کی سرفرازیاں بھی حاصل تھی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی، پھر دوسرا دور وہ آیا جس میں ان کا قرآنی نظام زندگی ملوکیت میں بدل گیا۔ اب ان کے پاس دولت و قوت، حشمت و ثروت، حکومت و مملکت تو پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن یہ قوم انسانیت کی امامتِ کبریٰ کی وارث نہیں رہی تھی۔ اس سے اگلا دور وہ ہے جس میں ان کی قوت و دولت اور حکومت و مملکت پر بھی زوال آگیا اور رفتہ رفتہ یہ قوم پستی کی انتہا تک پہنچ گئی اس کے بعد ان کی تاریخ کا چوتھا دور عصرِ حاضر کا دور ہے جس میں ان کے عروق مردہ میں پھر سے زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔ اس دور کے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلوم کرے کہ قوم ان مراحل سے کس طرح گذری ہے اور ان تغیرات کے اسباب و علل کیا تھے اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے اپنی قوم کی صحیح اور قابلِ اعتماد تاریخ ہو۔

یوں تو ہر قوم کی تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے، لیکن مسلمانوں کی تاریخ کی صورت میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ تاریخ میں شخصیتیں بہرحال سامنے آئیں گی اور تاریخی شخصیتوں کے متعلق حالت یہ ہے کہ ہماری بعض کے ساتھ عقیدت وابستہ ہے اور بعض کے خلاف جذبۂ عناد ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابیں جنبہ داری یا تعصب سے بمشکل محفوظ ہونگی اس کے علاوہ ان عناصر کو بھی سامنے رکھئے جو اسلام میں تخریب پیدا کرنے کے لیے مصروفِ عمل رہے ہیں۔

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ ہم تاریخ کی کتابوں میں سے کونسی کتاب کی سفارش کرتے ہیں

سو اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ہم تاریخ کی کوئی ایسی کتاب بتائیں جس پر بالکلیہ اعتماد کیا جا سکے تو معاف رکھئے ہم اس سے قاصر ہیں۔

جہاں تک دور رسالتؐ اور عہد صحابہؓ کا تعلق ہے، محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی تاریخ کا قرآن کریم کی روشنی میں مطالعہ کریں، اور جو بات قرآن کے خلاف نظر آئے اسے صحیح نہ سمجھیں اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے صحابہؓ قرآن پر عمل کرتے تھے اس لیے ان کی سیرت کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۱۹۵۵ء)

۲۔ اسلامی تاریخ

ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

آپ کہتے ہیں کہ تاریخ ظنی چیز ہے اس لیے وہ یقینی طور پر قابل اعتماد نہیں ہو سکتی لیکن اسلامی تاریخ تو بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے اس کے ذریعہ ہم دنیا کے سامنے اپنے ماضی کو پیش کر سکتے ہیں ہمارے مورخین عام ہسٹورینز HISTORIANS کی طرح نہیں تھے وہ تو بڑے بڑے ائمہ تھے وہ رسول اللہ کے زمانے سے قریب تر تھے اس لیئے اس تاریخ کو دوسری تاریخ کے برابر نہیں سمجھنا چاہیئے اگر یہ تاریخ نہ ہو تو ہم صحابہ کرامؓ کی سیرت اور کردار کا مطالعہ کہاں سے کریں؟

جواب

تاریخ، تاریخ ہی ہے خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی تاریخ کے ساتھ آپ کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے، اور دوسروں کی تاریخ کو آپ صرف تاریخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ورنہ یقینیات کا رتبہ نہ اسے حاصل ہو سکتا ہے نہ اسے۔ ہمارے مؤرخین بھی مورخین ہی تھے۔ امام کا لفظ ہمارے ہاں کی ایک عام اصطلاح تھی۔ اس سے معصومیت اور تقدس مستلزم نہیں آتی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تاریخ کا مطالعہ خود نہیں کیا ورنہ آپ تفصیلات دریافت کئے بغیر ہم سے متفق ہوتے۔ آپ نے چونکہ سیرت صحابہؓ کا ذکر کیا ہے اس لیے ہم تاریخ سے صحابہؓ کبار ہی کے متعلق ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے دیکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرمالیجئے کہ تاریخ ظنی شے ہے یا یقینی۔

امام محمد بن جریر الطبری ہمارے ہاں تفسیر اور تاریخ دونوں کے امام کہلاتے ہیں ان کی تفسیر ام التفاسیر ہے اسی طرح ان کی تاریخ بھی ام التواریخ ہے یعنی تفاسیر میں ان کی تفسیر سب سے پہلی اور اسلامی تاریخ میں ان کی تاریخ اولیت کا سہرا لیئے ہوئے ہے[1] یوں کہیئے کہ ہمارے ہاں صحابہؓ سے قریب ترین زمانہ کی مفصل تاریخ یہی ہے اس کے بعد کی تاریخیں بیشتر اسی تاریخ پر مبنی ہیں جیسے بعد کی تفسیریں بالعموم تفسیر طبری ہی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ یہ ہے تاریخ طبری کی حیثیت۔ اس میں سے بھی صرف وہ واقعہ لیجئے جو رسول اللہ

خلیفۂ اوّل کا انتخاب

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۳۰۴ پر دیکھیں۔

صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے پیش آیا یعنی حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب خلافت کا واقعہ۔ مختصراً بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور اپنے میں سے حضرت سعدؓ کو خلیفہ منتخب کرنا چاہا اس کے بعد وہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تشریف لے گئے۔ مسئلہ پیش نظر کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں ہوئیں اور بالآخر حضرت ابوبکرؓ متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہو گئے۔ بات اتنی جلدی ختم ہو جانے کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ کسی طرف سے یہ تجویز بھی آئی کہ ایک خلیفہ انصار میں سے ہو جائے اور ایک مہاجرین میں سے۔ چونکہ یہ چیز اتحاد ملت اور وحدت مرکز کے اصول کے خلاف تھی۔ جو درحقیقت اسلام کا بنیادی نقطہ تھا اس لیے اس امر کا احساس پیدا ہو گیا کہ مبادا مسئلہ انتخاب ہی ملت میں تفرقے کا موجب نہ بن جائے اس پر سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اب اس "معرکۂ انتخاب" کی تفصیل امام طبری کے الفاظ میں سنیئے۔ ان کی تاریخ کی جلد اول کے حصہ چہارم کا آغاز اسی واقعہ سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں۔

طبری کا بیان اب ہر طرف سے آ آ کر لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ سعدؓ کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا۔ اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو۔ اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا۔ چھوڑو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہیں رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا۔ عمرؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کے گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہ مانتے بلکہ میں ان کا

صلے تفسیر اور تاریخ میں طبری سے پہلے بھی کچھ متفرق چیزیں ملتی ہیں لیکن قرآن کی مکمل تفسیر اور مفصل تاریخ سب سے پہلی طبری ہی کی ہے۔ (سابقہ صفحہ کا نوٹ)

اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھالے چلو۔ . . . . . چند روز ان سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا گیا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آکر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش نہ خالی کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے نہ رنگ لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں۔ ہرگز بیعت نہ کروں گا اس کے بعد سے سعدؓ، ابوبکرؓ کی امامت میں نماز نہ پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک کو ان کے ساتھ ادا نہ کرتے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

یہ ہے تصویر امام طبری کے الفاظ میں ان صحابہؓ کبار کی جن کے متعلق قرآن کی شہادت ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم[۱] یعنی کفار کے مقابلہ میں نہایت سخت، لیکن آپس میں محبت اور ہمدردی کے پیکر۔ یہ ہیں وہ صحابہؓ جن کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ایک کی داڑھی دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے دانت توڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ایک امیدوار خلیفہ بن گئے ہیں اور دوسرے امیدوار کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر چلانے کی فکر میں اور اپنی تلوار کو ان کے خون سے رنگین کرنے کی سوچ میں ہیں۔

فرمائیے کہ اس تاریخ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اسے اس لیے صحیح مان لیا جائے کہ اس کے لکھنے والے امام الجریر طبری ہیں اور وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین زمانے میں ہوئے ہیں[۱]؟ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو پھر جو کچھ ان بزرگان کرام کے خلاف یورپ کے پادری اور ہندوؤں کے مہاشے لکھتے چلے آرہے ہیں، آپ اس پر چیں بجبیں اور خنجر بدست کیوں ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عہد محمد رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بھی قرآن کریم ہی ہے۔ اس لیے کہ اس عہد سعادت آگیں کے جو واقعات عبرت و بصیرت کا سامان اپنے اندر رکھتے تھے۔ قرآن نے انہیں اپنے دامن حفاظت میں لے لیا ہے یہی اس دور کی سچی تاریخ ہے۔ یا باقی تاریخ کا وہ حصہ جو اس

---

[۱] حالانکہ یہ بھی رسول اللہؐ سے قریب زمانہ کے نہیں ہیں۔ ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی تھی۔

(قرآنی) تاریخ سے مطابقت رکھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم تاریخ کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ اور صرف قرآن کو یقینی۔ اس نہج سے کتب روایات بھی درحقیقت کتب تاریخ ہی ہیں اور ان کا بیشتر حصہ اس سازش کا پیدا کردہ یا اس سے متاثر ہے، جو مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے یا ان کے رسولؐ اور دست پروردگان حضورؐ رسالت مآب کو ان کے مقام سے گرانے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ مثال کے طور پر اسی واقعہ کے ضمن میں دیکھیے کہ تاریخ کے ساتھ روایات میں کیا ہو رہا تھا طبری کی تاریخ میں صحابہ کبارؓ کی سیرت کا وہ نقشہ ہے جسے آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ انہی صحابہؓ کے متعلق امام بخاریؒ کے مجموعہ روایات میں حسب ذیل "سرٹیفکیٹ" موجود ہے۔

بخاری کتاب انبیاء میں ہے کہ:۔

صحابہؓ کے متعلق بخاری کی روایت

رسول اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہؓ میں سے کچھ لوگوں کو بائیں جانب (جہنم کی طرف) لے جانے کا حکم ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب دیا جائے گا کہ جب آپ ان سے رخصت ہوئے ہیں تو یہ لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے تو میں وہی کہوں گا جو ایک نیک بندے عیسیٰؑ نے کہا تھا" میں ان پر اس وقت تک نگراں تھا۔ جب تک میں ان میں موجود تھا..... الخ

یہ ہے صحابہ رسولؐ اللہ کے متعلق بخاری شریف کی شہادت..... اب فرمائیے کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی تاریخ اور (قرآن کے بعد) سب سے صحیح کتاب کی ان شہادات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر آپ انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں تو آپ جانیں اور آپ کا دل! لیکن ہم سے اس کی توقع نہ رکھیے کہ ہم صحابہ کبارؓ کے متعلق اس قسم کا خیال بھی دل میں لا سکیں۔ خواہ طبرستان اور بخارے کے ہزار امام، اس کی شہادت کیوں نہ دیں۔

۱۹۵۳ء

۳۔ قرآن اور تاریخ کی حیثیت

پوچھا گیا ہے کہ قرآنی احکام اور تاریخ کی باہمی حیثیت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان

جس پریشانی فکر و نظر سے گزر رہا ہے (اور اس کی یہ کیفیت آج سے نہیں صدیوں ہی سے ایسی چلی آ رہی ہے) اس کی بنیادی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح مؤقف (پوزیشن) کا عدم تعین ہے یعنی اس نے دین اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعین نہیں کیا، جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح نظام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ جس معاملہ میں دیکھو اختلاف، جس مسئلہ میں غور کرو، تشتت و افتراق۔ اگر ہم قرآن کو اس کے صحیح مقام پر رکھیں، اور تاریخ کو اسکی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل آج ہی ہو جائے۔

قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔ ایک یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک لفظ بعینہٖ وہی ہے جو نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حسن وساطت سے نوع انسانی کو ملا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، کسی رد و بدل کا امکان نہیں۔ لہذا جو چیز قرآن میں ہے اسے بلا توقف و تامل حتمی اور یقینی تصور کرنا ہوگا یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

قرآن کے بعد تاریخ دین ہمارے سامنے آتی ہے۔ تاریخ دین سے مراد یہ ہے کہ عہد رسول اللہ والذین معہٗ میں قرآنی نظام کس طرح متشکل ہوا۔ تاریخ دین کی کتابوں میں کتب احادیث کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ ان کی صحت کو عقیدہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (قرآن کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ صحیح کتاب) مانا اور منوایا جاتا ہے۔ لیکن کتب احادیث (یعنی دیگر کتب و تاریخ تو ایک طرف۔ خود کتب احادیث بھی) جس زمانہ میں اور جس انداز سے مرتب ہوئی ہیں وہ اس پر شاہد ہے کہ انہیں کس حد تک حتمی اور یقینی کہا جا سکتا ہے بخاری شریف عہد رسالت مآب سے قریب سوا دو سو سال بعد مرتب ہوئی ہے اور اس کا مدار تمام تر ان روایات پر مشتمل ہے جنہیں امام بخاریؒ نے لوگوں کی زبانی سنا۔ انہوں نے قریب چھ لاکھ روایات جمع کیں اور انہیں اپنے قیاس سے چھانٹا اور قریب چھ ہزار اپنے مجموعہ میں داخل کیں اب اس سے خود اندازہ فرما لیجئے کہ جہاں تک حتم و یقین کا تعلق ہے قرآن کے مقابلہ میں تاریخ کی ان "صحیح ترین" کتابوں کی حیثیت بھی کیا رہ جاتی ہے۔

اب اس سے آگے بڑھیے نبیٔ اکرم کی پوری حیات طیبہ، قرآن کے مطابق تھی۔ خود قرآن میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ آپؐ وحی کا اتباع کریں (قُلْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ) حضورؐ کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں قرآن کا اتباع کرتا ہوں (قُلْ) اگر قرآن میں یہ کچھ بہ صراحت مذکور نہ بھی ہوتا تو بھی اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرت طیبہ قرآن کا اتباع تھی اس لئے کہ

اگر رسولؐ بھی اپنی وحی کا اتباع نہیں کرے گا، تو اور کون اس کا اتباع کرے گا۔ رسولؐ کے ساتھ وہ جماعت سامنے آتی ہے جو رسولؐ کی تربیت یافتہ اور قرآنی نظام کے قیام کی اولین ذمہ دار تھی، ظاہر ہے کہ قدوسیوںؓ کی اس جماعت کی زندگی بھی قرآن ہی کا اتباع تھی۔

تاریخ ظنی ہے اب اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور تاریخ (کتب روایات و سیر) میں نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کا کوئی عمل یا قول اس کے خلاف مذکور ہے تو ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ تاریخ نے اس اہم واقعہ کو ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچایا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ عمل یا قول۔ قرآنی حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ ہے ہی نہیں جو قرآن کے ماننے والوں کے نزدیک قابل قبول ہو، اس لیے کہ قرآن حتمی ہے، اور تاریخ ظنی۔ اور جب بھی ظن اور یقین میں تصادم و تنازع ہوگا تو یقین کو بہر حال و بہر نوع صحیح تسلیم کیا جائے ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (۵۳/۲۸)

لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے ظن کو یقین پر غالب قرار دے رکھا ہے چنانچہ یہ چیزیں ہمارے عقیدہ میں داخل ہیں کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی ناسخ بھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دین یکسر ظنیات کا مجموعہ بن چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس ذات اقدس و اعظم کی حیاتِ طیبہ بھی جو اپنی سیرت کی رفعت اور کردار کی پاکیزگی میں انسانی کمال کے افق اعلیٰ پر فائز المرام ہے۔ ایسے واقعات سے ملوث کر دی ہے جنہیں دیکھ کر نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اس کے لیے آپ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" یعنی بخاری شریف کو ہی اٹھا کر دیکھیے۔ حقیقت سامنے آجائے گی، احکام و مسائل کو چھوڑیے صرف تاریخی واقعات کو لیجیے، اور سوچیے کہ کیا یہ تاریخ کسی صورت میں بھی قابل اعتماد قرار پا سکتی ہے مثلاً بخاری شریف (کتاب الوضوء) میں ہے۔

> حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ عکل یا عرینہ کے چند آدمی آئے اور مدینہ میں انہیں پیٹ کی بیماری ہوگئی۔ رسول اللہ نے انہیں اونٹنیوں میں جانے اور ان کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا چنانچہ وہ گئے، جب تندرست ہو گئے تو حضورؐ کے چرواہے کو قتل کر کے اونٹنیوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب صبح کو آپ کو خبر ہوئی، تو آپ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے۔ سورج چڑھتے ہی وہ لوگ (گرفتار کر کے) لائے گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ

دیئے جائیں، سیسہ پگھلا کر ان کی آنکھوں میں ڈالا جائے اور مقام حرہ میں پھینک دیا جائے۔ وہ لوگ شدت پیاس سے پانی مانگتے تھے لیکن انہیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔[۱]

کیا آپ کا خیال ہے کہ حضورؐ نے انہیں اونٹنیوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا ہوگا اور اس ذات رحمۃ اللعالمین نے ان مجرمین کو اسی طرح قتل کروایا ہوگا۔ جس طرح اس حدیث میں مذکور ہے؟ یا مثلاً کعب بن اشرف کے واقعہ قتل کو لیجئے، جو بخاری کی ایک حدیث میں شرح و بسط سے مذکور ہے۔ مختصراً یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "کعب بن اشرف نے خدا اور اس کے رسولؐ کو تکلیف دی ہے۔ لہٰذا اس کو کون قتل کرے گا۔ محمد ابن مسلمہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا۔ ہاں! ابن مسلمہ نے عرض کیا کہ پہلے مجھے اس سے بات بنانے کی اجازت دیجئے۔ فرمایا۔ جو تدبیر چاہو کرو۔" چنانچہ اس کے بعد اس بات بنانے اور تدبیر کرنے" کی پوری تفصیل موجود ہے کہ حضرت مسلمہؓ نے کس طرح کعب بن اشرف کو بہانہ سازی اور فریب دہی سے بلایا اور اس کے سر کی خوشبو سونگھنے کے بہانے سے اسے قتل کر دیا۔

ظاہر ہے کہ حضور سرور کائناتؐ یا صحابہ کبارؓ تو ایک طرف، دشمن کو اس طرح بہانہ سازی سے قتل کرنا عام عربوں کی قومی خصوصیات کے بھی منافی تھا۔ اسلام نے آکر انہیں مکارم اخلاق کی جن بلندیوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اسے سورج کی آنکھ نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ لیکن ان کا تو زمانہ جاہلیت میں بھی یہ عالم تھا کہ ان کی دوستی اور دشمنی بالکل للکار کر ہوتی تھی۔ خدع و دنائت ان کے قومی خصائص کے منافی تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے تاریخ کا یہ واقعہ قطعاً قابل اعتماد نہیں۔

یا مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ:۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور اب ان پر کتاب نازل کی۔ اس میں سنگساری (زنا کی سزا میں رجم) کی آیت موجود ہے۔

قرآن ہمارے پاس موجود ہے، اس میں سنگساری کی آیت کہیں نہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس روایت سے یہ دلیل لے آئے کہ جو قرآن اس وقت ہمارے پاس موجود ہے یہ وہ قرآن نہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھا۔ اس قرآن میں اس سے کچھ زیادہ بھی تھا، تو یہ دلیل اس لیے غلط ہوگی کہ قرآن اپنی حفاظت کے لیے

---

[۱] ہم نے احتیاطاً ترجمہ بھی خود نہیں کیا" مولانا مولوی حکیم دائم صاحب جلالی" کے مطبوعہ ترجمہ کو نقل کر دیا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار بتاتا ہے اور یہ روایت اس حفاظت کی تکذیب کرتی ہے یا مثلاً ازواج نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں بخاری میں یہ روایت ہے کہ فتح خیبر کے بعد (حضرت صفیہؓ) کے حسن وجمال کا چرچا حضورؐ تک پہنچا تو حضورؐ نے (قیدیوں میں سے) انہیں اپنے لیے انتخاب فرمایا۔ فرمائیے اگر ہم اس تاریخی بیان کو صحیح مان لیں تو بات کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ یا بخاری کی یہ روایت کہ حضورؐ اپنی گیارہ (یا نو) ازدواج مطہرات کا دورہ ایک شب میں فرمالیا کرتے تھے، چنانچہ جب لوگوں کو اس روایت پر تعجب ہوا تو اس کے راوی (حضرت انسؓ) نے ان سے کہا کہ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ نبی اکرمؐ میں تیس آدمیوں کی قوت رجولیت تھی۔

اس بیان سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ تاریخ کے واقعات ظنی ہوتے ہیں اس لیے انہیں کسی حتمی نتیجہ کا مدار نہیں قرار دینا چاہیئے اور جب صورت یہ ہے تو قرآن کی تفسیر تاریخی واقعات کے تحت بھی نہیں کرنی چاہیئے تاریخی واقعات کو ہمیشہ قرآن کے تابع رکھنا چاہیئے[1]

ممکن ہے یہاں کہہ دیا جائے کہ اس صورت میں تاریخ کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی یہ درست ہے۔ ظنی علم کی حیثیت دوسرے ظنی علم کے مقابلہ میں باقی رہ سکتی ہے۔ یقینی علم کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت رہ سکتی ہے؟ باقی دنیا کو اس لیے تاریخ پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کہ ان کے پاس یقینی علم کہیں بھی نہیں ہوتا اقوام عالم میں یہ خصوصیت کبریٰ صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس چودہ سو سال سے ایک ایسا یقینی صحیفہ موجود ہے جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ سے بھی زیادہ پائیدار اور محکم ہے۔ لہٰذا ہمیں اس یقینی ذریعہ علم کو چھوڑ کر ظنی ذریعہ علم کو دلیل وحجت بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس دن مسلمانوں نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اسی دن ان کی قسمت بدل جائے گی۔ اس لیئے کہ اس کے بعد ان کا دین پھر اپنے اصلی اور یقینی خطوط پر متشکل ہو جائے گا اور اپنے فطری نتائج سے انہیں اقوام عالم کی امامت و قیادت کا مستحق بنا دے گا۔

امام حسنؓ اور تاریخ

محترم مستفسر نے رسول اکرمؐ کے نواسہ امام حسنؓ کی شادیوں اور طلاقوں کا

---

[1] ہمارے ہاں اس قسم کی سیرت کوئی نہیں لکھی گئی جس میں تاریخ کو قرآن کے تابع رکھا گیا ہو۔ معراج انسانیت اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں حضورؐ کی سیرت طیبہ کو قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اور تاریخ کو اسی حد تک قابل اعتماد سمجھا گیا ہے۔ جہاں تک وہ قرآن کے تابع جاتی ہے۔

ذکر بھی فرمایا ہے، یہ درست ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے سو سے زیادہ بیویاں کیں اور انہیں طلاقیں دیں اور دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ طلاق کو حضورؐ نے بہت ناپسندیدہ عمل (البغض) قرار دیا ہے اب فرمائیے کہ تاریخ کے ان بیانات کی روشنی میں رسول اللہ کے نواسہ حضرت امام حسنؓ کے متعلق آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟

یزید کے متعلق روایات اور اگر تاریخ کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ سننا ہو تو وہ بھی سن لیجئے، بخاری شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا، وہ بخشا جا چکا ہے۔ (اول جیشن من اُمتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم بخاری) اور تاریخ اس پر شاہد کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا اس کے ایک دستہ کا سپہ سالار یزید (ابن معاویہؓ) تھا ۱۹۵۳ء

۴۔ صدر اوّل کی تاریخ میں کیا ہے

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جنوری ۱۹۵۹ء کے طلوع اسلام میں آپ نے تاریخ اور قرآن کے عنوان سے جو شذرہ لکھا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا پُرمغز، حقیقت کشا اور دین کے سمجھنے میں صحیح رہنمائی دینے والا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ آپ کم از کم ہمارے پہلے دور (عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ کے ان واقعات کو بھی سامنے لاتے جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں اور اس لیے اس قابل نہیں کہ انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اگر آپ اتنی تفصیل میں نہیں جا سکتے تو مثال کے طور پر کچھ واقعات ایسے بیان کر دیجئے جن سے اس امر کی وضاحت ہو جائے۔ یہ چیز میری طرح اور بہت سے قارئین کے لیے بڑے فائدے کا موجب ہو گی۔

طلوع اسلام ہم اس سے متفق ہیں (اور اس چیز کی اہمیت کو کئی بار سامنے لا چکے ہیں) کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم (کم از کم) قرن اوّل کی تاریخ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیں اور ان تمام واقعات کو، جو قرآن کی تعلیم کے خلاف جاتے ہیں۔ تاریخ سے خارج کر کے اسے از سرِ نو مرتب کریں لیکن یہ ظاہر ہے کہ اول تو یہ کام کسی ایک فرد یا ادارہ کے کرنے کا

نہیں۔ پوری ملت کے کرنے کا ہے۔ اس لیے کہ یہ کوشش اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب اس قسم کی تاریخ مرتب ہو جانے کے بعد، سابقہ کتب تاریخ کو ناقابل اعتماد قرار دے کر، اس جدید تاریخ کو دنیا میں رائج کیا جائے اور یہ کام بین الملی حیثیت ہی سے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی ادارہ اس کام کو از خود کرنا چاہے تو اس کے پاس بڑے وسیع ذرائع ہونے چاہئیں۔ ادارۂ طلوع اسلام کے پاس وہ ذرائع کہاں ہیں؟

باقی رہا اس عہد کی تاریخ سے کچھ مثالیں پیش کرنے کا سوال، سو اس کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں، نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد جو پہلا واقعہ تاریخ میں مذکور ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ جس کا آغاز حضورؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات ہی میں ہو گیا تھا) وہی اس حقیقت کی بین مثال ہے اس واقعہ کو سامنے لانے سے پہلے تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنی تعلیم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ:۔

۱۔ ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔

۲۔ مدارج کا معیار انسان کا ذاتی جوہر اور حسن عمل ہے۔

۳۔ خون اور رنگ (قبیلہ، نسب، قوم) کے امتیازات یا نسلی تفاخر کا تصور یکسر غیر قرآنی ہے

۴۔ ملت کے معاملات، باہمی مشورہ سے طے ہونے چاہئیں۔

۵۔ ملوکیت۔ یعنی حکومت کا ورثہ میں ملنا غیر قرآنی تصور ہے۔

خلیفہ کا انتخاب باہمی مشورہ سے ہونا چاہیئے۔

قرآن کی یہ وہ تعلیم ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ تعلیم تھی جسے نبی اکرمؐ زندگی بھر عام کرتے اور اس پر عمل کر کے دکھاتے رہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جسے صحابہ کبارؓ نے حاصل کیا اور اس پر عمل پیرا رہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا کوئی شخص اس کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ یہی صحابہؓ رسول اللہ کی وفات کے چند ثانیہ بعد (بلکہ حضورؐ کی وفات سے بھی پہلے) خدانہ کردہ ایسی روش اختیار کر لیں گے جو قرآن کی اس بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کے پورے پروگرام کے خلاف ہو۔ کوئی مسلمان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن دیکھئے کہ ہماری تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔

حضرت علیؓ اور مسئلہ خلافت

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی، علی ابن ابی طالبؓ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابوالحسنؓ رسول اللہ نے کس حال میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسولؐ اللہ کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں عموب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو، رسولؐ اللہ کے پاس چلیں، اور آپ سے دریافت کر لیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسرے لوگوں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے۔ (اس پر حضرتؓ علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہو گا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسولؐ اللہ سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۹)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ (تاریخ کی رو سے) ابھی حضور صلعم کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ کی جانشینی کا سوال بنو ہاشم میں سے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے دل میں پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائیگی لیکن حضرت عباسؓ کا انداز کچھ اور تھا اس لیے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے تصریح کرا لینا ضروری سمجھتے تھے اس پر حضرت علیؓ کی طرف جو جواب منسوب کیا گیا ہے وہ قابل غور ہے یعنی "بخدا اگر اس بارے میں ہم نے رسولؐ اللہ سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ ہمیں کبھی بھی حکومت نہیں دیں گے"

اب آگے بڑھئے۔ رسولؐ اللہ اس دنیا سے تشریف لے گئے آپ نے اپنے جانشین کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ امت کو پہلی مرتبہ امیر ملت کے انتخاب سے واسطہ پڑا۔ رسولؐ اللہ کی ہنوز تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا ایک اجتماع ہوا جس میں حضرت سعدؓ بن عبادہ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ وہیں

بیعت حضرت ابوبکر صدیقؓ

یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک قریش (مہاجرین) میں سے۔ اس وقت مہاجرین حضرت

صحابین الفوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے، مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں تشریف لے گئے۔ اس اجتماع کی جو روئداد تاریخ نے بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت حباب بن منذرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

"اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو۔ کیونکہ لوگ تمہارے مطیع ہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے تم اہل عزت و ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک ان میں سے۔" (محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیق اکبر" صـ۱۰۷)

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ کی طرف حسب ذیل تقریر منسوب کی گئی ہے۔

"ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب رسولؐ اللہ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جان نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے تیار ہو۔"

دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے یہ حدیث پیش کی گئی کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ الائمہ من قریش یعنی خلافت قریش میں رہے۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لیے گئے۔

آپ غور کیجئے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم رسولؐ اللہ کے اہل خاندان ہیں۔ اس لیے خلافت کے ہم حقدار ہیں اور پھر یہ حدیث کہ خلافت قریش میں رہے گی۔ کس طرح قرآن کی اس بنیادی تعلیم کے خلاف

جاتی ہے۔ جس کی عملی تبلیغ نبی اکرمؐ ساری عمر فرماتے رہے۔

اور آگے بڑھیے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے ہجوم کر کے آگے بڑھنے لگے تو انصار میں سے ایک نے کہا کہ:۔

دیکھو سعدؓ تمہارے پاؤں کے نیچے نہ روندے جائیں۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔

وہ ہے ہی روندے جانے کے قابل۔ اللہ اسے ذلت نصیب کرے۔ (ص ۱۱۴)

تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت سعدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی۔

وہ نہ ان کے ساتھ نماز پڑھتے اور نہ ان کے ساتھ شامل ہو کر حج کے ارکان بجالاتے (ص ۱۱۵)

یہ ہے ہماری تاریخ کی رو سے، باہمی تعلقات کا نقشہ ان صحابہؓ کا جن کے متعلق قرآن یہ سارٹیفکیٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بہت ہمدرد تھے۔ (۴۸/۲۹)

حضرت علیؓ کا موقف

یہ تو رہی اس اجتماع کی روئداد۔ اب یہ دیکھئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے متعلق حضرت علیؓ (اور دیگر ارباب بنو ہاشم) کا رد عمل (تاریخ کی رو سے) کیا تھا۔ ہیکل اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

یعقوبی نے بیان کیا ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے ایک جماعت نے ابوبکرؓ سے بیعت نہیں کی اور ان کا میلان علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل ابن عباس زبیر ابن العوام، ابن العاص، خالد بن سعید، مقداد بن عمر، سلمان فارسی، ابوذر غفاری عمار بن یاسر بداء بن عارف اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

ابوبکرؓ نے عمرؓ بن الخطابؓ، ابوعبیدہؓ ابن الجراح اور مغیرہؓ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارہ میں مشورہ کیا۔ انہوں نے حضرت صدیقؓ کو عباسؓ ابن عبدالمطلب سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا۔ صدیق اکبرؓ نے اپنی طویل گفتگو میں حضرت عباسؓ سے کہا ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ اس امر خلافت میں آپ کا حصہ بھی ہونا چاہیئے جو آپ کو اور آپ کی اولاد کو برابر ملتا رہے۔ کیونکہ آپ بہر حال رسول اللہ کے چچا ہیں۔ یعقوبی نے حضرت عباسؓ

کی گفتگو بیان کرتے ہوئے ان کا یہ جواب نقل کیا ہے

" اگر حکومت ہمارا حق ہے تو ہم اس پر راضی نہیں کہ کچھ لیں اور کچھ چھوڑ دیں"۔

ایک روایت میں یہ بھی موجود ہے جسے یعقوبی اور دوسرے بہت سے مؤرخین نے نقل کیا ہے اور یہ روایت آج تک برابر مشہور چلی آ رہی ہے کہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت حضرت فاطمہؑ کے مکان میں حضرت علیؑ کے پاس جمع ہوئی۔ جو حضرت علیؑ سے بیعت کرنا چاہتی تھی۔ ان میں خالدؓ بن سعید بھی تھے۔ جنہوں نے فرمایا۔ "خدا کی قسم! لوگوں میں کوئی بھی محمدؐ کی جانشینی کا تم سے زیادہ حقدار نہیں ہے"۔

ابوبکرؓ و عمرؓ کو حضرت فاطمہؑ کے مکان میں ان لوگوں کے اجتماع کی خبر ہوئی تو وہ ایک جماعت کے ساتھ وہاں پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکڑ کر پچھاڑ دیا اور ان کی تلوار توڑ ڈالی اور یہ لوگ مکان کے اندر گھس گئے۔ حضرت فاطمہؑ نکلیں، اور انہوں نے پکار کر کہا، "خدا کی قسم! تم لوگ یا تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ میں اپنے بال پراگندہ کر کے خدا کے سامنے فریاد و زاری اور بددعا کروں گی"۔

حضرت فاطمہؑ کی اس دھمکی پر گھر میں جس قدر لوگ تھے۔ سب ایک دم باہر نکل گئے یہ لوگ کچھ دن تک تو یونہی رہے پھر یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے چلے گئے۔ مگر حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کے انتقال تک ۔ یعنی چھ ماہ تک ۔ بیعت نہیں کی اور ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہیں چالیس روز کے بعد انہوں نے بیعت کر لی تھی

حضرت علیؑ اور بنو ہاشم کے تخلف کے بارہ میں جو روایت سب سے زیادہ مشہور اور شائع و ذائع ہے۔ یہ وہ روایت ہے جسے ابن قتیبہ نے (اپنی کتاب) الامامۃ والسیاست میں بیان کیا ہے۔ اسے اور اسی قسم کی دوسری روایتوں کو ان کے معاصرین اور متاخرین نے بھی بیان کیا ہے وہ روایت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ ایک جماعت کے ساتھ ابوبکرؓ کی بیعت کی تکمیل کے بعد بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ باہر نکل کر جیسا کہ تمام لوگوں نے بیعت کر لی ہے وہ بھی بیعت کر لیں۔ بنو ہاشم اس وقت حضرت علیؑ کے مکان میں مجتمع تھے۔ بنو ہاشم اور ان کے تمام ہم نواؤں نے عمرؓ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ زبیر بن العوامؓ ہاتھ میں تلوار لیے عمرؓ اور

ان کے ساتھیوں کی طرف نکلے۔ عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو پکڑ لو۔ چنانچہ لوگوں نے ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور انہوں نے جا کر بیعت کر لی۔ علیؓ ابن ابی طالب سے کہا گیا کہ ابوبکرؓ سے بیعت کر لو۔ علیؓ نے جواب دیا۔ میں تم سے بیعت نہیں کر سکتا۔ تمہاری بہ نسبت میں امر خلافت کا زیادہ حقدار ہوں اور تم لوگوں کو مجھ سے بیعت کرنا چاہیئے۔ تم لوگوں نے یہ امر خلافت انصار سے لیا ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی قرابت سے استدلال کیا ہے۔ تم لوگ اہل بیت سے خلافت کو غصباً چھیننا چاہتے ہو۔ کیا تم نے انصار سے یہ نہیں کہا کہ تم ان کی نسبت خلافت کے اس لیے زیادہ حقدار ہو کہ محمدؐ تم میں سے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے تمہیں قیادت و امامت سونپ دی؟ لہٰذا اب میں بھی تمہارے خلاف اسی دلیل سے استدلال کرتا ہوں جس دلیل سے تم نے انصار کے مقابلہ میں استدلال کیا تھا۔ ہم زندگی اور موت ہر دو حال میں رسولؐ اللہ سے زیادہ قریب ہیں۔ اگر تم میں ایمان ہے تو انصاف سے کام لو۔ ورنہ اس ظلم کے نتیجہ کے لیے تیار رہو اور وہ نتیجہ تم جانتے ہو۔

حضرت عمرؓ نے کہا "جب تک تم بیعت نہ کر لو تمہیں یوں نہیں چھوڑا جا سکتا"۔

حضرت علیؓ نے گرمی اور شدت کے ساتھ جواب دیا۔ اونٹنی کا دودھ دوھ لو، آدھا تمہیں مل جائے گا اور آج اس کا تھن باندھ کر چھوڑ دو تاکہ باقی کل مل جائے۔

ابوبکرؓ کو ڈر ہوا کہ ان کی تیز کلامی کہیں شدت اختیار نہ کرے۔ لہٰذا وہ دونوں کے بیچ میں آ گئے اور حضرت علیؓ سے انہوں نے فرمایا۔ اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتا"۔

اس کے بعد ابوعبیدہ بن الجراح حضرت علیؓ کے پاس گئے اور نرمی سے ان کو سمجھایا اور کہا۔ "بھیا! تم نوعمر ہو۔ یہ لوگ تمہاری قوم کے بوڑھے ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ ہے نہ معاملات کی پہچان ہے۔ میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ امر خلافت کے لیے ابوبکرؓ تم سے زیادہ قوی اہل اور موزوں شخص ہیں۔ لہٰذا اس امر کو تم ان ہی کے حوالہ کر دو۔ اگر تم زندہ رہے اور تمہاری عمر نے وفا کی تو اس میں شبہ نہیں کہ تم فضل، دین، علم، فہم، سبقتہ اسلام، نسب اور قرابت کے اعتبار سے ہر طرح اس کے اہل ہو"۔

اس پر حضرت علیؓ برافروختہ ہو کر بولے۔ مہاجرین کی جماعت اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو عرب پر محمدؐ کی سلطنت کو اس کے گھر اور اس کے مخزن سے نکال کر اپنے گھروں اور اپنے حفاظت خانوں میں نہ لے جاؤ اور سلطنت والوں کو ان کے مقام اور حق سے نہ ہٹاؤ۔ خدا کی قسم اے مہاجرین! ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور جب تک ہم میں کتاب اللہ کے پڑھنے والے۔ رسول اللہ کی سنتوں کو جاننے والے، امر رعیت کا لحاظ رکھنے والے، ان سے برائیوں کو دور کرنے والے، ان کے درمیان مساوات کے ساتھ اموال کو تقسیم کرنے والے موجود ہیں ہم ہی امر خلافت کے مستحق ہیں۔ خدا کی قسم خلافت ہم ہی میں ہے۔ تم لوگ خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کی راہ سے گمراہ نہ ہو جاؤ کہ اس طرح تم حق سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔

رواۃ کا بیان ہے کہ بشیر بن سعد اس گفتگو کے وقت موجود تھے انہوں نے یہ باتیں سنیں تو انہوں نے کہا۔ اے علیؓ! اگر انصار نے یہ باتیں ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لینے سے پہلے سن لی ہوتیں تو وہ کبھی تمہارے بارے میں اختلاف نہ کرتے۔

حضرت علیؓ یہاں سے غصہ میں بھرے ہوئے نکلے اور رات کے وقت حضرت فاطمہؓ کو ایک سواری پر سوار کر کے ساتھ لیا اور انصار کی مجالس میں گھومنا شروع کر دیا حضرت فاطمہؓ نے انصار سے مدد مانگی تو وہ جواب میں کہتے تھے۔ اے رسولؐ اللہ کی صاحبزادی! ہم اس شخص (ابوبکرؓ) کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ اگر تمہارا شوہر اور چچیرا بھائی ابوبکرؓ سے پہلے آجاتا تو ہم اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔

حضرت علیؓ کا غصہ اس جواب پر اور بھی تیز ہو گیا اور انہوں نے جواب دیا۔ کیا میں رسولؐ اللہ کو بلا دفن گھر میں چھوڑ کر چلا آتا اور سلطنت کیلئے لوگوں سے جھگڑتا پھرتا؟

اس پر حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں۔ "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کچھ کیا جو ان کو زیبا تھا اور لوگوں نے وہ کچھ کیا جس کا خدا کو جواب اور حساب دیں گے۔

اس واقعہ کے متعلق بخاری میں حسب ذیل روایت ملتی ہے۔

حضرت فاطمہؓ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر حضرت علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع

نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت نہیں کی تھی چنانچہ انہوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جاسکیں گے اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا تم سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کرلیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔ "ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو آپ کو حق تعالیٰ عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے، لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے"۔

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکرؓ صدیق ممبر پر چڑھے خطبہ دیا اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا۔ پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کا بیان کیا اور کہا کہ انہوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا، اور نہ اس

صد بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ اور کیا ہے۔ معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔

(ابن جریر طبری جلد ۳ صفحہ ۴۴۸)

ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقعہ پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔

فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابو بکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔

(صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۰۹)

قطع نظر اس کے یہ تاریخی روایات صحابہؓ کبار کے باہمی تعلقات کے متعلق کس قسم کی تصویر پیش کرتی ہیں غور طلب بات یہ ہے کہ ان کی رو سے، ایک طرف مہاجرین، انصار کے مقابلہ میں، "حق خلافت" کیلئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ " الائمۃ من قریش" تو دوسری طرف خود قریش میں سے حضرت علیؓ اپنے حق خلافت کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ سے قرابت کی بنا پر انہیں خلافت بطور استحقاق ملنی چاہیئے اور جن لوگوں نے انہیں ان کے حق سے محروم کیا ہے وہ مستبد اور غاصب ہیں۔ یہی وہ غصب و استبداد ہے جس کی بنا پر تاریخ (یعنی شیعہ حضرات کی روایت) یہاں تک کہتی ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد، بجز معدودے چند حضرات (جنہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) تمام صحابہؓ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق ممکن ہے سُنّی حضرات کہہ دیں کہ یہ روایت تعصب پر مبنی ہے لیکن اس کا کیا جواب کہ خود بخاری میں بھی حسب ذیل روایت موجود ہے۔

حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ کئے حشر کئے جاؤ گے آپ نے یہ آیت پڑھی۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ

اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں

اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لے جائے جا رہے ہوں گے میں کہوں گا، یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا۔ یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے

(بقیہ نوٹ سابقہ صفحہ)

ص۲ ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبد تم بہ علینا۔ یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ابن جریر طبری ج ۲ صفحہ ۴۴۸)

ف۱ جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے پس میں کہوں گا۔ جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسےٰؑ) نے کہا تھا۔ کنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم۔

(بخاری کتاب الانبیاء۔ ترجمہ شائع کردہ۔ نور محمد تاجر کتب کراچی۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۹)

یہ ہیں چند مثالیں، ہمارے تاریخی ذخیرہ میں سے، صرف ایک واقعہ کے متعلق جو رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد پیش آیا اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس کے بعد کے واقعات کے متعلق اس تاریخ میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔

اور یہ ہے وہ تاریخ جسے قرآن کے مقابلہ میں، دینی معاملات میں بہ حیثیت سند پیش کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ طلوع اسلام کا اس باب میں یہ مسلک ہے کہ ہم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ایمان اور حضورؐ کے صحابہؓ کبار کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی قرآن کریم کے مطابق بسر کی ہوگی۔ لہٰذا اگر ہماری تاریخ میں کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب کی گئی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ تاریخ کا بیان غلط ہے انہوں نے کبھی ایسا کیا یا کہا نہیں ہوگا اور ہمارا یہی وہ جرم ہے جس کی بنا پر ہمیں "منکر حدیث" اور نہ معلوم کیا کچھ نہیں کہا جا رہا۔ غور فرمائیے کہ ہم بخاری کی اس حدیث کو کس طرح صحیح تسلیم کر لیں کہ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ کبار کی ایک جماعت (معاذ اللہ، معاذ اللہ) دین سے مرتد ہو گئی تھی؟ ہم کہاں سے وہ جگر لائیں جو یہ کچھ سن کر شق نہ ہو جائے؟

یہ وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ قرآن اور تاریخ کے مقابلہ میں قرآن کو سند ماننا چاہیئے اور کسی مروجہ عقیدہ یا عمل کے لیے تاریخ کو بطور حجت پیش نہیں کرنا چاہیئے اور یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ جب تک ہم قرآن اوّل کی تاریخ کا قرآن کی روشنی میں تنزیہ کر کے اسے از سر نو مرتب نہیں کرتے، نہ دین کی صحیح عملی شکل ہمارے سامنے آسکتی ہے اور نہ ہی ان حضراتؓ کی صحیح سیرت، لیکن جمود اور تقلید کا بُرا ہو کہ جو شخص اس قسم کی آواز بلند کرتا ہے اسے ملحد اور بے دین قرار دے دیا جاتا ہے۔ (۱۹۵۹ء)

۵۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

ف۱ بخاری کے اصلی الفاظ "مرتدین علیٰ اعقابہم" ہیں۔

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

طلوع اسلام کی حال کی اشاعت میں آپ نے تاریخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس نے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں میں خود تاریخ کا طالب علم ہوں میں جب اپنی تاریخ کے ان مقامات پر غور کرتا تھا تو ذہن میں اس قدر الجھنیں پیدا ہوتی تھیں کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ نے صرف ایک واقعہ پر اکتفا کیا ہے یعنی نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے واقعہ۔ لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں یہ الجھنیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً میں تاریخ کی روشنی میں یزید کے واقعہ کو کبھی نہیں سمجھ سکا صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جس لشکر نے سب سے پہلے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، اس کا سپہ سالار یزید ابن معاویہ تھا اور اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ ابن عباسؓ۔ حضرت امام حسینؓ، جیسے جلیل القدر اصحاب بہ حیثیت سپاہی شریک تھے۔ خود صحیح بخاری کے شارح، عسقلانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث (جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے) امیر معاویہ اور یزید کی منقبت میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر صحیح بخاری کی یہ حدیث صحیح ہے اور جو حضرات علم حدیث میں سند مانے جاتے ہیں ان کا اصرار ہے کہ بخاری کی تمام حدیثیں صحیح ہیں) تو پھر جس شخص (یعنی یزید) کی بخشش کا خود رسول اللہ یقین دلائیں۔ اس کے خلاف ہم لوگ (یعنی اہل سنت والجماعت) کس طرح لب کشائی کرسکنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ یہ بات میرے دل میں مدت سے کھٹکتی چلی آرہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ یزید کی خلافت کے متعلق ایک طرف ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس سے اسلام کی جڑ کٹ گئی اور حضرت امام حسینؓ نے اس کے خلاف آواز بلند کرکے دین کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا۔ چنانچہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ[1]

حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ

لیکن دوسری طرف ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ یزید کی بیعت میں کم از کم دو اڑھائی سو صحابہؓ شریک تھے اور باقی تابعینؒ حضرات تھے جن حضرات نے اس کی بیعت سے انکار کیا تھا، ان کی تعداد شاید ان سے بھی کم ہو۔ جنہوں نے (مثلاً) حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یزید کی خلافت سے اصولاً اسلام

---

[1] یہ رباعی خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی نہیں۔

کی جڑ کٹتی تھی یا انفرادی طور پر وہ ایسا فاسق و فاجر تھا جیسا کہ بتایا جاتا ہے تو پھر اس قدر صحابہؓ اور تابعین حضراتؒ نے اس کی بیعت کس طرح کر لی؟ اگر ہم یزید اور اس کی خلافت سے متعلق وہی عقیدہ رکھیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ان تمام صحابہؓ اور تابعینؒ حضرات کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس کی بیعت کی تھی؟ اور اگر ان حضرات کے . . . . . .

. . . . . .

اس فیصلہ اور عمل کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ حق کے مطابق تھا تو پھر ہم یزید کے خلاف کس طرح لب کشائی کر سکتے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان حضرات نے مجبوراً بیعت کی تھی یعنی ان سے استبداداً بیعت لی گئی تھی، تو اس سے (معاف فرمائیے) ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کی سیرت کے متعلق جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر سوال کوئی فروعی سا ہوتا تب بھی شاید اس بات سے چشم پوشی کر لی جا سکتی۔ لیکن یہ سوال ایسا اہم تھا، جس پر خود اسلام کی عمارت کے قائم رہنے اور گر پڑنے کا دار و مدار تھا۔ ایسے اہم سوال کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان تمام حضرات نے ڈر کے مارے بیعت کر لی اور جرأت ایمانی کا ثبوت صرف چند افراد (حضرت امام حسینؓ اور آپ کے ساتھیوں) نے دیا، صحابہؓ کبار اور تابعینؒ کے متعلق جس قسم کا تصور پیدا کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ میرے دل میں ان تمام حضرات کی بڑی عظمت اور عقیدت ہے اس لیے میں تو اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن دوسری طرف مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اگر ان حضرات کے اس عمل (یعنی یزید کی بیعت کر لینے) کو حق بجانب قرار دیا جائے تو پھر حضرت امام حسینؓ . . . . . اور آپ کے ساتھیوں کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ میرے دل میں ان کی بھی ویسی ہی عظمت اور عقیدت ہے۔

یہ ہیں وہ الجھنیں جن میں میں ایک مدت سے گرفتار ہوں اور جن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا شیعہ حضرات نے اپنے لیے اس الجھن کا حل نکال لیا۔ یعنی انہوں نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ امام بھی رسولؐ کی طرح خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے اور یہ امامت حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد میں رہنی تھی جن لوگوں نے ان حضرات میں سے کسی کی بھی امامت کا انکار کیا، ان کا انکار ایسا ہی تھا جیسا نبوت کا انکار۔ لہٰذا ایسے لوگ حق پر ہو نہیں سکتے۔ اس میں نہ امت کے منتخب کردہ خلیفہ کا سوال ہے نہ باپ کے بعد وراثت میں خلافت پانے کا سوال۔ حتیٰ کہ اس میں نہ کسی خلیفہ کے فاسق و فاجر ہونے کا سوال ہے، نہ صالح اور متقی ہونے کا سوال۔ شیعہ حضرات نے اپنے لیے یوں راستہ صاف کر لیا لیکن ہم (سُنّی) جو اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتے، اس الجھن سے کس طرح نکلیں۔ جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے؟ میں شکر گزار ہوں گا، اگر آپ

براہ کرم اس مشکل مسئلہ کے حل کی کوئی صورت بتا دیں گے۔

طلوع اسلام جب تک ہماری تاریخ وہی رہے گی جو اس وقت تک ہمارے ہاں چلی آ رہی ہے اس الجھن (اور اس قسم کی سینکڑوں الجھنوں) کا کوئی حل پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ان مشکلات کا علاج وہی ہے جسے ہم ایک مدت سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم اپنی تاریخ کو از سر نو مرتب کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقین مانیے، ہم اپنی آنے والی (تعلیم یافتہ) نسلوں کو کبھی اسلام پر مطمئن نہیں کر سکیں گے۔ ہماری تاریخ اس وقت تک ساتھ دے سکتی تھی جب تک ہم نے قوم کے لیے سوچنا حرام قرار دے رکھا تھا۔ ہماری نئی نسلوں نے سوچنا شروع کر دیا ہے اور انہیں اس سے کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر ہم نے ان سوچنے والی نسلوں کو یہ بتایا (جیسا کہ ہم جہلا کو بتاتے چلے آ رہے ہیں) کہ ہماری یہی تاریخ، اسلام کی صحیح تعلیم کی مظہر ہے تو وہ اس قسم کے اسلام کو دل میں جگہ دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ ہمارے اربابِ مذہب کو اس خطرہ کا کوئی احساس نہیں وہ "ان مغرب زدہ ملحدین" کا علاج گالیوں کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قوم میں غور و فکر کی صلاحیت اور عادت پیدا نہ ہو اس لیے کہ وہ کبھی اس پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ ہماری تاریخ کو کوئی ہاتھ تک بھی لگا سکے۔ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے اور کب آتی ہے ؎

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکین و لکم ماندہ دریں کش مکش اندر

(۱۹۵۹ء)

(۱۲)

غلام اور لونڈیاں

۱۔ ایک خط میں نے ذیل کا خط محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔

میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا نظام شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگا، اور اس پر تعداد کی تو کوئی قید نہ ہوگی۔؟

(۲) کیا اس نظام شریعت میں لونڈی اور غلام کی خرید و فروخت (علاوہ ان لونڈی غلاموں کے جو جنگی قیدی ہوں) پاکستان میں جائز ہوگی، جس طرح آج کل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے!

اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔

مکرمی و محترمی! اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا عنایت نامہ ملا، جو سوالات آپ نے کئے ہیں۔ ان کا مختصر جواب تو "ہاں اور نہیں" کی شکل میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہوگی، اس لئے میں ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں۔

نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت اسی صورت میں دی گئی ہے۔ جبکہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہوئی ہو نہ تو قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو۔ نہ فدیہ لے کر قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔

آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں۔ وہ یا تو انہیں قتل کر دے گی۔ یا انہیں عمر بھر اس قسم کے "انسانی باڑوں" میں رکھے گی۔ جنہیں آج کل (CONCENTRATION CAMPS) کہا جاتا ہے۔ اور کسی قسم کے "انسانی حقوق" دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہے۔ جس میں اس قسم کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے، وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے۔ اس طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک شخص کا ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا۔ اس میں، اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو، اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیران جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر لونڈی یا غلام ان سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ انہیں از روئے قانون ایک خاص مدت تک کے لئے اس کو مہلت دینی ہوگی، اور اس مدت میں اگر وہ اپنی رقم ادا کر دے تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔

اس قسم کے غلاموں اور لونڈیوں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول نہ ہونے تک اس سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے ..... اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص تک منتقل کر دیتا ہے قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو پوری طرح سے اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا اتفاق ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے، اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا، کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے لئے گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت دوسرے

کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ بلائے جان بن جاتے ۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جبکہ نہ ان کا تبادلہ ہوا اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے ۔) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دے دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے ۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا ۔ تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں ۔ قانونی حیثیت سے "ملک یمین" اور عقد نکاح میں خاص فرق نہیں ہے ۔ بلکہ "ملک یمین" تو باقاعدہ حکومت کے توسط سے حاصل ہوتی ہے ، جو عورت کسی کے "ملک یمین" میں دے دی جائے ، اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا جنسی تعلق جائز نہیں ہے ۔ جو اولاد اس سے ہوگی اس کا نسب اصل مالک ہی سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہوگی جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد ۔ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا ۔ اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے ۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آ سکتی ہیں ۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے ، اگر لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا جائے لیکن بعد کے ادوار میں امراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا دیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے ۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشا کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے ۔ تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے ۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے ۔ اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے ۔

حجاز میں جو بردہ فروشی آج کل ہوتی ہے ۔ اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم ۔ لیکن اصولی طور پر میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ، جنگ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے آزاد آدمیوں کو پکڑنا ، اور ان کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے ۔ والسلام بقلم ابو صالح اصلاحی بحکم

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔

محترم مودودی صاحبؒ نے میرے استفسارات کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا۔ لیکن ان کے خط سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے۔ ان لونڈیوں سے تمتع بھی جائز ہوگا۔ اور اس پر تعداد کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس کی تائید میں انہوں نے جو دلائل بیان فرمائے ہیں کم از کم میں تو ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ میرا تو اس تصور سے دل کانپتا ہے کہ اسلام جو دنیا سے غلامی کو مٹانے کا مدعی ہے۔ وہ خود انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے گذارش ہے کہ براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا مودودی صاحب کے خط سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ درست ہے۔ اور آیا اسلام کی یہی تعلیم ہے؟ جواب خواہ براہِ راست مجھے تحریر فرمادیں۔ خواہ طلوع اسلام میں درج فرمادیں۔ والسلام

جواب

ہمارے بھائی نے مودودی صاحب کے خط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ درست ہے۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ اسلام میں اسیرانِ جنگ کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاسکتا ہے۔ اور ان لونڈیوں سے بلا قید نکاح وتعداد جنسی تعلقات بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ باقی رہے ان کے دلائل تو وہ یقیناً ارسطو کے ان دلائل سے زیادہ دقیع اور قوی نہیں جو وہ نفسِ غلامی کے جواز بلکہ وجوب میں دیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں اس کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے وجوب میں اتنے ہی دلائل رکھتا تھا جنہیں ناقابلِ تردید سمجھا جاتا تھا لیکن یونان کو ارسطو کے دلائل لے ڈوبے اور اسلام کو مودودی صاحب جیسے فقہا کی منطق۔

ع خدائے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں اس اضطراب کی علت بھی معلوم ہے جس کی وجہ سے مودودی صاحب کو اس سیدھے سادھے جواب کے لئے دلائل ومصالح کے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ خواہ وہ دلائل ومصالح خود سہاروں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔ اور وہ علت یہ ہے کہ ایک طرف ان کا دامن روایات کی خاردار جھاڑیوں میں الجھا رہتا ہے اور دوسری طرف وہ "ماڈرن" بھی بننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا کش مکش لازمی ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

طلوعِ اسلام خدا کے عطا فرمودہ دین ہی کو دین سمجھتا ہے جو حقائق کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قدامت و

جدت کی کشش مکتوں سے بلند ہے۔ وہ جس قدر فراست بھی حاصل کر سکنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ خدا کی کتابِ منیر سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اسے ان امور میں کبھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا ؎

قلندر جزو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن اسیرانِ جنگ کے متعلق سورۂ محمد کی ایک ہی آیت میں حکم ہے اور اس آیت کے چار لفظوں نے معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ جنگ میں جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (۴۷/۴)

انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر

اللہ اللہ خیر سلا۔ باقی رہی وہ مدت جس میں وہ بطور قیدی تمہارے پاس رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں، اور ان سے انسانوں جیسا سلوک روا رکھا جائے گا کسی سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک۔ خود مسلمان کے شعار کے خلاف ہے کسی انسان پر دوسرے انسان کا "حقِ ملکیت" یکسر غیر فطری ہے۔ اس لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی ملکیت میں دے دینے کی اجازت دے دے اور اس کے لئے راہیں کشادہ کر دے۔ غلامی اسی کو کہتے ہیں۔ اور اسلام کا دامنِ تقدس ان اتہامات سے یکسر پاک ہے۔ جو اس کے دشمنوں نے وضعی روایات کے راستہ اس پر لگائے اور جو آج ہماری شومئی قسمت سے ہمارا دین بن چکے ہیں۔

سبحان اللہ تعالیٰ عمّا یصفون

قرآن میں ملک یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں موجود تھے اور جنہیں آہستہ آہستہ ان احکامات کی رو سے جزو سوسائٹی بنایا جا سکتا تھا۔ اس نے انہیں اس طرح بتدریج معاشرۂ اسلامی میں جذب کیا۔ اور آئندہ کے لئے غلامی کے دروازے اس حکم کی رُو سے بند کر دیئے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی ملوکیت نے ان دروازوں کو ایک ایک کر کے پھر سے کھول لیا۔ اور بالائے قیامت کہ اس ننگ انسانیت مسلک کو وضعی روایات کی رو سے منسوب کر دیا۔ اس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کی طرف۔ جس کے ظہور کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وہ اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آرہی تھی۔

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)

مودودی صاحب غلامی کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آج کل جنگ کے قیدی جس قسم کے "انسانی باڑوں" (CONCENTRATION CAMPS) میں رکھے جاتے ہیں۔ اور ان سے وہاں جس قسم کا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنالیا جائے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اوّل تو یہ کہ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ قرآنی نظام میں قیدیوں کے عبوری زمانہ میں کیمپوں کی یہی حالت ہوگی جیسی آج کل کی ابلیسی سیاست میں ہوتی ہے۔ اُس نظام میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ انسانوں سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ وہ نظامِ ظلم رد کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ نہ کہ ظلم کرنے کے لئے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان CAMPS کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں جو مسلمانوں کے ہاں اسیرانِ جنگ کے لئے تیار کیے جائیں گے ہم کہتے ہیں تو یہ کہ اسلام نے اس خرابی کا حل یہ بتایا ہے کہ انکے مردوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں کیا عمدہ اصلاح ہے! انسانیت اس پر ناز کرے گی؛ اور دنیا کے قیدی اِس احسانِ عظیم پر سجدہ ریز ہوں گے، جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں۔ بہنیں۔ بیٹیاں۔ اُن "مصلحین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا سامان بن رہی ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

> فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

یعنی قیدیوں سے کام لینا مشکل ہے۔ اور اسی طرح ان کی عورتوں کو گھروں میں رکھنا بے حد پُرخطر۔ لیکن جب انہیں غلام بنالیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ان کی عورتوں سے جب ان کے مردوں کے سامنے ان کی اپنی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کر لئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات رفع ہو جائیں گے جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی جہت سے ان کی طرف سے وارد ہو سکتے تھے! یا للعجب۔

پھر فرماتے ہیں:۔

> جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں۔ اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔

یعنی اگر ایک شخص دس بیس عورتیں سنبھال لے ۔ان سے ان کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات پیدا کرلے اور پھر جب جی چاہے، انہیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے ۔اور اس کی اس دوسرے سے قیمت بھی وصول کرلے تو یہ سب کچھ پاکیزگیٔ اخلاق میں شامل ہے ۔اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے تو وہ سوسائٹی میں منتقل بداخلاقی" پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں ۔اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ اول الذکر بداخلاقی اس لئے حسنِ اخلاق میں داخل ہوگئی کہ آپ نے اسے "مشروع" قرار دے دیا۔ اور موخرالذکر اس لئے حرام قرار پاگئی کہ آپ کی بارگاہ سے اسے جواز کا فتویٰ نہیں مل سکا ۔ آریہ سماجی "نیوگ" کی تائید میں بھی یہی دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ جس قسم کے تعلق کو سوسائٹی جائز قرار دے دے وہ جائز ہو جاتا ہے ۔اس پر کسی اور کو اعتراض کا کیا حق حاصل ہے ؟

لونڈیوں کی تعداد کو بے قید چھوڑ دینے کا فلسفہ بیان فرمانے کے بعد مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں ۔

> لیکن بعد کے ادوار میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے ۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم کے ہاں لونڈیاں دھڑا دھڑ آ رہی ہوں ۔ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو ۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جا سکتی ہوں ۔تو پھر وہ کونسی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں ۔جسے لونڈی مل جائے اور "شریعت" اس سے جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو ۔تو پھر اس لونڈی سے تمتع، عیاشی کا حیلہ کس طرح بن جائے گا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کر دیئے جائیں اور پھر ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام دھرا جائے ! باقی رہا ہر روز ایک نئی عورت سے نکاح کر کے دوسرے دن طلاق دے دینا۔ سو یہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نظام شریعت قرآن پر مبنی نہ ہو ۔ قرآنی نظام میں طلاق دے دینا ایسا کھیل نہیں ۔اس میں یہ مذاق نہیں ہوگا کہ طلاق ۔طلاق ۔طلاق کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال باہر کیا ۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا ہے کہ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو کوئی حق نہیں رہتا ۔اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے ۔لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو ، انہیں تو یقیناً معلوم ہوگا کہ ان کی "شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتا دی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات بھی قائم کیئے جائیں اور پھر یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے اولاد پیدا ہو جائے گی اور اس طرح اسے

بیچنے کا امکان باقی نہ رہے گا۔

سنئے وہ تدبیر کیا ہے؟ صحیح بخاری کتاب البیوع - باب بیع الرقیق (مطبوعہ مصر، جلد دوم صـ۱۸) میں حدیث بیان کی گئی ہے۔

"ان ابا سعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ قال یا رسول اللہ انا نصیب سبیا فنحب الاثمان فکیف ترٰی فی العزل فقال او انکم تفعلون ذالک؟ علیکم ان لا تفعلوا۔ ذالکم فانھا لیست نفس مخلوقۃ کتب اللہ ان تخرج الا ھی خارجۃ۔

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضورؐ سے یہ عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم انہیں بیچنا چاہتے ہیں۔ تو عزل کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونے والا خدا نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

عزل کے متعلق صحیح بخاری کتاب النکاح، باب العزل، (جلد سوم صفحہ ۱۶۲) میں جابر بن عبداللہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ:۔

قال کنا نعزل علی عھد النبی والقرآن ینزل

ہم حضورؐ کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے۔ اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا۔

اور اگر حمل ہو جائے تو؟ اسی صحیح بخاری (جلد دوم صـ۱۸) میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ:۔

لا باس ان یصیب من الجاریۃ الحاملۃ ما دون الفرج

اس میں حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے

سلہ طلوع اسلام پر وہ وقت بڑا اذیت و کرب کا ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی ایسی بات کرنی پڑ جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرتے سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جائیں۔ لیکن کیا کیا جائے۔ بعض صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ ان میں یہ ناگوار فریضہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ موضوع زیر نظر میں ہم عمداً اس سے گریز کرتے رہے کہ وہ روایات درج نہ کرنی پڑیں۔ جو لونڈیوں کے بارے میں ہماری کتب احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن ایک دو روایات تو ضرور نقل کرنی ہی پڑ گئیں۔ ان کے بغیر اصل بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

معاذاللہ! معاذاللہ! یہ ہیں وہ روایات جنہیں حضور حتمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور نہیں شرمایا جاتا کہ کل قیامت کو خدا، اور اس کے رسولؐ امین کے سامنے کیا جواب دیں گے۔

بہرحال یہ ہے وہ "نظامِ شریعت" جسے یہ حضرات یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے اپنے ہاں رائج کریں گے اور قومِ مخالف کے جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی مستورات کو لونڈیاں بنائیں گے تو آپ انہیں بھی نہیں روک سکتے کہ وہ آپ کے قیدیوں کو غلام بنائیں۔ اور آپ کی شریف بیبیوں کے ساتھ اسی طرح جنسی تعلقات قائم کرکے انہیں آگے منتقل کرتے رہیں۔ یہ سلسلہ جب عام ہو جائے گا تو یہ حضرات خوش ہوں گے کہ "خدا کا دین" کس طرح ساری دنیا میں خود بخود پھیل رہا ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے!
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

۱۹۵۳ء

۲۔ غلام اور لونڈیاں عہدِ عباسیہ میں

۱۔ **سوال**: آپ نے کہا ہے کہ اسلام، احترامِ آدمیت سکھاتا ہے۔ پھر یہ زرخرید باندیوں اور دشمنوں کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت کیسے دیتا ہے؟

جواب: اسلام نہ زرخرید باندیوں کی اجازت دیتا ہے، نہ دشمن کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی۔ دشمن کے قیدیوں کے متعلق اس نے بالفاظ صریح کہہ دیا کہ انہیں یا تو فدیہ لے کر چھوڑنا ہوگا یا احساناً۔ باقی رہا کسی انسان (مرد یا عورت) کو بھیڑ، بکری کی طرح خریدنا (اور اس طرح اس مرد کو غلام اور عورت کو باندی بنالینا) تو اس تصور سے اسلام کی روح کانپتی ہے۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان کے متعلق ہیں جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرے میں موجود تھے۔ قرآن نے آہستہ آہستہ انہیں یا تو رہا کرا دیا یا جزوِ خاندان بنا دیا۔ اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

۲۔ سوال: ۔ لونڈیاں اور باندیاں خلفائے عباسیہ اور اُمیہ رکھتے تھے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب: ۔ وہ خلفائے عباسیہ یا اُمیہ کا ذاتی فعل تھا جس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔ ان کا کوئی قول یا عمل اسلام میں سند نہیں ہو سکتا۔ آپ تو، ان کے ہاں کے غلاموں اور لونڈیوں کی بابت دریافت فرماتے ہیں۔ ان کا سرے سے بادشاہت کو ورثہ میں لینا کونسا اسلامی عمل تھا؟

۳۔ سوال: ۔ قرآن کا حکم ہے کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر چھوڑ دیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کسی قوم کو معلوم ہو کہ مسلمانوں نے ان کے قیدیوں کو بغیر کچھ لئے چھوڑ دینا ہے، تو فدیہ کیوں دیں گے؟

جواب: ۔ جنگ میں اوّل تو بالعموم ہوتا یہ ہے کہ کچھ ہمارے لوگ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں، کچھ ان کے لوگ ہمارے ہاں قید ہوتے ہیں۔ اس صورت میں قیدیوں کا تبادلہ خود ان کا فدیہ بن جاتا ہے۔ ایسی صورت نہ بھی ہو، تو بھی کوئی قوم، صلح ہو جانے کے بعد یہ نہیں چاہتی کہ ان کے افرادِ قوم دوسروں کی قید میں رہیں، وہ انہیں ضرور چھڑا لیتی ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال ایسی صورت پیدا نہ ہو اور ہمیں ان قیدیوں کو بغیر کچھ لیے چھوڑ دینا پڑے تو اس کے نتائج جس قدر خوشگوار نکل سکتے ہیں، اس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ آج ساری دنیا پر "کاروباری" ذہنیت چھا گئی ہے۔ اس لئے ہم احسان کی قدر و قیمت اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے لذّت آشنا ہی نہیں رہے۔ بیع و شریٰ کی اس منڈی میں جہاں ہر شے روپے سے تولی جاتی ہے، انسانیت کی بلند اقدار کی کوئی قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یاد رکھئے!۔ یہ اقدار اپنی مستقل قیمت رکھتی ہیں۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی جہاں کہیں اس قسم کی کسی قدر کی نمود ہوتی ہے اس کے سامنے آنے سے روح میں بے ساختہ شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا واقعہ کہ ایک شخص نے اپنا سب کچھ خرچ کر کے، ایک بیوہ کے دو مریض بچوں کی جان بچائی، "کاروباری" دنیا میں حماقت سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن دنیائے انسانیت میں آج بھی اس کا ذکر تحسین و تبریک کے ساتھ ہوگا۔ قرآن، بلند انسانی اقدار کا وزن، کاروباری میزان میں نہیں کرتا۔ اس کے لئے اس کے اپنے پیمانے ہیں۔ احسان، اسی قسم کی قدر ہے۔

سنہ ۱۹۶۳ء

۱۳

قرآن کا سیاسی نظام

۱۔ مرکزِ ملت

ہمیں بہت سے حضرات کی طرف سے یہ استفسار موصول ہوا ہے کہ "طلوعِ اسلام" کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ مرکزِ ملّت کی اطاعت "خدا اور رسول" کی اطاعت ہوتی ہے، اور مرکزِ ملّت سے مراد مرکزی حکومتِ پاکستان یا اسی قسم کی اور حکومت ہے۔ اس بات کی وضاحت کی جائے۔

ہم اس کی وضاحت ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار کر چکے ہیں اور طلوعِ اسلام میں صراحت سے لکھ چکے ہیں کہ اس سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں انداز یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جس کی مخالفت مقصود ہو اس کی صحیح بات لوگوں کے سامنے نہ آنے دی جائے۔ خود ہی اس کی طرف ایک غلط بات منسوب کر دی جائے اور پھر اسے ہدفِ طعن و تشنیع بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ آپ ایک بار پھر سن لیجئے کہ مرکزِ ملّت سے ہماری مراد کیا ہے۔

عام مذاہب میں صورت یہ ہے کہ جن امور کو مذہبی احکام کہا جاتا ہے وہ چند اخلاقی ہدایات یا پوجا پاٹ کی رسوم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے طور پر ان کی پابندی کرتے ہیں، بالفاظِ دیگر ان کے ہاں مذہب انفرادی چیز ہے۔ لیکن اسلام کا تصوّر اس سے مختلف ہے۔ اسلام ایک دین (نظامِ حیات) ہے جو ایک منظم اور اجتماعی شکل میں بروئے کار آتا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ یہ ایک ایسی مملکت متشکل کرتا ہے جس میں احکامِ خداوندی قانون کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مملکت کے قوانین کی اطاعت کے لئے کسی سنٹرل اتھارٹی کی ضرورت ہوگی، جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کو ہم "مرکزِ ملّت" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی۔ جس کی سنٹرل اتھارٹی خود حضورؐ ہی تھے۔ آپؐ کے سوا اور ہو کون سکتا تھا؟ اس مملکت میں احکام خداوندی کی اطاعت سے مقصود ان قوانین کی اطاعت تھی جسے یہ سنٹرل اتھارٹی نافذ کرتی تھی۔ یعنی صورت یہ نہیں تھی کہ قرآنی احکام پر جس طرح کسی نے چاہا عمل کرلیا۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف سے صادر فرمودہ فیصلوں کی کی اطاعت کرے۔ اسی کا نام اللہ اور رسولؐ کی اطاعت تھا۔

یہ نظام نبی اکرمؐ کی زندگی تک محدود نہیں تھا۔ اس لئے حضورؐ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد یہ اسی طرح قائم رہا۔ اسے "خلافت علیٰ منہاجِ نبوت" کہا جاتا ہے۔ اس میں سنٹرل اتھارٹی خلیفۃ المسلمین تھا۔ یہی وہ سنٹرل اتھارٹی (یا مرکز ملت) تھا جس کے فیصلوں کی اطاعت ہر مسلمان پر لازم تھی۔ کسی کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وہ قرآنِ کریم یا نبیؐ اکرم کے فیصلے پر اپنے طور پر جس طرح جی چاہے عمل کر کے کہے کہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر رہا ہوں۔ مثلاً جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا تو انفرادی طور پر کئی ایک صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا لیکن ان سب نے اطاعت اس سنٹرل اتھارٹی کے کے فیصلے کی کی۔ یا جب حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہ کی جائیں تو اکثر صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ لیکن اس کے باوجود عمل سنٹرل اتھارٹی کے فیصلے کے مطابق ہی ہوا۔ ظاہر ہے کہ جن صحابہؓ نے اپنی ذاتی رائے کے خلاف (جو بہرحال ان کے تفقہ فی الدین ہی کا نتیجہ تھی) مرکز کے فیصلہ کی اطاعت کی تو انہوں نے نہ تو (معاذ اللہ) طوعاً و کرہاً کسی مستبد حاکم کی اطاعت کی تھی اور نہ ہی ان کی یہ اطاعت (پناہ بخدا) "خدا اور رسولؐ کی معصیت تھی۔ یہ بلکہ عین خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف تھی یعنی عامۃ المسلمین کیلئے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا فیصلہ، خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے مرادف تھا۔

جب بدقسمتی سے خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو دین کے نظام کا یہ نقشہ باقی نہ رہا۔ اس کی وہ سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی۔ اب وہ دیگر مذاہب کی طرح انفرادی سطح پر آگیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اُمت میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ سنٹرل اتھارٹی کی موجودگی میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اب خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا عملی طریق اس کے سوا کوئی ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک فرقہ (یا اگر کوئی شخص کسی فرقہ سے متعلق نہیں ہونا چاہتا تھا تو وہ فرد) اپنے طور پر قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ کی پیروی کرے۔ یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے۔

ہمارے نزدیک دین کی وہی شکل مقصود تھی جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافت علیٰ منہاجِ نبوت میں قائم تھی اور دین اپنی وہی شکل اس وقت اختیار کرے گا۔ جب خلافت علیٰ منہاجِ نبوت دوبارہ قائم ہو۔ ہم اس کے دوبارہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اسی کو ہم قرآنی حکومت۔ حکومت خداوندی۔ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت اور اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کہتے ہیں"۔ خواہ وہ (امت کے مشورہ سے) ایک فرد کی صورت میں ہو، یا ایک مجلس کی شکل میں۔ اس مرکزِ ملت کے فیصلوں کی اطاعت، ہمارے نزدیک، اسی طرح خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف ہوگی۔ جس طرح مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اس وقت افرادِ امت کو اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ قرآنِ کریم۔ سنتِ رسولؐ اللہ یا فقہ ائمہؒ پر اپنی صوابدید کے مطابق اپنے طور پر عمل کریں۔ اس وقت یہ سنٹرل اتھارٹی (یعنی خلافت علیٰ منہاج نبوت) کتاب وسنت وفقہ وغیرہ کی روشنی میں معاملہ زیرِ نظر کے متعلق جو فیصلہ دے گی اس کا اتباع سب کے لئے ضروری ہوگا۔ اس سے امت میں وہ وحدت پیدا ہو سکے گی جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں تھی۔

یہ بات کہ قرآنِ کریم میں جہاں اس ضمن میں "اللہ اور رسولؐ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد اسلامی نظام ہے۔ ہماری اختراع نہیں، یہ خیال متقدمین کا بھی تھا۔ اور خود ہمارے زمانے کے مفسرین کا بھی ہے۔

مثلاً قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے۔ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَنفَالِ قُلِ الْأَنفَالُ لِلَّهِ وَالرَّسُولِ (۸/۱) اے رسول! تم سے پوچھتے ہیں، انفال کے متعلق۔ کہہ دو کہ انفال "اللہ اور رسولؐ" کے لئے ہے۔ امام ابنِ جریر طبری (جن کی تفسیر کو ام التفاسیر کہا جاتا ہے) اللہ اور رسولؐ کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

واولی هذه الاقوال بالصواب فی معنی الانفال قول من قال هی زیادات یزیدها الامام لبعض الجیش او جمیعهم

"انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرین صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے"۔

یہاں انفال کے معنی سے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ "اللہ و رسولؐ" کی تفسیر انہوں نے امامِ وقت لکھی ہے۔

(۲) امام رازیؒ نے آیت (۵/۳۳) انما جزآء الذین یحاربون اللہ و رسولہ کے تحت، امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابوحنیفہ اذا قتل واخذ المال فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے، اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل۔ قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے"

(۳) اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ الدر المنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں

عن السعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع بہ ما یشاء

سعید بن سیب، حسن بصری اور ضحاک (علیہم الرحمۃ) نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے۔

(۴) یہی امام محی السنۃؒ بغویؒ نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں۔

قال ابن عباس وسعید بن المسیب و مجاہد وعطاء والحسن البصری وابراھیم النخعی والضحاک وابو ثور من شھر السلاح فی قبۃ الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر بہ وقدر علیہ فامام المسلمین فیہ الخیار۔

حضرت ابن عباس۔ سعید بن المسیب مجاہد عطا حسن بصری، ابراہیم نخعی ضحاک ابوثور علیہم الرحمۃ نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پُرخطر کر دیا۔ پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے

(جو سزا چاہے دے)۔

ان حضرات کے اقوال سے دو باتیں ظاہر ہو گئیں۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک "اللہ اور رسولؐ" سے مراد "امام وقت" ہے اور دوسرے یہ کہ یہ احکام، رسولؐ اللہ کی ذات گرامی یا آپ کی زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، آیہ انفال کے متعلق اپنی تفسیر (ترجمان القرآن جلد دوم) میں لکھتے ہیں۔

مال غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اس کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

لیکن قرآن کریم نے یہ حکم دے کر مال غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع و حرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔

آپ دیکھیئے یہاں انہوں نے "اللہ اور رسولؐ" کے معنی حکومت (یعنی اسٹیٹ) لئے ہیں۔

اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اول (صفحہ ۴۶۴ - ۴۶۵) میں سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۳ کا ترجمہ اور تفسیر یوں لکھتے ہیں۔ آیت یہ ہے۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ... (۵/۳۳)

وہ اس کا ترجمہ یہ لکھتے ہیں:۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ص۵۵ ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں ص۵۶

جن الفاظ پر ص۵۵ اور ص۵۶ نمبر دیئے گئے ہیں وہ ان کی تشریح حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

ص۵۵ زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام کرنے کی ذمہ داری

اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی لئے اس نے اپنا رسولؐ بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اس چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے۔ جس کے زمین کے وسائل اس طرح استعمال کئے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں، ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ فاسد نظام قائم کر دینے کے لئے ہو، دراصل خدا، اور رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے۔ بادشاہ کے خلاف لڑائی۔۔۔۔۔۔

(WAGING WAR AGAINST THE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔ چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو۔ صلہ یہ مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

آپ دیکھئے مودودی صاحب نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "خدا اور رسولؐ" سے مراد اسلامی حکومت یا اسلامی نظام ہے۔ اسی کو طلوعِ اسلام مرکزِ ملت یا خلافت علیٰ منہاجِ نبوت سے تعبیر کرتا ہے یہ بات اس نے آج نہیں کہی، وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد سے اسے برابر دہراتے چلا آ رہا ہے۔ (مثلاً) ستمبر ۱۹۴۸ء کے طلوعِ اسلام میں "خدا و رسولؐ کی اطاعت" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جسے بعد میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اسلامی نظام" میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے۔

قرآن شریف کی ان نصوص صریحہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ گئی کہ "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت

سے مراد مرکزِ حکومتِ قرآن کی اطاعت ہے۔ وہ مرکز جو خدا کے احکام کا نافذ کرنے والا اور رسولؐ اللہ کی امامتِ کبریٰ کو آگے چلانے والا ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ مرکز "خدا اور رسولؐ" کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔

اور اس مضمون کو آخری سطریں یہ تھیں۔

یہ حصہ صرف ترتیب و تدوین قوانین کا ہے۔ لیکن یہ قوانین کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ جو اسلامی نظام کا ماحصل ہیں۔ جب تک ان کے نافذ کرنے والوں کو سیرت میں وہ تبدیلی نہیں پیدا ہو جائے گی جو قرآن چاہتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اکثر ابواب ایسے ہیں جن میں مسلمان بادشاہوں نے وہی قوانین رائج کئے جنہیں ہم قانونِ شریعت کہتے ہیں (اور آج بھی کئی ایک اسلامی ممالک میں قوانینِ شریعت رائج ہیں) لیکن بایں ہمہ، ان کی سلطنتیں نوعِ انسان کے لئے کبھی موجبِ رحمت نہ بن سکیں۔ ان قوانین نے اپنے صحیح اور مکمل نتائج اس وقت پیدا کئے تھے جب یہ دنیا میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے مقدس ہاتھوں سے نافذ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا نظام وہی نتائج پیدا کر رہا ہے یا نہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت، سیرتِ محمدیؐ کے قالب میں ڈھل رہی ہے یا نہیں۔ سیرتِ محمدیؐ معراجِ انسانیت ہے اور اس کی اصل تصویر قرآن کے صفحات میں محفوظ ہے۔

اگر باذر سیدی تمام بولہبی است

اُمید ہے اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ "مرکزِ ملّت" سے ہماری مراد اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم اس حقیقت کو اس سے قبل کئی بار طلوعِ اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔ جو حضرات ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ہاں طلوعِ اسلام جاتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس سے بے خبر نہیں کہ "مرکزِ ملت" سے ہماری مراد کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات برابر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کے نزدیک ہر فاسق و فاجر حکومت کی اطاعت (معاذ اللہ معاذ اللہ) "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ (۱۹۶۱ء)

۲ مرکزِ ملّت کی اطاعت

نوشہرہ سے ایک صاحب کا حسب ذیل خط موصول ہوا ہے ۔

آپ کے لٹریچر سے ایک بات بالکل کھل کر سامنے آتی ہے ۔ لفظِ رسولؐ کے معنی مرکزِ ملّت (CENTRAL AUTHORITY) کے بھی ہیں اور وہ مرکزِ ملّت ہی کی حیثیت سے امّت کے مطاع ہے ۔ ایک قاری کے ذہن میں لامحالہ چند سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں ۔ امید ہے کہ آپ کے ان سوالات کا دلائل کے ساتھ تسلی بخش جواب دیکر مزید خلجان سے نجات دلائیں گے ۔

۱ ۔ اگر رسولؐ، بحیثیت رسولؐ (اپنے اصل معنوں میں) نہیں بلکہ بحیثیتِ مرکزِ ملّت مطاع ہے تو

(ا) کلمۂ طیبہ (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ) میں محمدؐ کی رسالت پر ایمان لانے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ؟ اور

(ب) کلمہ کے اس جز کو مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے، جبکہ مرکزِ ملّت گاہ بگاہ بدلنے والے ہستی ہے ۔

۲ ۔ قرآن پاک میں رسولؐ کی غیر مشروط اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کی حیثیت اس مرکزِ ملّت (سنٹرل اتھارٹی) کی موجودگی میں کیا رہ جاتی ہے ۔ جو اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑنے اور اوامر و نواہی کی پروا نہ کرے ۔

۳ ۔ کیا ان انبیاءؑ کی جو کوئی ریاست قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اطاعت ان کے اُمتیوں پر ان کی وفات کے بعد ختم ہو جاتی تھی، اور دوسرے نبی کے آنے تک وہ اپنی یا اس ملک کے مرکزِ ملّت کی مرضی پر برضا و رغبت زندگی گذارنے کے مجاز تھے ۔

۴ ۔ کیا خلافت راشدہ میں قرآن کے ساتھ ساتھ سنّت کو بھی قانون کی اساس کا درجہ حاصل تھا یا نہیں ؟

طلوعِ اسلام | چونکہ آپ نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا تعلق طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ ایک بنیادی اصول سے ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب طلوعِ اسلام کے صفحات پر دیا جائے تاکہ دیگر قارئین بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔

۱۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضورؐ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے، حضورؐ کی یہ حیثیت منفرد تھی، جس میں نہ اس وقت کوئی اور شریک ہو سکتا تھا، نہ اس کے بعد۔ اس لئے کہ حضورؐ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضورؐ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائے رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاءؑ پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

۲۔ حضورؐ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔ اس مرحلہ میں حضورؐ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔ دوسرا مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس میں حضورؐ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (STATE) اور اس اتھارٹی کو سنٹرل اتھارٹی کہا جاتا ہے۔ ہر دو مراحل میں، حضورؐ کی اطاعت جماعت مومنین پر فرض تھی۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا، لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اب مرکزِ ملت، حضورؐ کا جانشین، خلیفۃ الرسولؐ، یا امیر المومنین تھا۔ اور امت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

۴۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینانِ رسالت مآبؐ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اور خلافت سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں احکامِ خداوندی کے بجائے سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔ چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا، اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اسی قسم کی تھی، جس قسم کی دنیا کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان سلاطین کو "مرکزِ ملت" کہنا ہی غلط ہے۔ "مرکزِ ملت" صرف اسی نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا۔ (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکامِ خداوندی کو نافذ کرے اور امورِ مملکت امت کے مشورہ سے طے پائیں۔ جو نظام خدا کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پروا نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے کیا تعلق؟ اس کی اطاعت، طاغوت کی اطاعت ہے۔ یہ طلوعِ اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے۔ جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام فلاں فلاں کو مرکزِ ملت اور ان کی اطاعت

کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے - هٰذَا اِفْكٌ عَظِيْمٌ - طلوع اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس نے مرکزِ ملّت کی تشریح ہمیشہ "خلافت علیٰ منہاج رسالت" کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی اس قسم کا نظام جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

۵- جب صحیح اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) باقی نہ رہے تو پھر دین عملاً موجود نہیں رہتا، مذہب رہ جاتا ہے۔ جس میں سیاسی امور کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور شخصی امور میں لوگوں کو اجازت دے دیتی ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے عمل کریں۔ سابقہ اُمتوں میں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتی تھی، اور اب ہمارے ہاں صدیوں سے یہی ثنویت کارفرما ہے۔ شخصی امور میں لوگ اپنی صوابدید کے مطابق، اسی طریق پر چلنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں جو حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھا۔ اس میں جس قدر اختلاف پائے جاتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس طریق کار میں اختلاف ناگزیر ہیں یہی وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے یہ روایت وضع کر لی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔ "مرکزِ ملت" کی موجودگی میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ اب خود اہلِ حدیث حضرات نے بھی اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ حدیث وضعی ہے)

۶- ایسا نظام جس میں امت کو احکامِ خداوندی کے مطابق چلایا جائے پھر سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو وہ "مرکزِ ملّت" کہا جائے گا۔ جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائمقام ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکز سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی کی اطاعت کرے گا۔

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو، جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے، اس میں اس کے سابقہ ادوار کے فیصلے علیٰ حالہٖ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو، ان میں اس دور کی حکومت ضروری تبدیلی کر لیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم رہی، اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآن کریم نے جب امورِ مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہی منشاء تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں جس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت واجب ہے"۔ تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حضورؐ کے زمانے کے فیصلوں کو ہمیشہ کے لئے علیٰ حالہٖ رہنا مقصود ہوتا تو اس حدیث میں "خلفائے راشدین کی سنّت" کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے

کہ تاریخ میں ایسے واقعات کا پتہ ملتا ہے، جن میں نبی اکرمؐ کے زمانے کے فیصلوں میں زمانۂ خلافت میں تبدیلی کی گئی - اس کی تفصیل طلوعِ اسلام میں متعدد بار پیش کی جا چکی ہے[1] یہ "خلفائے راشدین" کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے - اگر خلافتِ راشدہ، مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے لے کر آج تک کے خلفاء، خلفائے راشدین ہوتے - اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہو گیا ہے تو اسے پھر جاری کیا جا سکتا ہے - جب وہی سلسلہ پھر قائم کیا جائے گا تو ان نئے خلفائے راشدین کی سنّت کی اطاعت واجب ہو جائے، اس سے مراد ہوں گے - وہ فیصلے جو یہ نظام قرآنِ کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں باہمی مشاورت سے کریگا - اس سلسلہ میں وہ یقیناً ان فیصلوں کو بھی سامنے رکھے گا جو اس سے پہلے زمانۂ نبویؐ اور خلافت راشدہ میں طے پائے تھے - اس میں شبہ نہیں کہ ان فیصلوں کے ریکارڈ کو (جس طرح وہ ہم تک پہنچا ہے -) یقینی طور پر صحیح نہیں کہا جا سکتا - لیکن چونکہ اسلامی نظام کے لئے غلط اور صحیح کا بنیادی معیار، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصول و احکام ہوں گے، اس لئے اسے سابقہ ریکارڈ کے پرکھنے میں بھی دقت نہیں ہوگی -

یہ ہے اس باب میں طلوعِ اسلام کا مسلک، جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھ سکے ہیں

(۱۹۶۱ء)

۳- اسلام اور جمہوریّت

سوال :- آج کل یہ سلوگن عام کیا جا رہا ہے کہ اسلام اور جمہوریت پاکستان کے دو ستون ہیں، اس کا صحیح مطلب کیا ہے؟ کیا اسلام میں جمہوریت شامل نہیں؟

جواب :- اس کا مطلب انہیں سے پوچھئے جو اس سلوگن کو لے کر اٹھے ہیں - ہمارے ہاں سلوگن خاص مقاصد کے ماتحت وضع ہوتے ہیں اور انہی مقاصد کے حصول کے لئے بلند کیے جاتے ہیں - اسلام کو ان میں سپر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے - اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کی بنیاد "اسلامی جمہوریت" پر ہے تو یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے - لیکن یہ کہنا کہ اسلام اور جمہوریت، پاکستان کے دو ستون ہیں، ایسے ہی ہے جیسے (مثلاً) یہ کہا جائے کہ اسلام اور عدل، اسلامی حکومت

---

[1] یہ تفصیل "سلیم کے نام خطوط" میں ملے گی -

کے دو ستون ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب "اسلام" کہا جائے تو اس میں عدل شامل نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلام کے ساتھ عدل کی شرط عائد کرنا بھی ضروری ہے۔

لیکن اگر "جمہوریت" سے مراد، مغربی انداز جمہوریت ہے، جس میں پارلیمان کی اکثریت کے فیصلے بلا شرط مبنی برحق سمجھتے جاتے اور ملک کا قانون بن جاتے ہیں، تو یہ وہ جمہوریت تھی جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، اور جو اسلام کی عین نقیض ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کی رو سے، اسلام اور جمہوریت، دو متضاد نظریات ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔

اسلامی حکومت کی بنیاد قرآن ہے اور یہ وہ جامع ضابطۂ زندگی ہے جس میں صحیح جمہوریت سے مراد ہے قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت کو امت کے باہمی مشورے سے طے کرنا"۔

(۱۹۶۳ء)

۴۔ اسلامی نظام کی خصوصیّت

سوال:۔ اسلامی نظامِ معاشرہ کی وہ بنیادی خصوصیت کونسی ہے جس کے پیش کرنے سے یہ بات واضح ہوجائے کہ یہ نظام دیگر نظام ہائے زندگی سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

جواب:۔ انسانی زندگی کا منتہا ایک فرد کی انفرادیت کا استحکام اور اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ اختیار اور ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسلامی نظام فرد کے اختیار و ارادہ کی وسعتوں کو زیادہ سے زیادہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس پر صرف وہ پابندیاں عائد کرتا ہے جن سے ایک فرد دوسرے افراد کے اختیار و ارادہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ اس نظام کا مقصود و مطلوب، فرد کی انفرادیت کا حفظ و بقا ہے۔ اسی لئے وہ ہر اس ضابطہ اور اسلوب کی مخالفت کرتا ہے، جس سے فرد کی انفرادیت میں کمزوری واقع ہوئی ہو۔ اس کے نزدیک ملوکیت حرام ہے۔ کیونکہ اس اسلوبِ معاشرہ میں ایک فرد، دوسرے فرد کے فیصلوں کا محکوم ہو جاتا ہے وہ مذہبی نظام (THEOCRACY) کی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے تابع فرد کو اپنی عقل و بصیرت کی رو سے کسی بات کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔ وہ نظامِ سرمایہ داری کا دشمن ہے۔ کیونکہ اس میں معاشی محتاجی کی بنا پر فرد کی انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ وہ پیدائش کے اعتبار

سے انسانی بچوں میں تفریق کو باطل ٹھہراتا ہے۔ کیونکہ اس سے ایک فرد ان حالات کی بنا پر دوسرے افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے جن پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسی اصول کے مطابق وہ مرد اور عورت میں انسانی تفریق کو غلط قرار دیتا ہے۔ کیونکہ کوئی بچہ نہ اپنی مرضی سے لڑکا بنتا ہے نہ لڑکی۔ نیز وہ ہر اس کمی کو پورا اور کمزوری کو رفع کرتا ہے۔ جس کے پیدا کرنے کا ذمہ دار فرد متعلقہ نہیں تھا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اسلامی نظام معاشرہ کی وہ خصوصیت جو اسے انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی سے ممتاز کرتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اسلام کی رو سے نظام فرد کے لئے ہوتا ہے، فرد نظام کے لئے نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۲ء

۵۔ جُرم اور سزا

سوال:۔ ایک شخص خدا کے حکم کی خلاف ورزی (جرم) کرتا ہے۔ اسلامی مملکت اسے سزا دیتی ہے۔ کیا اس سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں، یا اس سے آگے کچھ اور بھی ہوتا ہے؟

جواب:۔ خدا کے احکام کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک قسم ان احکام کی ہے جو اسلامی مملکت میں قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً خدا کا حکم ہے کہ چوری نہ کرو۔ چوری نہ کرنا اسلامی مملکت میں جرم قرار پاتا ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اسے سزا ملتی ہے۔ جہاں تک صرف چوری کے فعل کا تعلق ہے، یہ سوسائٹی کے خلاف جرم ہے سوسائٹی اسے سزا دیتی ہے تاکہ جرم کی روک تھام ہو سکے اور معاشرہ میں امن و اطمینان قائم رہے سوال یہ ہے کہ کیا اس سزا سے جرم کا معاملہ صاف ہو گیا، یا اسے کچھ باقی رہ گیا؟ اسے شراب کی مثال سے سمجھئے۔ شراب پینا جرم ہے۔ ایک شخص شراب پیتا ہے۔ سوسائٹی اسے سزا دیتی ہے۔ جرمانہ کر دیتی ہے، قید کر دیتی ہے، بید لگاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جو جرم اس شخص نے سوسائٹی کے خلاف کیا تھا، سوسائٹی نے اس کی سزا دے دی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سزا سے، یہ شخص آئندہ ارتکاب جرم سے اجتناب کرے۔ اور اس کی سزا دیگر افراد کے لئے موجب عبرت ہو۔

لیکن شراب نے اس شخص کی صحت پر برا اثر کیا ہے۔ سوسائٹی کی طرف سے دی جانے والی سزا سے یہ اثر نہیں مٹ سکتا۔ اس کے لئے اسے علاج کرانا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی فعل سے جو جو اثرات شخص متعلق

کی ذات (یعنی اس کے اپنے آپ) پر مرتب ہوتے ہیں، سوسائٹی کی سزا ان کا ازالہ نہیں کرسکتی۔

لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے جرم (یعنی حکم خداوندی کی خلاف ورزی) سے ایک تیسرا اثر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اور یہ اثر مرتب ہوتا ہے انسان کے نفس۔ ذات (PERSONALITY) پر۔ شراب کی مثال میں۔

(۱) ایک جرم سوسائٹی کے خلاف ہوتا ہے، سوسائٹی کی طرف سے سزا، اس جرم کا ازالہ کردیتی ہے۔

(۲) ایک اثر اس شخص کی صحت پر ہوتا ہے۔ اس کا ازالہ مناسب علاج کردیتا ہے۔

(۳) ایک اثر اس شخص کی ذات پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح سزا اس نقصان کا ازالہ نہیں کرسکتی جو شراب کی وجہ سے اس شخص کی صحت پر ہوا ہے۔ اسی طرح سزا اور طبعی علاج، اس اثر کو زائل نہیں کرسکتے جو خدا کے حکم کی خلاف ورزی سے اس کی ذات پر مرتب ہوا ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص اپنے کمرے کے اندر شراب پیئے اور اس طرح نہ پولیس کی گرفت میں آئے، اور نہ اس جرم کی سزا پائے۔ لیکن اس سے وہ اس نقصان سے نہیں بچ سکتا جو اس کی صحت کے نقطۂ نگاہ سے ہوا ہے۔ وہ اثر مرتب ہو کر رہے گا، خواہ اسے کسی نے شراب پیتے دیکھا ہو یا نہ۔ اور خواہ اسے اس جرم کی سزا ملی ہو یا وہ بچ گیا ہو۔

شراب کی مثال سے آگے بڑھیئے۔ ایک شخص چوری کا گھی کھاتا ہے اور پکڑا نہیں جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحت پر مضر اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ اور اچھی ہو جائے گی۔ لیکن اس سے جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوا ہے۔ اس کے مضر اثرات تو اپنی جگہ پر ہوں گے۔ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس سے واضح ہے کہ انسان کے غلط عمل کا۔

(۱) ایک اثر سوسائٹی پر ہوتا ہے سوسائٹی اس کا ازالہ سزا دے کر کرتی ہے۔

(۲) دوسرا اثر صحت پر ہوتا ہے۔ اس کا ازالہ مناسب علاج سے ہوسکتا ہے، لیکن

(۳) تیسرا اثر اس شخص کی ذات پر ہوتا ہے جس کا ازالہ نہ سوسائٹی کی سزا سے ہوسکتا ہے نہ طبعی علاج سے۔ یہ اثر ہر جرم سے مرتب ہوتا ہے خواہ سوسائٹی اس کی سزا دے نہ دے اور خواہ اس کا اثر مجرم کی صحت پر پڑے یا نہ پڑے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ (۴/۱۱۱) جو شخص کوئی جرم کرتا ہے، اس کا مضر اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یہ بنیادی اصول ہے

جو مومن اور غیر مومن میں خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ مومن اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے اور کافر صرف پہلے دو اثرات کو مانتا ہے۔ اس تیسرے اثر کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ انسانی ذات، پر اس کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ اس تیسرے اثر کا ازالہ قرآنِ کریم کے تجویز کردہ نسخہ سے ہو سکتا ہے۔ یعنی احساسِ جرم اور آئندہ کے لئے اصلاح (من تاب واصلح) کے بعد ایسے کام کرنے جن سے انسانی ذات کو اس قدر تقویت مل جائے کہ اس سے اس جرم کے مضر اثرات کا ازالہ بھی ہو جائے، اور آئندہ کے لئے وہ جرم پر آمادہ کرنے والی ترغیبات کی مدافعت کرنے کے بھی قابل ہو جائے۔ اگر کوئی شخص اس تیسرے اثر کا اس طرح ازالہ نہیں کرتا تو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس کی سزا پاتا ہے۔ اس سزا کو اگر وہ اس زندگی میں محسوس نہ کرے، تو موت کے بعد کی زندگی میں محسوس کرتا ہے۔ سوال صرف محسوس کرنے کا ہے، ورنہ اس کا اثر، ارتکابِ جرم کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

جن قوموں میں جرائم عام ہو جائیں، ان پر تینوں قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ پہلی تباہی اس طرح کہ اس قوم میں تخریبی قوتیں عام ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں امن و سلامتی باقی نہیں رہتی۔ اس عدم تحفظ (INSECURITY) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے اور اجتماعی مفاد کسی کے پیشِ نظر نہیں رہتا وغیرہ وغیرہ۔

دوسری تباہی اس طرح آتی ہے کہ اس قوم کی صحت اور توانائی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ لوگ محنت کے عادی نہیں رہتے۔ ذہنی قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ زندہ صلاحیتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور اس طرح وہ قوم زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

اور تیسری اور سب سے بڑی تباہی اس طرح آتی ہے کہ اس طرح قوم میں مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں رہتا۔ وہ حیوانی سطح پر زندہ رہتی اور اسی سطح پر مر جاتی ہے اس میں انسانیت کی خوبیاں پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ انسانی ذات سے انکار کرنے والی قوم چونکہ اس کمزوری کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس لئے اسے اس تباہی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہ تباہی ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ ان مقامات سے آتی ہے جن کا انہیں شعور تک نہیں ہوتا۔ (من حیث لا یشعرون) ۱۶/۲۶ - ۱۶/۴۵ - ۳۹/۲۵

اب ان احکام کو لیجئے، جو مملکت کے قوانین کی زد میں نہیں آتے۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ کسی دوست کو ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہ تپاک سے ملتا ہے اور آپ کے ساتھ محوِ گفتگو ہے

آپ کی نگاہ اس کی گھڑی پر پڑتی ہے جو میز کے ایک طرف پڑی ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ اگر وہ کسی کام کے لئے کمرے سے باہر چلا جائے تو آپ وہ گھڑی چرا لیں۔ آپ سارا وقت یہی سوچتے رہتے ہیں، لیکن وہ آپ کا دوست اپنی جگہ سے سرکتا تک نہیں۔ اسے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور آپ ملاقات ختم کر کے مایوس واپس آ جاتے ہیں۔ جہاں تک ملک کے قانون کا تعلق ہے آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن جہاں تک قرآن کے قانونِ مکافات کا تعلق ہے، آپ ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ اس کی سزا آپ کو مل کر رہے گی۔ یہ وہی جرم ہے جس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس کا اثر انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کی ایک سزا تو انسانی ذات کی نشوونما دب جانے کی صورت میں ملے گی، اور دوسری سزا (جس کے تصور سے انسان کی چیخیں نکل جاتی ہیں) اس شکل میں ملے گی کہ مرنے کے بعد، آپ کا وہ دوست جس کی نگاہوں میں آپ بہترین مخلص دوست تھے اور معاشرہ جس میں آپ اس قدر معتبر بنے ہوئے تھے۔ سب موجود ہوں گے۔ اور ان کے سامنے آپ کا سینہ چاک کر کے دکھایا جائے گا کہ اس ملاقات کے وقت آپ کے دل میں کیا خیالات گذر رہے تھے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت آپ کی حالت کیا ہو گی؟ ہمارے نزدیک اس سزا سے زیادہ سخت اور شدید سزا کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ جہنم ہے جس کی آگ، قرآن کے الفاظ میں، انسان کے دل میں شعلہ ریز ہوتی ہے۔ (۱۰۴/۷)

دوسری قسم کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآن کریم "عدل اور انصاف" کا حکم دیتا ہے۔ عدل کے معنی ہیں کسی کا واجب حق دے دینا۔ اگر آپ کسی کا یہ حق دبا لیتے ہیں تو آپ قانون شکنی کرتے ہیں۔ حکومت اس کا نوٹس لے گی۔ اور حق دار کو اس کا حق دلائے گی۔ اور اگر اس میں خیانت کا پہلو بھی ہو گا، تو اس جرم کی سزا ملے گی۔ لیکن احسان اس قسم کا حکم نہیں۔ آپ ایک مزدور کو تین روپیہ روز پر کام پر لگاتے ہیں۔ اگر آپ اسے شام کو تین روپے دے دیتے ہیں تو آپ نے تقاضائے عدل کو پورا کر دیا۔[1] لیکن اگر آپ دیکھتے ہیں کہ تین روپے میں اس کے بال بچوں کا پیٹ نہیں پلتا اور آپ اسے ایک روپیہ زیادہ دے دیتے ہیں تو اسے احسان کہیں گے۔ یعنی کسی کی کمی پوری کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اگر آپ اسے ایک روپیہ زائد نہیں دیتے تو آپ از روئے قانون کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ لیکن آپ اپنی ذات کے خلاف جرم کرتے ہیں۔ آپ کی ذات کی نشوونما عدل اور احسان دونوں سے ہونی تھی۔ آپ نے احسان نہیں کیا تو آپ کی ذات کی نشوونما رک گئی۔ یہ سخت سزا ہے جو کسی ذات کو دی جائے۔

---

[1] ہم اس وقت اس سوال سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ مزدور کی تین روپے روز کی اجرت بھی عدل کے اصول پر مبنی تھی یا نہیں۔

[2] (۸۶/۹ - ۱۰۰/۱۰ - ۱۷/۱۳۰۱۴ - ۱۸/۴۹)

لہٰذا قرآنی معاشرہ کے افراد، نہ صرف ان جرائم سے بچتے ہیں جو از روئے قانون، جرم ہیں۔ بلکہ ان "جرائم" سے بھی بچتے ہیں جو قانون کی زد میں نہیں آتے۔ جو معاشرہ ان جرائم کو عادی طور پر نظر انداز کر دیتا ہے اس میں مستقل اقدار کا بہت بڑا حصہ عملی دائرے میں نہیں آتا۔ لہٰذا نشوونما یافتہ ذات نے جو تعمیری کام کرنے تھے، یہ معاشرہ ان سے محروم رہ جاتا ہے۔ یہ چیز بجائے خویش اس کی تباہی کے لئے کافی ہوتی ہے، خواہ وہ ان جرائم کی، جو قانون کی زد میں آتے ہیں، کتنی ہی روک تھام کیوں نہ کرے۔ اس معاشرہ کا حسنِ تدبر اور خوبیٔ نظم و نسق اسے اس بنیادی کمزوری کے تباہ کن نتائج سے نہیں بچا سکتے۔ لیکن جس معاشرہ میں نہ قانونی جرائم کی روک تھام ہو اور نہ ہی ذات کے خلاف جرائم کا انسداد، اس کا جو انجام ہو سکتا ہے، اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

یاد رکھئے! یہ تو ممکن ہے کہ کسی معاشرہ میں قانونی جرائم کی روک تھام کا انتظام ہو۔ لیکن اس میں ذات کے خلاف جرائم کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ یہ معاشرہ تباہ تو ہوگا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد مغرب کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

لیکن اگر کسی معاشرہ میں قانونی جرائم کے انسداد کا انتظام نہیں، تو اس میں ذات کے خلاف جرائم کی اہمیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ معاشرہ اوّل الذکر کے مقابلہ میں بہت جلد تباہ ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ جس معاشرہ میں قانونی جرائم عام ہوں، وہ معاشرہ دینی نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی اس میں "دیندار" یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے سکتے ہیں کہ ہم تو دین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو لوگ جرائم کرتے ہیں ان سے ہمیں کیا واسطہ۔ وہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں یہ ذہنیت دین کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ دین کی اہمیت محسوس کرنے والے افراد کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں جرائم بار ہی نہ پا سکیں۔ ان کا فریضہ صرف اپنے آپ کو جرائم سے بچانا نہیں، دوسروں کو جرائم سے باز رکھنا بھی ہے۔ اور یہ کیفیت صرف قرآنی معاشرہ میں ممکن ہے۔ جس میں ہر فرد اس امر کا شدید احساس رکھتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہونے پائے، جس سے اس کی ذات پر مضر اثر پڑے۔ اس میں قانون اور ذات دونوں کے خلاف جرائم آ جاتے ہیں۔

۱۹۶۱ء

۶۔ شرعی سزائیں

طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء میں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن نے جو سزائیں بتائی ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ حدود شرعی نافذ کرنے والے، احوال وظروف اور جرم کی نوعیت کے پیشِ نظر ان سے کم سزا بھی دے سکیں گے۔

(۱) کیا یہ آپ ہی کا اجتہاد ہے، یا اس سے پہلے کہیں اس کی مثال بھی ملتی ہے؟

(۲) زانی کی سزا سو کوڑے لکھی ہے، کیا کوئی شخص سو کوڑے کھا کر زندہ بچ سکتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کی سزا موت ہے، اور موت کا طریقہ کوڑے مارنا ہے۔ اس لئے اس کی سزا اگر سنگساری کر دی گئی تھی۔ تو اس میں کیا حرج تھا؟

جواب

جی نہیں۔ یہ ہمارا ہی اجتہاد نہیں تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا قطع ید ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے۔ جو قرآن نے متعین کی ہے۔ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہوگا۔ اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار، اس کے متعلق فقہ اور روایات دونوں میں تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ دینار سے کم کی چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نصاب ایک دینار ہے۔ اور بعض کے نزدیک ربع (چوتھائی) دینار۔ یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجئے احوال وظروف کو۔ فقہ کی رو سے چور کو اس وقت تک قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب تک اس نے مال کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو۔

سارق کسے کہتے ہیں؟

نسائی کی ایک روایت ہے کہ حضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ جو جانور پہاڑوں پر چرتے ہوں ان کی چوری کی بابت کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسا جانور چرا لے تو وہ جانور اور اس جانور جیسا ایک اور جانور پیش کرے، اور اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص بھوکا ہو۔ وہ اگر اپنی ضرورت کے مطابق کسی درخت سے پھل توڑ کر کھا لے (بشرطیکہ ساتھ باندھ کر نہ لے جائے) تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ ساتھ لے جائے تو اس کا دگنا معاوضہ اور کوڑوں کی سزا ہوگی۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے زمانہ قحط میں روٹی چرا کر کھانے والے کو سارق نہیں ٹھہرایا۔ امام ابن حزم

ایسے مواقع کے متعلق یہاں تک کہتے ہیں کہ جب غرباء پر ایسا وقت آجائے۔ اور دولت مند اس اضطرار کا احساس نہ کریں تو بھوکے غریبوں کو اجازت ہے کہ ان لوگوں کو لوٹ کر اپنی خوراک حاصل کرلیں۔ اگر اس کش مکش میں غریب مارا جائے۔ تو اس کے قاتل پر اس کا خون بہا ہوگا، اور اگر امیر مارا جائے تو اس امیر پر خدا کی لعنت ہوگی۔ غریب قاتل پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔

آپ کا دوسرا سوال کوڑوں کے متعلق ہے۔ کوڑے اس قسم کے نہیں ہوتے کہ سو کوڑوں سے انسان کی موت واقع ہوجائے۔ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ ملتا ہے کہ عہد حضرت عمرؓ میں ایک شخص نے دھوکے سے بیت المال سے کچھ روپیہ وصول کرلیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سو کوڑے لگوائے۔ پھر دوسرے دن مزید سو کوڑوں کی سزا دی اور پھر تیسرے دن سو کوڑے اور لگوائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوڑے ایسی چیز نہ تھے کہ جن سے موت واقع ہوجائے۔

باقی رہا یہ کہ زنا کی سزا سنگساری (رجم) میں کیا ہرج ہے تو اس میں ہرج یہ ہے کہ یہ سزا قرآن کریم نے مقرر نہیں کی۔ اس نے زنا کی سزا کوڑے ہی تجویز کی ہے۔ (۲۴/۳) ۱۹۵۳ء

۷۔ زنا کی سزا

سورۂ نساء میں ایک آیت ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ..... (۴/۱۵)

اس کے متعلق کسی صاحب نے مدیر صدق، مولانا عبدالماجد دریابادی سے حسب ذیل استفسار کیا۔

"نص سے ثابت ہے کہ جرم زنا کے الزام میں اربعۃ منکم یعنی چار گواہوں کی ضرورت ہے اور گواہ بھی قیاسی نہیں۔ عینی اور چشم دید واقع ہوں۔

فعل زنا یہ ایک ایسا بدترین اور مذموم فعل ہے جو کہ برضا ہو یا بالجبر ہر حالت میں خفیہ اور پوشیدہ طور پر واقع ہوتا ہے۔ اور مطلق ہی سو فیصدی موقعوں پر اس کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اللہ میاں کا چار گواہوں کی قید لگانا سمجھ میں نہیں آتا۔

معلوم نہیں ان حالات میں چار گواہوں کی قید کا غایت و خاصہ کیا ہے ؟ بالفرض جب تک چار گواہ نہ ہوں اور اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ عورت کے ساتھ بالرضا یا بالجبر زنا کرتا ہے تو وہ صرف گواہوں کے نہ ہونے کے باعث قابلِ گرفت نہ ہو سکے گا۔ چاہے عورت لاکھ بار اقرار کرے، لیکن بے سود۔ چنانچہ اسی وجہ سے مرد اس معاملہ میں آزاد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ شریعت حقہ میں جرم زنا کے الزام کے کیا طریقے ہیں ؟ مفصل وضاحت فرمائیں گے"؟

اس کے جواب میں مفسرِ دریابادی صاحب نے لکھا ہے کہ :-

معصیت کی بعض ایسی صورتیں ہیں کہ ان کا جتنا چرچا کیا جائے اتنا ہی وہ اور پھیلتی ہیں، اور اس میں نمبر اوّل پر زنا کاری اور اس کے متعلقات ہیں، بے حیائی اور فحش محض اپنے تذکرے ہی سے متعدی ہونے لگتے ہیں۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ حتی الامکان کسی واقعۂ زنا کا چرچا ہی نہ پھیلنے پائے۔ اس لئے اگر ایک آدھ شخص چھپ چھپا کر کسی واقعۂ زنا کو دیکھ لیں۔ تو انہیں چاہیئے کہ اس پر خاک ڈالیں، اور اس کا نام اپنی زبان پر نہ لائیں۔ لیکن جب مجرم اتنے ڈھیٹ اور بے باک ہو جائیں کہ اخفا کا اہتمام ہی چھوڑ دیں، اور ان کے شیطانی ڈرامے کے من دعن گواہ چشم دید چار چار موجود ہوں تو اب تو جرم انفرادی نہیں۔ تمام تر اجتماعی حیثیت کا ہو گیا۔ اور اب مجرموں پر حد شرعی لازم آ گئی۔ اور اب انہیں سزا ایسی عبرت انگیز ملنی ہی چاہیئے۔ جس سے معاشرہ تھرا اُٹھے، اور ایسی عبرتناک سزا علی الاعلان ملے جو معاشرے کے علم میں براہِ راست آ جائے"۔

آپ نے غور فرمایا کہ مولانا دریابادی کی تفسیر کی رو سے بات کیا ہوئی ؟ بات یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اگر لوگ زنا اس طرح کریں کہ اس فعل کے ارتکاب کو عام طور پر لوگ نہ دیکھ سکیں تو پھر یہ جرم جرم ہی نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ایک آدھ آدمی کہیں چھپ چھپا کر انہیں ایسا کرتے دیکھ بھی لے، تو بھی اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس کا کہیں چرچا نہ کرے۔ لیکن اگر لوگ اس طرح زنا کرنے لگیں کہ ان کے اس فعل کو لوگ کھلے بندوں دیکھیں تو ایسی صورت میں یہ جرم بڑا سنگین ہو جاتا ہے، اور اس کی انہیں عبرت انگیز سزا ملنی چاہیئے۔

قرآن کریم کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ برحق ہے اور اس پر ہمارا ایمان بھی ہے۔) کہ یہ ایک ایسا ضابطہ قوانین ہے جس کی مثال و نظیر دنیا کے تمام لوگ مل کر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس ضابطہ کے ایک اہم قانون کے متعلق جو کچھ دریابادی صاحب نے لکھا ہے وہ اگر غیروں کے سامنے آ جائے۔ تو وہ اس ضابطۂ قانون

کے متعلق کیا کہیں گے ؟ جنسی اختلاط ایک ایسا فعل ہے کہ دنیا میں بے حیا انسان بھی اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ کسی ایسی جگہ اس کا مرتکب ہو جہاں اس پر دوسرے لوگوں کی نگاہ پڑے ۔ زنا تو ایک طرف رہا ۔ میاں بیوی تک بھی اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص انہیں اس فعل میں مصروف پائے ۔ حالانکہ اس کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے کہ شادی جنسی اختلاط ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ بھی بچوں کی صورت میں دنیا کے سامنے آجاتا ہے ۔ اس قسم کی اتفاقی صورتیں تو کبھی کبھار پیدا ہو جاتی ہیں کہ کسی جوڑے نے کسی ایسی جگہ اس امر کا ارتکاب کیا جہاں اسے اطمینان تھا کہ انہیں کوئی نہیں دیکھتا اور اتفاق سے ایسا ہو گیا کہ کوئی راہ گذر ادھر سے آنکلا ، اور اس نے انہیں دیکھ لیا ۔ لیکن یہ چیز کہ لوگ سرِ راہ اور کھلے بندوں جنسی اختلاط میں مصروف ہو جائیں (اور وہ بھی زنا کے طور پر) انسان کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتی ۔ اندریں حالات آپ غور کیجئے کہ محترم دریا بادی صاحب نے جو تفسیر پیش فرمائی ہے وہ کس حد تک قرآنی ہو سکتی ہے ؟

تو یہ ہے اس آیت کی وہ تفسیر جسے ہمارے علمائے کرام کا ایک گروہ پیش کرتا ہے ۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت ہی منسوخ ہے ۔ لیکن وہ بھی اسے منسوخ اسی حد تک مانتے ہیں جہاں تک سزا کا تعلق ہے ۔ جرم زنا کے ثبوت کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت ان سب کے نزدیک ضروری ہے ۔ بہرحال آپ ان علماء کا نقطۂ نگاہ بھی دیکھئے جو اسے منسوخ بھی مانتے ہیں ۔ تفسیر ابنِ کثیر ہمارے ہاں ایک بڑی قابلِ اعتماد تفسیر سمجھی جاتی ہے ۔ یہ تفسیر درحقیقت امام طبری کی تفسیر ہی کا ایک "سب ایڈیشن" ہے ۔ اس میں آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ۔

> ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ جب عادل گواہوں کی شہادت سے کسی عورت کی سیاہ کاری ظاہر ہو جائے تو اسے گھر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے ۔ گھر ہی میں قید کر دی جائے اور جنم قید ہو ۔ یعنی موت سے پہلے نہ چھوڑا جائے ۔ خدا اس کا بیان فرما کر پھر فرماتا ہے کہ ہاں یہ اور بات ہے کہ خدا ان کے لئے کوئی اور راہ بتا دے ۔ پھر جب دوسری صورت کی سزا تجویز ہوئی تو وہ ناسخ ٹھہری اور یہ حکم ہٹ گیا ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب تک سورۂ نور کی آیت نہ اتری زنا کار عورت کا یہی حکم رہا ۔ پھر اس آیت میں شادی شدہ کو رجم کرنے یعنی پتھر مار مار کر مار ڈالنے اور بے شادی شدہ کو کوڑے مارنے کا حکم اترا ۔ حضرت عکرمہؒ حضرت سعید بن جبیر حضرت حسنؒ حضرت عطا خراسانیؒ حضرت ابوالصالح حضرت قتادہؒ حضرت زید بن اسلمؒ حضرت ضحاکؒ کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس امر پر سب کا اتفاق ہے ۔

اس تفسیر میں آپ کے سامنے ایک نئی بات آگئی۔ یعنی اس میں لکھا ہے کہ سورۃ نور کی آیت میں شادی شدہ کو رجم کرنا۔ یعنی پتھر مار مار کر مار ڈالنا۔ اور بے شادی شدہ کو کوڑے مارنے کا حکم اترا۔ لیکن سورہ نور میں کسی جگہ بھی رجم کا ذکر نہیں۔ اس میں صرف یہ حکم ہے۔

الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد من هما مائة جلدة (۲۴/۲)

یعنی زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔

آپ حیران ہوں گے کہ آیت میں تو صرف کوڑے لگانے کا حکم ہے۔ پھر امام ابن کثیر نے یہ کیسے فرما دیا کہ اس میں رجم کرنے کا بھی حکم ہے۔ لیکن آپ کو شاید اس کا علم نہیں ہمارے علمائے تفسیر و روایات کے نزدیک قرآن کی آیتوں کی کتنی قسمیں ہیں ان کے عقیدہ کی رو سے قرآن میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، اور وہ محض ثواب کی خاطر پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی ایسی آیتیں بھی ہیں جو قرآن کے اندر موجود نہیں، لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ آیت رجم انہی آیات میں سے ہے۔ یعنی اس کا حکم تو موجود ہے۔ لیکن خود آیت قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفسیر خود امام ابن کثیر کی زبانی سنیئے۔ وہ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کی۔ یاد کی۔ اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانہ میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضے کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا، چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ خواہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ اس کے زنا پر شرعی دلیل ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطوّل ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ ہم قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا۔ تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا۔ جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف

میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں رجم کا ذکر کیا اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں میں سے ایک حد ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب عبداللہ بن عوف اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں جو رجم کو اور شفاعت اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم میں سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے ہوں۔ مسند احمد میں ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ رجم کے حکم سے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا الخ امام ترمذیؒ بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو یعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زناکاری کریں تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو، ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں تمہاری تشفی کئے دیتا ہوں۔ ایک شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے ایسا ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا۔ یا رسول اللہؐ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ اب تو میں لکھ نہیں سکتا۔ یا اسی کی مثل یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی۔ پھر تلاوت میں منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم۔

خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی بیوی کے رجم کا حکم دیا۔ جس نے اپنے ملازم سے بدکاری کرائی تھی۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز رضی اللہ عنہ کو اور ایک غامدیہ عورت کو رجم کرایا۔ ان سب واقعات میں یہ مذکور نہیں کہ رجم سے پہلے آپ نے انہیں کوڑے بھی لگوائے ہوں۔ بلکہ ان سب صحیح اور صاف حدیثوں میں صرف رجم کا ذکر ہے۔ کسی میں کوڑوں کا بیان نہیں۔ اسی لئے جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہیئے تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے۔ جیسے کہ حضرت امیر المومنین

علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ لائی گئی جو شادی شدہ عورت تھی اور زنا کاری میں آئی تھی تو آپ نے جمعرات کے دن تو اسے کوڑے پٹوائے اور سنت رسول اللہ پر عمل کر کے سنگسار کرا دیا۔

مسند احمد سنن اربعہ اور مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری بات لے لو۔ میری بات لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا۔ کنوارا کنواری کے ساتھ زنا کرے تو سو کوڑے اور سال بھر کی جلاوطنی اور شادی شدہ، شادی شدہ کے ساتھ کرے تو رجم۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے آئمہ تفسیر و روایات کے نزدیک خود قرآن کی کیا پوزیشن ہے اور زنا کے متعلق کیا احکام ہیں؟

اس تمام پریشانیٔ فکر و نظر کے بعد آپ قرآن کریم کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں سے اس آیت کے معنی کیا ملتے ہیں۔ آیت میں یہ لکھا ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے جو فحش کا ارتکاب کرے تو اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہے اور جب یہ جرم ثابت ہو جائے تو ان کی سزا یہ ہے کہ ان کی آزادی سلب کر لی جائے۔ قرآن میں فحش کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اس کے معنی ناپسندیدہ حرکات یا بے حیائی کی باتیں ہیں۔ مثلاً سورۃ اعراف میں کفار کے متعلق ہے۔

واذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا علیها ابانا ۔ (۲۸/۷)

یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں فاحشہ کے معنی عام بے حیائی کی باتوں کے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے زنا کو بھی فحش (بے حیائی) کہا ہے۔ اس لئے کہ زنا ہے ہی بے حیائی۔ لیکن ہر فحش (بے حیائی) زنا ہی نہیں ہو سکتی۔ بے حیائی میں اور باتیں بھی تو داخل ہیں۔

سورۃ نور میں زنا کی تصریح کے ساتھ اس کی سزا کا ذکر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ سورہ نساء کی آیت میں فاحشة سے مراد زنا کے علاوہ دوسری بے حیائیاں ہیں۔ لہٰذا اس آیت کے واضح معنی یہ ہوئے کہ جو عورتیں زنا کے علاوہ اور بے حیائی کی باتیں کریں۔ تو اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہے۔ اور جب یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ ان کی آزادی روک لی جائے۔ یعنی قرآن نے جرم زنا کے لئے چار عینی شاہدوں کی ضرورت نہیں بتائی۔ عام بے حیائی کی باتوں کے لئے (جو زنا تک لے جانے کا موجب بن سکتی ہیں۔) چار گواہوں کی شرط عائد کی ہے۔

آپ فرمایئے کہ قرآنی آیت کے اس مفہوم میں کسی قسم کا کوئی اشکال یا ابہام باقی رہ جاتا ہے؟ لیکن مشکل

یہ ہے کہ جو شخص اس مفہوم کو پیش کرے گا جو خود قرآن سے متعین ہوتا ہے اور عقل کے مطابق ہے تو اس کے متعلق شور مچا دیا جائے گا کہ وہ منکرِ حدیث و منکرِ سنت رسول اللہ ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کا جرم یہ ہے کہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ وہ اس قسم کی رکیک روایات کو حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف منسوب کرے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ روایات وضعی ہیں اور حضورؐ کی طرف یونہی منسوب کر دی گئی ہیں۔ اسی کا نام "فتنہ انکارِ حدیث" ہے۔

۱۹۵۵ء

۱۴

(متفرقات)

۱- کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

ایک صاحب لاہور سے دریافت فرماتے ہیں۔

آیا انسان کی موت کا وقت پہلے سے ہی متعین ہوتا ہے؟

یعنی اس عالم کون وفساد میں ہر متنفس کا عرصۂ حیات خدائے عزّوجل کی طرف سے مقدر کر دیا گیا ہے اور اس میں کم وبیش نہیں ہو سکتا۔ یا مرگ وزیست حالات وحادثات دہر کے تابع ہوتے ہیں۔

بعض اوقات کسی مریض کے علاج میں کوتاہی، مریض کا اخفائے مرض، مناسب طبی امداد کی عدم موجودگی، غلط تشخیص وغیرہ موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان حالات میں کیا سمجھنا چاہیئے کہ متوفی کا عرصۂ حیات ہی اسی قدر تھا یا اس کا مناسب علاج ہوتا تو وہ زندہ رہ سکتا تھا۔

یا مثلاً ایک شخص سات بجے صبح تندرست وتوانا جہاز میں سوار ہوتا ہے۔ اور سات بج کر ۱۵ منٹ پر ہوائی حادثہ کی وجہ سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیا وہ جہاز پر سوار نہ ہونے سے بچ سکتا تھا؟

صلۂ رحمی، صدقات وخیرات سے عمر بڑھ سکتی ہے اور مرض الموت سے نجات مل سکتی ہے یا یہ محض توہمات ہیں؟

طلوعِ اسلام یہ سوال دراصل مسئلہ تقدیر سے متعلق ہے، اور تقدیر کا مسئلہ وہ ہے جس کے متعلق غلط تصور نے مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس کے متعلق ہر دور میں کتابوں کے انبار کے انبار لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی پیچیدگیاں حل ہونے میں نہیں

آئیں۔ محترم پرویز صاحب نے اپنی کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد میں اس[1] موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مطالعہ بہت سے اشکال کو رفع کر دیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ سوال کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے، یا یہ گھٹ بڑھ سکتی ہے، اسی اصولی مسئلہ کے متعلق ہے کہ انسان مجبور محض ہے یا اسے اختیار و ارادہ بھی حاصل ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب باب المراسلات میں ضمنی طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے ہم اس اصولی سوال کے تعلقات و تضمنات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اسی نکتہ کے متعلق کچھ صراحت کریں گے۔ کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے یا گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

سورۂ آل عمران میں ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۔ (۳/۱۴۵)

اس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے کہ:۔

"کسی شخص کے لئے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ موت کا مقرر وقت لکھا ہوا ہے"۔

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ:۔

موت کا ایک دن معیّن ہے۔

اس لئے نہ تو انسان کی احتیاط اور تدبیر اس وقت معیّن کو مؤخر کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کی بے احتیاطی قبل از وقت موت لا سکتی ہے۔ اس عقیدہ کا اثر یہ ہے کہ لوگ عام طور پر اپنی صحت سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ بیمار ہو جاتے ہیں تو اول تو علاج ہی نہیں کرتے، اور اگر علاج کرتے ہیں تو بڑی بددلی سے۔ متعدی امراض کے متعلق کبھی احتیاط نہیں برتتے اور جب بھی ان سے اس کے متعلق کہا جائے تو جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ موت اور بیماری سب پہلے سے لکھی ہوئی ہے انسان کی کوئی تدبیر اس لکھے کو مٹا نہیں سکتی۔ اگر موت آنی ہے تو ہزار تدبیروں کے باوجود آ کر رہے گی، اور اگر اس کا وقت نہیں آیا تو انسان جس قدر بداحتیاطی چاہے کرے اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ لیکن یہ تصور قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

---

[1] اس جلد کا نام "من و یزداں" ہے۔ جس میں "مشیت" کے عنوان کے تحت اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ (۱۹۶۴ء)
نیز اس موضوع پر مبسوط تصنیف کتاب التقدیر شائع ہو چکی ہے (۱۹۶۶ء)

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر شخص جو پیدا ہوا ہے اسے موت ضرور آئے گی۔ لیکن اس نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ موت کب آئے گی۔ اس لئے ہر شخص کی موت کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ مر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے قانون نے ہر چیز کے اثرات کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں۔ آگ کے سامنے ہاتھ رکھو تو وہ (سردی کے موسم میں) خوشگوار گرمی پہنچائے گی۔ لیکن اگر اس کے اندر ہاتھ ڈال دو۔ تو ہاتھ جل جائے گا۔ پانی کا ایک گلاس ہو تو وہ زندگی عطا کرے گا، لیکن جب اسی پانی میں ڈوب جاؤ تو اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ سنکھیا کی بوندیں (طبی اصولوں کے مطابق) کھاؤ تو وہ کئی امراض کو فائدہ دے گا۔ لیکن اگر اس کی ڈلی نگل جاؤ تو اس سے ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ یہ ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسی طرح موت کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ۔ (۵۶/۶۰)

ہم نے تمہارے درمیان موت کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

یہ پیمانے ایسے قوانین کے مطابق متعین ہوئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقامات پر کتاب مؤجل کہا ہے۔ کتاب کے معنی قانون ہیں اور مؤجل کے معنی مقرر کردہ۔ یعنی یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے کہ فلاں چیز سے ہلاکت ہوگی اور فلاں سے زندگی ملے گی۔ اس کے بعد قرآن نے کہہ دیا کہ یاد رکھو۔

لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲/۱۹۵)

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔[1]

اگر موت کا وقت پہلے ہی سے مقرر ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہی وہ حکم ہے جس کی رو سے خودکشی جرم قرار پاجاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خودکشی کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں انسان اپنا خاتمہ چند لمحوں میں کر لیتا ہے۔ لیکن اس کی دوسری شکل وہ بھی ہے جس میں انسان آہستہ آہستہ خودکشی کرتا ہے۔ مثلاً اگر تپ دق کا مریض اپنی صحت اور بیماری کے علاج سے لاپرواہی برتتا ہے تو وہ تدریجی خودکشی کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

قرآن علم الطب کی کتاب نہیں کہ وہ انسانی امراض اور ان کے علاج سے بحث کرے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ایسے اشارات دے دیئے ہیں جن سے توجہ اس طرف منعطف ہو جاتی ہے کہ ایسے کاموں سے اجتناب برتنا چاہیئے

---

[1] اگرچہ یہ آیت اجتماعی موت اور حیات کے قانون سے بحث کرتی ہے لیکن انفرادی موت اور حیات بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔

جن سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب امراض پیدا ہوں تو ایسی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں جن سے شفا ملتی ہے مثلاً اس نے ایک عام اصول بیان کیا ہے کہ :۔

کلوا واشربوا ولا تسرفوا (۷/۳۱)

کھاؤ پیو ، لیکن زیادتی نہ کرو۔

یہ صحت کا بنیادی اصول ہے۔ دوسری طرف مثلاً شہد سے متعلق کہا ہے کہ :۔

فیہ شفاء للناس ۱۶/۶۹

اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر موت اور مرض کو ایک مقررہ وقت پر آنا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تو پرہیز اور علاج سے متعلق ان ہدایات کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ مرض اور موت کے لئے قانون مقرر ہیں یہ چیزیں ان ہی قوانین کے مطابق جاتی ہیں۔ لہٰذا ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے۔ سورۂ فاطر میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا کہ :۔

وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ۔ (۳۵/۱۱)

نہ کسی کی عمر بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قانون کے مطابق عمر لمبی ہوتی ہے اور قانون ہی کے مطابق کم ہوتی ہے۔ اور قانون یہ ہے کہ بے احتیاطی سے عمر کم ہوتی ہے۔ اور احتیاط سے عمر بڑھ جاتی ہے۔

سطورِ بالا میں ہم نے "عمر گھٹنے" اور عمر بڑھنے" کے الفاظ رواج عامہ کے مطابق استعمال کئے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے گھٹنے اور بڑھنے کے الفاظ صرف اس وقت استعمال کئے جا سکتے ہیں جب پہلے عمر کو متعین شدہ فرض کر لیا جائے۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے عمر کے متعین ہونے کا تصور ہی صحیح نہیں۔ جسم کی مشینری خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلتی ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی سے رک جاتی ہے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانون کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے۔ اسی قانون کی خلاف ورزی سے یہ مشین چلنے سے رک جاتی ہے۔ کبھی بتدریج اور کبھی یک لخت۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ جی چاہے تو اس قانون کی خلاف ورزی سے اس چلتی گاڑی کو روک دے اور جی چاہے تو ان قوانین کے اتباع سے عمر طبعی تک پہنچ جائے۔ یاد رکھئے موت کا وقت مقرر نہیں قانون مقرر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صدقات و خیرات سے بیماری رفع ہو سکتی ہے اور موت ٹل سکتی ہے یا نہیں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ جسم کی مشینری خدا کے طبعی قوانین کے مطابق چلتی ہے۔ اس پر غیر طبعی افعال کا براہ راست اثر نہیں ہوتا۔ البتہ صدقہ و خیرات وغیرہ، غیر طبعی افعال کا اثر مریض پر نفسیاتی طور پر ہوتا ہے اور نفسیاتی اثر (PSYCHOLOGICAL) سے مریض کی قوتِ مدافعت بڑھ جاتی ہے جس سے بیماری کے رفع ہونے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نفسیاتی اثر عقیدہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر عقیدہ نہ رہے تو پھر اس کا اثر بھی نہیں رہتا۔ ہمیں قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہ عقیدہ جھاڑ پھونک گنڈے تعویذ کے عقائد کے قبیل سے ہے۔ جو انسان کے دورِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ قرآن ان توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے۔ وہ عقل و بصیرت اور قوانین و ضوابط سے بات کرتا ہے نفسیاتی فریب کے الجھاؤ میں نہیں الجھتا۔

۱۹۵۳ء

۲۔ امام مہدی کا مذہب

ایک صاحب کراچی سے دریافت کرتے ہیں کہ :۔

شیعہ حضرات بھی امام مہدی کی آمد کے منتظر ہیں اور سنی بھی۔

سوال یہ ہے کہ امام مہدی سنی ہوں گے یا شیعہ؟

طلوعِ اسلام آپ کو یہ کہانی ذرا پیچھے سے شروع کرنی چاہیئے تھی۔ صرف شیعہ اور سنی ہی نہیں، دنیا کے تمام اہلِ مذاہب ایک آنے والے کے منتظر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا عقیدہ ہے کہ یہ آنے والا آخری زمانہ (قیامت کے قریب) آئے گا اور ان کے مذہب کو باقی تمام مذاہب پر غالب کر کے ان کے تسلط کو قائم کر دے گا۔

ہندو کلنکی اوتار کے منتظر ہیں جو ان کے نزدیک دیدک دھرم کو غالب کرے گا۔ بدھ، مہاتما بدھ کے متیا اوتار کے منتظر ہیں جو بدھ مت کو تمام مذاہب پر غالب کرے گا۔ جینی آخری مہادیر کے منتظر ہیں۔ جس کے ہاتھ جین مت کو غلبہ ہوگا۔ مجوسی میترا کے آنے کے منتظر ہیں جو زرتشتی مذہب کے غلبہ و تسلط کا حامل ہوگا۔ یہودی ایک آخری اسرائیلی نبی کے منتظر ہیں۔ جو بنی اسرائیل کو تمام اقوام پر غالب کر دے گا۔ عیسائی حضرت مسیحؑ کی آمد کے منتظر ہیں۔ جن سے ساری

دنیا میں عیسائیت کا تسلط ہو جائے گا۔ اسی طرح مسلمان بھی ایک مہدی کے منتظر ہیں جن سے اسلام کا دین تمام ادیان پر غالب آجائے گا۔

اب سوچئے کہ یہ سب آنے والے قیامت کے قریب، یعنی ایک ہی زمانہ میں دنیا میں آئیں گے اور ہر ایک کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ دوسرے مذاہب کو مغلوب کرے اور اپنے مذاہب کو غالب۔ ذرا تصوّر میں لایئے کہ اس وقت دنیا کا نقشہ کیا ہوگا؟ کیا ان کے ہاتھوں قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا نہیں ہو جائے گی؟

اس کے بعد مسلمانوں کو لیجئے۔ شیعہ حضرات اس انتظار میں ہیں کہ امام آخرالزماں تشریف لائیں گے اور اپنے شیعوں کو تمام مسلمانوں پر غالب کریں گے اور ان کی حکومت قائم کریں گے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ سنیوں کے تینوں خلیفوں (حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ) کو پھر دنیا میں بلائیں گے اور انہیں قتل کریں گے (اسے رجعت کا عقیدہ کہتے ہیں) دوسری طرف امام آخرالزماں کی آمد کے سُنّی بھی منتظر ہیں۔ وہ لامحالہ سنیوں کے اسلام ہی کو غالب کرنے کے لئے آئیں گے۔ لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ سنیوں کے کس فرقہ کے اسلام کو غالب کریں گے؟ اہلِ فقہ کے یا اہلِ حدیث کے۔ اور پھر فقہ والوں میں سے حنفیوں کے یا شافعیوں کے، حنبلیوں کے یا مالکیوں کے؟

جہاں تک حضرت عیسٰے علیہ السلام کا تعلق ہے ان کی بابت تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت خضرؑ سے بحالت کشف معلوم کر لیا تھا کہ وہ حنفی المذہب ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے مکتوبات کی جلد سوم میں لکھتے ہیں کہ حضرت خضرؑ نے انہیں بتایا کہ:۔

> اگر بالفرض درایں امت پیغمبرے مبعوث ی باشد موافق فقہ حنفی عمل ی کرد۔ دریں وقت حقیقتِ سخن حضرت خواجہ محمد پارسا قدس سرہ معلوم شد کہ حضرت عیسٰے بعد از نزول بمذہب امام ابوحنیفہ عمل خواہد کرد۔

اور چونکہ یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام امام مہدی کی متابعت کریں گے اس لئے ظاہر ہے کہ امام مہدی کا مذہب بھی حنفی ہوگا۔ لیکن دوسری طرف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فتوحاتِ مکیہ میں لکھتے ہیں کہ امام مہدی ظاہر ہوں گے تو فقہاء خصوصیت سے ان کی مخالفت کریں گے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ابن عربی کے خیال کے مطابق امام مہدی اہلِ طریقت میں سے ہوں گے۔

دنیا کے دیگر اہلِ مذاہب آنے والے کے متعلق جو عقیدہ جی میں آئے رکھیں۔ لیکن جہاں تک قرآن کریم کا تعلق

ہے، اس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی آنے والے کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ امام مہدی کا۔ نہ حضرت عیسےٰ کا۔

۱۹۵۴ء

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کی واپسی

دہران سے ایک صاحب کہتے ہیں کہ قرآن میں حضرت عیسےٰؑ کے متعلق مَہْدًا کے ساتھ کَہْلًا آیا ہے۔ (جس کے معنی ادھیڑ عمر کے ہیں) تو بعض لوگ اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتر کر اپنی عمر کا باقی ماندہ حصہ یہاں گذاریں گے اور پھر وفات پائیں گے۔ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے:۔

طلوع اسلام قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمانوں پر چلے جانے اور دوبارہ آنے کا کوئی ذکر نہیں حضرت عیسےٰؑ یہودیوں کی سازشانہ تدبیروں سے بچ کر کسی اور طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے عمر کا باقی حصہ گزارا۔ یعنی وہ وہاں کَہْلًا کی عمر تک پہنچ گئے تھے۔ کسی آنے والے کا تصور۔ وہ کوئی پرانا نبی ہو یا نیا مسیح ہو یا مہدی۔ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف اور ختم نبوت کے نقیض ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور قرآن آخری کتاب ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد اُمتِ مسلمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا گیا ہے اور قرآنی نظام کو عملاً نافذ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے مسلمانوں کی توجہ کو ملت اور نظام کے تصور سے ہٹا کر افراد کی طرف منتقل کر دینا عجم کی انہی سازشوں میں سے ایک سازش تھی۔ جس کی رو سے انہوں نے اس اُمت کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر دوسری راہوں پہ ڈال دیا۔ ان کا دوبارہ صراطِ مستقیم پر آنا اپنے ہاں قرآنی نظام کو رائج کرنے سے ہوگا نہ کہ کسی مرحوم آنے والے کے ہاتھوں۔ آنے والوں کا دور رسول اللہؐ پر ختم ہو گیا۔

۱۹۵۵ء

۴۔ بہائیت اور مرزائیت

اشاعت سابقہ کے باب المرسلات میں ہم نے بہائیت اور مرزائیت کے متعلق ضمنی طور پہ کچھ عرض کیا تھا۔

لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے بحث تشنۂ تکمیل رہ گئی تھی۔ آپ غور کریں گے۔ تو یہ حقیقت نمایاں طور پر آپ کے سامنے آجائے گی کہ بہائیت اور مرزائیت قسم کی تحریکیں دراصل مایوسی کی پیدا کردہ ہیں اور ایک آنے والے کا عقیدہ (جسے مسلمانوں نے مجوسیوں سے مستعار لیا ہے) انہیں ہوا دینے کا موجب ہے یوں تو مسلمانوں کا زوال ایک عرصہ سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن گذشتہ (انیسویں) صدی میں مسلمانوں کے تمام ممالک اس قدر مصائب کا شکار ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے نجات کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ ان پیہم مصائب و نوائب سے چاروں طرف مایوسی ہی مایوسی پھیل رہی تھی اس مایوسی سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام بحیثیت ایک زندہ مذہب کے ختم ہو چکا ہے اب اس میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب مسلمانوں کو ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے جس کے لئے ایک نئے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ (یعنی وجہ مایوسی تھی مسلمانوں کی حالت اور نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ خود اسلام ہی بانجھ ہو چکا ہے) اس کی وجہ سے ایران میں مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور پنجاب میں مرزا غلام احمد صاحب نے ایک نئے ظہور کا دعویٰ کر دیا۔ دنیا میں ہر دعویٰ کے لئے دلائل مل جاتے ہیں۔ ان حضرات نے تو پھر بھی نبوت اور مہدویت وغیرہ کے دعاوی کئے تھے۔ لوگ خدا بننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس دعوے میں بہاء اللہ صاحب کا مسلک مرزا غلام احمد صاحب سے زیادہ صاف اور "دیانتدارانہ" تھا۔ بہاء اللہ صاحب نے یہ کہا کہ ہر کتاب ایک متعین میعاد تک کے لئے ہوتی ہے۔ جب اس کی میعاد ختم ہو جاتی ہے تو وہ ریلوے کے پرانے ٹائم ٹیبل کی طرح منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نئی کتاب لے لیتی ہے۔ قرآن کا دور (معاذ اللہ) ختم ہو گیا ہے۔ اب اس کی جگہ وہ کتاب آگئی ہے جو مجھے ملی ہے۔ مرزا صاحب نے بھی دعویٰ تو ایسا ہی کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ میں نبی تو ہوں، لیکن کوئی نئی کتاب نہیں لایا۔ حالانکہ "نبی بلا کتاب" کا تصور ہی بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ بہاء اللہ صاحب کا دعویٰ مرزا صاحب کی نسبت زیادہ "دیانتدارانہ" تھا۔ بہاء اللہ صاحب نے قرآن کو منسوخ کر کے جو نیا دین پیش کیا اس کی اصولی تعلیم یہ ہے۔

(۱) حق کی آزادانہ تحقیق۔ (۲) وحدت انسانیہ (۳) محبت اور اخوت۔

(۴) تمام مذاہب اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں[1] (۵) مذہب اور سائنس کے اعتبار سے۔

---

[1] اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوسی کا شکار مولانا ابوالکلام بھی تھے جنہوں نے تھک کر کہہ دیا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اس لئے کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فضیلت نہیں۔ ان کی یہی مایوسی تھی جس کی وجہ سے وہ مبتدیوں سے جا ملے۔

(۶) عالم گیر امن ۔ (۷) بین الاقوامی زبان ۔ (۸) جبری تعلیم بالخصوص عورتوں کے لئے ۔
(۹) مرد اور عورت کی مساوات ۔ (۱۰) سب کے لئے کام ۔ (۱۱) دولت اور غربت کی افراط کا مٹانا ۔
(۱۲) خدا کی توحید (بہ حوالہ "بہائی" مذہب اور اسلام" مصنفہ ایس ایچ قریشی) اور مرزا صاحب کی نبوت نے جو کچھ پیش کیا، اس کا مخلص تھا۔ جہاد کی تنسیخ اور وفات مسیح ۔

مسلمان برسوں سے مرزا صاحب (اور ان کی اُمت) کے ساتھ مناظرے کرتے چلے آ رہے ہیں جن میں ان کے دلائل کا رد پیش کیا جاتا ہے۔ اب شاید یہ سلسلہ بہائیت کے ساتھ شروع ہوگا۔ لیکن اصل سوال ان کے دلائل کا نہیں ۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا قرآن اپنی راہ نمائی میں عاجز آچکا ہے یا اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کی ہمیشہ کے لئے راہ نمائی کر سکے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ قرآن سے اب مزید راہ نمائی نہیں مل سکتی تو اسے چاہیئے جس جگہ سے نئی راہنمائی مل سکتی ہو وہاں چلا جائے البتہ یہ سمجھ لے کہ اس کے بعد اُسکا قرآن اور قرآن والوں کے ساتھ کوئی واسطہ باقی نہیں رہے گا ۔ لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہماری راہنمائی کے لئے قرآن کافی ہے اس کے لئے کسی نئے ظہور کے کسی دعوے اور اس دعوے کی کسی دلیل پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ۔ بہائیوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ فنائے عالم کا عقیدہ غلط ہے۔ عالم اسی طرح سے رہے گا۔ لہٰذا قیامت کے معنی قوموں کا انقلاب ہے جو ایک نئے ظہور کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے ۔ فرض کیجئے کہ فنائے عالم کا عقیدہ غلط ہے اور یہ بھی فرض کر لیجئے کہ قیامت سے مراد ایک عظیم الشان دنیاوی انقلاب ہے ۔ تو جو شخص قرآن کی دوامی راہنمائی کا قائل ہے ۔ وہ کہدے گا کہ یہ عظیم الشان انقلاب قرآن ہی کے ذریعے رونما ہوگا ۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک مدت معین ہوتی ہے ۔ مسلمانوں کی قوم کی مدت ختم ہوگئی ہے ۔ اس لئے اب ایک نئی قوم اٹھے گی ۔ فرض کیجئے کہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جو قوم تاریخ میں مسلمان کے نام سے متعارف چلی آ رہی ہے ۔ اس کی مدت ختم ہو چکی ہے ۔ تو جو شخص قرآن کی ابدیت کا قائل ہے وہ کہے گا کہ اس کے بعد ایک اور قوم (جو ابھی تک مسلمان نہیں) اٹھے گی، اور اسی قرآن سے ایک نیا انقلاب پیدا کر دے گی ۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ[۱]

محفل ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآں را نوا ہا باقی است !
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر

آسماں دارد ہزاروں زخمہ در
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی
از زماں و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جداست
احتیاجِ ردم و شام اورا کجاست
حق اگر از پیش ما بردار دش!
پیشِ قومے دیگرے بگزار دش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بلرزد در بدن!
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

ہمارا چونکہ ایمان ہے (اور علی وجہ البصیرت ایمان) کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ تک کے لئے کامل راہ نمائی دینے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے ہم کسی بہائی اور کسی مرزائی کی دلیل پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہاں یہ مسائل کہ عالم فنا آمادہ ہے یا نہیں قیامت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اجل امت کا قرآنی مطلب کیا ہے۔ علمی مباحث ہیں جن پر عند الضرورت گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں نہیں کہ ان مسائل کا کوئی تعلق کسی نئے ظہور کی آمد سے ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد کسی اور ظہور کا تصور بھی ہمارے نزدیک توہین رسالت ہے جسے رسالتِ محمدیہ پر ایمان کے بعد قطعاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ (۱۹۵۵ء)

۵۔ پاکستان میں پیری مریدی

جہلم سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ پاکستان میں پیری مریدی کا بہت زور ہو گیا ہے۔ جہلا میں ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ میں بھی۔ اس کی وجہ کیا ہے اور علاج کیا؟

پیری مریدی کی نفسیات پر غور کیا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ پاکستان میں اس کا زور کیوں ہو گیا ہے کہ جو قوم قانون کی پابند ہو اسے غیر قانونی سہارے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ "قانون" میں قوانینِ فطرت۔ وحی کے متعین کردہ قوانینِ انسانیت اور مملکت کے معاشرتی قوانین سب آجاتے ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ جو شخص جسم سے متعلق طبعی قوانین پر یقین رکھتا ہے وہ اگر بیمار ہوتا ہے تو حکیم یا ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ "روحانی عاملوں" کی طرف وہی جاتا ہے جسے ان قوانین کا علم یا ان پر یقین نہ ہو۔

۲۔ دین کا مدار، قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ یعنی ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے اور کوئی قوت اس نتیجے کو بدل نہیں سکتی۔ جو شخص دین کی اس بنیادی حقیقت پر یقین رکھتا ہے وہ کبھی ان آسروں کی تلاش نہیں کرتا جو "قانونِ مکافات" کے خلاف نتائج برآمد کر دینے کے مدعی ہوں۔ وہ عمل کرتا ہے اور اس کے نتیجے کا منتظر رہتا ہے۔

۳۔ جس معاشرہ کا نظم و نسق قانون کے مطابق طے پاتا ہو اس میں جو شخص قانون کا اتباع کرتا ہے اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں رہتا۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے۔ غیر قانونی سہاروں کی کسی کو ضرورت نہیں پڑتی۔ خواہ وہ رشوت یا سفارش کی شکل میں ہوں اور خواہ پیروں فقیروں کی دعا یا نذر نیاز کی صورت میں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں گذشتہ دس سال تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا ہے۔ اس لئے یہاں کے رہنے والے غیر قانونی سہاروں کے عادی ہو گئے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کوئی کاروبار شروع کیا تو اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اسے قاعدے اور قانون کے مطابق کیا کرنا اور کیا کمانا چاہیئے۔ اس نے معلوم کرنا یہ شروع کیا کہ کون کون سے غیر قانونی ذرائع اختیار کئے جائیں کسے رشوت دی جائے اور کس تک سفارش پہنچائی جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوٹ مچائی جا سکے۔ اس کے لئے اگر ہزار روپیہ رشوت کے دیئے تو دس روپے پیر صاحب کی بھی نذر کر دیئے۔ تاکہ وہ بھی اس کی اس مہم میں اس کی مدد کریں۔ پھر اگر پکڑے گئے تو جہاں دو ہزار روپیہ پولیس یا عدالت تک پہنچایا، سو روپیہ "روحانی آسروں" پر بھی خرچ کر دیا۔ تاکہ ان کی مدد سے اس بلا سے نجات مل جائے۔

یا اگر کوئی شخص (خلافِ قاعدہ) ملازمت میں ترقی کرنا چاہتا تو ایک طرف وہ افسر بالا تک سفارشیں اور رشوت پہنچاتا، اور دوسری طرف نذر نیاز مانتا تاکہ ان ذرائع سے کامیابی ہو جائے۔

مختصراً یہ کہ جب انسان خلافِ قانون روشِ زندگی اختیار کرلے تو اپنے آپ پر اعتماد (SELF CONFIDENCE) باقی نہیں رہتا۔ اور جب خود اعتمادی نہ رہے تو پھر روحانی سہاروں کی تلاش شروع ہوجاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ[1]

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

قانون کا پابند اپنی قوتِ بازو اور قانون کی محکمیت پر بھروسہ رکھتا ہے اسے اس قسم کے نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) سہاروں۔ (یا بالفاظِ دیگر فریبِ نفس) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن نے جہاں میسرہ سے منع فرمایا ہے تو اس کی لِم بھی یہی ہے۔ میسرہ کے عام معنی "جوا" کیے جاتے ہیں۔ درحقیقت اس سے مراد ایسی دولت ہے جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ یُسر بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آسان کام کے لئے کہتے ہیں کہ "یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔ جو دولت قاعدے اور قانون کے خلاف، محنت اور مشقت کے بغیر نہایت آسانی سے ہاتھ آجائے وہ میسرہ میں شامل ہے۔ گذشتہ دس سال، ہماری قوم کا بیشتر طبقہ اسی طرح دولت حاصل کرنے میں مصروف رہا اور اس کا اس طرح عادی ہوگیا کہ قاعدے اور قانون کے مطابق، محنت و مشقت سے روٹی کمانا اس کے لئے مصیبت بن گیا۔ اس قسم کی (میسرہ کی) کمائی کے لئے انسان نفسیاتی سہاروں کا محتاج ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کے بعد، دل میں ایک خلش بھی پیدا ہوتی ہے۔ (اسے سوسائٹی کا ڈر کہئے یا بچپن سے دل میں پڑے ہوئے خیالات کا نتیجہ۔ بہرحال ایک خلش ضرور پیدا ہوتی ہے اگرچہ رفتہ رفتہ اس کا احساس بھی مٹ جاتا ہے) اس خلش کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے بھی انسان کو فریبِ نفس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ مقصد پیروں فقیروں کی دعاؤں اور منتوں اور نیازوں سے حاصل ہوجاتا ہے۔ پیر، ہر مصیبت کے وقت کام آنے اور آخرت میں نجات دلانے کا ضامن ہوتا ہے۔ جو اس کا دامن تھام لے وہ ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی نظروں میں نیکوکار اور بدکار میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ بلکہ جو زیادہ گنہگار (یعنی مجرم) اور بدکردار ہو وہ اس کی نگاہوں میں زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ بدکرداروں کے طبقے عام طور پر پیر پرست ہوتے ہیں) اس کا تصوّر ان لوگوں کو نفسیاتی کش مکش سے نجات دلاکر "اطمینانِ قلب" کا موجب بن جاتا ہے۔

یہ ہیں، مختصراً وہ وجوہات جن کی بنا پر پاکستان میں پیر پرستی کا زیادہ زور ہوگیا۔ اب رہا اس کا علاج؟ سو مرض کی تشخیص کے بعد، علاج بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی

(۱) جہاں تک قوانین طبعی سے ناواقفیت (جہالت) کی بناء پر پیر پرستی اور قبر پرستی کا تعلق ہے، اس کا علاج سائنس کی تعلیم کا عام کرنا ہے۔ اس سے توہم پرستیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(۲) جہاں تک مذہب کے معاملہ میں پیر پرستی کا تعلق ہے، اس کا علاج قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرنا ہے۔ اس سے خدا کا محکم اور اٹل قانون مکافات اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ انسان نفسیاتی کش مکش میں مبتلا ہی نہیں ہوتا۔ قرآن اپنے آپ کو شفاءٌ لما فی الصدور کہتا ہے۔ (۱۰/۵۷)

(۳) جہاں تک دنیاوی معاملات کے لئے "روحانی سہاروں" کا تعلق ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرہ میں قانون کا سکہ اس طرح سے رواں ہو کہ اس کی اطاعت کرنے والے کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہ رہے۔ اور جو اس کی خلاف ورزی کرے، اسے کوئی قوت پاداش عمل سے بچا نہ سکے۔ نیز، معاشرہ میں خدا کا متعین کردہ نظامِ ربوبیّت اس انداز سے قائم کر دیا جائے کہ مملکت کا کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہ ہونے پائے۔ نظامِ خداوندی کی یہ وہ زندہ کرامات ہیں جنہیں آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد انسان کو کسی وہمی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

وہ تھی مرض کی تشخیص اور یہ ہے اس کا علاج۔ (۱۹۵۹ء)

۶۔ متفرق سوالات

گجرات سے ایک صاحب کا حسبِ ذیل خط موصول ہوا ہے۔

چند موٹے موٹے اختلافی مسائل کے متعلق جناب کی رائے سے مستفید ہونے کی آج کل کے زمانہ کے حالات میں ازحد ضرورت ہے۔ اس لئے استدعا ہے کہ ان کے سلسلہ میں قرآن مجید کی روشنی میں ان کے جوابات اپنے مؤقر رسالہ میں دے کر مشکور فرمادیں۔ تاکہ جملہ مسلمانانِ پاکستان ان سے فیضیاب ہو سکیں۔ چونکہ جناب کا قرآن مجید پر کامل عبور ہے۔ اس لئے یہ تکلیف دی ہے۔

سوال۔ (۱) سود کا لینا، دینا۔ ازروئے قرآنِ مجید حرام مطلق ہے۔ اس کی کوئی تاویل قرآن مجید میں نہیں ہے کہ فلاں قسم کا جائز ہے۔ موجودہ زمانہ میں کاروبار تجارت کا دارومدار سود پر ہے۔۔۔۔۔۔ اس بارہ

میں آپ کی کیا رائے ہے ۔

(۲) زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ٹیکس جو حکومت لوگوں سے لیتی ہے ۔ان کے جواز یا عدم جواز کے بارہ میں جناب کی کیا رائے ہے ۔کیا دیگر مروّجہ ٹیکسوں کی موجودگی میں زکوٰۃ کو نظر انداز کر دینا چاہیئے یا زکوٰۃ کو بحال رکھ کر ان کو نظر انداز کرنا مناسب ہوگا ۔

(۳) وقف علی الاولاد کا مروّجہ قانون قرآن مجید کی کس آیت یا حکم کے ماتحت ہے ۔اگر یہ قانون غیر از قرآن ہے ،تو یہ کیوں منسوخ نہ ہونا چاہیئے ۔جس کی رو سے جائیدادیں قیامت تک ایک خاص گروہ کی تحویل میں دی جاتی ہیں ۔جن کو ان کی فروخت کی بھی اجازت نہیں اور آمدنی بکثرت حصہ داروں میں بٹ کر آہستہ آہستہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے ۔

(۴) حق شفع کا قانون قرآن مجید کے کس حکم کے ماتحت جاری ہے ۔جس کی وجہ سے مالک جائیداد اپنی جائیداد کی پوری قیمت وصول نہیں کر سکتا ۔بلکہ شفع کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے ۔یا سودا کرتے وقت ناجائز طور پر بخوف حق شفع اس کی قیمت حد سے زیادہ فرضی طور پر لکھواتا ہے ۔کیا اس قانون کی وجہ سے مالک جائیداد کے آزادانہ حق فروخت میں دست اندازی آرزوئے قرآن مجید جائز ہے اور اس کا مفاد کیا ہے ۔

(۵) قانون وراثت میں ایک مالک کو اپنی پوری جائیداد کے متعلق انصاف سے اپنے لواحقین جس میں ماں باپ بھی شریک ہیں ۔پورے مال کے متعلق وصیت کرنے کا کیوں حق حاصل نہیں بلکہ کسی ایسے شخص کو جس نے اس کی خدمت کی ہو ۔وصیت میں کیوں شامل نہیں کر سکتا ۔بجائے ان رشتہ داروں یا تعلق داروں کے جنہوں نے عمر بھر اس کو چین نہ لینے دیا ہو ۔مگر اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد کے وارث بن جاتے ہوں ۔وصیت کا حق از روئے قرآن مجید سب سے اوّل مالک کو حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیئے ۔اور جب اس کی وصیت پوری ہو چکے اور جو کچھ باقی بچ رہے ،اس کی تقسیم وارثان میں مطابق تجویز و حکم قرآن ہونی مناسب ہے ۔جناب کی اس بارہ میں کیا رائے ہے ؟

(۶) حلالہ کا جو قانون قرآن مجید میں ہے ۔اس سے پایا جاتا ہے کہ ایک خاوند اگر اپنی بیوی کو بدچلنی کے شک پر طلاق دیدے ۔تو وہ اگر اپنے آشنا سے جس کی وجہ سے اس کے پہلے خاوند نے اسے طلاق دی ہے نکاح کر سکتی ہے ۔اور اس شک کو یقین کا درجہ دے کر مطلقہ ہو جانے پر پھر پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے ۔کیا ایسا ہونا اخلاقاً درست اور روا ہے ۔رائے عالی سے مستفید فرماویں کوئی تاویل خلاف قرآن نہ پیش

کی جاوے ؟

(۷) لڑکیوں کو لڑکوں سے وراثت میں نصف حصہ کس بنا پر تجویز کیا گیا ہے ۔ درآنحالیکہ لڑکیاں اور لڑکے پیدائش اور پرورش کے لحاظ سے ماں باپ کی نظر اور سلوک میں یکساں درجہ رکھتے ہیں ؟

(۸) جب لڑکیاں بھی اپنے والدین کی جائیداد میں حق دار قرار دی جاویں تو ان کے نکاح اور شادی کے وقت ان کو جہیز کس بنا پر دینا لازمی قرار دیا گیا ہے ۔ نیز جہیز کی کوئی حد کیوں مقرر نہیں کی گئی ہے ۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں بہت خرابی پیدا ہو رہی ہے ۔ بلکہ جہیز میں کمی اکثر حالات میں مانع نکاح ثابت ہوئی ۔ اس بارہ میں جناب کی کیا رائے ہے ؟

(۹) نیک مسلمان کو اپنی جائز منکوحہ بیوی کے علاوہ ایک لونڈی بطور زوجہ بلا نکاح رکھنے کی اجازت ہے ۔ اس کا کیا مفاد ہے ۔ واضح فرما کر مشکور فرماویں ؟

(۱۰) ارزوئے قرآن مجید جب مسلمان مرد باوجود لاکھ کوششوں کے دو بیویوں کے درمیان انصاف اور عدل نہیں کر سکتے تو پھر ان کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی کیوں ایک ناممکن امر کی موجودگی میں اجازت دی گئی ہے اور اس فعل میں کیا فائدہ مضمر ہے ۔ واضح فرما کر مشکور کریں ؟

(۱۱) جب نبی اکرمؐ نے گیارہ بیویاں اپنے نکاح میں رکھیں تو عام مسلمانوں کو فقط چار کی ہی اجازت دی گئی ۔ ملا کہتا ہے کہ چار کی تعداد مقرر ہونے سے پہلے پیغمبرؐ نے ایسا کیا تھا ۔ اور بعد میں چار کی حد مقرر ہوئی ۔ اس کا ثبوت کہاں ہے کہ وہ حکم پہلے نازل ہوا اور چار والا بعد میں ۔ مہربانی فرما کر اس پر مفصل روشنی ڈالیں ؟

(۱۲) جب منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے کسی ایک مرد کو حق نکاح حاصل ہے ۔ تو منہ بولی ماؤں سے کیوں ان کا حق نکاح باقی نہیں رکھا گیا ۔ جیسا کہ نبیؐ کی بیویوںؓ کے بارہ میں ہے ۔ حالانکہ نبیؐ کی بیویاںؓ بھی مسلمانوں کی حقیقی مائیں قرار دی گئی ہیں ۔ اصلی مائیں تو ان کی بھی وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنم دیا ؟

(۱۳) قرآن مجید میں متعدد بار آتا ہے کہ اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ میں کتب الٰہی ہیں ، وہ ان کی تصدیق کرتا ہے ۔ درآنحالیکہ ان کتب کو قرآن مجید محرف قرار دیتا ہے ۔ اور ان کے احکام کو ناقابل اتباع قرار دیتا ہے ۔ پھر اس کی تصدیق کا کیا حاصل ہے ۔

(۱۴) حج کی تقریب پر جو لاکھوں جانور بطور قربانی ذبح کر کے ، ان کا گوشت زمین میں دفن کیا جاتا ہے ۔ کیا یہ صریح طور پر اسراف کے تحت نہیں ۔ اور قرآن مجید میں آتا ہے کہ خدا کو ان کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا ۔ بلکہ تقویٰ

یعنی ان جانوروں کی قیمت جو ادا کی جاتی ہے وہ بمنزلہ تقویٰ کے ہے۔ کیونکہ درحقیقت جانوروں کے قربان ہونے کا درد تو ان کو ہی ہوتا ہے جو ذبح ہو جاتے ہیں۔ قربانی کرنے والوں کو تو جو روپیہ وہ خرچ کرتے ہیں اس کا ہی رنج یا تکلیف ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور خدا ان کو دوست نہیں رکھتا۔ ہر ایک حاجی جو حج کر کے آتا ہے وہ ایمانداری سے اس امر کی گواہی دے سکتا ہے کہ ان جانوروں کا گوشت ضائع جاتا ہے اور کم از کم انسانوں کے کام آتا ہے اس کے علاوہ دیگر ممالک میں مسلمانوں کے اپنے شہروں اور گاؤں میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اس تقریب پر بلا ضرورت جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے گوشت مہنگا ہی نہیں ہو رہا ہے بلکہ کھانے والوں کے لیے بلحاظ اصول حفظانِ صحت نہایت برا اثر پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی اس فضول خرچی کو نہ صرف جاری ہی رکھا جا رہا ہے۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ اس قسم کی قربانی کی بجائے اس کی قیمت قربانی کرنے والوں سے لے کر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی جاوے۔ اس بارہ میں اپنی رائے عالی سے مستفید فرماویں۔

مذکورہ بالا سوالات کے جواب موصول ہو جانے پر باقی ماندہ دیگر مسائل پر جو اختلاف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مزید گذارش کی جاوے گی۔

والسلام

ان سوالات میں سے بیشتر کے متعلق اس سے پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ ان کا مختصر جواب درج ذیل ہے۔

جواب (۱)

قرآنِ کریم کی رُو سے، جو کچھ محنت سے کمایا جائے وہ جائز ہے اور جو محض سرمایہ لگا کر زائد وصول کیا جائے، وہ ناجائز ہے۔ اس اعتبار سے صرف سود ہی ناجائز نہیں قرار پاتا۔ (خواہ بینک کا ہو یا کسی اور قسم کا) بلکہ اور بھی بہت کچھ ناجائز قرار پا جاتا ہے، جسے آج کل عام طور پر جائز سمجھا جاتا ہے۔ اور جس کے متعلق دریافت کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے، اس لئے سوال اس کی بعض شقوں کے متعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ قرآن کے معاشی نظام میں، زائد از ضرورت دولت کسی کے پاس نہیں رہتی، اس لئے سرمایہ پر کچھ وصول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری طرف اس نظام میں کسی کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہتی۔

اس لئے کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج اور دست نگر نہیں ہوتا۔ اس نظام میں بینکوں کا کاروبار بھی آج سے مختلف ہوگا اور تجارت کا منہج بھی مختلف۔

جواب (۲) اسلامی حکومت، نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے جو کچھ افرادِ مملکت سے لیتی ہے اور اسے نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے صرف کرتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اسلامی حکومت "زکوٰۃ" دیتی ہے (۲۲/۴۱) یعنی نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان مہیا پہنچاتی ہے۔ جب اسلامی حکومت نہ ہو، تو زکوٰۃ کی حیثیت محض خیرات کی رہ جاتی ہے۔ اور حکومت کے ٹیکس اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کے نصاب یا شرح وغیرہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ قرآن کی رُو سے تو مسلمان کی ساری فاضلہ دولت "زکوٰۃ" کے لئے وقف ہونی چاہیئے۔ (۲/۲۱۹)

جواب (۳) وقف علی الاولاد تو ایک طرف، قرآنِ کریم کی رُو سے سرے سے وقف ہی کی کوئی حیثیت نہیں۔ وقف میں مرنے والا، قیامت تک زندہ انسانوں کو، اپنے منشاء اور حکم کا پابند کر دیتا ہے، اور چونکہ (مرنے کے بعد) اسے خود اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی بھی قدرت نہیں رہتی، اس لئے حالات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، وقف کا فیصلہ اٹل اور ناقابلِ تغیر و تبدل رہتا ہے۔ قرآن ایسی پوزیشن کو کب روا رکھ سکتا ہے؟ اس کے نزدیک، مردہ بدستِ زندہ ہوتا ہے۔ زندہ بدستِ مردہ نہیں ہوتا۔

جواب (۴) حق شفع کا قانون، قرآنی نہیں۔

جواب (۵) قرآن کریم کی رو سے، ہر شخص کو اپنے پورے مال میں وصیت کا حق حاصل ہے، اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق جس کے حق میں چاہے وصیت کر سکتا ہے۔ "حق" ہی نہیں، بلکہ قرآنِ کریم بنصِ صریح، وصیت کرنے کو فرض قرار دیتا ہے۔ اور جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر کرتا ہے، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ یہ تقسیم، وصیت پوری کرنے، اور متوفی کا قرض ادا کرنے کے بعد عمل میں آئے گی۔ یعنی جو حصے قرآنِ کریم میں مذکور ہیں، ان کے مطابق تقسیم صرف اس وقت ہوگی جب کسی کی وصیت اس کے پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (COVER) نہ کرتی ہو، یا اتفاق سے کسی کو وصیت کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو۔

جواب (۶) قرآنِ کریم میں "حلالہ" کا کوئی قانون نہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی میاں بیوی کی زندگی میں تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آجائے۔ یعنی ان میں ایک مرتبہ طلاق ہوئی اور انہوں نے پھر آپس میں نکاح کر لیا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب اگر تیسری مرتبہ طلاق ہوگی تو ان کا باہمی نکاح نہیں ہو سکے گا۔

البتہ اگر ایسا ہو کہ مطلقہ عورت کسی دوسری جگہ نکاح کرلے، اور اس کے بعد اسے طلاق مل جائے یا وہ بیوہ ہو جائے، تو ان سابقہ میاں بیوی کو اجازت ہے کہ اگر وہ بطیب خاطر، باہمی رضامندی سے چاہیں، تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اس میں صرف اجازت ہے۔ مجبوری نہیں، تیسری طلاق تو ایک طرف، اگر یہ پہلی طلاق کے بعد بھی باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح نہ کرنا چاہیں، تو انہیں اس پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔

جواب (۷) ہم اس کی مصلحت یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، تقسیم کار یوں ہے کہ بال بچوں کی روزی مہیا کرنے کا ذمہ دار مرد ہے۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔ ہاں، اگر کوئی باپ دیکھے کہ حالات ایسے ہیں کہ بیٹی کو زیادہ حصہ ملنا چاہیئے، تو وہ اس کے لئے وصیت کر سکتا ہے۔ وہ سارے کا سارا مال بیٹی کو دے سکتا ہے۔

جواب (۸) جہیز، محض ایک رسم ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

جواب (۹) قرآنِ کریم کی رُو سے کسی کو لونڈی رکھنے کی اجازت نہیں۔ اسلام نے غلامی کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ قرآنِ کریم میں جن غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر آتا ہے۔ وہ، وہ ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ قرآن کریم نے انہیں آزاد کرا دیا یا رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا، اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

جواب (۱۰) سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا سوال درپیش ہو۔ ورنہ اجازت نہیں۔ اب رہا عدل کا سوال۔ سو اس نے کہا ہے کہ جہاں تک مختلف بیویوں میں جذباتی مساوات کا سوال ہے ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے اس عدل کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔ جس عدل کا تقاضا ہے وہ حسن معاشرت، سلوک اور برتاؤ کا عدل ہے۔ یہ ممکن ہے۔

جواب (۱۱) قرآنِ کریم میں نبی اکرمؐ کی ایک سے زیادہ ازواج مطہراتؓ کا تو ذکر ہے، لیکن ان کی تعداد مذکور نہیں۔ نہ ہی اس کی تصریح ہے کہ بیک وقت حضورؐ کے عقد میں کتنی ازواجِ مطہراتؓ تھیں۔ اگر بیک وقت چار سے زیادہ تھیں، تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ واقعہ چار کی تحدید سے پہلے کا ہے۔ تاریخی واقعات کے متعلق اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اگر تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہو جو قرآنِ کریم کے خلاف ہے، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ تاریخ کی غلطی ہے اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد

گرامی یا عمل، قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

جواب (۱۲) منہ بولی "ماؤں" سے نکاح کی ممانعت کہیں نہیں آئی۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت کو، جس سے، قرآن کی رو سے، اس کا نکاح ہوسکتا ہے، احتراماً ماں کہہ دے تو اس سے نکاح حرام نہیں ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو تو سینکڑوں رشتے ناجائز قرار پا جائیں، مثلاً، ہم چھوٹی لڑکیوں کو عام طور پر بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں۔ برابر کی عورتوں کو بہن۔ اور بڑی عورتوں کو ماں۔ اس سے وہ سچ مچ کی بیٹیاں، بہنیں اور مائیں نہیں ہو جاتیں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص انہیں از خود اس قسم کا حقیقی درجہ دے کر، ان سے عقد کا تصور نہ کرے۔ قانونی بندش اور چیز ہے اور اپنے آپ پر بندش عائد کر لینا اور ــــ قرآن کریم نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے کہ (مثلاً) بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں ہو جاتی۔ ۵۸/۲

نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے نکاح کی ممانعت اس لئے نہیں کی گئی کہ وہ مومنین کی "منہ بولی مائیں" تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں مومنین کی مائیں قرار دے دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان سے تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ اس خصوصی حکم کے تحت تھا جس کا اطلاق دوسری عورتوں پر نہیں ہو سکتا۔ خود قرآنِ کریم نے حضورؐ کی ازدواج مطہراتؓ کے متعلق کہا ہے کہ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ (۳۳/۶ - ۳۳/۵۳ - ۳۳/۳۲)

اسلامی معاشرہ میں جو پوزیشن نبی اکرمؐ کی تھی، اسے سامنے رکھا جائے تو اس خصوصی حکم کی علت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ پوزیشن نبیؐ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ (نہ ہو سکتی تھی۔ نہ ہو سکتی ہے۔ نہ ہو سکے گی۔) اس لئے قرآنِ کریم کے بعض احکام، حضورؐ کے لئے خاص تھے۔ عام مومنین سے الگ۔

جواب (۱۳) قرآن کریم نے اس کے لئے "مصدق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب، ان معنوں میں "تصدیق کرنے والا"، نہیں جن معنوں میں ہم اسے بولتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "سچ کر دکھانے والا"۔ اہل کتاب کے چند دعاوی تھے۔ کچھ آرزوئیں تھیں۔ آنے والے کا انتظار تھا تاکہ وہ "خدا کی مرضی زمین پر پوری کرے"، حق کا غلبہ ہو۔ باطل کو شکست ہو۔ یہ باتیں ان کی تحریف شدہ کتابوں میں بھی موجود تھیں۔ قرآنِ کریم نے ان سے کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ ــــ میں تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھاؤں گا، اور تمہاری آرزوں کو پورا کر دوں گا۔ وہ آنے والا آگیا ہے۔ وہ ان سب باتوں کو عملاً سچ کر دکھائے گا۔ قرآنِ کے مصدق ہونے کا یہ مطلب ہے۔ (تفصیل ان امور کی "لغات القرآن"۔ باب ص۔ د۔ ق۔ میں ملے گی۔)

جواب (۱۴) قربانی کے متعلق ہم نے، طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۵۱ء میں ایک خصوصی مقالہ شائع کیا تھا جس

میں، قرآنِ کریم کی نصوص صریحہ کی رُو سے بتایا گیا تھا کہ جو کچھ اس ضمن میں ہمارے ہاں ہوتا ہے وہ منشائے قرآنی کے مطابق نہیں[1]۔ طلوعِ اسلام کے خلاف جو آپ اس قدر شدید پراپیگنڈہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی ابتدا ہمارے اسی "جوم" سے ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے — لیکن اس سے قرآنِ کریم کی بیان کردہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ وہ بہرحال آشکارا ہو کر رہے گا۔

والسّلام

(اگست ۱۹۶۱ء)

---

[1] یہ مقالہ "قرآنی فیصلے" جلد اوّل میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] دیکھئے صـ ۷۲

۱۵

معاشی نظام

۱۔ کمیونزم اور اسلام

سوال:۔ آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہمارے زمانے میں کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مدِ مقابل اُٹھی ہے اور یہی اس وقت اسلام کی سب سے بڑی حریف ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواب:۔ "دین اس نظام زندگی کا نام ہے جو ایک مخصوص آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) کی بنیادوں پر متشکل ہو۔ اگر وہ آئیڈیالوجی، حق ہے تو وہ دین بھی برحق ہوگا۔ اگر وہ بنیاد باطل ہے، تو اس پر استوار، نظام بھی باطل ہوگا۔ اسلام دین الحق ہے۔ کمیونزم دینِ باطل"

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایک نظام زندگی کی نہیں۔ مذاہب کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ انسان کا۔ پرائیویٹ عقیدہ ہے۔ جس کا مقصد خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق پیدا کرنا ہے ——— اس کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب پرست لوگوں کے یہاں مملکت سیکولر بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً انگلستان کے باشندے، عیسائی ہیں، وہاں کے بادشاہ کے لیے بھی عیسائی ہونا ضروری ہے۔ لیکن ان کی مملکت سیکولر ہے۔ ان کا مذہب گرجے کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اس سے باہر کی دنیا سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ یہی کیفیت ہندوستان کی ہے۔ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو مذہب کی پیرو ہے۔ لیکن مملکت آئینی طور پر سیکولر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت یا ہندومت (وغیرہ) کو ان کے اجتماعی نظام سے کچھ تعلق نہیں۔ لہٰذا یہ دین نہیں مذاہب ہیں اور جب یہ دین نہیں تو ان کا دین (نظامِ زندگی) کی حیثیت سے اسلام کے مدِ مقابل آنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام ان مذاہب کو بھی مبنی برصداقت قرار نہیں دیتا، اس لیے کہ اپنی جس تعلیم کو یہ مذاہب تعلیم خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں، قرآن کا بیان ہے کہ وہ حقیقی تعلیم خداوندی نہیں۔ اس میں انسانی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ حقیقی تعلیم خداوندی اب صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس لیے اگر یہ اہلِ مذاہب چاہتے ہیں کہ تعلیم خداوندی کا اتباع کریں تو ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ مذاہب اسلام کے مقابلہ میں ایک متوازی دین (نظام زندگی یا نظام مملکت) کی حیثیت سے کھڑے نہیں ہوتے، اس لیے اسلامی مملکت، ان اہلِ مذاہب کو، اپنی حدود کے اندر نہ صرف پُرامن زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتی ہے، بلکہ انہیں مذہبی آزادی دیتی ہے اور ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے۔

کمیونزم کی پوزیشن ان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک فلسفۂ حیات یا نظریہ زندگی (آئیڈیالوجی) پیش کرتی ہے اور اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر، ایک اجتماعی نظام متشکل کرتی ہے۔ اس اجتماعی نظام میں اس آئیڈیالوجی کو ایمان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کمیونزم کی آئیڈیالوجی پر ایمان نہ لاتے لیکن اس کے معاشی نظام کو تسلیم کر لے، تو اسے کمیونسٹ تصور کر لیا جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ کمیونسٹ برادری کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ کمیونزم اسے اپنے دائرہ میں داخل نہیں سمجھے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کی آئیڈیالوجی پر ایمان لا کر اس کے اجتماعی نظام کو صحیح تسلیم کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کمیونزم کی پوزیشن نہ تو ایک مذہب کی سی ہے جس میں آئیڈیالوجی (عقیدہ) کو اجتماعی نظامِ زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی وہ ایک سیکولر نظامِ مملکت ہے جو افرادِ مملکت کے مذہب (نظریہ زندگی) سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی حیثیت بالکل "دین" کی سی ہے۔ جس میں نہ آئیڈیالوجی نظام اجتماعی سے الگ ہوتی ہے اور نہ ہی نظام اجتماعی، آئیڈیالوجی سے جدا۔ اس میں "ایمان و عمل" کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ اب آیئے آئیڈیالوجی کی طرف۔ اسلام کی آئیڈیالوجی کے اہم عناصر یہ ہیں کہ:۔

(۱) انسان صرف اپنے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس میں طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے قرآن "روح خداوندی" کہہ کر پکارتا ہے۔ اور جسے بغرض تعارف، انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کی مشینری طبیعی قوانین کے تابع چلتی رہتی ہے اور جب یہ مشینری چلنے سے بند ہو جاتی ہے تو انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات، نہ تو طبیعی قوانین کے تابع ہے اور نہ ہی جسم کی موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کی زندگی، اس کی طبیعی موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔

(۲) جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے لیے قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لیے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں۔ وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دوسرے انسانوں تک پہنچتی تھی۔ اب یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ ہے۔

(۳) وحی کی رُو سے عطا شدہ قوانین کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ دین نام ہے اس نظامِ حیات کا جو ان مستقل اقدار کی حدود کے اندر گھرا ہو۔ وہ نظام ان حدود کا پابند بھی ہوتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ ان سے تجاوز کرنا تو ایک طرف، وہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدّل بھی نہیں کر سکتا۔

(۴) انسان کے ہر عمل، حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کو اعمال کا نتیجہ کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے اعمال کے نتائج سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ خواہ وہ اس دنیا میں سامنے آجائیں یا حیاتِ اُخروی میں۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ جو عمل وحی کے مقرر کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہوگا اس کا نتیجہ خوشگوار ہوگا۔ جو ان کے خلاف ہوگا وہ انسان کے لیے مضرت رساں ہوگا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ آئیڈیالوجی جس پر دینِ اسلام (یعنی اسلامی نظامِ اجتماعیہ) کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ کمیونزم کی آئیڈیالوجی اس کی بالکل ضد اور نقیض ہے۔ اس کی رُو سے:۔

۱۔ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام ہے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ خدا۔ وحی۔ رسالت۔ مستقل اقدار۔ حیاتِ آخرت وغیرہ عقائد سب فریب ہیں۔

۳۔ چونکہ انسان نام ہے اس کی طبیعی زندگی کا، اس لیے انسان کے سامنے مسئلہ صرف روٹی کا ہے، اس سے آگے کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ جس طریق اور جس ذریعہ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے، وہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ جو اس کی راہ میں حائل ہو وہ ناجائز اور مذموم۔

مارکس کے الفاظ میں:

> اخلاقیات۔ مذہب۔ مابعد الطبیعیات اور دیگر تمام تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔

اسی لیے لینن نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ:

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں..... اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا بقا اور استحکام کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب۔ دروغ بافی۔ فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔

یہ ہے وہ آئیڈیالوجی جس پر کمیونزم اپنے اجتماعی نظام کی عمارت استوار کرتی ہے۔ لہٰذا "دین اشتراکیت" "دین اسلام" کی ضد اور اس کا حریف ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس　　بر مساواتِ شکم دارد اساس

اقبالؒ نے مارکس کو پیغمبر (لیکن پیغمبر حق ناشناس) اور اشتراکیت کو "دین" سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ یوں ہی شاعری نہیں کی۔ اس کی اسی نظم کا پہلا شعر ہے:

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیلؑ　　یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیلؑ

یعنی کتاب۔ سرمایہ (THE CAPITAL) کا یہودی مصنف، کارل مارکس "پیغمبرِ بے جبرئیلؑ" تھا۔ ایسے دین باطل کا موجد جس کی بنیاد وحیٔ خداوندی پر نہیں تھی۔ باطل پر تھی۔

میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب میں نے کہا تھا کہ ہمارے زمانے میں کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مقابلہ میں اُٹھی ہے تو اس کا مطلب کیا تھا۔ اور میرے اس فقرہ کا مفہوم کیا ہے۔ جسے میں اکثر دہرایا کرتا ہوں کہ:

نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ۔

کمیونسٹ ایک ایسے "دین" کا قائل ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ اس لیے اس "دین" کا ماننے والا مسلمان کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا پیرو، کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہے؟

لیکن کمیونزم اور اسلام کے اس قدر کھلے ہوئے تضاد کے باوجود لوگ بالعموم ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کا دشمن ہے اور کمیونزم کا معاشی نظام بھی سرمایہ داری کے نظام کا حریف ہے۔ اس سے سطحی بین لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہیں۔ یہ وہ نہایت "لطیف فریب" ہے

جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ :

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است

کارل مارکس کے "باطل" میں "حق" پوشیدہ ہے۔ یعنی اس کا دین (نظامِ حیات) تو باطل ہے، لیکن اس باطل میں ایک عنصر ایسا بھی ہے جو حق ہے ـــ یعنی نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت ـ اس لیے لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لیے حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ :

" بالشویت + خدا = اسلام" یعنی کمیونزم کے معاشی نظام کو اگر وحی خداوندی (قرآن کی اقدار) کے تابع رکھ دیا جائے تو وہ اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔ جس طرح، اگر سیاست میں، جمہوری نظام (شورائیت) کو وحیٔ خداوندی (قرآنی اقدار) کی حدود کے اندر رکھ لیا جائے تو وہ اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں ایک اور قسم کا دھوکا عام ہو رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ جوں ہی کسی نے اسلام کے معاشی نظام کا نام لیا، مخالفین نے جھٹ سے اس پر کمیونسٹ کا لیبل لگا دیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس طرح آپ ایک کمیونسٹ (یعنی وحیٔ خداوندی سے انکار کرنے والے) کو مسلمان نہیں کہہ سکتے، اسی طرح آپ ایک مسلمان (وحیٔ خداوندی پر ایمان رکھنے والے) کو کمیونسٹ نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کمیونزم اور اسلام کے اس بنیادی فرق کو، اس مقام پر مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اگر آپ اس کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہوں تو میری کتاب "سلیم کے نام" خطوط (جلد اوّل) میں آٹھویں اور نویں خط کا مطالعہ کیجئے۔ میری تصنیف "نظامِ ربوبیت" اور "انسان نے کیا سوچا" میں معاشیات سے متعلق باب بھی اس موضوع پر کافی معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔

یہاں تک میں نے، ان ہر دو نظام ہائے حیات ـــ اشتراکیت اور اسلام ـــ کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ لیکن ان کا حقیقی فرق وہاں جا کر اُجاگر ہوتا ہے جہاں ان کا مقصود و منتہیٰ سامنے آتا ہے۔ جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، دونوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں لیکن کمیونزم، ایک فرد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) یا اس کی ذات کو کچل کر اسے روٹی دیتی ہے اور اسلام اسے اس لیئے روٹی کی فکر سے آزاد کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات یا انفرادیت کی نشوونما اطمینان سے کر سکے۔ اقبال کے الفاظ میں :

آں خدا نانے دہد، جانے دہد ایں خدا نانے دہد، جانے بُرد

روٹی کے مسئلہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دے لینا، حیوانی سطح زندگی ہے۔ انسان کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ یعنی جو چیز اشتراکیت میں مقصود بالذات ہے، وہ اسلام میں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ان مستقل اقدار کے اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جو وحی کی رو سے ملی ہیں۔ لہٰذا مقصود و منتہیٰ کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو کمیونزم کا نظامِ حیات اسلام کی یکسر نقیض ہے۔

(۱۹۶۲ء)

۲ــــ اشتراکی نظریۂ زندگی اور اسلام

ذیل کا خط بغور ملاحظہ فرمائیے:

"بندہ ایک سال سے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کر رہا ہے اور طلوعِ اسلام بھی برابر زیرِ نظر رہے۔ آپ نے قرآن حکیم کی تفہیم جس نہج پر و چار کی ہے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ تاریک خیال ملّا کا آپ سے سیخ پا ہونا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم نظامِ ربوبیت کا داعی ہے۔ اور حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم کا کلام بھی آپ کے ہمنوا ہے۔ چونکہ نظامِ ربوبیت اپنے خواص میں انقلابی فطرت کا ہے اور ملّا ازم فطرتاً اس کی ضد ہے۔ بقول کسے:

ہرگز نمیرد آنکہ شیخ شود اہلِ انقلاب باور مکن کہ ہست در عالم غراب سُرخ

پرویز صاحب! نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے لہٰذا اپنے سوال کا جواب بہ توسل طلوعِ اسلام چاہتا ہوں۔ اگر جواب مذہبی عقیدتمندی کے جذبات سے ہٹ کر مدلل اور تاریخی وجوب و حقائق کا حامل ہو تو میرے لیے زیادہ مؤثر و مسکت ہوگا۔

قدیم اشتراکی نظام سے لے کر آج تک تدریجی ادوار میں ارتقائی قوانین قدرت جاری و ساری ہیں۔ مادی تاریخ ان ادوار کا تعین کرتی چلی آ رہی ہے۔ مذہب کی دخیل کاری نے مادی تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی اور ایک مخصوص خطہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جو سراسر اپنی فطرت کے لحاظ سے اس وقت مادی دور سے جو اس زمانہ کا طبعی تاریخی دور تھا الگ تھلگ تھا یہ پیغمبر اسلامؐ کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا

اور تاریخی عجوبہ جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن شارعؐ اسلام کے رخصت ہوتے ہی چند ماہ و سال کے اندر یہ اسلامی نظام جو تاریخی لحاظ سے قبل از وقت تھا ختم ہو گیا اور "مستثنیات" واقعات کی تعریف میں جگہ پا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رسولِ پاکؐ سے بہ نفس نفیس تربیت پائی تھی اور قیصر و کسریٰ کو اس واسطے ختم کیا تھا کہ یہ غیر صالح نظام کے نمائندہ ہیں۔ چند ہی روز کے بعد اسی غیر صالح نظام کے شہنشاہ بن کر جلوہ نما ہوئے اور تاریخ کا تیز رو دھارا اسی سمت ہی بہتا رہا جس سمت سے اس کو غیر طبعی طور پر موڑنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ تاریخ کے ارتقائی مادی تقاضے ہی تاریخ سے عبارت ہیں۔

یہ امر بالکل غیر طبعی اور غیر فطری ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے اور شیر خوارگی۔ بچپن، عنفوانِ شباب، شباب اور کہولت کے دوروں سے گزرے ہی نہ۔ ایسا ہونا ناممکنات سے ہے۔ کیونکہ انسان کو ان تمام ارتقائی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور بعینہٖ یہی ارتقائی قوانین انسانی معاشرہ میں بھی موجود ہیں۔ ہمیں منزل بہ منزل ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے جیسے برف کو پانی اور پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے کے لیئے انقلابی عملوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان تینوں یعنی برف پانی اور بھاپ میں اصل ہستی پانی کی ہے جس نے مختلف مدارج میں پہنچ کر اپنی اصل ہستی کو فنا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خواص اور صورتِ نوعیہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح یہ کاروانِ زندگی ابتدا میں پھسل پھسل کر اور رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاریخی عوامل کے تھپیڑوں کو سہنے کی اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یعنی تنازع للبقا کی قوتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اس کے اندر روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ کارِ رواں اور تاریخی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور اب یہ ایٹم اور برقیات کے دور میں ہے۔ پانی کی طرح زندگی کے ان مختلف قافلوں کی اصل بھی مادی تاریخ ہی ہے جو مختلف دوروں میں اپنی صورت نوعیہ اور خواص تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی یا مذہب کے خیالات کا رجحان ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان اعمال و افعال کی تجدید بھی کرتا جاتا ہے جو نئے مادی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ تو ایسا نظام ترقی پسندانہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ مادی تاریخ کے یہ سائنٹفک اصول ہیں جن کو نہ ماننا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ہم جدلی تاریخ کے سائنٹفک مطالعہ کے بغیر مادی تقاضوں اور عوامل کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف مذہبی پیشوا اس قابل ہیں کہ اپنے مذہبی علوم کے سہارے سے تاریخ کا پہیہ ہمیشہ آگے کو لے جائیں؟ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی تاریخ

رجعت پسندانہ تاریخ ہے۔" آئین نو سے ڈرنا۔ رسم کہن پر اڑنا۔ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں" چونکہ پیغمبر کا ہر فعل خواہ وہ وقتی تقاضے کی مصلحت پر مبنی ہو۔ مذہب کی اصطلاح میں "سنت" کہلاتا ہے جس کو ترک کرنا مذہب کی اصطلاح میں "کفر" تصور کیا جاتا ہے۔ خواہ پیغمبر کے اس فعل کی افادیت صرف وقتی طور پر ہو۔ اور بعد کے حالات میں اس فعل پر عمل کرنا سراسر ناقابل عمل ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ کو ان کی خلافت کے عہد میں یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ خزانہ عامرہ کو ہر شام خالی نہ کر دیا کریں۔ بلکہ خزانہ کو باقاعدہ جمع کریں۔ اور کارکنان حکومت کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائیں۔ تو آپ نے جواب دیا کہ میں سنت رسولؐ کے خلاف نہیں کر سکتا ہوں۔ بہر حال یہ ایک امر واقع ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جن خطوط پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے وہ نہ ہوا اور معاشرہ مادی تاریخ کے عوامل کی سنت کا پیرو کار رہا۔ اور مذہبی پیشواؤں نے اس وقت کے صاحب اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق جواز نکالنے کا کام سنبھال لیا جو آج بھی جاری ہے۔

محترم پرویز صاحب! آپ اس بستی یعنی پاکستان میں واحد شخص ہیں جو فرماتے ہیں کہ "الارض للّٰہ" اور نظام ربوبیت قائم ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف شرق تا غرب تمام مولوی صاحبان یک زبان آپ کے خلاف تکفیر کے فتوے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اسلام کا ماحصل صرف چار نکاحوں تک جانتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر اسلام کا نام لے کر جاگیرداری نظام کا جواز نکالتے ہیں۔ اور اپنی کتاب "سود حصہ دوم" میں فرماتے ہیں۔ ایک مربع گز سے لے کر اگر کسی شخص کے قبضہ میں اس قدر رقبہ ہو جس کی کوئی حد ہی مقرر نہ ہو اگر جائز طریقہ سے قابض ہے تو شریعت کی رو سے درست ہے" لیکن آپ فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

وہ خدایا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

آپ بھی جواز اپنے دعوے کا قرآن ہی سے نکالتے ہیں اور مودودی صاحب بھی قرآن ہی سے۔ جن کے نزدیک یہ زمین، پاکستان کھوڑوؤں۔ دولتانوں اور ٹوانوں کی ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ حصول پاکستان سے پیشتر کیا وعدے کئے گئے تھے کہ پاکستان بن

جانے کے بعد آپ کے لفظوں میں "نظام ربوبیت" قائم کیا جائے گا۔ اور حضرت عمرؓ کا دور لوٹ آئے گا۔ عوام نے ہولناک اور بے مثال قربانیاں دیں، پاکستان بن گیا۔ سولہ سال گذر گئے اور ان سولہ سالوں میں ہر صدر مملکت اور ان گنت وزیروں نے اور مولوی صاحبان نے یہی کہا کہ ہمارا نظام اسلامی ہونا چاہیئے۔ لیکن مادی تاریخ کہتی ہے کہ نہیں۔ نظام صرف میری سنت پر چلنا چاہیئے آپ غور فرمائیں کہ ہماری حکومت اور علمائے دین دونوں فریق یہی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام ہونا چاہیئے لیکن یہ دونوں فریق اسلامی نظام بنانے سے عاجز ہیں۔ اگر آپ نظام ربوبیت پیش کرتے ہیں تو علمائے دین کے نزدیک کافر ٹھہرتے ہیں۔ ادھر خانہ کعبہ سے بھی اسلامی نظام کی آواز نہیں آتی ہے۔ بلکہ عربوں کا آج ایک ہی محبوب نعرہ ہے (عرب نیشنلزم زندہ باد) لیکن آج زمین میر و سلطان سے بے زار ہو رہی ہے اور ہمارے ملک کا جاگیرداری نظام عالم نزع میں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہنمائی لینی چاہیئے اور اپنے اردگرد کے حالات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نظام ربوبیت تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ یہی ہے"۔

طلوع اسلام

ہم نے اس تفصیلی خط کو بتمامہ اس لیے شائع کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اشتراکی فلسفۂ حیات کیا ہے؟ اور اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ ایک چیز ہے اشتراکی نظام معاشی اور دوسری چیز ہے اشتراکی فلسفہ زندگی۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظام معیشت کی عمارت، اشتراکی فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہے اس لیے اس نظام کو سمجھنے کے لیے اس فلسفہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعینہٖ جس اسلامی نہج زندگی کے کسی گوشے کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات یا نظریۂ زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جو نظام یوں ہی ہنگامی طور پر اپنا لیا جائے اس کی صورت کچھ اور ہوتی ہے۔ لیکن جو نظام کسی خاص فلسفۂ حیات کی پیداوار ہو اُسے اس فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے اس فلسفہ کا سمجھنا لابدّ ہوتا ہے۔

۲۔ مشہور جرمنی مفکر ہیگل کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ ایک (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا پھولتا۔ پھلتا۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے ایک اور تصور کی نمود ہوتی ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے تصور کے ساتھ ہوا تھا وہی کچھ اس جدید تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ گردش دو لابی شروع سے آج تک جاری ہے اور اسی طرح جاری رہے گی۔ اس

کا نام جدلی عمل (DIALECTIC PROCESS) ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو اس عمل کو ایسے ضبط اور نظم کے ساتھ جاری رکھتی ہے، تو اس نے کہا کہ اس مخفی قوت کا نام "روح عالم" (WORLD SPIRIT) ہے وہ اس عمل سے خود اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔

مارکس (MARX) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا، لیکن اس نے ذرا آگے جاکر ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ اس کا یہ اختلافی نظریہ خود ایک الگ فلسفہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ جنگ اضداد کا جو تصور ہیگل نے پیش کیا ہے وہ تو درست ہے لیکن یہ جنگ تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظام ہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتی ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں اس نظام کو تباہ کرکے اس کی جگہ ایک جدید نظام کو مسلّط کر دیتی ہیں۔ جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے، نظام سرمایہ داری دنیا پر مسلّط تھا۔ اب اس کی جگہ، اشتراکی نظام لے رہا ہے۔ جو اس پہلے نظام کی ضد ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ جنگ اضداد کون سی قوت کی رُو سے جاری رہتی ہے تو اس نے کہا کہ اسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس قدر محکم اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے سامنے یکسر بے بس اور عاجز ہے۔ جب یہ ایک نظام کو مسلّط کرتی ہے۔ تو انسان اس نظام کو بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے اس نظام کو مجبوراً تسلیم اور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اختیار کرنا کیا معنی، اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ قوت اس نظام کو فنا کرنا چاہتی ہے تو انسانوں کی کوئی تدبیر اسے بچا نہیں سکتی۔ مارکس کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ اس کی اس بے بسی اور بے کسی کی داستان ہے۔ خدا وحی، مستقل اقدار، حق و باطل کا تصور اس کے نزدیک سب افسانے ہیں اور ذہن انسانی کی تخلیق۔ حقیقت صرف تاریخی وجوب کی ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کی عملی تعبیر کا نام "تاریخ کی مادی تعبیر" (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) ہے۔ وہ اس تعبیر کو اس قدر حتمی اور یقینی قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک، دنیا کی کوئی قوت اس کے دھارے کا رُخ بدل نہیں سکتی۔

۳۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اشتراکی فلسفۂ زندگی۔ اس کی روشنی میں، آپ مندرجہ بالا خط پڑھیں گے تو بات صاف ہو جائے گی کہ اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

اسلام کا نظریۂ حیات، اس فلسفہ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حق (TRUTH) ایک ابدی حقیقت ہے، جو ذہن انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ اپنے مقام پر اٹل اور غیر متبدل ہے، اور کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ جو تصورات حق کے مطابق ہوں وہ مبنی بر صداقت ہونگے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار، حق پر مبنی ہونے کی وجہ سے ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ یہ وحیٔ خداوندی کی رُو سے (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) انسانوں کو ملتی ہیں۔ تاکہ وہ ان کے مطابق اپنا نظام زندگی قائم کریں۔ جو نظام ان اقدار کے مطابق قائم ہوتا ہے اسے حق کا نظام کہا جاتا ہے؛ اس نظام کی عملی شکل، زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

جو تصورات مستقل اقدار کے خلاف ہوں انہیں باطل کے تصورات کہا جاتا ہے جو حق کی نقیض ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کش مکش رہتی ہے اور اس کشمکش میں حق، باطل کو شکست دیتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح باطل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ تاآنکہ آخر الامر، یہ میدان چھوڑ جائے گا۔ اور حق کا غلبہ مکمل ہو جائے گا۔

حق اور باطل کی یہ کشمکش، خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے جاری ہے لیکن چونکہ اس قانون کی رفتار ہمارے حساب وشمار کی پیمائش کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک دن، قرآن کے الفاظ میں ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے) اس لیے اس کشمکش کے نتائج بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخی نوشتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے اس حقیقت کی شہادت مل سکتی ہے کہ یہ کشمکش جاری ہے۔ اس میں حق (تعمیری تصورِ حیات) باطل (تخریبی نظریہ) پر بتدریج غالب آ رہا ہے۔

اسلام کی رُو سے انسان بے بس اور بے کس۔ مجبور و مقہور مخلوق نہیں۔ یہ صاحبِ اختیار و ارادہ ہستی ہے۔ اسے اس انتخاب (CHOICE) کی قوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا نظام، حق کے مطابق قائم کرے یا باطل کے مطابق۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت حق کے مطابق

نظام قائم کرتی ہے تو اس کے تعمیری نتائج مرتب ہونے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اتنی تیز کہ کائناتی قانون کی رفتار سے جو نتائج صدیوں میں جا کر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، وہ اس رفتار کی رُو سے دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ ادوار (خواہ ان کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو) نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ حق و باطل کی یہ کش مکش "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کی رُو سے جاری نہیں۔ یہ خدائے علیم و حکیم کے متعیّن کردہ پروگرام کے مطابق جاری ہے جس کی رُو سے کائنات بالحق اور بامقصد پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں جا رہی ہے۔ جب انسان حق کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیتے ہیں تو وہ (حق) پھر کائناتی رفتار سے آگے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقل اقدار کی صحیح تعلیم و تربیت سے انسانوں کو ہر زمانے میں اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ حق کا نظام قائم کر سکیں۔ تاریخ کے جن درخشندہ ادوار کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ ادوار تھے جن میں انسانی جماعتوں کو اس قابل بنایا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یہ دور محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے زمانے میں آیا۔ جب تک اس صحیح تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ نظام قائم رہا۔ جب لوگوں نے اسے منقطع کر دیا، تو وہ نظام بھی باقی نہ رہا۔ وہ مستقل اقدار جن کے مطابق یہ نظام قائم ہوا تھا اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں عملی نظام کی شکل میں متشکل کی جا سکیں۔ جب اور جہاں بھی ان کی صحیح تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا وہ نظام متشکل ہو جائے گا۔

۴۔ اس چودہ سو سال کے عرصے میں جب کہ حق کا وہ نظام، جسے انسانی ہاتھوں نے قائم کیا تھا، باقی نہ رہا، حق پر مبنی تصورات، کائناتی رفتار سے باقاعدہ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور انسانی معاشرہ پر غیر شعوری طور پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔ ملوکیت کا مٹ جانا اور اس کی جگہ شورائیت کے تصور کا عام ہو جانا۔ غلامی کا خاتمہ۔ ذات پات کی تمیز کا دور ہو جانا۔ قومیت کی جگہ عالمگیر انسانی برادری اور وحدتِ نظامِ انسانیہ کے تصور کا اجاگر ہوتے چلے جانا۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے احساس کا بیدار ہونا۔ زمین داری جاگیرداری، سرمایہ داری کے نظام کا منسوخ بن جانا اور عالمگیر نظامِ ربوبیت کا مقبول ہوتے چلے جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب قرائن و شواہد اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حق کے مطابق نظریاتِ زندگی، کائناتی قانونِ خداوندی کے مطابق آہستہ آہستہ متمکن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی قوت، اُن باطل تصورات کو واپس نہیں لا سکتی جنہیں حق کے تصورات نے شکست دے کر میدان سے بھگا دیا ہے۔ اس وقت اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت قرآنی تصورات کے مطابق

کر دی جائے تو صحیح نظامِ عدل و صداقت کے قائم ہونے میں (جسے ہم خدا کے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں) کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اس کے لیے کائناتی قانون نے فضا کو بڑا سازگار بنا دیا ہے۔

۵۔ تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام کا نظریۂ حیات اور اشتراکیت کا فلسفۂ زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم اکثر و بیشتر کہتے رہتے ہیں کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ جب اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات اور قرآن کے معاشی نظام میں مماثلت دیکھتے ہیں تو جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ غلطی صرف اشتراکی نظام کے بارے میں ہی نہیں کی جاتی۔ ہر نظام کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً جب لوگوں نے دیکھا کہ مغربی جمہوریت بھی ملوکیت کے خلاف ہے اور اسلام بھی ملوکیت کی جگہ نظامِ شورائیت کا حامی ہے تو انہوں نے فوراً اعلان کرنا شروع کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ہی شے ہے۔ حالانکہ مغرب کی جمہوریت، جس مادی نظریۂ حیات کی پیداوار ہے وہ اسلامی نظریۂ زندگی کے یکسر خلاف اور اس کی نقیض ہے۔ اسی قبیل کا یہ نعرہ ہے۔ (جسے آج کل مغربی سیاست خاص طور پر بلند کر رہی ہے) کہ چونکہ عیسائی دنیا بھی خدا کو مانتی ہے اور مسلمان بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ عیسائی دنیا جس چیز کو خدا پر ایمان قرار دیتی ہے۔ قرآن اسے کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ خدا کو ان تصورات کے مطابق نہ مانیں جنھیں قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ کبھی خدا کے ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اسلام کا نظریۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۶۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، محترم مستفسر کے استفسارات کا اصولی جواب اسی میں آ گیا ہے۔ لیکن ان کی بعض جزئی باتوں کے متعلق مختصراً ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) انہوں نے کہا کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی۔ اور ایک مخصوص خطہ میں ایسا نظام قائم کر دکھایا جو اس زمانے کے طبعی تاریخی دور سے الگ تھا اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ "یہ پیغمبر اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور ایک معجزہ"۔

محترم مستفسر یا تو پورے طور اشتراکی فلسفہ کے قائل نہیں۔ یا (معاف بفرمائیے) انہیں پورے طور پر اس کا علم نہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی رُو سے نہ "روحانیت" کوئی شے ہے اور نہ ہی اس پر مبنی معجزہ کا کوئی وجود۔

جب تاریخ کی تعبیر یکسر مادی ہے تو اس میں روحانیت کا ذکر ہی کیا۔ مارکس اس قسم کے تصورات کو انسانی اوہام کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ جب تاریخی وجوب کی قوت ایسی بے پناہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کو نہیں روک سکتی، دنیا کے کسی ایک ..... خطہ ہی میں سہی اور تھوڑے سے وقت کے لیئے ہی سہی جب اس دھارے کا رُخ موڑ دیا گیا اور اس کے علی الرغم ایک اور نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا تو وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر اشتراکی فلسفہ کی عمارت اُستوار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا عام روش سے ہٹ کر سوچا جائے تو یہ بات اُبھر کر سامنے آ جائے گی کہ جسے "تاریخی وجوب" کہا جاتا ہے، اس کی اصل ہی کچھ نہیں۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں "ان ناموں میں سے ایک نام ہے، جنہیں تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے وضع کر لیا تھا" ــــ محض ایک نام ــــ تاریخ، انسانوں کے اختیار و ارادہ اور اعمال و کردار کی داستان کا نام ہے۔ اسے ایک ایسی مہیب قوت سمجھ لینا جس کے سامنے انسان بے دست و پا اور محکوم و مقہور بن کر رہ جائے، پتھر کو دیوتا بنا لینے والی بات ہے۔ مارکس نے خدا سے انکار کیا ــــ اور اس کا مذہب اسے جس خدا کا ستار بنانا چاہتا تھا وہ خدا تھا ہی اس قابل کہ اس سے انکار کیا جاتا ــــ اس خدا سے اس نے انکار کیا اور حقیقی خدا کا تصور اس کے سامنے کسی نے پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ذہن میں خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ خلا کا قائم رہنا ناممکنات سے ہے اس لیے اس خلاء کو پورا کرنے کے لیے ایک "خدا" وضع کرنا پڑا۔ یہ خدا ہے "تاریخی وجوب" جو محض ایک موہوم نام ہے۔ اس کی اصل و حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کوئی کمیونسٹ آج تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ "تاریخی وجوب" ہے کیا؟ نہ ہی خود مارکس کے ہاں اس کی تشریح ملتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جو نظام رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا وہ تھوڑے عرصے کے بعد جاری کیوں نہ رہا۔ سو اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں مختصراً بتایا جا چکا ہے۔ (تفصیلاً دیکھنا ہو تو سلیم کے نام خط کی تیسری جلد میں وہ خط دیکھئے جس کا عنوان ہے "اسلام آگے کیوں نہ چلا")

اس مقام پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ جو نظام نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ نہ معجزہ تھا۔ نہ "روحانیت" کا کرشمہ۔ وہ اس پروگرام کا فطری نتیجہ تھا۔ جسے قرآن کریم نے اس نظام کے قیام کے لیے تجویز کیا ہے یعنی صحیح تعلیم و تربیت سے مستقل اقدار کی اہمیت کو اس قدر دلوں میں جاگزیں کر دینا کہ وہ انسانی زندگی کا نصب العین بن جائیں اور اس طرح انسان ان کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی مادی

قربانی کے لیے بطیب خاطر تیار ہو جائے۔ اس پروگرام پر جب بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ وہی برآمد ہوگا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس نظام کے اصول دیے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ انہیں ہر زمانے کے انسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کریں۔ اس لیے محترم مستفسر کا یہ سمجھنا کہ کسی ایک زمانے کی متعین کردہ جزئیات بھی ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں گی، قرآنی تصورِ نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ خود نبی اکرمؐ کے جانشینوں (خلفائے راشدینؓ) کے زمانے میں کئی ایک جزئیات میں سے جو علی حالہ رہنے دی گئیں تو اس لیے کہ ان میں سے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(۱۱) محترم مستفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے تدریجی ارتقاء فطرت کے اصولوں میں سے ہے۔

یہ درست ہے لیکن اس اصول کا اطلاق انہی امور پر ہو سکتا ہے۔ جو انسانی ذہن کے پیدا کردہ ہوں۔ آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسانی ذہن وہ باتیں نہیں سوچ سکتا تھا جو آج کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ لیکن وحیٔ خداوندی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے۔ جو ماحول کے اثرات سے بلند ہے۔ وحی، انسان کو ابدی حقائق دیتی ہے جو مستقل بالذات اور غیر متبدل ہیں۔ وحی نے سب سے پہلے نبی سے بھی یہی کہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ ذرائع رزق، انسانی نشوونما کے لیے ہیں۔ انہیں افراد اور مخصوص گروہوں کی مفاد پرستیوں کے لیے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ذہن انسانی اور وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ذہن انسانی کا طریق، تجرباتی ہے۔ اس لیے وہ تدریجاً حقیقت تک پہنچتا ہے۔ لیکن وحیٔ خداوندی پہلے ہی دن حقیقت کو سامنے لے آتی ہے، البتہ اس حقیقت کو عملی نظام میں متشکل کرنے کے لیے ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ انسانی جدوجہد کی رُو سے ہوگا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وحی کی رُو سے اس نظام کے اصول ملتے ہیں، جزئیات نہیں ملتیں۔ تدریجی ارتقاء کا عمل انسانی زندگی کی جزئیات میں ہوتا ہے اصولوں میں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچے کی مختلف قوتوں کی نشوونما تدریجاً ہوتی ہے لیکن جن اصولوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، وہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا دارومدار سانس پر ہے تو یہ چیز زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک یکساں طور پر کارفرما رہتی ہے۔ اسی طرح زندگی اور صحت سے متعلق دوسرے اصولوں کی کیفیت

ہے یہ اصول تدریجاً مرتّب نہیں ہوتے۔ جس نے زندگی دی ہے، اسی نے ان اصولوں کو مستقل طور پر متعین کر دیا ہے۔ جو ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔

جس طرح زندگی کے خالق نے طبعی زندگی کے لیے اصول دیے ہیں، اسی طرح اس نے انسان کی تمدّنی زندگی کے لیے بھی اصول دیے ہیں۔ یہ اصول بھی اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبیعی زندگی سے متعلق اصول۔ تدریجی ارتقاء کا سوال نہ ان میں ہے نہ ان میں، پھر جس طرح طبیعی زندگی سے متعلق اصول انسانی ذہن کی پیداوار نہیں اسی طرح اس کی تمدّنی زندگی سے متعلق اصول بھی اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی کسی چیز نے بھی اپنے لیے اصول آپ وضع نہیں کئے سب "وحی" کی رُو سے ملے ہیں۔

(iii) محترم مستفسر نے، اشتراکی فلسفہ کی ایک بنیادی کمزوری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب (مثلاً) تاریخی وجوب کی رُو سے اب وقت آگیا ہے کہ سابقہ نظامِ سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام دنیا پر مسلط ہو جائے تو اس کے لیے نہ کسی جدوجہد کی ضرورت ہے نہ کد و کاوش کی حاجت۔ "تاریخی وجوب" کی بے پناہ قوّت اس جدید نظام کو خود بخود مسلّط کر دے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ اسے خس و خاشاک طرح بہا کر لے جائے گی۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر اشتراکی ممالک، اشتراکیت کو پھیلانے اور مسلّط کرانے کے لیے اس قدر نعل برآتش کیوں رہتے ہیں۔ یہ اس قدر پراپیگنڈے کا طوفان، مختلف ممالک میں دہشت پسند جماعتیں، سرمایہ دارانہ نظام کی حامل سلطنتوں کے خلاف سرد اور گرم جنگ کا سلسلہ، اس قدر سپاہ، اتنا عظیم سامانِ جنگ، ایٹمی بم وغیرہ وغیرہ کس مقصد کے لیے ہیں۔ کیا "تاریخی وجوب" اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اسے ان سہاروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اور ضرورت پڑ رہی ہے ان انسانوں کے مقابلے کے لیے جو اشتراکی فلسفہ کے مطابق نہایت بے بس اور مجبور ہیں۔

اس فلسفہ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ (مثلاً) آج کل جدلی جنگ کی رُو سے اشتراکی نظام کے مسلّط ہونے کی باری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد جب اسی جنگ کے مطابق اشتراکی نظام کی ضد، دوسرے نظام (یعنی نظامِ سرمایہ داری) کے مسلّط ہونے کی باری آئے گی۔ تو اس وقت اس فلسفہ کے معتقدین کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس وقت انہیں نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہونا پڑے گا۔ اور اشتراکی نظام کے خلاف وہی کچھ کرنا ہوگا جو کچھ وہ اسوقت نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ تمام لٹریچر جس میں

نظام سرمایہ داری کو نوعِ انسان کے لیے لعنت قرار دیا گیا ہے، نذرِ آتش کر دینا پڑے گا اور وہ تمام دلائل جو اس وقت نظامِ اشتراکی کے حق میں دئے جاتے ہیں۔ خود ان کی تردید کرنی پڑے گی۔ اس وقت سب سے بڑا سرمایہ دار، سب سے زیادہ مستحق تبریک و تہنیت قرار دیا جائے گا۔

پھر اسی نقشہ کو ذرا پیچھے کی طرف الٹیے۔ موجودہ دور سے پہلے، نظام سرمایہ داری، تاریخی وجوب کے تقاضے کے عین مطابق تھا سوال یہ ہے کہ آپ اس دور کے سرمایہ پرستوں کو موجبِ لعنت و ملامت کیوں قرار دیتے ہیں؟ ان کی شان میں قصائد کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اس "مذہب" کو "افیون" کیوں قرار دیتے ہیں۔ جو اُس وقت اُس نظام کی تائید کرتا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا طرزِ عمل کس طرح فلسفۂ وجوبِ تاریخی کے خلاف ہے؟ اگر آپ اس فلسفہ کو فی الواقعہ سچا سمجھتے ہیں تو آپ کو سابقہ دور کے سرمایہ پرستوں کی مدح میں قصیدے پڑھنے چاہئیں کہ انہوں نے تاریخی وجوب کا ساتھ دیا تھا۔ نیز اس زمانے کے مذہب کو سچا مذہب قرار دینا چاہیئے، جس نے تاریخی وجوب کی تائید کی تھی، اسی طرح آپ کو اس دور کے بعد بھی اس مذہب کو حق و صداقت کا مذہب سمجھنا چاہیئے جو نظامِ سرمایہ داری کی تائید کرے۔ کیونکہ اس وقت تاریخی وجوب کا یہی تقاضا ہوگا۔

آپ مذہب پرست طبقہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، آنکھیں بند کئے اپنے معتقدات پر جمے رہتے ہیں۔ اور جو شخص ان کے خلاف کچھ کہے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا نام آپ کے نزدیک مذہبی جنون (FANATICISM) ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ جو مانتے ہیں کہ نظامِ اشتراکیت بہترین نظام ہے تو کیا آپ اس نتیجہ پر عقل و فکر کی رُو سے پہنچے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ اس دور میں پیدا ہوئے جب تاریخی وجوب کی رُو سے اشتراکی نظام کی باری آئی۔ آپ نے اس نظام کی تائید شروع کر دی۔ اگر آپ چند صدیاں پہلے پیدا ہوتے تو تاریخی وجوب کے معتقد کی حیثیت سے آپ نظامِ سرمایہ داری کو عین حق و صداقت کے مطابق نظام قرار دیتے۔ سوچئے یہ مذہبی جنون نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جنون بھی اس شدت کا کہ جو شخص آپ کے اس عقیدہ سے متعلق نہیں آپ اسے زندہ رہنے کا حق تک دینے کے لیے تیار نہیں۔

اسکے مقابلہ میں دینِ خداوندی کو دیکھئے کہ اس نے پہلے دن سے ایک نظام (ربوبیت) کو حق و صداقت کا نظام قرار دیا۔ اور آج تک اسی کو حق و صداقت کا نظام قرار دیئے چلا جاتا ہے اور ہمیشہ تک اسے

ہی حق و صداقت پر مبنی نظام قرار دے گا۔ آپ سوچیئے کہ جو لوگ اس نظام کے مؤید ہیں ان کا مؤقف علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی سمجھا جائے گا یا تاریخی وجوب کے معتقدین کا، جنہیں ہر دور میں اپنے سابقہ مؤقف کے خلاف کہنا اور کرنا پڑے گا۔ یہ فرق ہے وحیٔ خداوندی اور انسانی ذہن کے وضع کردہ نظریاتِ حیات میں!

(۱۷) محترم مستفسر یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی قرآن سے پرویز صاحب نظام ربوبیت ثابت کرتے ہیں۔ اور اسی سے مودودی صاحب، نظامِ سرمایہ داری کی تائید لاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ:۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

محترم مستفسر جس خدا سے پوچھتے ہیں کہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں، اس خدا نے ان سادہ دل بندوں کو پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم نہ دیکھو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مودودی کیا کہتا ہے؟ میری کتاب "گیت ودیا" نہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے تم اس کتاب کو اپنی عقل و فکر کی رُو سے دیکھو اور سمجھو بات صاف ہو جائے گی۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے ممالک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری قرآن کی تعلیم پر ہے یا انسانوں کے خود ساختہ مذہب پر جسے بدقسمتی سے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔

(۱۸) محترم مستفسر نے کہا ہے کہ "ہمیں آگے بڑھنے کے لیے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہ نمائی لینی چاہیئے اور اپنے اردگرد کے حالات سے اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نظامِ ربوبیت تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ یہی ہے"۔

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات اگر وہ اس مذہب پرست طبقہ سے کہتے جو نظامِ سرمایہ داری کو مقدس سمجھتا ہے تو قابلِ فہم ہوتی۔ لیکن نظامِ ربوبیت کے داعیان سے یہ کہنا، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے ان کی مراد وہ چیز ہے جسے وہ اپنے خط کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ "نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے۔ لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے"۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ نہ ہی ہمیں ایسا فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ یہ صاحب واقعی

اشتراکی ہیں اس لیے ان کے پیش نظر وہی ذرائع ہیں جنہیں اشتراکی لیڈر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے پیش نظر کوئی اور ذریعہ ہو لیکن جہاں تک اشتراکی نظام کا تعلق ہے اس کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے جو ذرائع ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لینن اس باب میں کہتا ہے کہ:

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔

ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے"۔

اب رہا طریق کار۔ سو اس کے متعلق لینن لکھتا ہے کہ:۔

سرمایہ داری نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسر اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔ [1]

ظاہر ہے کہ اسلام کی رُو سے ان ذرائع کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام، ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام ربوبیت بھی اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں، بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کی صورت یہ ہے کہ جہاں کوئی مستقل قدر ہاتھ سے چھوٹی، نشوونما رک گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "زندگی کی بعض ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے" تو یہ خالص میکیاولی سیاست ہے جسے شریعتِ خداوندی سے کوئی واسطہ نہیں۔

باقی رہا تشدد کے ذریعہ انقلاب لانا تو قرآن کی رُو سے، اس طرح فساد تو برپا کیا جا سکتا ہے، انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے نزدیک خارج میں انقلاب نہیں آسکتا جب تک انسان کے قلب میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور قلب میں انقلاب صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرمؐ جو انقلاب لائے تھے تو اس کا ذریعہ تعلیم کتاب و حکمت ہی تھا۔ اس سے حضورؐ نے اپنی جماعت کے قلب و نگاہ میں ایسا

---

[1] حوالوں کے لیے دیکھیئے سلیم کے نام خطوط جلد اوّل۔ آٹھواں خط

انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کی نظروں میں زندگی کی اقدار بدل گئیں۔ تشدد کے ذریعے جس قسم کا انقلاب آتا ہے اس کا مزہ خود روس نے چکھ لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اسٹالن کا دور، تشدد کا سخت ترین دور تھا، اب روس میں اس دور کے ہیرو اسٹالن کی لاش تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ اور اس دور کے تشدد کی ہولناک داستانوں کو بار بار دہرا کر لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رُو سے، انقلاب کے لیے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا۔ قرآنی نظریۂ زندگی کی رُو سے احترامِ انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ، ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لیے تو قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریۂ زندگی کی تبدیلی کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی، یقین (CONVICTION) سے آتی ہے اور (CONVICTION) کی بنیاد، دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یہی ایمان وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) عطا کرتا ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے زیادہ سے زیادہ کمائے اور اس میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب، بطیب خاطر دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دے۔ مادی تاریخ، انسان کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس پر اشتراکیت کی کشتی اس بُری طرح ٹوٹی ہے کہ انہیں اس کی شکست و ریخت کو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہاں آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں۔ اس کے برعکس جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ دنیا بھر کے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے مرکز (کعبہ) میں آئیں۔ (لیشھدوا منافع لھم) اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ ان کی نفع بخشیوں کے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔

یہ ہے فرق اسلام کے طریق کار اور اشتراکیت کے طریق کار میں۔

(۷) محترم مستفسر نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک، اسلامی نظام کی مخالف سمت کو جا رہے ہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجہ کے اخذ

کرنے کے لیے یہ دلیل جس قدر کمزور ہے وہ ظاہر ہے۔ محترم مستفسر اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت دنیا کی اکثریت، اشتراکی نظام کی مخالف ہے۔ کیا وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام صحیح نہیں۔ کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ کتنے لوگ اس کے موافق ہیں اور کتنے مخالف۔ اس بات کے پرکھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس نظام پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کیا جائے اور دلائل و براہین کی رُو سے کسی نتیجہ پر پہنچا جائے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور دلائل کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام ربوبیت، نوع انسان کی منفعت کا ضامن ہے اور اس کے سوا دنیا کا کوئی نظام یہ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ ہم اپنے اس دعوے کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرے۔

آخر میں ہم محترم مستفسر کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ اسے حسنِ اتفاق سمجھئے کہ اس وقت آپ کے خیال کے مطابق تاریخی وجوب کا تقاضا بھی وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ سوال اس فلسفۂ زندگی کے اختلاف کا ہے جس پر یہ دونوں نظام متفرع ہیں۔ اگر آپ اس نظام کو قرآنی فلسفۂ زندگی کی رُو سے اختیار کریں گے تو اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ کل کو جب، تاریخی وجوب کی اٹل گردش کے مطابق، پھر سے نظامِ سرمایہ داری کی باری آگئی تو اس وقت آپ کو یہ خفت نہیں اٹھانی پڑے گی کہ جس اشتراکی نظام کو آپ کل تک نوع انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیتے تھے، اسے نوع انسانی کی تباہی و بربادی کا موجب ٹھہرانا پڑے۔ قرآن یہ کبھی نہیں کہے گا کہ جس بات کو وہ آج نوع انسان کی منفعت کا موجب بتائے اسے کل کو، انسانیت کی تباہی کا باعث قرار دیدے۔ اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ وہ "تاریخی وجوب" کی گردشِ دولابی سے ہر زمانے میں بدلتے نہیں رہتے۔ اس نکتہ کو ذرا اشتراکی نظام کی تاریخ کی روشنی میں دیکھیے۔ مارکس نے اپنے تصوّر کو ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے پیش کیا اور لینن کے زمانے تک اسے ایسا ہی سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسٹالن نے اس کی عالمگیر حیثیت کو ختم کر کے قومی حیثیت دے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ نظام روس کا قومی نظام بن کر رہ گیا۔ اب اس نظام کی جنگ دوسرے نظاموں سے نہیں رہی۔ اب روس کی جنگ دیگر ممالک سے ہوتی ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ روس کو انہی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے دوستی کے معاہدات کرنے پڑ رہے ہیں۔ جس نظام کے خلاف اشتراکی نظام صدائے احتجاج بن کر اُٹھا تھا اور اس کے خلاف ان ممالک سے تعلقات منقطع کرنے پڑ رہے ہیں، جو خود اشتراکی نظام کے داعی ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مستقل اقدار پر ایمان نہ ہونے کا۔ اس کے برعکس قرآن کریم زندگی کا جو نظام پیش کرتا ہے اس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ (۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے (۲) نظام وہی حق و صداقت پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے جس کے پیش نظر کسی خاص ملک، خاص قوم، خاص گروہ اور خاص پارٹی کا مفاد نہ ہو بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔ (۳) دنیا میں "اپنوں" اور "بیگانوں" کی تمیز اور تفریق کا معیار یہ ہے کہ جو لوگ قرآنی نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں وہ اپنے ہیں جو اس کے مخالف ہوں وہ بیگانے۔ خواہ وہ روس کے اشتراکی ہوں یا امریکہ کے جمہوریت نواز۔ (۴) اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور انسان کا ہر ارادہ اور عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔ خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آئے یا اس کے بعد۔ اسی تصور کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انسان اپنے ہر عمل بلکہ ہر ارادہ تک کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ اور کسی دور کے کسی "اسٹالن" کو اس کا اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں جناب مستفسر سے کہ کیا نوعِ انسان کے امن و فلاح کا ضامن اس قسم کا نظام ہو سکتا ہے یا اشتراکی نظام!

(جنوری ۱۹۶۴ء)

---

(۳) کیا سود لینا جائز ہے

ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیا بنک کا سود جائز ہے۔ اسی سلسلے میں یہ سوال سامنے آگیا کہ سود (ربوٰ) کہتے کسے ہیں۔ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جو ماہنامہ فکر و نظر کی نومبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ

قرآن کریم کی رو سے ربوٰا کی صرف وہ شکل حرام ہے جو اضعافاً مضعفہ ہو جائے۔ اس پر طلوع اسلام نے ایک تبصرہ لکھا۔ جس میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس امر کی وضاحت کی کہ قرآن کی رُو سے ربوٰا کسے کہتے ہیں۔ وہ تبصرہ حسب ذیل ہے:۔

طلوع اسلام کا تبصرہ

محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ جس کے لیے ہم انہیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ قرآن کی رُو سے ربوٰا کی واضح تعریف، جو ان کے بالکل سامنے پڑی تھی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی جس کی وجہ سے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ قرآن نے صرف (مروّجہ الفاظ میں) سود در سود (یا سود مرکب) کو حرام قرار دیا ہے۔ سادہ سود کو نہیں۔

قرآن کی رُو سے ربوٰا کی تعریف قرآن کی رُو سے ربوٰا کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے جو سورۃ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں اور جنہیں ڈاکٹر صاحب نے بھی درج کیا ہے یعنی

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ

اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارا راس المال ہے۔

سابقہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربوٰا لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربوٰا لینے سے باز آجاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے لو اس کے بعد ہے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ:۔

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے یہ مقروض پر ظلم ہوگا۔ اسی کا نام ربوٰا ہے۔ یعنی زرِ اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہیئے کہ اس میں کوئی الجھاؤ۔ کسی قسم کا التباس۔ کوئی شک و شبہ کوئی دشواری یا مشکل ہے؟

۲- ڈاکٹر صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ نتیجہ بوجوہ غلط ہے۔ یہ نتیجہ انہوں نے حسب ذیل آیت سے نکالا ہے:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (۳/۱۳۰)۔

اس کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے:۔

"اے ایمان والو! یہ دوچند سہ چند ہونے والا ربوٰ کھانا چھوڑ دو۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں مُضَاعَفَةً دراصل ضَعْفٌ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضِعْفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربوٰ، جیسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھانا نہیں بلکہ درحقیقت (ضَعْفٌ) کم کرنا ہے۔ ربوٰ سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے۔ اور سود خور کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لیے کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ربوٰ سے افراد کی کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آجاتی ہے۔

لیکن اگر اضعافًا مُّضٰعَفَةً کے معنی "دوچند۔ سہ چند" بھی لئے جائیں تو بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا۔ کہ قرآن کریم صرف مرکب سود (ربوٰ) کو حرام قرار دیتا ہے۔ مفرد ربوا کو جائز ٹھہراتا ہے قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ ممنوع چیزوں کی شدید ترین شکل کو سامنے لاکر ان سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد ان چیزوں کی ہر شکل سے اجتناب ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ حج میں ہے کہ وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (۲۲/۳۰) "تم بتوں کی گندگی سے بچو"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم صرف بتوں کی گندگی سے بچو اور باقی ہر قسم کی گندگی سے بے تکلف ملوث ہوتے رہو۔ یا سورۂ بقرہ میں ہے۔

قرآن کا انداز

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (۲/۱۹۷)۔

حج میں، فحش کلامی۔ گناہ کے کام۔ اور لڑائی جھگڑا مت کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان باتوں سے صرف حج کے ایام میں باز رہو۔ سال کے باقی حصوں میں یا دوسرے مقامات پر یہ سب کچھ کرتے رہو۔ ظاہر ہے کہ حیائی اور گناہ کی باتیں بہرحال ناجائز ہیں۔ ان کی کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اجازت نہیں۔ قرآن

نے حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ ایسے اجتماع میں ان امور شنیعہ سے اجتناب اشد ضروری ہے یا اس لیے کہ اس زمانے میں لوگ حج کے اجتماع میں بھی ان باتوں سے باز نہیں آتے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہے کہ یہ باتیں ہر حال میں معیوب اور ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن ان اجتماعات میں ان سے اجتناب اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اضعافاً مضاعفۃ کی ہے۔ یعنی ربوٰ تو ہر شکل میں ناجائز ہے لیکن جب وہ مرکب سود کی شکل اختیار کر جائے تو وہ اور بھی زیادہ شدید طور پر خطرناک ہو جاتا ہے۔ اگر (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے) ممانعت صرف سود مرکب کی ہوتی تو سورۂ بقرہ کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو تمھارے لیے صرف اصل زر واپس لینا جائز ہے۔ وہاں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ تم اصل زر کے ساتھ اتنا اور لے سکتے ہو جتنا سود مفرد کے حساب سے بنتا ہے۔ اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوگا لیکن قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے صرف اصل زر واپس لینے کی اجازت دی ہے۔ اس پر ایک پائی بھی زیادہ لی جائے گی تو وہ ظلم ہوگا۔ اسی طرح اس سے پہلی آیت میں جو اس نے کہا ہے کہ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا (۲/۲۷۸) "جو ربوٰ تم نے ابھی تک وصول نہیں کیا اسے چھوڑ دو" تو ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق کہنا یہ چاہیئے تھا کہ سود مفرد کے حساب سے جس قدر رقم بنتی ہے اسے مجرا لیکر بقایا چھوڑ دو۔ قرآن نے ایسا نہیں کہا اس سے بھی واضح ہے کہ اس کے نزدیک مطلق ربوٰ حرام ہے۔

قرآن کی رُو سے ربوٰ کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع اصول ہے اور قرآنی نظام معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ، محنت (LABOUR) کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے

معاوضہ کس چیز کا جائز ہے کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹) انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی

کیوں نہ ہو۔ وہ ربوٰ ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے۔ اور خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعہ اراضی خرید

ربوا کی مختلف شکلیں

کر اس میں کاشت کرے اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا قرضہ بھی ادا کر دے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے لیکن اسی روپے سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پٹہ پر دے دیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے کیا یہ ربوٰ نہیں ؟

یا ایک دکان دار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے۔ آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں وہ آپ کو منافع کا حصہ دیئے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟

یا آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بنک میں جمع کر دیتے ہیں اور بینک والے اس روپے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دے دیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے۔ اور آپ کا اصل زر بینک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟ یہ سب ربوٰ ہے اور قرآن کی رُو سے ناجائز۔ خواہ اسے سود مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں

آپ غور کیجئے تو بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفتہً دیتا ہے۔ لہٰذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورت مند کی مدد کے لیے حسبۃً للہ دیا جاتا ہے۔

قرآن کی رُو سے وہ ضرورت مند اس امداد کو معاشرہ سے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اُجرت۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) ربٰو۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا، محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار (جُوا) اس میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔ (شقِ اول کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھیے جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اسکا اصول یہ ہے کہ معاوضہ

معاوضہ محنت کا ہے

محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لیے ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربٰو میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپیہ قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے۔؟

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (۲/۲۷۵) وہ بیع اور ربٰو کو ایک جیسا سمجھتے تھے لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آجاتا ہے اور

بیع اور ربٰو میں فرق

دکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ، سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے، یہ حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربٰو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے۔ جو حرام ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی رُو سے اصول یہ ہے کہ:۔

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے۔ تو وہ ربٰو ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (RISK) لیتا ہے یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربٰو میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلّت اور حرمت کے لیئے یہ معیارِ تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہی ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربٰو میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں راس المال + محنت کا معاوضہ واپس ملتا ہے۔ اور ربٰو میں صرف راس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ راس المال کا معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رُو سے ربٰو کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آج کل پیش آرہی ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ:-

(۱) ربٰو کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن (بدقسمتی سے) ہماری مروجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جاسکے وغیرہ) ہمارے ارباب شریعت اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں۔ اس لیے وہ ربٰو کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رُو سے یہ شکلیں ربٰو کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلا محنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہوچکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے اس لیے وہ ربٰو کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگاکر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہوگیا ہے۔ لیکن وہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لیے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کرکے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش

پیوندسازی سے کام نہیں چلے گا

کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے :۔

(ا) زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوع انسان کی پرورش کے لیے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُمت کی تحویل میں رہے گی۔ تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لیے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لیے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کسی کا دست نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرنے کی ایجنسی ہو گا اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربٰو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ربٰو سود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔ قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کر کے، کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو "خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ" قرار دیا ہے یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربٰو کا مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کر لیں۔ اسی قسم کی کوشش ہم نے

دو متضاد نظام

اس سے پہلے اپنے جاگیر داری اور زمینداری دور (عہد عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربت، تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب در فریب میں مبتلا کر لیں گے۔ بینکوں کے سود وغیرہ کے سلسلے میں اس وقت جو مخالفت قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظام معیشت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے۔ اسے اب "جائز" کی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک "بدعت" ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دے دی گئی تھیں، ممکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلے میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت نرم شکل ہے۔

بینکوں کے سود کی مخالفت

اشتراکیت کی آڑ

لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اور چونکہ قرآنی نظام بھی سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفۂ حیات کی ضد ہے[1]۔ اس چیز کو ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ:۔

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش، نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ محنت کئے بغیر دولت حاصل ہو جائے۔ علمت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں، نہ سرمایہ دار، سرمایہ دار تو

---

[1] اس نکتہ کی وضاحت سابقہ عنوان میں کی جا چکی ہے۔

پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں، مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہٰذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔

(۲) لیکن ان میں اتنی جرأت ہے نہیں کہ یہ کھلے بندوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رُو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہٰذا یہ کرتے یہ ہیں کہ (۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ اور چونکہ (جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) قرآنی نظام اور اشتراکی نظام کی بعض جُزئیات میں مماثلت ہے۔ اس لیے عوام اور سطح بین پڑھے لکھے لوگ فوراً ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سینے میں دردمند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہیئے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ ٹھہرا دیے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لیے، مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہر بیں ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے۔ ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضرور نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی فرق، اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفۂ حیات کا ماننے والا بیشک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جز کا باہمد گر مماثل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لیے کہ کمیونزم میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کو ناجائز قرار دے دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لیے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کو جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت

اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ہائے حیات کے فرق کو پیش نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جب سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کو لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام + خدا = اسلام

تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائداعظم سے کہا تھا کہ ہندو اگر اشتراکی نظام معیشت کو اپناتا ہے تو اسے ہندومت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپناتا ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرف جانے کے مترادف ہوگا۔ جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا۔ تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفۂ زندگی کے فرق کو نظرانداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ:۔

"اگر ہم نے اشتراکی نظام معیشت اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی قبول کرنا ہوگا جس کے لیے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں"۔

یہ "جبر" اشتراکی فلسفۂ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفۂ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات، اُسے نشوونما دینے والی مستقل اقدار، قانون مکافاتِ عمل اور اُخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان ہے جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں جبر نہیں

اشتراکیت خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر استوار اور ایمان کے ذریعہ قبول اور اختیار کیا جائے۔ اس سے وہ "جذبۂ معاونت" پیدا ہوتا ہے جسے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے نظام سرمایہ داری کو کالعدم کر دینے کے لیے بنیادی شرط قرار دیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو

کرنے لگ گئے۔ اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے

کرنے کا کام پہلے:۔

یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لیے کہ:۔

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آ رہی ہے اس پر نظر ثانی نہیں کی جا سکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآن کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصر حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح، پہلے یہ متعین ہو جائے۔ کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجود نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طریق و وسائل پر غور کر کے چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اسلامی نظام اور اس کی حکمتِ بالغہ۔ اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعے آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اسطرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اس طرح مضطرب و بے تاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہے جس طرح اب تک بناتے چلے آ رہے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ، اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہیں۔ ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنا.....

ویحسبون انھم یحسنون صنعا۔ (۱۰۴-۱۰۵/۱۰۸)

اور اصل مسئلہ جوں کا توں رہے۔ بینک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجیے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ "بے محنت کی کمائی" کی اُس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصولِ معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آ رہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی۔ مضاربت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی۔ مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بینک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بینک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ قرآن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی ہی نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت، ملت کی تحویل میں رہے گی۔ اور وہیں سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اُٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔ (فروری ۱۹۶۴ء)

قرآن کا معاشی نظام

اسلام وعلیکم۔ چند ایک نکات پر آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے لیے تھوڑا بہت وقت نکال سکیں گے۔

نمبر ۱ اسلامی معاشی نظام میں ایک لامحدود ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کے پاس ایک دفعہ کسی طرح سے سرمایہ آجائے تو پھر وہ سرمایہ عموماً بڑھتا ہی رہتا ہے۔ بیشتر حالات میں نفع اور نقصان کے بعد حساب کرنے پر نفع کا پلڑا عموماً بھاری ہی رہتا ہے اور پھر نتیجتہً سرمایہ اپنی اصلی مقدار سے دُگنا، سہ گنا اور کئی ہزار گنا تک ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) کیا سرمایہ میں یہ زیادتی محض اس سرمایہ اور محنت کا بدلہ ہے جو شروع میں لگایا جاتا ہے۔

(۲) یا محض اس دیکھ بھال (SUPERVISION) کا انعام ہے۔ جو ایک بڑا سرمایہ دار اپنے بند کمرے میں بیٹھ کر ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ کرتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آخر سرمایہ دار نے بھی تو اپنے جسم و ذہن سے محنت کی ہے۔ اس کا بدلہ اسے بھی ملنا چاہیئے لیکن تب بھی یہ چیز سامنے آتی ہے کہ آیا ایک شخص کی ذہنی و جسمانی محنت کی قیمت دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اس لیے کئی سو گنا ہو گئی کہ اس کے پاس سرمایہ ہے۔ مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس دس لاکھ روپے کا کاروبار ہے اگر آپ اسے ایک ماہ میں صرف ایک فیصدی منافع لینے کی اجازت دیں تب بھی اسے دس ہزار روپے ماہوار بچے گا جو آپ کے ایک بہترین معاشی نظام میں کم از کم دس آدمیوں کی آمدنی کے برابر ہو گا۔ صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کو جس چیز نے مالی طور پر دس آدمیوں کے برابر بنایا ہے وہ صرف لامحدود (یا بہ نسبت زیادہ) سرمایہ ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کی حدِ منافع بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس لامحدود ملکیت کے تصور نے معاشی توازن کو کتنا بگاڑ دیا ہے۔

لیکن اگر اس کے مقابلہ میں بڑی صنعتوں کو تمام لوگوں کے اجتماعی کنٹرول (حکومت) میں دے دیا جائے اور چھوٹے پیمانے پر عام آدمی کو کاروبار کرنے کی اجازت ملے تو سرمایہ دار اور مزدور کی آمدنی کا فرق معقول حد تک گھٹ جائے گا۔

نمبر ۲ ایک شخص نے محنت کی اور اسے اس کا بدلہ مل گیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان کو کروڑوں روپے محض اسلیئے مل جائیں کہ وہ ایک کروڑپتی کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک انسان کو ہوش آتے ہی سب سے بڑی فکر اپنی روٹی کی ہو تو کیا یہ محض اس لیے کہ اس کا باپ ایک غریب انسان تھا۔ (کسی امیر یا غریب کے گھر پیدا ہونا کوئی اختیاری فعل تو ہے نہیں کہ جس کے سلسلے میں کوئی انعام یا سزا دی جا سکے)۔ اسلام کا وراثت کا قانون بھی اس مسئلہ کا مکمل حل نہیں۔ یہ درست ہے کہ قانون وراثت سے جائداد کئی حصوں میں بٹے گی لیکن ایک بڑی جائداد کے اگر دو چار حصے ہو بھی جائیں اور پھر یہ علیحدہ علیحدہ کاروبار میں لگ کر منافع کمانا شروع کر دیں۔ جس منافع میں سرمایہ کے مقابلہ میں محنت کا حصہ بعض اوقات تقریباً نظر انداز کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے — تو تھوڑے ہی عرصے بعد

اصل جائداد سے کئی گنا بڑی جائداد پھر بن جائے گی۔

صورت حال خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ اعتراض بہرحال وہیں ہے کہ ایک شخص کو ورثہ میں دس لاکھ روپیہ ملے۔ اور دوسرے کو دس روپے محض اس بنا پر کہ ایک کے باپ کی چالیس لاکھ کی جائداد تھی اور دوسرے کی صرف چالیس روپے کی۔ ورثہ میں مقدار کے فرق کے علاوہ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو کس حق کی بنا پر کچھ دیا جائے۔ محنت نہیں کی تو آخر بدلہ کس چیز کا۔ ؟

نمبر۳ اس چیز کے نتیجہ میں جو چیز ظہور پذیر ہو گی وہ اس اصول کو ہی ختم کر دے گی کہ ہر شخص کو زندگی کی دوڑ میں مساوی مواقع ملنے چاہئیے۔ ظاہر ہے کہ پہلا شخص تو آسانی سے اپنا کام شروع کر سکے گا۔ لیکن دوسرے کو سوائے مصائب و مشکلات کے اور کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ کیا اسلام کوئی ایسا متوازی نظام پیش کرتا ہے جس میں اس چیز کا ازالہ کیا گیا ہو ؟ اور ہر شخص کو بنیادی طور پر زندگی کی دوڑ میں ہر طرح کے مساوی مواقع ملیں۔ ——————

—————— اور اگر نہیں تو کیوں نہ ہر شخص کو ورثہ میں ملنے والی جائداد کو اتنا گھٹایا یا بڑھایا جائے کہ ایک متوازن صورت حال پیدا ہو جائے۔ ضرورت سے زیادہ ورثہ کو "جنرل کنٹرول" میں دے دیا جائے اور اگر ورثہ ضرورت سے کم ہو تو جنرل کنٹرول سے ہی پورا کر لیا جائے۔ میرے ذہن میں یہ چند اشکالات ہیں۔ جن کا حل مقصود ہے کوئی بحث کھڑی کرنا مقصد نہیں۔

والسلام

جواب

قرآن کریم جس معاشی نظام کا تصور پیش کرتا ہے اس میں وہ مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ اس نظام کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایک چیز ہے سرمایہ اور دوسری چیز ہے محنت۔ قرآن کریم کی رُو سے معاوضہ، محنت کا مل سکتا ہے (لیس للانسان الا ما سعیٰ (۵۳/۳۹)

جو نفع محض سرمایہ پر حاصل ہوا سے ربوٰ کہا جاتا ہے اور ربوٰ قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے۔ ایسا حرام کہ اسے "خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲/۲۷۹) تجارت ہو یا صنعت، زمینداری ہو یا جائداد اندوزی۔ جہاں اور جتنا منافع صرف سرمایہ پر حاصل ہو گا۔ اس کا شمار

ربوٰ میں ہو جائے گا۔

(۲) قرآنی نظام میں تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ (مملکت) کے سر پر ہوتی ہے (۵۱/۱۹) ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے کہ وسائل پیداوار اس کے زیر اقتدار ہوں۔ جب شکل یہ ہو گی تو کسی کو جائدادیں بنانے اور دولت سمیٹ کر رکھنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ جو کچھ کسی کی ضروریات سے زائد ہے وہ نوع انسان کی عام پرورش کے لیے کھلا رہنا چاہیئے (۲/۲۱۹)۔ اس کی رُو سے دولت کے انبار جمع کرنا جہنم کا عذاب مول لینا ہے۔ (۹/۳۴-۳۵)

(۳) جب اس نظام میں جائدادیں کھڑی کرنے یا دولت کے انبار جمع کرنے کی اجازت (یا ضرورت) ہی نہیں ہو گی، تو وراثت میں اتنا کچھ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ لہٰذا زندگی کے میدان میں ہر انسانی بچہ ایک ہی مقام سے دوڑ کی ابتدا کرے گا اور چونکہ ہر ایک کے لیے سامان نشوونما کا مہیا کرنا معاشرہ کے ذمہ ہو گا۔ اس لیے وہ راستے میں بھی کسی مقام پر اس لیے نہیں رُک جائے گا کہ اسے آگے بڑھنے کا سامان میسّر نہیں۔

(۴) لیکن قرآن دنیا میں مروج غلط نظام سے اپنے اس مثالی[1] نظام تک بتدریج لے جانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ سب سے پہلے تعلیم و تربیت سے انسانی قلب و دماغ کی اصلاح کرتا ہے اور اس کے دل میں اس یقین کو راسخ کرتا ہے کہ جو انسان زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنی ضروریات سے زائد سامان زیست (دولت وغیرہ) کو دوسرے انسانوں کی ضروریات کے لیے دے دیتا ہے، اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور وہ اس دنیا سے اگلی دنیا میں سرفرازی اور خوشگواری (جنّت) کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ایمان وہ بنیاد ہے جس پر اس نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ بتدریج موجودہ معاشی نظام کو اپنے نظام میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے وہ کہیں حکم دیتا ہے کہ دولت کی گردش اوپر کے طبقہ میں ہی نہیں رہنی چاہیئے (۵۹/۷) اسے سارے معاشرہ میں یوں رواں دواں رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ کہیں

---

[1] قرآن کے معاشی نظام کی تفصیلات پرویز صاحب کی کتاب "نظام ربوبیت" میں ملیں گی۔

وہ زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر ذاتی املاک کو کم کئے جاتا ہے (۱۳/۴۱)
دوسری طرف وہ صدقہ اور خیرات اور احسان و ایثار کی ترغیب سے، بہ طیب خاطر، دولت کو ضرورت مندوں کی طرف منتقل کرنے کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ وراثت کے احکام بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ اس طریق سے وہ رفتہ رفتہ معاشرہ کو اپنے معیاری نظام کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد ان اقدامات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جب معاشرہ میں کوئی محتاج ہی نہیں رہے گا تو خیرات کسے دی جائے گی۔ جب کسی کی جائیداد ہی نہیں ہوگی تو ورثہ میں کیا تقسیم ہوگا۔

(۵) رسول اللہ کی زندگی اس مثالی نظام کا بہترین نمونہ تھی۔ (حضورؐ کی حیاتِ طیبہ، امت ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ۔ بہترین نمونہ ہے) رسول کرنا یہ ہے کہ معاشرہ کو بتدریج منتہیٰ تک لے جاتا ہے اور اس منتہیٰ کا نمونہ خود بن کر دکھاتا ہے۔ آپ، حضورؐ کی زندگی کو دیکھیے۔ آپؐ نے تمام عمر ایک پائی بھی ضرورت سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھی۔ حتیٰ کہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے رہے (۵۹/۹) آپؐ نے ایک پیسہ کی جائداد تک نہیں کھڑی کی۔ وفات کے وقت گھر میں سات دینار تھے۔ جب تک انہیں منفعت عامہ کے لیے دے نہیں دیا۔ دنیا سے رُخصت نہیں ہوئے۔ دنیا سے رُخصت ہوئے تو اپنے ورثا میں کچھ بھی نہ چھوڑا۔ جو استعمال کی چیزیں چھوڑیں ان کے متعلق بھی فرما دیا کہ وہ عام مسلمانوں کے لیے کھلی رہیں گی۔ ورثہ میں تقسیم نہیں ہوں گی۔ اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع مملکت وجود میں آچکی تھی اور حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے۔ قرآن کریم نے بعض احکام کے متعلق کہا ہے کہ وہ صرف حضورؐ کی ذات تک محدود تھے۔ دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں تھے۔ مثلاً حضورؐ کی ازواج مطہرات کسی اور کے نکاح میں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن حضورؐ نے جو معاشی زندگی بسر فرمائی اس کے متعلق کہیں یہ نہیں آیا کہ وہ صرف حضورؐ تک محدود تھی۔ وہ زندگی قرآن کریم کے پیش کردہ معاشی نظام کا سمٹا ہوا عکس تھی اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ جب یہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوگا تو اس میں افرادِ معاشرہ کی یہی زندگی ہوگی۔

اور یہی وہ نظام ہے جو نوعِ انسان کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے جس میں وہ اس وقت بُری طرح سے مبتلا ہے اور جس کے ذمہ دار یورپ کا قدیم غاصبانہ معاشی نظام اور روس کا جدید

مستبدانہ نظام دونوں ہیں۔ بنیاد ان دونوں کی باطل پر ہے اور جو نظام بھی باطل کی بنیادوں پر اُٹھے گا۔ وہ انسانیت کے لیے کبھی تعمیری نتائج مرتب نہیں کر سکے گا۔ حق کی بنیادیں صرف وحیٔ خداوندی مہیا کر سکتی ہے اور وحی خداوندی نہ یورپ اور امریکہ کے ہاں ہے نہ روس کے۔ یہ صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ (۱۹۶۴ء)

---

۵ ـــــ حضورؐ نے کچھ جمع نہیں کیا

حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ

سوال:۔ کیا رسول اللہؐ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع ہمارے لیے ضروری نہیں۔ جب رسول اللہؐ نے ایک پیسہ بھی جمع نہیں کیا اور نہ ہی کچھ ورثہ چھوڑا ہے تو کیا ہمارے لیے یہی اُسوہ نہیں؟ اور اگر یہی ہے تو پھر قرآن میں ترکہ اور وراثت کے احکام کیوں ہیں؟

جواب:۔ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ قرآن، مومن کی زندگی کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کی مکمل ترین مثال حضورؐ کی سیرت تھی۔ اسی لیے وہ ہمارے لیے نمونہ بنتی ہے۔ حضورؐ نے اس کی مثال قائم کی۔ اور جماعتِ مومنین بتدریج اس منتہیٰ کی طرف بڑھتی گئی۔ لیکن اس قسم کی زندگی اس نظام کے اندر ہی ممکن ہے جو قرآنی خطوط کے مطابق قائم کیا جائے۔ یہی وہ نظامِ معاشرہ تھا جس کے اندر یہ جماعت اس منتہیٰ کی طرف بڑھتی گئی تھی۔ اس نظام میں کسی فرد کو ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ مال جمع کرے اور اپنے ورثا کے لیے جائدادیں چھوڑے۔ لیکن یہ نظام بتدریج قائم ہوتا ہے۔ جب تک یہ قائم نہ ہو، لوگوں کے پاس مال بھی جمع ہوتا ہے۔ اور وہ ترکہ بھی چھوڑتے ہیں۔ اور یہ ترکہ وراثت کے احکام کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد، نہ کوئی ترکہ چھوڑتا ہے نہ اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہی اسلامی زندگی کی آخری شکل ہے جس کی مثال حضورؐ نے قائم کر کے دکھائی۔ لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ ہمارے ہاں سنتِ رسول اللہؐ کے

اتباع پر اس قدر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس طرزِ زندگی کو عین اسلامی بھی بتایا جاتا ہے جس میں لوگ دھڑا دھڑ مال جمع کرتے جائیں۔

صحابہ کبارؓ کی زندگی

سوال: تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑے بڑے اولوالعزم صحابہؓ کے پاس دولت کے انبار ہوتے تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے تو یہ اس زمانے کی بات ہو سکتی ہے جب اسلامی نظام ہنوز اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم، دولت کے انبار جمع کرنے کو اتنی سختی سے روکے۔ نبی اکرمؐ، قرآن کی اس تعلیم پر عمل کر کے نمونہ پیش کریں۔ اور صحابہ کبارؓ (معاذ اللہ) اس کے خلاف زندگی بسر کریں! اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ضمن میں ایک اصول یاد رکھیے۔ صحابۂ کبارؓ رسولؐ اللہ کے سچے متبع تھے اور رسول اللہ کی زندگی عین مطابق قرآن تھی۔ اس لیے اگر ہمیں تاریخ میں صحابۂ کبارؓ (یا خود نبی اکرمؐ) کے متعلق کوئی ایسی بات ملے جو قرآن کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔ رسولؐ اللہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی، کے مطابقِ قرآن ہونے کی شہادت خود قرآن دیتا ہے۔ جب ایک طرف قرآن کی شہادت ہو (جو خود خدا کی شہادت ہے) اور دوسری طرف تاریخ کا بیان ہو (جو بہرحال انسانوں کی جمع اور مرتب کردہ ہے) تو قرآنی شہادت کو بہرحال قبول کیا جائے گا، اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ اس اصول کے مطابق کریں گے تو عہد محمد رسول اللہ والذین معہؐ کا صحیح تصور ہمارے سامنے آ جائے گا۔

(۱۹۶۳ء)

---

۶ — قومی ملکیت

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ طلوع اسلام اس نظریہ کا داعی ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلامی معاشرہ کی مکمل شکل اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب زمین اور دیگر ذرائع پیداوار اجتماعی نظام کی

تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اور وہ تمام افرادِ مملکت کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اس کے برعکس سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی کتاب مسئلہ ملکیت زمین میں اس نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصولوں پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔ جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ۔ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔ اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہیں ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمین پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے۔ تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو۔ مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے، نہ کہ اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے، نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لیے تو یہ نہایت ضروری

ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض
کے لیے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔"

یعنی ان کے نزدیک اس طرح ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے۔ جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کرسکا۔ ہم حیران ہیں کہ ہم اسے کیا سمجھیں کیا آپ براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں گے؟

جواب۔

قومی ملکیت کے مسئلہ پر جو کچھ طلوع اسلام میں آیا ہے۔ اس کے متعلق قرآنی دلائل دیے گئے تھے۔ مودودی صاحب نے اس فتویٰ میں کسی قرآنی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ باقی رہی ان کی وہ ادیبانہ دلیل جو انہوں نے اس اقتباس میں پیش کی ہے۔ سو وہ تلبیس حق و باطل کی ایک بڑی دلچسپ مثال ہے۔ سوال پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی نظام معاشرت و تمدن میں ذرائع پیداوار مرکزی تحویل میں دیئے جائیں گے یا افراد کے پاس رکھے جائیں گے۔ یہ حقیقت واضح ہے اور خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت آج تک یہی پکارتی چلی آرہی کہ اسلام کے نظام حکومت میں نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین، متشرع، متقی پرہیز گار، خدا ترس یعنی بہمہ وجوہ خدا اور رسولؐ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ حکومت کو علیٰ منہاج نبوت و منہاج خلافت راشدہ قائم کریں گے۔ اب مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار کو نظام کی تحویل میں دے دیا جائے تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمراں گروہ کی غلام بن کر رہ جائے گی جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی، انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہوجائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوجائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کرسکا۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی نظام حکومت میں۔

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر حکمراں گروہ کے ہاتھ میں آجائے گا۔

(۲) ملت اس حکمراں گروہ کی غلام ہوگی۔

(۳) اس حکمراں گروہ کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی جو

وہ دوسروں کو غلام بنانے کے لیے استعمال کر سکیں گے۔

لہٰذا

(۴) سوداگری، کارخنداری اور زمینداری بھی سمٹ کر انہی کے ہاتھوں میں آ گئی تو اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت ذبح ہو جائے گی۔

اگر اسلامی نظام حکومت کے ارباب حل و عقد کی بھی یہی حالت ہو گی کہ اگر ان کے ہاتھ میں رزق کے سرچشمے چلے گئے تو وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ تو فرمائیے کہ فرعونی نظام اور ایک اسلامی نظام میں پھر فرق کیا ہو گا ؟ اگر حالت یہی ہونی ہے۔ تو پھر اس اسلامی نظام میں کیا خوبیاں ہیں جن کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کی ہر کوشش کا نام جہاد رکھا جاتا ہے ؟ اگر اسلامی نظام میں بھی بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کا محکوم بننا ہے۔ اگر اس میں بھی پولیس، فوج، عدالت اور قانون سازی کی طاقتوں نے حکمراں گروہ کے مفاد ہی کا تحفظ کرنا ہے۔ اگر انہوں نے بھی ذرائع پیداوار پر سانپ بن کر بیٹھ جانا ہے۔ تو پھر موجودہ نظاموں میں کون سی خرابی ہے کہ اس نظام میں نہیں ہو گی۔

یہ ہے وہ دلیل جس کی بنا پر مودودی صاحب نے قومی ملکیت کو شیطانی نظام قرار دیا ہے۔ یعنی بات اسلامی نظام کی ہو رہی ہے اور اس مسئلہ کے خلاف خرابیاں وہ گنا رہے ہیں جن کا موجودہ غیر اسلامی نظام حکومت میں پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے شام اور عراق اور دیگر مفتوح ممالک کی زمینوں کے متعلق یہ انتظام فرمایا تھا کہ انہیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے اور اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتہً نظام حکومت کرے۔ تو کیا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) شیطان کی ایجاد تھا ؟ اور کیا اس انتظام سے وہ تمام خرابیاں رونما ہو گئی تھیں جنہیں مودودی صاحب اس نظام کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

اس تصور کے خلاف کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "مسئلہ ملکیت زمین" میں ایک عجیب طنزیہ تنقید کی ہے وہ فرماتے ہیں۔

> آجکل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک فقرہ یوں نکالا ہے۔ " الارض للہ" اور انہوں نے اس پر قیاسات کا ایک پورا کریملن تعمیر کر ڈالا ہے۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں :۔

اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ للہ ما فی السموات و ما فی الارض (آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔)

قطع نظر اس کے کہ الارض للہ زمین کی نجی ملکیت کی تائید میں کوئی اہم دلیل بن سکتی ہے یا نہیں، ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب ایک ہی قسم کی آیات سے ایک مفہوم اپنے مطلب کے مطابق لیتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری آیات کا مفہوم جب ان کی مصلحت کے خلاف جاتا ہے تو اسے مردود قرار دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی جماعت کے تمام دعاوی کا مدار اس اصولی دعوے پر ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کے لیے ہے۔ کسی فرد کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اور "خدا کی حکومت" سے ان کی مراد یہ ہے کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو (بقول ان کے) خدا کی نیابت کے طور پر اس کی منشاء کے مطابق حکومت چلائیں۔ اس دعوے کی بنیاد ان الحکم الا للہ (ان الحکم للہ الا للہ) ہے۔ یعنی "خدا کی حکومت"۔ اب ذرا سوچئے کہ مودودی صاحب نے الحکم للہ سے قیاسات کا یہ سارا کرہمان اپنے حق میں تعمیر کر لیا کہ حکومت کا حق افراد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اس کا حق ملت کو پہنچتا ہے جو منشائے خداوندی کے مطابق حکومت چلائے لیکن اگر کوئی شخص الارض للہ سے بعینہٖ اس قسم کا مفہوم لے یعنی وہ کہے کہ زمین پر افراد کو ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ملت کی ملکیت ہے اور ملت ہی کو حق پہونچتا ہے کہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق اس کا انتظام کرے۔ تو مودودی صاحب کے نزدیک یہ "من مانی تاویل" بن جاتی ہے۔ یعنی الحکم للہ کی وہی تاویل عین قرآنی ہے۔ اور الارض للہ کی اس قسم کی تاویل من مانی ــــ الارض للہ کے خلاف مودودی صاحب کی دلیل یہ ہے۔ کہ قرآن میں تو یہ بھی آیا ہے کہ للہ ما فی السموات و ما فی الارض لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح سے الحکم للہ کے ضمن میں بھی تو ان میں آیا ہے کہ ملکوت کل شئی خدا کے لیے ہے اور ملکوت السموات والارض اسی کے لیے ہے۔

مودودی صاحب نے بڑے طعن آمیز انداز میں فرمایا ہے کہ اس طرح تو سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت میں نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ جو کچھ زمین آسمان میں ہے اللہ کا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ میاں (معاذ اللہ) بیٹھے بیٹھے یونہی شاعری کرتے رہتے ہیں اس لیے جو کچھ وہ

کہتے ہیں اسے سچ مچ نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ انہیں کون سمجھائے کہ قرآن میں اللہ نے شاعری نہیں کی۔ جو کچھ کہا ہے سچ مچ ٹھیک کہا ہے۔ قانون خداوندی کے مطابق قائم کردہ نظام میں "افراد کی ملکیت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں افراد کا فریضۂ زندگی نوع انسانی کی ربوبیت (نشوونما) ہوتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی میں وہ خود بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس میں ان کی اپنی ربوبیت بھی شامل ہوتی ہے ان کی ربوبیت کے لیے کچھ چیزیں ان کے تصرف میں بھی دیدی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس آئین و ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جو نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے اصول کلی کی روشنی میں مدون کئے جاتے ہیں۔

علاوہ بریں قرآن کریم کے اس معاہدہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے جس کی رُو سے اس نے کہہ دیا ہے کہ "اللہ نے مومنین سے ان کا جان اور مال بعوض الجنۃ خرید لیا ہے"۔ اور یہ خرید، محض تصور ہی تصور میں نہیں ہوتی۔ عملاً واقع ہوتی ہے۔ خدا کے (BEHALF) پر مومن اپنی جان اور مال اس نظام کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں جو دنیا میں حکومت خداوندی کے قائم کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی دیکھئے تو جماعت مومنین میں کوئی شے بھی کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتی۔

(۱۹۵۳ء)

۷ ــــ نظامِ یوسفیؑ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جب مصر میں قحط پڑا تو حضرت یوسفؑ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اس کی تفسیر کہیں نہیں ملتی کہ آپ اس مقصد کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائے تھے کیا اس کی تفسیر کہیں سے مل سکتی ہے!

جواب:۔

قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لیے خزائن الارض (زمین کے خزانے) میری تحویل میں دے دو اس لیے کہ انی حفیظ علیم میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں کس طرح حفاظت میں رکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ ان کا بہترین مصرف کیا ہے حضرت یوسفؑ نے غلہ کی گرانی کو دور کرنے کے لیے کیا طریق عمل اختیار کیا اس کی تفصیل تورات میں ملتی ہے۔ چنانچہ

کتاب پیدائش باب ۴۷ میں اس تفصیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لیے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی حضرت یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلّہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا، جمع کی۔ اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں؟ کیونکہ نقدی چک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چک گئی کہ میں تمھارے چوپایوں کے بدلے تمھیں روٹی دونگا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کے لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلّوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گذر گیا۔ وہ دوسرے سال اس کے پاس آئے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہماری چوپاؤں کے گلے بھی لے لیے سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں۔؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو پیٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اسنے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی۔ کیوں کہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔

تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمھاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا۔ لو یہ بیج تمھارے لئے ہے، کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہوگا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے۔ اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمھاری خوراک اور ان کی جو تمھارے گھرانے کے ہیں اور تمھارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں۔ اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے۔ اور یوسفؑ کے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا۔ مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علت مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہونچا دیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشت کار اپنی محنت کے۔ ماحصل کے آپ مالک تھے۔ زمیندار کاشتکار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا، جو دبلی گایوں کو کھائے جا رہی تھیں (۱۹۵۳ء)

---

۸ ـــــ انفرادی مفاد پرستی

کراچی سے ایک طالب علم کا سوال ہے۔ کیا قرآنی نظام میں انفرادی مفاد (INDIVIDUAL ENTERPRISE) کی گنجائش ہو گی؟

جواب۔

"انفرادی مفاد" سے مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ذاتی سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار کرے اور اس کاروبار کے منافع کا مالک سمجھا جائے۔ اس سوال کے جواب کے لیئے روپیہ کے متعلق قرآن کا نظریہ سامنے رکھیے بات خود بخود صاف ہو جائے گی۔

قرآن کی رُو سے

(الف) زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ اس لیے فاضلہ روپے سے زمین نہیں خریدی جا سکتی۔

(ب) جب زمین نہیں خریدی جا سکتی تو ظاہر ہے جائیداد کی غرض سے مکانات بھی نہیں بنائے جا سکتے۔ قرآن کی رُو سے معاشرہ پر لازم ہے کہ وہ تمام افراد کے لیے سکنی مکانات مہیا کرے۔ اس لحاظ سے بھی مکانات کرایہ پر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ج) روپیہ کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن کی رُو سے چاندی اور سونے کا اکتناز منع ہے اور دولت جمع کر کے گننے رہنے والوں کے لیے بڑی تہدید آئی ہے۔

(د) کوئی شخص بلا ضرورت روپیہ خرچ نہیں کر سکتا اسے تبذیر کہتے ہیں، جس کی قرآن میں سخت ممانعت ہے۔

(ہ) نہ ہی کوئی شخص ضرورت سے زیادہ خرچ کر سکتا ہے۔ اسے اسراف کہتے ہیں اور قرآن کی رُو سے اسراف بھی منع ہے۔

اب فرمائیے کہ ایک شخص ذاتی کاروبار سے منافع حاصل کر کے اس روپیہ کو کرے گا کیا۔ وہ روپیہ تو اس کے لیے وبال جان ہو جائے گا۔ اس کے پاس اس روپیہ کو رکھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ وہ نہ تو اسے جمع رکھ سکے گا نہ زائد از ضرورت خرچ کر سکے گا۔

اندریں حالات قرآنی نظام میں (INDIVIDUAL ENTERPRISE) کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی ذاتی ملکیت کا تصور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب مسلمانوں میں ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری آ چکی تھی۔ اگرچہ اس کے مفاد پرستانہ استبداد نے عہد رسالت مآبؐ کے صحیح واقعات ہم تک پہنچنے نہیں دیئے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی کرن نظر آ جاتی ہے کہ اس دور میں

روپیہ پاس رکھنے کا تصور تک بھی نہیں آتا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قسم کے واقعات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں کہ آپ کے پاس جو کچھ آتا تھا آپ اسے رات ہونے سے پہلے پہلے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند لمحات پہلے آپ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھ لیا کہ گھر میں کوئی روپیہ تو نہیں رکھا۔ جو چند دینار موجود تھے جب تک انہیں بھی ضرورت عامہ کے لیے نہیں دے دیا اطمینان نہیں ہوا۔ کتب تاریخ میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی باقی رہ گیا ہے کہ انبیاءؑ کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا کرتی۔ یعنی ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ربوبیت عامہ کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں کتب روایات میں موجود ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان رسولؐ اللہ کی اس سنت کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتے۔ وہ اس قسم کی روایات بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے پاس اتنے لاکھ دینار تھے، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پاس مال ومتاع کے لدے ہوئے اتنے اونٹ تھے ایسا بیان کرتے ہیں وہ کبھی نہیں سوچتے کہ ایک طرف تو صحابہؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے (جو رنگ درحقیقت قرآن کا رنگ ہے) اور دوسری طرف وہ یہ بتاتے ہیں کہ روپے پیسے کے معاملہ میں رسولؐ اللہ کا عمل اور تھا اور ان صحابہ کا عمل اور۔ ہمارے نزدیک رسولؐ اللہ اور آپؐ کے صحابہؓ کے عمل کے پرکھنے کا صحیح معیار قرآن ہے۔ کتب روایات میں ان بزرگوں کی طرف جس قدر ایسے واقعات منسوب کئے گئے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ وہ سب وضعی ہیں اور اس ملوکیت اور سرمایہ داری کے دور کی پیداوار جسے اپنی زراندوزی اور جاگیرداری کے نظار کے لیے اس قسم کی سندات کی ضرورت تھی۔

(۱۹۵۳ء)

۹ —— رہن با قبضہ

رسالپور سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ :۔

رہن کے متعلق قرآنی احکام کیا ہیں۔ مجھے تو سود ہی کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں رہن

رکھ کر روپیہ لینے کا عام دستور ہے۔

جب تک مقروض اپنا قرض بے باق نہیں کرتا، قرض دینے والا اس زمین سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔

جواب:۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲/۲ میں یہ حکم ہے کہ جب تم آپس میں قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ اس کے بعد آیت کے باقیماندہ حصّہ میں پوری تفصیل دی گئی ہے کہ تحریر کی شکل کیا ہوگی، گواہیاں کیسی ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے۔ وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضۃ یعنی اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور وہاں لکھنے والا نہ ملے تو پھر تم کوئی چیز بطور ضمانت اپنے قبضہ میں رکھ لیا کرو۔ اس کا نام ہے رہن با قبضہ۔ یعنی جب کبھی ایسی صورت ہو جاتے کہ قرضہ کا معاملہ لکھنے میں نہ آسکے۔ (اس زمانہ کے عرب میں تو ایسی صورتیں اکثر و بیشتر پیش آسکتی تھیں لیکن ہمارے ہاں اب شاذ ہی کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی کو قرضہ دے اور اس بات کو لکھنے والا نہ ملے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے) تو قرض لینے والے کی کسی ایسی چیز کو بطور ضمانت رکھ لیا جائے جو اس قرض کی رقم کے برابر یا اس سے زیادہ ہو۔ مقصد صرف ضمانت ہے اور اس کی تشریح آیت کے باقی ٹکڑے نے کر دی ہے۔ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ فَاِنْ امن بعضکم بعضا۔ اگر تم میں سے ایک دوسرے کا اعتماد کرے فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ قرضہ دینے والے کی امانت (زرِ قرضہ) کو واپس کر دے۔ اس سے بات صاف ہو گئی کہ قرض کے معاملہ میں تحریر کی عدم موجودگی میں، قرض لینے والا جو چیز اپنے قبضہ میں لے گا، وہ محض ضمانت کے طور پر ہوگی، نہ اس لیے کہ یہ شخص اس کی آمدنی کھائے۔ قرآن میں ربوٰ کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ربوٰ کے معنی زرِ اصل سے زیادتی کے ہیں۔ لہٰذا زرِ اصل سے زیادہ لینے کی کوئی شکل بھی ہو، وہ ربوٰ میں داخل ہوگی اور حرام قرار پائے گی۔ بنا بریں کسی کا مکان گروی رکھ کر کرایہ وصول کرتے جانا یا زمین رہن رکھ کر اس کی آمدنی کھاتے جانا (اور مکان کے کرایہ اور زمین کی آمدنی کو زرِ اصل میں محسوب نہ کرنا) ربوٰ ہے جو نصوص قرآنی کی رُو سے حرام ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے تحریر کافی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور کسی چیز کا بطورِ ضمانت اپنے قبضہ میں لے لینا اسی وقت ہوگا جب تحریر ممکن نہ ہو۔ اس شکل میں بھی اگر

قرض دینے والا، اعتماد کرے تو پھر کسی چیز کو بطور ضمانت رکھ لینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن آج کل تو قرضہ کی تحریریں نہیں، رہن یا قبضہ کی باقاعدہ تحریریں ہوتی ہیں اور انہیں رجسٹری بھی کرایا جاتا ہے اور ان کا نفع لینا شیرِ مادر کی طرح حلال سمجھا جاتا ہے۔ (۱۹۵۴ء)

---

۱۰ ـــــ قانونِ وصیّت

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے ستمبر کے طلوع اسلام میں قانون وصیت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ہر شخص کو حق حاصل ہے، کہ وہ اپنی جائداد کے متعلق جس قسم کی وصیت چاہے کر جائے۔ کیا اس سے اس کے وارثوں کا حق غصب نہیں ہو جاتا۔ یہ ان پر صریح ظلم ہے جس کی اجازت اسلام نہیں دے سکتا۔

طلوع اسلام قانون وصیّت کے سلسلہ میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا تھا صرف قرآن کریم کا حکم نقل کیا تھا جس میں اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ اپنے ترکہ کے لیے وصیّت کرنا ہر مسلمان پر خدا کی طرف سے فرض قرار دے دیا گیا ہے (سورۂ بقرہ۔ آیت نمبر ۱۸۰) اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ترکہ کے اتنے حصّے سے زیادہ وصیّت نہیں کی جا سکتی، نہ ہی یہ کہ وصیت وارثوں کے لیے نہیں کی جا سکتی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ترکہ کے لیے وصیت کرنا ظلم ہے تو آپ سوچئے کہ اس اعتراض کی زد کس پر جا کر پڑتی ہے؟

آپ نے اس اعتراض کی بنیاد غلط مفروضہ پر رکھی ہے اور وہ غلط مفروضہ یہ ہے کہ کسی شخص کی املاک میں، اس کے وارثوں کا حق ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنی ملکیت پر پورا پورا حق ہوتا ہے اور اس کے وارث، اس میں سے، بطور حق کے کچھ بھی طلب نہیں کر سکتے۔

بات یوں سمجھ میں آ جائے گی۔ مثلاً

(۱) ایک شخص اپنی کمائی ساری کی ساری خرچ کر ڈالتا ہے۔ اس میں سے کچھ بچاتا نہیں۔ ظاہر ہے

کہ اس کے ہونے والے وارث یہ کہہ کر اسے اس سے نہیں روک سکتے کہ تم ہمارا حق غصب کر رہے ہو؟ جو اپنی ساری کمائی خود ہی خرچ کر ڈالتے ہو۔ ہمارے لیے بچا کر کچھ بھی نہیں رکھتے۔

(۱۱) ایک شخص اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد، اپنی صوابدید کے مطابق کسی کو دے دیتا ہے۔ اس کے وارث یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ وہ ان کا حق مار کر دوسروں کو کیوں دے رہا ہے!

اب ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی میں ایسا کر سکتا ہے تو اس بات کی وصیت کیوں نہیں کر سکتا کہ اس کے مرنے کے بعد، اس کی جائیداد کی یوں تقسیم ہو گی؛ قرآن کریم نے وارثوں کے جو حصے مقرر کئے ہیں ان کے ضمن میں، بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے، تو یہ تقسیم اس صورت میں ہو گی۔ لہٰذا وارثوں کا یہ کہنا کہ چونکہ قرآن نے ہمارے حصے مقرر کر دیئے ہیں، اس لیے متوفی کی وصیت کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ اس سے ہماری حق تلفی ہوتی ہے، بے بنیاد دعوے اور قرآن کے خلاف مطالبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وصیت کو ایک تہائی تک مقید کرتے ہیں اور اسے صرف غیر وارثوں کے لیے جائز سمجھتے ہیں، وہ وصیت کے متعلق قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی اس آیت کی موجودگی میں کسی کے حق وصیت پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

آپ ذرا عملی زندگی کی طرف آیئے، اور غور کیجیے کہ اس میں کس کس قسم کی مشکلیں سامنے آتی ہیں۔ ایک شخص کے بھائی ہیں جو ساری عمر اس سے مقدمہ بازی کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کی جان کے دشمن ہیں اور خون کے پیاسے ہیں۔ اس کی بیوی کے ساتھ بھی ان کی مخالفت کی یہی کیفیت ہے۔ وہ اس احساس کے ماتحت کہ اس کے بھائی، اس کے مرنے کے بعد، اس کی بیوہ کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں گے (کیونکہ اس کی اولاد کوئی نہیں اور وہ بے چاری لاوارث رہ جائے گی) اپنی جائداد کی وصیت اس کے نام پر کر جاتا ہے لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ بھائی دندناتے ہوئے آجاتے ہیں اور متوفی کے ترکہ میں اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے موجودہ قانون شریعت کی رُو سے (جو سراسر قرآن کے خلاف ہے) اس کی وصیت کالعدم قرار دے دی جاتی ہے۔ اور وہ اس کے عمر بھر کے دشمن، اس کی جائیداد سے اپنا حق لے جاتے ہیں۔ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص نے جو وصیت کی تھی اس سے ان بھائیوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور اب جو کچھ وہ لے گئے ہیں وہ بالکل جائز اور "حق بحق دار رسید"

کے اصول کے مطابق ہے ؟

یا ایک شخص اپنی اولاد کو روزگار پر لگا کر، اپنے ترکہ کو منفعت عامہ کے لیے دے جاتا ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد، اس کی اولاد راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ وہ ایک تہائی سے زیادہ کے لیے وصیّت نہیں کر سکتا تھا۔ ترکہ کا دو تہائی ہمارا حق ہے۔ وہ ہمیں ملنا چاہیئے۔

یہ تمام دعاوی اس غلط مفروضہ کے پیدا کردہ ہیں کہ ایک شخص کی املاک میں اس کے رشتہ داروں کا حق ہوتا ہے۔ قرآن اس حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ جب والدین یا دیگر اقربا کی مدد کرنے کی تائید کرتا ہے تو اسے احسان کہتا ہے۔ ان کا حق نہیں کہتا (وبالوالدین احسانا و بذی القربیٰ) اور ظاہر ہے کہ وہ جب کسی کی زندگی میں کسی کو اس کے مال کا حقدار قرار نہیں دیتا، تو یہ کس طرح روا ہو گا کہ اس کی موت کے بعد، یہ لوگ، اس کے حقِ وصیت کو برطرف کرتے ہوئے، اس کے ترکہ کا بطور اپنے حق کے مطالبہ کریں۔ ہاں! اگر وہ وصیّت نہیں کرتا ۔ یا اس کی وصیت کے بعد کچھ باقی بچ جاتا ہے، تو اس کے حقدار یہ لوگ ضرور ہو جائیں گے کیونکہ جو اس کا مالک تھا اس نے (وصیت نہ کرنے کی وجہ سے) اپنے حق کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اور ایسی شکل میں قرآن نے ان لوگوں کے حصے مقرر کر دیے تھے۔

قرآن کی رُو سے مسلمان کے مال میں حق صرف محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہے (محض رشتہ دار ہونے کی بنا پر حق نہیں ہے)۔

اس کا ارشاد ہے کہ:۔

فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ——— (۷۰/۲۴—۲۵)

"ان کے مال میں ان لوگوں کا حق ہے اور حق بھی ایسا جس کا ہر ایک کو علم ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں یا جو کمانے سے یکسر معذور ہو چکے ہیں اور اس طرح وہ ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جاتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ جب ان ضرورت مندوں کی ضروریات کو انفرادی طور پر پورا کیا جائے گا تو اس کی ابتدا ہر شخص کے قریبی دائرے سے ہو گی۔ رشتے دار اگر ضرورت مند ہیں تو ضرورت مند ہونے کی حیثیت سے ان کا حق ہے، محض رشتے دار ہونے کی بنا پر حق نہیں۔ آیت (۱۷/۲۶) میں جہاں رشتہ داروں کے حق کا ذکر ہے تو وہاں انہیں مساکین کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یعنی مسکین رشتے داروں کا حق۔ اگر اس کی وصیت سے کسی ایسے محتاج کی حق تلفی ہوتی ہے، تو قرآن نے اس کی گنجائش رکھی ہے کہ مناسب

طریق سے (جسے معاشرہ طے کرے) اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جس آیت میں وصیت کا حکم دیا گیا ہے اس سے آگے ہے کہ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ... (۲/۱۸۲) "اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا، وہ کسی کی طرف جھک گیا ہے اور اس سے کسی حقدار کی حق تلفی ہوتی ہے، تو اسے چاہیئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ یہ چیز، وصیت بدل دینے کے مترادف نہیں ہوگی جو جرم ہے۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ وصیت اور وراثت کے یہ احکام اس دور سے متعلق ہیں جب قرآنی نظام معاشرہ اپنی مکمل شکل میں ہنوز قائم نہ ہوا ہو۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت نہ ذاتی جائدادیں کھڑی کی جائیں گی نہ ان کی تقسیم کا سوال پیدا ہوگا ــــ جیسے نبی اکرمؐ نے نہ کوئی جائداد چھوڑی، نہ اس کے لیے وصیت کی ضرورت پڑی۔ جو کچھ آپ کے مصرف کے لیے تھا، وہ بیت المال کی طرف لوٹ گیا تاکہ وہ دوسرے ضرورت مندوں کے کام آسکے۔ (۱۹۶۳ء)

---

۱۱ ــــ ترکہ اور وصیّت

ایک صاحب رقم طراز ہیں۔

آپ نے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کے احکام ... ہمارے وقتی مصالح اور مقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلے کر لیں۔ لیکن اس باب میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو اس کی ملکیت کی چیزوں پر تصرف کا حق دیتا ہے لیکن اِن کی تقسیم کے لیے اس کے مقتضیات کی کوئی رعایت نہیں رکھتا بلکہ تقسیم وراثت کے ایسے حصے مقرر کرتا ہے جن میں تغیّر و تبدّل کا اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لیجیئے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو لکھایا پڑھایا۔ ولایت تک پاس کرایا۔

اب وہ نہایت معقول ملازمت میں ہے۔ ہزاروں روپے کی آمدنی رکھتا ہے۔ خود صاحب جائداد بھی ہے۔ اس شخص کا دوسرا لڑکا ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا کہ اس کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس ننھے سے یتیم کی کفالت کے لیے ترکہ الگ کر دیا جائے لیکن اسے اس پر کچھ اختیار نہیں۔ قرآن کی رُو سے بڑا بیٹا برابر کا حصہ لے جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے پنجاب کی زراعت پیشہ اقوام نے زمین میں سے لڑکیوں کو حصہ دینا بند کر دیا تھا۔ ایک شخص کی تھوڑی سی اراضی ہے، اس کی لڑکی پچاس میل کے فاصلے پر کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس شخص کے ورثہ میں سے اس لڑکی کا حصہ نکالیے تو چپہ بھر زمین نہ لڑکی کے کسی کام کی نہ اس کے بیٹے کے۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات کا لحاظ کیسے رکھا جائے گا۔

جواب۔

آپ نے جن دقتوں کا فرمایا ہے وہ وراثت کے اس قانون کی پیدا کردہ ہیں جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروج چلا آرہا ہے۔ لیکن جو بدقسمتی سے قرآن کے خلاف ہے۔ یہ مشکلات اس بنا پر پیش آتی ہیں کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے (اور یہی ہمارے ہاں کا مروجہ قانون وراثت ہے) کہ کسی شخص کو اپنے مال اور جائیداد میں وصیت کا حق نہیں۔ قرآن نے جو حصے مقرر کر رکھے ہیں اس کا ترکہ بالکل انہی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ یہ غلط ہے اور قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف، قرآن نہ صرف وصیت کی اجازت ہی دیتا ہے بلکہ اسے فرض قرار دیتا ہے سورۃ بقر میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲/۱۸۰)

مسلمانو! یہ بات تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آگئی ہے اور وہ اپنے مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہے، تو وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کر جائے جو متقی انسان ہیں ان کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس آیۂ مبارکہ پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ اس سے زیادہ واضح اور صریح حکم اور بھی کوئی ہو سکتا تھا؟

آیت کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ تم پر وصیّت فرض قرار دی گئی ہے۔ اور انتہا اس پر کہ یہ وصیّت متقیوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ پھر سورۂ مائدہ آیات (۱۰۷ — ۱۰۶) میں یہ تاکید آئی ہے کہ اس وصیّت کے لیے گواہ بھی مقرر کئے جائیں۔ اور ان گواہوں کی شہادت مشکوک نظر آئے تو پھر کیا کیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمان کو اس کے ترکہ کی تقسیم کے لیے وصیت کی اجازت (بلکہ تاکید) ہے۔ تو پھر قرآن کریم نے تقسیم وراثت کے حصے کس لئے متعین کئے ہیں۔ اس سوال کا جواب خود قرآن ہے اور ان آیات کے اندر جن میں وراثت کے حصے متعین کئے گئے ہیں۔ احکام وراثت سورۂ نساء کے شروع میں آتے ہیں۔ آیات نمبر ۱۱ الغایت نمبر ۱۳ کو دیکھیے۔ "پہلے اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱) یہ حصے اس وصیت کے بعد تقسیم ہوں گے جو میّت نے کی ہو یا جو کچھ اس نے قرض چھوڑا ہو اس کی ادائیگی کے بعد۔" اس کے بعد پھر ارشاد ہے کہ یہ تقسیم، وصیت کی تعمیل اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ پھر تیسری مرتبہ بھی یہی ارشاد فرمایا ہے اس کے بعد باقی ماندہ حصّوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد پھر چوتھی مرتبہ وہی ارشاد ہے کہ یہ تقسیم میّت کی وصیّت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی اور اس کے بعد فرمایا کہ وَصِيَّةً مِنَ اللّٰهِ (۴/۱۲) یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ ان الفاظ پر احکام وراثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچ لیجئے کہ بات کس قدر واضح ہے یعنی ہر مسلمان پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ اسے اپنی جائداد و اموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح و مقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے اور جتنا جی چاہے دے دے۔ لیکن اگر اتفاق ایسا ہو جائے کہ کسی وجہ سے انسان وصیّت نہ کر سکا ہو۔ یا اس کا ترکہ وصیّت سے بڑھ جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ورثے کی تقسیم اس کے وارثوں پر نہیں چھوڑی بلکہ اس کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہیں وہ حصّے جو غیر متبدّل ہیں۔

لیکن جائداد کے اس اختیار کو بھی "بے لگام" نہیں چھوڑا گیا کہ انسان مستحقین کو محروم کر دے اور اپنی جائداد میں ناانصافی سے کام لے۔ اس لیے جہاں وصیّت اور قرضہ کا ذکر فرمایا۔ وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ غَيْرَ مُضَارٍّ (۴/۱۲) بشرطیکہ وصیّت اور قرضہ سے مقصود (حقداروں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔ اگر کسی نے ایسا کیا ہے اور اس کا علم اس کی زندگی میں ہو گیا ہے تو جماعت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اصلاح حال کی صورت پیدا کر دے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ (۲/۱۸۲)

اگر کسی شخص کو وصیّت کرنے والے سے بے جا رعایت کرنے یا کسی معصیت (بے انصافی) کا اندیشہ ہو تو (اسے چاہیئے کہ) وہ بروقت مداخلت کر کے اور وارثوں کو (سمجھا بجھا کر) ان میں مصالحت کرا دے۔

اور اگر یہ صورت اس کی موت کے بعد واقع ہو تو اس کی وصیّت میں ضروری ردّو بدل کرا دیا جائے۔ لیکن یہ اختیار صرف اسلامی عدالت کو حاصل ہوگا۔ افراد کو نہیں۔

یہ ہیں وصیّت اور ترکہ کی تقسیم کے بارے میں قرآن کے احکام۔ غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور غیر مبہم ہیں یہ احکام۔ لیکن اس کے باوجود مقام صد حیرت ہے کہ مسلمانوں کا "مسلّمہ" قانونِ وراثت کس قدر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ قانونِ وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس پر سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے۔ اس قانون میں یا تو سرے سے وصیّت کی اجازت ہی نہیں۔ اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں اور وہ بھی وارثین کے لیے نہیں۔ اور یا للعجب! کہ اس قانون کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف جس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس قرآن کے اتباع میں گزرا۔ اور یہ صرف اس لیے کہ بدقسمتی سے ہمارے مجموعۂ روایات میں ایک روایت اس قسم کی شامل ہو گئی ہے۔ اب روایت پرستی کا تقاضا ہے کہ اس روایت کو صحیح سمجھا جائے خواہ اس سے قرآن کریم کے صریح احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو اور خواہ اس سے حضور صاحب قرآن (علیہ التحیہ والسلام) کی ذاتِ اقدس پر طعن بھی کیوں نہ آئے۔ آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم وصیّت کو فرض قرار دے۔ اور بلا مشروط یعنی پورے مال میں وصیت کا حق دے۔ (اور اس کی تاکید کرے) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرمائیں کہ نہیں! وصیّت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لیے۔ خدا کے حکم میں ایسا ردّو بدل یقیناً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ اقدس کے خلاف ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارے یہاں یہ قانون موجود ہے اور صدیوں سے اس پر امّت کا عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

امید ہے کہ آپ کے وہ شکوک اب رفع ہو گئے ہیں جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں فرمایا

ہے۔ لیکن ایک بات قابل گذارش اور ہے۔ اور وہ زمین کے ترکہ کے ضمن میں ہے، جس کا ذکر آپ نے اپنے خط کے آخری حصہ میں فرمایا ہے۔ قرآن کی رُو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت جائز نہیں اس لیے زمین کی تقسیم وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس کی خرید و فروخت، اجارہ داری، زمین داری، یا تقسیم بطور ترکہ خارج از بحث ہے (لیکن یہ سوال الگ ہے اور جداگانہ تفصیل کا محتاج)۔

آخر میں اتنی وضاحت اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مصالح اور مقتضیات کے مطابق جزئیات متعین کرنے کے لیے صرف انہی امور میں مجاز ہیں جن کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جن جزئیات کو قرآن نے خود متعین کر دیا ہے ان میں کسی کو ردّ و بدل کا حق نہیں۔ اور قرآن کریم نے اگر ان کے ساتھ خود ہی بعض شرائط بھی لگا دی ہیں تو ان شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے (تقسیم وراثت کے احکام مشروط ہیں وصیّت کے ساتھ)۔ (۱۹۵۳ء)

---

۱۲ ——— یتیم پوتے کا حصّہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانون وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہمارا مروّجہ فقہی قانون جس کی رُو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے، قرآن کی رُو سے کیسا ہے؟

جواب

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانون وراثت جس حسن و خوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اُس قانون پر پڑتی ہے۔ جو ہمارے فقہانے مرتّب کیا ہے۔ اور ہزاروں سال سے مسلمانوں میں مروّج چلا آرہا ہے۔ تو

ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے۔ اس مروجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمہ دگر متضاد شقیں موجود ہیں۔ بلکہ اس میں قرآنی اصول کی صریح مخالفت بھی ہے۔ جنہیں قرآن وارث قرار دیتا ہے۔ یہ قانون انہیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لیے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے۔ یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔ کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پاجاتا ہے اور دوسرا محروم ہو جاتا ہے۔ وعلیٰ ھذا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مروجہ قانون وراثت کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور اس میں جہاں جہاں کوئی غلطی نظر آئے اسے درست کر لیا جائے۔ اس وقت ہم قانون کے اس ایک گوشہ کو سامنے لائیں گے۔ جس کے متعلق نمایاں طور پر استفسارات موصول ہوتے ہیں۔ یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال۔

قانون وراثت چونکہ ایک فنی (TECHNICAL) مسئلہ ہے۔ اس لیئے اسے سمجھنے کے لیے ذرا دقت نظر کی ضرورت ہو گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اصطلاحات سے بچ کر اسے عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کریں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے لیے ضروری ہو گا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا۔ یہ اس طرح سمجھ میں آئے گا۔

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہو گیا)	عمر (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے)
خالد (زندہ ہے)	حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں۔ خالد یتیم ہے، اس کا باپ (بکر) زید کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے۔ حامد زندہ ہے اور حامد کا باپ بھی زندہ ہے۔ زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے۔ ہمارا فقہی قانونِ وراثت کہتا ہے کہ اس جائیداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو) اگر محض عقل عامہ

کی رُو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دے گا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہ اس کا جُرم قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مر چکا ہے۔ اس لیے اب خالد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائداد کا وارث ہوگا۔

اب آیئے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لیے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں دو دلیلیں اہم ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس کی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا جو اس سے براہ راست رشتہ رکھتا ہے۔

یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے براہ راست نہیں، ٹھیک ہے لیکن بکر تو مر چکا ہے۔ اس لیے اب خالد اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ اپنے چچا عمر کے واسطہ سے نہیں۔ اپنے باپ کے واسطہ سے تھا۔ اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اب اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں۔ لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مر جاتے۔ تو اس کی جائیداد زید کو دیتے ہیں یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے۔ لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

اب ان کا دوسرا اصول لیجیے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ حکم اصول قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی رُو سے یتیم پوتا وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اصول یہ ہے

الاقرب فالاقرب: یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے۔ (اس لیے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی

میں محروم رہ جائے گا۔



خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)

اول تو یہ سُن لیجیے کہ ہمارے فقہا خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے اصول یہ ہے کہ:۔

"قریب رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔"

مثلاً رشید کا انتقال ہو گیا۔ اس کا دادا ابھی موجود ہے اور بیٹا بھی ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے۔ اور دادا بعید کا۔ لہٰذا اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

اب آیئے اس اصول کی طرف اس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقرباء نے چھوڑا ہے۔ اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو والدین اور اقربا نے چھوڑا ہے۔ خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت ایک معیّن حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ اس وقت ہم اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے۔ جو اس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقرباء میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطۂ زیرِ نظر سامنے رہنا چاہیئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے قریب اور بعید ہوتے ہیں۔ مثلاً والدین، اولاد، اولاد کی اولاد، بہن بھائی، چچا، پھوپھی وغیرہ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب، خواہ قریب ہوں یا بعید، ایک ساتھ وارث ہوں۔ اس لیے وراثت

کا مدار اقربیت پر ہے۔ یعنی میّت کے ترکہ میں اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقرباء جو چھوڑ کر مریں اس میں سے ان مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میّت کے اقربین کو حصہ ملے گا۔ یہ فرق بڑا نازک ہے۔ اور اس کو نظر انداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا ہے کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دُور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔ اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا۔

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اس لیے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمھارے اقرب جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا۔ اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میّت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میّت کا سب سے قریبی ہو اسے حصہ ملے گا جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملے گا۔ یعنی ہر اُس رشتہ دار کو جس کے اور میّت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ——— کریم کا دادا زندہ ہے

رحیم ——— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے

متوفی کریم ——— اس کی وفات ہوئی ہے

رشید ——— کریم کا بیٹا زندہ ہے

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلا واسطہ رشتہ دار ہے) سعید (کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی موجودگی میں اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں سعید کو محروم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب یہ صورت ہے، تو پھر پہلی مثال کو سامنے لایئے۔

زید

بکر (وفات پا چکا ہے)	عمر (زندہ ہے)
خالد (زندہ ہے)	حامد (زندہ ہے)

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے۔ اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے ہیں۔ اور براہ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے لہذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ حامد کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہو چکا ہوتا۔ تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

فقہا نے اقرب کا استحقاق ورثہ (زندہ رشتہ داروں) کے لیے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدے کے بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہو گیا۔ جس کی وجہ سے کہیں خود اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے۔ اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا (رحمہم اللہ) نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ ہر انسان سے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے اس لیے قصور اُن کا بھی نہیں۔ اصل میں قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رُو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہہ دیا ہے، وہ منزّل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کسی پس آئند کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کر کے چلتے جانا چاہیئے۔ اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ اسی ایک مسئلہ وراثت کو لیجئے۔ قرآن نے وصیّت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا ہے۔ فقہ اور روایات نے وصیّت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ پھر قانون وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں جائز وارث اپنے آباؤ اجداد کی جائیدادوں سے محروم ہو گئے۔

اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کر لیتا۔ اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانونِ اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہیئے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے، آپ اندازہ فرما لیجئے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے۔ آئین و قانون سازی کا کام اُن کے سپرد کر دیا جن کا عقیدہ ہے اور فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آرہا ہے وہ وحی منزّل کی طرح منزّہ عن الخطاء ہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں۔ تو ان کا وضع کردہ آئین و قانون کس حد تک قرآنی ہو سکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے، جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے، تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے[1]

وَفِيهَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ (۱۹۵۳ء)

---

۱۳ ــــــ اوقاف

ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اس غرض کے لیے وقف کر دیا تھا کہ اس کی آمدنی سے ایک خانقاہ (مزار) کی دیکھ بھال کا انتظام کیا جائے۔ ہم اس وقف کے متولی ہیں، قبر پرستی کو شرک سمجھتے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی صورت کیا ہو۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ وقف کی اصلی حیثیت کیا ہے؟

جواب۔

وقف کی شرعی حیثیت اہل فقہ اور اہل حدیث دونوں کے ہاں مسلّم چلی آرہی ہے۔ وقف سے مفہوم یہ ہے کہ الوقف لا یملک ولا یوھب ولا یورث یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ

---

[1] للہ الحمد کہ اب فیملی لاز میں یتیم پوتے کا حصہ تسلیم کر لیا گیا ہے اگرچہ علماء حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ (۱۹۶۴ء)

فروخت کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس قسم کے وقف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہے قرآن میں انتقالِ اموال کی جتنی شکلیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے کہیں بھی اس قسم کے وقف کا جواز نہیں نکلتا۔ مثلاً خرید و فروخت، بخشش، وصیت، وراثت، قرض، خیرات وغیرہ میں سے کوئی ایسی شکل نہیں جس میں منتقل کردہ مال دوسرے کی ملکیت میں نہ چلا جائے، اور اس پر پہلے مالک کا بدستور قبضہ رہے۔ اور یہ قبضہ اس کی زندگی تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ابدالآباد تک مسلسل چلا جائے۔ کیونکہ قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ مال کا تصرف مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور وقف کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں قیامت تک مال مُوقف کی مرضی کے مطابق صرف ہوتا ہے۔ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وقف کا جذبہ محرکہ صاحب اموال و جائیداد کی وہ ہوسِ اقتدار ہے جس کی بنا پر وہ دوسروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کراتے ہیں۔ موت کا ہاتھ اس قوت و اختیار کو ان سے چھیننا چاہتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی بقا کی یہ شکل پیدا کر لی ہے کہ وہ اپنی جائیداد کو وقف کر جائیں۔ اور اس طرح قیامت تک ان کی مرضی و منشا جاری و ساری رہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ وقف عام طور پر "نیک کاموں" کے لیے کیا جاتا ہے، اس لیے اوقاف تو قوم کا مستقل سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچیے کہ قوم کے کام تو وہی سرمایہ آ سکتا ہے جو قوم کی ضرورت کے وقت کام آئے اور قوم کی ضرورتیں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں۔ مستقبل کی ضروریات کا تعین مُردوں کے سپرد کر دینا قوم کو ماضی کی زنجیروں کے ساتھ باندھ دینا ہے۔ جو مر چکا ہے اسے کیا علم کہ قوم کو آج کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ قوم کے سرمایہ (یعنی جائیداد موقوفہ کو جامد (FREEZE) کر کے رکھ دیتا ہے۔ غور کیجئے کہ اگر تمام صاحب جائیداد اپنی اپنی جائیداد کو مخصوص مقاصد کے لیے وقف کرتے جائیں۔ تو کچھ عرصہ کے بعد قوم ان مخصوص مقاصد کے علاوہ باقی امور کے لیے پائی پائی کی محتاج ہو جائے۔ "نیک کام" وہ ہے جو دنیا میں خدا کا قانون رائج کرنے والے نظام کی تقویت کا موجب ہے۔ اس تقویت کے لیے اسباب و ذرائع آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ بحالتِ امن اس تقویت کا راز کسی اور چیز میں ہوتا ہے اور بحالت جنگ اس کے تقاضے کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس لیے اگر ہر صاحب جائیداد، قومی سرمایہ کو اُن مقاصد کے ساتھ وابستہ کرتا جائے۔ جنہیں وہ اپنی دانست اور اپنے زمانہ میں "نیک کام" سمجھتا

تھا تو اس سے قوم محتاج سے محتاج تر ہوتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص اپنے مال میں وصیّت کرسکتا ہے۔ تو وقف بھی تو وصیّت ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وصیّت میں موصی کے مرنے کے بعد جس کے حق میں وصیّت کی گئی ہے وہ اس مال کا مالک بن جاتا ہے۔ اور اسے اپنی منشاء کے مطابق تصرّف میں لاسکتا ہے۔ برعکس اس کے وقف میں متولّی کو اس مال میں کسی قسم کے تصرّف کا اختیار نہیں ہوتا۔ اسے وصیّت کرنے والے کی مرضی کے مطابق صرف کرتے رہنا ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن کی رُو سے وقف کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔ اگر کوئی شخص اپنے مال کو "نیک کاموں" میں صرف کرنا چاہتا ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مال بروئے وصیّت ملّت کے نظامِ اجتماعی کے سپرد کردیا جائے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اسے استعمال میں لے آئیں۔ یعنی ضروریات کا تعیّن زندوں کے سپرد ہو نہ کہ مُردوں کے اختیار میں۔

لیکن جس قوم نے "خدائی اختیارات" کو بھی مُردوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہو وہ انسانی اختیارات کو ان کے ہاتھ سے چھیننے پر آمادہ کیوں ہونے لگی۔؟ (۱۹۶۳ء)

---

۱۴ — کیا خدمت دین کا معاوضہ لینا جائز ہے ؟

سرگودھا سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اس بات کی تصریح فرمائی جائے کہ دین کی تبلیغ و تعلیم کے معاوضہ کی طلب گاری کس حد تک جائز ہے۔ آج کل کے علماء کا ذریعہ معاش ہی یہی ہے۔

طلوعِ اسلام

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ دین کی تبلیغ اور تعلیم کا صحیح نظام کیا ہے اور جو لوگ ان امور کی سرانجام دہی کے لیے مامور کئے جائیں، ان کے معاش کی صورت کیا ہونی چاہیئے۔ اس وقت بھی جب اسلامی نظام مملکت

موجود نہ ہو۔ اور اس نظام کے تابع بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام میں اس کی کیا شکل ہوگی اور دوسرا یہ کہ جب وہ نظام قائم نہ ہو اس وقت کیا صورت ہوگی۔

جہاں تک اسلامی نظام میں تعلیم کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اس میں دین۔ دنیا سے الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس میں یہ شکل ہوتی ہی نہیں کہ اذان دینے، نماز پڑھانے، وعظ کہنے اور فتوے دینے کے لیے کوئی الگ جماعت ہو۔ مذہبی پیشوائیت کا یہ تصور اس زمانے کا پیش کردہ ہے جب دین اور سیاست میں افتراق ہو گیا۔ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا اور یوں ہمارے ہاں بھی، دیگر اہلِ مذاہب کی طرح مذہبی پیشواؤں کا الگ گروہ پیدا ہو گیا۔ دین کے نظام میں وہ تمام امور جنہیں مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لیا تھا، دین کے اجزا، لہٰذا امورِ مملکت تھے اور مملکت ہی انہیں سرانجام دیا کرتی تھی۔ اس مقصد کے لیے جو عمّال مقرر کئے جاتے تھے ان کے معاش کی ذمّہ داری بھی مملکت کے سر ہوتی تھی۔ چنانچہ اس باب میں سربراہ مملکت سے لے کر نیچے تک، ہر ایک کی کفالت مملکت کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں اور تو اور خود نبی اکرمؐ کے معاش کی کفیل بھی مملکت ہی تھی۔ یہی صورت، خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ ان کا سارا وقت امورِ مملکت (یعنی خدمت دین) میں صرف ہو جاتا تھا۔ اس لئے ان کی ضروریات مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں۔ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ (مع نبی اکرمؐ) اپنی قوم سے کہا کرتے تھے کہ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا تو اس کے مخاطب وہ غیر مسلم ہوتے تھے جن تک یہ حضرات اپنی دعوت پہنچاتے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو ان کی دعوت قبول کر کے، ان کے نظام میں شامل ہو جاتے تھے اور اس سے مراد اگر اپنے لوگ بھی لے لیے جائیں تو اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان سے انفرادی طور پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا معاوضہ اجتماعی نظام کے ذمے ہوتا تھا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہ (میرا اجر اللہ کے ذمہ ہے) کے یہی معنی تھے کہ میں ان امور کو فریضۂ خداوندی سمجھ کر سرانجام دیتا ہوں اور اس کا معاوضہ نظام خداوندی کے ذمّہ ہے۔ انفرادی طور پر کسی کے ذمّہ نہیں۔ سربراہ مملکت سے نیچے اتریئے تو یہی صورت عمّالِ حکومت کی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے محصلینِ زکوٰۃ (حکومت کی آمدنی وصول کرنے والوں) کی کفالت کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اذان۔ امامت۔ خطابت۔ تعلیم۔ سب اعمالِ مملکت کے فرائض تھے۔ باقی رہی دین کی تبلیغ،

سو وہ عمال حکومت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی ہر مومن کا فریضہ تھی۔ لہٰذا اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب رہا وہ دور جس میں اسلامی نظام قائم نہ ہو، (جیسا کہ اس وقت ہے) تو اس سلسلہ میں موجودہ صورتِ حال نہ صرف بڑی نا اطمینان بخش بلکہ تباہ کن بھی ہے۔ اب اذان۔ امامت۔ خطابت۔ وعظ نصیحت وغیرہ سب کا شمار "خدمت دین" کے زمرے میں کر لیا گیا ہے اور اس خدمت کو وہ لوگ سنبھال لیتے ہیں، جن کا ذریعہ معاش کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھی ایسی شکل نہیں کہ اس مقصد کے لیے جس قدر ضرورت ہو اسی کے مطابق لوگ پیدا ہوں۔ (جیسا کہ ملک کے دوسروں شعبوں میں ہوتا ہے) اس کے لیے ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ نکلتے چلے آ رہے ہیں اور چونکہ ان کے لیے خالی اسامیاں موجود نہیں ہوتیں۔ اس لیے وہ اپنی جگہ آپ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس کا معاوضہ قوم سے وصول کرتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی مساجد ہیں جنہیں امام مسجد اپنی جگہ پیدا کر لینے کے لیے بنوا ڈالتے ہیں۔ اسی طرح جگہ جگہ وعظ کہتے پھرتے ہیں۔ قوم سے روپیہ بھی وصول کرتے ہیں اور احسان بھی دھرتے ہیں کہ وہ دین کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ خدمت اس کے سوا اور کیا ہوتی ہے کہ اُمّت میں باہمی نفرت اور عداوت کے سے جذبات کو مشتعل کیا جاتا ہے۔ اور بھائی کو بھائی سے الگ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ طالب علم جو مذہبی دارالعلوموں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تلاش معاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ اور جب انہیں کہیں اور جگہ نہیں ملتی تو وہ ایک مدرسہ قائم کرنے کی تدبیر کر لیتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اس طرح ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد کس قدر بڑھتی جا رہی ہے جو خود کمانے کے قابل نہیں اور دوسروں کی کمائی پر بوجھ بنتے ہیں۔ ایسے ملک کی معاشی حالت کبھی سُدھر ہی نہیں سکتی۔

اس وقت ہمارے ہاں مساجد سے صرف اتنا کام لیا جاتا ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھ لی جائے اور جمعہ کے روز خطبہ سنا دیا جائے۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ اتنے سے کام کے لئے لاکھوں روپے کی عمارت باقی تمام وقت بیکار پڑی رہتی ہے۔ پھر اس کام کے لیے کم از کم ایک مؤذّن اور ایک امام — اور بعض مساجد میں خطیب — مستقل طور پر رکھے جاتے ہیں جن کا فارغ وقت کاٹے نہیں کٹتا — انسان بالآخر کتنا وقت سو کر گذار سکتا ہے؟ مؤذن کے لیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کو اوقاتِ مقررہ پر اذان دینی ہوتی ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں اس مقصد کے لیے کسی ایک آدمی کا تعین

ضروری ہے۔ لیکن امامت کے لیے تو اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص جس نے بالآخر خود بھی نماز پڑھنی ہے، اس لیے تنخواہ دار ہو کہ وہ باقیوں سے ذرا آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے، ویسے بھی امامت کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ جس قدر نمازی جمع ہوں۔ ان میں سے جو شخص دوسروں کی نسبت قرآن سے زیادہ واقف ہو، اسے وہ نمازی امام منتخب کر لیں۔ اس کام کے لیئے ایک الگ مستقل آدمی مقرر کر رکھنا خالص پاپائیت ہے۔ یہی صورت جمعہ کی نماز اور خطبہ کی ہونی چاہیئے۔ حاضر نمازیوں میں سے جو شخص زیادہ صاحبِ علم ہو وہ لوگوں کو کام کی باتیں بتائے۔ خطبہ کے معنی ہی دوسروں کو مخاطب کرنا یا ان سے بات چیت کرنا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ مساجد میں اسکول قائم کرائے جائیں اور ان کا نظام الاوقات ایسا رکھا جائے کہ نماز کے وقت نمازی ان میں نماز بھی ادا کر لیں۔ اسکول کا مدرس، مسجد کی حفاظت بھی کرے اور وقت پر اذان بھی دے دے۔ یہ شخص جو اس کام کے لیئے اپنا سارا وقت دے گا، یقیناً اس کا مستحق ہو گا کہ اس کی ضروریات کی مکتفل قوم ہو۔ اس کے لیئے معاوضہ بالکل جائز ہو گا۔ اس کی یہ خدمت غیر اسلامی نظام میں بھی، ایک حیثیت سے "دین کی خدمت" تصور کی جا سکے گی کیونکہ بچوں کو صحیح تعلیم دینا، دین کی خدمت ہے، بشرطیکہ اس تعلیم کو محض "مذہبی تعلیم" تک محدود نہ کر دیا جائے۔ جب ہم مذہبی اور دنیاوی تعلیم کو یک جا کر دیں گے تو وہ دینی تعلیم ہو جائے گی۔

اب رہا تبلیغ کا سوال، سو (اس وقت) یہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ہو گی۔ اور غیر مسلموں میں بھی۔ مسلمانوں کے اندر اس لیئے کہ مسلمان، قرآن سے بہت دور چلا گیا ہے اور ہمارا مروجہ اسلام، دینِ خداوندی سے کچھ الگ چیز ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے دین کا صحیح تصور لانے کی بے حد ضرورت ہے۔ مسلموں سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس وقت عیسائی مشنریز، مسلمانوں کے ممالک میں (سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر) بڑی شدت اور تیزی سے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ اس خطرہ کی مدافعت نہایت ضروری ہے۔ ویسے بھی قرآن کریم کے پیغام کا دوسرے انسانوں تک پہنچانا اُمت مسلمہ کا اوّلین فریضہ ہے۔

اب اگر قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان مقاصد کے لیے موزوں سمجھے جاتے ہیں، اور ان کا سارا وقت یا اس کا بیشتر حصہ اس کے لیئے وقف ہو جاتا ہے، تو ان کی کفالت بھی بہر حال قوم کے ذمے ہو گی۔ ان سے یہ کہنا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک یہ تھا کہ "لا اسئلکم من اجر" ہم اس کے لیے کچھ معاوضہ نہیں چاہتے، اس لیئے اس خدمت کا معاوضہ لینا، انبیاء کرامؑ کے مسلک کے خلاف

ہے، اس آیت سے بھی غلط استدلال کرتا ہے اور حقیقت سے بھی چشم پوشی۔ لیکن یہ کام کسی تنظیم کے تابع ہونا چاہیئے جو اس کا فیصلہ کرے کہ کس جگہ کس کام کی ضرورت ہے۔ اس کے لیئے کون سا آدمی موزوں ہے اور اس کی کفالت کا انتظام کس طرح ہوگا یہ نہیں کہ جس شخص کا جی چاہے خود ہی یہ کام شروع کر دے اور پھر قوم سے تقاضا کرے کہ وہ اس کی کفالت کا انتظام کرے۔ اس وقت یہ تو ممکن نظر نہیں آتا کہ اس قسم کی کوئی کلی تنظیم عمل میں آجائے۔ اس لیئے سردست انتظام مختلف اداروں یا جماعتوں کو ہی کرنا ہو گا۔ جو تنظیم یا جماعت یا ادارہ ایسے افراد کے سپرد اس قسم کا کام کرے، وہ ان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام بھی کرے۔ ان افراد کے لیئے اس قسم کا معاوضہ لے لینا عیب کی بات نہیں۔ (۱۹۶۳ء)

---

۱۵ اورنگ زیب کی روزی کا سلسلہ

ایک صاحب لکھتے ہیں۔ میں نے ایک تاریخ کی کتاب میں دیکھا ہے کہ اورنگ زیب قرآن شریف کی کتابت کر کے روزی کماتا تھا اور اس پر گذارہ کرتا تھا۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

طلوع اسلام

ہماری کتب تواریخ میں کونسی بات عجیب سی نہیں ہوتی جو اس ایک بات پر تعجب آئے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اورنگ زیب قلعہ دہلی کے محلات میں رہتا تھا۔ اس کا گھرانا بہت بڑا تھا۔ ان کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ملازمین کا لشکر تھا۔ کیا ان سب کا گذارہ اورنگ زیب کی کتابت کی کمائی پر ہوتا تھا؟ یا یہ صورت تھی کہ ان کا لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ تو حکومت کے خزانے سے ادا ہوتا تھا اور اورنگ زیب اپنی روٹی کتابت کر کے کھاتا تھا؟ سوچئے کہ وہ روزانہ کتنی کتابت کر لیتا ہوگا۔ اور اس کی اُجرت اسے کس قدر ملتی ہو گی! کیا اس اُجرت پر اس کی "دال روٹی" چل سکتی ہے!

اب اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ اگر اورنگ زیب واقعی ایسا کرتا تھا تو اس سے زیادہ

غیر ذمہ دار کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ؟ سارے ہندوستان پر اس کی حکومت تھی۔ امور مملکت اس قدر اہم اور پیچیدہ تھے کہ اس کی تمام تر توجہات ان کے حل کے لیئے درکار تھیں۔ کروڑوں انسانوں کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت اس کی ذمہ داری میں داخل تھی۔ ملک میں سیاسی خلفشار ایسا تھا کہ اسے اپنی عمر کے آخری پچیس سال دکن میں میدان جنگ میں گذارنے پڑے۔ اگر وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر اپنا وقت کتابت میں صرف کرتا تھا کہ اس سے دال روٹی کے لیئے پیسے کمائے، تو ایسے شخص کو تختِ حکومت پر نہیں، کسی مسجد کے حجرے میں بیٹھے ہونا چاہیئے تھا۔ !

اس کا تیسرا پہلو ایسا ہے جو سب سے اہم ہے۔ اورنگ زیب کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ بڑا دیندار۔ متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ (ممکن ہے کہ وہ ایسا ہی ہو) اور یہ چیز ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے کہ یہ بات تورّع اور پرہیزگاری کے خلاف ہے کہ بادشاہ یا اولی الامر میں سے کوئی اور، اپنی ضروریات کے لیے حکومت کے خزانے سے کچھ لے۔ یہی وجہ ہے کہ جن بادشاہوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ ان کے متعلق اس قسم کی باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں کہ فلاں ٹوپیاں بنا کر گذارہ کیا کرتا تھا اور فلاں قرآن شریف کی کتابت کر کے۔ حالانکہ یہ خیال ہی سرے سے باطل ہے کہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے حکومت کے خزانے سے کچھ لینا جائز نہیں۔ ہمارے سامنے سب سے پہلے خود نبی اکرمؐ کی مثال موجود ہے۔ حضورؐ کی دعوئے نبوت سے پہلے کی زندگی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ آپ تجارت کیا کرتے تھے۔ لیکن دعوئ نبوت کے بعد جب آپ کا سارا وقت اس مشن کے لیئے وقف تھا یہ کہیں سے متحقق نہیں کہ آپ نے اپنی معاش کے لیے کوئی کام کیا ہو۔ مکہ کی زندگی کے متعلق اس باب میں تفصیل سے کچھ معلوم نہیں لیکن مدینہ کی زندگی میں یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کی معاشی ضروریات مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں۔ یہی کیفیت خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ جو شخص اپنی زندگی ایسے بلند مقاصد کے لیئے وقف کر دے اسے اگر روٹی کے فکر سے آزاد نہ کیا جائے تو یہ چیز ان بلند مقاصد کے حصول کے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔ اس لیئے کہ اسے جو وقت ان مقاصد کی کامیابی کے لیئے صرف کرنا تھا وہ اسے حصول معاش کی نذر کر دینا پڑے گا اور مشن کے نقطۂ خیال سے یہ سودا جس قدر خسارے کا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ بات صرف امور مملکت تک محدود نہیں۔ ان کے علاوہ بھی جو شخص اپنا وقت ملّت کی بہبود کے کاموں کے لیئے وقف کر دے، ملّت کے لیے ضروری ہے کہ

وہ اس کے کفاف کی ذمہ داری لے۔ اور یہ بات ذرا بھی قابل اعتراض نہیں کہ وہ اس کفاف کو قبول کرلے۔ لیکن یہ ہمارے ہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہے یہاں اگر کوئی شخص اپنا کماتا کھاتا ہے، قوم سے کچھ نہیں لیتا۔ اور اپنے آپ کو قوم کے کاموں کے لیئے وقف کر دیتا ہے تو بجائے اس کے کہ قوم اسے فکر معاش سے فارغ کردے۔ اُلٹا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ قوم کے حوالے کردے ؛ یعنی وہ اپنا سب کچھ قوم کے حوالے کردے اور اس کے بعد خود بھوکا مرے! قائداعظم کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ قوم کو کیوں نہیں دے دیتے۔ نیز یہ بھی اعتراض ہوتا تھا کہ وہ اپنی ذات پر اتنا خرچ کیوں کرتے ہیں! یعنی دوسرے لوگ جو اپنا کاروبار کرتے تھے۔ اور قوم کو پوچھتے تک نہ تھے ان کے متعلق کوئی محاسبہ نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنی ذات پر کس قدر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اس شخص (قائداعظم) نے چونکہ اپنے آپ کو قومی کاموں کے لیے وقف کر رکھا تھا اس لیے (گویا) قوم کو حق حاصل ہوگیا تھا کہ وہ ان کے متعلق ہر وقت محاسبہ کرتی رہے۔ اگر قوم کوئی فنڈ اکٹھا کر کے ان کی تحویل میں دے دیتی تو اس کے متعلق اسے محاسبہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن اگر وہ اپنی کمائی میں سے اپنے آپ پر خرچ کرتے تھے تو قوم کو کیا حق حاصل تھا کہ ان پر محاسبانہ تنقید کرے۔ قوم کو تو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے تھا کہ قوم سے کچھ نہیں لیتے اور قوم کا اس قدر کام کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس قوم کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں یہ ذہنیت عام ہے جونہی کوئی شخص ملّی کاموں کے لیے آگے بڑھا، انہوں نے اسے ہدفِ تنقید بنایا۔

(۱۹۶۳ء)

۱۶۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا

طلوع اسلام کے اگست۔ ستمبر کے مشترکہ شمارہ میں، ہم نے "اورنگ زیب کی روزی" کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ جن لوگوں کا وقت ملک و ملّت (بلکہ قرآن کے الفاظ میں انسانیت) کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیئے وقف ہو، انہیں اپنی معاش کے لیئے ملک و ملّت سے کچھ لے لینا، جرم نہیں! اس ضمن میں ہم نے

نے خود نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عمل سے شہادت پیش کی تھی کہ ان کا سارا وقت، قرآن کی تبلیغ۔ جماعت کی تنظیم اور (بعد میں) امور مملکت کی سرانجام دہی میں صرف ہوتا تھا اس لیے انہیں فکرِ معاش سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں ایک صاحب نے یہ دریافت کیا ہے کہ کیا یہ چیز وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۲/۴۱) کے تحت نہیں آجاتی؛ یعنی کیا، قرآنی خدمت کے معاوضہ میں کچھ لے لینا، قرآنی آیات کو بیچنا نہیں ؟

پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ اگر اس آیت کا مفہوم یہی لیا جائے تو قرآنی تبلیغ۔ تعلیم، قرآنی جماعت کی تنظیم قرآنی معاشرہ کی تشکیل۔ حتیٰ کہ قرآنی مملکت کی تنسیق کے تمام کام بند ہو جائیں، یا کم از کم اطمینان بخش طریقہ سے کبھی نہ چل سکیں۔ اس لیئے کہ جو لوگ ان امور کو سرانجام دینے کے قابل ہوں اگر انہیں اپنا وقت اور توانائی حصول معاش کے لیے صرف کرنا پڑے، تو ان بلند مقاصد کے لیئے وقت اور توانائی کہاں سے آئے گی ؟ ایسے لوگوں کو فکرِ معاش سے آزاد کر دینا درحقیقت جماعتی زندگی میں تقسیم عمل کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآنی مقاصد کی بردمندی کے لیئے ایک جماعت وجود میں آتی ہے ان میں مختلف صلاحیتوں کے افراد ہوتے ہیں۔ جن افراد میں تعلیم و تبلیغ و تنظیم و تنسیق کی صلاحیت ہوتی ہے، انہیں وہ جماعت، فکرِ معاش سے آزاد کر دیتی ہے۔ تاکہ وہ اپنا سارا وقت انہی مقاصد کے لیے صرف کر سکیں۔ اس جماعت کی کمائی درحقیقت جماعت کے سارے افراد کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے جسے حسب ضرورت صرف کیا جاتا ہے۔ یہی کیفیت قرآنی مملکت کی ہوتی ہے۔ اس میں بھی مملکت کی آمدنی ملّت کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے۔ جسے حسبِ ضرورت صرف میں لایا جاتا ہے۔ اس میں جن لوگوں کے سپرد قرآنی تعلیم و تبلیغ اور نظم و نسق سے متعلق امور کر دیئے جاتے ہیں، وہ جماعت یا امّت سے اپنی قرآنی خدمات کا معاوضہ نہیں لیتے۔ وہ ان کی کفاف اس لیئے لے لیتے ہیں کہ اپنا سارا وقت ان مقاصد کے حصول کے لیئے صرف کر سکیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی توجہ ان کے خلیفہ منتخب ہو جانے پر دلائی تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد حسب معمول کپڑا بیچنے کے لئے نکلے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ اب آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اب آپ کا وقت، آپ کا اپنا نہیں رہا۔ یہ امت کی ملکیت ہو گیا ہے اس لیئے آپ کو اس کا حق حاصل نہیں رہا کہ آپ اسے جس طرح جی چاہے صرف کریں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا کہ اس صورت میں میری معاش کا کیا ہوگا ؟ انہوں نے کہا کہ اس فکر امّت کو ہو گی جس نے آپ کا

وقت لے لیا ہے۔

آیت وَلَا تَشْتَرُوْا ..... کا مفہوم اس سے ملحقہ آیت نے واضح کر دیا ہے۔ دونوں آیات ساتھ ملا کر دیکھنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ پہلے کہا ہے۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ۔ تم میری (خدا کی) آیات کو دنیاوی مفاد کی خاطر مت بیچو، (جو ان مقاصد عالیہ کے مقابلے میں جن کی طرف یہ آیات دعوت دیتی ہیں، بہر حال قلیل و کاسد ہیں یا تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اگرچہ اس آیات کے اتنے حصے نے (کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو) بھی بات کسی حد تک واضح کر دی ہے لیکن اگلی آیت میں اس کی تشریح آ گئی ہے۔ یعنی وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۴۲) تم تلبیس حق و باطل نہ کرو۔ حق کو بلا آمیزش پیش کرو۔ اسے باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے، اس کا نام شریعت خداوندی نہ رکھو۔ اور حق کو چھپاؤ نہیں۔ درآنحالیکہ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنا کس قدر ظلم عظیم ہے، یہ ہے آیات خداوندی کو بیچنا یعنی جب کوئی ایسا موقع آئے جس میں اپنے (یا اپنے حمایتیوں اور ساتھیوں کے) کسی مفاد پر زد پڑتی ہو، تو اول تو حق کو سامنے نہ آنے دیا جائے اور اگر مجبوراً اسے پیش کرنا ہی پڑے تو اسے بلا آمیزش سامنے لانے کے بجائے باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے پیش کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ جرم عظیم جس سے روکا گیا ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ یہی کرتی ہے۔ اور چونکہ ایسا کرنے میں ان کے اپنے مفاد کا تحفظ پیش نظر ہوتا ہے۔ اس لیئے اسے "آیات فروشی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسا کرنے والا سنگین ترین جرم کا مرتکب ہوتا ہے، خواہ وہ اس کے معاوضہ میں محسوس طور پر کسی سے کچھ بھی نہ لے (واضح رہے کہ معاوضہ کی بیسوں شکلیں ایسی ہیں جن میں بظاہر معاوضہ کچھ نہیں دکھائی دیتا مثلاً عزت الاثم یعنی اپنے ایغو کی جھوٹی تسکین۔ تحفظ پندار وغیرہ۔ لیکن یہ معاوضہ روپے پیسے کے معاوضہ سے کہیں زیادہ اور وزنی ہوتا ہے۔ (کتنے لوگ ہیں جو گروہ سے روپیہ صرف کر کے اس "معاوضہ" کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) لہٰذا دیکھنا یہ چاہیئے کہ کوئی شخص کتمان حقیقت اور تلبیس حق و باطل تو نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو یہ "آیات فروشی ہے" خواہ وہ اس کا معاوضہ نقدی میں وصول نہ بھی کرے۔ اور جو ایسا نہیں کرتا بلکہ بلا آمیزش حق بیان کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس مقصد کے لیئے وقف کر دیتا ہے تو اس کا اپنی جماعت یا امت سے اپنے کفاف کے لیئے کچھ لے لینا، اس آیت کے تحت بالکل نہیں آتا بلکہ وہ اگر فکر معاش کے، نسبتاً پست مقصد کی خاطر ان بلند مقاصد کے لیئے اپنے آپ کو وقف نہیں کرتا، تو اس

کا یہ فیصلہ درست نہیں ۔ جیسا کہ ہم حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قصّہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس قسم کی جماعت کی عدم موجودگی میں اگر کوئی شخص اپنے طور پر کسی داعیٔ قرآن کی مدد کرتا ہے اور اس کی وہ مدد اس کی حق گوئی کے راستے میں حائل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس کی ممد و معاون بنتی ہے، تو اس قسم کے تعاون یا معاونت کا قبول کر لینا بھی اس آیت کے تحت نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے کتمانِ حقیقت یا تلبیسِ حق و باطل کرتا ہے، اور اسے خود اپنی کمائی سے پیدا کردہ دولت کے ذریعے پھیلاتا ہے، تو یہ بھی "آیات فروشی" کرتا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، آیات اللہ کی قیمت صرف نقدی میں نہیں لی جاتی۔ اس کی بیسیوں اور شکلیں بھی ہیں۔ (۱۹۶۴ء)

۱۷۔ بہ صد چشم نم!

روزنامہ مشرق (لاہور) بابت ۷ فروری ۱۹۶۴ء میں شائع شدہ ایک خبر۔

"گذشتہ شب چشتیاں کی گیارہ سالہ بچی بلقیس بیگم میو ہسپتال میں انتقال کر گئی۔ پانچ روز قبل اس کی معمر والدہ فضل بی بی اور اس کا بھائی بشیر نہایت کسمپرسی کی حالت میں اسے لے کر لاہور پہنچے تھے۔ اور ایک تانگے والا ان کا وہ صندوق لے کر فرار ہو گیا۔ جس میں فضل بی بی کے بیان کے مطابق ضروری کپڑوں کے علاوہ بچی کا کفن بھی رکھا تھا۔ فضل بی بی نے نمائندہ مشرق کو بتایا کہ ہسپتال میں بلقیس داخل ہو گئی مگر اس کے ساتھ مجھے نہیں رہنے دیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں دو دن تک بچی کی شکل دیکھنے سے محروم رہی اور اور ہسپتال کے گیٹ پر پڑی ہر آنے جانے والے کا منہ دیکھتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے سنا تھا کہ لاہور میں اہل دل حضرات کی کمی نہیں مگر میری مصیبت میں کسی نے میری حوصلہ افزائی نہ کی۔ اور میری بچی کا کفن تک چھین لیا۔ مرحوم بلقیس بیگم کے بھائی بشیر نے بتایا کہ اخبار میں ہماری داستان سُن کر ایک صاحب نے مجھے سات روپے دیئے جو میں نے قرضہ حسنہ سمجھ کر قبول کر لیئے اس نے کہا کہ لاہور میں ہمارا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ والدہ کے لیے کھانے پینے اور بیمار بہن کی ضروریات کا انتظام کرنا بہر حال میرے ذمہ تھا۔ جس

کی تکمیل کے لیئے میں نے دو دن تک لاہور میں مزدوری تلاش کی اور مارا مارا پھرا مگر کسی نے بھی مجھے مزدوری نہ دی۔ والدہ دو دن تک فاقوں کا شکار رہی اور میں نے لنڈے بازار میں اپنے جوتے اور پگڑی فروخت کی اور والدہ اور اپنے لئے روٹی کا انتظام کیا۔"

اس کے بعد خبر میں کہا گیا ہے کہ دوسرے دن اس بچی کا انتقال ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس لاہور میں ہوا جس میں خیر سے اُس رسولؐ کے لاکھوں نام لیوا بستے ہیں جس نے فرمایا تھا کہ :-

"جس بستی میں ایک فرد نے رات بھوکے بسر کی اس بستی کی حفاظت کی ذمہ داری خدا کے ہاں سے ختم ہو جاتی ہے"۔

اور یہ اس رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا جس میں ایک ایک مسجد میں ختم قرآن کریم پر ہزاروں روپے تزئین و آرائش پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اولئک حبطت اعمالھم کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

(۱۹۶۴ء)

۱۸۔ مجرم کون ہے

۲۷ اگست ۱۹۶۴ء کے روزنامہ مشرق (لاہور) میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

"ماں سے سولہ دن کی بچی کا بھوک سے تڑپنا نہ دیکھا گیا اور وہ دیوانوں کی طرح بچی کو لے کر گھر سے باہر نکل آئی اس نے ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑی گئی۔ ماں کی اس حرکت سے بچی کی بھوک تو ختم نہ ہو سکی البتہ اس کی زندگی کا (۱۷) واں دن حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گذرا۔

حشمت بی بی نے بتایا کہ پانچ سال قبل اس کی شادی ملتان روڈ کے ایک نوجوان مسکین سے ہوئی تین سال تک دونوں میاں بیوی بڑی خوشگوار ازدواجی بسر کرتے رہے۔ چند ماہ پہلے اچانک اس کا شوہر بیمار ہو گیا اور اس کی بیماری طول پکڑتی

چلی گئی۔ حشمت بی بی نے شوہر کا علاج کرانے کے لیے اپنی تمام پونجی لٹا دی۔ لیکن وہ صحت یاب نہ ہوا آخر اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب حشمت بی بی پر گھر کے اخراجات کا بوجھ بھی آپڑا اور اس نے محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاوند کا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔

سولہ روز قبل حشمت بی بی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اس طرح اس کی مزدوری بھی چھوٹ گئی۔

حشمت بی بی نے کہا کہ وہ گذشتہ چار دنوں سے بھوکی تھی۔ اور اس فاقہ نے اس کی سولہ دن کی بچی کو بھی نڈھال کر دیا۔ اس سے بچی کی حالت نہ دیکھی گئی اور وہ اسے لے کر دودھ کی تلاش میں گھر سے باہر نکل آئی۔ حشمت بی بی نے کہا کہ اس نے کئی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ لیکن کسی نے اس کی دادرسی نہ کی۔ آخر اس نے ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگنا چاہا۔ تو پولیس نے اسے پکڑا اور حوالات میں بند کر دیا۔"

ہم نہیں جانتے کہ اس کے بعد اس خاتون پر کیا گذری اور وہ اب کہاں ہے۔ نہ ہی ہم نے مزید تحقیق کے لیئے اس خبر کو اپنے ہاں شائع کیا ہے۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بے شک پولیس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز کو زبردستی چھینتا ہے تو اسے حراست میں لے لے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی کسی کی ذمہ داری ہے یا نہیں کہ جو بچی اس طرح بلک بلک کر بھوک سے جان دے رہی ہو اس کے لیئے سامان زیست مہیا کیا جائے؟

ہمارے موجودہ معاشرہ میں تو یہ کسی کی بھی ذمہ داری نہیں۔ اس لیئے نہیں کہ یہاں ایسے مخیّر افراد موجود نہیں۔ یہ بات افراد کے بس کی نہیں۔ یہ ذمہ داری وہ معاشرہ اپنے سر پر لیتا ہے جو قرآن کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس معاشرہ کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب قرآنی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو اس میں آپ کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں کہ:۔

"اگر دجلہ کے کنارے کوئی کُتا بھی بھوک سے مر جائے
تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔"

(۱۹۶۴ء)

۱۹ —— اسلامک سوشلزم

ایک صاحب کہتے ہیں۔ طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت اگست۔ستمبر ۶۴ء) میں آپ نے اسلامک نیشنلزم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت سے شبہات رفع ہوگئے۔ اس سے درحقیقت مراد یہ ہے کہ مسلم نیشن ایمان کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے اور نسل۔ رنگ۔ وطن کی تفریق مسلمانوں کے اُمتِ واحدہ ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ اسی سلسلہ کی ایک اصطلاح "اسلامک سوشلزم" ہے۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق ..... نے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> معاشی اور معاشرتی دائروں میں ہمارے پیش نظر منتہی یہ ہے کہ ہم بتدریج پاکستان میں اسلامک سوشلزم قائم کردیں۔ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح رفاہی مملکت (WELFARE STATE) کی اصطلاح کے قریب مترادف ہے اس فرق کے ساتھ کہ رفاہی مملکت کے نصب العین کے علاوہ اسلامک سوشلزم اس بات کا بھی خیال رکھے گی کہ ملک کا کلچرل اور مذہبی ورثہ محفوظ رہے اور وہ معاشی ترقی کے اندھے جذبہ کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ لہٰذا اسلامک سوشلزم کا تصور، رفاہی مملکت کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ایک فرد کی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۳۰/۶/۶۴)

اس سے واضح ہے کہ پاکستان میں معاشی ترقی کا منتہی مغربی ممالک کی رفاہی مملکت نہیں بلکہ دین کی اقدار کا تحفظ بھی اس کے اندر آجاتا ہے۔ یہ تشریح اطمینان بخش ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہم ان اصطلاحات کی بجائے، اپنی اصطلاحات کیوں نہ استعمال کیا کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ نیشنلزم، سوشلزم، رفاہی مملکت کی اصطلاحات عصر حاضر میں ایک خاص مفہوم کی حامل ہیں۔ اول الذکر دونوں اصطلاحات، اسلام کے بنیادی اصولوں کی نقیض ہیں اور تیسری اصطلاح اتنی ناقص ہے کہ اسے اسلامی رنگ دینے کے

لیئے خاصے اضافہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم مسلم نیشنلزم کی جگہ اُمتِ مسلمہ (یا ملت اسلامیہ) کی اصطلاح استعمال کریں اور اپنے معاشی پروگرام کے منتہیٰ کی "اسلام کے معاشی نظام" کی اصطلاح سے تعبیر کریں، تو یہ اصطلاحات جامع بھی ہونگی اور اپنے مقصد و منتہیٰ کی رُو سے واضح بھی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ طلوع اسلام میں اس سے پہلے ان امور کیمتعلق کچھ لکھا تھا۔ لیکن اگر ان کی پھر وضاحت ہو جائے تو اچھا ہے۔

طلوع اسلام

آپ کو ٹھیک یاد پڑتا ہے۔ طلوع اسلام ان موضوعات پر ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار لکھ چکا ہے بلکہ لکھتا چلا آرہا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں ایک نظام زندگی دیا ہے اور اس نظام کی تعبیر کے لیئے اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ نہ یہ اصطلاحات کسی اور نظام پر فٹ بیٹھتی ہیں اور نہ ہی کوئی دوسری اصطلاح اس نظام کے متعلقہ گوشہ کی صحیح تعبیر کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نظام کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اور وہی اصطلاحات اس نظام کی تعبیر کر سکتی ہیں۔ مثلاً سوشلزم ایک خاص معاشی نظام کی اصطلاح ہے۔ نہ یہ اصطلاح کسی اور نظام کے لیئے استعمال ہو سکتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی اور اصطلاح اس نظام کی صحیح تعبیر کر سکتی ہے۔ اسی طرح نیشنلزم کی اصطلاح ہے۔ اس لیئے ہمیں اسلامی نظام اور اس کے مختلف گوشوں کی تعبیر کے لیے اسی کی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں۔

لیکن اس باب میں ہمارے ارباب حل و عقد کی جو دشواریاں ہیں۔ ان کا بھی ہمیں احساس ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ ہمیں "اسلام کا معاشی نظام" کہنا چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے کون متعین کرے گا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ معاشی نظام تو ایک طرف یہاں یہی متعین نہیں ہو پایا کہ خود اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں، اسلام ہر فرقہ کا الگ الگ ہے۔ اس قدر الگ کہ ایک فرقہ کا اسلام دوسرے فرقے کے نزدیک کفر ہے۔ اور مسلمان کی تعریف کے سلسلہ میں حضرات علماء کرام کی طرف سے جو کچھ منیر کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس پر ایک زمانہ شاہد ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے ارباب بست و کشاد "اسلام" کا نام لیتے، یا اس کی طرف کسی اسکیم کی نسبت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ نہ معلوم اسے کیا معانی پہنا دیے جائیں۔ وہ بچارے تو مملکت کو اسلامی کہہ کر بھی عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہر بوالہوس اٹھتا ہے اور چلا چلا کر کہتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ غیر اسلامی ہے، حکومت ہمارے حوالے کر دو تاکہ ہم اسے صحیح معنوں

میں اسلامی بنائیں۔ اسلام کے ان مدعیان کی حالت یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان میں یہ شق رکھی گئی کہ ملک میں کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا تو انہوں نے شادیانے بجائے کہ مملکت مسلمان ہوگئی ہے لیکن جب ۱۹۶۲ء کے دستور میں لکھا گیا کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنے گا تو ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ اب اس شق کو بدل کر پھر "کتاب وسنت" کے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ دستور پھر غیر اسلامی کا غیر اسلامی ہی ہے۔ یہاں تو "اسلام" کو تماشا بنا دیا گیا ہے۔ اور جب دین مذہبی پیشوائیت کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسی طرح تماشا بن جایا کرتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مشکل کا حل کوئی نہیں۔ اس کا حل موجود ہے۔ اور نہایت اطمینان بخش حل۔ یعنی آپ "اسلامی نظام معاشی" کہنے کے بجائے قرآن کا معاشی نظام کہئے۔ بات صاف واضح اور متعین ہو جائے گی۔ قرآن سے دو قسم کے معاشی نظام مرتب ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کا نظام متعین ہے اور اسی لیے اس نظام کی اصطلاحات کے معانی بھی متعین ہیں۔ یہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح یہ تمام دشواریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے لیئے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا مذہبی پیشواؤں کا طبقہ، قرآن کا نام تک سننے کے لیئے تیار نہیں۔ یہ اس لیئے کہ قرآن کے نام سے ہر بات متعین ہو جاتی ہے اور تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو جانا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس "کتاب وسنت" کہنے سے ہر فرقہ کو اپنے وجود کی سند مل جاتی ہے اور مذہب کے خلاف اڈے قائم رہتے ہیں۔

لیکن اس الجھاؤ کو بالآخر ختم کرنا پڑے گا۔ کوئی قوم ذہنی اور نظری انتشار کی حالت میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی۔ یا اسے اس انتشار کو ختم کرنا ہوگا۔ اور یا یہ انتشار اُسے ختم کر دے گا۔ اس قسم کے انتشار کو ختم کرنے کے لیے بس ایک عزم راسخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہمیں یہ میسر آ گیا تو ہم بچ جائیں گے، ورنہ انتشار نے آج تک کسی قوم کو زندہ چھوڑا نہیں۔ اس کے لیئے اس صاحبِ عزم کو کرنا یہ ہوگا کہ زندگی کے ایک ایک شعبے کے متعلق قرآن جو نظام دیتا ہے، اسے واضح اور نکھری ہوئی شکل میں مدوّن کیا جائے اور پھر اسے مملکت میں بتدریج عملی شکل دی جائے اور اس کے لیئے اصطلاحات بھی قرآن ہی کی استعمال کی جائیں۔ یاد رکھیے۔ قرآن اپنا مخصوص نظام رکھتا ہے اور اس میں کسی قسم کے پیوند کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس باب میں کس حد تک غیر لچکدار ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیئے سورۂ محمدؐ کی آیات

نمبر ۲۶، ۲۵ کو سامنے لایئے۔ آیت نمبر ۲۵ میں کہا گیا ہے کہ دین سے مرتد کون ہوتا ہے؟ اور آیت نمبر ۲۶ میں اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ کَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ (۴۷/۲۶) جو ان لوگوں سے جنہیں قرآن سخت ناگوار گزرتا ہے کہتے ہیں کہ ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے یعنی دین سے وہی لوگ نہیں پھرتے جو دین کو چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ دین سے وہ بھی پھر جاتے ہیں جو دین کے نظام میں کسی غیر دینی نظام کو پیوند لگا لیتے ہیں اور اس طرح خدا اور طاغوت میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اس نے سورہ بقرہ کی اس آیۃ جلیلہ میں دھرایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلّت و خواری نصیب ہوتی ہے۔ اور آخرت میں بھی عذاب شدید۔ (۲/۸۵) اور اس پیوندسازی کے معنی یہی نہیں کہ آپ ایک بات قرآن کی لے لیں اور دوسری بات (مثلاً) عیسائیت کی یا کسی سیکولر نظام (مثل مغربی جمہوریت یا کمیونزم کی) پیوندسازی یہ بھی ہے ——— اور یہ سنگین قسم کی پیوندسازی ہے۔ کہ آپ کچھ باتیں قرآن کی لے لیں اور کچھ باتیں وہ لے لیں جو اسلامی شریعت کے نام سے ہم میں مروّج چلی آ رہی ہیں لیکن قرآن کے خلاف جو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی پیوندسازی بھی دین سے ارتداد ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت جس اسلام کو پیش کر رہی ہے وہ تو ہے ہی اس قسم کی پیوندسازی۔ جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر کسی معاملہ میں ان کی مروّجہ شریعت اور قرآن میں تضاد واقعہ ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے، ان کے ہاں خالص قرآن کا دین مل کس طرح سکتا ہے!

دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے کہ وہ یہاں خالص دین خداوندی (قرآنی نظام) متشکل کر دکھائے۔ یہ شہد خالص اسی کو مل سکے گا جو نہ تو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گھبرائے، اور نہ ہی ان کی نیش زنی سے خوف کھائے۔

وذالك من عزم الامور (۱۹۶۴ء)

۲۰۔ روس میں سزائیں

سوال :۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر لوگ فکر معاش سے آزاد ہو جائیں تو جرائم کا ازسرنو باب نہیں ہوتا۔ یا کم از کم جرائم بڑی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ روس نے اپنے ہاں ایک جدید معاشی نظام رائج کیا ہے جس سے مقصود یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ فکر معاش سے آزاد ہو جائیں۔ کیا اس نظام کی ترویج کے بعد، روس میں جرائم (بالخصوص سنگین جرائم) میں کمی واقع ہو گئی ہے یا ان کی صورت بدستور ہے۔؟

جواب :۔ روس کے صحیح حالات بہت کم باہر آتے ہیں کیونکہ وہاں فولادی پردے لٹکے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں کی قانونی حالت کے متعلق جو خبریں باہر آتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سنگین جرائم کی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ نتیجہ اس حقیقت سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں جن جرائم کی سزا موت ہے ان کی فہرست میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ روس میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سزائے موت منسوخ کر دی گئی تھی کیونکہ اسے زارِ روس کے عہد استبداد کی یادگار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کے چند ہی ماہ بعد (۱۹۱۸ء میں) اس سزا کو پھر رائج کرنا پڑا۔ اسے ۱۹۲۰ء میں پھر منسوخ کر دیا گیا لیکن چند ہی ماہ بعد اسے دوبارہ رائج کرنا پڑا۔ اسٹالن کے عہد اقتدار میں ان جرائم کی فہرست بڑھتی گئی جن کی سزا موت تھی۔ جبکہ ایک وقت میں وہاں اس فہرست میں ۶۴ جرائم مندرج تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں اسے پھر منسوخ کر دیا گیا لیکن ۱۹۵۰ء میں اسے پھر زندہ کرنا پڑا۔ اسٹالن کی وفات کے بعد (۱۹۵۴ء میں) اس کی توقع تھی کہ شاید یہ فہرست کچھ سکڑ جائے لیکن اس میں مزید وسعت آ گئی۔ اس وقت وہاں اکثر جرائم کی سزا موت ہے۔ مثلاً مملکتی یا معاشرتی مقبوضات کی بڑے پیمانے پر چوری۔ سکوں کی جعل سازی، منصوبہ بندی سے متعلق امور کے حساب کتاب میں فریب دہی، مملکت کے حفاظتی دستوں پر حملہ۔ کرنسی کا غیر قانونی کاروبار۔ زنا بالجبر، رشوت، اصلاحی اداروں کے کارندوں کا ڈسپلن کا پابند نہ رہنا[1] وغیرہ۔

---

[1] ہماری ان معلومات کا ماخذ، جرنل اوف دی انٹرنیشنل کمیشن اوف جورسٹس کا ستمبر ۱۹۶۴ء کا شمارہ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر جرائم کی وجہ معاشی کشمکش اور دولت کی ناہموار تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن جس فلسفہ پر روس کے اشتراکی نظام کی عمارت استوار ہوئی ہے اس کی رُو سے ان کے معاشی نظام میں بھی جرائم میں کمی واقع نہیں ہو سکتی، یہ تو ہو سکتا ہے کہ بھوک کی وجہ سے پیدا ہونے والے جرائم میں وہاں کمی ہو جائے۔ اور سزائے موت کے جرائم کی فہرست میں وسعت اس حقیقت پر دال ہے کہ وہاں چھوٹے چھوٹے نہیں بلکہ سنگین جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب زندگی کا تصور خالصتہً مادی ہو یعنی اس میں وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار، قانون مکافات، حیات آخرت کا تصور ہی نہ ہو تو پھر کونسا جذبہ محرکہ جرائم کو روک سکے گا۔ یہ چیز صرف قرآن کے نظام زندگی میں ممکن ہے جس کا اوّلیں مقصد انسان کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے۔ معاشی نظام تو اس انقلاب کے ثمراتِ شیریں کا صرف ایک خوشہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں نظاموں کی خرابیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اکثر کہا کرتے ہیں، سرمایہ داری جذام اور قابل ہے اور اشتراکیت سرسام۔ صحیح انسانی زندگی قرآنی نظام ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جس کی بنیاد صحیح تعلیم پر قائم ہوتی ہے۔ فریضۂ رسالت۔ یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم کے معنی ہی یہ ہیں۔ یعنی کتاب اور حکمت پر مبنی تعلیم اور اس کے نتیجہ میں وہ نظام جس میں ہر فرد کو بھرپور سامان نشوونما ملتا جائے۔ یہی ہے وہ نظام جس میں جرائم اس طرح ناپید ہو جاتے ہیں کہ جب عہد صدیقیؓ میں مجسٹریٹ کی اسامی کو تجربتہً وجود میں لایا گیا تو سال بھر کے بعد اسے منسوخ کرنا پڑا کیونکہ اس عرصہ میں کوئی مقدمہ ہی اس کے ہاں پیش نہیں ہوا۔

آپ کو شاید اس کا علم ہو کہ اس وقت دنیا میں سب سے بہتر رفاہی مملکت سویڈن کی ہے جہاں ہر فرد کو سامان زیست باافراط حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کے واقعات بھی سویڈن میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی یورپ کا مادی تصورِ حیات ہے۔

(۱۹۶۴ء)

۲۱۔ کیا خدا عادل ہے

لائلپور سے ایک صاحب نے ہمیں ایک سوال بھیجا جس کا موضوع یہ تھا کہ "کیا خدا عادل ہے"۔ ہم نے انہیں لکھا کہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب ایک خط میں دیا جا سکے۔ اس اہم اور بنیادی سوال کے سمجھنے کے لیئے نظام کائنات۔ قانونِ مکافاتِ عمل۔ انسانی اختیار و ارادہ۔ انسانی دنیا میں خدا کا طریق کار۔ فرد اور معاشرہ کے تعلقات۔ ظالم کے ظلم میں خود "مظلوموں" کا حصہ وغیرہ بیسیوں گوشے سامنے آئیں گے جو بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ اس لیئے اس سوال کو زبانی گفتگو سے سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔ لیکن ان کا اصرار ہے کہ ان کے سوال کا جواب لکھ کر ہی دیا جائے۔ اور اسے طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ ہم شروع ہی میں اس امر کا اعتراف یا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس جواب میں بھی وہ تمام متعلقہ گوشے تفصیلاً سامنے نہیں آ سکتے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ جواب بہرحال مختصر ہوگا اور صرف اصولی حیثیت لیئے ہوئے۔ آپ پہلے ان کا سوال ملاحظہ فرمایئے۔

سوال۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسلام کا خدا عادل کے نام مشہور ہے۔ لیکن اس کے باوجود میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ وہ کیسا عادل خدا ہے، جو اس دنیا میں ایک غریب آدمی کو ساری عمر تڑپتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس غریب کے آنسوؤں کو خشک کر سکے۔ اس کے درد کی دوا بن سکے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس غریب کی زندگی میں المیہ پر المیہ ٹوٹتے ہیں۔ لگاتار حادثات اس کی کمر توڑتے رہتے ہیں۔ مزید برآں وہ آدمی ہوتا بھی نیک ہے، خدا کے قرآن کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ ساری دنیا گواہی دیتی ہے کہ اس جیسے نیک طینت آدمی بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود ظلم و ستم کا شکار رہتا ہے، اس کے برعکس ایک امیر فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے، دولت اس کے قدموں کو بوسہ دیتی ہے، دنیا کی تمام آرائشیں اس کو ہدیہ تبریک پیش کرتی ہیں۔ اس طرح بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ رشوت خور کو اس دنیا میں پوری سزا مل ہی جائے۔ ایک چور بعض اوقات تو قانون کی نظر میں چور ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات قانون کو اس کی چوری کا علم ہی نہیں ہوتا۔ ایک انشورنس ۶۰ لاکھ جانیں تلف کرنے

کے بعد قانون کی نظر میں صرف پھانسی کا مستحق ہوتا ہے۔ دیکھئے اس سوال کو حل کرنے میں بعض علماء کرام آخرت کے جواز میں دلیل نکالتے ہیں، جو میرے نظریے کے خلاف ہے میں صرف خدا کو مانتا ہوں۔ آخرت کے متعلق میرا ایمان ابھی شک کی دہلیز پر ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک عادل خدا اگر صرف آخرت میں ہی عدل کو سکتا ہے اور اس دنیا میں بالکل خاموشی سادھے ہوئے ہے تو کیا یقین کہ آخرت میں بھی وہ عدل کر سکے یا نہ۔ اس لیے میرا سوال یہ ہے کہ خدا عادل ہے تو اتنا ظلم کیوں ہو؟ اگر نہیں تو اس قسم کے خدا پر جو عدل نہیں کر سکتا، کون یقین کرے۔؟

جواب:۔ سوال کے آخری حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ فلسفہ اخلاق میں یہ "معمہ" بہت قدیم اور مشہور ہے کہ اگر شر، خدا کی مرضی سے موجود ہے تو خدا خیر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ خدا کی مرضی کے خلاف موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں ہو سکتا۔ لفظی طور پر یہ معمہ بڑا مشکل نظر آتا ہے لیکن جب اسے قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بات محض ضمناً سامنے آگئی ہے ہمارے زیر نظر سوال کا تعلق عدل سے ہے۔

۲۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا نے اپنے لیے (قرآن میں) عادل کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے کائنات کے نظم و نسق کے لیے (جس میں انسانی دنیا بھی شامل ہے) کچھ قوانین مقرر کر دیے ہیں اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ لہٰذا یہاں ہر بات قانون کے مطابق عمل میں آتی ہے اور اگر عدل کی تعریف یہ ہے کہ جو بات قانون کے مطابق ہو اسے عدل کہا جاتا ہے تو اس اعتبار سے آپ خدا کو عادل کہہ سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ظلم پر مبنی نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ہمارے مستفسر کے ذہن میں خدا کے عادل ہونے کا تصور یہ ہے کہ جونہی کوئی شخص جھوٹ بولے اس کی زبان گنگ ہو جائے۔ جونہی کوئی کسی کی طرف نظر بد سے دیکھے تو اس کی آنکھ پھوٹ جائے۔ جونہی کوئی ظالم کسی کمزور کے خلاف ہاتھ اٹھائے تو اس کا بازو پتھر کا بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کو عادل مانا جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو (جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا) تو پھر خدا عادل کس طرح کہلا سکتا ہے، یعنی اگر خدا ہمارے تصور کے مطابق عادل ہو تو اسے عادل کہا جائے۔ اور اگر وہ عدل کے اس تصور پر پورا نہ اترے

تو اسے عادل کس طرح مانا جائے ؟

خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے اور یہی اس کا بابہ الامتیاز شرف ہے۔ اسی سے وہ اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جسے انسان اپنے اختیار سے عمل میں لائے۔ انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ بدی کی استعداد و استطاعت رکھتا ہوا بدی سے مجتنب رہے۔ ہم پتھر کو نیک نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ وہ ساری عمر برائی نہیں کرتا۔ ہم بکری کی شان میں کبھی قصیدۂ مدحیہ نہیں پڑھتے کہ اس نے ساری عمر کسی کا خون نہیں پیا۔ نہ مجبور کی نیکی نیکی ہے۔ نہ اس کی بدی بدی۔ سعدیؒ کے الفاظ ہیں

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا کر تواضع کند خوئے اوست

جس میں سر اٹھا کر چلنے کی استطاعت ہی اس کی انکساری اور خاکساری کبھی وجہ تحسین نہیں ہو سکتی۔ اختیار و ارادہ کی قوت کے صحیح استعمال ہی سے انسان کی صلاحیتوں کی برومندی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے۔ تو وہ اسے کبھی سلب نہیں کرتا۔ خدا نے اپنے قادر مطلق ہونے کے باوجود اپنے آپ پر خود یہ پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اور یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ کوئی تنگ ظرف ہو تو اسے بات بات پر غصہ آجائے اور انسان کے اختیار کو جھٹ سلب کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کر دے۔ ہمارے مستفسر نے خدا کے عادل ہونے کا جو تصور پیش کیا ہے، اس سے خدا کا نقشہ اسی قسم کا سامنے آتا ہے۔ یعنی خدا کو چاہیئے کہ وہ انسانوں کے معاملات میں انفرادی طور پر دخل دے اور جونہی کوئی بات اس کے منشاء کے خلاف ہونے لگے اسے اپنی قوت کے زور سے فوراً روک دے۔ آپ سوچئے کہ اگر خدا نے یہی کچھ کرنا ہوتا تو اسے اس قدر طولِ عمل کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ انسانوں کو (بھیڑ بکری کی طرح) پیدا ہی اس طرح کرتا کہ ان میں غلط راستے پر چلنے کی استطاعت ہی نہ ہوتی۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اس سے انسانی دنیا کا نقشہ کیسا ہوتا؟ یہ صاحب عقل و شعور اور ذی اختیار و ارادہ انسانوں کی چلتی پھرتی زندہ اور متحرک دنیا نہ ہوتی بلکہ سنگ و خشت اور دام و دد کی دنیا ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَاحِدَةً۔ اگر ہم چاہتے تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتے کہ وہ ایک روش پر چلنے کے لیے مجبور ہوتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ انسان کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ جس کا جی اپنے اختیار و ارادے سے سیدھے راستے پر چلے اور جس کا جی

چاہے غلط راستہ اختیار کرے۔ اور یہ اس لیے کہ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۹۳) تاکہ ہر ایک پر اس کے کام کی ذمہ داری عائد ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہو کہ جو شخص غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کرے اس کا قدم ہی نہ اٹھ سکے، تو انسان کے صاحب اختیار و ارادہ ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جائے اور وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً صحیح روش پر چلے۔ اس باب میں (کہ کسی کو جبراً صحیح روش پر نہ چلایا جائے) اسقدر احتیاط برتی گئی ہے کہ مخالفین رسول اللہ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور خدا اس سے یہ کہہ کر انکار کر دیتا تھا کہ معجزہ دکھانے سے ذہنی جبر (MENTAL COMPULSION) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس قسم کا اقرار انسان کی آزادیٔ فکر (FREE WILL) کا نتیجہ نہیں ہوتا اس لیے معجزہ دکھا کر مسلمان بنانا خدا کی اسکیم کے خلاف جاتا ہے؛ چہ جائیکہ ظالم کے ہاتھوں کو مافوق الفطرت قوت سے روک کر اسے ظلم سے باز رکھتا۔

۳۔ اب یہ دیکھئے کہ ظلم ہوتا کس طرح سے ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون مکافات عمل پیرا کس طرح ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ کا نظام صحیح خطوط پر متشکل ہو تو اس میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں انفرادی طور پر کوئی شخص کسی پر دراز دستی کر ہی بیٹھے تو معاشرہ کا نظام اس کا فوری مواخذہ اور تدارک کر دیتا ہے۔ ظلم ہوتا ہی اس معاشرہ میں ہے جو غلط بنیادوں پر استوار ہو۔ لہٰذا سوال کسی فرد (ظالم) کے مواخذہ کا نہیں۔ اس غلط معاشرہ کے مواخذہ کا ہے۔ جس میں ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ خدا کا قانون یہ ہے جو نظام ظلم پر مبنی ہوگا۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ خواہ نظم و نسق کی لاکھ تدبیریں اس کے استحکام کے لیے کوشاں کیوں نہ ہوں۔ عام طور سمجھا جاتا ہے کہ جو نظام، مادی قوتوں کو اکٹھا کر لے۔ اپنی حفاظت کے اسباب و ذرائع کو مستحکم کر لے۔ اپنے نظم و نسق کو نہایت حسن تدبر سے چلائے وہ نظام کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔ لیکن خدا کا کہنا یہ ہے کہ یہ غلط ہے ہمارا قانون یہ ہے کہ ایسا معاشرہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں خدا کا عدل سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں تاریخ عالم کے متعدد شواہد پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ قومیں قوت، دولت، شان و شوکت۔ سامان زیست۔ کثرت تعداد۔ ذرائع پیداوار وغیرہ کے اعتبار سے بڑی ممتاز تھیں لیکن چونکہ ان کا نظام ظلم پر مبنی ہے اس لیے ان کی دولت و قوت اور حسن تدبیر انہیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ حتیٰ کہ ان کا علم و بصیرت بھی انکے کسی کام نہ آیا۔ وہ خدا کے قانون مکافات کو بے بس

نہ کر سکے۔ وہ قومیں تباہ ہو کر رہیں۔

۴۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک اور حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کو دھوکا لگ جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا عدل کوئی شے نہیں۔ نہ ہی اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی کوئی ہستی ہے۔ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں، ایک وقفہ ہوتا ہے۔ جس طرح تخم ریزی اور فصل کے پکنے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ اسے خدا کا قانون تدریج کہا جاتا ہے۔ یعنی قوموں کا بتدریج آہستہ آہستہ تباہی کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ یہ مہلت کا وقفہ بھی خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ اگر اس قوم کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہے اور کمزوریاں اور لغزشیں کم ہیں۔ تو وہ وقفہ لمبا ہو جاتا ہے۔ قوم ڈوبتی اس وقت ہے جب اس کی کمزوریاں اس کی صلاحیتوں پر غالب آجاتی ہیں یہاں کمزوریوں اور صلاحیتوں سے مراد ہے غلط روش اور صحیح روشِ زندگی۔ چونکہ قوموں کی زندگی دنوں اور مہینوں سے نہیں ناپی جاتی۔ وہ صدیوں کے حساب سے ناپی جاتی ہے۔ اس لیے یہ مہلت کا وقفہ بھی بعض اوقات سینکڑوں برسوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کی مدت العمر میں یہ وقفہ پورا نہیں ہو سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ سب دعوے یونہی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں کہ ظالم اور جابر پنپتے چلے جاتے ہیں اور مظلوم و مقہور بیچارے پستے چلے جاتے ہیں۔ اگر خدا عادل ہوتا۔ یا اس کا قانونِ مکافاتِ حقیقت ہوتا تو ظالم تباہ نہ ہو جاتے؟

۵۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مہلت کا عرصہ سکڑ کر کم بھی ہو سکتا ہے یا اتنے کا اتنا ہی طول طویل رہتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ کم ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں کی کوئی جماعت ایسی پیدا ہو جائے جو خدا کے قانون کے مطابق معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ تو اس کے ہاتھوں ظلم و استبداد پر مبنی نظام کا خاتمہ دنوں میں ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر انسان کا دست و بازو قانونِ خداوندی کا رفیق و دمساز بن جائے تو پھر صدیوں کے کام دنوں میں سرانجام پا جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ انسانی دنیا میں خدا کا قانون انسانوں کے حساب و شمار سے انسانوں کے ہاتھوں نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ مہلت

کا وقفہ جس کے بعد غلط نظام نے تباہ ہونا تھا۔ صدیوں کے بجائے دنوں میں بدل جاتا ہے۔

ہمارے مستفسر نے کہا ہے کہ ایک شخص بڑا نیک ہے۔ وہ قرآن کو سینے سے لگائے رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس پر ظلم پر ظلم ہوتے ہیں۔ اس مقام پر ہمارے محترم مستفسر پھر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اس شخص کے نیک ہونے سے غالباً ان کی مراد یہ ہے، کہ وہ نماز روزے کا پابند ہے۔ صدقہ خیرات بھی کرتا ہے، اس کے عام اخلاق بھی اچھے ہیں۔ لیکن قرآن کی میزان میں نیکی اسی کو نہیں کہتے۔ اس کے نزدیک "نیک" وہ ہے جو غلط نظام کے الٹنے اور اس جگہ صحیح نظام خداوندی قائم کرنے کے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور یہ کام انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا اس کے لیے یہ شخص اس جماعت کا فرد بن کر جدوجہد کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ جماعت جو غلط نظام کی جگہ صحیح نظام خداوندی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے قرآن کی رو سے زندگی ہے ہی اجتماعی۔ اگر وہ شخص جو ہمارے مستفسر کے تصور کے مطابق بڑا نیک ہے اور قرآن کو سینے سے لگائے پھرتا ہے، لیکن ظلم پر مبنی نظام کے اندر خاموش زندگی بسر کیے جاتا۔ بلکہ ظلم پر ظلم سہے جاتا اور اس کے خلاف کچھ نہیں کرتا (بجز آہ فغاں کے) تو وہ شخص نہ صرف یہ کہ نیک ہی نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ اس ظالم نظام کی تقویت کا (بالواسطہ) موجب بننے کی وجہ سے، عدالت خداوندی میں ظلم کی اعانت کا مجرم بھی قرار پاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے اپنے تمثیلی انداز میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے جب جہنم میں تباہ ہونے والی قوم کے لیڈر اور ان کے متبعین جمع ہوں گے تو آپس میں ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ ہماری تباہی کا موجب تم ہو۔ ظاہر ہے کہ ان لیڈروں کے جرائم تو نمایاں طور پر سامنے ہوں گے لیکن یہ متبعین وہ ہوں گے جن کی ساری عمر ظلم وستم سہتے سہتے گذری تھی۔ جب یہ اپنے لیڈروں کو مورد الزام قرار دیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اس باب میں تم بھی کم مجرم نہیں ہو۔ ان لیڈروں کی طاقت کا ذریعہ تم ہی تھے۔ تمہارے بل بوتے پر یہ اس قدر بد مست اور سرکش ہو رہے تھے، اگر تم ان کے مظالم برداشت کرتے چلے جانے کے بجائے، ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تو انہیں ان دراز دستیوں کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ اس لیے ان کے مظالم میں تم بھی برابر کے شریک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تم بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو۔ اسی لیے جس مظلوم کو دیکھ کر ہم خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ وہ بھی درحقیقت بالواسطہ اس باطل نظام کا پرزہ ہوتا ہے۔

۹۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے قانون خداوندی کی رُو سے

ہوتے ہیں۔ اور اسی کا نام خدا کا عادل ہونا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ انہ لا یفلح الظالمون۔ جو نظام ظلم پر مبنی ہوگا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ دوسری طرف واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷) بقا اس نظام کے لیے ہے جو تمام نوع انسان کے لیے منفعت بخش ہو۔ یہی اچھے اور برے نظام کا معیار ہے اور اسی معیار کے مطابق کسی نظام کی فنا اور بقا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کے اس قانون کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر معیار صرف یہ رہ جائے گا کہ جس نظام کی پشت پر مادی قوت زیادہ ہو وہ کامیاب و کامران ہو خواہ وہ کتنا ہی ظلم و استبداد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اور جس کے پاس نسبتاً کم طاقت ہو وہ تباہ ہو جائے خواہ وہ نوع انسان کے لیے کیسا ہی منفعت بخش کیوں نہ ہو۔ یعنی معیار صرف مادی قوت قرار پا جائے۔ اس بات کا اس پر کچھ اثر نہ ہو کہ خود وہ نظام کیسا ہے۔ قوموں کی تاریخ اور مورخین تہذیب کی تحقیقات اس نظریہ کی تغلیط کرتی ہیں۔ اور اس قانون کو صحیح قرار دیتی ہیں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ایک اچھے نظام کی حفاظت کے لیے بھی مادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس نظام کی بنیادی اچھائی بھی ایک قوت اپنے اندر رکھتی ہے۔ جو اسے تباہ ہونے سے محفوظ رہنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

یہ ہے خدا کا "نظام عدل"

سنہ ۱۹۶۴ء

۱۶

متفرقات

۲۲۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

ایک محترمہ خاتون کا خط

محترم۔ السلام علیکم۔ آپ عورتوں کے حقوق کی بازیابی اور حفاظت کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کے لیے اس طبقہ کو یقیناً آپ کا شکر گزار ہونا چاہیئے جہاں تک میرے علم میں ہے، پاکستان میں صرف آپ کی آواز ہے جس نے اس مظلوم طبقے کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس طبقہ کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ خیال (بلکہ عقیدہ) ان کے دل میں راسخ کر دیا گیا تھا کہ انسان صرف مرد ہیں۔ عورتیں کوئی ایسی جنس ہیں جو انسانی سطح سے بہت پست ہیں۔ اس وقت میں آپ کی توجہ معاشرہ کی ایک ایسی خرابی کی طرف دلانا چاہتی ہوں جس نے ان بیچاریوں کے لیے ایک اور مصیبت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں نے زندگی کی ضرورتوں کے لیے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا ہے ان کی بچیاں اسکول جاتی ہیں۔ بڑی لڑکیاں کالجوں میں جاتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے نوجوان لڑکوں میں بدتمیزی کی ایسی لہر پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ان عورتوں۔ لڑکیوں اور بچیوں کو چھیڑنے اور ستانے میں بڑی لذت لیتے اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور حیرت اس پر ہے کہ یہ حرکات ایسے گھرانوں کے نوجوانوں کی طرف سے سرزد ہوتی ہیں جن کی اپنی مائیں اور بہنیں اسی زمرہ میں آتی ہیں جنہیں اس طرح تنگ کیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کوئی شریف زادی گھر سے باہر نکل کر اپنے آپ کو محفوظ تصور ہی نہیں کر سکتی۔ بچیاں اسکول جانے سے گھبراتی ہیں۔ لڑکیاں کالج جانے سے ڈرتی ہیں۔ اور بڑی عورتیں کام کاج کے لیے باہر نکلنے سے جھجکتی ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ اس کی آدھی آبادی اپنے آپ کو ہر وقت غیر محفوظ پائے اس معاشرہ کا زندہ قوموں میں مقام کیا ہو سکتا ہے اور۔ آدھی آبادی وہ ہو جس کی گود میں آنے والی نسلوں کو پرورش پانا اور تربیت حاصل کرنا ہو۔ جس ماں کا دل ہر وقت خوف اور ہراس سے کانپتا رہے۔ جسے ہر مرد سے ہر وقت ڈر محسوس ہوتا رہے جو اپنے آپ کو کبھی

محفوظ تصور نہ کرے۔ جو بچہ اس کی گود میں پرورش پائے گا۔ اس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہو گی۔ اور آگے چل کر اس کا کیریکٹر کس قسم کا بنے گا؟ حالت اس وقت یہ ہو چکی ہے کہ بچیاں اسکولوں اور کالجوں میں جاتی ہیں تو جب تک وہ خیریت سے واپس گھر نہ آجائیں، دل دھڑکتا رہتا ہے۔ وہ واپس آتی ہیں تو ڈری اور سہمی ہوئی۔ جب وہ بتاتی ہیں کہ راستوں میں بدتمیز لڑکوں نے کس طرح انہیں تنگ کیا تو خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا علاج کیا کیا جائے۔ اڑوس پڑوس والوں سے بات کیجئے تو ہر ایک یہی مشورہ دے گا کہ لڑکیوں کو باہر نکلنا ہی نہیں چاہیئے۔ حیرت ہے کہ اب یہ مشکل کسی ایک کی نہیں رہی۔ قریب قریب ہر ایک ماں باپ اس کا شاکی ہے۔ لیکن اس کے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ ہر ایک اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب اوباش پن کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ان لوگوں کی طرف سے کرایا جا رہا ہے جو عورتوں کے حقوق کے مخالف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر عورتوں نے تعلیم حاصل کر لی تو یہ اپنے حقوق کی محافظ بن جائیں گی۔ اس لیے ان کی اسکیم یہ ہے کہ انہیں ڈرا دھمکا کر پھر گھروں کے اندر بند کر دیا جائے۔ میں اس نتیجہ پر اس لیے پہنچی ہوں کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر راستے میں کوئی اوباش کسی عورت کو چھیڑتا تھا تو دوسرے لوگ اس کی مذمت کرتے تھے۔ لیکن اب یہ دیکھا گیا ہے کہ چھیڑنے والے اب یہ کہہ کر چھیڑتے ہیں کہ عورتوں کا باہر نکلنا اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم اس خلافِ اسلام طریقہ کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اور راستہ چلنے والے نہ صرف یہ کہ ان کی مذمت نہیں کرتے بلکہ اسی قسم کے دو چار فقرے اور بڑھا کر ان کی حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں آپ غور کیجئے کہ اس صورت حال کا نتیجہ کیا ہو گا؟ آپ براہ کرم اس کے متعلق کچھ کیجئے۔ اب تو پانی سر تک چڑھ آیا ہے۔ ان بیچاریوں کے لیے کوئی گوشہ بھی سکون اور حفاظت کا نہیں رہا۔ والسلام۔

طلوعِ اسلام

ہماری محترمہ بہن نے جس خرابی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے اس کا ہمیں بھی شدت سے احساس ہے۔ آئے دن اس قسم کی شکایات ہم تک پہنچتی رہتی ہیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمانوں کی جماعت ہجرت کے بعد مدینہ پہنچی ہے تو اسے وہاں اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا

پڑا تھا۔ وہاں کا اوباش طبقہ مسلمان شریف زادیوں کو راستوں میں تنگ کرتا تھا اور جب ان سے باز پُرس کی جاتی تو وہ یہ کہہ دیتا کہ ہم پہچان نہیں سکے کہ یہ شریف عورتیں ہیں۔ ان کی اتمام حجت کے لیے قرآن کریم نے یہ حکم دیا کہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۳۳/۵۹) اے نبی! تم اپنی عورتوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ باہر نکلتے وقت، اپنے جلباب اوڑھ لیا کریں۔ یہ اس لیے مناسب ہے کہ وہ پہچانی جائیں اور شریر طبقہ انہیں تنگ نہ کرے۔" (جلباب) اوور کوٹ کی قسم کا کپڑا ہوتا تھا جسے عام لباس کے اوپر پہن لیا جاتا تھا جیسے آج کل نرسیں یا ڈاکٹر (DOCTORS) پہنتے ہیں) یہ حفاظتی تدبیر تھی جسے قرآن نے اس ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تجویز کیا۔ لیکن اگر وہ لوگ اس پر بھی عورتوں کو چھیڑنے سے باز نہ آئیں تو پھر کیا کیا جائے؟ قرآن کریم نے کہا یہ سوال ایسا نہیں جسے اسی طرح چھوڑ دیا۔ یہ معاشرہ کا بیحد اہم سوال ہے۔ اور اس کا مؤثر حل نہایت ضروری ہے۔ فرمایا لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ - اگر مدینہ کے منافق ـــــ یعنی وہ لوگ جو بظاہر بڑے شریف نظر آتے ہیں لیکن ان کی نیتیں سخت خراب ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ ہے۔ وہ شریف زادیوں کو تنگ کرتے ہیں اور پھر ان کے متعلق ایسی افواہیں پھیلاتے ہیں جن سے ان کی عزت پر حرف آجائے۔ اگر یہ لوگ اس حفاظتی تدبیر کے باوجود، اپنی حرکات سے باز نہ آئیں۔ تو۔ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ۔ یہ نہیں کہ انہیں کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرتے پھریں۔ بالکل نہیں۔ اس طرح تو یہ لوگ شریف زادیوں کا باہر نکلنا محال کر دیں گے۔ تم اٹھو اور اس طرح ان کے پیچھے لگ جاؤ کہ ان کا اس شہر میں رہنا محال ہو جائے۔ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَاۤ اِلَّا قَلِیْلًا) یا تو یہ، اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور اگر یہاں رہیں تو انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ (مَّلْعُوْنِیْنَ) اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو اَیْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا۔ وہ جہاں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے۔ وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا۔ (۳۳/۶۰-۶۱) اور ان کا خوب قتل کیا جائے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے، شریف زادیوں کے تنگ کرنے اور ان کے متعلق غلط افواہیں پھیلانے کو کس قدر سنگین جرم قرار دیا ہے۔ اس نے سزائے موت یا تو جرم قتل عمد کے لیے مقرر کی ہے اور یا مملکت کے خلاف بغاوت کے لیے۔ لیکن یہاں اس نے قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا کہہ کر اس جرم کو ان جرائم سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ قرآن کریم عورتوں کی حفاظت کو انسانی جان اور مملکت کی حفاظت سے کم اہمیت نہیں

دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں عورت اپنے آپ کو محفوظ تصور کرے تو اس معاشرہ کا توازن ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر نبی اکرمؐ نے اس قرآنی معاشرہ کا منتہیٰ جسے حضورؐ کے ہاتھوں متشکل ہونا تھا، یہ بتایا تھا کہ ایک عورت یمن سے شام تک تنہا سفر کرے گی اور اسے کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہوگا۔ یعنی حسنِ معاشرہ کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس میں عورت، کسی جگہ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ نہ محسوس کرے۔

یہ ہے اس مرض کا وہ علاج جسے قرآن کریم نے تجویز کیا تھا۔ اور یہ علاج وقتی اور ہنگامی نہیں تھا۔ قرآن نے مندرجہ بالا آیات کے بعد کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۱) - خدا کا یہ فیصلہ اور قانون نیا نہیں۔ ایسے واقعات اقوام گذشتہ میں بھی ہوتے رہے ہیں، وہاں بھی خدا نے یہی قانون دیا تھا۔ اب تمہیں بھی یہی کہا جا رہا ہے۔ اور اس کے بعد جب بھی اس قسم کے واقعات سامنے آئیں، خدا کے اس قانون کے مطابق عمل کرنا چاہیئے اس لیے کہ یہ خدا کا وہ قانون ہے جس میں تو کوئی تبدیلی نہیں پائے گا یہ اس کا غیر متبدل قانون ہے۔ جب اور جہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو تو اس قانون پر عمل کیا جائے۔

آپ قرآن کریم کے اس قانون کی مختلف شقوں پر غور کیجئے۔ بات صاف ہو جائے گی۔

(۱) جہاں تک اس پہچان کا تعلق ہے کہ یہ لڑکیاں شریف زادیاں ہیں یا نہیں۔ اس کے لیے آج کل کسی امتیازی نشان کی ضرورت نہیں۔ اسکول میں جانے والی بچیوں اور کالج میں جانے والی لڑکیوں کے متعلق کسے دھوکا لگ سکتا ہے کہ وہ شریف زادیاں نہیں ہیں۔ اس لیے جو بدمعاش طبقہ انہیں راستوں میں تنگ کرتا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم پہچان نہیں سکے تھے کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا اوباش لڑکیاں۔

(۲) قرآن کریم نے پہلی حفاظتی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ایسے بدمعاش عنصر کے خلاف پورے کا پورا معاشرہ اُٹھ کھڑا ہو۔ لوگ اس طرح ان کے پیچھے پڑ جائیں کہ ان کا جینا حرام ہو جائے۔ یا وہ اپنی ان حرکات سے باز آجائیں اور یا شہر (بلکہ ملک) چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں۔

یہ ہے سب سے پہلا موثر قدم جسے قرآن نے اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس کے لیئے ضروری ہے کہ معاشرہ کی ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا جائے۔ ان کے دل میں ان حرکات کے خلاف جذباتِ مذمت بیدار کئے جائیں تاکہ باہر نکلنے والی لڑکیاں اور عورتیں اسے محسوس

کریں کہ بدمعاش عنصر کو چھوڑ کر، ہر راہ رو، ان کی عزت کا محافظ اور ان کی ناموس کا پاسبان ہے۔ آج کل ہمارے ہاں ہر شہر اور ہر بستی میں یونین کونسلیں موجود ہیں۔ اگر ہر کونسل اپنے اپنے علاقے کا ذمہ لے لے کہ اس میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہونے پائے گی تو معاشرہ اس فتنہ سے پاک ہو جائے۔ علاوہ بریں، اس سلسلے میں ملک میں عام پراپیگنڈہ ہونا بھی ضروری ہے۔ جس طرح پچھلے دنوں، بچوں کے اغوا کے سلسلے میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے سلسلے میں پراپیگنڈہ کی ایک مہم شروع ہوئی تھی، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی ایک مہم شروع کی جائے اور اسے اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک معاشرہ سے اس خرابی کا کلیتہً استیصال نہ ہو جائے۔ یہاں تک افراد کے کرنے کا کام ہے۔ اس سے آگے قانون کی باری آتی ہے۔

۳۔ ملک میں ایسا واضح قانون ہونا چاہیئے کہ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہو، اسے

(ا) پہلی مرتبہ یہ سزا دی جائے کہ اسے حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔

(ب) اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو اس کے وارنٹ بلا ضمانت جاری کئے جائیں۔ اور مجرم ثابت ہونے پر اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔ (یاد رہے کہ قرآن کریم نے پاک دامن عورتوں کے خلاف الزام تراشی کی سزا ۸۰ کوڑے مقرر کی ہے)

(ج) اور عادی مجرم کو سزائے موت دی جائے۔

واضح رہے کہ حکومت کا اولین فریضہ ملک میں امن قائم رکھنا ہے۔ قیام امن کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد معاشرہ، اپنی جان۔ مال۔ عزت کو ہر وقت محفوظ سمجھے، اور ملک میں بلا خوف وخطر نقل وحرکت کر سکے۔ جو لوگ حکومت کے اس بنیادی فریضہ کی سرانجام دہی کے راستے میں حائل ہوں اور ملک کی حالتِ امن کو خوف میں بدلنے کے درپے، انہیں سخت سزا دی جانی چاہیئے۔ اسی لیے قرآن کریم نے عورتوں کو تنگ کرنے والوں کے خلاف اس قدر سخت اقدامات کی تاکید کی ہے اور اسے خدا کا غیر متبدل قانون قرار دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ارباب حل وعقد اس طرف ضرور توجہ دیں گے۔

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قانونی اقدامات سے پہلے، یہ کام انفرادی طور پر معاشرہ میں شروع ہو جانا چاہیئے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب ہر فرد معاشرہ، ہر عورت اور لڑکی کی عزت کو خود اپنی بہن اور بیٹی کی عزت سمجھے، اور فتنہ پرور عناصر سے ان کی حفاظت ایسے ہی کرے جس طرح وہ

اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس لیے معاشرہ میں رائے عامہ کا بیدار کیا جانا اشد ضروری ہے۔ کیا ہم توقع کریں کہ ملک کے اخبارات اس باب میں قدم اٹھائیں گے؟ یا وہ اسی مشغلہ میں مصروف رہیں گے کہ اس قسم کے واقعات کی خبروں کو نمک مرچ لگا کر اور اس طرح انہیں سنسنی خیز بنا کر شائع کریں اور یوں قوم کی معصوم بیٹیوں کی ناموس کی تشہیر کرتے رہیں اور کبھی اتنا سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہ کریں کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

(۱۹۶۴ء)

شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

سابقہ فروری کے طلوع اسلام میں ہم نے ایک محترمہ خاتون کا خط شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ آج کل ہمارے ہاں یہ وبا عام ہو رہی ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے گزرگاہوں پر شریف زادیوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ہم نے اس پر انتہائی رنج و تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس قسم کے بدنہاد، فتنہ پرور لوگوں کو عبرت آموز سزائیں دی جائیں۔ اس پر ہمیں (بزعم خویش) "دیندار" طبقہ کی طرف سے کئی ایک خط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> طلوع اسلام ملک میں بے حیائی پھیلانے کا ٹھیکہ دار بن گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ ان عورتوں اور جوان لڑکیوں سے کہتا کہ تم گھروں سے باہر کیوں نکلتی ہو۔ اندر کیوں نہیں بیٹھتیں۔ اس نے الٹا ان لڑکوں کو کوسنا شروع کر دیا اور اسطرح ان باہر پھرنے والیوں کی حوصلہ افزائی کر دی۔ (وغیرہ وغیرہ)

ہم اپنے ان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام نے جو کچھ کہا تھا اپنی طرف سے نہیں کہا تھا۔ خدا کا حکم پیش کیا تھا۔ خدا نے رسول اللہ سے کہا تھا کہ ان فتنہ پرور منافقین کی اتمام حجت کے لیے اپنی عورتوں سے تو یہ کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر ایک کپڑا اوڑھ لیا کریں تاکہ یہ لوگ یہ نہ کہہ

سکیں کہ ہم پہچان نہیں سکے تھے۔ کہ یہ عورت آوارہ ہے یا شریف زادی۔ اور اگر اس کے بعد یہ ان حرکات سے باز نہ آئیں تو انہیں سخت سزا دی جائے۔ جس میں سزائے قتل بھی شامل ہے (دیکھئے ۳۳/۶۰-۵۹) افسوس ہے کہ ہمارے یہ معترض حضرات نزول قرآن کے وقت موجود نہ تھے ورنہ یہ ضرور اللہ میاں سے کہتے کہ (معاذ اللہ) "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس سے تو یہ عورتیں اور بیباک ہو جائیں گی۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ گھروں سے باہر نہ نکلا کریں"۔ اور ان چھیڑ چھاڑ کرنے والوں سے کہتے کہ شاباش! تم بہت بڑا کام کر رہے ہو۔ اگر یہ عورتیں پھر باہر نکلیں تو انہیں ایسا تنگ کرو کہ دوبارہ باہر آنے کا نام نہ لیں۔ اس کارِ خیر کا بہت بڑا اجر تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا"۔ اسی قسم کا وہ طبقہ تھا جو رسول اللہ سے کہا کرتا تھا کہ اِئْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵)۔ یہ قرآن ہماری منشاء کے مطابق تعلیم نہیں دیتا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس کے فلاں فلاں مقام میں ہماری حسب منشاء تبدیل کر دو۔ پھر ہم اسے مانیں گے۔ طلوع اسلام کا قصور صرف اتنا ہی ہے کہ یہ قرآن کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا ہے قرآن کا وہ مفہوم پیش نہیں کرتا جو لوگوں کی منشاء کے مطابق وضع کیا گیا ہو۔ واضح رہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھنا، قرآن کریم نے ایک جُرم کی سزا کے طور پر تجویز کیا ہے۔ (۴/۱۵) اگر مقصد یہ ہوتا کہ عورتیں گھروں سے باہر ہی نہ نکلیں تو یہ کیوں کہا جاتا کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ اور قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ (۲۴/۳۰-۳۱)۔ مومن مردوں اور عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ وہ جو سورۂ احزاب میں "نبی کی عورتوں" سے کہا گیا ہے کہ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ۔ اپنے گھروں میں وقار سے بیٹھیں۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ گھروں میں بند رہیں۔ باہر نکلیں ہی نہیں۔ ان الفاظ کی تشریح اگلے الفاظ نے کر دی، جہاں کہا گیا کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى۔ (۳۳/۳۳)۔ جس طرح زمانہ جاہلیت میں عورتوں کا حال تھا کہ وہ مردوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے اپنی آرائش و زیبائش کی نمود و نمائش کرتی پھرتی تھیں۔ وہ کچھ نہ کریں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے۔

(۱) عورتوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ گھروں کے اندر بند رہیں۔ پابندِ مسکن رکھنا تو ایک جُرم کی سزا ہے۔ (۴/۱۵)

(۲) وہ کام کاج کے لیے مردوں کی طرح باہر آجا سکتی ہیں۔ البتہ انہیں اس سے روکا گیا ہے کہ

وہ زیب وزینت کی نمائش یا حسن کی نمود کرتی پھریں۔

(۳) عورتوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا سنگین جُرم ہے۔ معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا کرنے والوں کو اس سے روکے اور اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو انہیں سخت ترین سزا دے۔

(۱۹۶۴ء)

---

۲۴ — مسلمانوں کے "حرم"

ایک صالح نوجوان جو حال ہی میں یورپ اور امریکہ وغیرہ کے سفر سے واپس آئے ہیں، ایک نہایت نازک سوال دریافت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مغربی ممالک میں جہاں بھی پہنچا، اس سے سب سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ تمہارے "حرم" کتنے ہیں۔ حرم سے ان کی مراد ہوتی ہے، بیویوں کا ریوڑ اور لونڈیوں کی پوری کی پوری کھیپ۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے متعلق ان کا احساس یہ ہے کہ ان میں من حیث القوم جنسی جذبہ بڑا قوی اور شدید ہوتا ہے اور بدقسمتی سے ہماری تاریخ خود اس کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ خواہ وہ پچھلی تاریخ ہو یا خود ہمارے زمانے کی تاریخ۔ قرآن کریم نے زنا کی سخت سزا مقرر کی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں زنا ایسا عام ہے بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اس معاملہ میں بڑا بدنام ہے۔ یورپ میں آج کل جنسی جذبہ کی جو شدت پائی جاتی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہاں زنا کو (سوائے بالجبر کے) معیوب ہی خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن جس قوم میں زنا کو اس قدر معیوب خیال کیا جاتا ہو ان میں جنسی جذبہ کی شدت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیا آپ بتائیں گے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

جنسی جذبہ کے متعلق سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بھوک یا پیاس کی طرح از خود بیدار نہیں

ہوتا۔ اسے انسان اپنے خیالات سے بیدار کرتا ہے اور اس کے لیے جس قدر زیادہ مواقع ممکن نظر آئیں اسی قدر زیادہ خیال اس کی طرف جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے بیدار بھی ہوتا ہے۔ سوال جائز یا ناجائز کا نہیں۔ نفسیاتی طور پر سوال مواقع (OPPORTUNITIES) کے کم یا زیادہ ہونے کا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ جس حلقہ کو محارم (PROHIBITED AREA) تصور کر لیا جاتا ہے (یعنی جن عورتوں یا مردوں سے نکاح حرام ہوتا ہے) اس میں جنسی جذبہ کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ بیٹی بہن۔ خالہ۔ پھوپھی وغیرہ کے حلقہ میں انسان دن رات پھرتا رہے جنسی جذبہ کا تصوّر تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے زنا کو سنگین ترین جُرم اور معیوب ترین حرکت قرار دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا تھا کہ محارم کا دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ مثلاً مسلمان مردوں کے لیے تمام غیر مسلم عورتیں (بجز اہل کتاب کی عورتوں کے) محرکات کی فہرست میں داخل۔ اور مسلمان عورتوں کے لیے تمام غیر مسلم مرد، محارم کے دائرے کے اندر۔ آپ غور کیجئے کہ مسلمان مرد، کفار اور مشرکین کی عورتوں کے اثر دھام میں دن رات پھرتا رہے۔ چونکہ اس سے نکاح حرام ہے اس لیے اس کے دل میں ان کی طرف سے جنسی جذبہ کا خیال تک نہیں آئے گا۔ وہ سب اس کے نزدیک۔ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے برابر ہوں گی۔ قرآن کریم نے اس ایک حکم سے ان غیر مسلم عورتوں کو مسلمانوں کی طرف سے کس طرح یکسر محفوظ اور مامون کر دیا کہ یہ ان کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کے نزدیک دنیا کے تمام غیر مسلم مرد بھائیوں اور بیٹوں کی مانند ہوں گے۔

اب لیجئے وہ حلقہ جس کے اندر نکاح ہو سکتا ہے۔ اس میں قرآن کریم نے وحدتِ زوج (MONOGAMY) کو عام اصول قرار دے کر شادی کے بعد دنیا بھر کی عورتوں کو محرکات کی فہرست میں داخل کر دیا۔ یعنی جب ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کر لیا تو چونکہ اس کی موجودگی میں وہ (بجز ہنگامی حالات کے) کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کر سکتا اس لیئے جب تک وہ عورت زندہ یا اس کے نکاح میں ہے۔ دنیا کی تمام عورتیں اس پر حرام ہو گئیں۔ اسی طرح وہ مرد بھی باقی تمام عورتوں کے نزدیک باپ اور بیٹے کی طرح ہو گیا۔ اسے کسی اور عورت سے یا کسی عورت کو اس سے شادی کا خیال اسی صورت میں آ سکتا ہے جب اس کی پہلی بیوی مر جائے یا ان میں طلاق ہو جائے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے جنسی جذبہ کی تسکین کے مواقع کو کم از کم حد تک سکیڑ کر کس طرح اس

جذبہ کی بیداری کے نفسیاتی محرکات کو سمٹا دیا ــــ زنا حرام ــــ اور ایک عورت سے شادی کر لینے کے بعد اس کی موجودگی میں دنیا کی ہر عورت سے نکاح ناجائز۔ (بجز ان خصوصی حالات کے جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے)۔ یہ سب محرکات کی صف میں چلی گئی ہیں۔ اسی طرح تمام شادی شدہ مسلمان مرد، دنیا بھر کی عورتوں کے نزدیک محارم کی صف میں آ گئے۔

لیکن مسلمان نے کیا کیا؟ زنا کو تو حرام سمجھا لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے مواقع کو عام کر دیا۔ قرآن کریم نے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت صرف ان استثنائی صورتوں میں دی تھی جب معاشرہ میں عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت اور حفاظت کا سوال ایک لاینحل مسئلہ بن جائے۔ انہوں نے اسے عام اجازت قرار دے کر شادی ہو جانے کے بعد بھی، باقیماندہ عورتوں کو محرم نہ رہنے دیا۔ نہ ہی باقی عورتوں نے اس مرد کو محرم سمجھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہر مرد کو چھٹی مل گئی کہ وہ جس عورت کا خیال چاہے جی میں لے آئے اور سوچتا رہے۔ کہ اس سے شادی کی کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہر عورت یہ خیال کرتی رہے کہ اس کے نکاح میں جانے کی کیا شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) جنسی جذبہ کی بیداری، خیالات سے ہوتی ہے، اس سے اس قوم میں اس جذبہ کی مسلسل بیداری کی راہیں کھل گئیں ــ پھر چونکہ مرد کو اس کا بھی اختیار مطلق دے دیا گیا کہ وہ جس وقت جی چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے، بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اس لیئے چار تک کی تحدید بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکی۔ چار بیویوں کے بعد بھی اس کے لیئے اور عورتوں سے نکاح کر لینے کا راستہ کھول دیا گیا ــ یعنی ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آنے سے ــ اس سے آگے بڑھے تو لونڈیوں کو حرم میں داخل کرنے لگے (حالانکہ قرآن کریم نے غلاموں اور لونڈیوں کا تصور تک مٹا دیا تھا) کبھی دشمن کی قید کردہ عورتیں بطور لونڈیاں اور کبھی بازار میں بکتی ہوئی عورتیں ــ اور چونکہ لونڈیوں کی تعداد پر بھی حدبندی نہ تھی اس لئے اس سے جنسی جذبہ کے اشتعال کی جو صورت پیدا ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے)۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر بدقسمتی سے ہماری قوم میں جنسی جذبہ کی بیداری اس افراط اور شدت سے پائی جاتی ہے۔ آپ زنا اور مبادیاتِ زنا کو جُرم اور معیوب حرکات قرار دے کر وحدتِ زوج کے قانون کو (بجز ہنگامی حالات کے) اصول بنا دیں۔ اس کے بعد دیکھیں کہ جنسی جذبات میں کتنا سکون اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور معاشرہ میں عام عورتوں اور مردوں کے تعلقات کا وہ مسئلہ

جس نے اس وقت قوم کو اس قدر مضطرب و پریشان کر رکھا ہے اس کا حل بھی کس طرح خود بخود مل جاتا ہے۔ مسلمان مرد کے ہاتھوں تو دنیا کی ہر عورت اپنے آپ کو سب سے زیادہ محفوظ تصور کر سکتی ہے۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں تو وہ اس کی طرف بُری نگاہ سے دیکھ نہیں سکتا، کیونکہ زنا اور مبادیاتِ زنا اس کے نزدیک انتہائی معیوب افعال اور جرائم ہیں۔ اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو جب تک اس کی بیوی موجود ہے وہ عام حالات میں کسی عورت کے متعلق جنسی خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ وہ سب محرمات کی صف میں داخل ہیں۔

جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک سمیٹ دینے سے اتنا ہی نہیں ہوتا کہ معاشرہ میں سکون پیدا ہو جاتا ہے بلکہ یہ قوم زندگی کی خوشگواریوں میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ مغرب کا مشہور ماہرِ جنسیات (J.D. UNWIN) اس ضمن میں لکھتا ہے:-

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود نہ کر دیں اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو قلیل ترین حد تک محدود کر دیا جائے) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل بن جائے گی۔ (۱۹۶۴ء)

امتناعِ شراب کا حکم

اخبارات میں شائع شدہ ایک خبر سے معلوم ہوا ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل نے حکومت کو اپنی رائے سے مطلع کر دیا ہے کہ اسلام میں شراب واقعی ممنوع ہے۔ معلوم نہیں کونسل بیچاری کو اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے کس قدر کوہ کنی اور خارہ شگافی کرنی پڑی ہو گی! بہر حال مقامِ تشکّر ہے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی اور انہیں بالآخر بالتحقیق معلوم ہو گیا کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے۔

اصل میں قصور مشاورتی کونسل کا بھی نہیں۔ ان سے جب کسی معاملہ کے متعلق استفسار یا استصواب کیا جائے گا تو انہیں اس کے جواب میں اپنی رائے دینی ہی ہوگی۔ غور طلب بات تو یہ ہے کہ کیا یہ معاملہ ایسا تھا جس کے لیے اس تحقیق کی ضرورت پڑتی کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے یا نہیں؟ نہ پینے والے تو ایک طرف، جو مسلمان بدقسمتی سے شراب پیتے ہیں انہیں بھی اس کا علم (بلکہ اقرار) ہوتا ہے کہ شراب ممنوع ہے۔ اصل میں طے کرنے کی بات اور تھی۔ اور ہمیں نہیں معلوم کہ وہ بات طے بھی کی گئی ہے یا نہیں۔ شراب کے متعلق زیر غور مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں اس کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور ظاہر ہے کہ جب اسے قانوناً ممنوع قرار دیا جائے گا تو اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دی جائے گی۔ جب کسی چیز کو قانون کے دائرے میں لایا جائے تو قانون کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے۔ (بلکہ یہ اس کا اولین تقاضا ہوتا ہے) کہ جس چیز کو ممنوع قرار دیا جائے اس کے متعلق متعین طور پر بتائے کہ وہ کون سی چیز ہے جسے ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔ یعنی اس چیز کی تعریف (DEFINITION) دی جائے۔ لہٰذا قانون نافذ کرتے وقت اس بات کی صراحت ضروری ہوگی کہ "شراب" جسے قانوناً ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔ کس چیز کو کہتے ہیں۔ بظاہر یہ بات کچھ مضحکہ انگیز سی دکھائی دے گی کہ یہ متعین کیا جائے کہ "شراب" کسے کہتے ہیں۔ کہہ دیا جائے گا کہ ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ شراب کسے کہتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو قانون کی باریکیوں سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بات کے تعین کے بغیر قانون ناقص رہ جاتا ہے۔ بعض لوگ بیئر (BEER) کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ شراب نہیں۔ اور خود ہمارے ہاں یہ مسئلہ شروع سے زیر بحث چلا آ رہا ہے کہ نبیذ شراب (خمر) میں داخل ہے یا نہیں۔ بنا بریں اس کا تعین ضروری ہے کہ شراب کسے کہتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مشاورتی کونسل نے اس کی بابت بھی کوئی رائے دی ہے یا نہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں ڈاکٹروں کی رائے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے۔

دوسری بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہم اس حقیقت کو دہرانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے اور اسلامی معاشرہ میں اس کا استعمال قانوناً ممنوع ہونا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن حالات میں ہمارا معاشرہ اس وقت گرفتار ہے ان میں اس قانون کو نافذ کس طریق سے کیا جائے؟ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس حکم سے زیادہ کسی قانون

کی ضرورت ہی نہیں کہ اسلام نے جس شے کو ممنوع قرار دیا ہے اس سے باز رہنا ضروری ہے۔ قانون کی ضرورت ان لوگوں کے لیے پڑتی ہے جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایسے کاموں سے باز نہیں آتے۔ سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے قانون کس انداز سے نافذ کیا جائے کہ اس پر واقعی عمل ہونا شروع ہو جائے اور وہ لوگ شراب کے استعمال سے باز آجائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خدشہ یہ ہے کہ اس قانون کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس وقت کئی ایک دیگر قوانین کا ہو رہا ہے۔ رشوت، چور بازاری۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ وغیرہ قانوناً منع ہیں لیکن یہ سب کچھ کھلے بندوں ہوتا ہے اور قانون بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کریم نے ایک چیز کہی ہے "کتاب" اور اس کے ساتھ دوسری چیز بتائی ہے "حکمت" کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض و غایت۔ اس کے مقاصد اور مصالح۔ اس کے مطابق زندگی گذارنے کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کے نقصانات۔ اس نے جس قانون کی پابندی کرانی ہوتی ہے، وہ اس کی حکمت کو اس انداز سے عام اور دل نشین کراتا ہے کہ انسان عقل و بصیرت کی رُو سے (RATIONALLY) اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس قانون کی پابندی واقعی اس کے فائدے کے لئے ہے۔ اس طرح اس کے دل میں اس قانون کا احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس قانون کی خلاف ورزی وہی لوگ کرتے ہیں جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اصلاح یا روک تھام سزا کے ذریعے (خواہ وہ صرف تادیب ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو) کرائی جاتی ہے۔

قانون کے نفاذ کے لیئے اس طریق کار کی ضرورت اگرچہ ہر قانون کی صورت میں ضروری ہے لیکن ایسے امور کے سلسلہ میں جن کا انسان عادی ہو چکا ہو اور طبعی یا نفسیاتی طور پر اس عادت کا یک لخت چھوڑنا مشکل ہو، اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ قانون نافذ کرنا چاہیں کہ پاکستان میں مسلمانوں کے لیے خنزیر کے گوشت کا استعمال ممنوع ہے تو اسے آپ فی الفور بھی نافذ کر دیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص اس کا استعمال کرتا ہے تو اس کا یک لخت چھوڑ دینا کچھ مشکل نہیں۔ (اگرچہ ایسی صورتوں میں بھی اس قانون کی حکمت بیان کرنا بہت مفید ہوگا) لیکن (مثلاً) اگر آپ یہ قانون نافذ کرنا چاہیں کہ پاکستان میں تمباکو نوشی ممنوع ہے تو اس

قانون کو آپ شبا شب نافذ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اس پر بالکلیہ عمل نہیں ہوگا۔ جو لوگ تمباکو کے عادی ہیں ان کے لیے ناممکن ہوگا کہ وہ اس کا استعمال یک لخت چھوڑ دیں۔ وہ اس قانون سے بچنے کی ہزار راہیں سوچیں گے۔ اس قانون کو مؤثر (EFFECTIVE) بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے لوگوں کو متنبہ کریں۔ کہ اب قانون نافذ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ تمباکو نوشی کے نقصانات کے متعلق عام پبلسٹی کریں اور ایسا مسلسل اور متواتر کرتے جائیں۔ اور لوگوں کی توجہ بار بار اس طرف منعطف کراتے رہیں۔ جب یہ خیالات فضا میں عام ہو جائیں تو پھر اس قانون کو نافذ کر دیں۔ اس طرح یہ قانون فی الجملہ مؤثر ہو جائے گا۔

نظر آتا ہے کہ قرآن کریم نے امتناع شراب کے سلسلہ میں یہی تدریجی طریق اختیار کیا تھا۔ شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ایسے لوگوں سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ اس عادت کو یک لخت چھوڑ دیں نفسیاتی، ناممکنات میں سے تھا۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضورؐ کی مکہ کی (تیرہ سالہ) زندگی میں امتناع شراب کا حکم نہیں دیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو اتنا کہا گیا کہ قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۔ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ (خمر اور میسرہ میں) نقصانات بھی ہیں اور فائدے بھی۔ لیکن ان کے نقصانات ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ نفع اور نقصان کا موازنہ کرتے کے بعد فیصلہ کرنے کی روش اختیار کئے ہوں گے انہوں نے اس تصریح کے بعد از خود شراب چھوڑ دی ہوگی۔

اس کے بعد اگلا حکم یہ آیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى (۴/۴۳) جب تم ہوش میں نہ ہو تو اجتماع صلوٰۃ میں شریک نہ ہوا کرو۔ ظاہر ہے کہ بہت سے قلوب کے لیے یہ تہدید بھی بڑی کارگر ثابت ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد سورۂ المائدہ میں یہ حکم آیا کہ "خمر اور میسرہ وغیرہ شیطانی افعال ہیں اور انسان کی کامیابی کی راہ میں سخت رکاوٹ کا باعث۔ اس لیے تم ان سے باز رہو۔" اس کے بعد اس قانون کی مزید حکمت بیان کرتے ہوئے کہا کہ یاد رکھو۔ یہ تم میں انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گے اور قوانین خداوندی کو پیش نظر رکھنے اور نظام صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گے۔ اس کے بعد فرمایا۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۵ : ۹۱)

کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہتے ؟

اب کون ایسا ہوسکتا تھا جو اس سے باز نہ آتا؟ وہ جو کہا جاتا ہے کہ امتناع شراب کا حکم آنے پر مدینہ کی گلیوں میں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور وہاں کی نالیوں میں شراب بہنے لگی، تو وہ اس مقام کا ذکر ہے جہاں تک ان لوگوں کو اتنے لمبے عرصہ کی تربیت کے بعد لایا گیا تھا۔ ایسے امور میں قانون کے نفاذ کے لیے قرآن کریم یہ حکیمانہ انداز اختیار کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ آخری حکم نافذ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی یوں قانون مؤثر (EFFECTIVE) بنتا ہے۔ ہمارے ہاں محراب و منبر کی طرف سے یہ تو بتایا جاتا ہے کہ جب امتناع شراب کا حکم آیا تو مدینہ کی گلیوں میں کیسے شراب بہنے لگی۔ لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ ان لوگوں کو اس مقام تک کیسے پہنچایا کہ جب امتناعی حکم آیا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جام و سبو کے ٹکڑے کر دیے۔ دوسری طرف حکومت کی یہ حالت ہے کہ اس نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ جس قانون کو نافذ کرنا چاہتی ہے اس کی غرض و غایت اور مصالح و حکم کے متعلق عام پبلسٹی کی جائے۔ یا جن نقصان رساں امور کے لوگ عادی ہو چکے ہیں، یا وہ باتیں معاشرہ میں عام ہو چکی ہیں ان کے نقصانات کے متعلق لوگوں کو مسلسل اور متواتر متنبہ کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے ہاں مستقل شعبہ ہونا چاہیے جسکا یہ کام ہو کہ جو امور معاشرہ میں خرابیاں پیدا کرنے کا موجب ہیں لوگوں میں ان کے نقصانات کے متعلق عام پبلسٹی کی جائے اور اس طرح ان میں ایسی کیفیت پیدا کی جائے کہ وہ انہیں ترک کر دینے میں اپنا فائدہ محسوس کرنے لگیں، انہیں اس طرح سمجھانے کے بعد یہ بتایا جائے کہ یہ وجہ ہے کہ اسلام نے ان باتوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد اسلام کے ان قوانین اور احکام کو معاشرہ میں نافذ کیا جائے۔ دوسری طرف ہمارے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم ایسی دی جائے جس سے ان خرابیوں کے نقصان رساں اثرات کے خلاف نوجوان طالبعلموں کے دل میں نفرت اور بغاوت کے جذبات بیدار ہو جائیں اور وہ ان سے خود بھی محترز رہیں اور دوسروں کو بھی ان کی طرف آنے سے روکیں۔ حکومت نے اس سے تغافل برتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قانون پر قانون نافذ کئے جاتی ہے۔ لیکن معاشرہ میں اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

بنابریں، ہم ارباب حکومت سے گذارش کریں گے کہ وہ امتناع شراب کے متعلق قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے معاشرہ میں ایسے قانون کے متعلق دو آراء ہو نہیں سکتیں) تو اس کے لیے ایک تاریخ مقرر کرے، اور اس سے پہلے شراب کے نقصان رساں اثرات کے متعلق

اس قدر پبلسٹی کرے کہ اس سے فضا معمور ہو جائے اور (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) اس کی ضرورت شراب تک ہی محدود نہیں۔ قرآن کریم نے جن جن امور سے روکا ہے، ان سب کے متعلق اس قسم کی مسلسل اور عام پبلسٹی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ نہ صرف عام پبلسٹی بلکہ تعلیم کے ذریعے بھی ایسی فضا کا عام کرنا۔ پہلے یہ کیا جائے اور اس کے بعد ان قوانین کو ملک میں نافذ کیا جائے۔ اور جو شخص اس کے بعد ان کی خلاف ورزی کرے اسے سخت سزا دی جائے۔

بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ شراب کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ یہ "حرام" ہے اس لیئے اس کا استعمال ممنوع ہونا چاہیئے۔ (گویا جن چیزوں کے متعلق "حرام" کا لفظ آیا ہے ان سے تو یہ حضرات بالکل پاک صاف رہتے ہیں اور شراب کے متعلق ان کی دشواری یہ ہے کہ اس کے لئے "حرام" کا لفظ نہیں آیا!!) خمر کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ (۱) رجس ہے۔ رجس ایسے اضطراب انگیز امور کو کہتے ہیں جو انسان کو تباہی کی طرف لے جائیں (۲) شیطان کا فعل ہے (۳) اس سے باہمی عداوت اور بُغض پیدا ہوتا ہے (۴) یہ قوانین خداوندی کے اتباع کے راستے میں روک بن جاتی ہے (۵) اس سے انسان اپنے بلند مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتا (۶) اس سے اس قدر اضمحلال اور افسردگی پیدا ہوتی ہے کہ انسان میں قوتِ عمل باقی نہیں رہتی ـــــ اور اس کے بعد کہا کہ

بتاؤ! تم اس سے باز آتے ہو یا نہیں

فرمایئے کہ ان تصریحات کے بعد اس کے متعلق کسی قسم کے شبہ کی گنجائش بھی باقی رہ سکتی ہے کہ اسلام میں شراب کا استعمال ممنوع ہے؟

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات قابلِ غور ہے۔ بعض امراض ایسے ہیں جن میں ڈاکٹر شراب کے چند قطرات بطور دوائی استعمال کرتے ہیں ـــ یا انہیں ایسی دوائیاں تجویز کرنی پڑتی ہیں جن میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے (اور آج کل تو عام طور پر دوائیاں ایسی ہی ملتی ہیں) اور ان کے بغیر مریض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ صورتیں اس "اضطراری حالت" کے تابع آجاتی ہیں جن میں قرآن نے حرام اشیاء کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ لیکن وہ اجازت صرف اضطراری حالت تک کے لیے ہے۔ لذت یابی یا قانونِ تسکین کے لیے نہیں۔ ایسے حالات کے لیے قانون میں گنجائش رکھنی ضروری ہو گی لیکن اس گنجائش کی شکل ایسی نہ ہو جس سے شراب کے دھارے عام بہنے لگ جائیں اور قانون بے چارہ

دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ ایسی صورتوں کو روکنے کا طریقہ بھی وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے نقصان رساں اثرات کے خلاف عام پبلسٹی کی جائے۔ بالفاظ دیگر، تبلیغ اور تعلیم کے ذریعے، ذہنوں میں علیٰ وجہ البصیرت ایسا انقلاب پیدا کیا جائے جس سے قانون کا احترام، دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو محراب و منبر سے اس آواز کا بلند ہونا کچھ نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ کہ "اسلام نے فلاں چیز کو حرام قرار دیا ہے"۔ اور نہ ہی ایوان حکومت سے کسی قانون کا نفاذ اصلاح کی صورت پیدا کر سکتا ہے۔ جس طرح حکمت بلاکتاب (قانون) محض وعظ (SERMON) بن کر رہ جاتی ہے اس طرح کتاب بلاحکمت بار دوش ہو جاتی ہے۔ کتاب اور حکمت دونوں کے امتزاج سے صحیح نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

پابندی اسی قانون کی بطیب خاطر ہوتی ہے جس کی افادیت کا دل معترف ہو۔ نہ اس کی جسے محض خارج سے عائد شدہ حکم سمجھا جائے اور اُسے مرگِ مفاجات سمجھ کر قبول کیا جائے۔ (۱۹۶۴ء)

مسلم اور مومن میں فرق

سوال

کیا قرآن شریف کی رُو سے مسلم اور مومن میں کوئی فرق ہے یا دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لفظ "مسلمان" تو قرآن شریف میں نہیں آیا۔

جواب

یہ ٹھیک ہے کہ "مسلمان" کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ جہاں تک مسلم اور مومن کا تعلق ہے، قرآن کریم نے ان الفاظ کو بالعموم

مرادف معانی میں استعمال کیا۔ اور ان دونوں میں فرق نہیں۔ لیکن ایک مقام ایسا ہے جس میں ان دونوں میں فرق بھی کیا گیا ہے۔ اور وہ مقام بڑا اہم ہے۔ بالخصوص ہماری موجودہ حالت کے پیشِ نظر۔ جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوئی تو بہت سے بدوی قبائل (اعراب) اس سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے۔ اور اپنے آپ کو مومن سمجھنے لگ گئے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق کہا قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا — ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تمھیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے (ہم "مسلم" ہو گئے ہیں) انگریزی زبان میں اسے کہیں گے (SURRENDERED)۔ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) "ابھی ایمان تمھارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا"۔ اس سے مسلم (مسلمان) اور مومن میں فرق سامنے آ گیا۔ مومن تو وہ ہیں جو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے، بغیر کسی اور جذبہ اور خیال کے، اس دین (نظام خداوندی) کی صداقت پر یقین کامل رکھیں۔ اور پھر صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا خود ان کا قلبی تقاضا بن جائے۔ وہ ان کے لیے خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندی نہ ہو، بلکہ ان کے اندرونی تقاضے کی تسکین کا سامان ہو، جس طرح پیاس میں پانی پینا، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اپنے اندرونی تقاضے کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جو اس کے قیام اور استحکام کے اولیں ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بعض اور لوگ اس نظام میں داخل ہوتے ہیں جن کے متعلق یوں سمجھئے کہ وہ اپنے آپ کو SURRENDER کر دیتے ہیں۔ یہ SURRENDER کرنا ضروری نہیں کہ میدانِ جنگ ہی میں ہو۔ اس کی اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ اس نظام کا نظریہ بھی قبول کر لیتے ہیں۔ (اسے ایمان لانا یا مسلمان ہونا کہتے ہیں) اور اس کے احکام کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن وہ اطاعت، قانون (حکومت) کی رُو سے کرتے ہیں۔ وہ ان کے دل کی پکار نہیں ہوتی۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو محض کسی مصلحت کی بنا پر دکھاوے کے لیے اس نظام میں داخل ہو جائیں۔ انہیں منافقین کہا جائے گا۔ اور دوسرے وہ جو اس نظریۂ زندگی کو محض رسمی طور پر قبول کر لیں۔ انہیں منافق نہیں کہا جائے گا لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں اس نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کی طرف سے شکوک و شبہات اُبھریں۔ یہ اگر اس نظام کی اطاعت کرتے رہیں اور ان کی ضروری تعلیم و تربیت

ہوتی رہے تو ان میں سے رفتہ رفتہ مومنین کے زمرے میں داخل ہوتے جائیں گے۔ اس لیے قرآن کریم نے ان اعراب کے متعلق جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کہا کہ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۴۹/۱۴)

اگر تم اس نظام خداوندی کی اطاعت کرتے رہے تو تمہارے اعمال کے نتائج میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ ہو جائے گا کہ تم میں جو کمی رہ گئی تھی اس کے مضر نتائج سے تمہاری حفاظت ہو جائے۔ اور اسکے ساتھ تمہاری ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے۔ اور یوں تم مومنین کے زمرہ میں شامل ہو جاؤ۔ اس لیے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا۔ مومن وہ ہوتے ہیں جو (دل و دماغ کے کامل اطمینان کے بعد) اللہ اور رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اس نظریہ زندگی کے متعلق ان کے دل میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اور اس نظام کے قیام و استحکام کی خاطر اپنے جان اور مال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (۴۹/۱۵) یہ لوگ ہیں جو اپنے دعوے ایمان میں سچے اور مومن کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس جنہیں (اعراب کے انداز کا) مسلم کہا گیا ہے ان کے متعلق کہا کہ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ ۔ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو اپنی دینداری جتلاتے ہو؟ آپ نے غور کیا کہ اس سے ان کی اطاعت و فرمان پذیری کی صحیح کیفیت کس طرح نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے؟ یعنی یہ اطاعت ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتی۔ وہ دین کی خاطر کچھ کرتے ہیں تو اسے جتلاتے ہیں۔ کہا کہ ان سے کہہ دو کہ تمہارے جتلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا ہو اور کیا کرتے ہو (اس لیے کہ) وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ اللہ کائنات کی ہر شے سے خوب واقف ہے۔

اس کے بعد ان کی ایک اور نفسیاتی کیفیت سامنے آتی ہے۔ کہا کہ یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا۔ اے رسول یہ لوگ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ ۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مت رکھو۔ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ۔ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ (۴۹/۱۷) اگر واقعی سچے دل سے مسلمان ہوئے ہو تو تمہیں اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا۔

قرآن کریم کی ان تصریحات سے مسلم اور مومن کا فرق سامنے آگیا۔ دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اسلامی مملکت (نظامِ خداوندی) میں تین قسم کے شہری (CITIZENS) ہونگے۔

(۱) غیر مسلم یعنی جنہوں نے اسلام کے نظریۂ زندگی کو قبول نہ کیا ہو۔ ان کی حفاظت ہر طرح سے ہوگی لیکن انہیں پورے حقوقِ شہریت حاصل نہیں ہوں گے۔ یوں کہئے کہ یہ (NATURAL CITIZENS) ہوں گے۔

(۲) مسلم۔ جنہوں نے اسلامی نظریۂ زندگی کو قبول کر لیا ہو لیکن ہنوز اس کی روح ان کے دل کی گہرائیوں میں نہ اتری ہو۔ انہیں حقوق شہریت تو تمام کے تمام حاصل ہوں گے۔ لیکن مملکت کے ایسے امور جن کا تعلق اس نظام کی اصل و بنیاد سے ہو، وہ ان کے سپرد نہیں کئے جا سکیں گے۔ ان کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ اور

(۳) مومن۔ اسلامی نظریۂ زندگی کی صداقت جن کی روح میں حلول کر چکی ہو۔ یہ اس نظام کے قیام و استحکام کے حقیقی ضامن ہوں گے۔

واضح رہے کہ مسلم اور مومن الگ الگ گروہ نہیں ہوں گے۔ یہ ایک ہی اُمت کے فرد ہوں گے۔ ان میں ایسا ہی فرق سمجھئے جیسا (مثلاً) ایک تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ مسلمان میں فرق ہوتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اُمت کا الگ گروہ نہیں قرار دے سکتے لیکن ان کے سپرد وہ کام بھی نہیں کئے جا سکتے جن کے لیے تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔

ہم (موجودہ مسلمان) کس شق میں شامل ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس میں شبہ نہیں کہ ہم اسلامی نظریۂ زندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے ہم مسلم ہیں۔ غیر مسلم نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے، ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان میں (امت کا فرد ہونے کی حیثیت سے) کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ "پیدائشی مسلمانوں" کو مسلمان نہ سمجھنا اور اپنے آپ کو مسلمان قرار دینا، انانیت کی سرکشی اور تجر نہیں تو جہالت کی خود فریبی ضرور ہے یہ کہنا بھی زیادتی ہوگا کہ امت میں کوئی مومن نہیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ ایسی کوئی جماعت نظر نہیں آتی جو مومنین پر مشتمل ہو۔ اپنی دینداری کی دھونس جما کر اپنے آپ کو مومن تسلیم کرانے والوں کے متعلق ہم قرآن کا فیصلہ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اندریں حالت، اگر ہم کسی ملک میں اسلامی نظام قائم کرنا چاہیں تو اس کی یہی صورت ہو سکے گی کہ۔

(۱) موجودہ مسلمانوں کو قانون کے ذریعہ اس نظام کا پابند بنایا جائے۔ اور

(۲) آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اس نظام کی صداقت ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہو جائے اور احکامِ خداوندی کی اطاعت ان کا اندرونی تقاضا ہو۔

اِس طریق کار اور اُس طریق میں جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا، تقدم و تاخر کا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ جب حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو اس وقت مسلم کوئی نہیں تھا۔ سب غیر مسلم تھے۔ ان غیر مسلموں میں سے جو بھی اسلام قبول کرتا تھا مومن کی حیثیت سے قبول کرتا تھا۔ لہٰذا سابقون الاولون کی یہ جماعت مومنین کی جماعت تھی۔ یہی وہ "مہاجر و انصار" تھے۔ جنہیں قرآن نے "مومن حقاً" کہہ کر پکارا ہے۔ اسلامی نظام کی بنیاد اسی جماعت کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اور یہی اس کی تشکیل و استحکام کے اولین ذمہ دار تھے۔ اس نظام میں "مسلم" بعد میں شامل ہوئے تھے۔ اس کے برعکس آج "مسلم" پہلے سے موجود ہیں۔ اور اس نظام کی تشکیل کا آغاز اگر کرنا ہے تو انہی سے کرنا ہے۔ ان "مسلموں" کو غیر مسلم قرار دے کر براہ راست مومن پیدا کرنے کی جو مہم ہمارے ہاں شروع ہوئی تھی (خواہ اسے میرزا غلام احمد صاحب نے شروع کیا ہو یا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب[1] نے) اس کا نتیجہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک غیر مسلم، کسی کے ہاتھ پر "بیعت کرنے سے" مسلم تو ہو سکتا ہے لیکن ایک مسلم، محض کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لینے سے مومن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت کے مناسب پروگرام کی ضرورت ہوگی۔

طلوعِ اسلام کی دعوت یہی ہے کہ پاکستان میں قرآنی قوانین کے نفاذ سے موجودہ مسلمانوں کو ان کا پابند بنا دیا جائے۔ اور آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔

(۱۹۶۴ء)

---

[1] جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی تاسیس کی ہے تو اس میں داخل ہونے والوں کی تجدید ایمان اپنے ہاتھ پر کرائی تھی۔

غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ

سوال

کہا جاتا ہے کہ نجات صرف مسلمان کی ہوسکتی ہے۔ کافر کی نہیں ہوسکتی ایک غیر مسلم بڑے نیک کام کرتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا کسی کو ستاتا نہیں۔ خیرات کرتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو کیا اسے اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ اور اس کی اس لیے نجات نہیں ہوگی کہ وہ مسلمان نہیں ہوا اور ایک مسلمان محض اس لیے جنّت میں چلا جائے گا کہ وہ مسلمان تھا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اس سوال نے مجھے ایک مدت سے پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلّی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

جواب

اس سوال نے صرف آپ ہی کو پریشان نہیں کر رکھا۔ بہت سوں کو پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلّی بخش جواب اس لیے نہیں ملتا کہ بنیادی طور پر یہ بات صاف نہیں کی جاتی کہ اسلام کہتے کسے ہیں۔ اور کُفر ہوتا کیا ہے۔ یہ بنیادی چیز سمجھ میں آجائے تو اس (بظاہر) پریشان کُن سوال کا جواب آسانی سے مل جاتا ہے۔ لہٰذا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معنی کیا ہیں؟ یہ ہے کیا؟ کفر اور اسلام میں فرق کیا ہے؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ کفر اور اسلام میں فرق صرف کھانے پینے کی چیزوں میں جائز اور ناجائز کی تمیز یا پرستش کے طور طریقوں میں اختلاف ہے۔ اصل سب مذاہب کی ایک ہی ہے۔ مولانا آزاد مرحومؒ کے الفاظ میں "عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف ظاہری اعمال و رسوم میں ہے۔ اور اس فرق کا نجات و سعادت سے کچھ تعلق نہیں"۔ یہ ہے اسلام کے متعلق وہ بنیادی غلط فہمی جس کی وجہ سے وہ تمام سوالات سینے میں اُبھرتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جو وجہِ خلش و اضطراب بنتے ہیں۔

قرآن کریم چند مستقل اقدار۔ چند غیر متبدل اُصول۔ چند ابدی حقائق عطا کرتا ہے جن کی بنیادوں پر انسانی معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے، کفر ان اُصول اور حقائق سے انکار کا نام ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے

کہ جن باتوں کو عام طور پر "نیک کام" کہا جاتا ہے (اور جن کی مثالیں آپ نے بھی پیش کی ہیں) اس معاشرہ میں جو خلاف قرآن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، ان کی حقیقت اور وزن کیا ہوتا ہے؟ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آسکے گی۔ ہندو نظریۂ حیات کی رُو سے انسانوں کی تفریق و تقسیم پیدائش کی رُو سے ہو جاتی ہے۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، محض پیدائشی نسبت سے، ہر شخص کے نزدیک واجب الاحترام ہوتا ہے اور اسے معاشرہ میں وہ مقام اور حقوق حاصل ہوتے ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس، شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، تمام عمر ذلت اور پستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی طریق ایسا نہیں جس سے وہ معاشرہ میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کر سکے۔ خواہ اس کے جوہر ذاتی کچھ ہی کیوں نہ ہوں[1]۔ برہمن ساری عمر اس نظریۂ زندگی کی تلقین کرتا رہتا ہے اور اسے خدائی تفریق قرار دیتا ہے جسے دنیا کا کوئی انسان مٹا نہیں سکتا۔ ہندو معاشرہ کی تشکیل اسی نظریہ حیات کے مطابق ہوتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر یہ برہمن، جو ساری عمر اس معاشرہ کے بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہتا ہے۔ اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو ذلت و خواری کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ کہے کہ وہ چوری نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ یا وہ مویشیوں کے پانی پینے کے لیے پیاؤ بنواتا ہے کوڑھیوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈالتا ہے۔ یا اس قسم کے اور "دان پن" کا کام کرتا ہے۔ تو کیا اس کی یہ انفرادی "نیکیاں" انسانیت کی میزان میں کچھ بھی وزن رکھیں گی؟ کیا معاشرہ کو غلط بنیادوں پر استوار کرنے کا وہ جرم عظیم جس کا یہ مرتکب ہوتا ہے، ان "نیکیوں" کے صدقے میں قابل معافی تصور کیا جا سکے گا۔ اگر میزان کے ایک پلڑے میں یہ نیکیاں رکھی جائیں اور دوسرے پلڑے میں اس کا وہ جُرم، تو سوچئے کہ ان میں سے کون سا پلڑا بھاری ہوگا؟ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم اس قسم کی انفرادی نیکیوں کو بہت بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اصول و مبانی کیا ہیں

---

[1] اب یہی تفریق و تقسیم دولت کی رُو سے ہوتی ہے۔ امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ابتداء ہی سے جس مقام پر فائز ہوتا ہے غریب آدمی کا بچہ ساری عمر اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ روح وہی ہے۔ صرف پیکروں کی تبدیلی ہوئی ہے۔ بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں۔ اگرچہ پیر ہے آدم
جواں ہیں لات و منات

جن کے مطابق انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل شے وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ نظام صحیح ہے تو اس کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں۔ اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر استوار ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے روا رکھا جا رہا ہے۔

قرآن کریم یہودیوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہوں نے نظامِ زندگی ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں خود ان کے اپنے افراد ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے اور بالادست لوگ کمزوروں اور ناتوانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ان لوگوں کو دوسرے قید کر لیتے تھے تو یہ فدیہ دے کر انہیں چھڑانے تھے اور اسے بڑا نیکی کا کام تصوّر کرتے تھے حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ خود ان لوگوں کو گھروں سے باہر نکال دینا سخت جرم تھا۔ اس جرم کے ارتکاب پر تو ان کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن قیدیوں کو چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کے لیے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے ایک عظیم اصول بیان کیا ہے جو اس باب میں بڑی واضح راہ نمائی دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کیا تم یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھو اور اس کے دوسرے حصّے سے انکار کرو۔ اگر یہی روش جاری رکھنا چاہتے ہو تو سُن رکھو کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرو گے اور قیامت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہو گے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے یہاں کس قدر بلیغ اور بلند اصول بیان کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھوڑانا بہرحال ایک نیک کام ہے جس کا اجر ملنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں موجبِ ثواب نہیں بن سکتیں۔ اس جرم کا سیلاب، اس قسم کی جزئی "مرمتوں" کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اور اس تمام عمل کا کُلی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اسی قسم کی غلط ذہنیت قریش مکہ کی تھی جس کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان سے کہا

گیا کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَایَۃَ الْحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جَاھَدَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے لیے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تعمیر و تزئین کے کاموں میں حصہ لینا اس شخص کے اعمال کے برابر ہے جو صحیح نظامِ زندگی کی ابدی حقیقتوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) پر یقین رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام اور استحکام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ فیصلہ کر لو۔ لَا یَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰہِ۔ میزان خداوندی میں ان کا وزن برابر نہیں ہو سکتا۔ غلط نظام قائم کرنیوالے اس قسم کے انفرادی نیک کاموں کے باوجود ظالم رہتے ہیں اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں پر نجات و سعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔

وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۹/۱۹)

ہمارا خیال ہے کہ ان مختصر سی توضیحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ "کافر" کے نیک اعمال میزان خداوندی میں وزن کیوں نہیں رکھتے! جو شخص کسی مملکت کے خلاف بغاوت کیلئے اُٹھ کھڑا ہو، ذاتی طور پر کتنا ہی اچھا شہری کیوں نہ ہو اس کی یہ انفرادی خوبیاں جرمِ بغاوت کا کفارہ نہیں ہو سکتیں۔ کفر درحقیقت نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے ـــــ خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی و اعتقادی۔

باقی رہا یہ کہ مسلمان، بغیر نیک اعمال کے بھی جنّت میں جائے گا تو یہ "حدیث بے خبراں" ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جنّت تو نام ہی اعمال کے فطری نتائج کا ہے۔ وَتِلْکَ الْجَنَّۃُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْھَا بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (۴۳/۷۲) البتہ اس ضمن میں دو ایک بنیادی باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) اگر کہیں صحیح قرآنی نظام قائم ہے ـــ یا اس کے قیام کے لیئے جدوجہد کی جا رہی ہے تو اس میں اگر کسی سے سہواً اور خطاءً کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو گئی ہے اور وہ اس پر نادم ہو کر آئندہ اس سے محتاط رہتا ہے تو اس کے اعمالِ حسنہ کا پلڑا ابھاری رہے گا۔

(۲) اگر مسلمان بھی غیر قرآنی نظام پر رضامند ہو چکا ہے تو اس نظام کے اندر اس کی انفرادی نیکیاں

وہ نتائج مرتب نہیں کر سکتیں جن کا نتیجہ جنّت کی زندگی ہوتا ہے۔ ہم (مسلمان) صدیوں سے اس غلط ذہنیّت کا شکار ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے نیک لوگوں کی نیکیاں بھی کوئی نیک نتیجہ مرتب نہیں کرتیں۔ یہی وہ غلط ذہنیّت ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا مُنہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف ۔ نیکی تو اس کی ہے جو

(i) خدا پر۔ آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتب خداوندی پر اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے ۔ (یعنی ان اصولوں پر جو نظامِ خداوندی کی بنیاد بنتے ہیں)

(ii) مال اور دولت کی محبت کے باوجود، اسے ضرورت مند، قریبیوں۔ یتیموں۔ مسکینوں نادار مسافروں۔ محتاجوں کے لیئے دے دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے۔

(iii) جو نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کرتا ہے۔

(iv) جو اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے اور اس عہد میں بنیادی حیثیت اس عہد کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے۔ اور جس کی رُو سے اس نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہوتا ہے ۔ (۹/۱۱۱)

(v) جو ان مصائب و مشکلات میں جو اس راہ میں اسے درپیش ہوں ثابت قدم رہتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوئی ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں جنہیں متقی کہا سکتا ہے ۔ (۲/۱۷۷)

نیکی ان لوگوں کی ہے نہ کہ ان کی جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر انفرادی نیکیاں انہیں جنّت کا وارث بنا دیں گی۔

آپ نے غور فرمالیا کہ غیر مسلموں کی انفرادی نیکیاں تو ایک طرف، خود ان مسلمانوں کی انفرادی نیکیاں، جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہوں۔ میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھتی ہیں ؟ انفرادی نیکیاں نہایت ضروری ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں صحیح نتائج پیدا ہی اس وقت کرتی ہیں جب یہ صحیح قرآنی نظام

کے اندر سرزد ہوں۔ غلط نظام میں یہ تعمیر انسانیت کے نتائج مرتب ہی نہیں کر سکتیں۔ دریاؤں اور ندیوں کا میٹھا پانی، انسانوں اور حیوانوں کے لیے زندگی بخش اور زمین مُردہ کے لیے حیات آور ہوتا ہے۔ لیکن وہی پانی سمندر کے اندر پہنچ کر اپنی تمام زندگی بخش صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ دہی کے برتن میں جتنا دودھ جی چاہے ڈالتے جائیے۔ سب دہی بنتا جائے گا ــــ قرآنی نظام ــــ یا اس نظام کے قیام کے لیے جدوجہد ــــ اور اس کے ساتھ اخلاقی نیکیاں۔ یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن "ایمان اور اعمال صالح" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اس دنیا اور اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں جنّت کی وراثت ہے اور یہ پروگرام قرآن کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ (۱۹۶۴ء)

اخلاقی اور روحانی ترقی

سوال

ہم عام طور پر سنتے رہتے ہیں کہ اسلام، مادی۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کا ضامن ہے "مادی ترقی" قابلِ فہم ہے۔ "اخلاقی ترقی" کی بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ "روحانی ترقی" کیا ہے اور اسلام اس کا کس طرح ضامن ہوتا ہے؟۔

جواب

اس کا جواب تو انہی سے مانگئے جو ان الفاظ کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا جواب ان کے پاس بھی کچھ نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر الفاظ ایسے ہیں جن کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم (چند نام ہیں جنہیں تم نے یا تمھارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑا ہے) ان الفاظ کو ہم صبح شام رٹتے اور دہراتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا مطلب کیا ہے۔

"اخلاقی ترقی" کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کے اخلاق بلند ہو

ہوجاتے ہیں اور اخلاق، سیرت وکردار ہی کا دوسرا نام ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے بعد کوئی اور چیز بھی باقی رہتی ہے جسے "روحانی ترقی" سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ کیا اخلاقی بلندی (سیرت وکردار کی رفعت) میں شرفِ انسانیت کی انتہائی منزل نہیں آجاتی؟ یہ بات تو واضح ہے کہ مادی ترقی اور چیز ہے اور اخلاقی برتری اور شے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی فرد یا قوم کو مادی ترقی حاصل ہو لیکن اس کی اخلاقی سطح پست ہو۔ یہ وجہ ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی کے نتائج کے لیئے مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی برتری کا اضافہ ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اخلاقی برتری کے بعد وہ کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے جسے "روحانی ترقی" سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم، شرفِ انسانیت کی جس انتہائی بلندی کو بطور نصب العین پیش کرتا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی، اس ارفع و اعلیٰ مقام کی مظہر اتم ہے۔ اس کے لیئے قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴) - "اے رسول! تو اخلاق کے عظیم ترین مقام پر فائز ہے"۔ قرآن کریم نے حضورؐ کے لیے اخلاقی بلندی کا ذکر کیا ہے۔ "روحانی ترقی" کا کہیں ذکر نہیں کیا اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی بلندی کے بعد وہ روحانی ترقی کون سی ہے جس کا ذکر نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے سلسلے میں تو آیا نہیں لیکن جس کا ہم اس طرح دن رات چرچا کرتے رہتے ہیں؟ اصل یہ ہے کہ انگریزی زبان میں تین الفاظ تھے MATERIAL یعنی مادی MORAL یعنی اخلاقی۔ اور SPIRITUAL یعنی روحانی۔ ہم نے اپنے ہاں انہی اقنوم ثلاثہ کو دہرانا شروع کر دیا اور اس کا خیال تک نہ کیا کہ عیسائیت نے تو مادہ (MATTER) اور روح (SPIRIT) کی ثنویت کے لیے اس اصطلاح کو وضع کیا تھا۔ اور مادہ کو قابلِ نفرت قرار دینے کے بعد اس کی ضد SPIRIT کو انسانی ترقی کا منتہیٰ ٹھہرایا تھا۔ لیکن اسلام میں اس کی قسم کی ثنویت نہیں۔ نہ ہی اس کے نزدیک مادہ قابلِ نفرت شے ہے، پھر ہم SPIRIT کا لفظ کس منطوق کے لیے بولتے ہیں۔ ہم نے اس اصطلاح کو "عیسائیت" سے مستعار لے کر اپنے "تصوف" میں داخل کیا اور اس طرح روحانی ترقی انسانی شرف کی منتہیٰ قرار پا گئی۔ اور پھر اس کا چرچا شروع کر دیا کہ شریعت کی پابندی سے اخلاقی بلندی حاصل ہوتی ہے۔ اور طریقت کی پابندی سے روحانی ترقی۔ یعنی جس (اخلاقی) بلندی کو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کا مقام

بلند قرار دیا ہے۔ تصوف کے اس تصوّر کی رُو سے اس مقام سے اونچا ایک اور مقام بھی ہے جسے روحانی ترقی کہا جاتا ہے۔ یعنی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ کے مقام (خلق عظیم) سے بھی بلند مقام!

پھر سُن لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی اخلاقی بلندی ہی کا ذکر کیا ہے۔ روحانی ترقی کا کہیں ذکر نہیں کیا اس لیے خدا کی اس شہادت کے پیشِ نظر اسلام میں سیرت کے اعتبار سے اخلاقی بلندیوں سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ (نبوت البتہ اور چیز ہے جس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔)

(۱۹۶۴ء)

حقوقُ اللہ اور حقوقُ العباد

سوال

ہم بچپن سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اصطلاحات سنتے چلے آ رہے ہیں۔ حقوق العباد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ "حقوق اللہ" کیا ہیں، اس کی بابت وضاحت کر دیجئے۔

جواب

قرآن کریم میں حقوق العباد کا ذکر آیا ہے۔ لیکن حقوق اللہ کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مثلاً فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴) "ان کے مال میں سائل و محروم کا ایسا حق ہے جو معلوم ہے"۔ یا وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ... (۱۷/۲۶) قریبی رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو۔ اس قسم کی قرآن کریم میں اور آیات بھی ہیں۔ ایک جگہ "خدا کے حق" کا بھی ذکر ہے لیکن وہ حق بھی دراصل بندوں ہی کا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے باغات اور کھیتوں میں پھل اور فصلیں پیدا کی ہیں۔ تم اس پیداوار کو اپنے کام میں لاؤ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ..... (۶/۱۴۲) اور "فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کر دو"۔ ظاہر ہے کہ یہاں جس چیز کو اس کا (خدا کا) حق" کہا گیا ہے، یہ وہی ہے جسے دوسرے مقامات میں

محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حق قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح "خدا کو قرضہ دینے" سے مراد ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے نظامِ خداوندی کو اپنا مال دے دینا۔ یا جہاں کہا گیا ہے کہ خدا نے مومنین کا مال اور جانیں خرید لی ہیں" تو اس سے بھی مقصود یہی ہے کہ جماعتِ مومنین اپنے مال اور اپنی جانوں (اور جذبات) کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لیے وقف کر دیتی ہے ان مقامات سے ظاہر کہ حقوق اللہ، حقوق العباد سے الگ کچھ اور نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت میں جو ثنویت تھی کہ ــــ خدا کا حصہ، خدا کو دو اور قیصر کا قیصر کو ــــ تو اسی تصوّر کو ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ لیکن اسلام میں اس تفریق کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین نام ہے انسانوں کے باہمی تعلقات یا معاملات کو قوانین خداوندی کے مطابق استوار یا طے کرنے کا۔ جس چیز کو فرد کی اصلاح (یا انسانی ذات کی نشوونما) کہا جاتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی انسانوں کے باہمی تعلقات اور معاملات کے صحیح خطوط پر متشکل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص پہاڑ کے کسی غار یا جنگل میں ایسی جگہ رہتا ہے، جہاں کوئی دوسرا انسان نہیں بستا۔ اور اس طرح اس کا معاملہ کسی دوسرے انسان سے نہیں پڑتا۔ تو اس کے لیے نہ دین کی ضرورت کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ وحی کی راہ نمائی کا۔ نہ اس کے لیے حقوق العباد ہوتے ہیں نہ حقوق اللہ۔ اس کی یہ زندگی انسانی سطح کی زندگی ہوتی ہی نہیں۔ حیوانی سطح کی ہوتی ہے۔

عام طور "عبادت" کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے عبادات بھی مقصود بالذات نہیں۔ ان سے مقصد، انسان کی ایسی اصلاح ہوتی ہے جس سے انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش اسلوبی پیدا ہو۔ اور ان کے معاملات، عدل اور احسان کی مستقل اقدار کے مطابق طے پائیں۔ اس لیے "عبادات" بھی درحقیقت حقوق العباد کی حسن کارانہ انداز سے ادائیگی کا ذریعہ ہیں۔

(۱۹۶۴ء)

تعلق باللہ سے مراد

سوال

میں آپ کے درس میں اکثر شریک ہوتا ہوں۔ آپ اس میں قرآن شریف کے حقائق کو خوب بیان کرتے ہیں۔ اس کے احکام کی حکمت وغیرہ کی بھی خوب وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں تعلق باللہ کی بات کوئی نہیں ہوتی۔ کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ؟

جواب

میں سمجھ نہیں سکا کہ تعلق باللہ سے آپ کا مطلب کیا ہے ؟ میں اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق اس کتاب کے ذریعہ سے ہے۔ جو اس نے ہماری راہ نمائی کے لیے نازل کی ہے۔ اس کے علاوہ خدا اور بندے کا تعلق میری سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا خدا سے تعلق وحی پانے کا تھا وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب ہم ہیں اور خدا ہیں واسطہ اس کی کتاب عظیم ہی ہے۔

جب ہم اس کی کتاب پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے کیونکہ اس نے وہ باتیں ہم ہی کو مخاطب کر کے کی ہیں۔ خدا کی اس ہمکلامی میں کسی کی تخصیص نہیں۔ اس نے اس میں "الناس" (تمام لوگوں) کو مخاطب کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم قرآن کریم کو پڑھتے اور پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو خدا سے ہمارا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں تو خدا سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ خدا کے ساتھ اس تعلق میں کوئی راز نہیں۔ کوئی سرِ مستور نہیں۔ کوئی باطنیت نہیں۔ یہ تعلق کھلے بندوں قائم ہوتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ قائم ہوتا ہے۔ ہر ایک اس تعلق کو دیکھ سکتا ہے۔ پرکھ سکتا ہے۔ خود قائم کر سکتا ہے۔ قائم کرا سکتا ہے۔ یعنی خود علم و بصیرت کی رُو سے قرآن کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسروں کو دلیل و برہان کی رُو سے سمجھا سکتا ہے۔ خود اس پر عمل کر سکتا ہے۔

خلق قرآن کو لیجئے۔ صدیوں تک بغداد کی گلیوں میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہتا رہا۔ محض اس لئے کہ ایک فریق، دوسرے فریق کو اس کا حق نہیں دیتا تھا کہ وہ اس کے عقیدے کے خلاف اپنے عقیدہ کا اظہار کرے جونہی کسی نے کسی ایسے خیال کا اظہار کیا جو ان کے خلاف ہو اُسے انہوں نے مُرتد قرار دے دیا ہے۔ اور چونکہ یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا تھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے اس لیے اس کا خون مباح ہو گیا۔ آج بھی ان کی یہی حالت ہے۔ جس سے انہیں اختلاف ہوا اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا اور اس طرح معاشرہ میں اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اس وقت زمام اقتدار ان کے ہاتھ نہیں اس لیے معاملہ صرف کفر سازی اور عوام کی اشتعال انگیزی تک رہتا ہے۔ کل کو اگر (خدا نہ کرے) اختیارات ان کے ہاتھ میں آ گئے تو پھر دیکھئے گا کہ جن امور کو آپ بنیادی حقوق انسانیت قرار دیتے ہیں، ان کے ہاتھوں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ آپ اظہار خیال کا حق لئے پھرتے ہیں، یہ کسی کو جینے کا حق بھی نہیں دیں گے۔ ان کے ضابطہ قوانین میں حق کا تصور ہی نہیں۔ ہر بات ان کی خوشنودئی مزاج پر منحصر ہوتی ہے۔ (۱۹۶۴ء)

زمانے کے تقاضے

ایک صاحب لاہور سے دریافت کرتے ہیں کہ آج کل عام طور پر یہ بات سُننے میں آتی ہے۔ اور طلوع اسلام خود بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ اسلام زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ لیکن زمانے کے تقاضے تو آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ کیا ان کے ساتھ اسلام بھی آئے دن بدلتا جائے گا۔ مثلاً۔ آج کل زمانے کا تقاضا ہے کہ عورتیں عریاں لباس پہنتی ہیں۔ کلبوں میں جا کر ناچتی ہیں۔ جیم خانوں میں شراب کا دور چلتا ہے۔ کیا اسلام کو ان کا ساتھ دینا ہوگا؟ اگر اسلام ایسا نہیں کرے گا تو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دے گا!

طلوعِ اسلام

جس غلط فہمی میں ہمارے یہ مستفسر مبتلا ہیں اس میں آج کل بہت سے لوگوں کو مبتلا پایا گیا ہے۔ درحقیقت ہمارے ہاں ایک رَو پیدا کی گئی ہے۔ جس سے اس قسم کی غلط فہمیاں دانستہ پھیلائی جاتی ہیں ورنہ بات کچھ ایسی مشکل یا الجھاؤ کی نہیں، پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ایک چیز ہے کسی معاشرہ کی روش اور دوسری چیز ہے زمانے کا تقاضا۔ جو مثال ہمارے مستفسر نے پیش کی ہے وہ معاشرہ کی روش ہے۔ زمانے کا تقاضا نہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں ان دونوں باتوں کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اب آیئے اسلام کی طرف۔

قرآن کریم نے بعض احکام دیئے ہیں اور بعض اصول۔ اس کے احکام ہوں یا اصول وہ سب غیر متبدّل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ اگر کسی معاشرہ کی روش ان کے خلاف جاتی ہے تو ہمیں اس روش میں تبدیلی کرنی ہوگی نہ کہ قرآن کے احکام و اصول میں تبدیلی۔

جہاں تک قرآن کے اصولوں کا تعلق ہے انہیں عملی شکل دینے کے لئے فقہی قوانین مرتب کئے جاتے ہیں۔ یہ قوانین اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے جاتے ہیں جن میں ان اصولوں کو عملاً نافذ کرنا مقصود ہو۔ اگر وہ حالات باقی نہ رہیں تو ان فقہی قوانین میں بھی تبدیلی کی جائے گی تاکہ نئے قوانین بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عمل پذیر ہوسکیں۔ اس کو زمانے کا تقاضا کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے اپنے زمانے کے حالات۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ تو اس سے مطلب یہ ہے کہ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں جو فقہی قوانین کسی گذشتہ زمانے میں مرتب ہوئے تھے اگر ہمارے زمانے کے حالات بدل گئے ہیں تو ہمیں ان قوانین میں بھی مناسب ردّوبدل کر لینا چاہیئے۔ ان جزئی قوانین میں اس قسم کا ردّوبدل، اسلام کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ مثلاً نبی اکرمؐ کے زمانے میں بعض لوگوں کو مملکت کی طرف سے کچھ مالی امداد دی گئی تھی۔ انہیں مؤلفۃ القلوب کہا جاتا ہے جس کا ذکر خود قرآن میں ہے (۹/۶۰) حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس امداد کو یہ کہہ کر بند کر دیا کہ جن حالات میں وہ امداد دی گئی تھی وہ اب باقی نہیں رہے لہٰذا قرآن کا یہ حکم ملتوی رہے گا۔ اسی طرح نبی اکرمؐ اور عہدِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں

میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب عراق کا وسیع زرعی رقبہ مملکت کے ہاتھ آیا تو حضرت عمرؓ نے سابقہ قانون پر ازسرِ نو غور کیا اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق اسے بدل دیا۔ وہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم کرنے کی بجائے مملکت کی تحویل میں لے لی گئیں۔ اسی طرح عہدِ صدیقیؓ تک یہ قاعدہ تھا کہ مملکت کی جس قدر نقد آمدنی ہوتی اسے ساتھ کے ساتھ تقسیم کر دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک طرف یہ آمدنی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف مملکت کی مستقل ضروریات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ ان بدلے ہوئے حالات کے ماتحت آپ نے سابقہ قاعدہ کو بدل دیا اور اس آمدنی کو بیت المال میں داخل کر کے باقاعدہ حساب کتاب کا محکمہ (دیوان) کھول دیا۔ اس قبیل کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے خارج از قرآن، احکامِ شریعت اس زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مدوّن کئے گئے تھے۔ جس زمانے میں وہ مرتّب ہوئے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان احکام کا ازسرِ نو جائزہ لیں اور حالات کی تبدیلی سے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو ان میں مناسب تبدیلی کر لی جائے یہ ہے مطلب۔ زمانے کے تقاضوں۔ یا "بدلے ہوئے حالات" کا ساتھ دینے کا۔ نہ یہ کہ جس چیز کو خدا نے ناجائز قرار دیا ہے اسے جائز قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا اختیار کسی فرد۔ معاشرہ یا حکومت کو حاصل نہیں۔ جس طرح ہمیں مروجہ قوانین شریعت کا جائزہ لینا چاہیے۔ اسی طرح آج کل کی معاشرتی روشوں کا بھی محاسبہ کرنا چاہیئے۔ ان میں سے جو روش بھی قرآن کے کسی حکم یا اصول کے خلاف ہو اسے بدل دینا چاہیئے۔

پھر سُن لیجئے کہ دین، قوانین یا اصولوں کی حیثیت سے قرآن کریم کے اندر مکمل ہو چکا ہے۔ جو کچھ قرآن میں ہے وہ غیر متبدّل ہے۔ قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو جزئی قوانین مرتب ہوں گے اور ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لیئے جو طریقے اختیار کئے جائیں گے وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلے جا سکیں گے۔

و ذالك الدين القيم

(۱۹۶۴ء)

عالم کسے کہتے ہیں

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام، علم سے بے بہرہ ہیں، یہ حضرات اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں۔ اتنے سال تحصیل علم کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اگر یہ علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں تو پھر عالم کسے کہا جائیگا۔

طلوع اسلام

ہم اپنے مستفسر سے یہ عرض کریں گے کہ وہ اس بات پر غور کرکے خود ہی جواب دیں کہ اگر ایک شخص قرآن کریم کو حفظ کرے تو کیا آپ اسے قرآن کا عالم کہیں گے؟ آپ اسے قرآن کا عالم کبھی نہیں کہیں گے حالانکہ اسے سارا قرآن حفظ یاد ہے۔ یہ اس لیے کہ اس نے قرآن کریم کے الفاظ یاد کئے ہیں۔ ان پر غور و فکر نہیں کیا۔ عقل و بصیرت سے کام لے کر اس کے مطالب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یاد رکھئے۔ کسی چیز کے حفظ کرنے میں عقل و فکر کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لیے حفظ کرنے کو علم نہیں کہا جاسکتا۔

ہمارے علمائے کرام کی بعینہٖ یہی حالت ہے۔ انہوں نے قدیم زمانے کی کتابوں کو اسطرح حفظ کیا ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے، فلاں امام نے کیا کہا ہے۔ فلاں مفسر کا کیا قول ہے، فلاں محدث کا کیا ارشاد ہے۔ جو کچھ انہیں ان کتابوں میں لکھا ملتا ہے وہ اسے حرفاً حرفاً نقل کر دیتے ہیں اس میں اپنی عقل و فکر کو قطعاً دخل نہیں دینے دیتے۔ انہیں اس کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے، اب ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں معلومات (INFORMATIONS) حاصل ہوتی ہیں لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا علم بہت ہے۔ قرآن کریم نے علم کی تعریف خود بیان کر دی ہے۔ جب کہا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں "علم" نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ اس کے بعد ہے۔ کہ

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا (۱۷/۳۶)۔

یاد رکھو تمہارے سمع۔ بصر۔ اور قلب (فؤاد) ہر ایک سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے "علم" وہ ہے جس میں سننے دیکھنے کے علاوہ انسان کی فکری صلاحیتوں فواد (MIND) کا بھی دخل ہو۔ جو معلومات محض سمع، بصر پر مبنی ہوں اور ان میں انسان کے اپنے فہم و تدبر کا دخل نہ ہو، وہ علم کی تعریف میں نہیں آتیں۔ ہمارے علماء کرام کا سارا "علم" سمع و بصر پر موقوف ہوتا ہے۔ یعنی یا کتابیں رٹ لینا اور یا استاد کی سنائی ہوئی باتوں کو محفوظ کر لینا (خواہ حافظہ کی مدد سے یا تحریر کے ذریعے)۔ ان کی فکری صلاحیتوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انہیں اس کی اجازت ہی نہیں کہ جو کچھ چلا آ رہا ہے اس میں عقل فکر کو دخل دے سکیں۔ یہ ان کے نزدیک بدعت اور الحاد ہے۔ ان میں سب سے بڑا عالم وہ ہوگا جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے۔ ہم اسی لیے انہیں عالم کے بجائے (CATALOGUER) کہا کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے انہیں کے متعلق کہا تھا کہ:-

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن نے اسکو "حمل اسفار" (۶۲/۵)۔ کتابیں اٹھائے اٹھائے پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اپنے محدود سے دائرے میں معلومات کے حافظ ہوتے ہیں۔ عالم نہیں ہوتے جن لوگوں کے مسلک میں عقل و فکر سے کام لینا حرام ہو وہ عالم ہو کیسے سکتے ہیں؟ ان سے کسی مسئلہ کے متعلق پوچھئے۔ یہ بیس اسناد گن دیں گے اور درجنوں حوالے پیش کر دیں گے۔ لیکن ان سے اگر یہ پوچھئے کہ ایسا کیوں کرنا چاہیئے تو اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ بجز کفر کے فتوے کے۔ کیا علم اسی کو کہتے ہیں؟ (۱۹۶۴ء)

اختلافات کی نوعیت

جب ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مسالک کو مستند مان لیا جائے تو اس قسم

کے قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتے جنہیں تمام مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں۔ کیونکہ ان فرقوں میں باہمی اختلافات بڑے شدید ہیں تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ نہیں۔ یہ اختلافات محض فروعی ہیں انہیں ایسی اہمیت حاصل نہیں۔

اہلِ حدیث کے ترجمان (الاعتصام) میں احناف کے ساتھ ایک بحث چل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی ۱۳ دسمبر کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مضمون میں لکھا ہے۔

یہ تو ایک اصل کی ایک جزی کو نہایت اختصار سے نقل کیا گیا ہے۔ اگر اس پر اور دیگر سینکڑوں اصول جو نصوص اور ائمہ اہلِ حدیث کی تردید کے لیے وضع کئے گئے ہیں بحث و تمحیص کے لیے قلم کو اجازت دی جائے تو ایک مبسوط کتاب مرتب ہو جائے۔ وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو، اور پھر اس کو خارج از اسلام کرنے کے لیے اصول نہ وضع کئے گئے ہوں۔ اصول سے ہٹ کر ویسے بھی احناف کرام کی ائمہ اہلِ حدیث کے متعلق گفتگو اس طرح کی ہوتی ہے۔ جس کا نمونہ آپ فاضل دیوبند کے کلام میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہم اگر ان کے بزرگوں کے بزرگوں کے وہ اقوال اور ملفوظات جو اہلِ حدیث کی تحقیر و تنقیص میں ان کی کتابوں میں موجود ہیں، پیش ہی کریں تو غالباً اس کو بھی ہماری کم ظرفی اور چھچھورے پن پر محمول کریں گے۔

(الاعتصام ۱۳ دسمبر ۶۳ء صد ۲)

آپ ان الفاظ پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے کہ

وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو اور پھر اسے خارج از اسلام کرنے کے لیے اُصول نہ وضع کئے گئے ہوں۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا ان فرقوں کے اختلافات محض فروعی ہیں جنہیں چنداں اہمیت حاصل نہیں یا ایسے بنیادی کہ ان کی بنا پر ایک دوسرے کو خارج از اسلام قرار دیا جاتا ہے؟ اور ان دونوں فرقوں کا دعویٰ یہ ہے۔ (بلکہ ہر فرقے کا دعویٰ) کہ ہمارے احکام "کتاب و سنت" پر مبنی ہیں۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جس کتاب کا دعویٰ یہ ہو (اور اس دعوے کی صداقت پر ہمارا ایمان ہو) تو کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ جن احکام کی بنیاد ایسی کتاب پر ہو ان میں

اس قدر اختلافات ہوں ؟ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ممکن ہے تو اس کتاب کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ تمام اختلافات، کتاب اللہ سے ہٹ کر اور چیزوں کو بنیاد قرار دے لینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی سوچئے کہ جب تک آپ ان چیزوں کو بنیاد تسلیم کرتے رہیں گے، ان اختلافات کے مٹنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی ؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہماری ہزار برس کی تاریخ خود اس پر شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان اختلافات کے مٹنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم کتاب اللہ کو بنیاد تسلیم کریں۔ اسی سے ایسے احکام و قوانین مرتب ہو سکیں گے جن کا اطلاق اسلامی قوانین کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے گا۔

پاکستان میں قانون سازی کا یہی وہ اصول ہے جس کی طرف ہم دعوت دیتے چلے آ رہے ہیں لیکن فرقوں میں جکڑی ہوئی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہے جس سے تمام مسلمانوں کے لئے مشترکہ اسلامی قوانین مرتب کئے جا سکیں ؟ ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا — نہ ہی دیا جا سکتا ہے۔

یاد رکھئے۔ جب تک یہ شکل اختیار نہیں کی جائے گی، ہمارے فرقے نہیں مٹ سکیں گے — اور فرقے نہیں مٹیں گے تو ہم خود مٹ جائیں گے۔ (۱۹۶۴ء)

الیکشن کی وبا

ایک صاحب لکھتے ہیں :۔ الیکشن آ رہے ہیں اور ان کی وجہ سے ملک میں اختلاف انگیزی اور تفرقہ بازی کی وبا عام شروع ہو گئی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ مصروف نبرد آزمائی ہے۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف آمادۂ جنگ و جدال ہے۔ کیا یہ الیکشن کسی طرح ختم نہیں کئے جا سکتے!

طلوعِ اسلام

یہ دبا الیکشنوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ الیکشن صرف دیوانے کے لیے "ہُو" کا کام دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اور ہے۔ ۱۹۶۲ء کے دستور پاکستان میں جو چند کام کی باتیں تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کا وجود اور "پرسنل لا" کے سلسلہ میں مذہبی فرقہ بندیوں کی تمیز ختم کر دی گئی تھی یہ اقدام بڑا مستحسن تھا۔ لیکن آپ کے ہاں کی اسمبلیوں نے خیر سے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سیاسی پارٹیوں کو پھر سے وجود میں لے آئیں اور عائلی قوانین میں مذہبی فرقہ بندی کو (جسے قرآن کریم بہ نصِ صریح شرک قرار دیتا ہے) پھر سے اُجاگر کر دیا اور اس پر مسرّت کے شادیانے بجائے کہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔ یہ تمام سر پھٹول، یہ جنگ و جدل۔ یہ نبرد آزمائیاں اور اختلاف انگیزیاں سب سیاسی پارٹیوں کے وجود کا فطری نتیجہ ہیں۔ اسلام نے وحدتِ انسانیت کا اصول دیا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم المثال تعلیم و تربیت سے اُمتِ واحدہ پیدا کی تھی۔ اس میں نہ سیاسی پارٹیوں کی لعنت تھی نہ مذہبی فرقوں کا شرک ایک امت۔ ایک مرکز۔ ایک ضابطہ قوانین۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس اُمت کو بہتّر فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اور سیاسی مفاد پرستوں نے پارٹیوں کی طرح ڈال دی۔ قرآن کریم نے سیاسی پارٹیوں کو حکمتِ فرعون کی دسیسہ کاری سے تعبیر کیا تھا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور جمہوریت کا نظام سیاسی پارٹیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتا" یاد رکھیئے۔ جو نظام اُمت کے اختلاف کے بغیر چل نہیں سکتا وہ کبھی اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ جس جمہوریت میں پارٹیوں کا وجود لاینفک ہو وہ اسلام کا نظام نہیں مغرب کی لادینی جمہوریت کا نظام ہے۔ اسلامی نظام کا مقصد قوانین خداوندی کا عملی نفاذ ہوتا ہے اور یہ مقصدِ بلند پوری اُمت کی مشاورت سے حاصل ہوتا ہے۔ جس جگہ بھی الیکشن سے مقصود کسی خاص پارٹی کا برسرِ اقتدار آنا ہوگا وہاں تفرقہ بازی اور اختلاف انگیزی ناگزیر ہو گی۔ مقصد، نظام خداوندی کا قیام سامنے رکھیئے اور پھر دیکھیئے کہ اُمت میں کس طرح وحدت پیدا ہوتی ہے۔

(۱۹۶۴ء)

قومی یادگاریں

سوال دنیا میں بھی عام رواج ہے اور ہمارے ہاں بھی اب اس کی طرح پڑ رہی ہے کہ مشاہیر یا بڑے بڑے واقعات کی یادگاریں تعمیر کی جائیں۔ قرآن شریف کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟

جواب اگر کسی شخص نے نوعِ انسان کی منفعت بخشی کا کوئی بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ تو اسکی یادگار اس کے عظیم کام کی یاددہانی کا ذریعہ ہوتی ہے تاکہ اس سے آنے والی نسلوں کے دل میں اسی قسم کے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے پیش نظر اس قسم کی یادگار قائم کرنا مفید ہوتا ہے۔ جو یادگاریں نظام خداوندی کے قیام و استحکام سے متعلق ہوں قرآن نے انہیں شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی طرح ایسے عظیم واقعات جو اس سلسلہ میں رونما ہوں ان کی یاد قائم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ انہیں قرآن کریم نے ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور ان کی یاددہانی بھی ضروری قرار دی ہے۔ چنانچہ فرعون اور حضرت موسیٰ کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے وذکرھم بایام اللہ (۱۴/۵) انہیں ایام اللہ کی یاد دلاؤ۔ اگر اس قسم کے اہم واقعات کی یاد کے لئے کوئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ بھی مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی اصول کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ یادگار ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ محض ایک ستون کھڑا کر دینا یا مینار بنا دینا جس کی آفادی حیثیت کچھ نہ ہو، اسراف بیجا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے قومِ عاد کی غلط کاریوں کی جو فہرست پیش کی تھی اس میں یہ بھی تھا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ (۲۶/۱۲۸) تم اونچے اونچے مقامات پر ایسی یادگاریں تعمیر کرتے ہو جن کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بے کار عمارت ہوتی ہے۔ تعبثون (ع۔ب۔ث) سے ہے۔ جس کے معنی بے کار، بے غرض و غایت۔ بے مطلب یعنی عبث ہیں۔ ہم نے ہندوستان میں صدیوں تک حکومت کی۔ لیکن غور کیجئے کہ اس ملک میں بڑے بڑے عظیم الشان مقبروں کے علاوہ اس دورِ حکومت کی یادگار کیا ہے۔ ان مقبروں پر کروڑوں روپے صرف آ گئے۔ لیکن سوچئے کہ ان کی (خود اس وقت جب وہ تعمیر کئے گئے تھے۔ یا آج) آفادی حیثیت کیا ہے؟ وہ سب بیکار عمارتیں ہیں۔ ان کے برعکس (مثلاً) سرسید کی یادگار (علی گڑھ کالج) کو

دیکھیئے علوم و فنون کا ایک چشمۂ جاریہ ہے۔ جس کے ایک گوشے میں اس کے بانی کی سادہ سی قبر ہے۔ جو کچھ کالج کی عمارت پر صرف کیا تھا اگر اس سے سرسید کا عالیشان مقبرہ بنا دیا جاتا تو سوچیئے کہ وہ سرسید کی بہتر یادگار ہوتی یا کالج بہتر یادگار ہے۔

ہم اتنا اور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جب ہم نے کہا ہے کہ ان عمارات کی آفادی حیثیت ضرور ہونی چاہیئے۔ تو اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ان میں جمالیاتی پہلو نہیں ہونا چاہیئے۔ جمالیاتی پہلو تو انسانی زندگی کی تاریک راتوں کے لئے چاندنی ہے۔ اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو اس کے ساتھ افادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لئے دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔ بہرحال یادگار ایسی ہونی چاہیئے جو منفعت بخشی اور جمال آفرینی کی جوئے رواں ہو۔ نہ کہ عبث و بیکار عمارت۔

(۱۹۶۴ء)

اقوامِ مغرب کیلئے وحی کی ضرورت

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ آپ نے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں یکیونزم کے متعلق ایک صاحب کے استفسارات کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میرے کئی ایک شکوک رفع ہو گئے۔ اور اس سلسلہ میں کئی ایک ایسے کانٹے نکل گئے۔ جن کی خلش ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جن کا مداوا کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ اب میں خود ایک سوال پوچھنے کی جرأت کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ یورپ کی کئی ایک رفاہی مملکتوں (WELFARE STATES) کے تذکرے سننے میں آتے ہیں۔ مثلاً انگلستان کی مملکت۔ کہ وہاں کوئی شخص بھوکا نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے لیے روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ بیکاروں کو الاؤنس ملتا ہے۔ بوڑھوں کو پنشن ملتی ہے، بیماروں کا علاج مفت ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم مفت ہوتی ہے۔ بے گھر لوگوں کو نہایت آسان قسطوں پر مکانات بنوا دیئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی سہولتیں صرف ان کی اپنی قوم کے افراد تک محدود نہیں۔ جو دوسرے لوگ بھی وہاں جا کر بسنے لگ جائیں وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے نظامِ معاشرہ تک کس طرح پہنچے ہیں ان کے سامنے تو قرآن کی تعلیم نہیں تھی۔

اور مذہب کی جو تعلیم ان کے سامنے تھی اس میں "دنیاوی زندگی" سے متعلق باتوں کا کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کو اسکے بعد بھی قرآنی تعلیم کی ضرورت رہے گی۔ اگر رہے گی تو کس کمی کو پورا کرنے کے لئے۔

طلوع اسلام پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ مفروضہ صحیح نہیں کہ ان لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم نہیں تھی۔ یہ لوگ صدیوں سے قرآن کی تعلیم سے آشنا ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے مذہب پرست متعصب طبقہ نے ان کے سامنے اسلام کی بڑی رنگ آمیز تصویر پیش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے قرآن کی تعلیم کا اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اور صاف و شفاف نہ سہی تو کم از کم اس کے اصولوں کا دھندلکا سا تصور ان کے سامنے ضرور ہے۔

لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں عقل کا تجرباتی طریق کار فرما ہوتا ہے۔ جسے ہم "خدا کے کائناتی قانون" کی اصطلاح سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ اسی کو زمانے کا تقاضا بھی کہا جاتا ہے۔ آپ یورپ کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جب سے اس کا مسلمانوں سے میل جول شروع ہوا خواہ وہ صلیبی جنگوں کے میدانوں میں تھا یا اندلس کی تکرگاہوں میں افراد کے حقوق کا تصور ان کے سامنے آیا۔ اگر وہ قرآنی وحی پر ایمان لاتے تو ان حقوق کو بلا توقف و تاخیر عمل میں لے آتے انہوں نے ایسا نہ کیا اور عقل کے تجرباتی طریق کو اپنا راہ نما بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ انہیں اپنے موجودہ مقام تک پہنچنے میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ یہ جو ہم ان کے ہاں افراد کے حقوق کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

لیکن انہیں اب بھی وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی ضرورت رہے گی۔ انکے ہاں افراد کے حقوق کا جذبہ محرکہ نیشنلزم ہے۔ انسانیت کا تصور نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مختلف اقوام اپنی اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ خوش حالیاں اور فارغ البالیاں پہنچانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اپنی قوم کے باہر کے انسانوں کا سلب و نہب (EXPLOITATION) ان کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار پاتا ہے۔ اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ان کی قوم کے کسی مفاد کا تصادم کسی غیر قوم کے مفاد سے ہوتا ہے۔ اس وقت دیکھئے کہ وہ قوم انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر کس طرح درندوں کی طرح قوم مخالف پر جھپٹتی ہے آپ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک اور دوسری طرف افریقی اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ وہی اقوام یورپ اور امریکہ جو عام حالات میں اس قدر مہذب اور شریف نظر آتی ہیں اسوقت

کیا بن کر سامنے آتی ہیں جب ان کا اپنا مفاد، ان اقوام کے مفاد سے ٹکراتا ہو۔ انسانیت کا تصور تو بڑی چیز ہے وہ اس وقت عام معاشرتی اصول و آداب تک کو بھی خیرباد کہہ دیتی ہیں۔ اور ایسے ایسے حربے استعمال کرتی ہیں۔ جن پہ عظمت انسانیت ماتم کرے اور احترام آدمیت خون کے آنسو بہائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگلستان میں بسنے والے پاکستانیوں کو وہاں دوائی مفت مل جاتی ہے۔ (بشرطیکہ وہ وہاں کی انشورنس فیس ادا کرتا ہو) لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اسی پاکستان کے غریب اور مفلوک الحال انسانوں کی محنت کی کمائی کا کس قدر عظیم حصہ دوائیوں کی قیمت کے طور پہ ہر سال انگلستان اور امریکہ جا پہنچتا ہے۔ وہ یہاں کے غریبوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں تاکہ ان کی اپنی قوم کے افراد کے چہروں کی سُرخی میں فرق نہ آنے پائے۔ اور اس میں سے دو چار بوندیں وہاں کے مقیم پاکستانیوں کو بھی دیدیتے ہیں تاکہ انہیں انسانیت کا ہمدرد اور غیروں کا بہی خواہ سمجھا جائے۔

اقوام مغرب کو اپنی اپنی قوم کے افراد کے حقوق کے تصوّر تک پہنچنے میں صدیاں لگ گئیں۔ اور اس دوران میں جو کچھ ان اقوام پر گذری اس پر ان کی تاریخ شاہد ہے۔ اب اگر انہوں نے احترام آدمیت اور وحدت انسانیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے عقل کے تجرباتی طریق ہی کو اپنا امام قرار دیا تو نہ معلوم اس مقصود تک پہنچنے میں انہیں کتنے دن لگ جائیں اور اس عرصے میں انسانیت کو جن تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے۔ اس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ پہلے زمانے میں تو پھر بھی انسانوں کو شمشیر و سناں سے ہلاک کیا جاتا تھا۔ لیکن اب سائنٹفک ایجادات نے انسانوں کی تباہی کے لیے ایسے اسباب و ذرائع وضع کر دیئے ہیں کہ دنیا کے اکثر مفکر اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو دنیا میں انسانوں کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔ اندریں حالات، اب انسانیت اسے AFFORD ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا عقل کے تجرباتی طریق کی سُست رفتاری سے وحدت انسانیت کی منزل تک پہنچے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اقوام مغرب کو قرآن کی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ وحی کی راہ نمائی میں اس منزل تک جلد از جلد پہنچ سکے۔ اور عالمگیر انسانیت اس تباہی سے بچ جائے۔ جو بصورتِ دیگر اس کی تقدیر مبرم نظر آتی ہے۔ ۱۹۶۴ء

قرآن کریم اور عقل انسانی

لاہور سے ایک صاحب نے ذیل کے چار سوالات بھیجے ہیں۔

۱ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے۔ آپ کے نزدیک اس کے حق میں عقلی و نقلی، داخلی اور خارجی شہادتیں کیا ہیں ؟

۲ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید ایک وجدانی تخلیق ہے تو اس کی تردید میں آپ کا کیا جواب ہوگا ؟

۳ کیا عقل اس وحی ربانی یعنی قرآن کی ترجمانی تصریح اور تشریح کرنے کی اہل ہے ؟ اگر یہ کہا جائے کہ عقلِ انسانی کی رسائی وہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اسمیں تصریح و تشریح کی صلاحیت آگئی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اب شارع اور مفسر حقیقی کی ضرورت باقی نہیں ؟ اندریں صورت ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ عقل اس حد تک پختہ ہوگئی ہے کہ وہ وحی کا احاطہ کرنے کے قابل ہے تو پھر وحی کی ضرورت جو تکمیلِ عقل انسانی کے لئے لازمی تھی غیر ضروری ہو جاتی ہے اور اس کو چھوڑ دینا چاہیئے ؟

۴ اگر یہ مانیں کہ عقل انسانی اپنے ارتقاء کے لیے وحی کی اب بھی محتاج ہے تو اس سے استفادہ کرنے کے لیے اس مفسر اور شارع کی جو وحی کے جزء پر کلیتہً اور کاملاً احاطہ اور اطلاع رکھتا ہو موجودہ زمانے میں اس کی نشاندہی کی جائے۔

مندرجہ بالا استفسارات کا جواب اگر انفرادی طور پر دیا جا سکے۔ تو یہ عنایت خصوصی ہوگی۔ ورنہ بصورت دیگر ازراہِ لطف مطلع فرمایا جائے کہ آپ کے کس مجلہ عالیہ میں جوابات اشاعت پذیر ہوں گے تاکہ اسے خرید لیا جائے۔ والسّلام۔

جواب (۱) سب سے پہلے اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لیے "الہامی" کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ (اس کے لیے یا کسی دوسری آسمانی کتاب کے لیے یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا) یہ وحیٔ خداوندی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب رسول اللہ کے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ اسے خدا نے رسول پر نازل کیا اور حضور نے اسے اسی طرح انسانوں تک پہنچا دیا سو وحی خداوندی میں OBJECTIVITY کا تصور بنیادی ہوتا ہے اس میں SUBJECTIVITY کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت صرف وحی کو حاصل ہے جہاں تک داخلی اور نقلی شہادت کا تعلق ہے، قرآن کریم شروع سے اخیر تک اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کئے جاتا ہے کہ اسے خدا نے وحی کیا۔ (وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰن۔ پ۷ ؛ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰن پ۱۳ ؛ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ پ۲۷ وغیرہ) اس کی دلیل اس کا دعوٰے ہے کہ وَاِنْ كُنْتُمْ

فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ..... (۲/۲۳) "اگر تمہیں اس میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند ایک سورت بنا کر دکھاؤ"۔ چونکہ یہ چیلنج تمام انسانوں کے لئے ہے۔ (ہر قوم کے انسانوں کے لئے اور ہمیشہ کے لیے) اس لئے اس سے مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ انسانی کوشش کی تخلیق نہیں اور یہ حقیقت کہ اس چیلنج کو آج تک کسی نے قبول (ACCEPT) نہیں کیا۔ اس دعوے کی صداقت کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کے من جانب اللہ ہونے کی ایک عقلی دلیل تو وہی ہے جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے یعنی اس کا یہ چیلنج کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد اس تیرہ سو سال کی انسانی تاریخ خود اس کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے اور اس کا ایک استفسار کے جواب میں سمٹانا مشکل۔ اسلئے سر دست چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

نزول قرآن کے وقت ساری دنیا کا فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت کا نظام سیاست عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق ہے۔ بادشاہ ایشور کا اوتار اور خدائی اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے بہتر نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ انسانوں کو اپنے معاملات (وحی کی مستقل اقدار کی روشنی میں) باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔

۲ انسانی ذہن کا اس زمانے تک یہ فیصلہ تھا کہ غلاموں کا وجود انسانی معاشرہ کے لیے ضروری ہے اور فطرت کی صحیح تعلیم کا نتیجہ قرآن کریم نے یہ انقلابی تصور دیا کہ کسی انسان کا دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا لینا یکسر خلافِ انسانیت ہے۔

۳ اس زمانے میں انسانوں کی تقسیم و تفریق پیدائش کے اعتبار سے ہوتی تھی۔ برہمن کا بیٹا، برہمن اور محض برہمن کے گھر پیدا ہو جانے سے واجب التکریم، بادشاہ کا بیٹا شاہزادہ، لارڈ کا بیٹا لارڈ، سردار کا بیٹا سردار، قرآن کریم نے کہا کہ یہ تقسیم یکسر غلط ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت نہیں۔ فوقیت ہر انسان کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی بنا پر ہونی چاہیئے۔

۴ اس زمانے میں انسان مختلف گروہوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ تمام انسان ایک خاندان کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں ہیں۔ لہذا تمام دنیا کے انسانوں کو اُمت واحدہ (ایک قوم) کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ ان کا ایک اجتماعی نظام اور ایک ضابطہ زندگی ہونا چاہیئے۔

آپ ذرا سوچیے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تصور کر لیا جائے کہ ختم نبوت کے بعد خدا کی کتاب کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ خدا ہی کی طرف سے کوئی انسان آئے تو یہ اس کتاب کا کتنا بڑا نقص ہوتا۔ اگر کوئی مصنف ایک کتاب تصنیف کرے اور اسے عام افادہ کے لیے شائع کرے لیکن اس کے بعد ضرورت یہ لاحق ہو کہ اس کتاب کو سمجھانے کے لیے وہ اپنے ہاں سے "ٹرینڈ ٹیچرز" بھیجا کرے تو فرمایئے اس کتاب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہو گا؟ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ صاف، واضح، آسان، غیر مبہم کتاب ہے۔ اور اس کی تعلیم غور و فکر سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس لیے اس کے سمجھانے کے لیے خدا کو اپنی طرف سے "ٹرینڈ ٹیچر" بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مامورین من اللہ کی ضرورت باقی ہوتی تو سلسلۂ نبوت ختم کیوں کیا جاتا۔ نزول قرآن کے وقت رسول کی ضرورت اس لئے تھی کہ قرآن بتدریج نازل ہو رہا تھا اور رسول اللہ اس کے مطابق معاشرہ متشکل کرتے جاتے تھے۔ قرآن مکمل ہو گیا۔ اور اس کی وارث اُمت وجود میں آ گئی۔ لہذا نبوت ختم ہو گئی۔ اور قرآن اور اُمت آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کی موجودگی میں کسی "مامور من اللہ" کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ "شارع" خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انسان خدا کی عطا کردہ "شریعت" کو نافذ کرتے ہیں۔ شریعت وضع نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے شریعت اور دین سے مفہوم ایک ہی ہے اگرچہ عام مفہوم کے اعتبار سے دین کو اصول اور شریعت کو اس کی جزئیات سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۶۴ء

تلاعب بالدّین

دار العلوم دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ تذکرہ کی فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں معارف و حقائق کے زیر عنوان حسب ذیل نوادرات شائع ہوئے ہیں۔

۱ امام شافعیؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میری بیوی کے پاس ایک کھجور تھی۔ میں نے اس کو یہ کہہ دیا کہ اگر تو نے یہ کھجور کھالی تو تجھ پر طلاق اور اگر پھینک دیا تو تب بھی طلاق۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا کہ آدھی کھائے اور آدھی پھینک دے۔ (حرملہ بن یحییٰ)

۲ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا جو پانی میں کھڑی تھی کہ اگر تو اس پانی میں ٹھہری تو تجھ پر طلاق اور نکلی تب

بھی طلاق۔ تو ہم دیکھیں گے کہ اگر پانی جاری تھا اور اس شخص نے کوئی خاص نیت نہیں کی تھی تو اس پر طلاق واقع نہ ہو گی۔ چاہے وہ نکل آئے یا کھڑی رہے، لیکن اگر وہ پانی کھڑا ہوا تھا تو اس کی صورت یہ ہو گی کہ اسے فوراً کوئی دوسرا شخص زبردستی اٹھا کر پانی سے باہر لے آئے۔ (کتاب الاذکیا)

۳ ایک شخص نے اپنی بیوی کو جو کہ سیڑھی پر تھی یہ کہا کہ اگر تو اس سیڑھی پر چڑھی یا اس سے نیچے اتری یا تو نے اپنے آپ کو نیچے گرایا یا کسی نے تجھے نیچے اتارا تو تجھ پر طلاق ہے۔ تو اس سے رہائی کی صورت یہ ہو گی کہ ایک سیڑھی اس کے برابر رکھدی جائے اور وہ اس سیڑھی پر منتقل ہو جائے۔

۴ ایک شخص نے گھر والوں کے ساتھ مل کر بہت سی کھجوریں کھائیں، پھر بیوی سے یہ کہدیا کہ اگر تو نے میرے سامنے کھجوروں کی ان تعدادوں کا ذکر نہ کیا جو میں نے کھائی ہیں تو تجھ پر طلاق۔ اس سے رہائی کی یہ صورت ہو گی کہ جس قدر کھجوریں کھانے کا زیادہ سے زیادہ احتمال ہو وہ عورت ایک سے لیکر اس عدد تک گنتی چلی جائے۔ اس گنتی میں صحیح عدد بھی اس کے سامنے مذکور ہو ہی جائے گا۔

۵ ایک شخص نے اپنی بیوی کے پاس پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ دیکھا تو اس نے کہا یہ پانی مجھے پلا دو۔ اس نے انکار کیا تو اس شخص نے کہا اگر تم نے اس پانی کو پیا یا اس کو گرایا یا اس پیالہ میں چھوڑ دیا۔ یا کسی اور کو پلا دیا تو تم پر طلاق۔ تو اس سے رہائی کی یہ صورت ہو گی کہ اس پیالہ میں کوئی ایسا کپڑا ڈال دیا جائے جو اس پانی کو جذب کر لے۔

طلوع اسلام

قرآن کریم نے طلاق کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (۲/۲۳۱)

اللہ کے احکام کے ساتھ مذاق مت کرو

مسلم نیشنلزم

قرآن کریم نے دنیا کو جس قدر انقلابی نظریات عطا کئے ہیں ان میں ایک (اور نہایت اہم اور بنیادی) نظریہ یہ بھی ہے کہ قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک سے ہوتی ہے نہ کہ وطن، زبان، نسل، رنگ وغیرہ کے اشتراک سے۔ اس نے یہ نظریہ عطا کیا اور نبی اکرمؐ نے اس کے مطابق ایک نئی امت کی

تشکیل کر کے بتا دیا کہ یہ کس قدر ممکن العمل نظریہ ہے۔ اس نئی امت کے ساتھ ایک مملکت بھی وجود میں آئی جسکی وسعتیں آہستہ آہستہ حدود فراموش ہوتی چلی گئیں اور مختلف جغرافیائی حدود میں بسنے والے مسلمان اس کے دائرے کے اندر آتے چلے گئے۔ اس مملکت کا مرکز ایک ہی تھا۔ صرف انتظامی سہولتوں کی خاطر اسے مختلف ولایتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس تقسیم سے نہ مملکت کی مرکزیت پر کوئی اثر پڑ سکتا تھا نہ امت کی وحدت پر۔ ایک امت ایک مملکت۔ ایک مرکز۔ ایک قانون۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کی مملکتوں کا مجموعی رقبہ قرن اوّل کی مملکت کے رقبہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح ان کی آبادی بہ حیثیت مجموعی، ان کی آبادی سے کہیں بیش۔ لیکن مملکتیں مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ اور ہر ایک کی مرکزیت الگ الگ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ایک دین کا تصور رکھنے کے باوجود ایک قوم نہیں ہیں۔ ہر مملکت میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ قوم تصور کرتے ہیں۔ اور ان کے باہمی تعلقات اسی طرح باہمی معاہدات سے استوار ہوتے ہیں جس طرح غیر مسلم اقوام کے تعلقات ان کے باہمی معاہدات کی رُو سے قائم ہوتے اور ٹوٹتے ہیں یا جس طرح مسلمانوں کے تعلقات معاہدات کی رُو سے غیر مملکتوں کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ان میں آئیڈیالوجی (ایمان یا دین) کے اشتراک کا زبانی دعویٰ ان کی عملی زندگی پر کہیں اثر انداز نہیں ہو رہا ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ مردہ آن ایمان کہ ناید در عمل۔ اس زبانی دعویٰ کا فائدہ کیا ہے جو عمل سے ظاہر نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کے وحدت امت کے نظریہ کو ایک زندہ حقیقت بنانے کیلئے کیا کیا جائے۔ یعنی جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے اس میں کوئی کلام ہی نہیں کہ اسلام کی رُو سے قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی کی وحدت سے ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے کرنا کیا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک اس کے لیے حسب ذیل پروگرام عمدہ نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

۱ سردست مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں کی الگ الگ حیثیتوں کو اعلیٰ حالہ رہنے دیا جائے اور ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔

۲ ہر مملکت کے اندر اس نظریہ کو عام کیا جائے کہ قرآن کی رُو سے قومیت کی بنیاد آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اس مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو غیر مسلموں سے الگ قوم تصور کریں اور اس کے اعلان سے کوئی جھجک اور ندامت محسوس نہ کریں۔

۳ جو مملکتیں اس نظریہ پر عمل پیرا ہو جائیں ان میں بین المملکتی تعلقات نئے خطوط پر استوار کئے جائیں۔ ان میں بنیادی تبدیلی یہ ہونی چاہیے کہ

ا ایک مملکت کا مسلمان باشندہ دوسری مملکت میں جائے تو اسے اگر ابتداءً اس مملکت کی شہریت کے کلی حقوق نہ بھی دیئے جا سکیں تو بھی اسے نقل و حرکت کی ایسی سہولتیں مہیا پہنچائی جائیں کہ وہ اپنے آپ کو اس مملکت میں اجنبی محسوس نہ کرے۔ مثلاً پروانہ راہداری یا زر مبادلہ کی سہولتیں۔

ب ان میں اقتصادی معاہدات اس قسم کے ہوں کہ آہستہ آہستہ ان کی معاشی ناہمواریاں دور چلی جائیں اور ایک مملکت کی خوشحالی میں دوسری مملکت کے باشندے بھی شریک ہو سکیں۔ مثلاً اگر ایک مملکت میں سوء اتفاق سے قحط پڑ گیا ہے اور دوسرے مملکت کے پاس غلہ فاضلہ ہے تو اسے اس مملکت کے باشندوں کے لیے مہیا کیا جائے

ج سب سے بڑی بات یہ کہ ان مملکتوں کی خارجہ پالیسی ایسی ہو کہ ایک مملکت کے مسلمان کی تلوار دوسری مملکت کے مسلمان کے خلاف کسی صورت میں نہ اُٹھے۔

۴ رفتہ رفتہ ان مملکتوں میں باہمی وفاق کی شکل پیدا کی جائے۔ اس وفاق کی بنیاد وحدت قانون پر ہو۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ یہ مملکتیں قرآن کریم کو قانون کی بنیاد تسلیم کریں۔ اور جن امور میں قرآن نے صرف اصولی راہ نمائی دی ہے۔ ان کی جزئیات ہر مملکت کے مقامی یا مخصوص تقاضوں کو سامنے رکھ کر متعین کی جائیں۔

۵ اسی طرح ان مملکتوں کا نصاب تعلیم اس طرح مرتب کیا جائے کہ قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار ہر جگہ مشترک ہوں۔

اگر کوئی دو مسلمان مملکتیں بھی اس قسم کا اتحاد کر لیں تو یہ "وحدت" کی طرف ایک اہم قدم ہو گا۔ کچھ عجیب نہیں کہ اس کے بعد یہ کسی شکل میں مشترکہ مرکز پر بھی متفق ہو جائیں۔ بُعد مکانی اب ان امور میں قطعاً حائل نہیں ہو سکتا۔ اگر مغربی اور مشرقی پاکستان اس قدر بُعد مکانی کے باوجود ایک وحدت بن سکتے ہیں تو (مثلاً) پاکستان اور ایران پاکستان اور افغانستان میں ایسی صورت کیوں نہیں پیدا ہو سکتی؟ ان میں تو بعد مکانی اس سے بھی کم ہے اس کیلئے اوّلین قدم یہ ہے کہ خود اس مملکت کے اندر وحدت پیدا ہو۔ یعنی اس میں نسلی، جغرافیائی، سیاسی حتیٰ کہ مذہبی گروہ بندیوں کو ختم کر کے وحدت امت پیدا کی جائے۔ اور یہ بات اسی صورت میں پیدا ہو سکے گی کہ ہم اپنے معاشرہ کی عمارت قرآن کریم کی بنیادوں پر استوار کریں یعنی پہلے آئیڈیالوجی کے اشتراک سے خود ایک

قوم بنیں اور اس کے بعد دوسروں کو وحدت کی دعوت دیں۔ ہمارے نزدیک "مسلم نیشنلزم" کا مفہوم یہی ہے۔ اور اسی سے آخر الامر ہم وحدت امت کے نصب العین تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہی وحدت پھر عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل کا ذریعہ بن سکے گی۔ جو اسلام کا مقصود ہے۔ ۱۹۶۴ء

نوجوانوں کے دل کی دھڑکن

اس خط کو ملاحظہ فرمایئے۔

محترمی ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام کراچی۔ تسلیم! طلوع اسلام کافی عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کا طرز استدلال اور اجتہاد قابل داد ہے اور آپ کی روشن دماغی مسلّم۔ قرآن فہمی میں جو ملکہ آپ کو حاصل ہے۔ شائد ہی کسی کو ہو۔ مگر آپ کی یہ ذہانت اور استدلال اسلام کے راستہ کی مشکلات کو رفع نہیں کر سکتا۔ چونکہ جو واقعات صدیوں سے صفحہ تاریخ پر ثبت ہیں۔ طلوع اسلام کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتے۔ اور اگر آپ آج پونے چودہ سو سال بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرنا چاہیں تو میرا خیال ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی۔

اسلامی نظام ایک واہمہ ہے

آپ ہر بار اسلامی نظام کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ کی طرح خوش عقیدہ اور لوگ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق بار بار یہ دہرا رہا ہے کہ اسلامی نظام ایک واہمہ ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ اُمرا اور حکمران طبقہ کے ہاتھ میں ایک ایسا سحر ہے جس سے وہ جس وقت چاہیں عوام کو سُلا سکتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے اس کا اثر زائل ہی ہونے نہیں دیتے۔ اس کے سوا اگر اور کوئی اسلامی نظام ہے۔ تو وہ ممکن ہے کہ آپ کے یا اور کسی کے ذہن میں موجود ہو تو ہو مگر آج تک نہ تو تاریخ نے اس نظام کی کبھی جھلک دیکھی۔ اور نہ آئندہ کبھی دیکھ سکے گی۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کی طرح یہ مفروضہ نظام کچھ عرصہ زندہ رہ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور خدا کی مشیت بھی یہی ہے کہ کوئی نظام پائیدار نہ ہو۔ کیونکہ انسان ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے۔ اور اگر کوئی

مستقل نظام اس پر مسلط کر گیا۔ تو اس کا ارتقاء رک جائے گا۔ جو سراسر خلاف قانون قدرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نظام خواہ وہ انسان کا بنایا ہوا ہو یا اسے خدا کا بنایا ہوا کہا جائے۔ وہ روئے زمین پر کہیں بھی متواتر لاگو نہیں رہ سکتا۔ اس میں تغیر و تبدل زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

دورِ اول کی تاریخ

آپ کے مبینہ نظام اسلام نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس وقت جبکہ حضورؐ علیہ الصلوٰۃ و السلام کو رحلت فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ نے کیا کچھ کیا۔ خلیفہ اوّل کو کس نظام نے تلوار کی گھاٹ اتارا[1]۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو کس نظام نے موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت عثمانؓ پر کیا بیتی۔ حضرت علیؓ کا کیا حشر ہوا۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے۔ ان کا کیا حشر ہوا۔ اور اس کے بعد آج تک کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا وہ کون سا صفحہ، صفحہ نہیں، سطر بلکہ وہ کون سا لفظ ہے جو بے گناہوں کے خون سے نہ لکھا گیا ہو۔ خیر اس پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام صرف خلافتِ راشدہ تک ہی قائم رہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس سے اسلام بری الذمہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمان کو کیوں قتل کیا گیا اور ان کے قاتل کو کیوں سزا نہیں دی گئی اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے امیر معاویہ نے نیزوں پر قرآن لڑکا کر کیوں علیؓ کی فوج کو لڑنے سے روک دیا۔ اور کہا کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ قرآن کو درمیان میں رکھ کر بذریعہ ثالثی کیا جائے۔ اور پھر ثالثی فیصلہ کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس جنگ میں دونوں اطراف سے صحابہ عشرہ مبشرہ موجود نہ تھے۔ وہ صحابہ موجود نہ تھے جنہوں نے رسول پاکؐ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ کیا وہ اسلامی نظام سے واقف نہ تھے۔ پھر کیوں خونریزی ہوئی۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ حضور پاکؐ کو رحلت فرمائے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اور ان کے فیض سے براہ راست مستفیض ہونیوالے صحابہؓ کرام اسلامی نظام کو ہم اور آپ سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے وہ دوبارہ اسلامی نظام کو کیوں نہ زندہ کر سکے۔ کیا خدائی نظام ایسا ہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں صرف چند سال اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے۔ اور اس کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا نظام ہزارہا سال تک چلتا رہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں سے تو اس کے بندے ہی زیادہ سمجھدار ہیں کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو اللہ میاں کے نظام کے مقابلہ میں زیادہ مقبول ہوتا ہے اور زیادہ عرصہ چلتا ہے۔

---

[1]:- خلیفہ اوّل کو کسی نے تلوار کی گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ طلوع اسلام

محترم مدیر صاحب یاران سبکسار تو محمل تک جا پہونچے ہیں اور آپ قوم کے دامن کو پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دور وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں۔

اسلامی آئین کیا ہے

آپ کس نظام کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ آج تک اس کی کوئی باقاعدہ تشکیل ہوئی۔ آئین اسلامی کی کوئی کتاب چھپی۔ یا ویسے ہی آئین کا مجموعہ تیار کیا گیا ؟ جہاں تک میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ آپ سے پوچھا جائے اسلامی آئین کیا چیز ہے آپ قرآن کی ایک دو آیت پڑھ کر تقریر کرنے لگیں گے۔ کسی حنفی سے پوچھا جائے۔ وہ بخاری، مشکوٰۃ یا فقہ کی کتاب کا حوالہ دے گا۔ شیعہ سے پوچھا جائے تو وہ مجتہدین کے اقوال کے حوالے دینے لگے گا۔ اور باقی لوگوں سے پوچھنے پر بھی اسی قسم کا جواب ملیگا۔ مگر آج تک نہ ہی کسی فرقہ کے علماء نے آئین کی کتاب مرتب کی ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر تمام فرقوں کے علماء نے کوئی آئین بنا کر پیش کیا ہے۔ آئین کے مطابق جو استدلال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی رائے تو ہو سکتا ہے۔ مگر اسے قرآن حدیث یا فقہ کا منشاء نہیں کہا جا سکتا۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارا آئین زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ خطوں پر وضع کیا جائے تاکہ ہم دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ مادی ترقی کر سکیں۔ اور عالم اسلام پر جو ذلت اور نحوست چھائی ہوئی ہے اسے اس سے نجات دلا سکیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کا کوئی مبینہ اسلامی نظام قائم کر دیا گیا تو اس کا حشر معلوم۔ کیونکہ بنو امیہ اور بنو عباس کی صدیوں کی کشمکش کی تاریخ شاہد ہے۔ اور یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی جائے گی۔ یہ مرزائی ہے اسے وزارت خارجہ سے الگ کر دو اور مرزائیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دو۔ یہ شیعہ ہے اسے وزارت یا سفارت سے نکال دو کیونکہ یہ کافر ہے صحابہؓ پر سب و شتم کرتا ہے۔ یہ وہابی ہے یہ فقہ کو نہیں مانتا اسے بھی نکال دو۔ اور یہ اہل قرآن ہے اسے بھی کراچی سے شہر بدر کر دو۔ کیونکہ یہ محدثین کی سر قریہ ہی سے جمع کی ہوئی احادیث کا منکر ہے۔ اس لیے کافر ہے۔ اور یہ آپ کون سا اسلامی نظام قائم کریں گے۔ کیا آپ بقول شیعہ حضرات حق خلافت سادات کو تفویض فرمائیں گے۔ اگر نہیں تو شیعہ حضرات آپ سے کیسے تعاون کریں گے۔ کیا آپ خلیفہ ثانی مرزا محمود احمد کو خلیفہ اوّل پاکستان تسلیم کریں گے۔ نہیں تو پھر مرزائی صاحبان کیوں ایسے نظام کو تسلیم کریں گے۔ اسی طرح دوسرا کونسا فرقہ ہو گا جو اسلامی آئین کی تشکیل میں آپ کا ساتھ دے۔

آپ میرا یہ طویل خط جس کے لیے میں معافی چاہتا ہوں پڑھ کر مجھے گمراہ کر سکتے ہیں ۔ کافر کہہ سکتے ہیں کمیونسٹ یا اور جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے کہہ سکتے ہیں ۔ مگر خدارا حقائق کو نظر انداز نہ کریں ۔ قوم کو تباہی اور بربادی کے غار میں نہ دھکیلیں ۔ بار بار اسلامی آئین کی رٹ نہ لگائیں ۔ یہ ایک واہمہ ہے ۔ خوش اعتقادی ہے ۔ ہٹ دھرمی اور ضد ہے ۔ جس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی آئین بنا کر بھیجا ہوتا تو یقیناً وہ اس کے نفاذ کے لیے حالات پیدا کر دیتا ۔ اور اپنے ہمہ گیر آئین سے کبھی بھی اپنے بندوں کو محروم نہ کرتا ۔ اس کا آئین یہی ہے جو چل رہا ہے ۔ اور زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا ۔ اس میں حالات کے مطابق ترامیم اور تنسیخ ہوں گی ۔ ایک آئین کو ختم کر کے دوسرا بہترین آئین نافذ بھی کیا جاتے گا ۔ یہی مشیت ربی اور سنت اللہ ہے ۔ جو ازل سے ابد تک چلی جانے گی ۔

یہ عریضہ بے ربط سہی ۔ مگر میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ آپ صحابہ عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے ۔ ابوبکرؓ، عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ نہیں بن سکتے ۔ اگر یہ بھی نہیں بن سکتے تو اسلامی آئین کیسے نافذ کریں گے ۔ جس نظام کو پہلے دو خلفاء نے مضبوط کیا وہ عثمان اور علی کے دور خلافت میں کیوں رُو بہ انحطاط ہو گیا ۔ آپ اس بارے میں غور فرمائیں کیا یہی مشیت الٰہی نہیں تھی کہ وہ نظام ختم ہو کر ایک اور نظام جنم لے ۔ اور پھر ایک اور ، اور ، اور یہ سلسلہ چلتا رہے ۔

میں پھر اس طویل خط کے لیے معافی چاہتا ہوں اور آپ اسے مطالعہ کر کے جو بھی سخت سے سخت الفاظ میرے لیے استعمال کریں گے انہیں میں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا ۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو بہت بڑی ٹھیس پہنچادی ہے ۔ اور اگر اس ٹھیس سے کوئی آواز پیدا ہو تو مجھے یہ برداشت کرنا پڑے گی ۔

اچھا ۔ زیادہ آداب

طلوعِ اسلام

اس خط کو ہم نے اس لیے شائع کیا ہے کہ یہ صرف مراسلہ نگار کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار نہیں بلکہ ترجمانی کر رہا ہے ۔ ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں کے عام خیالات کی جو اسلام کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو کر ذہنی انتشار کا باعث اور انہیں اسلام سے متنفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ ہمارے پاس اس قسم کے خطوط عام طور پر آتے رہتے ہیں ۔ ان کے علاوہ اکثر نوجوانوں کی طرف سے زبانی گفتگو میں بھی اسی قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں ۔ بنا بریں اسے زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کا جواب انفرادی نہیں بلکہ عمومی حیثیت سے بذریعہ طلوع اسلام دیا جائے ۔ اس خط میں بہت سی تلخیاں اور بہت

کچھ غلطیاں بھی ہیں۔ لیکن ہم ان جزئیات سے صرف نظر کر کے صرف اصولی جواب پر اکتفا کریں گے۔

مراسلہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام چند دنوں کے لیے قائم ہوا اور اس کے بعد ختم ہو گیا۔ اگر یہ نظام مبنی بر صداقت تھا اور اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی تو ہمیشہ کے لیے کیوں قائم نہ رہا۔ چونکہ یہ نظام نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی آج کہیں قائم ہے۔ اس لئے اس نظام کے احیاء اور از سر نو قیام کی دعوت اور کوشش ایک مقدس آرزو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس خوش عقیدگی سے دامن چھڑا کر اسی قسم کا نظام قائم کر لینا چاہیئے جس قسم کے نظام دنیا کی اور قوموں میں قائم ہیں۔

اسلامی نظام آگے کیوں نہ چلا

معترض کے نزدیک کسی اصول یا نظام کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس پر تمام انسان یا کم از کم انسانوں کا کوئی گروہ ہمیشہ کاربند رہے اور اسی طرح وہ اصول یا نظام مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ دلیل بڑی کمزور اور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ جب سے انسانی شعور پیدا ہوا ہے یہ حقیقت بطور مسلمہ تسلیم کی گئی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو اس اصول سے انکار کرتا ہو اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس اصول سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام انسانی تاریخ میں (سوائے جستہ جستہ لمحات کے) کوئی بھی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسانوں نے کوئی ایسا نظام قائم کیا ہو جو خالص سچائی پر مبنی ہو۔ آپ گزشتہ تاریخ کو چھوڑیئے، خود اپنے زمانے پر نگاہ ڈالیے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ لیکن (قریب قریب) ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا دلیل کو صحیح مانا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ چونکہ انسانوں نے ہمیشہ سچ نہیں بولا۔ اور آج بھی کوئی نظام ایسا نہیں جو سچائی پر مبنی ہو۔ اس لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ اور جھوٹ بولنا بُرا چونکہ تمام انسان جھوٹ بولتے ہیں۔ اسلئے صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ جھوٹ کو حکم اصول تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی کا نظام بنا لیا جائے۔ خدا نے بھی یہ کہہ کر کہ جھوٹ بُری چیز ہے ایک تجربہ کیا تھا جو (معاذ اللہ) ناکام ثابت ہوا۔ اس کے مقابل میں انسانوں کا نظام جو جھوٹ پر مبنی ہے اچھا بھلا چلتا رہا ہے۔ اس لیے یہی راہ ثواب کی ہے۔

اسے بھی چھوڑیئے، روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالیئے۔ ہر ذیابیطس کا مریض اچھی طرح جانتا ہے کہ میٹھا کھانا اس کے لیے موجب ہلاکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ چند مستثنیات کے علاوہ

ہر مریض میٹھا کھالیتا ہے اور پھر چیختا چلاتا ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے اور میٹھے سے سخت پرہیز بتاتا ہے۔ مریض تین چار دن تک اس پر عمل کرتا ہے۔ اور پھر میٹھا کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کی مندرجہ بالا دلیل کی رُو سے یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ عام مریض پرہیز شکن واقع ہوئے ہیں اور ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود میٹھے سے باز نہیں آتے اس لیے یہ اصول ہی غلط ہے کہ میٹھا ذیابیطس کے مریضوں کیلئے مہلک ہے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ ذیابیطس کے مریض خوب میٹھا کھائیں۔

اسلام اور مسلمانوں میں فرق

اب آیئے اس شبہ کی طرف جو اسلام کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ اور جس کا اظہار اوپر کے خط میں کیا گیا ہے۔ اس شبہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کو ایک فرض کر لیتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے زندگی کے کچھ اصولوں کو اپنایا اور اس سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قوم قعرِ مذلت میں گر گئی۔ اور اس میں وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہونچے کہ وہ اصول اس قسم کے تھے کہ ان سے ہنگامی طور پر اچھے نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مستقل طور پر ان نتائج کو برآمد کرتے رہتے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک قوم نے ان اصولوں کو ضابطۂ زندگی بنایا اور زندگی کی کامیابیاں حاصل کر لیں۔ کچھ وقت کے بعد اس قوم نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا اور ان نتائج سے محروم ہو گئی۔ جو ان اصولوں پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ فرمایئے کہ اس میں ان اصولوں کا کوئی قصور ہے؟ آپ کہتے یہ ہیں کہ چونکہ اس قوم نے ان اصولوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ نہ رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصول اس قابل تھے ہی نہیں کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ لیکن یہ مفروضہ بالبداہت غلط ہے۔ آیئے، ہم دیکھیں کہ وہ اصول زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے چل رہے ہیں یا انہیں دنیا پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس خاص قوم نے تو ان اصولوں کو چھوڑ دیا۔ لیکن انسانیت بحیثیت مجموعی غیر شعوری طور پر انہی اصولوں کی طرف بڑھتے چلی جا رہی ہے اس کا ثبوت ذیل کی تصریحات سے ملیگا۔

کیا اسلام آگے بڑھ رہا ہے یا نہیں

(۱) نزول قرآن کے وقت یعنی چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بادشاہت (MONARCHY) ایک ایسا

مسلمہ نظام حکومت تھا۔ جس کے غلط ہونے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور خود خداوند سمجھا جاتا تھا۔ ہر گردن اس کے حقوق خداوندی (DIVINE RIGHTS) کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ ملوکیت وجہ فساد آدمیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ نہ ہی کوئی انسان پیدائشی طور پر یہ حق لے کر دنیا میں آتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھا جائے۔ بڑائی کا معیار جوہر ذاتی ہے نہ کہ نسبتی انتساب۔ انسانوں کے باہمی معاملات عدل اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پانے چاہئیں۔ ایک قوم نے اس اصول کو اختیار کیا۔ اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے بہرہ یاب ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے اس اصول کو چھوڑ دیا۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ اس تیرہ سو سال میں عام انسانیت کا قدم اس اصول کی طرف اٹھتا گیا ہے۔ جو قرآن نے پیش کیا تھا یا اس اصول کی طرف جسے نزول قرآن سے پیشتر ایک مسلمہ کی حیثیت سے عام اصول مانا جاتا تھا۔

ملوکیت دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت غیر شعوری طور پر اسی راستہ پر بڑھتی چلی آرہی ہے۔ جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور اس راستہ کو چھوڑ چکی ہے (یا چھوڑتی چلی جارہی ہے) جسے انسانوں نے اس سے پہلے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ دنیا سے کئی بادشاہتوں کے نام مٹ چکے ہیں اور شاہوں کے تاج آئے دن فضا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سمجھدار ہیں وہ خود اس اصول کو اختیار کئے جارہے ہیں۔ جو از خود نہیں چھوڑتے ان سے زمانے کے تقاضے مار مار کر تخت و تاج چھین رہے ہیں۔ آج دنیا میں شاذ ہی کوئی انسان ایسا موجود ہو جو یہ کہے کہ ملوکیت صحیح نظام حکومت ہے۔

ہم اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا قرآن کے تجویز کردہ نظام کو قبول کررہی ہے یا اس نظام کو جو اس سے پہلے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا دیا ہوا اصول صرف چند دنوں کیلئے چلا تھا یا تیرہ سو سال سے برابر آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔

پیشوائیت (۲) نزول قرآن کے وقت ایک مسلمہ اصول یہ تھا کہ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ انہیں مذہبی پیشوا یا (PRIESTS) کہا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ زلزلہ انگیز آواز بلند کی کہ خدا اور بندے کا تعلق (اس کے ہمہ گیر قانون کی رُو سے) براہ راست ہے اور پیشوائیت مفاد پرست انسانوں کا خود ساختہ تصور ہے۔ ایک قوم نے اس اصول کو اپنایا اور ان کے

قلوب واذہان اِن زنجیروں سے آزاد ہو گئے جو پیشوائیت کی عقیدتمندیاں وضع کئے چلی آ رہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور پیشوائیت کی لعنت پھر سے ان کے دل و دماغ پر مسلط ہو گئی لیکن آپ دیکھئے کہ آج انسانیت کا رُخ اس تصور کو مٹانے کی طرف ہے یا اسے مستحکم کرنے کی طرف آپ دیکھیں گے کہ آج انسان پیشوائیت سے بیزار ہو چکا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

مدارِ قومیت

(۳) نزول قرآن سے پہلے دنیا کے انسان قبیلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے تھے اور نسلی و جغرافیائی امتیازات انسان اور انسان کے درمیان حد فاصل بن رہے تھے قرآن نے آکر ان تمام خود ساختہ حدود بندیوں کو مٹایا۔ اور انسانوں کو اس اصل عظیم سے روشناس کرایا کہ تمام انسانوں کی پیدائش نفس واحدہ (جرثومۂ زندگی) سے ہوئی ہے۔ اس لیے تمام انسان بلا تمیز نسب و وطن ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ ایک خطۂ زمین میں اس اصول کو اپنایا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح مختلف نسلوں اور مختلف وطنوں کے انسان ایک امت بن گئے کچھ عرصہ بعد یہ اصول فراموش کر دیا گیا اور وہ قوم پھر خود ساختہ گروہ بندیوں میں بٹ گئی۔ لیکن آپ سوچئے کہ آج انسانیت کا قدم ان گروہ بندیوں اور حدود سازیوں کو مستحکم کرنے کی طرف ہے یا ان کو مٹا کر ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج ہر اہل فکر اسی کوشش میں ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر لینے کا نظام قائم کیا جائے کہیئے کہ انسانیت اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو اپنا رہی ہے یا اس کو جسے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔

سرمایہ داری

(۴) نزول قرآن سے پہلے سرمایہ داری اور مفاد پرستی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا۔ صاحب اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتا تھا۔ اور اس طرح زیر دست انسانوں کا خون چوستا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب آفرین اصول پیش کیا کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے۔ جو نظام اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا، اسے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے اس اصول کو اپنایا اور وہ زمین و آسمان کی برکتوں سے مالا مال ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا اور پھر سرمایہ داری اور مفاد پرستی کے جذام میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن یہ دیکھئے کہ اس تیرہ سو برس میں، عام انسانیت کا رخ سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی طرف بڑھ رہا ہے یا اسے انسانیت کے لیے لعنت قرار دیا جا رہا ہے۔

آج حالت[1] یہ ہے کہ عود پاکستان میں زمین پر افراد کی ملکیت کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زمینداروں کے گھروں سے ان کی زمینوں کی پیداوار کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر برآمد کیا جاتا ہے اور اسے نظام اجتماعی کی تحویل میں دیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورتمندوں کی ضرورت کو پورا کرے۔ جو زمیندار اپنے غلہ کی مقدار سے حکومت کو مطلع نہیں کرتا، یا غلہ کی برآمدگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اسے گرفتار کیا جاتا ہے۔ اور سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے زمیندار ہر شخص کی نگاہ میں سوسائٹی کے بدترین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف زمین پر ان کا حق ملکیت بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف انہیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زمین کی پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھ سکیں۔ حتیٰ کہ اب یہ بھی تجویز ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دیا جائے کہ زمینداروں کو اس کی اجازت نہ ہو کہ اپنی زمینوں میں جو کچھ جی میں آئے کاشت کریں۔ انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زمین وہ کاشت کریں جس کی اہل ملک کو ضرورت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے تقاضے کس طرح مار مار کر انسانی نظام کو قرآنی اصولوں کی طرف لا رہے ہیں۔ کہیئے، انسان خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کو اختیار کر رہا ہے یا اپنے خود ساختہ نظام کو۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پیش نظر مقصد کے لیے اتنی ہی مثالیں کافی ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ قرآنی اصول اپنی اندرونی قوت سے از خود انسانی معاشرہ کی بنیادیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کے اس طرح نافذ العمل ہونے کی رفتار بہت سست ہے۔ کیونکہ انسان انہیں مختلف تجربوں کے بعد اختیار کرتا ہے جس میں بہت زیادہ وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں سے اس کی بہت سی قوتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان وحی پر ایمان لا کر بلا تجربہ ان اصولوں کو اختیار کر لے تو ان کے نتائج کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اور ان میں زیادہ قوت بھی صرف نہیں ہوتی۔

اب مراسلہ نگار کے خط کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ اسلامی نظام کے اصولوں سے ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کے اصولوں میں یہ قوت موجود تھی کہ وہ ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد

---

[1] یہ خط ۱۹۵۳ء سے بھی پہلے لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں یہی حالات تھے۔ اس کے بعد یہاں اصلاح اراضی کا قانون نافذ ہوا جس کی رو سے کسی زمیندار کے پاس پانچ سو ایکڑ سے زیادہ زمین نہ رہنے دی گئی۔ (کاغذوں میں)۔

مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی یہ اصول جب انسانی ہاتھوں سے قائم ہوئے تھے۔ تو انسانی ہاتھوں سے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اگر انسانی ہاتھوں نے انہیں آگے نہ بڑھایا۔ بلکہ انہیں چھوڑ دیا تو یہ انسانی ہاتھوں کا نقص ہے نہ کہ قرآنی اصولوں کا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کیا گزری۔ بنو امیہ اور سادات میں کیا آویزش ہوئی۔ دمشق اور بغداد کے مناقشات نے کیا شکل اختیار کی۔ مسلمانوں کی جماعتیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ یہ باتیں ایک قوم کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کا صرف ایک فیصلہ ہے اور وہ یہ کہ

ہمارے اسلاف

تلک امة قد خلت لها ما کسبت ولکم
ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون (۲)

یہ ایک قوم تھی جو گزر چکی۔ جو کچھ انہوں نے کیا ان کے نتائج ان کے لیے تھے۔ اور جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لیے ہیں۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

اس لیے آج ہمارے لئے اس بحث میں الجھنا بے کار ہے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ کیوں ایسا کیا۔ علوم اسلام سے کبھی یہ "سعی لا حاصل" سرد نہیں ہوئی کہ آج پونے چودہ سو سال کے بعد ان واقعات کو تنقیح تنقیح کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرے۔ وہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ جو چیز فی الحقیقت گھناؤنی نہ تھی لیکن جسے بعد کی سازشوں نے خواہ مخواہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے گھناؤنے پردے چاک کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ ولو کرہ المشرکون

اب رہا یہ سوال کہ ہماری یہ کوشش ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآنی نظام پھر سے قائم ہو جائے۔ کیونکہ ہم اصحاب عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ سو عرض یہ ہے کہ قرآنی نظام کسی خاص عشرہ مبشرہ کا محتاج نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور جن انسانوں کے ہاتھوں سے اس کا قیام عمل میں آئے گا۔ وہی مبشرین بن جائیں گے آپ یہ

قرآنی نظام اور اشخاص

فرماتے ہیں کہ کہ جب یہ نظام حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں قائم نہ رہا تو ہم اسے کس طرح قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہو گیا تھا تو وہ ہی نظام آج قائم ہو سکتا ہے۔ عمرؓ کو عمرؓ اسی نظام کی برکتوں نے بنا دیا تھا نہ کہ عمرؓ نے اس نظام میں وہ برکتیں پیدا کر دی تھیں۔ وہ نظام اپنی تمام ممکنات کو لیے ہوئے آج بھی

اسی طرح موجود ہے۔ جو انسان چاہیں اس سے اسی قسم کی برکات حاصل کر کے وہی کچھ بن سکتے ہیں۔ جو کچھ اس نے اس سے پہلے بنایا تھا۔ قرآن کو محفوظ رکھنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ نظام ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں نافذ العمل ہو سکتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے عام مسلمانوں کی توجہ اس وقت مبذول کرائی تھی جب رسول اللہ صلعم کی وفات سے ان کے ذہنوں میں اس خدشہ کے پیدا ہونے کا امکان نظر آتا تھا۔ کہ اب یہ نظام آگے نہیں چل سکے گا۔ عین اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا تھا کہ یہ نظام کسی خاص شخصیت کے سہارے سے وابستہ نہیں۔ یہ زندہ خدا کا دیا ہوا زندہ نظام ہے جو ان تمام انسانوں کے ہاتھوں سے قائم رہ سکتا ہے۔ جو اسے قائم رکھنا چاہیں۔ اور اس پر انہوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل

افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم

محمد ایک رسول تھے۔ جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مر گئے یا قتل ہو گئے تو تم پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟

آپ لکھتے ہیں کہ اس نظام کو ختم کرنے سے اللہ کا منشا یہ تھا کہ ایک آئین کو ختم کر کے دوسرا بہتر آئین نافذ کر دیا جائے گا۔ سو اول تو یہ دیکھئے کہ آپ خود اس کا رونا رو رہے ہیں کہ اسلام کا بہترین نظام ختم ہوا تو اس کے بعد اس قوم نے وہ نظام اختیار کر لیا جو تمام برائیوں کا منبع تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی مشیت یہ تھی کہ اس نظام کو ختم کر کے اس سے بہتر نظام قائم کر دیا جائے گا۔ ان دونوں چیزوں میں جو تضاد ہے وہ واضح ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظام ایک جامد (RIGID) نظام ہے جو انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا نظام دیا جائے۔ اور یہ سلسلہ آگے چلتا رہے۔ ذرا یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہو گا کہ بعض اصول ایسے ہیں جو ابدی طور پر قائم رہتے ہیں۔ مثلاً

اسلامی نظام کیا ہے؟

عدل کا اصول، دیانتداری کا اصول۔ آپ یقیناً اس سے متفق ہونگے کہ یہ ایسے اصول نہیں ہیں کہ ایک نظام ان کے مطابق قائم کیا جائے اور کچھ عرصہ بعد اس نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے۔ جو ظلم اور بددیانتی کے اصولوں پر استوار ہو۔ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے عدل اور دیانت کے اصول اپنی جگہ قائم رہیں گے۔ اسی قسم کے اصولوں کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے کچھ اصول دیئے ہیں۔

یہ غیر متبدل ہیں۔ اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں ظاہر ہے کہ وہ غیر متبدل اصول جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ اور ان کی روشنی میں وضع کردہ نظام انسانیت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا جائے گا۔ اب آپ فرمایئے کہ اس قسم کے نظام میں آپ کو کون سی چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اور اسے آپ کس طرح ناقابل عمل تصور کرتے ہیں کہ جو صرف ایک مرتبہ قائم ہو سکا اور اس کے بعد دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں ملا کا پیش کردہ نظام شریعت ہوتا ہے۔ جو قرآنی نظام کی نقیض ہے۔ یہ تمام اعتراضات جو آپ نے اسلامی نظام پر وارد کئے ہیں۔ ملا کے نظام شریعت پر وارد ہوتے ہیں۔ جس کی تمام جزئیات ناقابل تغیر و تبدل قرار دی جاتی ہیں۔ آپ اس قرآنی نظام کو سامنے رکھیئے۔ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پھر فرمایئے کہ آپ کے اعتراضات میں سے کون سا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام شیعہ سُنی، وہابی، مرزائی، چکڑالوی میں سے کس کے مطابق ہو گا۔ اور باقی فرقوں کو کیا جائے گا۔ آپ کو غالباً علم نہیں کہ شیعہ سُنی وغیرہ کے اختلافات ملا کی شریعت کے پیدا کردہ ہیں۔ قرآن میں جا کر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف ہماری خوش عقیدگی ہی نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے۔ جسے ہم ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں۔ قرآن پر مسلمانوں کے ہر فرقہ کا ایمان ہے۔

اس لیے ہر مسلمان کے لیے قدر مشترک (COMMON FACTOR) بن سکتا ہے۔ قرآن کے اصولوں میں بھی کسی کو اختلاف نہیں۔ لہٰذا اس حد تک بھی تمام مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اب رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گی۔ تو اس کے لیے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ تمام مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عقل و فکر کی رُو سے طے ہوں گی۔ لہٰذا جو چیز ہماری باہمی مشاورت سے طے پا جائے اس میں اختلافات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اب صرف یہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بنیادی نقطہ نظر پر کس طرح لایا جائے کہ ان کا نظام قرآن کے اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے طلوع اسلام کوشش کر رہا ہے۔ جو احباب اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں ان کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی اس کوشش میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔

آخر میں ہم اپنے بھائی سے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس

نوجوان طبقے کی مشکلات

کی وجہ سے ہم آپ کے خلاف کوئی سخت الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتے اس لیے کہ ان خیالات کے آپ خود ذمہ دار نہیں۔ ان کا ذمہ دار ہے اسلامی نظام کا وہ تصور جو ملّا نے پیش کر رکھا ہے۔ اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف اس قسم کے خیالات پیدا ہوں۔ نوجوان بیچارے معذور ہیں ایک طرف انہیں کالجوں میں ہیگل کا فلسفہ اور آئین سٹائن کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے مذہب کا وہ تصوّر پیش کیا جاتا ہے جس سے عقل ابا کرے اور علم شرمائے۔ اگر اس کے بعد ان کے دل میں مذہب کیطرف سے نفرت اور اس کے تصوّرات کی طرف سے سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں تو اور کیا ہو گا۔ اس لیے ہمارا نوجوان طبقہ قابل نفرت نہیں مستحق ہمدردی ہے۔ اور اسی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ہم ان سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ وہ مُلّا کے پیش کردہ مذہب کے بجائے قرآن کے دیئے ہوئے دین کے تصوّرات کو سمجھنے کی کوشش کریں اس باب میں جتنی حقیر سی کوشش طلوع اسلام کر سکتا ہے۔ وہ اس سے کبھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسکا حقیقی مخاطب طبقہ نوجوانوں ہی کا گروہ ہے۔ (۱۹۵۳ء)

مکرر

یہ خط آج سے بارہ تیرہ سال پہلے کا ہے۔ اس دوران میں طلوع اسلام اپنی اس کوشش میں برابر مصروف رہا کہ قوم کے سامنے اسلام کے صحیح نظام کو پیش کرے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو بتائے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کیا ہے اور کس طرح وہ نظام ہماری (اور نوع انسانی) کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم ارباب اقتدار کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی طرف مبذول کراتے رہے کہ جب تک ہمارے نظام تعلیم کو بدلا نہیں جائیگا قوم کا قدم اصلاح کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔ اس لیے کہ آج کے نوجوان ہی کل کی قوم ہوتے ہیں۔ جب آپ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں کرتے تو قوم کا قدم کسطرح صحیح خطوط کے مطابق اٹھے گا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا نیا طبقہ پورے طور پر فکر و نظر کی پریشانی کا شکار ہے۔ جس کے مظاہر سے آئے دن کے خلفشار سے ہوتے رہتے ہیں۔ اس خلفشار کے خلاف (وہ جب بھی رونما ہوتا ہے) ہنگامی اقدامات کئے جاتے ہیں۔ جن سے یہ مرض صرف دب جاتا ہے۔ اس کا ازالہ نہیں

ہوتا۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ یاد رکھئے! اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے نظام تعلیم کو کلیتہً بدل دیں اور اس کی جگہ ایسا نظام رائج کریں جس میں طالب علموں کو یہ بتایا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ وہ تعلیم کیوں حاصل کر رہے ہیں۔ اس تعلیم کا قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار سے کیا تعلق ہے۔ ان اقدار کی روشنی میں اس تعلیم کے ماحصل کو کس طرح نوع انسان کی بہبود کے لیے صرف کیا جائے گا۔ انسان، پاکستانی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح نافذ کیا جاتا ہے۔ اس کے انسانیت ساز نتائج کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب تک اس قسم کا نظام تعلیم رائج نہیں کیا جائے گا ہمارے نوجوانوں کا قلبی اضطراب اور ذہنی خلفشار بڑھتا جائے گا۔ خدا کرے کہ قوم کا سنجیدہ طبقہ اسطرف توجہ کرے۔

(۱۹۶۵ء)

باسمہٖ تعالیٰ

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

جلد دوم

روزمرّہ کے اُن معاملات کے
متعلق جن کی تفصیل فہرست
میں درج ہے

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور ۱۱

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	قرآنی فیصلے
جلد	دوم
ایڈیشن اوّل	۱۹۸۲ء
ایڈیشن چہارم	اکتوبر ۲۰۰۲ء
ناشر	طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور ۵۴۶۶۰
	Email: trust@toluislam.com · Web: www.toluislam.com
طابع	طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز۔ لاہور

No part of this book may be reproduced by any mechanical, photographic, or electronic process, or in the form of a phonographic recording, nor may it be stored in a retrieval system, transmitted, or otherwise copied for public and private use, without written permission except in the case of brief quotations embodied in critical articles and reviews.

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات

قرآنی فیصلے

جلد دوم

(مبنی بر سابقہ جلد چہارم و پنجم)

مضامین سابقہ جلد چہارم

مضمون — صفحہ

باب اول
قرآن مجید

- وحی کی کنہ و ماہیت--- وحی کیسے نازل ہوتی تھی؟ 17
- وحی کی آواز 18
- قرآن کو گا گا کر پڑھنا 20
- ناظرہ قرآن شریف 24
- بچوں کو قرآن شریف کیسے پڑھایا جائے 26
- قرآن کریم کی تعبیر میں اختلاف 27
- قرآن مجید کی حنفی تفسیر--- قدما کی کتب تفسیر میں کیا ہے؟ 29
- کیا قرآن کریم مکمل ضابطہ حیات ہے؟ 30
- ناسخ و منسوخ کا عقیدہ 31
- قرآن کریم میں تحریف کی نہایت خطرناک سازش 43
- جمع و تدوین قرآن مجید (روایات کی روشنی میں) 55
- i) کتاب المصاحف 56

مضمون	صفحہ
ii) قرآن کو حضورؐ نے جمع نہیں کیا' بلکہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جمع کرایا	56
iii) حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں قرآن کیونکر جمع کیا گیا	57
جمع قرآن کا کام حضرت صدیق اکبرؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے شروع کیا	58
حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن	60
عہد عثمانؓ میں قرآن کیسے جمع کیا گیا	60
قرآن کریم میں غلطیاں رہ گئیں	63
اختلاف قرات کا مفہوم	64
مودودی صاحب نے قصہ ہی تمام کردیا	67
قرآن مجید کی حفاظت (فرقہ اہل قرآن کی گمراہی)	70
قرآن کریم سے غفلت برتنے سے عمر ضائع ہوگئی (مولانا انور شاہ کشمیری' (دیوبندی) کا مخلصانہ اعتراف)	73
شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تنبیہہ (ترک قرآن)	75

باب دوم
نبوت' رسالت' احادیث

رسالت محمدیہ کا ثبوت	77
اطاعت رسولؐ کا مفہوم	85
ختم نبوت کی اصولی بحث	88
دین اللہ یا دین الرسول	91
رسولؐ اللہ پر (معاذ اللہ) جادو	92
معراج شریف کس سال اور کس ماہ میں ہوا	94
رسولؐ اللہ اور تفسیر قرآن مجید	95
روایات پرکھنے کا معیار قرآن مجید نہیں؟	96
روایات میں جنت کی تفصیل	97
ذبح حضرت اسماعیل علیہ السلام	100
حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور شیر خوار بچہ	102

مضمون | صفحہ

- نبوت نبی اکرمؐ کے خلاف یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش (حیات و وفات مسیح جیسے مسائل کی اہمیت) 104
- سیرت رسولؐ اللہ (مودودی صاحب کی تفسیر کے آئینے میں) 109

باب سوم
ہماری تاریخ

- ہمارا تاریخی ریکارڈ کہاں چلا گیا؟ 114

باب چہارم
تقدیر

- کیا دعا سے خدا کے فیصلے بدل سکتے ہیں؟ 116
- رضا اور مشیت میں فرق؟ 118
- ابتلاء یا آزمائش 119
- بے گناہوں پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ قصور کس کا ہے؟ 124
- بے وقت کی بارشوں سے کسان تباہ ہو جاتے ہیں- یہ کیوں؟ 125
- کیا ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے؟ 126
- اکتساب رزق کی صلاحیتوں میں فرق 133
  (تقدیر- من یشاء- سخر یا کا صحیح مفہوم)
- اس فرق کے نتائج کو کیسے مٹایا جائے- 142
  (اجرت کا نظریہ نظام سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے)
- صلاحیتوں کے فرق کی مزید وضاحت 145
- توکل علی اللہ کا "صوفیانہ" تصور 148

باب پنجم
تصوف

- کشف و الہام کی حقیقت (مرزا غلام احمد کے دعاوی) 150

مضمون	صفحہ
● "چھٹی حس" کیا ہوتی ہے؟	158
● پیش گوئیاں (علم غیب کسے حاصل ہوسکتا ہے؟)	160
● پاکستان میں پیری مریدی کا اس قدر زور کیوں ہے؟	162
● پیروں کی کرامات اور مزاروں کے غسل	166
● دیو بندی حضرات کی کرامات	168
● عملیات پر اعتقاد	166
● حضرت ابن عباسؓ کا آنکھیں بنوانے سے انکار	169
● حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجالس	169
● مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کی بیان کردہ کرامت	171

باب ششم
علوم سائنس اور قرآن

● سائنس کیسے مسلمان ہوگی؟	174
● سائنس اور ایمان بالغیب	177
● کیا زمین متحرک ہے؟	184
● عالم افلاک ـــــ خارجی کائنات (قرآن اور روایات کی روشنی میں)	185
● اسلامی کیلنڈر (شمسی یا قمری)	187
● کیا مردوں کی آنکھیں زندہ اندھوں کو لگائی جاسکتی ہیں؟	189

باب ہفتم
عائلی زندگی

● ترکہ میں مرد، عورت میں عدم مساوات؟	201
● نکاح کی غرض و غایت اور اس تقریب کی رسومات	201
● شادی کے لئے کس کی رضا مندی ضروری ہے؟	203
(محبت کی شادی (Love Marriage) کسے کہتے ہیں)	
● عورتوں کا زبردستی خاوند بنے رہنا؟	208

مضمون	صفحہ
● نابالغ لڑکی کی شادی	215
● دارالعلوموں کے نصاب میں فحاشی کی تعلیم	217
● بیویوں کو مارنا	220
● اہل کتاب کی عورتوں سے شادی پر پابندی(حضرت عمرؓ کے ایک حکم کی وضاحت)	222
● طلاق اور خلع	225
● طلاق کے قرآنی احکام	226

باب ہشتم
(فرقہ بندی)

● فرقے نہیں' مکاتب فکر (ابلہ فریبی کی نئی سازش)	228
● مزید وضاحت	229
● فرقہ اہل قرآن----- گمراہ ترین فرقہ	231
● "پرویزی فرقہ" کوئی نہیں	236
● فرقے کی پہچان کیا ہے؟	237

(مضامین سابقہ جلد پنجم)

پہلا باب
مذہبی پیشوائیت اور اسلام

● نگہ باز گشت	241
● "مولانا حضرات" کے اسلام کا نقشہ	241
● قرآن مجید کے نادان دوست	243
● کشف المحجوب میں وضعی روایات	245
● ڈاڑھی (سنت رسولؐ اللہ کا معاذ اللہ استہزاء)	247
● تصوف کی ریاضتیں	248
● مولانا احمد رضا خان مرحوم کی وصیت	249

مضمون	صفحہ
• کوا حلال ہے یا حرام	249
• جمعہ کی تعطیل	250
• اتباع سنت کا صلح کل طریق!	251
• دین اور مذہب میں فرق (روس میں مذہبی آزادی)	251
• ثابت کرو کہ قرآن وہی ہے؟	253
• ہمارا منشور قرآن ہے	254
• تقلیم اعضاء ناجائز ہے!	254
• شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح	255
• سود نہیں منافع	256

دوسرا باب
شرعی قوانین

• اصلاح مجرد قوانین سے نہیں ہوسکتی	257
• شرعی سزائیں کن حالات میں دی جاسکتی ہیں؟	258
• را بطۃ العالم الاسلامی کی تنبیہہ	263
• اسلام میں "ڈنڈے" کا مقام	264
• قوانین شریعت کا جائزہ	268
• شرعی قوانین کا تجزیہ	271
(۱) منشیات	273
(۲) سرقہ (چوری)	275
--- حرابہ (ڈکیتی' بغاوت وغیرہ)	277
(۳) زنا	277
--- جرم کا ثبوت	279
--- عینی شہادت	280
(۴) قذف (زنا کی تہمت)	281
(۵) لعان	282

مضمون	صفحہ
(۵) لعان	281
(۶) کوڑے کا تعین	282
● فتاویٰ عالمگیری میں شرعی سزائیں	287
(۱) ہاتھ کاٹنے کی سزا	289
(۲) زنا کی سزا	290
(۳) حد قذف	291
(۴) شراب نوشی کی سزا	291
● اورنگ زیب عالمگیر اور شرعی سزائیں	292
● رجم (سنگساری) کی سزا	294
● اسلامی قوانین کی تفاصیل میں اختلاف	301
● ان قوانین کی سند کیا ہے؟	302
● کوڑوں کی سزا (کوڑا کس قسم کا ہونا چاہئے؟)	303
● کوڑوں کی وضاحت (فقہی تحقیق)	304
● ------ عینی شاہد کی روئیداد	306
● فقہ کی کتاب الحیل	307
------ پہلی تدبیر	307
------ دوسری، تیسری اور چوتھی تدبیریں	308
● قوانین حدود کی ناکامی	309
------ اہل حدیث کی طرف سے	310
● اس ناکامی کی بنیادی وجہ	311
(۱) جرم زنا (اثبات کے شرائط)	312
(۲) قذف (زنا کی تہمت)	313
(۳) سرقہ (چوری)	313
(۴) شراب نوشی	314
● چور کا کٹا ہوا ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا؟	316

مضمون صفحہ

تیسرا باب
علماء کی باہمی سر پھٹول

- مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑے 318
- اہل حدیث اور فقہ حنفی 320
- ہم تو حرمین الشریفین کے امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے 321
- تبلیغی جماعت اور حنفیوں میں سر پھٹول 322
- فرقہ اہل قرآن 323
- مذہب میں مصلحت بنی 324
- غریب مسلمان کی میت 325

چوتھا باب
تحریک پاکستان اور علماء حضرات

(صرف دو ایک مثالیں)

- نیشنلسٹ علماء مسلم لیگ سے کیوں الگ ہوئے تھے 327
- مفتی محمود مرحوم اور نظریہ پاکستان 328
- مفتی محمود مرحوم نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا 329
- پاکستان قائم کرنے کا گناہ 329

پانچواں باب
اسلامی نظام و نظام مصطفیٰ

- نظام مصطفیٰ کی اصطلاح 330
- اسلامی نظام میں رسولؐ اللہ کا مقام 332
- قانون سازی کا سوال 335
- مرکز ملت کا مفہوم 336

مضمون | صفحہ

چھٹا باب
زکوٰۃ کا مفہوم اور نظام زکوٰۃ میں تبدیلیاں

- نصاب اور عشر کا قرآنی مفہوم ----- (نصاب میں تبدیلیاں --- تفصیلی بحث) 340
- زمین ----- (صفحہ ۳۹۷ بھی دیکھیں) 348
- زکوٰۃ کا مفہوم و نصاب (مسلسل) 349
  (۱) اس پر اہل حدیث کی طرف سے اعتراض 355
  (۲) زکوٰۃ کے مروجہ نظام کے خلاف اعتراضات 358

ساتواں باب
ارکان اسلام کے مقاصد

- حج کا مقصد 360
- حج بدل کی شرعی حیثیت 365
  قبیلہ خشعم کی عورت والی روایت 368
  حرف آخر 372
- روزوں کا مقصد (خدا کی کبریائی کا قیام) 374
  صلوٰۃ اور دیگر ارکان کے مقاصد پر نگہ بازگشت 381

آٹھواں باب
جنسیات

- غلام اور لونڈیاں 397
- کم از کم ایک لونڈی 397
- غلام سربراہ مملکت کا نیلام 397
- تمام فتنوں کی جڑ عورت 399
- نابالغ لڑکی سے خلوت 399
- جنت کی حوریں 399

مضمون	صفحہ
• جنت میں جنسیات	400

نواں باب

تحفظ ناموس رسالتؐ

• ہماری وضعی روایات کی چیرہ دستیاں---- (تفصیل پہلے باب میں)	401
• غیر مسلموں کی دریدہ دہنیاں	401
• حدیث کے متعلق پرویز صاحب کا مسلک	402

متفرق سوالات و جوابات

• انسان سے افضل مخلوق ----- (کیا انسان خدا کا خلیفہ ہے؟)	404
• کفن کے لئے نیا کپڑا------ (قل' جمعراتیں' چالیسواں وغیرہ رسومات)	404
• رشوت کس طرح ختم کی جاسکتی ہے؟	406
• "حاجیوں" کا کردار!	408
• زر' زمین اور زن سے متعلق مسائل اور ان کا قرآنی حل--	
زمین (صفحہ ۳۳۴ بھی دیکھیں)	409
زن	412
• **لم تقولون مالا تفعلون** کا صحیح مفہوم	415
• زنا کی سزا' رجم یعنی سنگساری------- (آیہ رجم کہاں گئی؟)	419
• کیا مشینوں کے ذریعے ذبیحہ حلال ہوگا؟	421
------- (اہل کتاب کے ہاں کا کھانا)	
• کیا انسان کی کوئی فطرت ہے؟	423
• کیا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت میں موجود ہے؟	425
• کیا ٹیکسوں کی چوری جائز ہے؟	426
• کیا انشورنس جائز ہے؟	428
• مرتد کی سزا------- (ہائی کورٹ کا قرآن کے مطابق فیصلہ)	431
• عوام کی آواز' خدا کی آواز نہیں ہوتی	433

مضمون	صفحہ
● حادثوں میں مرنے والے شہید نہیں ہوتے	434
● قرآن کریم اور زمانے کے تقاضے------ (ثبات و تغیر کا حسین امتزاج)	435
● مادر وطن کی اصطلاح غیر اسلامی ہے	437
● مہنجوڈارو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ	439
● وصیت کے حکم کی وضاحت	439
● جمعہ کی چھٹی	443
● دو قومی نظریہ---- قوم اور امت	444
● سیکولر نظام کسے کہتے ہیں؟	451
● مسجد اقصیٰ سے کون سی مسجد مراد ہے؟	454
● حج بدل کی حیثیت	457
● نفلی حج یعنی دوسرے حج کی شرعی حیثیت	458
● فطرانہ کی شرح کیا ہے؟	460
● معجزہ اور کرامت میں کچھ فرق نہیں!	461
● پیشہ وکالت	463
● ایرانی شہنشاہیت اور ولی عہدی	464
● "عزیر" کے متعلق غلط فہمی	466
● محنت کشوں کے مسائل ------ (اجرتوں کے نظام کی خرابی)	466
● تصویر کی شرعی حیثیت	468
● استیذان کی اہمیت ------ (اجازت لے کر آؤ)	470
● میں نے جماعت کیوں نہیں بنائی؟ میں نماز کیسے پڑھتا ہوں؟--- پرویز	472
امر بالمعروف و نہی عن المنکر	476
ایک اور پیچیدگی	479
ایک اور جماعت	479
یہ شرک ہے	481
میرا مشن	481
لوگوں کی تسکین کی خاطر ہی سہی	482

مضمون	صفحہ
لوگوں کی تسکین کی خاطر ہی سہی	482
نماز کیسے پڑھی جائے؟	482
ریسرچ	482
تواتر محسوس	482
احادیث	483
تاریخ	484
وہ ریکارڈ کہاں گیا؟	484
کنوینشن میں نماز	485
اصول اور تفصیلات	487
آخری سوال	488
جواب	

نگہِ بازگشت

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد قرآنی فکر اور تعلیم کی نشر و اشاعت ہے۔ اس کا آغاز (تحریکِ پاکستان کے دوران) ۱۹۳۸ء میں ہوا تھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء سے مسلسل جاری ہے۔ اس کا بنیادی گوشہ تو قرآنی حقائق اور معارف سے متعلق ہے جس کے لئے ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے بڑی بڑی ضخیم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ہماری روز مرّہ کی زندگی میں بے شمار ایسے معاملات آتے ہیں جنہیں غلطی سے اسلامی سمجھا جاتا ہے' لیکن درحقیقت وہ اسلامی ہوتے نہیں۔ ان کے متعلق ہمیں عوام کی طرف سے سوالات موصول ہوتے تھے اور ان کے جواب طلوعِ اسلام میں شائع کئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حتّٰی کہ یہ تقاضا ہوا کہ ایسی اہم معلومات کو طلوعِ اسلام کے اوراق میں محبوس رکھنے کے بجائے' ان کا الگ مجموعہ شائع کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ یہ مجموعہ "قرآنی فیصلے' جلد اول" کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جوئے رواں کی طرح جاری رہا اور اس کے مجموعے علی التواتر شائع ہوتے رہے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۷۹ء میں اس کی چوتھی جلد شائع ہوئی اور اب پانچویں جلد پیشِ خدمت ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم نے اس سلسلہ کا عنوان "ہماری بصیرت کے مطابق-- قرآنی فیصلے" رکھا ہے۔ یہ تخصیص سمجھنے کے قابل ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جن کے متعلق قرآنِ مجید میں بہ نصِ صریح کہا گیا ہے کہ وہ جائز ہیں یا ناجائز۔ ان میں سے جب کسی کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ ناجائز ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اسے قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں ناجائز قرار دیا ہے۔ لیکن اگر قرآنِ مجید نے ایسا نہیں کہا تو اس کے متعلق اس کے دیگر مقامات پر غور و تدبّر کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ اس کا منشا کیا ہے۔ اس کے متعلق کہا جائے گا کہ "ہماری بصیرت کی رُو سے قرآن کا یہ فیصلہ نظر آتا ہے"۔ایسے فیصلوں کے متعلق ہر صاحبِ علم و بصیرت کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ از خود غور و تدبّر کے بعد دیکھ لے کہ قرآنِ مجید کا منشا کیا ہے۔ ان ہر دو اقسام کے فیصلوں میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

یہ مجموعے' بہ ہیئتِ مجموعی' اس قدر جامع ہیں کہ جن کے پاس یہ موجود ہیں' انہیں کسی سوال کے پوچھنے کی بمشکل ضرورت پیش آتی ہے۔ جن کے پاس یہ مجموعے نہیں' ان کے سوالات کے جواب میں انہیں بتا دیا جاتا ہے کہ اس کے متعلق فلاں جلد میں وضاحت ملے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان سوالات کا سلسلہ خود ہی کم ہوتا جا رہا ہے۔ بایں ہمہ' زندگی کے تقاضے ختم نہیں ہوسکتے۔ جب کوئی نیا تقاضا سامنے آتا ہے تو اس کے متعلق ہم سے پوچھا جاتا ہے۔ اس طرح سوال اور جواب کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے' اگرچہ اس کی رفتار میں کمی آجاتی ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسا سوال آئے جس کا جواب آپ کو ان جلدوں میں نہ ملے' تو اسے ہم سے دریافت فرمالیں۔

اس سلسلے کو شروع کئے کم و بیش تیس سال ہوگئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دوران میں جو کچھ ہم نے لکھا

ہے اس میں کہیں تضاد نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد قرآنِ کریم ہے اور قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں' کوئی اختلاف نہیں (۴/۸۲)۔ اگر ان مجموعوں میں آپ کو کسی مقام پر کوئی جھول' کوئی سلوٹ' کوئی سقم محسوس ہو' تو اسے ہماری فکر کی کوتاہی تصور فرمایئے۔ قرآن کا دامن اس قسم کے اسقام سے بہت بلند ہے۔ انسانی کوششوں میں سہو اور غلطی کا امکان ہوتا ہے' خدا کی کتاب میں نہیں۔

آخر میں ایک اور بات۔ طلوعِ اسلام کے خلاف یہ الزام بڑی شدت سے عائد کیا جاتا ہے کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔ اس کے لٹریچر میں آپ دیکھیں گے کہ اس کے نزدیک کسی حدیث کے پرکھنے کا معیار قرآنِ مجید ہے۔ ہم صرف اسی حدیث (روایت) کے صحیح ہونے سے انکار کرتے ہیں جو قرآن کے خلاف جاتی ہو۔۔۔۔ ان مجموعوں میں بھی آپ ہمارے اس معیار کو کارفرما دیکھیں گے۔ اس سے آپ اندازہ لگالیں گے کہ یہ انکارِ حدیث نہیں' بلکہ حدیثوں کے پرکھنے کا صحیح معیار ہے۔

ان تصریحات کے ساتھ یہ مجموعہ اربابِ فکر و دانش کے پیش خدمت ہے۔

والسلام

ناظم' ادارۂ طلوعِ اسلام'

گلبرگ نمبر ۲ لاہور

نومبر ۱۹۸۲ء

طباعتِ جدید

حصہ اوّل (مبنی بر سابقہ جلد اوّل' دوم اور سوم) کی طباعتِ نو کے وقت (۱۹۸۷ء میں) یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ تمام مطبوعات کا سائز ایک کر دیا جائے۔ چنانچہ حصہ اوّل بڑے سائز میں طبع کیا گیا تھا۔ اس وقت یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ جب جلد چہارم اور پنجم کی طباعتِ نو کا مرحلہ آئے گا تو اس کا سائز بھی بڑا کر دیا جائے گا۔ اس وعدہ کے مطابق قرآنی فیصلے' حصہ دوم (مبنی بر سابقہ جلد چہارم و پنجم) بھی بڑے سائز پر حاضرِ خدمت ہے۔ بایں دعا کہ اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں یہ ہدایت نصیب کریں کہ ہم اپنی زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کے لئے قرآن کریم کی بارگاہِ عالیہ کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اس کتابِ عظیم کے نازل کرنے والے اللہ کا فرمان ہے کہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ

بلاشبہ یہ قرآن (سفرِ زندگی میں) اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی اور توازن بدوش ہے۔

والسلام

پروفیسر ڈاکٹر زاہدہ درانی

انتظامی سربراہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور

دسمبر ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول

قرآنِ مجید

۱- وحی کی کُنہ و ماہیت

سوال : وحی کی کُنہ و ماہیت کیا ہوتی ہے- یہ خدا کی طرف سے کیسے نازل ہوتی تھی- نبیؐ کو کس طرح ملتی تھی؟

جواب : ایک اصولی بات سمجھ لیجئے- حصول علم کا ایک ذریعہ فکر انسانی (Human Intellect) ہے- اس کے متعلق ہر شخص علیٰ قدر وسعت جانتا ہے کہ یہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے اور اس کی نوعیت' ماہیت اور کیفیت کیا ہوتی ہے' اس لئے ان امور کے متعلق بحث بھی کی جاسکتی ہے اور کسی کے دعویٰ کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے-

اس کے برعکس' علم کا ایک ذریعہ' وحی ہے جس میں انسانی فکر اور کدو کاوش کو کوئی دخل نہیں ہوتا- بلکہ یوں کہئے کہ یہ وہ علم ہے جسے حاصل نہیں کیا جاسکتا' یہ خدا کی طرف سے اس کے کسی منتخب بندے کو براہ راست ملتا تھا' کوئی غیراز نبی اس میں شریک نہیں ہوسکتا تھا-

اب آپ سوچئے کہ جس علم میں کوئی غیراز نبی شریک تک نہیں ہوسکتا' اس علم کے متعلق غیراز نبی انسانوں کا بحث کرنا کہ اس کی کنہ و حقیقت کیا ہوتی ہے' وہ نبی کو کیسے ملتا تھا' اس میں نبی کی اپنی پوزیشن کیا ہوتی تھی' ان انسانوں کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ غیراز نبی انسانوں کا ان امور کے متعلق گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے دو اندھے یہ بحث کر رہے ہوں کہ سرخ رنگ کیسا ہوتا ہے؟

یہ ہے' ہمارے عزیز! اس مسئلہ میں غیراز نبی انسانوں کی پوزیشن' خواہ وہ کتنے ہی بڑے مفکر اور متکلم کیوں نہ ہوں!

خدا کی یہ وحی' آخری مرتبہ' حضور نبی اکرمؐ کو ملی جسے حضورؐ نے من و عن بغیر کسی قسم کی آمیزش یا تبدیلی کے دوسرے انسانوں تک پہنچا دیا- یہ وحی خدا کے الفاظ میں' قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر ہمارا ایمان ہے- ہم اس وحی خداوندی کو اپنے علم و عقل و فکر کی رو سے سمجھ سکتے ہیں' لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ یہ رسولؐ اللہ پر نازل کس طرح ہوئی تھی' نہ ہی کوئی غیراز نبی اسے جان سکتا ہے-

باقی رہا یہ کہ ہم یہ ثابت کیسے کرسکتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام ہے' انسان کا نہیں- سو اس کے لئے خود اس وحی کا دعویٰ موجود ہے کہ انسانی فکر اس کتاب کی مثل' کوئی کتاب تخلیق نہیں کرسکتی- اس دعویٰ کو علم و بصیرت' عقل و فکر اور انسانی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ثابت کرنا ہمارا فریضہ ہے- وحی' انسانی فکر کی تخلیق نہیں لیکن اس کی

پیش کردہ تعلیم کا سمجھنا سمجھانا اور اس کے دعاوی کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانا' انسانی فکر کا کام ہے۔
یہ ہے ہمارے نزدیک' اس باب میں قرآن کی رو سے صحیح پوزیشن!

۲۔ وحی کی آواز

کراچی سے ایک ماہ نامہ شائع ہوتا ہے' "البلاغ"۔ اس کے مدیر محترم مفتی محمد شفیع صاحب (اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ نومبر ۱۹۷۶ء) کے صاحبزادہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس ماہنامہ کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۵ء میں' حکیم محمود احمد ظفر صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے' جس کا عنوان ہے۔۔۔۔۔ وحی کی آواز۔ اس میں وہ مختلف روایات کی سند سے' یہ بتاتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ پر وحی نازل ہوتی تھی' تو مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کبھی گھنٹے کی سی آواز' کبھی مکھیوں کے گنگنانے کی سی۔ ان آوازوں کو اہل مجلس بھی سنتے تھے۔ یہ آواز کس کی ہوتی تھی' اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

(۱) پہلا مسلک جو کہ سب سے نمایاں ہے' امام بخاریؒ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کی آواز ہوتی تھی' جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی صحیح میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں' جس میں صاف الفاظ ہیں۔

اذا یکلم اللہ بالوحی۔۔ جب اللہ تعالیٰ وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ علاوہ ازیں' آپ نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں کئی احادیث کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ کے لئے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ ایسا ہی ابن عربیؒ نے بھی لکھا ہے۔

(۲) دوسرا مسلک اس بارے میں یہ ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پیروں کی ہوتی تھی۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی اور دوسرے کئی علماء کا یہی مسلک ہے۔
(فتح الباری' جلد ۱ ص ۱۶)

(۳) تیسرا مسلک اس بارہ میں یہ ہے کہ یہ فرشتہ کی زبان کی آواز ہوتی تھی۔ کئی شارحین بخاری اور جلیل القدر محدثین اس کے بھی قائل ہیں۔
(واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

اس کے بعد وہ اس کی "فلسفیانہ تشریح" کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

آواز کے اس تیز احساس اور خفیف احساس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ وحی خواب و خیال سے بالاتر ایک محسوس شئے ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ اس کی بے کیف آواز سے بھی مجلس میں بیٹھنے والے ادراک کرلیتے ہیں اور جو جاہل وحی کو (العیاذ باللہ) محض

ایک دماغی تخیل سمجھتے ہیں' وہ نبوت کی حقیقت سے جاہل اور نا آشنا ہیں۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر کو وحی کی اس صورت میں جو آواز سنائی دیتی تھی وہ تو گھنٹے کی آواز کی طرح اور بقول سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ شہد کی مکھیوں کی گنگناہٹ کے مشابہ ہوتی تھی۔ اس سے آپ کو احکام الٰہی کا پتہ کیسے چلتا تھا' اس سوال کا جواب شاید زمانہ ما قبل میں مشکل ہوتا' لیکن عصر جدید میں ٹیلیگراف کی ایجاد نے اس سوال کے جواب کو آسان ترین بنا دیا ہے۔ تار گھر میں جا کر دیکھئے۔ آپ کو وہاں صرف ٹک ٹک کی آواز سنائی دے گی جس کو آپ فضول اور لایعنی سمجھیں گے' لیکن تار کلرک جو اس فن سے واقف ہے' اسی آواز کو سن کر تار لکھتا جاتا ہے۔ آواز ایک ہی ہے لیکن ایک کے نزدیک با معنی اور دوسرے کے نزدیک بے معنی۔ اسی طرح بلا تشبیہ اگر وحی کی آواز کوئی دوسرا سن بھی لے تو وہ اس کی کیفیت کو اپنے علم کے لحاظ سے اپنے الفاظ میں بیان تو کر سکتا ہے' لیکن اس بسیط اور بے جہت آواز' کلام الٰہی کو اخذ نہیں کر سکتا۔ یہ کلام صرف اور صرف ایک نبی اور رسول ہی سمجھ سکتا ہے' جس پر وحی الٰہی نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری قدس سرہ فرماتے ہیں۔

وصلصلته الجرس ههنا كنقرات التلغراف لاداء الرسالته۔

(مشکلات القرآن ص۱۲۴)

اور گھنٹہ کی آواز ٹیلیگراف کی ٹک ٹک کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لئے کی جاتی ہے۔

طلوع اسلام۔ "وحی کی آواز" اور اس کی اس تشریح کے بعد سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر رہ جائے' اور کیا کرے۔ مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے نہ قرآن ہوتا ہے' نہ ہی عصر حاضر کے علوم اور نہ ہی یہ کبھی اس پر غور کرتے ہیں کہ معاندین اسلام نے کس مقصد کے لئے اس قسم کی روایات وضع کی تھیں' جنہیں اب بطور سند پیش کیا جاتا ہے:۔

وحی کی کنہ و حقیقت کے متعلق کوئی غیر از نبی کچھ نہیں جان سکتا' نہ ہی اسے معلوم کر سکتا ہے کہ اس کے نزول کی کیفیت کیا تھی۔ لیکن قرآن کریم نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی ہے کہ **فانه نزله علی قلبک** (۲/۹۷) جبریل اسے بحکم خداوندی' قلب نبویؐ پر نازل کرتا تھا۔ دوسری جگہ ہے **نزل به الروح الامین علی قلبک** (۲۶/۱۹۳) روح الامین اسے لے کر قلب محمدیؐ پر نازل ہوا۔ اب ظاہر ہے کہ جو علم کسی کے قلب میں اتارا جائے' اس کی آواز کیسی' اور کسی دوسرے کو اس کا علم و احساس ہونے کا سوال کیا؟ یہ تو رہی ان حضرات کی قرآن کریم سے بے خبری! باقی رہا علم' سو یہ کہتے ہیں کہ:۔

وحی' خواب و خیال سے بالاتر ایک محسوس شے ہے۔

انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ جب "خواب و خیال" بھی محسوس شے نہیں ہوتے تو ان سے بالاتر' "وحی" محسوس شے کیسے ہوسکتی ہے؟ وحی کو خدا نے عالم امر سے متعلق بتایا ہے جب کہا ہے **وکذالک اوحینا الیک روحا من امرنا** ۴۲/۵۲- اور یہ ظاہر ہے کہ عالم امر' عالم خلق (یعنی عالم محسوسات) سے بالکل الگ اور غیر مرئی اور غیر محسوس ہے۔ لہٰذا' وحی محسوس شے کیسے ہوسکتی ہے۔ اسے محسوس شے قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہماری مادی دنیا سے متعلق ہے۔ اس سے وحی کا منفرد تصور ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اسے:

(۱) خدا کی ایسی آواز قرار دینا جسے اہل مجلس بھی سن لیتے تھے' خود خدا کے متعلق جو تصور سامنے لاتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) اسے فرشتہ وحی کے پیروں کی آواز یا اس کی زبان کی آواز کہنا' خود ملا ئکہ (روح الامین) کا جو تصور پیش کرتا ہے' وہ بھی ظاہر ہے۔

اور اسے "ٹیلیگراف کی ٹک ٹک" سے تشبیہ دے کر' وحی کو جس مقام پر لے آیا گیا ہے' اس کے تو خیال تک سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ جب وحی کے متعلق آپ کی یہ تفصیلات اور تشبیہات' غیر مسلم اہل علم و دانش کے سامنے جاتی ہیں تو وہ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق کیا خیال قائم کرتے ہیں۔ اور جب اس قسم کی باتیں خود ہمارے اپنے ہاں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے آتی ہیں تو وہ کس طرح اسلام سے برگشتہ ہی نہیں' متنفر ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا غرض! ان کا اسلام تو بس اتنا ہی ہے کہ ان روایات کو تنقید کی حد سے بلند سمجھا جائے اور جو "بدبخت" ان پر دعوت غور و فکر دے' اسے منکر حدیث قرار دے کر' اس پر کفر کا فتویٰ عائد کردیا جائے اور اسے دین کی سب سے بڑی خدمت قرار دے کر' قوم کے سر پر احسان دھرا جائے۔ (مارچ ۱۹۷۵ء)

۳۔ قرآن کو گا گا کر پڑھنا

سوال : گزشتہ چند سالوں سے یہ معمول ہو رہا ہے کہ مختلف اسلامی ممالک سے قاریوں کے گروہ آتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں ان کی قرات کی محفلیں جمتی ہیں۔ وہ گا گا کر قرآن سناتے ہیں اور سامعین عرجبا اور سبحان اللہ کے نعروں سے داد دیتے ہیں۔ وہ چلے جاتے ہیں تو ان کے ریکارڈ' ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اسلام میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا؟

جواب : اس سوال کے جواب تک آنے سے پہلے' تمہیداً" کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم پر غور و فکر کرکے' اس پر عمل کرنے والی جماعت مومنین نے دنیا میں جو محیر العقول انقلاب برپا کیا اور اس سے مفاد پرست گروہوں' ملوکیت' مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری پر جو زد پڑی' وہ تاریخ انسانیت کا ایک عدیم النظیر باب ہے۔ ان گروہوں نے محسوس کرلیا کہ عربوں جیسی قوم میں--- جن کے متعلق ان کی ہمسایہ قومیں یہ کہہ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا کرتی تھیں

کہ "زشیر شتر خوردن و سوسمار"--- اس قسم کی حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرنے کی موجب یہ کتاب ہے- جب تک اس قوم کو اس کتاب سے بیگانہ نہ کر دیا جائے گا' ان کی مفاد پرستیاں محفوظ نہیں رہ سکیں گی- چنانچہ مسلمانوں کو اس کتاب عظیم--- زندگی کے اس ضابطہ خداوندی- سے بیگانہ بنانے کے لئے انہوں نے قسم قسم کی چالیں چلیں اور طرح طرح کی سازشیں کیں- کہیں اس کی محفوظیت کے متعلق دلوں میں شکوک پیدا کرنے کے لئے یہ قصہ وضع کیا گیا کہ رسولؐ اللہ اسے ایک مرتب کتاب کی شکل میں دے کر گئے ہی نہیں تھے- یہ ہڈیوں' ٹھیکریوں اور کھجور کے پتوں وغیرہ پر لکھا ہوا منتشر پڑا تھا- اسے بعد میں مل جل کر کتابی شکل دی گئی اور وہ بھی اس طرح جس میں شکوک و شبہات کے سیکڑوں قرائن موجود ہیں-

کہیں کہا گیا کہ شروع میں اس کے حروف پر نقطے ہی نہیں تھے- بعد میں لوگوں نے اپنے اپنے قیاس سے ان پر نقطے (اور اعراب) لگائے- (نقاط اور اعراب کے فرق سے معانی میں جس قدر فرق پڑ جاتا ہے' عربی دان حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں)-

کہیں اس کی معنوی حیثیت کے متعلق کہا گیا کہ یہ بڑی مجمل کتاب ہے' جس سے کوئی بات متعین طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی- اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے بیسیوں قسم کے خارجی سہاروں کی ضرورت ہے-

کہیں کہا گیا کہ اس میں سیکڑوں آیات ایسی ہیں جنہیں پڑھا تو جاتا ہے لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے- دوسری طرف' بعض آیات ایسی بھی ہیں جو موجودہ قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے-

کہیں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ قرآن کے معانی سمجھنے کی ضرورت نہیں' اس کے الفاظ دہرا لینے سے ثواب مل جاتا ہے- اگر کسی کو اس کے الفاظ بھی پڑھنے نہ آتے ہوں تو وہ اس کی سطروں پر انگلیاں پھیر لیا کرے- اس سے بھی تلاوت کا ثواب حاصل ہو جاتا ہے- بغیر سمجھے نماز میں قرآنی سورتوں کا پڑھ لینا' تراویح میں قرآن شریف ختم کرنا---- جبکہ نہ پڑھنے والا اس کا مطلب سمجھے' نہ سننے والے-- عزیزوں کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن خوانی--- سب اسی عقیدہ کے برگ و بار ہیں-

اس سے آگے بڑھے تو ارباب طریقت نے یہ نظریہ قائم کیا کہ قرآن کا حقیقی مطلب' اس کے الفاظ کے لسانی مفہوم سے سامنے نہیں آسکتا- اس کے باطنی معانی ہیں جو ارباب طریقت کے ہاں سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں- قرآن کا مفہوم ان باطنی معانی کی رو سے سمجھ میں آسکتا ہے---- ان باطنی معانی کی ایک جھلک سامنے آجائے تو انسان ورطہ حیرت میں گم ہو جائے کہ وہ کس طلسم ہوش ربا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے-

اس سے یہ عقیدہ وضع ہوا کہ قرآنی حروف و الفاظ کے ورد' وظیفہ' نقش' تعویذ سے وہ کام لئے جاسکتے ہیں جن کا حصول دنیاوی اسباب و ذرائع سے ممکن نہیں--- اور طرفہ تماشا یہ کہ ان کا نام "اعمال قرآنی" رکھ دیا گیا اور ایسا کرنے والے "عامل" کہلانے لگے-

اور اگر کسی کے دل میں اس کے الفاظ کے معانی کو پیش نظر رکھ کر پڑھنے کا خیال پیدا ہوا تو اس سے یہ کہہ دیا

گیا کہ قرآن میں غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا جو مطلب سمجھا جاسکتا تھا' وہ سمجھا جاچکا ہے۔ تم اسلاف کے بتائے ہوئے مفہوم سے ذرا بھی اختلاف نہیں کرسکتے۔

یہ (اور اس قسم کے دیگر کئی ایک) حربے تھے جو مسلمانوں جیسی انقلاب آفریں جماعت کو قرآن سے دور اور بیگانہ رکھنے کے لئے وضع اور استعمال کئے گئے۔ نتیجہ اس کا ہمارے سامنے ہے۔ وہی قوم جس نے اسی کتاب کی بدولت' ہر باطل نظام کا تختہ الٹ کر رکھ دیا تھا آج' انہی نظاموں کے علمبرداروں کے دروازوں پر بھیک مانگتی دکھائی دے رہی ہے۔

انہی سازشوں میں ایک سازش یہ بھی تھی کہ قرآن کو گا گا کر پڑھا جائے۔ گانے کا تعلق انسانی جذبات سے ہے۔ آپ کسی اعلیٰ موسیقی کو سنئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دوران میں نہ گانے والا' عقل و فکر کی رو سے کسی بات کی طرف دھیان دے سکنے کے قابل ہوگا' نہ سننے والے۔۔۔ اگر گانے والے کا دھیان ذرا بھی کسی اور طرف چلا جائے تو اس کا راگ بگڑ جاتا ہے۔ اور اگر سننے والے کچھ سوچنے لگ جائیں تو وہ موسیقی کی لذت سے بے کیف ہوجاتے ہیں۔ موسیقی میں' سب جذبات میں گم ہوجاتے ہیں اور اس دوران میں ان کی عقل و فکر کے (SWITCH OFF) ہوتے ہیں۔ موسیقی کا مقصد ہی یہ ہے کہ جب انسانی ذہن مسلسل سوچ بچار سے تھک جائے' تو اسے کچھ وقت کے لئے سکون مل جائے۔ لہٰذا' کسی چیز کو گا کر پڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے متعلق غور و تدبر سے کام نہیں لے سکتا۔ آپ اس کا خود تجربہ کرکے دیکھ لیں۔ آپ کسی عبارت کو جھوم جھوم کر' گا گا کر پڑھیں' آپ دیکھیں گے کہ آپ جذبات سے لذت اندوز تو ہوں گے' لیکن (اس دوران میں) اس کے مطالب و معانی پر غور و فکر نہیں کرسکیں گے۔ اس کے برعکس' آپ اسے نثر کی طرح پڑھیں (یا کسی کو پڑھتے ہوئے سنیں) خواہ آواز سے اور خواہ آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموشی سے۔۔۔۔ آپ اس کے مطالب کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں گے۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کی کتاب سے (جیسی کچھ بھی وہ رہ جاتی ہے) اس کے معتقدین کا تعلق جذباتی رہ جاتا ہے۔ وہ ان کے لئے عملی زندگی کا ضابطہ نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ "مذہبی کتابوں" کو عام طور پر گا کر پڑھا جاتا ہے۔۔۔ مندروں میں ویدوں کے منتر' گردواروں میں گروبانی کے شبد۔۔ گرجاؤں میں "خداوندی گیت" صوموں میں غزل الغزلات وغیرہ' گا کر پڑھی جاتی ہیں اور اس طرح عقیدت مندوں کے "جذبات کی تسکین" کا سامان بہم پہنچا دیا جاتا ہے۔ اسی جذباتی تسکین کا نام روحانی اطمینان یا ایشور پرماتما سے لو لگنا رکھ دیا جاتا ہے۔ جب اس کی شدت سے جذبات بے قابو ہوجاتے ہیں تو اس کا مظاہرہ قوالی کی محفل (سماع) میں' وجد اور رقص کی شکل میں ہوتا ہے۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ بنانے (اور اس طرح دین کو مذہب کی سطح پر لے آنے) کے لئے جو سازشیں ہوئیں' ان میں ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کو گا گا کر پڑھا جائے۔ پھر جس طرح اس قسم کی ہر سازش کو تقدس کا لبادہ اوڑھا دیا گیا' فن قرات پر بھی تقدس کی چادر چڑھا دی گئی۔

آپ نے اس پر غور کیا ہوگا کہ قرآن کریم نے (فاتحۃ الکتاب کے بعد) سب سے پہلی سورت کے ابتدائی الفاظ میں اپنا تعارف

ذالک الکتاب

کہہ کر کرایا ہے۔ اس نے کہا یہ ہے کہ یہ ایک کتاب (ایک ضابطہ زندگی) ہے' اسے کتاب ہی کی حیثیت دینا۔ اس سے الگ کچھ اور نہ بنا دینا۔ اس کے بعد اس میں بار بار دہرایا گیا ہے' کہ یہ واضح عربی زبان کی ایک کتاب ہے جس میں جو کچھ کہا گیا ہے' نہایت نکھرے اور ابھرے ہوئے انداز میں کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں' التباس نہیں' کوئی مشکوک بات نہیں' کوئی دعویٰ ظن و قیاس پر مبنی نہیں۔ پھر' اس میں بیان کردہ حقائق پر غور و فکر کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ کیا ایک اچھی کتاب کی ایسی ہی خصوصیات نہیں ہوتیں؟ (اور قرآن تو صرف ایک اچھی کتاب ہی نہیں' بے مثل کتاب ہے)۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ کیا ہم نے اسے کتاب ہی سمجھا ہوا ہے' یا کچھ اور بنا رکھا ہے؟ آپ سوچئے کہ:۔

(۱) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کتاب کا ایک لفظ بھی آپ کی سمجھ میں نہ آیا ہو' اور اس کے باوجود آپ اسے پڑھتے یا سنتے رہیں؟ آپ کبھی ایسا نہیں کرتے۔

(۲) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی کتاب کے الفاظ (یا جس فن سے وہ متعلق ہے اس کی اصطلاحات) کی رو سے' اس کے جو مطالب سامنے آتے ہوں' آپ انہیں مسترد کردیں اور یہ کہیں کہ ان الفاظ کے کچھ باطنی معانی ہیں اور انہی سے اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے؟

(۳) کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ کسی ڈاکٹری کی کتاب میں مندرج نسخوں کو کاغذ پر لکھ کر' اور اسے گھول گھول کر مریضوں کو پلائیں۔ یا انجینئری سے متعلقہ کتاب کے فارمولوں کو ٹھیکری پر لکھ کر' گرتے ہوئے پلوں کے نیچے دبا دیں کہ اس سے وہ پل مضبوط ہو جائیں گے؟

(۴) کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ آپ ضابطہ فوجداری کی شقوں کو گا گا کر پڑھیں' اور کمرۂ عدالت میں جج کے سامنے' بھیرویں میں الاپیں کہ زانی مرد ہو یا عورت' انہیں سو سو کوڑوں کی سزا ملنی چاہئے (۲/۲۴)۔

جب آپ کسی اور کتاب کے ساتھ یہ کچھ نہیں کرتے' تو قرآن کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ اس نے خود اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ---- یہ ایک کتاب ہے---- اس تعارف سے اس کا مقصد یہ کہنا تھا کہ یہ تمہارے لئے زندگی کی راہ نمائی کے لئے کتاب ہے۔ اسے کتاب کی طرح سمجھو' اس پر غور و فکر کرو اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کرو۔

آپ سوچئے کہ کیا ہم نے اسے یہی حیثیت دے رکھی ہے؟ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ

(۱) جس کثرت' التزام اور اہتمام سے اس کتاب کو پڑھا جاتا ہے'

(۲) جس قدر روپیہ اس کے الفاظ کے دہرانے پر صرف کیا جاتا ہے'

(۳) جس قدر دولت' وقت' توانائی' اس کی آرائش و زیبائش کے لئے وقف کی جاتی ہے' کیا دنیا کی کسی اور کتاب

کے متعلق بھی ایسا کیا جاتا ہے؟ اور اس کے بعد اس حقیقت کو بھی سامنے لائیے کہ
اس کتاب کے مفہوم و مقصود سے جس قدر ہم محروم ہیں'
کیا اس کی مثال کہیں اور بھی مل سکتی ہے؟
اور پھر سوچئے کہ جن لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ **(اولئک) فحبطت اعمالھم فلا نقیم لھم یوم القیمۃ وزنا** (۱۸/۱۰۵)--- یہ وہ ہیں جن کے اعمال اس قدر بے نتیجہ رہتے ہیں کہ ان کا وزن کرنے کے لئے' قیامت میں میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن **وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا** (۱۸/۱۰۴) وہ بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں--- کیا ہمارا شمار انہی میں نہیں ہوتا؟ (ستمبر ۱۹۶۸)

۴۔ ناظرہ قرآن شریف

نوٹ : اس ضمن میں قرآنی فیصلے' حصہ اول' صفحہ ۲۶۱' ایڈیشن سوم مارچ ۹۲ء کو بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

جب قومیں سوچنا چھوڑ دیتی ہیں تو ان کے فیصلوں کے محرک' جذبات ہوتے ہیں' فکر و شعور نہیں ہوتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے فیصلوں کو نظر بظاہر دیکھئے تو وہ بڑے خوش آئند دکھائی دیں گے لیکن ذرا گہرائی میں جا کر ان پر نگاہ ڈالئے تو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں بالعموم اسی قسم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ان کی تازہ مثال حکومت کا یہ فیصلہ ہے کہ اسکولوں میں بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھایا جائے۔ نظر بظاہر دیکھئے تو یہ فیصلہ یکسر مستحق تبریک و تہنیت اور در خور تعریف و توصیف قرار پائے گا۔ لیکن آیئے ذرا سطحی جذبات سے نیچے اتر کر اس کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ "ناظرہ" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ دہرائے جائیں' ان کے معانی' مفہوم' مطلب نہ سمجھا جائے۔

الفاظ ذریعہ ہوتے ہیں متکلم کے ما فی الضمیر کو' مخاطب کو سمجھانے کا۔ الفاظ سے کلام مرتب ہوتا ہے اور جب اس کلام کو صفحہ قرطاس پر محفوظ کرلیا جائے' تو ان صفحات کے مجموعہ کو کتاب کہا جاتا ہے۔ لہٰذا' کتاب اس کلام کا مجموعہ ہوتا ہے' جس سے ایک شخص اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

لیکن ایک اور چیز ہے جسے سحر یا جادو (MAGIC) کہتے ہیں۔ اس میں بھی الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں' لیکن ان الفاظ کے معانی کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے معانی سمجھنے کے نہیں۔ ان کی کچھ تاثیر ہے اور وہ تاثیر ان الفاظ کے دہرانے یا لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن کریم ایک کتاب ہے۔ اس کے بھیجنے والے نے' افتتاحیہ (سورۂ فاتحہ) کے بعد اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ **ذالک الکتاب**--- یہ ایک عظیم کتاب ہے اور پھر اس میں بار بار تاکید کی کہ اسے سوچ سمجھ کر پڑھو۔ اس کے مطالب و مقاصد پر غور و فکر کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ کتاب تمہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ قرآن کریم نے جو بار بار کہا ہے کہ یہ "کتاب" ہے تو اس سے اس نے اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ اسے سحر (جادو) نہ سمجھ لینا کہ اس

کے الفاظ دہراتے جاؤ اور سمجھ لو کہ ان الفاظ کے تاثیر ہے۔ انہیں دہرانے سے وہ تاثیر پیدا ہو جائے گی۔ یہ ایک کتاب ہے' اس کے الفاظ کے معانی ہیں۔ اسے پڑھنے سے مقصد یہ ہے کہ اس کے معانی سمجھے جائیں' اس کا مطلب اور مفہوم سمجھا جائے۔

جب امت کی گاڑی صحیح پٹڑی پر جا رہی تھی تو قرآن مجید کو کتاب ہی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ وضع کرلیا گیا کہ اس کے الفاظ میں "برکت" ہے اور انہیں دہرانے سے (سمجھنے سے نہیں بلکہ محض دہرانے سے) "ثواب" حاصل ہوتا ہے اور ثواب بھی اس قدر کہ اس کے ایک ایک حرف کے بدلے دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ مثلاً" الم سے تیس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے اور چونکہ مذہب میں (دین میں نہیں بلکہ مذہب میں) "اعمال" سے مقصد حصول ثواب ہوتا ہے تاکہ اس طرح آخرت میں نجات حاصل ہوجائے' اس لئے قرآن کریم کے الفاظ کو بہ غرض حصول ثواب' دہراتے چلے جانا' امت کا عام شعار بن گیا۔ اس طرح یہ قوم' اس کتاب کو مسلسل اور متواتر پڑھتے رہنے کے باوجود' اس کے مطالب و مقاصد سے محروم ہوگئی۔ اور یوں یہ صحیفہ "کتاب" کے زمرے سے نکل کر "سحر" کے دائرہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد' اس کی آیات کے ورد اور وظائف ہونے لگے' تعویذ لکھے جانے لگے اور اس طرح اسے سچ مچ کا "سحر" بنا دیا گیا حتی کہ اب "اعمال قرآنی" سے مراد ہی قرآنی آیات کے وظائف و تعویذ ہوتے ہیں--- اور ایسا کرنے والے کو "عامل" کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کوئی ایسی کوشش یا اقدام' جو قرآن کو "کتاب" کے زمرہ سے نکال کر "سحر" کی (CATEGORY میں لے جائے' غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی دیوار پر ایک اور روا رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ دین کی خدمت نہیں' امت کو اس سے اور دور لے جانے کی کوشش ہے۔ "ناظرہ قرآن" کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

آپ ذرا غور کیجئے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنے سے اسکولوں میں ہوگا کیا؟ طالب علم' اردو پڑھے گا' تاریخ' جغرافیہ' سائنس پڑھے گا۔ ان تمام مضامین کے پڑھنے پڑھانے کی کیفیت یہ ہوگی کہ استاد جو کچھ پڑھائے گا اسے بچوں کو سمجھائے گا۔ جو بات بچوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی وہ استاد سے اس کی مزید وضاحت چاہیں گے۔ جو کچھ سمجھ کر پڑھا ہوگا اسے لکھیں گے۔ اس طرح ان مضامین کی کتابیں ان کے علم میں اضافہ کریں گی۔ عین ان مضامین کے درمیان ایک پیریڈ "قرآن شریف" کا بھی آئے گا۔ اس میں استاد جو کچھ پڑھائے گا اسے سمجھائے گا نہیں' صرف اس کے الفاظ پڑھنا اور یاد کرنا سکھائے گا۔ بچے جو کچھ پڑھیں گے--- اسے سمجھیں گے نہیں' صرف الفاظ یاد رکھیں گے۔ اور جب یہ کتاب ختم ہوگی تو وہ ان کے علم میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کرے گی۔ ان کے ذہن میں بہرحال' یہ سوال ابھرے گا کہ اس کتاب کے پڑھنے سے انہیں حاصل کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ دے دیا جائے گا کہ اس کے الفاظ دہرانے سے ثواب ہوتا ہے' اس کی "تلاوت" "موجب برکت" ہوتی ہے۔ گویا ان بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے یہ عقیدہ راسخ کردیا جائے گا کہ قرآن کریم ایک "کتاب" نہیں' اس کا تعلق "سحر" سے ہے اور یہ عقیدہ عمر بھر ان کے شعور یا لاشعور میں جاگزیں رہے گا--- فرمایئے! یہ دین کی خدمت ہوئی یا آنے والی نسلوں کو دین سے بیگانہ رکھنے کی "مبارک

کوشش؟"۔ "بیگانہ" ہی نہیں' یہ بچے جب بڑے ہوں گے تو یہ اسلام کو اوہام پرستی کا مظہر قرار دیں گے اور اسے بنظر استخفاف دیکھیں گے۔

قرآن کریم کو ناظرہ پڑھانے کے بجائے' یہی ایک پیریڈ اگر عربی زبان پڑھانے کے لئے مختص کردیا جائے تو اس سے بچے قرآن کریم کو ناظرہ بھی پڑھ جائیں گے اور اس کا مطلب سمجھنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ لیکن عربی زبان اس فرسودہ طریق سے نہ پڑھائی جائے جس سے سات سال میں گردانیں ہی ختم نہیں ہوا کرتیں۔ اسے سائنٹفک طریق سے پڑھایا جائے تاکہ بچوں کو اس سے دلچسپی بھی پیدا ہو جائے اور ان کا وقت اور توانائی بھی بچے۔ (اگست ۱۹۶۶ء)

۵۔ بچوں کو قرآن شریف کیسے پڑھایا جائے

سوال : ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے اسکولوں میں اسلامیات کے نام سے بچوں کو جو کچھ پڑھایا جاتا ہے' اس سے ان کے ذہن میں اسلام کے متعلق جو الجھنیں پیدا ہوتی ہیں' اس کا تجربہ ہر حساس ماں باپ کو ہو رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے طور پر بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم کس طرح دیں' یعنی بچے کی کس عمر سے اسے شروع کیا جائے اور اس کا طریقہ کیا ہو۔

جواب : یہ سوال بڑا اہم ہے اور اسکولوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کی چیستاں نے اس کی اہمیت اور بھی بڑھا دی ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر غور بھی کیا ہے اور کچھ تجربے بھی--- ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ بچوں کو ابتدائی اسٹیج میں قرآن کریم مسلسل نہیں پڑھانا چاہئے--- ناظرہ پڑھانے کا کچھ فائدہ نہیں اور سمجھ کر پڑھنے کی ان میں ہنوز استعداد نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے طور پر باتوں باتوں میں' روز مرہ کی زندگی سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم سے آشنا کراتے رہنا چاہئے--- اس سلسلہ میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب--- "اسلامی معاشرت"--- کا انداز بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح' حضورؐ کی سیرت طیبہ کے جستہ جستہ واقعات بھی انہیں بتاتے رہنا چاہئے۔ جب بچے کی اردو اور انگریزی زبان کی استعداد اس سطح تک پہنچ جائے جس سطح تک ہمارے ہاں بالعموم نویں یا دسویں جماعت کا طالب علم پہنچتا ہے' تو اسے عربی زبان پڑھانا شروع کردینا چاہئے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ انداز اگر اس نہج کے مطابق ہو--- "عربی خود سیکھئے"--- میں اختیار کیا گیا ہے' ہفتہ میں تین چار دن' ایک ایک گھنٹہ بھی اس کے لئے دے دیا جائے تو بچہ' سال چھ مہینے میں اتنی عربی با آسانی سیکھ سکتا ہے جس سے قرآن کریم کے الفاظ اور آیات کا ترجمہ سمجھ میں آجائے۔ اس کے بعد قرآن کریم کو مسلسل پڑھانا شروع کیا جائے۔ اس سلسلہ میں' الفاظ قرآنی کے ترجمہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ پڑھانے والے کو چاہئے کہ ان الفاظ کا جو مفہوم "لغات القرآن" میں دیا گیا ہے' اسے اپنے الفاظ میں بچے کے ذہن نشین کرائے اور اس کے بعد پوری آیت کا مفہوم "مفہوم القرآن" سے اخذ کرکے اسے ساتھ کے ساتھ سمجھاتا جائے۔ شروع شروع میں یہ سبق' دو دو' تین تین آیات سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس

ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب از پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا نام ہے۔

سلسلہ کو کالج کی تعلیم کے دوران بھی جاری رکھا جائے۔ جوں جوں بچہ' عام تعلیم میں آگے بڑھتا جائے گا' قرآن زیادہ عمدگی سے سمجھ میں آتا جائے گا۔

اس سلسلہ میں' اس کے لئے سب سے بڑی مشکل "اسلامیات" کی تعلیم پیدا کرے گی' جو قوم کی بدقسمتی سے' اب لازمی قرار پاگئی ہے۔ گھروں میں والدین کو چاہئے کہ "اسلامیات" کی کتابوں کا خود مطالعہ کریں اور ان میں جو باتیں قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہوں' بچوں کو سمجھا دیں کہ وہ غلط ہیں اور موجودہ نظام تعلیم کے ناقص ہونے کی وجہ سے انہیں پڑھائی جا رہی ہیں۔ حساس اور ذی فہم والدین پر اس باب میں بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور انہیں اس کے لئے بڑی محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر وہ بچے کی زندگی کو صحیح خطوط پر مستقل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس کوہ کنی اور خارا شگافی سے مفر نہیں ہوسکتا۔۔۔۔ ایک انسانی بچے کو دنیا میں لانے سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے' وہ مذاق نہیں۔ یہ تو ۔۔۔ "یک قطرہ خوردہ ایم و بدریا گرستیم"۔۔۔۔ والا معاملہ ہے۔ (اپریل ۱۹۶۷ء)

۶۔ قرآن کریم کی تعبیر میں اختلاف

سوال : آپ کہتے ہیں کہ قانون سازی کے سلسلہ میں اگر قرآن مجید کو بنیادی سند قرار دے دیا جائے تو موجودہ اختلافات بھی مٹ سکتے ہیں اور ایک ایسا ضابطہ قوانین بھی مدون ہوسکتا ہے' جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوسکے۔ لیکن مولوی صاحبان اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی تعبیر میں خود اختلاف ہے۔ اس سے اختلافات کس طرح سے مٹ سکیں گے اور ایک متفق علیہ ضابطہ کس طرح مرتب ہوسکے گا؟ کیا آپ اس کی وضاحت فرمائیں گے؟

جواب : ہمارے مولوی صاحبان کی تو حالت ہی عجیب ہے۔ قرآن کریم کے متعلق جب ان سے وعظ سنو تو اس میں یہ بتائیں گے کہ خدا کی یہ آخری کتاب بے مثل و بے نظیر ہے۔ دنیا بھر کے انسان مل کر اس کی مانند کوئی کتاب نہیں بنا سکتے۔ یہ اس کتاب عظیم کا معجزہ ہے جس کے سامنے عرب بھی سرنگوں تھے اور آج تک کوئی اس چیلنج کو قبول نہیں کرسکا اور نہ ہی کرسکے گا۔

لیکن جب ان سے اس کتاب کو ضابطہ شریعت بنانے کے متعلق کہا جائے تو یہ دنیا بھر کے نقائص اس کتاب میں گنائے چلے جائیں گے۔ یہ نامکمل ہے' اس میں احکام دیئے گئے ہیں لیکن ان کی عملی تفصیل کہیں نہیں دی گئی۔ یہ غیر واضح اور مبہم ہے۔ یہ اپنا مطلب واضح طور پر بیان نہیں کرسکتی۔ اس میں تضادات ہیں جن کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بعض آیات کو ناسخ مانا جائے اور بعض کو منسوخ۔ لیکن اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کی کون سی آیات ناسخ ہیں اور کون سی منسوخ۔ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کے اندر موجود نہیں' لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ اس کی مختلف "قراتیں" ہیں۔ یعنی ایک آیت قرآن کریم میں کسی طرح لکھی ہوئی ہے اور بعض صحابہؓ اسے کسی اور طرح پڑھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

آپ غور کیجئے کہ جتنے نقائص یہ حضرات اس کتاب میں بیان فرماتے ہیں' ان میں سے کوئی ایک نقص بھی ان کی اپنی کتاب میں دکھایا جائے' تو یہ اس شخص کے گلے پڑ جائیں اور کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں کہ اس میں ایسا نقص موجود ہے۔ اب ان نقائص کی فہرست میں ایک اور اضافہ بھی ہوگیا ہے اور وہ یہ کہ اس کی آیات کے الفاظ تو اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن ان کی تعبیر(INTER PRETATION) میں اختلاف ہے۔ اس لئے ان کا کوئی متفق علیہ مفہوم نہیں لیا جاسکتا۔ لہٰذا' یہ مسلمانوں کا ضابطہ قوانین بن سکنے کے قابل نہیں۔

قرآن کریم میں احکام بھی ہیں اور حقائق بھی' تاریخی نظائر بھی ہیں اور علمی دلائل بھی۔ قانون سازی کے سلسلہ میں چونکہ معاملہ احکام سے متعلق ہوتا ہے' اس لئے ہم بنیادی طور پر اس کے اسی حصہ کو لیتے ہیں۔ جہاں تک احکام کا تعلق ہے' قرآن کریم میں بعض احکام متعین قانون کی شکل میں دیئے گئے ہیں (**حرمت علیکم امھتکم** ۴/۲۳) اور بعض اصول کی شکل میں (مثلاً **اعدلو** (۵/۸)۔ جہاں تک متعین احکام کا تعلق ہے ان میں کسی تعبیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ احکام واضح' متعین اور محکم ہیں۔ مثلاً" جو مثال ہم نے اوپر پیش کی ہے کہ تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں۔۔۔ ذرا سوچئے کہ اس میں دو تعبیریں ممکن ہیں؟ اس میں ایک ہی سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ "ماؤں" میں سوتیلی مائیں بھی شامل ہیں یا نہیں' تو اس کی وضاحت قرآن کریم نے یہ کہہ کر کردی کہ (**ولا تنکحوا ما نکح اباوکم من النساء** (۲۲/۴) "ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کرچکے ہیں"۔ بات واضح ہوگئی کہ حقیقی اور سوتیلی دونوں مائیں حرام ہیں' حتیٰ کہ رضاعی مائیں بھی۔ (۴/۲۳)

جہاں تک اصولی احکام کا تعلق ہے وہ بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے واضح اور دو ٹوک ہیں۔ انہیں اصولی طور پر بیان کرنے سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانے کے مقتضیات کی روشنی میں تفصیلی احکام خود مدون کرے۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے جو جزئی احکام مرتب کئے جائیں گے ان میں حالات کے تقاضے کے مطابق رد و بدل ہوسکے گا۔ مثلاً" "عدل کرو" ایک اصولی حکم ہے۔ عدل کسے کہتے ہیں' اس کی وضاحت مختلف مقامات پر خود قرآن نے کردی ہے۔ لیکن یہ امور کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں عدل کی شکل کیا ہوگی' عدل کرنے کی عملی صورتیں کیا ہوں گی' کس مقام پر کہا جائے گا کہ یہ فیصلہ عدل کے مطابق نہیں' (وغیرہ وغیرہ) اسلامی نظام مملکت کے طے کرنے کے ہوں گے۔ اسی طرح یہ فریضہ بھی اسلامی مملکت کا ہوگا کہ قرآن میں جو اصطلاحات آئی ہیں ان کا منطوق متعین کیا جائے۔ مثلاً" قرآن میں الخمر کی ممانعت آئی ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق کون کون سی چیزوں پر ہوگا اور کن کن حالات میں' اس کا تعین بھی نظام مملکت کرے گا۔ اسی طرح قرآن کریم کے متعین احکام کی روشنی میں ان سے ملتے جلتے حالات کے لئے قوانین کی تدوین بھی اسی مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔

قرآن کریم نے امور مملکت کے سلسلے میں مشاورت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس مشاورت کی مشینری کی کیا شکل ہوگی' اس کا تعین بھی اس نے مملکت پر چھوڑ دیا ہے۔ مشورہ دیتے وقت مختلف ارباب فکر و نظر کی آراء مختلف ہوسکتی

ہیں۔ لیکن جب اس کے بعد مملکت کسی فیصلہ پر پہنچ کر قانون نافذ کر دے گی تو اس کی اطاعت سب پر لازم آجائے گی۔ اگر کوئی شخص اس میں کوئی ترمیم چاہے گا تو اس کے لئے اسے وہی طریق کار اختیار کرنا ہوگا جو اس مقصد کے لئے نظام مملکت نے طے کیا ہو۔

غور کیجئے کہ مولوی صاحبان جس چیز کو تعبیر کے اختلافات کا ہوا بنا کر پیش کرتے ہیں' اسلامی نظام مملکت میں اس کا کوئی وجود بھی ہے؟ یہ اختلافات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب نظام مملکت موجود نہ ہو اور تعبیر کا حق ہر ایک کو انفرادی طور پر دے دیا جائے۔ ہمارے مولوی صاحبان کے ذہن میں نظام کا تصور ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اسلام انفرادی زندگی کا نام ہے اور انفرادی زندگی میں--- قوانین تو بہت بڑی چیز ہیں--- یہ بھی طے نہیں ہو سکتا کہ نماز میں آمین اونچی آواز سے کہنی چاہئے یا نیچی آواز سے---" اس لئے یہ سمجھ سکنا ان کے بس کی بات نہیں کہ ایک نظام کے تابع اختلافات کس طرح مٹ جایا کرتے ہیں۔ ان کی یہی بے بسی تھی جس کے لئے اقبال نے کہا تھا کہ۔

قوم کیا چیز ہے' قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

ان کی بے بسی کا یہ عالم اور ہماری سادہ لوحی کی یہ کیفیت کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے بغیر اسلامی ضابطہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتا--- نتیجہ ظاہر ہے۔

باقی رہے خود حقائق جنہیں قرآن کریم نے تشبیہی انداز سے بیان کیا ہے (جنہیں وہ متشابہات کہہ کر پکارتا ہے) مثلاً" **کان عرشہ علی الماء** (۱۱/۷) خدا کا عرش پانی پر ہے۔ سو ان کا سمجھنا انسان کی علمی سطح کی نسبت سے ہے۔ انسان کی علمی سطح مختلف ادوار میں مختلف ہو سکتی ہے۔ اور جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے یہ سطح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس لئے ان تشبیہی حقائق کے متعلق مختلف ادوار میں مختلف تعبیرات ہو سکتی ہیں' نیز کسی ایک دور میں بھی مختلف افراد کی علمی سطح کے مطابق مختلف۔ لیکن ان کے متعلق تعبیرات کے اختلاف سے نہ امت کی عملی زندگی پر اثر پڑتا ہے نہ اجتماعی نظام اور ضابطہ قوانین پر۔ اس کے لئے صرف اتنی احتیاط کی ضرورت ہے کہ کوئی تعبیر قرآن کے اصول سے نہ ٹکرائے لیکن اس باب میں ہمارے مولوی صاحبان کا مسلک یہ ہے کہ ان حقائق کے متعلق' جو کچھ متقدمین نے لکھ دیا ہے وہی حق و صداقت ہے اور اس سے اختلاف' کفر و الحاد۔ یہ مسلک قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے جو انسانوں کو تدبر و تفکر کی شدت سے تاکید کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ حکم' نہ تو کسی خاص دور کے انسانوں تک محدود ہو سکتا ہے نہ کسی خاص گروہ کے اندر مقید نہ ہی اس باب میں کسی فرد کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے تدبر کے نتیجہ کو حرف آخر قرار دے کر اسے کفر و ایمان کا معیار ٹھہرائے۔ (اگست ۱۹۶۵ء)

۷۔ قرآن مجید کی حنفی تفسیر۔

اس اقتباس کو غور سے پڑھئے۔

"صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختہ مشق ہے' یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علما کے علم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو' خوش آئند ہے' جس جماعت کی جانب سے ہو' قابل پذیرائی ہے' مگر افسوس "علم" جیسے لازوال' ابدیت نشان' سب کی دولت' سب کے سرمایہ کو' ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طول و طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہرحال جو کچھ ہوچکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطہ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو"۔

(تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ از مولانا سید انظر شاہ مدرس دارالعلوم دیو بند' پارہ اول کا جز اول' ص ۴)

اب آپ نے سمجھا کہ ہر فرقہ کا قرآن کس طرح الگ الگ ہوگیا ہے؟ اور یہ بھی کہ مروجہ تفاسیر (اور ان پر مبنی تراجم) کی رو سے کس قسم کا قرآن آپ کے سامنے آسکتا ہے؟ سچ کہا تھا حکیم الامتؒ نے کہ :-

زمن بر صوفی ملا سلامے! کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

---------- (مارچ ۱۹۶۹ء)

کتب تفسیر : (مولانا سندھی مرحوم) کتب تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

ہم نے امام فخرالدین رازی کی تفسیر پڑھی' نیز جار اللہ زمخشری کی کتاب کا مطالعہ کیا۔ اس کے علاوہ معالم التنزیل از فراء بغوی اور تفسیر حافظ ابن کثیر پڑھی۔ ان سب تفسیروں کے ذریعے ہم نے قرآن سمجھنے کی اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کی لیکن سوائے تحیر کے ہمیں کچھ نصیب نہ ہوا۔ اگر زمانہ طالب علمی میں ہم نے نجم الائمہ حضرت شیخ الہند سے چند آیتوں کی تفسیر جو کتابوں میں نہیں ملتی' نہ سنی ہوتی' اور ہمارے لئے وہ اطمینان کا ذریعہ نہ بنتی' نیز شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بعض تفسیری جملے نہ پڑھے ہوتے' تو قدما کی ان تفسیروں کو پڑھ کر ہم علم تفسیر کے حصول سے قطعاً" مایوس ہوجاتے۔ بیشک ہم اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ پہلے زمانے میں مسلمانوں نے انہی کتابوں کی مدد سے قرآن سمجھا تھا اور انہی اصول و قواعد پر انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق قرآن کی حکومت قائم کی تھی۔ لیکن جہاں تک اس زمانے کا تعلق ہے ہمارے لئے اس قسم کی تفسیروں سے قرآن فہمی ناممکن ہے' (از ماہنامہ "الرحیم" ستمبر ۱۹۶۵ء) (دسمبر ۱۹۶۶ء)

۸۔ کیا قرآن کریم مکمل ضابطہ حیات ہے؟

سات دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقع پر' ٹیلی ویژن پر جو مسلسل پروگرام نشر ہوا' اس میں ایک مذاکرہ بھی' مندرجہ بالا عنوان سے شامل تھا۔ مجلس مذاکرہ میں کراچی کے دو بزرگوار تھے اور تیسرے صاحب ان کا درمیانی واسطہ۔

ان میں سے ایک صاحب نے تو یہ کہہ کر بات ہی ختم کردی کہ قرآن کریم تلاوت کے لئے ہے۔ اسے ضابطہ وغیرہ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسرے صاحب نے ان سے اختلاف تو کیا لیکن جواب میں کوئی متعین اور واضح بات نہ کہی۔ لہٰذا' موضوع نہ صرف مبہم رہ گیا بلکہ ناظرین اور سامعین کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب بھی بن گیا۔ ہماری سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی کہ ٹیلی ویژن یا ریڈیو کے ارباب نظم و نسق کو جس میدان میں درک حاصل نہ ہو' وہ اسے اپنے پروگراموں میں شامل کیوں کرلیتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ عنوان میں لفظ "ضابطہ" کا مفہوم کیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ لفظ ایک قانونی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً" ضابطہ فوجداری' ضابطہ دیوانی وغیرہ سے مراد ہوتا ہے ایسا مجموعہ قوانین جس میں متعلقہ قوانین اور ان کی تفاصیل اور جزئیات وغیرہ مندرج ہوں۔ قرآن کریم ان معنوں میں ضابطہ حیات نہیں۔

اگر ہم "ضابطہ" کے معنی ضبط یعنی کنٹرول میں رکھنے والا' کرلیں تو پھر بات واضح ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن مجید انسانی زندگی کے تقاضوں کو کنٹرول میں رکھتا ہے' انہیں بیباک نہیں ہونے دیتا۔ مثلاً" جنسی جذبہ انسانی زندگی کا تقاضا ہے اور قرآن کریم وہ حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے اس تقاضے کی تسکین کی جاسکتی ہے۔ یا مثلاً" جلب منفعت انسانی زندگی کا تقاضا ہے اور قرآن کریم وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اس تقاضے کو پورا کرسکتا ہے۔ قرآن کریم میں' بجز معدودے چند قوانین کے' اسی قسم کے حدود اور اصول دیئے گئے ہیں جو ضابطہ حیات کا کام دیتے ہیں۔ اس میں ان ضوابط (یعنی حدود) کی جزئیات نہیں دی گئیں۔ ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضے کے مطابق ملت کا قرآنی نظام باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گا۔ یہ جزئیات بدلتی رہیں گی لیکن قرآنی حدود ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔

اب رہا سوال اس ضابطہ کے مکمل ہونے کا' سو انسانی زندگی کی دو سطحیں ہیں۔ ایک اس کی طبیعی زندگی اور دوسری وہ زندگی جسے سمجھنے کی خاطر آپ انسانی زندگی کہہ لیجئے۔ جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے' وہ جسم سے متعلق طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ یہ میدان قرآن کریم کے احاطہ ہدایت سے باہر ہے' اگرچہ اس کے لئے بھی اس میں کہیں کہیں کوئی اشارہ مل جاتا ہے۔ قرآن کا حقیقی موضوع انسانی زندگی ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ اس زندگی کے جملہ تقاضوں کے متعلق اس میں ضوابط (حدود) موجود ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ضابطہ حیات مکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی نہج سے قرآن کریم کو مکمل بھی کہا ہے اور غیر متبدل بھی (**وتمت كلمت ربك صدقا و عدلا لا مبدل لكلمته**) (۶/۱۱۶)

واضح رہے کہ قرآن کریم میں ضابطہ کا لفظ کہیں نہیں آیا۔ (جنوری ۱۹۷۱ء)

۹۔ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

(نوٹ) اس ضمن میں قرآنی فیصلے' حصہ اول صفحہ ۲۳۹ ایڈیشن سوم' مارچ ۹۲ء کو بھی دیکھ لیا جائے۔

قرآن کریم کی رو سے' کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے' ان میں ایک "کتب" بھی ہے' یعنی خدا کی کتابوں پر ایمان۔ ان کتابوں میں وہ بھی شامل ہیں جو حضور نبی اکرمؐ سے پہلے کے انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ملیں (واضح رہے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق' کتاب ہر نبی کو ملی تھی' "نبی بلا کتاب" کا عقیدہ قرآن کریم کی نص صریح کے خلاف ہے) اور اس کتاب پر بھی جو حضورؐ پر نازل ہوئی' یعنی قرآن کریم۔ ان میں فرق یہ ہے کہ انبیاؑ سابقہ کی کتابوں پر صرف اس حد تک ایمان ضروری ہے کہ وہ اپنے اپنے وقت میں مختلف انبیاؑء کو ملیں لیکن اس کے بعد وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہیں۔ ان میں تحریف ہوگئی اور یا وہ بھلا دی گئیں یا حوادث ارضی و سماوی کی نذر ہوگئیں۔ ان کے برعکس' قرآن مجید (جو اس وقت امت کے پاس ہے) حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے رسولؐ اللہ پر نازل کیا اور جسے رسولؐ اللہ نے امت کو دیا۔ اس میں ایک نقطے یا شعشعہ کا بھی فرق نہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ یہ جو ہمارا دعویٰ ہے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے' تو اس کی بنیاد یہ ہے کہ منزل من اللہ کتاب' اس آسمان کے نیچے' اب صرف قرآن مجید ہے۔ دیگر مذاہب کی کتابیں جنہیں وہ اپنے بانیان مذاہب کی طرف منسوب کرتے ہیں' اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔

مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ جو کتابیں دیگر اہل مذاہب اپنے انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں' وہ اپنی اصل شکل میں موجود نہیں' ایسی محکم شہادات پر مبنی ہے جس کی تردید وہ اہل مذاہب کر نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا' انہوں نے اس سے عاجز آکر' یہ سازش شروع کی کہ خود قرآن کے متعلق یہ ثابت کردیا جائے کہ یہ بھی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روایات وضع کیں اور کثرت سے وضع کیں اور انہیں ان کتابوں میں داخل کردیا جنہیں "صحیح ترین کتب احادیث" قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کہ قرآن کریم کو خود رسولؐ اللہ نے جمع اور مرتب شدہ شکل میں امت کو نہیں دیا تھا' اسے بعد میں مرتب کیا گیا۔ مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن کے مختلف نسخے تھے جن میں بے حد اختلاف تھا۔ قرآن کا جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے جمع کیا اس میں بھی تغیر و تبدل ہوا وغیرہ' انہی روایات کے پیدا کردہ ہیں۔ انہی عقاید میں ایک عقیدہ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا بھی ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے تسلیم یہ کیا جاتا ہے کہ

(۱) خدا کی طرف سے کچھ احکام نازل ہوتے تھے' انہیں پھر وہ منسوخ کر دیتا تھا۔ قرآن کی وہ آیات جن میں وہ احکام دیئے گئے تھے' اگر لکھی ہوئی ہوتیں تو رسولؐ اللہ صحابہ کو حکم دے دیتے کہ انہیں مٹا دیا جائے۔ اگر وہ رسولؐ اللہ اور صحابہؓ کو حفظ یاد ہوتیں تو خدا انہیں ان کے حافظہ سے محو کردیتا۔ یہ وہ آیات ہیں جن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ ان کا حکم بھی منسوخ ہے اور تلاوت بھی۔

(۲) دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم میں تو موجود نہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے اور

(۳) تیسری قسم ان آیات کی ہے جو قرآن کریم میں موجود تو ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں' ان تینوں قسموں کی آیات میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا گیا کہ خدا نے اس کا حکم یا اس کی تلاوت منسوخ کر دی ہے' نہ ہی کہیں یہ آیا ہے کہ ایسی آیات بھی تھیں جو پہلے نازل ہوئی

تھیں لیکن بعد میں انہیں حافظوں سے بھی محو کردیا گیا اور جہاں جہاں وہ لکھی ہوئی تھیں، وہاں سے بھی انہیں مٹا دیا گیا۔ یہ سب کچھ کتب روایات میں ہے۔

ظاہر ہے کہ "اس قسم کے قرآن" کے متعلق بیسیوں شکوک ابھریں گے اور اس پر سیکڑوں اعتراضات وارد ہوں گے۔ ہمارے علماء کرام کی طرف سے ان کا کیا جواب دیا جاتا ہے، وہ قابل غور ہے۔ کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔ "البلاغ"۔۔ جس کے مدیر محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس مجلّہ کی ستمبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں (خود مدیر کے قلم سے) ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "حفاظت قرآن کے متعلق شبہات اور ان کا جواب"۔ اس مقالہ کے متعلقہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ اقتباسات طویل ہیں لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی، اس لئے ہم نے اس طوالت کو گوارا کرلیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

البلاغ کے اقتباسات

مشہور مستشرق ایف۔ بہل (F - BUHAL)[۲] نے دعویٰ کیا ہے کہ عہد رسالتؐ کی ابتداء میں قرآن کریم کی آیات لکھی نہیں جاتی تھیں بلکہ ان کی حفاظت کا سارا دار و مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے حافظے پر تھا۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے کہ ابتدائی زمانے کی قرآنی آیات محفوظ نہ رہی ہوں۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں بہل نے قرآن کریم کی دو آیات پیش کی ہیں۔

(۱) **سنقرئک فلا تنسی الا ماشا اللہ** (سورۂ اعلیٰ: ۷-۶)

"ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں، مگر جو کچھ اللہ چاہے"

(۲) **ما ننسخ من ایۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا** (بقرہ: ۱۰۶)

"ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے، ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے"

لیکن جو شخص بھی قرآن کریم اور اس کی تفسیر سے ادنیٰ واقفیت رکھتا ہو وہ اس اعتراض کی لغویت محسوس کرسکتا ہے، اس لئے کہ ان دونوں آیتوں میں قرآن کریم کی منسوخ آیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت کا شان نزول یہ ہے کہ جب جبریل امین علیہ السلام قرآن کریم کی کچھ آیات لے کر نازل ہوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بھول جانے کے خوف سے بار بار دہراتے رہتے تھے اور اس میں آپؐ کو شدید تعب ہوتا تھا۔ اس آیت میں آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا کہ آپ کو یاد کرنے کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لہٰذا آپ ان آیات کو بھول نہیں سکیں گے۔ لیکن اس پر یہ اشکال ہوسکتا تھا کہ قرآن کریم کی بعض آیات تو بعد میں منسوخ ہونے کے سبب حافظ سے محو ہوگئیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے

۲۔ F-BUHL "EMCYCLOPAEDIA OF ISLAM" PJ067 V.3 "KORAN"

الا ماشا اللہ (مگر جو کچھ اللہ چاہے) کے الفاظ بڑھا دیئے گئے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی آیت کو منسوخ کرے گا تو صرف اسی وقت وہ آیت آپ کے حافظ سے محو ہو سکے گی' اس کے بغیر نہیں۔ اسی طرح دوسری آیت میں بھی زیادہ سے زیادہ اتنا بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات منسوخ ہونے کی بنا پر آپؐ کے اور صحابہؓ کے حافظوں سے محو ہو جائیں گی۔

لہٰذا' ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض آیات کو جب اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دیا تو ان کی کتابت کو مٹانے کا حکم تو دیا ہی گیا مگر ساتھ ساتھ انہیں لوگوں کے حافظے سے بھی محو کر دیا گیا' ورنہ جہاں تک غیر منسوخ آیتوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں تو صراحتہً کہا جا رہا ہے کہ آپ انہیں کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ اس سے یہ بات آخر کیسے نکل آئی کہ جو آیتیں منسوخ نہیں ہوئیں ان کے فراموش ہو جانے کا بھی کوئی امکان ہے؟

دوسرا اقتباس ملاحظہ ہو

"مارگولیوتھ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے

عن عائشہؓ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم قالت لقد انزلت ایتہ الرجم و رضعات الکبیر عشرا" فکانت فی ورقتہ تحت سریر فی بیتی فلما اشکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشاغلنا بامرہ و دخلت دویبتہ لنا فاکلتھا ۳۔

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رجم کی آیت اور بڑے آدمی کی دس رضعات کی آیت نازل ہوئی تھیں۔ یہ آیتیں میرے گھر میں' ایک تخت کے نیچے کاغذ پر لکھی ہوئی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (مرض وفات کی) تکلیف شروع ہوئی تو ہم آپؐ کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ ہمارا ایک پالتو جانور تھا۔ وہ آیا اور اس نے وہ کاغذ کھا لیا"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت عائشہؓ نے جن آیتوں کا ذکر فرمایا ہے یہ باجماع امت' وہ آیتیں ہیں جن کی تلاوت منسوخ ہو چکی تھی۔ خود حضرت عائشہؓ بھی ان آیتوں کے منسوخ التلاوۃ ہونے کی قائل ہیں۔ لہٰذا' اگر انہوں نے یہ آیات کسی کاغذ پر لکھ کر رکھی ہوئی تھیں تو اس کا منشاء سوائے ایک یادگار کے تحفظ کے کچھ نہ تھا ورنہ اگر یہ آیات' حضرت عائشہ کے نزدیک' قرآن کریم کا جزو ہوتیں تو وہ کم از کم ان کو تو یاد تھیں۔ وہ ان کو قرآن کریم کے نسخوں میں درج کراتیں لیکن انہوں نے ساری عمر ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس سے صاف واضح ہے کہ خود حضرت عائشہؓ کے نزدیک یہ آیات محض ایک علمی یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں اور قرآن کریم کی دوسری آیات کی طرح

۳۔۔ مسند احمدؒ حصہ زوائد۔ مسندات عائشہؓ ص۲۶۹ ج۶۔ دار صادر۔ بیروت۔

اس کو مصحف میں درج کرانے کا کوئی اہتمام ان کے پیش نظر بھی نہیں تھا۔ لہٰذا' اس واقعہ سے قرآن کریم کی حفاظت پر کوئی حرف نہیں آتا"۔

یہ ہیں وہ جوابات جن سے یہ حضرات مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے معترضین کو اگر قائل نہیں کردیا تو کم از کم ان کا منہ بند کردیا۔ ہم پوچھتے ہیں اپنے قارئین (بالخصوص قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ) سے کہ (مستشرقین کو تو چھوڑیئے) کیا وہ ان جوابات سے مطمئن ہوگئے ہیں اور ان سے ان کے شکوک و شبہات دور ہوگئے ہیں؟ شکوک و شبہات کا دور ہونا تو ایک طرف' ان سے تو مزید شکوک و شبہات ابھر آتے ہیں۔ (مثلاً") پہلے اس آیت کو لیجئے جسے حضرت عائشہؓ کا جانور کھا گیا تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ ان آیات میں سے تھیں جنہیں خدا نے منسوخ قرار دے دیا تھا۔ ان آیات کے متعلق پہلے کہا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ حکم دے دیتے تھے کہ اگر یہ آیات کہیں لکھ رکھی ہیں تو انہیں مٹا دیا جائے۔ اور اگر یہ حافظہ میں ہوتیں تو خدا خود انہیں رسولؐ اللہ اور دوسرے لوگوں کے حافظہ سے محو کردیتا۔ یہ آیت حضرت عائشہؓ کے پاس لکھی ہوئی شکل میں موجود تھی لیکن انہوں نے اسے' رسولؐ اللہ کے حکم دینے کے باوجود مٹایا نہیں۔ کیا رسولؐ اللہ کے زمانے میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ رسولؐ اللہ ایک بات کا حکم دیتے تو صحابہؓ (اور وہ بھی حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ) اس کی تعمیل نہ کرتے؟ اس کی توجیہہ یہ بتائی گئی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اسے ایک یادگار کے تحفظ کے طور پر کسی کاغذ پر لکھ رکھا ہوگا! سوال یہ ہے کہ ان آیات کو بطور یادگار محفوظ رکھنے سے کیا ارشاد رسولؐ اللہ کی تعمیل اور منشائے خداوندی کی تکمیل (کہ ان آیات کو مٹا دیا جائے) ہو جاتی تھی؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ تو کیا اسے باور کرلیا جائے کہ اس زمانے میں ارشادات رسولؐ اللہ کی تعمیل اور منشائے خداوندی کی تکمیل اسی طرح ہوا کرتی تھی؟

اور پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ ایسا صرف حضرت عائشہؓ نے کیا' اور وہ بھی صرف ایک آیت کے سلسلہ میں کیا تھا! کیا معلوم کتنے صحابہؓ نے ان آیات کو لکھ رکھا تھا؟ اور یہ بھی کیا معلوم کہ وہ کہاں کہاں تشریف لے جاچکے ہوں گے اور ان تک رسولؐ اللہ کا یہ حکم پہنچا بھی ہوگا یا نہیں کہ ان آیات کو مٹا دیا جائے! وہ تو ان آیات کو قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے اور اسی حیثیت سے انہوں نے انہیں محفوظ رکھ چھوڑا ہوگا! کیا اس سے ان آیات کی تنسیخ کا مقصد خداوندی پورا ہوگیا تھا؟ اور کیا بعد ازاں جب صحابہؓ ایک دوسرے سے ملتے ہوں گے تو ان آیات کے متعلق نزاعات پیدا نہ ہوتی ہوں گی کہ یہ قرآن کا جزو ہیں یا نہیں؟

اب آیئے اس آیت کے متن کی طرف جس کے متعلق عثمانی صاحب نے فرمایا ہے کہ خدا نے اسے منسوخ کردیا تھا اور اسے حضرت عائشہؓ کا جانور کھا گیا تھا۔ اس آیت میں ایک حکم زانی اور زانیہ کو سنگسار (رجم) کرنے کا تھا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار' اہل سنت والجماعت کی نہایت قابل اعتماد کتب تفاسیر میں ہوتا ہے۔ دیکھئے کہ اس میں اس آیت کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔ اس میں سورۂ نور کی دوسری آیت (جس میں حکم خداوندی ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا سو سو کوڑے ہے) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

موطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل کی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جو ہم نے تلاوت کی' یاد کی اور اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا' چھوڑ کر مر جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ' خواہ مرد ہو یا عورت جبکہ اس کے زنا پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطول موجود ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا' عمر نے لکھ دیا تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب' عبداللہ بن عوف اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو! تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے ہوں۔ مسند احمد میں لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا' رجم کے حکم کے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا الخ۔۔ امام ترمذی بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو العلی موصلی میں ہے کہ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زنا کاری کریں تو انہیں ضرور رجم

کردو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو! ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہاری تشفی کردیتا ہوں کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا یا رسولؐ اللہ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے نہیں لکھ سکتا یا اسی کے مثل۔ یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی یا پھر تلاوت میں منسوخ ہوگئی اور حکم باقی رہا۔

آپ نے غور فرمایا کہ حفاظت قرآن مجید کے سلسلہ میں ہماری کتب احادیث و تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے؟ اور آپ کو شاید اس کا بھی علم ہوگا کہ ہمارے ہاں رجم کا یہ حکم بدستور چلا آرہا ہے۔ شرعی قوانین کی رو سے' غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کو کوڑے مارے جاتے ہیں اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جاتا ہے اور ایسا اس آیت کی رو سے کیا جاتا ہے جو قرآن میں تو موجود نہیں لیکن اس کا حکم بدستور موجود ہے۔

اور اس پر ہم (مسلمانوں) کو شکایت ہوتی ہے کہ غیر مسلم اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن محفوظ نہیں اور ہمارے مولانا حضرات ان اعتراضات کا وہ جواب دیتے ہیں جسے آپ تقی صاحب کے مقالہ میں دیکھ چکے ہیں۔ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) کس قدر مظلوم ہے ہمارا قرآن!

اب آیئے قرآن میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی طرف۔ ہم اس سلسلہ میں پہلے بھی بہت کچھ اور متعدد بار لکھ چکے ہیں' لیکن چونکہ ابلاغ نے اسے حفاظت قرآن کے سلسلہ میں بطور دلیل پیش کیا ہے' اس لئے اس عقیدہ کی (باروگر) وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ عقیدہ حال کا وضع کردہ نہیں بلکہ اس زمانے سے چلا آرہا ہے جب سے وضعی روایات وجود میں ہیں اور اس وقت تک چلا جائے گا جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ **و اذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباء نا** (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا"۔ اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ اسی مسلک تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے بیشتر حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ سمجھی جاتی ہیں۔

اس عقیدہ کی سند میں قرآن کریم کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے جسے تقی صاحب نے اپنے مقالہ میں درج کیا ہے یعنی

ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (۲/۱۰۶)

قرآن میں ناسخ و منسوخ کے عقیدہ کی تائید اس آیت سے تو نہیں ہوتی' البتہ اس ترجمہ سے ہوتی ہے جسے تقی صاحب نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔ وہ اس کا ترجمہ یوں لکھے ہیں :-

"ہم جس آیت کو بھی منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے' ہم اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے"۔

اس آیت کا "فعل مستقبل" میں ترجمہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "خدا ایسا کرے گا"۔ یہ ترجمہ قرآنی مفہوم کے خلاف ہے اور اسے محض اس عقیدہ کی تائید کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ شاہ رفیع الدین اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

"جو موقوف کرتے ہیں ہم آیتوں سے یا بھلا دیتے ہیں ہم ان کو لاتے ہیں ہم بہتر ان سے یا مانند ان کے"

مولانا محمود الحسن (مرحوم) نے یوں ترجمہ کیا ہے

"جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر"

یعنی یہ نہیں کہ نزول قرآن کے زمانے میں خدا نے کہا تھا کہ (تقی صاحب کے ترجمہ کے مطابق) قرآن کی جن آیتوں کو ہم منسوخ کریں گے یا بھلا دیں گے تو ان سے بہتر یا ان جیسی آیات اور بھیج دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کہا۔ اس نے اپنے وحی کا ایک اسلوب بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم ایسا کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے' اسے غور سے سنئے۔

قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنہیں وہ اپنی آسمانی کتابیں کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی منسوخ کردیتی تھی اور ان کی جگہ ان سے بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کرسکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرامؑ کی وحی اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہتی تھی۔ اس میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا اور اس کا اکثر حصہ حوادث ارضی و سماوی کی وجہ سے یا خود انسانی دسیسہ کاریوں کے باعث یا ویسے ہی ذہنوں سے فراموش ہوجاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسول اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کرکے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے تمام سابقہ احکام کو جو وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے' منسوخ کردیا اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دے دیئے جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ سابقہ انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا وہ حصہ جو فراموش کردیا گیا تھا لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا اسے قرآن دوبارہ لے آیا۔ اس کی وجہ سے اہل کتاب قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں (یعنی جنہیں قرآن نے منسوخ کردیا تھا اور ان کی

جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی)۔ یا ایسی باتیں جس کا ان کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا جو ان کے پاس اس وقت موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہو چکا تھا اور جسے قرآن دوبارہ لایا تھا)۔ وہ اس تبدیلی کو بطور اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اسی خدا کی طرف سے ہے جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں تو پھر قرآن عینہ ان کتابوں جیسا کیوں نہیں۔

دیکھئے' قرآن کریم ان کی ان بہانہ سازیوں کی پردہ کشائی کس انداز سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ (اے رسولؐ!) اہل کتاب ہوں یا مشرکین عرب' وہ اسے گوارا ہی نہیں کرتے کہ وحی تمہاری طرف نازل ہو۔

ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

(۲/۱۰۵)

"اہل کتاب ہوں یا مشرکین عرب' جو بھی (قرآن کی صداقت سے) انکار کرتے ہیں (ان کے اس انکار کی در حقیقت وجہ یہ ہے کہ) وہ اسے چاہتے ہی نہیں کہ خدا کی یہ خیر و برکت تمہاری طرف نازل ہو جائے (لیکن یہ تو خدا کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے نہ کہ لوگوں کی منشاء کے مطابق)۔ وہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہتا ہے مختص کر لیتا ہے۔ وہ صاحب فضل عظیم ہے"۔

اہل کتاب میں سے یہودی اس انکار و مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان کی اس مخالفت کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت (بنی اسرائیل کو چھوڑ کر) بن اسماعیل کی طرف چلی جائے[۴۰] لیکن اعتراضات اس قسم کے کرتے تھے کہ قرآن کے احکام ان کی شریعت کے خلاف کیوں ہیں۔ (مثلاً" ان کے ہاں اونٹ حرام تھا' قرآن نے اسے حلال قرار دے دیا وغیرہ وغیرہ) اس کے جواب میں قرآن نے یہ بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے کہ **ما ننسخ من ایتہ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا**(۲/۱۰۶) کہ ہم جن سابقہ احکام کو منسوخ کر دیتے ہیں' ان کی جگہ بعد میں آنے والے نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کار فرما ہے۔ سورہ نحل میں منکرین قرآن کا اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

واذا بدلنا ایتہ مکان ایتہ واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون (۱۶/۱۰۱)

"جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل

۴۰۔ قریش اسے کیوں نہیں پسند کرتے تھے' اس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ نبوت' ہمارے سرداروں میں سے کسی کو ملنی چاہئے تھی۔ اس غریب اور یتیم کو کیوں مل گئی؟

کر رہا ہے' تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسولؐ) تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے (کیونکہ یہ ان کتابوں سے مختلف ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں (کہ وحی کا اسلوب کیا ہے)

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔

یہ تو ہوا کتب سابقہ کے ان احکام کے متعلق جنہیں خدا خود منسوخ کرکے' وحی جدید میں ان سے بہتر احکام عطا کردیتا تھا۔ ان میں ایسے احکام بھی شامل تھے جنہیں اہل کتاب نے اپنی طرف سے وضع کرکے شامل کتاب کر رکھا تھا۔ اس کی شہادت قرآن کریم کے مختلف مقامات میں موجود ہے (مثلاً ۵/۱۳)۔ ان تحریفات کو جدید وحی منسوخ کرکے' ان کی جگہ اصلی احکام دے دیتی تھی۔ سورہ حج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته فینسخ الله ما یلقی الشیطن ثم یحکم الله ایته والله علیم حکیم
(۲۲/۵۲)

"اور ہم نے (اے رسولؐ!) تجھ سے پہلے کوئی رسول اور نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کے بعد اس کے تلاوت کردہ (پیغامات خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے کچھ ملا نہ دیا ہو۔ (شیاطین یہ کرتے تھے اور) اللہ ان کی اس آمیزش کو (دوسرے رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا اور اپنے پیغامات کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔ اللہ علیم و حکیم ہے"۔

یہ تھا وحی کے پروگرام کا اسلوب یعنی ہر رسول کی طرف بھیجی جانے والی وحی' سابقہ وحی کے ان احکام کو منسوخ کردیتی تھی جن کا باقی رکھا جانا مقصود نہیں ہوتا تھا' خواہ وہ احکام' سابقہ کتب میں' اپنی اصل شکل میں موجود ہوں اور خواہ وہ الحاقی یا محرف ہوں۔ ان کی جگہ ان سے بہتر احکام نازل کردئے جاتے تھے (**نات بخیر منها** - ۲/۱۰۶)۔

اہل کتاب کے اپنی کتابوں کے بعض پیغامات کے فراموش کردینے کا بھی ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ (**ونسوا حظا مما ذکروا به** (۵/۱۴-۱۳) اگر ان فراموش کردہ پیغامات کا موجود رکھنا مقصود ہوتا تو جدید وحی خداوندی انہیں بحال کردیتی۔

ان تصریحات کی روشنی میں دیکھئے کہ آیہ تنسیخ (۲/۱۰۶) کے صحیح مفہوم کے سمجھنے میں کوئی بھی دقت پیش آتی ہے؟ یعنی اس مفہوم کے سمجھنے میں کہ وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جن سابقہ احکام کا باقی رکھنا مقصود نہیں ہوتا تھا انہیں منسوخ کرکے وحی جدید میں ان سے بہتر احکام دے دیئے جاتے تھے اور وحی سابقہ کے جن احکام کو علے حالہ رکھنا مقصود ہوتا تھا' وحی جدید میں ان کی تجدید کردیجاتی تھی خواہ اہل کتاب نے انہیں فراموش ہی کیوں نہ کردیا ہو۔ اس مفہوم کو

سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہو سکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات' دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے' اور ایسی بھی جنہیں پہلے نازل کیا گیا تھا پھر انہیں محو کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات' روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض موجودہ آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں لیکن خدا نے بتایا نہیں کہ کون سی آیات' کون سی سے منسوخ ہو چکی ہیں' تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کو اس سے کیا غرض کہ خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور رسولؐ اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا؟ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس میں کہیں فرق نہ آجائے' خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات' مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات۔

اب آیئے تقی صاحب کی پیش کردہ دوسری آیت کی طرف یعنی **سنقرئک فلا تنسی الا ماشا اللہ** (۸۷/۶-۷)۔ اس کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے :-

"ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ بھولیں گے نہیں مگر جو کچھ اللہ چاہے"۔

اس آیت کو انہوں نے اس عقیدہ کی تائید میں پیش کیا ہے کہ خدا پہلے (قرآن میں) کچھ آیتیں نازل کر دیتا تھا' پھر انہیں واپس لے جاتا تھا اور انہیں حضورؐ کے حافظہ سے بھی محو کر دیتا تھا۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ سرے سے قرآن کریم کے خلاف ہے کہ خدا پہلے کچھ آیات نازل کرتا تھا اور پھر انہیں واپس لے جاتا تھا۔ قرآن کریم میں ہے

ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیک ثم لا تجد لک بہ علینا وکیلا

(۱۷/۸۶)

"اگر ہم چاہتے تو جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اسے اٹھا کر لے جاتے اور پھر کوئی قوت تیری طرف سے ہمارے خلاف وکالت کر کے (اسے واپس نہ دلا سکتی)"۔

"اگر ہم چاہتے" سے واضح ہے کہ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا بھی کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا' اس لئے ایسا نہیں کیا۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضورؐ پر نازل کیا اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے گیا۔

اس کے بعد آیئے آیت (۸۷/۶) کی طرف جس سے یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ جو کچھ حضورؐ کی طرف نازل کیا جاتا تھا اسے آپؐ خود تو نہیں بھلا سکتے تھے لیکن جس حصہ کے متعلق خدا چاہتا تھا وہ آپ کے حافظہ سے محو ہو جاتا۔ اس کے لئے سند ہے "الا ماشاء اللہ" جس کا مطلب لیا جاتا ہے "بجز اس کے جس کے لئے خدا کی مشیت ہو کہ آپؐ بھول جائیں"۔

تنسیٰ کا مادہ (ن- سی- ی) ہے جس کے معنی بھول جانے کے علاوہ' ترک کر دینے' حفاظت چھوڑ دینے کے بھی

ہیں۔ المنار علامہ محمد عبدہٗ (مرحوم) کی بڑی مستند اور مشہور تفسیر ہے' جسے ان کے شاگرد علامہ رشید رضا (مرحوم) نے مرتب کیا ہے۔ آیت (۸۷/۶) کی تشریح میں وہ نسیان کے مختلف مطالب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

اگر اس کے معنی بھول جانے کے بھی لئے جائیں تو بھی الا ماشاء اللہ اس کی نفی کردیتا ہے۔ کیونکہ "استثناء بالمشیت" اسلوب قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لئے آتا ہے (یعنی جہاں الا کے بعد ماشاء اللہ وغیرہ الفاظ آئیں جن سے مراد مشیت خداوندی ہوتی ہے' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہا گیا ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں ہوگا)۔ جیسا کہ دوسری جگہ ہے **خالدین فیھا ماداست السموت والارض الا ماشاء ربک عطاء غیر مجذو ذ** (۱۱/۱۰۸) یعنی غیر مقطوع اور استثناء میں یہ نکتہ ہے کہ یہ ظاہر کردینا مقصود ہے کہ یہ امور جو ثابتہ اور دائمہ ہیں خدا کی مشیت سے ایسے ہیں' اپنی طبیعت کے لحاظ سے ایسے نہیں۔ اگر خدا اس کے خلاف چاہتا تو ان کو ویسا ہی بنا دیتا (لیکن اس نے ایسا چاہا نہیں)۔

(المنار' جلد اول' ص۱۹-۴۱۶ زیر **ننسخ و ننسھا**)

الا ماشاء اللہ کے ان معانی کی رو سے' سورہ الاعلےٰ کی آیت نمبر۶ کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ :

"اے رسولؐ ! جو کچھ ہم تجھے وحی کی رو سے پڑھائیں گے تو اس میں سے نہ تو کچھ ترک کرسکے گا' نہ فراموش۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ یہ حتمی بات ہے"۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے' قرآن کی صحیح پوزیشن۔ اللہ تعالیٰ نے یوم اول سے جو کچھ حضورؐ پر نازل فرمایا اور یوم آخر تک جب اس کے اتمام کا اعلان کردیا' اس کا کوئی ایک لفظ بھی نہ منسوخ ہوا نہ تبدیل' نہ فراموش۔ یہ سارے کا سارا قرآن' حضورؐ نے خود لکھوا کر' زبانی یاد کراکر' صحابہؓ کو دیا اور وہی قرآن بلا تغیر و تبدل امت کے پاس متواتر چلا آرہا ہے۔ جس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (۱۵/۹) اس میں تغیر و تبدل کیسے ہوسکتا ہے؟ (مسلمان تو ایک طرف) خود غیر مسلموں کی تحقیق بھی اس کی شاہد ہے۔

یہ تو ہے قرآن کریم کی رو سے حفاظت قرآن کی پوزیشن' لیکن وضعی روایات نے اس کا کچھ بھی غیر مشکوک نہیں رہنے دیا اور انہی کے سہارے غیر مسلم اس کے خلاف اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جو جواب دیا جاتا ہے' اس کا نمونہ آپ تقی صاحب کے مقالہ میں دیکھ چکے ہیں۔ یاد رکھئے! جب تک آپ ان وضعی روایات کو صحیح اور مستند تسلیم کرتے رہیں گے' نہ قرآن کی حفاظت ثابت ہوسکے گی اور نہ ہی معترضین کے کسی اعتراض کا اطمینان بخش جواب دیا جاسکے گا۔ اس قسم کی روایات کے متعلق صحیح موقف وہی ہے جسے (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو' بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ کچھ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لئے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں مان لینا پڑے گا کہ یہ اللہ کے رسول کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً" یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی"۔

(ترجمان القرآن' جلد دوم' ص۵۰۰) شائع کردہ' مکتبہ برہان' دہلی۔

لیکن یہاں تو مصیبت یہ ہے کہ وہی بات (مولانا) آزاد کہیں تو وہ امام الہند کے امام الہند رہیں لیکن وہی بات طلوع اسلام کہے تو اسے منکر حدیث' کافر' مرتد قرار دے دیا جائے۔

لیکن طلوع اسلام کو منکر حدیث اور کافر قرار دینے سے آپ اپنے آپ کو تو مطمئن کرسکتے (بلکہ فریب دے سکتے) ہیں' غیر مسلم معترضین کے اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتے' قرآن مجید کی حفاظت ثابت نہیں کرسکتے۔ اس کے لئے تو (مولانا) آزاد کی طرح "منکر حدیث" بننا اور اسلام کے خلاف اعتراضات کا جواب دینے کے لئے قرآن کو سند و حجت قرار دینا ہی پڑے گا۔ (اکتوبر ۱۹۷۴ء)

۱۰۔ قرآن کریم میں تحریف کی نہایت خطرناک سازش

اختلاف قرات

(میرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ محدثیت)

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۷۳ء کی مجلس استفسارات میں ایک سوال میرے پاس بھیجا گیا۔ سوال کا جواب تفصیل طلب تھا اور وقت کم' اس لئے اس کا جواب اس مجلس میں نہ دیا جاسکا۔ لیکن سوال کی اہمیت اس کے جواب کی متقاضی ہے۔ سوال یہ تھا:

آج کل اخبارات میں تحریف قرآن کے متعلق کچھ بحث چل رہی ہے' اس میں ایک بات یہ بھی کہی جا رہی ہے کہ میرزا غلام احمد صاحب نے قرآن کی ایک آیت میں اضافہ کردیا تھا۔ اس کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ وہ آیت حضرت ابن عباسؓ کی قرات میں اسی طرح ہے جس طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ "حضرت ابن عباس کی قرات" سے کیا مراد ہے۔ ذرا تفصیل سے سمجھایئے۔

بات توجہ سے سمجھنے کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر "قرات" سے مراد قرآن کریم کے پڑھنے کا انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ "قاری" اسے کہتے ہیں جو ایک خاص انداز سے قرآن پڑھے۔ لیکن اصطلاح میں "قرات" کا مفہوم اس سے بالکل

الگ ہے۔ قرآن مجید کے متعلق شکوک اور شبہات پیدا کرنے کے لئے جس قدر سازشیں ہوئی ہیں' ان میں "اختلاف قرات" ایک اہم کڑی ہے۔

۲۔ اسلام کی صداقت' افضلیت اور اکملیت کا مدار ختم نبوت پر ہے اور ختم نبوت کا عملی مفہوم یہ ہے کہ :

(۱) **تمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلمته** (۶/۱۱۶) یعنی قرآن مجید مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے سلسلہ میں جو کچھ انسانوں کو دینا تھا وہ مکمل طور پر قرآن کریم میں دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا' اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں اور جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ محکم اور ابدی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکتا اور

(۲) **انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون** (۱۵/۹)

"حفاظت قرآن کا ذمہ خدا نے خود لے رکھا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قرآن' رسولؐ اللہ کو بذریعہ وحی دیا جسے رسولؐ اللہ نے امت تک پہنچایا' اور جو اس وقت سے اس وقت تک مروج ہے' وہ مکمل' غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ بنا بریں' اب خدا کی طرف سے کسی وحی کی ضرورت نہیں۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں۔ اگر قرآن مجید کی ان تینوں بنیادی خصوصیات میں سے کسی ایک کے متعلق بھی کوئی شک و شبہ پیدا ہو جائے تو دین باقی نہیں رہتا۔

(۳) حضورؐ کو جو قرآن خدا کی طرف سے عطا ہوا' آپ نے اسے نہایت احتیاط اور حفاظت سے' امت کو دے دیا' لکھوا کر بھی اور حفظ یاد کرا کر بھی۔ چنانچہ جو قرآن' امت میں مروج ہے' حضورؐ نے اسے اسی ترتیب اور شکل میں امت کو دیا تھا۔ یہی قرآن مکمل' غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ دین کے خلاف سازشوں کے سلسلہ میں پہلے اس قسم کی روایات وضع کی گئیں کہ رسولؐ اللہ نے امت کو قرآن مجید مرتب شکل میں نہیں دیا تھا۔ یہ مختلف اور متفرق کاغذ کے پرزوں' پتھر کے ٹکڑوں' کھجور کے پتوں اور اونٹوں کی ہڈیوں پر منتشر تھا۔ اسے بعد میں جمع اور مرتب کیا گیا--- عہد صدیقیؓ یا فاروقیؓ یا عثمانیؓ میں'--- (روایات کی رو سے) جس طریق سے اسے جمع اور مرتب کیا گیا' وہ بجائے خویش' مختلف قسم کے شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہے (میں اس وقت اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا[۵] موضوع زیر نظر کی طرف بڑھ جانا چاہتا ہوں)۔ عام طور پر اس پر اتفاق ہے کہ عہد عثمانیؓ میں جو نسخہ مرتب ہوا تھا' وہ آگے چلا اور وہی اس وقت تک امت میں رائج چلا آرہا ہے۔ اسی نہج سے اسے مصحف عثمانی کہا جاتا ہے۔

(۴) بات یہاں تک بھی رہتی تو کسی حد تک غنیمت تھا' لیکن سازش اس سے بھی آگے بڑھی۔ کہا یہ گیا کہ خود حضرت عثمانؓ کے زمانے میں' مختلف صحابہؓ کے پاس قرآن مجید کے ایسے نسخے تھے جن میں متعدد آیات ایسی تھیں جو مصحف عثمانی سے مختلف تھیں۔ اسے "اختلاف قرات" کہا جاتا ہے یعنی جب (مثلاً") یہ کہا جائے گا کہ "حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی قرات میں یوں آیا ہے"' تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ 'مصحف عثمانی میں تو یہ آیت یوں درج ہے' لیکن قرآن کا جو نسخہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس تھا' اس میں یہ آیت یوں تھی۔ اس قسم کے اختلافات' دو' چار' دس' بیس'

۵۔ اس کی تفصیل ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" میں ملے گی۔

آیات تک محدود نہیں' ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ حدیث کے مشہور امام اور جامع ابوداؤد کے صاحبزادہ حافظ ابوبکر عبداللہ سجستانی (متوفی ۳۱۶ھ) کی ایک مشہور تالیف ہے۔۔۔ کتاب المصاحف۔۔ اس میں انہوں نے قرآن کی جمع اور تدوین سے متعلق روایات بھی یک جا درج کی ہیں اور صحابہؓ اور تابعینؒ کے مختلف نسخوں (مصاحف) کا بھی ذکر کیا ہے۔ (معاندین کو ایسا مسالہ خدا دے۔ چنانچہ) ایک مستشرق (ARTHUR JEFFERY) نے اس کتاب کو نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے اور اس میں ان مصاحف کی تفصیل بھی درج ہے جو مختلف صحابہؓ اور تابعینؒ کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ان مصاحف کی ان آیات کو بھی درج کیا ہے جو مصحف عثمانی سے مختلف ہیں۔ ان میں صرف صحابہؓ کی طرف منسوب مصاحف حسب ذیل ہیں۔ ہم نے قوسین میں ان آیات کی تعداد لکھ دی ہے جو ان میں مصحف عثمانی سے مختلف ہیں۔ مثلاً" ابن مسعود (۱۳۲۲) سے مراد یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب مصحف میں (۱۳۲۲) آیات ایسی تھیں جو مصحف عثمانی (یعنی ہمارے مروجہ قرآن مجید) سے مختلف تھیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) حضرت ابن مسعودؓ (۱۳۲۲)۔ (۲) حضرت ابی بن کعبؓ (۹۵۲)۔ (۳) حضرت علیؓ (۸۹)۔ (۴) حضرت ابن عباسؓ (۱۸۶)۔ (۵) حضرت ابو موسیٰؓ (۴)۔ (۶) حضرت حفصہؓ (۱۰)۔ (۷) حضرت انس بن مالکؓ (۲۴)۔ (۸) حضرت عمرؓ (۲۸)۔ (۹) حضرت زید بن ثابتؓ (۱۰)۔ (۱۰) حضرت ابن زبیرؓ (۳۴)۔ (۱۱) حضرت عمرابن العاصؓ (تعداد معلوم نہیں)۔ (۱۲) حضرت عائشہؓ (۱۳)۔ (۱۳) حضرت سالمؓ (۲)۔ (۱۴) حضرت ام سلمہؓ (۴)۔ (۱۵) حضرت عبید ابن عمیرؓ (۱۸)۔

تابعینؒ کی طرف منسوب مصاحف' نیز ایسے مصاحف جو بے نام ہیں' ان کی تعداد الگ ہے۔ ان اختلافات کی یہ نوعیت نہیں کہ ان میں محض زیر' زبر کا فرق ہے' (اگرچہ عربی زبان میں زیر' زبر کے فرق سے بھی بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے) ان میں الفاظ تک بدلے ہوئے ہیں۔ کہیں الفاظ کا اضافہ ہے' کہیں وہ محذوف ہیں۔ کہیں تبدیل شدہ ایسے الفاظ ہیں جن سے معانی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جب قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ صحابہؓ کے زمانے میں بھی' مختلف صحابہؓ کے نسخوں میں اختلاف تھا اور جو نسخہ مستند طور پر امت کو دیا گیا تھا (مصحف عثمانی) خود اس میں' اور ان نسخوں میں سیکڑوں مقامات میں اختلاف تھا' تو قرآن کے دعوئے اکملیت' محکمیت (غیر متبدل) اور محفوظ ہونے کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اور قیامت تک کے قیامت یہ کہ ہمارے علماء کرام ان "مختلف قراتوں" کے قائل ہیں۔ چنانچہ آپ نے اکثر ان حضرات کو کہتے سنا (یا لکھتے دیکھا) ہوگا کہ قرآن مجید کی آیت یوں ہے لیکن فلاح صحابی کی قرأت میں یوں آیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ

افلا یتدبرون القران ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (۴/۸۲)

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے"۔

یعنی قرآن نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف بات نہیں۔ آپ

سوچئے کہ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ فلاں آیت ایک مصحف میں یوں آئی ہے اور دوسرے میں یوں' تو کیا قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ باقی رہ سکتا ہے؟ اس عقیدہ سے دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے- یہ ہے وہ سازش جو قرآن یا (دین) کے خلاف کی گئی!

اس تمہید کے بعد' اس سوال کی طرف آیئے جسے شروع میں درج کیا گیا ہے- سورۂ حج کی ایک آیت ہے-

(۱) وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیته فینسخ الله ما یلقی الشیطن ثم یحکم الله ایته و الله علیم حکیم (۲۲/۵۲)

"(وحی کا سلسلہ ایسا رہا ہے کہ) کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں آیا جس (کے بعد اس) کی وحی میں' دین کے دشمنوں (شیاطین) نے آمیزش نہ کردی ہو- (جب ایسی تحریف ہو جاتی تھی تو خدا ایک اور رسول بھیج دیتا تھا اور اس کی طرف نازل کردہ وحی کے ذریعے) اس آمیزش شیطانی کو منسوخ کرکے' خالص وحی کو پھر محکم کردیتا تھا اور یہ سب کچھ خدا کے علم و حکمت کی بنا پر ہوتا تھا-[۶]

مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب' "براہین احمدیہ" میں (جو غالباً" ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے) کہا ہے کہ انہوں نے رسالت یا نبوت کا دعویٰ نہیں کیا- انہوں نے "محدث" ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کی سند میں کہا ہے کہ محدثین کا ذکر خود قرآن مجید میں موجود ہے- (معترضین نے کہا کہ) مرزا صاحب نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیت کو اس طرح پیش کیا ہے-

(۲) وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث الا .....

یعنی مرزا صاحب نے قرآن کریم کی آیت میں' لفظ محدث کا اضافہ اپنی طرف سے کردیا ہے- یہ قرآن میں تحریف ہے اور جس دعویٰ کی بنیاد تحریف قرآنی پر ہو' اس کے باطل ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ مرزا صاحب کے متبعین کی لاہوری شاخ کے ترجمان "پیغام صلح" کی ۱۴ نومبر ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے-

> مصنف کتابچہ نے اس عبارت سے پیشتر یہ الفاظ حذف کردیئے ہیں' "آپ کو معلوم ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی قرات میں آیا ہے"- حضرت مرزا صاحب' حضرت ابن عباسؓ کی قرات درج کر رہے ہیں اور فاضل مصنف اسے آیت قرآنیہ قرار دے کر اور سیاق

۶- ہمارے مترجمین نے اس آیت کا ترجمہ کیا کیا ہے' اور تفسیری روایات نے اس میں کیا گل کھلائے ہیں- ہم اس وقت ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ہم سردست اپنے آپ کو موضوع زیر نظر تک محدود رکھنا چاہتے ہیں-

و سباق کو حذف کرکے اشتعال انگیزی میں مصروف ہیں تاکہ نان جویں تو میسر آسکے۔
یاد رہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی قرات درج کرکے حضرت مرزا صاحب بھی یہی ثابت
کر رہے ہیں کہ میرا منصب ملہم و محدث کا ہے نہ کہ نبوت کا' جیسا کہ غالی مریدوں اور
مخالفوں کا پروپیگنڈا ہے۔

میرزا صاحب نے براہین احمدیہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آپ لوگ کیوں قرآن شریف میں غور نہیں کرتے اور کیوں سوچنے کے وقت
غلطی کھا جاتے ہیں۔ کیا آپ صاحبوں کو خبر نہیں کہ صحیحین سے ثابت ہے کہ
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اس امت کے لئے بشارت دے چکے ہیں کہ اس امت
میں بھی پہلی امتوں کی طرح محدث پیدا ہوں گے اور محدث بفتح دال وہ لوگ ہوں
گے جن سے مکالمات و مخاطبات الہیہ ہوتے ہیں۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ابن عباس
کی قرات میں آیا ہے۔ **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث
الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطان ثم
یحکم اللہ ایتہ** ۷۔ پس اس آیت کی رو سے بھی جس کو بخاری نے بھی لکھا ہے'
محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا۔
(براہین احمدیہ' شائع کردہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام' لاہور)
۱۹۷۰ء آفسٹ ایڈیشن' ص۳۴۸' حاشیہ در حاشیہ)

آپ ان الفاظ کو غور سے پڑھئے۔ میرزا صاحب پہلے کہتے ہیں کہ " ابن عباس کی قرات میں آیا ہے"۔ اور اس کے بعد لکھتے ہیں "اس آیت کی رو سے بھی جسے بخاری نے بھی لکھا ہے' محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے۔ "بالفاظ دیگر' وہ قرات حضرت ابن عباس کی آیت کو "آیت" کہہ کر پکارتے ہیں (جس کے معنی لا محالہ آیت قرآنی ہیں) اور اس آیت کو اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ "محدث" کا الہام قطعی اور یقینی ہوتا ہے" (واضح رہے کہ لفظ محدث سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا)۔

اس ضمن میں ہم "احمدی" حضرات سے حسب ذیل سوالات متعین طور پر پوچھنا چاہتے ہیں۔

(ا) کیا ان کے عقیدے کی رو سے' اللہ تعالیٰ نے جو آیت بذریعہ وحی رسولؐ اللہ پر نازل کی تھی' وہ اس طرح تھی جس طرح ہمارے مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے یا اس طرح' جیسے قرات حضرت ابن عباس میں بتائی جاتی ہے (لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ)۔

۷۔ میرزا صاحب نے یہاں آیت کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن اپنے اشاریہ میں اس کا حوالہ (انبیاء ـــــ ۲۱ : ۲۵) لکھا ہے جو غلط ہے۔ قرآنی آیت کا حوالہ سورۂ الحج آیت نمبر ۵۲ ہے۔ (۲۲/۵۲)

(۲) اگر وہ آیت اس طرح تھی جس طرح مروجہ قرآنی نسخوں میں درج ہے (لفظ محدث کے بغیر)' تو جس آیت میں لفظ محدث کا اضافہ ہو' آپ اسے کیا قرار دیں گے؟ کیا آپ اسے قرآن میں تحریف قرار دیں گے یا نہیں' کیونکہ اضافہ بھی تو تحریف ہوتا ہے۔

(۳) اگر آپ اسے قرآن میں تحریف قرار دیں گے تو جو شخص اپنے کسی دعویٰ کی تائید میں اس قسم کی محرف آیت کو پیش کرے' اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے!

(۴) اور اگر آپ کہیں کہ آپ دونوں آیتوں کو منزل من اللہ مانتے ہیں تو پھر قرآن کریم کے اس دعویٰ کے متعلق آپ کیا کہیں گے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۵) آپ دنیا کے سامنے "منزل من اللہ قرآن شریف" کون سا پیش کرتے ہیں؟ وہی جو مسلمانوں میں مروج ہے یا دیگر قراتوں والا؟ اگر وہی پیش کرتے ہیں تو دوسری قراتوں والے مصاحف کی آپ کے نزدیک کیا حیثیت ہے؟

ہم "احمدی" حضرات سے گزارش کریں گے (خواہ وہ قادیانی ہوں یا لاہوری) کہ وہ ان سوالات کے دو ٹوک اور متعین جوابات مرحمت فرمائیں۔ اس قسم کا جواب کہ "اس باب میں جو عقیدہ جمہور مسلمانوں کا ہے وہی ہمارا عقیدہ ہے" قابل تسلیم نہیں ہوگا۔ بات آپ کے مقتدا نے کی ہے' اس لئے اس کا جواب آپ کے ذمے ہے۔ آپ اپنا متعین جواب لکھئے (خواہ وہ جمہور مسلمانوں کے مطابق ہو یا اس کے خلاف)۔ آپ کا جواب موصول ہونے پر بات آگے چل سکے گی۔ (پرویز) (جنوری ۱۹۷۴)

اس کے جواب میں "احمدی" حضرات کی لاہوری شاخ کے ترجمان "پیغام صلح" بابت ۲۳ جنوری ۱۹۷۴ء نے مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا کہ اگر ان حضرات کا مبلغ علم اتنا ہی ہے تو پھر اس مذہب کا خدا حافظ جس کے یہ مبلغ ہیں۔ اور اگر انہوں نے ایسا کچھ (دیدہ و دانستہ) محض میرزا صاحب کی مدافعت کے لئے لکھا ہے تو یہ صورت حالات اس سے بھی زیادہ تاسف انگیز ہے۔ "پیغام صلح" نے لکھا ہے کہ جسے "اختلاف قرات" کہا جاتا ہے اس سے مراد یہ نہیں کہ ان (صحابہؓ) کی طرف منسوب قرآنی نسخوں (مصاحف) میں یہ آیات اس طرح درج تھیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرات ان آیات کا مفہوم یہ لیتے تھے۔ "پیغام صلح" کے الفاظ یہ ہیں۔

(۱) اس سے ظاہر ہے کہ ان نسخوں میں مندرج آیات کو آیات قرآنی قرار نہیں دیا گیا' بلکہ "اختلاف قرات" کہا گیا ہے اور یہ اختلاف قرات کیا ہے؟ اس کو آیات قرآنی کی تعبیر و تفسیر ہی کہا جاسکتا ہے۔

(۲) قرات ابن عباس سے مفہوم یہ ہے کہ اس قرات کے مطابق محدث کے معنی بھی اس آیت سے نکل سکتے ہیں۔

(۳) میرزا صاحب نے اپنے دعوائے محدثیت کی تائید میں اسے قرآن کی آیت کے

طور پر پیش نہیں کیا بلکہ صرف آیت قرآنی کا مفہوم قرار دیا ہے۔

عربی زبان کا ایک ابجد خواں بھی اس حقیقت سے واقف ہوگا کہ "قرات" کے معنی "تفسیر و تعبیر" نہیں۔ اس کے معنی "پڑھنا" ہیں۔ جب "قرات ابن عباس" کہا جائے گا تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کو یوں پڑھا کرتے تھے اور جس طرح وہ اس آیت کو پڑھا کرتے تھے اسی طرح یہ ان کے مصحف میں درج تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی تفسیری روایات الگ ہیں اور ان کی طرف منسوب کردہ مصحف (قرآنی نسخہ) الگ۔ ان کی تفسیر میں نہیں' بلکہ ان کی طرف منسوب کردہ مصحف میں زیر بحث آیت' لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ درج ہے۔ لہٰذا' اسے "تفسیر" کہنا دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ "قرات" کا لفظ قرآن کریم میں (بصیغہ فعل) اور کتب احادیث میں "پڑھنے" کے معنوں میں آیا ہے۔ بخاری میں "مدالقرات" ایک باب ہے جس میں "قرات رسولؐ اللہ" کے تحت لکھا ہے کہ حضورؐ قرآن کریم کو ٹھہر ٹھہر کر اور الفاظ کو کھینچ کر پڑھا کرتے تھے۔ بخاری (کتاب فضائل قرآن) میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ایک روایت ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ :-

میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسولؐ اللہ کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے سنا۔ "**فاستمعت لقراتہ**" میں نے ان کا پڑھنا (قرات) سنا تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسولؐ اللہ نے نہیں پڑھائے تھے....

ان تصریحات سے واضح ہے کہ "قرات" کے معنی "پڑھنا" ہیں' تفسیر یا مفہوم نہیں۔ ویسے بھی قرآنی آیت **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی .....** کے متعلق کہنا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث.....** قرآن کریم سے (معاذ اللہ) مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآن کریم نے "رسول اور نبی" کہا ہے۔ ان میں سے کون سا لفظ ہے جس کا مفہوم "محدث" ہے؟ اور اگر یہ تفسیر ہے تو پھر اضافہ کسے کہتے ہیں؟

آیئے! آپ کو بتائیں کہ صاحب "کتاب المصاحف" (سجستانی) نے "اختلاف قرات" کا مفہوم کیا بتایا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ جب یہ کہا جائے گا کہ فلاں صاحب کا مصحف' ہمارے مصحف سے مختلف ہے تو اس اختلاف کی تین شکلیں ہوں گی۔

(۱) رسم الخط (کتابت) میں اختلاف۔

(۲) آیات میں الفاظ کے اضافہ کا اختلاف۔

(۳) آیات میں الفاظ کی کمی کا اختلاف۔ (کتاب المصاحف ص۳۰)

اس کے بعد جب وہ اختلاف قرات کی روایات درج کرتے ہیں تو ان میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں کہ فلاں راوی (یا راویوں) نے کہا ہے کہ **سمعنا عمر ابن الخطاب یقراء** ہم نے عمر ابن خطابؓ کو اس آیت کو یوں پڑھتے سنا..... **یا وقال ھذا قرات ابی ابن کعبؓ.....** راوی نے کہا ہے کہ یہ ابی بن کعبؓ کی قرات ہے (ص۵۳'۵۱)۔

ان مثالوں سے واضح ہوگیا ہوگا کہ اختلاف قرات سے کیا مراد ہے۔

رسم الخط کے اختلاف سے قطع نظر' اختلاف قرات کی دو شکلیں بتائی گئی ہیں۔ (۱) آیات میں الفاظ کا اضافہ۔ (۲) الفاظ کی کمی۔ پہلے الفاظ کی کمی کی دو چار مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) مروجہ نسخوں میں **فلا رفث لا ولا فسوق ولا جدال فی الحج** (۲/۱۹۷) مصحف عبداللہ بن مسعود میں **فلا رفث ولا جدال فی الحج** (ولا فسوق کے الفاظ نہیں ہیں)۔

(۲) مروجہ نسخوں میں **قالا ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا**۔ (۷/۲۳) مکتبہ مصحف ابن مسعودؓ میں **قالا ربنا الا تغفرلنا و ترحمنا** (ظلمنا انفسنا کی کمی اور **وان لم** کی جگہ **الا تغفرلنا**)۔

(۳) مروجہ نسخوں میں **ومن الشیطین من یغوصون لہ ویعملون عملا دون ذالک وکنالھم حفظین**۔ (۲۱/۸۲)

مصحف ابن مسعودؓ میں **ومن الشیطین من یغوص لہ ویعمل و کنالھم حفظین** (الفاظ میں کمی اور اختلاف دونوں)۔

آیات میں الفاظ کے اضافہ کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تفسیر (یا توضیح مطلب) کے لئے لکھ دیئے گئے ہیں لیکن جن آیات میں الفاظ کو حذف کردیا گیا ہے' ان کے متعلق کیا کہیں گے؟ یا (مثلاً") اس اختلاف کے متعلق کہ مروجہ قرآن مجید میں ہے **وسخر لکم الیل والنھار والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ** (۱۶/۱۲) اور مصحف ابن مسعودؓ میں ہے **وسخرلکم الیل والنھار والشمس والقمر والریاح بامرہ** کیا الریاح (ہوائیں) النجوم (ستارے) کی تفسیر قرار پاسکتی ہے؟

"کمی" کے متعلق اتنا اور سن لیجئے کہ مصحف حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ میں قرآن کریم کی تین سورتیں (سورۃ فاتحہ' سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) تھیں ہی نہیں (روایات میں ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ یہ سورتیں قرآن کا حصہ ہیں ہی نہیں)۔

غور فرمایا آپ نے کہ "اختلاف قرات" کا کیا مفہوم ہے؟ جہاں تک اضافہ کا تعلق ہے' ہم اس کے لئے ایک مثال ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کے سلسلہ میں قرآن کریم (سورۃ النساء) میں ان رشتوں کی تفصیل دینے کے بعد جن سے نکاح حرام ہے' کہا گیا ہے۔

> **واحل لکم ما وراء ذالکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین فما استمتعتم بہ منھن فاتوھن اجورھن فریضہ ..... (۴/۲۴)**
>
> "اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لئے حلال ہیں' اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لاکر نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے جس

کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو" (ترجمہ مولانا محمد علی لاہوری)

سینوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مراد اکرکے' دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس' شیعہ حضرات متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت' ایک مدت معینہ کے لئے مباشرت کا معاملہ طے کرلیتے ہیں اور اس کے لئے اس عورت کو جنسی تعلق کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سینوں کے ہاں متعہ حرام ہے۔

اس تمہید کے بعد آگے بڑھئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سینوں کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ ان کی قرات (مصحف) میں مندرجہ بالا آیت یوں آئی ہے۔

فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی .....

تم ان سے ایک مدت معینہ کے لئے فائدہ اٹھاؤ۔

یعنی اس قرات کی رو سے آیت قرآنی میں "الی اجل مسمی" کا اضافہ کیا گیا ہے جس سے متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ اب دیکھئے کہ اس اضافہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کیا فرماتے ہیں۔ سینوں کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ قابل اعتماد تفسیر' تفسیر طبری ہے۔ وہ اس آیت (۴/۲۴) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"ابو نضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۃ النساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا' کیوں نہیں۔ کہا' پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ **فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمی**۔ میں نے کہا' نہیں۔ میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا کہ اچھا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبدالاعلیٰ کی روایت میں بھی ابو نضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباسؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی **فما استمتعتم بہ منھن**۔ ابن عباسؓ نے کہا **الی اجل مسمی**۔ میں نے کہا میں تو اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا' "خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے"۔

ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب بھی یہ بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے یا نہیں کہ "اختلاف قرات" سے کیا مراد ہے؟ کیا اس کے بعد بھی آپ فرمائیں گے کہ اختلاف قرات سے مراد تفسیر اور مفہوم کا اختلاف ہے؟ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "خدا کی قسم! خدا نے اس آیت کو نازل ہی اس طرح کیا تھا جس طرح میں پڑھتا ہوں نہ کہ اس طرح جس طرح یہ مصحف عثمانی میں درج ہے"!

آیئے اب آپ کو یہ بتائیں کہ یہ تصور کہاں سے آیا ہے کہ "اصل میں تو یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی' لیکن مروجہ قرآن میں یہ اس طرح درج ہے"۔

شیعہ حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ جو قرآن مسلمانوں میں مروج ہے وہ محرف ہے۔ اس میں اکثر و بیشتر آیات اس طرح نہیں لکھی گئیں جس طرح وہ نازل ہوئی تھیں۔ ان میں تحریف کردی گئی ہے۔ اصلی آیات کا علم ان کے ائمہ کرامؒ کو ہے۔ الکافی شیعہ حضرات کی سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث کی کتاب ہے۔ یہی ان کے مسلک کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ اس میں متعدد آیات کے متعلق لکھا ہے کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں اس طرح درج ہے۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

عن جابر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال قلت لہ لم سمی امیر المومنین قال اللہ سماہ وھکذا انزل فی کتابہ واذ اخذ ربک من بنی ادم من ظھورھم ذریتھم واشھدھم علی انفسھم الست بربکم وان محمد رسول اللہ وان علیا امیر المومنین (۷/۱۷۲)

جابر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ حضرت علیؓ کا نام امیرالمومنین کیوں ہوا۔ فرمایا کتاب خدا میں یوں نازل ہوا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

(کتاب الشافی' ترجمہ الکافی' جلد اول' ص۵۰۹)

قرآن کریم (مروجہ نسخوں) میں اس آیت (۷/۱۷۲) میں **"وان محمد رسول اللہ وان علیا امیر المومنین"** کے الفاظ نہیں۔ لیکن الکافی میں ہے کہ یہ آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی جس طرح الکافی میں درج ہے۔ یا مثلاً":۔

عن ابی بصیر عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قولہ تعالی و من یطع اللہ و رسولہ فی ولایتہ علی وولایتہ الائمتہ من بعدہ فقد فازا فوزا" عظیما۔ ھکذا نزلت۔

ابو بصیر سے مروی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت **من یطع اللہ و رسولہ** کے متعلق فرمایا..... (اس کے بعد آیت درج ہے) کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی تھی۔

(کتاب الشافی' جلد اول' ص۵۱۰)

قرآن کریم کے مروجہ نسخوں میں آیت (۳۳/۷۱) میں یہ الفاظ نہیں **"فی ولایتہ علی و ولایتہ الائمتہ من بعدہ"** لیکن الکافی کا بیان ہے کہ یہ آیت دراصل ان الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی تھی لیکن مصحف عثمانی میں ان الفاظ کو خذف کر دیا گیا ہے۔

غرضیکہ' الکافی میں متعدد آیات ایسی درج ہیں جو مروجہ قرآنی نسخہ سے مختلف ہیں اور جن کے متعلق کہا گیا کہ "**ھکذا انزلت**" یہ اسی طرح نازل ہوئی تھیں۔ اس کو وہ "قرات اہل بیت" کہتے ہیں۔

شیعہ حضرات نے یہ کہا تو سنیوں نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ یہ روایات شیعہ حضرات کی ہیں جو ہمارے نزدیک وضعی ہیں۔ ہم ان کو سند تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ خود سنیوں کی کتب روایات میں بے شمار آیات ایسی آگئیں جو مروجہ نسخہ قرآن مجید سے مختلف ہیں۔ انہیں "اختلاف قرات" کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق وہ صحابہؓ جن کی طرف یہ روایات منسوب ہیں' فرماتے ہیں (جیسا کہ ہم حضرت ابن عباسؓ کے متعلق دیکھ چکے ہیں) کہ یہ آیات دراصل نازل اس طرح ہوئی تھیں' یعنی وہی بات جو شیعہ حضرات کی روایات میں تھی۔ اس کے بعد سنیوں کے پاس' شیعہ حضرات کی مخالفت کے لئے کوئی دلیل نہ رہی' اور شیعہ اور سنی دونوں کی کتب روایات کی رو سے ثابت ہو گیا کہ موجودہ قرآن مجید (معاذ اللہ) محرف ہے۔

لیکن سنی حضرات ہیں کہ ہزار برس سے شیعہ حضرات سے جھگڑتے چلے آ رہے ہیں کہ آپ لوگ قرآن کو محرف کہتے ہیں حالانکہ قرآن غیر محرف' غیر متبدل' کتاب خداوندی ہے اور اس کے ساتھ ہی "اختلاف قرات" کی روایات کو بھی صحیح مانتے چلے آتے ہیں اور اتنا نہیں سوچتے کہ ان روایات کو صحیح مان کر' تحریف فی القرآن کا ثبوت آپ خود بہم پہنچا رہے ہیں۔

---------○---------

اب آیئے عقیدۂ محدث کی طرف اور اسے غور سے پڑھیئے۔

الکافی کی "کتاب الحجۃ" کے ایک باب کا عنوان ہے

نبی و رسول و محدث کا فرق

اس کے نیچے سب سے پہلی روایت یہ درج ہے:۔

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے **انہ کان رسولا نبیا** " کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ فرمایا نبی وہ ہے جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے' اس کی آواز سنتا ہے' لیکن ظاہر بظاہر حالت بیداری میں نہیں دیکھتا اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے' خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی۔ میں نے پوچھا' امام کی منزلت کیا ہے۔ فرمایا فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی ولا محدث.....

(کتاب الشافی' جلد اول' ص ۲۰۳)

عربی (الکافی) میں (**ولا محدث**) کے نیچے (حاشیہ میں) لکھا ہے:۔

انما ھو فی قراۃ اھل البیت علیھم السلام۔ (جلد اول' ص ۱۷۶)

قرات اہل بیت میں اسی طرح آیا ہے

الکافی میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ میں اور میرے صلب میں گیارہ امام محدث ہیں۔ (الشافی' جلد اول' ص۲۸۱)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ محدث کے عقیدہ کا سرچشمہ (ORIGIN) کیا ہے اور قرات کا مفہوم کیا؟

لیکن یہ روایت شیعہ حضرات کی ہے جو سینوں کے نزدیک سند قرار نہیں پا سکتی تھی اس لئے سینوں کے ہاں یہی روایت "قرات ابن عباسؓ" کے لباس میں آگئی۔ چنانچہ مصحف حضرت ابن عباسؓ میں یہ آیت اسی طرح درج ہے۔ یعنی:۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول و لا نبی ولا محدث۔ (۲۲/۵۲)

اور اس کو میرزا صاحب اپنے دعویٰ محدثیت کی تائید میں پیش فرماتے ہیں اور "پیغام صلح" اسے تفسیر قرار دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ:۔

(۱) قرآن کریم جس طرح خدا کی طرف سے حضورؐ پر نازل ہوا' حضورؐ نے اسے محفوظ و مرتب شکل میں امت کو دے دیا۔ یہ مصحف' حضورؐ کی زندگی میں لکھا ہوا' مرتب شکل میں بھی موجود تھا اور ہزاروں' لاکھوں حفاظ کے سینے میں بھی محصور۔

(۲) قرآن کریم کا یہی نسخہ صحابہ کرامؓ کے پاس تھا۔ اس کی نقول عہد خلافت راشدہ میں مختلف ممالک میں بھیجی گئیں۔ یہی قرآن امت کے پاس محفوظ شکل میں اب تک چلا آرہا ہے۔

(۳) کسی کے پاس نہ کوئی اور نسخہ تھا اور نہ کوئی اس بات کا مدعی یا قائل کہ اس کے پاس کچھ آیات ایسی ہیں جو مروجہ قرآن میں اور طرح درج ہیں۔

اس قسم کی تمام روایات جن میں کہا گیا ہے کہ۔ (۱) حضورؐ قرآن کو غیر مرتب شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ (۲) اسے بعد میں صحابہؓ نے مرتب کیا۔ (۳) مختلف صحابہؓ بعض آیات کو کسی اور طرح پڑھتے تھے یا۔ (۴) ان کے پاس مختلف مصاحف تھے' سب وضعی ہیں اور قرآن کریم کو محرف ثابت کرنے کی سازش۔

ہمارے علماء ان وضعی روایات کو صحیح مانتے ہیں کہ انہیں اسلاف کی تقلید میں ایسا کرنا پڑتا ہے' لیکن آپ غور کیجئے کہ ایک صاحب (میرزا غلام احمد صاحب) نبی' رسول' یا کم از کم' مامور من اللہ' مجدد' محدث' ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ایک ایسی روایت کو اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کرتے ہیں جو بالبداہت وضعی ہے۔ یہ صورت دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو مرزا صاحب کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ محدث کے نظریہ کا سرچشمہ کونسا ہے اور کس طرح یہ شیعی عقیدہ' وضعی روایات کے راستے سینوں کے ہاں پہنچ گیا اور یا انہوں نے عام مسلمانوں کے تقلیدی عقیدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' دانستہ ایسا کیا۔ دونوں صورتوں میں جو نتیجہ سامنے آتا ہے' ظاہر ہے۔

اس کے بعد میرا سوال جو پہلے اٹھایا گیا تھا' بدستور قائم رہتا ہے۔ یعنی:۔

(۱) میرزا صاحب نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ کی قرات میں آیت (۲۲/۵۲) لفظ "محدث" کے اضافہ کے ساتھ آئی ہے۔

(۲) طبری کی تفسیر سے واضح ہے کہ خود حضرت ابن عباسؓ نے اس امر کی تشریح کر دی تھی کہ ان کی "قرات" سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ آیات دراصل یوں نازل ہوئی تھیں۔

(۳) اس سے واضح ہے کہ خود مرزا صاحب یہ مانتے تھے کہ یہ آیت لفظ محدث کے اضافہ کے ساتھ نازل ہوئی تھی اور مروجہ نسخہ قرآن میں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا' وہ قرآن میں تحریف کے قائل تھے۔ یہ کہہ کر ان کی مدافعت کرنا کہ اختلاف قرات سے مراد تفسیر و تعبیر ہے' خود فریبی ہے یا مغالطہ آفرینی کی ناکام کوشش۔

"پیغام صلح" نے مرزا صاحب کے غلط مسلک کی مدافعت میں جس طرح پیچ و تاب کھائے ہیں' اس قسم کے واقعات سے یہ حقیقت اور بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ختم نبوت کا اعلان کس طرح خدا کی رحمت ہے۔ اس عقیدہ کا عملی مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کے بعد کوئی شخصیت ایسی نہیں ہو سکتی جسے ہم منزہ عن الخطاء سمجھنے کے لئے مکلف ہوں۔ ختم نبوت پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک میرزا صاحب ایک عام انسان تھے۔ اس لئے ان کی فکر میں اسقام اور پیش کردہ تعلیم میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جب انہیں مامور من اللہ ملہم ربانی تسلیم کر لیا جائے تو پھر انہیں منزہ عن الخطاء ماننا پڑتا ہے اور ایسا ماننے والوں پر' ہر معاملہ میں ان کی مدافعت عقیدۃً ضروری قرار پا جاتی ہے۔ اب سوچئے کہ جس شخص کو کسی کی ناقابل مدافعت (غلط) بات کی مدافعت کرنی پڑے تو (اگر اسے اپنی اس مجبوری کا احساس ہے تو) وہ کس قدر ذہنی کوفت اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے گا۔ اور اگر (شدت عقیدت کی بنا پر) اسے اس کا احساس ہی نہیں' تو اس سے کس قدر مضحکہ انگیز حرکات سرزد ہونگی۔ یہی کیفیت میرزا صاحب کے اغلاط و اسقام کی مدافعت میں انکے متبعین کی ہوتی ہے' جیسا کہ زیر نظر بحث سے واضح ہے۔ (پرویز)

(مارچ ۱۹۷۴ء)

۱۱۔ جمع و تدوین قرآن مجید (روایات کی روشنی میں)

"اختلاف قرات" سے متعلق وہ مقالہ جو سابقہ صفحات میں درج کیا جا چکا ہے' شائع ہوا تو چاروں طرف سے اس قسم کے استفسارات موصول ہونے شروع ہو گئے کہ قرآن مجید کی جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ روایات میں آیا ہے' اسے بھی تفصیل سے بیان کر دیا جائے۔ ان کے جواب میں حسب ذیل مقالہ طلوع اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ یہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے تاکہ آپ کو معلوم ہو

جائے کہ وضعی روایات کے ذریعے اسلام کے خلاف کتنی گہری اور خطرناک سازش ہوئی ہے۔ اس قسم کی ہیں وہ روایات جن کو صحیح ماننے سے طلوع اسلام کو "منکر حدیث" قرار دیا جاتا ہے۔

عجمی سازشوں نے جہاں حقیقی اسلام کی جگہ ایک بالکل نیا اسلام وضع کر کے مسلمانوں میں عام کر دیا' اس کے ساتھ ہی انہوں نے چپکے ہی چپکے ایسی کوششیں بھی کیں جن سے یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہا۔ یہ اس سازش کا اتنا بڑا حربہ تھا جس نے فی الواقع دین کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قرآن کی جمع و تدوین کے متعلق عجیب و غریب داستانیں وضع کیں اور انہیں احادیث کے مجموعوں میں بھر دیا۔ اس ضمن میں حافظ ابو بکر عبد اللہ ابن ابی داؤد سلیمان ابن اشعث بجستانی کی شہرۂ آفاق کتاب "کتاب المصاحف" (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں قرآن کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یک جا جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ روائتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر موجود ہیں۔

کتاب المصاحف۔ یہ کتاب ابو بکر عبد اللہ بن ابی داؤد کی تصنیف ہے جن کا سنہ پیدائش ۲۳۰ھ اور سنہ وفات ۳۱۶ھ ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث بجستانی (جن کی کتاب سنن ابو داؤد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے) کے بیٹے ہیں۔ آپ کی کتاب المصاحف علمائے حدیث کے ہاں بہت مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر متقدمین کی کتابوں میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ امام ابن الجزریؒ نے ان کو ثقہ' کبیر' مامون کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

مصنف کے اس مختصر تعارف کے بعد ہم آپ کو کتاب المصاحف کے جستہ جستہ مقامات سے روشناس کراتے ہیں۔ سنتے جائیے اور سر دھنتے جائیے۔

قرآن کو حضورؐ نے جمع نہیں کیا بلکہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جمع کرایا

(۱) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابتؓ سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہل یمامہ کا قتل ہوا' حضرت ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابو بکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہو گئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسولؐ اللہ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارہ میں مجھ سے برابر کہتے رہے' حتی کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرح صدر کر دیا تھا میرا بھی شرح صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہو گئی جو ان کی تھی۔ ابو بکرؓ مجھ سے کہنے لگے تم نوجوان اور عقل مند آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمہیں متہم نہیں سمجھتے' لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زیدؓ بن ثابت

کہتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسولؐ اللہ نے نہیں کیا وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابو بکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے' حتی کہ جس امر کے لئے ان دونوں کو شرح صدر ہو چکا تھا مجھے بھی شرح صدر ہو گیا اور وہی میری رائے بھی ہو گئی جو ان دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں' کھجور کے پٹھوں' پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کیا۔ حتی کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی' یعنی **لقد جاء کم رسول من انفسکم** (الایہ) چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالاخر' خزیمہ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا۔

صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قرآن کیونکر جمع کیا گیا۔

(۲) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عروہ بن زبیر سے نقل کرتے ہیں کہ جب بہت سے قاری قتل ہو گئے تو ابو بکرؓ کو یہ خوف ہوا کہ اس طرح تو قرآن ہی ضائع ہو جائے گا۔ آخر انہوں نے عمرؓ اور زیدؓ ابن ثابت سے کہا کہ مسجد کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور جو شخص کتاب اللہ کے متعلق کسی چیز پر دو گواہ پیش کر دے اس کو قرآن میں لکھ لو۔

(۳) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبد خیر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو کہتے ہوئے سنا کہ مصاحف کے بارہ میں سب سے بڑا ثواب ابو بکرؓ کو ملے گا۔ خدا ابو بکرؓ پر رحم فرمائے۔ وہی پہلے شخص ہیں جس نے قرآن کو لوحین کے درمیان جمع کر دیا۔

قرآن صدیق اکبرؓ نے خود جمع کیا اور حضرت زیدؓ نے نظر ثانی فرمائی

(۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ سالم اور خارجہ سے نقل کرتے ہیں کہ ابو بکر صدیقؓ نے قرآن کو کلغذات میں جمع تو کر لیا تھا مگر زید بن ثابتؓ سے درخواست کی تھی کہ ان کو ایک نظر دیکھ لیں۔ زید بن ثابتؓ نے اس سے انکار کر دیا' حتی کہ انہوں نے عمرؓ سے مدد چاہی کہ وہ زید بن ثابتؓ کو راضی کرادیں۔ چنانچہ عمرؓ نے انہیں راضی کرا دیا اور نظر ثانی کر دی۔ یہ کتابیں ابو بکرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر عمرؓ کی وفات تک ان کے پاس رہیں۔ پھر حضرت حفصہؓ اہلیہ رسول اللہ صلعم کے پاس رہیں۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں منگایا تو حفصہؓ نے ان کو دینے سے انکار کر دیا' حتی کہ عثمانؓ سے عہد لیا کہ وہ انہیں واپس کر دیں گے اور اس شرط کے ساتھ بھیج دیں۔ چنانچہ عثمانؓ نے ان کو مصحفوں میں لکھ کر حفصہؓ کو وہ کتابیں واپس کر دیں اور وہ ان ہی کے پاس رہیں حتی کہ مروان نے اپنے زمانے میں انہیں لے کر جلا دیا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایسے اہم واقعہ کے متعلق ایک بیان دوسرے سے کس طرح ٹکراتا جا رہا ہے۔ لیکن

بایں ہمہ' یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن رسول اللہؐ نے مرتب کر کے نہیں دیا تھا بلکہ حضرت ابو بکرؓ صدیق کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھئے:۔

جمع قرآن کا کام صدیق اکبرؓ نے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے شروع کیا اور عثمانؓ نے تکمیل کی۔

(۵) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ یحییٰ بن عبد الرحمٰن بن حاطب سے نقل کرتے ہیں کہ عمر ابن الخطابؓ نے قرآن کو جمع کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لئے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ جس شخص نے رسولؐ اللہ سے کچھ بھی قرآن حاصل کیا ہو اسے ہمارے پاس لے آئے۔ لوگوں نے قرآن کو کاغذات پر' لکڑی کی تختیوں پر اور کھجور کے پٹھوں پر لکھ رکھا تھا۔ اور عمرؓ کسی شخص سے کوئی چیز اس وقت تک قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دیں۔ اسی اثناء میں عمرؓ شہید ہو گئے تو عثمان ابن عفانؓ کھڑے ہوئے اور انہیں نے لوگوں سے کہا کہ جس کے پاس کتاب اللہ کا کچھ حصہ ہو وہ ہمارے پاس لے آئے اور یہ بھی اس وقت تک کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ گواہی نہ دے دیں۔ چنانچہ خزیمہ ابن ثابت آئے اور کہنے لگے کہ میں دیکھ رہا ہوں تم نے دو آیتیں لکھنے سے چھوڑ دی ہیں۔ پوچھا گیا وہ کون سی دو آیتیں ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دو آیتیں حاصل کی تھیں **"لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رئوف رحیم** (۹/۱۲۸) آخر سورت تک"۔ اس پر عثمانؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ دونوں آیتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ پھر عثمانؓ نے خزیمہؓ سے پوچھا' "بتاؤ ان آیتوں کو کہاں رکھیں"۔ خزیمہؓ نے جواب دیا کہ قرآن کی جو سورت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہو' اسے ان آیتوں ہی سے ختم کر دو۔ چنانچہ سورہء براۃ کو ان ہی آیتوں سے ختم کر دیا گیا۔

لیجئے! اب بات یہاں تک پہنچا دی گئی کہ قرآن کو نہ تو رسولؐ اللہ نے مرتب فرمایا نہ ہی یہ عہد صدیقی میں مرتب ہوا۔ اس کی ابتداء حضرت عمرؓ نے کی اور وہ بھی اسے ادھورا چھوڑ کر شہید ہو گئے۔ اب آگے بڑھئے!

عہد عثمانی میں قرآن میں اختلافات

(۶) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ یزید بن معاویہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں ولید بن عقبہ کے زمانے میں مسجد میں اس حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا جس میں حضرت حذیفہؓ (مشہور صحابی) بھی تشریف فرما تھے۔ مسجد میں اس وقت روکنے والے اور پولیس کے سپاہی وغیرہ موجود نہ تھے کہ یکایک کسی پکارنے والے نے پکار کر اعلان کیا جو شخص ابو موسیٰ (اشعریؓ) کی قرات پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو ابواب کندہ کے پاس ہے اور جو شخص عبد اللہ بن مسعودؓ کی قرات پر قرآن پڑھتا ہو وہ اس گوشہ کی طرف آجائے جو عبد اللہ کے گھر کی طرف ہے۔۔۔ اور وہاں دو آدمیوں میں سورہ بقرہ کی ایک آیت کے بارہ میں اختلاف ہوا تھا۔ ایک پڑھتا تھا **"واتموا الحج**

والعمرة للبیت" اور دوسرا پڑھتا تھا "**واتموا الحج والعمرة للہ**" (۲/۱۹۶)۔ حضرت حذیفہؓ کو غصہ آگیا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ انہوں نے فوراً" اپنے کرتہ کو سمیٹ کر بغل میں کیا اور مسجد میں ہی کھڑے ہو گئے (یہ واقعہ حضرت عثمان کے زمانہ کا ہے) اور فرمانے لگے یا تو امیر المومنین میرے پاس آئیں یا میں امیر المومنین کے پاس جاؤں (تو میں اس کے متعلق اس سے کہوں) کیونکہ تم سے پہلی امتوں نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ انہوں نے مومنین کو ساتھ لے کر منکرین سے قتال کیا' حتی کہ خدا نے اپنے دین کو غالب کر دیا۔ پھر خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا تو لوگوں نے بے لگام گھوڑے کی طرح ہر طرف دوڑ لگانی شروع کر دی۔ پھر خدا نے عمرؓ کو خلیفہ بنایا تو وہ اسلام کے عین وسط میں اترے (اور اس کو اعتدال پر قائم کرنا چاہا)۔ پھر خدا نے ان کو بھی اٹھا لیا تو لوگوں نے پھر منہ زور گھوڑے کی طرح ہر طرف جادہ پیائی شروع کر دی۔ اس کے بعد خدا نے عثمانؓ کو خلیفہ بنایا اور اللہ کی قسم وہ وقت قریب ہے کہ لوگ اسلام میں وہ جادہ پیائی کریں جو اپنی تمام پچھلی جادہ پیائیوں کو پیچھے چھوڑ جائے۔

زید بن ثابتؓ کے انتخاب پر عبد اللہ بن مسعودؓ کی ناگواری

(۷) امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ جب (عثمانؓ نے اپنے مرتب کردہ قرآن کے علاوہ) باقی تمام مصاحف کو پھاڑ ڈالنے کا حکم دیا تو عبداللہ ابن مسعود نے کہا' "لوگو! اپنے قرآنوں کو چھپالو کیونکہ جو شخص کچھ چھپا کر رکھے گا قیامت کے روز اسے اپنے ساتھ لے کر آئے گا اور بہترین چھپانے کی چیز قرآن ہی ہے جسے تم میں سے کوئی قیامت کے روز اپنے ساتھ لے کر آئے"۔

(۸) نیز امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبید اللہ بن عتبہ سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے زید ابن ثابتؓ کے لئے قرآن لکھنے کو ناپسند کیا اور کہنے لگے' اے مسلمانوں کی جماعت! مجھے تو قرآن لکھنے کے کام سے الگ تھلگ رکھا جاتا ہے اور اس کی ذمہ داری ایک ایسے شخص نے لی ہے کہ بخدا میں اسلام لایا تو وہ ابھی اپنے کافر باپ کی صلب میں موجود تھا (یعنی پیدا بھی نہیں ہوا تھا)۔

غور فرمایا آپ نے کہ جمع قرآن کی مزعومہ کوششوں کے سلسلہ میں صحابہؓ کا رد عمل کیا بتایا جا رہا ہے اور ان کے باہمی تعلقات کو کس رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(۹) نیز امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زر بن جیش سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا' "میں نے حضورؐ کے دہن مبارک سے ستر (۷۰) سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور زید بن ثابتؓ ابھی بچہ تھے جن کے سر پر دو زلفیں لہراتی رہا کرتی تھیں۔ نیز شقیق سے نقل کرتے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعودؓ نے کہا' "**من یغلل یات بما غل یوم القیمتہ**" عثمانؓ مجھے کس کی قرات پر قرآن پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سے اوپر سورتیں پڑھی ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جانتے ہیں کہ میں

ان میں کتاب اللہ کا سب سے بڑا جاننے والا ہوں اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جانتا ہے تو میں سفر کر کے بھی اس کے پاس جاتا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جمع قرآن

(۱۰) نیز امام ابن ابی داؤد ابن شہاب زہری کی اسی روایت کو نقل کرنے کے بعد جو نمبر ا میں گزر چکی ہے' ابن شہاب زہری ہی کی روایت سے انس ابن مالکؓ انصاری سے یہ اضافہ نقل کرتے ہیں کہ آذر بائیجان اور آرمینیہ کے غزوہ میں اہل شام اور اہل عراق جمع ہوئے اور آپس میں انہوں نے ایک دوسرے کو قرآن سنایا تو اس میں بڑا اختلاف ہوا اور قریب ہو گیا کہ ان میں کوئی فتنہ برپا ہو جائے۔ جب حذیفہ ابن الیمان نے قرآن کے بارہ میں ان کے یہ اختلافات دیکھے تو وہ حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچے اور کہا لوگ قرآن کے بارہ میں بڑا اختلاف کر رہے ہیں' حتی کہ بخدا مجھے یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ وہ بھی اسی اختلاف میں مبتلا نہ ہو جائیں جس میں یہود اور نصاریٰ مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ بہت گھبرائے اور انہوں نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج کر وہ صحیفہ نکلوایا جو ابو بکرؓ کے حکم سے زید بن ثابت نے جمع کیا تھا اور اس سے کئی مصحف لکھوائے اور ان کو ملک کے گوشوں میں بھیج دیا۔ جب مروان مدینہ کا امیر ہوا تو اس نے حضرت حفصہؓ کے پاس آدمی بھیج کر وہ صحیفے منگائے تاکہ انہیں جلا دے۔

مروان نے حضرت حفصہؓ کے صحیفے جلا دیئے

اسے یہ اندیشہ تھا کہ لکھنے والے ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرنے لگیں مگر حضرت حفصہؓ نے انکار کر دیا۔ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے سالم بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ جب حضرت حفصہؓ کا انتقال ہوا تو مروان نے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کے پاس سختی کے ساتھ کہلا کر بھیجا کہ ان صحیفوں کو اس کے پاس بھیج دیں۔ چنانچہ جوں ہی لوگ حضرت حفصہؓ کے جنازہ سے فارغ ہو کر لوٹے' عبد اللہ ابن عمرؓ نے وہ صحیفے مروان کے پاس بھیج دیئے۔ مروان نے ان کو الگ الگ کر کے جلا دیا اس اندیشہ سے کہ ان صحیفوں میں کوئی چیز اس کے خلاف نہ ہو جو حضرت عثمانؓ نے لکھا تھا۔

عہد عثمانؓ میں قرآن کیسے جمع کیا گیا۔

(۱۱) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ایوب سے اور وہ ابو قلابہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ایک معلم کسی شخص کی قرات کے مطابق تعلیم دیتا تھا اور دوسرا معلم دوسرے شخص کی قرات کے مطابق۔ بچے قرآن پڑھتے اور آپس میں اختلافات کرتے حتی کہ یہ اختلافات معلمین تک بلند ہو گئے اور لوگوں نے ایک دوسرے کی قرات پر تکفیر شروع کر دی۔ حضرت عثمانؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے خطبہ دیا اور کہا "تم لوگ میرے پاس ہوتے ہوئے بھی قرآن میں اختلاف کرتے ہو اور دوسروں کی تغلیط کرتے ہو۔ جو لوگ دوسرے

شہروں میں مجھ سے دور ہیں ان کی غلطیاں اور اختلافات تو اور بھی سخت ہیں۔ اے اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اتفاق سے کام لو اور تم لوگوں کے لئے ایک (متفقہ) امام (کتاب اللہ) لکھ دو۔ ابو قلابہ کہتے ہیں کہ مجھ سے مالک بن انسؓ نے بیان کیا (یہ امام مالک بن انس کے دادا ہیں) کہ میں ان لوگوں میں شریک تھا جنہوں نے ان کو قرآن لکھوایا۔ اکثر کسی آیت کے بارہ میں اختلاف ہوتا تھا اور کوئی ایسا آدمی یاد آجاتا تھا جس نے اس آیت کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا اور بعض مرتبہ وہ شخص موجود نہیں ہوتا تھا یا کسی دیہات میں ہوتا تھا تو اس سے آگے اور پیچھے کی آیتیں لکھ لیتے تھے اور اس آیت کی جگہ چھوڑ دیتے تھے' حتی کہ وہ شخص خود آجاتا یا اس کو بلوا لیا جاتا تھا (اور اس سے پوچھ کر وہ آیت لکھ لی جاتی تھی)۔جب مصحف لکھنے سے فراغت ہو گئی تو حضرت عثمانؓ نے تمام شہروں میں لکھ دیا کہ میں نے ایسا ایسا کام کیا ہے اور جو کچھ میرے پاس تھا میں نے اس کو مٹا دیا ہے۔ لہٰذا' جو کچھ (اس قرآن کے خلاف) تمہارے پاس ہو تم بھی اس کو مٹا دو۔

(۱۲) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ مصعب ابن سعد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے جدا ہوئے ابھی تیرہ سال ہی گزرے ہیں مگر تم قرآن میں شک کرنے لگے ہو۔ کہتے ہو کہ یہ ابی (بن کعبؓ) کی قرات ہے اور وہ عبد اللہ (بن مسعودؓ) کی قرات ہے۔ خدا کی قسم! تو اپنی قرات ٹھیک نہیں پڑھتا۔ لہٰذا' میں تم میں سے ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی کتاب اللہ میں سے کوئی چیز ہو وہ بالضرور اسے میرے پاس لے آئے۔ چنانچہ کوئی کاغذ کا ورق لے کر آتا' کوئی چمڑے کا ٹکڑا لے کر آتا جس میں قرآن لکھا ہوا ہوتا۔ حتی کہ اس طرح بہت کچھ جمع ہو گیا۔ پھر حضرت عثمانؓ اندر گئے اور ایک ایک آدمی کو بلا بلا کر قسم دے دے کر انہوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تم نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں یہ کچھ لکھوایا تھا؟ وہ شخص اقرار کرتا۔ حضرت عثمانؓ اس سے فارغ ہو گئے تو لوگوں سے پوچھا تم میں سے بہترین کاتب کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب زید بن ثابتؓ۔ پھر انہوں نے پوچھا تم میں لغت عربی کا بہترین ماہر کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ سعید بن العاصؓ۔ حضرت عثمانؓ نے کہا ٹھیک ہے سعید لکھوائیں اور زید لکھتے جائیں۔ چنانچہ زید ابن ثابتؓ نے قرآن لکھا اور کئی قرآن لکھے اور ان قرآنوں کو عثمانؓ نے لوگوں میں بھیجا دیا۔ ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں نے بعض اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ عثمانؓ نے بہت اچھا کام کیا۔

(۱۳) امام ابن ابی داؤد اپنی دوسری سند سے مصعب ابن سعد ہی سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ابی (ابن کعبؓ) اور عبداللہ (بن مسعودؓ) اور معاذ (ابن جبلؓ) کی قرات کو سنا تو لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا' ابھی تمہارے نبیؐ کی وفات کو پندرہ سال ہوئے ہیں اور تم قرآن میں اختلاف کرنے لگے ہو۔ میں ہر شخص پر لازم کرتا ہوں کہ جس کے پاس بھی قرآن میں سے کچھ ہو جسے اس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو' اسے میرے پاس لے آئے۔ چنانچہ لوگ لکڑی کی تختیاں' ہڈی کے ٹکڑے' کھجور کی چھالیں جن میں قرآن لکھا ہوا تھا' لانے لگے۔

جو شخص لے کر آتا اس سے حضرت عثمانؓ پوچھ لیتے کہ کیا اس نے یہ کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ پھر انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ تم میں فصیح ترین شخص کون ہے؟ لوگوں نے سعید بن العاصؓ کا نام لیا۔ پھر پوچھا کہ بہترین ماہر کتابت کون ہے؟ لوگوں نے زید بن ثابتؓ کا نام لیا۔ آپ نے فرمایا اچھا زید لکھیں اور سعید لکھوائیں۔ چنانچہ کئی مصحف لکھے گئے اور ان کو مختلف شہروں میں تقسیم کردیا گیا۔ مصعب بن سعد کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جس نے عثمانؓ کے اس فعل پر عیب چینی کی ہو۔

(۱۴) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ محمد (ابن ابیؓ) سے نقل کرتے ہیں کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو کہتا تھا کہ جو کچھ تو پڑھتا ہے اس سے تو کافر ہوگیا۔ اس کی اطلاع عثمان بن عفانؓ کو کی گئی تو ان کے دل پر بڑی گرانی ہوئی اور انہوں نے قریش اور انصار کے بارہ آدمیوں کو جمع کیا جن میں ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ بھی تھے اور ان سب کو اس صحن میں اکٹھا کردیا جو حضرت عمرؓ کے مکان میں تھا۔ اسی مکان میں قرآن رہتا تھا۔ حضرت عثمانؓ بھی ان لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ محمد (ابن ابیؓ) کہتے ہیں کہ مجھ سے کثیر ابن افلح نے بیان کیا جو ان لوگوں کے لئے قرآن لکھنے والوں میں سے ایک تھے کہ اکثر ان بارہ آدمیوں میں اختلاف ہوجاتا تھا تو اس اختلافی آیت کو وہ موخر کردیا کرتے تھے' محمد کہتے ہیں کہ میں نے کثیر سے پوچھا کہ تم لوگ اس کو موخر کیوں کردیا کرتے تھے۔ تو انہوں نے بتایا کہ یہ مجھے معلوم نہیں۔ محمد کہتے ہیں کہ میں نے اس بارہ میں ایک گمان بنایا ہے' تم لوگ اسے یقین نہ بنا لینا۔ میرا گمان یہ ہے کہ جب ان میں کسی آیت کے متعلق اختلاف ہوتا تھا تو وہ اسے اس لئے موخر کردیتے تھے کہ دیکھیں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو حضورؐ کے ساتھ آپ کے آخری دور میں شریک رہا ہو تو اس آیت کو اس کے قول کے مطابق لکھ لیں۔

قرآن کی ترتیب حضرت عثمانؓ نے قائم کی تھی

(۱۵) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عثمانؓ سے کہا کہ تم نے سورۂ انفال کو جو مثانی میں سے ہے' سورہ برات کے ساتھ کیوں رکھ دیا حالانکہ وہ مئین میں سے ہے اور پھر ان دونوں کو سبع طوال میں رکھ دیا ہے۔ ایسا تم نے کیوں کیا؟ عثمانؓ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف زمانوں میں مختلف عدد والی سورتیں نازل ہوتی رہتی تھیں۔ جب آپ پر کچھ وحی نازل ہوتی تو کسی کاتب کو آپ بلا کر فرما دیتے کہ اس آیت کو ایسی ایسی سورت میں رکھ دو جس میں ایسا ایسا تذکرہ آیا ہے۔ سورۂ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو ابتداً مدینہ میں نازل ہوئیں اور سورۂ برات بالکل آخر میں نازل ہوئی ہے مگر دونوں کا قصہ ایک سا ہے۔ مجھے خیال گزرا کہ سورۂ برات سورۂ انفال ہی کا حصہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا اور ہمیں آپ نے یہ بتایا نہیں کہ آیا واقعی یہ اسی کا حصہ ہے بھی یا نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے دونوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور دونوں کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہیں لکھی اور دونوں کو سبع طوال میں رکھ دیا۔

یہاں تک یہ کہا گیا ہے کہ قرآن حضرت عثمانؓ کے عہد میں مرتب ہوا۔ لیکن یہ قرآن کس قسم کا تھا اس کی بابت بھی سن لیجیے۔

قرآن میں غلطیاں رہ گئیں

(۱۶) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عبدالاعلیٰ بن عبداللہ بن عامر قرشی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہوگئے اور انہوں نے اسے دیکھا تو فرمایا تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر اس میں کچھ غلطیاں مجھے نظر آتی ہیں جنہیں عرب لوگ اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں گے۔

لیجیے! قرآن عہد عثمانی میں مرتب تو ہوا لیکن اس میں بھی غلطیاں رہ گئیں۔ ان غلطیوں کو حضرت عثمانؓ نے درست نہیں کیا بلکہ علی حالہ رہنے دیا کہ عرب خود اپنی زبان سے درست کرلیں گے۔ اور آگے بڑھیے۔

(۱۷) امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ عکرمہ طائی سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمانؓ کے پاس مصحف لایا گیا تو اس میں انہیں کچھ غلطیاں نظر آئیں۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر لکھنے والا بنو ہذیل کا اور لکھانے والا بنو ثقیف کا کوئی آدمی ہوتا تو اس میں یہ غلطیاں نہ پائی جاتیں۔

(۱۸) سعید ابن جبیر سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا قرآن میں چار حرف غلط ہیں۔ (۱) **الصٰبئون** (۵/۶۹) (۲) **والمقیمین** (۴/۱۶۲) (۳) **فاصدق واکن من الصلحین** (۱۰/۶۳) اور (۴) **ان ھذان لساحران** (۲۰/۶۲)

(۱۹) زبیر ابو خالد کہتے ہیں کہ میں نے ابان بن عثمان سے پوچھا کہ آیت---**الراسخون فی العلم منھم والمومنون یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک والمقیمین الصلوۃ والموتون الزکوۃ** الآیہ کیسے ہوگیا۔ آگے اور پیچھے رفع لایا گیا ہے اور **المقیمین** پر نصب ہے۔ ابان نے جواب دیا کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ پچھلا حصہ لکھا چکا تھا' اس نے پوچھا آگے کیا لکھوں۔ لکھوانے والے نے کہا کہ **المقیمین الصلوۃ** لکھو۔ اس سے جو کچھ کہا گیا لکھ دیا۔

(۲۰) عروہ کہتے ہیں کہ قرآن کی غلطیوں کے متعلق میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا **ان ھذان لساحران** اور **والمقیمین الصلوۃ والموتون الزکوۃ** اور **والذین ھادوا والصٰبئون** کے متعلق سوال تھا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا' "بھتیجے! یہ کاتبوں کا کام ہے کہ انہوں نے لکھنے میں غلطی کر ڈالی۔

صرف غلطیاں ہی نہیں رہ گئی تھیں بلکہ بعض آیات بھی قرآن میں درج ہونے سے رہ گئی تھیں۔ (مثلاً") ہمارے ہاں مشہور ہے کہ شادی شدہ زانی کی سزا سنگسار ہے لیکن قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں۔ اس ضمن میں' سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) حضرت عائشہؓ کی طرف یہ روایت منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ آیہ رجم (سنگسار) اور رضاعت کبیر والی آیت ایک صحیفہ میں تھی جو میرے تخت کے نیچے رکھا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہوگئے۔ اتنے میں گھر کی پالتو

بکری آگئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اور وہ آیتیں ضائع ہوگئیں)۔ چنانچہ اس کے بعد فیصلہ یہ کیا گیا کہ یہ آیت قرآن میں تو داخل نہ کی جائے لیکن عمل اس کے مطابق ہو۔

اس کے بعد کتاب المصاحف میں ہے کہ جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے مرتب فرمایا تھا اس میں اور مدینہ منورہ کے دیگر مصاحف میں کئی ایک آیات میں اختلاف تھا۔ اس کتاب میں اس قسم کے تمام اختلافی مقامات درج ہیں۔ نیز یہ کہ قرآن مجید کے جو نسخے مختلف شہروں کے لئے مرتب کئے گئے تھے ان میں بھی باہمد گر اختلاف تھا۔ ان اختلافات کو بھی اس کتاب میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔

اختلاف قرات

ازاں بعد' امام ابن ابی داؤد نے اپنی کتاب نیز اس کے انگریزی ترجمہ میں (جسے مشہور مستشرق آرتھر جیفری نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے) ان قرآنی نسخوں کی تفصیل دی ہے جو عہد حضرت عثمانؓ اور ان کے بعد مختلف صحابہؓ اور تابعینؒ کے پاس تھے اور جن میں بے شمار آیات ایسی تھیں جو مصحف عثمانؓ میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔ ان کی تفصیل سابقہ صفحات میں دی جاچکی ہے۔

سابقہ صفحات میں "اختلاف قرات" کے متعلق بھی تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال کا اضافہ کیا جاتا ہے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ سنی حضرات وضو میں پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ حضرات پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے دریافت کیا کہ ان میں سے کون سا طریق قرآن کے مطابق ہے۔ مودودی صاحب نے اس کے جواب میں (جو ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا تھا) پہلے قرآن کریم کی متعلقہ آیت درج کی جو حسب ذیل ہے۔

ایایھا الذین امنوا اذا قمتم الی الصلوۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین (۵/۶)

اس کے بعد تحریر فرمایا

"اس میں لفظ **وارجلکم** کی دو قراتیں متواتر ہیں۔ نافع' ابن عامر' حفص' کسائی اور یعقوب کی قرات **وارجلکم** (بفتح لام) ہے' اور ابن کثیر' حمزہ' ابو عمرو اور عاصم کی قرات **وارجلکم** (بکسر لام)۔ ان میں سے کسی قرات کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشاء کے مطابق الفاظ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں' بلکہ یہ دونوں قراتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرات اختیار کی جائے تو **وارجلکم** کا تعلق **فاغسلوا** کے حکم سے جڑتا ہے

اور معنی یہ ہوجاتے ہیں "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک"۔ اور اگر دوسری قرات قبول کی جائے تو اس کا تعلق **وامسحوا برء وسکم** سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں "اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک"۔

یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قراتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہوجاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قراتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جاسکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعد زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنے کو ترجیح دی جائے لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں۔ اب آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل کو دیکھا جائے"۔

اور اس کے بعد لکھا:۔

قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لئے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کون سا ہوسکتا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ شیعہ حضرات اسی "معتبر ذریعہ" کی رو سے پاؤں پر مسح کرتے ہیں اور سنی حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اسی "معتبر ذریعہ" کی رو سے پاؤں دھوتے ہیں' مودودی صاحب کے ارشاد ہے کہ قرآنی آیت کی دونوں قراتیں متواتر ہیں اور ایسی مستند کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) قرآن کریم کی یہ آیت **ارجلکم** میں ل کے زبر کے ساتھ بھی نازل ہوئی تھی اور زیر کے ساتھ بھی اور دونوں کا یہ اختلاف اس قدر اہم ہے کہ ایک قرات کی رو سے پاؤں دھونے کا حکم ملتا ہے اور دوسری قرات کی رو سے پاؤں پر مسح کرنے کا اور اس طرح قرآن کے الفاظ سے بات واضح نہیں ہوتی"۔

آپ سوچئے کہ اس کے بعد' قرآن مجید کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے اور ہم جو دنیا کے سامنے یہ دعویٰ پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس کتاب میں ایک حرف اور نقطہ کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا' اس دعویٰ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے"۔ قرآن کے الفاظ سے بات اسی لئے حل نہیں ہوتی کہ آپ زبر کے ساتھ ل کو بھی منزل من اللہ مانتے ہیں اور زیر کے ساتھ بھی منزل من اللہ ---- اور اس کے بعد سوچئے کہ ایسی کتاب نازل کرنے والے (خدا) کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور قائم ہوتا ہے جو متضاد احکام نازل کردیتا ہے؟ اور اگر خدا نے اس آیت کو

ایک ہی شکل میں نازل کیا تھا--- یعنی ل کے زیر یا زبر کے ساتھ---- تو اگلی صورت یہی سامنے آتی ہے کہ رسولؐ اللہ نے (معاذ اللہ) کسی کو ل کے زیر کے ساتھ بتا دیا اور کسی کو زبر کے ساتھ- اس صورت میں سوچئے کہ خدا کے رسولؐ کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے اور اگر یہ صورت بھی نہیں تھی تو پھر فرمایئے کہ یہ دو قراتیں کس طرح وجود میں آئیں؟

آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ اختلاف قرات کے ماننے والے یہ قطعاً" نہیں بتاتے کہ ان مختلف قراتوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیا خدا نے ایسا کہا یا اس کے رسولؐ نے؟---- اس باب میں شیعہ حضرات کا مسلک واضح ہے- وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ان آیات کو اسی طرح اتارا تھا جس طرح ان کے ائمہ پڑھتے تھے- مصحف عثمانی میں ان میں تحریف کردی گئی- لیکن سنی حضرات نہ اسے ماننے کے لئے تیار ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے ایسا کردیا اور نہ ہی یہ بتاتے ہیں کہ پھر دوسری قراتوں کی حیثیت کیا ہے! مصحف عثمانی بھی صحیح اور متضاد آیات بھی درست! ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

آگے چل کر مودودی صاحب فرماتے ہیں-

"اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشاء سے قریب تر محسوس ہوتا ہے (یعنی ل کے زبر والی آیت کے مطابق)"-

لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد ل کے زیر والی قرات کا کیا بنے گا جو اسی طرح متواتر اور مستند ہے جس طرح ل کے زبر والی قرات؟

ہم نے اوپر کہا کہ "اختلاف قرات" کے عقیدہ کی رو سے یہ فطری نتیجہ سامنے آتا ہے کہ (معاذ اللہ--- معاذ اللہ) رسولؐ اللہ کسی کو ایک طرح قرآنی آیت بتاتے اور کسی کو دوسری طرح! اس کی تائید میں ہماری بخاری شریف میں ایک روایت ملتی ہے- ملاحظہ فرمایئے :-

مسور ابن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن عبد قاری حضرت عمرؓ سے سن کر بیان کرتے ہیں- حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سورۃ فرقان پڑھتے ہوئے سنا- میں نے ان کا پڑھنا سنا تو وہ بہت سارے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھائے تھے- قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر بیٹھوں مگر میں نے بمشکل صبر کیا- حتی کہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہی کی چادر میں انہیں کس لیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنی ہے' تمہیں کس نے پڑھائی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے تو رسولؐ اللہ نے پڑھائی ہے- میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو

تو پڑھ رہا تھا اور میں اس کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے چلا۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں نے اس کو سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انہیں چھوڑ دو ہشام! پڑھو"۔ چنانچہ ہشام نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ دیا جیسا کہ میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یونہی تو نازل ہوئی ہے"--- پھر فرمایا عمرؓ! اب تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مجھے پڑھائی تھی میں نے پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یوں بھی نازل ہوئی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا' جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو"۔

سوچئے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

یہ ہے وہ شکل جو "اختلاف قرات" کے عقیدہ سے ہمارے سامنے آتی ہے! سوچئے کہ اس کے بعد دین کا کچھ بھی باقی رہتا ہے۔ لیکن دین کا کچھ باقی رہے یا نہ رہے' ہمارے علماء حضرات ان روایات کو وضعی قرار دینے کے لئے تیار نہیں۔ جو ایسا کہے' اسے منکر حدیث قرار دے کر اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے۔

یاد رکھئے! اختلاف قرات کی تمام روایات وضعی ہیں۔ قرآن کریم بغیر کسی اختلاف کے' خدا کی طرف سے نازل ہوا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح مرتب و مدون کرکے خود امت کو دیا اور وہی قرآن' بغیر ایک حرف کے تغیر و تبدل کے امت کے ہاں مروج چلا آرہا ہے۔ ایسی تمام روایات جو اس میں کسی قسم کے اختلاف کی نشاندہی کرتی ہیں' وضعی ہیں اور خاص سازش کا نتیجہ۔ (جولائی ۱۹۷۴)

۱۲۔ مودودی صاحب نے قصہ ہی تمام کردیا

مودودی صاحب نے اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں "رسائل و مسائل" کے عنوان سے ایک سلسلہ تشریحات شروع کر رکھا ہے' جس کا نقطہ ماسکہ یہ ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فیصلوں میں حک و اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے اور رد و بدل بھی۔ ان کا یہ پورے کا پورا مقالہ (تشریحات) خاص محاکمہ کا متقاضی ہے۔ لیکن اسے ہم کسی اور وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست ہم اس کا صرف وہی حصہ سامنے لانا چاہتے ہیں جس کا تعلق قرآن مجید سے ہے۔

(۴) قرآن مجید کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت قرآن پاک کو جس حالت میں چھوڑا وہ یہ تھی کہ اپنی مکمل اور مرتب صورت میں وہ صرف ان حافظوں

کے سینے میں محفوظ تھا جنہوں نے حضورؐ سے سیکھ کر اسے از اول تا آخر یاد کیا تھا۔ تحریری شکل میں آپ نے اس کا لفظ لفظ لکھوا ضرور دیا تھا' مگر وہ متفرق پارچوں پر' تختیوں' کھجوروں کی چھالوں' شانے کی ہڈیوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر لکھا گیا تھا' جو ایک تھیلے میں رکھی ہوئی تھیں۔ حضور نے اسے سورتوں کی ترتیب کے ساتھ ایک مسلسل کتاب کی صورت میں مرتب نہیں فرمایا تھا۔

(ترجمان القرآن' ستمبر ۱۹۷۵ء' ص ۳۵ و نومبر ۷۵ء' ص ۴۲)

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں' حضرت عمرؓ کے ایماء سے حضرت زیدؓ نے اسے (قرآن کریم کو) کس طرح مرتب فرمایا۔ انہوں نے اسے اس "تھیلے" میں جمع شدہ اجزاء کی مدد سے نہیں' بلکہ ان پارچوں' ہڈیوں' کھجور کے پتوں وغیرہ کی مدد سے مرتب کیا جو لوگوں کے ہاں بکھری پڑی تھیں۔ (حضرت زیدؓ کی اس ترتیب کی تفصیل کتب روایات میں درج ہے اور طلوع اسلام میں متعدد مقامات پر اس پر تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں)۔

اس کے بعد مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سرانجام نہیں دیا تھا' اسے حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے سرانجام دیا' یعنی حضورؐ کے چھوڑے ہوئے تھیلے کو کتابی شکل دے دی۔ یہ ان کے نزدیک "رد و بدل" کی نمایاں ترین مثال ہے"۔

(ترجمان القرآن' ستمبر ۱۹۷۵ء' ص ۳۵)

آپ غور فرمایئے کہ مودودی صاحب کی اس تشریح کے مطابق قرآن کریم کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق (معاذ اللہ) کس قسم کا خیال ذہن میں ابھرتا ہے یعنی۔

حضور نے قرآن کریم کو مرتب صورت میں صحابہؓ کو حفظ تو کرادیا لیکن ۲۶' ۲۶ کاتبوں کے باوجود' اسے کتابی شکل میں مرتب فرما کر امت کو نہ دیا۔ حضورؐ کے بعد اس فریضہ کو صحابہؓ نے سرانجام دیا۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب قرآن کریم کے شروع میں (سورۃ فاتحہ کے بعد) **ذالک الکتاب** یعنی یہ وہ کتاب ہے' کہا تھا..... تو کیا اس سے اشارہ اس تھیلے کی طرف تھا (جسے مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق رسولؐ نے رکھا ہوا تھا) یا یہ آیت اس وقت اتری تھی جب حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں قرآن مجید نے کتاب کی شکل اختیار کرلی تھی؟

سوچئے کہ اس کے بعد ہمارا نوجوان طبقہ اس قرآن کے متعلق کیا خیال کرے گا جو امت کے ہاتھوں میں موجود چلا آرہا ہے۔

(۵) اس کے بعد مودودی صاحب نے دین میں کمی کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اس سلسلہ

میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم در حقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا اور رسولؐ اللہ نے بھی قرآن کریم کو ان سات زبانوں میں ہی پیش کیا اور امت کو سکھایا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد جب زبانوں کے اس اختلاف سے جھگڑے پیدا ہونے شروع ہوئے تو حضرت عثمانؓ نے ان میں سے صرف ایک زبان والے قرآن کو باقی رکھا اور بقایا چھ زبانوں والے نسخوں کو جلا دیا۔

مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ :

اس معاملہ میں آپ یہ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ قریش کی زبان کے سوا باقی چھ زبانوں کی قراتیں، جو سب کی سب تو قیفی تھیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی تھیں، اس مصلحت کی بنا پر منسوخ کردی گئیں کہ امت کو قرآن کے الفاظ اور اس کی عبارتوں میں اختلاف کے فتنے اور خطرے سے بچا لیا جائے حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا کوئی حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا نہ رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے سنا گیا۔

(ترجمان القرآن، ستمبر ۱۹۷۵ء، ص ۳۹ و نومبر ۱۹۷۵ء، ص ۴۳)

آپ ذرا دل کو تھام کر دیکھئے کہ مودودی صاحب کیا ارشاد فرما رہے ہیں؟ وہ کہہ یہ رہے ہیں کہ :-

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید سات زبانوں میں نازل کیا تھا۔

(۲) رسولؐ اللہ نے بھی قرآن کریم کو ان سات زبانوں ہی میں امت کو دیا تھا۔

(۳) رسولؐ اللہ کی وفات تک، نہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ ان میں سے صرف ایک زبان کا قرآن باقی رکھا جائے اور دیگر چھ زبانوں والے قرآن منسوخ سمجھے جائیں اور نہ ہی رسولؐ اللہ نے کوئی ایسا حکم دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ منشائے خدا اور رسول یہی تھا کہ قرآن مجید ان سات مختلف زبانوں میں موجود رہے۔

(۴) لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآنوں کو منسوخ قرار دے کر جلا دیا اور ایک زبان کے قرآن کو باقی رکھا۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ اس قرآن مجید کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جسے ہم (خدا کے ارشاد اور اپنے ایمان کی بنا پر) اس دعویٰ کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ یہ لفظاً لفظاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور جسے رسولؐ اللہ نے امت کو دیا تھا۔ (واضح رہے کہ مودودی صاحب نے سات زبانیں، اور چھ زبانیں اور ایک زبان، جس میں قرآن رکھا گیا، کے الفاظ بصراحت لکھے ہیں۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی زبان کا جہاں جہاں بھی ذکر کیا ہے اس کے لئے لسان واحد کا صیغہ ہی استعمال کیا ہے، السنہ (زبانیں، جمع کا صیغہ) کہیں استعمال نہیں کیا۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ وہ ہم نے جو کہا تھا کہ اس شخص کا مقصد ہی یہ ہے کہ نوجوان نسل کو دین سے

برگشتہ کیا جائے' کیا اس میں کوئی شبہ باقی رہ سکتا ہے؟ کہا جائے گا کہ یہ باتیں مودودی صاحب نے اپنی طرف سے نہیں لکھیں۔ یہ سب کتب احادیث میں موجود ہیں۔ تو ہم عرض کریں گے کہ احادیث کے متعلق تو مودودی صاحب نے خود فرمادیا ہے کہ وہ ہر حدیث کو صحیح نہیں مانتے۔ لہٰذا' جن روایات کی بنیادوں پر مودودی صاحب نے قرآن مجید کے متعلق یہ کچھ لکھا ہے' ظاہر ہے کہ وہ انہیں خود اپنی بصیرت کے مطابق صحیح مانتے ہیں (ہمارے نزدیک' وہ تمام روایات جو قرآن کریم کے خلاف جاتی ہیں' وضعی ہیں اور مودودی صاحب جیسی ذہنیت رکھنے والوں کی سازش کا نتیجہ)۔

اور قیامت یہ ہے کہ اس شخص کی کتابوں (بالخصوص نام نہاد تفسیر) کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں' (بالخصوص انگریزی زبان) میں بھی شائع ہو رہے ہیں۔۔۔ نہ معلوم اس "پردہ زنگاری" کے پیچھے کون سا "معشوق" چھپا بیٹھا ہے؟

(فروری ۱۹۷۶ء)

۱۳۔ قرآن مجید کی حفاظت (فرقہ اہل قرآن کی گمراہی)

قارئین میں سے ایک صاحب نے اپنے کسی ملنے والی کی طرف سے اٹھایا گیا ایک اعتراض پیش کیا ہے جس کا جواب طلوع اسلام میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا ہے۔ اعتراض یہ ہے

> خدا کی طرف سے انبیاء سابقہ کو جو کتابیں دی گئیں ان کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں انسانوں نے تحریف کردی۔ آخر میں خدا نے ضروری سمجھا کہ اپنی کتاب کی حفاظت خود ہی کرنی چاہئے تو قرآن شریف کے سلسلہ میں یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت ہم خود کرلیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کے دل میں یہ خیال سابقہ تجربات کی ناکامی کے بعد پیدا ہوا۔ خدا کے متعلق اس قسم کا تصور یکسر باطل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ بات یوں نہیں تو پھر اس کا جواب کیا ہے؟

طلوع اسلام

خدا کے متعلق اس قسم کا تصور فی الواقع باطل ہے اور پیدا ہوتا ہے اس غلط مفروضہ سے جس پر مذکورہ بالا اعتراض کی بنیاد ہے۔ وہ مفروضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کتب سابقہ کو ابدی طور پر محفوظ رکھنا چاہتا تھا' لیکن انسانوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ تو اس کے بعد خدا نے یہ سوچا کہ اسے اپنی کتاب کی حفاظت آپ کرنی چاہئے۔ صحیح صورت یہ نہیں۔ کتب سابقہ کا ابدی طور پر محفوظ رکھے جانا مشیت خداوندی کا مقصود تھا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کتابیں تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت قرار پانے کے لئے نازل نہیں کی گئی تھیں۔ ان ادوار میں ہوتا یہ تھا کہ ایک رسول ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوتا۔ اس کی تعلیم کا دائرۂ اثر و نفوذ بھی ایک خاص خطہ زمین تک محدود ہوتا۔ اس کی طرف نازل کردہ کتاب میں جو جزئی احکام شریعت دیئے جائے' وہ اس قوم اور اس زمانہ کے حسب حال

ہوتے۔ جب زمانہ ذرا اور ترقی کر جاتا تو سابقہ احکام میں سے جو اس قابل ہوتے کہ وہ اس دور میں بھی نافذ العمل رہ سکیں' انہیں بحال رہنے دیا جاتا۔ جو اس قابل نہ رہتے ان کی جگہ دوسرے احکام دے دیئے جاتے۔ یوں ان سابقہ کتابوں کے (یوں سمجھئے کہ) نئے ایڈیشن شائع کردیئے جاتے (واضح رہے کہ دین کے اصول تو وہی رہتے ہیں کیونکہ وہ غیر متبدل تھے۔ اس تبدیلی کی ضرورت ان احکام شریعت میں لاحق ہوتی جو وقتی تقاضوں کے مطابق دیئے جاتے تھے)۔ یہ تصریح خود قرآن مجید میں موجود ہے جب کہا کہ **ما ننسخ من ایتہ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا** (۲/۱۰۶) "ایک رسول کے بعد جب دوسرا رسول آتا تو اس وقت دیکھا جاتا کہ سابقہ رسول کی وساطت سے دیئے گئے احکام شریعت میں سے جو نافذ العمل رہنے کے قابل نہیں رہے' انہیں منسوخ کرکے ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور جن احکام میں تبدیلی کی ضرورت نہ ہوتی لیکن انہیں (سابقہ رسول کی امت نے) فراموش کردیا ہوتا' ان کی تجدید کردی جاتی۔ سورۂ النحل میں اس کی وضاحت **واذا بدلنا ایتہ مکان ایتہ** (۱۶/۱۰۱) کہہ کر کردی گئی ہے' یعنی ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم دے دینا" اب ظاہر ہے کہ جو کتابیں دی ہی وقتی طور پر گئی تھیں' ان کا ابدی طور پر محفوظ رکھے جانا مقصود مشیت تھا ہی نہیں۔

وحی خداوندی کا یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہا تا آنکہ مشیت کے پروگرام کے مطابق ایک ایسی کتاب کا دیا جانا ضروری سمجھا گیا جو تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت بننے کے قابل ہو۔ یہ کتاب (قرآن کریم کی شکل میں) دی گئی۔ اس کے متعلق اعلان کردیا کہ **وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلمتہ** (۶/۱۱۶) "تیرے رب کے قوانین اس کتاب میں تکمیل تک پہنچ گئے۔ اب ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب مکمل بھی ہوگئی اور غیر متبدل بھی قرار دے دی گئی' اس کا ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جانا بھی ضروری تھا۔ اس بنا پر خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا (۱۵/۹) اور اس کے بعد سلسلہ وحی کے ختم کردینے کا اعلان کردیا۔ چونکہ قرآن کریم کو تمام نوع انسان کے لئے ابدی طور پر ضابطہ ہدایت بنانا تھا' اس لئے اس میں احکام شریعت بہت کم دیئے گئے ہیں۔ اس کی تعلیم بیشتر ان اصولوں پر مبنی ہے جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں۔ اس کتاب کے متبعین سے کہہ دیا گیا ہے کہ وہ ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے' جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مرتب کریں۔ **وامرھم شوری بینھم** (۴۲/۳۸) کا یہی مطلب ہے۔ یہ اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں وضع کردہ احکام' زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے (اس طرح احکام وضع کرنے کا فریضہ قرآنی مملکت ادا کرے گی جسے خلافت علی منہاج نبوت بھی کہا جاتا ہے)۔

انبیاء سابقہ کے زمانے میں وقتی احکام کی کیا صورت تھی' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ سیلاب سے بچنے کے لئے کشتی کی ضرورت ہوگی تو انہیں یہ بھی وحی کی رو سے بتانا پڑا کہ کشتی کس طرح بنائی جاتی ہے (۱۱/۳۷)۔ ظاہر ہے کہ جب زمانہ ذرا آگے بڑھا تو کشتی بنانے سے متعلق آسمانی ہدایات کی ضرورت نہ رہی (حتی کہ اس قسم کی کشتی کی بھی ضرورت نہ رہی جسے حضرت نوحؑ نے بنایا تھا)۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔ آپ

تورات-- (بائبل کے عہد نامہ عتیق) کو دیکھئے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی سی باتوں کے لئے بھی کس تفصیل اور کثرت کے ساتھ احکام ملتے ہیں۔ اس قسم کے جزئی اور تفصیلی احکام اس زمانہ کی وقتی ضروریات پوری کرنے کے لئے تھے۔ وہ ابدی طور پر غیر متبدل قرار نہیں پاسکتے تھے۔ ابدی طور پر وہی نظام کارفرما رہ سکتا ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے' یعنی غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں وقتی احکام خود مرتب کرنا۔

(ضمناً") ہمارے ہاں جب قرآنی نظام مملکت باقی نہ رہا تو قرآن کریم نے جس بلند و بالا حکمت کے پیش نظر جزئی احکام خود نہیں دیئے تھے' وہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ سمجھا یہ گیا کہ اسلام مکمل اور آخری دین اسی صورت میں قرار پاسکتا ہے جب اس میں' زندگی کے تمام تقاضوں کے لئے چھوٹے سے چھوٹے احکام بھی موجود ہوں اور وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں۔ قرآن کریم میں تو یہ احکام تھے ہی نہیں' اس لئے انہیں خود مرتب کرلیا گیا اور انہیں ابدی قرار دے دیا۔ انہیں احکام فقہ کہا جاتا ہے۔ سابقہ شریعتوں کے ناقابل عمل احکام کو بدلنے کے لئے تو بعد کے رسول آجایا کرتے تھے۔ لیکن اب چونکہ سلسلہ نبوت ختم ہوچکا ہے' اس لئے ان احکام (فقہ) کو بدلنے کے لئے کوئی رسول بھی نہیں آئے گا۔ یہ ہے وہ مقام جس پر ہم صدیوں سے کھڑے ہیں۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ انسانوں کو گیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ احکام کو احکام شریعت کہہ کر' امت سے ان پر عمل کرائیں۔ یہ احکام خدا کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ اس خیال کے تابع وہ لگے قرآن کریم سے احکام فقہ تلاش کرنے! لیکن قرآن کریم میں یہ احکام تھے نہیں۔ تو اب کیا کیا جائے! اب وہ لگے اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارنے اور وہ احکام جو قرآن میں تھے نہیں' لگے انہیں قرآن سے تلاش اور متعین کرنے۔ اس کا جو نتیجہ ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اسے **تلاعب بالدین**-- دین سے مذاق کرنے-- کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتے ہیں۔ مصیبت یہ کہ اہل فقہ نے جو احکام مدون کئے تھے' انہیں بہرحال' انسانوں کے وضع کردہ احکام ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے' خواہ ان انسانوں کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ تصور کرلیا جائے۔ لیکن یہ لوگ (اہل قرآن) جو احکام پیش کرتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ خود خدا کے مقرر کردہ احکام ہیں! یا للعجب!!

یہ تمام الجھنیں اس لئے پیدا ہو رہی ہیں کہ (۱) اللہ تعالیٰ نے جس حکمت اور غایت کے لئے قرآن کریم کو اس انداز کی کتاب ہدایت بنایا تھا' وہ غایت نگاہوں سے اوجھل ہوچکی ہے اور (۲) جس نظام نے اس کتاب پر عمل کرانا تھا' وہ نظام قائم نہیں رہا۔ اب ہر شخص اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو اس کی دانست میں (معاذ اللہ) قرآن میں رہ گئی ہے۔ اسی غلط سمجھی یا گمراہی کی ایک مظہر قادیانی نبوت تھی جس کے مدعی نے آکر یہ کہا کہ جہاد کا حکم ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ کرنا ضروری سمجھا تو مجھے بھیج دیا کہ میں اس کے منسوخ ہونے کا اعلان کرکے قرآن میں ترمیم کردوں (معاذ اللہ)۔ آپ نے دیکھا کہ ایک نظام قرآنی کے قائم نہ رہنے سے امت کس کس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوگئی؟ (مئی ۱۹۷۶ء)

۱۴- قرآن سے غفلت برتنے سے عمر ضائع ہوگئی

(مولانا انور شاہ کاشمیریؒ (دیو بندی) کا مخلصانہ اعتراف اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تنبیہہ)

مولانا انور شاہؒ کاشمیری (دیو بندی) دنیائے علم و تقویٰ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں- ان کا نام سنتے ہی نگاہیں احترام سے جھک جاتی ہیں- ان کی آخری زندگی کا ایک عبرت آموز واقعہ مفتی محمد شفیع۸؎ صاحب کی زبانی موقر ماہنامہ "میثاق" کی نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جو اس قابل ہے کہ اسے نہایت غور و فکر سے ملاحظہ کیا جائے- وہ لکھتے ہیں :-

"ایک اہم واقعہ بھی آپ کے گوش گزار کروں جو اہم بھی ہے اور عبرت خیز بھی- قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہوا کرتا تھا اور سیدی حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے- ایک سال اسی جلسہ پر تشریف لائے- میں بھی آپ کے ساتھ تھا- ایک صبح نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں- میں نے پوچھا "حضرت کیسا مزاج ہے؟" کہا "ہاں! ٹھیک ہی ہے' مزاج کیا پوچھتے ہو' عمر ضائع کردی!"

میں نے عرض کیا "حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں' دین کی اشاعت میں گزری ہے- ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں' مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں- آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی!"

فرمایا "میں تمہیں صحیح کہتا ہوں' عمر ضائع کردی!"

میں نے عرض کیا "حضرت بات کیا ہے؟"

فرمایا "ہماری عمر کا' ہماری تقریروں کا' ہماری ساری کد و کاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں- امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں- یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور عملی زندگی کا- اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابو حنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود

۸؎ یہ بھی اب مرحوم ہو چکے ہیں- (نومبر ۱۹۷۶ء)

اپنا لوہا منوائے گا۔ وہ تو ہمارے محتاج نہیں اور امام شافعیؒ، مالکؒ اور احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو **"صواب محتمل الخطاء"** (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کریں اور دوسرے کے مسلک کو خطاء محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں۔ اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں"

پھر فرمایا:۔

"ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا۔ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح۔ یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترک رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق یا بالسر حق تھی۔ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا"۔

حضرت شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے الفاظ یہ تھے:۔

"اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو، نہ مالک کو نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے جنہوں نے نور ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدان حشر میں کھڑا کرکے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس۔ یہ نہیں ہوگا۔

تو جس چیز کو نہ دنیا میں کہیں ٹکرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں، اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی، اپنی قوت صرف کردی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرامؑ لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام

کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا' اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی' آج یہ دعوت تو نہیں دی جارہی۔ یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہئے تھا' وہ پھیل رہے ہیں' گمراہی پھیل رہی ہے' الحاد آرہا ہے' شرک و بت پرستی چل رہی ہے' حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں!"

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کردی"۔

طلوع اسلام

یہ تاثر در حقیقت' عبرت آموز تفسیر ہے قرآن کریم کی اس آیہ جلیلہ کی جس میں اس نے اسلاف کے ساتھ ہمارے رشتہ اور تعلق کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسلون عما کانوا یعملون (۲/۱۴۱)

"یہ لوگ اپنے اپنے کام سرانجام دے کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انہوں نے جو اچھے کام کئے ان کی انہیں جزا ملے گی اور ان کی غلطیوں کا ان سے مواخذہ ہوگا۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ (تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا)۔

کیا ہمارے علمائے کرام بالعموم' اور وابستگان دیو بند بالخصوص' حضرت شاہ صاحبؒ کے اس حاصل زندگی سے کچھ سبق حاصل کریں گے؟ (لیکن یہ کبھی ایسا نہیں کریں گے)۔

(۲) ترک قرآن

شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیو بندی کا مقام بلند بھی کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۸ پر (مفتی محمد شفیع صاحب ہی کے حوالے سے) ان کا ایک واقعہ درج ہے جو اسی طرح غور و فکر کا محتاج ہے۔ شیخ الہند مرحوم نے فرمایا:۔

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں' تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس

لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً" اور معناً" عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

حضرت شیخ الہندؒ نے جو فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی کے دو سبب معلوم ہوئے' ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کے اختلافات' تو یہ دوسرا سبب بھی درحقیقت پہلے سبب ہی کا فطری نتیجہ ہے۔ قرآن کریم نے اپنے نزول کا مقصد یہ بتایا تھا کہ وہ نوع انسان کے اختلافات کو ختم کردے گا۔ لہٰذا' قرآن کریم کو چھوڑ دینے کا فطری نتیجہ باہمی اختلافات ہیں اور ان کے مٹانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر اختلافی معاملہ میں قرآن کریم کو اتھارٹی تسلیم کرلیا جائے۔

لیکن یہاں مصیبت یہ ہے کہ ان لوگوں کے روزگار کا دار و مدار ہی ان اختلافات پر ہے۔ جو شخص انہیں قرآن کو اتھارٹی تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے' وہ اس پر کفر کے فتوے لگا دیتے ہیں اور ان اختلافات کی رو سے پیدا شدہ فرقوں کو "مکاتب فکر" کا نام دے کر خود فریبی یا دانستہ فریب دہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے وہ تباہی رک جائے گی جس کی لپیٹ میں اس وقت تمام کی تمام امت مسلمہ آچکی ہے۔

(جنوری ۱۹۷۶ء)

باب دوم

نبوت' رسالت' احادیث

۱- رسالت محمدیہؐ کا ثبوت

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب کا تفصیلی خط آیا ہے۔ چونکہ خط میں جو سوال اٹھایا گیا ہے اس کا تعلق کسی ایک فرد (یعنی مستفسر) ہی سے نہیں بلکہ وہ سوال اکثر دلوں میں (بالخصوص ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں) پیدا ہوتا رہتا ہے' اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس خط اور اس کے جواب کو طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ خط حسب ذیل ہے۔

"بچپنا تھا۔ کچھ اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید اکتالیس بیالیس کا زمانہ تھا۔ اس وقت طلوع اسلام والد محترم کے ہاتھوں میں دیکھا تھا۔ بچوں سے طلوع اسلام کا نام پڑھ کر بہت خوش ہوا تھا اور والدہ کے سامنے شوخی بگھارنی شروع کی کہ میں اب رسالہ بھی پڑھ لیتا ہوں۔ پھر کچھ مدت بعد خبر نہیں طلوع اسلام نکلنا بند ہو گیا یا والد صاحب نے لانا چھوڑ دیا۔ خدا جانے کیا ہوا۔ کبھی نہ دیکھا یا دیکھا تو کچھ خیال نہ کیا۔ وقت سالوں کی شکل میں بیت گیا۔ غالباً" اکیاون باون آیا' تو ہمارے ہاں طلوع اسلام بھی آنا شروع ہو گیا۔ اب کے میں نے طلوع اسلام کے بیچ نہیں کئے۔ پڑھا' شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ کئی ایک کیا بلکہ بہت سی باتیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔ مگر اکتاہٹ کے بجائے دل چسپی بڑھتی رہی۔ ایک دفعہ ایک مہمان نے ڈرائنگ روم کی میز پر طلوع اسلام پڑا دیکھا' تو حیران ہو کر والد صاحب سے پوچھنے لگا' کیوں صاحب! یہ طلوع اسلام آپ پڑھتے ہیں؟ والد صاحب کے اثبات پر مہمان کے چہرے پر کچھ اچھے جذبات نہ دیکھ کر طلوع اسلام سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں' میں نے والد صاحب سے پوچھا تھا کہ پرویز صاحب نے اتنا علم کیسے اور کہاں سے حاصل کرلیا ہے؟ والد محترم ہر ماہ طلوع اسلام لاتے رہے اور میں ہر ماہ طلوع اسلام پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۶۴ء اور جنوری ۱۹۶۵ء کا [illegible] شمارہ بھی پڑھ کر طلوع اسلام کے پرانے پرچوں کے ساتھ محفوظ کردیا ہے۔

کیمیائے سعادت' شاہ ولی اللہ کا نظریہ توحید' بہشتی زیور اور قصص الانبیاء سے لے کر مولانا آزاد کی تصنیفات اور پہلے پانچ سات پاروں کی تفسیر کے علاوہ مولانا مودودی کی پچیس تیس کتابوں کو بھی پڑھا۔ ادیب فاضل کے کورس میں سیرت النبی اور کئی ایک مذہبی قسم کی کتابوں سے پالا پڑا۔ دوچار باہر کے مصنفین کی کتابیں بھی نظر سے گزریں۔ (BIBLE CORRESPONDENCE SCHOOL) سے "بائبل مقدس" کا "کورس" کرکے لینے کو تو سرٹیفکیٹ بھی لیا ہے۔ گرونانک کے خیالات پر مبنی سکھ منی اور جپ جی کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ شرمد بھگوت گیتا کا ترجمہ بھی پڑھا اور

تلسی داس کی رامائن پڑھی۔ موج کوثر' آب کوثر' یعنی ان سب کوثروں کو بھی دیکھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خیالات پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ "مولوی" کے پندرہ بیس اور اس سے دوگنے "آستانہ" کے پرانے رسالوں کا اشاک مل گیا۔ چھوڑا اسے بھی نہیں۔ ستیارتھ پرکاش پڑھ چکا ہوں۔ برق کی تصانیف کو بھی دیکھا۔ ان کے علاوہ کئی ایک کتابیں اور مضامین اور ہیں جن کی لسٹ بتانا گویا "میں" کو اجاگر کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ جو کچھ پڑھا بڑی جستجو سے پڑھا۔ جتنا پڑھا تشنگی اتنی ہی شدت اختیار کرتی گئی۔ ان مندرجہ بالا کتابوں کے پڑھنے سے ہوا یہ کہ میں ایک روز یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ مذہب میں آخر رکھا ہی کیا ہے۔ اس میں کتنے جھگڑے ہیں' اس میں کتنے جھنجٹ ہیں۔ موجودہ زمانے میں مذہب سے روپے کی طاقت زیادہ ہے اور مذہب کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر یہ جھگڑا کرانے والی اور دلوں میں وہم ڈالنے والی شے نہ ہو تو کون سی قیامت آجائے گی۔ پھر میں اس خیال سے متفق ہوگیا اور شدت سے ہوا۔ سوچتا دنیا میں مذہب کی چنداں ضرورت نہیں اور اگر کبھی ضرورت تھی بھی تو پہلے وقتوں میں جب کہ تعلیم عام نہ تھی۔ مذہب اخلاق سکھانے کے لئے میدان عمل میں آیا۔ آج کے دور میں اگر مذہب نہ بھی ہو تو بھی لوگ تعلیم سے اخلاق سیکھ سکتے ہیں۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ وقت خود بخود سکھا دیتا ہے۔ اور پھر وہ لوگ جو مذہب تو کجا خدا ہی کو نہیں مانتے' وہ بھی تو زندگی گزار لیتے ہیں اور ہم سے بہت بہتر گزارتے ہیں۔ آگے جا کر انہیں عذاب ملے گا تو یہ بھی صحیح طور پر کیا معلوم۔ مذکورہ کتابوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد ڈارون کی تھیوری نے رہا سہا بھی خاک کی نذر کردیا اور گویا مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ڈارون نے غلط نہیں کہا۔ میں "ڈارون کا سالک" آخری مقام بھی طے کرنے کو تھا۔ اب میں آزاد ہونے کو تھا۔ یہی میری انتہا تھی لیکن میں نے مطالعہ نہیں چھوڑا۔ جو بھی مذہبی کتاب ملتی' پڑھتا اور پڑھنے کے بعد ہنس کے کسی کونے میں پھینک دیتا۔ طلوع اسلام اور اس ادارہ کی دوسری کتابیں بھی پڑھتا' مگر انہیں پڑھ کر کبھی ہنسی نہیں آئی بلکہ دیر تک خاموش کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ سوچ کیا ہوتی تھی۔ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ معراج انسانیت' انسان نے کیا سوچا' قرآنی فیصلے' سلیم کے نام خطوط' طاہرہ کے نام خطوط' ابلیس و آدم' مزاج شناس رسول' ان کے علاوہ کئی اور کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان مذکورہ کتابوں اور طلوع اسلام کے مسلسل مطالعہ سے ممکن ہے بہت سے فائدے ہوئے ہوں' مگر جس فائدے کا مجھے علم ہے وہ یہ ہوا کہ میں ہر کسی بات کو عقل و شعور سے کام لے کر ماننے کا عادی ہوگیا اور اس عادت نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کردیا کہ ڈارون غلط کہتا ہے۔ مسلمان ہی کیا بلکہ دنیا کی تقریباً تمام قومیں خدا کے وجود کی کسی نہ کسی طرح قائل ہیں لیکن قائل ہونا اور بات ہے اور کسی بات پر مطمئن ہونا اور بات۔ اب میں قائل ہونے کے علاوہ مطمئن بھی ہوں۔ مجھے اطمینان ہے' مجھے یقین ہے' مجھے تسکین ہے' مجھے تسلی ہے۔ وہ خدا جو وہموں کے پردے میں تھا' آپ کی کتابوں کے مطالعہ سے اب ظاہر ہوچکا ہے۔ اب میں اس خدا کو دل میں محسوس کرتا ہوں۔

لیکن یہ کہتے ہوئے مجھے نہایت افسوس ہے' شدید قلق ہے' بڑا دکھ ہے کہ وہ اطمینان جو مجھے خدا کے تصور سے ہے' رسول کریمؐ کے متعلق ویسا اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ قائل ہونا اور بات ہے اور

مطمئن ہونا اور بات ہے۔ اب اس درد کا مداوا چاہتا ہوں تاکہ دل میں وہم' وسوسے' شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بن جاؤں اور شاید پھر عمل کرنا بھی شروع کردوں۔ ہاں تو آپ رسول کریمؐ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ

(۱) وہ سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ امین تھے وغیرہ وغیرہ۔ سب درست مگر یہ سب اچھائیاں تو نبوت ملنے سے پہلے بھی تھیں۔

(۲) چونکہ قرآن میں ان کی رسالت کا ذکر ہے اس لئے وہ رسول تھے۔ بالکل ٹھیک ہے' اس کے لئے ہمیں قرآن کو خدائی کلام ثابت کرنا پڑے گا۔ یعنی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن خدائی کلام ہے' تو پھر آپ کی رسالت خود بخود پایہ ثبوت تک پہنچ جائے گی۔ اور قرآن کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ :

(۱) چونکہ قرآن کے چیلنج کے باوجود اس جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں بنی' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قرآن کے چیلنج کو منظور کرکے دوسری کتاب اس کے مقابلہ میں بنائی گئی ہو اور مسلمانوں نے اپنے عروج میں یا اس سے پہلے ہی کسی طریق سے ضائع کردیا ہو یا کسی کو دے دلا کر ضائع کرادیا ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایسی کتاب بنالی جاتی تو کفار اس ذوق و شوق سے دعوت اسلام پر لبیک نہ کہتے۔ عرض ہے کہ سرداروں کے ظلم و ستم سے نجات کے لئے بھی تو کفار اسلام قبول کرسکتے تھے۔

(۲) چونکہ قرآن شریف میں کوئی بات جھوٹی نہیں' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک کتاب ایسی لکھی جائے جس میں کوئی جھوٹ نہ ہو' تمام فنڈامینٹل ہوں۔

(۳) چونکہ عام آدمی ایسی فلسفیانہ باتیں نہیں کرسکتا' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔
باتوں کا عمر' تجربے اور کوشش و دھیان وغیرہ پر بھی دار و مدار ہوتا ہے اور پھر چالیس سال کی عمر تک تو خاصا تجربہ حاصل ہوجاتا ہے۔

(۴) چونکہ پرانے زمانے کی (گزشتہ قوموں کی) باتیں بھی اس میں موجود ہیں جبکہ رسول کریمؐ تھے ہی نہیں' اس لئے یہ خدائی کلام ہے۔ پرانی داستانیں دوسری مذہبی کتابوں میں بھی درج تھیں جنہیں ان پڑھ کے لئے پڑھنا ناممکن ضرور تھا' مگر کسی نہ کسی طرح سنی ضرور جاسکتی تھیں۔ ان باتوں کے علاوہ کچھ باتیں سینہ بسینہ بھی چلی آرہی ہوں گی۔ دونوں طریقوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر کوئی "پرانی بات" ایسی ہے جو نہ تو کہیں کسی کتاب میں ہو اور نہ ہی سینہ بسینہ چلی آرہی ہو' تو ایسی بات کی صحت کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ درست ہے یا غلط۔

مرہم کچھ اس طرح رکھیں کہ جلد آرام آجائے اور دل میں کسی وسوسے یا وہم (جو کہ دل میں دو چار سیکنڈ ہی کے لئے آتا ہے) کی گنجائش ہی نہ رہے۔ جب تک اطمینان نہ ہو اس وقت تک صرف قائل ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ کیا آپ مجھے فخر کرنے کا موقع نہ دیں گے؟"۔

جواب : مجھے آپ کے ذوق تجسس کا معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی اور اس سے بھی کہ میں نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق جو کچھ اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے اس سے آپ کے بہت سے شکوک رفع ہوگئے اور خدا پر آپ کا اطمینان اس درجہ محکم ہوگیا کہ آپ کا اضطراب' سکون سے بدل گیا۔ وہ سکون جو عقل و فکر اور علم و بصیرت کی بنا پر حاصل ہوتا ہے' نہ وہ جو جہالت اور تقلید پر مبنی ہوتا ہے اور غور و تدبر اور تنقید و تحقیق سے ختم ہوجاتا ہے۔ (ضمناً) یہ بھی ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ میری انہی کتابوں سے (جنہیں ان میں سے کسی نے بھی پڑھا نہیں تھا) ہمارے ہاں کے مفتیان گرام نے مجھے "خدا کا منکر" لہٰذا (معاذ اللہ) ملحد و بے دین قرار دیا تھا اور انہی کتابوں سے آپ علی وجہ البصیرت' خدا پر ایمان لائے ہیں۔ یضل بہ کثیر و یھدی بہ کثیرا (۲/۲۶ کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

آپ نے بالکل صحیح سمجھا ہے کہ ایمان وہی ایمان ہے جو علی وجہ البصیرت دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے بعد لایا جائے۔ اگر ناخن میں چبھی ہوئی پھانس نکالی نہ جائے تو وہ ساری رات سونے نہیں دیا کرتی۔

۲۔۔ آپ کے سوال کا ملخص یہ ہے کہ یہ کس طرح مانا جائے کہ قرآن کریم خدا کا کلام ہے' نبی اکرمؐ نے اسے خود ہی وضع کرکے اسے خدا کی طرف منسوب نہیں کردیا؟

قبل اس کے کہ میں اس سوال کا جواب عرض کروں' آپ کے اعتراضات میں سے دو ایک اہم شقوں کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس سے اصل سوال پر خاصی روشنی پڑے گی۔

آپ نے لکھا ہے کہ "آپ رسول کریمؐ کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ امین تھے' وغیرہ وغیرہ۔ سب درست مگر یہ اچھائیاں تو نبوت ملنے سے پہلے بھی تھیں"۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ صحیح ہے (اور اس کی صحت میں کسی کو بھی شبہ نہیں) کہ نبی اکرمؐ نبوت سے پہلے سچے تھے۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد ان کی یہ سب خوبیاں ختم ہو گئی تھیں اور وہ راتوں رات ایسے بدل گئے تھے کہ (معاذ اللہ) اتنا بڑا جھوٹ بولنے لگ گئے اور پھر تیئس برس تک مسلسل جھوٹ بولتے چلے گئے۔ ایسا کرنے والے کو یا تو اتنا بڑا مکار اور ریاکار ہونا چاہئے کہ وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اس قسم کا دعویٰ کرے اور پھر اتنے لمبے عرصہ تک اس منافقت' عیاری اور مکاری کو نہایت کامیاب طریق سے نباہتا چلا جائے۔ اور یا وہ ایسا نفسیاتی مریض ہو کہ اپنے توہمات کو خدا کا کلام سمجھ کر اس خود فریبی میں مبتلا ہو جائے کہ وہ مامور من اللہ ہے۔ (اس قسم کی نفسیاتی بیماریاں ہوتی ہیں۔ ہماری طب قدیم میں بھی اس قسم کی علامات کو "نوعے ازجنون" کہا گیا ہے)۔

لیکن رسولؐ اللہ کی نبوت کی تیئس سالہ زندگی ان دونوں باتوں کی تغلیط کرتی ہے۔ مکاری و عیاری کا پردہ کسی نہ کسی مقام پر ضرور چاک ہو جاتا ہے' بالخصوص جب مخالفین کی ہزاروں نگاہیں اس کی تلاش میں ہوں اور نفسیاتی مریضوں کی ایک ایک حرکت ان کے غیر متوازن ذہن اور شکست ذات (TORN PERSONALITY)

کی غماز ہوتی ہے۔ بعض متعصب پادریوں نے حضورؐ کے خلاف اس قسم کے الزامات بھی لگائے تھے۔ لیکن خود انہی کے ارباب علم و تحقیق نے ان کی تردید کر دی اور برملا کہا کہ آپؐ کی زندگی میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ملتی۔

۳۔ آپ نے اس دعوے کے سلسلہ میں (کہ قرآن کا چیلنج ہے کہ اس جیسی کتاب کوئی انسان نہیں بنا سکتا) کہا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کی کوئی کتاب بنائی گئی ہو اور مسلمانوں نے اسے ضائع کر دیا ہو۔

قرآن کا یہ چیلنج' قریش عرب تک ہی محدود نہیں تھا۔ ان سے زیادہ تحدی کے ساتھ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو بھی دیا گیا تھا۔ یہودی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور عیسائیوں کی اتنی اتنی عظیم الشان سلطنتیں موجود تھیں۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی طرف سے اس چیلنج کا جواب دیا گیا ہو اور اس کا کوئی ذکر ان کی کسی تاریخ میں موجود نہ ہو؟ کتاب ضائع کی جا سکتی ہے (حالانکہ جس تسلسل سے عیسائی سلطنتیں ظہور اسلام کے وقت سے لے کر اس زمانہ تک چلی آرہی ہیں' اس کے پیش نظر ایسا ہونا بھی ناممکنات میں سے ہے) لیکن اس قسم کے واقعہ کے تذکرہ کو ساری دنیا کی کتب تاریخ سے مٹا دینا تو کسی طرح ممکن نہیں۔

پھر' قرآن کا یہ چیلنج' اسی دور تک محدود نہیں تھا۔ ساری دنیا کے لئے' اور ہر ایک زمانے کے لئے تھا۔ دنیا نے (بالخصوص عیسائی دنیا نے) اسلام کی مخالفت میں ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ سیکڑوں برس تک صلیبی لڑائیاں ہوتی رہیں' ہزارہا کتابیں اسلام کے خلاف لکھی گئیں' مناظرے کئے گئے' مباحثے ہوئے (اور ہوتے چلے جا رہے ہیں)۔ اگر اس چیلنج کا قبول کر لینا ممکن ہوتا تو مخالفین کو اتنا کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ایک کتاب' قرآن کی مثل لکھ دی جاتی۔ ساری دنیا کے مسلمان شکست کھا جاتے۔

اور اب بھی کونسا موقع نکل گیا ہے؟ دنیا اس چیلنج کو قبول کر کے اس جھگڑے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں ختم کر دیتی؟ ذرا سوچئے کہ یہ سوچنے کا مقام ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ "سرداروں کے ظلم و ستم سے نجات کے لئے بھی تو کفار اسلام قبول کر سکتے تھے"۔ ہو سکتا ہے کہ مظلوم اور مقہورؐ' کمزور و ناتواں لوگوں نے اسی طرح اسلام قبول کر لیا ہو۔ (اور اسلام کی برتری کا یہ ثبوت بھی کیا کم ہے کہ وہ مظلوموں اور کمزوروں کی پناہ گاہ ہے!) لیکن سوال یہ ہے کہ ان سرداروں نے اسلام کس طرح قبول کر لیا؟۔ بلالؓ اور صہیبؓ نے تو مظلومیت سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیا ہو گا۔ (حالانکہ اسلام قبول کرنے سے ان پر جس قدر ظلم و ستم ڈھائے گئے' وہ ان مظالم سے کہیں شدید تھے جو ان پر اس سے پہلے روا رکھے جاتے تھے) لیکن ابو بکر و عمر' عبد الرحمٰن اور عثمان' طلحہ اور زبیر (رضی اللہ عنہم) نے کن مظالم کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا؟ ان کا شمار تو سرداران قریش میں ہوتا تھا!

۴۔ آپ کہتے ہیں کہ گذشتہ زمانے کی جو باتیں قرآن کریم میں مذکور ہیں' وہ باتیں پہلی کتابوں میں موجود تھیں' یا سینہ بسینہ چلی آرہی تھیں اور جو باتیں نئی تھیں' ان کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں یا غلط!

گزشتہ زمانے کی جو باتیں کتب سابقہ میں بیان ہوئی تھیں' ان میں اور جس طرح وہ قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں ان میں' جہاں جہاں اختلاف ہے (یا جو باتیں صرف قرآن میں بیان ہوئی ہیں) وہ مقامات قابل غور ہیں۔ جوں جوں تاریخی تحقیقات بڑھتی جا رہی ہیں' وہ قرآن کے بیانات کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتی جا رہی ہیں۔ یہ مشکل ہے کہ ان مقامات کی تفصیل' یا نشاندہی ایک خط میں درج کر سکوں۔ یہ موضوع بڑا تفصیل طلب ہے۔ ایک آدھ مثال پر غور کیجئے۔ عیسائیوں کے ہاں یہ مسلمہ چلا آرہا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش' ۲۵/دسمبر کو ہوئی۔ قرآن نے کہا کہ ان کی پیدائش اس موسم میں ہوئی تھی جب کھجوریں درختوں پر پکتی ہیں۔ یہ موسم دسمبر میں نہیں ہوتا' گرمیوں کا ہوتا ہے۔ اب خود مغربی محققین اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش اور آپ کی زندگی سے متعلق دیگر اہم کوائف جس طرح بائبل میں مذکور ہیں محض افسانے ہیں۔ اب ان کی تحقیقات کا رخ قرآن میں بیان کردہ واقعات کی طرف ہے۔ ان میں سے بعض کی تصدیق وہ کر چکے ہیں۔ اور جب ان کی تحقیق آگے بڑھے گی تو بقایا کی تصدیق بھی اسی طرح ہوتی جائے گی۔ یا مثلاً" فرعون موسیٰؑ کی لاش کے متعلق' کتب سابقہ خاموش تھیں۔ قرآن نے بتایا کہ اسے غرقابی کے بعد' محفوظ رکھ لیا گیا تھا۔ مصری تہ خانوں کی کھدائی نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ فرعون کی ممی شدہ لاش محفوظ رکھی ہے۔

اب میں آپ کے اصل سوال کی طرف آتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے جو کچھ کہنا ہے اس کی طرف آپ نے خود ہی اشارہ کر دیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ "باتوں کا عمر' تجربے' کوشش اور دھیان وغیرہ پر بھی دار و مدار ہوتا ہے۔ اور پھر چالیس سال کی عمر تک تو خاصا تجربہ حاصل ہو جاتا ہے"۔ اس لئے قرآن میں جو "فلسفیانہ باتیں" ہیں وہ رسولؐ اللہ کے اپنے علم و تجربہ کی پیداوار ہو سکتی ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے جس کی تائید کے لئے کسی دلیل و شواہد کی ضرورت نہیں کہ انسان کتنا ہی زیادہ دانا و بینا کیوں نہ ہو' نہ اس کی معلومات اپنے زمانے کی علمی سطح سے آگے جا سکتی ہیں' نہ وہ اپنے ماحول سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ حتیٰ کی جن امور کو بڑے بڑے مفکر بطور اپنے فلسفہ کے پیش کرتے ہیں' شعوری اور غیر شعوری طور پر ان قیاسات کا منبع بھی ان کے زمانے تک کا علم انسانی ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ محمدؐ ابن عبد اللہ (بحیثیت ایک انسان کے) اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ ان کی معلومات اپنے زمانے کی علمی سطح سے آگے بڑھ سکتی تھیں' نہ وہ اپنے ماحول سے یکسر غیر متاثر رہ سکتے تھے۔ اب دیکھنا یہ چاہیے کہ زندگی کے جو اصول قرآن نے دیئے ہیں' کیا وہ اس زمانے کی علمی سطح تک محدود تھے یا اس سے آگے جاتے تھے اور آیا ان اصولوں کو پیش کرنے والا' اپنے ماحول سے متاثر ہو کر یہ کچھ کہہ سکتا تھا؟ اس باب میں میری دشواری پھر یہی ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے۔ خط اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا' میں دو چار مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔

(۱) زمانہ نزول قرآن میں' بادشاہت کو' ساری دنیا میں' مسلمہ نظام سیاست و تمدن سمجھا جاتا تھا۔ کہیں راجہ

کو ایشور کا اوتار مانا جاتا تھا' کہیں بادشاہ کو زمین پر خدا کا سایہ۔ سلاطین کے آسمانی حقوق الوہیت کا عقیدہ عام تھا۔ کوئی انسانی ذہن ایسا نہیں تھا جو اس عقیدہ میں کسی قسم کا سقم یا عیب محسوس کرے۔ عین اس زمانے میں' عرب کی سرزمین کا ایک امی یہ کہتا ہے کہ یہ عقیدہ بالکل باطل اور یہ تصور یکسر غلط ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ حکومت صرف قانون کی ہو سکتی ہے اور قانون بنانے کا اختیار بھی کسی انسان کو حاصل نہیں۔ ان قوانین کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے متنازعہ فیہ معاملات کا تصفیہ' لوگوں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہئے۔

میں پوچھتا یہ ہوں کہ کیا اس زمانے کا کوئی انسانی ذہن یہ اصول حکمرانی دے سکتا تھا؟

(۲) خود خدا کے متعلق یہ عقیدہ' اسی زمانے تک ہی نہیں' بلکہ (عام طور پر) آج تک بطور مسلمہ چلا آتا ہے کہ "خدا قادر مطلق ہے"۔ وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں۔ وہ جسے چاہے خاک سیاہ کر دے جسے چاہے تخت پر بٹھا دے' جسے چاہے تباہ کر دے جسے چاہے فروغ دے دے۔ اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے۔ لیکن آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے' ایک شخص یہ کہتا ہے کہ خدا بے شک قادر مطلق ہے لیکن اس نے اس کائنات کے نظام کے لئے خود ہی کچھ قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔ اور اب یہاں جو کچھ ہوتا ہے ان قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان ان قوانین کا علم حاصل کر سکتا ہے' اس لئے وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کرکے انہیں اپنے کام میں لا سکتا ہے (یہ اس زمانے میں کہا جا رہا تھا جب دنیا کائناتی قوتوں کو دیوی دیوتا مانتی تھی) اور اپنی ہر ناکامی کے اسباب و علل پر غور کرکے' سمجھ سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور مجھے کیا کرنا چاہئے جس سے آئندہ ایسا نہ ہو۔

آپ سوچئے کہ کیا اس زمانے میں یہ کچھ' انسانی ذہن کہہ سکتا تھا؟

(۳) ذات پات کی تمیز اور انسانوں کی طبقاتی تقسیم اس زمانے کا عام معمول تھا۔ حتی کہ اسے خدائی سند اور برہما کی تخلیق قرار دیا جاتا تھا۔ عین اس زمانے میں (اور خود عرب میں جہاں یہ تفریق اپنے انتہا تک پہنچ رہی تھی) یہ کہا گیا کہ ہر انسانی بچہ' محض انسان ہونے کی جہت سے' یکساں واجب التکریم ہے۔ مدارج کا فرق صرف جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی بنا پر ہونا چاہئے۔

غور کیجئے کیا اس اصول کو بطور ایک غیر متبدل اصول حیات اور مستقل قدر کے پیش کرنا' اس زمانے کے ذہن کی پیداوار ہو سکتا تھا؟

(۴) اس زمانے میں جب ایک بستی کے رہنے والے' دوسری بستی والوں کے حالات سے واقف نہیں ہوتے تھے اور دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی' ایک شخص یہ کہتا ہے کہ یہ تقسیم' انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری ہے اور اسے آخر الامر ایک قوم بن کر رہنا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دنیا ایک مشترکہ ضابطہء قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لہٰذا' قبائلی یا قومی تشکیل کا مدار نسل یا وطن کے اشتراک پر نہیں' آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ ذرا سوچئے کہ یہ تصور اس زمانے کی علمی سطح سے کتنا آگے تھا؟

کیا اس قسم کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہو سکتا تھا؟

(۵) غلامی اس زمانے میں ساری دنیا میں بطور ایک مسلمہ کے رائج تھی اور دنیا کے بلند ترین ذہنوں کے حامل' اسے فطرت کا تقاضا اور صحیح انسانی تقسیم قرار دیتے تھے۔ اس زمانے میں یہ اصول پیش کرنا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنا غلام بنائے' کیا ماحول کا اثر یا اس زمانے کی علمی کاوش کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

(۶) اس زمانے میں جب زمینداری' جاگیرداری اور سرمایہ داری کو معیشت کا متفق علیہ نظام قرار دیا جاتا تھا (اور اس کے خلاف' عرب کے ہمسایہ ملک میں مزدک کی اشتراکی کوشش بری طرح ناکام ہو چکی تھی)' یہ اصول پیش کرنا کہ تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا نظام معاشرہ کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے رزق کے سرچشموں کو معاشرہ کے کنٹرول میں رہنا چاہئے۔ دولت جمع کرنا عذاب جہنم کا موجب ہے اور اپنی محنت کے ماحصل کو نوع انسان کی بہبود کے لئے کھلا رکھنا جنت کی خوشگواریوں کا باعث۔ اور اس کے لئے ایسی محکم بنیادیں مہیا کرنا جن سے یہ نظام کبھی ناکام ثابت نہ ہو۔ غور کیجئے کہ کیا یہ چیز عرب کے تاجرانہ قبیلہ سے متعلق ایک فرد کی ذہنی تخلیق ہو سکتی تھی؟

(۷) اس زمانے میں' مذہبی پیشوائیت "دنیائے روحانیت" کا ایسا عقیدہ تھا جس میں کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ دنیا کا ہر مذہب' اسے ایمان کا جزو قرار دیتا تھا۔ عین اس زمانے میں' کسی کا یہ اعلان کرنا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب اور دربان نہیں - یہ احبار و رہبان (علماء اور مشائخ) لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں۔ دین میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ اعلان ہو رہا ہے اس گھرانے کے فرد کی طرف سے جو کعبہ کے متولیوں میں سب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کیا یہ تصور اس شخص کے اپنے ذہن کی تخلیق ہو سکتا تھا؟

(۸) ان اقدار و اصول حیات سے ہٹ کر' علمی حقائق کی طرف آیئے' تو (مثلاً") علم الافلاک کے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے۔ تمام اجرام فلکی اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ یہ عظیم الجثہ کرے' کشش ثقل کی زنجیروں کے ساتھ بندھے ہوئے مسلسل مصروف خرام ہیں۔ زمین اس قدر تیزی سے گھومنے کے باوجود' مخلوق کے لئے رہائش و آسائش کا گہوارہ ہے' وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ سائنٹیفک حقائق' اس زمانے کا انسانی ذہن وضع کر سکتا تھا؟

آپ انہی چند مثالوں پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا یہ باتیں اس زمانے میں انسانی تجربہ یا کاوش کا نتیجہ ہو سکتی تھیں۔ اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ دنیا نے اس زمانے میں ان باتوں کو جھٹلایا۔ لیکن دنیا جوں جوں' علم' تجربہ اور سائنٹیفک تحقیقات و انکشافات میں آگے بڑھتی جا رہی ہے' کیا وہ ان اصولوں کی طرف آ رہی ہے جو اس رسولؐ نے پیش کئے تھے یا ان نظریات کو صحیح تسلیم کر رہی ہے جو اس سے پہلے دنیا میں بطور مسلمات مانے جاتے تھے؟ کیا (قرآن کے الفاظ میں) انفس و آفاق کی شہادتیں' قرآنی حقائق کی تائید کر رہی ہیں یا تردید؟ اور کیا آج کا

اپنے ذہن کے وضع کردہ نظام زندگی کے ہاتھوں کا متایا ہوا انسان' جس قسم کے نظام کو انسانیت کی نجات و سعادت کا ضامن سمجھ کر' اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے' وہ نظام وہی نہیں جسے اس رسولؐ نے یہ کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا کہ انسان کو آخر الامر اس کی طرف آنا پڑے گا۔

کیا یہ حقائق' اس رسولؐ کے اس دعویٰ کی صداقت نہیں کہ "میں جو کچھ کہتا ہوں وہ میرے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ علم الٰہی ہے جو بذریعہ وحی مجھے دیا گیا ہے" **"وما ینطق عن الھویٰ ط ان ھو الا وحی یوحی"** (۵۳/۳-۴)

خدا کرے کہ میری یہ معروضات' آپ کے لئے اس مرہم کا کام دیں جس کی آرزو میں آپ نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ لیکن اگر اب بھی کوئی بات وضاحت طلب رہ گئی ہو تو میں اس کی مزید تشریح کی بھی کوشش کروں گا **ھی حتی مطلع الفجر۔** (پرویز)

(مارچ ۱۹۶۵ء)

نوٹ :- اس ضمن میں قرآنی فیصلے حصہ اول' ایڈیشن سوم' مارچ ۹۲ء میں عنوان "کیا اقوام مغرب کو وحی کی ضرورت ہے" صفحہ ۵۱۴ بھی دیکھ لیجئے۔

۲- اطاعت رسولؐ کا مفہوم ـــــ احترام کا صحیح مفہوم

"اطاعت رسول" کا تفصیلی مفہوم "قرآنی فیصلے حصہ اول' ایڈیشن سوم' مارچ ۹۲ء صفحہ ۳۳۵ میں' "قرآن کا سیاسی نظام" کے زیر عنوان ملے گا۔ زیر نظر سوال ایک اور نوعیت کا ہے' اس لئے اس کا الگ جواب دیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ سوال اور جواب ملاحظہ فرمایئے۔

سوال :- اگست کے پرچے میں آپ نے سورۂ نساء کی آیت **فلا و ربک لا یومنون** (۴/۶۵) ..... الخ درج کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک رسولؐ اللہ کو اپنے معاملات میں حکم تسلیم نہ کریں اور پھر ان کے فیصلوں کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ اس کے باوجود آپ نے حضرت زیدؓ کا واقعہ درج کیا ہے کہ انہوں نے رسولؐ اللہ کے فرمانے کے باوجود اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ لیکن اسے معصیت رسول نہ سمجھا گیا کیونکہ آپؐ نے ایسا اپنی ذاتی حیثیت سے فرمایا تھا۔ اس لئے حسب ذیل سوالات دل میں ابھرتے ہیں:-

(۱) ہماری کتب احادیث میں رسولؐ اللہ کے کسی ارشاد کے ساتھ یہ تصریح نہیں ہوتی کہ اس بات کا حکم حضورؐ نے اپنی کس حیثیت سے دیا تھا۔ اس سے ایک تو یہ واضح ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا ہر قول وحی خداوندی تھا جس کی اطاعت واجب تھی' ان کا یہ کہنا صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ جن احادیث کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صحیح ہیں' ان کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپؐ نے وہ حکم اپنی ذاتی حیثیت سے بطور مشورہ دیا تھا یا

کسی اور حیثیت سے۔ اس لئے احادیث کی رو سے متعین طور پر اطاعت رسولؐ اللہ کیسے کی جا سکتی ہے؟

(۲) دوسرے یہ کہ رسولؐ اللہ کے فیصلے کے خلاف اگر کسی کے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس ہو' تو وہ شخص مومن نہیں رہتا۔ کیا یہ حیثیت کسی اور کو بھی حاصل ہو سکتی ہے؟

(۳) ہم اپنے کئی معاملات میں' دوسروں کے فیصلوں کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن اس کے باوجود' متعدد وجوہات کی بناء پر' ان فیصلوں کو مان لیتے ہیں حالانکہ دل اس پر کڑھتا رہتا ہے' مثلاً" کسی زبردست کے ڈر سے یا اپنے کسی بڑے کے احترام کی وجہ سے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ اطاعت کیسی ہو گی؟

جواب:۔ (۱) آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ سنت کے سلسلہ میں اسی قسم کی دشواریاں ہیں جنہیں ہم مدت سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کا اطمینان بخش جواب تو کہیں سے ملتا نہیں البتہ "منکر حدیث" اور منکر رسالت" کے فتوے ضرور صادر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح یہ مسائل حل تو ہو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں کی تگ و تاز کے باجود' ایسے قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکے (نہ ہی کبھی ہو سکتے ہیں) جنہیں یہ حضرات متفقہ طور پر مطابق "کتاب و سنت" قرار دیں۔ [۱] اس لئے کہ جب یہ حضرات متفقہ طور پر یہی طے نہیں کر سکتے کہ "سنت" کا اطلاق کس پر ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ فلاں فیصلہ مطابق سنت ہے یا نہیں۔

(۲) اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھئے کہ ایمان کہتے کسے ہیں؟ ایمان کے معنی ہیں کسی بات کو دل کی پوری پوری رضا مندی کے ساتھ صحیح تسلیم کر لینا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی بات کے تسلیم کرنے میں دل کی رضا مندی شامل نہ ہو (دل میں اس کے خلاف گرانی پائی جائے) تو اسے ایمان کہا ہی نہیں جائے گا۔

دوسرے یہ کہ نبی پر ایمان لانے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کو دل کی پوری پوری رضا مندی کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ (i) نبی' خدا کے احکام کو صحیح صحیح طور پر ہم تک پہنچاتا ہے۔ اور (ii) اس کے فیصلے احکام خداوندی کے مطابق ہوتے ہیں۔ نبی پر ایمان لانے کے بعد' یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے کسی فیصلے کے خلاف اگر دل میں گرانی محسوس ہو' تو یہ بات نبی پر ایمان کے خلاف ہو گی۔

نبی کے علاوہ' ہم کسی انسان پر ایمان لانے کے لئے مکلف نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ پوزیشن کسی اور کی نہیں ہو سکتی کہ اس کے فیصلے کے خلاف دل میں گرانی گذرے تو انسان کا ایمان جاتا رہے۔

البتہ ایک بات قابل غور ضرور ہے۔ ایک شخص آپ کے سامنے قرآن کریم کا کوئی فیصلہ پیش کرتا ہے۔ اسے آپ تسلیم تو کر لیتے ہیں لیکن دل کی کبیدگی کے ساتھ۔ آپ کی یہ کبیدگی اس شخص کے خلاف نہیں ہو گی' بلکہ در حقیقت قرآن کریم کے خلاف ہو گی۔ اور قرآن کریم پر ایمان لانے کے لئے ہم مکلف ہیں۔ اس لئے یہ چیز اس ذیل میں آجائے گی۔ البتہ اگر صورت یہ ہے کہ وہ فیصلہ قرآن کریم کے کسی اصول کے ماتحت اس شخص کا (یا کسی اور کا)

---

[۱] مودودی صاحب کو بالآخر اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے تو کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں کیا جاسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ ملاحظہ ہو "ایشیا" مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء

اپنا استنباط ہے اور آپ اس سے متفق نہیں' تو اس کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا ہو جانا خود قرآن کریم کے خلاف کبیدگی پیدا ہونے کے مرادف نہیں ہو گا۔

(۳) جن لوگوں کے فیصلوں کی اطاعت ہم کرھا" (مجبوراً") کرتے ہیں (خواہ وہ مجبوری کسی قسم کی ہو۔ خود اپنے کسی مفاد کا خیال بھی تو مجبوری ہوتی ہے) اول تو اس کے لئے "اطاعت" کا لفظ ہی استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ "اطاعت" اس فرماں پذیری کو کہتے ہیں جس میں دل کی رضا مندی شامل ہو لیکن ایسی "اطاعت" کے لئے جس میں دل کی رضا مندی شامل نہ ہو' احترام کا لفظ تو بالکل استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ احترام' اس تعظیم کو کہتے ہیں جو دل کے پورے خلوص اور رضا مندی کے ساتھ کی جائے۔ اگر آپ کسی کے فیصلے کے خلاف دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہیں لیکن اسے کسی مصلحت کے تابع مان لیتے ہیں--- مثلاً" کسی کے ڈر کی وجہ سے یا کسی کی ناراضگی کے خیال سے' تو یہ کہئے کہ میں نے اسے مصلحتاً تسلیم کر لیا۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ میں نے ان کے احترام کی وجہ سے اسے مان لیا' تو اس سے آپ ایسے جذبہ کا اظہار کر رہے ہیں جو فی الحقیقت آپ کے دل میں نہیں۔ یہ "احترام" ایسا ہی ہے جیسا ہمارے ہاں رمضان شریف کا "احترام" کیا جاتا ہے کہ دل میں یہ جذبات موجزن ہوتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی اور زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس کے احترام میں لوگوں کے سامنے نہیں کھاتے پیتے۔ احترام اس کا ہے جو رمضان کے روزوں کو خدا کا حکم سمجھے اور اس حکم کے خلاف دل میں کوئی کبیدگی محسوس نہ کرے' لیکن (خدا ہی کی دی ہوئی اجازت کے ماتحت) اپنی کسی معذوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے' اور حکم خداوندی کی تعظیم کے جذبہ کے ماتحت' کھلے بندوں نہ کھائیے پیئے' الا بحالت مجبوری۔ احترام اس شخص کا ہے کہ وہ کسی کے فیصلے کو اپنے کسی فائدے یا دل کے رجحان کے خلاف ہی کیوں نہ پائے لیکن اسکے باوجود اس بات پر یقین رکھنے کی وجہ سے کہ وہ حق و باطل اور غلط اور صحیح کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے' اس فیصلہ کے خلاف دل میں کوئی کبیدگی محسوس نہ کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس سے اس فیصلہ کی سند یا علت دریافت کر کے اپنا مزید اطمینان کر لے۔ جہاں یہ بات نہ ہو وہاں مصلحت ہوتی ہے' احترام نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ جب لوگوں کی حالت یہ ہو جائے کہ دل اور زبان میں ہم آہنگی نہ رہے' تو پھر وہ زبان سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جو دل کے جذبات کی ترجمانی کے لئے وضع ہوئے تھے حالانکہ ان کے دل کے جذبات ان الفاظ کی تائید نہیں کر رہے ہوتے۔ **یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم** (۳/۱۶۶) (وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا)۔ لیکن جب کسی معاشرہ میں الفاظ اپنا حقیقی مفہوم ہی کھو بیٹھیں' تو وہ معاشرہ (یوں سمجھئے کہ) زبان ہی کوئی دوسری بولنے لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس معاشرہ کو اپنے ہاں کے مروجہ الفاظ کے معانی کے لئے لغات بھی نئی مرتب کرنی چاہئے تاکہ کسی کو لفظوں سے دھوکا نہ لگ سکے (لیکن یہ بحث الگ ہے اور ہمارے زیر نظر موضوع سے ہٹی ہوئی)۔

مومن' قرآنی مملکت کے فیصلوں کی (صحیح معنوں میں) اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے احکام کی اطاعت کراتی

ہے اور اس وجہ سے اس کا ان کے دل میں احترام ہوتا ہے۔ انہیں اگر کسی فیصلہ کی صحت کے بارے میں کچھ شبہ گزرے تو وہ اپنے اطمینان کی خاطر مملکت سے اس کی وضاحت کرا لیتے ہیں۔ اور اگر مملکت دیکھے کہ اس سے سہو ہو گیا ہے تو وہ فوراً" اپنی اصلاح کر لیتی ہے۔ (ستمبر۱۹۶۵ء)

۳۔ ختم نبوت کی اصولی بحث

مسئلہ ختم نبوت نے آج کل پھر غیر معمولی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ چاروں طرف اس کا شور ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ (۱۹۵۳ کے ہنگاموں کی طرح اب بھی) اس کا صحیح اور متعین مفہوم بہت کم لوگوں کے ذہن میں ہے۔ یہ مقدس موضوع' جو دین کی اصل و اساس ہے' اوائل عمر ہی سے میرا مرکز فکر اور محور نظر رہا ہے اور میں گذشتہ چالیس سال سے اس پر لکھتا اور بولتا چلا آرہا ہوں۔ میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت اور صحیح مفہوم نہایت مختصر الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا تمہیداً" ذکر کرنا ضروری ہے۔

(۲) ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ ریاست بہاولپور کی ایک خاتون نے عدالت میں یہ دعویٰ دائر کیا کہ اس کا خاوند مرزائی ہو کر مرتد ہو گیا ہے' اس لئے اس کے ساتھ اس کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں کی طرف سے اس دور کے چوٹی کے علماء حضرات شہادت کے لئے پیش ہوتے رہے۔ زیر بحث مسئلہ ختم نبوت تھا۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اس کے بعد منشی محمدؐ اکبر (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاول نگر نے ۷/فروری ۱۹۳۵ء کو اس کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ اس زمانے میں بھی الگ شائع ہوا تھا اور اس کے بعد بھی شائع ہوتا رہا۔ حال ہی میں اسے "محفل ارشادیہ" سیالکوٹ نے پھر کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور یہی نسخہ اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ محترم ڈسٹرکٹ جج نے اپنے فیصلے میں پہلے یہ لکھا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

"مقام نبوت" کا کوئی جامع تصور ان کے سامنے آسکے۔ اس سلسلے میں علماء حضرات کی طرف سے نبی کی مختلف تعریفیں پیش ہوتی رہیں لیکن ان سے ان کا اطمینان نہ ہوا۔ آخر کار:۔

ایک رسالہ میں ایک مضمون بعنوان "میکانکی اسلام" از جناب چوہدری غلام احمدؐ صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں انہوں نے مذہب اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں نبوت کی جو حقیقت انہوں نے بیان کی ہے' میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں ان کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔" (صفحہ نمبر۱۰۷)

اس کے بعد فاضل جج نے میرے مضمون کو بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا اور اس کی بنیاد پر یہ فیصلہ دیا کہ۔

"مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہٰذا' اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے"۔ (صفحہ نمبر۱۸۲)

میں نے اس واقعہ کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ جب تک مقام نبوت یا نبی کی صحیح تعریف سامنے نہ ہو' مسئلہ ختم نبوت سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اسی کو میں ذیل میں مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(۳) انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ' مشاہدہ' تجربہ' تعلیم و تعلم اور درس و تدریس ہے۔ یہ ذرائع علم ہر شخص کے لئے کھلے ہیں اور جس کا جی چاہے اپنی محنت اور استعداد کے مطابق مطلوبہ علم حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن علم کا ایک اور ذریعہ ہے (یا تھا) جو ان ذرائع سے بالکل منفرد اور یکسر الگ تھا۔ اس علم کو خدائے تعالیٰ کسی منتخب ہستی کو براہ راست عطا کرتا تھا۔ اس میں نہ اس ہستی کی اپنی فکر کو کوئی دخل ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اسے اپنی محنت اور کاوش سے حاصل کر سکتا تھا۔ اس علم کو وحی کہا جاتا ہے اور جس ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا' قرآن نے اسے نبی اور رسول کہہ کر پکارا ہے۔ نبی اور رسول ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ یوں سمجھئے کہ خدا کی طرف سے اس علم کو پانے کی جہت سے وہ نبی کہلاتا ہے اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانے کی جہت سے رسول۔ بہرحال' ہر نبی رسول ہوتا تھا اور ہر رسول نبی۔

(۴) نبی کو جو علم خدا کی طرف سے ملتا تھا' اسے وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہی وحی اس نبی کی کتاب کہلاتی تھی۔ واضح رہے کہ اس کتاب کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ایک ضخیم جلد ہو۔ وحی کا ایک حکم بھی اس نبی کی کتاب کہلاتا تھا۔ کتاب کے معنی حکم یا قانون کے ہیں۔ لہٰذا' کوئی نبی بلا کتاب نہیں آتا تھا۔

(۵) قرآن کی رو سے نبوت کا یہ سلسلہ حضرت نوحؑ سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ ہوتا یہ کہ ایک نبی آتا۔ وہ خدا کی وحی یا کتاب اپنی امت کو دے جاتا۔ اس کے بعد یا تو اس کے نام لیوا اس میں تحریف کر دیتے اور یا وہ دست برد زمانہ سے ضائع ہو جاتی۔ تو اس کے بعد ایک اور نبی مبعوث ہو جاتا۔ علم خداوندی کی رو سے سابقہ نبی کی وحی سے جو کچھ باقی رکھنا مقصود ہوتا' اس نبی کو وہ وحی بھی عطا کر دی جاتی اور اس کے علاوہ ضرورت کے مطابق مزید احکام بھی دے دیئے جاتے۔

(۶) یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا' تا آنکہ مشیت خداوندی نے یہ طے کیا کہ اب ایک ایسا ضابطہ حیات بذریعہ وحی نازل کردیا جائے جو تمام انسانوں کے لئے..... قیامت تک کے لئے' زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کے لئے کافی اور وافی ہو۔ یہ ضابطہ حیات قرآن کریم ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ اس ضابطہ کے متعلق خود خدائے تعالیٰ نے یہ فرما دیا کہ **وتمت کلمت ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلمته** (۶/۱۱۶) "تیرے رب کی باتیں صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب انہیں تبدیل کرنے والا کوئی نہیں"۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ **انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون** (۱۵/۹) "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت بھی ہمارے ذمے ہے"۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ

(۱) قرآن کریم قیامت تک تمام نوع انسان کے لئے ضابطہ حیات ہے۔

(۲) یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور
(۳) اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطہ ہدایت کی موجودگی میں قیامت تک وحی خداوندی کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ بالفاظ دیگر' اس ضابطہ ہدایت کی تکمیل کے ساتھ سلسلہ نبوت کا خاتمہ ہوگیا--- یہ خدا کی آخری کتاب ہے اور جس ذات گرامیؐ پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی' وہ خدا کا آخری نبیؐ--- نہ اس وحی کے بعد کسی اور وحی کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس نبیؐ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی گنجائش۔ قرآن خاتم الکتب ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین جو شخص حضورؐ کے بعد اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے' وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹا[۲] ہے' خدا پر افترا کرتا ہے اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں انتہائی گستاخی۔ کیونکہ وحی کے دعویٰ سے وہ (معاذ اللہ) حضورؐ کا ہمسر ہونے کا مدعی ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ کسی کو حضورؐ کی اطاعت سے نبوت مل سکتی ہے' مقام نبوت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' نبوت صرف خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی اور حضورؐ کی ذات گرامی پر اس کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ نبوت کی مختلف قسمیں نہیں ہوتیں۔ ظلی' بروزی' حلولی وغیرہ یہ اصطلاحات مجوسیوں کی وضع کردہ ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

(۷) ایک رسول خدا کی وحی کو انسانوں تک پہنچاتا ہی نہیں تھا' بلکہ وہ ایک امت کی تشکیل کرتا تھا جو اس وحی کے مطابق ایک نیا نظام وجود میں لاتی تھی۔ یہ امت اس نبی کی طرف نسبت سے متشکل ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص جو حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لاتا ہے وہ امت عیسوی کا فرد قرار پاتا ہے۔ جب تک وہ حضرت عیسیٰؑ کو آخری نبی مانتا ہے وہ اس امت کا فرد رہتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبی---- (یعنی نبی اکرمؐ) کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے' وہ امت عیسوی سے کٹ کر امت محمدیہؐ میں داخل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ کو بھی خدا کا نبی مانتا ہے۔ اس مثال سے یہ واضح ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو نبی تسلیم کرلیتا ہے تو وہ امت محمدیہؐ سے کٹ کر اس نئے نبی کی امت میں شامل ہو جاتا ہے' خواہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بھی ایمان کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے خدا کے آخری نبیؐ کی طرف نسبت سے بننے والی امت' دین کے نقطہ نگاہ سے آخری امت ہوتی ہے--- اسی امت کو مسلمان کہا جاتا ہے--- اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہے تو اسے مسلمان نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ نہ ہی اسے مسلمان قرار دیا جاسکتا ہے جو اس مدعی نبوت کو مسلمان کہے۔

(۸) یہ ہے قرآن کریم کی روشنی میں ختم نبوت کا مفہوم' منطوق اور اس کا عملی نتیجہ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں نہ کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے نہ بحث و تمحیص کی ضرورت۔ بات بالکل واضح ہے۔

(۹) میں نے اس جگہ اس اہم مسئلے پر نہایت مختصر الفاظ میں گفتگو کی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے

۲۔ خواہ وہ اس کا اصطلاحی نام کچھ اور بھی کیوں نہ رکھ لے۔ (پرویز)

اس موضوع پر ایک مستقل تصنیف مرتب کی ہے جو اس وقت کتابت و طباعت کے ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس میں ان نکات کی پوری پوری تفصیل آجائے گی۳؎۔ ویسے میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب۔۔۔ "شاہکار رسالت' عمر فاروقؓ"۔۔ کے آخری باب میں بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

. میں اس مقالہ کو ان الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو میری مایہ ناز تصنیف "معراج انسانیت" کے افتتاحیہ کا مقطع کا بند ہیں اور میرے لئے باعث صد فخر و سعادت۔

"خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا' آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے' وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت رہی اور نہ کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراط مستقیم ہے جس پر اس ذات اقدس و اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ ۔

مقام خویش اگر خواہی در ایں دیر
بجز دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

(پرویز) (جولائی ۱۹۷۴ء)

۴۔ دین اللہ یا دین الرسول

ادارۂ تحقیقات اسلامی کے ترجمان' ماہنامہ "فکر و نظر" کی مئی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔۔۔ قرآن کریم کے سیاسی مبادیات۔۔۔ اس مقالہ میں ایک ایسی بات کہی گئی ہے جو قرآن کریم کے خلاف ہے اور اس کی زد دین کی اساسات پر پڑتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہم نے اس کا تعاقب ضروری سمجھا ہے۔ اس میں تحریر ہے :

دین کے معنی مذہب کے ہیں۴؎ لیکن دین کا استعمال ملت سے وسیع تر معنوں میں ہوتا ہے۔ دین کی نسبت پیغمبر اور خدا دونوں کی طرف کی جاسکتی ہے۔ قرآن مجید میں دین اللہ اور دین ابراہیم کی ترکیب متعدد جگہ آتی ہے۔ لیکن ملت اللہ کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نظر نہیں آیا۔ ملت کا تعلق فقط نبی سے ہے اور دین کی اضافت نبی اور اللہ

۳؎ یہ کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

۴؎ دین کے معنی مذہب کے نہیں ہیں۔ لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر وہ دوسرا نکتہ ہے جسے ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

دونوں کی طرف ہوسکتی ہے۔

یہ صحیح نہیں کہ "قرآن مجید میں دین اللہ اور دین ابراہیم کی ترکیب متعدد جگہ آئی ہے۔ "متعدد جگہ" تو ایک طرف' قرآن مجید میں کہیں ایک جگہ بھی "دین ابراہیم" کی ترکیب نہیں آئی۔ اور یہ بات حضرت ابراہیمؑ تک ہی محدود نہیں' قرآن مجید میں کہیں بھی دین کی نسبت کسی نبی کی طرف نہیں کی گئی۔ ہر جگہ دین کی نسبت خدا ہی کی طرف کی گئی ہے اور یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔ دین خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ رسول' خدا کے دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے اور خود بھی اس کا متبع ہوتا ہے۔ لہٰذا' قرآن مجید کی رو سے' دین کی نسبت یا اضافت نبی کی طرف نہیں کی جاسکتی۔

البتہ جب کوئی شخص یا قوم' خدا کے دین کو اختیار کرلے' تو قرآن میں اسے "اس کا دین" (دینہ یا دینھم) کہا گیا ہے۔ اسی جہت سے ایک نبی بھی اس دین کو **دینی** (میرا دین) کہہ سکتا ہے جسے وہ خدا کی طرف سے پاکر' خود بھی اختیار کرتا ہے اور دنیا کے سامنے بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً" سورۂ یونس میں ہے **قل یا یھا الناس ان کنتم فی شک من دینی** ....(۱۰/۱۰۴) "اے نوع انسان! اگر تم میرے دین کے متعلق کسی قسم کے شک میں ہو تو..... یعنی اس دین کے متعلق جسے میں پیش کرتا ہوں۔ (اگست ۱۹۷۱ء)

۵۔ رسولؐ اللہ پر (معاذ اللہ) جادو

ہفت روزہ توحید (لاہور) جماعت اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ یہ جماعت بدعتیں مٹانے اور اسلام سے توہمات ختم کرنے کی مدعی ہے۔ اس جریدہ کی ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں' حضور نبی اکرمؐ کی ذات اقدس و اعظم کے متعلق لکھا ہے:

> مدینہ کے یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی دفعہ جادو کیا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بالآخر' انہوں نے ایک ماہر جادوگر کی خدمات حاصل کیں۔ حافظ صاحب نے فتح الباری میں اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔
>
> جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماہ ذوالحجہ میں حدیبیہ سے واپس تشریف لائے اور محرم سے ۷ھ کا آغاز ہوا تو سرکردہ یہودی ایک جادوگر لبید بن اعصم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے:
>
> **یا ابا الاعصم انت اسحرنا وقد سحرنا محمدا فلم نصنع شیا ونحن نجعل لک جعلا علی انہ تسحرہ سحرینکوہ فجعلوا لہ ثلثتہ د نانیر۔**
>
> ترجمہ: اے ابوالاعصم! ہم نے محمدؐ پر جادو کیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔ تم جادو میں ہم سب سے زیادہ ماہر ہو۔ اس لئے اس پر کوئی مہلک جادو کرو۔ ہم آپ کا حق الخدمت ادا کئے دیتے ہیں۔ راوی کا بیان ہے اس کام کے لئے انہوں نے اس کو تین

اشرفی معاوضہ دیا"۔

حافظ صاحب لکھتے ہیں

لبید نے موم لے کر آپ کا مجسمہ بنایا۔ اس میں جگہ جگہ سوئیاں گاڑ دیں۔ پھر ایک تانت لے کر اس میں گیارہ گرہیں لگائیں اور جادو پھونک کر اس پتلے پر لپیٹ دی۔ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ اس نے کسی طرح آپ کے سر کے بال حاصل کئے۔ ان کو کنگھی کے دانوں میں پھنسا کر جادو کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ دونوں طریقے استعمال کئے اور جادو کا عمل مکمل کرنے کے بعد کھجور کے گابھے کے چھلکے میں رکھ کر غیر آباد کنوئیں ذی اردواں کی تہ میں چھپا دیا۔

اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے' آپ کی طبیعت بگڑنے لگی اور آپ پر بیماری کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ کی بصارت پر بھی اثر پڑا۔ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات میں بھی فرق آگیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں:

مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اخذ عن النساء والطعام والشراب

(فتح الباری ۲۴/۴۳۵)

عن عانشتہ حتی انکر بصرہ (حوالہ مذکور)

کم و بیش آپ چھ مہینے تک متاثر رہے۔ جب تکلیف بڑھنے لگی تو ایک رات آپ نے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو خواب میں فرشتوں کی معرفت جادو کی خبر بتا دی۔ چنانچہ آپ دوسرے دن صحابہؓ کی ایک جماعت لے کر کنوئیں پر گئے۔ اس کی تہ سے جادو شدہ پتلہ اور کنگھی نکالی۔ آپ معوذ تین پڑھتے جاتے تھے اور تانت سے گرہیں کھولتے اور پتلے سے سوئیاں نکالتے جاتے تھے۔ جب سوئی نکالتے' تو آپ کو تکلیف محسوس ہوتی لیکن اس کے بعد فوراً آرام آجاتا حتی کہ جب آپ نے وہ تمام عمل باطل کردیا تو فی الفور آپ کے تمام عوارض دور ہوگئے۔

حتی قام کانما نشط من عقال

"جیسے کوئی آدمی رسیوں میں بندھا ہوا ہو اور اس کی رسیاں کھول دی جائیں"۔

طلوع اسلام

قرآن کریم میں ہے کہ مخالفین (کفار اور مشرکین) حضورؐ کے خلاف مختلف قسم کے بہتان تراشتے۔ کبھی آپ کو ابن ... کبھی شاعر' کبھی مجنوں کہتے کبھی مسحور--- سورۂ فرقان میں ہے:

وقال الظالمون ان تتبعون الا رجلا مسحورا انظر کیف ضربوا لک الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلا (۹-۸/۲۵)

اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کردیا ہے۔ دیکھو! یہ تمہارے خلاف کس کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ گمراہ ہوچکے ہیں اور اب (صحیح) راستہ پا نہیں سکتے۔

یعنی کفار اور مشرکین حضورؐ کے خلاف یہ بہتان بھی تراشتے کہ آپؐ پر (معاذ اللہ) کسی نے جادو کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ لوگ بکتے ہیں اور گمراہ ہوچکے ہیں۔

اور یہ ہمارے "حامیان دین متین" ہیں کہ بخاری شریف کے حوالے اور فتح الباری کی تائید کے ساتھ دھڑلے سے، خم ٹھونک کر کہتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ آپ پر جادو کیا گیا تھا اور اس کا آپؐ پر اثر بھی ہوا تھا، یعنی آپؐ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) "رجل مسحور" تھے۔

غور فرمایا آپ نے کہ یہ حضرات خدا اور اس کے رسول کے متعلق کس قسم کا تصور پیش کرتے ہیں؟ اور اگر کسی کی غیرت ایمانی اسے گوارا نہ کرے کہ وہ اپنے رسولؐ مقبول کی شان اقدس کے خلاف اس قسم کی باتوں کو سچا سمجھے (بالخصوص جب خود خدا اس کی تردید کر رہا ہو) اور کہہ دے کہ اس قسم کی روایات وضعی ہیں، تو اسے "منکر حدیث" قرار دے کر، ملحد و مرتد (اور نہ جانے کیا کچھ) قرار دے دیا جائے! حقیقت یہ ہے کہ

از باغباں شد است کہ صیاد آں نہ کرد

(جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ معراج شریف کس سال اور کس ماہ میں ہوا؟

روزنامہ "کوہستان" کے معراج النبیؐ نمبر (۱۹۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء) میں، مولانا احمد علیؒ کا ایک مضمون "معراج سید الانبیاء علیہ الصلوۃ والسلام" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے

اختلاف روایات

معراج شریف کس سال ہوا

سال	حوالہ کتاب
ہجرت کے چھ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری شرح بخاری باب معراج
ہجرت کے آٹھ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے گیارہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "

ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا	فتح الباری و عینی شرح البخاری
ہجرت سے چودہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری
ہجرت سے پندرہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری و عینی شرح البخاری
ہجرت سے سترہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے اٹھارہ ماہ پہلے ہوا	" " " " "
ہجرت سے تین سال پہلے ہوا	عینی شرح البخاری
ہجرت سے آٹھ سال پہلے ہوا	" " "

اختلاف روایات

معراج شریف کس ماہ میں ہوا

نام ماہ		حوالہ کتاب
ہجرت کے چھ ماہ پہلے ہوا	شوال	فتح الباری و عینی شرح البخاری
ہجرت کے آٹھ ماہ پہلے ہوا	ذی الحجہ	" " " "
ہجرت کے گیارہ ماہ پہلے ہوا	ربیع الاول	" " " "
ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا	ربیع الاخر	فتح الباری
ہجرت سے چودہ ماہ پہلے ہوا	رجب	فتح الباری و عینی
ہجرت سے پندرہ ماہ پہلے ہوا		شرح البخاری
ہجرت سے سترہ ماہ پہلے ہوا	رمضان	فتح الباری

یہ اختلاف

(۱) اس واقعہ کے ضمن میں ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ نے اسے بیان فرمایا تو کفار نے اس پر بڑے اعتراض کئے اور اس طرح اس کا چرچا عام ہوگیا۔ اور

(۲) اختلافات' مختلف کتب روایات و سیر سے نہیں لئے گئے' احادیث کی معتبر ترین کتاب-- بخاری--- اور اس کی شرح سے لئے گئے ہیں۔

اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری (کتب تاریخ میں نہیں بلکہ) کتب احادیث تک میں' خود عہد رسالتمابؐ کے اہم ترین واقعات کے متعلق بھی جو کچھ مذکور ہے اس میں کس قدر تضاد ہے۔ (دسمبر ۱۹۶۸ء)

۷ - رسولؐ اللہ اور تفسیر قرآن مجید

ہفتہ وار المنبر (لائل پور) کی ۱۸-۲۵ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر "امام غزالی کی نکتہ چینی" کے

عنوان سے، حسب ذیل الفاظ شائع ہوئے ہیں

امام غزالیؒ نہ صرف یہ کہ تفسیر بالرائے کرنے والوں کی تائید کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں جو صحابہؓ اور تابعینؒ سے منقول تفسیر کو پسند کرتے ہیں اور اس سے تجاوز نہیں کرتے۔ غزالیؒ کے وجوہ تنقید مندرجہ ذیل امور ہیں۔

(۱) اگر یہ درست ہے کہ آنحضرتؐ نے قرآن کریم کی ساری تفسیر بیان فرما دی ہے تو ضروری ہے کہ سلف سے جو کچھ بھی تفسیر کے سلسلہ میں مروی ہے، وہ سند صحیح کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہو اور سب کا سب آپؐ سے سنا ہو۔ لیکن یہ بات قرآن کے صرف بعض حصوں کے بارے میں تو درست ہے، سارے قرآن کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اور جب صورت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی سارے قرآن کی تفسیر کا صرف کچھ حصہ ہی ہم تک پہنچا تو ہمیں چاہئے کہ باقی حصہ کے بارے میں آنحضرتؐ سے منقول تفسیر کی روشنی میں ہم تفسیر سمجھنے کی کوشش کریں۔

(۲) یہ کہ صحابہؓ سے منقول جو تفسیر مرفوعاً ثابت نہیں، لا محالہ اسے تفسیر بالرائے قرار دیا جائے گا۔ اور جب انہوں نے ایک طرح ڈال دی ہے تو مناسب ہے کہ ہم بھی ان کے راستہ پر چلیں اور تفسیر میں ان کے افکار و آراء سے بھی اسی طرح مستفید ہوں جس طرح فقہ میں ان سے استفادہ کرتے اور عربیت میں ان کو حجت سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بات بھی اس امر میں مانع نہیں ہے کہ ہم قرآن کو اپنے اجتہاد سے سمجھنے کی کوشش کریں بشرطیکہ صحیح علمی بنیادوں پر قرآن فہمی کی قابلیت کسی شخص میں پیدا ہو چکی ہو۔

طلوع اسلام : اس کے باوجود ان حضرات کی عملی کیفیت یہ ہے کہ اگر آج کوئی شخص اپنے اجتہاد سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے تو یہ اس کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ جاتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ سلف صالحین کی تفسیر کے خلاف ہے۔ (دسمبر ۱۹۶۸ء)

۸۔ روایات پرکھنے کا معیار قرآن مجید نہیں

احادیث کے متعلق قرآنی فیصلے حصہ اول، باب دہم، ایڈیشن سوم، مارچ ۹۲ء میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے، لیکن ذیل کا تبصرہ اپنی نوعیت کا منفرد ہے۔ اس لئے اسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ آپ اسے غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

جماعت اہل حدیث کے ترجمان، الاعتصام (لاہور) کی ۲۳ جنوری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"دسمبر۱۹۶۵ء کے رسالہ "فکر و نظر" راولپنڈی میں لکھا گیا ہے "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

اذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان وافقہ فاقبلوہ والا فلا تقبلوہ (؟)"

"جب کوئی حدیث میری نسبت بیان کی جائے تو اس کا مقابلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر قرآن کے حکم کے مطابق ہو تو قبول کرو' ورنہ اسے چھوڑ دو۔

واضح رہے کہ یہ بات جو مقالہ نگار نے لکھی ہے جتنی بڑی شہرت پذیر ہے اسی قدر یہ بڑا جھوٹ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ لگایا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ روایت گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی' اسی دور میں ماہرین فن حدیث ائمہ کرامؒ نے بپانگ دہل اعلان کردیا تھا کہ یہ ہرگز ہرگز فرمان رسولؐ نہیں بلکہ یہ عبارت زنادقہ (گمراہ لوگوں) کی وضع کردہ ہے۔چنانچہ چوتھی صدی کے نامور فقیہہ و محدث امام خطابی نے صراحت فرمائی ہے۔ (تذکرۃ الموضوعات للفتنی ص۲۸ و مولانا محمد عبدالحئی لکھنوی حنفیؒ کی ظفر الامانی ص۲۶۷۔ نیز دیکھئے جامع بیان العلم ابن عبدالبر' ص۱۹۱ جلد۲) امید ہے کہ محترم مقالہ نگار (ڈاکٹر معصومی صاحب) آئندہ احتیاط فرمائیں گے"۔

طلوع اسلام

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے نزدیک' احادیث کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ یعنی اگر کوئی حدیث قرآن کے مطابق ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ رسولؐ اللہ کی نہیں اور اگر وہ قرآن کے خلاف ہے تو اسے صحیح سمجھئے **انا للہ وانا الیہ راجعون!**

اور یہ کچھ اس ذات اقدس و اعظمؐ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کا یہ اعلان خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ **ان اتبع الا ما یوحی الی** (۴۶/۹) میں تو اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے (مارچ ۱۹۷۰ء)

۹۔ روایات میں جنت کی تفصیل

سوال : قرآن شریف میں جنت کی بعض تفاصیل کا ذکر ہے۔ کیا حدیثوں میں بھی جنت کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تفاصیل کیا ہیں؟

جواب : احادیث میں جنت کی بڑی تفاصیل دی گئی ہیں۔ ان سب کو یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ چند ایک تفاصیل بطور نمونہ درج ذیل کی جاتی ہیں۔ یہ احادیث' مشکوۃ شریف کے اس اردو ترجمہ سے لی گئی ہیں جسے مولوی نور

محمدؐ کارخانہ تجارت کتب' کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ اس کتاب کی دوسری جلد کے صفحات ۳۲۶ لغایت ۳۳۲ پر درج ہیں۔ ہر حدیث سے پہلے اس کا نمبر شمار بھی دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے

(۵۳۴۴) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں' رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں ایک درخت ہے۔ اگر کوئی سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تب بھی وہ سایہ ختم نہ کرسکے۔ اور جنت میں تمہاری کمان کی برابر جگہ ان تمام چیزوں سے بہتر و برتر ہے جن پر آفتاب طلوع یا غروب ہوتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۵) ابی موسیٰؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مومن کے لئے ایک خالی موتی کا ایک خیمہ ہوگا جس کا عرض (ایک روایت میں ہے جس کا طول) ساٹھ کوس کا ہوگا۔ اس خیمہ کے ہر گوشے میں اس کی بیویاں وغیرہ ہوں گی اور ایک گوشے کے آدمی دوسرے گوشہ کے آدمیوں کو نہ دیکھ سکیں گے۔ ان سب گھروں میں مسلمان چلتا پھرتا رہے گا۔ اور مومن کے لئے دو جنتیں ہوں گی جن کے برتن اور تمام چیزیں چاندی کی ہوں گی اور دو جنتیں سونے کی' جن کے برتن اور تمام چیزیں سونے کی ہوں گی۔ اور لوگوں اور ان کے پروردگار کے درمیان بزرگی و عظمت باری کا صرف ایک پردہ حائل ہوگا (یعنی) جنت عدن کے اندر۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۶) انسؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں ایک بازار ہے جس میں جمعہ کو جنتی جمع ہوں گے اور وہاں شمالی ہوا چلے گی جو جنتیوں کے منہ اور کپڑوں پر خوشبو ڈالے گی اور اس کے حسن و جمال میں زیادتی ہو جائے گی۔ پھر جب وہ زیادہ حسین و جمیل بن کر اپنی بیویوں کے پاس جائیں گے تو ان کی بیویاں کہیں گی قسم ہے خدا تعالیٰ کی! ہم سے جدا ہو کر تم نے اپنے حسن و جمال کو بڑھا لیا۔ اس کے جواب میں وہ کہیں گے' اور ہمارے بعد تمہارے حسن و جمال میں زیادتی ہوگی۔ (مسلم)

(۵۳۴۷) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے جو لوگ جنت میں سب سے پہلے داخل ہوں گے' وہ چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوں گے اور ان کے بعد جو جماعت داخل ہوگی' وہ اس روشن ستارے کی مانند ہوگی جو سورج اور چاند سے کم اور دوسرے ستاروں سے زیادہ روشن ہے۔ اور جنتیوں کے دل ایک شخص کے دل کی مانند ہوں گے' یعنی نہ تو ان میں اختلاف ہوگا اور نہ بغض و عداوت۔ اور جنت میں ہر جنتی کی دو بیویاں حورعین میں سے ہوں گی جن کی پنڈلیوں کا گودا' ہڈی اور گوشت کے اندر نظر آتا ہوگا (یعنی وہ اس قدر حسین ہوں گی کہ ان کا گودا ہڈیوں اور گوشت کے اندر سے دکھائی دے گا)۔ جنتی صبح و شام اللہ تعالیٰ کو یاد کریں گے۔ نہ تو بیمار ہوں گے' نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ پھریں گے' نہ تھوکیں گے اور نہ رینٹھ سنکیں گے۔ اور جنتیوں کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے۔ ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کی انگیٹھیوں کا ایندھن اگر ہوگا۔ ان کا پسینہ مشک ہوگا اور سارے جنتی ایک شخص کی سیرت و عادت پر ہوں گے اور صورت میں اپنے باپ آدمؑ کی شکل پر اور ان کا قد ساٹھ گز اونچا ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

(۵۳۴۸) جابرؓ کہتے ہیں' رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے جنتی جنت میں کھائیں گے اور پئیں گے' لیکن نہ تو تھوکیں

گے' نہ پیشاب کریں گے' نہ پاخانہ پھریں گے اور نہ رینٹھ سنکیں گے۔ صحابہ نے پوچھا کھانے کا فضلہ کیا ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا ڈکار ہوجائے گا اور پسینہ مشک کی خوشبو کی مانند--- اور سبحان اللہ والحمد للہ کہنا جنتیوں کے دل میں ڈال دیا جائے گا اور وہ اس طرح ان کی زبان پر رواں ہوگا جیسے سانس جاری ہے۔ (مسلم)

(۵۳۵۸) ابی ہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جنت میں جو درخت بھی ہے' اس کا تنا سونے کا ہے۔ (ترمذی)

(۵۳۶۱) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے خداوند تعالیٰ کے اس قول "وفرش مرفوعہ" کے متعلق فرمایا کہ ان بچھونوں کی بلندی اتنی ہوگی جتنی کہ آسمان و زمین کے درمیان مسافت ہے' یعنی پانچ سو برس کا راستہ۔ (ترمذی)

(۵۳۶۳) انسؓ کہتے ہیں نبی صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی (یعنی مثلاً" دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت)۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ صلعم! کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟ فرمایا' جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائے گی تو پھر وہ کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔ (ترمذی)

(۵۳۷۰) ابی ایوبؓ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسولؐ اللہ! میں گھوڑوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔ کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا اگر تجھ کو جنت میں داخل کیا گیا تو تجھ کو یاقوت کا ایک گھوڑا دیا جائے گا جس کے دو بازو (پر) ہوں گے۔ پھر تجھ کو اس پر سوار کیا جائے گا اور جہاں تو جانا چاہے گا' یہ گھوڑا تجھ کو اڑا کر لے جائے گا۔ (ترمذی)

(۵۳۷۵) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے ادنیٰ درجہ کا جنتی وہ ہوگا جس کے پاس اسی ہزار خادم ہوں گے اور بہتر (۷۲) بیویاں۔ اور اس کے لئے موتی' زبرجد اور یاقوت کا خیمہ ہوگا اتنا بڑا جتنی مسافت کہ جابیہ اور صفا کے درمیان ہے۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنتیوں میں سے جو لوگ دنیا کے اندر مریں (یعنی وہ لوگ جو جنت میں جائیں گے) خواہ وہ چھوٹی عمر کے ہوں یا بڑی عمر کے' جنت کے اندر تیس سال کی عمر کے ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی' اور اسی طرح دوزخی۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضور صلعم نے فرمایا ہے جنتیوں کے سر پر تاج رکھے ہوں گے اور ان تاجوں کا معمولی موتی ایسا ہوگا جو مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کردے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ہے کہ جب جنتی جنت کے اندر اولاد کا خواہشمند ہوگا' تو حمل اور بچہ کی (تیس سال کی) عمر ایک ساعت میں وقوع پذیر ہوگی (یعنی یہ سب باتیں ایک ساعت کے اندر عمل میں آجائیں گی اور تیس سال کا بچہ پیدا ہو جائے گا)۔ ابو اسحٰق بن ابراہیمؒ کہتے ہیں کہ جنتی کی اس خواہش کا پورا ہونا ممکن تو ہے لیکن وہ ایسی خواہش نہیں کرے گا۔ (ترمذی' یہ حدیث غریب ہے)

(۵۳۷۸) ابی سعیدؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے جنت میں مرد ستر مسندوں پر تکیہ لگا کر بیٹھے گا اور یہ صرف ایک پہلو پر ہوں گے (دوسرے پہلو پر اور طرح طرح کی مسند اور تکئے ہوں گے)۔ پھر جنت کی عورتوں میں سے

ایک عورت اس کے پاس آئے گی اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس کے کاندھے پر ٹھوکا دے گی- مرد اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس کے رخساروں میں جو آئینہ سے زیادہ صاف و روشن ہوں گے' اپنا چہرہ دیکھے گا- اور اس عورت کا معمولی سا موتی (اتنا بیش قیمت ہوگا کہ) مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کردے گا- یہ عورت اس مرد کو سلام کرے گی اور مرد اس کے سلام کا جواب دے گا اور پوچھے گا کہ تو کون ہے؟ وہ عورت کہے گی' میں مزید۵- میں سے ہوں (یعنی ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ جنتیوں کو اپنے پاس سے اور دے گا)- اس عورت کے جسم پر ستر کپڑے (رنگ برنگ کے) ہوں گے جن کے اندر سے اس کا جسم نظر آئے گا- یہاں تک کہ اس کی پنڈلی کا گودا تک بھی دکھائی دے گا- اور اس کے سر پر تاج ہوں گے جن کا ایک معمولی موتی مشرق و مغرب کے درمیان کو روشن کردے گا- (احمد)

ایک اور

آخر میں ایک روایت تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے بھی ملاحظہ فرمایئے- لکھا ہے:

> حضرت ابو طیبہؒ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا اور انہیں ندا ہوگی کہ بتلاؤ! کس چیز کا برسنا چاہتے ہو- پس جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے' وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی- یہاں تک کہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرے ہوئے سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں- چنانچہ وہی برسیں گی- اسی لئے فرمایا کہ فضل کبیر' زبردست کامیابی' کامل نعمت یہی ہے-
>
> (اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر از مولانا محمد جونا گڑھی' پارہ ۲۵' ص۱۱)

یہ ہیں وہ احادیث جنہیں منسوب کیا جاتا ہے حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کی طرف! یا للعجب (اگست ۱۹۶۵ء)

۱۰- ذبح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

ہمارا مذہب پرست طبقہ اگر طوعاً" قرآن کریم کی طرف نہیں آتا تو اسے کرہاً" اس طرف آنا پڑتا ہے اگرچہ--- بعد از خرابی بسیار--- اور کرہاً" سے مراد یہ ہے کہ جوں جوں علم و بصیرت کی روشنی پھیلتی ہے' دنیا توہم پرستیوں سے متنفر ہو کر عقل و فکر کی رو سے بات سمجھنے کا تقاضا کرتی ہے- اس کی ایک نمایاں مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے-

ہمارے ہاں یہ عقیدہ مسلسل چلا آرہا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حکم دیا کہ وہ اپنے بیٹے (حضرت اسمٰعیلؑ) کو خدا کی راہ میں قربان کردیں--- چنانچہ انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لٹا

۵- قرآن مجید میں ہے ھم ما یشاؤن فیھا ولدینا مزید جنت میں جنتیوں کو ہر وہ چیز ملے گی جس کے وہ خواہشمند ہوں گے اور اس کے علاوہ ہماری طرف سے اور زیادہ دیا جائے گا کہ اسی کی طرف ان الفاظ کا اشارہ ہے- ۱۲- مترجم-

دیا اور خدا نے اسے بچا لیا اور اس کی جگہ جانور کی قربانی کا حکم دے دیا۔

عرصہ ہوا' پرویز صاحب نے اس سلسلہ میں لکھا کہ وہ خواب' حضرت ابراہیمؑ کے اپنے خیالات کا عکاس تھا' خدا کی طرف سے نہیں تھا۔ خدا کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ انسانوں کی قربانی کا حکم دے گا' بڑی زیادتی ہے۔ باقی رہا حضرت اسمٰعیلؑ کا "ذبح عظیم" ہونا' تو اس سے مراد یہ تھی کہ انہیں اور ان کی ذریت کو وادی غیر ذی زرع میں خانہ خدا کی تولیت کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اس پر ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جو طوفان برپا کیا گیا' وہ ان فتاویٰ سے ظاہر ہے جو پرویز صاحب کے خلاف صادر کئے گئے تھے۔

اور اب یہ طبقہ خود اس طرف آ رہا ہے۔ گزشتہ عید الاضحیٰ کی تقریب پر نوائے وقت (لاہور) کی ۱۴ دسمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں' مولانا محمد عنایت اللہ وارثی کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ جس زمانے میں حضرت ابراہیمؑ کی بعثت ہوئی' ان کی قوم (بلکہ ساری دنیا) کس کس قسم کی جہالتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک "رسم بد" انسانوں کو (بزعم خویش) خدا کی راہ میں قربان کر دینا بھی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے:

> ایسے موقع پر ملک کے سب سے بڑے پروہت' شاہی بت خانوں کے مہتمم اور منتظم اعلیٰ آزر کے بیٹے ابراہیمؑ نے آخری عمر میں اپنے ایک تمثیلی خواب کو عینی خواب تصور کر کے اکلوتے نوجوان بیٹے اسمٰعیلؑ کو چھیانوے سال کی عمر میں اطاعت کے سچے جذبہ کے تحت ذبح کرنے کی کوشش کی' لیکن قدرت کو اس خواب میں اسماعیلؑ کو خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دینے کا اشارہ مقصود تھا اور انسانی قربانی کی اس بد رسمی کو جس میں ایک اشرف مخلوق انسان کو خدا کی راہ میں جہاد کر کے شہادت کا رتبہ بلند حاصل کرنے اور کلمۃ اللہ کے بلند کرنے کی بجائے یوں ہی لٹا کر بے مقصد ذبح کرایا جائے' ہمیشہ کے لئے مٹا دینا مطلوب تھا اور یہ کار خیر پیغمبرؑ ہی کے ہاتھ سے کرانا ضروری تھا۔ اس کے بجائے حیوانی قربانی کا فطری عمل رواج پانا تھا جو آج تک چلا آ رہا ہے۔ وہ بھی صرف خدا ہی کے نام پر' جو ہر جان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس امانت کی واپسی کا حق دار ہے۔ چنانچہ یہ عمل پورا ہوا۔
>
> اس صورت میں اسمٰعیلؑ ذبیح اللہ ان معنوں میں ذبیح نہیں کہ انہیں فی الواقع چھری سے ذبح کرایا گیا اور نہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت یہ ہے کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کیا ہے۔ بلکہ سنت ابراہیمیؑ بیٹے کو ذبح نہ کرنا ہے جس عمل نے انسان کو اس طرح اس کی حالت میں ذبح کرنے کی رسم بد کو ہمیشہ کے لئے جد انبیاء (ابراہیمؑ) کے ہاتھوں ختم کرایا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں "انسانی قربانی" کو کس طرح "بد رسم" قرار دیا گیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے خواب کو تمثیلی بتایا گیا ہے! پھر حضرت اسمٰعیلؑ کے "ذبح عظیم" ہونے کی توجیہہ بھی وہی بیان کی گئی ہے جسے پرویز صاحب نے عرصہ پہلے پیش کیا تھا!

یہ ہے زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآنی حقائق کی طرف آنا۔

لیکن' اس کے باوجود' یہاں خیر سے' ایک ایسے "بزرگوار" بھی موجود ہیں' جن کی زندگی کا گویا مشن یہ ہے کہ اسلام کو ایسی گھناؤنی شکل میں پیش کیا جائے جس سے دنیا اس سے متنفر ہو جائے۔ عیدالاضحیٰ ہی کی تقریب پر انہوں نے بھی ایک تقریر کی جس میں حضرت ابراہیمؑ کے اس واقعہ کے متعلق فرمایا:

> بہر حال' بچہ کچھ ہوشیار ہوا۔ اس عمر کو پہنچا کہ باپ کا دست و بازو بن سکے۔ اس وقت اشارہ ہوتا ہے کہ اسے قربان کردو۔ صاف الفاظ میں یہ حکم نہیں ہے کہ اسے قربان کردو۔ خواب میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ اس کو قربان کر رہے ہیں یعنی حکم کے الفاظ میں نہیں۔ صرف ایک فعل دکھایا جا رہا ہے کہ وہ بچے کو قربان کر رہے ہیں۔ نبی کا خواب چونکہ وحی کی نوعیت رکھتا ہے' اس لئے اس خواب کو دیکھ کر حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام اپنی جگہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ مجھ سے میرے بیٹے کی--- میرے اکلوتے بیٹے کی--قربانی مانگی جا رہی ہے۔
>
> (مودودی صاحب کی تقریر' جامعہ منصورہ' لاہور' بحوالہ چٹان' بابت ۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء)

یعنی یہ صاحب فرما رہے ہیں کہ "نبی کا خواب وحی کی نوعیت رکھتا ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ (حکم نہ سہی اشارہ) خود خدا کی طرف سے ہوا تھا!-- (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یعنی جس عمل کو ایک مولانا صاحب' زمانہ جاہلیت کی "رسم بد" قرار دے رہے ہیں جسے حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں مٹانا مقصود خداوندی تھا' یہ حضرت اس کے متعلق فرما رہے ہیں کہ اس رسم پر عمل پیرا ہونے کا حکم (اشارہ) خود خدا نے وحی کے ذریعے دیا تھا۔

اور یہ ہے اس تفسیر القرآن کا نمونہ جس کے تراجم اب غیر ملکی زبانوں میں کئے جا رہے ہیں۔

از باغباں شد است کہ صیاد آں نہ کرد

واضح رہے کہ خدا کی طرف سے وحی خوابوں کے مبہم اشارات میں نہیں آیا کرتی تھی۔ وہ قلب نبویؐ پر نازل ہوا کرتی تھی (۲/۹۷) اور واضح زبان میں (۲۶/۱۹۲-۹۵) (فروری ۱۹۷۶ء)

۱۱۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور شیر خوار بچہ

ایک طالب علم اپنے خط میں لکھتا ہے کہ "عید کے موقع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ایک تقریر کی تھی جسے اخبار چٹان نے شائع کیا ہے۔ اس میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ :

آج تاریخ انسانی کا وہ عظیم دن ہے جس کی نظیر تاریخ میں کوئی دوسری نہیں ملتی۔ ذرا اپنی آنکھوں کے سامنے اس نقشے پر غور کیجئے کہ ایک انسان مکہ معظمہ کی وادی میں جو پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی اور جس میں آس پاس دور دراز کہیں کسی آبادی کا نشان نہ تھا' وہاں اپنے اکلوتے بچے کو لے کر اس کی ماں کے ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پانی کا ایک مشکیزہ اور ایک تھیلے میں کچھ کھجوریں' اس کے پاس رکھ دیتا ہے۔ جب وہ وہاں سے پلٹنے لگتا ہے تو اس کی بیوی اس سے کہتی ہے کہ--- "مجھے کہاں چھوڑے جا رہے ہو' اس بچے کو کہاں چھوڑے جا رہے ہو"۔ مگر وہ خاموشی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ آخر کار وہ پوچھتی ہیں کہ "کیا خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں؟" وہ جواب دیتے ہیں کہ "ہاں!" ..... "خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں" اور اس صبر و ضبط کی پیکر اور اللہ پر بھروسہ کرنے والی خاتون نے یہ سننے کے بعد' کہ خدا کے حکم سے ایسا کیا جا رہا ہے' کوئی فکر اور کسی پریشانی اور کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا اور اس جنگل میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد یہ طالب علم لکھتا ہے کہ اس واقعہ کے پڑھنے کے بعد میرے دل میں جو خیالات پیدا ہوئے ہیں' انہیں تحریر نہیں کر سکتا۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ جیسی عظیم شخصیت نے ایسا کیا ہوگا! لیکن جب میں نے یہ پڑھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ "وہ خدا کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں"۔ تو میرے دل میں اور بھی اضطراب پیدا ہوا کہ کیا اللہ تعالیٰ اس قسم کے حکم دیتا تھا؟ میں بڑی کش مکش میں مبتلا ہوں۔ مجھے بتایئے کہ کیا یہ واقعہ قرآن مجید میں ہے؟ اگر نہیں تو پھر مودودی صاحب نے ایسا کس طرح کہہ دیا؟

طلوع اسلام

یہ واقعہ قرآن شریف میں نہیں' تورات میں ہے اور وہیں سے ہماری کتب روایات میں درج کر دیا گیا ہے اور اسی کو مودودی صاحب جیسے "مفسر" عام کرتے چلے جا رہے ہیں تاکہ سوچ سمجھ سے کام لینے والے طالب علم اسلام سے برگشتہ ہوتے جائیں--- اور جب طلوع اسلام یہ کہتا ہے کہ بابا! خدا کے لئے اس قسم کی وضعی روایات کو رسولؐ اللہ کی احادیث مت کہو' تو اسے "منکر حدیث" قرار دے کر بدنام کرنے کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مودودی صاحب اپنے مشن میں بہت کامیاب ہیں۔ اس طالب علم نے تو اپنے شکوک کے ازالہ کے لئے ہم سے دریافت کر لیا۔ نہ معلوم اس جیسے کتنے طلباء (اور دیگر تعلیم یافتہ نوجوان) ان باتوں کو اسلام کی تعلیم سمجھ کر دین سے برگشتہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جا رہے ہیں (فروری ۱۹۷۶ء)

۱۲- نبوت نبی اکرمؐ کے خلاف یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش
(حیات و وفات مسیح جیسے مسائل کی اہمیت!)

ایک صاحب لکھتے ہیں :-

قرآن شریف کی رو سے ایک مسلمان کے لئے تمام سابقہ انبیاءؑ پر ایمان لانا ضروری ہے اور ہم ان پر ایمان لاتے ہیں- لیکن ان میں سے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور وفات کے مسائل نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے کہ یہ گویا ہمارے لئے ایمان کی شرط قرار پاگئے ہیں- جو شخص ان مسائل میں مولوی صاحبان کا ہم نوا نہیں ہوتا' اس پر کفر کے فتوے لگ جاتے ہیں- حالانکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا قائل ہوتا ہے جو ایمان کے لئے بنیادی تقاضا ہے- تمام انبیاء کرامؑ میں سے حضرت عیسیٰؑ کی ان خصوصیات کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟ اسے تفصیل سے سمجھایئے گا کہ ان سوالات نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے-

جواب : ان مسائل نے اس قدر اہمیت کیوں حاصل کر رکھی ہے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکے گی جب تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ یہود اور نصاریٰ نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے- حضور نبی اکرمؐ نے جو دین پیش کیا' اس کا مقابلہ نہ یہودیت کرسکتی تھی نہ عیسائیت- یہ لوگ قرآن مجید میں تو کوئی رد و بدل کر نہیں سکتے تھے- انہوں نے ایسی ایسی روایات وضع کرکے انہیں جزو دین بنا دیا جس سے اسلام کی صحیح صورت ہی مسخ ہوگئی- اس طرح وہ اگر اپنے مذاہب کو اسلام سے افضل ثابت نہ بھی کرسکے تو بھی اسلام کو ان کی سطح پر لانے میں ضرور کامیاب ہوگئے- چنانچہ ہمارے مروجہ اسلام کا بیشتر حصہ انہی تحریفات پر مشتمل ہے جنہیں "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے- اسلام میں اس طرح تبدیلی پیدا کرنے کے بعد سوال انبیاء کرامؑ کا سامنے آیا- ان کی محرف کتابوں میں ان کے انبیاء کی جو زندگی سامنے آتی ہے وہ حضور نبی اکرمؐ کی بلند اور پاکیزہ سیرت کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتی- ان کی دوسری کوشش یہ تھی کہ وہ حضورؐ کی طرف ایسی باتیں منسوب کردیں جن سے ان کے انبیاء آپ سے بلند مقام پر نظر آئیں- مثال کے طور پر آپ بخاری شریف میں معراج سے متعلق روایت کو دیکھئے- اس میں کہا گیا ہے کہ جب حضورؐ واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں (آسمان پر) حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی- (اس کے بعد کیا ہوا' اسے بخاری شریف

کے الفاظ میں سنئے)۔

حضرت موسیٰؑ نے پوچھا کہ آپ کو کیا حکم دیا گیا ہے؟

حضرتؐ نے فرمایا مجھے ہر روز پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ موسیٰؑ نے کہا آپ کی امت ہر روز پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکتی۔ اور میں نے خدا کی قسم! آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بہت سخت برتاؤ کیا ہے۔ پس آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی امت کے لئے اس میں تخفیف کی درخواست کیجئے۔چنانچہ میں لوٹ گیا اور اللہ نے مجھے دس نمازیں معاف کردیں۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے ویسا ہی کہا۔ پھر میں لوٹ گیا اور اللہ نے مجھے دس نمازیں معاف کردیں۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے ویسا ہی کہا۔ پھر میں خدا کے پس لوٹ گیا تو مجھے ہر رو پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ پھر میں موسیٰؑ کے پاس لوٹ کے آیا تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کو کس چیز کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے کہا ہر روز پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہ آپ کی امت ہر روز پانچ نمازیں نہیں پڑھ سکتی اور بیشک میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ بہت سخت برتاؤ کیا ہے۔ پس آپ اپنے پروردگار کے پاس لوٹ جایئے اور اپنی امت کے لئے اس میں تخفیف کی درخواست کیجئے۔ حضرتؐ نے فرمایا! میں نے اپنے پروردگار سے (کئی مرتبہ) درخواست کی' اب مجھے شرم آتی ہے۔ لہٰذا' اب میں راضی ہوں اور (اس کے حکم کو) تسلیم کرتا ہوں۔

(صحیح بخاری' جلد دوم' ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی ص۷۱-۷۰)

آپ غور کیجئے کہ اس روایت کی رو سے (اس خدا کو تو چھوڑیئے جس نے نماز جیسے فریضہ کے متعلق اس طرح حکم دیا) دیکھئے یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ میں حضور نبی اکرمؐ کی کیا پوزیشن سامنے آتی ہے؟ آپ نے دیکھا کہ یہودی سازش اس ایک روایت کے ذریعے اپنے مقصد میں کس قدر کامیاب ہوگئی؟ اس نے "اپنے نبی" کو کیا مقام عطا کردیا اور حضور نبی اکرمؐ کو کس مقام پر لے آئی! اور پھر سازش کی کامیابی کا یہ عالم کہ مسلمان ان روایات کی حفاظت کے لئے مرنے مارنے تک آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور جو شخص یہ کہہ دے کہ اس سے حضورؐ کی عظمت میں فرق آتا ہے' اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہوسکتی' اسے "منکر حدیث" قرار دے کر' دائرہ اسلام سے خارج کردیا جاتا ہے۔ اسے کہتے ہیں کامیاب سازش!!

۲۔ اور آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ نے (از روئے قرآن) حضرت ابراہیمؑ کو امت مسلمہ کا مورث اعلیٰ اور اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا متبع قرار دیا۔ یہودی حضرت ابراہیمؑ کو بھی نبی تسلیم کرتے تھے لیکن' چونکہ رسولؐ اللہ نے اپنے آپ

کو ان کی ملت کا پیرو قرار دیا اور انبیاء بنی اسرائیل میں انہیں ایک بلند مقام پر فائز بتایا' انہوں نے (یہودیوں نے) ایک روایت وضع کی کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا- یہ روایت بھی مجموعہ بخاری میں موجود ہے- اس ایک روایت سے انہوں نے "مسلمانوں کے" دو جلیل القدر نبیوں کو جس مقام پر لاکر کھڑا کر دیا وہ ظاہر ہے' یعنی ایک وہ جس نے جھوٹ بولا اور دوسرا وہ جس نے اس کے جھوٹ کی تصدیق کی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)- اب مسلمان ہیں کہ اس روایت کو اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور یہودی یہ فلیتہ چھوڑ کر الگ بیٹھے ہنس رہے ہیں-

ہم اس مقام پر انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ہمارے احادیث کے مجموعوں میں اس اس قسم کی (وضعی) روایات شامل ہیں جن سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ (معاذ اللہ) بے حد داغدار ہو کر سامنے آتی ہے- ظاہر ہے کہ یہ سب اسلام کے مخالفین کی سازش کا نتیجہ ہیں- لیکن آج کوئی مسلمان ان کا انکار کرے اور پھر دیکھے کہ علماء حضرات اس کا کیا حشر کرتے ہیں-

۳ - اب آیئے عیسائیوں کی طرف- بخاری شریف کے پہلے باب کا عنوان ہے "رسولؐ اللہ کی طرف وحی کی ابتدا کس طرح ہوئی" اس میں کہا گیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپ کا معمول تھا کہ آپؐ کھانے پینے کا کچھ سامان ساتھ لے کر غار حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں کئی کئی دن لگاتار محو عبادت رہتے- واضح رہے کہ اس روایت کا اتنا حصہ بھی اس زمانے کا وضع کردہ نظر آتا ہے جب مسلمانوں میں تصوف آیا اور صوفیا نے پہاڑوں' جنگلوں' غاروں میں ریاضتوں اور مراقبوں کے ذریعے خدا سے "شرف ہمکلامی" حاصل کیا- اس "ہم کلامی" کی سند قرآن مجید سے تو مل نہیں سکتی تھی- انہوں نے یہ روایت وضع کی کہ خود رسولؐ اللہ نے اسی طریق سے خدا سے ہم کلامی کا مقام حاصل کیا تھا- یہ سارا تصور قرآن کے خلاف ہے- اول تو ختم نبوت کے بعد خدا سے ہم کلامی کے امکان کا تصور ہی ختم نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے- دوسرے یہ کہ نبوت' خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی' مراقبوں اور ریاضتوں سے حاصل نہیں کی جاسکتی تھی- اس کے متعلق تو قرآن یہاں تک کہتا ہے کہ ہونے والے نبی کو ایک ثانیہ پہلے بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا تھا کہ اسے اس مرتبہ بلند کے لئے منتخب کیا جا رہا ہے- لیکن جب اسے وحی سے سرفراز کیا جاتا تھا تو یہ سارا ماجرا واضح طور پر اس کے سامنے آجاتا تھا- پھر اس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا تھا- لہٰذا' اس روایت کا شروع کا حصہ بھی اس کے اگلے حصے کی طرح وضعی ہے- لیکن ہم نے اس مقام پر اسے اس کے اگلے حصے کی نسبت سے درج کیا ہے- اس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ اس طرح غار حرا میں تشریف لے جایا کرتے تھے- ایک دن کیا ہوا کہ---

> فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے (آپ سے) کہا کہ پڑھو! آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں- آپ فرماتے ہیں پھر فرشتے نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے (زور سے) دبایا' یہاں تک کہ مجھے تکلیف ہوئی- پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھئے تو میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں- پھر فرشتے نے مجھے پکڑ لیا اور (زور سے) دبایا یہاں

تک کہ مجھے تکلیف ہوئی۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھئے۔ تو میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ فرشتے نے مجھے پھر پکڑ لیا اور سہ بارہ مجھے (زور سے) دبایا۔ پھر مجھ سے کہا کہ **اقرا باسم ربک الخ** (۳-۱/۹۶) اپنے پروردگار کے نام (کی برکت) سے پڑھو! جس نے (ہر چیز) کو پیدا کیا' انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا اور (یقین کرلو کہ) تمہارا پروردگار بڑا بزرگ ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس واقعہ کے سبب سے (مارے خوف کے) ہلنے لگا اور آپ خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اور وہاں لوگوں سے کہا کہ مجھے کمبل اڑھا دو' مجھے کمبل اڑھا دو۔ ان لوگوں نے آپ کو کمبل اڑھا دیا یہاں تک کہ (جب) آپ کے دل سے خوف جاتا رہا' تو آپؐ نے خدیجہؓ سے سب حال (جو غار میں گزرا تھا) بیان کرکے کہا کہ بلاشبہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ خدیجہؓ بولیں کہ (آپ کو اس قسم کا خیال کرنا) ہرگز نہیں (چاہئے)۔ خدا کی قسم! اللہ آپ کو کبھی پریشان نہ کرے گا۔ یقیناً" آپ قرابت کی پاسداری کرتے ہیں اور (خدا کی راہ میں) مدد کرتے ہیں۔ پھر خدیجہؓ آپ کو لے کر چلیں اور ورقہ بن نوفل' اپنے چچا کے بیٹے' کے پاس آپ کو لائیں۔ اور ورقہ ایک شخص تھا جو زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہوگیا تھا اور عبرانی کتاب لکھا کرتا تھا یعنی جس قدر اللہ کو منظور ہوتا تھا انجیل کو عبرانی میں لکھا کرتا تھا اور بڑا بوڑھا آدمی تھا کہ بینائی جا چکی تھی۔ تو اس سے خدیجہؓ نے کہا کہ' اے میرے بیٹے! اپنے بھتیجے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے (ان کا حال) سنو۔ ورقہ بولے اے میرے بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ رسول خدا صلعم نے جو کچھ دیکھا تھا ان سے بیان کردیا۔ تو ورقہ نے آپ سے کہا کہ یہ وہ فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اس (زمانہ) میں (جب آپ نبی ہوں گے) جوان ہوتا۔ اے کاش میں (اس وقت تک) زندہ ہی رہتا جب کہ آپ کو آپ کی قوم (مکہ سے) نکالے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر بہت تعجب سے) فرمایا کہ' کیا یہ لوگ مجھے نکالیں گے؟ ورقہ نے کہا ہاں۔ جس شخص نے آپ کی جیسی بات بیان کی اس سے (ہمیشہ) دشمنی کی گئی۔ اور اگر مجھے آپ (کے نبوت) کا زمانہ مل گیا تو میں آپ کی بہت زور دار مدد کروں گا۔ مگر چند ہی روز میں ورقہ کی وفات ہوگئی اور وحی کی آمد چند روز کے لئے ست ہوگئی۔

(صحیح بخاری' جلد اول' ص۲' ترجمہ شائع کردہ نور محمد کراچی)

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک وضعی روایت میں عیسائی کیا کچھ کر گئے ہیں؟ وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ رسولؐ اللہ کے

سامنے فرشتہ آیا۔ اس نے خدا کی وحی آپ تک پہنچائی۔ خدا نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا لیکن آپ کو کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کیا ہوا ہے! الٹا آپ پر خوف طاری ہوگیا۔ یہ بات ایک عیسائی عالم--- ورقہ بن نوفل--- نے بتائی کہ آپ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ آپ کو نبوت سے نوازا گیا ہے! یعنی (۱) اجزائے نبوت کے متعلق اس عیسائی عالم کو خود صاحب نبوت (نبی اکرمؐ) سے بھی زیادہ علم تھا۔ (۲) اس کے کہنے پر کہ آپ کو نبوت مل رہی ہے آپ اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ گئے۔ (۳) لیکن اس علم و شہادت کے باوجود خود عیسائی کا عیسائی ہی رہا' آپ پر ایمان نہ لایا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک روایت سے عیسائیوں نے اپنے ایک عالم کے مقابلہ میں حضورؐ کو کس مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں انہوں نے (اپنے نبی) حضرت عیسیٰؑ کو ان خصوصیات کا حامل قرار دیا جو (ظاہر ہے کہ) رسولؐ اللہ میں نہیں تھیں' یعنی یہ کہ ان کی (حضرت عیسیٰؑ کی) پیدائش بھی دنیا کے تمام انسانوں' حصرات انبیاء کرامؑ اور خود حضور نبی اکرمؐ کے مقابلہ میں منفرد تھی اور ان کی حیات ارضی کی پہلی منزل بھی منفرد--- وہ بن باپ کے پیدا ہوئے اور زندہ آسمان پر تشریف لے گئے۔ اس طرح انہوں نے' اپنے نبی (حضرت عیسیٰؑ) کی افضلیت حضور نبی اکرمؐ پر ثابت کردی اور اپنے اس دعویٰ کی تائید و تصدیق خود مسلمانوں کی روایات سے کردی اور ان روایات کی اہمیت اس قدر بڑھا دی کہ یہ مسلمانوں کے ہاں (گویا) جزو ایمان قرار پاگئیں۔

۴ - اس کے بعد آگے بڑھیئے۔ اس دین کے متعلق جسے حضور نبی اکرمؐ نے پیش کیا تھا' خدا نے کہا ہے کہ **لیظھرہ علی الدین کلہ** (۶۱/۹) وہ تمام ادیان عالم پر غالب آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ غلبہ حضور نبی اکرمؐ کی حیات ارضی میں تکمیل تک نہیں پہنچا تھا۔ اسے آپؐ کے بعد آپ کی امت کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچنا تھا۔ لیکن نزول حضرت مسیحؑ سے متعلق روایات میں کہا گیا کہ یہ غلبہ حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچے گا۔ یعنی دین مصطفویؐ کا آخری غلبہ رہین منت ہوگا" عیسائیوں کے نبی (حضرت عیسیٰؑ) کے ہاتھوں کا۔ یہ ہے جو (ان وضعی روایات کی رو سے) عیسائی کہہ گئے۔ اور پھر اس کے لئے اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ یہ مسلمانوں کے ایمان کا جزو بن گئیں۔ جب اس قسم کے اعتراضات ابھرے کہ ایک انسان بہ جسد عنصری' آسمان پر زندہ کس طرح رہ سکتا اور واپس آسکتا ہے' تو (اس اعتراض سے بچنے کے لئے) بعض نے کہہ دیا کہ وہ آنے والا مسیح ابن مریم' بہ نفس نفیس نہیں ہوگا' ان کا "مثیل" ہوگا۔ سادہ لوح لوگ خوش ہوگئے کہ اس اعتراض کا جواب مل گیا۔ لیکن اتنا نہ سوچا کہ اس سے عیسائیوں کے ہاتھ کتنا بڑا حربہ آگیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ سوچو کہ جس نبی (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کا مثیل' دین محمدیؐ کو غلبہ عطا کرے گا' خود اس نبی کا مقام کس قدر بلند ہوگا' یعنی جو بات (معاذ اللہ) نبی اکرمؐ سے نہ ہوسکی' آپ کی امت میں سے کسی سے نہ ہوسکی' اسے ہمارے (عیسائیوں کے) نبی کے مثیل نے آکر پورا کردیا۔ جب مثیل کی عظمتوں کا یہ عالم ہے تو خود اس نبی کے مقام کی رفعتوں کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

یہ ہے جو کچھ یہودی اور عیسائی سازشوں نے ہمارے ساتھ کیا ہے اور ہم ہیں کہ ان روایات کو جزو ایمان بنائے

بیٹھے ہیں۔

یاد رکھئے روایات کے صحیح یا وضعی ہونے کا معیار قرآن کریم ہے اور قرآن کریم میں کسی آنے والے کا ذکر نہیں۔ آنے والا' وہ نبیؐ آخرالزمان تھا جو آج سے چودہ سو سال پہلے دین کامل کے ساتھ آگیا۔ اس کے بعد "آنے والوں" کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ (دسمبر ۱۹۷۳ء)

۱۳۔ سیرت رسول اللہ

مودودی صاحب کی تفسیر کے آئینے میں

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ :۔

مودودی صاحب کی معرکہ آراء تفسیر' تفہیم القرآن کی تکمیل پر ایک عظیم جشن منعقد کیا گیا۔ اس جشن میں اس تفسیر پر مودودی صاحب پر گلہائے عقیدت برسائے گئے۔ اس اہتمام کو دیکھ کر توجہ غیر ارادی طور پر اس طرف جاتی ہے کہ اس تفسیر کا وہ کونسا امتیازی نکتہ ہے جس کی وجہ سے اسے لاثانی قرار دیا گیا اور قوم پر ایک عظیم احسان گردانا گیا۔ نکات تو بہت ہیں' کہاں تک گنائے جائیں۔ گلہائے رنگارنگ چاروں اطراف میں بکھرے پڑے ہیں۔ تاحد نظر تحیر انگیز حقائق زیب وہ کتاب ہیں جن کے بیان کرنے کے لئے ایک عرصہ درکار ہے۔ تاہم تفسیر کی خاصیت یہ ہے کہ مفسر نے بات صاف کرنے کی بجائے داستانوں میں الجھا کر رکھ دیا ہے اور اسے اپنے ہی ہاتھوں مجموعہ اضداد بنا دیا ہے۔ انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ ایک چیز کو خود ہی فرض کر لیا گیا ہے اور پھر اس پر حسب منشا حاشیئے چڑھائے گئے ہیں۔ مودودی صاحب کی ذہنی تخلیق کی آمیزش نے قرآنی حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو اور دبیز کر دیا ہے۔ اس طرح جس چیز کی کسر رہ گئی تھی صاحب موصوف نے اسے پورا کر دیا ہے۔ قرآن اور صاحب قرآنؐ کے خلاف وہ ہرزہ سرائی کی گئی ہے کہ الحذر! دیگر جلیل القدر انبیاء کو بھی دل کھول کر ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔

یہ تو تھا مودودی صاحب کی تفسیر کا انداز۔ لیکن اس وقت مسئلہ زیر بحث' وہ رنگ ہے جس میں مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں قرآن اور صاحب قرآنؐ کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس وقت سورۃ "الاعلیٰ" (سورہ ۸۷) کی صرف دو آیات کی تفسیر قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ترجمہ بھی مودودی صاحب ہی کا ہے۔

سنقرئک فلا تنسی ۙ الا ما شاء اللہ (۸۷/۶-۷)

ترجمہ :۔ ہم تجھے پڑھوا دیں گے۔ پھر تم نہیں بھولو گے سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔

آیت نمبر (۸۷/۶) کی تفسیر میں مودودی صاحب وحی کے بارے میں بالصراحت کہتے ہیں کہ

"ہم آپ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لئے آپ کو یاد ہو جائے گی۔ اس بات کا کوئی اندیشہ آپ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ بھی آپ بھول جائیں گے..... اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن جس طرح معجزے کے طور پر آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم پر نازل کیا گیا تھا' اسی طرح معجزے کے طور پر ہی اس کا لفظ لفظ آپ کے حافظے میں محفوظ بھی کر دیا گیا تھا اور اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا گیا تھا کہ آپ اس میں سے کوئی چیز بھول جائیں یا اس کے کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہو جائے"

اس سے صاف ظاہر ہے اور ہے بھی حقیقت' کہ خدا کا منشا یہ تھا کہ قرآن حکیم حضورؐ کے سینہ میں اس طرح جمع اور محفوظ کر دیا جائے کہ اس بات کا کوئی امکان باقی نہ رہے کہ آپ اس میں سے کچھ بھول جائیں یا کسی لفظ کی جگہ کوئی دوسرا ہم معنی لفظ آپ کی زبان مبارک سے نکل جائے۔ کیونکہ خدا ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ لیکن آیت کے اس حصہ **الا ماشاء اللہ** کی تفسیر کرتے ہوئے مودودی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ۔

اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ پورے قرآن کا لفظ بلفظ آپ کے حافظے میں محفوظ ہو جانا آپ کی اپنی قوت کا کرشمہ نہیں ہے' بلکہ اللہ کا فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ ہے ورنہ اللہ چاہے تو اسے بھلا سکتا ہے۔

دیکھا آپ نے کس قدر تضاد ہے استدلال میں اور الجھاؤ ہے بیان میں۔ آپ ذرا سوچئے کہ جب خدا نے ایسا چاہا ہی نہیں تھا کہ جو کچھ حضورؐ کے سینہ میں جمع اور محفوظ کرا دیا جائے گا اس میں سے کچھ بھی حضورؐ بھول سکیں تو دوسرے ہی ٹکڑے کی تفسیر میں خدا کے اس قانون کے بخئے کیوں ادھیڑ دیئے گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے (CATEGORICALLY) حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ **سنقرئک فلا تنسی**(۸۷/۶) تو یہ ایسے اعلان کی حیثیت اختیار کر گیا جس کے خلاف کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیا قرآن حکیم کا یہ اعلان مودودی صاحب کے لئے قابل قبول نہیں؟

مگر سب سے زیادہ دل ہلا دینے والا ان آیات کی تفسیر کا وہ حصہ ہے جہاں آپ فرماتے ہیں:۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی وقتی طور پر آپ کو نسیان لاحق ہو جانا اور آپ کا کسی آیت یا لفظ کو کسی وقت بھول جانا اس وعدے سے مستثنیٰ ہے۔ وعدہ جس بات کا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ مستقل طور پر قرآن کے کسی لفظ کو نہیں بھول جائیں گے۔

دیکھا آپ نے ایک غلط مفروضہ کی بنا پر مودودی صاحب کس کس قسم کی قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ پہلے ایک بات کو خود ہی وضع کرنا اور پھر اسکی تاویلیں کرنا' یہ کہاں کا فہم قرآن ہے۔ اگر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی بجائے جناب مودودی' قرآن کی بارگاہ سے پوچھتے تو ان آیات کا مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا۔ کیونکہ اس کا دعویٰ ہے **ان علینا بیانہ**(۱۹/۷۵)۔ اور پھر ایسا کرنے سے ان کا وقت اور توانائی بھی ضائع ہونے سے بچ جاتے' جنہیں وہ کسی تعمیری کام میں صرف کر سکتے تھے۔ لیکن جس کے فہم کا انحصار غیر از قرآن پر ہو تو ایسی حالت میں قرآن اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر آیات کی تفسیر کی وضاحت میں مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

اس مفہوم کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرات کے دوران میں ایک آیت چھوڑ گئے۔ نماز کے بعد حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کیا آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا' نہیں میں بھول گیا تھا۔

اب صاحب تفسیر نے حضورؐ کو ایسی کشتی پر سوار کرا دیا ہے کہ وہ "نسیان" کی متلاطم موجوں میں تھپیڑے کھاتی نظر آتی ہے۔ اگر مودودی صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہوتا تو ان سے ایسی حرکت کبھی سرزد نہ ہوتی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مودودی صاحب کی فکر کا سرچشمہ قرآن نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس کا جواب تو آپ کو ان کی متذکرہ تفسیر کے اس ٹکڑے میں مل چکا ہے جہاں (بقول ان کے) حضورؐ پر "نسیان" لاحق ہوجانا صحیح بخاری کی ایک روایت سے ثابت کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں "نسیان" کی مزید تشریح کے لئے مودودی صاحب کے علم و فکر کے سرچشمہ کی چند ایک مثالیں آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔

(ا) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز قائم کی گئی اور صفیں کھڑی کر کے برابر کی گئیں۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے تو جب آپ اپنی نماز پڑھنے کی جگہ کھڑے ہو گئے' اس وقت یاد کیا کہ جنب ہیں۔ پھر ہم سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر رہو اور آپ لوٹ گئے اور غسل کیا۔ بعد اس کے ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ پھر آپ نے تکبیر تحریمہ کہی اور ہم سب نے آپ کے ہمراہ نماز پڑھی

(روایت نمبر۲۶۴' ۴۰۱' صحیح بخاری' جلد اول' ترجمہ مرزا حیرت دہلوی)

ملاحظہ کی آپ نے "نسیان" کی کیفیت۔ کیا ایسی بھول ایک رسول کے شایان شان ہے؟ اور آگے بڑھئے۔

(ب) عبد اللہ بحینہ کہتے ہیں (اور قبیلہ ازدشنودہ کے ہیں اور بنی عبد مناف کے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے) کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن) لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی تو (بھولے ۔۔۔) پہلی دو رکعتوں (کے ختم) پر کھڑے ہو گئے اور بیٹھے نہیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے' یہاں تک کہ جب آپ نماز تمام کر چکے اور لوگ آپ کے سلام پھیرنے کے منتظر ہوئے تو آپ نے بیٹھے ہی بیٹھے تکبیر کہی اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کئے بعد اس کے سلام پھیرا۔

(روایت نمبر۷۷۷' ۷۷۸' ایضاً)

(ج) "حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو (دو رکعتوں کے بعد) آپ نے سلام پھیر دیا۔ ذوالیدین نے آپ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا نماز کچھ کم پڑھائی گئی ہے (اس وقت آپ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں)۔ پس آپ نے اپنے اور اصحاب سے پوچھا کہ کیا ذوالیدین صحیح کہتے ہیں؟ ان لوگوں نے عرض کیا جی ہاں۔ تو آپ نے دو رکعتیں اور پڑھیں' پھر دو سجدے کئے' (روایت نمبر۱۱۳۶۔ ایضاً")

اس مضمون کی کئی روایات اور بھی آپ کو ملیں گی لیکن اختصار کے طور پر میں نے چند ایک ہی پر اکتفا کیا ہے۔ مندرجہ بالا روایات ایک تو حضورؐ کا (بقول روایات) نماز میں بھول جانا نظر آئے گا اور دوسرے اس بھول کے کفارہ میں دو سجدے (سہو کے) ادا کرنا نظر آئیں گے۔ ان دو سجدوں کی اساس بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جب کوئی شخص تم میں سے نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان آتا ہے اور اس کے دل میں شبہ ڈال دیتا ہے یہاں تک کہ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے نماز کس قدر پڑھی۔ لہٰذا' جب یہ بات کسی کو پیش آوے تو اسے چاہیے کہ بیٹھے بیٹھے دو سجدے کر لے۔

(روایت نمبر۱۱۴۲۔ایضاً")

اس روایت کی رو سے جو کوئی نماز میں بھول جاتا ہے' وہ شیطان کے غلبہ کی وجہ سے بھول جاتا ہے۔ لہٰذا' (معاذ اللہ۔ بقول ان کے) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شیطان کے غلبہ کی وجہ سے نماز میں بھول جاتے تھے جس کی وجہ سے دو سجدے (سہو کے) ادا کرتے تھے۔ دیکھا آپ نے متذکرہ تفسیر میں مودودی صاحب کے بیان کردہ "نسیان" کے ڈانڈے کہاں جا کر ملتے ہیں۔ یہ قرآن کی تفسیر ہے یا (معاذ اللہ) تضحیک؟

لیکن برادران عزیز! قرآن حکیم کا فتویٰ اس بات میں کچھ اور ہے۔ قصہ آدم کی تمثیل میں ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت مانگی تاکہ وہ لوگوں کو بہکا سکے اور ان کے دل میں وسوسہ ڈال سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دیدی اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ

ان عبادی لیس لک علیھم سلطن الا من اتبعک من الغوین○ (۱۵/۴۲)

تیرا غلبہ میرے مخلص بندوں پر نہیں ہو سکے گا۔ تیرا بس انہیں پر چلے گا جو متوازن راہ چھوڑ کر تیرے پیچھے لگ جائیں گے۔

اور پھر اس کا اعتراف خود ابلیس نے بھی کیا تھا کہ

الا عبادک منھم المخلصین۔ (۱۵/۴۰) "بے شک جو اللہ کے مخلص بندے ہیں ان پر میرا زور نہیں چل سکے گا اور نہ ہی میرا غلبہ ان پر ہو سکے گا"۔

تو پھر برادران عزیز! آپ خود ہی اپنے دل سے پوچھئے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر بھی کوئی عبد خالص ہے۔ اور کیا خالق مطلق کے واضح فتویٰ کے باوصف اور ابلیس کے اپنے اعتراف کے باوجود' ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ جیسی ہستی پر شیطان کے غلبہ سے نماز میں "نسیان" لاحق ہو سکتا تھا جس کے کفارہ کے لئے وہ سجدہ سہو ادا کرتے تھے۔ یہ ہے نمونہ اس مایہ ناز تفسیر تفہیم القرآن کا جس کی تکمیل پر جشن مسرت منایا گیا اور جسے انسانیت پر ایک عظیم احسان قرار دیا گیا۔ آخر میں شمع قرآنی کی روشنی میں جسے طلوع اسلام نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا ہے' محولہ بالا سورۃ "الاعلیٰ" کی آیات کا ترجمہ و مفہوم پیش کرتا ہوں۔ **سنقرئک فلا تنسے** (۸۷/۶) (اے محمد) ہم قانون الٰہی (قرآن) کو تیرے سینہ میں اس طرح جمع و محفوظ (ثبت) کردیں گے کہ تو اسے کبھی بھول نہیں سکے گا (ترک نہیں کرسکے گا)۔ اور پھر تاکید و تائید کے لئے کہا **الا ماشاء اللہ** (۸۷/۷) اور خدا نے ہرگز ایسا نہیں چاہا کہ قانون الٰہی (قرآن) کبھی بھی تیرے قلب و نگاہ سے محو ہو سکے۔

اس آیت میں **الا** استثنا کے لئے نہیں بلکہ جو حقیقت آیت نمبر (۸۷/۶) میں بیان کی گئی ہے اس کی تائید و تاکید کے لئے آیا ہے۔ عربی دان اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ لہٰذا' اس قسم کے تراجم اور تفاسیر بالکل غلط اور گمراہ کن ہیں' جو مودودی صاحب نے اپنی تصنیف تفہیم القرآن میں پیش کئے ہیں۔ علم تفسیر کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہے' باقی سب بتان آذری.....! (دسمبر ۱۹۷۳ء)

باب سوم

ہماری تاریخ

ہمارا تاریخی ریکارڈ کہاں چلا گیا؟

سوال:- ہماری سب سے پہلی تاریخ (تاریخ طبری) تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی' اور وہ بھی کسی سابقہ تحریری ریکارڈ سے نہیں' بلکہ زبانی روایات کی رو سے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے کا تاریخ رکارڈ موجود ہی نہیں تھا یا ان حضرات کو وہ ملا نہیں تھا؟

جواب:- ہمارے جامعین احادیث اور مورخین نے (ان کے بیانات کے مطابق) بڑی سعی و کاوش سے مواد اکٹھا کیا۔ اس کے لئے انہوں نے دور دراز کے سفر اختیار کئے' سیکڑوں' ہزاروں افراد سے ملے۔ اگر تحریری ریکارڈ کہیں موجود ہوتا' تو وہ یقیناً" اسے حاصل کر لیتے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ تحریری ریکارڈ کہیں تھا ہی نہیں۔ اس لئے انہوں نے زبانی روایات کی بنا پر احادیث کے مجموعے اور تاریخ مرتب کی۔

اس سلسلہ میں ایک بات بڑی غور طلب ہے۔ مدینہ' ہماری سب سے پہلی مملکت کا دارالخلافہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ مملکت قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس کی وسعت قریب بائیس لاکھ مربع میل تک چلی گئی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس کی حدود دور دراز تک پھیل گئیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے کاروبار کے لئے کوئی سیکریٹریٹ ہو گا' محکمہ مال ہو گا۔ صوبوں کے گورنروں سے امور مملکت کے سلسلہ میں خط و کتابت ہو تی ہو گی۔ داخلی امور حکومت کے متعلق احکامات جاری ہوتے ہوں گے۔ دیگر مملکتوں کے سفراء اور قاصد آتے جاتے ہونگے۔ فوج سے متعلق امور سرانجام پاتے ہوں گے۔ یہ سب کچھ تحریری طور پر ہوتا ہو گا۔

دوسری طرف اسے بھی پیش نظر رکھئے کہ رسولؐ اللہ کے زمانے سے لے کر آج تک مدینہ پر مسلمانوں کا تسلط رہا ہے۔ کسی غیر مسلم کے قدم اس سرزمین پر نہیں پڑے۔ وہاں کوئی ایسا زلزلہ نہیں آیا جس سے عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔ کوئی سیلاب نہیں آیا جس سے شہر غرقاب ہو گیا ہو۔ کوئی ایسی آگ نہیں لگی جس سے وہ بستی خاکستر ہو گئی ہو۔ کوئی فوجی یورش ایسی نہیں ہوئی جس سے اس پر تباہی آگئی ہو۔

لیکن ان تمام امور کے باوجود' اس مملکت کے کاروبار سے متعلق کوئی پرزۂ کاغذ کہیں نہیں ملتا' نہ مدینہ میں ملتا ہے نہ کہیں باہر۔ سوال یہ ہے کہ اس مملکت سے متعلق تحریری ریکارڈ کہاں چلا گیا؟ کہاں گم ہو گیا؟ اسے کون لے گیا۔ وہ کیسے ضائع ہوا؟ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ تاریخ کے متلاشیوں کو بحرمیت کے کنارے حضرت مسیحؑ

کے زمانے سے بھی قبل کے مخطوطات (SCROLLS) تک مل گئے۔ مکتشفین کو بابل اور نینوا کے کھنڈرات سے حمارابی تک کے زمانے کے احکام و قوانین کا پتہ چل گیا۔ مصر کی قدیم تہذیب کے متعلق' چٹانوں پر کندہ اور دیواروں پر منقوش مواد مل گیا۔ لیکن مدینہ کی مملکت سے متعلق تحریر میں ایک لفظ تک کہیں سے دستیاب نہیں ہوا۔

اور آگے بڑھیے۔ خلافت راشدہ کے بعد' اسلامی مملکت کا دارالخلافہ دمشق میں منتقل ہو گیا اور وہاں قریب ایک سو سال تک اموی حکومت کار فرما رہی۔ وہ اس زمانے کی سب سے بڑی بین الاقوامی مملکت تھی۔ اس حکومت سے متعلق بھی اصلی (ORIGINAL) ریکارڈ کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا؟ اور جتل ریکارڈ تو عباسی حکومت کا بھی نہیں ملتا۔ اس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بغداد کی تباہی میں تلف ہو گیا ہو گا۔ لیکن مدینہ اور دمشق کے متعلق تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ بالخصوص مدینہ کے متعلق کہ وہاں کی حکومت (عہد رسالت مآب اور خلافت راشدہ کی حکومت) اور اس کے متروکات کے ساتھ توامت کی عقیدت وارادت بھی وابستہ تھی۔ پھر اس تحریری ریکارڈ کو کیا ہوا؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے' تاریخ کے کسی محقق نے اس کے متعلق تحقیق ہی نہیں کیا کہ یہ ریکارڈ چلا کہاں گیا!

اس کے بعد آپ غور فرمایئے کہ جس تاریخ کے اور جتل ماخذ کی یہ کیفیت ہو' اسے کس حد تک قابل اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس دور کا ایک ہی تحریری سرمایہ ہے جو ہم تک محفوظ چلا آرہا ہے اور وہ ہے قرآن کریم۔

(جون ۱۹۶۹ء)

باب چہارم

تقدیر

۱۔ کیا دعا سے خدا کے فیصلے بدل سکتے ہیں؟

مودودی صاحب کے درس قرآن و حدیث میں موضوع زیر بحث دعا تھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا:۔
اگر انسان کا مقدر پہلے سے طے ہو چکا ہے تو پھر دعا کے کیا معنی ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے کو بدل دیتا ہے؟
جواب میں فرمایا:۔

جی ہاں PRE-DESTINTAION بھی صحیح ہے اور دعا بھی اپنی جگہ درست ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات طے کرنے کے بعد بے بس ہو گیا ہے۔ وہ جس طرح فیصلہ کرتا ہے اسی طرح اس فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے کہ وہ پہلے سے طے کر چکا ہو کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنے فیصلے کو بدل دوں گا اور اگر دعا نہیں مانگے گا تو میں اس کے ساتھ طے شدہ فیصلے کے مطابق معاملہ کروں گا۔ اس چیز کو اصطلاحاً" تقدیر معلق کہتے ہیں' وہ تقدیر جس میں اللہ تعالیٰ نے ردو بدل کی گنجائش رکھی ہو۔ اور تقدیر مبرم وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہو کہ اس میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

(ایشیا' مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۶۹ء)

ایشیا کی ۲۵ جولائی کی اشاعت میں ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے اس جواب کی مزید تصریح یوں فرمائی۔

اس حدیث میں ایک اہم سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ پہلے سے ایک فیصلہ کر دیتا ہے اور انسان کی تقدیر میں وہ لکھا جاتا ہے تو پھر دعا کا کیا فائدہ؟ ظاہر ہے کہ جب آدمی کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ جائے تو وہ اپنے خدا سے مایوس ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی تعلق اپنے خدا سے نہیں رہتا--- یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے بارے میں آدمی کا یہ تصور درست نہیں ہے۔ جو خدا فیصلہ کرتا ہے وہ اپنے فیصلے کو بدلنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اگر وہ بادشاہ ہے' حاکم ہے' مختار مطلق ہے اور کوئی چیز اسے باندھنے والی نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے معافی مانگیں اور وہ متوجہ نہ ہو۔ قضا عربی زبان میں

فیصلے کو کہتے ہیں اور دعا حقیقت میں درخواست ہے جو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو پورا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اپنے بندوں کی درخواست قبول کرتے ہوئے اپنے سابقہ فیصلے کو بدل دے اور چاہے تو نہ بدلے۔ لیکن اس کی یہ مرضی بھی اپنی عظیم الشان حکمت کے تابع ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ الل ٹپ کسی دعا کو قبول کر لیتا ہے اور کسی کو رد کر دیتا ہے۔

متکلمین نے اسی لئے یہ رائے دی ہے کہ قضا کی دو قسمیں ہیں' ایک قضائے مبرم اور دوسری قضائے معلق۔ قضائے مبرم وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اسے کسی صورت میں تبدیل نہیں کروں گا اور قضائے معلق وہ ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ کا ہی یہ فیصلہ ہے کہ اگر بندے نے مجھ سے درخواست کی اور میرے آگے دست طلب دراز کیا تو میں اسے تبدیل کر دوں گا۔ خود قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے **ادعونی استجب لکم** ۴۰/۶۰ مجھ سے مانگو میں تمہاری پکار کو سنتا ہوں۔

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فیصلے ایسے ہیں جو بندے کی دعا سے بدلے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے تو بندوں کو اس طرف رغبت دلائی گئی ہے۔

اس پر کسی صاحب نے پوچھا کہ " اگر دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے بدل دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت وہ فیصلے لکھ رہا تھا (نعوذ باللہ) اسے معلوم نہ تھا کہ متعلقہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں"۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا:۔

فیصلے میں اس نے یہ لکھا تھا کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔ اگر نہیں مانگے گا' تو اسے برقرار رکھوں گا۔ میں پہلی حدیث ہی میں اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ خدا کو تو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا علم ہوتا ہے' اس لئے اسے فیصلے میں یہ کیوں لکھنا پڑا کہ اگر یہ شخص دعا مانگے گا تو میں اپنا فیصلہ بدل دوں گا۔ اگر نہیں مانگے گا تو اسے برقرار رکھوں گا۔ کیا اسے اس وقت (معاذ اللہ) اس کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص دعا مانگے گا یا نہیں۔

ہم نے اس لئے کہا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کسی نے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا"۔ یہ اس لئے کہ اگر کسی نے یہ سوال پوچھ لیا ہوتا تو اس وقت تک اس کے خلاف ایک احتسابی کمیٹی بیٹھ چکی ہوتی یہ فیصلہ دینے کے لئے کہ اس شخص کے عقائد خلاف اسلام ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اقبال پر بھی کفر کا فتویٰ لگ چکا ہوتا جس نے کہا تھا کہ ۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

اور یہ تفسیر ہے قرآن کریم کی ان آیات کی جن میں کہا گیا ہے کہ **لا تبدیل لکلمت اللہ** (۱۰/۶۴) خدا کے فیصلوں (قوانین) میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ **ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا** (۳۳/۶۲) تو خدا کی روش میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم** (۱۳/۱۱) جس قسم کی تبدیلی کوئی قوم اپنے اندر پیدا کرلیتی ہے اسی قسم کا خدا کا قانون اس پر نافذ ہو جاتا ہے۔

رمز باریکش بحر فے مضمر است — تو اگر دیگر شوی' او دیگر است
خاک شو' نذر ہوا سازو ترا — سنگ شو' برشیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست — قلزمی؟ پائندگی تقدیر تست
(اقبال)

اس لئے دعا خدا کے فیصلے بدلوانے کا نام نہیں۔ اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ دعا' اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی شدت آرزو کا نام ہے تاکہ اس تبدیلی کے مطابق خدا کا فیصلہ (قانون خداوندی) اس پر لاحق ہو۔ اسی لئے کہا گیا ہے ۔

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے
(اقبالؒ)

لیکن یہ حقائق ان حضرات کی سمجھ میں کیسے آسکتے ہیں؟---- سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند--- کہاں قرآن کی بلندیاں' کہاں ان کے ذہن کی پستیاں !۔

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب
(اقبالؒ)

(اکتوبر ۱۹۶۹ء)

۲۔ رضا اور مشیت میں فرق؟

مودودی صاحب کا پیش کردہ خدا کا تصور

ان صفحات میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے کہ مودودی صاحب کا مشن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا اسلام پیش کیا جائے جس سے ہمارا سوچ بچار کرنے والا نوجوان طبقہ اسلام کا لبادہ اتار کر پھینک دے اور جس کا دنیا کے ارباب فکر و

نظر مذاق اڑائیں۔ اس سلسلے میں ہم ان کی طرف سے پیش کردہ متعدد تصورات اور عقائد سامنے لا چکے ہیں۔ اس وقت یہ دیکھئے کہ وہ خدا کے متعلق کیا تصور پیش کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے ترجمان "ایشیا" کی ۴ اپریل ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا درس قرآن شائع ہوا ہے (جو غالباً ان کی تفسیر سے لیا گیا ہے)۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

> قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا میں بہت بڑا فرق ہے جس کو نظر انداز کر دینے سے بالعموم شدید غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں۔ کسی چیز کا اللہ کی مشیت اور اس کے اذن کے تحت رونما ہونا لازمی طور پر یہ معنے نہیں رکھتا کہ اللہ اس سے راضی بھی ہے اور اسے پسند بھی کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی واقعہ کبھی صدور میں نہیں آتا جب تک اللہ اس کے صدور کا اذن نہ دے ..... کسی چور کی چوری، کسی قاتل کا قتل، کسی ظالم و مفسد کا ظلم و فساد اور کسی کافر و مشرک کا کفر و شرک، اللہ کی مشیت کے بغیر ممکن نہیں .... مگر اس قسم کے واقعات سے اللہ راضی نہیں ہے۔

اس سے (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ) بیچارے اللہ میاں کی مجبوری کا اندازہ لگائیے۔ وہ ایک واقعہ کے صادر ہونے کا حکم دیتا ہے درآں حالیکہ وہ اس سے خوش نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ تلخ گھونٹ بہ امر مجبوری پینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھئے کہ کوئی تھانیدار اپنے ماتحت سپاہی سے کہے کہ فلاں بے گناہ کو گرفتار کر کے الٹا لٹکا دو۔ وہ سپاہی کہے کہ حضور آپ جانتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہے، پھر آپ مجھے ایسا کرنے کا حکم کیوں دے رہے ہیں۔ اس کے جواب میں تھانیدار صاحب کہتے ہیں کہ بھائی میں بھی جانتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے لیکن میں یہ حکم چاؤ سے نہیں دے رہا۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے اوپر سے ایسا ہی کہا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ مودودی صاحب کے پیش کردہ خدا کی کیفیت بھی (معاذ اللہ) کچھ ایسی ہی نہیں؟ وہ ایسے احکام نافذ کرنے پر مجبور ہوتا ہے جنہیں وہ ناپسند کرتا ہے لیکن اس کے باوجود، اسے وہ احکام صادر کرنے پڑتے ہیں توبہ توبہ معاذ اللہ۔ ہمیں افسوس مودودی صاحب پر نہیں، بے حد افسوس ان کے ان معتقدین پر ہے جو ان کی اس قسم کی مزخرفات پر بھی تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اندھی عقیدت کس طرح انسانوں سے فکر و بصیرت کی صلاحیتیں چھین لیتی ہے۔ لیکن جس قوم سے میرزا غلام احمد جیسوں کو معتقدین کی کھیپ مل سکتی ہے اس سے مودودی صاحب کو متبعین کامل جانا کون سی تعجب کی بات ہے؟

(مئی ۱۹۷۶)

۳۔ ابتلاء یا آزمائش

ایک صاحب نے (جن کی اہلیہ، پانچ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر انہیں داغ مفارقت دے گئی ہیں) مودودی صاحب کو لکھا:

> اہلیہ کے انتقال کے فوراً بعد ہی سے یہ سوال دل و دماغ پر مسلط ہو چکا ہے کہ آخر وہ

کونسا گناہ عظیم ہے جس کی پاداش میں مجھے اور میری اولاد کو یہ سزا دی گئی۔ اور اگر یہ واقعی گناہ کا نتیجہ ہے تو میرے معصوم بچوں کو اس میں کیوں شامل کر لیا گیا؟ اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہا گیا ہے اور کئی مرتبہ میں بھی اپنے آپ سے یہی کہتا ہوں کہ ہر انسان بہرحال گنہگار ہے اور اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے ہم جتنی بھی اللہ تعالیٰ کے حضور لجاجت سے دعا کریں، کم ہے۔ مگر موت کی مصیبت چونکہ اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے نیک بندوں پر بھی جن کی نظیر پیش کرنا شاید ممکن نہیں، آچکی ہے اور اس کے تلخ عواقب سے نہ صرف خود انہیں بلکہ ان کی بے مثال اولادوں کو بھی دوچار ہونا پڑا ہے، لہٰذا یہ حکم لگانا کہ فلاں موقع پر موت کا وقوع کسی خاص گناہ یا گناہوں کے کسی خاص مجموعے کی پیداوار تھا، غالباً درست نہ ہوگا۔

مزید برآں، دعا مانگنے کے بارے میں بھی متعدد ظنون و اوہام پیدا ہو گئے کہ یہ عمل واقعی وہ تاثیر رکھتا ہے یا نہیں جو عموماً اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ میں نے اور میرے بچوں نے مرحومہ کی صحت یابی کے لئے سیکڑوں دعائیں کیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد میں نے دعا مانگنا ترک تو نہیں کیا مگر منافقت ہو گی اگر میں یہ کہوں کہ اہلیہ کے بارے میں دعاؤں کے رائگاں جانے سے مجھے کمال درجے کی مایوسی نہیں ہوئی۔ میرے بچوں پر اس کا اثر بہت برا ہوا ہے اور وہ دعا کے قائل ہی نہیں رہے۔ پچھلے دنوں میں نے ان کو اس امر کی ترغیب دلانا چاہی تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ "آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدا سے دعا کیا کرو، وہ سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ ہم نے اپنی ماں کے لئے بیشمار مخلصانہ دعائیں کیں مگر ایک بھی مستجاب نہ ہوئی"

علاوہ ازیں، سب سے زیادہ ایک پیچیدہ اور تکلیف دہ سوال جو اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ پیدا ہو چکا ہے مگر جس کی تلخی اور شدت موجودہ حالات میں کئی گنا زیادہ محسوس ہوئی، وہ پیمانہ عمر کی مقدار اور موت کے مقدر ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ حقیقت بہ صراحت مذکور ہے کہ موت کا وقت معین ہے اور وہ کسی طرح آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس کے بالمقابل مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ خود ہمارے ملک میں جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جا رہی ہے، افراد کی اوسط عمر میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اہل مغرب کی اوسط عمر مدتوں سے اہل مشرق کی اوسط عمر سے زیادہ رہی ہے اور آج بھی ہے۔ ان حقائق سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی کمی بیشی شاید ان معنوں میں مقدر نہیں جن معنوں میں ہم اسے مقدر سمجھتے آرہے ہیں۔

بلکہ انسانی سعی و کوشش بھی عمر کے بڑھانے اور گھٹانے میں دخیل ہے۔ مجھے اس امر کا پورے طور پر احساس ہے کہ یہ سوال جبر و قدر کے عام مسئلہ ہی کا ایک جزو ہے اور اس میں محض استدلال کی مدد سے کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا شاید ممکن نہیں۔ مگر جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں' محض یہ کہہ کر ان مسائل سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔

---------- ☆ ----------

آپ نے غور فرمایا کہ ان الفاظ میں ایک قلب مضطرب کی دھڑکنیں کس طرح ابھر ابھر کر فریاد طلب سامنے آرہی ہیں۔ اب اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ مودودی لکھتے ہیں:

آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم کر کے افسوس ہوا۔ آپ کو اپنی اہلیہ مرحومہ کی وفات کے سبب سے جو اضطراب لاحق ہے اور جس ذہنی کیفیت سے آج کل آپ گزر رہے ہیں' اس میں صبر کی تلقین کرنا گویا فطرت سے لڑنے کا مشورہ دینا ہے۔ لیکن درحقیقت اس صورت حال میں صبر کے سوا کچھ بھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ صبر نہ کرے تو اس نقصان کی تلافی بہرحال نہیں ہو سکتی جو پہنچ چکا ہے۔ صرف اپنی تکلیف میں اضافہ ہو سکتا ہے۔[1]

آپ کا یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی اہلیہ کی وفات کوئی سزا ہے جو آپ کو یا آپ کے بچوں کو دی گئی ہے۔ دراصل یہ سزا نہیں بلکہ ان بے شمار آزمائشوں میں سے ایک آزمائش ہے جو دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو لازماً پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان غیر فانی نہیں ہے۔ ہر ایک کو لازماً کسی نہ کسی وقت مرنا ہے اور موت بہرحال اس شرط کے ساتھ نہیں آتی کہ مرنے والا اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہ چھوڑے جس کے لئے اس کی موت وجہ پریشانی بن سکے۔ بچے' جوان' بوڑھے' سب مرتے ہیں۔ اکثر مرنے والے ایسی حالت میں مرتے ہیں جس سے بہت سے دوسرے انسانوں کے لئے رنج و غم کے علاوہ بہت سی الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

دنیا کی بہت سی دوسری آزمائشوں کی طرح اس آزمائش سے بھی انسان کو کبھی نہ کبھی ضرور سابقہ پیش آتا ہے۔ اس پر دل برداشتہ ہونے کی بجائے اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ اس سے بخیر گزرنے کی طاقت بخشے اور ان مشکلات کو رفع کر دے جو ان سے رونما ہوئی ہیں۔

دعا کے بارے میں بھی یہ سمجھ لیجئے کہ دعا ایک درخواست ہی ہے جو مالک کائنات

۱۔ خود ہی کہتے ہیں کہ صبر کرنا فطرت سے لڑائی کرنا ہے اور خود ہی صبر کی تلقین کئے جا رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

سے کی جاتی ہے۔ مالک ہر دعا کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہے اور نہ وہ اس شرط کے ساتھ مانگنی چاہیے کہ مالک لازماً" اس کو قبول ہی کرے۔ ہمارا کام اس سے صرف التجا کرنا ہے۔ یہ اس کے مالک ہونے اور ہمارے بندہ ہونے کا عین تقاضا ہے۔ وہ قبول کرے تو اس کا کام' نہ قبول کرے تو اس کو اختیار ہے۔ اگر معمولی انسانی حکومتیں بھی ہر سائل کی ہر درخواست کو قبول نہیں کرتیں اور ان کے قبول نہ کرنے کی وجہ بہت سی ایسی مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں سائلین نہیں جانتے' تو آخر کائنات کی حکومت کیسے ہماری ہر درخواست کو قبول کر لینے کی پابند ہو سکتی ہے۔ اور کائنات کا یہ نظام کیسے چل سکتا ہے اگر ہر دعا مانگنے والے کی ہر ایک دعا جوں کی توں قبول کر لی جائے۔

پیمانہ عمر کے بارے میں جو سوال آپ نے کیا ہے' اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آج تک کسی تدبیر سے بھی انسان اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ ہر انسان کی عمر خود مقرر کر دے اور یہ طے کر دے کہ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے کوئی شخص نہ مرنے پائے گا۔ آج تمام انسانی تدبیروں کے باوجود' ہر عمر کے آدمی مر رہے ہیں' عین ہسپتالوں میں مر رہے ہیں اور ایسے ایسے باوسیلہ آدمی بھی مر رہے ہیں جن کو علاج کی بڑی بڑی ممکن سہولتیں میسر آسکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بس یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح کم ہو گئی ہے اور انسانوں کی اوسط عمر میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے ہاتھ میں عمر کا سررشتہ آگیا ہے۔ درحقیقت جس طرح تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ تعالیٰ بتدریج انسان پر قوانین کائنات کے اسرار کھول رہا ہے اور رفتہ رفتہ اس کو مزید ذرائع پر دسترس عطا کر رہا ہے' اسی طرح انسانی امراض کے اسرار بھی وہ اس پر منکشف کرتا جا رہا ہے۔ ان کے علاج کے ذرائع بھی اس کو دیتا جا رہا ہے اور اسی کے مطابق وہ انسان کی تقدیر بھی بدلتا جا رہا ہے۔ لیکن بہرحال تمام دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی انسان کی تقدیر ہے خدا ہی کے ہاتھ میں۔ اور آج بھی جب کسی انسان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مرنے سے بچا نہیں سکتی۔

میرے خیال میں آپ کو موجودہ ذہنی پریشانی سے نکلنے میں جو چیز سب سے زیادہ مدد دے سکتی ہے وہ قرآن مجید کا غائر مطالعہ ہے۔ اگر میری تفسیر تفہیم القرآن آپ کے پاس ہو تو آپ اس زمانے میں فرصت کے اوقات .... زیادہ تر اس کے مطالعہ میں صرف کریں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کو سکون قلب حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

(ترجمان القرآن' جنوری ۱۹۶۶ء)

طلوع اسلام

ہم نہیں کہہ سکتے کہ جن صاحب نے مودودی صاحب سے یہ سوال کیا تھا اس جواب سے ان کے دل درد آگیں کو سکون حاصل ہوا یا نہیں۔ لیکن اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس جواب سے اسلام بے چارہ سرپیٹ کر رہ گیا ہوگا کہ اس کی طرف کیا کچھ منسوب کیا جا رہا ہے۔

بیماری' موت' دعا' تقدیر وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کی تشریح و تفسیر ضمنی طور پر پیش کی جا سکے۔ ان موضوعات پر ہم تفصیل سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور قارئین طلوع اسلام اس سے آگاہ ہیں ۲۔ اس وقت ہم ان چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں کہ:۔

(۱) صحت' بیماری' عمر کا تعلق خدا کے مقرر کردہ قوانین طبیعی سے ہے۔ اگر ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے تو انسان کی صحت قائم رہتی ہے' بیماری کم آتی ہے اور آتی بھی ہے تو اس کی مدافعت آسانی سے ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے اور اس کی تائید اب انسان کے تجربات اور مشاہدات کر رہے ہیں--- موت کا ایک دن مقرر ہے--- شاعرانہ خیال ہے' حقیقت نہیں۔ موت کا دن پہلے سے مقرر نہیں ہوتا۔ انسان' اسے خود خدا کے قوانین کے مطابق مقرر کر لیتا ہے۔ کسی کا جی چاہے تو آج ہی اپنے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی زندگی ختم کر سکتا ہے۔ آخر کار موت پر تو انسان قابو نہیں پا سکتا لیکن بیماری پر پا سکتا ہے اور اپنی عمر بڑھا بھی سکتا ہے۔

(۲) خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرنے سے جو نقصان رساں نتائج سامنے آتے ہیں (بیماری انہیں میں سے ایک ہے) ان کا ازالہ' خدا ہی کے مقرر کردہ دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنے سے ہو سکتا ہے (بیماری کی صورت میں صحیح علاج اس کی مثال ہے)۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسے قوانین عطا کر رکھے ہیں جو تخریبی نتائج کی مدافعت کر سکتے ہیں۔

(۳) خدا کسی کی آزمائش نہیں کرتا--- ایک شخص ہماری دوستی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اس دعویٰ دوستی میں سچا ہے یا نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی کسی مصیبت میں اس کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک اپنے دعویٰ میں سچا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے اس دوست کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ خدا کو اس قسم کی آزمائشیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ البتہ مصائب و تکالیف کے وقت ہم خود اپنی آزمائش کر لیتے ہیں کہ ہم میں حوصلہ اور ہمت کس قدر ہے اور ہم کس حد تک نامساعد حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مصائب و تکالیف ہمیں اپنی صلاحیتوں کی پرکھ کرنے کے مواقع بہم پہنچاتی ہیں۔ قرآن کریم میں جس ابتلا کا ذکر آتا ہے اس سے یہی مراد ہے' نہ کہ خدا کسی اپنے مقصد کے لئے ہماری آزمائش کرتا ہے۔ خدا کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔

(۴) مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے اور الجھنیں دور کرنے کے لئے بے شک قرآن کریم کا غائر مطالعہ بے حد نفع

۲ مسئلہ تقدیر پر پرویز صاحب کی مستقل تصنیف میں شائع ہو چکی ہے جس کا نام "کتاب التقدیر" ہے۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

بخش ہے کہ وہ خدا کے ان قوانین کی نشان دہی کرتا ہے جن کے مطابق کائنات میں یہ کچھ ہوتا ہے لیکن جن انسانی خیالات کا نام ان حضرات نے قرآنی تعلیم رکھ چھوڑا ہے (خواہ اسے یہ براہ راست پیش کریں یا پہلے قرآن کی کوئی آیت پڑھ کر) ان سے تو ان الجھنوں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی یہی تعلیم تو ہے جس کی وجہ سے ہمارے زمانے کا "غور کرنے والا طبقہ" اسلام سے دور بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ (فروری ۱۹۶۶ء)

۴۔ بے گناہوں پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ قصور کس کا ہے؟

ایک صاحب قلب حساس کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

"کچھ ہی سال ادھر کی بات ہے جب میں ..... ریلوے اسٹیشن پر بطور ..... کام کرتا تھا۔ رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر مسافر خانے میں جا کر ایک کپ چائے پی جو گرم ہونے کے باوجود سرد ہونٹوں سے لگنے کے بعد ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی سردی میں مسافر خانے کے کونے میں ایک غریب خاندان جس پر غربت کو بھی شرم آئے' بیٹھا ہوا تھا۔ مرد جو مفلوک الحال ہونے کے علاوہ ٹی بی کے مارے خون تھک رہا تھا' مجھے فارغ پا کر یا جانے کیا سوچ کر' میرے پاس آیا اور کہنے لگا' مجھے غالباً" یہ بتانے کی دقت تو پیش نہ آئے گی کہ مجھے ٹی بی ہے۔ ہاں اس بات کا آپ کو علم نہ ہوگا کہ میں حیدر آباد مل میں اچھی خاصی کمائی کرتا تھا۔ جب ٹی بی ہوئی تو مل والوں نے نکال دیا۔ دوا دارو کیا' افاقہ تو خیر کیا ہونا تھا۔۔۔۔ مگر ہاں اثاثہ ضرور ختم ہو گیا۔ بھائی کے پاس رہنے لگا تو کچھ روز بعد بھاوج کے کہنے پر بھائی نے دھتکار دیا۔ آخر بیمار سے پیار بھی کون کرے۔ کوئٹہ جا رہا تھا بغیر ٹکٹ ہونے پر یہاں گاڑی سے اتار دیا گیا ہوں۔ کھانے کو تو خیر پہلے بھی کچھ نہ تھا البتہ پینے کو آنسو تھے۔ ہائے رے وہ بھی نہ رہے۔ کیا آپ مجھے' میری بیوی اور بچیوں کو کوئٹہ پہنچانے کا انتظام کر دیں گے۔ میں نے بچیوں کی طرف دیکھا جن میں سے ایک کی عمر سات برس کے لگ بھگ اور دوسری کی تیرہ چودہ کے قریب تھی۔ دونوں بچیاں پھٹی میلی سی ایک ہی چادر اوڑھے دونوں ایک دوسری کے ساتھ اکٹھی بیٹھی سردی کے مارے کانپ رہی تھیں۔ خاموش مگر کس حسرت سے ٹکٹکی باندھے مجھے چائے پیتے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اس غریب خاندان کی کیا مدد کی' اسے چھوڑیئے۔ دو چار روز بعد بھی جب اس خاندان کو وہیں پایا تو میں نے چائے والے سے پوچھا کہ یہ لوگ ابھی تک کوئٹہ کیوں نہیں گئے تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ بھولے بادشاہو! ابھی سودا نہیں ہوا۔ مطلب؟ مطلب یہ کہ ایک زمیندار آیا تھا۔ وہ بڑی لڑکی کے آٹھ سو دے رہا تھا اور یہ بارہ سو مانگ رہے تھے۔ سودا نہیں ہوا مگر وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ اور جب رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پھر چائے پینے گیا تو وہ خاندان وہاں نہیں تھا۔ دکاندار نے بھی کہا کہ معلوم نہیں وہ کب اور کہاں چلے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ "سودا" ہوا یا نہیں۔ اگر نہیں ہوا تو بھی ایسے سودے آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اور اگر سودا ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمیندار اس بچی کو اپنے ہاں لے جائے گا۔ اس کے ساتھ نوکروں سے بھی برا سلوک کیا جائے گا۔ کھانے کو اتنا دیا جائے گا کہ بمشکل زندہ رہ سکے۔ معصوم بچی کے سر پر کام ہوگا کہ صبح سے شام

تک کرنے پر بھی ختم نہ ہوگا۔ اس پر ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ مفت کی۔ بچی کو ہر وقت زدوکوب کیا جائے گا مگر کیا مجال جو اف بھی کر سکے۔ درد کا درماں نہ ہوگا۔ کوئی اس کے سر پر دست شفقت پھیرنے والا نہ ہوگا۔ فرار ہونا تو درکنار تڑپ کر مرجانا بھی اک بات ہے مگر بچاری کو تو اس پر بھی اختیار نہ ہوگا۔ کچھ سالوں بعد اس کی ذمہ داریاں تبدیل ہو جائیں گی۔ پھر ایک جگہ سے دوسری' تیسری اور چوتھی جگہ بکنا شروع ہو جائے گی اور خدا جانے کہاں کی کہاں پہنچ جائے گی۔

اس طرح اس بچی نے تمام عمر گناہ اور دکھوں میں گزاری۔ آخر اس گناہ اور دکھ کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر گناہ کو معصوم بچی کے باپ کے سر تھوپ دیا جائے یا معاشرے یا حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے' بہرصورت بچی کو جو دکھ ملے آخر وہ کس سلسلے میں؟ کس جرم میں؟ کس قصور کی پاداش میں؟ ذمہ دار کوئی ہو یا قصور کرنے والا کوئی ہو اور پکڑی جائے بچی جیسے عیسائیوں کے ہاں ہے کہ "ہم ان کا بدلہ ان کی اولاد سے لیتے ہیں"۔ یہ تو کسی طور مبنی برانصاف نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ "ہر آدمی اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے" یا جو خرابی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے' تو بھی بچی نے اپنے کئے کا پھل نہیں پایا۔ بچی نے کونسا گناہ کر دیا تھا جس کی پاداش میں اس کی تمام عمر دکھ میں بیتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس بچی کو اگلے جہان جا کر دکھ کی بجائے سکھ ملے گا تو یہ بھی مبنی برانصاف نہیں کہ قدرت نے اسے اس جہان میں سکھ نہ دیا بلکہ الٹا سکھ کے بجائے (اور لطف کی بات یہ کہ بغیر کسی گناہ کے) دکھ دیا۔

ان باتوں کو جوں جوں سوچتا ہوں پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا آپ اس اضطراب کو دور کر سکیں گے؟"

طلوع اسلام

اسی قسم کے تھے وہ مقامات جہاں ذہن انسانی نے اپنے عجز کا مظاہرہ مختلف انداز سے کیا۔ اس نے کبھی (عیسائیت کے عقیدہ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور اس کی پاداش میں دکھ جھیلتا ہے۔ کبھی (یونان سے برآمد شدہ اور ہندوؤں کے اپنائے ہوئے عقیدہ تناسخ کی رو سے) یہ کہا کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ کہیں اس نے (مجوسیوں کے تتبع میں اختیار کردہ مسلمانوں کے عقیدہ کے رو سے) یہ کہا کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر سے متعلق ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جن کا دل (مہاتما بدھ کی طرح) زیادہ رقیق تھا' انہوں نے اس قسم کے دو چار واقعات دیکھ کر خود دنیا سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ اگر ان کے دل جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے' حقائق کا بے نقاب سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتے تو اس بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ اس طرح ان کے سامنے یہ حقیقت آجاتی ہے کہ فرد' معاشرہ کا جزو ہوتا ہے۔ جس قسم کا معاشرہ اسی قسم کے افراد کے حالات۔ غلط معاشرہ میں بے گناہ افراد بڑے دکھ جھیلتے اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور اس معاشرہ کا مفاد پرست طبقہ انہیں "گناہ اول" "تناسخ" یا تقدیر کے عقیدوں میں الجھائے

رکھتا ہے تاکہ ان کی نگاہ ان کی طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔ اگر انہیں پتا اور سمجھا دیا جائے کہ ان کی مصیبتیں اور تکلیفیں اسی معاشرہ کی پیدا کردہ ہیں تو وہ اٹھ کر اس معاشرہ کو زیر وزبر کر دیں اور اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر دیں۔ غلط معاشرہ کا یہی وہ "فتنہ" ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے محتاط رہو کیونکہ اس کی خرابیاں انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جو ان کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس آگ کے شعلے دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہماری نگاہ ان تکلیفوں کی طرف تو جاتی ہے جو غلط معاشرہ میں ہمیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کے لئے ہم پکار اٹھتے ہیں کہ یہ سزا ہمیں کس جرم کے پاداش میں مل رہی ہے۔ لیکن معاشرہ کی طرف سے ہمیں جو سہولتیں میسر ہوتی ہیں ان کے متعلق ہم کبھی نہیں سوچتے (اور کہتے) کہ ہم نے (انفرادی طور پر) وہ کون سے کارنمایاں کئے ہیں جن کے صلہ میں ہمیں یہ سب آسانیاں میسر ہو رہی ہیں۔ (مثلاً") انگریزی طب کی کتابوں میں ایک تصویر دیکھنے میں آئے گی۔ آج سے قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل کا زمانہ ہے۔ یونان کا ملک۔۔۔ ایک بادشاہ کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا ہے جس کے متعلق اطبا کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ بادشاہ کو فرش پر لٹا رکھا ہے اور چار پانچ دیوہیکل غلام اسے چاروں طرف سے دبائے ہوئے ہیں کہ وہ ہلنے نہ پائے۔ ایک "سرجن" آری سے اس کی ٹانگ کاٹ رہا ہے۔ ایک طرف کوئلے دہک رہے ہیں جن میں لوہے کی سلاخیں گرم ہو رہی ہیں۔ پاس ہی کڑاہی میں تیل ادنٹھ رہا ہے۔ جب آری سے ٹانگ کٹتی ہے تو دوسرا طبیب اسے لوہے سے داغتا ہے اور اس پر گرم گرم تیل ڈالتا جاتا ہے تاکہ خون بند ہو جائے اور زخم جل کر سوکھ جائے۔ آپ سوچئے کہ اس عمل جراحی میں اس مریض (بادشاہ) پر کیا گزرتی ہوگی۔ اس نے چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

اس سے اگلے ہی صفحہ پر دور حاضر کے ایک کلینک کی تصویر ہے جس میں سرجن نے مریض کو ایک ٹیکہ لگا کر بے حس کر دیا ہے اور نہایت اطمینان سے اس کا اپریشن کئے جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بادشاہ نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے اس قدر جانکاہ تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی تھی اور ہم نے کون سے "اعمال صالحہ" کئے ہیں جن کی جزا میں ہم اس قدر آرام اور راحت سے اپنا علاج کرا لیتے ہیں۔ یہ ہے معاشرہ میں افراد کی حالت کا نقشہ۔

یہ مثال طبعی احوال و کیفیات کی ہے۔ اسی سے تمدنی اور عمرانی احوال و کیفیات کا اندازہ لگا لیجئے۔ جب اور جہاں معاشرہ صحیح اقدار انسانیت کا حامل ہوگا' افراد کی زندگی سکون اور اطمینان سے گزرے گی۔ جب وہ غلط بنیادوں پر متشکل ہوگا' افراد مصیبتیں بھگتیں گے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کیا اور کہا کہ بے گناہ افراد کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ غلط معاشرہ کو صحیح معاشرہ میں تبدیل کیا جائے۔ معاشرہ کو غلط بنیادوں پر قائم رہنے دینا اور افراد کی مصیبتوں پر آنسو بہانا (یا خیر خیرات سے ان کی تکالیف کو دور کرنے یا ان میں کمی کرنے کی کوشش کرنا' حالانکہ اس سے ان کی طبعی تکالیف تو دور ہو سکتی ہیں لیکن ان کے شرف انسانیت کی جس قدر تذلیل

ہوتی ہے' ایک قلب حساس کے نزدیک اس کی تکلیف' طبیعی تکلیف سے کہیں زیادہ اور شدید ہوتی ہے) یا تو کمزوری اعصاب کی دلیل ہے اور یا مفاد پرست گروہ کی فریب کاری کا مظہر جس کا آلہ کار مذہبی پیشوائیت بنتی اور مظلوموں کو غلط عقائد کی افیون پلا کر سلائے رکھتی ہے۔ ان مصیبتوں کا صحیح علاج غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ کی تشکیل کے سوا کچھ نہیں۔

صحیح معاشرہ کا قیام وہ عمل صالحہ ہے جس کا خوش گوار اور حیات بخش ثمرہ تمام (موجودہ اور آنے والی نسلوں تک کے) افراد معاشرہ کو ملتا ہے اور غلط معاشرہ کو قائم کرنا یا اس کے قائم رکھنے میں ممد معاون بننا (خواہ یہ معاونت بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ) وہ جرم ہے جس کی پاداش میں افراد معاشرہ اس قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے اور دکھ جھیلتے ہیں۔ غلط معاشرہ کو بدلنے والے افراد بھی اپنی ان کوششوں میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں' لیکن اس سے ان کی ذات کی ایسی نشوونما ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں طبیعی تکالیف اور مصائب ہیچ ہو جاتے ہیں۔ (مئی ۱۹۶۶ء)

۵۔ بے وقت کی بارشوں سے کسان تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟

ایک خط : "میں یہ خط گاؤں سے لکھ رہا ہوں۔ کسانوں نے رات دن ایک کر کے چھ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد گیہوں کی فصل تیار کی۔ فصل پکی' کسانوں کے گھروں میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں کہ اب چند دنوں کے بعد ان کی کوٹھیاں اناج سے بھر جائیں گی۔ وہ سال بھر کا قرضہ چکائیں گے۔ آئندہ سال کے لئے روٹی کی فکر سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ کئی رکے ہوئے کام کاج کریں گے۔ انہی جذبات کو سینوں میں لئے ہوئے کسانوں نے گیہوں کاٹی۔ دھوپ کڑاکے کی تھی۔ انہیں اس کی ضرورت تھی۔ چٹیل میدانوں میں گیہوں گاہنے کے لئے ڈال دی۔ سارا سارا دن اس چلچلاتی دھوپ میں انہوں نے اور ان کے بے زبان مویشیوں نے لہو پسینہ ایک کر کے اسے گاہا۔ اب اسے اڑا کر دانہ اور بھوسہ الگ کرنا باقی تھا کہ رات اچانک کالی گھٹا اٹھی۔ آدھی رات سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے پکی پکائی فصل پانی کی نذر ہو گئی۔ کسان حسرت بھری نگاہوں سے اپنی اجڑتی ہوئی دنیا کو دیکھ رہے تھے اور کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کی بے بسی اور بے کسی قابل رحم ہے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ میاں کا کیا بگاڑا تھا جو اس نے انہیں اس طرح تباہ کر دیا۔ مولوی صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ سب تمہارے گناہوں کی سزا ہے۔ اللہ میاں کسی پر ظلم زیادتی نہیں کیا کرتے۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ گنہگار تو ہم سے بھی بڑھ کر کئی ہیں۔ ان کا تو بال تک بیکا نہیں ہوتا۔ گناہوں کا وبال ہم پر ہی کیوں پڑ رہا ہے جو کئی سالوں سے ہمارے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے؟--- فرمایئے میں انہیں کیا جواب دوں؟

طلوع اسلام

کسانوں کی بے بسی' آپ کی حیرت' اور ملا کی جہالت' سب اپنے مقام پر ٹھیک ہے۔ بادل' ہوائیں' دھوپ' سردی' گرمی' وہ "ملا کہ" ہیں جن کے متعلق ہمیں کہا گیا ہے کہ وہ "آدم" (یعنی آدمی) کے سامنے سجدہ ریز ہوں

گے۔ جب "ابن آدم" (یعنی زمانہ قدیم کا انسان) ہنوز مقام آدم تک نہیں پہنچا تھا وہ ان ملا کہ کو اپنے سامنے جھکا نہیں سکا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا' کانپتا تھا۔ جوں جوں وہ "آدم" بنتا گیا فطرت کی قوتیں اس کے تابع تسخیر ہوتی چلی گئیں۔ ہماری بے بسی کی وجہ یہ ہے کہ ہم مقام آدم تک نہیں پہنچ سکے۔

ہمارے ہاں فصلوں کے بونے اور کاٹنے کا پروگرام نہ معلوم کتنے ہزار سال پہلے متعین ہوا تھا۔ یہ مقرر ہوا تھا اس زمانے کے موسموں کے مطابق۔۔۔ اب موسموں میں تغیر آچکا ہے لیکن ہمارے ہاں فصلوں کا پروگرام ابھی تک وہی چلا آرہا ہے۔ یہ فریضہ قوم کے ارباب فکر و دانش کا تھا کہ وہ ان موسمی تغیرات کا جائزہ لے کر فصلوں کے لئے ایک نیا پروگرام مرتب کرتے اور کسانوں کو اس کے مطابق ہدایت کرتے' لیکن انہوں نے یہ نہ کیا۔

زندہ قوموں نے یہ بھی کیا اور اس کے ساتھ ہی ایسی ایسی مشینیں بھی ایجاد کرلیں جن سے ہفتوں کے کام گھنٹوں میں سرانجام پا جائیں۔ مثلاً" انہوں نے (HARVESTER) تیار کر لئے ہیں۔ ایک مشین پورے گاؤں کی کھڑی فصل کو کاٹ کر۔۔۔ گاہ کر۔۔۔ دانہ کو بھوسے سے الگ کر کے۔۔۔ بوریاں بھر کر تیار کر دیتی ہے اور یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ وہاں پورے گاؤں کی کاشت کو اپریٹو طریق سے ہوتی ہے۔ اس لئے ایک مشین' ایک دن میں سب کچھ کر کے اگلے دن دوسرے گاؤں پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح نہ کسانوں کی حسرت بھری نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف تکتی ہیں نہ انہیں خدا کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ نہ ملا کو یہ فریب انگیز افیون پلانی پڑتی ہے کہ یہ سب تمہارے گناہوں کی سزا ہے اور نہ ہی آپ جیسوں کو کسی معقول جواب کی تلاش میں مارے مارے پھرنا پڑتا ہے۔

یہاں' نہ یہ ہوا' نہ وہ۔۔۔ اب ان کسانوں کو کون بتائے کہ انہیں کس کے گناہوں کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے؟

ایک بتانیوالے نے البتہ اتنا بتایا تھا کہ ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازو لعل ناب
از جفائے وہ خدایاں کشت دہقاناں خراب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب! (زبور عجم)

سو ہم نے اسے شاعر کا خواب کہہ کر ان سنی کر دیا۔

(جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ کیا ہر ایک کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے؟

سورہ ہود کی ایک آیت ہے۔ **وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** (۱۱/۶) "اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو"۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ۳؎ نے اس آیت

۳؎ جو اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

جلیلہ کی تفسیر بیان فرمائی ہے جو ہفت روزہ شہاب (لاہور) کی ۱۹ ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ پہلے فرماتے ہیں:

انسان کے رزق کی کفالت حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف انسان کی بلکہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی۔ وہ جہاں کہیں رہتا ہے یا چلا جاتا ہے اس کی روزی اس کے پاس پہنچتی ہے۔ تو کفار کے یہ ارادے کہ اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ سے چھپالیں' جہالت اور بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں۔

پھر اس کے عموم میں جنگل کے تمام درندے' پرندے اور حشرات الارض' دریا اور خشکی کے سب جانور داخل ہیں۔ اس عموم کی تاکید کے لئے لفظ "من" کا اضافہ کر کے "وما من دابتہ" فرمایا۔ دابتہ ہر اس جانور کو کہتے ہیں' جو زمین پر چلے۔ پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں زمین پر ہی ہوتا ہے۔ دریائی جانوروں کا بھی تعلق زمین سے ہونا کچھ مخفی نہیں۔ اب سب جانداروں کے رزق کی ذمہ واری حق تعالیٰ نے ذمہ لے کر ایسے الفاظ سے اس کو بیان کیا ہے جیسے کوئی فریضہ کسی کے ذمہ ہو۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری حق تعالیٰ پر ڈالنے والی کوئی اور طاقت نہیں بجز اس کے کہ اس نے اپنے فضل سے یہ وعدہ فرمالیا۔ مگر وعدہ ایک صادق کریم کا ہے جس میں خلاف ورزی کا کوئی امکان نہیں۔ اسی یقین کو ظاہر کرنے کے لئے اس جگہ لفظ علیٰ لایا گیا ہے جو فرائض کے بیان کے لئے مستعمل ہوتا ہے"۔

اس دعویٰ کے ثبوت میں (کہ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوتی ہے) انہوں نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے۔

ایک عجیب جانور: "بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کی بجائے تجلیات الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس کا کون متکفل ہوگا۔ اس خیال کی اصلاح کے لئے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں۔ انہوں نے تعمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا۔ حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں۔ ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا۔ اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا جس کے منہ میں ہرا پتہ تھا۔ آج بھی پہاڑوں کی چٹانوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ان میں سے جانور (جاندار کیڑے) نکلتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین تو کوئی نہ ہوتا' مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہو گئے۔ زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے' وہاں جا رہا ہوں"

اس کے بعد مفتی صاحب کے دل میں وہ خیال پیدا ہوا جو ہر اس شخص کے دل میں ابھرتا ہے جو دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہزاروں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں:

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے' تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مرجاتے ہیں"۔

سوال بڑا اہم ہے اور اس کا جواب سننے کے لئے یقیناً" آپ مضطرب و بے قرار ہوں گے۔ لیجئے جواب حاضر ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔ ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہو جاتی۔ جب یہ عمر پوری ہو گی تو اس کو بہرحال مرنا اور اس جہاں سے گزرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں۔ کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا رزق بند کر دیا گیا' اس سے موت واقع ہو گئی"

سورہ ہود کی اس آیت کی یہ تفسیر مفتی محمد شفیع صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ اس آیت کے متعلق ایک صاحب نے مودودی صاحب سے بھی دریافت کیا اور اپنے سوال میں لکھا کہ

"مجھے جو بات کھٹک رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب رزق کا ذمہ دار اللہ ہے تو بنگال کے قحط میں جو تیس ہزار آدمی ۴۴-۱۹۴۳ء میں مر گئے تھے' ان کی موت کا کون ذمہ دار تھا؟

(ترجمان القرآن' جنوری ۱۹۶۶ء)

اب اس سوال کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر جتنی مخلوقات ہیں ان سب کے رزق کا سامان خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ سامان اگر خدا پیدا نہ کرتا تو کون چھوٹے چھوٹے کیڑوں اور بھنگوں سے لے کر نوع انسانی تک' اس بے حد و بے حساب مخلوق کے لئے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق رزق فراہم کر سکتا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ مخلوقات میں سے کچھ افراد کبھی رزق نہ ملنے کی وجہ سے بھی مرجاتے ہیں تو اس سے آخر یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رزاق ہونے کا انکار کر دیا جائے؟ اول تو آپ ذرا یہ اندازہ کریں کہ مخلوقات میں سے کتنے فی کروڑ' بلکہ کتنے فی ارب ایسے ہیں جو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مرجاتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جس طرح خدا نے اپنی

مخلوقات کے لئے زندگی کا بے حدو حساب سامان فراہم کیا ہے اسی طرح اس نے ان کے مرنے کے لئے بھی تو بے شمار اسباب پیدا کئے ہیں۔ روزانہ لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ مرنے والے ایک ہی طرح نہیں مرتے بلکہ بے شمار مختلف صورتوں سے مرتے ہیں اور موت کی ان بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت رزق نہ ملنا بھی ہے۔ جب موت کا وقت مقرر آپہنچتا ہے تو اس وقت رزق کی موجودگی بھی کسی متنفس کو موت سے نہیں بچا سکتی۔ صرف رزق ہی نہیں بلکہ زندگی اور موت کا سامان بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے **علی اللہ رزقھا** کے ساتھ **یعلم مستقرھا وستودعھا** بھی فرمایا گیا۔

---------- ☆ ----------

طلوع اسلام

مفتی صاحب کی بیان کردہ تفسیر اور مودودی صاحب کے جواب کا ملخص قریب قریب ایک ہی ہے' یعنی ان حضرات کا ارشاد یہ ہے کہ ہر فرد کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ اری خدا نے خود لے رکھی ہے۔ لیکن جب کوئی شخص رزق نہ ملنے کی وجہ سے مرجاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خدا نے اس کی موت ہی ایسے لکھی تھی۔ بالاخر موت کا اختیار بھی تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے! اب اگر اس قسم کے دلائل باہرہ کے بعد بھی کوئی شخص اسلام کا گرویدہ نہ ہو تو اس کی سیاہ بختی کا کیا علاج؟

لیکن اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ صاحب ! یہ فرمایئے کہ ایک مزدور صبح سے شام تک مزدوری کی تلاش میں مارے مارے پھرتا ہے۔ اسے کہیں مزدوری نہیں ملتی اور وہ شام کو خالی ہاتھ گھر واپس آجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اور اس کے بیوی بچے بھوکے سو جاتے ہیں یا اگر اس کو مزدوری ملتی ہے تو اتنی کہ اس سے ان سب کا پیٹ نہیں بھرتا تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس مزدور کے افراد خاندان کو موت تو نہیں آتی لیکن یہ رزق نہ ملنے یا کم ملنے کی وجہ سے سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ تو کیا یہی ہے خدا کی وہ ذمہ داری جس کا اعلان اس نے ایسے واضح الفاظ میں کیا ہے؟ اگر کوئی شخص کسی خاندان کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور اس کے بعد انہیں اس طرح کھانے کو دے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کماحقہ پورا کر رہا ہے؟ اقوام متحدہ کے غذائی شعبہ کی رپورٹ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کی قریب آدھی آبادی ایسی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ کیا مخلوق کے رزق کی ذمہ واری پوری کرنا اسی کو کہتے ہیں؟

یہ تو ہے ان حضرات کی ذہنی سطح جو اس قسم کے جوابات سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی حقانیت اور قرآن کی افضلیت کو دلائل و براہین کی رو سے ثابت کر دیا ہے اور پھر اس پر (یہ اور ان کے عقیدت مند) پھولے نہیں

سماتے---- کہ ہم نے کتنا بڑا کارنمایاں کر دکھایا ہے-

---- اب دیکھئے قرآن کریم کے متعلق ان کا مبلغ علم ! قرآن کریم لوگوں سے بار بار کہتا ہے کہ تم غریبوں اور مسکینوں کو رزق بہم پہنچانے کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ جو شخص **یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین** (۱۰۷/۲-۳) یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مساکین کو رزق بہم پہنچانے کے لئے دوسروں کو رغبت نہیں دلاتا---- وہ تکذیب دین کرتا ہے خواہ وہ دکھاوے کی کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھے- سوال یہ ہے کہ اگر رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے تو وہ لوگوں سے کیوں کہتا ہے کہ تم بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرو اور جو ایسا نہیں کرتے انہیں مستحق عذاب قرار دیتا ہے؟

یہ خیال کہ خدا خود ہر ایک کو رزق پہنچاتا ہے' انہی حضرات کا پیدا کردہ نہیں- قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ کن لوگوں کا پیدا کردہ ہے؟ سورہ یٰسین میں ہے **واذا قیل لھم انفقو مما رزقکم اللہ** جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق خدا نے تمہیں دیا ہے اس میں سے محتاجوں اور مسکینوں کے لئے کھلا رکھو یعنی ان کے لئے بھی دو **قال الذین کفروا للذین امنوا انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ** تو کفار' اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ ہم ایسے لوگوں کے رزق کا انتظام کیوں کریں کہ اگر خدا چاہتا تو ان کے رزق کا انتظام خود کر دیتا- اس کے جواب میں خدا کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ **ان انتم الا فی ضلال مبین** (۳۶/۴۷) تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو--- یعنی قرآن کریم کی رو سے اس قسم کا عقیدہ---- کہ خدا براہ راست رزق پہنچاتا ہے---- کفار کا پیدا کردہ اور کھلی ہوئی گمراہی ہے- قرآن کی تعلیم کے خلاف' مسلمانوں میں یہ عقیدہ اس وقت آیا جب قرآنی نظام کی جگہ نظام سرمایہ داری نے لے لی اور اس کی حمایت' مذہبی پیشوائیت نے اس قسم کے عقائد پھیلا کر کی کہ--- رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے- وہ جسے چاہے "بلا حدو نہایت" دولت دیدے' جسے چاہے مفلس اور غریب رکھے- اگر کسی کو رزق نہیں ملتا تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کی مشیت ہی ایسی ہے- اگر مخلوق بھوکی مرتی ہے تو اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں- خدا نے ان کا رزق ختم کر دیا ہے وغیرہ وغیرہ- اور یہی ہیں وہ عقائد جو ان حضرات کی طرف سے اسلام کے نام سے پھیلائے جاتے ہیں-

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ :-

(۱) رزق کے ذخائر خدا نے بلا مزد و معاوضہ' نوع انسان کی پرورش کے لئے عطا کر دیئے ہیں-

(۲) ان ذخائر سے رزق نکالنا انسانوں کی سعی و کاوش پر منحصر ہے- جو قوم صحیح خطوط پر (خدا کے قوانین طبیعی کے مطابق) محنت اور کوشش کرتی ہے اسے باافراط رزق ملتا ہے- جو ایسا نہیں کرتی اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے--- اور

(۳) اس طرح پیدا کردہ رزق کی تقسیم' انسانوں کے اجتماعی نظام کی رو سے ہوتی ہے- جس نظام میں رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق رزق ملتا جائے' وہ نظام' مشیت خداوندی کے مطابق ہے کیونکہ اس میں "خدا کی ذمہ داری" پوری ہوتی چلی جاتی

ہے- جس نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے---- یعنی جس میں بعض لوگوں کے پاس دولت کے انبار کے انبار جمع ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا---- وہ نظام مشیت خداوندی کے مطابق نہیں- اس میں "خدا کی ذمہ داریاں" پوری نہیں ہوتیں--- یاد رکھیے ! انسانی دنیامیں خدا کی ذمہ داری' انسانی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے- یہ وجہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ "جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھالیتا ہے" اور خدا کی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا ہی احساس تھا جس کے لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مرگیا تو خدا کی قسم! عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی"-

اگر حضرت عمرؓ بھی اس اسلام کے حامل ہوتے جو اس وقت ان حضرات کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے' تو وہ دجلہ کے کنارے' بھوک سے مرجانے والے کتے کے متعلق نہایت آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ جب تک وہ کتا زندہ رہا' خدا اسے رزق دیتا رہا- جب اس کی موت آگئی' خدا نے اس کا رزق بند کر دیا- اس کی بھوک کا مجھ سے کیا تعلق جو اس کی بازپرس مجھ سے ہو؟ اور یہی تھا (حضور نبی اکرمؐ کا پیش کردہ) وہ اسلام جسے دیکھ کر قریش کے نظام سرمایہ داری کے نمائندہ ابوجہل نے اپنے "خداؤں" کے حضور فریاد کرتے ہوئے (اقبال کے الفاظ میں) کہا تھا کہ

ایں مساوات' ایں مواخات اعجمی است
خوب میدانم کہ سلمانؓ مزد کی است

اور یہی کچھ آج بھی کہا جاتا ہے لیکن کہا جاتا ہے خود اسلام کا نام لے کر- مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کردہ اسلام ہمارے دور ملوکیت یا سرمایہ داری کا اسلام ہے- اسی کو عجمی اسلام کہہ کر پکارا جاتا ہے-

(فروری ۱۹۶۶ء)

۷- اکتساب رزق کی صلاحیتوں میں فرق

(تقدیر- من یشاء- سخریا- کا صحیح مفہوم)

استفسار: "جناب بادشاہ گل بخاری نے ایک کتاب "حجیت حدیث" کے نام سے تصنیف کی ہے- اس میں وہ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ نبوت اور رسالت کی طرح رزق بھی وہبی طور سے ملتا ہے اور یہ کسبی چیز نہیں--- "رسول اور امیر میں فرق" کے زیر عنوان یہ عبارت درج ہے-

"غرض رسالت کا معاملہ رزق کی طرح صرف خدا کی تقسیم پر موقوف ہے- اھم یقسمون رحمت ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم یعنی نبوت اور رسالت' رزق

کی طرح ربوبیت کا حق ہے۔ جب رزق کی تقسیم اس نے کسی کے حوالے نہیں کی'
اپنے ذمہ رکھی ہے' تو نبوت کی تقسیم بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے"

" مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس آیت کا اگلا ٹکڑا **فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضا سخریا** بھی اس کے ساتھ جوڑ کر یہ استدلال عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ "خدا نے ازلی اور قدرتی طور سے بعض لوگوں کو بعض پر رزق میں فوقیت دی ہے اور یہ فوقیت اس لئے دی ہے تاکہ بعض بعض کو پکڑیں اور زبردستی پکڑ کر مسخر کریں۔ لفظ " سخریا" اس پر دال ہے۔"

"اگر اس آیت کو زیر بحث لا کر اس پر تفصیلی گفتگو ہو جائے تو بہت سارے لوگوں کے شکوک رفع ہو جائیں گے۔"

جواب :۔ جناب بادشاہ گل بخاری صاحب سے ہمارا تعارف نہیں لیکن فہم قرآن کریم کے سلسلے میں انہوں نے جس تاسف انگیز ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے' اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ انہی مکتبوں کے دستار فضیلت یافتہ ہیں جن کے نصاب میں قرآن شامل نہیں ہوتا۔ ہم نفس مضمون کی طرف تو بعد میں آئیں گے' پہلے یہ عرض کر دیں کہ ان صاحب نے وہبی ہونے کے اعتبار سے نبوت کو جو رزق کا ہم پلہ قرار دیا ہے تو اس سے انہوں نے نبوت جیسے عظیم اختصاص کو جس پست سطح پر لا کر کھڑا کر دیا ہے' اس سے ہمیں افسوس ہی نہیں' بے حد قلق ہوا ہے۔ ان صاحب کا کہنا یہ ہے کہ رزق ای طرح سے وہبی طور پر ملتا ہے جس طرح نبوت وہبی طور پر ملتی ہے (یعنی ملتی تھی)۔ اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی رو سے حصول رزق کی کیفیت کیا ہے۔

(۱) سورہ شوریٰ میں ہے **من کان یرید حرث الدنیا نوتہ منھا** (۴۲/۲۰) "جو شخص دنیا کی کھیتی لینے کا ارادہ کرتا ہے' ہم اسے وہ دے دیتے ہیں۔" اس سے ظاہر ہے کہ متاع دنیا (جس میں لا محالہ رزق سب سے پہلے آئے گا) حاصل کرنے کے لئے انسان کا اپنا ارادہ شرط ہے یعنی رزق اسے ملے گا جو رزق لینے کا ارادہ کرے گا۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں بخاری صاحب سے کہ کیا نبوت حاصل کرنے کے لئے بھی یہی شرط ہوتی ہے یعنی نبوت اسے ملتی تھی جو نبوت لینے کا ارادہ کرتا تھا۔

(۲) سورہ جمعہ میں ہے۔

فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ .....(۶۲/۱۰)

(ابتغاء فضل اللہ کی آیتیں قرآن میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔

مولانا محمود الحسنؒ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

پھر جب تمام ہو چکے نماز تو پھیل پڑو زمین میں اور ڈھونڈو فضل اللہ کا"

اور اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

حضرت شاہ صاحبؒ (شاہ عبدالقادرؒ) لکھتے ہیں' "یہود کے ہاں عبادت کا دن ہفتہ تھا۔

سارا دن سودا منع تھا۔ اس لئے فرما دیا کہ تم نماز کے بعد روزی تلاش کرو اور روزی کی تلاش میں اللہ کی یاد نہ بھولو۔

یعنی "**ابتغاء فضل من اللہ**" کے معنی "روزی کی تلاش کرنا" ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ تم ..... رزق کو تلاش کرو ------ رزق اسی کو ملے گا جو اسے تلاش کرے گا۔ تلاش کے بغیر رزق نہیں مل سکے گا یعنی رزق سراسر اکتسابی شے ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا نبوت کے لئے بھی تلاش شرط تھی؟ اور جو چیز تلاش کے بعد حاصل ہو' کیا اسے وہبی کہا جائے گا؟ نبی (اور خود نبی اکرمؐ) کے متعلق تو خدا نے یہ کہا ہے کہ **وما کنت تدری ماالکتاب ولا الایمان** (۵۲/۴۲) تو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔"

(۳) انفاق رزق کے متعلق قرآن کریم میں بے شمار آیات آئی ہیں۔ سورہ بقرہ کے شروع میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ---- **ومما رزقنھم ینفقون** (۲/۳) "جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں" یعنی اس میں سے دوسروں کو بھی دیتے ہیں۔ بعض آیات میں انفاق کا حکم بھی آیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی نبی سے بھی ایسا کہا گیا ہے کہ جو نبوت ہم نے تمہیں دی ہے اس کا کچھ حصہ دوسروں کو بھی دیا کرو؟ اور جو چیز کسی انسان کو کسی دوسرے انسان سے ملے کیا اسے وہبی کہا جائے گا؟ "وہبی" تو وہ شے ہوگی جو کسی انسان کو' بلاکسب و ہنر اور بلاسعی و کاوش' براہ راست خدا کی طرف سے ملے۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ رزق کے اس قسم کے وہبی ہونے کا عقیدہ کفار کا تھا جس کی تردید خدا نے کی۔ سورۃ یٰسین میں ہے کہ **واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ قال الذین کفروا للذین امنوا** جب ان کفار سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمہیں دیا ہے اس میں سے دوسرے (ضرورت مندوں) کو بھی دیا کرو' تو یہ لوگ' جماعت مومنین سے کہتے ہیں----- **انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ** کیا ہم اسے کھانے کو دیں جسے اگر اللہ چاہتا تو خود کھانے کو دے دیتا۔ اس کے جواب میں کہا کہ (اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ)------ **ان انتم الا فی ضلال مبین** (۳۶/۴۷) "تم بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔"

غور فرمایئے کہ جو عقیدہ کفار کا ہے اور جسے قرآن کھلی ہوئی گمراہی قرار دیتا ہے' یہ حضرات اسے (معاذ اللہ معاذ اللہ) ہم پلہ نبوت ٹھہرا رہے ہیں۔ کیا قرآن سے بے گانگی کا اس سے بڑا ثبوت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے؟

ہم پھر دہرا دیں کہ ان صاحب نے کہا یہ ہے کہ رزق اسی طرح وہبی ہے جس طرح نبوت' اور رزق کے متعلق بھی ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کی رو سے' اسے حاصل کرنے کے لئے پہلے ارادہ شرط ہے اور پھر تلاش۔ جو شخص بھی رزق حاصل کرنے کا ارادہ کرے اور پھر حصول رزق کے لئے سعی و کاوش' اسے رزق مل جاتا ہے۔ اب اگر اس کے بعد' کوئی قادیانی صاحب یہ کہیں کہ میرزا صاحب نے بھی تو حصول نبوت کے لئے یہی کچھ کیا ہے تو فرمایئے کہ بادشاہ گل بخاری صاحب اس کا کیا جواب دیں گے؟

یہ ہے ان حضرات کا مبلغ علم قرآن کے متعلق اور یہ ہے ان کی پیش کردہ دلیل کی حقیقت!

------ ☆☆ ------

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہے بے حد و حساب دولت عطا کردے' جسے چاہے محتاج اور مفلس بنا دے۔ لہٰذا' کوئی ایسی تدبیر' ایسا نظام' جس سے محتاجوں کی محتاجی دور ہوتی ہو اور وہ ناداری سے صاحب رزق بن جائیں' خدا کی مشیت کے خلاف ہے' اس لئے خلاف اسلام۔ کسی غریب کو اپنی غریبی دور کرنے کی قطعاً" کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ایسا چاہنا اور ایسا کرنا' خدا سے برسر پیکار ہونے کے مترادف ہوگا اور اس کی دلیل (بقول ان کے) یہ ہے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ **نحن قسمنا بینہم معیشتہم** (۴۳/۳۲) ان کا رزق' ان میں ہم تقسیم کرتے ہیں۔

اس قسم کے الفاظ کہ "ہم رزق کی تقسیم کرتے ہیں یا" **واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب** (۲/۲۱۲) یا **اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر** (۱۳/۲۶) وغیرہ' صرف رزق کے متعلق ہی نہیں آئے' بہت سے اور امور کے متعلق بھی آئے ہیں۔ مثلاً" دین کی بنیاد ہدایت پر ہے اور ضلالت (گمراہی) جہنم کی طرف لے جانے والی راہ ہے۔ قرآن کی اساسی تعلیم کے مطابق اس کا تعلق انسان کے اپنے اختیار و ارادہ اور عمل سے ہے۔ **قل الحق من ربکم ف فمن شاء فلیومن و من شاء فلیکفرلا** (۱۸/۲۹) "ان سے کہہ دو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔" یہ اور اس قسم کے دیگر ارشادات باری تعالیٰ اس بنیادی حقیقت پر شاہد ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں قرآن کریم میں اس قسم کی آیات بھی ملتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ **فیضل اللہ من یشاء ویھدی من یشاء** (۱۴/۴) یا **ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد** (۳۹/۲۳)۔ اگر ان آیات کے یہ معنی لئے جائیں کہ ہدایت اور گمراہی کے معاملہ میں انسان کے اختیار و ارادہ کو کوئی دخل نہیں' نہ ہی اس سے اس کی سعی و کاوش کا کوئی تعلق ہے۔ جسے خدا چاہے ہدایت دیدے اور جسے چاہے گمراہ کردے اور جسے وہ گمراہ کردے وہ پھر کسی طرح بھی راہ راست پر نہیں آسکتا' تو (اس مفہوم کے مطابق) خدا کا متعین کردہ سارا نظام رشد و ہدایت' جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔ خدا نے انسانوں کو اختیار و ارادہ دیا' پھر اپنی طرف سے انبیاء کرامؑ بھیجے --- ہر بستی میں رسول --- ہر قریہ میں نبی ----- ہر زمانہ میں پیغامبر---- ان کے ساتھ خدا کی کتاب۔ کتاب کی طرف دعوت دینے والا خود رسول اور اس کی جماعت' ہدایت قبول کرنے والوں کے لئے بشارات' اس سے روگردانی کرنے والوں کے لئے عذاب۔ "من یشاء" کے اس مفہوم کی رو سے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' یہ سارا سلسلہ رشد و ہدایت (معاذ اللہ) بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ یہ عقیدہ (کہ خدا جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے' انسان کے اختیار و ارادہ کا اس میں کوئی دخل نہیں) مشرکین کا ہے اور مبنی بر جہالت۔ سورہ الانعام میں ہے **سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اباء نا ولا حرمنا من شیء** "مشرکین کہیں گے (یا کہتے ہیں) کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہی ہمارے آباء و اجداد اور نہ

ہی ہم (خدا کی حلال کردہ چیزوں کو) حرام قرار دیتے۔" اس کے بعد کہا **کذالک کذب الذین من قبلھم** اس طرح حقیقت سے انکار اور صداقت کی تکذیب کچھ انہی کا شیوہ نہیں۔ ان سے پہلے بھی لوگ' اپنی غلط روش کے جواز میں اس قسم کی باتیں کیا کرتے اور اس طرح صداقت کو جھٹلایا کرتے تھے۔ **حتی ذاقوا باسنا** لیکن ان کے ایسا کہنے سے خدا کے قانون مکافات عمل میں کچھ فرق نہیں آجاتا تھا۔ ان کی غلط روش کا نتیجہ ان کے سامنے آجاتا تھا۔ خدا کا عذاب ان پر مسلط ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد فرمایا **قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا** ان سے پوچھو کہ کیا تمہارے پاس (اس عقیدہ جبر کی تائید میں) کوئی علمی دلیل بھی ہے؟ اگر ہے تو اسے پیش کرو۔ اور اس کے بعد خود ہی کہہ دیا کہ **ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون** (۶/۱۴۹) ان کے پاس کوئی علمی دلیل نہیں ہو سکتی۔ یہ محض اپنے ظن و قیاس کے پیچھے چلتے ہیں اور یونہی اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں۔

ہم اس باب میں قرآن کریم کی اور بھی کئی آیات پیش کر سکتے ہیں' لیکن اس موضوع کا تعلق درحقیقت مسئلہ تقدیر سے ہے اور وہ بڑی تفصیل چاہتا ہے' اس لئے ہم اس کے بعد صرف ایک اور آیت سامنے لانا چاہتے ہیں جو ہمارے نزدیک سردست اکتفا کرے گی۔ سورہ النحل میں ہے **ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء** "اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا لیکن خدا جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔"

آیت کے اتنے ٹکڑے اور اس کے مروجہ ترجمہ اور مفہوم کی رو سے مترشح ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کا اس میں کوئی اختیار نہیں۔ اور جب انسان کا اس میں کوئی اختیار ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ نہ ہدایت پر چلنے والے کسی جزا کے مستحق ہو سکتے ہیں' نہ ضلالت پر گامزن کسی عذاب کے مورد۔ ان پر کسی قسم کی ذمہ واری ہی عائد نہیں ہو سکتی۔ لیکن آیت کا اگلا حصہ یہ ہے **ولتسئلن عما کنتم تعملون** (۱۶/۹۳) اور یقیناً" تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کس قسم کے کام کئے تھے۔" آیت کا یہ حصہ سورج کی طرح اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ " **یضل من یشاء ویھدی من یشاء** " کا قطعاً" یہ مفہوم نہیں ہو سکتا کہ ہدایت اور گمراہی کے معاملہ میں انسان کے اختیار و ارادہ اور سعی و عمل کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے جسے چاہے گمراہ کر دے۔

ان حقائق سے واضح ہے کہ اس قسم کے معاملات کے متعلق جہاں قرآن کریم میں "**قسمنا**" یا "**من یشاء**" وغیرہ الفاظ آئے ہیں' ان سے قطعاً" یہ مراد نہیں کہ ان چیزوں کے حصول میں انسان کی سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں۔ خدا جسے چاہے عطا کر دے' جسے چاہے ان سے محروم رکھے۔" "جسے چاہے عطا کر دے" کی استثناء صرف نبوت کے لئے ہے کیونکہ اس کے متعلق یہ بتا دیا گیا ہے کہ جسے منصب نبوت سے سرفراز کیا جاتا تھا اسے اس سے ایک ثانیہ پہلے تک اس کا علم تک نہیں ہوتا تھا کہ "کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔" نبوت کے علاوہ دیگر معاملات کے متعلق' "من یشاء" کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کے حصول کے لئے خدا نے اپنی مشیت سے قاعدے اور قانون مقرر کر دیئے

ہیں۔ جو ان قواعد و قوانین کے مطابق عمل کرے گا' اسے وہ چیز مل جائے گی۔ جو ان سے اعراض برتے گا' وہ اس سے محروم رہ جائے گا۔ چنانچہ رزق کی بست و کشاد کے متعلق فرمایا کہ **ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیمۃ اعمی** (۲۰/۱۲۴) اور جو شخص ہمارے "ذکر" سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت (روزی) تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ یہاں سے واضح ہے کہ رزق کی تنگی نتیجہ ہوتی ہے احکام الہیہ سے اعراض برتنے کا۔ اس کی تفسیر سورہ الفجر میں ان الفاظ میں کر دی ہے کہ **واما اذا ما ابتلہ فقدر علیہ رزقہ** جب ہم انسان کو دوسری طرح کی گردش دیتے ہیں سو اس سے اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے۔ **فیقول ربی اھانن** تو وہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے (یونہی) ذلیل کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ (**کلا**۔۔۔۔۔۔ ایسا مت کہو۔ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کیا کرتا۔ اس کا دستور یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے رزق کشادہ کر دیا جس کا جی چاہے تنگ کر دیا۔ اس کے ہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے اور ان کے مطابق انسان کے اعمال کا نتیجہ برآمد ہوتا رہتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خدا نے یونہی تمہارا رزق تنگ کر دیا۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ **بل لا تکرمون الیتیم ۙ ولا تحضون علی طعام المسکین ۙ وتاکلون التراث اکلا لما وتحبون المال حبا جما** (۸۹/۱۶-۲۰) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کو اس کی تاکید نہیں کرتے تھے کہ محتاجوں کی روٹی کا انتظام کیا جائے۔ تم وراثت کے مال کو سارے کا سارا سمیٹ کر کھا جاتے تھے اور دولت کو جی بھر کر پیار کرتے تھے۔ (یہ الفاظ مولانا محمود الحسنؒ کے ہیں) یہ تھا تمہارا نظام معاشرت و معیشت ' جس کی وجہ سے تم پر یہ عذاب آیا ہے۔ سورہ النحل میں اس غلط نظام کو "کفران نعمت" سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ "خدا ایک مثال کے ذریعے بات سمجھاتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے باشندوں کو امن و اطمینان دونوں میسر تھے۔ ان کی طرف چاروں طرف سے رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ **فکفرت بانعم اللہ** انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفران برتا' تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ **بما کانوا یصنعون** (۱۶/۱۱۲) یہ ان کے خود ساختہ باطل نظام معیشت کا نتیجہ تھا۔

اس کے برعکس فرمایا کہ **ولو انھم اقاموا التورتہ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم** اگر یہ اہل کتاب (اپنے اپنے وقت میں) اس نظام پر عمل پیرا ہوتے جو تورات اور انجیل میں دیا گیا تھا اور جسے اب قرآن میں دیا گیا ہے' **لَاَ کَلُوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم** (۵/۶۶) تو ان پر اوپر سے بھی رزق کی بارش ہوتی اور وہ نیچے سے بھی ابل کر باہر آجاتا۔

اب آیئے سورہ زخرف کی اس آیت کی طرف جسے (بقول مستفسر) جناب بادشاہ گل بخاری صاحب نے اپنے خود ساختہ مفروضہ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ استفسار کے الفاظ یہ ہیں۔

پیشوائیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس آیت کا اگلا ٹکڑا۔۔۔ **فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضا سخریا** (۳۲/

۴۳) بھی اس کے ساتھ جوڑ کر یہ استدلال عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ "خدا نے ازلی اور قدرتی طور سے بعض لوگوں کو بعض پر رزق میں فوقیت دی ہے اور یہ فوقیت اس لئے دی ہے تاکہ بعض' بعض کو پکڑیں اور زبردستی پکڑ کر مسخر کریں۔ لفظ سخریا اس پر دال ہے"

اس اقتباس میں جو الفاظ داوین (".....") میں آئے ہیں' ان کے متعلق ہمیں علم نہیں کہ وہ بادشاہ گل بخاری صاحب کے ہیں یا کسی اور کے' لیکن ان کا کہنے والا کوئی بھی ہو' مولوی صاحبان سب اس سے یہی مفہوم لیتے ہیں۔ اس مفہوم سے جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ۔

(۱) خدا خود فیصلہ کرتا ہے کہ زید کو امیر پیدا کیا جائے اور بکر کو غریب۔

(۲) پھر خدا زید کو اجازت دیتا ہے کہ وہ بکر کو زبردستی پکڑ کر مسخر کرے کیونکہ اسے خدا نے پیدا ہی اس مقصد کے لئے کیا ہے۔

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ میں اور اس میں جس کی رو سے ہندو کہتے ہیں کہ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں اور شودر اس کے پاؤں سے اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ برہمن' شودروں سے زبردستی اپنی خدمت لیں' کچھ بھی فرق ہے؟ اس سے بھی آگے بڑھیے۔ غلام کے جواز میں دلیل یہ پیش کی جایا کرتی تھی کہ خدا بعض انسانوں کو آزاد پیدا کرتا ہے اور بعض کو غلام' تاکہ غلام آزاد لوگوں کے لئے بیگار کے کام سرانجام دیں۔ غلاموں کو آزاد لوگوں جیسا مقام دے دنیا ایسا ہی ہے جیسے کسی ٹیڑھے پاؤں کو سیدھا جوتا پہنا دیا جائے۔ وہ اس کے لئے سخت تکلیف دہ ہو گا! ہمارے ہاں اس آیت سے جو مطلب لیا جاتا ہے وہ نتیجہ کے اعتبار سے انسانوں کی پیدائشی تقسیم کو اسی مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ کیا یہی ہے اسلام کی تعلیم اور اسی کا نام ہے تکریم انسانیت اور مساوات آدمیت جس کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے؟

اس آیت میں سخریا کا مفہوم کیا ہے' اس کے متعلق ہم سے نہیں' مکتب دیوبند کے ایک ممتاز عالم مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں سنئے۔ وہ اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" میں پہلے اس آیت کا حسب ذیل ترجمہ لکھتے ہیں:

> ہم نے بانٹ دی ہے الحیوۃ الدنیا (پست زندگی) میں ان کی معیشت کو ان کے درمیان اور اونچا کر دیا ہے ہم نے بعض کو بعض سے مدارج و مراتب کے لحاظ سے (یہ اس لئے کیا گیا ہے) تاکہ انسانوں میں بعض بعضوں سے کام لیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> اس کا مطلب آج ہی نہیں' صدیوں پہلے' مشہور مفسر قرآن' القاضی البیضاوی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے --- "بعض انسانوں میں بعض بعض سے اپنی حاجتوں میں کام

لیں اور اس ذریعہ سے باہم انسانوں میں باہمی الفت پیدا ہوتی ہے اور بعض بعض کے
ساتھ مل گئے ہیں۔ عالم کے نظام کا انتظام اسی پر قائم ہے۔ (ص ۱۵۲)

(قرآن کے الفاظ اور اس عبارت میں "بعض بعض" کے معنی ہوتے ہیں--- "ایک دوسرے سے") آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں۔ انسانی صلاحیتوں میں اختلاف' تقسیم کار کے لئے ہے تاکہ معاشرہ کے تمام امور سرانجام پاتے رہیں۔ یہ ہے عطیا کا مفہوم۔

اب آیئے **"ورفعنا بعضهم على بعض"** کی طرف۔ یہ ظاہر ہے کہ مختلف افراد میں اکتساب رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض کا رجحان نظری اور علمی ہوتا ہے' بعض کا عملی اور میکانکی۔ بعض میں ذہنی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے' بعض میں جسمانی قوت۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ صلاحیتوں کے اختلاف کے عوامل و اسباب کیا ہوتے ہیں۔ ہم اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں **"رفعنا بعضهم فوق بعض درجت"** کے معنی یہ نہیں کہ خدا ہر فرد کی صلاحیتوں کو (اس کی پیدائش سے پہلے ہی) خود متعین کر دیتا ہے اور وہ پھر کچھ ہی کرے' ان میں نہ تبدیلی ہو سکتی ہے نہ ترقی --- یعنی جو بچہ شودر کے گھر میں جنم لیتا ہے وہ جو جی میں آئے کرے' ساری عمر شودر ہی رہتا ہے۔ یہ عقیدہ قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ اس نے تعین مدارج کے متعلق خود ہی کہہ دیا ہے کہ **ولكل درجت مما عملوا۔ وليوفيهم اعمالهم وهم ولا يظلمون**(۴۶/۱۹) ہر ایک کے مدراج' اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں کیونکہ ہر ایک کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوتا۔ **لہٰذا** "رفعنا" (ہم مدارج بلند کرتے ہیں) میں (نا --- ہم) اسی قسم کا ہے جس قسم کا "ہم" --- رزق کے معاملہ میں --- قسمنا میں تھا اور جس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم اپنے مقرر کردہ قاعدے اور قانون کے مطابق ایسا کرتے ہیں" اور خدا کا مقررہ کردہ قانون یہ ہے کہ اختلاف مدارج' اعمال کی نسبت سے ہوتا ہے۔

یہاں تک بات یوں ہوئی کہ افراد میں صلاحیتوں کا اختلاف معاشرہ میں مدارج کے اختلاف کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ معیار یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کام کس قدر اور کس انداز کا کرتا ہے۔ اس کے اسی کام کے اعتبار سے اس کا درجہ متعین ہوگا۔ اگر ایک معمار نہایت دیانت اور امانت سے اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے تو معاشرہ میں اس کا درجہ اس انجینئر سے بلند ہوگا جو کام چور اور بددیانت ہے۔

اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا صلاحیتوں کا اختلاف' امارت اور غربت کا معیار قرار پا سکتا ہے؟ یہ ہے اصل سوال اور نہایت اہم--- دنیا یہی کہتی ہے کہ جو زیادہ کماتا ہے وہ دولتمند ہے' جو کم کماتا ہے وہ غریب ہے۔ لیکن قرآن اس کا جواب کچھ اور دیتا ہے۔ وہ پہلے ان لوگوں کی ذہنیت کو سامنے لاتا ہے جو کہتے ہیں کہ جو زیادہ کماتا ہے وہ اپنی ساری کمائی کا مالک ہے۔ وہ اس میں سے (اگر اس کا جی چاہے تو) دوسروں کو بطور خیرات کچھ دے دے' ورنہ اپنی کمائی کا مالک وہ آپ ہے۔ قرآن اس ذہنیت کو سورہ النحل کی آیت نمبر ۷۱ میں بڑی عمدگی سے بیان کرتا ہے۔ یہ آیت بڑی اہم ہے اور عمیق غوروخوض کی متقاضی۔ ارشاد ہے **والله فضل بعضكم على بعض فى الرزق** خدا کے قانون

مشیت کے مطابق اکتساب رزق کی استعداد مختلف لوگوں میں مختلف ہوتی ہے' بعض میں کم بعض میں زیادہ- **فما الذین فضلوا برادی رزقهم علی ما ملکت ایمانهم** جن لوگوں کو زیادہ استعداد حاصل ہوتی ہے وہ اپنی زائد کمائی کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو ان کے ساتھ ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں- **فهم فیه سواء** وہ اس خیال سے ایسا نہیں کرتے کہ اس طرح تو چھوٹے بڑے سب برابر ہو جائیں گے --- **افبنعمة الله یجحدون** (۱۶/۷۱) ایسا خیال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ یہ زیادہ استعداد خدا کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہے (۱۶/۵۳)- یہ ذہنیت نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ ہے جس کا سب سے بڑا نمائندہ قارون تھا-وہ کہتا تھا کہ **انما اوتیته علی علم عندی**(۲۸/۷۸) جو کچھ میرے پاس ہے یہ سب میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے اور قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فساد کی جڑ ہے (۳۹/۴۹)-

مولانا مناظراحسن گیلانی (مرحوم) اس آیت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

> "رزق برتری چونکہ صفاتی و کمالاتی برتری کا نتیجہ ہوتی ہے' اس لئے اپنے کمالات کی بنیاد پر رزق کا زیادہ حصہ جن لوگوں کے قبضہ میں چلا جاتا ہے وہ اس حصہ کو اپنے کمالات کی قدرتی قیمت سمجھتے ہیں اور اس کا اپنے آپ کو جائز حقدار یقین کرتے ہیں- یہی وجہ ہے کہ ایسا کوئی نہیں ہے جسے اپنے کمالات کی قیمت کی صورت میں زائد حصہ زیردستوں کے اعتبار سے اگر ملا ہو تو یہ خیال کر کے کہ جو کچھ مجھے ملا ہے' میرا نہیں ہے- اپنے زیردستوں کو واپس کر دے یعنی اس حصہ کا اپنے آپ کو حقدار قرار دے کر واپس تو کوئی نہیں کرتا البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اپنا جائز حق قرار دینے کے بعد دوسروں کو وہ عطا کر دے' دیدے- لوگ رد اور عطا میں فرق نہیں کرتے اسلئے طرح طرح کے مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ اگر وہ اس پر غور کریں کہ رد کے معنی واپس کرنے کے ہیں' پس رد اور واپسی تو اس چیز کی ہوتی ہے جس کا آدمی مالک ہی نہیں ہوا- اور عطا یعنی دینے کا مطلب یہ ہے کہ چیز تو میری ہے' میں تمہیں اس کا ہبہ کرتا ہوں- قرآن میں نفی رد کی کی گئی ہے نہ کہ ہبہ اور عطا کی ور ہبہ اور عطا کی نفی کیسے صحیح ہوگی جب کہ رات دن مالداروں کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ اپنا مال دوسروں کو عطا کرتے ہیں' البتہ یہ کوئی نہیں کرتا کہ جو قیمت اپنے کمال یا مہارت کی کسی کو ملی ہو' اسے یہ کہہ کر واپس کر دے کہ اس کا میں حقدار ہی نہیں ہوں' پھر لوں کیسے ؟ (ص ۱۱۱)

قرآن' انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ زیادہ استعداد کے مالک اپنی زائد کمائی کو اپنا حق ہی نہ سمجھیں- ان کا حق سمجھ کر انہیں لوٹا دیں جن کی کم استعداد کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو اور اس طرح ضروریات پوری ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہو جائیں- اسی لئے قرآن کریم نے (زائد کمائی والوں کے متعلق) کہا

ہے کہ **فی اموالھم حق معلوم للسائلین والمحروم** (۲۵-۲۴/۷۰) ان کی دولت میں محتاجوں اور محروموں کا حق ہے اور حق بھی ایسا جو ڈھکا چھپا نہیں' سب کو معلوم ہے۔ اور اس کی حد یہ ہے کہ **یسئلونک ماذا ینفقون - قل العفوا** (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کو دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ اس لئے کہ "زائد کمائی" پر تمہارا حق نہیں۔ حق ان کا ہے جن کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام
اور اس کی ضروریات کے مطابق کفاف

یہ ہے معاشیات کا وہ زریں اصول جسے قرآن نے قائم کیا اور جسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً کر کے دکھایا۔ میدان جنگ میں ہر مجاہد (مومن) اپنی اپنی استعداد کے مطابق خدمات سرانجام دیتا تھا لیکن مال غنیمت کی تقسیم میں حضورؐ کا اصول یہ تھا کہ شادی شدہ کو دگنا حصہ ملتا تھا اور مجرد کو ایک' کیونکہ شادی شدہ کی ضروریات' مجرد سے زیادہ تھیں اور یہی تھا وہ اصول جس کے مطابق حضرت صدیق اکبرؓ نے وظائف کا تعین کیا تھا ---- اصول' خدمات کا معاوضہ نہیں تھا' ضروریات کا تقاضا تھا۔

یہ ہیں وہ اصول جن کے مطابق "خدا اپنے بندوں میں رزق کی تقسیم کرتا ہے۔" آپ نے غور فرمایا کہ بادشاہ گل بخاری اور اسی زمرے کے دیگر حضرات' (لغت ہائے حجازی کے قاروں ہوں تو ہوں لیکن) قرآن فہمی کے معاملہ میں کس قدر کورے ہوتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآن ان کے کسی کام ہی نہیں آتا (بجز ختم پڑھنے یا رمضان شریف میں ختم کرنے کے)۔ اسی لئے یہ ان کے نصاب تک میں داخل نہیں ہوتا۔ ان کا سارا کاروبار فقہ پر چلتا ہے اور فقہ عباسی ملوکیت کے زمانہ میں مرتب ہوئی اور سرمایہ دارانہ ماحول میں پروان چڑھی۔ اس لئے اگر وہ نظام سرمایہ داری کو "خدائی سند" عطا کرنے کیلئے غریبی اور امیری کو خدا کی غیر متبدل ازلی تقسیم نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ قرآنی اقدار و نظام تک پہنچنا ان بے چاروں کے بس کی بات ہی نہیں۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

مکتب و ملا و اسرار کتاب!
کور مادر زاد و نور آفتاب

(دسمبر ۱۹۶۹ء)

۸۔ اس فرق کے نتائج کو کیسے مٹایا جائے

(اجرت کا نظریہ نظام سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے)

سوال : قرآن شریف میں ہے کہ خدا نے مختلف افراد میں اکتساب رزق یعنی کمائی کرنے کی استعداد مختلف رکھی ہے۔ جب صورت یہ ہے تو پھر ایک کے پاس زیادہ دولت ہو سکتی ہے اور دوسرے کے پاس کم۔ اسی کو امیری اور غریبی

کہتے ہیں اور یہ تفاوت کمائی کی استعداد کے فرق کا فطری نتیجہ ہے۔ پھر اس فرق کو مٹایا کیسے جا سکتا ہے۔ جس کے پاس زیادہ دولت ہے اس سے زائد دولت لے کر دوسروں کو دے دینا زبردستی نہیں ہوگی؟ کیا اسلام میں اس کی اجازت ہوگی؟

جواب : ان امور پر غور و فکر کرنے کے سلسلے میں ہماری بنیادی دشواری یہ ہے کہ دنیا میں جو معاشی نظام رائج ہے وہ اس قدر پرانا اور عالمگیر ہو چکا ہے کہ اس نے ایک گونہ مسلمہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور ہم اس سے ہٹ کر سوچنے کے عادی ہی نہیں رہے۔ "کمائی" کا تصور اسی نظام کا پیدا کردہ ہے۔ آیئے ہم پہلے یہ دیکھیں کہ "کمائی" کہتے کسے ہیں؟

ایک مزدور دن بھر کام کرتا ہے اور اسے تین روپے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس' ایک انجینئر کو سو روپیہ یومیہ مل جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہیں گے کہ انجینئر' مزدور کے مقابلہ میں زیادہ کماتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرتا ہے اور کس اصول کے مطابق کرتا ہے کہ مزدور کو تین روپے روز ملنے چاہئیں اور انجینئر کو سو روپیہ یومیہ؟ بادنے تدبر' یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اجرتوں (یا معاوضوں) کا یہ تعین طلب و رسد (SUPPLY AND DEMAND) کے مطابق ہوتا ہے۔ مزدوروں کی تعداد زیادہ ہے اور مانگ کم' اس لئے ان کی "قیمت" بہت کم پڑتی ہے۔ اس کے برعکس' انجینئروں کی تعداد کم ہے اور مانگ زیادہ' اس لئے ان کی "قیمت" زیادہ ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جائے' (یعنی مزدوروں کی تعداد طلب کے مقابلہ میں کم ہو جائے اور انجینئروں کی زیادہ) تو انجینئر کی کمائی تین روپے روز ہو جائے اور مزدور کی سو روپے یومیہ۔ (چنانچہ آجکل ہمارے ہاں انجینئر' ڈاکٹر' وکلاء کی تعداد جس نسبت سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے اسی نسبت سے ان کی "کمائی" کم ہوتی جا رہی ہے) اس سے واضح ہے کہ "کمائی" فی ذاتہ ---- (INTRINSICALLY) کوئی شے نہیں' اسے معاشرہ طلب و رسد کے تناسب سے مقرر کرتا ہے۔ اس لئے "کمانے کی استعداد" کے بجائے اگر کچھ "بنانے" یا پیدا کرنے" کی استعداد کہا جائے تو یہ حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔ زمانہ قدیم میں جو بارٹر سسٹم (BARTER SYSTEM) رائج تھا (جس میں سکوں کے عوض خرید و فروخت کے بجائے اشیائے ضروریہ کا باہمی تبادلہ ہوتا تھا) اس میں "دولت کمانے" کا تصور نہیں تھا' ضروریات پوری کرنے کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس کے بعد' آپ تصور میں لایئے ایسے نظام کو جس میں معاشرہ تمام بچوں کو پرورش' تربیت اور تعلیم کے یکساں مواقع حاصل ہوں (مملکت خود اس کا انتظام کرے)۔ پھر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر "چھلنے" لگا دیئے جائیں جو مختلف بچوں کی ذہنی استعداد اور افتاد طبیعت کی چھان بین کرتے جائیں۔ اس طرح رکنے والے بچے رکتے جائیں' آگے بڑھنے والے آگے بڑھتے جائیں اور معاشرہ کی ضروریات کے مطابق' انہیں مختلف شعبوں کی تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد "معاشرہ" تقسیم کار کے اصول پر مختلف کام' مختلف نوجوانوں کے سپرد کر دے۔ ان کا فریضہ' اپنا اپنا مفوضہ کام' بطریق احسن سرانجام دینا ہو۔ اس کام کے معاوضہ یا اجرت کا سوال سامنے ہی نہ آئے۔ وہ اپنا اپنا کام کریں اور

معاشرہ ان کی ضروریات زندگی پوری کرتا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس نظام کے مطابق معاشرہ کے تمام امور کس خوش اسلوبی اور حسن کاری سے تکمیل تک پہنچ جائیں گے اور وہ تمام خرابیاں کس طرح از خود دور ہو جائیں گی جو موجود نظام معیشت و معاشرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن کریم کا منتہی ایک ایسے نظام کا قیام ہے جس میں "کمانے" کی بجائے "کام کرنے" کا اصول کارفرما ہو۔

بادنیٰ تدبر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر تمام بچوں کو تعلیم و تربیت اور پرورش کے مواقع یکساں حاصل ہوں' تو جن بچوں میں زیادہ استعداد کی نمود ہوگی وہ ان کی اپنی کارگیری کا نتیجہ نہیں ہوگی۔ وہ ان میں بنیادی طور پر موجود ہو گی یا یوں کہیے کہ وہ ایسے عناصر کا نتیجہ ہوگی جن میں ان کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اسے اصطلاح میں "موہبت" (یعنی خدا کی طرف سے بلامزد و معاوضہ عطا کردہ) یا "اللہ کی نعمت" کہا جاتا ہے۔ قرآنی نظام اور موجودہ معاشی نظام میں یہی اصولی فرق ہے۔ قرآن' موجودہ معاشی نظام کو "قارونیت" سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب قارون سے کہا گیا کہ تجھے جو زیادہ دولت حاصل ہوئی ہے اسے دوسروں کی کمی پوری کرنے کے لئے کھلا رکھو' تو اس نے کہا کہ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں **انما اوتیتہ علی علم عندی** (۲۸/۷۸) یہ دولت مجھے میری ہنرمندی اور چابکدستی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس قارونی ذہنیت کے حاملین کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ اکتساب رزق کی استعداد میں مختلف افراد میں فرق ہوتا ہے' لیکن حیرت ہے کہ جن لوگوں میں یہ استعداد زیادہ ہوتی ہے' وہ اس کے ماحصل کو اپنے زیردستوں کی طرف نہیں لوٹاتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح گدھا گھوڑا سب برابر ہو جائیں گے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان کی اس ذہنیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ استعداد کی یہ زیادتی ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں خدا کی عطا کردہ ہے (۱۶/۷۱)۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ خدا کی عطا کردہ نعمت ہے (۱۶/۵۳)۔ استعداد کا یہ فرق' زیادہ دولت کمانے اور اس کا مالک بن جانے کے لئے نہیں۔ یہ محض اس لئے ہے کہ معاشرہ کے مختلف (چھوٹے بڑے سب) کام چلتے رہیں (۴۳/۳۲)۔ جب ذہنیت یہ پیدا ہو جائے کہ استعداد کی زیادتی میری اپنی زرخرید یا پیدا کردہ نہیں' یہ موہبت ۴ خداوندی ہے' تو استعداد سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے' انسان اسے اپنی ملکیت نہیں سمجھتا۔ وہ اسے ان کی طرف لوٹا دیتا ہے جنہیں کم استعداد حاصل ہوتی ہے اور ایسا کرتے وقت اس کا جذبہ یہ ہوتا ہے کہ **لا نرید منکم جزاء ولا شکورا** (۷۶/۹) "اس کے لئے ہم تم سے نہ کسی قسم کا بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ کے متمنی ہیں" ----- ذہنیت کی یہ تبدیلی ایمان کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مومن اور کافر میں بنیادی فرق ذہنیت (نفسیات) ہی کا ہوتا ہے۔

لیکن جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوتا اور کام کا معاوضہ' طلب و رسد کے اصول کے مطابق سکوں

۴۔ ہم اس وقت' اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ تفاوت استعداد کے لئے کون کون سے عوامل و عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ اس وقت ہم صرف اس نکتہ تک محدود رہتے ہیں کہ یہ چیز فرد متعلقہ کی اپنی ہنرمندی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ محنت اس کی اپنی ہوتی ہے۔ استعداد خود پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ محنت اور مناسب تعلیم و تربیت بچے کی بنیادی استعداد میں جلا پیدا کرتی ہے۔

میں ادا کیا جاتا ہے' قرآن کریم اس دور کے لئے بھی احکام و ہدایات دیتا ہے۔ مال کو کھلا رکھنے کی تاکید' اپنی ضروریات سے زائد' سب کچھ اجتماعی امور کے لئے صرف کر دینے کی خاطر دے دینے کا حکم' یہ بنیادی تصور کہ مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے یا یہ کہ دولت کو اوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہیں کرتے رہنا چاہیے وغیرہ وغیرہ' اسی نوع کے احکامات ہیں۔ اس سے وہ اس تفاوت کو ابھرنے نہیں دیتا جو اختلاف استعداد کی بنا پر (موجودہ معاشی نظام میں) کمائی کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب عبوری دور کے بعد' قرآنی نظام اپنی آخری شکل میں قائم ہو جاتا ہے تو پھر یہ تفاوت خود بخود مٹ جاتا ہے۔

اب رہا آپ کا دوسرا سوال' کہ کیا کسی سے زائد دولت لے لینا' جبر نہیں؟ اس سوال کے جواب کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام ہے کیا اور مسلمان کسے کہتے ہیں۔ اسلام ایک سوسائٹی متشکل کرنا چاہتا ہے جس کے ممبروں کو مسلمان کہا جاتا ہے۔ اس سوسائٹی کے قواعد و ضوابط اور شرائط داخلہ قرآن کریم کے اندر مذکور ہیں۔ اسلام' ان قواعد و ضوابط اور شرائط و حدود کو عام کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ نوع انسانی میں سے جس کا جی چاہے ان شرائط کو قبول کرکے اس سوسائٹی کا ممبر بن جائے۔ اس میں کسی قسم کا جور واکراہ نہیں۔ اس میں ممبر شپ کی شرط اولین یہ ہے کہ ممبر بننے والا اس کا اعلان کرتا ہے کہ میں نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے (۹/۱۱۱)۔ اور اس کے قواعد و ضوابط میں لکھا ہوتا ہے کہ ممبروں کے پاس جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہوگا' وہ سوسائٹی (یا عالمگیر انسانیت) کی فلاح و بہبود کیلئے کھلا رکھا جائے گا (۲/۲۱۹)۔ اس سوسائٹی کی ممبر شپ قبول کرنے کا نام ذہنیت کی وہ تبدیلی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

اب آپ فرمایئے کہ اگر یہ سوسائٹی اپنے ممبروں سے زائد از ضرورت مال طلب کرتی ہے تو کیا اسے جبر کہا جائے گا؟ بالخصوص جب اس کے ممبروں کو اس کا بھی حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہیں اس کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب ایک شخص اس سوسائٹی کا ممبر رہے گا' اس کے قواعد و ضوابط کی پابندی اس پر لازمی ہوگی۔ اس کی اجازت تو کوئی سوسائٹی بھی نہیں دے گی کہ اس کا ممبر رہتے ہوئے اس کے قوانین و ضوابط سے سرکشی برتی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ اول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک وہ زکوٰۃ کے اونٹ کی رسی تک ادا نہ کر دیں گے میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔

لیکن جب نہ سوسائٹی ہو نہ اس کے ممبر--- کمرے کے باہر بس ایک سائین بورڈ لٹک رہا ہو' تو پھر تو کسی سے ماہانہ چندہ مانگنا بھی جبر کہلائے گا۔

(جون ۱۹۶۹ء)

۹۔ صلاحیتوں کے فرق کی مزید وضاحت

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔ قرآن نے کہا تھا **فضل بعضکم علی بعض فی الرزق** ۱۶/۷۱ ---- طلوع

اسلام نے اس خلش کو کسی حد تک دور کیا لیکن "ذہنی صلاحیتوں کے اختلاف" کا مسئلہ اب بھی بڑی چبھن پیدا کرتا ہے۔ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو طلوع اسلام بھی اس ذہنی اختلاف کو تسلیم کرتا ہے (یعنی اسے خدا کی دین سمجھتا ہے)۔ ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔ براہ مہربانی اس سلسلہ میں راہنمائی فرمائیں اور ممکن ہو تو --- تفصیلاً"۔ میرا خیال ہے کہ قدرت اپنے عطیات کی تقسیم میں بخیل نہیں۔ وہ ہر چیز مساوی دیتی ہے۔ انسان اسے اپنے اعمال سے کم یا زیادہ کر لیتا ہے اس لئے رزق میں فضیلت یا ذہنی فضیلت خدا کا عطیہ نہیں ہو سکتی۔ یہ فضیلت' وراثت' ماحول اور اعمال کی بنا پر ہوتی ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ اکتسابی ہے وہبی نہیں۔

طلوع اسلام

طلوع اسلام بے شک ذہنی اختلاف کو تسلیم کرتا ہے' اس لئے کہ یہ ایک امرالواقعہ ہے جس کا ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس لئے اس اختلاف کا انکار' حقیقت کا انکار ہے۔ لیکن آپ نے اس کے بعد جو قوسین میں لکھا ہے (یعنی اسے خدا کی دین سمجھتا ہے) یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

ہماری بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ ہم جہاں جہاں قرآن کریم میں یہ لکھا پاتے ہیں کہ "خدا ایسا کرتا ہے" یا "خدا دیتا ہے" تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ ایسا کچھ "وہبی طور پر" ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ خدا اپنے عالم امر میں جو کچھ کرتا ہے اس میں کسی کے اختیار' ارادہ' عمل' دخل' کسب و ہنر کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن جو کچھ وہ محسوس کائنات میں کرتا ہے' وہ سب کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اور انسانی دنیا میں خدا کا قانون طبیعی' انسانی ہاتھوں سے بروئے کار آتا ہے۔ مثلاً" قرآن کا ارشاد ہے کہ خدا زمین سے رزق پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی قطعہ زمین بنجر پڑا ہو اور انسان اپنی کوشش سے اسے زراعت کے قابل نہ بنائے اور اپنی محنت سے ہل چلا کر اس میں کاشت نہ کرے' تو اس زمین سے رزق کبھی پیدا نہ ہوگا۔ لہٰذا' خدا کے اس کہنے کا (کہ ہم زمین سے رزق پیدا کرتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ زمین سے رزق خدا کے قانون کے مطابق پیدا ہوتا ہے جس کے لئے انسانی سعی و کاوش کی ضرورت ہے۔ یا مثلاً" حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ جب مجھے پیاس لگتی ہے تو خدا مجھے پانی پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو خدا مجھے شفا دیتا ہے' تو ظاہر ہے کہ نہ خدا' پیاس کے وقت' حضرت ابراہیمؑ کو خود آکر پانی پلاتا تھا' نہ ہی ان کی بیماری کا علاج براہ راست خود کرتا تھا۔ یہ سب خدا کے قانون کے مطابق' حضرت ابراہیمؑ کی اپنی کوشش سے ہوتا تھا۔ مقصد ہمارے کہنے کا یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں (طبیعی کائنات کے سلسلہ میں) اس قسم کے الفاظ آئیں (کہ خدا یوں کرتا ہے یا یوں دیتا ہے) تو وہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ خدا "وہبی طور پر" ایسا کرتا ہے' انسان کے کسب و ہنر کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس قسم کی موہبت' صرف نبوت کے لئے مختص تھی (اور وہ سلسلہ ختم ہو گیا)۔

اب آیئے ذہنی صلاحیتوں کی طرف۔ اسے دو شقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ شق اول یہ کہ ایک قوم' دوسری قوم

کے مقابل میں بلند ذہنی صلاحیتوں کی مالک ہوتی ہے اور شق دوم یہ کہ ایک ہی قوم میں بعض افراد دوسرے افراد سے مختلف صلاحیتیں رکھتے ہیں۔

پہلے شق اول کو لیجئے۔ ماہرین علم عمرانیات یا علم الانسان کی تحقیق یہ ہے کہ انسان نے اپنی تمدنی زندگی کی ابتداء ایک خطہ زمین (بحیرہ کیسپین کے اردگرد کے علاقہ) سے کی تھی۔ اس کے بعد وہ پھیلتے پھیلتے مختلف ممالک میں چلے گئے اور مختلف اقوام میں بٹ گئے۔ ان اقوام میں متعدد طبیعی عناصر و عوامل (مثلاً" جغرافیائی اور موسمی اثرات وغیرہ) کے اختلاف سے مختلف خواص پیدا ہو گئے جو پھر نسلی طور پر آگے منتقل ہوتے چلے گئے۔ یوں ایک قوم' دوسری قوم سے مختلف نظر آنے لگی اور ان میں صلاحیتوں کا اختلاف ابھر آیا۔ اس کے بعد تمدنی اور سیاسی اثرات سے مختلف اقوام' یا ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں میں صلاحیتوں کا اختلاف شروع ہوا۔ مثلاً" زرخیز علاقوں میں بسنے والی قوم کو تھوڑی سی محنت سے ضرورت کے مطابق خوراک حاصل ہو گئی تو اسے مسائل زندگی پر فکری طور پر سوچنے کے لئے وقت اور فراغت مل گئی۔ اس سے اس کی ذہنی صلاحیتیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ اس کے برعکس' لوٹ مار پر گزارہ کرنے والی قوم میں جسمانی قوتوں نے زیادہ نشوونما پالیا یا قوم حاکم نے' محکوم قوم کو ایسا دبائے رکھا کہ اس میں انسانی صلاحیتیں ابھر ہی نہ سکیں۔ (جس علاقہ میں سکول نہ کھولنے دیا جائے' ظاہر ہے کہ وہاں کے رہنے والے جاہل رہیں گے اور یہی جہالت جب دو چار نسلوں تک متوارث چلتی جائے گی تو اس علاقہ کے لوگ وحشی کہلائیں گے جس طرح عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے)۔

اب اقوام سے نیچے اتر کر افراد کی طرف آیئے۔ انسانی بچے کی ساخت اور اس کی طبیعی صلاحیتیں' خدا کے مقرر کردہ قوانین طبیعی کے مطابق مرتب ہوتی ہیں۔ جوں جوں انسانی علم ترقی کرتا جاتا ہے' یہ قوانین بے نقاب ہو کر سامنے آتی چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جن اقوام نے ان قوانین کا علم حاصل کر لیا ہے وہ رحم مادر ہی میں جنین کی دیکھ بھال شروع کر دیتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کے بچے ان اقوام کے بچوں کے مقابلہ میں جو ان قوانین کا علم نہیں رکھتیں یا ان کے مطابق عمل نہیں کرتیں' کہیں زیادہ عمدہ صلاحیتیں لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ ان کے ہاں پیدائشی اندھے' لولے لنگڑے' مختلف امراض کا شکار' کمزور و نحیف یا دماغی نقائص کے حامل بچے نسبتاً" بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ پیدائش کے بعد بھی بچوں کی طبیعی نشوونما کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہتا ہے۔ اس لئے وہ بچے تنومند و توانا اور شگفتہ و شاداب' پروان چڑھتے ہیں۔

پیدائش کے بعد' بچوں کی صلاحیتوں پر ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے اور پھر تعلیم کا۔ وہ قومیں اس کا بھی خاص اہتمام کرتی ہیں کہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت (ان کے معیار کے مطابق) صحیح ہو۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ کسی بچے میں کوئی خاص جسمانی' ذہنی یا نفسیاتی نقص ہے تو وہ اس کے اسباب کی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ اس بچے کا وہ نقص رفع ہو جائے اور آئندہ اس قسم کا نقص پیدا نہ ہو۔ بچوں میں ذہنی صلاحیتوں کے تفاوت کے اسباب یہی ہیں۔ اس کے بعد' ان صلاحیتوں کی نمود کے لئے مواقع بہم پہنچانے اور ان سے کام لینے کا سوال سامنے آتا ہے۔

زندہ قومیں یہ کچھ بھی خاص نظم و نسق اور ربط و ضبط کے مطابق کرتی ہیں۔

یہ ہے مطلب "فضل بعدکم علی بعض فی الرزق" ۱۶/۷۱ کا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اختلاف خدا کا پیدا کردہ اور انمٹ ہے۔ یہ قوانین خداوندی کی مطابقت یا ان سے انحراف کا فطری نتیجہ ہوتا ہے اور اگر ان قوانین سے انحراف کی وجہ سے کہیں پیدا ہو گیا ہے تو ان کی مطابقت سے اسے دور کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ کہنے اور سمجھنے سمجھانے کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک بچہ جو کچھ بن کر پیدا ہوتا ہے' یا ابتدائی تعلیم اور ماحول کے اثرات سے جو کچھ اسے بنا دیا جاتا ہے' اس کا ذمہ دار وہ بچہ نہیں ہوتا۔ اس کا ذمہ دار معاشرہ ہوتا ہے۔ غلط معاشرہ میں' ایک بچہ (یا ایک فرد) ساری عمر' اپنی اس کمی یا کمزوری کی سزا بھگتتا رہتا ہے جس کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا --- معاشرہ ہوتا ہے۔ قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں کوئی بچہ (یا فرد) اپنی اس کمی یا کمزوری کی سزا نہیں بھگتتا جس کا ذمہ دار وہ خود نہیں ہوتا ---- جس معاشرہ میں وہ (قرآن) اپنے انقلاب کا آغاز کرتا ہے' ظاہر ہے کہ اس میں' مختلف افراد میں اس قسم کے اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان اختلافات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر لیتا۔ وہ انہیں تسلیم کرتا ہے (اور یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام بھی بہ حالات موجودہ' انہیں تسلیم کرتا ہے) لیکن وہ ایسے اصول دیتا ہے جنہیں عملاً" بروئے کار لانے سے کوئی فرد اپنے "ناکردہ گناہوں" کی وجہ سے (یعنی صلاحیتوں کے اس تفاوت کی وجہ سے) سزا میں ماخوذ نہیں ہوتا۔ اس باب میں اس کا پہلا اصول یہ ہے کہ

(۲) ولقد کرمنا بنی ادم ۱۷/۷۰ ہر انسانی بچہ' محض انسان ہونے کی جہت سے' یکساں طور پر واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ صلاحیتوں کے تفاوت کا شرف انسانیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(۲) لکل درجت مما عملوا ۴۶/۱۹ معاشرہ میں مدارج کا تعین' ہر فرد کے ان کاموں کی وجہ سے ہوتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیار و ارادہ اور سعی و کاوش سے کرتا ہے---- ایک محنتی اور دیانتدار جاہل' ایک فرض ناشناس اور بددیانت عالم سے کہیں زیادہ واجب العزت قرار پاتا ہے۔

(۳) ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریات پوری کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ان کی ضروریات بھی جو کسی ابتدائی نقص یا بعد کے حادثہ کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔

اس کے ساتھ ہی' یہ معاشرہ' ان افراد کی کمی کو پورا یا نقائص کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش اور آئندہ کے لئے ایسا انتظام کرتا ہے کہ بچوں میں اس قسم کے نقائص پیدا ہی نہ ہوں اور ان کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما ہوتی جائے (اسے نظام ربوبیت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو قرآن میں عطا کردہ راہ نمائی کی روشنی میں ہی قائم ہو سکتا ہے)۔

امید ہے اس وضاحت سے وہ چبھن دور ہو گئی ہوگی جس کی طرف ہمارے مستفسر نے اشارہ کیا ہے اور جو موجودہ غلط معاشرہ میں ہر قلب حساس کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ (فروری ۱۹۷۰ء)

۱۰۔ توکل علی اللہ کا "صوفیانہ" تصور

لائل پور سے شائع ہونے والے ہفتہ وار "المنبر" کی ۹ جون ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں' مولانا غلام رسول (قلعے والے)

مرحوم کے کوائف حیات شائع ہوئے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے باکمال موحد بزرگ تھے۔ ان کا ایک واقعہ یوں درج ہے کہ وہ اکثر تبلیغی دوروں پر باہر تشریف لے جاتے اور مہینوں بعد گھر کی طرف لوٹتے۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولوی صاحب چار مہینے کے مذکورہ قسم کے تبلیغی دورے پر سے گھر واپس تشریف لائے تو بیوی نے کہا کہ اگر گھر میں بھینس نہ ہوتی جس کے دودھ وغیرہ سے بسر اوقات اور گزارہ ہوا ہے' تو ہم تو بھوکوں مر جاتے۔ آپ نے اسی وقت قصائی کو بلایا' بھینس کو ذبح کرایا' گوشت گاؤں میں تقسیم کرا کر خود پھر سفر کو نکل گئے۔ چار پانچ مہینے کے بعد آئے تو گھر والوں کو بخیر و عافیت دیکھا تو بیوی سے کہا کہ تمہارا خدا تو میں ذبح کر گیا تھا' اب تمہارا گزارہ کیسے ہوا۔"

یہ بزرگ بھی "موحد" تھے اور المنبر کا مسلک بھی (غالباً) اہلحدیث کا ہے۔ کیا ہم اس جریدہ سے اتنا دریافت کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کا یہ عمل کونسی سنت رسولؐ اللہ کے مطابق تھا؟ اس رسول کی سنت کے مطابق جن کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ جب ایک بدو اپنا اونٹ باہر چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اونٹ کا کیا کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اسے خدا کے توکل پر باہر چھوڑ دیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ **اعقل وتوکل** ---- جاؤ --- پہلے اونٹ کو رسی سے باندھو اور پھر خدا پر توکل کرو --

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند!

اس کے جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ میاں! یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔ ان کے اتباع سنت کے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں' یعنی ان کے "برگ حشیش" شاخ طوبیٰ سے اترتے ہیں!

اسی "تصوف" نے تو قوم کو تباہ کر رکھا ہے۔ (جولائی ۱۹۶۷ء)

باب پنجم

تصوف

۱۔ کشف و الہام کی حقیقت

(میرزا غلام احمد کے دعاوی)

میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آرہا ہوں کہ کشف و الہام کے عقیدہ سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹ جاتی ہے۔ قرآن کریم سے اس کی کوئی سند اور شہادت نہیں ملتی اور یہ دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے۔ اس سے پہلے' میرے اس پیش کردہ نظریہ کے خلاف کوئی ردعمل نہ ہوا۔ لیکن اب جو میں نے اپنی کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں اسے دہرایا اور بتایا کہ میرزا غلام احمد کس طرح انہی سیڑھیوں سے بتدریج دعویٰ نبوت تک پہنچ گئے تو "احمدی" حضرات کی طرف سے اس کے خلاف خاص ردعمل ہوا۔ انہوں نے اس کے خلاف مضامین بھی شائع کئے اور مجھے خطوط بھی لکھے۔ ان کے "دلائل" کا ملخص یہ ہے کہ بڑے بڑے صوفیاء کرام اور اولیاء عظام نے کشف والہام کے دعوے کئے ہیں۔ اگر اس قسم کے دعوے کی بنا پر میرزا صاحب کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جا رہا ہے' تو یہ فرمایئے کہ ان بزرگوں (حضرات) صوفیاء اور اولیا کے متعلق آپ کیا کہیں گے! طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت ـــــ (بابت فروری ۱۹۷۵ء) میں ان کے اس اعتراض کو واضح طور پر سامنے لایا گیا ہے۔ میں نے ان میں سے بعض حضرات کے خطوط کا نجی طور پر جواب دیا لیکن چونکہ یہ اس اعتراض کی اشاعت عام کر رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے عوام چھوڑ' خواص تک کا بھی مطالعہ ایسا وسیع نہیں کہ وہ از خود حقیقت تک پہنچ جائیں' اس لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ ان کی اس مغالطہ آفرینی کی کوششوں کی نقاب کشائی کر دی جائے۔

وحی خداوندی اور علم انسانی میں بنیادی فرق کے متعلق میں (اس سے پہلے متعدد مقامات پر) بالتفصیل لکھ چکا ہوں۔ اس جگہ اسے مختصر طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس کا طریقہ' مشاہدہ' تجربہ' مطالعہ' افہام و تفہیم' تعلیم و تعلم' درس و تدریس وغیرہ ہے۔ بالفاظ دیگر' یوں سمجھئے کہ انسان کے حواس (SENSES) خارج سے کچھ معلومات حاصل کر کے انہیں ذہن تک پہنچاتے ہیں اور وہ ان پر غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ یہ اس فرد کا حاصل کردہ علم ہے۔ افراد انسانیہ از خود بھی اس طرح علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کے حاصل کردہ علم سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ انسانوں کے لئے حصول علم کا یہی طریق ہے۔ اصطلاح میں اسے ادراک بالحواس کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی ادراک بالحواس ہی کو علم قرار دیا ہے جب کہا ہے

کہ **لا تقف مالیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسعولا** (۱۷/۳۶) "جس بات کا تمہیں علم نہ ہو' اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت' بصارت اور عقل و فکر' ہر ایک سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔" دوسری جگہ ان ذرائع علم (حواس) سے کام نہ لینے والے کو جہنمی اور حیوانات سے بھی زیادہ راہ گم کردہ کہا گیا ہے یعنی وہ لوگ کہ **لھم قلوب لا یفقھون بھاز ولھم اعین لا یبصرون بھاز ولھم اذان لا یسمعون بھا** "جو سمجھنے سوچنے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اس سے کام نہیں لیتے۔ جو آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ جو کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ **اولئک کالا نعام بل ھم اضل** (۷/۱۷۹) "یہ لوگ' انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔" ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے بھی ذرائع حصول علم' حواس ہیں۔

لیکن اس نے اس باب میں ایک استثنا بتائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک علم وہ بھی ہے جسے خدا اپنے منتخب بندوں کو براہ راست عطا کرتا تھا یعنی اس میں' اس شخص کی' جسے یہ علم عطا کیا جاتا تھا' سعی و کاوش کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ علم' ادراک بالحواس نہیں ہوتا تھا حتیٰ کہ جس برگزیدہ انسان کو یہ علم عطا کیا جانے والا ہوتا تھا اسے' اس سے ذرا پہلے' اس کا علم و احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے۔ اس علم کو وحی خداوندی کہا جاتا ہے اور جس برگزیدہ ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا' اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا جاتا۔ یہ علم (وحی) آخری مرتبہ' حضور نبی اکرمؐ کو عطا ہوا اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ سلسلہ وحی کے اس طرح بند کر دیئے جانے کو ختم نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ختم نبوت کے بعد' علم حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ادراک بالحواس رہ جاتا ہے۔ اسی علم کے ذریعے خود قرآن کریم پر غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں ذرائع علم (یعنی وحی اور ادراک بالحواس) کو نہایت واضح اور متعین طور پر بیان کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ [illegible] نے نہ کسی اور ذریعہ علم کا ذکر کیا ہے نہ امکان بتایا ہے۔

اہل کتاب کے ہاں وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی خدا کی طرف سے ملی تھیں۔ جن کتابوں کو وہ آسمانی کہہ کر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں.... ان میں وحی کا واضح اور منزہ تصور نہیں ملتا نہ ہی نبوت یا نبی کا متعین مفہوم سامنے آتا ہے۔ (مثلاً") یہودیوں کے ہاں حضرت موسیٰؑ کو بھی نبی مانا جاتا ہے اور یرمیاہ' دانیال' حزقیل وغیرہ کو بھی نبی کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ان کی طرف منسوب صحائف بھی عہد نامہ عتیق میں شامل ہیں۔ حالانکہ یہ حضرات' ہیکل میں کہانت کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ کہانت سے مفہوم تھا پیش گوئیاں کرنا اور لوگوں کی قسمت کا حال بتانا۔ انگریزی زبان میں نبی کا ترجمہ (PROPHET) اس اعتبار سے کیا جاتا ہے یعنی (PROPHECIES) کرنیوالا۔ بعد میں' جب یہودیت میں تصوف (MYSTICISM) در آیا تو باطنیت (یعنی داخلی واردات) ذریعہ علم قرار پا گیا اور اس طرح ان کے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ عام ہو گیا۔ عیسائی' حضرت عیسیٰؑ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ مانتے تھے۔ اسلئے ان کے ہاں بھی نبی یا وحی کا تصور واضح نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ان کے سوانح حیات' ان کے شاگردوں

(متی' لوقا' مرقس وغیرہ) نے مرتب کیے تو انہیں رسول کہہ کر پکارا گیا۔ ان میں یوحنا (ST. JOHN) کی انجیل کو خاص طور پر (REVELATION) قرار دیا گیا اور اس کا ترجمہ "مکاشفہ" کیا گیا۔ ان مرتبین اناجیل کے بعد' ان کے ہاں (SAINTS) اولیاء کا سلسلہ جاری ہوا جن کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ انہیں خدا کی طرف سے علم حاصل ہوتا ہے۔ یوں ان کے ہاں کشف و الہام کا عقیدہ عام ہوا۔

نزول قرآن کے وقت' اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ہاں' وحی کا تصور بڑا مبہم لیکن کشف و الہام کا عقیدہ عام تھا۔ جگہ جگہ ان کے کاہن اور ولی مرکز عوام تھے جو باطنی علم رکھنے کے مدعی تھے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قران کریم نے وحی کا نہایت واضح اور متعین تصور دیا اور اس کے سوا خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کے ہر عقیدہ کو ختم کر دیا۔ وحی کے بعد' علم صرف ادراک بالحواس کو قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ صدر اول میں' جب اسلام اپنی حقیقی اور منزہ شکل میں موجود اور نافذ العمل تھا' کشف والہام کے الفاظ تک کہیں نظر نہیں آتے' نہ ہی امت مسلمہ میں سے کوئی اس کا مدعی دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد جب اسلام میں غیر قرآنی تصورات' نظریات اور معتقدات کی آمیزش شروع ہوئی' تو تصوف نے بھی ہمارے ہاں جگہ پائی اور اس طرح کشف والہام کا عقیدہ بھی وجود میں آگیا۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ) ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں) پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا' ابوہاشم عثمان بن شریک تھا' جس نے ۱۴۰ھ میں رملہ کے قریب پہلی خانقاہ قائم کی۔ ابوہاشم رہنے والا تو کوفہ کا تھا لیکن وہ نقل مکانی کر کے فلسطین میں آبسا تھا جو عیسائیوں کی خانقاہوں کا مرکز تھا۔ اس نے انہی سے یہ تصور لیا اور مسلمانوں میں مسلک تصوف کی طرح ڈال دی۔ (رملہ فلسطین میں واقع ہے) مسلک تصوف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ صوفیاء کرام (جنہیں اولیاء اللہ بھی کہا جاتا ہے) خدا سے براہ راست علم حاصل کرتے ہیں۔ اسے کشف والہام کہا جاتا ہے۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے علم کی صرف دو نوعیتیں بیان کی ہیں۔ ایک علم (یاادراک) بالحواس اور دوسرے خدا سے براہ راست حاصل ہونے والا علم۔ اس (موخرالذکر) کو اس نے وحی سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوئی علم جس کا ذریعہ انسانی حواس نہ ہوں' بلکہ کہا جائے کہ وہ خدا سے براہ راست حاصل ہوتا ہے' وحی کی شق میں شامل ہوگا' خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اس کا الگ نام رکھ لینے سے وہ وحی سے الگ نہیں ہو سکتا اور چونکہ وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا' اس لئے (حضورؐ کے بعد) یہ دعویٰ صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ کسی کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے۔

یہاں سے وہ پیچیدہ سوال سامنے آتا ہے جو ہمارے ہاں سخت الجھن کا باعث بنتا ہے اور جس سے فائدہ اٹھا کر "احمدی" حضرات مغالطہ آفرینی سے کام لیتے اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ کو (صوفیاء کرام کے دعویٰ کی مثل قرار دے کر) عین مطابق اسلام ٹھہراتے ہیں۔ اس سلسلہ' میں سب سے پہلے' اور بنیادی طور پر' اسے سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب قرآن کریم کی رو سے' خدا سے براہ راست علم حاصل ہونے کا سلسلہ ختم ہو گیا' تو اس قسم کے علم حاصل ہونے کے دعویٰ کو کسی صورت میں صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ جو بات

قرآن کریم کی رو سے غلط ہے' وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی طرف منسوب کر دینے سے بھی صحیح نہیں قرار پا سکتی۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہو گا کہ پھر ان صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس قسم کا دعویٰ کیا' یا جن کی طرف اس دعویٰ کو منسوب کیا جاتا ہے۔

جہاں تک منسوب کئے جانے کا تعلق ہے' ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی طرف اس قسم کے دعویٰ کی نسبت غلط ہے۔ اگر وہ حضرات قرآنی تعلیم کا علم رکھتے تھے تو انہوں نے کبھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہوگا۔ ان دعاوی کو ان کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔

جن حضرات کے متعلق یہ ثابت ہو کہ انہوں نے فی الواقع ایسا دعویٰ کیا تھا' تو ان کے متعلق ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اس باب میں غلط فہمی ہو گئی ہوگی۔ جسے انہوں نے "خدا کی طرف سے براہ راست علم" سمجھا وہ خدا کی طرف سے علم نہیں تھا۔ وہ ان کے اپنے تخیل کے پیدا کردہ تصورات تھے۔ بات یہ ہے کہ تصوف کے پر مشقت مراقبوں اور ریاضتوں سے انسانی دماغ کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں طرح طرح کے تصورات ابھرتے ہیں اور اس شخص کا جس قسم کا عقیدہ ہو' یہ تصورات وہی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے' ان کے "باطنی مشاہدات" یا "واردات" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عصر حاضر کی اصطلاح میں انہیں (HALLUCINATIONS) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ میں چاہتا تو اس سلسلہ میں بہت سے ارباب واردات کے بیان کردہ "باطنی مشاہدات" کی مثالیں پیش کر دیتا ا۔ لیکن (بغرض اختصار) میں' صرف دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ایک عیسائیوں کے ایک بہت بڑے ولی (ST.MACARIUS) کا بیان اور دوسرے علامہ اقبالؒ کا تبصرہ۔ اول الذکر کا بیان ہے کہ جو تارک الدنیا زاہد اس قسم کی ریاضتوں کی منزلیں طے کر رہا ہے:۔

> اسے ایک نور کی چادر اڑھا دی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کرتی ہے تا آنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے' لیکن درحقیقت وہ تکمیل نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے اور تمام اسرار و رموز کے پردے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں اور آخر الامر وہ خود حقیقت مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔

یہ ایک غیر مسلم عیسائی اہل تصوف کے مشاہدات کی کیفیت ہے۔ لیکن اگر آپ خود اپنے ہاں کے بڑے بڑے صوفیاء کرام کے مشاہدات کے بیانات پڑھیں گے تو وہاں بھی آپ کو یہی کچھ ملے گا۔ ان صوفیاء کرام کے مشاہدات کے متعلق علامہ اقبالؒ نے اپنے اس مقالہ میں جو اخبار (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا' لکھا تھا:۔

ا اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات' ولیم جیمس کی شہرہ آفاق کتاب (THE VARIETIES OF RELIGIOUS-EXPERIENCE)- کا مطالعہ کریں۔

آج کل مسلمان یونانی اور ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گردو پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور توجہ اس نیلی' پیلی' سرخ روشنی پر جما دی جائے جسے "اشراق" کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و تواتر کے باعث ماؤف ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ فنائیت۔۔۔۔ یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود ہی نہ ہو' دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے روبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

یہ مقالہ کافی طویل ہے جس کے آخر میں وہ کہتے ہیں:۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبدہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبدہ بازوں کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحتانہ انداز کی اس توحید کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ عجمیت کے دھندلکے سے باہر نکلو اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاؤ۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان مدعیان کشف والہام میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو شعبدہ بازی اور فریب کاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ ایک خاص مقصد کے تحت اس قسم کے دعوے کر کے لوگوں کو اپنے "پھندے میں پھنساتے ہیں۔" لیکن ان میں وہ بھی ہیں جو مراقبوں اور ریاضتوں کے پیدا کردہ تخیلات کو حقائق سمجھ لیتے ہیں اور نہایت "دیانت داری" سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے عطا کردہ علم و عرفان ہے۔ چونکہ نیتوں کا علم صرف خدا کو ہے اس لئے ہم ان حضرات کے متعلق کسی قسم کا فیصلہ صادر کرنے کے بجائے صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں (جس کی تعلیم ہمیں خدائے تعالیٰ نے دی ہے) کہ **تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون** (۲/۱۳۴) "یہ وہ لوگ تھے جو (اپنے اپنے وقت میں) اس دنیا سے چلے گئے۔ جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے۔ جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔"

ان کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے دعویٰ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ان کا دعویٰ قرآن کریم کے خلاف تھا' اس لئے نہ وہ صحیح قرار پا سکتا ہے اور نہ ہی ہمارے (یا کسی اور کے) لئے سند۔ دین میں سند اور حجت صرف خدا کی کتاب ہے۔ جو لوگ ان بزرگوں کے کشف والہام کو مانتے ہیں' ان کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تعلیم نہیں۔ مسلمانوں میں (قرآنی تعلیم کے نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے) بے شمار ایسے

عقائد و رسوم' رواج پذیر ہو چکی ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں۔ انہی میں یہ عقیدہ بھی شامل ہے۔ یہ ان کی جہالت ہے' وہ کفر و شرک نہیں جس کی بنا پر ایک شخص امت محمدیہ کے زمرہ سے کٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ جب قرآن کی تعلیم عام ہو جائے گی تو اس قسم کے عقائد ختم ہو جائیں گے۔ **جاء الحق وزھق الباطل** (۱۷/۸۱) خدا کا ارشاد ہے۔

اب آیئے "احمدی" حضرات کی طرف۔ سب سے پہلے وہ' ان حضرات صوفیاء کرام کے اس قسم کے دعاوی کو پیش کر کے' یہ کہتے ہیں کہ جب آپ لوگ یہ مانتے ہیں کہ نبی اکرمؐ کے بعد' خدا سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے اور انہیں یہ علم حاصل ہوا تھا' تو مرزا صاحب نے اگر یہ کہہ دیا کہ خدا کی طرف سے اب بھی براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے' تو ان کے ایسا کہنے کی بنا پر آپ انہیں کس طرح کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دے سکتے ہیں۔ آپ ان کے اس دعویٰ کو (کہ انہیں بھی اس قسم کا علم حاصل ہوا تھا) سچا نہیں مانتے تو نہ مانئے' لیکن جو لوگ اسے سچا مانتے ہیں' انہیں آپ کس طرح خارج از اسلام ٹھہرا سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ کہ حضور نبی اکرمؐ کے بعد بھی خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہو سکتا ہے' کس طرح "ختم نبوت" کی مہر کو توڑ دیتا ہے۔ اگر اس سے "ختم نبوت" کی مہر ٹوٹ جاتی ہے تو آپ ان ہزارہا صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کے متعلق کیا کہیں گے جو اس قسم کے علم کے جاری رہنے کا عقیدہ رکھتے اور اس علم کے حاصل ہونے کے خود مدعی تھے!

یہ ہیں وہ اعتراضات جو "احمدی" حضرات کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔ جو حضرات اولیاء کرام کے کشف والہام پر عقیدہ رکھتے ہیں (اور یہ عقیدہ عام ہے) ان سے ان اعتراضات کا اطمینان بخش جواب نہ بن پڑتا ہے نہ پڑ سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی رو سے (نبی کریمؐ کے بعد) خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کا عقیدہ غلط ہے' اس لئے مرزا صاحب اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

اس پر یہ حضرات کہتے ہیں کہ بہت اچھا۔ مرزا صاحب اپنے اس دعویٰ میں جھوٹے ہی سہی' لیکن جو الاؤنس آپ' اس قسم کے دعویٰ کرنے والے حضرات صوفیاء کرام کو دیتے ہیں' وہی الاؤنس مرزا صاحب کو کیوں نہیں دیتے۔ انہیں کیوں کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اس کا جواب غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مرزا صاحب کی اپنی شائع کردہ کتابیں موجود ہیں' اس لئے ان کے دعاوی کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ نہ معلوم انہوں نے ایسا کہا تھا یا نہیں۔

(۱) ہم نے اوپر کہا ہے کہ اپنے "کشف" کو خدا کی طرف سے براہ راست حاصل ہونے والا علم سمجھنا' غلط فہمی ہے جس میں انسان "دیانتدارانہ" طور پر بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب کے معاملہ میں ایسا نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کے "الہامات" جس طرح سے شائع کئے گئے اس سے مقصد یہ تھا کہ "لوگ ان کے پیچ میں پھنس جائیں"۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

> اور یہ الہامات میری طرف سے اگر اس موقع پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہو گئے تھے
> تو وہ ہزارہا اعتراض کرتے۔ لیکن وہ ایسے موقع پر شائع کئے گئے جبکہ یہ علماء میرے

موافق تھے۔ یہی سبب ہے کہ باوجود اس قدر جوشوں کے ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ وہ ایک دفعہ ان کو قبول کر چکے تھے اور سوچنے سے ظاہر ہوگا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے اور انہی میں خدا نے میرا نام عیسیٰ رکھا اور جو مسیح کے حق میں آیتیں تھیں وہ میرے حق میں بیان کر دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات سے تو اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہوتا ہے تو وہ کبھی ان کو قبول نہ کرتے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ انہوں نے قبول کر لیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔ (اربعین نمبر ۲' ص ۲۱)

کیا اسے دیانتدارانہ غلط فہمی قرار دیا جائے گا؟

(۲) جو شخص دیانتدارانہ سمجھتا ہے کہ اسے خدا کی طرف سے الہامات ہوتے ہیں' وہ (منصور کی طرح) سولی پر چڑھ جائے گا لیکن ان الہامات کے اظہار و اعلان سے مجتنب نہیں رہے گا۔ مرزا صاحب کی کیفیت یہ تھی کہ جب ان پر' ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداس پور کی عدالت میں' زیر دفعہ نمبر ۱۰۷' مقدمہ دائر ہوا تو انہوں نے معافی نامہ داخل کر دیا جس میں اس امر کا اقرار کیا کہ وہ آئندہ اپنے الہامات کو شائع نہیں کریں گے۔

(تریاق القلوب' مصنفہ مرزا غلام احمد' ص ۱۳۰ بحوالہ
"ختم نبوت اور تحریک احمدیت" ص ۱۸۹)
تیسرا ایڈیشن' مئی ۱۹۸۷ء (بلا ترمیم)

(۳) مرزا صاحب کی ساری اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ ان پر انگریزوں کی حکومت کی اطاعت ازروئے اسلام' فرض ہے اور جہاد بالسیف حرام ہو چکا ہے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ اس موضوع پر انہوں نے اس شدومد سے لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو اس سے پچاس الماریاں بھر جائیں۔ وہ ساری عمر "بحضور ملکہ معظمہ' جناب گورنر جنرل' اور بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر" عرضداشتیں اور محضرنامے بھیجتے رہے کہ انہیں ان خدمات جلیلہ کا صلہ دیا جائے۔ مخالفین سے ان کی حفاظت کی جائے اس لئے کہ یہ خود ان کا "خود کاشتہ پودا" ہے جس کی حفاظت اور نگہداشت ان کا فریضہ ہے۔

کیا ایسے شخص کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ دیانتدارانہ غلط فہمی کا شکار تھا!

(۴) یہ تو رہا "الاؤنس" نہ دینے کا سوال۔ اب آگے بڑھئے۔ صوفیاء کرام میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انہیں بذریعہ الہام' اوامر و نواہی دیئے جاتے ہیں جن پر شریعت متفرع ہوتی ہے۔ یہ دعویٰ مرزا صاحب ہی کا تھا۔ چنانچہ وہ واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ :

یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے جس نے اپنی وحی کے ذریعے سے چند امر و نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا' وہی صاحب شریعت ہو گیا۔

میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔ (اربعین نمبر ۴' ص ۷)

(۵) صوفیاء کے الگ الگ مسلک ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کسی نے اپنا الگ فرقہ نہیں بنایا۔ چشتیہ' قادریہ' نقشبندیہ وغیرہ طریقت کے سلسلے ہیں' الگ الگ فرقے نہیں۔ جداگانہ فرقہ کی پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے' اپنی الگ نماز پڑھتے ہیں۔ چشتیہ' قادریہ وغیرہ سلسلہ سے منسلک الگ الگ نماز نہیں پڑھتے' سب مل کر نماز پڑھتے ہیں۔ ان کے برعکس' مرزا صاحب نے نہ صرف اپنا فرقہ الگ بنایا' بلکہ جداگانہ امت کی تشکیل کی۔ انہوں نے کہا۔

> پہلا مسیح صرف مسیح تھا اس لئے اس کی امت گمراہ ہو گئی اور موسوی سلسلہ کا خاتمہ ہوا۔ اگر میں بھی صرف مسیح ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ لیکن میں مہدی اور محمد(صلعم) کا بروز ہوں۔ اس لئے میری امت کے دو حصے ہوں گے۔ ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور تباہ ہو جائیں گے۔ دوسرے وہ جو مہدیت کا رنگ اختیار کریں گے۔
> (الفضل' ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

انہوں نے اپنی امت کو حکم دیا کہ وہ کسی "غیر احمدی" کے پیچھے نماز نہ پڑھیں۔ کہا:۔

> مجھے خدا نے اطلاع دی ہے کہ تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی کفر اور مکذب یا متردد کے پیچھے نماز پڑھو' بلکہ چاہئے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔
>
> (اربعین نمبر ۳' ص ۳۴' حاشیہ)

نماز ہی نہیں' انہوں نے کہا "غیر احمدی" کا جنازہ پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ انہیں اپنی لڑکی دینا بھی ناجائز--- صاحبزادہ بشیر احمد کے قول کے مطابق :۔

> غرض ہر ایک طریقہ سے ہم کو حضرت مسیح موعود نے غیروں سے الگ کیا ہے اور ایسا کوئی تعلق نہیں جو اسلام نے مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا اور پھر ہم کو اس سے روکا نہ گیا ہو۔
>
> (حکمۃ الفصل)

کیا صوفیاء کرام میں سے کسی نے بھی ایسا کیا ہے؟

(۶) صوفیاء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جو میرے الہامات کو نہیں مانتا اور میری بیعت نہیں کرتا' وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ یہ "شرف" مرزا صاحب ہی کو حاصل ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ

> جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا کیونکہ میری نسبت خدا اور رسول کی پیش گوئی موجود ہے..... اب جو شخص مجھ کو باوصف صدہا نشانیوں کے مفتری

ٹھہراتا ہے وہ مومن کیونکر ہو سکتا ہے۔ (حقیقتہ الوحی' ص ۱۶۳)

(۷) صوفیاء میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا الہام قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکتا ہے۔ یہ جرات مرزا صاحب ہی نے کی کہ

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا' خدا کے حکم سے بند کیا گیا۔ (اربعین نمبر ۴' ص ۴۷)

واضح رہے کہ قادیانی (یعنی ربوی) اور لاہوری' دونوں گروہوں کے "احمدی" مانتے ہیں کہ مرزا صاحب نے تلوار کے جہاد کو منسوخ اور قطعی حرام قرار دیا ہے۔ (تفصیل ان امور کی میری کتاب "ختم نبوت اور تحریک احمدیت" میں ملے گی)۔

-------☆☆------

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ وجوہات جن کی بنا پر' مرزا غلام احمد اور ان کے متبعین دائرہ اسلام سے خارج قرار پاتے ہیں (اور قرار دیئے گئے ہیں)۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ مرزا صاحب نے بھی کشف والہام کا دعویٰ اسی طرح کیا تھا جس طرح صوفیاء کرام اور اولیاء عظام' اس کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ سو اگر وہ حضرات اس دعویٰ کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں پاتے تو مرزا صاحب کو ایسا کیوں قرار دیا گیا ہے۔ کس قدر تلبیس اور ابلہ فریبی پر مبنی ہے۔

ضمناً" ' کشف والہام کے سلسلہ میں مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں' ان میں یہ تقاضا بھی کیا گیا ہے کہ تصوف کے موضوع پر تفصیلی مقالہ شائع کیا جائے جس میں وضاحت سے بتایا جائے کہ اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور مسلمانوں میں یہ کب اور کس طرح مروج ہوا۔ میں اس موضوع پر پہلے ہی کافی تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ میں نے پہلے "سلیم کے نام" تین خطوط میں اس پر بڑی شرح و بسط سے لکھا اور اب "شاہکار رسالت" میں بھی اس پر بحث کی۔ سلیم کے نام خطوط (اسی نام کی کتاب کی تیسری جلد میں) قریب بیس برس پہلے شائع ہوئے تھے اور شاہکار رسالت' حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ (پرویز) (مارچ ۱۹۷۵ء)

۲۔ "چھٹی حس کیا ہوتی ہے؟

ایک صاحب پرویز صاحب کے نام اپنی طویل گرامی نامہ کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

ہاں! مجھے آپ کے ان افکار کے متعلق شک ہے جو تصوف کے بارے میں سامنے آئے ہیں۔ کیوں کہ موجودہ (PARK PSYCHOLOGY) اور قوت اشراق کے سائنٹیفک مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ذہن انسانی کو اللہ نے ماورائے حواس خمسہ کی قوت سے نوازا ہے اور (اس) چھٹی حس (یعنی) وجدان'

روحانیت یا مافوق الفطرت قوت سے انسانی ذہن محروم نہیں اور نہ کبھی رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی تحریر اور آپ کے قلم سے کچھ تبرکاً" حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

جواب :۔ میں اس "چھٹی حس" کا منکر نہیں اور منکر ہو بھی کیسے سکتا ہوں جب میں نے اسے خود حاصل کر کے دیکھ لیا ہوا ہے۔ لیکن اس حس کا تعلق نہ "روحانیت" سے ہے نہ کسی مافوق الفطرت سرچشمہ سے۔ چند قاعدے اور چند مشقیں ہیں جن سے انسان جب اپنی قوت فکر و خیال' یا قوت ارادی کو نہایت شدت سے مرکز (CONCENTRATE) کر لیتا ہے تو خود اس کی فکر ایک لطیف قوت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسی کا نام "چھٹی حس" ہے جسے سائیکلوجی میں وجدان (INTUITION) کہا جاتا ہے۔ (خود برگسان جو وجدان کا بہت بڑا حامی ہے' اسے ادراک ہی کی شکل کہہ کر پکارتا ہے)۔ اس فکری قوت کے پیدا کرنے کے لئے نہ کسی عقیدہ کی پابندی ضروری ہے نہ کفر اور اسلام ہی کی تمیز۔ یہ ایک فنی ملکہ ہے جسے جو شخص چاہے (ان مشقوں کے ذریعے) پیدا کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی "مافوق الفطرت" راز بھی نہیں۔ (جب آپ کہتے ہیں کہ اس کا "سائنٹیفک طریق" سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے تو اس کے "مافوق الفطرت" ہونے کی تردید آپ خود ہی کر دیتے ہیں۔ کسی "مافوق الفطرت" عنصر کا مطالعہ سائنٹفک طریق سے نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس کا دائرہ فطرت تک محدود ہے۔ وہ اس سے باہر جا ہی نہیں سکتی)۔ بہرحال یہ "حس" فکر انسانی ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ عام حواس خمسہ سے الگ یا بلند اور لطیف ہوتی ہے' اس لئے لوگ اسے "فوق الفطرت" یا "روحانی" قوت سمجھ لیتے ہیں۔ تصوف کی ریاضتوں اور مراقبوں سے بھی یہی قوت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے اسے تصوف کی ریاضتوں اور یوگ کی مشقوں سے پیدا کر کے دیکھا ہوا ہے۔

تصوف کا عقیدہ کشف والہام کا ہے جس کے معنی خدا سے براہ راست علم حاصل ہونا ہے۔ یہ عقیدہ ختم نبوت کے منافی ہے۔ خدا سے "براہ راست علم" صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو عطا ہوتا تھا جسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ اب کسی کو خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں۔

وحی کے اتباع سے انسان میں پاکیزگی سیرت اور بلندی کردار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا ارفع ترین اور مکمل ترین مقام وہ تھا جس پر نبی اکرمؐ فائز تھے اور جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **وانک لعلی خلق عظیم** (۶۸/۴) "اے نبی! تو اخلاق کے عظیم مقام پر فائز ہے"۔ قرآن نے حضورؐ کی عظمت آپؐ کی اخلاقی بلندی کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی تھی جسے حضورؐ نے مخالفین کے سامنے اپنے سچا ہونے کی شہادت کے طور پر پیش فرمایا تھا جب کہا تھا کہ

فقد لبثت فیکم عمرا من قبله افلا تعقلون (۱۰/۱۶)

"میں نے اس سے قبل' اپنی زندگی تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی کسی جھوٹے انسان کی ہوتی ہے یا سچے کی"

یہی پاکیزگی سیرت و حسن کردار ہے جو حضور نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے اتباع سے حاصل ہوتا ہے اور اس قسم کی سیرت و کردار کے حامل افراد پر مشتمل وہ جماعت (امت محمدیہؐ) ہوتی ہے جس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوتا ہے جو اسلام کا مقصود اور دین کا منتہی ہے۔ اسلام کوئی "چھٹی حس" پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا۔ وہ دنیا میں اس قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے آیا تھا جو ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ (پرویز)

(ستمبر ۱۹۷۴ء)

۳۔ پیش گوئیاں

(علم غیب، رسولؐ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا)

سوال :۔ "آپ نے میرے سابقہ استفسار کے جواب میں طلوع اسلام بابت ماہ مئی ۱۹۷۰ء میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے ختم نبوت کا مسئلہ اس طرح واضح اور صاف ہو گیا ہے کہ اس باب میں کسی قسم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں حیران ہوں کہ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق ہم اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں (اور ہمیں ایسا احساس ہونا بھی چاہیے کیونکہ اسلام کی اصل بنیاد ہی ختم نبوت ہے) لیکن جس راستے سے یہ دروازہ کھولا جاتا ہے اس طرف ہماری نگاہ ہی نہیں جاتی۔ لاریب، یہ کشف و الہام کا عقیدہ ہے جس سے ختم نبوت کی مہر ٹوٹتی ہے۔ **فجزاک اللہ احسن الجزاء**۔ اسی سلسلہ میں پیش گوئیوں کا سوال سامنے آتا ہے۔ میں شکر گزار ہوں گا اگر آپ اس کی بھی وضاحت فرما دیں کہ پیشین گوئیاں کرنے والوں کی پوزیشن کیا ہوتی ہے۔ اس سے بھی بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

جواب :۔ کسی لمبی چوڑی بحث میں الجھے بغیر، تمہیداً" اتنا سمجھ لیجئے کہ:۔

(۱) پیشین گوئی کرنے والے کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیب کا علم جانتا ہے (۲) "غیب کے علم" سے مراد ہے وہ علم جو سمع و بصر و فواد (حواس) کے ذریعے حاصل نہ ہو سکے۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم میں ہے کہ غیب کا علم خدا کیلئے مخصوص ہے **انما الغیب للہ** (۱۰/۲۰) "ان سے کہہ دو کہ غیب کا علم صرف خدا کے لئے ہے"۔ دوسری جگہ ہے **قل لا یعلم من فی السموت والارض الغیب الا اللہ** (۲۷/۶۵) "ان سے کہہ دو کہ ارض و سماء (کائنات) میں خدا کے سوا کوئی نہیں جسے غیب کا علم حاصل ہو"

(۳) خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اور جس حد تک چاہتا ہے، غیب کا علم عطا کر دیتا ہے۔ **وما کان اللہ لیطلعکم علی الغیب ولکن اللہ یجتبی من رسلہ من یشاء ص** (۳/۱۷۸) اور خدا ایسا کرتا ہی نہیں کہ تمہیں غیب پر مطلع کر دے۔ ہاں، البتہ وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے اس مقصد کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ ہے **علم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول .....** (۷۲/۲۶-۲۷) خدا عالم الغیب ہے۔ وہ اپنے غیب کا علم کسی شخص پر ظاہر نہیں کرتا بجز اس کے جسے وہ اس مقصد کے لئے چن لیتا ہے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ

(i) عالم الغیب خدا ہے۔

(ii) وہ صرف رسولوں کو غیب کا علم عطا کرتا تھا' کسی اور کو نہیں

(۴) رسولوں کو غیب کا علم وحی کے ذریعے ملتا تھا۔ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ مثلاً" حضرت مریمؑ کے کوائف حیات بیان کرنے کے بعد فرمایا **ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک** (۳/۴۴) یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم' اے رسول! تیری طرف وحی کرتے ہیں۔۔۔۔ داستان حضرت نوحؑ بیان کرنے کے بعد کہا **تلک من انباء الغیب نوحیھا الیک ما کنت تعلمھا انت ولا قومک من قبل ھذا** (۱۱/۴۹) اے رسول! یہ غیب کی باتیں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ اس سے پہلے انہیں نہ تو جانتا تھا نہ تیری قوم۔ یہی الفاظ تذکرہ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں دہرائے گئے ہیں یعنی **ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک.....** (۱۲/۱۰۲)

(۵) ان آیات سے واضح ہے کہ رسولوں کو غیب کا علم' بذریعہ وحی عطا ہوتا تھا۔ انہیں جن امور غیب کا علم بذریعہ وحی نہیں ملتا تھا' ان کا علم وہ از خود حاصل نہیں کر سکتے تھے اور واضح الفاظ میں اس کا اعتراف کرتے تھے۔ خود نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا گیا کہ **قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب..... ان اتبع الا ما یوحی الی** (۶/۵۰ تا ۱۱/۳۱) اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں قطعاً" اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی اس کا دعویٰ کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں۔ میں تو صرف اس کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے کہ **ولو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر وما مسنی السوء.....** (۷/۱۸۸) (ان سے کہہ دو کہ) اگر میں غیب کا علم رکھتا تو میں اپنے لئے ڈھیروں دولت جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف چھو تک نہ سکتی۔

(۶) یہ بات کہ کوئی شخص مستقبل کا علم نہیں رکھ سکتا' ان واضح الفاظ میں کہہ دی کہ **وما تدری نفس ما ذا تکسب غدا وما تدری نفس بای ارض تموت ان اللہ علیم خبیر** (۳۱/۳۴) کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور کوئی شخص نہیں جان سکتا کہ اس کی موت کس خطہ زمین میں واقع ہو گی۔ علیم و خبیر صرف خدا ہے' اور کوئی نہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تصریحات کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مستقبل کے حالات قبل از وقت بتا سکتا ہے (اسی کو پیشین گوئی کہتے ہیں) تو اس کا یہ دعویٰ' دو حالتوں سے خالی نہیں یعنی

(i) یا تو وہ اس کا مدعی ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے اور اسے یہ علم وحی کے ذریعے ملا ہے۔
(ii) اگر وہ ایسا دعویٰ نہیں کرتا تو وہ یہ کہتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ غیب کا علم خدا اور اس کے رسولوں کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ میری طرف دیکھو' میں رسول ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود میں غیب کی باتیں بتا سکتا ہوں۔

اس کے بعد' آپ خود سوچ لیجئے کہ ختم نبوت کے بعد پیشین گوئیاں کرنے والوں (اور ان کی پیشین گوئیوں پر کان دھرنے والوں) کا قرآن کریم کی رو سے مقام کیا ہے۔ یہ دعوائے رسالت نہیں تو اور کیا ہے؟

---------- ☆☆ ----------

یہاں تک ہم نے ان لوگوں کے متعلق بات کی ہے جو اس کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خدا سے براہ راست علم پا کر پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ایسا دعویٰ کئے بغیر پیش گوئیاں کرتے ہیں (جیسا کہ عام طور پر اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے) سو ان کے متعلق اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ان کی قیاس آرائیاں ہوتی ہیں جن میں سے بعض ٹھیک نکل آتی ہیں اور بعض غلط ثابت ہوتی ہیں۔ قرآن اسے **رجما" بالغیب** سے تعبیر کرتا ہے (۱۸/۲۲) یونہی اٹکلیں دوڑانا اور اندھیرے میں تیر چلانا۔

(جون ۱۹۷۰ء)

۴۔ پاکستان میں پیری مریدی کا اس قدر زور کیوں ہے؟

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد ملک میں پیری مریدی اور اس کے متعلقات قبر پرستی' گنڈا تعویذ وغیرہ کا بہت زور ہو گیا ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے یہ چیزیں اور زور پکڑتی جاتی ہیں۔ اور حیرت یہ ہے کہ (اس سے پہلے یہ چیزیں بالعموم جہلا کے طبقہ تک محدود ہوتی تھیں' لیکن اب) یہ لکھے پڑھے طبقہ' بالخصوص سرکاری ملازمین میں بھی عام ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوع اسلام

یہ سوال' اس سے پہلے بھی' (ایک عرصہ ہوا) ہم سے پوچھا گیا تھا اور اس کا جواب طلوع اسلام کے صفحات میں دیا گیا تھا۔ ۲؎ لیکن اس کے بعد' یہ چیزیں وبائی امرض کی طرح اور شدت سے پھیل رہی ہیں۔ اس لئے اس سوال کا دوبارہ جواب دینا ضروری سمجھا گیا ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ :-

(i) کائنات میں ہر شے کے لئے ایک قانون مقرر ہے۔ قانون کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔

۲؎ ملاحظہ ہو قرآنی فیصلے' حصہ اول' صفحہ ۳۶۹' ایڈیشن سوم' مارچ ۱۹۹۲ء

(۲) اصول یہ ہے کہ **لیس للانسان الا ماسعی** (۵۳/۳۹) انسان اسی کا حقدار ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔

(۳) یہی وجہ ہے کہ اس نے میسرہ کو حرام قرار دیا ہے۔ میسرہ کا عام ترجمہ جوا کیا جاتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے کہیں زیاہ وسیع ہے۔ میسرہ کے معنی ہیں وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔

تشکیل پاکستان کے بعد' ہندو جو کچھ یہاں چھوڑ گئے تھے' قوم نے اسے لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قوم نے بہ ہیئت مجموعی قاعدہ اور قانون کو بالائے طاق رکھ کر میسرہ کو اپنا شعار بنایا۔ قاعدہ اور قانون کے مطابق کام کرنے میں محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے اور انسان راتوں رات "سیٹھ" بھی نہیں بن سکتا۔ "لوٹ" میں یہ دونوں باتیں ممکن ہیں یعنی اس میں محنت کچھ کرنی پڑتی نہیں اور انسان شباشب لاکھ پتی بن جاتا ہے۔ یہ "مال غنیمت" (لوٹ کا مال) تو چند دنوں میں ختم ہو گیا لیکن قوم کو میسرہ کی ایسی لت پڑ گئی کہ اس نے اسی کو اپنا شعار زندگی بنا لیا۔ اب ہر شخص اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا کہ اسے نہ محنت کرنی پڑے اور نہ ہی قانون اور قاعدہ کی پابندی اور وہ "سیٹھ" بن جائے راتوں رات۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خلاف قانون راستوں کی تلاش ہوگی۔

اس کے ساتھ ہی (بدقسمتی سے) ملک کا نظام' سرمایہ داری قرار پا گیا۔ یہ نظام میسرہ کی بدترین شکل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے' ہماری قوم محنت کش اور مزدور پیشہ تھی۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص' ایک کمرے میں میز کرسی لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ نہ کہیں آتا ہے نہ جاتا' نہ محنت کرتا ہے نہ مزدوری۔ چار کاغذ ٹائپ کرتا ہے اور دس ٹیلیفونیں اور چھ ماہ کے بعد دیکھئے تو لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ اس سے ہر شخص کے منہ میں پانی بھر آیا اور انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ محنت' مشقت اور قاعدے قانون کی پابندی سے بمشکل روٹی ملتی ہے اور اس طریق سے انسان ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر امیر کبیر بن جاتا ہے۔ اس لئے کیوں نہ یہی راہ اختیار کی جائے۔

قوم کا یہ طبقہ حکومت کی مشینری کا کل پرزہ ہوتا ہے اور اس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم کو قانون کا پابند بنائے۔ جب اس طبقہ نے دیکھا کہ قانون شکنی سے اس قدر مفاد حاصل ہو رہے ہیں تو اس نے دل میں کہا کہ کیا قانون کی پابندی کے لئے ہم ہی رہ گئے ہیں؟ چنانچہ اس کے بعد اس نے بھی یہی روش اختیار کر لی۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ افراد قوم خلاف قانون راہوں پر چلنے کے لئے ان کے پاس پہنچتے اور یہ ان کے ممد و معاون بن کر اس کی قیمت وصول کرتے۔ اس طرح انہوں نے بھی میسرہ سے اپنا حصہ لینا شروع کر دیا۔

ادھر "دنیاداروں" نے یہ روش اختیار کی اور ادھر سے "روحانیت" کے مدعیوں کی طرف سے آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ آؤ! تمہیں ہم بتائیں کہ بلا محنت و مشقت مرادیں کس طرح پوری ہوتی ہیں! فلاں مجذوب' سٹہ کا نمبر بتاتے ہیں۔ فلاں حضرت صاحب کی دعا سے کاروبار میں "برکت" پیدا ہو جاتی ہے۔ فلاں بزرگ کے تعویذ سے' افسر مہربان ہو جاتا ہے۔ فلاں مزار پر حاضری دینے سے سب رکے ہوئے کام رواں ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میسرہ پسند' تن آسان' محنت سے جی چرانے والی' قانون شکنی کی عادی' قوم کے لئے اس آواز سے بڑھ کر جاذبیت اور کس میں ہو سکتی تھی۔

انہوں نے جوق در جوق ادھر کا رخ کر لیا۔ بزرگوں کے آستانوں پر ہجوم لگ گیا۔ خانقاہوں اور مزاروں پر مرادیں طلب کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ چنانچہ اب میسرہ کے لئے دوہرے راستے اختیار ہونے لگے۔ جب کوئی کام سامنے آیا پہلے یہ سوچا کہ فلاں افسر تک پہنچنے کا ذریعہ اور سفارش تلاش کی جائے۔ دوسری طرف یہ کہ خدا تک اپنی بات پہنچانے کے لئے کسی بزرگ کا وسیلہ حاصل کیا جائے۔ اس سے اگلا قدم یہ کہ افسر متعلقہ کو اس قدر رشوت دی جائے اور حضرت صاحب کے حضور اسقدر نذرانہ گزارا جائے یا مزار پر منت مانی جائے۔ بادنیٰ تعمق نظر آجائے گا کہ ان دونوں طریقوں میں فرق صرف الفاظ کا ہے' روح دونوں جگہ ایک ہی کارفرما ہے۔

یہ معاملات ذرا چھوٹے درجے کے آستانوں پر ہوتے ہیں' بڑی مسندوں پر بات اس سے آگے چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں فری میسنز یا روٹری کی قسم کی تنظیمیں ہوتی تھیں۔ ان کے ممبر بننے کا ایک بڑا فائدہ (اور دیسی ممبروں کے لئے شائد یہی ایک فائدہ) تھا کہ اس سے بڑے بڑے حکام کے ساتھ روابط پیدا ہو جاتے تھے (آجکل' اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی' لائنز کلب کے نام سے متعارف ہے)۔ بلند آستانوں اور درگاہوں کے مرشدان طریقت کے وابستہ داماں ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ روابط پیدا ہو جاتے ہیں اور اس میں جو کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے وہ بہرحال' مذکورہ صدر کلبوں کے اخراجات سے کم ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں' اس سے انسان معاشرہ کی نگاہ میں بھی "اللہ والا" بن جاتا ہے۔

قوم کو مزاج خانقاہیت میں پختہ تر کرنے کے لئے یہی اسباب و علل کچھ کم نہ تھے کہ محکمہ اوقاف نے' سمند ناز پہ اک اور تازیانہ کا کام کیا۔ اس سے پہلے' چند بڑی بڑی خانقاہوں اور مزاروں کو چھوڑ کر' باقی مزارات' دستبرد زمانہ کے ہاتھوں رفتہ رفتہ مٹتے جارہے تھے۔ اس محکمہ نے اپنی حسن کارکردگی دکھانے کے لئے ان مٹتے ہوئے نشانات کو از سر نو زندہ کر دیا اور اس طرح قدم قدم پر نئی نئی درگاہیں ابھرنی شروع ہو گئیں۔ پھر اس محکمہ کی طرف سے ان "بزرگوں" کے کوائف حیات سے متعلق کتابیں مرتب اور شائع ہونے لگیں اور ظاہر ہے کہ ان کے کوائف حیات میں سب سے نمایاں حصہ ان کی کرامات کا ہوتا ہے۔ جب ان کی طرف اس قدر محیرالعقول کرامات منسوب ہونے لگیں تو پھر ان کے نشانات کے مرجع انام بن جانے میں کسر کونسی باقی رہ سکتی تھی؟ اس سے پہلے' مزاروں اور درگاہوں کے مجاور بالعموم جاہل بھی ہوتے تھے اور اخلاقی اعتبار سے بھی ان کی شہرت اچھی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے لوگ ان مراکز کی طرف زیادہ رجوع نہیں کرتے تھے۔ اب ان کی جگہ "سرکاری مجاوری" نے لے لی ہے جو سب پڑھے لکھے ہیں اور عام طور پر دانش ور شمار ہوتے ہیں۔ یہ حضرات ان مزاروں پر' اور ان سے متعلق اجتماعات میں' وہی حرکتیں کرتے ہیں جو اس سے پہلے جاہل مجاور کیا کرتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس محکمہ کے ملازمین اس باب میں مجبور ہیں۔ جب ان کا وزیر (منسٹر) کسی مزار کو غسل دے تو یہ بیچارے غسل کے پانی کو شیشیوں میں کیونکر نہیں بھریں گے؟ لیکن اس کا نتیجہ بہرحال یہ ہوتا ہے کہ جب عوام انہیں یہ کچھ کرتا دیکھتے ہیں تو ان کی نگاہوں میں ان خرافات کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ اسباب و علل جن کی بنا پر' پاکستان میں پیری مریدی' قبر پرستی اور خانقاہ نوازی کی روش

بڑھتی جا رہی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا علاج کیا ہے' تو

علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی!

ان توہم پرستیوں کی بنیادی وجہ تو جہالت ہے۔ جہالت سے مراد ہے قرآن کی تعلیم سے ناواقفیت۔۔۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کو عام کیا جائے جس میں بتایا جائے کہ (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) "تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے"۔ یہ تصور ہی غیر اسلامی ہے۔ اسے ہم نے غیروں سے مستعار لیا تھا۔ قرآن کے نظام زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ کشف و کرامات کی دینی حیثیت کچھ نہیں۔ مردوں کا اس دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ باقی رہے زندہ بزرگ' سو ان کی دعائیں اور نگاہیں بھی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔ یہ ہماری اپنی عقیدت مندی کی پیدا کردہ نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے جس سے ہم ان کا اثر لے لیتے ہیں۔ آپ انہیں اپنے جیسا انسان سمجھئے' پھر دیکھئے ان کا کوئی اثر آپ پر نہیں ہوگا۔ ۳۔ ان کی تو کیفیت ہے کہ

ایں خدا تا سجدہ اش کردمی خدا ست

چوں یکے اندر قیام آئی فنا ست

جہالت کے بعد' زندگی کے عملی معاملات آتے ہیں اور ان کا تجزیہ غور طلب ہے۔ آپ دیکھئے کہ انسان' اس قسم کے سہارے ڈھونڈتا کب ہے؟ صرف اس وقت جب اس کا کوئی کام رک جائے' جب اس پر کوئی مصیبت پڑ جائے' جب قاعدے اور قانون کے مطابق چلنے سے اسے کامیابی نہ ہوتی ہو۔

لہٰذا' اس کا علاج یہ ہے کہ معاشرہ کے نظام میں ایسی تبدیلی پیدا کی جائے جس سے کسی کا کوئی جائز کام رکے نہیں' جس سے کسی کی مصیبت تنہا اسی کی مصیبت بن کر نہ رہ جائے' جس سے قاعدے اور قانون کے مطابق ہر کام آسانی سے ہوتا چلا جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا وہ ارشاد اس قدر اہم اور عمیق ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کا صحیح تصور نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے۔ آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ

میں یہاں اس لئے ہوں کہ تمہاری دعاؤں کو خدا تک پہنچنے سے روک دوں۔

اور اس کی تشریح میں آپ نے فرمایا تھا کہ تم خدا سے اسی وقت دعا کرو گے جب تمہارا کوئی کام رک جائے گا۔ میرا فریضہ یہ ہے کہ میں دیکھوں کہ تمہارا کوئی کام رکے نہیں۔ جب تمہارا کام رکے گا نہیں تو تمہیں خدا کے دروازے پر دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ کسی مشکل کے حل کے لئے اگر تم خدا تک بات پہنچاؤ گے تو وہ درحقیقت میرے خلاف شکایت ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے قاصر رہا ہوں۔ اس لئے میں ایسا انتظام کروں گا کہ تمہیں خدا کے حضور میری شکایت کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

۳۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے۔ "پیر مندیاں نوں کھاندا اے" یعنی پیر' انہی سے کچھ وصول کر سکتا ہے جو اسے پیر مانتے ہیں۔ آپ اسے پیر ماننا چھوڑ دیجئے' اس کی ساری بزرگی ختم ہو جائے گی۔ جس قبر کی عقیدت آپ کے دل میں ہوگی' وہ آپ کو عرش معلیٰ سے بھی بلند نظر آئے گی۔ اس عقیدت کو دل سے نکال دیجئے' وہ اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر بن کر رہ جائے گی۔

اگر ایسا معاشرہ قائم کر دیا جائے تو پھر لوگوں کو اس قسم کے سہاروں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ باقی رہے وہ لوگ جو میسرہ کے لئے یہ کچھ کرتے ہیں تو ان کا علاج بھی اسی قسم کے معاشرہ کا قیام ہے۔ اسلامی معاشرہ میں' کسی شخص کی ضروریات زندگی رکی نہیں رہتیں اور ضرورت سے زائد کوئی شخص اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ لہٰذا' جس معاشرہ میں "سیٹھ" بننے کا امکان ہی نہ ہو' اس میں اس قسم کی "میسرانہ" حرکات کی نہ ضرورت رہتی ہے نہ گنجائش۔ اس وقت نہ توہم پرستی باقی رہتی ہے نہ ہوس زرپرستی------ یہ دونوں چیزیں درحقیقت غلط معاشرہ کی پیداوار ہیں۔ اسلام کے صدر اول میں' جب یہ معاشرہ قائم ہوا تھا' نہ کوئی پیر تھا' نہ خانقاہ۔ نہ قبروں پر چادریں چڑھائی جاتی تھیں نہ بزرگوں کے عرس ہوتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں نہ کوئی بھوکا تھا نہ سیٹھ۔ ان خرافات کے ختم کرنے کا یہی عملی طریق ہے اور دین یہی سکھانے کے لئے آیا تھا۔ اسی سے انسان میں وہ خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے جس سے وہ کسی خارجی سہارے کا محتاج نہیں رہتا۔ اقبال کے الفاظ میں :۔

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا!
ہے بندہ آزاد خود اک زندہ کرامات

قرآن' اسی قسم کے آزاد بندے پیدا کرنے کے لئے آیا تھا جو اپنے معاملات کے لئے انسانوں کے آستانوں پر جھولی پھیلانے کے بجائے' صرف قانون خداوندی کے دروازے پر دستک دیتے تھے اور اس قانون کا اتباع ان کی ہر مشکل آسان کر دیتا تھا۔

(جولائی ۱۹۶۸ء)

۵۔ پیروں کی کرامات اور مزاروں کے غسل

روزنامہ "مشرق" (لاہور) کی اشاعت بابت ۲۴ اپریل ۱۹۶۶ء میں حضرت بابا فرید الدین مسعودؒ گنج شکر کے حالات زندگی میں لکھا ہے:۔

> آپ تمام دن مسجد میں عبادت کرتے اور سرشام ہی مسجد کے ایک خدمتگار رشید الدین مینائی کی مدد سے رسے کے ایک سرے کو اپنے پاؤں سے باندھ کر کنوئیں میں الٹے لٹک جاتے اور رشید مینائی رسے کا دوسرا سرا لمبی شاخوں والے درخت کی ایک ٹہنی سے باندھ دیتے جو کنوئیں پر چھتری ڈالے ہوئے تھا۔ صبح ہوتی تو مینائی انہیں باہر نکال لیتے۔ چالیس دن کے اس عمل نے آپ پر کمزوری کی کیفیت طاری کر دی۔ ناچار آپ نے چھڑی کا سہارا لے کر چلنا شروع کر دیا۔ ندائے غیبی آئی "اب ہمارا سہارا چھوڑ کر غیر کے سہارے پر اتر آئے ہو۔" فوراً" چھڑی پھینک کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔

آگے چل کر لکھا ہے:

"آپ کو گنج شکر کہا جاتا ہے۔ اس کی توجیہہ میں کئی روایات ملتی ہیں۔ یہاں دو روایات درج کی جاتی ہیں:۔

اول :۔ آپ جنگل میں عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دوپہر پیاس کی شدت بڑھی تو آپ نے ایک کنواں تلاش کیا۔ کنوئیں میں جھانکنے سے معلوم ہوا کہ پانی زیادہ گہرا ہے اور بغیر مشکیزے اور ڈور کے کام نہیں بن سکتا۔ آپ یہی سوچ رہے تھے کہ اس اثناء میں دو ہرن ادھر آنکلے۔ جب وہ کنوئیں کی منڈیر پر آئے تو پانی قدرت الٰہی سے کناروں تک اچھل پڑا۔ جانوروں نے پانی پیا اور چلے گئے۔ آپ نے یہ تماشا دیکھا اور خود بھی پینے کیلئے بڑھے کہ پانی اپنی اصل جگہ پر پہنچ گیا۔ بڑے حیران ہوئے۔ غیب سے ندا آئی "تم نے مشکیزے اور ڈوری پر بھروسا کیا ہوا ہے۔ جانور میرے بھروسے پر آئے' سو میں نے انہیں پانی پلا دیا"۔ آپ ندامت کے ساتھ واپس تشریف لائے' اور چالیس روز تک چلہ کشی کی۔ چالیسویں روز بھوک پیاس نے ستایا تو زمین سے چند کنکر اٹھا کر منہ میں رکھ لئے۔ کنکر منہ میں رکھتے ہی وہ شکر میں تبدیل ہو گئے۔

دوم :۔ آپ کی والدہ بچپن میں آپ کے جانماز کے نیچے آپ سے چھپا کر شکر کی چند ڈلیاں رکھ دیتیں۔ ایک روز شکر رکھنا بھول گئیں۔ آپ نے جانماز پر نماز پڑھی اور بعد میں حسب معمول جانماز کا کونہ اٹھایا تو نیچے شکر پائی۔ ماں حیران رہ گئیں اور بارگاہ خداوندی میں سر بسجود ہو گئیں۔

اسی اخبار کے یکم مئی ۱۹۶۶ء کے ایڈیشن میں حضرت سلطان باہوؒ کے متعلق حسب ذیل واقعات شائع ہوئے ہیں:۔

آپ پیدائشی ولی تھے۔ رمضان المبارک میں سحری سے لے کر شام تک والدہ کا دودھ نہیں پیا کرتے تھے۔ آپ نے حصول معاش کی خاطر کوئی دنیاوی شغل اختیار نہیں کیا تھا۔ آپ نے دو مرتبہ بیل خرید کر کھیتی باڑی شروع کی لیکن ابھی فصل پکنے نہ پائی تھی کہ آپ اسی حالت میں سب کچھ چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فاقہ کی رات فقیر کے لئے معراج کی رات ہوتی ہے جس رات اسے اللہ تعالیٰ کا وصال ہوتا ہے۔

اور سنئے :۔ ۲ مئی ۱۹۶۶ء کے اخبار پاکستان ٹائمز میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جس کے نیچے لکھا ہے کہ میر غلام قادر صاحب' وزیر مغربی پاکستان' داتا صاحب کے دربار (یعنی مزار) کو غسل دے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک خبر شائع ہوئی ہے جس میں اس غسل کی تفصیل دی گئی ہے اور لکھا گیا ہے کہ اس غسل کے وقت محکمہ اوقاف کے چیف

ایڈمنسٹریٹر صاحب بہ نفس نفیس موجود تھے اور اس محکمہ کی طرف سے غسل کے بعد لنگر تقسیم کیا گیا۔
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے!

(جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ دیوبندی حضرات کی کرامات

ہمارے ہاں عام طور پر مشہور ہے کہ دیوبندی حضرات' پیری مریدی اور کشف و کرامات کو نہیں مانتے۔ اسی بنا پر انہیں' عرف عام میں "گلابی وہابی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ حضرات بھی کشف و کرامات کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح عام "پیر پرست"۔ چند ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(دارالعلوم) دیوبند سے شائع ہونے والے ماہنامہ "تذکرہ" کی فروری ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں "معارف و حقائق" کے عنوان سے حسب ذیل معارف و حقائق شائع ہوئے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

ویران مقامات کی آبادی:۔ جس زمانہ میں ملکہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا تھا اس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ دہلی میں رہتے تھے مگر اکثر غائب رہتے تھے۔ جب دریافت کیا گیا کہ حضرت! آپ کہاں رہتے ہیں تو فرمایا کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ دہلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا ہم اس جگہ کو آباد کر دیں گے' اس لئے میں اکثر شہر اور خوالی شہر میں گشت کرتا ہوں تاکہ ویران مقامات آباد ہو جائیں۔

اور واقعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جہاں جہاں آپ کے قدم پہنچے وہ تمام جگہیں آباد ہو گئیں (امیرالروایات)

جاڑا بخار کو آرام:۔ ایک مرتبہ نانوتہ میں جاڑا بخار کی بہت کثرت ہوئی۔ جو شخص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کی قبر سے مٹی لے کر باندھ لیتا بس اسے فوراً آرام ہو جاتا۔ چنانچہ لوگ اس قدر کثرت سے مٹی لے گئے کہ جب بھی قبر پر مٹی ڈالی جاتی ختم ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو ایک مرتبہ مولانا کے صاحبزادے نے قبر پر جا کر کہا کہ آپ کی تو کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہو گئی۔ اگر اب کے کوئی اچھا ہوا' تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔

پس اسی دن سے پھر کسی کو آرام نہیں ہوا اور لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔

عملیات پر اعتقاد:۔ ایک مرتبہ ایک شخص کا مقدمہ سہارنپور میں ڈپٹی ظہیر عالم کی عدالت میں پیش ہوا۔ وہ شخص عابد حسین صاحب دیوبندی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مقدمہ میں کامیابی کا تعویذ مانگا۔ حاجی صاحبؒ نے دے دیا اور فرمایا کہ جب عدالت میں جانا تو اس کو اپنی پگڑی میں رکھ لینا۔ وہ شخص جب عدالت میں اجلاس پر پہنچا اور ڈپٹی نے کچھ سوال کیا تو اس کو یاد آیا کہ تعویذ بھول گیا ہوں۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب سے کہا کہ اجی ابھی ٹھہر جاؤ۔ میں دیوبند والے حاجی صاحب کا تعویذ لایا ہوں۔ اس کو لے آؤں تب پوچھنا۔ ڈپٹی صاحب یہ سن کر

ہنسے' کیونکہ وہ عملیات پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔

جب وہ شخص تعویذ لے آیا' تب کہا کہ اب پوچھو کیا پوچھ رہے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے کچھ سوالات کئے اور پھر اپنے خیال میں قصداً" اس مقدمہ کو بگاڑ دیا۔ مگر جب فیصلہ لکھ کر پڑھنے بیٹھے تو وہ موافق تھا۔ یہ دیکھ کر ڈپٹی صاحب بہت پشیمان ہوئے۔ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ عمل کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب وہ معمول پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کا دماغ صحیح نہیں رہتا اور جب دماغ صحیح نہیں رہتا تو کام بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

پانی کی جگہ سونے سے بھرا ہوا ڈول :۔ ایک بزرگ کو ایک روز عصر کی نماز میں دیر ہو گئی۔ دوڑے ہوئے وضو کے لئے کنوئیں پر گئے۔ کنوئیں کے اندر ڈول ڈالا تو پانی کی بجائے چاندی سے بھرا ہوا نکلا۔ ان بزرگ نے پھینک دیا اور جناب باری میں عرض کیا کہ مذاق نہ کرو۔ مجھے تو نماز کو دیر ہوئی جا رہی ہے۔ پھر دوبارہ ڈول ڈالا تو اب کے سونے سے بھرا ہوا نکلا۔ پھر عرض کیا کہ مذاق نہ کرو مجھے تو نماز سے دیر ہوئی جاتی ہے۔ اس وقت ان کو یہ الہام ہوا کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا تاکہ لوگ تم کو حقیر نہ جانیں۔ وہ بزرگ جولاہے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا آنکھیں بنوانے سے انکار:۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں پانی اتر آیا' تو آنکھ بنانے والے حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ اجازت ہو تو ہم آنکھ بنا دیں' لیکن پانچ دن تک آپ کو احتیاط کرنا پڑے گی۔ سجدہ زمین کے بجائے کسی اونچی لکڑی پر کرنا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ واللہ! ایک رکعت بھی ہم اس طرح پڑھنا منظور نہیں کر سکتے؟ حضورؐ کا ارشاد مجھے معلوم ہے کہ جو شخص ایک نماز بھی جان بوجھ کر چھوڑ دے گا وہ حق سبحانہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا کہ اس پر ناراض ہوں گے۔
(از در منثور)

(اپریل ۱۹۶۵ء)

۷۔ حکیم الامت' مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجالس

مفتی محمد شفیع صاحب ؒ۴ کے زیر سرپرستی' کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے۔۔ البلاغ۔۔۔ اس کے مدیر' مفتی صاحب کے صاحبزادہ' محمد تقی عثمانی صاحب ہیں۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہے' مجالس حکیم الامتؒ' جس میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مجالس کے احوال و کوائف شائع کئے جاتے ہیں۔ اس کے مرتب خود مفتی محمد شفیع صاحب ہیں۔ اس ماہ نامہ کی مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں' اس مجلس کے احوال میں جو واقعات شائع کئے گئے ہیں' ان میں سے دو واقعات آپ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ پہلے واقعہ کا عنوان ہے' "رحمت حق کا ایک عجیب واقعہ" وھو ھذا۔۔

۴ؒ اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (نومبر ۱۹۷۶ء)

ایک جاہل عورت مرنے کے وقت کچھ کلمات بول رہی تھی جو اس کے جاہل گھر والوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ کسی مولوی صاحب کو بلا کر لائے اور کہا ذرا دیکھو یہ کیا بھونک رہی ہے۔۔۔ مولوی صاحب نے قریب جا کر سنا تو عربی زبان کے یہ کلمات اس کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔

ان هذين الرجلين يقولان ادخلي الجنة

یہ دو آدمی یوں کہہ رہے ہیں کہ تو جنت میں داخل ہو جا۔

مولوی صاحب حیرت میں رہ گئے۔ گھر کے جاہل لوگوں کو بتلایا کہ اس کو تو جنت کی بشارت دی جا رہی ہے۔ اس کے اعمال کیا تھے جن کے بدلے میں اس کو یہ نعمت ملی۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو بالکل بے عمل بلکہ بد عمل عورت تھی۔ مولوی صاحب نے فرمایا غور کرو اس کا کوئی اچھا عمل اللہ کے نزدیک مقبول ہو گیا ہے' وہ کیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد لوگوں نے بتلایا کہ اس کی خاص عادت یہ تھی کہ جب اذان ہوتی تو سب کام چھوڑ دیتی اور اذان کی طرف متوجہ ہو کر سنتی تھی۔ دوسروں کو بھی اس وقت بولنے نہیں دیتی تھی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام کی یہ عزت کرنا ہی اس کے کام آگیا جس نے دوسری برائیوں پر پانی پھیر دیا۔

اللہ جل شانہ کی اس رحمت عامہ کا یہ واقعہ نقل فرمانے کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے رحمت الٰہیہ کے متعلق انشا کا یہ شعر بہت پسند ہے۔ ؎

تصدق اپنے خدا کے جاؤں کہ مجھ کو آتا ہے پیار انشا
ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے یہ دمبدم عنایت

احقر جامع کہتا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد برزخ میں سب کی زبان خود بخود عربی ہو جائے گی کیونکہ وہی انسان کے وطن اصلی یعنی جنت کی زبان ہے۔ اسی میں اللہ کی سب کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ پھر انبیاء نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے امت کو سنائے ہیں۔ (کذا فی الاتقان للسیوطی)

دوسرے واقعہ کا عنوان ہے' حضرت قرشی کی ایک کرامت۔۔۔ اسے بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہے:۔

جامع کرامات الاولیاء' طبع مصر میں ایک عجیب واقعہ حضرت قرشی مجذومؒ کا نقل کیا ہے کہ یہ بزرگ ولی اللہ جذامی تھے۔ اسی لئے نکاح نہیں کرتے تھے کہ دوسروں کو تکلیف ہوگی۔ مگر جوان تھے۔ طبعی تقاضے موجود تھے۔ ایک روز اس تقاضے کی بنا پر مریدوں کو کہا کہ اب ہم نے نکاح کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آپ پیغام دیں مگر اس

طرح کہ ہمارا پورا حال بیان کر دو۔ اگر کوئی عورت ان حالات کے باوجود نکاح کے لئے تیار ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ صبر کریں گے۔

ایک مرید اٹھا اور اپنے گھر گیا۔ اس کی ایک جوان بیٹی تھی' اس سے پیر صاحب کا پورا حال بیان کر کے نکاح کے متعلق پوچھا۔ لڑکی نے خوشدلی سے کہا کہ میں راضی ہوں۔ یہ مرید خوش ہو کر واپس آیا اور قرش مجذومؒ سے کہا کہ میری لڑکی راضی ہے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ تم نے اس کے سامنے میری پوری حالت بیان کر دی تھی یا نہیں؟ اس نے کہا' بالکل واضح کر کے بتلا دی تھی' مگر لڑکی نے کہا کہ میں ان کی خدمت گزاری کو دینی سعادت سمجھ کر قبول کرتی ہوں۔ چنانچہ نکاح ہو گیا۔

قرشیؒ صاحب کرامات و تصرفات تھے۔ لڑکی کی اس بلند حوصلگی کو سن کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ جب میں اس کے پاس جاؤں تو میری صورت تندرست اور حسین ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ جب گھر میں تشریف لے گئے تو ایک جوان رعنا کی صورت میں تھے۔ لڑکی نے ان کو دیکھ کر پردہ کر لیا اور کہا کہ تم کون ہو؟ قرشی مجذومؒ نے کہا کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔ لڑکی نے جواب دیا کہ وہ تو مجذوم ہیں' تم وہ نہیں ہو۔ تب حضرت قرشی نے واقعہ کرامت کا ذکر کر کے بتلایا کہ اب میں جب بھی تمہارے پاس آؤں گا اسی صورت میں آؤں گا۔

لڑکی کی عالی حوصلگی دیکھئے۔ اس نے جواب دیا کہ افسوس! آپ نے میری نیت اور اس کے ثواب کو برباد کر دیا۔ میں نے آپ سے نکاح محض معذور سمجھ کر خدمت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے کیا تھا' دنیوی راحت اور خواہش نفسانی کے لئے نہیں۔ اب اگر اپنی اصلی صورت میں مجھے ملنا چاہتے ہیں تو میں خادمہ ہوں ورنہ مجھے طلاق دے دیجئے۔ حضرت قرشی یہ سننے کے بعد اپنی اصلی ہیئت و صورت میں آگئے اور لڑکی ان کے ساتھ اسی حالت میں رہنے لگی۔

حکیم الامت' حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرمانے والے' مرتب کرنے والے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم' اور رسالہ کے مدیر' مولانا محمد تقی صاحب عثمانی۔

فبای الاء ربکما تکذبان

(اپریل ۱۹۷۰ء)

۸۔ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کی بیان کردہ کرامت

دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور ممتاز عالم دین' مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اپنی خود نوشت سوانح حیات "نقش حیات" کی جلد دوم میں لکھتے ہیں:۔

(اسی پنجلاسہ کا دوسرا واقعہ) تینوں حضرات (حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب' مولانا گنگوہی' مولانا نانوتوی ر حمہم اللہ تعالیٰ) کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا ہے اور گرفتار کنندہ کے لئے صلہ (انعام) تجویز ہو چکا ہے۔ لوگ تلاش میں سائی اور حراست کی تگ و دو میں پھرتے ہیں۔ اور حضرت حاجی صاحب راؤ عبداللہ خاں رئیس پنجلاسہ کے اصطبل خانہ کی اندھیری کوٹھڑی میں مقیم ہیں۔ چاشت کی نماز کا وقت ہے (یعنی ۹ یا ۱۰ بجے صبح کا)۔ ایک روز اسی کوٹھڑی میں وضو فرما کر چاشت کی نماز کے ارادہ سے مصلیٰ بچھایا اور جاں نثار حضار جلسہ سے فرمایا کہ آپ لوگ جائیں میں نفلیں پڑھ لوں۔ راؤ عبداللہ خاں اعلیٰ حضرت کے بڑے جاں نثار خادم اور مشہور مرید ہیں۔ گھر کے خوشحال زمیندار اور سرکار کے نزدیک باوجاہت شخص سمجھے جاتے تھے۔ سمجھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت پر جو الزام لگایا گیا ہے' اس کے قائم ہوتے ہوئے حضرت کے لئے اپنا مکان کھول دینا دنیاوی حیثیت سے کس درجہ خطرناک ہے۔ کیونکہ باغی کی اعانت بھی سرکاری بغاوت میں شمار ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی غلبہ حب دین اور فرط عشق میں اس درجہ مغلوب تھے کہ نہ مال کی پروا تھی نہ جان کی۔ خدا کی شان کہ جس وقت راؤ عبداللہ خاں حضرت کو تحریمہ باندھے نوافل میں مشغول چھوڑ کر کوٹھڑی سے باہر نکلے اور پٹ بند کر کے اصطبل کے دروازہ کے قریب پہنچے ہیں' تو سامنے سے دوش کو آتے دیکھا اور ہکا بکا کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ خدا جانے مخبر کون تھا اور کس بلا کا پتلا تھا جس نے عین وقت پر روپوشی کی کوٹھڑی تک معین کر دی تھی۔ چنانچہ دوش اصطبل کے پاس پہنچی اور افسر نے مسکرا کر راؤ صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں' گویا اپنے آنے کی وجہ کو چھپایا۔ جہاں دیدہ و تجربہ کار راؤ صاحب دور ہی سے تاڑ گئے تھے کہ "ایں گل دیگر شگفت" مگر "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔" اپنی جان یا عزت کے جانے' ریاست و زمینداری کے ملیامیٹ ہونے اور ہتھکڑیاں پڑ کر جیل خانہ پہنچنے یا پھانسی پر چڑھ کر عالم آخرت کا سفر کرنے کی مطلق پرواہ نہ تھی۔ مگر فکر و رنج یا حزن و افسوس تھا تو یہ کہ ہائے غلام کے گھر سے اور آقا گرفتار ہو اور عبداللہ خاں کے گھر میں اس کا جان سے زیادہ عزیز شیخ پابہ زنجیر کیا جائے' مگر اس کے ساتھ ہی راؤ صاحب ایک جواں مرد' مستقل مزاج' نہایت دلیر' قوی القلب راجپوت تھے۔ تشویش کو دل میں دبا اور چہرہ یا اعضا پر کوئی بھی اثر اضطراب کا محسوس نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر جواب دیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ دوش کا افسر گھوڑے سے اترا اور یہ کہہ کر کہ میں نے آپ کے یہاں ایک گھوڑے کی تعریف سنی ہے اس لئے بلا اطلاع یکایک آنے کا اتفاق

ہوا۔ اصطبل کی جانب قدم اٹھائے۔ راؤ صاحب بہت اچھا کہہ کر ساتھ ہو لئے اور نہایت ہی اطمینان کے ساتھ گھوڑوں کی سیر کرانی شروع کی۔ افسر بار بار راؤ صاحب کے چہرہ پر نگاہ جماتا اور اس درجہ مطمئن پاکر کبھی مخبر کی دروغ گوئی کا غصہ اور گاہے اپنی ناکامی و تکلیف سفر کا افسوس لاتا تھا۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا ہوا حاکم اس حجرہ کی طرف بڑھا جس میں اعلیٰ حضرت کی سکونت کا مخبر نے پورا پتہ دیا تھا اور یہ کہہ کر کہ "اس کوٹھری میں کیا گھاس بھری جاتی ہے" ' اس کے پٹ کھول دیئے۔ راؤ عبداللہ خان کی اس وقت جو حالت ہوئی ہوگی' وہ انہی کے دل سے پوچھا چاہیے۔ سمجھتے تھے کہ تقدیر کے آخری فیصلہ کا وقت آگیا اور پیمانہ حیات لبریز ہو کر اچھلا چاہتا ہے۔ اس لئے راضی برضاء الٰہی ہو کر جی ہاں کہا اور حکم گرفتاری کے منتظر کھڑے ہو گئے۔ خداوندی حفاظت کا کرشمہ دیکھئے کہ جس وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے' تخت پر مصلیٰ ضرور بچھا ہوا تھا۔ لوٹا رکھا ہوا اور نیچے وضو کا پانی البتہ بکھرا ہوا پڑا تھا' مگر اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کا پتہ بھی نہ تھا۔ افسر متحیر و حیران اور راؤ عبداللہ خاں دل ہی دل میں شیخ کی عجیب کرامت پر فرحاں و شاداں۔ کچھ عجیب سماں تھا کہ حاکم نہ کچھ دریافت کرتا ہے نہ استفسار۔ کبھی ادھر دیکھتا ہے کبھی ادھر۔ آخر مخبر کی دھوکا دہی سمجھ کر بات کو ٹالا اور کہا کہ خاں صاحب! یہ لوٹا کیسا اور پانی کیوں پڑا ہے۔ راؤ صاحب بولے' جناب اس جگہ ہم مسلمان نماز پڑھتے ہیں اور وضو میں منہ ہاتھ دھویا کرتے ہیں۔ چنانچہ ابھی آپ کے آنے سے دس منٹ قبل اسی کی تیاری تھی۔ افسر نے ہنس کر کہا' آپ لوگوں کی نماز کے لئے تو مسجد ہے یا اصطبل کی کوٹھری۔ راؤ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جناب مسجد فرض نماز کے لئے ہے اور نفل نماز ایسی ہی جگہ پڑھی جاتی ہے جہاں کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ جواب لاجواب سن کر افسر نے پٹ بند کر دیئے اور اصطبل کے چاروں طرف غائر نظر دوڑانے کے بعد باہر نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو' یہ کلمات کہہ کر رخصت ہوا "راؤ صاحب! معاف کیجئے' آپ کو اس وقت ہماری وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور پھر بھی ہمیں کوئی گھوڑا پسند نہ آیا"۔ راؤ عبداللہ خاں کی نظر سے دوش کے سوار جب اوجھل ہوئے تو واپس ہوئے اور کوٹھری کھول دی۔ دیکھا کہ اعلیٰ حضرت سلام پھیر چکے اور مصلے پر مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں۔"

(امداد المشتاق' ص ۲۹'۳۰ از تذکرۃ الرشید' ص ۷۶)

(فروری ۱۹۷۵ء)

باب ششم

علوم سائنس اور قرآن

۱۔ سائنس کیسے مسلمان ہوگی؟

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آجکل پاکستانی اخبارات میں ایک تحریک چلائی جا رہی ہے جس کا منشاء یہ ہے کہ سائنس کو مسلمان کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ مثلاً" یہ کہنے کے بجائے کہ دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کے ملنے سے پانی کا ایک قطرہ بن جاتا ہے' یہ کہا جائے کہ

جب دو حصے ہائیڈروجن کے ساتھ ایک حصہ آکسیجن مل جائے تو خدا اس سے ایک قطرہ پانی پیدا کرتا ہے۔

اس طرح سائنس مسلمان ہو جائے گی۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

طلوع اسلام

جب کسی کشتی کا لنگر نہ رہے تو پانی کی لہریں اور ہوا کے جھونکے اسے ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لئے پھرتے ہیں اور اس کے کہیں پاؤں ہی نہیں ٹکتے۔ یہی حالت ہم پاکستانیوں کی ہو رہی ہے۔ اس مملکت کی کشتی کا لنگر قرآن کریم کو بننا تھا۔ اس کا یہ لنگر بن نہیں سکا اور اب یہ موجوں کے تھپیڑوں کے رحم و کرم پر --- ڈانواں ڈول پھر رہی ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اس کی اسی بے بسی کی آئینہ دار ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات کا نظم و نسق خدا کے مقررہ کردہ اٹل قوانین کے مطابق چل رہا ہے۔ سائنس' ان قوانین کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور اس کا طریق تجرباتی ہے۔ تجرباتی طریق کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک مفروضہ کو بطور نظریہ اپنے سامنے رکھ کر اس پر عمل شروع کرتی ہے۔ کچھ عرصہ کی تگ و تاز کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ وہ پھر دوسرا نظریہ لے کر اس کے پیچھے چلنے لگ جاتی ہے۔ اس طرح بار بار کی کوشش (TRAIL AND ERROR) کے ذریعے' کسی ایک قانون کو دریافت کر لیتی ہے۔ وہ اس طرح فطرت سے متعلق بعض قوانین خداوندی کو حتمی طور پر دریافت کر چکی ہے اور باقیوں کے دریافت کرنے کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ قوانین کس قدر ہیں اور سائنس کو ان تک پہنچنے میں کتنا عرصہ درکار ہوگا۔ جو قانون خداوندی اس طرح سے دریافت ہو چکا ہو' اس کے متعلق ایسا کہہ دینے میں کہ "خدا یوں کرتا ہے" کچھ حرج نہیں۔ لیکن جو انکشافات ہنوز تجرباتی عمل کے مرحلہ میں ہیں' ان کے متعلق ایسا کہنا بڑا خطرناک ہے۔ مثلاً" ہمارے متقدمین نے

(یونانی تصور کے مطابق) یہ سمجھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس تصور کو ان الفاظ میں پیش کیا کہ خدا نے زمین کو ساکن پیدا کیا ہے اور سورج کو ایسا کہ وہ اس کے گرد گردش کرے۔ بعد کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ یہ غلط ہے۔ زمین گردش کرتی ہے۔ اب صورت یوں ہو گئی کہ

(۱) دسویں صدی میں خدا نے زمین کو ساکن پیدا کیا تھا -- اور

(۲) بیسویں صدی میں خدا نے زمین کو متحرک پیدا کر دیا۔

اب خود سوچئے کہ یہ بات کیا بنی --- ہمیں کہنا چاہیے کہ اس وقت تک سائنس کے انکشافات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ .....

اور اگر کسی معاملہ میں قرآن کریم نے کسی قانون فطرت کو خود بیان کر دیا ہے تو جب سائنس کا انکشاف اس نتیجہ پر پہنچے تو ہمیں کہہ دینا چاہیے کہ اس نے حقیقت (TRUTH) کو پا لیا ہے۔

لہٰذا' "سائنس کو مسلمان" بنانے کا یہ طریقہ نہیں۔ اسے "مسلمان" کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیں کہ

(۱) نظام فطرت خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین کے مطابق کارفرما ہے۔

(۲) فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان قوانین کو دریافت کیا جائے۔

(۳) جب ہم اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں' تو انہیں' نوع انسانی کی بھلائی کے لئے' ان مستقل اقدار کے مطابق صرف کرنا چاہیے جنہیں خدا نے قرآن کریم میں بیان کیا ہے۔ اس سے سائنس مسلمان ہو جائے گی۔

لیکن اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا کہہ دینے سے کہ "یہ سب کچھ خدا کرتا ہے' ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے اور ہماری سائنس بھی مسلمان' تو یہ وہ خود فریبی ہے جس کی نقاب کشائی قرآن نے بہت پہلے کر دی تھی۔ اس میں کئی ایک مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

> اگر ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا اور چاند اور سورج کس کے قانون کی زنجیروں سے مسخر ہیں' تو یہ کہیں گے کہ ایسا خدا ہی کرتا ہے۔ اگر ان سے پوچھو کہ بادلوں سے مینہ کون برساتا ہے اور اس طرح زمین مردہ کو زندگی کون عطا کرتا ہے' تو یہ جواب میں کہیں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ (۲۹/۶۱-۶۳)

وہ اس قسم کے شواہد پیش کرنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ لوگ اسے تو تسلیم کرتے ہیں کہ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کارفرما ہیں' لیکن جب خود اپنی زندگی کی طرف آتے ہیں تو اس میں اپنے لئے آپ قوانین وضع کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ **فانی یوفکون** --- (۲۹/۶۱) یہاں پہنچ کر تم الٹے کہاں پھر جاتے ہو؟ اپنی زندگی کو خدا کے قوانین کے تابع کیوں نہیں رکھتے؟ دوسری جگہ ہے **قل فانی تسحرون** ان سے پوچھو کہ اس مقام پر تمہیں کیا دھوکا لگ جاتا ہے؟ یاد رکھو! محض اتنا کہہ دینے سے کہ خارجی کائنات میں خدا کی کارفرمائی ہے' تم خدا پرست

نہیں بن سکتے۔ خدا پر ایمان کے معنی یہ کہ اس حقیقت کو عملاً" تسلیم کیا جائے کہ **وھوالذی فی السماء الہ وفی الارض الہ** (۴۳/۸۴) ۔۔ جس طرح خارجی کائنات میں خدا کے قوانین کی حکمرانی ہے' اسی طرح انسان کی ارضی زندگی میں بھی اسی کے قوانین کی حکمرانی ہونی چاہیے۔

اصل یہ ہے کہ پاکستانی مسلمان کی زندگی بڑی قابل رحم ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ ؎

ہے دل شوریدہ غالب طلسم پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر' کہ کس مشکل میں ہے

یہ حالت پاکستانی مسلمان کی ہو رہی ہے۔ اس نے پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا' لیکن اس میں اسلامی قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے سے اس کی جان جاتی ہے ---- اس سے' مذہبی طبقہ سے ان کی پیشوائیت چھنتی ہے اور "دنیادار" طبقہ سے ان کے ذاتی مفاد۔ لہٰذا' یہ دونوں ہی نہیں چاہتے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی ہو ----- اب یہ سانپ کے منہ میں چھپکلی والا معاملہ ہے کہ نہ نگلی جائے' نہ اگلے بنے۔ یہاں کا مسلمان' نہ اسلام سے انکار کر سکتا ہے نہ اس کے قوانین کی حکمرانی اپنے اوپر نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ شعوری اور غیر شعوری طور پر' اس قسم کے سوانگ بھرتا رہتا ہے جس سے معلوم ہو کہ یہاں اسلام کا بڑا چرچا ہے۔ لیکن درحقیقت یہاں اسلامی قوانین پار نہ پانے پائیں --- ریل کے ڈرائیور سے کہو کہ وہ انجن میں قرآن شریف کا نسخہ رکھے۔ بس کے ڈرائیور بسم اللہ پڑھ کر بس چلائیں۔ ہوائی جہاز میں یہ اعلان کرتے وقت کہ جہاز فلاں وقت فلاں جگہ پہنچے گا' انشاء اللہ کہا جائے (تاکہ جہاز کا عملہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے)۔ اوقاف کے روپے سے خانقاہوں کی مرمت کرائی جائے۔ عرس دھوم دھام سے ہوں' پیروں فقیروں کے کشف و کرامات کے قصے شائع کئے جائیں۔ دارالعلوموں کو وظائف دیئے جائیں۔ ان کے فارغ التحصیل طلباء کو یونیورسٹی کے گریجوایٹوں کے برابر تسلیم کیا جائے۔ رمضان شریف میں شراب بند کر دی جائے اور اس کے احترام میں ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جائیں۔ شب برات پر چینی کا کوٹہ ڈیوڑھا کر دیا جائے۔ غلاف کعبہ کے جلوس نکالے جائیں۔ قرات کی مجلسیں آراستہ کی جائیں۔ قرآن شریف کو لاکھوں روپے کے صرفہ سے قیمتی ریشم کے کپڑے پر سونے کے تاروں سے لکھا جائے۔ یا ہر وزیر' اپنے عہدہ کا حلف اٹھانے کے بعد' سیدھا کسی مزار پر سجدہ ریزی کے لئے حاضر ہو اور اپنی ہر تقریر کی تان اس پر توڑے کہ تمہیں اپنے آپ کو قرآن کے پیکر میں ڈھالنا چاہیے ---- یہ سب وہ "اسلامی سمجھنے" ہیں' جن سے قوم کے بچوں کو بہلایا جاتا ہے کہ وہ اماں کو ستائیں نہیں۔ انہی میں اب اس کا اضافہ ہو رہا ہے کہ سائنس پڑھاتے وقت یوں کہو کہ خدا یوں کرتا ہے --- اگر یہ کر دیا گیا تو سائنس اسی طرح مسلمان ہو جائے گی جس طرح' جب جماعت اسلامی نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو کہدیا تھا کہ قرارداد مقاصد پاس کرنے سے مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ ؎

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

(فروری ۱۹۶۷ء)

۲۔ سائنس اور ایمان بالغیب

وسط جنوری ۱۹۶۸ء میں' لاہور میں ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا "سائنس اور اسلام"۔ اس مذاکرہ کی کوئی تفصیلی روئداد اخبارات میں شائع نہیں ہوئی۔ البتہ پاکستان ٹائمز کے "زنیو" نے (اس اخبار کی ۲۰ جنوری کی اشاعت میں) اس پر تبصرہ کیا جس سے معلوم ہوا کہ مذاکرہ میں اس اہم ترین موضوع پر نہایت سطحی ہی گفتگو ہوئی۔ ہمارے ہاں' بدقسمتی سے' ہو یہ رہا ہے کہ مختلف ادارے اس قسم کے اجتماعات کا انتظام کرتے ہیں اور محض گرمی سخن کے لئے عنوانات ایسے تجویز کر دیتے ہیں جو اپنے اندر بڑی کشش اور جاذبیت رکھیں لیکن ان میں حصہ لینے والے یا تو علوم متعلقہ کے ماہر نہیں ہوتے یا وہ (جیسا کہ "زنیو" نے لکھا ہے) اس بحث کے لئے تیار ہو کر نہیں آتے۔ نتیجہ یہ کہ ایسے مذاکرات ذہنوں پر بڑا غلط اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر مذاکرہ کے موضوع ---- سائنس اور اسلام ---- کو لیجئے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اس میں شرکت کرنے والے حضرات ' ایک طرف علوم سائنس کے ماہر ہوں اور دوسری طرف حقیقی اسلام پر بھی ان کی نگاہ بڑی غائر اور عمیق ہو۔ اس کے بعد یہ ممکن تھا کہ مذاکرہ کوئی مثبت نتیجہ مرتب کر سکتا' لیکن جو کچھ "زنیو" نے لکھا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (سوائے ایک آدھ کے) شرکائے مذاکرہ نے موضوع کے متعلق تو کوئی بنیادی بات نہ کی' البتہ اپنی اپنی پوزیشن کی مدافعت کرتے رہے۔

اس کے بعد' ۳۱ جنوری ۱۹۶۹ء کے پاکستان ٹائمز میں' ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب کی طرف سے ایک خط شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ہمیں "سائنس اور اسلام" کی بحث ہی نہیں چھیڑنی چاہیے کیونکہ ان دونوں میں کوئی تعلق ہی نہیں۔ "زنیو" نے اس خط کا نہایت اچھا تعاقب اپنے اس تبصرہ میں کیا ہے جو ۲ فروری ۱۹۶۹ء کے پاکستان ٹائمز میں شائع ہوا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک دو ایک نکات ایسے ہیں جو مزید وضاحت چاہتے ہیں اور ان سطور کی تحریر کا جذبہ محرکہ یہی ہے۔

------ ☆☆ ------

ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے شروع میں لکھا ہے۔

> لیکن یہ مناسب نہیں کہ ہم سائنس اور اسلام میں باہمدگر تعلق پیدا کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ماننے والے ایک مافوق الفطرت حقیقت پر ایمان رکھیں جسے قرآن نے ایمان بالغیب کہہ کر پکارا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایمان کا ترجمہ (FAITH) کیا ہے اور غیب کا ترجمہ (UN-SEEN) اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ

(۱) سائنس صرف عالم محسوس (یا عالم مشہود) سے بحث کرتی ہے اور وہ اپنے ہر دعویٰ کو علم اور تجربہ کی بنیادوں پر

پیش کرتی اور دلائل و براہین کی رو سے منواتی ہے۔ اس کے برعکس'

(۲) اسلام غیر مرئی حقیقتوں (عالم غیب) پر ایمان کی دعوت دیتا ہے اور

(۳) ایمان سے مراد ہے پیش کردہ صداقتوں کو بلا علم و عقل صحیح تسلیم کر لینا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بنیاد ہی غلط ہے اور اسے استوار کیا گیا ہے اسلام کے اس تصور پر جو (اقبال کی اصطلاح میں) "ابلہان مسجد" کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اور جسے بلا تنقید صحیح تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ یہ تصور قران کا پیش کردہ نہیں' انسانوں کے خود ساختہ مذہب کا وضع کردہ ہے۔ اور جب اسلام کو (جو دین ہے) مذہب تصور کر لیا جائے تو اس میں اور دیگر مذاہب' مثلاً" عیسائیت' یہودیت' ہندومت وغیرہ میں بنیادی طور پر کچھ فرق نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط کے اخیر میں لکھا ہے کہ :-

> اسلام ایک فوق الفطرت حقیقت پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جو ایک عبد مومن (BELIEVER) کو جذباتی طور پر اس طرح متاثر کرتا ہے کہ وہ اس فوق الفطرت حقیقت کے حضور ایسی رسومات ادا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے' جن پر دلیل و برہان کی رو سے تنقید نہیں کی جا سکتی۔

سب سے پہلے اسے سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم کی رو سے "ایمان" کسی صداقت کو بلا سوچے سمجھے آنکھیں بند کر کے مان لینے کا نام نہیں۔ اس کے نزدیک' کسی دعویٰ کو علم و عقل کے رو سے پرکھ کر' قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ' علیٰ وجہ البصیرت صحیح تسلیم کرنے کو ایمان کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ مومنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ

> **والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخرو علیھا صما وعمیانا** (۲۵/۷۳)
>
> یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے (اور تو اور) آیات خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو ان پر بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے (انہیں عقل و فکر کی رو سے قبول کرتے ہیں)۔

وہ ارباب علم و عقل اور اہل ایمان کو مرادف المعنی قرار دیتا ہے' جب کہتا ہے کہ **فاتقوا اللہ یا اولی الالباب الذین امنوا** (۶۵/۱۰) اے ارباب عقل و فکر' یعنی اے ایمان والو! تم خدا کا تقویٰ اختیار کرو۔ فوق الفطرت حقیقتوں میں' سب سے سرفہرست اللہ کی ہستی ہے۔ اس کے متعلق رسولؐ اللہ سے کہا گیا کہ اعلان کر دو کہ **ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی** (۱۲/۱۰۸)۔ میں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ اب ظاہر ہے کہ جو دعوت علیٰ وجہ البصیرت دی جائے گی اسے بہرحال عقل و فکر اور دلائل و براہین کی رو ہی سے مانا جائے گا۔

فوق الفطرت (غیر مرئی) حقیقتوں میں دوسرا مقام حیات بعد الممات کا ہے' جسے آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ **کذالک یبین اللہ لکم الایات لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاخرۃ**

(۲۲۰-۲/۲۱۹) اس طرح خدا تمہارے سامنے واضح "علامات" لاتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غوروفکر کر سکو۔ (محسوس علامات سے غیر مرئی حقیقتوں تک کیسے پہنچایا جاتا ہے' اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر عرض کریں گے۔ سردست آپ یہ دیکھئے کہ) قرآن کریم نے دنیائے محسوسات کے متعلق ہی نہیں' بلکہ اس کے ساتھ "آخرت" کے متعلق بھی غوروفکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ لہٰذا' قرآن کی رو سے' آخرت پر ایمان بھی اندھی عقیدت کی بناء پر نہیں لایا جاتا۔ اس صداقت کو غوروفکر کے بعد تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان' کسی حقیقت کو بلا سوچے سمجھے' اور بلا دلیل و برہان' مان لینے کا نام نہیں۔ یہ' علم و بصیرت کی بناء پر صداقت پر یقین محکم کا نام ہے۔ ایمان کا ترجمہ (FAITH) نہیں۔ (CONVICTION) کا لفظ اس کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم قرآنی اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی کے ان الفاظ سے کر دیتے ہیں جو اس نے عیسائیت کے پیش کردہ تصورات کے لئے وضع کئے تھے۔ اس سے قرآن کا سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔ اور تو اور' ہم نے اسلام کو بھی ایک (RELIGION) قرار دے رکھا ہے حالانکہ اسلام (RELIGION) نہیں' دین ہے اور دین کے لئے انگریزی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔

"ایمان بالغیب" میں دوسرا لفظ غیب ہے جس کا ترجمہ(UN-SEEN)کیا جاتا ہے' قرآن کریم نے یہ لفظ (غیب) شہادۃ کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس لئے غیب' نامشہود کو کہیں گے۔ لیکن نامشہود کی دو شقیں ہیں۔ ایک تو وہ نامشہود حقیقتیں ہیں جو کبھی مشہود ہو کر سامنے نہیں آسکتیں جیسے ذات خداوندی۔ لیکن مشہود کی دوسری قسم ایسی حقیقتیں ہیں جو اگر آج غیر مشہود ہیں' تو ہو سکتا ہے کہ کل کو' جب انسان کا علم اور آگے بڑھے' وہ مشہود ہو جائیں۔ مثلاً" قرآن کریم' اقوام گزشتہ اور انبیاء سابقہ کے بعض حالات بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ **ذالک من انباء الغیب نوحیہ الیک** (۳/۴۴) یہ وہ "غیب" کی خبریں ہیں جنہیں ہم نے تیری طرف وحی کیا ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں' تاریخ نے ہنوز ان واقعات پر پڑے ہوئے پردے نہیں اٹھائے تھے۔ اس لئے ان کا تعلق "غیب" سے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جب تاریخی انکشافات مزید ترقی کریں تو یہ واقعات تاریخ کے مشہود حقائق بن کر سامنے آجائیں۔ اس زمرہ میں فطرت کی وہ قوتیں بھی آجاتی ہیں جو ایک وقت میں نامشہود ہوتی ہیں لیکن جب علم انسانی آگے بڑھتا ہے تو وہ مشہود ہو جاتی ہیں۔ نامشہود کے مشہود ہونے کا یہی وہ طریق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (۴۱/۵۳)

ہم انہیں انفس و آفاق میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ صداقت پر مبنی ہے۔

"غیب" کی ایک اور قسم بھی ہے جس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ طبیب آپ کو ایک نسخہ لکھ کر دیتا ہے جو بڑا

بھی ہے اور اس کا تیار کرنا بھی بڑا وقت طلب ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایسے پرہیز تجویز کرتا ہے جن سے آپ کو اپنے آپ پر کڑی پابندیاں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ آپ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس نسخہ کے استعمال اور طبیب کی ہدایات پر عمل کرنے سے آپ کو شفا ہو جائے گی۔ لیکن اگر آپ کو طبیب کی صداقت پر ایمان ہے تو آپ ان تمام مشقتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد' نتائج بتا دیں گے کہ حکیم صاحب نے جو کچھ کہا تھا' بالکل ٹھیک تھا۔ لہٰذا' کسی فارمولا' کسی قانون' کسی ہدایت کے ان دیکھے نتائج پر یقین کرنے کا نام بھی ایمان بالغیب ہے۔ یہ غیب' نتائج سے مشہود بن جاتا ہے۔ دنیائے انکشافات کی ساری عمارت اسی ایمان بالغیب پر استوار ہوتی ہے۔

------☆☆-------

اب آیئے سائنس کی طرف۔ یہ کہنا بھی درست نہیں کہ

(۱) سائنس میں ایمان کو کوئی دخل نہیں۔ اور

(۲) سائنس کا تعلق صرف ان اشیاء سے ہے جنہیں عام طور پر "محسوسات" سمجھا جاتا ہے۔

علوم سائنس کی ساری بنیاد ان اساسی قوانین پر استوار ہوتی ہے جنہیں (AXIOMS) کہا جاتا ہے۔ ان قوانین کے متعلق کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیوں ایسے ہیں' کائنات میں کیسے موجود ہیں اور کہاں سے آگئے ہیں۔ ان کے متعلق یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ موجود ہیں اور ایسے ہیں۔ انسان کو ان کا علم کیسے ہوا' اس کے متعلق مختلف نظریئے ہیں۔ ایک نظریہ کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قوانین خود انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ دوسرے نظریہ کی رو سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان نے تجربات کے بعد انہیں دریافت کیا ہے۔ یہ دریافت کیسے بھی ہوئے ہوں' یہ حقیقت ہے کہ ان کے ایسا ہونے کے متعلق کوئی دلیل یا توجیہہ پیش نہیں کی جا سکتی۔ بس یہ ایسے ہیں اور انہیں ایسا تسلیم کرنا ہوگا۔ ان قوانین پر ایمان لائے بغیر' سائنٹسٹ ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔

قانون کا سرچشمہ عالم نامشہود ہوتا ہے اور اس کے نتائج محسوسات کے پیکروں میں سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قانون پر ایمان' نامحسوس پر ایمان لانا ہے۔ اور اب تو سائنس ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جن چیزوں کو ہم محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھتے ہیں ان کی اصل و بنیاد غیر مرئی اور غیر محسوس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اب مادہ (MATTER) سمٹ کر توانائی محض (PURE ENERGY) بن کر رہ گیا ہے جو یکسر نامحسوس ہے۔ سر آرتھر ایڈنگٹن ہمارے دور کا ایک عظیم عالم طبیعات گزرا ہے۔ وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں اس باب میں لکھتا ہے۔

> میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ سائنس کو اب اس امر پر اصرار نہیں رہا کہ حقیقت عبارت ہے محسوسیت سے۔ یوں بھی جہاں تک اس کے لغوی معنوں کا تعلق ہے' مادیت کا عرصہ ہوا خاتمہ ہو چکا ..... اب دنیائے سائنس کا رجحان اس طرف نہیں

کہ ہر شے کو مادہ ہی کی ایک شکل قرار دیا جائے۔ مادہ کا رتبہ جہان طبیعات سے بہت نیچے گر گیا ہے۔ اس کا رجحان یہ ہے کہ ہر شے کو قانون فطرت کے عمل درآمد ہی کی ایک شکل ٹھہرائے اور قانون فطرت سے مراد کچھ ایسے قوانین ہیں جیسے ہندسہ' میکانیت اور طبیعات میں رائج ہیں ..... قانون سائنس کی یہی ہمہ گیر سیادت ہے جس کو آج کل مادیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ص ۳۲-۳۱)

لہٰذا' سائنس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کا تعلق ان اشیاء سے ہے جنہیں ہم عام طور پر "محسوسات" کہتے ہیں' فرسودہ خیال ہے۔ سائنس' درحقیقت حصول علم یا ادراک حقیقت کے ایک خاص طریق کا نام ہے۔ اس طریق کی عمارت ان بنیادوں پر اٹھتی ہے کہ

(۱) یہ سارا سلسلہ کائنات' غیر متبدل قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

(۲) محبوس اشیاء کے مطالعہ اور مشاہدہ سے ان قوانین کی صداقت کا علم حاصل ہو جاتا ہے اور

(۳) جب اور جہاں ان قوانین پر عمل کیا جائے گا' وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ سائنس کی یہ بنیادیں خود قرآن کی مہیا کردہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

وسخر لکم مافی السموت وما فی الارض جمیعا منہ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' اسے ہم نے تمہارے لئے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔

اب رہا ان قوانین کو دریافت کرنے کا طریقہ' تو اس کے لئے قرآن نے "علم" کو لاینفک قرار دیا ہے۔ علم کی (DEFINITION) اس کے نزدیک کیا ہے' یہ بڑے غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

ولا تقف مالیس لک بہ علم ط ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو' اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت' بصارت اور قلب' ہر ایک سے اس کی بابت پوچھا جائے گا۔

آپ سوچئے کہ کیا "علم" کی یہ (DEFINITION) بعینہ وہی نہیں جسے سائنس پیش کرتی ہے۔ سماعت و بصارت سے مراد ہیں انسانی حواس (SENSES)_ ہمارے حواس' اشیائے کائنات کے متعلق معلومات (DATA) فراہم کرتے ہیں اور انسانی قلب (MIND) ان معلومات سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کو سائنٹیفک طریق حصول علم کہا جاتا ہے۔ باقی رہا اس بات کا ٹسٹ کہ جس نتیجہ پر انسان پہنچا ہے وہ صحیح ہے یا غلط' تو قرآن نے اس کے لئے (PRAGMATIC TEST) تجویز کیا ہے۔ یعنی تم اس پر عمل کرو' نتائج خود بخود اس کی صحت و سقم کا ثبوت بہم پہنچا دیں گے۔ چنانچہ قرآن کریم میں رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ دین کا پروگرام پیش کر دینے کے بعد' آپ اپنے مخالفین سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اس کی صداقت پر اس طرح یقین نہیں کرتے تو اس کا دوسرا طریق یہ ہے کہ

یقوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل ۚ فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبتہ الدار (۶/۱۳۶)

اے میری قوم! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کئے جاؤ' میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ انجام کس کا اچھا ہوتا ہے۔

آپ دیکھئے کہ کیا حصول علم کا یہ طریق اور اس کی صحت کے پرکھنے کا یہ معیار' بعینہ وہی نہیں جسے آج سائنٹیفک طریق انکشافات کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن "علماء" کہتا ہی انہیں ہے جنہیں آج کی اصطلاح میں (SCIENTISTS) سائنس دان کہا جاتا ہے۔ سورہ فاطر میں ہے۔

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا بادلوں سے بارش برساتا ہے تو اس سے انواع و اقسام کے پھل اور فصلیں اگتی ہیں۔ پھر پہاڑوں پر غور کرو کہ ان کی چٹانوں پر کس طرح رنگا رنگ کے خطے ہوتے ہیں' کوئی سفید' کوئی سرخ' کوئی کالا بھجنگ۔ اور اسی طرح انسانوں' مویشیوں اور دیگر جاندار مخلوق کی بھی کتنی ہی قسمیں ہیں۔ (یہ حقائق تو سب کے سامنے ہوتے ہیں لیکن) ان کی عظمت کے سامنے وہی لوگ جھکتے ہیں جو ان پر علم و بصیرت سے غور و خوض کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں "علماء" کہلانے کا حق ہے۔ (۲۸-۲۷/۳۵)

فطرت کے ان محسوس حقائق و شواہد کو قرآن نے "آیات" کہہ کر پکارا ہے اور اس میں ایک عظیم نکتہ پوشیدہ ہے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ غیر مرئی اور غیر مشہود حقیقتیں' محسوس طور پر ہمارے سامنے نہیں آسکتیں۔ ان کے ادراک کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ محسوس مظاہر (علامات) پر غور و فکر سے انسان غیر مرئی حقائق کے متعلق علم حاصل کرے۔ آپ رات کے وقت کسی صحرا میں کھڑے ہوں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہ ہو۔ آپ کو دور کہیں آگ نظر آئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیں گے کہ وہاں کوئی انسان ہے۔ آگ اور انسان میں بظاہر کوئی تعلق نہیں' لیکن آگ علامت بنتی ہے اس امر کی کہ وہاں انسان ہے۔ اسی کو آیت کہتے ہیں۔ فطرت کے محسوس مظاہر' آیات بنتے ہیں فوق الفطرت نامشہود حقیقتوں کے۔ اسی سے ذہن انسانی کا رخ عالم مشہود سے عالم غیب کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھئے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح طبیعی دنیا کے متعلق خدا کے مقرر کردہ اٹل قوانین ہیں' اسی طرح خود انسانی دنیا کے متعلق بھی غیر متبدل قوانین ہیں۔ جس طرح طبیعی دنیا کے قوانین کی پابندی سے تعمیری نتائج مرتب ہوتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی سے تخریب ہوتی ہے' اسی طرح انسانی دنیا سے متعلق قوانین کے مطابق نظام معاشرہ متشکل کرنے سے انسانیت آگے بڑھتی ہے اور ان کی خلاف ورزی سے اس کا ارتقاء رک جاتا ہے جس کا نتیجہ

فساد ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کی طرح' انسانی زندگی سے متعلق قوانین بھی' انسانوں کے خود ساختہ نہیں' خدا ہی کے متعین فرمودہ ہیں۔ چونکہ مشاہدہ' مطالعہ اور تجربہ کی رو سے قوانین کے انکشاف میں بڑا لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے' اس لئے انسانی مشقت کو کم کرنے کے لئے' انسانی زندگی سے متعلق قوانین بذریعہ وحی عطا کر دیئے گئے۔ قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین میں یہ فرق' صرف ان معنوں میں ہے کہ ان کا علم کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے' یعنی دونوں کو غوروفکر اور علم و بصیرت کی رو سے سمجھا جاتا اور عملی نتائج کے ذریعے پرکھا جاتا ہے۔ مغرب کی غلط فہمی یہ تھی (اور ہے) کہ اس نے قوانین فطرت کی اہمیت پر تو اس قدر زور دیا لیکن انسانی زندگی کے متعلق قوانین کو یکسر نظرانداز کر دیا اور معاشرہ کو اپنے خود ساختہ قوانین کے مطابق متشکل کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ وہ جہنم ہے جس میں دنیا اس وقت مبتلائے عذاب ہے۔ قرآن نے قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ ان کے امتزاج کا نام الدین ہے۔ ہم الدین کی (DEFINITION) ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ

> فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا نام الدین ہے

اس سے ظاہر ہے کہ قوانین فطرت (علوم سائنس) اور مستقل اقدار (وحی) کو الگ الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر ان میں ثنویت (DUALITY) پیدا کر دی جائے تو اس کا جو نتیجہ مرتب ہوگا اسے قرآن کے الفاظ میں سنئے۔

سورہ بقرہ میں ہے۔

> کیا تم الکتاب (ضابطہ قوانین) کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور اس کے دوسرے حصہ سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو! تم میں سے جو بھی ایسا کرے گا' اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل ہوگا اور اخروی زندگی میں شدید ترین تباہی میں مبتلا۔ (۲/۸۵)

سیکولر تصور حیات میں قوانین فطرت پر ایمان لایا جاتا ہے اور مستقل اقدار سے کفر برتا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔

"مذہب" میں قوانین فطرت سے کفر برتا جاتا ہے اور (بزعم خویش) وحی خداوندی پر ایمان لایا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔

اور دین میں قوانین فطرت اور مستقل اقدار خداوندی' دونوں پر ایمان لایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' اس کے لئے تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال پیچھے پلٹانا ہوگا۔

مغرب نے مستقل اقدار خداوندی کو فراموش کر رکھا ہے اور مسلمان صدیوں سے "مذہب" کا پیرو بن چکا ہے۔ دین نہ وہاں ہے نہ یہاں۔ (یہ قرآن کی دو تین میں محفوظ ہے) جب تک انسان' دین پر عمل نہیں کرتا' انسانیت تباہیوں

سے نہیں بچ سکتی- یہی وہ حقیقت ہے ' جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ ۔

مغرب زتو بیگانہ مشرق ہہ افسانہ
وقت است کہ ور عالم نقش دگر انگیزی

(مارچ ۱۹۶۸ء)

۳- کیا زمین متحرک ہے؟

ضلع پشاور سے ایک صاحب نے حسب ذیل استفسار بھیجا ہے-

۱- موجودہ سائنس کہتی ہے کہ زمین گول ہے اور گھومتی ہے اور یہ کہ سورج ساکن ہے لیکن قرآن پاک میں لکھا ہے کہ سورج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک جھیل میں غیب ہو جاتا ہے- غالباً" جہاں ذوالقرنین کا قصہ ہے وہاں ہی یہ سب کچھ لکھا ہے-

دوسرا یہ کہ سائنس دان کہتے ہیں کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے- کبھی چاند چھوٹا ہو جاتا ہے اور کبھی بڑا ہو جاتا ہے-

مہربانی فرما کر اس سارے معاملہ پر ایک مفصل مضمون لکھیں اور بہتر ہو گا کہ آپ اس کو طلوع اسلام میں چھاپ دیں- اس پر لوگوں میں بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ اس کے متعلق ہمارے سکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے' قرآنی حقائق کے خلاف ہے- لہٰذا' اس سے متعلق نصاب کو بدلنا چاہئے-

طلوع اسلام

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں کہ اس میں اس قسم کے امور کی تفصیل دی گئی ہو- لیکن وہ چونکہ اس خدا کی کتاب ہے جو خالق کائنات ہے' اس لئے اس میں اگر کسی جگہ ضمناً" ایسے امور کا ذکر آگیا ہے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ حقیقت کے خلاف ہو-

قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ سورج اپنی منزلیں طے کرتا ہوا ایک جھیل میں غائب ہو جاتا ہے- اس نے ذوالقرنین کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب اس نے مغرب کی طرف رخ کیا تو ساحل سمندر (بحیرہ اسود) تک جا پہنچا- وہاں تاحد نگاہ پانی ہی پانی تھا- اس لئے اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج سمندر میں غروب ہو رہا ہے- سمندر کے کنارے ایسے ہی نظر آیا کرتا ہے (۱۸/۸۶)-

باقی رہا چاند اور سورج کا معاملہ' سو ان کے متعلق سورۃ یٰسین میں ہے **والشمس تجری لمستقر لها ذالک تقدیر العزیز العلیم** (۳۶/۳۸) سورج اپنے مقررہ راستہ پر چلتا ہوا اپنے مستقر کی طرف جا رہا ہے- یہ اس خدا کے

مقرر کئے ہوئے پیمانے (قوانین فطرت) ہیں جو بڑے غلبہ اور علم کا مالک ہے۔ **والقمر قدرنٰہ منازل** (۳۶/۴۰) چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ تمام اجرام فلکی کے متعلق ہے **کل فی فلک یسبحون** (۳۶/۴۰)۔یہ سب اپنے اپنے مدار (ORBIT) میں تیزی سے تیر رہے ہیں۔ شمس اور قمر دونوں کے متعلق **دائبین** کہا (۱۴/۳۳) یعنی مسلسل حرکت میں رہنے والے۔

جہاں تک روشنی کا تعلق ہے' قرآن کریم میں ہے **جعل الشمس ضیاء والقمر نورا** (۱۰/۵)۔ ضیاء اور نور دونوں کے معنی روشنی کے ہیں۔ لیکن آئمہ لغت نے ان میں فرق یہ بتایا ہے کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو کسی کی ذاتی ہو اور نور اسے جو اس نے کسی سے مستعار لی ہو۔ قرآن نے سورج کی روشنی کو ضیاء سے تعبیر کیا ہے (یعنی اس کی ذاتی روشنی) اور چاند کی روشنی کو نور سے (یعنی دوسرے سے لی ہوئی روشنی)۔ سورہ الشمس میں ہے۔ **والشمس وضحھا والقمر اذا تلھا** (۲-۱/۹۱)۔ اس کے معنی ہیں چاند جو روشنی حاصل کرنے کے لئے سورج کے پیچھے پیچھے جاتا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں۔ وہ اسے سورج سے حاصل کرتا ہے۔

ان اشارات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ سائنس کے انکشافات نے جو کچھ اس وقت تک بتایا ہے وہ قرآن میں بیان کردہ حقائق کے مطابق ہے۔ لہٰذا' اس جہت سے اس نصاب میں تبدیلی کی ضرورت نہیں جو قرآن پر مشتمل ہو' لیکن زمین آسمان کے متعلق جو تعلیم ملا کے ہاں سے ملتی ہے' اس کی روشنی میں چاند سورج کے نہیں بلکہ سائنس کے تمام انکشافات کو دریا برد کر دینا پڑتا ہے۔ وہ ابھی تک زمین کو ساکن بتاتا ہے اور سورج کے متعلق کہتا ہے کہ وہ شام کو خدا کے عرش کے نیچے جا کر چھپ جاتا ہے جہاں سے اسے فرشتے دوسرے دن نکالتے ہیں۔ وہ سردی اور گرمی کے موسموں کے متعلق یہ تحقیق انیق پیش کرتا ہے کہ جب خدا نے جہنم کو پیدا کیا تو اس کا منہ باندھ دیا۔ جہنم نے شکایت کی کہ اس سے تو اس کا دم گھٹتا ہے۔ چنانچہ اسے اجازت دی گئی کہ وہ سال میں ایک مرتبہ سانس اندر کھینچے اور ایک مرتبہ باہر نکالے۔ جب جہنم سانس اندر کھینچتی ہے تو سردی کا موسم آجاتا ہے اور جب وہ اسے باہر نکالتی ہے تو گرمی کا موسم آجاتا ہے۔ اور قیامت یہ ہے کہ وہ ان باتوں کو اس ذات اقدس و اعظم (علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث بتاتا ہے جو علم انسانی کے افق بلند پر فائز تھی یا للعجب! اور جس شخص کی حمیت دینی اس کی اجازت نہ دے کہ وہ اس قسم کی باتوں کو حضورؐ کی طرف منسوب کرے' اسے منکر حدیث قرار دے کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

۴۔ عالم افلاک ------ خارجی کائنات

(قرآن کریم اور روایات کی روشنی میں)

امریکہ کے خلاء نورد' چاند پر گئے' واپس آگئے اور اب وہاں کے سائنس دان ان اشیاء کا تجزیہ کرنے میں مصروف

ہیں جنہیں وہ وہاں سے ساتھ لائے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ابھی تک یہ بحثیں جاری ہیں کہ آیا انسان کے لئے ممکن بھی ہے کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھ سکے۔ چنانچہ اس دوران میں ہمیں متعدد استفسارات موصول ہوئے ہیں جن میں اس موضوع پر قسم قسم کی باتیں دریافت کی گئی ہیں ---- اور دریافت کی گئی ہیں علمی نقطہ نگاہ سے نہیں بلکہ' مذہبی زاویہ نظر سے۔ ان میں بعض استفسارات اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں کی طرف سے بھی ہیں۔ لیکن جو کچھ پوچھا گیا ہے وہ ایسا مضحکہ انگیز ہے کہ وہ باعث حیرت بھی ہے اور وجہ ندامت بھی۔ اس سے بار بار احساس یہ ابھرتا ہے کہ

یاران تیزگام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

ان استفسارات میں' بالواسطہ یا بلاواسطہ' قدر مشترک یہ ہے کہ اجرام فلکی کے متعلق' قرآن کریم نے کیا کہا ہے۔ اور ہم آج کی نشست میں' مختصر طور پر اسی سوال کا جواب پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے' یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم نہ سائنس کی کتاب ہے نہ فلکیات اس کا موضوع ہے۔ وہ سفر حیات میں انسان کو راہنمائی دیتا ہے اور "آدمی" کو "انسانی سطح" پر زندگی بسر کرنے اور اس طرح زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کا طریق بتاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے خالق کائنات' کائنات اور انسانی ممکنات کا ذکر ناگزیر ہے۔ اس میں "ارض و سما" کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسی ضمن میں کہا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ اس خدا کی کتاب ہے جو ارض و سما کا خالق اور علیم و خبیر ہے' اس لئے ہو نہیں سکتا کہ کارگہ کائنات کے متعلق کسی جہت سے بھی اس میں کوئی بات آئی ہو اور وہ حقیقت کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے (یعنی قرآنی) دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں یہ بھی کہا ہے کہ **سنریھم اٰیاتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق** ہم خارجی کائنات اور انسانی دنیا (دونوں) میں انہیں اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تاآنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آ جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ مبنی برحقیقت ہے۔ **اولم یکف بربک انہ علی کل شی شھید** (۴۱/۵۳) یہ اس لئے کہ کائنات کی کوئی شے خدا کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں اور یہی اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ جو کچھ کائنات کے متعلق کہے گا' حقیقت ہوگا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی علم جوں جوں رموز فطرت کو واشگاف اور اسرار کائنات کو بے نقاب کرتا جائے گا' قرآن کی صداقت' حقیقت بن کر سامنے آتی جائے گی۔

دوسری بات یہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ قرآن کریم نے اپنی پہلی سورۃ میں' قصہ آدمؑ کو اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے تو وہ کسی فرد کی داستان نہیں بلکہ خود "آدمی" کے خواص' کیفیات اور ممکنات کا بیان ہے۔ اس تخلیق نو کے خلاف ملا کہ نے یہ اعتراض کیا کہ اسے کس خصوصیت کی بناء پر زمین میں صاحب اقتدار بنایا جا رہا ہے جب کہ اس کے ہیولیٰ کے عناصر اس حقیقت کے غماز ہیں کہ یہ وہاں خوں ریزیاں کرے گا اور فساد انگیزیاں---- (۲/۳۰)۔ اس کے برعکس' ہم ہیں کہ **نسبح بحمدک ونقدس لک** (۲/۳۰) "ہم تیری تسبیح و تقدیس میں مصروف رہتے ہیں"۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ **انی اعلم مالا تعلمون** "ہم وہ کچھ جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے"۔ یہ

کہہ کر انہیں (معاذ اللہ) آمرانہ طریق سے خاموش نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی وجہ بھی بتا دی گئی۔ اور وہ یہ کہ **وعلم ادم الاسماء کلھا** (۲/۳۱) آدمی میں' جملہ اشیائے فطرت کے متعلق علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اس تحصیل علم کی حیثیت محض نظری نہیں تھی۔ اس کا عملی نتیجہ یہ تھا کہ فطرت کی قوتیں آدمی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں۔ آدم مسجود ملا کہ بن گیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ کہہ کر دہرایا ہے کہ **وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ** (۴۵/۱۳) ارض و سماوات میں جو کچھ ہے' خدا نے اسے اپنی طرف سے' تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ کارگہ کائنات کی ہر قوت کو مسخر کر لے۔ لہٰذا ' دنیا میں جب' جہاں اور جو انسان یا قوم' کوئی سائنٹیفک انکشاف اور اس طرح فطرت کی کسی قوت کو مسخر کرے گی تو اس کی یہ کوشش' ہمارے نزدیک ورخور تبریک و تہنیت ہوگی کیونکہ اس سے ایک تو خدا کے اس دعویٰ کا عملی ثبوت سامنے آجائے گا' جسے اس نے ملا کہ کے سامنے پیش کیا تھا اور دوسرے قرآن کریم کے مبنی برحقیقت ہونے کی ایک اور دلیل واضح ہو جائے گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انسان جو چاند پر پہنچا ہے تو عالم اسلامی میں اس تقریب پر چراغاں ہونا چاہیے تھا' لیکن یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب اس قوم کے سامنے خدا کی کتاب بے نقاب ہوتی اور یہ اس پر غوروفکر کرتی' کیونکہ جب اس نے کہا تھا کہ "ارض و سماوات کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے" تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ **ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون** (۱۳/۴۵) اس میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو غوروفکر سے کام لے۔ جو قوم عقل و فکر اور علم و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دے' اس کے لئے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تو ایک طرف' تسخیر فطرت کی اہمیت کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

(۲) اس تمہید کے بعد' ہم موضوع زیر نظر کی طرف آتے ہیں۔ قرآن کریم میں "ارض و سماوات" کے الفاظ بے شمار مقامات پر آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ارض کے معنی ہیں پستی اور سماء کے معنی ہیں بلندی۔ لہٰذا' سماء کے معنی (ہمارے مفہوم کے مطابق) آسمان نہیں ہوگے۔ ہمیں جو کچھ اپنے اوپر دکھائی دیتا ہے وہ سب "سماوات" کے زمرہ میں آجائے گا ---- کرہ ارض کے اوپر فضا' چاند' سورج' ستارے' مرئی اور غیر مرئی' معلوم و نامعلوم' جملہ اجرام فلکی' سب ہمارے لئے سماء ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ ارض (پستی) اور سماء (بلندی) اضافی الفاظ ہیں۔ ہم جو کچھ اپنے اوپر دیکھتے ہیں وہ ہمارے لئے سماء ہے اور اس کے لئے ہم ارض ہیں۔ اور جو کچھ ہمارے نیچے ہے وہ ہمارے لئے ارض ہے اور ہم اس کے لئے سماء' یعنی ہر سماء کی ایک رض ہوتی ہے اور ہر ارض کا ایک سماء۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان مختصر الفاظ میں (نہایت جامعیت سے) بیان کر دیا کہ **اللہ الذی خلق سبع سموت ومن الارض مثلھن** (۶۶/۱۲) خدا وہ ہے جس نے متعدد سموت پیدا کئے اور ہر سماء کے مقابل میں ایک ارض۔ (عربی زبان میں سبع کا لفظ جہاں "سات" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے' وہاں اس سے مراد "متعدد" بھی ہوتے ہیں جیسے ہم اپنے ہاں کہتے ہیں کہ "میں نے تمہیں بیسیوں مرتبہ کہا ہے' سو بار تاکید کی ہے' ہزار بار منع کیا ہے"۔ ان الفاظ سے مراد' متعین طور پر بیس' سو یا ہزار نہیں ہوتا' بلکہ اس سے مقصد بکثرت یا متعدد بار ہوتا ہے۔ اسی

انداز سے عربی زبان میں' سات' ستر' سات سو وغیرہ الفاظ آتے ہیں)۔

(۳) قرآن کریم میں خدا کو **بدیع السموت والارض**(۲/۱۱۷) اور **فاطر السموت والارض** (۶/۱۴) کہا گیا ہے۔ **بدیع یا فاطر** کے معنی ہوتے ہیں وہ جو کسی کام کو پہلی مرتبہ کرے۔ لہٰذا' خدا کے بدیع اور فاطر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارض و سماوات (سلسلہ کائنات) کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ مادی کائنات' ازلی اور قدیمی نہیں۔ خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور اس طرح پیدا کیا ہے کہ اس سے پہلے ان کا وجود ہی نہیں تھا۔

یہ ابتداء کے لئے ہے۔ جہاں تک انتہا کا تعلق ہے' قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے **کل یجری لا جل مسمی** (۱۳/۲) یہ تمام اجرام' ایک مدت معینہ تک کے لئے محو خرام ہیں' یعنی یہ نہ ازلی ہیں نہ ابدی۔ ازلی اور ابدی ہونا صرف خدا کے لئے ہے' مخلوق کے لئے نہیں۔

(۴) تخلیق سماء کے متعلق ایک مقام پر ہے **وھی دخان** (۴۱/۱۱) ابتداء میں یہ دخان تھا۔ دخان دھوئیں' ابخرات اور گیس (GASEOUS MATTER) کو کہتے ہیں۔ یہ (NEBULA) کی وہ ہیئت ہے جس میں اجرام فلکی کی پہلے پہل نمود ہوئی تھی۔ پہلے یہ ہیولی ایک ہی تھا' اس کے بعد اس میں سے "چھینٹے اڑے" اور مختلف اجرام الگ الگ ہوگئے۔ سورہ انبیاء میں ہے **اولم یرالذین کفروا ان السموت والارض کانتا رتقا ففتقنٰھما** (۲۱/۳۰) یہ لوگ جو قرآن کے دعاوی کی صداقتوں سے انکار کرتے ہیں' کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سموت پہلے ایک ہی ہیولی تھے۔ پھر یہ پھٹ کر الگ الگ ہوئے۔ زمین کے متعلق دوسرے مقام میں ہے **والارض بعد ذالک دحھا** (۷۹/۳۰) اس کے بعد زمین کو اس طرح دور پھینکا جس طرح گوپئے سے پتھر کو زناٹے کے ساتھ دور پھینکتے ہیں۔ یہ کرے اس شدت اور تیزی کے ساتھ الگ ہوئے کہ **کل فی فلک یسبحون** (۲۱/۳۳) ان میں سے ہر ایک کرہ' اپنے اپنے مدار (ORBIT) میں' تیرتا چلا جا رہا ہے۔ زمین کی یہ کیفیت ہے کہ یہ تمہیں اپنے اوپر لئے اس انداز سے گھوم رہی ہے کہ تم آرام اور سکون سے بیٹھے رہتے ہو۔ تمہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ محو گردش ہے **تمید بکم** کے یہی معنی ہیں (۱۶/۱۵)۔

پھر یہ کرے' مختلف ادوار (STAGES) میں سے گزرے۔ قرآن کریم میں' **ستتہ ایام** آیا ہے (۱۰/۳) چھ مختلف ادوار۔ کہیں ان مراحل کو کلی طور پر **یومین** (دو مراحل) بھی کہا ہے (۴۱/۱۲)۔ ان میں سے ایک ایک **یوم**' ہزار ہزار' (۳۲/۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار سال (۷۰/۴) کا بتایا گیا ہے۔ (علم انسانی ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا کہ ان ادوار کو متعین کر سکے۔ سائنس کے مزید انکشافات ایک دن اس حقیقت کو بھی واضح کر دیں گے)۔

ان مراحل سے گزرنے کے بعد' زمین پر پانی کی نمود ہوئی اور پانی سے ہر جاندار شے وجود میں آئی۔ **وجعلنا من الماء کل شی حی** (۲۱/۳۰) زندگی کی نمود کے لئے تو پانی کافی تھا لیکن اس کی حفاظت کے لئے کچھ اور بھی درکار تھا۔ یہ وہ کرہ فضائی (ATMOSPHERE) ہے جس کے بغیر یہاں کوئی جاندار مخلوق باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے قرآن نے **سقفا محفوظا** کہہ کر پکارا ہے (۲۱/۳۲)۔ وہ چھت جو خود بھی محفوظ ہے اور ساکنان ارض کے لئے سامان

حفاظت بہم پہنچاتی ہے۔ کرہ فضائی ہمارے لئے کس کس قسم کے سامان حفاظت بہم پہنچاتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چاند اگرچہ زمین کا توام ہے لیکن اس پر زندگی کی نمود نہیں ہو سکی۔ یہ اس لئے کہ اس کے اوپر کرہ فضائی نہیں ہے۔ اگر ہمارے سر پر بھی یہ "سقف محفوظ" نہ ہوتی تو ہماری زمین بھی چاند کی طرح ویرانہ ہوتی۔

(۵) یہ اجرام اپنے ابتداء ہیولیٰ سے الگ ہوئے اور اپنے اپنے مدار میں مصروف گردش ہو گئے' لیکن ان میں اس قسم کی باہمی کشش پیدا کی گئی کہ یہ فضا میں معلق ہیں۔ نہ گرتے ہیں نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس کشش کو قرآن کریم نے غیر مرئی ستون (INVISIBLE PILLARS) کہہ کر پکارا ہے۔ سورہ الرعد میں ہے **اللہ الذی رفع السموت بغیر عمد ترونھا** (۱۳/۲) اللہ وہ ہے جس نے اجرام سماوی کو ایسے ستونوں سے بلندی پر تھام رکھا ہے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ "دیکھ نہیں سکتے" کہا ہے' "سمجھ نہیں سکتے" نہیں کہا۔

(۶) کائنات کا یہ سلسلہ اس قدر وسعت ناآشنا اور تحیر انگیز ہے کہ انسانی فکر اس کے کسی ایک ادنیٰ سے گوشے کو بھی بہ نگاہ تعمق دیکھے تو اس کا سر چکرا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ تمام سلسلہ جس نظم و نسق کے ساتھ سرگرم عمل ہے' اس کی بنیاد کیا ہے؟ قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں سمو کر رکھ دیا ہے اور وہ لفظ ہے "خدا کا امر" ---- یعنی قانون خداوندی ---- یہ محیرالعقول کارگہ کائنات' قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ **والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ** (۷/۵۴) سورج' چاند' ستارے' سب خدا کے قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اس کے قانون کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آتی **ولن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا** (۳۳/۶۲)۔ یہ قانون خداوندی کا محکم اور غیر متبدل ہونا ہے کہ انسان' زمین پر بیٹھا' محض حسابی قاعدے سے' ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے اور اس کا کوئی نشانہ خطا نہیں جاتا۔ یہ قانون اس قدر اٹل ہے کہ اس کے بھروسے پر' ایک خلانورد' اپنے جہاز سے باہر نکل کر' فضا میں ٹہلنے لگ جاتا ہے اور امریکہ کا کنٹرول اسٹیشن' دو لاکھ اسی ہزار میل کے فاصلے سے' نیچے بیٹھا' چاند پر جانے والے جہاز کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا اور خلانوردوں کو ہدایات دیتا ہے۔ اور یہ اس کے قانون ہی کی محکمیت ہے جس کے بل بوتے پر' زمین سے چھ کروڑ میل دور' فضائی جہاز' مریخ کی تصویریں ٹیلیویژن پر بھیج رہا ہے۔ یہ اس کے محکم قانون ہی کی کارفرمائی ہے جس سے یہ حالت ہے کہ **والشمس تجری لمستقرلھا** سورج اپنے مدار ہی کے گرد گردش نہیں کرتا' بلکہ (اپنے پورے نظام کو ساتھ لئے) کسی اور منزل کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے جو اس کا مستقر ہے۔ **ذالک تقدیر العزیز العلیم** (۳۶/۳۸) یہ اس خدا کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق ہو رہا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور اس کی قوت علم پر مبنی ہے۔ یہ اس کے قانون ہی کی کارفرمائی ہے کہ **والقمر قدرنہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم** (۳۶/۳۹) خدا نے چاند کے لئے منازل مقرر کر دی ہیں جن کی وجہ سے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پہلی رات ناخن کی طرح باریک سا ہمارے سامنے آتا ہے' آہستہ آہستہ مہ کامل بن جاتا ہے۔ پھر گھٹتے گھٹتے اسی طرح باریک سی ٹہنی کی طرح نظر آتا ہے۔

اور یہ اسی کا قانون ہے جس کے مطابق **لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر** کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ

سورج جیسا عظیم الجثہ کرہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر' چاند کے اوپر چڑھ جائے۔ **ولا الیل سابق النھار** نہ ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دن اور رات کی گردشیں الٹی ہو جائیں۔ **وکل فی فلک یسبحون** (۳۶/۴۰) ہر کرہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔ ان کروں کی غیر متبدل گردشوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں کیلنڈر مقرر کرتے ہیں جو انسان کی تمدنی زندگی کے لئے اس قدر ناگزیر ہے۔ **الشمس والقمر بحسبان** ص (۵۵/۵) چاند اور سورج نہایت محکم حسابی قاعدے کے مطابق چل رہے ہیں اور ان کی یہ منازل اس لئے مقرر کی گئی ہیں **لتعلموا عدد السنین والحساب** (۱۰/۵) تاکہ تم ان سے سالوں کی گنتی اور مختلف قسم کے حساب کر سکو (نیز ۱۲/۱۷)۔

(۷) قرآن کریم میں سورج کو ضیاء اور چاند کو نور کہا گیا ہے (۱۰/۵)۔ ویسے تو ضیاء اور نور دونوں کے معنی روشنی ہیں' لیکن لغت کی رو سے' عام طور پر ضیاء کسی کی اپنی روشنی کو کہتے ہیں اور نور اس روشنی کو جسے کسی اور سے اکتساب کیا گیا ہو۔ سورہ الشمس میں اس کی وضاحت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ **والشمس وضحھا** سورج اور اس کی روشنی **والقمر اذا تلھا** (۲-۱/۹۱) اور چاند جب وہ روشنی مستعار لینے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ وہ سورج سے روشنی کی بھیک مانگتا ہے اور بھکاریوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ کیسا حسین ہے یہ استعارہ' اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ چاند' جو لوگوں کی نگاہوں میں بقعہ نور ہوتا ہے' خود روشن نہیں بلکہ اپنی روشنی کے لئے سورج کا محتاج ہے۔ یہ سورج کی روشنی ہے جو اس سے منعکس ہوتی ہے۔

(۸) فلکیات کے ضمن میں قرآن کریم میں ایک آیت ہے .....

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس آیت کو درج کریں' اسے ذہن میں رکھئے کہ یہ آیت لوگوں کے سامنے چھٹی صدی عیسوی میں آتی ہے۔ اس زمانے میں فلکیات سے متعلق انسانی علم کی جو کیفیت تھی وہ ارباب علم سے پوشیدہ نہیں۔

پھر جس شخصؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ دنیا تک پہنچتے ہیں وہ اس ملک کا رہنے والا ہے جو اس زمانے میں بھی' دیگر اقوام کے مقابلہ میں' علمی تحقیقات میں بہت پیچھے تھا۔ "علمی تحقیقات" تو ایک طرف' وہ لوگ زندگی کے عام حقائق سے بھی نا آشنا تھے۔

اور جس شخصؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں' وہ خود ای تھا' یعنی نزول قرآن سے پہلے' پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتا تھا۔ وہ شخصؐ اس زمانے میں' اور اس ملک میں' اعلان کرتا ہے کہ

ومن ایتہ خلق السموت والارض وما بث فیھما من دابتہ وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر۔ (۴۲/۲۹)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سموت کی تخلیق کی اور ان دونوں میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ (اس وقت یہ سب الگ الگ ہیں لیکن) خدا اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اپنے قانون مشیت کے مطابق' جب چاہے' ان اجرام میں باہمی رابطہ پیدا کر دے (یا ان کی آبادیوں کو ملا دے)۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں' سرزمین عرب کا ایک امیؐ تو ایک طرف' ابھی کل تک' دنیا کا بڑے سے بڑا سائنٹسٹ بھی یہ کہہ سکتا تھا کہ زمین اور آسمانی کروں میں باہمی ربط و ضبط پیدا ہو سکتا ہے؟ اور یہ کہ آسمانی کروں میں زندگی کا امکان ہے؟ کیا یہ ایک آیت' اس دعویٰ کی مثبت دلیل نہیں کہ قرآن' کسی انسان کے فکر کی تخلیق نہیں۔ اس کا سرچشمہ ماورائے علم انسانی ہے۔ اسی کو وحی خداوندی کہتے ہیں۔ یہ عظیم حقیقت تو ایک طرف' اس زمانے میں تو یہ بات بھی کسی کے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ آسمانی کروں کو انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس عہد میں تو انسان چاند سورج اور ستاروں کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کیا کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور یہ کچھ ابھی کل تک ہوتا تھا اور آج بھی بعض مقامات پر ہو رہا ہے ---- یہ قرآن تھا جس نے ان لوگوں سے کہا کہ **لا تسجدو للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن** (۴۱/۳۷) سورج اور چاند کو سجدے مت کرو۔ ان کے سامنے مت جھکو۔ اس خدا کے سامنے جھکو جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ اس نے اسے بھی واضح کر دیا کہ **لخلق السموت والارض اکبر من خلق الناس** (۴۰/۵۷) خارجی کائنات کی تخلیق' انسان کی پیدائش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خدا کی کبریائی کی متقاضی تھی۔ لیکن چونکہ انسان کو عظیم قوتوں کا حامل بنایا گیا ہے' اس لئے یہ مسجود کائنات ہے' کائنات اس کی معبود نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اسے اجرام فلکی کے سامنے سجدہ ریز ہونا نہیں چاہیے۔ ایسا کرنا شرف انسانیت کی تذلیل ہے۔

(۹) بہرحال' یہ تھی اس زمانے میں انسان کی ذہنی اور علمی سطح۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مفسرین حضرات بھی اسی زمانے کی پیداوار اور اسی ماحول سے متاثر تھے' اس لئے انہوں نے ان آیات قرآن کی تفسیر' اپنے دور کے رائج الوقت خیالات کے مطابق کی ---- وہ یہی کر سکتے تھے۔ (مثلاً") ہمارے ہاں امام ابن کثیرؒ کی تفسیر بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے تخلیق ارض سموت کے سلسلہ میں مختلف آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> حضرت ابن مسعودؓ' حضرت ابن عباسؓ اور دیگر صحابہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا۔ اور جب مخلوق کو رچانا چاہا تو پانی سے دھواں بلند کیا۔ وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے۔ پھر پانی خشک ہو گیا اور اس کی زمین بنائی۔ پھر اسی کو الگ الگ کر کے سات زمینیں بنائیں۔ اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں۔ زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے **ن والقلم**۔ مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور فرشتے پر اور فرشتہ پتھر پر اور یہ پتھر وہ ہے جس کا ذکر حضرت لقمان نے کیا ہے۔ یہ پتھر ہوا پر ہے۔ مچھلی کے ہلنے سے زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا اور وہ ٹھہر گئی۔
>
> (پارہ اول' اردو ترجمہ' ص ۷۶)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا۔ اس سے جو دھواں اوپر چڑھا اس کے آسمان بنائے جو ایک پر ایک' اس طرح سات ہیں اور زمینیں ایک کے نیچے ایک' اس طرح سات ہیں۔

چوبیسویں پارہ (سورہ فصلت/حم سجدہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ابن حریرؒ کی روایت میں ہے کہ یہودیوں نے حضورؐ سے آسمان و زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اتوار اور پیر کے دن اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا اور جتنے منفعے ان میں ہیں۔ اور بدھ کے دن درختوں کو' پانی کو' شہروں کو اور آبادی اور ویرانے کو پیدا کیا تو یہ چار دن ہوئے ..... جمعرات والے دن آسمان کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستاروں کو اور سورج' چاند کو اور فرشتوں کو پیدا کیا تین ساعت کے رہنے تک۔ (ص ۵۶-۵۵)

یہ حضرات' اپنے زمانے کے مروجہ خیال کے مطابق' اس نیلگوں فضا کو آسمان کہتے تھے جو ہمیں اپنے سر پر نظر آتی ہے۔ وہ اسے چوڑا اور ہموار سمجھتے تھے۔ اور سبع سموت سے مراد یہ لیتے تھے کہ اسی قسم کے سات آسمان' درمیانی فاصلوں کے بعد' اوپر تلے رکھے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ سورہ نازعات کی تفسیر کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

آسمان کو اس نے بنایا' یعنی بلند و بالا خوب چوڑا اور کشادہ اور بالکل برابر بنایا۔ پھر اندھیری راتوں میں خوب چمکنے والے ستارے اس میں جڑ دیئے۔ (ص ۸)

ہماری کتب تفاسیر میں زمین اور آسمان کے متعلق اسی قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ اس میں ان حضرات کا کوئی قصور نہیں۔ اس زمانے کی علمی سطح ہی ایسی تھی۔ اگر ہم اس زمانے میں ہوتے تو ہم بھی یہی کچھ لکھتے۔ ان حضرات کے مقابلہ میں ہماری پوزیشن اس لئے بہتر (ADVANTAGEOUS) ہے کہ ہمارے زمانے کی علمی سطح بلند ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ہم رموز کائنات' فلہذا' قرآن کو سمجھنے کے زیادہ قابل ہو گئے ہیں۔

ان تفاسیر نے جو خرابی پیدا کی ہے وہ ان کے اس قسم کے مندرجات کی وجہ سے نہیں' بلکہ ہمارے ہاں کے ایک غلط زاویہ نگاہ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ تفاسیر ہمارے دینی مکتبوں اور دارالعلوموں میں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے متعلق عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا ہے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے حرفاً" حرفاً" صحیح ہے۔ ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا سخت گناہ ہے کیونکہ سلف صالحین کی اتباع ہی اصل دین ہے۔ معاملہ اگر یہاں تک ہی رہتا تو اس سے کسی نہ کسی طرح بچاؤ کی صورت نکل سکتی تھی ---- ہم میں وہ گروہ بھی تو ہے جو تقلید ائمہ کو جائز نہیں قرار دیتا --- لیکن معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا۔ ان (مفسرین) حضرات نے جو کچھ لکھا اس کے متعلق یہ نہیں کہا کہ وہ ان کے اپنے خیالات ہیں۔ کہا یہ کہ وہ تفسیر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ہے۔ اس سے اصل دشواری پیدا ہوئی۔ ان مفسرین کے اقوال سے یہ کہہ کر اختلاف کرنے کی جرات کر لی جا سکتی تھی کہ وہ بالاخر ہمارے ہی جیسے انسانوں کے خیالات ہیں۔

لیکن جب کہا یہ جائے کہ وہ خیالات ان حضرات کے اپنے نہیں' بلکہ خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی ہیں تو ان سے اختلاف یا تنقید کرنے کی جرات کس مسلمان کو ہو سکتی ہے؟ اس سے ان تفسیری اقوال نے' غیر متبدل دین کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب اگر کوئی علمی تحقیق یا سائنٹیفک انکشاف ان اقوال میں سے کسی کے خلاف جاتا ہے تو ہمارے ہاں عجیب صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ قدامت پسند طبقہ یا تو اس قسم کے مشاہداتی انکشاف ہی سے انکار کر دیتا ہے اور یا اس میں اور اپنے ہاں کے تفسیری اقوال میں مطابقت پیدا کرنے کی بے معنی کوشش کرتا ہے۔ دوسری طرف' جب نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ دیکھتا ہے کہ جن باتوں کو ان کے سامنے اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے وہ علمی تحقیقات پر پورا نہیں اترتیں' تو وہ اسلام ہی سے متنفر ہو جاتا اور سرکشی اختیار کر لیتا ہے۔ (مثلاً") حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں' حضرت عباسؓ کی ایک روایت میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک (۷۱) یا (۷۲) یا (۷۳) سال کی راہ ہے۔ اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے۔ ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔

آپ سوچئے کہ جب اس روایت کو کالج کے کسی طالب علم کے سامنے پیش کیا جائے --- اور پیش کیا جائے یہ کہہ کر کہ حضور نبی اکرمؐ نے ایسا فرمایا ہے --- تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ یہ (اور اسی قسم کی دیگر روایات) رسولؐ اللہ کے ارشادات ہو نہیں سکتے۔ یہ روایات وضعی ہیں ----اور یہ دعویٰ کوئی نیا نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں' مغازی' ملاحم اور تفسیر---- لیکن ہمارا قدامت پسند طبقہ ہے کہ زور دیئے جاتا ہے کہ ان تمام روایات کو رسولؐ اللہ کے ارشادات تسلیم کرو۔ اور جس کی غیرت ایمانی اور ذات رسالت مابؐ کی عظمت کا احساس اسے ایسا کرنے سے روکے' اسے منکر حدیث اور نہ جانے کیا کیا قرار دے کر' حوالہ دار و رسن کرنے کے فتوے صادر کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ خرابی جو اس قسم کے تفسیری اقوال کو یہ حیثیت دے دینے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ہم اپنے اس بنیادی نظریہ کی اصلاح نہیں کریں گے اس خرابی کے ازالہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی اور ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے برگشتہ ہوتا چلا جائے گا۔

اب رہے وہ حضرات جو سائنس کے کسی انکشاف یا علمی تحقیق کے نتیجہ' اور اس قسم کے اقوال میں تطبیق کی کوشش کرتے ہیں' تو وہ معاملہ کو اور بھی مضحکہ انگیز بنا دیتے ہیں۔ مثلاً" ہمارے ہاں شق القمر کا معجزہ مشہور ہے (ہمیں حال میں جو استفسارات موصول ہوئے ہیں اور جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر میں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے)۔ ہمارے زمانے میں' سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کو بڑے سائیٹفک انداز سے پیش کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تفسیر (تفہیم القرآن) میں اس

بات سے تو انکار کیا ہے کہ یہ واقعہ حضور نبی اکرمؐ کے معجزہ کے طور پر ظہور میں آیا تھا' لیکن نفس واقعہ سے انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

> تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً (۵) سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

> معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اول تو ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کہ چاند جیسے عظیم کرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سیکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دور ہو جانے کے بعد پھر باہم جڑ جائیں۔ دوسرے وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر آتا اور علم نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا۔

ان اعتراضات کو سامنے لانے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

> درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے' قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں' ان کی بناء پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔

اس توجیہہ کو اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں پیش کر کے داد تحسین حاصل کر لینا تو آسان ہے' لیکن آپ اسے دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان تو ایک طرف ' سائنس کے کسی عام طالب علم کے سامنے پیش کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اس کا کس طرح مذاق اڑاتا ہے۔ باقی رہا دوسرا اعتراض' تو اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> رہا دوسرا اعتراض' تو وہ اس لئے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لئے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان

کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ پوری روئے زمین پر اسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا' وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مورخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم' مالابار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں' تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جبکہ چاند کی رفتار اور اس کے گردش کے راستے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی' اس لئے قدیم زمانے کے اہل تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں رصد گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔ (ترجمان القرآن' بابت مئی ۱۹۶۷ء' صفحہ ۱۵۱)

یہ ہے جو ہمارے ساتھ "مذہب اور سائنس" کی کشمکش کے سلسلہ میں ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم نے اپنے غلط نقطہ نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ کی تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو یورپ میں ہوا ہے۔ نقطہ نگاہ میں تبدیلی سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کے حقائق کو اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق سمجھا جائے اور کسی فرد یا زمانے کے فہم قرآن کو حرف آخر اور قول فیصل قرار نہ دیا جائے۔ باقی رہیں تفسیری روایات' سو ان کے متعلق امام احمد بن حنبلؒ کا سا موقف اختیار کیا جائے' یعنی یہ کہا جائے کہ وہ وضعی روایات ہیں اور ان کی نسبت حضور نبیؐ اکرم کی طرف صحیح نہیں۔

(۱۰) یہ تو رہی ہماری غلط فہمی۔ دوسری طرف' اہل مغرب کی کج نظری بھی کچھ کم تباہی کا موجب نہیں۔ ان کا نظریہ زندگی یہ ہے کہ۔

(۱) یہ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور طبیعی قوانین فطرت کی رو سے ازخود سرگرم عمل ہے - نہ اس کے پیچھے کوئی علیم و خبیر' صاحب اختیار و ارادہ ہستی ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق کا کوئی مقصد ہے۔

(۲) انسان بھی اسی کائنات کا ایک جزو ہے' اس لئے اس کی بھی تخلیق کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ہی اس کی کوئی منزل - اس کی زندگی بھی طبیعی قوانین کے تابع رہتی ہے۔ ان سے الگ اور بالاتر کوئی قوانین نہیں۔ موت سے ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بس!

(۳) باقی رہی انسان کی تمدنی زندگی' سو اس کے لئے ہر قوم اپنے اپنے قوانین خود وضع کرے گی۔ ان قوانین کا بنیادی مقصد یہ ہوگا کہ وہ قوم کس طرح زیادہ سے زیادہ قوت حاصل کر کے' باقی اقوام پر غلبہ و تسلط حاصل کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے مطابق' انسانی زندگی' حیوانی سطح کی رہ جاتی ہے اور اس کا قانون "جنگل کا آئین" جس میں ہر بڑی قوت کا مالک حیوان' کمزوروں کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ اب سوچئے کہ نظریہ زندگی ہو یہ' اور مختلف قوموں میں' حصول قوت کے لئے ریس (RACE) جاری ہو تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی جس کی رو سے آج یہ دنیا جہنم بن رہی ہے اور انسان اپنے ہی نہیں' خود اس کرۂ ارض کے مستقبل کے تصور سے سہمے چلا جاتا ہے۔ جس نسبت سے انسان فطرت کی قوتوں کو مسخر کئے جاتا ہے اسی نسبت سے انسانی قلوب خوف و ہراس کا نشیمن بنتے چلے جاتے ہیں۔

اس نظریہ زندگی کے خلاف' قرآن کریم نے' تسخیر کائنات کے لئے تاکید کے ساتھ' اس حقیقت کو بھی اتنی ہی' بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ بیان کیا ہے **ما خلقنا السماء والارض وما بینھما لاعبین** (۲۱/۱۶) ہم نے اس ارض و سما' اس کارگہ کائنات کو یونہی کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اسے ایک عظیم مقصد کے لئے بالحق پیدا کیا ہے **وخلق اللہ السموات والارض بالحق** (۴۵/۲۲)۔ بالحق پیدا کرنے کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ **ولتجزی کل نفس بما کسبت وھم لا یظلمون** (۴۵/۲۲) ہر شخص کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے **لیجزی الذین اساء وا بما عملوا ویجزی الذین احسنوا بالحسنی** (۵۳/۳۱) تاکہ جو غلط روش اختیار کرتا ہے اسے اس کے کاموں کا بدلہ ملے اور جو حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتا ہے اس کے اعمال کے خوشگوار نتائج اس کے سامنے آئیں' یعنی تخلیق ارض و سموت کا ایک مقصد یہ ہے کہ انسان کا کوئی کام بلا نتیجہ نہ رہ جائے' خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں اس کے سامنے آجائے یا مرنے کے بعد کی زندگی میں۔ یہ خوشگوار نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب انسان اپنی تمدنی زندگی کو وحی خداوندی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھے --- یہ اقدار اب قرآن کریم کی دو تین میں محفوظ ہیں۔ ان میں بنیادی قدر یہ ہے کہ **ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (۱۳/۱۷) وہی نظریہ زندگی' وہی نظام حیات' وہی قوت' وہی اقتدار بقا کا مستحق ہے جو تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ یہی وہ نظریہ زندگی ہے جس میں انسان ہر قسم کے خوف و حزن سے مامون رہ سکتا ہے۔ اس لئے کہ جب (قصہ آدم کے تمثیلی بیان میں) آدم کے متعلق کہا تھا کہ اس میں' فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ **فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** (۲/۳۸) جو خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی کا اتباع کرے گا' انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

بنا بریں' ہمارے سامنے تین گروہ آتے ہیں۔

۱۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدار خداوندی کے مطابق نوع انسان کی منفعت کے لئے صرف کریں' انہیں جماعت مومنین کہا جائے گا۔

۲۔ جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں صرف اپنے اقتدار کی خاطر کام میں لائیں' یہ مغرب کی خدا فراموش قومیں ہیں۔ انہیں مقام مومن نصیب تو نہیں ہو سکا لیکن مقام آدم تک ضرور پہنچ گئیں ---- اور

پہنچ رہی ---- ہیں --- اور

۳- جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہ کریں اور اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں مگن رہیں --- انہیں مقام مومن تو کجا' مقام آدمیت بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ **خسر الدنیا والاخرۃ ذالک ھو الخسران المبین** (۲۲/۱۱) ان کے حصہ میں حال اور مستقبل دونوں کی تباہی آتی ہے۔

اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرہ میں ہوتا ہے۔

-------☆☆-------

آخر میں ایک اور حقیقت کا سامنے لانا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوگا جس کی طرف قرآن کریم نے نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ انسان اس وقت تو بڑے فخر و ناز سے آسمانی کروں کی طرف پرواز کرتا اور وہاں کے حقائق مستور کو بڑے طرب و نشاط سے واشگاف کرتا ہے۔ اسے سب سے زیادہ تلاش اس کی ہے کہ کسی کرہ میں زندہ آبادی مل جائے۔ لیکن اگر ایسا ہوا کہ وہ آبادی اس سے زیادہ ارتقاء یافتہ ہوئی' تو سوچئے کہ اس وقت انسان کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ اس لئے کہ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ **ولقد کرمنا بنی ادم** ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ **وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** (۱۷/۷۰) ہم نے انہیں (بنی آدم کو) اپنی مخلوق میں سے اکثر پر۔ فضیلت دی ہے۔ "تمام مخلوق" پر نہیں' مخلوق میں سے اکثر پر۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں ایسی مخلوق بھی ہے جو انسان سے افضل ہے۔ لہٰذا' ثریا پرواز اور کہکشاں گیر انسان کو ان کروں پر ذرا سنبھل کر قدم رکھنا چاہیے اور آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی خاک نشینی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ (ستمبر ۱۹۶۹ء)

۶- اسلامی کیلنڈر

شمسی ------ یا ------ قمری

سوال :- کیلنڈر کو عام معاملات میں جو اہمیت حاصل ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کاروبار اسی صورت میں چل سکتا ہے کہ آنے والی تاریخوں اور دنوں کا یقینی طور پر علم ہو۔ قمری کیلنڈر سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ کاروبار تو ایک طرف' اس سے اسلامی تہواروں تک کا بھی تعین نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ ازروئے اسلام قمری کیلنڈر رکھنے پر مجبور ہیں یا اسے شمسی کیلنڈر میں بدلا جا سکتا ہے؟

جواب:- قرآن مجید میں چاند اور سورج دونوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ حساب رکھنے کا ذریعہ ہیں **والشمس والقمر حسبانا** (۶/۹۷ و دیگر مقامات)۔ چاند کی رو سے حساب کے سلسلہ میں' کیلنڈر کے علاوہ' مدوجزر وغیرہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ساحل سمندر کے رہنے والے کر سکتے ہیں۔ جہاں تک کیلنڈر کا تعلق ہے بدوی یا دیہاتی زندگی میں جب (اور جہاں) حساب رکھنے میں دقت ہو' چاند کی رو سے تاریخوں کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوتی

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام میں عام طور پر چاند ہی کی رو سے حساب رکھا جاتا تھا۔ یہودیوں کے ہاں' نیز ایران اور ہندوستان میں قمری کیلنڈر رائج تھا۔ لیکن اس کیلنڈر میں ایک نقص یہ تھا کہ اس کی رو سے ہر سال' ایک خاص دن اسی موسم میں نہیں آتا تھا۔ موسموں کی تبدیلی سورج کی رو سے ہوتی ہے۔ اور قمری کیلنڈر ہر سال (قریب) دس دن پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہودی' ایرانی اور ہندی اپنے مذہبی تہواروں کو خاص موسموں میں منانا چاہتے تھے اور یہ چیز قمری کیلنڈر کی رو سے ممکن نہ تھی۔ اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے انہوں نے کیا یہ تھا کہ وہ ہر تیسرے سال ایک مہینے کا اضافہ کر کے' سال' بارہ کے بجائے تیرہ مہینے کا شمار کر لیتے تھے۔ اس طرح تہوار منانے میں ہر سال چند دنوں کا فرق تو ضرور پڑتا تھا' لیکن موسم وہی رہتا تھا۔ اور تیسرے سال کے بعد' پھر تہوار اپنے پہلے وقت پر آجاتا تھا۔ ظہور اسلام سے پہلے عرب بھی' یہودیوں کے تتبع میں ایسا ہی کرتے تھے۔ ان کے ہاں کیلنڈر قمری تھا لیکن وہ ہر تیسرے سال ایک ماہ کا اضافہ کر کے' اسے شمسی کے برابر کر لیتے تھے اور اس طرح ان کے تہوار (بالخصوص حج' جو ان کا سب سے بڑا مرکزی اور قومی تہوار تھا) ایک ہی موسم میں آتے تھے۔

لیکن عربی معاشرہ میں ایک اور رسم بھی تھی۔ انہوں نے سال میں چار مہینے (ذی قعدہ' ذوالحجہ' محرم اور رجب) ایسے متعین کر رکھے تھے جن میں لوٹ مار اور جنگ و جدال منع تھا۔ انہیں حرمت کے مہینے کہا جاتا تھا۔ جب سال تیرہ مہینوں کا آتا تو حرمت کے مہینوں کا تعین مشکل ہو جاتا۔ یہ فریضہ کعبہ کے پجاریوں میں سے ایک قبیلہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ وہ (جیسا کہ ہر جگہ پجاریوں کے ہاں ہوتا ہے) اپنے اس اختیار کا بڑا ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ وہ خاص مفادات کے پیش نظر ان مہینوں میں ردوبدل کرتے رہتے تھے (اسے اصطلاح میں نسئ کہا جاتا تھا۔ وہ لوند کے سال کے علاوہ' ویسے بھی ان مہینوں میں ردوبدل کر دیتے تھے)۔ فتح مکہ کے بعد جب حج کا اہتمام جماعت مومنین کے ہاتھ میں آیا تو (دیگر امور کے ساتھ) کیلنڈر میں بھی خاص اصلاح کی گئی۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ فیصلہ کر دیا کہ :-

ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا فی کتاب الله یوم خلق السموت والارض منها اربعته حرم ذالک الدین القیم(۹/۳۶)

یاد رکھو! مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس قانون فطرت کے مطابق ہے جسے خدا نے تخلیق ارض و سما کے وقت سے نازل کر رکھا ہے۔ ان میں چار مہینے حرمت کے ہیں۔ یہی نظام محکم ہے۔

قانون فطرت کے مطابق' زمین' سورج کے گرد' قریب ۳۶۵ دن میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے۔ اس کو ایک سال کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بارہ مہینوں میں ایک سال (یعنی زمین کا چکر) اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ۳۶۵ دنوں کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینے مقرر کر لئے جائیں۔ یہ شمسی حساب ہی سے ہو سکتا ہے۔ قمری کیلنڈر کی رو سے سال کے قریب ۳۵۴ دن بنتے ہیں --- اس میں سورج کے گرد' زمین کا چکر پورا نہیں ہوتا۔ اس حساب سے ہمارا کیلنڈر شمسی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ہم نے سال کے مہینے بارہ کر لئے لیکن کیلنڈر قمری رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہمارے

تہوار مختلف موسموں میں آتے ہیں اور ہمارا سال بھی شمسی کے مقابلہ میں دس دن کم رہتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا کیلنڈر شمسی رکھ لیں تو یہ اسلام کے خلاف نہیں ہوگا' بلکہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہوگا۔ اس سے ہمارے تہوار بھی متعین موسموں میں آیا کریں گے اور وہ تمام دشواریاں بھی رفع ہو جائیں گی جو قمری حساب کی رو سے آئے دن پیش آتی رہتی ہیں۔ نیز اس سے "دین اور دنیا کی وہ ثنویت" بھی ختم ہو جائے گی جس کی رو سے ہمیں کاروبار کے لئے ایک قسم کا (شمسی) کیلنڈر استعمال کرنا پڑتا ہے اور "مذہبی امور" کے لئے دوسری قسم کا (قمری) کیلنڈر۔ ساری دنیا میں (غالباً) مسلمانوں کا کیلنڈر ہی ایسا ہے جو قمری بھی ہے اور اس میں لوند کا سال بھی نہیں آتا۔

باقی رہا چاند کی رو سے مذہبی تہواروں کا تعین' سو اس کے لئے اگر چاند دیکھنے کی شرط کی بجائے حسابی قاعدہ سے چاند نکلنے کا تعین کر لیا جائے تو کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نہ تو شمسی کیلنڈر پر رضامند ہوگی اور نہ ہی حسابی قاعدے سے قمری کیلنڈر کے تعین پر۔ اس لئے کہ اس سے ان کی اجارہ داری ختم ہو جاتی ہے اور انہیں ابتری پھیلانے کا موقع نہیں ملتا۔ امت کے فکر و عمل میں وحدت' مذہبی پیشوائیت کے لئے پیام مرگ ہوتی ہے۔ (جون ۱۹۶۶ء)

۶۔ کیا مردوں کی آنکھیں زندہ اندھوں کو لگائی جا سکتی ہیں؟

آج کل دنیا کے "ملحدوں اور دہریوں" نے بعد از کاوش و تحقیق بسیار' اس امر کا امکان پیدا کر دیا ہے کہ مردے کے اعضاء(جو انسان کی موت کے بعد گل سڑ جاتے ہیں انہیں) زندہ انسانوں کے جسم میں پیوست کر کے' خلق خدا کو اس سے فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے' لیکن "خدا پرست" ان کے خلاف لٹھ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ .... "از روئے شریعت حقہ" ..... یہ عمل یکسر ناجائز ہے (جس طرح اس سے پہلے لاؤڈ سپیکر کا استعمال از روئے شریعت حرام تھا اور آج کوئی مسجد ایسی نہیں جس میں لاؤڈ سپیکر نصب نہ ہو)۔ اس کے حق میں دلائل کس قسم کے دیئے جاتے ہیں' وہ سننے کے قابل ہیں۔

:.. عت اسلامی کے ترجمان ایشیا کی ۲۴ مارچ کی اشاعت میں' ملک غلام علی صاحب' معاون امیر جماعت اسلامی' کے قلم سے ایک سوال کے جواب میں مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :۔ ا؎

> اس بارے میں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اسلام نے میت کی تکفین و تدفین کے بارے میں جو ہدایات دی ہیں' ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مردے کی تکریم اسی طرح ضروری ہے جس طرح زندہ کی۔

یہ ہوا' ان کے نزدیک' اسلام کا حکم۔ اس کے بعد ارشاد ہے:۔

ا؎ واضح رہے کہ ملک غلام علی صاحب کا جواب مبنی ہے خود مودودی صاحب کے اس مضمون پر جسے انہوں نے رسائل و مسائل حصہ سوم (ص۲۹۷) پر شائع کیا تھا۔ اگرچہ ملک صاحب نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔

واضح احکام بے معنی نہیں ہیں۔ اگر ہم نے زندوں کے نفع کے لئے مردوں کے اعضاء کی قطع و برید کا دروازہ کھول دیا' تو پھر اس میں کوئی انتہا نہ رہے گی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک وقت آئے جب مردے کے تمام اعضائے رئیسہ زندہ جسم میں تقلیم کئے جا سکیں۔ پھر اس وقت اس کی حدبندی مشکل ہو جائے گی کہ کس عضو کو مردے کے جسم پر باقی چھوڑا جائے اور کس کو کاٹ لیا جائے۔ بالکل ممکن ہے کہ مردے کی بوٹی بوٹی ہاتھوں ہاتھ اڑالی جائے۔ اگر مردے کی آنکھ کسی زندہ کی بینائی کی بحالی کے لئے درکار ہو گی تو اس کا دل' اس کا پتہ' اس کا جگر' اس کے گردے اور دیگر اعضاء کیوں قابل استعمال نہ ہوں گے اور ان سے سرجری کی وساطت سے کسی کی جان کیوں نہ بچائی جا سکے گی۔ اس کے بعد کون سی حد ہوگی جہاں آدمی رک کر یہ کہہ سکے گا کہ مردے کے ان اعضاء سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور مردے کہاں باقی رہ جائیں گے کہ ان کے احترام کے لئے ہدایات کی ضرورت ہو؟ ایسے مسائل میں جواز کے دروازے کھولنا درحقیقت فتنوں کے طوفانوں کے لئے راہ بنانا ہے۔ اس لئے میری رائے میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ یہ عمل اسلام کے کسی اصول کے مطابق مستحسن و پسندیدہ ہے۔

یعنی اگر کسی مردے کی آنکھوں سے ایک زندہ نابینا کو عمر بھر کے لئے بینائی مل سکتی ہے' تو اسے اس بینائی سے محروم رکھیئے (اسے اندھے کا اندھا رہنے دیجئے)' کیونکہ اسے بینائی عطا کرنے سے ..... "مردے کی بے حرمتی"..... ہوتی ہے اور یہ چیز اسلام کے خلاف ہے! یعنی اگر اندھے کو آنکھیں مل جائیں' تو یہ اسلام کے خلاف ہوگا اور مردے کی آنکھیں گل سڑ کر بے کار چلی جائیں تو یہ عین مطابق اسلام ہوگا! ہم اس سلسلہ میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ۔

خدا اسلام کو اس کے ان دوستوں سے بچائے۔

(مئی ۱۹۶۸ء)

باب ہفتم
(عائلی زندگی)

۱- ترکہ میں مرد' عورت میں عدم مساوات؟

سوال : - یہاں ایک مولوی صاحب خطبہ میں فرماتے تھے کہ آجکل یہ بھی ایک فتنہ پیدا ہو رہا ہے کہ عورتیں اور مرد انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں- حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **للذکر مثل حظ الانثیین**(۴/۱۱)-- یعنی ایک مرد کے لئے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے- تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورتیں مردوں کے برابر نہیں ہو سکتیں- اس کا کیا جواب ہے-

جواب : - ان مولوی صاحب سے کہئے کہ اس آیت میں چار ہی لفظ آگے چل کر یہ کہا گیا ہے کہ **ولا بویہ لکل واحد منھما السدس** متوفی کے ماں اور باپ میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے- یہاں عورت اور مرد کا حصہ برابر بتایا گیا ہے- اسی طرح ذرا آگے چل کر کلالہ کی وراثت کے سلسلے میں ہے **ولہ اخ او اخت فلکل واحد منھما السدس** (۴/۱۲) اگر اس کے بھائی یا بہن ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا حصہ چھٹا ہے- یہاں بھی مرد اور عورت کا حصہ یکساں بتایا گیا ہے-

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی قرآن کھول کر دیکھتے تک نہیں- بس کہیں سے ایک بات سن پاتے ہیں اور اسے لے دوڑتے ہیں اور پھر ان تنکوں کے پل پر سے ہاتھی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں- اگر یہ کبھی قرآن کریم کا خود مطالعہ کریں' تو اس قسم کی باتیں کیوں کریں؟ ترکہ کی تقسیم کے حصوں کی حکمت کچھ اور ہے- اسے مرد یا عورت کی مساوات یا عدم مساوات کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا- اس کے لئے قرآنی فیصلے حصہ اول' باب ۱۲ اور ۱۴' ایڈیشن سوم مارچ ۹۲ء ملاحظہ کیجئے-

(مئی ۱۹۶۵ء)

۲- نکاح کی غرض و غایت اور اس تقریب کی رسومات

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ازروئے قرآن'

۱- خاوند کے فرائض کیا ہیں؟

۲- بیوی کے فرائض کیا ہیں؟

۳- مروجہ شادیاں رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہیں اور لوگ غیر محسوس بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہیں- نتیجہ یہ

ہے کہ یہ تقریب ایک ہنگامہ سے، کم نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اس تقریب کے کیا خدوخال ہیں۔

طلوع اسلام

قرآن کریم کی رو سے' نکاح ایک ایسے پیمان وفا کا نام ہے جس کی رو سے' ایک عاقل' بالغ' جوڑا باہمی رفاقت کا معاہدہ کرتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس باہمی رفاقت سے وہ ایک دوسرے کی ذات کی نشوونما کا موجب بنیں اور ایک ایسے خاندان کی بنیاد رکھیں جو انسانی شرف و مجد کا حامل اور قرآنی پیغام کو آگے بڑھانے کا موجب ہو۔

قرآن نے اس رشتہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس سے میاں بیوی میں "مودت' رحمت اور سکینت" کے تعلقات استوار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جس رشتہ کی بنیاد' مودت' رحمت اور سکینت پر ہو' اس میں حقوق اور فرائض کے امتیازی حدود کیا ہوں گے؟ اگر اس رشتہ میں حقوق و فرائض کی فہرستیں مرتب ہوئیں تو وہ بزنس (کاروبار) ہو گا' سودائے محبت نہیں رہے گا۔ اقبالؒ تو اس پیام وفا کے متعلق یہاں تک کہتا ہے کہ۔

یک نگہ' یک خندۂ دزدیدہ' یک تابندہ اشک
بہر پیمان محبت نیست سوگندے دگر

اگر کسی نے حقوق و فرائض کا تعین کرنا ہے تو اس کے لئے قرآن کریم نے ان کی فہرست دینے کے بجائے ایک اصول بیان کر دیا ہے اور وہ یہ کہ

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۲/۲۲۸)

بیوی پر جو ذمہ داری عائد کرو اس کے مثل اس کا ایک حق ہو جائے گا یعنی اس میں(RECIPROCITY) کا اصول کار فرما ہو گا۔۔۔۔۔۔ جس قدر حقوق اسی قدر ذمہ داریاں اور جس قدر ذمہ داریاں اسی قدر حقوق۔

البتہ' انسان کی تمدنی زندگی اور عورت کو اولاد کی پیدائش اور پرورش کے سلسلے میں جو فرائض سرانجام دینے پڑتے ہیں' ان کے پیش نظر' یہ اصولی رہنمائی بھی دے دی گئی ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔ **الرجال قوا مون علی النساء** (۴/۳۴) عورتوں کو چونکہ اپنے طبیعی فرائض کی بجا آوری کے لئے کسب معاش کی فرصت نہیں مل سکتی اور مرد ان فرائض سے فارغ ہوتا ہے اس لئے گھر کے اخراجات کی ذمہ داری مرد کے سر پر ہے۔ باقی رہے زندگی کے مختلف گوشے' سو ان میں مرد اور عورت دوش بدوش چلتے ہیں (دیکھئے ۳۵/۳۴)۔

جہاں تک اس کی تقریب اور اس کے ہنگامے کا تعلق ہے' سو یہ ایک معاشرتی سوال ہے۔ قرآن نے اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں دی' نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ یہ ایک معاہدہ ہے۔ جس طرح اور معاہدات طے پاتے ہیں' اسی طرح اسے بھی طے پانا چاہئے۔ اس خوشی میں اگر کوئی اپنے احباب کو شریک کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی مرضی ہے (جسے دعوت ولیمہ کہا جاتا ہے' وہ مربوں کے ہاں ایک معاشرتی رسم تھی جس طرح عقیقہ ان کے ہاں کی رسم تھی۔)۔۔۔۔۔لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے' قرآن کی روشنی میں وہ یکسر اسراف ہے۔۔۔۔۔ یہ

اسراف' اور وہ بھی اس قوم میں جو روٹی تک کے لئے دوسروں کی محتاج ہے' یا للعجب! اس سے امراء کی دولت برباد ہوتی ہے اور غریبوں کی لڑکیاں' محض (ان فضول رسموں کے لئے) پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ماں باپ کے لئے استخواں شکن بوجھ' اور اپنے لئے آتش خاموش کی بھٹی بنی رہتی ہیں--- اور یہ سب کچھ' بلا کسی جرم و خطا کے' محض معاشرہ کی تباہ کن روش کی وجہ سے۔

جہاں تک مہر کا تعلق ہے' وہ ایک تحفہ ہے جو خاوند بیوی کو ازرہ محبت پیش کرتا ہے۔ اس کی مقدار و تعداد کی کوئی قید اور شرط نہیں۔ البتہ اس کی ادائیگی ضروری ہے---- خواہ نکاح کے وقت ہو یا اس کے بعد--- جہیز دینے کے لئے قرآن میں کوئی حکم نہیں۔ جو ہونے والا شوہر' جہیز طلب کرتا اور اس کی شرطیں عائد کرتا ہے وہ محبت و رفاقت کا مظاہرہ نہیں کرتا' سودے بازی کرتا ہے۔ اور جس رشتہ کی ابتداء ہی سودے بازی سے ہو' اس کا انجام معلوم!

بس یہ ہے نکاح ازروئے قرآن!--- باقی سب کچھ ہماری خود ساختہ زنجیریں ہیں جن میں ہم اپنے آپ کو خود ہی جکڑتے ہیں اور پھر ساری عمر روتے رہتے ہیں۔ (مئی ۱۹۶۷ء)

عائلی زندگی سے متعلق بعض نکات "قرآنی فیصلے" حصہ اول' باب ۱۴ ایڈیشن سوم' مارچ ۱۹۹۲ء میں بھی آچکے ہیں۔ انہیں بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

۳۔ شادی کے لئے کس کی رضامندی ضروری ہے؟
محبت کی شادی (LOVE MARRIAGE) کسے کہتے ہیں!

سوال : ۔ آج کل اخبارات میں ایک بحث چل رہی ہے کہ شادی کے لئے' لڑکی اور لڑکے کی رضا مندی ہونی چاہئے یا ان کے ماں باپ کی رضا مندی بھی۔ اخبارات میں (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) یہ بحث کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ رہی۔ اس باب میں صحیح صورت کیا ہے؟

جواب : ۔ قرآن کریم کی رو سے' نکاح' عاقل' بالغ لڑکے اور لڑکی کی رضا مندی سے معاہدہ استوار کرنے کا نام ہے لہٰذا' لڑکے اور لڑکی کی رضا مندی کے بغیر نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اب رہی ماں باپ کی رضا مندی' سو قانونی طور پر یہ لازمی نہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کی صورت مغربی معاشرہ سے مختلف ہے۔ اس کا پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ مغرب میں لڑکا اور لڑکی اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نکاح ہو یا نہ ہو' بالغ ہونے کے بعد' اولاد کا ماں باپ سے اور ماں باپ کا اولاد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اس لئے وہاں شادی کے لئے' ماں باپ کی رضا مندی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس' ہمارے معاشرہ میں' یہ رشتہ لڑکی اور لڑکے کا ہی نہیں ہوتا' بلکہ دو خاندانوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ لڑکا اس لڑکی کا شوہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکی بھی شوہر کے خاندان کا ایک فرد بن جاتی ہے۔ اب سوچئے کہ اس لڑکی یا لڑکے نے جس خاندان کا فرد بننا ہے' اس خاندان کو اس باب میں کچھ کہنے کا حق ہونا چاہئے یا نہیں؟ کسی خاندان کی رضا مندی کے بغیر' کسی فرد کو اس کا جزو بنا دینا' جو دور رس نتائج پیدا کر سکتا ہے

وہ ظاہر ہیں۔

علاوہ بریں' جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے' ہمارے معاشرہ میں' اس کا تعلق اپنے اہل خاندان سے عمر بھر تک رہتا ہے۔ شادی کے بعد جب بھی اس پر کوئی آفت آتی ہے تو اسے (خواہ وہ تین چار بچوں کی ماں بھی کیوں نہ بن چکی ہو) اپنے میکے ہی میں سہارا ملتا ہے۔ کتنے واقعات ہمارے سامنے ہیں جن میں' شادی شدہ لڑکیوں کو' اپنے بچوں سمیت' باقی عمر' میکے میں گذارنی پڑتی ہے۔ جب صورت یہ ہے کہ بچی کی مصیبت کا بوجھ اس کے والدین پر (بھی) پڑتا ہے تو کیا والدین کو اتنا اطمینان نہیں کر لینا چاہئے کہ جس گھر میں لڑکی جا رہی ہے وہاں اس کے لئے مصیبت کا کم سے کم امکان ہے۔

اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کہتے ہیں کہ ہم شادی کے بعد آزادانہ زندگی بسر کریں گے۔ ماں باپ کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ تو اس کے بعد' ان کی شادی کے لئے بے شک ان کے ماں باپ کی رضا مندی کی ضرورت نہیں رہے گی۔ لیکن اس باب میں کم از کم لڑکی کو یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہئے کہ ہمارے معاشرہ میں' زندگی میں بیسیوں مقامات ایسے آتے ہیں جہاں عورت کو کسی سہارے یا حفاظت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ سہارا اور حفاظت بہترین اور باعزت طور پر ماں باپ کے گھر ہی میں مل سکتے ہیں۔ اگر وہ اس گھر سے اپنے تعلقات منقطع کر رہی ہے تو اسے اس کے عواقب کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بلکہ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جس خاوند کو معلوم ہو کہ اس کی بیوی کا اس کے سوا کوئی سہارا نہیں' نہ ہی اس کے لئے کوئی اور حفاظت کا مقام ہے' تو وہ اس کی اس احتیاج کا جس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا کرتا ہے' کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ اس قسم کے واقعات ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں۔

لہٰذا' ہمارے معاشرہ کی لڑکیوں کو' اپنے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہئے' یعنی (۱) جس جگہ اس کی اپنی رضا مندی نہ ہو وہاں اسے شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔ لیکن (۲) اپنی پسند کے ساتھ یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ اس میں اس کے والدین (یا اہل خاندان) کی پسند بھی شامل ہے۔ یہی طریق' بحالات موجودہ' انسب ہے۔ علاوہ بریں' شادی کے معاملہ میں انہی کا مشورہ صائب ہو سکتا ہے جنہیں متاہل زندگی کا عملی تجربہ ہو۔ یہ وہ ندی ہے جس میں اترے بغیر تیرنا نہیں سیکھا جا سکتا۔ اس لئے تنہا اپنی رائے یا ان کی رائے کو جنہیں ہنوز شادی کا عملی تجربہ نہ ہو' کافی نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ یہ آراء آپ کو غلط راستے پر ڈال سکتی ہیں۔

--------○--------

(۲) سوال : آج کل ہمارے ہاں (LOVE MARRIAGE) کا بڑا چرچا ہے۔ یہ کیا بلا ہوتی ہے؟

جواب : یہ "خوبصورت بلا"[۱] ہوتی ہے۔

مغرب کی بے راہ روی نے' جنسی ہیجان کو (LOVE) کا نام دے کر' عجیب قسم کی خود فریبی (یا فریب دہی) کی طرح ڈال رکھی ہے۔ وہاں یہ لفظ اب کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دو چار برس

---

۱ آغا حشر مرحوم کے ایک ڈرامے کا نام تھا۔

ادھر کا ذکر ہے' انگلینڈ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں ایک مشہور شخصیت کی حرامکاری کی رنگین داستانیں بڑی تفصیل سے بیان کی گئی تھیں۔ اس کتاب کا نام رکھا گیا تھا (THE GREATEST LOVER OF THE WORLD)_ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہاں (LOVER) کسے کہتے ہیں اور (LOVE) کیا ہوتی ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ اب ہمارے ہاں بھی عام ہو رہا ہے۔ یہاں بھی کسی کے (LOVE AFFAIRS) سے مراد اسی قسم کے ناجائز تعلقات کی داستانیں ہوتی ہیں۔ آیئے ہم ذرا اس کا تجزیہ کریں۔

ایک نوجوان' کسی لڑکی میں کچھ قلبی اور ذہنی (یعنی انسانی) خوبیاں دیکھتا ہے جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔ وہ جوں جوں ان خوبیوں پر غور کرتا ہے' اس کی پسندیدگی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ پاتا ہے اور بالآخر' اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے رفیق زندگی بن سکیں تو سفر حیات نہایت خوشگوار ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں اس کے جذبات کو دخل نہیں ہوگا۔ اس میں اس کی قوت فکر (REASONING) کار فرما ہوگی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ اپنی اس پسندیدگی میں (خواہ وہ کتنی ہی شدت تک کیوں نہ پہنچ جائے) کبھی اپنے ہوش و حواس نہیں کھوئے گا۔ وہ کبھی ایسی حرکتیں نہیں کرے گا جس پر دنیا ہنسے۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو کہ وہ اس سے شادی نہ کرسکے تو وہ کبھی پاگل نہیں ہو جائے گا' نہ ہی خود کشی کرے گا۔ (ہوسکتا ہے کہ ان خوبیوں کے ساتھ فریق ثانی کی جسمانی خوبصورتی بھی وجہ پسندیدگی ہو' لیکن یہ ثانوی چیز ہوگی۔ یہ پسندیدگی ایسی ہی ہوگی جیسے ہم تاج محل یا گلاب کے پھول کو پسند کرتے ہیں)۔

اس کے برعکس' آپ کسی لڑکی کی صرف جسمانی ساخت سے مسحور ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ آپ کی ہو جائے۔ یہ خالص جنسی ہیجان ہے۔ اسے (LOVE) کہہ کر اپنے آپ کو اور معاشرہ کو دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں آپ کی قوت فکر (REASONING) کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔ یہ کشش خالص جنسی جذبات پر مبنی ہوگی اور جوں جوں بڑھتی جائے گی آپ اپنا دماغی توازن کھوتے چلے جائیں گے۔ اگر وہ آپ کو نہیں مل سکتی تو ہوسکتا ہے کہ آپ پاگل ہو جائیں یا خود کشی کرلیں۔ یہی وہ (جنسی ہیجان پر مبنی)"LOVE" ہے جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ ع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

یہ وہ "دماغی خلل" ہے جس کی شدت سے (MATING SEASON) میں بیل' اس دروازے کو ٹکریں مارا کرتا ہے جس کے اندر گائے بندھی ہو۔ اس یکسر حیوانی ہیجان کو مقدس تصور کرنا (LOVE کو بڑا مقدس جذبہ سمجھا جاتا ہے) یا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا' حیوانیت کو تقدس کا لبادہ اوڑھانا ہے۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ یہ کشش' لڑکی کی خوبیوں کی بنا پر ہے یا اس کا جذبہ محرکہ جنسی ہیجان ہے۔ سو اس کی موٹی سی پہچان یہ ہے کہ اگر آپ کا جی یہ چاہتا ہے کہ اس لڑکی کے جسم سے لمس کیا جائے تو یہ خالص جنسی ہیجان ہے۔ جنسی ہیجان میں جسمانی کشش ہوتی ہے اور شدت سے جسمانی لمس کی خواہش---- آپ نے

دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں "محبت کے گیتوں" میں "گلے سے لگا لوں" اور "سینے سے لپٹا لوں" کی کس قدر بھرمار ہوتی ہے۔ یہ سب جنسی ہیجان کے مظاہرے ہیں جس کی آخری شکل کو "ہم آغوشی" کی "مہذب" اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (جس جسمانی خوبصورتی میں یہ خواہش پیدا نہ ہو' اس میں جنسی جذبہ کا دخل نہیں ہوتا۔ کسی کی بیٹی یا بہن کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو' اس کے جسم کے ساتھ جسم لگانے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آئے گا)۲۔

اگر اس دماغی خلل (یا جنسی ہیجان) میں لڑکی لڑکا' دونوں مبتلا ہیں تو اس سے اس فریب کا پردہ اور بھی دبیز ہو جائے گا۔۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ہیر رانجھا' سسی پنوں' سوہنی مہینوال کے افسانوں کو ہمارے ہاں کس قدر "تقدیس" حاصل ہو چکی ہے۔ یہ سب ہمارے "دماغی خلل" کا نتیجہ ہے۔ انہی کا اعادہ اب ہمارے ہاں کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں ہو رہا ہے۔ وہ جب اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے (LOVE MARRIAGE) قرار دیا جاتا ہے' حالانکہ اس (LOVE) کی عمر اتنی ہی ہوتی ہے جتنی جنسی ہیجان کی شدت کی۔ اس کے بعد' جب یہ آندھی اتر جاتی ہے تو یہ "فرہنگان" ایک دوسرے میں کوئی ہم آہنگی نہیں پاتے۔ پہلے آپس میں بے رغبتی پیدا ہوتی ہے' پھر ایک دوسرے سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اور یوں اس (LOVE MARRIAGE) کی ہنڈیا بیچ چوراہے پھوٹتی ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ (LOVE) کے یہ مظاہرے جنسی ہیجان کا نتیجہ تھے' یہ بھی ہے کہ جس شخص میں قوت رجولیت نہ ہو (یعنی وہ IMPOTENT ہو) اس میں اس قسم کی (LOVE) کے جذبات کبھی بیدار نہیں ہوتے۔

اس دماغی خلل کی بدترین شکل وہ ہوتی ہے جس میں لڑکا یا تو پاگل ہو رہا ہو اور لڑکی اس کی طرف مائل نہ ہو بلکہ اس سے گریز اور نفرت کرے۔ آپ سوچئے کہ اس صورت میں یہ خواہش اور کوشش کہ وہ لڑکی میری ہو جائے' کس قدر بہیمانہ ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ یہی کچھ کوئی گنوار اور غیر مہذب نوجوان کرے تو اسے معاشرہ اغوا (یا اغوا کی کوشش) سے تعبیر کرتا ہے اور وہی کچھ "مہذب" نوجوان کرے تو اسے (LOVE) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ (LOVE) یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ لڑکی' بیوی بننے کے بعد' اس سے اور نفرت کرتی ہے اور کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ لیکن یہ صاحب اسے زبردستی اپنے ساتھ باندھے رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر پوچھا جائے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں (I LOVE HER)۔ اس درندہ سے کوئی پوچھے کہ تمہیں اس حیوانی ہیجان کو (LOVE) کہتے ہوئے شرم نہیں آتی!

لیکن اس نوجوان سے کیا کہا جائے۔ محبت کی یہ روش تو ہمارے "بزرگوں" سے چلی آرہی ہے۔ ہماری (غزل کی) ساری شاعری اسی قسم کی محبت کی مظہر ہے۔ تفصیل میں جانے کے لئے' تو اس پر کتابوں کی کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن اختصار کو لیجئے تو غالب نے اسے ایک مصرعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ

۲۔ واضح رہے کہ بچے کو پیار سے چومنا یا گلے لگانا۔ یا اپنی جوان بیٹی کو شفقت کے ساتھ بانہوں میں لے لینا "جسمانی لمس" میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس میں آپ وہ لذت محسوس نہیں کریں گے جو اس لڑکی کے ساتھ جسمانی لمس سے کریں گے' جس سے آپ کو 'LOVE' ہے۔

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار

اور اس کے بعد بڑی سادگی سے پوچھتے ہیں کہ

یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے!

حضرت! ماجرا اس کے سوا کیا ہے کہ آپ اس سے زبردستی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے اس زبردستی کو خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے اور جب آپ کی طرف سے نوبت پیش دستی تک جاتی ہے تو ادھر سے دھول دھپا شروع ہو ہوجاتا ہے۳؎۔ آپ اسے بے وفا کہتے ہیں' ستم کوش کہتے ہیں' جفا پیشہ قرار دیتے ہیں' اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ کس بنیاد پر؟ اس پر کہ جب ہم اس سے محبت کرتے ہیں تو وہ ہم سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ آپ نے محبت کی اس منطق کو ملاحظہ فرمایا؟ منطق یہ ہے کہ جس سے ہم محبت کریں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہم سے محبت کرے' خواہ ویسے اسے ہم سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی اس نفرت کا ثبوت خود ان کے اپنے پاس ہوتا ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اسے یہ "رقیب رو سیاہ" کہتے ہیں۔ پہلے کوشش کی جاتی ہے کہ ان دونوں میں کسی طرح چشمک ہو جائے۔ اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو رقیب روسیاہ کی موت کی دعائیں مانگی جاتی ہیں اور جب یہ بھی نہیں ہوتا تو پھر انتہائی بے غیرتی سے اس مفاہمت پر اتر آتے ہیں کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ہماری ساری غزل کی شاعری کی بنیاد (THEME) ہی یہ ہے' اس لئے اگر آج کا نوجوان کسی معصوم لڑکی کو زبردستی اپنی گرفت میں لانا' اور لانے کے بعد جبراً" اپنے قابو میں رکھنا چاہتا ہے' تو وہ اپنے انہی "بزرگوں" کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ لیکن یہ طرح ہمارے مشرقی شعراء اور ادباء نے ڈالی ہو یا اب مغرب سے مستعار لی گئی ہو--- صاف الفاظ میں' جنسی بے راہروی کے سوا کچھ نہیں--- اور جن الفاظ میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے وہ اس جنسی ہیجان کا زندہ ثبوت ہوتے ہیں۔ جس "محبوبہ" کی تعریف یہ کہہ کر کی جائے کہ

بہار بستر و نوروز آغوش

اس سے "محبت" کے دعویٰ کو جنسی ہیجان نہیں تو اور کیا کہا جائے گا۔ یہ حضرات اس جذبہ کا اظہار شعر میں کرتے تھے۔ ہمارا آج کا نوجوان اس کا اظہار سیٹیاں بجا بجا کر کرتا ہے۔ نام اس کا دونوں ہی (LOVE) رکھتے ہیں۔

یہ سارے تصورات ہماری جنسی بد نہادی کے دور کے پیدا کردہ تھے۔ ہیں اب مغرب کی ہوسناکیوں نے اور جلا دے دی ہے اور آج اس بے حیائی کا نام (LOVE) رکھ لیا گیا ہے جس سے انسانیت کی نگاہیں جھک جائیں۔ ہمارا پرانا معاشرہ اس شاعری کی داد دے کر ذہنی لذت حاصل کرتا تھا۔ نوجوانوں نے اسے عملی شکل دے دی۔ ہمارے شعراء کی روحیں' ان سعادت مند نوجوانوں کے ایسے "کامیاب عشق" پر یقیناً" داد کے ڈونگرے برساتی ہوں گی کہ شاباش بیٹو۔

۳؎ دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

یہ ہے ہمارے عزیز! اس (LOVE MARRIAGE) کی حقیقت---- جس معاشرہ نے اپنے نوجوانوں کو نہ صحیح تعلیم دی ہو' نہ ان کی صحیح تربیت کی ہو' دوسری طرف ان کے سامنے اسلام وہ پیش کیا جائے جو ہمارے جنسی بد نہادی کے دور کا پیدا کردہ ہے اور جس میں جنسی تعلقات کی ایسی ایسی شکلوں کے لئے جواز کے فتوے دے دیئے جاتے ہیں' جن سے حیاء کی نظریں زمین میں گڑ جائیں' اس میں اس قسم کی بے حیائیاں عام نہیں ہوں گی تو اور کیا ہوگا۔ اور یہ تو ابھی ابتدا ہے---

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

لیکن اس ضمن میں ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر کوئی "حرمزدگی" کرنا چاہتا ہے تو اسے (کم از کم) "حرمزدگی" سمجھے اور کہے--- اسے (LOVE) کا "مقدس نقاب" تو نہ اوڑھائے۔ لیکن اگر ان کے مقدس بزرگ جبری اختلاط کو شرعی جواز کی سند بھی عطا کردیں اور ان کے شعراء اسے محبت کہہ کر پکاریں' تو یہ اسے (LOVE) سے کیوں نہ تعبیر کریں!

ایں خانہ ہمہ آفتاب است!

یاد رکھئے! (MARRIAGE) کہلانے کا مستحق صرف وہی رشتہ ہے جس کی بنیاد قلبی اور ذہنی خصوصیات و تصورات کی ہم آہنگی ہو۔ اگر یہ بنیاد ابتداء ہی میں نہیں' تو وہ (MARRIAGE)' (MARRIAGE) نہیں۔ اور اگر (MARRIAGE) کے بعد وہ رشتہ باقی نہیں رہا تو اس کے بعد' وہ (MARRIAGE) بھی باقی نہیں رہتی۔

(ستمبر ۱۹۶۸ء)

۴۔ عورتوں کا زبردستی خاوند بنے رہنا!

(کیا اس قسم کا اختلاط جائز قرار پاسکتا ہے؟)

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب فکر و صاحب قلم بزرگ نے ایک نہایت اہم اور اس کے ساتھ ہی نہایت نازک سوال دریافت کیا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ

> ان کے ہاں ایک میاں بیوی میں ایسا اختلاف پیدا ہوا ہے جس نے ایک پیچیدہ صورت پیدا کردی ہے۔ بیوی نہایت شریف' سمجھ دار' تعلیم یافتہ اور متین اور سنجیدہ ہے۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اس نے دیکھا کہ اس میں اور اس کے شوہر میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ اس کے برعکس' اس میں ایسی عادات خبیثہ ہیں جن سے ہر شریف انسان کی طبیعت ابا کرے۔ بیوی نے کافی عرصہ تک کوشش کی کہ اس شخص میں کچھ اصلاح ہو جائے--- لیکن بے سود۔ بالآخر' اس نے خاوند سے کہا کہ ہمیں خوش

ہے۔ اس سلسلہ میں اس سے اگلا عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

اسلوبی سے الگ ہو جانا چاہئے لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ بیوی نے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن عدالت نے بعض قانونی اسقام کی بنا پر نکاح کی تنسیخ نہ کی۔ اس پر اس نے تنگ آکر خود ہی علیحدگی اختیار کرلی تو خاوند نے حقوق زنا شوئی کی بازیابی (RESTITUTION OF CONJUGAL RIGHTS) کا دعویٰ کردیا اور عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیدیا۔ اب وہ محترمہ کہتی ہیں کہ ان حالات میں' خاوند کے ساتھ جنسی اختلاط سے اس کے اندر عجیب قسم کی نفسیاتی الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی طبیعت مانتی ہی نہیں کہ اس قسم کا جبری اختلاط جائز قرار پاسکتا ہے۔ وہ یوں سمجھتی ہے جیسے اس کے ساتھ "زنا بالجبر" کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ وہ پوچھتی ہے کہ اس قسم کے جنسی اختلاط کو کیا کہا جائے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ سوال کس قدر اہم اور نازک ہے۔ ملا کا تو صاف جواب ہوگا کہ جب تک نکاح منسوخ نہیں ہوتا' خاوند کو اختلاط کا حق حاصل ہے اور بیوی پر اس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ لیکن وہ محترمہ قرآن کی عدالت سے جواب مانگتی ہے۔ اس جواب تک پہنچنے سے پہلے' ایک تمہید کی ضرورت ہے۔

نزول قرآن سے پہلے' مرد اور عورت کے تعلقات کی ایک صورت یہ تھی کہ مرد' عورتوں کو جنگ سے پکڑ کر لے آتے یا بازار سے خرید کر اور پھر اس کے ساتھ جنسی اختلاط قائم رکھتے۔ اس عورت کو لونڈی کہا جاتا جو مالک کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی' یعنی اس کے ساتھ جنسی اختلاط بلا اس کی رضا مندی کے ہوتا تھا۔ وہ اس کے لئے مجبور تھی' البتہ جب مالک کا جی بھر چکتا تو وہ اسے کسی دوسرے کو دے دیتا' یا فروخت کردیتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس میں عورت کو کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ کلی اختیار مرد کو تھا۔

یا یہ سلسلہ وہاں کے رسم و رواج کے مطابق' نکاح کے ذریعے قائم ہو جاتا۔ نکاح میں بھی عورت کی رضا مندی محض رسمی ہوتی تھی۔ لیکن یہ رسمی رضا مندی بھی اس کے بعد ختم ہوجاتی تھی۔ یا تو وہ نکاح مدت العمر کے لئے ہوتا تھا اور اگر ایسا نہیں تھا تو عورت کو چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ایسی مشکلات میں سے گزرنا پڑتا تھا جن کے پیش نظر وہ اس مرد کے ساتھ مجبوراً زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے دیتی تھی--- مرتی کیا نہ کرتی؟

قرآن آیا اور اس نے انسانیت کش' حیا سوز طریق کو باطل قرار دیا اور کہا کہ ازدواجی تعلق باہمی رفاقت کا ہے اور رفاقت کے لئے ہر قسم کی ہم آہنگی اور یک رنگی ضروری ہے۔ اس رفاقت کا ایک مقصد بقائے نسل انسانی بھی ہے' لیکن اس سے مقصود صرف بچے پیدا کرنا نہیں' بلکہ بچوں کو ضروری تعلیم و تربیت سے "انسان" بنانا بھی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب میاں بیوی کے تعلقات رفاقت کے ہوں۔ جب میاں بیوی میں باہمی رفاقت نہ رہے تو رشتہ ازدواج کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب رشتہ ازدواج ہی باقی نہیں رہتا تو جنسی اختلاط کا سوال کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ رشتہ ازدواج کے اس طرح ختم ہو جانے کے بجائے' اس نے معاشرتی اغراض کے پیش نظر

ایک قاعدہ مقرر کردیا جسے طلاق کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح اس رشتہ کے شروع میں' استوار کرنے کے لئے مرد اور عورت کی رضا مندی کی ضرورت تھی' اسی طرح اسے قائم رکھنے کے لئے بھی دونوں کی رضا مندی ضروری ہے۔ جس طرح یہ صورت ہے کہ اگر فریقین میں سے کوئی ایک' اسے برقرار رکھنے پر رضا مند نہ رہے تو یہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس میں جبر کا سوال نہ ابتداء میں تھا' نہ بعد میں۔ قرآن کریم نے اس رشتہ کی استواری (یا معاہدہ) کے لئے

(۱) مردوں کی رضا مندی یہ کہہ کر ضروری قرار دے دی کہ

فانکحو اما طاب لکم من النساء (۴/۳)

اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرو۔

(۲) عورتوں کی رضا مندی یہ کہہ کر ضروری قرار دے دی کہ

لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا (۴/۱۹)

تمہارے لئے یہ قطعاً" حلال نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے بغیر زبردستی ان کے مالک بن جاؤ۔

اس کے بعد اس نے کہہ دیا کہ اس رضا مندی کے یہ معنی نہیں کہ جب ایک دفعہ تم نے رضا مندی کا اظہار کردیا تو اس کے بعد تمہارا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔۔۔ یعنی اس کے بعد تمہاری رضا مندی رہے یا نہ رہے' تمہیں بہر حال' اس رسی میں جکڑے رہنا ہوگا۔ قطعاً" نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ رضا مندی تو ایک ایک سانس کی رضا مندی ہے۔ جب بھی تم میں سے کسی فریق کی رضا مندی نہ رہے' یہ معاہدہ کالعدم قرار پا جائے گا۔ اس طرح اس نے مرد اور عورت کو (اس معاہدہ کے سلسلہ میں) برابر کے فریق قرار دے کر' شرف و احترام انسانیت کی حسین بنیاد رکھ دی۔

اس کے ساتھ ہی اس نے خلای کا دروازہ بند کرکے' لونڈیوں کا وجود بھی ختم کردیا۔

یوں عورت کی رضا مندی کے بغیر جنسی اختلاط کا سوال باقی نہ رہا۔

قرآن نے اس رضا مندی کو کس قدر اہمیت دی تھی' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ

ابتدائے اسلام میں جب مکہ کی وہ مسلمان عورتیں جو اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ آگئیں' اس جذبہ کے تحت کہ فکر و نظر کی ہم آہنگی ختم ہوجانے کے بعد ازدواجی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا' تو خدا نے ان کے اس فیصلہ پر صاد کیا اور قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کا ان خاوندوں کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اور اسلامی معاشرہ سے کہہ دیا کہ ان کے خاوندوں نے جو کچھ ان پر خرچ کیا ہے وہ انہیں واپس لوٹا دو اور انہیں اپنے ہاں بصد عزت و احترام رکھو۔

---------○---------

قرآن نے یہ کیا۔ لیکن جب اس کے بعد' مسلمانوں کے عہد ملوکیت میں' جنسی ہوسناکی اور بد نہادی کی رسیاں دراز ہونے لگیں تو انہوں نے قرآن کو لپیٹا خلافوں میں' اور پہلے' اپنے حرم میں لونڈیاں لے آئے اور اس کے بعد

معاہدۂ نکاح کا ایسا حلیہ بگاڑا جس سے (قرآن کی نص صریح کے خلاف) عورت کا زبردستی مالک بنے رہنا' عین حلال قرار پاگیا اور کہہ دیا کہ مرد کو تو یہ حق حاصل ہے جس وقت اس کی رضا مندی نہ رہے' نکاح کا رشتہ فسخ کردے لیکن عورت کو اس کا حق حاصل نہیں۔ اسے اس کے لئے' عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور عدالت نے اپنے دروازے پر قسم قسم کی حیلہ جوئیوں کے اتنے اتنے بڑے تالے ڈال دیئے جن کا کھولنا عورت بیچاری کے بس کی بات نہ ہو۔ یوں عورت کو پھر سے اسی مقام پر لاکھڑا کردیا گیا جس پر وہ قرآن نازل ہونے سے پہلے تھی' یعنی اس کی رضا مندی ہو یا نہ ہو' مرد کو اس سے جنسی اختلاط کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ اس سے انکار کرتی ہے تو اس پر قانون کا کوڑا برسا دیا جاتا ہے۔ سوچئے کہ اس قسم کا کوئی قانون' خدا اور رسولؐ کی منشاء کے مطابق ہو سکتا ہے؟

ہمارے یہی قوانین اب تک چلے آرہے تھے کہ پاکستان میں بعض با حمیت حلقوں کی طرف سے ان کے خلاف آواز بلند ہوئی اور حکومت نے' ان میں ترمیم و تنسیخ کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا۔ طلوع اسلام نے اس سلسلہ میں مسلسل کوشش کی کہ یہ قوانین قرآن کی منشاء کے مطابق از سرنو مرتب ہو جائیں جن کی رو سے' کوئی عورت نہ کسی مرد سے اپنی مرضی کے خلاف نکاح کرنے پر مجبور کی جائے اور نہ ہی وہ اپنی مرضی کے خلاف اس کے نکاح میں رہنے کے لئے مجبور ہو' یعنی جس طرح مرد کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے اس معاہدہ کو فسخ کردے' اسی قسم کا حق عورت کو بھی مل جائے تاکہ اسے اس کی مرضی کے خلاف جنسی اختلاط پر مجبور نہ کردیا جائے۔ طلوع اسلام نے بڑی جدوجہد کی لیکن قانون وضع کرنے والے حضرات صرف اتنی سی ترمیم پر رضا مند ہوئے کہ نکاح نامہ کے فارم پر ایک شق یہ بھی رکھ دی گئی کہ

> کیا شوہر نے عورت کو طلاق کا حق تفویض کردیا ہے' اور اگر کردیا ہے تو کن شرائط کے ماتحت۔

یعنی طلاق کا حق تو بدستور خاوند کے پاس ہی رہا' لیکن اسے اختیار دے دیا گیا کہ وہ چاہے تو نکاح کے وقت اسے بیوی کو تفویض کردے۔ چنانچہ اب صورت یہ ہے کہ

(۱) جن نکاں ناموں میں اس سوال کے سامنے لکھ دیا جاتا ہے کہ "بلا مشروط تفویض کردیا گیا" ان میں' عورت کو فسخ نکاح میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ وہ جب جی چاہے اپنے اس حق کا استعمال کرکے' معاہدۂ نکاح فسخ کرسکتی ہے۔ (اس کے لئے عائلی قوانین۵۔ میں طریق کار مذکور ہے) لیکن

(۲) جن نکاح ناموں میں ایسا نہیں لکھا جاتا یا جو نکاح ہی ان قوانین کے نافذ ہونے سے پہلے عمل میں آچکے تھے' ان میں فسخ نکاح کے لئے عورت کو عدالت میں جانا پڑتا ہے اور وہاں مرد (انتقاماً) ایسا کیچڑ اچھالتے ہیں کہ اس شریف زادی کو اپنا

۵۔ یہ ۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین کہلاتے ہیں۔

دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض تو تنگ آکر اپنے دعویٰ ہی سے دستبردار ہوجاتی ہیں اور اکثر صورت میں' قانونی موشگافیوں کی بنا پر' فیصلہ عورت کے خلاف صادر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد عورت' جنسی اختلاط پر رضا مند نہ ہو تو پھر حقوق زنا شوئی (CONJUGAL RIGHTS) کا ڈنڈا اس کے سر پر ہوتا ہے۔ (ہم تو سمجھتے ہیں کہ جنسی اختلاط کو بفور استحقاق طلب اور حاصل کرنا بجائے خویش ایسا حیا سوز تصور ہے جسے شرف انسانیت برداشت نہیں کرسکتا)۔

---------- ○ ----------

اس پس منظر میں آپ میاں بیوی کے ان جنسی تعلقات کا جائزہ لیجئے جس کی مثال شروع میں دی گئی ہے۔ اس میں عورت اس مرد کے ساتھ جنسی اختلاط کے لئے مجبور کردی جاتی ہے جس سے اسے سخت نفرت ہوتی ہے۔ ہم (اپنی واجب الاحترام خواتین---- ماؤں' بہنوں' بیٹیوں--- سے بصد معذرت) عرض کریں گے کہ آپ سوچئے کہ جسے (RAPE) کہتے ہیں' کیا وہ یہی نہیں ہوتا کہ عورت سے اس کی مرضی کے خلاف' جبراً'' جنسی اختلاط کا ارتکاب کیا جاتا ہے؟ اس میں اور اس مثال میں فرق اتنا ہی ہے نا کہ اس میں' اس جبری فعل کو ہمارا مروجہ قانون (RAPE) نہیں کہتا۔ لیکن کیا یہ ضرور ہے کہ جس چیز کو کسی ملک کا مروجہ قانون ناجائز قرار نہ دے' وہ عدالت خداوندی میں بھی ناجائز قرار نہ پائے؟ اب سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سو اس کا ذمہ دار معاشرہ کا غلط قانون ہے جو عورت کو جکڑ کر' باندھ کر ایسی حالت میں رکھ دیتا ہے جس سے اس کی غیرت بغاوت کرتی ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ اس سے معصیت کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔

اے اس معاشرہ میں بسنے والو! خدا کے غضب سے ڈرو!

---------- ○ ----------

لیکن یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ ہمارے ہاں کتنے گھرانے ایسے ہیں جن میں بیوی خاوند کے ہاتھوں تنگ آچکی ہوتی ہے۔ وہ اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی بن کر رہنے پر مجبور ہوتی ہے؟ کس بات نے مجبور؟ اس بات سے کہ اگر وہ اسے چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور جائے کہاں؟ (ہم پھر بصد معذرت عرض کرتے ہیں کہ) معاشرہ میں جو بدنصیب عورتیں جسم فروشی کے لئے مجبور ہوجاتی ہیں' کیا ان کی مجبوریاں اسی قسم کی نہیں ہوتیں؟ کیا وہ بھی (یا ان میں سے اکثر) اقتصادی احتیاج یا عدم حفاظت کی وجہ سے ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں ہوتیں؟ اگر اس قسم کی مجبوری کے تحت جنسی تعلق ناجائز قرار پاتا ہے تو ایسی ہی مجبوری کے ماتحت' گھر میں رہنے والی عورت کے ساتھ جنسی تعلق کس طرح جائز قرار پا جائے گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ اس تعلق کو بھی مروجہ قانون' جائز قرار دیتا ہے لیکن کیا انسانیت کی عدالت (جس کے میز پر خدا کی کتاب ہوتی ہے) عورت کے احساسات کے پیش نظر' ان دونوں میں کچھ بھی فرق کرے گی؟ یہی ہیں وہ انسانوں کے خود وضع کردہ قوانین جنہوں نے ہمیں دنیا میں کہیں

منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا اور ہمارے ساتھ خود اسلام کو بھی رسوا کردیا۔

یہ تو رہیں بے چاری مجبور و مقہور عورتیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ جو مرد--- یہ جانتے ہوئے کہ ان کی بیوی ان کے ساتھ رہنے پر قطعاً" رضا مند نہیں--- انہیں باندھ کر رکھتے ہیں اور اس طرح ان سے جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں' کیا وہ انسان کہلانے کے مستحق ہیں؟ انسان تو ایک طرف' وہ حیوان کہلانے کے بھی مستحق نہیں۔ حیوانات میں جبری جنسی اختلاط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور پھر یہ سوچئے کہ عورتوں کو اس طرح مجبور رکھ کر جو اولاد پیدا کی جائے گی--- یعنی جو بچے ایسی ماؤں کی آغوش میں پرورش پائیں گے جو اس قسم کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوگی--- ان بچوں کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی؟

شاید آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جو عورتیں معاشی احتیاج یا عدم حفاظت گی بنا پر ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں' ان کی مشکل کا کیا حل ہوسکتا ہے؟ اس کا حل بھی قرآن نے بتایا ہے۔ اس نے سلسلہ ازدواج کے منقطع کئے جانے کے سلسلہ میں جو احکام دیئے ہیں' ان میں عورت سے کہا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرتے وقت اس خیال سے مت گھبراؤ کہ میں کھاؤں گی کہاں سے اور جاؤں گی کہاں؟ **ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا لا و یرزقہ من حیث لا یحتسب** (۳-۲/۶۵) جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرے گا' خدا اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا اور اس مقام سے سامان زندگی عطا کرے گا جس کا وہ خیال بھی نہیں کرسکتی--- ظاہر ہے کہ اس قسم کی ذمہ داریاں جو خدا اپنے اوپر لیتا ہے' انہیں وہ حکومت پورا کرتی ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے' یعنی یہ معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ ایسا انتظام کرے کہ یہ عورتیں نہ محتاج رہنے پائیں نہ غیر محفوظ--- آپ نے غور فرمایا کہ قرآن' عورتوں کو جبری اختلاط سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کیا انتظامات تجویز کرتا ہے؟ جو معاشرہ ایسا انتظام نہیں کرتا' اس قسم کے خلاف انسانیت افعال شنیعہ کی تمام ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ کیا معلوم ان معصوم پابند سلاسل خواتین کی خاموش آہیں' اس معاشرہ پر کس قسم کی آگ بن کر برسیں! اور ہمارے ہاں تو یہ آگ بجلی بن کر برس رہی ہے جس سے عائلی زندگی جہنم بن رہی ہے۔

یہ معاشرہ یہ کہہ کر اس جرم کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا کہ اس نے ان جرائم کو قانوناً" جائز قرار دے رکھا ہے۔ یاد رکھئے! سنکھیا' سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اسے قانوناً" قند ہی قرار دے دیا جائے--- سنکھیا اور قند کے پرکھنے کا معیار' خدا کی کتاب ہے نہ کہ معاشرہ کے مروجہ قوانین۔

---------- ○ ----------

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اس کے لئے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس وقت قانونی طور پر صورت یہ ہے کہ

(۱) عائلی قوانین کے مطابق' نکاح نامہ کے فارم میں ایک شق یہ بھی ہوتی ہے کہ

کیا شوہر نے بیوی کو طلاق کا حق تفویض کردیا ہے؟ اگر کردیا ہے تو کن شرائط

کے ماتحت؟

اگر اس شق کا جواب "ہاں" میں لکھ دیا جائے (یعنی بلا مشروط تفویض کردیا گیا ہے) تو پھر بیوی کے لئے کسی درندہ صفت خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی۔

(۲) لیکن اگر اس شق کے سامنے کچھ نہیں لکھا گیا یا جواب نفی میں لکھا گیا ہے' یا نکاح عائلی قوانین کے نافذ ہونے سے پہلے (یعنی ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء سے پہلے) عمل میں آچکا تھا تو پھر بیوی کو فسخ نکاح کے لئے عدالت میں جانا ہوگا۔ "قانون تنسیخ نکاح" میں بہت سی وجوہات دی ہوئی ہیں جن کی بناء پر عدالت فسخ نکاح کا فیصلہ دے سکتی ہے۔ لیکن اس میں عورت بے چاری کو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں--- دشواریاں ہی نہیں' مرد کی طرف سے وضع کردہ خواریاں بھی--- یہی وہ دشواریاں اور خواریاں ہیں جن کے پیش نظر یہ مظلوم بیچاریاں' ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتی ہیں لیکن کچہری میں جانے کی جرات نہیں کرتیں۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ قانون کی جگہ ایسا قانون نافذ کر دیا جائے جس کی رو سے' نکاح کا معاہدہ کالعدم کرنے کا جیسا حق خاوند کو ہے' ویسا ہی بیوی کو حاصل ہو۔ اس قسم کا قانون نہ صرف بڑا معقول اور مبنی پر عدل و انصاف ہے' بلکہ قرآن کریم کے بھی عین مطابق ہے۔ جس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین مساوی سطح پر ہوں' اسے فسخ کرنے میں بھی انہیں مساوی سطح پر ہونا چاہئے۔ لہٰذا' جیسا قانون مرد کے لئے' ویسا ہی عورت کے لئے ہونا چاہئے۔ بات بالکل صاف اور واضح ہے۔

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ' جب (عائلی قوانین کی تدوین کے زمانے میں) یہ ترمیم طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی گئی تو اس کی کس قدر مخالفت ہوئی تھی--- ظاہر ہے کہ یہ مخالفت مردوں ہی کی طرف سے تھی (اور بدقسمتی سے ملا بھی سب مرد ہی ہوتے ہیں)۔ مردوں کی حالت عجیب ہے۔ جب ان کے سامنے عورتوں کے حقوق کا ذکر آئے تو "عورت" سے ان کا خیال صرف بیوی کی طرف جاتا ہے-- اور ظاہر ہے کہ جو عورت بیوی کی حیثیت سے مرد کی گرفت میں آچکی ہو' مرد اس کے لئے "حقوق کی تائید" کیسے کرے گا--- بقول اقبالؒ

دل شاہیں نسوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

"عورت" سے ان کا دھیان اپنی بہنوں در بیٹیوں کی طرف نہیں جاتا۔ مرد' عورت پر حکومت کے جذبہ کے نشے میں بدمست ہوکر' کس طرح ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے ہاں اکثریت ان باپوں کی ہے جن کی بیٹیاں' دوسرے گھروں میں' انہی مشکلات میں گرفتار ہیں اور ان کے غم میں خود باپ بھی گھلتا رہتا ہے اور ہزار جتن کرتا ہے کہ اس سے چھٹکارا کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن جب انہی باپوں کے سامنے اس قسم کی معقول تجویز آتی ہے تو ان کے ذہن میں پھر اپنی بیوی آجاتی ہے اور وہ اس کی مخالفت کرنے لگ جاتے ہیں---- اس کی مخالفت کرتے ہیں اور پھر بیٹیوں کی مصیبتوں کا رونا رونے لگ جاتے ہیں۔ آپ نے اس سے بڑھ کر بیوقوف قوم بھی دیکھی ہے؟ عائلی قوانین کے زمانے میں ہمیں اس کا عملی تجربہ ہوا۔ ہماری اس تجویز کی مخالفت ان مردوں کی طرف سے

بھی ہو رہی تھی جن کی بہنیں اور بیٹیاں خود اسی مصیبت کا شکار تھیں۔

لیکن اس سے زیادہ موجب حیرت و تاسف یہ حقیقت تھی کہ ہم نے اچھی اچھی پڑھی لکھی خواتین کے سامنے بھی جب یہ تجویز پیش کی تو انہوں نے اس سے اتفاق کیا--- بلکہ ہمیں بڑے بڑے دلسوز واقعات بھی سنائے جن میں عورتیں اس قسم کی مصیبتیں بھگت رہی تھیں--- لیکن اس کے باوجود' کسی نے اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا۔

(نوٹ : یہ شذرہ ستمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب (اواخر ۱۹۷۶ء میں) حکومت کی طرف سے حقوق نسواں کمیٹی مقرر ہوئی ہے جو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے سفارشات مرتب کر رہی ہے۔ طلوع اسلام ان سفارشات کی تائید کرتا ہے اور مذہب پرست طبقہ کی طرف سے حسب سابقہ ان کی مخالفت ہو رہی ہے)۔

۵۔ نابالغ لڑکی کی شادی

(مودودی صاحب کا فتویٰ)

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

ترجمان القرآن' بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے صفحہ ۸۹ پر مودودی صاحب رقمطراز ہیں کہ

"اس جگہ یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق عدت کا سوال اس عورت کے معاملہ میں پیدا ہوتا ہے جس سے شوہر خلوت کرچکا ہو۔ کیونکہ خلوت سے پہلے طلاق کی صورت میں سرے سے کوئی عدت ہے ہی نہیں (الاحزاب۔ ۴۹)۔ اس لئے ایسی لڑکیوں کی عدت بیان کرنا جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو' صریحاً" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس عمر میں نہ صرف لڑکی کا نکاح کردینا جائز ہے' بلکہ شوہر کا اس کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ جس چیز کو قرآن نے جائز قرار دیا ہو' اسے ممنوع قرار دینے کا کسی مسلمان کو حق نہیں پہنچتا"۔

خط کشیدہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مودودی صاحب صغر سنی کے نکاح کا جواز پیش کرتے ہوئے نابالغ لڑکی سے خلوت صحیحہ کرنے کو بھی جائز اور درست قرار دے رہے ہیں اور اس بہیمانہ فعل کو قرآنی سند کا سہارا دینے کی کتنی ناپاک جسارت کی گئی ہے۔ مفکر اسلام کی اس تفہیم قرآنی کے سلسلہ میں طلوع اسلام میں تبصرہ فرمایا جائے تاکہ جمہور مسلمان ان کی قرآن فہمی' تدبر فی الدین اور اجتہادی بصیرت کو ملاحظہ فرما کر اپنی عاقبت کو سنوارنے کا بروقت انتظام کرسکیں اور سید صاحب

کے تفقہ فی الدین کا طنطنہ اور غلغلہ سب پر آشکارا ہو جائے۔

طلوع اسلام

سوال مودودی صاحب کی قرآن فہمی' تدبر فی الدین' اجتہادی بصیرت اور ان کے طنطنہ اور غلغلہ کا نہیں۔ اصل سوال اس نفسیاتی مرض کا ہے جس میں اس قسم کے حضرات بدقسمتی سے مبتلا ہوجاتے ہیں جس سے ان کی ذہنیت مسخ ہوجاتی ہے اور وہ اس قسم کے فتوے دیتے رہتے ہیں کہ

۱۔ جنگ میں دشمن کی جو عورتیں قید ہو کر آئیں انہیں سپاہیوں میں تقسیم کردیا جائے۔ وہ ان سے بلا نکاح اور بلا قید تعداد' جنسی تعلقات قائم کریں اور جب جی بھر جائے تو انہیں کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردیں۔ یا

۲۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ سمندر میں جہاز غرق ہو جائے تو اس کی سواریوں میں سے ایک مرد اور ایک عورت بچ کر کسی جزیرے میں جا اتریں تو وہ وہاں عارضی "نکاح" کرکے جنسی اختلاط کرتے رہیں۔ یا

۳۔ جو شخص اپنے جنسی جوش سے مغلوب ہو کر استمنا بالید (MASTURBATION) کرلے تو خدا اسے سزا نہیں دے گا۔ یا

۴۔ کفار کی جو لڑکیاں کم سنی میں وفات پا جائیں گی وہ جنت میں حوریں بن کر مومنین کے تصرف میں آجائیں گی۔

(مودودی صاحب کے ان ارشادات عالیہ کے حوالے ہمارے پاس موجود ہیں)

اسی قبیل سے صغر سنی کے نکاح کے جواز کا فتویٰ ہے۔ لیکن مقام تاسف ہی نہیں بلکہ مقام مرگ یہ ہے کہ اس کے لئے یہ حضرات کبھی حضرت عائشہؓ کی مروی کے وقت کی عمر نو سال قرار دیتے ہیں اور کبھی قرآن کی آیات سے کھیل کھیل کر اس کے جواز کی سندیں لاتے ہیں اور ایسا کرتے وقت نہ حضورؐ کی عظمت شان کا احساس ان کے دامن گیر ہوتا ہے' نہ خدا کا خوف!

قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ مطلقہ کی عدت تین حیض ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن عورتوں کو حیض نہ آرہا ہو' ان کی عدت کس طرح شمار کی جائے۔ اس کے لئے سورۂ الطلاق میں فرمایا کہ

واللّٰئی یئسن من المحیض من نساء کم ان ارتبتم فعدتھن ثلثتہ اشھر و واللّٰئی لم یحضن (۶۵/۴)

تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں' اگر ان کی عدت کے شمار کرنے میں تمہیں شبہ لاحق ہو' تو ان کی عدت (تین حیض کے بجائے) تین مہینے شمار کرلو۔ یہی صورت ان عورتوں کے سلسلہ میں بھی ہوگی جنہیں حیض نہ آرہا ہو۔

جن عورتوں کو حیض نہیں آرہا' ان کی دو شکلیں ہوں گی۔

۱۔ وہ عورتیں' جو اس قدر عمر رسیدہ ہوچکی ہوں کہ انہیں حیض آنا بند ہوگیا ہو۔ یا

۲ – وہ عورتیں جن کی عمر تو ایسی ہو جس میں بالعموم حیض آیا کرتا ہے لیکن کسی عارضہ کی وجہ سے انہیں حیض نہ آرہا ہو۔

ان دونوں شکلوں میں عدت کا شمار حیض کے بجائے مہینوں سے ہوگا۔

مودودی صاحب **لم یحضن** کا ترجمہ کرتے ہیں--- "ایسی لڑکیاں جنہیں حیض آنا شروع نہ ہوا ہو"--- ہم پوچھتے یہ ہیں کہ **لم یحضن** کا یہ ترجمہ کس قاعدے کی رو سے کیا گیا ہے؟ اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ جنہیں حیض نہ آسکا ہو یا حیض نہ آرہا ہو۔ اس آیت سے صغر سنی کے نکاح اور نابالغ لڑکی کے ساتھ خلوت کا جواز ثابت کرنا' قرآن سے مذاق کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔ قرآن کریم نے نکاح کے لئے "جوانی کی عمر" خود بتا دی ہے (دیکھئے ۶/۴ : ۶/۱۵۳ : ۱۷/۳۴)۔ واضح رہے کہ مودودی صاحب کو خود اعتراف ہے کہ ایسی صورتیں ہوتی ہیں جن میں عورتوں کو (سن یاس سے پہلے ہی) حیض بند ہو جاتا ہے یا بے قاعدگی سے آتا ہے۔ حتیٰ کہ "ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عورت کو عمر بھر حیض نہیں آتا"۔ (ترجمان القرآن' بابت اکتوبر ۱۹۶۹ء ص۸۹)۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ یہ کہ ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ ایک نوجوان لڑکے کی منگنی ایک کمسن لڑکی سے کردی گئی ہے۔ وہ اپنی جنسی خواہش پر ضبط نہیں کرسکتا۔ تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے۔ تو اسی کے جواب میں انہوں نے کہا کہ

> اس لڑکے کے خاندان نے ایک جوان آدمی کو ایک کمسن لڑکی کے ساتھ منسوب کرکے اپنی نادانی کا پورا پورا ثبوت دے دیا ہے۔
>
> (رسائل و مسائل' جلد دوم' ص۲۰۲)

کون ان سے پوچھے کہ جب کمسن لڑکی کے ساتھ نکاح اور خلوت کی اجازت (بقول ان کے) خود خدا نے دے دی ہے' تو کمسن لڑکی کے ساتھ منگنی کردینے کو نادانی قرار دے کر آپ خدا پر معترض نہیں ہو رہے؟ دیکھا آپ نے جادو کس طرح سر پر چڑھ کر بولتا ہے؟

آپ نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ یہ حضرت عائلی قوانین ..... (۱۹۶۱ء)..... کو منسوخ کرانے کے در پئے کیوں ہیں؟ اس لئے کہ ان قوانین کی رو سے' نابالغ لڑکی (یا لڑکے) کی شادی کی اجازت نہیں۔ اور یہی پابندی ان حضرات پر شاق گزرتی ہے۔ یہاں (خدانکردہ) ان حضرات کی خود ساختہ شریعت کے قوانین نافذ ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ کیا کیا چیزیں آپ کے سامنے آتیں اور "خدا اور رسولؐ کے نام پر" آپ سے منوائی جاتی ہیں!

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

---

۶ – دارالعلوموں کے نقاب میں فحاشی کی تعلیم

ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ اٹھتے بیٹھتے اس مقدس وعظ کو دہراتا رہتا ہے کہ ملک میں فحاشی کا سیلاب بڑھتا

جا رہا ہے۔ قوم کا نوجوان طبقہ جو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتا--- یا تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد باہر نکلتا ہے--- وہ فحش نگاری' فحش گوئی' فحش بینی اور فحش جوئی کا رسیا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی غلط تعلیم' بیرون ملک سے درآمد ہونے والا عریاں لٹریچر اور ریڈیو' ٹیلی ویژن اور سینما کے جنسی محرکات ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے خلاف آئے دن جہاد کا اعلان کرتا رہتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ فحاشی بڑی مخرب اخلاق شے ہے اور ہر وہ حرف و صوت یا نقش و تمثال جو ان جذبات میں تحرک و ارتعاش پیدا کرنے کا موجب ہو' قابل احتراز ہے۔ لیکن ہمارا مذہب پرست طبقہ جس انداز سے فحاشی کی مخالفت کرتا ہے' اس سے وہ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فحاشی کا سرچشمہ "دنیاوی" تعلیم اور اس کے متضمنات ہیں۔ جو تعلیم ان کے مکاتب اور دارالعلوموں میں دی جاتی ہے' اس سے عفت فکر و نظر کے پیکر اور عصمت قلب و نگاہ کے مجسمے تیار ہوتے ہیں۔ ان کے خیالات نہایت پاکیزہ اور تصورات انتہائی مقدس ہوتے ہیں۔ لیکن آیئے اور ذرا دیکھئے کہ ان دینی مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کی کیفیت کیا ہے؟ اور یہ کیفیت کسی "مسٹر" کی زبان سے نہ سنئے۔ اس کے بیان کرنے والے مولانا عبدالغفار حسن ہیں جو (جماعت اسلامی سے اعتزال کے بعد) مدینہ یونیورسٹی میں قیام پذیر ہیں۔ ان کا ایک مضمون (یا خط) ہفتہ وار المنبر کی ۲۶ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

> "گزشتہ ماہ المنبر کا شمارہ ملا جس میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کی سوانح عمری کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے۔ حضرت موصوف کے یہ الفاظ کتنے بصیرت افروز ہیں۔
> از خواندن ابیات و شنیدن آں پرہیز کلی باید کرد کہ محققین نوشتہ اند کہ زناء زبان است۔

ایک طرف یہ پاکیزہ نقطہ نظر ہے' دوسری طرف ہمارے ہاں کے درس نظامی میں سبعہ معلقہ اور متنبی جیسی فحش اور عشقیہ اشعار و قصائد پر مشتمل کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھائی جاتی ہیں۔ عام طور پر چونکہ دینی مدارس کا انتظام مساجد میں ہوتا ہے' اس لئے بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ محراب و منبر بھی ان اشعار و قصائد کی شرح و تفسیر سے گونج اٹھتے ہیں اور طلباء بھی اپنی جلوت و خلوت میں مزے لے لے کر جھوم جھوم کر ان کو پڑھتے ہیں اور اپنی دبی آگ کو بھڑکانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ تماشا یہ ہے کہ استاد اگر دینی غیرت اور شرم و حیا کی بنا پر ان کتابوں کے فحش اشعار کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے' تو طلبہ بضد ہوتے ہیں کہ ہم ان اشعار کے ترجمے اور شرح و تفصیل سے محظوظ ہو کر ہی رہیں گے۔

چوں فسق از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی!

غور طلب امر یہ ہے کہ یہی اشعار یا ان کا منظوم ترجمہ ریڈیو پر کوئی مغنیہ پڑھ کر سنا دے تو کس بنا پر اسے مخرب اخلاق اور شرم و حیا کے منافی قرار دیا جاسکتا ہے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ ریڈیو کی اس قسم کی نشریات اپنا وسیع حلقہ

رکھتی ہیں اور شراب دو آتشہ سہ آتشہ کی شکل میں معاشرہ کے فساد کا ذریعہ بنتی ہیں۔ عربی مدارس کی فضا میں حلقہ سامعین انتہائی محدود ہوتا ہے۔ لیکن افسوسناک صورت احوال یہ ہے کہ یہ زہران کو پلایا جاتا ہے جو آئندہ قوم کے مرشد اور دینی رہنما بننے والے ہیں اور ساقی کا منصب ان کو حاصل ہے جو تقویٰ اور دینی علم سے بہرہ ور ہیں۔

اس قسم کی کتابوں کو جزو ایمان بنانے کے بارے میں عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ عربی زبان اور قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لئے ان کتابوں کو پڑھنا پڑھانا ناگزیر ہے۔

یہ جواب چند وجوہ سے قابل غور ہے۔

دیوان متنبی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے اشعار بطور سند پیش کئے جاسکیں۔ یہ تو اس دور کی یادگار ہے جبکہ عجمی تخیلات اور اسالیب کلام' عربی ادب میں سمو دیئے گئے تھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس میں بعض حکیمانہ اشعار بھی ہیں۔ ان سے استفادہ اگر ضروری خیال کیا جاتا ہے تو اس کتاب کے منتخب اشعار پڑھا دینے مناسب ہوں گے۔ باقی رہی "سبعہ معلقہ" تو اس کے ہر قصیدے میں سے موزوں اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ درجہ تخصص میں اسے مطالعہ میں رکھا جائے تاکہ جاہلی ادب اور اسلامی ادب کا فرق واضح ہوسکے۔

افسوس ہے کہ ہمارے مدارس میں یہ کتاب عام طور پر تیسرے یا چوتھے سال میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان درجات میں اکثر طلبہ نو عمر ہوتے ہیں۔ ان اشعار سے ان کے اخلاق پر انتہائی برا اثر پڑتا ہے۔

ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ انہوں نے دو نو عمر طالبات کو "عالم عربی" کی تیاری کی غرض سے "سبعہ معلقہ" پڑھانا شروع کی۔ جب امری القیس کے فحش اشعار پڑھانے کی نوبت آئی تو شرم و حیا کی بنا پر زبان ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ آخر کار' انہوں نے اس مشغلے کو خیرباد کہا اور اپنے گھر کی راہ لی۔ بعد میں ان طالبات نے "عالم عربی" کے امتحان کے لئے مدرسۃ البنات لاہور (سابق جالندھر) میں داخلہ لیا۔ سنا ہے کہ وہاں من وراء حجاب (پس پردہ) مرد اساتذہ طالبات کو درس دیتے ہیں۔ نہ معلوم وہ کس طرح ان اشعار کو نگلواتے ہوں گے۔

مولانا صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں

> یہ تفصیل حصہ نظم کے بارے میں عرض کی گئی ہے۔ اب حصہ نثر کا حال ملاحظہ ہو۔ ہمارے ہاں پاک و ہند کے مدارس میں حصہ نثر کے لئے نفحۃ الیمن اور مقامات حریری تجویز کی گئی ہیں۔ ان میں جو حکایات اور افسانے درج ہیں ان سے انتہائی گھٹیا کردار سامنے آتا ہے۔ حریری کے افسانے زیادہ تر گداگر واعظ کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ کیا اس قسم کی تحریروں سے طلبہ اچھا تاثر لے سکتے ہیں۔

طلوع اسلام

مولانا صاحب نے اپنی تنقید کو صرف عربی ادب کی دو چار کتابوں تک محدود رکھا ہے۔ اگر یہ جرات سے کام لے

کر کتب فقہ کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرما دیتے اور مزید ہمت کر کے' ان کے کچھ اقتباسات پیش کرتے' تو پھر اس کا صحیح اندازہ ہو تا کہ ان مکتبوں اور مدرسوں میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سے کس قسم کے ذہن تیار ہوتے ہیں۔ ہم ان سے عرض کریں گے کہ زیادہ نہیں تو عالم گیری' ہدایہ' شرح وقایہ' در مختار وغیرہ سے وضو' غسل' روزہ یا نکاح سے متعلق ابواب کے دو دو' چار چار مسائل سامنے لا کر بتائیں کہ ان سے نوجوان (اور بالعموم مجرد) طالب علموں کے دل میں کس قسم کے جذبات انگڑائیاں لیتے ہیں۔ یا کوئی اور صاحب ہمت بزرگ ایسا کر سکیں تو یہ قوم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ (اکتوبر ۱۹۶۶ء)

۷۔ بیویوں کو مارنا

(ایسا صرف عدالت کر سکتی ہے)

ایک صاحب نے ایک طویل خط لکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ سورۂ نساء میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اپنی بیویوں کی طرف سے سرکشی کا خوف ہو تو تم انہیں سمجھاؤ۔ اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو انہیں خواب گاہوں سے الگ کر دو۔ اور اگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو تو--- **واضربو ھن**(۴/۳۴) تم انہیں مارو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خاوند کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ایسی صورت میں بیوی کو مار بھی کر سکتا ہے۔ لیکن پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہ حق عدالت کو حاصل ہے۔ اگر وہ عورت کو مجرم پائے تو اسے بدنی سزا دے سکتی ہے۔ انفرادی طور پر ہر ایک کو حق حاصل نہیں کہ وہ اٹھ کر بیوی کو مارنا شروع کر دے۔ یہ پرویز صاحب کی اپنی رائے ہے جو قرآن حکیم کے حکم کے خلاف ہے۔

جواب : محترم مستفسر صاحب کا یہ اعتراض قرآن کریم کے اسلوب و انداز سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد جرائم کی سزا تجویز کی ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی یہ نہیں کہا کہ یہ سزا عدالت کی طرف سے دی جا سکتی ہے۔ قرآن میں عدالت یا نظام عدل کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مثلاً" سارق (چور) کی سزا کے سلسلہ میں فقط اتنا کہا ہے کہ--- **فاقطعوا ایدیھما** (۵/۳۸) چور' عورت ہو یا مرد' ان کا قطع ید کر دو۔ یا زانی اور زانیہ کی سزا کے سلسلہ میں یہ کہا ہے---- **فاجلدوا کل واحد منھما مائتہ جلدۃ**(۲۴/۳)------ زانی عورت ہو یا مرد' انہیں سو کوڑے مارو۔ بہتان تراشی کی سزا کے سلسلہ میں بھی---- **فاجلد و ھم**(۲۴/۴) کہا ہے' یعنی انہیں اسی کوڑے لگاؤ۔ لواطت یا سحاقت کے ضمن میں کہا ہے----**فاذو ھما** (۱۶/۴)---- انہیں مناسب سزا دو۔ جرم فحاشی کے سلسلہ میں کہا ہے---**فامسکو ھن** (۱۵/۴) انہیں پابند مسکن کر دو۔ آپ نے دیکھا کہ ان احکام میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ ملزم کو عدالت میں پیش کرو۔ عدالت فیصلہ کرے کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ اور جرم ثابت ہونے پر عدالت ہی اسے سزا دے جس کا نفاذ حکومت کی طرف سے ہو۔ اب سوچئے کہ اگر ان احکام کے الفاظ کے پیش نظر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان سزاؤں کا حق ہر ایک کو دیا گیا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ **والسارق**

والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما کا یہ مطلب ہے کہ جس شخص کو تم چوری کرتے دیکھو اس کا ہاتھ کاٹ دیا کرو؟ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ عدل کا اصول بیان کرتا ہے۔ نظام عدل کو امت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے۔ عام جرائم تو ایک طرف' وہ حکومت کے خلاف بغاوت جیسے سنگین جرم کے سلسلہ میں بھی عدالت کا ذکر نہیں کرتا' صرف باغیوں کی سزا کا ذکر کرتا ہے (۵/۳۳)۔ لیکن عدالت کا ذکر نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

کسی شخص کا کسی کو مارنا پیٹنا ـــــ خواہ وہ جرم کی پاداش ہی میں کیوں نہ ہو ـــــ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اگر آپ (مثلاً") کسی جیب تراش کو پکڑ کر پیٹنے لگ جاتے ہیں اور اس سے اس کا دانت ٹوٹ جاتا ہے' تو اسے اگر جیب تراشی کے جرم کی سزا ملے گی تو آپ کو اس ضرب خفیف یا شدید کے جرم کے ارتکاب کی سزا ملے گی۔ اس لئے کہ آپ نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ آپ کا کام تھا کہ اس جیب تراش کو حوالہ پولیس کرتے۔

جب عام قانون یہ ہے تو بیویاں بیچاری ہی ایسی جنس مظلوم ہیں کہ خاوندوں کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیں اور انہیں مارنا پیٹنا شروع کر دیں۔ لہٰذا' جس طرح **فاقطعوا** ؟۔ **یا۔ فاجلدو** کے معنی یہ نہیں کہ تم ان کے ہاتھ کاٹ دو یا انہیں کوڑے مارنے لگ جاؤ' بلکہ یہ معنی ہیں کہ عدالت انہیں اس قسم کی سزا دے۔ اسی طرح سورۂ نساء میں **واضربوھن** کے معنی بھی یہ نہیں کہ تم اسے خود ہی مارنے لگ جاؤ۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ عدالت مجاز انہیں بدنی سزا بھی دے سکتی ہے۔

-------○-------

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میاں بیوی کے تنازعہ کو عدالت میں لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری پرائیویٹ زندگی کی تشہیر ہو جائے ـــــــ اسے کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں اول تو یہ گذارش ہے کہ جب قرآن کریم متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ عدالت یا حکم کے ذریعے کرانے کا حکم دیتا ہے تو اس میں پرائیویٹ اور پبلک لائف کا کیا سوال ہے۔ میاں بیوی کے اختلافی معاملات کے سلسلہ میں ثالث مقرر کرنے کا حکم اسی سورۂ نساء میں ہے (۴/۳۵)ـــــــ اس میں تو پھر بھی شاید زیادہ پرائیویٹ باتیں سامنے نہ آئیں۔ وہ بیوی کے خلاف سنگین تہمت کے سلسلہ میں "لعان" تجویز کرتا ہے(۸۔۶/۲۴)ـــــ جو بہر حال' عدالت ہی میں ہو گا۔ اس میں واضح الفاظ میں الزام ثابت کرنے یا اس سے بریت کی کوشش کی جائے گی۔ پرائیویٹ زندگی کی اس سے بڑھ کر تشہیر اور کیا ہو گی۔

اس اعتراض کا جذبہء محرکہ دراصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے موجودہ حکام یا کونسلوں کے چیئرمین ہوتے ہیں جن کے سامنے ہماری پرائیویٹ زندگی کا پیش ہونا موجب تشہیر ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم جو مومنین کو حکم یا حاکم تجویز کرتا ہے ان کی صورت میں اس قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ وہ تو افراد ملت کے رازوں کے امین اور فریقین کے مشفق بزرگ ہوتے ہیں۔

(جنوری ۱۹۶۷ء)

-------○-------

۸۔ اہل کتاب کی عورتوں سے شادی
(حضرت عمرؓ کے ایک حکم کی وضاحت)

میں نے اپنی کتاب------ شاہکار رسالت-------- کے باب متعلقہ قانون سازی کے تحت لکھا ہے کہ

> قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے' لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے' یہ کہہ کر' نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں' مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔
>
> (صفحہ ۲۷۹) ایڈیشن چہارم (بلاترمیم) ۱۹۸۷ء۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بڑا مشہور ہے۔ لیکن ایک صاحب نے ایک تفصیلی خط کے ذریعہ اس کی وضاحت چاہی' جس کا میں نے خط کے ذریعہ جواب دیا۔ چونکہ سوال اور جواب عمومی اہمیت کا حامل ہے' اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اسے طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ اس لئے بھی' کہ میں نے شاہکار رسالت میں' اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ لیکن اب محسوس ہوا کہ ہو سکتا ہے کہ اس اجمال سے' بعض دیگر قارئین کے دل میں بھی اس قسم کا سوال پیدا ہوا۔ لہٰذا' اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ان صاحب نے اپنے خط میں ایک طویل اصولی سی تمہید کے بعد جو اعتراض کیا ہے وہ بالاختصار یہ ہے۔

> میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایک بشر کو' چاہے وہ خود صاحب کتاب ہی کیوں نہ ہو' یہ حق حاصل ہے کہ قرآن کی کسی بات کو معطل کر دے یا ممنوع قرار دے۔ قرآن کے کسی قاعدہ سے استنباط تو ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں اصل حکم باقی رہتا ہے' لیکن قاعدہ اور حکم کو ممنوع قرار دینا' میں سمجھتا ہوں' بالکل غلط ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ کا علم ناقص ہے۔ (نعوذ باللہ) کیا اس سے خدا کی حکمت پر حرف نہیں آتا کہ ایک ایسے مسئلہ کی اجازت دی' جس میں فتنہ روپوش تھا.....' جبکہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ اللہ علیم اور حکیم ہے۔ کیا اس سے خود قرآن مجروح نہیں ہوتا؟..... کیا اس سے کھلی اجازت نہیں ملتی کہ جو امیر آئے' مصلحتاً اس میں تغیر و تبدل کر دے' چاہے وقتی ہی کیوں نہ ہو؟ کیا اس سے **لا تبدیل لکلمت اللہ** کی تردید نہیں ہوتی؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کی تابعداری کی بجائے قرآن کو اپنے تابع بنایا جائے۔ کیا اس سے جماعت اسلامی والے سچے ثابت نہیں ہوتے جو جھوٹ (حرام) کو مصلحتاً جائز قرار دیتے ہیں؟

میں نے اس کا حسب ذیل جواب دیا ہے:-

"خترمی! السلام علیکم!

آپ کا تفصیلی گرامی نامہ وصول ہوا- یہ دیکھ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ آپ نے ایک وضاحت طلب نکتہ کے متعلق ازالہء شکوک کے لئے مصنف کی طرف رجوع کیا ورنہ آجکل تو یہ روش عام ہو رہی ہے کہ مصنف کی عبارات سے (غلط یا صحیح) خود ہی کوئی نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسے مصنف کی طرف منسوب کر کے اس کی تشہیر کی جاتی ہے- آپ نے جو سوال دریافت فرمایا ہے' اس کا جواب تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے-

۲:- قرآن کریم میں بعض امور کو حرام یا ممنوع قرار دیا گیا ہے اور بعض کو حلال یا جائز ٹھہرایا گیا ہے- اس کے حرام کو حلال یا حلال کو حرام قرار دینے کا کسی کو حق یا اختیار حاصل نہیں- لیکن حلال کی صورت میں ایک بنیادی نکتہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے- حلال کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اس کی اجازت دی ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو- اس کا حکم نہیں ہے کہ تم ایسا ضرور کرو- اگر ایسا نہیں کرو گے تو یہ معصیت خداوندی ہو گی- اس کی انفرادی مثال عام ہے- ہم بیسیوں ایسی حلال چیزیں نہیں کھاتے جو ہمیں پسند نہ ہوں' جن سے ہمیں طبعاً" نفرت ہو' جو ناخوشگوار ہوں یا ہمارے مزاج اور طبیعت کے موافق نہ ہوں- ہم ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے' صرف خدا کی عطا کردہ اجازت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے- قرآن کریم نے حلال کے ساتھ یہ طیب کا اضافہ کیا ہے' تو طیب میں یہ تمام باتیں شامل ہیں' جن کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے-

۳:- یہ تو انفرادی مثال تھی- اسی کی اجتماعی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں- برسات کے موسم میں یا بعض وبائی امراض کے زمانہ میں' گورنمنٹ بعض چیزوں کے استعمال کو حکماً" اور قانوناً" ممنوع قرار دے دیتی ہے- اس سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ حالات کا تقاضا ایسا ہے کہ خدا کی اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھایا جائے- اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ خدا کو اسکا علم نہیں تھا کہ بعض حالات میں ان چیزوں کا استعمال مضر ہو گا- یہ اعتراض اس صورت میں پیدا ہو سکتا تھا جب خدا یہ حکم دیتا کہ جو کچھ ہم نے حلال قرار دیا ہے' اسے ہر شخص کو کھانا ہو گا اور ہر حال میں کھانا ہو گا- اس نے ایسا نہیں کہا- اس نے اس کی اجازت دے دی جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے- لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو یہ معصیت نہیں ہو گی-

اسی قسم کی ایک مثال آج کل ہمارے ہاں رائج ہے- حکومت نے ہفتہ میں دو دن' حلال جانوروں کا ذبیحہ اور ان

کا گوشت فروخت کرنا حکماً" ممنوع قرار دیا ہوا ہے۔ مصالح کلی کے پیش نظر ایسا کرنا بھی حلال کو حرام قرار دینا نہیں۔ لیکن اس قسم کا اجتماعی فیصلہ صرف حکومت مجاز کر سکتی ہے' افراد نہیں خواہ ان کی حیثیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

۴:۔ اب آیئے نکاح کی طرف۔ پہلے انفرادی مثال لیجئے۔ چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح حلال ہے' یعنی اس کی اجازت ہے۔ اگر کوئی لڑکا اپنی چچا زاد بہن کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تو اس کا یہ اعتراض قابل اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ چچا کی لڑکی کے ساتھ نکاح حرام ہے' تو یہ قرآن کی مخالفت ہو گی۔

اب اسی مثال کی اجتماعی حیثیت سامنے لایئے۔ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح حلال ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اگر کوئی اہل کتاب قوم میں یہ سازش شروع کر دے کہ اپنی لڑکیوں کو مسلمانوں کے ساتھ نکاح کے ذریعہ جاسوس بنا کر بھیج دے اور اسلامی مملکت کو اس کا علم یا اندازہ ہو جائے' تو امت کے مصالح کلی کے پیش نظر اسے اس کا اختیار ہو گا کہ وہ ان حالات میں اس اجازت پر پابندی عائد کر دے۔ یہ نہ تو حلال کو حرام قرار دینا ہو گا اور نہ ہی معصیت خداوندی۔ یہ صرف خدا کی ایک عطا کردہ اجازت سے فائدہ نہ اٹھانے کا فیصلہ ہو گا۔ جب یہ مصلحت باقی نہیں رہے گی یہ پابندی اٹھا دی جائے گی' لیکن اس قسم کا اجتماعی فیصلہ اسلامی حکومت ہی کر سکتی ہے' کوئی فرد نہیں۔ ایسا ہی حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ عیسائی حکومتیں اس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگ گئی تھیں۔ اس قسم کی عورتوں نے اسلامی مملکتوں کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے' تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ لیکن جہاں اس قسم کی مضرت کا احتمال نہ ہو' وہاں اس کی اجازت پر پابندی کی ضرورت نہیں ہو گی۔

۵:۔ مجھے امید ہے کہ اس صراحت سے اس نکتہ کی وضاحت ہو گئی ہو گی اور آپ کا شبہ بھی رفع ہو گیا ہو گا۔ اس سے عند المصلحت جھوٹ بولنے یا فریب دینے کا شرعی جواز نہیں نکل سکتا۔ جھوٹ بولنا یا فریب ممنوع ہے۔ ان کی صورت یہ نہیں کہ خدا نے یہ کہا ہو کہ جھوٹ بولنا یا فریب دینا حلال ہے۔ تمہارا جی چاہے' جھوٹ بول لیا کرو تو جی چاہے تو نہ بولا کرو۔ یہ ہے فرق' حلال اور حرام یا جائز اور ممنوع میں!

اگر کوئی نکتہ مزید وضاحت کا متقاضی ہو تو مجھے مطلع فرمایئے گا۔

والسلام

مجھے امید ہے کہ اگر کسی صاحب کے دل میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کے متعلق اسی قسم کا شبہ پیدا ہوا ہو گا' تو اس کی وضاحت سے وہ شبہ زائل ہو گیا ہو گا۔

(پرویز)

(اکتوبر ۱۹۷۵ء)

۹۔ طلاق اور خلع

(عدالتوں کا دائرۂ اختیار)

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ گذشتہ قریب ڈیڑھ ماہ سے' اخبار پاکستان ٹائمز کے جمعہ کے ایڈیشن میں' سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ اس وقت تک اس کی چھ قسطیں شائع ہو چکی ہیں اور ابھی وہ سلسلہ اختتام پذیر نہیں ہوا۔ سوال زیر غور یہ ہے کہ کیا قانون شریعت کی رو سے' عدالت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ عورت کو اس کے خاوند کی نارضامندی کے باوجود' خلع دلا دے۔ یہ فیصلہ فاضل جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب نے لکھا ہے اور اس میں جس تفصیل سے بحث کی گئی ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس میں کس قدر کاوش اور محنت کرنی پڑی ہے اور اس پر ان کا کس قدر وقت صرف ہوا ہے۔

اس کے بعد یہ صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ کیا ہمارا قانون شریعت ایسا ہی ہے کہ اس کی رو سے' اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے (کہ عدالت عورت کو خلع دلا سکتی ہے یا نہیں) اس قدر کاوش کرنی پڑتی ہے۔ پھر جب اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ یہ مقدمہ گذشتہ سات سال سے چل رہا ہے اور اسے عدالت ماتحت سے لے کر عدالت عالیہ تک کے تمام مراحل طے کرنے پڑتے ہیں' تب جاکر یہ اصولی فیصلہ ہوا ہے کہ عدالت اس کی مجاز ہے' تو یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کی رو سے اس کی پوزیشن کیا ہے؟

جواب آپ کو صرف اس ایک قانون شریعت کی پیچیدگی کو دیکھ کر اس قدر حیرت ہوئی ہے۔ یہ سارے کا سارا ہی ایسا ہے۔ اس میں کسی معمولی سے معمولی معاملہ کے متعلق بھی دو ٹوک فیصلہ نہیں ملے گا۔ ہمارے قانون شریعت کی پیچیدگیوں اور ژولیدگیوں کے متعلق (بے چارے) ان ججوں سے پوچھنا چاہئے جنہیں اس کی رو سے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ اور پھر تماشا یہ کہ جتنی مرتبہ بھی کسی معاملہ کو زیر بحث لائیے' ہر بار اس میں سے نئی نئی شاخیں ابھرتی چلی آتی ہیں اور حرف آخر کہیں جاکر بھی نہیں ملتا۔

اس کے برعکس' قرآن کی رو سے' دیکھئے تو یہ بات دو فقروں میں طے ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے' نکاح کو فریقین (میاں بیوی) کے مابین معاہدہ قرار دیا ہے۔ جس طرح معاہدہ کرنے کے لئے فریقین میں سے ہر فریق صاحب اختیار ہوتا ہے' اسی طرح معاہدہ کو ختم کرنے کے لئے بھی ہر فریق یکساں طور پر صاحب اختیار ہوتا ہے۔ اس میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ معاہدۂ نکاح طے تو پا جاتا ہے انفرادی طور پر' لیکن اسے فسخ کرنے میں چونکہ فریق ثانی کے مفاد کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے' اس لئے قران کریم نے کہا ہے کہ اس کے لئے معاشرہ کے نظام عدل کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اس طرح فسخ معاہدہ کو قرآن کی اصطلاح میں طلاق کہتے ہیں (طلاق کے معنی کسی پابندی سے آزاد ہو جانے کے ہیں)۔ یہ طلاق (آزادی) جس طرح (عدالت کی رو سے) مرد حاصل کر سکتا ہے' اسی طرح عورت حاصل کر سکتی ہے۔

مرد کی طرف سے "طلاق" اور عورت کی طرف سے "خلع" کی تفریق قرآنی نہیں۔ قرآن میں تو خلع کا لفظ تک نہیں آیا۔ (اس حقیقت کو جسٹس رحمٰن صاحب نے اپنے فیصلے میں بھی تسلیم کیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، فسخ نکاح کے معاملہ میں، میاں اور بیوی کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔۔۔۔ پاکستان ٹائمز، مورخہ ۶۷-۲-۲۴)

اگر ہمارے قوانین شریعت کی، قرآن کریم کی رو سے، از سر نو تدوین ہو جائے تو یہ تمام مشکلات دور ہو جائیں۔

-------○-------

ان امور کی مزید وضاحت طلوع اسلام، بابت اکتوبر ۱۹۷۸ء میں کی گئی تھی۔ وہ بھی قابل توجہ ہے۔

-------○-------

۱۰۔ طلاق کے قرآنی احکام

طلوع اسلام کی ایک سابقہ اشاعت میں ہم نے عورت کی بے بسی کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا تھا، اس سلسلہ میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں جن اہم امور کا ذکر آیا ہے، انہیں ہم متعلقہ مقامات پر سامنے لائیں گے۔ ان میں سے ایک مشترکہ سوال کا جواب اس جگہ دیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم میں طلاق کے متعلق کیا احکام ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ نکاح، عاقل، بالغ، مرد اور عورت کے باہمی معاہدہ کا نام ہے جس میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا کوئی دخل نہیں، یعنی یہ دونوں اپنی رضاور غبت اور پسند سے، ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں۔ مرد کی طرف سے رضا مندی کے لئے کہا گیا کہ **فانکحوا ما طاب لکم من النساء**(۴/۳) "جو عورتیں تمہیں پسند ہوں تم ان سے شادی کرو"۔ اور عورتوں کی رضا مندی کے متعلق کہا کہ **لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا** (۴/۱۹) "تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن بیٹھو"۔

اس سے واضح ہے کہ مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی میں جب بھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بیوی خاوند کے لئے (**ما طاب**) نہ رہے، یعنی وہ اسے پسند نہ کرے یا عورت کے دل میں مرد کی طرف سے کراہت پیدا ہو جائے، تو ان کی ازدواجی زندگی باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی کو طلاق کہتے ہیں، یعنی نکاح کی قید سے آزاد ہو جانا۔ آپ نے غور فرمایا کہ عورت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ **لا یحل لکم** یعنی جب عورت کے دل میں خاوند کی طرف کراہت پیدا ہو تو وہ خاوند کے لئے حلال ہی نہیں رہتی۔ اس باب میں خاوند اور بیوی دونوں کی پوزیشن یکساں ہے۔ کسی کو کوئی امتیازی حق حاصل نہیں!

۲۔ چونکہ بعض اوقات ہو سکتا ہے کہ کسی چھوٹی سی بات پر میاں بیوی میں شکر رنجی یا کشیدگی پیدا ہو جائے اور وہ غصہ میں آکر ازدواجی زندگی منقطع کرنے کی ٹھان لیں۔ اس قسم کی کشیدگی دور نہیں ہو سکتی جب تک کوئی تیسرا آدمی درمیان میں نہ پڑے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے ایک مصالحتی کوشش تجویز کی ہے، یعنی ایک نمائندہ خاوند کا اور ایک بیوی کا (۴/۳۵)۔ یہ لوگ میاں بیوی میں مصالحت کی کوشش کریں۔ واضح رہے کہ یہ صرف مصالحتی بورڈ ہے۔ انہیں

اس کا حق حاصل نہیں کہ یہ میاں بیوی کے علیحدگی کے فیصلے کو مسترد کر سکیں۔ اگر ان میں مصالحت ہو جائے تو ہو المراد' ورنہ سلسلہ مناکحت منقطع ہو جائے گا۔

۳۔ اس سلسلہ کے انقطاع (یعنی طلاق) کی صورت میں بعض امور اور بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً" نکاح کے وقت عورت کو مہر دیا گیا یا اس کے بعد خاوند نے اسے زیورات یا کوئی جائیداد دی۔ ایسی (شاذ) صورتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ ایک عورت ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے کسی مرد سے شادی کر لے اور جب یہ کچھ حاصل کر لے' تو پھر اس سے سلسلہء مناکحت منقطع کر لے۔ ایسے معاملات کے تصفیہ کے لئے عدالت درمیان میں آجاتی ہے۔ یعنی عدالت کا یہ کام نہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ طلاق ہونی چاہئے یا نہیں۔ اس کا کام یہ فیصلہ کرنا ہے کہ طلاق کی صورت میں اگر کسی فریق کو ناحق نقصان پہنچتا ہے' تو اسے اس نقصان سے بچایا جائے۔

۴۔ مندرجہ بالا مقصد کے لئے اگر عدالت دیکھے کہ مرد سلسلہء نکاح منقطع کرنا چاہتا ہے تو فیصلہ دے دے گی کہ مرد نے جو کچھ بیوی کو دیا تھا' وہ اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتا (۴/۲۰)۔ لیکن اگر عورت بے حیائی کی مرتکب ہوئی ہو اور یہ چیز وجہ طلاق ہو تو پھر عدالت' مرد کو کچھ دلا سکتی ہے (۴/۲۰)۔ اگر یہ صورت نہیں تو مرد کے لئے قطعاً" یہ جائز نہیں کہ جو کچھ اس نے عورت کو دیا ہے' اس میں سے کچھ واپس لینے کے لئے عورت کو باندھ رکھے۔ یعنی اسے رکھنا بھی نہ چاہے' لیکن اسے تنگ کرے کہ وہ اس سے ان چیزوں میں سے کچھ واپس لے لے جو اسے دی تھیں۔ عدالت اس امر کا بھی فیصلہ کرے گی (۴/۲۰)۔

۵۔ اگر عدالت دیکھے کہ عورت' علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے' بایں نیت کہ جو کچھ وہ مرد سے لے چکی ہے' اسے ہتھیالے' تو وہ اس عورت سے کچھ واپس دلا سکتی ہے (۲/۲۲۹)۔

۶۔ بس یہ ہیں ازدواجی رشتہ کے انقطاع سے متعلق قرآنی احکام۔ ان احکام سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے قطعاً" یہ صورت نہیں کہ :-

(i) مرد جب جی چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اس رشتہ کو ختم کر دے اور عورت کو اس کے لئے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں۔ (عورت کے طلاق حاصل کرنے کے لئے خلع کا لفظ تک قرآن میں نہیں آیا) ..... رشتہ نکاح تو (مصالحت کی کوشش کی ناکامی کے بعد) منقطع ہو جائے گا خواہ اسے مرد منقطع کرنا چاہے یا عورت۔ عدالت' ان کے اس فیصلہ کے عواقب سے متعلق امور کا فیصلہ کرے گی۔

(ii) نہ ہی قرآن سے یہ ثابت ہے کہ طلاق کا حق صرف مرد کو حاصل ہے اور اگر وہ چاہے تو اپنا یہ حق عورت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۷۔ چونکہ سوال صرف طلاق سے متعلق قرآنی احکام کا ہے' اس لئے ہم یہاں طلاق کے بعد انہی میاں بیوی میں دوبارہ نکاح' عدت' مہر' نان نفقہ' حضانت (یعنی اولاد کس کی تحویل میں رہے گی) سے متعلق احکام درج نہیں کئے۔ جو حضرات ان احکام کو دیکھنا چاہیں وہ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ' پرویز صاحب کی کتاب "قرآنی قوانین" کا مطالعہ فرما لیں۔

(اکتوبر ۱۹۶۸ء)

باب ہشتم

(فرقہ بندی!)

۱۔ فرقے نہیں' مکاتب فکر

(ابلہ فریبی کی نئی سازش)

طلوع اسلام' برسہا برس سے' قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتا چلا آرہا ہے جن میں' فرقہ بندی کو شرک اور کفر بتایا گیا ہے۔ اور رسولؐ اللہ سے' بالفاظ صریح کہا گیا تھا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں' ان سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (ملاحظہ فرمایئے ۳۲-۳۱/۳۰' ۶/۱۶۰' ۳/۱۰۴)۔ یہ (اور اسی قبیل کی دیگر آیات) اس قدر واضح اور بین ہیں کہ مولوی صاحبان کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں۔ اب انہوں نے اپنی خفت مٹانے کے لئے ایک نیا حربہ وضع کیا ہے' یعنی وہ اپنے فرقوں کو "فرقے" نہیں "مکاتب فکر" کہتے ہیں اور اس طرح عوام کو یہ دھوکا دینے کی سعی لا حاصل کرتے ہیں کہ قرآن کریم کی ان آیات کا اطلاق "مکاتب فکر" پر نہیں ہوتا' فرقوں پر ہوتا ہے۔ ان کی یہ مذموم کوشش اتنی بڑی جعلسازی ہے جس پر علم روتا اور دیانت ماتم کرتی ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ مکتب فکر اور فرقہ میں کیا فرق ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے حقائق کائنات پر غور و فکر کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ بار بار تاکید کی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب مجرد حقائق پر غور و فکر کیا جائے گا تو اس میں مختلف ادوار میں' اور ایک ہی دور میں' مختلف مفکرین کے نتائج فکر میں اختلاف ہوگا۔ فکری (فلسفیانہ) اختلافات عصر قدیم و جدید' مشرق و مغرب' مسلم و غیر مسلم وغیرہ میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس قسم کے اختلاف مسلمان مفکرین کے ہاں بھی رونما ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن اس اختلاف سے امت میں تفرقہ پیدا نہیں ہوگا۔ ان فلاسفرز کے اختلاف کو مکاتب فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) کہا جاتا ہے۔

ان کے برعکس' فرقوں کی کیفیت یہ ہے کہ ایک گروہ' احکام شریعت پر ایک طرح سے عمل کرتا ہے' دوسرا گروہ دوسرے طریق سے۔ اور چونکہ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے طریق عمل کی بنیاد ایک خاص عقیدہ پر رکھتا ہے' اس لئے عقیدہ اور عمل' فرقہ کی بنیاد بن جاتا ہے۔ اس طرح امت' عملی طور پر' مختلف گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ یہ ہے جسے قرآن کریم نے "دین میں فرقہ" سے تعبیر کیا ہے۔ **ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم.....** (۳۲-۳۱/۳۰) **ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شی ء .....** (۶/۱۶۰) دین میں تفرقہ' مذہبی فرقوں سے پڑتا ہے اور اس کی زندہ شہادت وہ تفرقہ ہے جو موجودہ فرقوں کی وجہ سے امت میں پیدا

ہوچکا ہے۔ اس فرقہ بندی کو قرآن کریم نے شرک' کفر اور رسولؐ اللہ کے ساتھ انقطاع تعلق سے تعبیر کیا ہے۔

اب آپ سوچئے کہ موجودہ فرقوں کو مکاتب فکر کی اصطلاح سے تعبیر کرکے' یہ کہنا کہ ان پر قرآنی آیات کا اطلاق نہیں ہوتا کتنی بڑی خود فریبی یا ابلہ فریبی ہے۔ اس فریب سے آپ اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہیں' عوام کو دھوکا دے سکتے ہیں' لیکن خدا کو تو دھوکا نہیں دے سکتے۔ "رام داس" کا محض نام "عبدالرحمٰن" رکھ دینے سے' وہ مشرک سے مومن نہیں ہوسکتا۔ مذہبی فرقے' مکاتب فکر (سوچ کے مختلف طور طریق) نہیں ہوتے' مختلف سبل (چلنے کے مختلف راستے) ہوتے ہیں اور جب ایک امت' چلنے کے مختلف راستے اختیار کرے گی تو اس میں تفرقہ خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ دین' امت کو ایک سبیل (راستہ) پر چلاتا ہے' فرقے اس کے لئے مختلف راہیں تجویز کر دیتے ہیں اور اسی سے قرآن کریم نے منع کیا تھا جب کہا تھا کہ **وان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه** یہ ہے میرا سیدھا راستہ' سو تم اسی ایک راستہ کا اتباع کرو۔ **ولا تتبع السبل** مختلف راستوں کا اتباع مت کرو۔ **فتفرق بکم عن سبیله** (۶/۱۵۴) ایسا کرو گے تو یہ مختلف راستے تمہیں' خدا کے راستے سے ہٹا کر الگ الگ کر دیں گے۔ مذہبی فرقے وہ سبل متفرقہ ہیں جو امت کو خدا سے دور ہٹا کر الگ الگ راہوں پر چلاتے ہیں اور اس لئے مشرک ہیں۔ توحید سے امت ایک راستے پر چلتی ہے۔ اس سے اس کی وحدت قائم رہتی ہے۔ جونہی امت فرقوں میں بٹی' اس کی وحدت ختم ہوئی اور جب وحدت امت ختم ہوئی تو توحید بھی باقی نہ رہی' شرک آگیا۔ (مئی ۱۹۷۲ء)

۲۔ مزید وضاحت

طلوع اسلام کے ایک دیرینہ صاحب علم قاری کا مراسلہ قابل توجہ ہے۔

"جیسا کہ آپ کو علم ہے طلوع اسلام سے میرا قدیمی رابطہ ہے۔ اس نے ہمارے مروجہ غیر قرآنی عقائد و مسالک کی جس طرح نشاندہی کی ہے ان میں سے ہر کوشش مستحق ستائش ہے۔ لیکن میرے نقطہ نگاہ سے اس نے فرقوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن شریف تو ہم سب کے سامنے تھا لیکن یہ امر موجب صد تاسف ہے کہ ہماری اس طرف کبھی نگاہ ہی نہ گئی کہ اس نے فرقہ بندی کو بہ نص صریح شرک قرار دیا ہے اور رسولؐ اللہ سے کہا ہے کہ اسلام میں فرقہ پیدا کرنے والوں سے تیرا کوئی واسطہ نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ان نصوص قرآنیہ کو اس طرح اجاگر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے مذہبی راہ نما (علماء کرام) خدا کے خوف سے لرز اٹھیں گے اور فرقہ بندی سے تائب ہو جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مذہب کی گرفت اس قدر سخت اور ذاتی مصلحتیں اس قدر جاذب ہوتی ہیں کہ وہ واضح دلائل سامنے آجانے کے بعد بھی باطل پرستی کو چھوڑ کر حق کی طرف آنے ہی نہیں دیتیں۔ اس کے لئے واقعی بڑی جرات ایمانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بایں ہمہ' آپ کے دلائل اس قدر مسکت تھے (یا یوں کہئے کہ قرآنی نصوص اس قدر بین تھیں) کہ ان سے ان کا کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا' اس لئے یہ حضرات بالکل خاموش تھے۔ لیکن' جیسا

کہ آپ نے لکھا ہے' جب یہ حضرات طلوع اسلام کے پیہم اصرار سے تنگ آگئے تو ابلیس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ تم کہو کہ ہم فرقے نہیں' مکاتب فکر ہیں- چونکہ یہ ابلیسی دلیل ان کے لئے بہت بڑا سہارا بن رہی تھی' اس لئے یہ اس سے بہت خوش ہوگئے- چنانچہ اب ہر طرف سے اسے اچھالا جا رہا ہے- گویا یہ محض لفظوں کی تبدیلی سے (بقول طلوع اسلام' رام داس کا نام عبدالرحمٰن رکھ کر) خدا کو (معاذ اللہ) فریب دے رہے ہیں کہ دیکھ لو! ہم آپ کی گرفت سے کس طرح بچ گئے- ہمارے فرقے بھی بدستور قائم رہے اور ہم آپ کے غضب سے بھی محفوظ ہوگئے--- میں سمجھتا ہوں کہ خدا فریبی یا (بالفاظ صحیح) خود فریبی کی اس سے بدتر مثال شاید کہیں اور مل سکے- گویا ان کی الگ الگ نمازیں' جداگانہ مسجدیں (جنہیں سورۂ توبہ میں کفر اور دشمنان خدا کی پناہ گاہیں قرار دیا گیا ہے) سب "فکری اختلاف" ہیں' عملی تفریق نہیں! ان سے کوئی پوچھے کہ اگر یہ محض فکری اختلافات ہیں تو قرآن شریف نے جس چیز کو "**تفریقا" بین المومنین**" (سورۂ توبہ' آیت ۱۰۷) اور "**فرقوا دینھم**" (سورۂ روم' آیت ۳۲) سے تعبیر کیا ہے' وہ کیا ہے؟ اس کی کوئی مثال دیجئے تاکہ مکتب فکر اور فرقہ بندی کا فرق سامنے آسکے-

میں ان سے ایک اور سوال کرنا چاہتا ہوں- حدیث شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

> بنی اسرائیل کی قوم بہتر (۷۲) فرقوں میں منقسم ہوگئی تھی- میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں منقسم ہوگی جن میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہو گا' باقی سب دوزخ میں جائیں گے- (مشکوۃ' جلد اول)

اس حدیث کو تمام فرقے صحیح تسلیم کرتے اور اپنے فرقہ کو جنتی (اور دوسرے فرقوں کو دوزخی) ثابت کرنے کے لئے بطور سند پیش کرتے چلے آرہے ہیں اور آج بھی پیش کرتے ہیں- سوال یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کے موجودہ فرقے مکاتب فکر ہیں' ان میں فرقہ کوئی نہیں' تو حضورؐ نے جن تہتر (۷۳) فرقوں کا ذکر فرمایا ہے وہ کون سے ہیں؟ اور اگر فرقہ کوئی بھی نہیں تو پھر حضورؐ کے اس ارشاد کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ مسلمانوں میں دین سے برگشتہ کرنے والے اس قدر عقائد اور اعمال کس طرح وجود میں آگئے- اس کا سبب کیا تھا- اب سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مذہبی پیشوا محض اپنی قیادت (لیڈر شپ) قائم رکھنے کے لئے ان باطل عقائد کی نگاہ فریب تاویلات سے عوام کو گمراہ کرتے رہے- قرآن شریف نے اسی لئے ان گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں کو مورد الزام ٹھہرایا ہے- یہی ہیں وہ مذہبی لیڈر جن کے متعلق عوام' خدا سے عرض کریں گے کہ

> **ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراء نا فاضلونا السبیلا** (سورۂ احزاب- آیت ۶۷)
>
> اے پروردگار ہمارے! ہم نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور اکابر کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں صحیح راستے سے گمراہ کردیا-

اور یہی ہیں وہ مذہبی پیشوا جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قیامت کے دن وہ اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنی پیٹھ پر لادے ہوں گے اور ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا تھا (سورۂ نحل۔ آیت ۲۵)۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ان حضرات کا قرآن شریف کے ان ارشادات پر ایمان ہی نہیں۔ ورنہ ہو نہیں سکتا کہ دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے ارشادات پر ایمان' تو پھر اس قدر واضح نصوص کی موجودگی میں انسان' محض الفاظ کی تبدیلی سے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ یہ (فرقوں کو مکاتب فکر کہنے سے) الفاظ کی تبدیلی ہی تو ہے جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

اسماء سمیتموھا انتم و اباء کم

(سورۂ یوسف۔ آیت ۴۰)

کچھ نام ہیں جو پہلے تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لئے اور اب تم رکھ رہے ہو۔

ما انزل اللہ بھا من سلطن (ایضاً)

انہیں خدائی سند تو حاصل نہیں

خدا نے فرقہ بندی کہا (**فرقوا**) انہوں نے ان کا نام مکاتب فکر رکھ لیا۔ جس طرح مشرکین عرب' اپنے بتوں کا نام لات اور منات اور ہبل اور عزیٰ رکھ کر کہتے تھے کہ ہم انہیں اللہ تو نہیں کہتے۔

ہم اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں کہ خدا سے دعا کریں کہ وہ ان لوگوں کو اتنی جرات ایمانی عطا کردے کہ یہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہہ سکیں۔ بہرحال' آپ جس جہاد میں مصروف ہیں اسے جاری رکھئے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ والسلام (اکتوبر ۱۹۷۵ء)

۳۔ فرقہ اہل قرآن۔۔۔۔ گمراہ ترین فرقہ

ہماری تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ خدا کی کتاب پر ایمان رکھنے والی قوم (مسلمانوں) میں جب اور جہاں بھی خدا کی کتاب کی آواز بلند کرنے کی کوشش کی گئی' اس قوم کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی اور اس کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ زمانے کے تقاضوں کی بنا پر ہمارا دور' قرآنی پیغام کی طرف متوجہ ہونے کے لئے سابقہ ادوار کے مقابلہ میں زیادہ آمادہ تھا۔ انہی حالات کے پیش نظر طلوع اسلام نے یہ منصب اختیار کیا کہ قرآن کی آواز کو بے غل و غش قوم (اور دنیا) کے سامنے پیش کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہونی تھی اور اس مخالفت میں مذہبی پیشوائیت نے ہراول دستے کا کام دینا تھا۔ چنانچہ یہ مخالفت ہوئی اور اب تک ہو رہی ہے' اگرچہ اس کا زور دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے لیکن اس راستے میں جو سب سے بڑی روک ثابت ہوا وہ ایک نیا فرقہ

تھا جس نے اسی زمانے میں جنم لیا اور جو (بدقسمتی سے) اپنے آپ کو قرآن کی طرف منسوب کرتا ہے یعنی فرقہ اہل قرآن۔ ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ اس فرقہ کے بانی (مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم) کی نیت یہی تھی لیکن عملاً" ہوا یہ کہ یہ قرآن کے راستے میں سب سے بڑی روک بن گیا۔ ہم نے اس فرقہ کا کبھی تفصیلی جائزہ نہیں لیا اس لئے کہ اسے چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ مولوی عبداللہ مرحوم کی وفات کے بعد ہی ان کے معتقدین ادھر ادھر بکھر گئے اور ان کی حیثیت محض انفرادی رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان میں باہمدگر ایسے اختلافات نمودار ہو گئے کہ ان کی توانائیاں ایک دوسرے کے ساتھ الجھ کر ضائع ہو گئیں۔ (کوئی ایک نماز کا قائل' کوئی تین کا' کوئی پانچ کا' کوئی تین روزوں کا' کوئی نور کا' کوئی مہینہ بھر کا' کسی کے نزدیک انڈہ حلال' کسی کے نزدیک حرام **وقس علی ھذا**) اب ان کے کچھ افراد سمٹ سمٹا کر لاہور میں جمع ہو گئے ہیں جو ماہنامہ بلاغ القرآن کے ذریعے اپنی ہستی کا ثبوت پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' لیکن یہ بھی چند دنوں کا کھیل ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جس نظریہ میں زندہ رہنے کی قوت نہیں ہوتی مرور زمانہ اسے از خود ختم کر دیتا ہے۔ ان کے حالات کے پیش نظر یہ فرقہ ایسی اہمیت کا حامل نہیں کہ اس کا خصوصیت کے ساتھ نوٹس لیا جائے۔ لیکن بعض اوقات ان کی طرف سے ایسی شرر فشانیاں ہوتی ہیں جن کا ازالہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو کبھی کبھی اس فرقہ کا تذکرہ طلوع اسلام کے صفحات میں آجاتا ہے۔

۲۔ یہ فرقہ فکری اور عملی' ہر دو لحاظ سے ایسی بنیادوں پر استوار ہے جن میں مسلمانوں کے باقی فرقوں میں سے کوئی بھی ان سے اشتراک نہیں رکھتا۔ یعنی:۔

(۱) ان کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر احکامات آئے ہیں' ان کی تمام جزئیات اور تفصیلات بھی قرآن مجید نے خود متعین کر دی ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات ہماری رہنمائی کرتی ہیں اس سے پہلے کسی فرقہ نے بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔

(۲) ان کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ ہے کہ یہ تین وقتوں کی نماز کے قائل ہیں۔ ہماری تحقیق کی رو سے اس سے پہلے مسلمانوں کے کسی فرقے نے ایسا نہیں کیا۔

ہم اس مقام پر بلاغ القرآن والوں کے مسلک پر اکتفا کرتے ہیں۔ ورنہ اس عقیدہ کے ماننے والوں میں سے بعض افراد نماز کے علاوہ روزہ' زکوٰۃ' حرام' حلال وغیرہ کے معاملات میں بھی ایسی ایسی نرالی باتیں کرتے ہیں جن کا اس سے پہلے کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔

فکری اور عملی لحاظ سے مندرجہ بالا دو امور کی بنا پر ہی ان میں اور مسلمانوں کے دوسرے فرقوں میں ایک ایسی خلیج حائل ہے جس کے پر ہونے کا امکان ہی نہیں۔

(۳) اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اس فرقہ نے خود قرآن مجید کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں پہلے دو ایک مسلمات کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) قرآن کریم کی رو سے امت مسلمہ میں فرقہ بندی شرک اور خدا کے عذاب کا موجب ہے۔
(۲) قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔
(۳) شق نمبر ۲ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر فکر و عمل کی بنیاد قرآن ہو تو امت میں اختلاف و تفریق (فرقہ بندی) پیدا نہیں ہو سکتی۔ (قرآن کے بنیاد بننے کی عملی شکل کیا ہے' اس کے متعلق آگے چل کر بات کی جائے گی)۔
(۴) امت میں مختلف فرقے ہیں' لیکن ان میں سے کسی کا دعویٰ یہ نہیں کہ ان کے فکر و عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ نظری طور پر قرآن کو سب مانتے ہیں' لیکن عملاً" ان میں سے بعض احادیث کو اپنے مسلک کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور بعض فقہ کو۔ لہٰذا' ان کے باہمی اختلافات کے متعلق یہی کہا جائے گا (اور یہی کہا جاتا ہے) کہ ان کی وجہ روایات اور فقہ کا اختلاف ہے۔ قرآن مجید پر اس سے کوئی حرف نہیں آتا۔
(۵) لیکن فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے عمل کی بنیاد قرآن خالص ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کے عمل میں کسی قسم کا اختلاف نہ ہو۔
(۶) لیکن ان کے عمل کی کیا کیفیت ہے' اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں اور وہ بھی نماز کے اوقات کے سلسلہ میں جو (ان کے دعویٰ کے مطابق) ان کا امتیازی کارنامہ ہے۔ اسے ذرا غور سے سنیے۔
(ا) اس فرقہ کے بانی مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) قرآن خالص سے ثابت کرتے ہیں کہ نماز پانچ وقتوں کی ہے (ملاحظہ ہو ترجمۃ القرآن از مولوی عبداللہ چکڑالوی' پارہ نمبر ۴' صفحہ ۶۳ و دیگر مقامات)۔
(ب) اور اس فرقہ (یا عقیدہ) کے متبع' بلاغ القرآن والے' اسی قرآن خالص سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ نماز تین وقتوں کی ہے۔ اب پوچھنے والے پوچھتے ہیں کہ جب قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ اس سے پانچ وقتوں کی نماز بھی ثابت ہو جاتی ہے اور تین وقتوں کی بھی' تو اس کے اس دعویٰ کے متعلق کیا کہا جائے گا کہ **ولو کان من عند غیر اللہ لوجد وا فیہ اختلا فا کثیرا** (۴/۸۲) "اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے" (اور یہ تو صرف ایک مسئلہ اوقات صلوٰۃ کے متعلق ہے۔ اگر دیگر مسائل کو بھی دیکھا جائے تو نہ معلوم ان میں کس قدر باہمی اختلافات ملیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق یہ دعویٰ ہو کہ وہ قرآن سے ثابت ہے)۔ یہ ہے ان حضرات کا وہ مسلک جس نے قرآن مجید کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اس سے اس کا بنیادی دعویٰ ہی (معاذ اللہ) باطل ہو جاتا ہے۔
۴۔ قارئین شاید یہ معلوم کرنے کے بھی متمنی ہوں کہ یہ حضرات' نماز وغیرہ کی تفاصیل قرآن خالص سے کس طرح نکالتے ہیں۔ اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔
سورۂ قصص میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو انہیں جو ہدایات دیں'

ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہاں کسی سے ڈرنا نہیں' مضطرب و بے قرار نہیں ہونا۔ پوری دل جمعی اور اطمینان سے اپنی بات پیش کرنا۔ اس کے لئے کہا کہ **واضم الیک جناحک من الرھب** (۲۸/۳۲) خوف کی حالت میں اپنے بازو سمیٹ لینا۔ پرندہ خوف سے پھڑپھڑاتا اور اڑتا ہے۔ حالت امن میں وہ اپنے بازو (پر) سمیٹ لیتا ہے یہیں سے یہ محاورہ ہے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) اس آیت کو لکھ کر اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اپنے ہاتھ کہنیوں تک ایک دوسرے کے اوپر جمع کر کے اپنے سینے سے ملا لو۔ یہ عاجزی کی صورت ہے۔

اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ نماز میں ہاتھ سینے سے باندھنے چاہئیں۔

یہ ہے وہ طریق جس سے یہ لوگ قرآن مجید سے احکام قرآن کی تفاصیل اور جزئیات نکالتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اس سے انہوں نے قرآن مجید جیسی کتاب عظیم کو کس طرح بازیچہ اطفال بنا دیا ہے!

یہ ہے وجہ جو طلوع اسلام کہتا چلا آرہا ہے کہ یہ فرقہ قرآن مجید کے راستے میں سب سے بڑی روک بن کر کھڑا ہو گیا اور اس وجہ سے یہ اس فرقہ کی مخالفت کرتا ہے۔ لیکن اس فرقہ کی حالت عجیب ہے اور یہ بات بھی غور سے سننے کے قابل ہے۔

ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت نے دیکھا کہ ہمارے زمانے میں عوام کو مشتعل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اپنے مخالف کے متعلق کہہ دیا جائے کہ "یہ تین نمازوں اور نو روزوں کا قائل ہے۔" چنانچہ انہوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام یہی کہتا ہے۔ اس کے جواب میں طلوع اسلام کو کہنا پڑا کہ یہ مسلک اہل قرآن کا ہے' طلوع اسلام کا نہیں۔ طلوع اسلام کا اہل قرآن سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس سے ان کا اطمینان ہو جاتا لیکن (ہم نہیں کہہ سکتے کہ کن مصالح کی بنا پر) بلاغ القرآن والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام اور ہم ایک ہی ہیں۔ بس بعض معاملات میں یونہی ذرا ذرا سا فروعی فرق ہے۔ اس سے طلوع اسلام کی مخالفت کرنے والوں کو ایک حربہ (LEVER) ہاتھ آگیا اور انہوں نے عوام میں مشہور کرنا شروع کر دیا کہ دیکھو! اہل قرآن والے خود یہ کہتے ہیں کہ ہم اور طلوع اسلام ایک ہی ہیں۔ بلاغ القرآن والوں کی طرف سے طلوع اسلام کے خلاف یہ اتنی بڑی سازش ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

حال ہی میں (طلوع اسلام کنونشن میں پیش کردہ) ایک مقالہ بہ عنوان "تین نمازوں اور نو روزوں کے پس پردہ کیا ہے"--- میں صاحب مقالہ محمد اسلام صاحب نے بتایا کہ یہ مسلک اہل قرآن کا ہے' طلوع اسلام کا نہیں۔ اس پر بلاغ القرآن نے اپنی وسوسہ اندازی کی سلگتی آگ میں پھونکیں مارنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اشاعت بابت دسمبر ۱۹۷۴ء میں "معاصر عزیز' طلوع اسلام" کے متعلق لکھا ہے کہ:

> بلاغ القرآن اور طلوع اسلام ایک ہی راہ کے دو راہ رو ہیں۔ دونوں کی ایک ہی منزل ہے۔ امن عالم کا قیام بذریعہ نظام ربوبیت' یہ دونوں اس ایک ہی شاہراہ پر محو سفر ہیں۔ لیکن طلوع اسلام اپنے رفیق سفر کے ساتھ کچھ کھچا کھچا اور روٹھا روٹھا رہتا ہے۔ (صفحہ

-(۳۱

ہم بیانگ دہل اعلان کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ نہایت مکروہ قسم کا جھوٹ ہے' فریب ہے' انتہائی بددیانتی پر مبنی وسوسہ انگیزی ہے۔ امن عالم کا قیام بذریعہ قیام نظام ربوبیت دجل و فریب کا پردہ ہے۔ طلوع اسلام اور بلاغ القرآن کی نہ راہ سفر ایک ہے' نہ منزل ایک۔ نہ یہ دونوں رفیق سفر ہیں نہ ہم نوا۔ اس کے برعکس' طلوع اسلام کی منزل بھی بلاغ القرآن سے مختلف ہے اور راستہ بھی اس سے یکسر الگ اور ان دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ طلوع اسلام' فرقہ اہل قرآن اور اس کے نقیب بلاغ القرآن کے ساتھ "کچھ کھچا کھچا اور روٹھا روٹھا سا" نہیں رہتا' اعلانیہ اس کی مخالفت کرتا اور اس کی انتہائی گمراہ کن نظریات کی تردید کرنا اپنا قرآنی فریضہ سمجھتا ہے۔ ہم بلاغ القرآن سے واضح الفاظ میں کہیں گے کہ وہ اپنی اس فریب کارانہ روش سے مجتنب رہے۔ یہی اس کے حق میں بہتر ہے۔

آخر میں احتیاطاً" ہم طلوع اسلام کا مسلک دہرا دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کے اور بلاغ القرآن کے مسلک کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجائے۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ:۔

۱۔ قرآن نے (باستثنائے چند) اپنے احکام اصولی طور پر بیان کئے ہیں' ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ کیونکہ احکام کی طرح ان کی جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا مقصود نہیں تھا۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ ان جزئیات کو وہ قرآنی نظام متعین کرے جو اس کے احکام کو عملاً" نافذ کرنے کے لئے قائم ہو۔ اس نظام کو سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا اور حضورؐ کے بعد یہ خلافت علیٰ منہاج نبوت کی شکل میں سامنے آیا۔

۲۔ جب خلافت علیٰ منہاج نبوت قرآنی احکام کو (مع ان کی جزئیات کے) نافذ کرے گی تو امت میں اختلاف اور فرقہ سازی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ یہ امت' امت واحدہ رہے گی۔

۳۔اس وقت امت میں بہت سے فرقے ہیں جن میں باہمی اختلاف ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ خلافت علیٰ منہاج نبوت موجود نہیں۔ ان اختلافات اور تفرقات کے مٹانے کی واحد صورت یہ ہے کہ امت میں پھر سے اسی خلافت کا قیام عمل میں آجائے۔ طلوع اسلام اس کے لئے کوشاں ہے۔ یہ حکومت اپنا تمام کاروبار قرآن مجید کی حدود کے اندر رکھتے ہوئے سرانجام دے گی۔

۴۔ اس وقت (جبکہ وہ خلافت قائم نہیں) مسلمانوں کے مختلف فرقے جس جس طریق سے مختلف احکام اسلام پر عمل کرتے ہیں' ویسا کرتے رہیں۔ کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے یا کسی نئے طریق کو رائج کرے۔ طلوع اسلام اس کی تلقین کرتا ہے اور اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ نماز کی تفصیلات کی بھی یہی صورت ہے۔ جن جن اوقات میں اور جن جن تفصیلات کے ساتھ مختلف فرقے اسے ادا کرتے چلے آرہے ہیں' ہم ان میں ردو بدل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے' نہ کوئی طریق وضع کرنے کا حق۔

آپ سوچئے کہ اگر (اہل قرآن کے نظریہ کے مطابق) ہر شخص کو اس کا حق دے دیا جائے کہ وہ جس طرح جی چاہے احکام و ارکان اسلام کی تفصیلات مرتب کر کے اپنا الگ فرقہ بنا لے' تو امت میں (جس میں پہلے ہی اتنے فرقے

موجود ہیں) کس قدر تشتت و انتشار پیدا ہو جائے اور جب ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مسلک کو قرآن کی طرف منسوب کرے تو خود قرآن کے متعلق دنیا کیا کہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی (مرحوم) کے بعد جو بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے (اہل قرآن) پیدا ہوئے' ان کی آواز کسی نے نہیں سنی ورنہ (دنیا کی نظروں میں) اس وقت تک (معاذ اللہ) قرآن مجید کی دھجیاں اڑ چکی ہوتیں۔

اس کا یہ بھی مسلک ہے کہ مسلمانوں میں جس قدر ایسے عقائد و رسوم رائج ہیں ان کی نشان دہی کی جائے' لیکن اس بنا پر نہ تو اپنا الگ فرقہ بنایا جائے اور نہ ہی اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا جائے۔ کفر و اسلام کے تعین کا حق اسلامی حکومت کو حاصل ہے نہ کہ افراد یا فرقوں کو۔

اس مختصر سے تعارف سے آپ دیکھ لیجئے کہ کیا طلوع اسلام اور فرقہ اہل قرآن ایک ہی راستہ کے راہی اور ایک ہی منزل کے مسافر ہیں یا ان کی راہیں بھی مختلف ہیں اور منزلیں بھی ایک دوسرے سے متضاد! (جنوری ۷۵ء)

نوٹ:- یہ شذرہ جنوری ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے "فرقہ اہل قران کی گمراہیاں" کے عنوان سے ایک تفصیلی مقالہ سپرد قلم فرمایا' جو طلوع اسلام' بابت جون ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس مقالہ کا مطالعہ فرمالیں۔

۴- پرویزی فرقہ کوئی نہیں

(ہمارے مذہب پرست طبقہ کی فریب دہی)

(سابق) سرحد کے ایک گاؤں سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ دنوں سے ایک مولوی صاحب "پرویزی فرقہ" کے خلاف بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ یہ فرقہ کونسا ہے اور اس کے عقائد کیا ہیں؟

طلوع اسلام

آپ نے بھارت (ہندوستان) کی سیاست کا مطالعہ کیا ہے؟ ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ ان کے جس خلاف قانون اقدام کے خلاف پاکستان نے صدائے احتجاج بلند کرنی ہوتی ہے' وہ پہلے ہی وہ الزام خود پاکستان کے سر تھوپ کر' چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ (مثلاً") وہ کسی دریا کا پانی بند کر لیں گے اور اس کے ساتھ ہی دہائی مچانا شروع کر دیں گے کہ پاکستان دریاؤں کا پانی بند کر رہا ہے۔ ہم تباہ ہو گئے' ہم مارے گئے **وقس علی ذالک۔**

کچھ ایسی ہی کیفیت مولوی صاحبان کی ہے۔ طلوع اسلام پہلے دن سے اس حقیقت کو پیش کر رہا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے' اسلام میں فرقوں کا وجود شرک ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **ولا تکونوا من المشرکین ۝ من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا ط کل حزب بمالدیھم فرحون۔** (۳۲-۳۱/۳۰) مسلمانو! دیکھنا' تم (ایمان لانے کے بعد پھر) مشرکوں میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں

فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ (فرقہ بندی میں ہوتا یہ ہے کہ) ہر فرقہ اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس نے رسول اللہ سے کہ دیا کہ **ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا** " **لست منھم فی شی ء**(۶/۱۶۰) جو لوگ دین میں فرقے بنالیں اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھیں' اے رسول"! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

طلوع اسلام' شروع سے حضرات علماء کرام سے دریافت کرتا چلا آرہا ہے کہ قرآن کریم کی ان واضح تصریحات کی روشنی میں' مسلمانوں میں فرقوں کا وجود کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ان حضرات کے پاس اس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی مدافعت کی ترکیب سوچی اور مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام خود ایک فرقہ کا ترجمان ہے جس کا نام پرویزی ہے۔ انہوں نے عوام کو اس پیچ میں الجھا کر اپنا پیچھا چھڑایا۔ یہ ہے حقیقت اس "پرویزی فرقہ" کی جس کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔

فرقہ اس طرح بنتا ہے کہ لوگ کسی شخص کے قول کو دین میں سند اور حجت سمجھیں یا دوسرے مسلمانوں سے الگ نماز' روزہ وغیرہ کی کوئی شکل اختیار کریں۔ جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے' وہ اپنی ہر کتاب میں اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو اور خطا کا امکان ہے۔ میری کوئی بات نہ حرف آخر ہے نہ کسی کے لئے سند اور حجت۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ قوم کے افراد قرآن کریم پر غور کر کے اسے سمجھیں۔ جو لوگ ان کی پیش کردہ فکر سے متفق بھی ہوتے ہیں' وہ بھی انہیں قرآن کریم کے ایک مفکر سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ خود بھی اپنے آپ کو قرآن کریم کے ایک طالب العلم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے۔

جہاں تک نماز روزہ وغیرہ کا تعلق ہے' طلوع اسلام سیکڑوں مرتبہ اعلان کر چکا ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے جس جس طریق سے' اسلام کے ان ارکان پر عمل کرتے چلے آرہے ہیں' کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا رد و بدل کرے یا ان کی ادائیگی کی کوئی نئی شکل وضع کرے۔ چنانچہ طلوع اسلام کی پیش کردہ فکر سے متفق احباب کو بھی آپ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ وہ کسی خاص وضع کی نماز پڑھتے ہوں۔ لیکن اس کے باوجود' مولوی صاحبان کہتے چلے جائیں گے کہ طلوع اسلام والے ' تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کے قائل ہیں۔ اس پروپیگنڈہ میں جماعت اسلامی کے افراد پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہ سب جھوٹا پروپیگنڈہ ہے۔ نہ پرویزی کوئی فرقہ ہے' نہ طلوع اسلام کے کوئی الگ عقائد ہیں' نہ ہی یہ روزہ نماز کی کوئی مختلف شکل تجویز کرتا ہے۔ اس کا مشن' کوئی فرقہ بنائے بغیر' قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنا ہے اور بس۔

(جولائی ۱۹۶۸ء)

۵۔ فرقے کی پہچان کیا ہے؟

ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

طلوع اسلام کے خلاف مولوی صاحبان کا ایک اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ "پرویزی فرقہ" کا رسالہ ہے۔ جب ان سے کہئے کہ پرویزی فرقہ کوئی نہیں تو وہ رٹ لگائے جاتے ہیں کہ نہیں' پرویزی فرقہ ہے! کیا آپ بتائیں گے کہ فرقہ کی پہچان کیا ہے اور طلوع اسلام کس طرح کوئی فرقہ نہیں؟

طلوع اسلام

فرقے کی پہچان بڑی آسان ہے اور وہ یہ کہ ہر فرقہ دوسروں سے الگ نماز پڑھتا ہے۔ لہٰذا' جو لوگ اپنی نماز الگ پڑھیں' سمجھ لیجئے کہ وہ الگ فرقہ سے متعلق ہیں۔ اکثر تو ہر فرقہ کی نماز ہی مختلف ہوتی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ نماز دوسروں سے مختلف نہ ہو' لیکن وہ لوگ الگ نماز پڑھیں۔ مثلاً" جب "احمدی" اپنے آپ کو مسلمانوں کا فرقہ شمار کراتے تھے' تو وہ نماز تو وہی پڑھتے تھے جو حنفی مسلمان پڑھتے ہیں' لیکن نماز پڑھتے تھے دوسروں (حتیٰ کہ حنفیوں) سے الگ۔

فرقوں کی یہ علامت ہماری وضع کردہ نہیں' قرآن کریم کی بیان فرمودہ ہے۔ خود رسول اللہؐ کی زندگی میں' مدینہ میں ایک الگ مسجد تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس مسجد کے تعمیر کرنے والوں نے نہ اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا' نہ ہی انہوں نے کوئی نئی نماز وضع کر لی تھی۔ لیکن ان کا (الگ مسجد بنانے کا) یہ جرم اس قدر سنگین تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کو فرو کرنے کیلئے سخت ترین الفاظ میں تاکید کی۔ اس نے کہا کہ یہ مسجد نہیں' ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے' جو خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ کرنا چاہتے ہیں **(ارصاداً لمن حارب اللہ و رسولہ ۱۰۷/۹)**۔ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ ان لوگوں نے اسلام کو چھوڑ کر کفر نہیں اختیار کر لیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود' قرآن کریم نے ان کی اس مسجد سازی کو کفر قرار دیا (۱۰۷/۹) اور حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ تم اس میں قدم تک نہ رکھنا **(لا تقم فیہ ابدا")** اور اس کے بعد کہا یہ مسجد ان لوگوں کو جہنم میں لے جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ جرم کیا تھا' جس کی پاداش میں ایسا کچھ کہا گیا۔ سنئے اور غور سے سنئے۔ یہ جرم تھا **(تفریقاً" بین المومنین (۱۰۷/۹)** مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا۔ اور اس کی علامت کیا تھی؟ الگ مسجد! یہی وہ فرقہ سازی ہے جسے قرآن کریم نے یہاں کفر اور دوسرے مقام پر شرک کہہ کر پکارا ہے (۳۱/۳۰)۔ جب تک اسلام' دین کی شکل میں رہا' امت میں کوئی فرقہ پیدا نہ ہوا۔۔۔۔۔۔ یاد رکھئے! وحدت امت' دین کی بنیادی شرط ہے۔ اگر یہ وحدت باقی نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا۔ وہ دیگر مذاہب کی طرح مذہب بن جاتا ہے۔ ان فرقوں میں سے بہت سے مٹ مٹا گئے اور بہت تھوڑے سے باقی رہ گئے۔ اس کے بعد جدید فرقہ سازی کی وبا ختم ہو گئی۔ لیکن اس نے ہمارے زمانے میں پھر سر نکالا۔ پہلے "احمدیوں" نے (اپنے آپ کو ایک فرقہ کی حیثیت سے متعارف کرا کر) الگ نماز پڑھنا شروع کی اور اس کے بعد فرقہ اہل قرآن نے ایک الگ نماز ایجاد کی اور باقی فرقوں سے الگ نماز پڑھنے لگے اور اس کے لئے اپنی الگ مسجد بھی تعمیر کر لی۔ "احمدیوں"

کے غیر مسلم قرار پا جانے سے ان کا شمار مسلمانوں کے فرقوں میں نہ رہا۔ وہ "فرقہ" یوں ختم ہو گیا۔ باقی رہے "اہل قرآن"' سو وہ چند دلوں کا کھیل ہے۔ اس فرقہ میں باقی رہنے کی سکت نہیں۔ یہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ جو باقی فرقے چلے آرہے ہیں' بحالات موجودہ' ان کے مٹ کر امت واحدہ بن جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر ہماری کوئی ایسی مملکت وجود میں آگئی جس نے اسلام کو پھر سے دین کی شکل میں متمکن کر دیا' تو اس وقت اس امت متفرقہ کا امت واحدہ میں تبدیل ہو جانے کا امکان ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوا' تو پھر اسلام' دین کی شکل اس قوم میں اختیار کر سکے گا جو پہلے پہل مسلمان ہو گی اور قرآن مجید کی بنیادوں پر مملکت قائم کرے گی۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا' کیونکہ خدا کا اعلان ہے کہ یہ دین' غالب آکر رہے گا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جو طلوع اسلام' فرقہ سازی کو (ازروئے قرآن) شرک قرار دیتا ہو' کیا وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟ جو لوگ "پرویزی فرقہ" کی رٹ لگاتے ہیں' آپ ان سے پوچھئے کہ اس مبینہ فرقہ کے لوگ کونسی الگ نماز پڑھتے ہیں اور ان کی علیحدہ مسجد کونسی ہے! الگ مسجد بنانا تو ایک طرف' اس باب میں طلوع اسلام کی احتیاط کا تو یہ عالم ہے کہ یہ اپنی کنونشن میں بھی جلسہ گاہ یا قیام گاہ میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ شرکاء سے تاکید کرتا ہے کہ وہ قرب و جوار کی مساجد میں جاکر نماز پڑھیں۔ لیکن اس کے باوجود' یہ حضرات "پرویزی فرقہ" کی رٹ برابر لگائے جائیں گے۔ اس کی خاص وجہ ہے۔

جب سے مسلمانوں میں فرقے پیدا ہونے شروع ہوئے' یہ آواز طلوع اسلام کی طرف سے پہلی بار بلند ہوئی کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ سازی شرک ہے۔ اس سے پہلے ہوتا یہی تھا (اور اب بھی یہی ہو رہا ہے) کہ ہر فرقہ' دوسرے فرقوں کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتا تھا اور اپنے آپ کو صحیح اسلام کا پابند اور "ناجی" قرار دیتا تھا۔ جب طلوع اسلام کی طرف سے یہ آواز بلند ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس کی مخالفت تمام فرقوں کی طرف سے ہونی تھی۔ اس کی مخالفت تو ان سب نے کی۔۔۔۔ لیکن طلوع اسلام کی طرف سے قرآن کریم کی جو آیات پیش کی جاتی تھیں (جن میں اس نے فرقہ بندی کو کفر اور شرک قرار دیا ہے) ان کا جواب' ان سے نہیں بن پڑتا تھا۔ بالاخر' انہوں نے زچ ہو کر' اس کا علاج یہ سوچا کہ مشہور کر دیا جائے کہ طلوع اسلام کا بانی پرویز ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔ طلوع اسلام اس پر بھی قرآن کریم کی آواز بلند کرنے سے نہ رکا اور ان حضرات سے کہتا رہا کہ اس بحث کو چھوڑیئے کہ طلوع اسلام ایک فرقہ ہے یا نہیں۔ آپ یہ فرمایئے کہ' قرآن کریم کی رو سے' فرقہ سازی شرک ہے یا نہیں اور جو امت فرقوں میں بٹ جائے' کیا اس میں اسلام اپنی اصلی شکل میں باقی رہ سکتا ہے؟ اس کا ان کے پاس گالیوں کے سوا کوئی جواب نہیں تھا۔ جب یہ اس طرح سخت تنگ آگئے تو کوئی نہایت ہوشیار سیاسی ذہن آگے بڑھا اور اس نے ان کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ تم کہو کہ مسلمانوں میں کوئی فرقہ ہے ہی نہیں۔ یہ سب مختلف "مکتب فکر" ہیں۔ فرقہ کا نام مکتب فکر رکھا اور اس فریب نفس یا ابلہ فریبی سے مطمئن ہو گئے کہ ہم اس الزام سے بری الذمہ ہو گئے ہیں۔ ان کی بدستور الگ الگ نمازیں ہیں' الگ الگ مساجد' الگ الگ شریعت۔ لیکن اس کے باوجود یہ فرقے نہیں' مکاتب فکر ہیں۔۔۔۔ اور طلوع

اسلام جس کی نہ کوئی الگ نماز ہے' نہ الگ مسجد' نہ الگ شریعت' نہ کوئی الگ دعویٰ' فرقہ ہے! یا للعجب!

یہاں تو اس قسم کے فریب نفس سے اپنے آپ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے' لیکن معلوم نہیں' ان حضرات کو اس دن (یوم ظہور نتائج) کا بھی احساس ہے یا نہیں' جس کے متعلق فرمان خداوندی ہے کہ **یوم لا ینفع الظلمین معذ رتھم** .....(۴۰/۵۲) جب اس قسم کا فریب نفس کوئی کام نہیں دے گا---- مرنے کے بعد جو ایسا دن آئے گا' تو وہ اپنی جگہ (برحق) رہا- ہم ان خود فریبیوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ فرقوں کا نام مکاتب فکر رکھ لینے سے کیا آپ کے وہ جھگڑے ختم ہو گئے جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں؟

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ (اور نمازیں تو چھوڑیئے! کیا) آپ کے ان "مکاتب فکر" نے گذشتہ عید کی نماز بھی ایک جگہ مل کر پڑھی ہے؟ کیا آپ نے کفر کے وہ فتوے واپس لے لئے ہیں جو آپ نے ایک دوسرے فرقے کے خلاف لگائے تھے؟

(فروری ۱۹۷۶)

------○----

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلا باب

مذہبی پیشوائیت کا اسلام

۱۔ مولانا حضرات کے اسلام کا نقشہ

نوائے وقت' بابت ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء میں' (جماعت اسلامی کے) سید اسعد گیلانی صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نظامِ مصطفیٰؐ کیا ہے؟"۔ انہوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ اسلام کے دانا دشمنوں نے اس نظام کی کس قدر بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ اس کے نادان دوستوں نے اس کا نقشہ کس قسم کا کھینچا ہے۔ اس ضمن میں وہ تحریر فرماتے ہیں :۔

> اسلام کے نادان دوستوں نے اور بھی ستم ڈھایا۔ انہوں نے اسلام کے خلاف اندر کی غلط گواہی پیش کی۔ ان میں سے بیشتر اسلامی حکومتوں کے دور میں مرتّب کردہ نصابِ قانون کے فتویٰ ساز تھے جو اسلام کو بحیثیت نظامِ زندگی نہ جانتے تھے بلکہ اس کے قانون فوجداری اور دیوانی کے ماہرین تھے۔ ان کے پاس محض ضوابط حدود اور وراثت کے مسائل اور مسلمان حکومتوں میں عدالتی نصابوں کے چارٹ تھے۔ وہ ہر مسئلے کو قانونِ سزا اور احتساب کی نظر سے ہی دیکھتے تھے۔ مسلمان حکومتوں کے زوال کے بعد اسلامی نظامِ تعلیم کے نام سے مسلمانوں کا یہی فوجداری اور دیوانی نظامِ قانون باقی رہ گیا اور وہ بدلے ہوئے حالات سے بے نیاز اسی نظامِ قانون کو حالات' ماحول اور فضا سے بے نیاز ہو کر اسی انداز میں بیان کرتے رہے۔ گویا اسلامی نظام کی ساری فضا' سارا اخلاق اور سارے رفاہی ادارے تو موجود تھے بس اس کا قانونِ فوجداری ہی نافذ کرنے کی دیر تھی کہ اسلامی نظام کی بہار پورے معاشرے میں ہر طرف لہریں لینے لگے گی۔ چونکہ یہی حضرات اپنی اس ناکافی تعلیم' محدود نگاہ' حالات حاضرہ سے بے خبر دل و دماغ کے ساتھ اسلام کی نمائندگی کرتے' اس کے قوانین کے از سرِ نو اجراء کا مطالبہ کرتے اور اسلامی دور کے گن گاتے تھے' اس لئے فطری طور پر اسلامی نظام یا نظامِ مصطفیٰؐ کی حقیقی تعبیر کے مُفسّر انہیں کو قرار دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبوں'

وعظوں، تقریروں اور بیانوں میں جو اسلامی نظام کا نقشہ پیش کیا وہ بڑا ہی بھیانک نقشہ ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ذہن اور نفسیات کے مطابق اسلام کی خدمت اور تبلیغ ہی کرتے تھے لیکن اسلام کی رحمت اور برکات سے ناواقف لوگ ان کے سزاؤں سے معمور وعظ اور بیانات سن سن کر تھر تھر کانپتے تھے اور انہیں اپنی پیٹھوں پر بات بات پر کوڑے برستے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

اسلام کے ان نادان دوستوں نے اسلامی نظام یا نظام مصطفیٰؐ کی جو تصویر پیش کی وہ یہ تھی کہ امربالمعروف کے محکمے کے تحت ڈنڈا بردار اور کوڑے مار مشرّع کارکنوں کا ایک جتھہ گلی گلی پھرے گا۔ جس کا ٹخنہ ننگا نہ پائے گا اس کے ٹخنے پر ڈنڈے پڑیں گے۔ جو نماز میں لاپروائی کرے گا اسے جوتے مار مار کر نماز پڑھائی جائے گی۔ جس کی ڈاڑھی نہ ہوگی اس پر سنّتِ رسولؐ کی خلاف ورزی کے جرم میں کوڑے برسیں گے۔ چوروں کی تطاریں ہاتھ کٹواتی علیحدہ کھڑی ہوں گی۔ زانیوں کو دوسری طرف سنگسار کیا جارہا ہوگا۔ شرابی کسی اور چوراہے پر پٹ رہے ہوں گے۔ نوجوانوں اور بے پردہ عورتوں کو پکڑ پکڑ کر ہر چوراہے میں ان کے سر مونڈے جا رہے ہوں گے۔ بے پردہ عورتوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر گھروں میں بند کیا جا رہا ہوگا۔ جا بجا تکنکیاں لگی ہوں گی۔ مجرم ان پر ٹنگے ہوئے کوڑوں کی مار کھا رہے ہوں گے۔۔۔ اور دہشت زدہ عوام کا ہجوم ہاتھوں میں تسبیاں لئے اندر ہی اندر خوف زدہ یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہوگا۔ مٹھائی کی دکانیں بند کرکے صرف حلوے کی دکانیں کھلی رکھی جائیں گی۔ عدالتوں کا کام صرف لوگوں کو کوڑے لگوانا اور ہاتھ کٹوانا ہوگا۔ باقی کام واجبی سا ہوگا۔

اس نقشہ کا ایک گوشہ خالی رہ گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر یہ ناتمام رہ جاتا ہے۔ محترم گیلانی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اسے بھی اپنے پیش کردہ نقشہ میں شامل کرلیں۔

وہ یہ ہے:-

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رُونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہوچکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کرکے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدّت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور

پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کردیا جائے گا۔

("مرتد کی سزا" از ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔
اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن ص۷۶)

اسعد گیلانی صاحب' جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رکن ہیں' اس لئے انہیں اس نقشہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہونا چاہئے' نہ ہی اسے اپنے نقشہ میں شامل کرنے پر کوئی اعتراض۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس نقشہ کے مرتّب کا شمار اسلام کے دانا دشمنوں میں کریں گے یا نادان دوستوں میں۔ (ستمبر ۱۹۷۷ء)

مکرّر

گیلانی صاحب نے یہ تنقید جولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی۔ شروع ۱۹۷۹ء میں یہ تمام قوانین جن کے خلاف انہوں نے ایسی سخت تنقید کی تھی' "شرعی حدود" کے نام سے پاکستان میں نافذ ہوگئے اور جماعتِ اسلامی نے شادیانے بجا بجا کر ان کا استقبال کیا اور غلغلہ بلند کیا کہ للہ الحمد۔ ہزار سال کے بعد پھر سے اسلام کا احیاء ہوگیا ہے۔ ان قوانین کی تفصیل اگلے باب میں ملے گی۔

۲۔ قرآنِ مجید کے نادان دوست

(اسوۂ ابراہیمیؑ کی تاریک تصویر)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' ایلوپیتھک ڈاکٹر ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی (اپنے تصوّر کے مطابق) قرآنِ کریم کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے "خدّام القرآن" کے نام سے ایک انجمن کی بھی تشکیل کی ہے۔ قرآنِ مجید کے لئے اپنی زندگی وقف کردینا بہت بڑا عمل خیر ہے اور مستحقِ ستائش' لیکن اصل سوال خدمتِ قرآن کے لئے زندگی وقف کردینے کا نہیں' اصل سوال یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی وہ خدمت کس قسم کی ہے جس کے لئے زندگی وقف کی گئی ہے۔ اس "خدمت" کی ایک مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے زیر ادارت و اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ میثاق کی جنوری ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔۔۔۔ "سعی بین الصفا و المروہ" ۔۔۔۔ اس میں تحریر ہے:۔

> حضرت اسماعیلؑ ابھی شیر خوار ہی تھے کہ ان کی سوتیلی والدہ سارہؓ نے گھریلو جھگڑے کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ کو مجبور کیا کہ وہ بی بی ہاجرہؓ کو گھر سے نکال دیں۔ اس بات پر حضرت ابراہیمؑ نہایت رنجیدہ و کبیدہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً" آپ کو اطلاع دی کہ رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ جیسے سارہؓ کہتی ہیں' ویسے ہی کرو۔ اسحاقؑ و اسماعیلؑ

تیری ہی اولاد ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کو ہاجرہؓ کے فرزند دل پسند سے ایک عظیم قوم بنانی ہے۔ اس ارشادِ ربّانی پر سیکڑوں میل کا سفر طے کرکے حضرت ابراہیمؑ نہایت صبر و حلم۔۔۔ استقامت و تحمّل کے ساتھ اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ ہاجرہؓ کو کشاں کشاں بہ ہزار مشکل حجاز کی ایک وادی میں لے کر پہنچے جس کو وادیٔ بطحا یا وادیٔ بکّہ بھی کہتے تھے۔ یہ وہ وادی ہے جہاں اب مکۃ المکرمہ واقع ہے۔ یہ آبادی اس وقت انتہائی غیر آباد اور ویران تھی۔ تپتے ہوئے صحرا کی یہ بے آب و گیاہ وادی جہاں انسان زندگی کے بدلے موت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے چاروں طرف نوکیلے، تپتے اور چمکتے پہاڑ تھے جو نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔ صحرا کی وسعت حد نگاہ تھی۔ نہ چرند نہ پرند، سبزہ کا نام و نشان نہیں ماسوائے ریت کے تودوں کے یا سراب کے۔ دُور دراز تک پانی کا نام نہ تھا۔ بادِ صرصر کے تھپیڑے العطش العطش پکارتے تھے۔

الغرض اس وادی میں کوہِ صفا و مروہ کے پاس ان دو بے کس، نحیف اور بے بس جانوں کو مختصر زادِ راہ کے ساتھ چھوڑ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کی۔ واپس لوٹنے لگے تو بی بی ہاجرہؓ نے نہایت غمگین لہجہ میں پوچھا، ابراہیمؑ! ہمیں کس کے سپرد کرکے جا رہے ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا، "اس خدا کے جو دونوں جہان کا وارث ہے اور پالنے والا ہے"۔ ہاجرہؓ نے کہا، بیشک پھر آپ جاسکتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے ایک بیٹے (حضرت اسماعیلؑ) کو شام سے منتقل کرکے مکّہ میں بسانا دینِ خداوندی کے ایک عظیم پروگرام کی نہایت اہم بنیادی کڑی تھی۔ (ہم اس وقت اس نکتہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے) یہ کوئی ہنگامی یا اتفاقی واقعہ نہیں تھا۔ لیکن جس طرح یہ واقعہ مندرجہ بالا مضمون میں بیان کیا گیا ہے، (واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں یہ واقعہ یوں نہیں آیا۔ یہ تورات کا افسانہ ہے) اس کی رُو سے بات یوں سامنے آتی ہے کہ

۱۔ اس واقعہ کا محرک (معاذ اللہ) دو سوکنوں کا باہمی جلاپا تھا جس کی وجہ سے حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی نے انہیں "مجبور کیا" کہ وہ دوسری بیوی اور اس کے شیر خوار بچے کو گھر سے نکال دے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ اس پر بہت رنجیدہ ہوئے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ تم رنجیدہ نہ ہو۔ اپنی بیوی کی بات مان لو۔

یہ تو ہوا اس واقعہ کا محرک قصّہ۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ایک شخص (اور شخص بھی کوئی عام آدمی نہیں بلکہ خدا کا ایک عظیم المرتبت پیغمبرؑ) دو بے کس، نحیف اور بے بس جانوں کو جن میں ایک شیر خوار بچہ ہے، ایک ایسی وادی میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے جو انتہائی غیر آباد اور ویران تھی۔ تپتے ہوئے صحرا کی یہ بے برگ و گیاہ وادی جہاں انسان زندگی

کے بدلہ موت کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کے چاروں طرف نوکیلے' نپتے پہاڑ تھے جو نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔ صحرا کی وسعت حد نگاہ تھی۔ نہ چرند نہ پرند۔ سبزہ کا نام و نشان نہیں۔ ماسوائے ریت کے تودوں کے یا سراب کے دور دراز تک پانی نہ تھا۔ بادِ صرصر کے تھپیڑے العطش العطش پکارتے تھے۔ اس مقام پر خدا کا یہ پیغمبرؑ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو صرف ایک مشکیزہ پانی کا دے کر چلا گیا اور انہیں تنہا چھوڑ گیا۔ ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ غیر مسلم (یا ہماری نئی نسل کے نوجوان) جب اس "واقعہ" کو پڑھیں گے تو وہ خدا کے اس پیغمبرؑ کے متعلق کس قسم کا تصور قائم کریں گے۔ اور جب ان سے کہا جائے گا کہ خود خدا نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ ایسے خدا کے متعلق کیا کہیں گے؟ جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے' قرآنِ کریم میں یہ واقعہ درج نہیں۔ یہ تورات کا افسانہ ہے جو ہماری کتب روایات و تفاسیر میں راہ پاگیا ہے اور ہمارے "خدام القرآن" اسے آنکھیں بند کرکے نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ یہ قرآن کی خدمت ہے یا اس کی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) مذمّت! (فروری ۱۹۷۷ء)

۳۔ کشف المحجوب میں وضعی روایات

(حضرت داؤدؑ سے متعلق افسانہ)

ذیل کا خط ملاحظہ فرمائیں:۔

مسلمانوں کے تمام فرقوں کا حضرات انبیاء کرامؑ کی عصمت پر اتفاق ہے۔ لیکن بعض اوقات ہمارے اسلاف کی تحریروں میں ایسی چیزیں سامنے آجاتی ہیں جن سے ان کی عصمت داغدار ہوتی نظر آتی ہے۔ اگلے دن حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک عجیب چیز نظر سے گزری اور راقم اپنی کم علمی کی بنا پر اس کی کوئی تاویل نہ کرسکا۔ آپ کو تحریر کر رہا ہوں کہ اگر اس کی کوئی تاویل ہوسکتی ہے تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

بائبل میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے محل کی چھت پر سے اپنے ایک پڑوسی' اوریاہ حتّی کی بیوی کو برہنہ نہاتے دیکھ لیا اور اس پر عاشق ہوگئے۔ پھر اس کے ساتھ ہم بستر ہوئے۔ اور جب وہ حاملہ ہوگئی تو انہوں نے اس کے شوہر کو بنی عمون کے مقابلے میں جنگ پر بھیج دیا اور فوج کے سالارِ اعلیٰ کو حکم دیا کہ اسے ایسی جگہ متعین کرے جہاں سے وہ زندہ نہ بچ سکے۔ جب وہ مارا گیا تو داؤد علیہ السلام نے اس کی بیوی سے باقاعدہ شادی کرلی۔ اور شادی کے بعد اس کے بطن سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ا۔ (نعوذ باللہ من ہذا البہتان)

ظاہر ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ایک معصوم نبی پر بہتان ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا ذکر تو کجا' اشارہ بھی نہیں ملتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ان تفصیلات نے ہماری بعض کمزور روایات میں جگہ پالی ہے اور ہمارے مفسّرین ان

ا۔ عہد نامہ عتیق۔ سیموئیل نمبر ۲۔ باب نمبر ۱۲ - ۱۱۔

احادیث کو جانچے بغیر اللہ تعالیٰ کے انبیاءؑ پر اس قسم کے بہتان تسلیم کرلیتے ہیں۔ خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ کے منافقین اور یہودیوں نے کچھ ایسا ہی جھوٹا الزام لگایا کہ آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارث کی بیوی حضرت زینب بنت جحشؓ کو (جو رشتے میں آپ کی سگی پھوپھی زاد بہن تھیں) کو برہنہ حالت میں دیکھ لیا تھا اور ان پر عاشق ہوگئے تھے۔ پھر حضرت زیدؓ سے طلاق دلوائی اور اپنے نکاح میں لے آئے (نعوذ باللہ من ہذا البہتان)۔ قرآنِ حکیم نے خود اس واقعہ کی واضح الفاظ میں تردید کی ہے اور فرمایا کہ جب ناانفاقی کی بنا پر حضرت زیدؓ اور زینبؓ میں ان بن ہوگئی اور حضرت زیدؓ نے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلعم نے آپ کو ایسا کرنے سے روکا۔ لیکن جب حضرت زیدؓ نے' اس کے باوجود' اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو حضورؐ نے ان سے نکاح کرلیا۔

لیکن کشف المحجوب میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت محمد صلعم پر کافروں اور منافقوں کے لگائے ہوئے ان الزامات کو صحیح مان کر درج کردیا گیا ہے۔ کشف المحجوب کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

> تو جب فعل حق مضاف ہو بندہ کی طرف تو بندہ بخود قائم ہوتا ہے اور جب بندہ کا فعل حق کی طرف مضاف ہو تو بندہ بحق قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ داؤد علیہ السلام کی نظر مبارک وہاں پڑی جہاں پڑنی نہ چاہئے تھی' یعنی ایک عورت پر جو اوریا کی عورت تھی۔ جسے دیکھا وہ ان پر حرام تھی۔ اور جب بندہ بحق قائم ہوگیا جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر تو آپ کی بھی پڑی' اس طرح زیدؓ کی بیوی پر مگر وہ بیوی زیدؓ پر حرام ہوگئی۔ اس لئے کہ وہ نظر جو داؤد علیہ السلام کی تھی وہ محل صحو میں تھی اور یہ نظر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی یہ محل سکر۲ میں تھی۔
>
> (کشف المحجوب ترجمہ ابوالحسنات سید محمود احمد قادری' شائع کردہ المعارف گنج بخش روڈ لاہور' پہلا ایڈیشن ۱۳۹۳ھ' صفحہ ۳۵۲)

کشف المحجوب کے بہت سے اُردو ترجمے ہیں اور ان میں یہ عبارت "صوفیہ کے مختلف مکاتب و مذاہب کے باب" میں فرقہ طیفورہ کے ذیل میں ہر کتاب میں ملتی ہے۔ ہم نے ابوالحسنات قادری صاحب کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ ان کے عقیدت مندوں کے دعوٰی کے مطابق اسے خود حضرت داتا صاحب کی منظوری حاصل ہے۔ میں یہ عبارت پڑھ کر حیران ہوا تو کسی صاحب نے بتایا کہ میاں محمد طفیل' امیر جماعت اسلامی پاکستان نے بھی کشف المحجوب کا ترجمہ کیا ہے اور نوٹ بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے ضرور اس کی کوئی تشریح فرمائی ہوگی۔ لیکن جب میں نے اس نسخہ کو دیکھا تو اس نے میری پریشانی میں اور اضافہ کردیا کیونکہ انہوں نے مذکورہ بالا عبارت سمیت بہت سی عبارتیں حذف کردی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں یہ چیزیں قرآن اور اسلامی تعلیمات کے خلاف نظر آئی ہوں گی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ جس کتاب کو وہ تعمیرِ سیرت کے لئے مرتّب فرما رہے تھے' ایسے مقامات کے بارے میں کچھ وضاحت فرمادیتے۔

۲۔ صحو کے معنی ہوش مندی اور سکر کے معنی مدہوشی۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس بارے میں میری پریشانی دور فرمائیں۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

طلوع اسلام

محترم ..... نے، کشف المحجوب کا ایک اقتباس دیکھا اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم نے تصوف کے لٹریچر میں جو کچھ دیکھا ہے اگر کہیں وہ ان کے سامنے آجائے تو نہ معلوم ان کی کیا حالت ہو!

کیا جانئے کیا کرتا، کیا دیکھتا، کیا کہتا
زاہد کو بھی گر دیتا مجھ جیسی خدا آنکھیں

..... صاحب ان "ارشاداتِ عالیہ" کی تاویل کی فرمائش کرتے ہیں۔ انہیں شاید علم نہیں کہ یہ حضرات خدا سے براہِ راست علم حاصل کرکے (جسے کشف و الہام یا باطنی علم سے تعبیر کیا جاتا ہے) اس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ اس لئے کسی "بندے بشر" کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ ان کی کوئی تاویل کرسکے یا ان سے سند کا مطالبہ کرسکے۔ ایسے سوالات کا ان کے ہاں سے جواب یہ ملتا ہے کہ

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی!

قرآنِ کریم اس لئے آیا تھا کہ نوعِ انسانی کو شخصیت پرستی کی پستی سے نکال کر، خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے شرف و مجدِ انسانیت کے مقامِ بلند پر لے جائے۔۔۔ حضورؐ نے اپنی عملی زندگی سے ایسا کرکے دکھا دیا۔ لیکن اس کے بعد، مسلمانوں نے قرآن کا دامن بھی چھوڑ دیا اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور ان کا دین، مذہب، ایمان، مسلک و مشرب، سب شخصیت پرستی قرار پاگیا۔ چنانچہ اب قوم گلے گلے تک شخصیت پرستی کے دلدل میں غرق ہے۔ چونکہ شخصیت پرستی سے انسان کی عقل و فکر کی صلاحیتیں سلب ہوجاتی ہیں اور وہ یکسر جذباتی ہوجاتا ہے، اس لئے وہ بڑا ذکی الحس TOUCHY ہوتا ہے اور حقائق کا سامنا کرنے کی اس میں برداشت نہیں رہتی۔

یہ ہے وہ مقام جس پر ہم آج کھڑے ہیں۔ لہٰذا، ان حالات میں، اپنے لٹریچر پر تنقیدی نگاہ ڈالنے اور اسے قرآنِ کریم کی روشنی میں پرکھنے اور اسوۂ حسنہ کے معیار پر جانچنے کا کام بڑا ہمت طلب ہے۔ آپ اس باب میں ایک انگلی اٹھایئے اور پھر دیکھئے کہ آپ بھڑوں کے کتنے چھتوں میں پتھر دے مارتے ہیں۔ طلوع اسلام کے ساتھ یہی تو ہوا ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے (اپریل ۱۹۷۸ء)

۴۔ ڈاڑھی

(سنت رسولؐ کا معاذ اللہ استہزاء)

پشاور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ صدائے اسلام کی ۲۱ جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں عنوانِ بالا کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے :-

حضرت مولانا عبدالعزیز' خطیب زراعتی فارم ساہی وال' فرمایا کرتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں ایک بڑے عالم رہا کرتے تھے۔ جماع کے بعد تہجد کے وقت جب وہ غسل کرتے تو پیرانہ سالی کے سبب ان پر کپکپی طاری ہوجاتی اور وہ کہتے شریعت نے خواہ مخواہ غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر غسل کا حکم نہ ہوتا تو کیا حرج تھا۔ وفات کے بعد ان کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مدت کے بعد ان کی قبر' ہڈیاں نکالنے کے لئے کھودی گئی تو دیکھا کہ ایک عورت کی لاش ہے۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ مولوی صاحب تو عالم باعمل اور نیک آدمی تھے لیکن غسل کے بعد مذکورہ بالا الفاظ کہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ واقعی یہ اس کی سزا ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ شریعت کی تحقیر کا کیا انجام ہوا! ع

غور سے سن داستان ان کی!

حجاج میں سے ایک شخص نے اس عورت کی لاش پہچانی اور کہا کہ یہ انگلستان کی رہنے والی تھیں اور مسلمان ہوچکی تھیں--- اس کے خاندان کے سب افراد عیسائی تھے۔ چنانچہ ان کی نشان دہی پر انگلستان ایک عالم صاحب گئے اور عورت کے والدین سے ملے اور اس کے والدین کو ساتھ لے کر اس عورت کی قبر اکھاڑی گئی تو دیکھا کہ مولوی صاحب کی لاش موجود ہے جن کو مکہ معظمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ اس روح فرسا واقعہ سے ڈاڑھی منڈے عبرت حاصل کریں اور ڈاڑھی کا استہزاء و تضحیک چھوڑ دیں ورنہ اُمّتِ محمدیہؐ علیہ الصلوۃ والسلام میں محشور نہ ہوں گے۔ (جون ۷۸ء)

۵۔ تصوف کی ریاضتیں

(حضرت بابا فرید گنج شکرؒ)

روزنامہ مشرق (لاہور) کی ۳ مارچ ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مقالہ میں تحریر ہے:-

حضرت بابا صاحب (بابا فرید الدین گنج شکرؒ) بارہ برس تک صائم رہے۔ اس عرصہ میں نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ گلے میں ایک کاٹھ کی روٹی ڈال رکھی تھی۔ جب بھوک غلبہ کرتی تو آپ روٹی پر دانت مارتے۔ بارہ سال کی ریاضت کے بعد جب والدہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے لکڑی کے سہارے کو بھی برا منایا اور کہا کہ ابھی تم پر نفس غالب ہے۔ جاؤ

اور بغیر چوبی روٹی کے صائم رہو۔ چنانچہ انہوں نے کاٹھ کی روٹی پھینک دی اور پھر بارہ سال تک صائم رہے۔

انہی کے متعلق روزنامہ جاوداں کی اشاعت بابت ۲۴ فروری ۱۹۷۱ء میں کہا گیا ہے :۔

آپ نے بہت سخت سے سخت مجاہدے کئے' چلہ معکوس بھی کاٹا' یعنی بارہ سال کنویں میں لٹک کر نماز معکوس ادا کی (اس کا طریقہ یہ ہے کہ چلہ کرنے والا رات کو پاؤں میں رسی باندھ کر کنوئیں میں الٹا لٹک جاتا ہے اور عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ناقل)۔ جواہر فریدی میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں' حال ریاضت اور استغراق درجۂ فنا میں یہاں تک پہنچے کہ چڑیوں اور جانوروں نے آپ کے پاؤں اور وجود مبارک میں گھونسلے بنا لئے تھے۔ (جون ۱۹۷۸ء)

مولانا احمد رضا خان (مرحوم) کی وصیّت

بریلوی فرقہ کے بانی' مولانا احمد رضا خان (مرحوم) نے اپنی وفات سے دو گھنٹے پہلے جو وصیتیں فرمائیں ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ ان کی وفات کے بعد' ان کی فاتحہ میں کس کس قسم کی چیزیں رکھی جائیں۔ فرمایا:۔

اعزہ سے اگر بطیبِ خاطر ممکن ہو تو فاتحہ ہفتہ میں دو تین بار ان اشیاء سے بھی کچھ بھیج دیا کریں۔ دودھ کا برف خانہ ساز' اگر بھینس کا دودھ ہو' مرغ کی بریانی' مرغ پلاؤ' خواہ بکری کا ہو' شامی کباب' پراٹھے اور بالائی' فرنی' ارد کی پھریری دال مع ادرک و لوازم' گوشت بھری کچوریاں' سیب کا پانی' انار کا پانی' سوڈے کی بوتل' دودھ کا برف۔

(وصایا شریف نمبر۸' مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور۔

بحوالہ دھماکہ' ص۱۹) (جون ۷۸ء)

۷۔ کوّا حلال ہے یا حرام

ہمارے مولانا حضرات کس قسم کی مہمات مسائل کو حل کرنے میں مصروف رہتے ہیں' اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمالیجئے۔ راولپنڈی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ انصاف کی ۲۶ اگست ۷۶ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ:

ضلع سرگودھا میں ہزاروی گروپ سے متعلق مولوی صاحبان نے یہ ثابت کیا کہ کوا حلال ہے اور پھر اس نظری فتویٰ کو عملی شکل دینے کے لئے کوے ذبح کئے اور ان کا گوشت پکا کر کھایا۔ اس کے بعد اب مختلف فرقوں میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ کوا حلال ہے یا حرام۔ (جون ۷۸ء)

۸۔ جمعہ کی تعطیل

جماعت اسلامی کے ترجمان' "ہفتہ وار ایشیا کی ۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے اداریہ کا عنوان ہے ـــــ "شریعت نافذ' لیکن جمعہ کی تعطیل نہیں ہوسکتی" ـــــ اس میں تحریر ہے:۔

محترم وزیراعظم نے بڑی تحدّی کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ یہاں پر شریعت نافذ ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیسی شریعت نافذ ہے کہ جمعہ کی تعطیل بھی نہیں ہوسکتی۔

اس سے واضح ہے کہ ان حضرات کے نزدیک جمعہ کی تعطیل' شریعت کا لازی جز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تحریر ہے کہ:

جمعہ کی تعطیل نظامِ شریعت کا ایک حصہ نہیں ہے لیکن یہ جمہوریہ اسلامیہ اور اس کی تہذیب و ثقافت کی ضروری علامت ہے۔

جمعہ کی تعطیل نظامِ شریعت کا حصہ بھی نہیں' لیکن اگر جمعہ کی تعطیل نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں نظامِ شریعت نافذ نہیں! ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہئے!

اور سنئے! اسی پرچہ میں' آگے چل کر "جمعہ یا اتوار" کے عنوان سے' سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب کا ایک مقالہ درج ہے۔ اس میں تحریر ہے:۔

خدا اور رسولؐ کے حکم کے بموجب امت اسلامیہ کے ہر فرقہ اور جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز جمعہ کے بعد کاروبار حرام ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہے۔

اس کے بعد اگلی سطر میں کہا گیا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعد ختم نمازِ جمعہ' کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے۔

یعنی ـــــ اللہ تعالیٰ نے بعد نماز' کاروبار کرنے کی اجازت دی ہے اور "امت اسلامیہ کے ہر فرقہ اور جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ بعد نماز کاروبار حرام ہے" کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہے۔

شریعت کے ساتھ اس قسم کا مذاق' انہی حضرات کے لئے مخصوص ہے۔ خدا کا حکم تو واضح ہے کہ نماز سے پہلے بھی کاروبار کرو اور نماز کے بعد بھی۔ صرف نماز کے لئے کاروبار بند کرو۔ (سورۂ جمعہ' آیت نمبر ۱۰' ۶۲/۱۰)

(جنوری ۷۷ء)

۹۔ اتّباعِ سنّت کا صلحِ کل طریق

اس اقتباس کو غور سے پڑھئے:

مولانا محترم سے ایک صاحب نے آمین بالجہر کے اثبات کے بارے میں سوال کیا۔ مولانا محترم نے فرمایا: حدیث کی کتابوں میں آمین بالجہر کا ثبوت بھی ملتا ہے اور خاموشی سے آمین کہنے کا بھی' لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ اگر ایک آدمی ایک ثابت شدہ سنّت پر عمل کر رہا ہو اور اس کے مقابلے میں دوسری بھی ثابت شدہ سنتیں ہوں تو ایک مسلمان کو دوسری ثابت شدہ سنتوں پر بھی ضرور عمل کرنا چاہئے اگرچہ وہ زندگی میں ایک بار ہی کیوں نہ ہو۔ ایک بار زور سے آمین کہنے کا قائل ہے' اسے کبھی آہستہ بھی کہنی چاہئے تاکہ دونوں سنتوں پر اس کا عمل ہو جائے۔ بس یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی سنت ایسی نہ رہ جائے' جس پر آدمی عمل نہ کرسکا ہو۔ (ایشیا' ۳۰ مارچ ۱۹۷۵ء)

کیا فرماتے ہیں علماء اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ مودودی صاحب کے اس نسخہ کے بارے میں؟ کیا وہ اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں؟..... لیکن ہماری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ آمین بالجہر یا خفی کے معاملہ میں تو مودودی صاحب کا پیش کردہ طریق قابلِ عمل ہوسکتا ہے--- کبھی یوں کرلیا کبھی دُوں--- لیکن سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان کی اسلامی مملکت میں' سنّتِ رسول اللہ کی رُو سے ملکی قوانین مرتب ہوئے تو ظاہر ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ کیا اس وقت بھی ہر شخص کو اجازت ہوگی کہ وہ کبھی ایک قانون پر عمل کرے اور کبھی (اس کے برعکس) دوسرے قانون پر۔ اور اس طرح ساری زندگی ان مختلف قوانین پر عمل کرتا رہے تاکہ کوئی ایسی سنت نہ رہ جائے جس پر وہ عمل نہ کرسکا ہو۔ (فروری ۱۹۷۷ء)

۱۰۔ دین اور مذہب میں فرق

(روس میں مذہبی آزادی)

روسی سفارت خانہ (متعینہ کراچی) کی طرف سے ایک گشتی خبرنامہ موصول ہوا ہے جس کے ساتھ ایک مقالہ خصوصی بھی منسلک ہے جس کا عنوان ہے--- سوویت یونین میں تمام مذاہب کو مکمل آزادی حاصل ہے--- اس میں انہوں نے لکھا ہے:

سوویت یونین میں مسلمانوں کی انجمنوں کی بڑی تعداد کا تعلق سُنّی فرقے سے ہے۔ وہاں

مساجد میں روزانہ نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے اور عید کی نمازیں بھی ہوتی ہیں۔ مسلمان اپنی عیدیں بڑے ہی اہتمام سے مناتے ہیں۔ عید کے دن ہزاروں مسلمان مساجد میں جمع ہوتے ہیں۔ ماسکو کی مسجد میں عید کے موقع پر عموماً پانچ ہزار سے زیادہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں ..... سوویت یونین کے مسلمان اپنے عقائد کے مطابق ساری مذہبی رسمیں ادا کرتے ہیں۔ مثلاً عقیقہ، شادی اور نماز جنازہ وغیرہ..... مسلمان خاندانوں میں شادیاں اسلامی عقائد کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ سوویت یونین کے مسلمان فریضہ حج بھی ادا کرتے ہیں..... سوویت یونین کے مدرسوں اور مسلم اکیڈیمی میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے..... مسلم بورڈوں کی طرف سے جنتریاں اور فتوے شائع کئے جاتے ہیں۔

اس قسم کی تفاصیل کے بعد آخر میں لکھا ہے

مذاہب کو مکمل مساوات حاصل ہے اور انہیں عبادت کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ ان کی عبادت گاہوں کے تقدس کی ضمانت دی گئی ہے۔ مذہبی زندگی کے تعلق سے انہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ چیز اس اصول کے عین مطابق ہے کہ سوویت یونین میں ریاست کو مذہب سے علیحدہ کردیا گیا ہے۔

آپ ہمارے ہاں کے علمائے کرام سے پوچھئے۔ وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ اس قسم کی مذہبی آزادی سے اسلام کے تقاضے پورے نہیں ہوجاتے۔ اسلام میں مذہب کو ریاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہی علماء حضرات تحریکِ پاکستان کے دوران کیا فرمایا کرتے تھے؟ وہاں کا ہندو، مسلمانوں کو اس قسم کی پوری مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا تھا جس کا ذکر روسی سفارت خانہ کے مقالہ میں کیا گیا ہے۔ یہ علماء حضرات (جنہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا اور جو بالعموم دیوبند سے متعلق تھے) یہ کہتے تھے کہ مذہب کی اس قسم کی آزادی کے بعد، اسلام کے تقاضے پورے ہوجاتے ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ کا علیحدہ مملکت کا مطالبہ اسلام کا تقاضا نہیں۔ ان کے برعکس، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا موقف یہ تھا کہ اسلام محض عقائد، عبادات یا رسومات کی آزادی کا نام نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کے نفاذ کا نام ہے اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا۔ آپ اس بحث کو دیکھئے جو دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبال (مرحوم) کے مابین ۱۹۳۸ء میں چھڑی تھی اور جسے حضرت علامہؒ نے "معرکۂ دین و وطن" کہہ کر پکارا تھا۔ یہ علماء حضرات آخری وقت تک مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد ہجوم کرکے اس طرف آگئے۔ اور اب یہ اس مطالبہ میں پیش پیش ہیں کہ مذہب کو ریاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے مملکت کا اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو۔ (ستمبر ۱۹۷۷ء)

۱۱- ثابت کرو کہ قرآن وہی ہے

"قرآنی فیصلے" جلد چہارم' باب اول میں لکھا گیا تھا کہ مودودی صاحب نے نئی نسل کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کس طرح ایک نیا شگوفہ چھوڑا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سات زبانوں میں قرآن نازل کیا اور اسے انہی سات زبانوں میں رسولؐ اللہ نے امت کو دیا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ان میں سے چھ زبانوں کے قرآن کے نسخوں کو جلا دیا اور صرف ایک زبان کے قرآن کو باقی رہنے دیا جو مسلمانوں میں رائج ہے۔ ہم نے اس پر لکھا تھا کہ مودودی صاحب کی اس سازش سے اسلام سینوں سے جاتا رہے گا۔ اسلام کے معنی ہیں اس صداقت پر ایمان کہ قرآنِ مجید جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور رسولؐ اللہ نے امت کو دیا' وہ اپنے حروف' الفاظ' آیات' سورت' ترتیب کے ساتھ' اسی شکل میں' مکمل اور غیر متبدل و غیر محرف' ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر اس حقیقت یا اس کے کسی جزو میں' ذرا سا بھی شبہ لاحق ہو جائے' تو ایمان باقی نہیں رہتا۔

ہمیں قارئین طلوع اسلام (سندھ) میں سے ایک صاحب کا خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ وہاں "مولانا مودودی کے چاہنے والوں میں سے ایک صاحب" نے کہا کہ..... "تم ثابت کرو کہ قرآنِ شریف' جیسا آج کتابی صورت میں موجود ہے رسولؐ اللہ نے اسی طرح امت کو دیا تھا"۔ گویا مودودی صاحب کی سازش کا تیر ٹھیک ٹھکانے پر لگا..... اور ان کے معتقدین نے یہ سوال کرنا شروع کردیا ہے کہ تم ثابت کرو کہ موجودہ قرآن وہی ہے جسے رسول اللہ نے امت کو دیا تھا۔

ہم نے ان صاحب کو جواب میں لکھا تھا کہ اس قسم کا سوال اگر کوئی غیر مسلم کرے تو اس کا جواب اور انداز سے دیا جائے گا۔ اگر کوئی ایسا شخص پوچھے جس کا قرآن پر ایمان ہو اور وہ صرف اپنی معلومات کے لئے دریافت کرنا چاہے تو اس کا جواب خود قرآن مجید سے دیا جائے گا۔ لیکن ان حضرات کے نزدیک (جنہوں نے یہ سوال پوچھا ہے) چونکہ مودودی صاحب کے سوا کوئی سند اور حجت نہیں ہوسکتی' اس لئے ان کے سامنے مودودی صاحب ہی کی تحریر پیش کرنی چاہئے۔ مودودی صاحب اپنی تفسیر' تفہیم القرآن' جلد اول کے مقدمہ (ص۳۰۰ ایڈیشن ۱۹۵۱ء) میں لکھتے ہیں۔

> کوئی شک نواز قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے وہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی ہے جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا تو یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

اس پر مودودی صاحب کے معتقدین اور مصاحب تو نہ جانے کیا کہیں گے لیکن جن لوگوں کی آنکھوں پر عقیدت مندی یا مفاد پرستی کے رنگین چشمے نہیں چڑھے ہوئے' وہ یقیناً یہ پوچھیں گے کہ کیا رسولؐ اللہ نے اسی ایک قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا یا ان سات قرآنوں کو پیش کیا تھا جن میں سے چھ کو (بقول مودودی صاحب) حضرت عثمانؓ نے

(معاذ اللہ) تلف کردیا تھا۔ اگر ان سات قرآنوں کو پیش کیا تھا تو یہ کہنا کس طرح صحیح ہوگا کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے یہ ٹھیک وہی ہے' جسے رسولؐ اللہ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا؟ (فروری ۱۹۷۷ء)

۱۲۔ ہمارا منشور قرآن ہے

(مفتی محمود صاحب کا اعلان)

نوائے وقت بابت ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ء میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

> پاکستان قومی اتحاد نے اعلان کیا ہے کہ ملک میں قرآنِ مجید کا نظام نافذ کرنے کی جدوجہد اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی ہے۔ آج یہاں نشتر پارک میں ایک عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے قرآنِ پاک کا ایک نسخہ ہاتھوں میں تھام کر کہا کہ کراچی کے باحمیت شہریوں نے مجھے یہ نسخہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہی کتاب مقدس ہمارا منشور ہے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی منشور پیش نہیں کیا جاسکتا۔ میں یہی عظیم منشور آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ برسرِاقتدار آنے کے بعد ہم اس پر عمل کریں گے۔

(اس کے دو ایک دن بعد انہوں نے فرمایا تھا کہ ہمارا منشور زیرِ ترتیب ہے اور مجلسِ عمل کی منظوری کے بعد شائع کیا جائے گا)۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

۱۳۔ تقلیمِ اعضاء ناجائز ہے

(اندھوں کو بینائی مت دو)

ہمارے دور میں میڈیکل سائنس نے اس حد تک ترقی کرلی ہے کہ ایک مردہ انسان کی (بیکار) آنکھ کو زندہ اندھے انسان کی آنکھ میں پیوست کرکے اسے بینا (دیکھنے والا) بنا دیا جاتا ہے۔ یہ انسانیت پر بہت بڑا احسان ہے۔ لیکن ہمارے تاریکی پسند حضرات کے نزدیک ایسا کرنا خلافِ اسلام اور شریعت کی رُو سے ناجائز ہے۔ کوئی دس سال ادھر کی بات ہے' جماعت اسلامی کی طرف سے یہ فتویٰ صادر ہوا تھا کہ اسلام کی رو سے' مردوں کے اعضاء کی زندہ انسانوں مین پیوستگی ناجائز ہے۔ (ایشیاء' ۲۴ مارچ ۶۸ء بحوالہ قرآنی فیصلے' جلد چہارم' باب ششم)۔ اب (مولانا) احتشام الحق صاحب نے ارشاد فرمایا ہے کہ

> شریعت اسلامی کی رو سے ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے بدن میں چڑھانا تو

جائز ہے مگر ایک بدن کے اعضاء کی پیوند کاری دوسرے بدن کے ساتھ اسلام میں ناجائز ہے۔

(روزنامہ جنگ کراچی' ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ

مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب!

ضمناً"------ آپ نے دیکھا کہ ان دونوں فتوؤں میں کہا یہ گیا ہے کہ "شریعتِ اسلامی کی رُو سے" اور "اسلام کے نزدیک"------ سند اور حوالہ نہ جماعت اسلامی والوں کے نزدیک ضروری ہے' نہ مولانا احتشام الحق صاحب کے لئے------ یہ حضرات خود ہی اسلام اور شریعت ہوتے ہیں۔ (مارچ ۱۹۷۸ء)

۱۴۔ شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح

روزنامہ سیاست (لاہور) کی اشاعت ۳۱ جنوری ۱۹۷۸ء میں شائع شدہ ذیل کی خبر پڑھ کر ہنسئے بھی اور روئیے بھی:۔

سیالکوٹ ۱۰ جنوری (نمائندہ خصوصی) گذشتہ روز سمبڑیال کے قریب تحصیل ڈسکہ کے گاؤں کلوں میں ایک مردہ خاتون کا شیشم کے درخت کے ساتھ نکاح پڑھوایا گیا۔ اس واقعہ کے عینی شاہد..... ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص..... کی چالیس سالہ دختر کا بغیر شادی کے انتقال ہوگیا۔ چنانچہ جب میت کو جنازگاہ پہنچایا گیا تو لوگوں نے جنازہ پڑھنے سے انکار کردیا کہ چونکہ اسلام میں جو مرد یا عورت بغیر نکاح کے فوت ہو جائے اس کا جنازہ جائز نہیں ہوتا۔ لہٰذا' اس عورت کا جنازہ جائز نہیں ہوسکتا۔ اس پر متوفیہ کے ورثا نے جنازگاہ ہی میں اس علاقہ کے مولوی..... سے عورت کا نکاح شیشم کے درخت سے پڑھوایا اور اس موقع پر آئے ہوئے لوگو کو چاول پکا کر کھلائے گئے جسکے بعد اس کا جنازہ پڑھا کر دفن کردیا گیا۔

یوں تو آپ اس خبر کو "جہالت" سے تعبیر کرکے جھٹک دیں گے لیکن اس میں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسئلہ یہ بتایا گیا ہے کہ جو مرد یا عورت بلا نکاح فوت ہو جائے' اسلام کی رو سے اس کا جنازہ جائز نہیں۔ یہ بات اس گاؤں کے جہلا تک محدود نہیں۔ آپ بڑے بڑے جید علماء اور اقامتِ دین اور نظامِ اسلامی کے مدعیوں کی زبان سے صبح شام اس قسم کے الفاظ سنیں گے کہ "اسلام میں اس کی اجازت نہیں" "اسلام کی رُو سے ایسا جائز نہیں' شریعتِ اسلامی کا حکم یہ ہے وغیرہ۔ یعنی یہ حضرات کبھی یہ نہیں بتائیں گے کہ کس نے ایسا کہا ہے۔ اس حکم کا حوالہ کیا ہے'

اس کی سند کیا ہے۔ جو کچھ انہوں نے فرما دیا بس وہی سند ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرے تو وہ منکرِ اسلام ہے' ملحد ہے' بے دین ہے۔ یہ لوگ ان اصطلاحات کو دانستہ مبہم رکھتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کہنے والوں کو سند اور حوالہ دینے کا پابند بنا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ کتنے اُلجھاؤ صاف ہو جاتے ہیں اور ان لوگوں کے "اسلامی احکام" کی قلعی کس طرح کھل جاتی ہے۔

اور خبر میں دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ علاقہ کے مولوی صاحب نے متوفیہ کا نکاح شیشم کے درخت سے پڑھایا۔ یہ ہے نمونہ ان مولوی صاحبان کے اسلام کا جو کہتے ہیں کہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دو تاکہ ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کر سکیں!

(مارچ ۱۹۷۸ء)

۱۵۔ سود نہیں' منافع

ہمارے زمانے میں اہم ترین مسئلہ اقتصادیات کا ہے۔ اس قدر اہم کہ سیاست بھی اس کے تابع ہے۔ اقتصادیات میں سرِفہرست بینکاری ہے اور بینکاری کا دار و مدار سود پر ہے۔ ہمارے ہاں جب اقتصادیات کو "مسلمان کرنے" کا سوال سامنے آیا تو اس باب میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ بینکوں کو بلا سُود کیسے چلایا جائے؟ اس پر بہت کچھ کہا گیا' بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن کوئی بات بنتی دکھائی نہ دی۔ چونکہ ساری دنیا میں مشہور کیا گیا تھا کہ اس مسئلہ کا حل اسلام پیش کرتا ہے' اس لئے اقوامِ عالم بڑی بے تابی سے منتظر تھیں کہ دیکھیں اسلام اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ ایک عرصہ کی کد و کاوش کے بعد' بانی جماعت اسلامی' مودودی صاحب نے اس مسئلہ کا حل پیش کر دیا۔ پاکستان ٹائمز کے نمائندہ نے ان سے اس مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:۔

> سماجی اور اقتصادی ترقی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ بلاسود اقتصادی نظام کا نفاذ ہے۔ اس طرح ترقی کے فوائد سے عوام براہ راست مستفیض ہوں گے۔

انہوں نے بلا سود بینکاری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:۔

> روپیہ جمع کرانے والوں کو سود دینے کے بجائے بینک ایسے اقتصادی منصوبے تیار کریں گے جن کے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے برابر کے حق دار ہوں گے اور یہ بینکوں کا اپنا مفاد ہو گا کہ وہ دیکھیں کہ جو بھی اقتصادی منصوبہ تیار ہو وہ نفع بخش اور قابل عمل ہو (ایشیا' ۵ نومبر ۱۹۷۸ء)۔

یعنی اس وقت بینک جو کچھ سود کے نام سے دیتے ہیں' اسے منافع کہہ دیا جائے تو یہ اسلامی ہو جائے گا۔

(جنوری ۱۹۷۹ء)

دوسرا باب

شرعی قوانین

۱۔ اصلاح مجرّد قوانین سے نہیں ہوسکتی۔

(سعودی عرب کی معاشرتی حالت)

طلوعِ اسلام شروع سے کہتا چلا آرہا ہے کہ مجرد اسلامی قوانین کے نفاذ یا "شرعی سزاؤں" کے اجرا سے نہ کوئی مملکت اسلامی ہوسکتی ہے نہ معاشرہ حقیقی معنوں میں مسلمان۔ اس کے لئے قلب و نگاہ میں تبدیلی ہونا ضروری ہے جسے قرآنِ کریم نفسیاتی تبدیلی کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت ان سزاؤں کے نفاذ کا بڑی شدّت سے مطالبہ کئے جاتی ہے۔ اس مطالبہ کی تائید میں وہ یہ دلیل پیش کرتی ہے کہ سعودی عرب میں ان سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں جرائم ختم ہوگئے ہیں۔ ہم سعودی عرب کے متعلق کچھ تفصیل سے لکھنا چاہتے تھے کہ جماعت اسلامی کے ترجمان' ہفتہ وار مجلّہ ایشیا کا یکم جنوری ۱۹۷۸ء کا پرچہ ہمارے سامنے آگیا جس میں عنوان بالا کے تحت' محمد امین ریاض صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ اس کے متعلقہ اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں :۔

> اصولی طور پر یہ سمجھ لینے کی بات ہے کہ اسلامی قوانین کا اجرا اگرچہ بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کام کے بطریق احسن نبھ جانے کے لئے ایک مدّت' محنتِ شاقّہ اور بڑے تدبّر کی ضرورت ہے۔ لیکن مجرد اسلامی قوانین کے اجرا سے انقلاب نہیں آجائے گا۔ اگر اسلامی نظام و قانون نافذ کرنے سے مراد اس قانونی اور اجتماعی ڈھانچے کا مہیا کرنا ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہو تو یہ قطعاً" لازمی نہیں ہے کہ اس ڈھانچے کے مہیا ہو جانے کے ساتھ ہی معاشرے میں وہ انقلاب بھی برپا ہو جائے اور وہ تبدیلیاں رونما ہو جائیں جو اسلام کا مطلوب حقیقی ہیں کہ لوگ نیک اور متقی ہو جائیں۔ نماز' زکوٰۃ اور روزہ پر عمل ہر سُو نظر آنے لگے۔ چوریاں اور قتل ختم ہو جائیں گے یا ہر طرف دودھ کی نہریں بہیں گی۔ اس کی جیتی جاگتی مثال سعودی عرب کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اس ملک میں اجتماعی اور قانونی ڈھانچہ الحمد للہ ابھی تک اسلام کی اساس پر ہے' لیکن تجربے کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اسلامی انقلاب کی جتنی ضرورت سعودی عرب کو ہے شاید پاکستان کو بھی نہیں۔ کیونکہ اس قانونی ڈھانچے کے

باوجود' یہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو دوسری دنیا میں ہو رہا ہے۔

سعودی معاشرے کے تنزل کی داستان' محض زیبِ داستان کے لئے نہیں ہے' بلکہ چند سال کے گہرے مشاہدے کی بنا پر میں نے یہ بات کہنے کی جرأت کی ہے۔ اخلاقی انحطاط کو دیکھتے ہوئے دل لرز اٹھتا ہے اور بے ساختہ ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں کہ اے ربِّ ذوالجلال! اس سرزمین کو ہر شر سے محفوظ فرما دے کہ اسے تیرے جلّ شانہ اور تیرے حبیب صلعم کے گھر سے نسبت ہے آمین۔ یہ انحطاط پذیر سعودی معاشرہ' اس حقیقت کی موجودگی میں کہ یہاں قوانین کی اساس اسلام پر ہے' ہر کسی کے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود ہے۔ ذہن اس بات کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ انحطاط اگر رُک سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ قرآن (یہاں غالباً" ایک لفظ مٹا ہوا ہے طلوع اسلام) کی روشنی سے عوام کے قلوب کو منور کیا جائے۔ عمل کو ابھارنے کے لئے ان پر پیہم محنت کی جائے۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

اسلام میں اصل مقصود قانون کو تبدیل کرنے سے زیادہ انسانوں کو تبدیل کرنا ہے اور یہ تبدیلی ڈنڈے کے زور سے پیدا نہیں ہوتی' قلوب اور اذہان میں انقلاب سے ہی یہ مقصد حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھنا چاہے تو ڈنڈے کے زور سے اسے نماز کا عادی نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن اس کے برعکس' جو نماز پڑھتا ہے وہ شیروں کی کچھار اور تختۂ دار پر بھی نماز سے غافل نہ ہوگا۔ لہٰذا' حقیقی اور پائیدار تبدیلی اوپر کے بجائے نیچے سے ہی ممکن ہے۔ اوپر سے آنے والی تبدیلی خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے اور نیچے سے آنے والی تبدیلی بدر میں جان لڑا کر سرفراز ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں اٹھے جام ٹوٹتے ہیں' شراب گلیوں میں بہتی ہے' خود حاضر ہو کر اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ (فروری ۱۹۷۸ء)

۲۔ شرعی سزائیں کن حالات میں دی جاسکتی ہیں؟

(از ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم)

تعزیرات کے باب میں سب سے پہلے اس باقاعدہ کلیہ کو ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اور دوسری شرعی حدیں صرف اسی جگہ نافذ کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم و نسق اسلامی اصولوں پر ہو اور

تمدن و معاشرت کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابلِ تجزیہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کئے جائیں اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔

مثلاً زنا اور قذف[1] کی حدود کو لیجئے۔ نکاح و طلاق اور حجاب شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاق صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے زانی اور قازف کے لئے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اس سوسائٹی کے لئے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابا نہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں اور عشق و محبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لئے پوری آسانیاں ہوں اور فسخ و تفریق اور طلاق و خلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کئے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لئے سخت سزائیں مقرر کی جائیں۔ اور اتنی سخت سزائیں اس حالت میں ہرگز نامنصفانہ نہیں ہیں جبکہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کردی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسباب تحریک سے پاک کردیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لئے نہایت عبرت ناک سزاؤں کے بغیر چارہ نہ ہو۔

لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں، خلوت اور جلوت میں ہر جگہ جہاں مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو، جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور ازدواجی رشتے کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں، جہاں معیار اخلاق بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں ایک معمولی قسم .....(NORMAL TYPE) کے معتدل مزاج اور سلیم الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ایسے حالات میں کسی شخص کا مبتلائے گناہ ہونا یہ نتیجہ نکالنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (ABNORMAL TYPE) کا اخلاقی مجرم ہے۔ رجم اور کوڑوں کی سزا درحقیقت ایسے گندے حالات کے لئے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔

اسی پر حد سرقہ کو بھی قیاس کرلیجئے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لئے مقرر کی گئی ہے جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں۔ قطع ید اور اسلامی نظم معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں یہ نظم معیشت قائم ہو وہاں قطع ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے۔ اور جہاں یہ نظم معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا، اس ظالم سوسائٹی کے لئے مقرر

---

[1] قذف سے مراد کسی عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگانا ہے اور قازف وہ شخص جو ایسی تہمت لگائے۔

ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو' زکوٰۃ متروک ہو' انصاف قیمتاً" فروخت کیا جاتا ہو' ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریات زندگی نہایت گراں ہوگئی ہوں' اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لئے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔

عام طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیشِ نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے اور پھر چوری' زنا' قذف اور شراب نوشی جیسے "عامتہ الورود" جرائم کا موازنہ قطع ید' رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کرکے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موازنہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اس نظامِ حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی ہی چاہئے۔ زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہئے۔ آئے دن مشتبہ طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بری خبریں مشہور ہونی ہی چاہئیں۔ بری صحبتوں میں نوخیز نسلوں کو بری عادتیں پڑنی ہی چاہئیں۔ لہٰذا' ان کا دل یہ سوچ کر پریشان ہوجاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانون فوجداری رائج کردیا جائے تو شاید کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے' ہزارہا آدمیوں کے ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں اور ہر روز سیکڑوں آدمی سنگسار کئے جائیں۔

بلاشبہ ان کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بیہودہ سوسائٹی کے بیہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین میں سے محض اس کے قانونِ فوجداری کو نافذ کردینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہوگا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سوسائٹی کے اس بیہودہ نظام کو' جس کی بیہودگیوں سے وہ مایوس ہوچکے ہیں ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ فطری حالت نہیں ہے' بلکہ شیطنت کے غلبہ نے اس غیر فطری حالت کو عالم انسانی پر مسلط کردیا ہے اور اس حالت کا باقی رہنا بجائے خود ایک ظلمِ عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظامِ اجتماعی کو من حیث الکل قبول کرکے اس ظلم کا انسداد کیجئے۔ پھر آپ پر خود روشن ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری جرائم نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع نہیں ہے۔ جو اجتماعی حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعالِ قبیحہ کا ارتکاب کرسکتے ہیں اور ان کے لئے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطع ید ہی ہوسکتے ہیں۔ (تفہیمات' حصہ دوم' ص ۸۳-۲۸۰' اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن)

---

(۲) مودودی صاحب اپنے مندرجہ بالا مقالہ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں

اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانونِ فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لئے ہیں جس میں پورا اسلامی نظام

زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لئے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے' اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو' اور یہ قطعی ظلم ہے' اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجت مند انسان کی دستگیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچئے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔ (رسائل و مسائل' حصہ چہارم' ص۱۹-۱۸' اشاعت اول)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومتِ اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو الگ نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دیدے' تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شارب خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دے گا' وہ تو ظالم نہیں ہوگا' البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعتِ الٰہیہ کے ایک حصے کو معطل اور دوسرے حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اس آیتِ قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے:

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذ الک منکم الا خزی فی الحیوۃ الد نیا و یوم القیمہ یرد ون الی اشد العناب (۲/۸۵)

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور روزِ قیامت وہ شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں۔

جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے اس کے نظام میں اصلاح' سدِّباب' ذرائع اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیرِ نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے۔ دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد کرکے ہم بگاڑ کے [illegible] کی روک تھام کرسکتے ہیں۔ اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود' اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کردیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کرکے ہی پورا کیا جاسکتا ہے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کے کسی جز کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز

میں یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ جس جز کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم کا مرتب کردہ نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آجائے اور وہ اس کے بہت سے اجزاء میں سے صرف دو چار اجزاء نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزاء میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اس دلیل کا جواب آخر آپ یہی تو دیں گے کہ بندۂ خدا! حکیم کے نسخے میں جو مصلحات اور بدرقے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جز کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شریعت' آیا اپنے نفاذ کے لئے مومن و متقی کارکن چاہتی ہے یا فاسق و فاجر لوگ اور وہ لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدم جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک کام جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمت دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمت دین کا تقاضا ہے کہ احکام شرعیہ کا اجراء ایسے حکام کے ذریعہ سے کرایا جائے جن کی اکثریت رشوت خور' بدکردار اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدتاً" مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے؟ میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لئے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں احکام شریعت جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگان خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی' تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدودِ شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔

(رسائل و مسائل' حصہ چہارم' اشاعت اول' ص۷۸-۲۷۴)

ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ احکام شریعت کو فوراً" نافذ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

> اب اگر ہم اسلامی قانون کو از سرِ نو قائم کرنا چاہیں تو یہ تبدیلی بھی یک لخت نہیں' بتدریج ہی ہو گی۔ (ایضاً" ص۲۵۲)

طلوع اسلام

مودودی صاحب کی ان تصریحات کی روشنی میں' فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مملکتِ پاکستان کے

حالات ایسے ہیں کہ یہاں قوانین شریعت فوری طور پر نافذ ہو سکیں؟

فروری ۱۹۷۹ء

رابطۃ العالم الاسلامی کی تنبیہہ

شیخ محمد محمود حافظ' رابطۃ العالم الاسلامی' مکہ مکرمہ' کے سربر آوردہ علماء میں سے ہیں اور رابطہ کے علمی و دینی ترجمان "ماہنامہ رابطۃ العالم الاسلامی" کے رئیس التحریر' یعنی چیف ایڈیٹر ہیں۔ آپ نے موجودہ معاشرے میں شرعی قوانین کے نفاذ کے بارے میں اس ماہنامہ کے تازہ شمارہ بابت صفر ۱۳۹۹ھ کے اداریئے میں رابطۃ العالم الاسلامی کا مؤقف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج اسلامی قانون کے نفاذ کے مطالبے نے ایک اہم اسلامی شعار کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بہت سے اسلامی اور عربی ممالک' اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے عملی کوششیں کر رہے ہیں۔ اگر مسلمان اس دنیا میں قوت اور عزت چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ان کے لئے لازمی ہے۔ آج مسلمان جن مصیبتوں اور دکھوں میں مبتلا ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو دین اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں لیکن دین کو اپنے دنیاوی معاملات میں عملی طور پر اپنانے سے دور ہیں۔ اسلامی قانون کی تطبیق ہمارے ایمان اور اعتقاد کے مطابق ہونی چاہئے جو قول و عمل دونوں کا نام ہے۔ ہم یہاں اعتقاد اور ایمان کے بارے میں کسی فقہی یا فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ کیونکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ الحمد للہ ہر مسلمان اسلام پر بطور عقیدہ و عمل ایمانِ کامل رکھتا ہے۔

دریں حالات' اسلامی قانون کے نفاذ کے بارے میں مسلمانوں کے عملی تردّد کے پیشِ نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہم اسلامی عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر اپنی زندگی کے روزمرّہ کے مشاغل اور کاروبارِ حیات میں اسلامی نظام کی بنیادی باتوں کو کیوں نہیں اپناتے۔ یہ سوال جیسا بھی ہے ایک منطقی سوال ہے کیونکہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہم پر لازم آتا ہے کہ ہم اپنے اعتقاد کے مطابق اس پر عمل بھی کریں' ورنہ ہمارے مؤقف میں تضاد ہو گا۔ اسلامی قانون کے نفاذ کے حالیہ مطالبوں کو جب میں ایک اسلامی مقصد و شعار قرار دیتا ہوں۔۔۔۔۔ جس کے نفاذ کے لئے بہت سے اسلامی ممالک کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ تو میں بعض ایسی صورتوں کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نفاذ کے اس مطالبے کے ساتھ ہی سامنے آ رہی ہیں۔

عقلی اور شرعی طور پر یہ حقیقت مسلّمہ ہے کہ جس طرح [illegible] نبی اکرم (صلعم) آخری نبیؐ ہیں' اسی طرح دینِ اسلام بھی آخری دین ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کے متعلق کسی چھان پھٹک کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ہم نفاذِ شریعت کے حالیہ مطالبوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعض کے نزدیک اس سے مراد صرف شرعی حدود کا نفاذ ہے۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیادی باتیں اور تعلیمات کا اول تو کوئی ذکر ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی ان

کا ذکر کرتا ہے تو وہ بھی بڑی غیر واضح صورت میں۔ حالانکہ طرزِ عمل اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ہر مسلمان اپنے ملک میں اپنی زندگی کے روزمرہ کے تمام مشاغل پر اسلامی تعلیمات کا نفاذ کرے۔ دوسرا قدم یہ ہونا چاہئے کہ اسلامی ثقافت کو عام کرنے اور اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ مسلمانوں میں اس شعور کو بھی بیدار کیا جائے کہ ایمان و اعتقاد' قول و عمل دونوں کا نام ہے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی ابتداء کوڑوں اور ہاتھ کاٹنے سے بمشکل ہو گی۔ ان سے پہلے یہ کرنا ہو گا کہ تمام مسلمانوں پر اس حقیقت کو اُجاگر کیا جائے کہ اسلام قانون الٰہی کا نام ہے جو ان کی سعادت اور بھلائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ وہ اسلامی تکریم کا محافظ اور امنِ عالم کا داعی ہے۔ وہ ہر مسلمان پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے مسلمان بھائی کی عزت کی حفاظت کرے۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے اس کے مقاصد پر عمل کرنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے چوری کے ثبوت کے باوجود چوری کی شرعی حد کو نافذ نہیں کیا تھا کیونکہ اس مقصد کے لئے جس قسم کے اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے' اس میں کچھ ناہمواری پیدا ہو گئی تھی جس کی بنا پر آپ نے اس شرعی حد کو معطل کر دیا تھا۔ ناہموار معاشرے میں ایک بھوکا شخص احتیاج کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو موت سے بچانے کے لئے غیر کی روٹی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائے۔ اس وقت وہ کسی دوسرے آدمی کی محفوظ جگہ سے مال چرانے کے باوجود چوری کا مرتکب متصوّر نہیں ہو گا۔

ان گذارشات کی روشنی میں ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ شرعی قوانین کے نفاذ میں کامل احتیاط کی ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے ابتداء کے طور پر لازم ہے کہ ہر انسان کے سامنے اسلامی نظام کامل شکل میں اجاگر ہو۔ یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کی اکثریت' اسلام سے اپنے تعلق کے باوجود' اسلامی حقوق و واجبات اور دوسری ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے عملاً" دور ہے۔ یہ صورت حالات علمائے کرام سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اسلامی ثقافت اور نظام کو مختلف طریقوں سے معاشرے میں اجاگر کریں۔ اسلامی نظام کی تفصیلات سے ناواقفیت ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس صورت حالات پر خاموشی اختیار کی جائے۔

(ترجمہ رفیع اللہ)

(مارچ ۱۹۷۹ء)

۴۔ اسلام میں ڈنڈے کا مقام

سوال یہ کیا گیا کہ کیا اسلامی نظام ڈنڈے کے زور پر نافذ کیا جائے گا۔ اس کے جواب میں مودودی مرحوم نے کہا:۔

> اسلامی قانون میں ڈنڈے کا بھی ایک مقام ہے مگر وہ سب سے آخر میں آتا ہے۔
> اسلام میں ترتیب کار یہ ہے کہ پہلے ذہنوں کی اصلاح کا کام تعلیم و تلقین کے ذریعے

سے گیا جائے تاکہ لوگوں کے خیالات تبدیل ہوں۔ پھر لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر کام کیا جائے۔ یہاں تک کہ محلے محلے، بستی بستی اور کوچے کوچے میں ایسے لوگ تیار ہو جائیں جو بدکرداریوں کو عوام کی مدد سے دبائیں اور اپنے اپنے علاقوں کے باشندوں میں دینداری اور دیانتداری پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح ملک کے اندر ایک ایسی رائے عام پیدا ہو جائے گی جو برائیوں کو سر نہ اٹھانے دے گی۔ کوئی شخص ایسی عام رائے کی موجودگی میں بگڑنا چاہے گا تو اس کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا ہو جائینگی اور جو شخص صحیح طرز زندگی اختیار کرے گا اس کو پورا معاشرہ مدد دینے والا ہو گا۔ اس کے ساتھ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ معاشرہ ایسا ہو جس کے لوگ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار ہوں، ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے والے ہوں۔ ہر شخص انصاف کا حامی اور بے انصافی کا مخالف ہو۔ ہر شخص اپنے اوپر پیٹ بھرنا حرام سمجھے اگر اس کو معلوم ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا سو رہا ہے۔ پھر اسلام ایک ایسا معاشی نظام بھی قائم کرتا ہے جس میں سود حرام ہو، زکوٰۃ فرض ہو، حرام خوری کے دروازے بند کر دیئے جائیں، رزق حلال کمانے کے تمام مواقع لوگوں کے لئے کھول دیئے جائیں اور کوئی آدمی اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہ ہونے پائے۔ ان تدابیر کے بعد ڈنڈے کا مقام آتا ہے۔ ایمان، اخلاق، تعلیم، انصاف، اصلاح معیشت اور ایک پاکیزہ رائے عام کے دباؤ سے بھی جو آدمی درست نہ ہو، تو وہ ڈنڈے ہی کا مستحق ہے اور ڈنڈا پھر اس پر ایسی بے رحمی کے ساتھ علی الاعلان چلایا جائے کہ ان تمام لوگوں کے دماغ کا اپریشن ہو جائے جو جرائم کے رجحانات رکھتے ہوں۔
(ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۷۸ء، ص ۶۹)

اس کے بعد کہا:۔

لوگ بڑا غضب کرتے ہیں کہ اسلام کے پروگرام کی ساری تفصیل چھوڑ کر صرف اس کی سخت سزاؤں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام پہلے عام لوگوں میں ایمان پیدا کرتا ہے۔ پھر عوام کے اخلاق کو پاکیزہ بناتا ہے۔ پھر تمام تدابیر سے ایک ایسی مضبوط رائے عامہ تیار کرتا ہے جس میں بھلائیاں پھلیں پھولیں اور برائیاں پنپ نہ سکیں۔ پھر وہ معاشرتی اور معاشی اور سیاسی نظام ایسا قائم کرتا ہے جس میں بدی کرنا مشکل اور نیکی کرنا آسان ہو جائے۔ وہ ان تمام دروازوں کو بند کرتا ہے جن سے فواحش و جرائم نشوونما پاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈنڈا وہ آخری چیز ہے جس سے ایک پاک معاشرے میں سر

اٹھانے والی ناپاکی کا قلع قمع کیا جاتا ہے۔ اب اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے کہ ایسے برحق نظام کو بدنام کرنے کے لئے آخری چیز کو پہلی چیز قرار دیتا ہے اور سچ کی سب چیزوں کو ایمان کی طرح نگل جاتا ہے۔

(ایضاً ص۲۲-۲۱)

لیکن انہوں نے اس سے پہلے اپنے کتابچہ "مرتد کی سزا" میں لکھا تھا:۔

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو' وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظام اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں' مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ اور پھر جو کوئی دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھے گا' اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (کتابچہ' "مرتد کی سزا' اسلامی قانون میں")

(اگست ۱۹۵۳ء ایڈیشن' ص۷۶)

یعنی ان کے "اسلامی انقلاب" میں ڈنڈا ہی نہیں' تلوار کا استدلال سب سے مقدم ہو گا۔

(جون ۱۹۷۸ء)

۵۔ قوانین شریعت کا جائزہ

نظامِ مصطفےٰ جس کا چرچا قریب دو سال سے سنتے چلے آرہے تھے' اس کے قدم اول کے متعلق کہا گیا کہ وہ ۱۲/ ربیع الاول کے مقدس دن کو اٹھایا جائے گا' یعنی اس دن شرعی سزاؤں سے متعلق قوانین کے نفاذ کا اعلان کیا جائے گا۔ ملک میں اسلامی نظام کے احیاء کی خواہش بڑی مبارک و مسعود ہے۔ لیکن خواہش کیسی ہی مبارک اور نیک کیوں نہ ہو' اس کی صحیح نتیجہ خیزی کے لئے حسن تدبّر لازم اور لاینفک ہے۔ کتنی ہی نیک خواہشیں اور مبارک ارادے ہیں جو عدم تدبّر کی وجہ سے نہ صرف ناکام رہ جاتے ہیں بلکہ تخریبی نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم نے کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی جو منزل من اللہ قرار دیا ہے تو اس سے یہی مراد ہے۔ کتاب کے معنی قانون کے ہیں اور حکمت سے مراد وہ حسن تدبّر ہے جس کی رُو سے اس قانون کو نافذ کیا جاتا ہے اور صحیح نتائج برآمد کرنے کا ضامن بنایا جاتا ہے۔ اس حسن تدبر میں' ترجیحات..... (PRIORITIES) یا تدریج کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اسی عمل تدریج کا نتیجہ تھا کہ' خود

حضورؐ نبی اکرم کے قائم کردہ نظام میں' شراب جیسی ام الخبائث کی ممانعت' آغاز نبوت سے قریب اٹھارہ سال بعد عمل میں آئی۔ اور اس پر بھی قرآن کریم نے اس کی کوئی سزا خود متعین نہ کی۔ عمل تدریج کے نقطہء نگاہ سے دیکھا جائے تو معاشرہ کے نظام میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ معاشرہ کی اصلاح کا آغاز بچوں کی صحیح تربیت اور پرورش سے ہوتا ہے۔ پھر ان کی تعلیم صحیح خطوط پر کی جاتی ہے۔ معاشرہ میں حالات ایسے پیدا کئے جاتے ہیں جن میں قانون کا احترام اور اتباع' افراد معاشرہ کا اندرونی تقاضا بن جائے۔ قانون کے قیام و استحکام کے لئے ایسی انتظامیہ وجود میں لائی جاتی ہے جو اخلاقی اعتبار سے پاک اور صاف ہو۔ نزاعی امور کے تصفیہ کے لئے ایسا نظام عدل قائم کیا جاتا ہے' جو ہر قسم کی لغزش سے منزہ ہو۔ اس قسم کے اہتمامات اور انتظامات کے بعد' اگر معاشرہ میں ایسے نفسیاتی مریض باقی رہ جائیں جن کے دیوانہ پن سے معاشرہ کو نقصان کا اندیشہ ہو تو معاشرہ کی حفاظت اور خود ان کی اصلاح کے لئے سزائیں تجویز ہوتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاشرتی اصلاح میں سزاؤں کی باری سب سے آخر میں آتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی سزا کے لئے کہیں عقاب کی اصطلاح آئی ہے (**فکیف کان عقاب** (۱۳/۳۲) اور کہیں **عاقبۃ** کی (**فانظر کیف کان عاقبۃ المجرمین** (۷/۸۴)۔ عقاب ہو یا عاقبۃ اور عقوبت' ان کے عام معنی انجام کے ہیں' یعنی معاشرتی پروگرام میں سب سے آخر میں آنے والی کڑی——— اگر معاشرہ کی اولیں کڑیاں درست ہوں' تو اس آخری کڑی کی نوبت شاذو نادر ہی آتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ خلافت صدیقیؓ میں حضرت عمرؓ کو مدینہ کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تو انہوں نے سال بھر کے بعد رپورٹ کی کہ اس اسامی کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ سال بھر میں ان کے سامنے کوئی مقدمہ ہی پیش نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ معاشرہ کی یہ کیفیت "سخت سزاؤں" کی پیدا کردہ نہیں تھی۔ سزاؤں کی تو وہاں ابھی نوبت ہی نہیں آئی تھی——— یہ پیدا کردہ تھی اس اصلاحی پروگرام کی جو افراد معاشرہ میں اندرونی (نفسیاتی) تبدیلی کے لئے بتدریج عمل میں لایا گیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے یہ ارشاد خداوندی تھا کہ: **ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم** (۱۳/۱۱) (تم تو ایک طرف) خدا بھی اس معاشرہ میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ معاشرہ اپنے افراد میں اندرونی (قلب و نگاہ کی نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہ کرے۔

ہمارے ہاں اٹھتے بیٹھتے کہا جاتا ہے کہ سعودی عرب کو دیکھئے۔ وہاں شرعی سزائیں نافذ ہیں جس کی وجہ سے وہاں جرائم کا سدباب ہو گیا ہے۔ سعودی عرب میں جرائم کی کیا حالت ہے' اس کی بابت تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے۔ لیکن ان سزاؤں کے باوجود' وہاں کے معاشرہ کی حالت کیا ہے' اس کے متعلق محمد ریاض صاحب کا وہ مقالہ ملاحظہ فرما لیجئے جسے اس باب کے شروع میں درج کیا جا چکا ہے۔

اس سے آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہو گا کہ جس ملک کو اسلامی نقطہء نگاہ سے مثالی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے' اس میں شرعی سزاؤں کے نفاذ کے باوجود' معاشرہ کی حالت کیا ہے؟

ہماری سوچ کا بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم مرض کے علاج کے لئے علّتِ مرض (مرض کے بنیادی سبب) کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کرتے' علامات مرض کی سطحی مرہم پٹی کو علاج سمجھ لیتے ہیں۔ اس نکتہ کو ذرا غور سے سمجھنے کی

ضرورت ہے۔ جن جرائم کی شرعی سزاؤں کے نفاذ کا پروگرام زیر تجویز ہے (یعنی چوری' زنا' شراب نوشی وغیرہ) مروجہ قوانین کی رو سے بھی وہ جرائم ہیں اور ان کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ اس کے باوجود یہ شکایت عام ہے کہ حقیقی مجرموں کو سزائیں نہیں ملتیں اور بے گناہ پکڑے اور مارے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ یہاں رشوت کا چلن عام ہے۔ اس باب میں پہلے تو پولیس ہی بدنام تھی۔ اب عام عدالتوں کے بارے میں بھی چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اثبات جرم کے لئے جس طرح شہادات وضع کی جاتی ہیں اس کا بھی کسے علم نہیں۔

آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کر دی جائیں زیادہ سخت' تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف' اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے۔ اگر کسی جرم کی سزا (مثلاً) تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانسو سے زیادہ نہیں ہو گا۔ لیکن اگر اسی جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کر دینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس کی ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظامِ عدل کی اصلاح کے بغیر' سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی؟

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم کے تعزیری احکام تجویز ہی "اسلامی معاشرہ" کے لئے کئے گئے تھے۔ اسلامی معاشرہ میں کیفیت کیا ہوتی ہے' اس کا اندازہ بھی ایک مثال سے لگا لیجئے۔ اثبات جرم کا بنیادی مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں شہادت کے متعلق ارشادِ خداوندی (جس کی تعمیل افرادِ معاشرہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں) ہے۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ و لو علی انفسکم اوالو الدین والاقربین ان یکن غنیا اوفقیرا" فاللہ اولی بھما۔ فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا و ان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا"۔ (۴/۱۳۵)

اے اہل ایمان! تم ہمیشہ نظامِ عدل کو قائم رکھو۔ اس کی اولیں شرط یہ ہے کہ اگر تمہیں کہیں گواہی دینی ہو تو تم نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر پیش ہو نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ اور سچی سچی شہادت دو' خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف۔ اس باب میں امیر اور غریب میں بھی کوئی فرق نہ کرو (حتیٰ کہ دوست اور دشمن میں بھی نہیں (۵/۸)۔ تم جادۂ حق و صداقت سے ہٹ کر ان کے بھی خواہ مخواہ بنو۔ خدا کو ان کی بھی خواہی کی تم سے زیادہ فکر ہے۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ تمہارے جذبات اور میلانات کہیں عدل کی راہ میں حائل نہ ہو جائیں۔ نہ ہی کوئی پیچدار اور ذومعنی بات کہو' نہ ہی شہادت دینے سے پہلو تہی کرو۔ یاد رکھو! اللہ کا قانونِ مکافات

تمہارے تمام اعمال' جذبات اور رجحانات سے باخبر ہے۔

جہاں تک عدالت کا تعلق ہے' اور تو اور' خدا نے اپنے ایک جلیل القدر رسول سے فرما دیا کہ

یٰداود انا جعلنک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ۔ (۳۸/۲۶)

اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں اقتدار اور اختیار عطا فرمایا ہے تو لوگوں کے معاملات میں الحق (احکام خداوندی) کے مطابق عدل کرو اور اپنے جذبات' رجحانات اور خواہشات کا اتباع نہ کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو تم خدا کی طرف جانے والے راستے سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگیٔ سیرت کے پیکر۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات موجود ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکاب جرم پر مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔ اس قسم کی بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت اس پروگرام سے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآنِ کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر' جرائم کا سدباب تو ایک طرف' عادات و اطوار میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی واضح مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ حال ہی میں صدر مملکت نے ملازمین حکومت کو نماز پڑھنے کی تلقین کی۔ نماز' فریضۂ خداوندی ہے اس لئے اس کی ادائیگی ہر مسلمان پر لازمی ہے۔ اس فریضۂ خداوندی کے ساتھ صدر مملکت کی طرف سے اس کی تلقین بھی ہوئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا' اسے ذیل کی خبر سے ملاحظہ فرمایئے:۔

> ۴/جنوری ۱۹۷۹ء کے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور میں یہ افسوس ناک خبر شائع ہوئی ہے کہ صدر جنرل ضیاء الحق نے سرکاری اداروں میں نماز باجماعت کے اہتمام کے لئے جو تلقین کی تھی اور جس کے لئے آدھے گھنٹے کا وقفہ بھی دے دیا گیا تھا' سرکاری ملازمین نے چند ہفتے تو اس میں دلچسپی سے حصہ لیا اور مساجد میں نمازِ ظہر کے وقت خاصی رونق رہی مگر بتدریج سرکاری ملازموں نے نماز ظہر کے وقت اپنے دفاتر سے نکلنا شروع کر دیا اور اس طرح نماز کی باجماعت ادائیگی کو دفتر سے غیر حاضر رہنے کا بہانہ بنا لیا گیا۔ بعض سرکاری ملازم تو ظہر کی اذان کے بعد اپنے دفاتر میں واپس ہی نہیں آتے۔ یہ صورتِ حال پنجاب کے سول سیکریٹریٹ کی مسجد سمیت دیگر تمام دفاتر کی مساجد میں ہے۔ سول سیکریٹریٹ میں جہاں دسمبر کے اوائل میں پوری مسجد نمازیوں سے بھر جاتی تھی' اب وہاں روزانہ صرف ۴ صفیں ہوتی ہیں جو معمول کے مطابق ہیں۔
>
> (بحوالہ الاعتصام' مورخہ ۱۲/۱/۷۹)

اسلامی نظام کا آغاز سزاؤں سے کرنے کا ایک نقصان تو وہ ہو گا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے' یعنی اس سے

رشوتوں کے دائرے وسیع ہو جائیں گے لیکن اس سے بھی زیادہ نقصان ایک اور ہو گا۔ ہم نے صدیوں کے بعد اسلامی نظام کے احیاء کا دعویٰ' اور اس کے انسانیت ساز نتائج کا فردوس بداماں منظر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں' اس منظر کو دیکھنے کے لئے ہماری طرف لگ رہی ہیں۔ اگر زیر نظر تجربہ ناکام رہا' تو دنیا ہمارے متعلق جو کہے گی سو کہے گی' وہ اسلام کے متعلق اپنے اس خیال میں پختہ ہو جائے گی کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے جو زمانے کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اور ان کے اس پروپیگنڈہ سے خود ہمارے ہاں کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہو کر اسلام کی طرف سے بددل ہو جائے گا۔ اور اس کی یہ بددلی خود پاکستان کے مستقبل کو بری طرح مجروح کر دے گی۔ یہ ایسا نقصان ہو گا جس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

مجوزہ قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ مرکزی حکومت کے وزیر قانون' محترم بروہی صاحب نے..... اسلامک لاء کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ موجودہ (مارشل لا) حکومت عبوری ہے۔ اس لئے اس کے صادر کردہ احکام اور نافذ کردہ قوانین عارضی نوعیت کے ہیں۔ یہ اس کے بعد آنے والی منتخبہ مجلس قانون ساز کے لئے ہو گا کہ وہ انہیں قانونی تحفظ دے دے' تبدیلی کر دے یا منسوخ کر دے۔ (پاکستان ٹائمز' مورخہ ۱۴ ذ ۱۷/جنوری ۱۹۷۹ء)۔ ان حالات کے پیش نظر' اور تو اور' خود مودودی (مرحوم) کے ماہنامہ ترجمان القرآن نے محترم صدر ضیاء الحق کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے گذشتہ محرم کے اعلان کو واپس لے لیں جس میں شریعت بنچوں کے قیام اور مروجہ قوانین کو کتاب و سنت کے منافی ہونے کی بنا پر چیلنج کئے جانے کا حق دیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے۔

> اول جب یہ اعلان ہوا تھا کہ بہت جلد ایسا دستوری فیصلہ سامنے آجائے گا کہ جس کے تحت کسی بھی قانون کو اس بنیاد پر چیلنج کیا جا سکے گا کہ وہ شریعت کے خلاف ہے۔۔۔۔ تو اسی وقت مجھے پریشانی ہوئی کہ ایسا ہونا کسی قلیل مدت میں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ جب تک پورے قانونی نظام' مالیاتی نظام اور عدالتی نظام (بلکہ تعلیمی اور فوجی نظام وغیرہ بھی شامل ہیں) کی تشکیلِ نو شریعت کے مطابق نہیں کر لی جاتی' اس قسم کا حکم یا دستوری فرمان سخت مشکلات پیدا کریگا' بلکہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔
>
> اور اب اس اعلان کی مشکل کو حل کرنے کے لئے اتنے قوانین اور اداروں کو آئینی تحفظ دے دیا گیا ہے کہ اعلان کے مطابق چیلنج کرنے کے حکم کا دائرۂ اثر بے حد محدود بلکہ برائے نام ہے۔ آخر خواہ مخواہ اس اعلان کو نبھانے کی ضرورت کیا تھی۔ جو لے دے اب وسیع دائرہ تحفظ کے خلاف ہو رہی ہے' زیادہ سے زیادہ اتنی ہی ترک اعلان کے بارے میں ہو جاتی۔
>
> ذمہ داری دراصل سی' ایم' ایل' اے' جنرل محمد ضیاء الحق کے ان قانونی مشیروں پر جاتی ہے جنہوں نے ایک قانونی فیصلے کے اثرات کا بروقت اندازہ نہیں کیا۔

اب بھی کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ اقرار کر لیا جائے کہ متذکرہ اعلان کے تقاضے پورے کرنے کا وقت ابھی دُور ہے۔ فی الحال اسے واپس لیا جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن' بابت جنوری ۱۹۷۹ء' ص۶)

ان حضرات کو کون بتائے کہ اسلامی قوانین کے سلسلہ میں جو اُلجھنیں پیدا ہو رہی (یا پیدا کی جا رہی) ہیں' ان کی ذمہ داری' جنرل محمد ضیاء الحق کے قانونی مشیروں پر تو جس قدر عائد ہوتی ہے' ہوتی ہے' ان سے کہیں زیادہ ذمہ دار خود آپ حضرات ہیں۔ آپ کی حالت یہ ہے کہ ایک طرف مودودی (مرحوم) بالتصریح ارشاد فرماتے ہیں کہ اس قسم کے معاشرہ میں جو یہاں موجود ہے' اسلامی تعزیرات نافذ کرنے والی حکومت ظالم قرار پائیگی۔ اور ان کے زیرادارت شائع ہونے والا صحیفہ' صدر مملکت کے اعلان کو واپس لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اسی جماعت کی مجلس شوریٰ اپنے اجلاس منعقدہ اوائل جنوری ۷۹ء میں حسب ذیل قرار داد منظور کرتی ہے:۔

مجلس شوریٰ' جماعت اسلامی کا یہ اجلاس صدر مملکت کے نئے ہجری سال کے آغاز پر اس اعلان کا خیر مقدم کرتا ہے کہ بارہ ربیع الاول کو ملک کے چاروں ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ میں شریعت بنچ قائم کر دیئے جائیں گے جو قرآن و سنت کے منافی قوانین کو کالعدم قرار دے سکیں گے۔ اس کے علاوہ چوری' ڈاکہ' قذف اور زنا کی اسلامی سزاؤں اور تحفظ عقیدہ کا قانون بھی نافذ کر دیا جائے گا۔ مجلس شوریٰ یہ توقع رکھتی ہے کہ اب ان اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی تاخیر روا نہ رکھی جائے گی۔

(ایشیا' لاہور' مورخہ ۷/جنوری ۱۹۷۹ء)

اس جماعت کی اسی قسم کی دورخی پالیسی ہے جو یہاں اسلام کے نام پر اُلجھاؤ پر اُلجھاؤ پیدا کئے چلی آ رہی ہے۔

(فروری ۱۹۷۹ء)

۶۔ شرعی قوانین کا تجزیہ

جن شرعی قوانین کا چرچا ایک عرصہ سے ہو رہا تھا' محترم صدر مملکت پاکستان نے ان کا' ۱۲ ربیع الاول کے مقدس یوم (بابت ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء) کو اعلان بھی کردیا اور ان کے متعلق احکامات بھی جاری کردیئے' جو پاکستان ٹائمز' مورخہ ۱۲ فروری میں شائع ہوئے ہیں۔ ان قوانین کا تعلق ان سزاؤں سے ہے' جنہیں فقہی اصطلاح میں حد (جمع حدود) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ (۱) شراب (منشیات) ۔ (۲) سرقہ (چوری اور ڈاکہ) (۳) زنا۔ (۴) قذف (تہمت تراشی) اور لعان (میاں بیوی کی ایک دوسرے کے خلاف تہمت تراشی) سے متعلق ہیں۔ نیز ان میں "کوڑے" کا بھی تعین کیا گیا ہے۔

طلوع اسلام کا اجراء ۱۹۳۸ء میں (قبل از تقسیم ہند) ہوا۔ اس کے بعد یہ پاکستان میں ۱۹۴۸ء سے مسلسل شائع ہو

رہا ہے۔ جن قارئین کی نظروں سے یہ شروع سے گزر رہا ہے وہ اس حقیقت سے واقف اور اس کے شاہد ہیں کہ
۱۔ اس کا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ نہ ہی اس نے کوئی اپنا نیا فرقہ بنایا ہے۔
۲۔ اس نے نہ کبھی کوئی ایسی بات کی ہے جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو اور نہ ہی اس نے کبھی عملی سیاسیات میں حصہ لیا ہے۔
۳۔ اس تیس سال کے عرصہ میں نہ اس کا تعلق کسی حکومت سے رہا ہے او نہ ہی اس نے ملک میں پیدا ہونے والے کسی قسم کے ہنگامے اور انتشار کی تائید و حمایت کی ہے۔ اس نے ان کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔
۴۔ اس نے کبھی نہ خود قانون شکنی کی ہے' نہ کسی کو قانون شکنی کی ترغیب دی ہے۔ قانون شکنی کی یہ مخالفت کرتا ہے اور کسی قسم کی تبدیلی یا اصلاح کے لئے آئینی اور قانونی طریق کار اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد اور ایک ہی مشن ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ کوئی کہے یا کرے یا ملک میں جو کچھ ہو' قرآن کریم کی روشنی میں اس کا جائزہ لے کر بتائے کہ کتاب اللہ کی رو سے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس نے ملک کے ہر آئین کو بھی اسی معیار کے مطابق پرکھا اور ہر قانون کا اسی کی روشنی میں جائزہ لیا اور اس کے بعد وہ' اپنی قرآنی بصیرت کی رو سے جس نتیجہ پر پہنچا' اسے بے کم و کاست اور بلا رو رعایت قوم کے سامنے پیش کردیا خواہ وہ کسی کے خلاف جائے یا کسی کے حق میں۔ اس نے اپنے اوپر یہ ذمہ داری از خود عائد نہیں کر رکھی۔ یہ خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے جس کی ادائیگی ایک مسلمان کی حیثیت سے اس پر لازم ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :-

ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینت والھدی من بعد ما بینہ للناس فی الکتب ۙ اولئک یلعنھم اللہ ویلعنھم اللعنون (۲/۱۵۹)

جو لوگ ان واضح احکام اور راہ نمائی کی باتوں کو چھپا کر رکھیں جنہیں ہم نے نازل کیا ہے' اس کے بعد کہ ہم نے انہیں تمام لوگوں کے لئے اپنی کتاب میں نہایت وضاحت سے بیان کردیا ہے' تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی لعنت بھی۔

آپ غور فرمایئے کہ احکام و ارشادات خداوندی کو چھپانے کے خلاف کس قدر سخت وعید ہے۔ دوسرے مقام پر اس کا حکم دیا گیا کہ

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون (۲/۴۲)

جب تم جانتے ہو کہ حق کیا ہے تو پھر نہ تو حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کرو اور نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

یہ (اور اسی قسم کے متعدد دیگر ارشادات خداوندی) کی رو سے' ہم پر یہ اہم فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہم ہر پیش آنے والے معاملہ کے متعلق بتائیں کہ قرآن مجید کا اس باب میں فیصلہ کیا ہے۔ یوں تو اس قسم کی وضاحت ہر معاملہ میں

ضروری ہے' لیکن موجودہ قوانین کے سلسلہ میں اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ انہیں اسلامی قوانین کہہ کر ملک میں نافذ کیا گیا ہے۔ "اسلامی" کی اصطلاح بڑی وسیع اور غیر متعین ہے۔ اس میں بہت کچھ شامل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ کے ..... "اسلامی احکام"..... (جو ان کی فقہ کے احکام ہوتے ہیں) دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ زیر نظر احکام بھی فقہی احکام ہیں۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم بتائیں کہ قرآن مجید کی رو سے ان کی پوزیشن کیا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ہی کو حق و باطل کا معیار' بلکہ کفر و ایمان کا خط امتیاز قرار دیا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہیں کو کافر کہا جاتا ہے۔

اور خود رسولؐ اللہ کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ **فاحکم بینھم بما انزل اللہ (۵/۴۸)** "تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ لہٰذا' کوئی حکم' کوئی قانون' کوئی فیصلہ' جو کتاب اللہ کے خلاف ہو وہ یقیناً" سنت رسولؐ اللہ کے بھی خلاف ہوگا۔

زیر نظر قوانین کے متعلق اتنا اور سمجھ لینا چاہئے کہ

۱۔ ان کا تعلق حدود سے ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں حد (جمع حدود) ان سزاؤں کو کہتے ہیں جو متعین اور مقرر ہیں اور جو سزائیں مقرر نہیں' انہیں تعزیرات کہا جاتا ہے۔ اپنے جائزہ میں ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ ان میں جو سزائیں بطور حدود تجویز کی گئی ہیں' قرآن کریم کی رو سے ان کی پوزیشن کیا ہے' یعنی وہ قرآن کے مطابق ہیں ..... یا ..... نہیں۔

۲۔ ان قوانین کے متن وغیرہ کے متعلق طلوع اسلام کو اتھارٹی نہ تصور کرلیا جائے۔ اتھارٹی وہی ضابطہ ہوگا جسے حکومت شائع کرے گی۔ غالباً" اس نے اسے شائع کردیا ہے۔ ہم نے' بہرحال' انہیں پاکستان ٹائمز' بابت ۱۲ فروری ۱۹۷۹ء سے اخذ کیا ہے۔

ان تمہیدات کے بعد آیئے' ان قوانین کی طرف' **وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم**

---

(۱) منشیات

ان میں شراب' بھنگ' چرس' افیون وغیرہ تمام نشہ آور چیزیں شامل ہیں اور ان کا بنانا' رکھنا' لے جانا' خرید و فروخت کرنا' استعمال کرنا ممنوع اور مستوجب سزا جرم ہے۔ ان کے استعمال کی حد (سزا) اسی (۸۰) کوڑے قرار دی گئی ہے۔ دیگر جرائم کی تعزیری سزائیں مختلف ہیں۔

قرآن کریم میں خمر کی ممانعت کی گئی ہے۔ خمر کے لغوی معنے ڈھانپ دینے کے ہیں اور چونکہ نشہ انسانی عقل پر

پردہ ڈال دیتا ہے' اس لئے عربوں کے ہاں شراب کو خمر کہا جاتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں آیا ہے۔

لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکری (۴/۴۳)

جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ۔

اس سے مستنبط کیا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ہر نشہ آور چیز ممنوع ہے۔ قرآن کریم میں اس کی ممانعت تو آئی ہے لیکن اس نے اس کی کوئی سزا خود مقرر نہیں کی۔ اس کی ممانعت میں بھی بڑی اہم حکمت عملی سے کام لیا گیا تھا۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے رفتہ رفتہ انسان ان کا ایسا عادی ہوجاتا ہے کہ انہیں یک لخت چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں اس کی ممانعت کے احکام بتدریج نازل ہوئے تھے۔ سب سے پہلے انہیں سمجھایا گیا کہ

فیھما اثم کبیر ومنا فع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما (۲/۲۱۹)

ان میں تھوڑے بہت فائدے بھی ہیں' لیکن ان کے نقصان ان کے فائدے کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔

پھر کہا گیا کہ

یاایھاالذین امنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکٰری حتی تعلموا ما تقولون (۴/۴۳)

اے جماعت مومنین! تم نشہ کی حالت میں صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ' تاآنکہ جو کچھ تم کہتے ہو' اسے سمجھ سکو۔

اور پھر آخر میں خمر کو **رجس من عمل الشیطن** ....."شیطانی عمل" ..... قرار دے کر حکم دیا کہ **فاجتنبوہ** "اس سے اجتناب کرو" اور آخر میں کہا کہ

فھل انتھم منتھون (۵/۹۰-۹۱)

اور کیا تم اس پر بھی باز نہیں آؤ گے۔

ان تدریجی احکام کا نتیجہ تھا کہ خمر کی آخر ممانعت مدینہ میں جاکر ہوئی' یعنی آغاز نبوت سے کم از کم چودہ پندرہ سال بعد--- اس دوران میں اس کے متوالوں کو آہستہ آہستہ اس حقیقت کی طرف لایا گیا کہ انہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔

حالیہ قانون میں اس تدریج کو پیش نظر نہیں رکھا گیا اور فوری ممانعت کے احکام نافذ کردیئے گئے ہیں۔ دیگر نشوں کے متعلق تو ہمیں معلوم نہیں۔ افیونیوں کو ہم نے دیکھا ہے کہ اگر انہیں وقت پر افیون نہیں ملتی تو ان کی کرب انگیز حالت دیکھی نہیں جاسکتی۔ وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات انہیں جان تک کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ زیر نظر قانون کے فی الفور نفاذ سے بہت سی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جائیں گی اور بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اس قسم کی پیچیدگیوں اور مشکلات سے بچنے کے لئے کتاب (قانون) کے ساتھ حکمت کو بھی منزل من اللہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ صدر اول میں اس جرم کی سزا کے سلسلہ میں بھی شروع میں اتنا ہی تھا کہ مجرم کو کسی درخت کی

ٹہنی سے' چادر سے' یا ہاتھوں سے پیٹا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کے شروع میں بھی یہی عمل جاری رہا۔ عہد فاروقیؓ کے اخیر زمانے میں چالیس تازیانوں کی سزا مقرر کی گئی اور عادی مجرم کے لئے اسی (۸۰) تازیانے۔

ان سطور کی تسوید کے وقت یہ خبریں سننے میں آرہی ہیں کہ اس قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں نرمی برتنے کی تجاویز اور تدابیر زیر غور ہیں۔

(۲) سرقہ (چوری)

جرم سرقہ کی سزا کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ پہلی دفعہ کے جرم کی سزا کے طور پر مجرم کا دایاں ہاتھ' اس کی کلائی کے جوڑ سے کاٹ دیا جائے گا۔ دوسری بار کے جرم پر مجرم کا بایاں پاؤں ٹخنے سے کاٹ دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد کے ارتکاب جرم کی سزا عمر قید ہوگی جسے' مجرم کے تائب ہونے کی صورت میں' ہائی کورٹ معاف بھی کرسکے گا۔

قرآن مجید میں سرقہ کے جرم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:۔

والسارق والسارقہ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ و اللہ عزیز حکیم (۵/۳۸)

سرقہ کے مجرم مرد یا سرقہ کی مجرمہ عورت کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ یہ ان کے جرم کی سزا ہے جو اللہ کی طرف سے اس جرم کی روک تھام کے لئے مقرر کی گئی ہے' وہ اللہ جو غلبہ بھی رکھتا ہے اور حکمت بھی۔

اللہ تعالیٰ کے صاحب غلبہ (ذی اقتدار) ہونے کا ثبوت تو ارتکاب جرم کی مقرر کردہ سزا ہے۔ لیکن اس کے صاحب حکمت ہونے کی شہادت اس سے اگلی آیت میں دی گئی ہے۔ فرمایا:۔

فمن تاب من بعد ظلمہ واصلح فان اللہ یتوب علیہ ان اللہ غفور رحیم (۵/۳۹)

پھر جو شخص ارتکاب جرم کے بعد اپنے کئے پر شرمسار ہو اور اپنی اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے معاف کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً" اللہ ایسے لوگوں کو سزا سے محفوظ بھی رکھتا ہے اور انہیں اپنی مرحمت سے نوازتا بھی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ سزا پہلی بار جرم کے ارتکاب پر نہیں دی جاسکتی۔ ارتکاب جرم پر نادم ہونے والے مجرم کو آئندہ کے لئے اصلاح کی غرض سے معافی بھی دی جاسکتی ہے یا عندالضرورت کوئی تعزیری سزا بھی۔ قطع ید کی سزا عادی مجرموں کے لئے ہے۔ سورۂ آل عمران میں ایک عام اصول بتایا گیا ہے' یعنی:۔

والذین اذا فعلوا فاحشہ اوظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا

لذنوبهم ومن یغفر الذ نوب الا اللہ ولم یصروا علی ما فعلوا وھم یعلمون (۳/۱۳۵)

جو لوگ کوئی برائی کی بات کر بیٹھیں یا کسی جرم کے ارتکاب سے اپنے آپ پر زیادتی کرلیں' اور اس کے بعد جب قانون خداوندی ان کے سامنے آئے تو وہ اپنے جرم کے لئے معافی کے خواستگار ہوں' تو قانون خداوندی میں معافی کی بھی گنجائش رکھ دی گئی ہے۔ یہ معافی ان مجرموں کے لئے ہے جو جانتے بوجھتے بار بار ارتکاب جرم نہ کریں' یعنی عادی مجرم نہ ہوں۔

غیر مصر مجرموں کے متعلق کہا کہ

اولئک جزاوھم مغفرۃ من ربھم (۳/۱۳۶)

قانون خداوندی کی رو سے ایسے مجرمین کو معافی دی جائے۔

اس کی تائید میں روایات بھی موجود ہیں۔ ایک روایت میں تو یہاں تک بھی آیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک مجرم کو چار مرتبہ چوری کرنے پر بھی قطع ید کی سزا نہیں دی۔ علاوہ ازیں' اس قسم کی سزاؤں کے نفاذ میں معاشرہ کے حالات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں غلہ کی چوری کو مستوجب سزا قرار نہیں دیا تھا۔ اس سلسلے میں حاطبؓ ابن بلتعہ کے ملازموں کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔ انہوں نے کسی کی اونٹنی چرا کر اسے ذبح کرکے کھالیا۔ جرم بھی ثابت ہوگیا لیکن حضرت عمرؓ کے پوچھنے پر کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا تھا' انہوں نے کہا تھا کہ ہمارا مالک ہم سے کام تو پورا لیتا ہے لیکن ہمیں کھانے کو کم دیتا ہے اور ہم نے بھوک سے تنگ آکر ایسا کیا ہے۔ اس پر آپؓ نے ان مجرموں کو تو چھوڑ دیا اور مالک کو بلا کر کہا کہ مجرم یہ نہیں' تم ہو' کہ جس نے انہیں اس جرم کے ارتکاب پر مجبور کردیا۔ اس دفعہ تو تم سے رعایت برتی جاتی ہے--- تم اونٹنی کے مالک کو اس کی قیمت ادا کردو۔ اگر آئندہ ایسا کیا تو تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔ غیر اسلامی معاشرہ میں اسلامی سزاؤں کے نفاذ کے متعلق قارئین کی توجہ مودودی صاحب کے اس مقالہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو طلوع اسلام کی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے۲؎۔ خود قرآن کریم نے معاشرتی حالات کا اس قدر لحاظ رکھا ہے کہ اس نے لونڈیوں کے لئے (جو اس زمانہ کے عربی معاشرہ میں موجود تھیں) جرم زنا کی سزا آزاد عورتوں کے مقابلے میں نصف مقرر کی۔

۲ - زیر نظر قانون میں دوسری مرتبہ کے ارتکاب جرم کے لئے نہ بایاں پاؤں کاٹنے کی سزا رکھی گئی ہے۔ قرآن کریم میں سرقہ کے جرم میں صرف ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کی گئی ہے' پاؤں کاٹنے کی نہیں۔

۳ - اس قانون میں سرقہ کا نصاب (۴--- اعشاریہ- ۴۵۷) گرام سونا (یا اس کے برابر قیمت) مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں سرقہ کا نصاب مقرر نہیں کیا گیا۔

۲؎ مودودی صاحب نے اپنی تحسینات کے باوجود حالیہ قوانین کے نفاذ کو مستحق تبریک و تحسین قرار دیا ہے۔
(ہفت روزہ الشیاء- ۱۱ فروری ۱۹۷۹ء ص۹)

حرابہ

زیر نظر قانون میں حرابہ کو بھی مستوجب حد قرار دیا گیا ہے۔۔۔ فقہی اصطلاح میں حرابہ کا لفظ عام طور پر ڈکیتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس جرم کی مختلف سزائیں مقرر کی گئی ہیں جن میں سے ایک سزا مجرم کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دینا ہے۔

حرابہ کے ضمن میں ذیل کی قرآنی آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے:۔

انما جزاوا الذین یحاربون اللہ و رسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا اویصلبوا او تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف اوینفوا من الارض ذالک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم
(۵/۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرتے ہیں تو ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا صلیب دیا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف طرفوں سے کاٹ دیئے جائیں یا قید یا جلا وطن کردیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب۔ (اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ قبل اس کے کہ ان پر قابو پالیا جائے توبہ کرلیں تو پھر انہیں معافی دی جاسکتی ہے)۔

اس آیت میں محاربہ کے معنے مملکت کے خلاف بغاوت' اور فساد فی الارض کے معنی (عام طور پر) ہنگامہ آرائیاں کئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحات بڑی وسیع ہیں اور فقہ میں ان سے مراد' ڈاکہ زنی بھی لی جاتی ہے اور اس کی سزا ہاتھ اور پاؤں کا کاٹ دینا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عام قانون شکنی بھی مملکت کے خلاف بغاوت کے ذیل میں آجاتی ہے۔ اور چونکہ اس آیت میں سزائے موت' صلیب' ہاتھ پاؤں کا کاٹنا اور قید یا جلا وطنی متبادل سزاؤں کے طور پر تجویز کی گئی ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ حرابہ کے علاوہ دیگر جرائم کی کم از کم سزا قید بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ زیر نظر قانون میں حرابہ کو ڈکیتی کے معنوں میں لیا گیا ہے اور اس کی سزا آیت (۵/۳۳) کی رو سے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔

(ضمناً) بعض لوگ قطع ید سے مراد ہاتھ کا سچ مچ کاٹ دینا نہیں لیتے۔ عربی زبان کی رو سے اس کے معنی روک تھام کے بھی ہوتے ہیں' اس لئے وہ اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے مجرم آئندہ کے لئے اس جرم کے ارتکاب سے خود بخود رک جائے۔ توبہ اور اصلاح اس کی بنیادی تدبیر ہے۔

۳۔ زنا

جرم زنا کی سزا کے متعلق قرآن کریم میں ہے

الزانیہ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائہ جلدۃ .... (۲۴/۲)

زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر اک کو سو کوڑے لگاؤ۔

الزانی اور الزانیہ میں ہر قسم کے مجرم آجاتے ہیں لیکن زیر نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر :۔

۱۔ زانی مرد یا زانیہ عورت شادی شدہ (محصن) ہو تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں رجم کہا جاتا ہے۔ اور

۲۔ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوں تو انہیں سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔ قرآن مجید میں رجم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کے لئے جو سند لائی جاتی ہے وہ بڑی غور طلب ہے۔ روایات میں ہے کہ جب رسولؐ اللہ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضرت زیدؓ بن ثابت کی زیر مرکردگی قرآن مجید جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا گیا' تو حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کے جمع کردہ قرآن میں آیہ رجم نہیں۔ وہ اس آیت کو لے کر حضرت زیدؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اصول یہ طے کر رکھا ہے کہ جو شخص کسی آیت کو لے کر آئے اسے اس وقت درج قرآن کیا جائے جب وہ اپنے دعویٰ کی تائید میں ایک گواہ بھی لائے۔ حضرت عمرؓ کوئی گواہ نہ لاسکے اس لئے یہ آیت قرآن میں درج نہیں کی گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ ہم رسولؐ اللہ کے زمانے میں اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ:

> قرآن کی دو آیتیں کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی میرے صحیفہ میں موجود تھیں۔ ایک آیہ رجم اور دوسری رضاعت (جس میں کہا گیا تھا کہ دودھ کے دس گھونٹ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے)۔ جب رسولؐ اللہ نے وفات پائی تو ہم اس حادثہ میں مشغول ہوگئے۔ میری بکری آئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی (اس لئے اب یہ آیتیں تمہیں کہاں سے مل سکیں گی؟)۔ (ابن ماجہ)

اس طرح یہ دو آیتیں قرآن میں درج نہ ہوسکیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر یہ قرآن میں درج نہیں ہوسکیں' تو کوئی بات نہیں۔ ہم ان پر عمل اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے کہا گیا کہ جب آپ کو اس قدر یقین ہے کہ آیہ رجم قرآن کی آیت ہے تو آپ اسے داخل قرآن کیوں نہیں کردیتے۔ اس پر آپ نے فرمایا:۔

> اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے قرآن میں اضافہ کردیا' تو میں اس آیت کو ضرور داخل قرآن کردیتا۔

چنانچہ یہ آیت قرآن میں تو داخل نہ ہوئی لیکن عمل اس کے مطابق ہوتا رہا۔ واضح رہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن کریم میں موجود تو ہیں' لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔ اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں موجود نہیں لیکن حکم ان کا جاری ہے۔ آیہ رجم کا شمار انہی آیات میں کیا جاتا ہے۔ یہ ہے جرم

زنا کے لئے رجم کی سند ۳۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے' قرآن مجید میں رجم کی سزا کا ذکر کہیں نہیں آیا' صرف کوڑوں کی سزا کا ذکر آیا ہے۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ لونڈیوں کے جرم زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی سزا آزاد عورتوں کی سزا کا نصف ہوگی (۴/۲۵)۔ کوڑوں کی سزا کا نصف تو ہوسکتا ہے' رجم کی سزا کا نصف نہیں ہوسکتا۔

جرم کا ثبوت

جرم زنا کے ارتکاب کے ثبوت کے لئے زیر نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اس کے لئے :۔

۱۔ چار ثقہ اور پاکباز گواہ ہونے چاہئیں اور

۲۔ ان گواہوں نے اس فعل شنیع کے ارتکاب کے سلسلے میں دخول (ACT OF PENETRATION) کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

قرآن کریم نے فعل زنا کے ثبوت کے لئے گواہوں کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے لئے عام طور پر مندرجہ ذیل آیت سے سند لائی جاتی ہے۔

والتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم فان شھدوا فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفھن الموت او یجعل اللہ لھن سبیلا (۴/۱۵)

تمہاری عورتوں میں سے جو کوئی کسی امر فاحش (بے حیائی) کا ارتکاب کرے تو اس کے ثبوت میں تم میں سے چار مرد گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر وہ گواہی دیں تو ایسی عورتوں کو پابند مسکن کیا جائے تا آنکہ وہ وفات پا جائیں یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راستہ نکال دے۔

اس آیت میں لفظ **الفاحشۃ** آیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ زنا بھی فواحش میں شامل ہے۔ لیکن ہر فحش کلم زنا نہیں ہوسکتا۔ اس سے مراد عام بے حیائی کی باتیں ہیں جن کی اگر شروع میں روک تھام نہ کی جائے تو وہ آخر الامر زنا تک لے جاسکتی ہیں۔ انہیں انگریزی زبان میں (OBSCENITY) کہا جائے گا۔ اس مفہوم کی تائید خود اس آیت سے ہوتی ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس میں صرف عورتوں کا ذکر ہے' اور یہ ظاہر ہے کہ زنا کا ارتکاب تنہا عورت سے نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے عورت کے ساتھ مرد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے سورۃ النور میں الزانیۃ اور الزانی

۳۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نبی اکرمؐ کی زندگی میں جمع' مرتب اور مدون ہوچکا تھا اور حضورؐ نے اسے امت کو اسی شکل میں دیا تھا جس شکل میں یہ آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں نہ کوئی آیت درج ہونے سے رہ گئی ہے اور نہ ہی کوئی آیت منسوخ ہے۔ ان امور کی تفصیل' ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" اور پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "شاہکار رسالت" میں ملے گی۔

(۲۴/۲) دونوں آئے ہیں۔ زیر نظر آیت میں ایسی بے حیائی کی باتوں کی طرف اشارہ گیا گیا ہے جس کی مرتکب تنہا عورت ہو سکتی ہے۔

اور دوسرے اس لئے کہ اس آیت میں اس جرم کی سزا پابند مسکن بتائی گئی ہے' حالانکہ زنا کی سزا سو کوڑے ہے۔ لہٰذا' اس آیت سے فعل زنا کے لئے چار گواہوں کی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔

سورۃ النور کی آیت نمبر۴ میں چار گواہوں کی شرط کا ذکر ہے' لیکن وہ تہمت تراشی (قذف) کے سلسلے میں ہے۔ اور قذف کے لئے ایک الگ قانون ہے۔ قرآن کی آیت یہ ہے :۔

والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعۃ شھدا فاجلدوھم ثمنین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا و اولئک ھم الفسقون (۲۴/۴)

جو لوگ پاکباز عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر اس الزام کے ثبوت میں چار گواہ نہ لاسکیں تو ان تہمت تراشوں کو اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے' کیونکہ وہ فاسق ہیں۔

(اگلی آیت میں ان کے تائب ہونے کی صورت میں معافی کا ذکر آیا ہے)۔

تہمت تراشی کے سلسلے میں چار گواہوں کا ذکر سورۃ النور کی آیت نمبر۱۳ میں بھی آیا ہے۔ وہاں اس کے لئے افک کا لفظ آیا ہے۔ ان آیات میں جرم تو تہمت تراشی کا ہے لیکن ان سے زنا کے سلسلے میں یہ استنباط گیا جاسکتا ہے کہ اگر ان شہادات کی رو سے تہمت صحیح ثابت ہو جائے تو اس سے گویا جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ یوں جرم زنا کے ثبوت کے لئے بالواسطہ چار گواہوں کی شہادت کی تائید مل سکتی ہے۔

عینی شہادت

جیسے کے پہلے لکھا جاچکا ہے' زیر نظر قانون میں یہ کہا گیا ہے کہ گواہوں کے لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اس فعل کے ارتکاب کے سلسلے میں دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ قرآن کریم میں اس قسم کی شرط کا تو تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شرط کی رو سے زنا کا جرم ثابت ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا' اس کی سزا بھی نہیں مل سکتی۔ فقہ کی رو سے اس شہادت کی شرائط کس قسم کی ہیں' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ) اگر تین گواہوں نے عینی گواہی دے دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید تو کردی لیکن کہا یہ کہ اس نے ملزم مرد اور عورت کو ایک لحاف میں دیکھا تھا' تو اس سے اس ملزم پر حد جاری نہیں ہوگی۔ لیکن پہلے تین گواہوں کو جرم قذف کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور انہیں اسی اسی کوڑے مارے جائیں گے (فتاویٰ عالمگیری' اردو ترجمہ' ص۳۴۲)۔

نوٹ : زیر نظر قوانین میں خلاف وضع فطرت جنسی اختلاط کا (HOMO SEXUALITY) ذکر نہیں۔

۴۔ قذف

قذف سے مراد ہوتی ہے کسی پاکباز عورت کے خلاف زنا کی تہمت لگانا۔ اس باب میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے:

والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعۃ شھدا فاجلدوھم ثمنین جلدۃ ولا تقبلوا لھم شھادۃ ابدا واولئک ھم الفسقون (۲۴/۴)

جو لوگ پاکباز عورتوں کے خلاف تہمت لگائیں اور اس عائد کردہ الزام کے ثبوت میں چار گواہ پیش نہ کریں تو انہیں اسی (۸۰) کوڑے لگاؤ اور اس کے بعد ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو' کیونکہ یہ لوگ فاسق ہیں۔

(اس سے اگلی آیت میں ہے کہ جو لوگ اس کے بعد تائب ہو جائیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انہیں معاف کیا جاسکتا ہے)۔

قرآن کریم نے عورتوں کے خلاف بہتان تراشی کا ذکر کیا ہے لیکن زیر نظر قانون میں "کسی شخص کے خلاف تہمت لگانے" کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس میں عورتوں کی تخصیص نہیں۔ عورت ہو یا مرد' کسی کے خلاف بھی زنا کی ناحق تہمت لگانا جرم قرار پائے گا۔ اس کی سزا تو اسی (۸۰) کوڑے ہی مقرر کی گئی ہے لیکن اس کے ثبوت کے لئے صرف دو گواہوں کی شہادت کافی قرار دی گئی ہے۔

قرآن کریم مین بہتان تراشی کے علاوہ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے اور بڑا سنگین جرم۔ سورۂ احزاب میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ وہ اپنی ازواج مطہرات' بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے اوپر کے پیرہن کو لٹکائے رکھا کریں تاکہ محض لباس ہی سے معلوم ہو جائے کہ وہ شریف زادیاں ہیں اور انہیں کوئی تنگ نہ کرے۔ اس کے بعد ہے کہ اگر اس کے باوجود شریر الطبع اور جھوٹی خبریں اڑانے والے باز نہ آئیں تو **این ما ثقفوا اُخذوا وقتلوا تقتیلا (۳۳/۶۱)** "جہاں بھی یہ پائے جائیں انہیں گرفتار کیا جائے اور قتل کیا جائے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے متعلق بھی قانون نافذ کرنا ضروری ہے کیونکہ اس قسم کی حرکتیں آج کل عام ہو رہی ہیں۔

۵۔ لعان

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں کے خلاف تہمت لگائیں اور اس الزام کے ثبوت میں ان کے اپنے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ایسا شخص چار مرتبہ حلفیہ بیان کرے کہ میں بالکل سچ کہتا ہوں اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر یہ الزام جھوٹ ہو تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کے جواب میں اس کی بیوی بھی اسی طرح قسمیں کھائے اور کہے کہ اس کا خاوند جھوٹ کہتا ہے اور یہ بھی اضافہ کرے کہ اگر وہ سچا ہو تو مجھ پر خدا کا غضب ہو (سورۂ النور آیات نمبر۹-۶)۔

زیر نظر قانون میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ عورت اپنے خاوند کے الزام کی اس طرح تردید نہ کرے تو اسے جرم زنا

کی سزا دی جائے۔ اگر وہ اس کی تردید کردے تو پھر عدالت مجاز ان کے نکاح کو فسخ کرنے کا حکم صادر کردے۔ قرآن کریم میں تو اس کی صراحت نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ جب میاں اور بیوی کے باہمی تعلقات کی یہ صورت ہو تو ان کے نکاح باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس فیصلے کی رو سے طلاق کے ضمن میں بہت سے سوالات ابھریں گے۔ لیکن چونکہ عائلی قوانین کے سلسلے میں ابھی کوئی بات سامنے نہیں آئی' اس لئے سردست اس نکتہ پر بحث نہیں کی جاسکتی۔

۶۔ کوڑے کا تعین

قرآن کریم مین کوڑوں کی سزا تو مقرر کی گئی ہے لیکن کوڑے کا تعین نہیں کیا گیا کہ وہ کس قسم کا ہونا چاہئے۔ ایک بات البتہ واضح ہے او وہ یہ کہ اس نے سزا کے طور پر سو سو اور اسی اسی کوڑے مقرر کئے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوڑا ایسا ہونا چاہئے جس کی سو سو اور اسی اسی ضربیں بھی انسانی حد برداشت سے باہر نہ ہوں۔ حالیہ قوانین میں کہا گیا ہے کہ کوڑا' اس کے دستے کو چھوڑ کر' ایک ٹکڑا ہوگا اور بہتر یہ ہو کہ وہ چمڑے کا بنا ہوا ہو یا بید ہو یا کسی درخت کی شاخ جس پر کوئی گانٹھ یا جوڑ نہ ہو۔ اس کی لمبائی ایک اعشاریہ بائیس میٹر اور موٹائی ایک اعشاریہ پچیس سینٹی میٹر سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی کوڑے لگانے کے لئے بھی جزئیات کی وضاحت کردی گئی ہے۔ اس انداز کی تازیانہ زدگی کا نتیجہ کیا ہوگا' یہ تو ان کے عملی استعمال کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا۔

یہ ہیں حالیہ نافذ کردہ قوانین حدود کے نمایاں خد و خال۔ ہم نے ان قوانین پر کوئی تنقید یا تبصرہ نہیں کیا۔ صرف اتنا بتانے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ان جرائم کے متعلق قرآن کریم میں کیا آیا ہے۔ یہ درحقیقت فقہی قوانین ہیں اور فقہ کے متعلق ہمارا موقف اور مسلک واضح ہے۔ ہمارے نزدیک فقہی قوانین ابدی اور غیر متبدل نہیں ہوتے۔ ابدی اور غیر متبدل صرف خدا کے احکام' قوانین اور اصول ہوتے ہیں' انسانوں کے وضع کردہ قوانین نہیں۔

ہم نے طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت فروری ۱۹۷۹ء) کے لمعات میں یہ لکھا[۴] تھا کہ سزاؤں سے متعلق قوانین نافذ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جرائم کی تفتیشی ایجنسی' انتظامیہ اور عدلیہ کو ان بدعنوانیوں اور رشوت ستانیوں سے پاک کیا جائے جن کی وجہ سے لوگوں کو عدل اور انصاف نہیں مل رہا۔ ہم نے ججوں اور گواہوں کے متعلق قرآنی معیار کی وضاحت کرنے کے بعد لکھا تھا کہ:

> اسلامی سزائیں اس معاشرہ کے لئے ہیں جہاں گواہ اس کردار کے حامل ہوں اور جج اس پاکیزگی سیرت کے پیکر۔ اس کے ساتھ معاشرہ کی فضا بھی ایسی ہو جس میں نہ جرائم کے محرکات ہوں اور نہ ہی کسی کو ارتکاب جرم پر مجبور کرنے کے اسباب اور مقتضیات۔

۴۔ یہ سابقہ صفحات میں "قوانین شریعت کا جائزہ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

اس قسم کی بلندی کردار اور پاکیزگی میرت اس پروگرام سے پیدا ہوتے ہیں جسے قرآن کریم نے نفسیاتی تبدیلی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر جرائم کا سدباب تو ایک طرف' عادات و اطوار میں بھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محترم صدر مملکت نے بھی اس ضرورت کا اظہار فرمایا ہے۔ اگلے دنوں انہوں نے (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا جو پاکستان ٹائمز کی اشاعت بابت ۱۸ فروری میں شائع ہوا ہے۔ اس میں حالیہ قوانین اور ان کی رو سے دی جانے والی سزاؤں کے متعلق بھی ایک سوال پوچھا گیا۔۔۔ وہ سوال اور صدر محترم کی طرف سے اس کا جواب درج ذیل ہے۔

سوال : مغرب میں بعض لوگ مسلمانوں کو وحشی سمجھتے ہیں۔ مثلاً" ان کے لئے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دینا کس طرح عدل انسانی کہلا سکے گا؟

جواب : یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام تعذیب (PUNISHMENT) کے مقابلہ میں تخویف (DETERRENCY) پر زیادہ زور دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں جو ان (نام نہاد) سنگین سزاؤں (مثلاً" ہاتھ کاٹ دینا یا ہاتھ اور پاؤں کاٹ دینا یا سنگسار کردینا) کے پیچھے کار فرما ہے' تو آپ دیکھیں گے کہ اس قانون شہادت کی رو سے جس کا نفاذ کیا جا رہا ہے' ایک فی ہزار مجرموں کو بھی یہ سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔ اسلام' صرف سزائیں مقرر نہیں کرتا' وہ پہلے یہ بھی متعین کرتا ہے کہ جو شخص ایسے مقدمات کے فیصلے کرے گا وہ کس قسم کا ہے۔ ان ججوں یا قاضیوں کے لئے جو اس قسم کے مقدمات کی سماعت کریں گے' بڑی کڑی شرطیں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جس کی میرت اور کردار کے خلاف انگشت نمائی نہ کی جاسکے۔ اسے انتہائی دیانتدار ہونا چاہئے۔ اسے اچھا مسلمان ہونا چاہئے۔ اسے کسی کے خلاف تعصب نہیں ہونا چاہئے (یعنی اسے انتہائی غیر جانبدار ہونا چاہئے)۔ یہ تو رہیں اس جج کی خصوصیات جو ایسے مقدمات کی سماعت کرے گا۔ جہاں تک ان شہادات کا تعلق ہے جو اثبات جرم کے لئے پیش کی جائیں' تو ان کے بارے میں بھی ایسی کڑی شرائط عائد کی گئی ہیں جن کی رو سے کسی ایسے شخص کا مجرم قرار پا جانا ناممکن ہوگا جس کے ارتکاب جرم کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہ ہو۔ مثلاً" گواہ کو عینی شاہد ہونا چاہئے۔ وہ ایسا شخص ہونا چاہئے جس نے ہمیشہ سچ بولا ہو' جس کا کیریکٹر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو۔ نیز اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ملزم سے یہ جرم پہلی بار صادر ہوا ہے' تو متعلقہ عدالت سزا کے تعین میں

اس کا خاص خیال رکھے گی۔ اکثر احادیث نبویؐ میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جب اس قسم کے جرائم کا مقدمہ سامنے آئے جو قطع ید وغیرہ سزاؤں کے مستوجب ہوں' تو کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی ایسا عذر مل جائے جس کی روشنی میں نرم سزا دی جاسکے خواہ اس میں تھوڑا سا شک بھی کیوں نہ ہو (یعنی ذرا سے شک کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہئے)۔

سوال : اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ان سزاؤں کا بنیادی مقصد تخویف ہے۔

جواب : یہ ٹھیک ہے' بنیادی مقصد تخویف ہی ہے۔ ان سزاؤں کے سلسلہ میں یہ وہ اہم پہلو ہے جس کے نظرانداز کرنے سے اہل مغرب کو غلط فہمی لاحق ہوجاتی ہے۔ وہ اسے بھول جاتے ہیں کہ قانون شہادت' ججوں کی تعیناتی' گواہوں کے متعلق شرائط' (یعنی) وہ پورے کا پورا ضابطہ جس کی رو سے کسی ملزم کے مجرم یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا' ایسا سخت ہے کہ ایک ہزار میں سے بمشکل ایک مقدمہ ایسا ہوگا جس میں یہ انتہائی سزائیں دی جاسکیں گی۔

اس سلسلے میں ہم اتنا گزارش کرنا ہی مناسب سمجھتے ہیں کہ حالیہ قوانین کو ان شرائط کے پورا ہو جانے کے بعد نافذ کیا جانا چاہئے تھا۔ ضمناً ان قوانین میں مجرم کے انفرادی حالات یا جرم اول کی صورت میں سزا کی تخفیف کا بھی کوئی ذکر نہیں۔

ان قوانین کو نافذ کرتے وقت صدر محترم نے فرمایا تھا کہ انہیں مختلف فرقوں نے متفقہ طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ اس سے ہمیں دلی خوشی ہوئی تھی کہ یہ چیز وحدت قانون اور اس کے بعد وحدت امت ..... کے حق میں بڑا نیک شگون ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ہمیں ہزار برس میں بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کی فرقہ وارانہ مخالفت شروع ہوگئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں شیعہ حضرات کے نمائندہ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ جب کونسل میں یہ قوانین پیش ہوئے تو انہوں نے ان کی بعض جزئیات سے اختلاف کیا تھا لیکن انہیں اس کے باوجود کثرت رائے سے پاس کردیا گیا۔ اس کے بعد شیعہ حضرات کی مختلف جماعتوں کی طرف سے اس قسم کے بیانات شائع ہو رہے ہیں کہ ان قوانین کی رو سے فقہ جعفریہ پر اکثریت کی فقہ یعنی ---- فقہ حنفی---- کو مسلط کیا جا رہا ہے جسے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی طرف سے یہ احتجاج نیا نہیں۔ انہوں نے بہت پہلے ایسا کہہ دیا تھا۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ نہایت مختصر الفاظ میں اس کا پس منظر قارئین کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔

تشکیل پاکستان کے بعد پہلا سوال یہ اٹھا' یا اٹھایا گیا کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔ ہم نے کہا کہ اس کی وضاحت کردی جائے کہ اسلامی قوانین کی بنیاد کیا ہوگی۔ اکتیس علماء کے ایک اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ شخصی

قوانین تو ہر فرقے کے الگ الگ ہوں گے لیکن پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔ ہم نے کہا کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرلیں۔ بات بالکل واضح تھی۔ جسے "کتاب و سنت" کہا جاتا ہے' وہ درحقیقت ہر فرقہ کی اپنی اپنی فقہ ہوتی ہے جسے بدلنے یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کے لئے کوئی فرقہ تیار نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ ہوا کہ پبلک لاز کا فی الواقع کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جو ان سب کے نزدیک اسلامی کہلاسکے۔ اس سے گریز کی راہ یہ تراشی گئی کہ طلوع اسلام کے متعلق مشہور کردیا گیا کہ یہ منکر سنت ہے تاکہ لوگ اس کی بات نہ سننے پائیں۔ بیس برس تک یہ پراپیگنڈہ بھی جاری رہا اور ملک میں کوئی ضابطہ قوانین بھی نہ بن سکا۔ بالاخر ۱۹۷۰ء میں' مودودی (مرحوم) کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی رو سے فی الواقع پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اس پر سوال اٹھا کہ پھر پبلک لاز مدون کیسے کئے جائیں۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ چونکہ ملک میں اکثریت حنفیوں کی ہے' اس لئے یہاں حنفی فقہ رائج کردی جائے۔ اس کے خلاف اہل حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔

شیعہ حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ہم پر اکثریت کی فقہ کو مسلط کیا گیا تو "ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی"۔ ان خدشات کے پیش نظر ہم نے اس موضوع پر طلوع اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ایک مبسوط مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "اسلامی مملکت کا خواب جو کثرت تعبیر سے پریشان ہوگیا"۔ اس مقالہ کا پمفلٹ بھی شائع کیا گیا جسے کثیر تعداد میں ملک میں تقسیم کیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ یہ ملک (خدانکردہ) خانہ جنگی کا شکار نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ ملکوں کی تقدیر کے لئے سیاسی اختلافات اتنے زیادہ خطرناک نہیں ہوتے جتنے خطرناک مذہبی اختلافات ہوتے ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں' اس حقیقت کا ایک بار پھر اعادہ کردینا ضروری ہے کہ ہمارا تعلق کسی فرقے سے نہیں۔ اس لئے ہم نہ کسی فرقے کی فقہ کے خلاف ہیں نہ کسی کے حق میں۔ ان فقہوں میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے (وہ کسی فرقہ کی فقہ میں ہو) ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں' جو اس کے خلاف ہو اسے غلط۔ لیکن مودودی (مرحوم) کا اس فقہ حنفی کے متعلق کیا عقیدہ تھا جسے ملک میں نافذ کرنے کی انہوں نے تجویز پیش کی تھی' اسے مختصر الفاظ میں واضح کردینا ضروری ہے۔ انہوں نے اس کے متعلق لکھا تھا:۔

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے' جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہد گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن' بابت محرم ۱۳۶۰ھ)

دوسری جگہ لکھا تھا:

امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں-- یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کرلیا گیا ہے- یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں-

(رسائل و مسائل' حصہ اول' ص۷۵-۲۷۴)

اس سوال کے جواب میں کہ کیا فقہی احکام ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہوتے ہیں' انہوں نے کہا تھا:-

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے- نبی کی بصیرت براہ راست علم الٰہی سے مستاد ہوتی ہے' اس لئے اس کے احکام تمام از منہ و احوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں- مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو' زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا' نہ اس کی نظر تمام از منہ و احوال پر وسیع ہوسکتی ہے- لہٰذا' اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے-

(تفہیمات' حصہ دوم' ص۴۲۶)

مسلک کا مدار آئمہ فقہ کی تقلید پر ہے- اس کے متعلق مودودی مرحوم نے کہا تھا:-

میرے نزدیک ایک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے-

(رسائل و مسائل' حصہ اول' ص۲۴۴)

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جب ۱۹۷۰ء میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ملک میں حنفی فقہ رائج کردی جائے تو اس کے خلاف اہل حدیث اور شیعہ حضرات نے شدت سے احتجاج کیا تھا- اس کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کی تدوین یا نفاذ کا سوال سامنے نہ آیا- اب پہلی بار ان قوانین کو اسلای قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے اور ان کے خلاف سردست شیعہ حضرات نے اپنے اسی احتجاج کا اعادہ کیا ہے جسے انہوں نے ۱۹۷۰ء میں بلند کیا تھا- شیعہ مطالبات کمیٹی کے جائنٹ سیکرٹری کی طرف سے شائع کردہ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ:

اہل تشیع کے نزدیک فقہ جعفریہ ہی نظام مصطفیٰؐ ہے- اس لئے ہم موجودہ اعلانات کو حقیقی معنوں میں نظام مصطفیٰؐ کا نفاذ نہیں سمجھتے اور موجودہ حالات میں اہل تشیع بجا طور پر فکر مند ہیں- انہوں نے شیعہ مطالبات کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کرلیا ہے جو اپریل کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا-

(بحوالہ روزنامہ مساوات' مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۷۹ء)

اس طرح ان اختلافات کا آغاز ہو رہا ہے- ابھی چار پانچ قوانین ہی نافذ ہوئے ہیں اور وہ بھی ایسے جن کا تعلق حدود

(سزاؤں) سے ہے۔ ان میں اختلاف کی زیادہ صورت نہیں ہوتی۔ مزید قوانین نافذ ہونے کے بعد نمعلوم کس کس قسم کے اختلافات نمودار ہوں؟

فقہی اختلافات کے علاوہ' ان قوانین کے عملی اطلاق کے وقت بہت سے جزئیاتی اختلافات بھی سامنے آئیں گے۔ حکومت کی طرف سے شریعت بنچوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جن کا منصب یہ ہے کہ جس قانون کے متعلق کوئی پاکستانی شہری یہ سمجھے کہ وہ کتاب و سنت کے خلاف ہے' وہ اس کے لئے شریعت بنچ کی طرف رجوع کرے۔ وہ بنچ فیصلہ کرے گا کہ وہ قانون کتاب و سنت کے خلاف ہے یا نہیں۔ خلاف ہونے کی صورت میں اس قانون کو کالعدم قرار دیا جاسکے گا یا اس میں ضروری ترمیم و تنسیخ کردی جائے گی۔ جن حضرات' افراد یا اداروں کو حالیہ قوانین سے اختلاف ہو' ہم ان سے گزارش کریں گے کہ ایسے اختلافات کو بحث و نزاع کا موضوع بنانے کے بجائے وہ شریعت بنچ کی طرف رجوع کریں تاکہ ملک میں کسی قسم کا انتشار پیدا نہ ہو۔ انہیں اس کا یقیناً" علم و احساس ہوگا کہ ملک میں تشکیل پاکستان کے وقت سے ایسے عناصر چلے آرہے ہیں (خواہ وہ ملک کے اندر ہوں اور خواہ بیرون ملک) جو یہاں مسلسل انتشار پیدا کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو انتشار مذہب کے نام پر پیدا کیا جائے' اس کے نتائج بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہر بہی خواہ پاکستانی کی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ مملکت کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا

(فروری ۱۹۷۹ء)

۷۔ فتاویٰ عالمگیری میں شرعی سزائیں

وطن عزیز میں جب بھی اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے تو فتاویٰ عالمگیری کا نام اکثر سننے میں آتا ہے۔ ہمارے علماء کا ایک طبقہ جہاں یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اسلامی قانون کو زمانہ جدید کے تقاضوں کے مطابق مدون کیا جائے' وہاں ایک دوسرے طبقے کی طرف سے اس مطالبے کی مخالفت کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں اسلامی قانون پہلے ہی سے مدون شکل میں موجود ہے۔ بس ایک سرکاری چٹھی کے ذریعے ملک میں اسے نافذ کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑا اہم مجموعہ قوانین ہوگا۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قارئین کو اس سے متعارف کرایا جائے۔

مغل بادشاہ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کہ جن کے نام سے یہ مجموعہ منسوب ہے' خود شریعت کے بہت بڑے عالم تھے۔ اپنی مملکت میں اسلامی قانون نافذ کرنے کے لئے آپ نے حنفی فقہ' کہ جس کے وہ پیرو تھے' کی تمام معتبر کتابوں کا دقت نظر سے مطالعہ کیا۔ لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ ان میں سے کون سی کتاب ہندوستانی مسلم معاشرے کی

ضروریات پوری کرسکے گی۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے لئے ایک نیا مجموعہ قوانین مرتب کرایا جائے۔ چنانچہ مملکت کے مختلف حصوں سے آپ نے کوئی پانچ صد جید فقہا کو جمع کیا اور یہ خدمت ان کے سپرد کی۔ ان علماء نے کافی محنت کے بعد یہ مجموعہ تیار کرکے سلطان کی خدمت میں پیش کردیا' جسے ایک حکم کے ذریعے مملکت میں نافذ کردیا گیا۔

اس مجموعے نے' اس دور کی' جس میں اسے مدون کیا گیا تھا' ضروریات کو پورا کردیا ہوگا' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کو بھی پورا کرسکے گا۔ اس مقصد کے لئے اس پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قانون کے نفاذ کی ابتداء کرنے کے سلسلے میں یہ اعلان کیا جاچکا ہے کہ مستقبل قریب میں شرعی حدود کو نافذ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوگا کہ ہم اس مجموعے کے مطالعے کو صرف اسی موضوع تک محدود رکھیں۔ اسلامی حدود وہ سزائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں مقرر فرما دی ہیں۔ اس لئے ان کی یہ اصطلاحی تعریف بیان کی جاتی ہے کہ کسی انسان حتی کہ اللہ کے رسولؐ کو بھی ان میں رد و بدل کا اختیار نہیں۔ یہ حدود مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ چوری کی سزا۔

۲۔ زنا کی سزا۔

۳۔ زنا کی تہمت (قذف) کی سزا۔ اور

۴۔ شاہراہوں پر ڈاکے ڈالنے یا بغاوت کی مختلف سزائیں۔

سلطان اورنگ زیب عالم گیرؒ نہایت پارسا قسم کا انسان تھا' لیکن چونکہ یہ مجموعہ دور ملوکیت میں تیار کیا گیا تھا اس لئے اپنے ماحول سے اس کا متاثر ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ مذکورہ بالا شرعی حدود کہ جن میں اصطلاحی طور پر اللہ کے رسولؐ کو بھی رد و بدل کرنے کی اجازت نہ تھی' فقہاء نے مسلمان بادشاہوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دے دیا کہ اگر ان سے مذکورہ بالا جرائم سرزد ہو جائیں تو ان پر شرعی حدود نافذ نہ کی جائیں۔ فتاویٰ عالمگیریؒ میں اس مقصد کے لئے یہ قانون بنایا گیا:۔

ایسے امام المسلمین نے جس کے اوپر امام نہیں' اگر ایسی بات کی جس سے حد واجب ہوتی ہے' جیسے زنا و سرقہ و شراب خوری و قذف' تو اس سے مواخذہ نہ کیا جائے (فتاویٰ عالمگیری اردو جلد سوم' صفحہ ۳۴۱ شائع کردہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور)۔ فقہ میں امام سے مراد مسلمان حکمران ہوتا ہے۔ کیا ہمارے علماء آج کل کے مسلمان حکمرانوں کو یہ حقوق دینے کو تیار ہیں؟

اصل فتاویٰ عالمگیری عربی زبان میں ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لئے راقم نے اردو ایڈیشن کا حوالہ دیا ہے جو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن چھ ہزار صفحات کی دس جلدوں پر مشتمل

ہے۔

اب ہم مختلف شرعی حدود کو لیتے ہیں کہ ان کے نفاذ کے لئے فتاویٰ عالمگیری میں کیا تفاصیل ملتی ہیں۔

۱۔ ہاتھ کاٹنے کی سزا

اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ رزق حلال پر قناعت کریں اور کسی دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے حاصل نہ کریں۔ آج کل ان ناجائز طریقوں نے مختلف صورتیں اختیار کرلی ہیں لیکن زمانہ قدیم میں چوری اس کی سب سے بڑی صورت تھی۔ اسلام نے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے اس کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا مقرر کی۔ لیکن فتاویٰ عالمگیری میں اس جرم کو ثابت کرنے کے لئے جن کڑی شرائط کو ضروری قرار دیا گیا ہے' اس کے بعد ایسی کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ جس میں ہاتھ کاٹنے کی نوبت آئے۔ چوری کا جرم دو طریقوں سے ثابت ہوسکتا ہے۔ ایک چور کے اپنے اقرار سے اور دوسرے گواہوں کی گواہی سے۔ اگر چور خود اقرار کرے تو اسے' حد سے بچانے کے لئے مسلمان حکمران پر لازم قرار دیا گیا کہ وہ اسے تلقین کرے کہ وہ چوری کا اقرار نہ کرے (ص۳۸۹) یعنی اپنے اقرار سے پھر جائے تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ اور اگر چوری کا اقرار کرکے بھاگ جائے تو کبھی اس کا پیچھا نہ کیا جائے نہ فی الفور' نہ بعد (ص۳۹۳)۔ پھر گواہوں کی گواہی کے نتیجے میں چوری ثابت ہو جانے کے باوجود' مندرجہ ذیل صورتوں میں ہاتھ کاٹنے کی حد نافذ نہ ہوگی۔

جلانے کی لکڑی' گھاس' نرکل اور مچھلی کی چوری (ص۳۹۸) دودھ' گوشت اور تازہ پھلوں کی چوری' (ص۳۹۹) نمک کی چوری' (ص۴۰۰)۔ آلات موسیقی اور مختلف علوم کی کتابوں کی چوری(ص۴۰۱)۔ سونے چاندی کی صلیب یا بت کی چوری (ص۴۰۲)۔ چاندی کے برتن کی چوری جن میں کھانے پینے کی چیزیں ہوں (ص۴۰۳)۔ سونے کے زیورات پہنے ہوئے بچے کی چوری (ص۴۰۴)۔اگر کسی مرد یا عورت سے دغا بازی کرکے مال لے لیا' یا لوٹ لیا' یا اچک کر لے بھاگا' تو اس پر ہاتھ کاٹنا نہیں آتا اور کفن چور پر بھی ہاتھ کاٹنا نہیں آیا ص(۴۰۴)۔ اسی طرح اگر چور کے پاس سے کسی دوسرے چور نے مال چوری کرلیا تو چور اول اور مالک میں سے کسی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ دوسرے چور کا ہاتھ کاٹے (ص۴۰۵)۔ بیت المال (سرکاری خزانے) سے چوری میں ہاتھ نہیں کٹے گا (ص۴۰۵)۔ اگر کوئی شخص دارالحرب سے امن حاصل کرکے دارالاسلام میں آگیا تو اس کے مال کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۰۶)۔ اگر کسی کو مکان میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی' پھر اس نے اجازت سے داخل ہو کر کوئی چیز چرائی تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص ۴۰۸)۔اور اگر اونٹ کو راستہ سے مع اس کے بوجھ کے چرالیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح اگر جوال یعنی تھیلے کو چرالیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔اگر اسی تھیلے کو چاک کرکے اس میں سے مال نکال لیا تو پھر ہاتھ کاٹا جائے گا (ص۴۰۸)۔ اگر کسی نے قطار میں سے اونٹ چرالیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص ۴۰۸)۔ اگر

کسی نے کسی مکان کو نقب لگائی یعنی دیوار توڑی اور اندر والے چور نے مال' اس نقب والی جگہ پر رکھ دیا جسے اس کے باہر والے ساتھی نے اٹھالیا تو دونوں میں سے کسی کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے (ص۴۰۹)۔ چور ایک گدھے کو لے کر ایک مکان میں داخل ہوا اور کپڑے جمع کرکے گدھے پر لاد کر مکان سے باہر آیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ پھر اس کے بعد گدھا وہاں سے نکل کر اس کے گھر آگیا تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص۴۱۰)۔ اگر چور نے کسی گھر کو نقب لگا کر اس میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز لے لی تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۱۰)۔ اگر آستین کے باہر لٹکتی ہوئی تھیلی کو کاٹ کر درہم لے لئے تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔ ہاں! آستین میں ہاتھ ڈال کر تھیلی کو چاک کرکے درہم لے لئے تو ہاتھ کاٹا جائے گا (ص۴۱۱)۔ اگر قفل توڑنے والے نے دن میں بند دروازہ کھول لیا اور اس گھر میں کوئی نہیں اور سامان چوری کرلیا تو اس چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (ص۴۱۱)۔ اگر چراگاہ سے کوئی بکری یا گائے یا اونٹ چرالیا تو اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے گا (۴۱۲)۔ اگر کسی نے ماں باپ اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے گھر سے ان کا یا اگر ان کے پاس کسی دوسرے کا مال پڑا ہو' اس کو چرالیا تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا (ص۴۱۲)۔

یہ ہیں چند تفصیلات' سرقہ کے جرم کی سزا کے سلسلہ میں۔ جن تفاصیل کا ذکر غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق تھا' ان کے نقل کرنے سے مجھے کراہت سی محسوس ہوتی تھی' اس لئے انہیں دانستہ قلم زد کردیا گیا ہے۔ خیال رہے کہ اگر ہماری فقہ کی کتابوں سے غلاموں اور لونڈیوں کے مسائل خارج کردیئے جائیں تو ان کی ضخامت نصف سے بھی کم رہ جائے۔ چوری کے بارے میں ان تفصیلات پر اگر نظر ڈالی جائے تو شاید ہی کوئی صورت ایسی باقی رہ جائے جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جاسکے۔

۲۔ زنا کی سزا

زنا ایک سخت قبیح فعل ہے۔ جس معاشرے میں اس کا رواج پڑ جائے وہ جلد ہی تباہی کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے اس برائی کو ختم کرنے کے لئے قرآن حکیم نے اس کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے' لیکن فتاویٰ عالمگیری میں' چوری کی سزا کی طرح' اس بارے میں بھی جرم کے ثبوت کے لئے کچھ ایسی شرائط عائد کی گئی ہیں جن سے شرعی سزا کے نفاذ کی نوبت شاذ و نادر ہی آسکتی ہے۔ یہ جرم بھی دو طرح سے ثابت ہوتا ہے' ایک مجرم کے اپنے اقرار سے' اور دوسرے گواہوں کی گواہی سے۔ اب اگر مجرم خود اقرار کرلے تو اسے تلقین کی جائے گی کہ وہ اپنے اقرار سے پھر جائے تاکہ وہ اس حد سے بچ سکے (ص۳۲۳)۔ یا اگر مرد نے زنا کا اقرار کیا لیکن عورت نے انکار کردیا' یا عورت نے اقرار کیا اور مرد نے انکار کردیا تو (امام رحمتہ اللہ کے نزدیک) دونوں میں سے کسی پر حد واجب نہ ہوگی (ص۳۲۲)۔ کسی عورت سے متعہ کا وقتی نکاح کیا اور مرد جانتا تھا کہ اسلام میں یہ نکاح حرام ہے' لیکن اس کے باوجود اس نے یہ وقتی نکاح کرکے اس عورت سے مباشرت کی تو پھر بھی حد واجب نہ ہوگی (ص۳۳۴)۔ اگر بلا گواہوں کے کسی عورت سے نکاح کیا یا بلا ولی کے عورت سے نکاح کیا تو بالاتفاق اس پر حد واجب نہ ہوگی (ص۳۳۴)۔ اگر چھوٹی

نابالغ بچی سے زنا کیا تو زانی پر حد نہ ہوگی۔ اس پر اس لڑکی کا مہر واجب ہوگا (ص۳۳۷)۔ اگر عورت کسی سوتے ہوئے مرد کے بستر میں گھس گئی اور مرد کو اپنے نفس پر قابو دے دیا تو دونوں میں سے کسی پر حد شرعی واجب نہ ہوگی (ص۳۳۷)۔ اگر کسی عورت سے لواطت کی یا فرج کے سوا کسی اور جگہ زنا کیا یا کسی لڑکے سے لواطت کی' تو (امام اعظم کے نزدیک) حد لازم نہیں آئے گی' نہ اس کو تعزیر دی جائے گی اور قید میں ڈالا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے (ص۳۳۹)۔ تعزیر کی حد تین سے ۳۹ کوڑے ہیں جو حاکم کی صوابدید پر منحصر ہیں۔ چار مردوں نے ایک شخص پر زنا کی گواہی دی جن میں سے دو گواہوں نے کہا کہ اس مرد نے اس عورت سے زبردستی زنا کیا ہے جبکہ دوسرے دو گواہوں نے کہا کہ اس عورت نے خود اسے ترغیب دی تھی' تو امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ حد ان سب سے دور کردی جائے گی (ص۳۴۴)۔

۳۔ حد قذف

قذف یہ ہے کہ کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگائی جائے تو اس جھوٹے گواہ پر حد قائم کی جاتی ہے جو اسی کوڑے مقرر ہے۔ چنانچہ گواہوں پر اس قسم کی جرح ہوتی تھی کہ کسی کو گواہی دینے کی جرات ہی نہ ہوتی' بلکہ اکثر زانی تو زنا کی حد سے بچ جاتے لیکن گواہ اس سزا سے نہیں بچ سکتے تھے۔ اس کی وضاحت کے لئے صرف ایک مثال کا نقل کرنا کافی ہے۔

زنا کا جرم ثابت کرنے کے لئے چار چشم دید گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر چار گواہوں میں سے تین نے کسی مرد کے خلاف اس کے زنا کے جرم کے بارے میں گواہی دی اور چوتھے گواہ نے بھی ان کی تائید کردی' لیکن الفاظ میں صرف یہ کہا کہ اس نے مجرم مرد اور عورت دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا تھا' تو زنا کار مرد پر تو حد جاری نہ ہوگی لیکن پہلے تینوں گواہوں پر حد قذف نافذ کی جائے گی' یعنی انہیں اسی اسی کوڑے مارے جائیں گے (ص۳۴۲)۔

سوچئے کہ اس قسم کے فیصلوں کے بعد کسے گواہی دینے کی جرات ہوسکتی تھی؟

۴۔ شراب نوشی کی سزا

شراب نوشی کی سزا قرآن مجید میں تو مذکور نہیں لیکن فقہ میں اسے بھی حدود میں شمار کیا گیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں بھی فتاوٰی عالمگیری میں مذکورہ بالا اسلوب کو اپناتے ہوئے اس جرم کے ثبوت کے لئے ایسی شرائط ضروری قرار دی گئی ہیں کہ پہلے جرائم کی طرح اس میں بھی شرعی حد کے نفاذ کی نوبت نہیں آتی۔ مثلاً" حرام شراب کو صرف دو جنسوں یعنی انگور اور کھجور تک محدود کیا گیا ہے۔ باقی ہر قسم کی شراب کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ چھوہارے و انگور' تر و خشک وغیرہ سے جو شرابیں بنائی جاتی ہیں' اگر ان کے پینے سے بے ہوش ہی کیوں نہ ہو جائے تو اس کو حد نہ ماری جائے گی (ص۳۶۲)۔ اور جو شراب کہ حبوب و فواکہ مثل گیہوں و جوار اور آلو بخارا وغیرہ سے بنائی جاتی ہے' جب تک وہ شیریں ہوں تو ان کا پینا حلال ہے۔

اس سلسلے میں زیادہ تفصیلات نقل کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور انہی پر بس کرتا ہوں' جو عام قارئین کے غور و فکر کے لئے کافی ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں وہ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کیا فتاویٰ عالمگیری ہمارے جدید زمانے کی ضروریات پورا کرسکتا ہے یا ہمیں بھی سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کی طرح ایک نیا مجموعہ قوانین مرتب کرنا ہوگا۔
(پروفیسر رفیع اللہ شہاب) (فروری ۱۹۷۹ء)

۸۔ اورنگ زیبؒ عالمگیر اور شرعی سزائیں

برصغیر ہند و پاک کے مسلم دور حکومت کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جملہ مسلمان بادشاہوں کی بہ نسبت اورنگ زیب عالمگیرؒ نے شرعی حدود کو سختی سے نافذ کیا تھا۔ اس تصور کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان موصوف نے اپنے وقت کے پانچ صد جید علماء کو جمع کرکے حنفی فقہ کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین کرائی تھی۔ یہ کوشش فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی' جس کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے اسے اسلامی ہند کے طول و عرض میں نافذ کردیا تھا۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے دور حکومت میں جو متعدد فرامین جاری کئے تھے ان کا پورا ریکارڈ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس لئے راقم کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ فتاویٰ عالمگیری کو نافذ کرنے والے فرمان کی اصل عبارت کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ فرمان تو مجھے کہیں سے بھی نہ مل سکا' البتہ اس کوشش کے دوران شرعی حدود کے نفاذ کے بارے میں ان کے کچھ دوسرے فرامین نظر سے گزرے جن سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئی کہ سلطان موصوف شرعی احکامات کے نفاذ کے سلسلے میں فقہ کی کتابوں میں متعین کردہ شرعی سزاؤں کے بجائے قرآن مجید پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔ یہ بات تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ سلطان موصوف کو مملکت کے انتظام و انصرام کے بعد جو تھوڑا بہت وقت ملتا تھا وہ اسے قرآن کریم کی خدمت میں صرف کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کے فرامین پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب مقدس پر غور و فکر بھی کرتے رہتے تھے اور فقہ کے مقابلے میں جن قرآنی احکامات کے بارے میں ان کا اطمینان ہو جاتا تھا' انہیں نافذ بھی کردیتے تھے۔ اس کی وضاحت کے لئے ہم چوری کی سزا نافذ کرنے کے بارے میں ان کا ایک فرمان قارئین تک پہنچانے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

یہ تو معلوم ہے کہ فقہ کی کتابوں میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بیان کی گئی ہے۔ یہ علحدہ بات ہے کہ "ہاتھ" کی شرعی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں انگلیوں سے لے کر بازو تک "ید" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں اکثر فقہا کے نزدیک پہنچے سے ہاتھ کاٹا جانا چاہئے' خوارج پورا بازو کاٹنے کا مشورہ دیتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام نخعیؒ' امام ابن شبرمہؒ' امام ابن ابی لیلیٰؒ' خواجہ حسن البصریؒ اور حضرت عمرؓ صرف پانچ انگلیوں کے کاٹنے کو کافی سمجھتے تھے (نیل الاوطار' جلد ہفتم' ص ۱۳۳)۔اور فقہ جعفریہ کا یہ مشہور

مسئلہ ہے کہ صرف چار انگلیاں ہی کاٹی جانی چاہئیں۔ لیکن سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنی مملکت میں چوری کی جو سزا نافذ کی وہ ان سب سے مختلف تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو فرمان جاری کیا اس کے اصل الفاظ یہ ہیں :۔

اول شخصے کہ بر او سرقہ نزد قاضی بہ ثبوت شرعی برسد' بہ اقرار یا بہ بینہ شرائط اقامت حد نمودہ' محبوس سازد' تا اثر توبہ دزدی ظاہر شود۔

(نقل فرمان عدالت' عنوان مشتمل برسی وسہ فصل' فرمان اورنگ زیب عالمگیر' بحوالہ مرات احمدی' جزو اول' مصنفہ مرزا محمد محسن' مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۸ء' صفحہ ۲۷۸)

(ترجمہ) ایسا شخص جس پر شرعی ثبوت کے ذریعے قاضی کے نزدیک چوری کا جرم ثابت ہو جائے' چاہے اس کے اپنے اقرار سے یا اقامت حد کے لئے جو شرائط ہیں ان کی شہادت کے ذریعے' تو اسے قید کردیا جائے یہاں تک کہ وہ چوری سے توبہ کرلے۔

آج سے چالیس سال پہلے ہمارے علمی رسائل میں اس موضوع پر بحث چلی تھی جس میں کسی نے امام ابو مسلمؒ اصفہانی کے حوالے سے بیان کیا تھا کہ قرآن میں چوری کی سزا قید مقرر کی گئی ہے اور شریعت ابراہیمی کے ایک نبی' حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان چوری کی سزا کے سلسلے میں اس کا بیان ہوا ہے۔ جب ان کے چھوٹے بھائی کی بوری سے سرکاری پیالہ برآمد ہوا جس کی چوری کے شبہ میں ان کے مال کی تلاشی لی گئی تھی' تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے ان کی شریعت میں چوری کی سزا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:۔

قالوا جزاوہ من وجد فی رحلہ فھو جزاوہ کذ لک نجزی الظلمین

(سورۃ الیوسف : آیت ۷۵)

انہوں نے کہا کہ جس کی بوری سے یہ (پیمانہ) ملے' یعنی اس پر چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو وہی اس کی سزا ہے۔ اس طرح ہماری شریعت میں ظالموں کو سزا دی جاتی ہے۔

ابو مسلم کی چودہ جلدوں میں قرآنی تفسیر کو تو مخالفین نے ضائع کردیا تھا' لیکن ان کے جو اقوال دوسری تفاسیر میں کہیں نہ کہیں نقل ہوچکے ہیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں سرمایہ بصیرت ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے پانچ صد جید علماء سے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرانے کے باوجود اس کتاب میں درج شدہ چوری کی سزا نافذ کرنے کے بجائے' اس جرم کی وہ سزا نافذ کی جو ان کے خیال کے مطابق قرآن سے ثابت ہوتی تھی۔ اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان پانچ صد جید علماء میں سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ موجودہ دور کے علماء کے لئے اس میں غور و فکر کا کافی سامان ہے۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

۹۔ رجم (سنگسار) کی سزا

پاکستان میں حال ہی میں جو چند فقہی قوانین نافذ کئے گئے ہیں' (انہیں شرعی حدود کہہ کر پکارا جاتا ہے) ان کی رو سے جرم زنا کی سزا کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اگر مجرم غیر شادی شدہ ہوں تو انہیں سو سو کوڑے مارے جائیں اور اگر وہ شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں رجم کہا جاتا ہے' یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کردینا۔ ہم نے طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۹ء میں ان قوانین کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قرآن مجید میں جرم زنا کی سزا صرف کوڑے مقرر کی گئی ہے' بلا تخصیص اس امر کے کہ مجرم شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ۔ اس میں رجم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا' یہ سزا قرآن مجید کے خلاف ہے۔ ہم نے اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی' اس لئے کہ جب یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں بات قرآن مجید کی نص صریح کے خلاف ہے تو اس کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس استفسارات آرہے ہیں جن میں کہا جاتا ہے کہ اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس سزا کا ثبوت روایات سے ملتا ہے۔ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہمارے نزدیک جو روایت قرآن مجید کے خلاف ہو اس کی نسبت رسولؐ اللہ کی طرف کی ہی نہیں جاسکتی۔ اس کے متعلق بلا تامل کہہ دینا چاہئے کہ وہ وضعی ہے۔ رسولؐ اللہ نے ایسا ہرگز نہیں فرمایا ہوگا' کیونکہ حضورؐ کا کوئی قول یا فعل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

کوئی دو سال ادھر کی بات ہے' جرم زنا کی سزا کے عنوان سے' محترم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک مقالہ (طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۷ء میں) شائع ہوا تھا۔ وہ قدرے مفصل تھا' ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ مستفسرین کے تقاضوں کے پیش نظر اسے دوبارہ شائع کردیا جائے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب پاکستان میں اس قانون کے نفاذ کا سوال بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ لہٰذا' اس وقت اس مقالہ کی حیثیت نظری اور تحقیقاتی تھی۔ لیکن اب اس کی افادیت کم ہونے کی بجائے اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

قرآن حکیم کا یہ انداز ہے کہ اس نے چند احکام تو متعین طور پر دیئے ہیں اور زندگی کے دیگر معاملات کے متعلق اصول اور اقدار عطا کئے ہیں۔ جس کتاب عظیم کو تمام اقوام عالم اور تمام زمانوں کے لئے ضابطہ رہنمائی بننا تھا' اس کا یہی اسلوب ہونا چاہئے تھا۔ لیکن احکام ہوں یا اصول' اس نے تکمیل دین کے اعلان کے ساتھ واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :۔

وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلمته (۶/۱۱۶)

تیرے رب کی تمام باتیں صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں۔ اب ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔

اس کے ساتھ' اس کی بھی وضاحت کردی کہ یہ کتاب انسانی رہنمائی کے لئے کافی ہے' اس لئے اس میں کسی اضافہ کی

بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتب یتلی علیھم (۲۹/۵۱)

کیا یہ ان کے لئے کافی نہیں کہ خدا نے تیری طرف یہ کتاب نازل کردی جو ان کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔

۲ - قرآن مجید میں جو احکام متعین طور پر دیئے گئے ہیں ان میں چار جرائم کی سزائیں بھی شامل ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں ان سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے۔ وہ جرائم ہیں' زنا (جس میں ناحق تہمت تراشی بھی شامل ہے) سرقہ' قتل اور بغاوت۔ اس وقت ہمارے پیش نظران میں سے زنا کی سزا ہے۔ اس کے متعلق قرآن مجید میں واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ :-

الزانیتہ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائتہ جلدۃ ولا تاخذکم بھما رافتہ فی دین اللہ ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ولیشھد عذابھما طائفتہ من المومنین (۲/۲۴)

زانی مرد اور زانیہ عورت میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔ اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو قانون خداوندی کے نفاذ میں کسی قسم کی نرمی مت برتو۔ اور یہ سزا اس طرح دو کہ مومنین کی ایک جماعت وہاں موجود ہو۔

قرآن مجید میں یہی ایک مقام ہے جہاں زنا کی سزا کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ حکم متعین طور پر دیا گیا ہے اس لئے کسی دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت کی ضرورت لاحق نہ ہوئی۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ قرآن تمہارے لئے کافی ہے۔ جب تک صدر اول میں قرآنی نظام نافذ رہا' حسبنا کتاب اللہ' مملکت اسلامی کا دستور رہا' لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہا تو پھر یہ تصور پیدا کیا گیا کہ انسانی رہنمائی کے لئے قرآن کافی نہیں' اس میں حک و اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں زنا کی سزا کے متعلق کہا گیا کہ قرآن میں متعین کردہ سزا غیر شادی شدہ کے لئے ہے۔ شادہ شدہ زانی اور زانیہ کی سزا رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر امت میں یہ خیال ابھرا ہوگا کہ ایسا اہم حکم خود قرآن کریم میں کیوں نہ دیا گیا۔ یہ تو قرآن پر اضافہ ہے۔ اب بجائے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جاتا کہ واقعی قرآن پر اضافہ ہے' کہا یہ گیا کہ نہیں' یہ حکم خود قرآن میں موجود تھا لیکن جو قرآن امت کے پاس ہے' اس میں یہ آیت نہیں رہی۔ یہ ایسا "عذر گناہ" تھا جس پر زمین لرز جاتی' آسمان پھٹ پڑتا۔ لیکن اس عقیدہ کے وضع کرنے والوں کے دل میں ذرا سی لرزش بھی پیدا نہ ہوئی اور انہوں نے اس کی تائید میں روایات وضع کرلیں۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ سے یہ روایت بیان کی گئی۔

عن زر بن جیش' قال قال لی ابی بن کعب کاین تعد سورۃ الاحزاب قلت اثنین و سبعین ایتہ او ثلاثتہ و سبعین ایہ قال ان کانت لتعدی

سورة البقرة کنا لنقراء فیها ایته الرجم قلت وما ایه الرجم------؟
قال اذا زنیا الشیخ والشیخته فارجموهما البته نکالا من الله والله
عزیز حکیم- (الاتقان فی علوم' جلد دوم' ص۲۵)

حضرت زر بن جیش سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ سورۂ احزاب میں کتنی آیات تھیں؟ میں نے کہا کہ یہی ۷۲-۷۳ (جو سورۂ احزاب میں موجود ہیں)- انہوں نے کہا کہ نہیں' سورۂ احزاب میں سورۂ بقرہ جتنی آیات تھیں (یعنی ۲۸۶ تا قل)- ان میں سے ایک آیہ رجم بھی تھی جس کی ہم تلاوت کیا کرتے تھے- میں نے پوچھا کہ آیہ رجم کیا تھی؟ فرمایا کہ جب بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں سنگسار کرکے ختم کردیا جائے- یہ اس اللہ کی طرف سے سزا مقرر ہے جو غلبہ اور حکمت والا ہے-

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ اس روایت میں الفاظ الشیخ والشیخہ آئے ہیں- عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ ان کے معنی ہیں بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت- لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ان سے مراد ہیں شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت- عربی زبان میں یہ الفاظ ان معانی میں کہیں نہیں آئے- لیکن ان واضعین روایت نے تو زانیوں کو دو قسموں میں منقسم کرنا تھا- اس لئے سورۂ النور کی آیت میں جو الفاظ ---الزانیته والزانی ---- آئے ہیں' ان کے معنے کئے گئے "غیر شادی شدہ عورت اور غیر شادی شدہ مرد" اور اس کے بالمقابل الشیخ والشیخته کے معنی کئے گئے "شادی شدہ مرد اور شادی شد. عورت"-

اس روایت میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے- کہا یہ گیا ہے کہ سورۂ احزاب میں سورۃ بقرہ جتنی آیات تھیں' یعنی ۲۸۶ آیات- قرآن مجید میں سورۂ احزاب کی کل آیات ۷۳ ہیں- سوال یہ ہے کہ بقایا ۲۱۳ آیات کا کیا ہوا؟---- وہ کہاں چلی گئیں؟ ان میں سے ایک آیت کے متعلق جو رجم سے متعلق تھی' انہوں نے تحقیق کرلی- غور سے سنئے کہ وہ تحقیق کیا تھی- سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک مستند کتاب ہے) کہا گیا ہے کہ جب قرآن کریم مرتب کیا جانے لگا تو صحابہ کرامؓ کو دو آیتیں کہیں نہ مل سکیں- ایک آیت رجم سے متعلق تھی' اور دوسری رضاعت سے متعلق- چنانچہ وہ ان آیات کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے' تو انہوں نے فرمایا کہ :-

آیہ رجم اور آیہ رضاعت کبیر ایک صحیفہ میں تھیں جو میرے تخت کے نیچے تھا- جب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ہم لوگ اس حادثہ میں مشغول ہوگئے-
اتنے میں گھر کی پالتو بکری اندر گھس گئی اور اس صحیفہ کو کھاگئی-

لہٰذا' ان دونوں آیات کا دنیا میں وجود ہی باقی نہ رہا- لیکن (روایات کی رو سے) اس کے باوجود صحابہؓ کو اس پر اصرار تھا کہ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ہم آیہ رجم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور ایسا کہنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے-

لوگوں نے آپ سے کہا (غالباً" اس زمانہ میں جب وہ برسر اقتدار آئے) کہ جب آپ خود کہتے ہیں کہ آپ بھی اس آیت کی' رسول اللہ کے زمانے میں تلاوت کیا کرتے تھے' تو آپ اسے قرآن کریم میں درج کیوں نہیں کردیتے؟ آپ کا جواب ملاحظہ فرمایئے :-

وقال عمرؓ لولا ان یقول الناس زاد عمرؓ فی کتاب اللہ لاثبتہ فی المصحف

(تفسیر کبیر' امام رازی' نیا ایڈیشن' جلد ۳۲' ص۱۳۴)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس آیت کو قرآن میں ضرور درج کر دیتا' لیکن ڈرتا ہوں کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے خواہ مخواہ قرآن مجید میں اضافہ کردیا۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر خدا کے اس حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ہم اس آیت کو قرآن میں تو درج نہیں کریں گے' لیکن تعمیل اس کی کرتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ موجود ہے کہ

(۱) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن حکیم میں تو موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہوچکا ہے۔ وہ صرف تلاوت کے لئے رہ گئی ہیں اور

(۲) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن حکیم میں تو موجود نہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے' جیسے آیہ رجم۔

آپ نے غور فرمایا کہ رجم (سنگساری) کا حکم کس طرح قرآن مجید سے ثابت کیا گیا؟ اس پر تو آپ غور کریں یا نہ کریں' لیکن اس پر ضرور غور کیجئے گا کہ اس کے بعد خود خدا کی کتاب کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اہل حدیث ہوں یا اہل فقہ' قرآن حکیم کی اس حیثیت پر سب متفق ہیں۔

یہ تو رہا رجم کا حکم۔ اس کے بعد اس کی حکمت بھی بیان کی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ ایسا کرنا عین مطابق فطرت ہے۔ ہمارے ہاں احادیث کے چھ مجموعوں کو صحیح قرار دیا جاتا ہے اور ان میں بخاری کا مجموعہ سرفہرست ہے---- اس موضوع پر بخاری کی دو ایک روایات ملاحظہ فرمایئے۔

عن عمرو بن میمون قال رایت فی الجاھلیتہ قردۃ اجتمع علیھا قرودقد زنت فرجموھا فرجمت معھم۔

(صحیح بخاری' باب ایام الجاہلیتہ)

حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی ہیں) کہ زمانہ جاہلیت میں' میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا۵ کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہوگئے

۵۔ حیوانات کے متعلق زنا کا تصور پیش کرنا' ان وضعی روایات ہی کا حصہ ہے۔

اور اسے سنگسار کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔

اس روایت میں تو اس واقعہ کو اجمالاً" بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجر عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے۔

عن عمرو بن میمون قال کنت فی الیمن فی غنم لا علی وانا علی شرف۔ فجاء قردبع قردة۔ فتو سدیدها فجاء قردا اصغر منه۔ فغمزها۔ فسلت یدها من راس القرد سلا رقیقا۔ فتبعته فوقع علیه وانا انظر۔ ثم رجعت و جعلت تدخل یدها تحت قرد اول برفق۔ فاستقظ فزعا۔ فشمها۔ فصاح فاجتمعت القرود فجعل یصح ویوحی الیها یده فذهب القرودیمنته ویسرة فجاوا بذلک القردا عرفه فحفورا لها حفرة فرجموهما

(فتح الباری، شرح صحیح بخاری از ابن حجر عسقلانی، جلد ہفتم، ص۱۲۱)

حضرت عمر بن مامون فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سوگیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً" کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کردی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہوگئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر ادھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لئے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کردیا۔ (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے)۔

یہ ہے اس سزا کی تائید میں فطرت کی گواہی جسے ان روایات کی رو سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

کہا یہ جاتا ہے کہ کسی زانی یا زانیہ کو رجم کی سزا دیجئے اور پھر دیکھئے کہ معاشرہ سے زنا جیسا فعل شنیع کس طرح

ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم کہہ نہیں سکتے کہ اس سے اس جرم کا ارتکاب ختم ہو جائے گا یا نہیں۔ قرآن کریم میں جرم قتل کی سزا موت مقرر کی گئی ہے اور یہی سزا ہمارے مروجہ قانون کی رو سے بھی قاتل کو دی جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود، قتل کی وارداتوں کا ختم ہو جانا تو ایک طرف، ان میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض سزا دینے سے جرم رک نہیں جاتا۔ جرائم کے سدباب کے لئے افراد کے قلب و نگاہ کی تطہیر اور معاشرے کے اجتماعی نظام کی اصلاح ضروری ہوتی ہے۔ بہرحال، یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ کہا یہ جاتا ہے کہ زنا کی یہ سزا دی جائے تو اس جرم کا سدباب ہو جائے گا۔ لیکن جرم کی سزا تو اسی صورت میں مل سکے گی جب جرم ثابت ہو جائے۔ ہماری فقہ نے اس جرم کے اثبات کے لئے ایسی شرائط عائد کی ہیں، جن کی رو سے اس جرم کا ثابت ہونا ناممکنات میں سے ہے[۶]۔ مثلاً" فقہ حنفی کی معتبر ترین کتاب ہدایہ شریف میں ہے:-

(۱) من زنی فی دار الحرب او فی دار البغی ثم خرج الینا لا یقام علیہ الحد

(ہدایہ مجیدی اولین، صفحہ ۴۹۳)

جس نے دارالحرب یا باغیوں کے علاقے میں جرم زنا کا ارتکاب کیا اور پھر دارالاسلام میں آگیا، تو اس پر کوئی حد نہیں۔

وضاحت کے لئے بطور مثال یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص واہگہ پار کے کھیت میں زناکاری کے بعد پھر پاکستان کی طرف آجائے، تو اسے اس جرم کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ اب آگے چلئے۔

(۲) ومن اقر اربع مرات فی مجالس مختلفۃ انہ زنی بفلانۃ وقالت ھی تزوجتنی۔ او اذا اقرت بالزناء وقال الرجل تزوجھا فلا حد علیھا و علیہ المھر۔ (ایضاً")

اگر کوئی شخص (کسی ایک جگہ نہیں) چار مختلف مجالس میں، (اور ایک ہی بار نہیں) چار دفعہ اقرار کرے کہ اس نے فلاں عورت سے زنا کیا ہے لیکن عورت کہے کہ نہیں، اس نے مجھ سے (پہلے) نکاح کرلیا تھا یا اسی طرح کوئی عورت ارتکاب زنا کا اقرار کرے لیکن مرد کہے کہ نہیں، میں نے اس سے نکاح کرلیا تھا، تو نہ اس مرد کو سزا دی جائے گی اور نہ اس عورت کو۔ البتہ اس مرد کے لئے ضروری ہوگا کہ اس عورت کو مہر کے پیسے ادا کردے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ بات کہاں تک پہنچ رہی ہے؟ ان قوانین کی رو سے نہ صرف یہ کہ زنا جیسے جرم کے ارتکاب

۶۔ "شرعی حدود" کے نفاذ کے بعد خود صدر مملکت نے فرمایا تھا کہ جن شرائط سے یہ جرائم مشروط ہیں ان کے پیش نظر شاید ہی کسی کو شرعی سزا مل سکے۔ (طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۷۹ء)

کا نہ کوئی سدباب سوچا گیا ہے بلکہ اس کے لئے پھاٹک کھول دیئے گئے ہیں۔

اور اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ اگر یہ زنا کار خود اس جرم کے ارتکاب کا اعتراف نہ کریں تو پھر عدالت کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ تحقیق کرے کہ اس جرم کا ارتکاب ہوا تھا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات شہادات (گواہیوں) کی رو سے ہی طے ہوسکے گی۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس شہادت کے لئے کیا کیا شرائط عائد کی گئی ہیں---- امام ابن رشد فرماتے ہیں:

وان من وصفهم ان تكون علو لا وان من شرط هذه الشهادة ان تكون المعانيه فرجها و انها تكون بالتصريح لا بالكنايه

(بدایہ المجتہد' جلد دوم' مطبوعہ مصر' ص۴۳۰)

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ گواہ عدل کی صفت سے متصف ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہوں' یعنی انہوں نے بچشم خود اس فعل کو صادر ہوتے دیکھا ہو۔ اور اس کے بعد اسے اشاروں کنایوں سے بیان نہ کریں بلکہ پوری صراحت سے بیان کریں۷۔

آپ سوچئے کہ کیا کوئی مرد اور عورت اس فعل کے مرتکب ایسی صورت میں ہوسکتے ہیں کہ ایک نہیں چار چار شخص اس کی ساری جزئیات تک کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ حیوانات کے جنسی اختلاط میں تو یہ چیز ممکن ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی بے حیا سے بے حیا تک کوئی قوم یا گروہ ایسا نہیں ملے گا جو ناجائز تو ایک طرف' اس جائز عمل کا ارتکاب بھی اس بے حیائی کے ساتھ کرے۔ فرمایئے! کیا اس جرم کے اثبات کے لئے اس قسم کے چار گواہ مل سکیں گے؟

اور اگر بفرض محال ایسے چار گواہ مل بھی جائیں' لیکن ان کی گواہی کی جزئیات میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے' حتی کہ اگر دو گواہ زنا بالجبر کی شہادت دیں اور دو گواہ یہ کہہ دیں کہ نہیں اس عورت نے اس مرد کو اپنی طرف مائل کیا تھا تو اس صورت میں بھی یہ جرم ثابت نہیں ہوسکے گا۔ ہدایہ میں یہ تمام تفاصیل موجود ہیں۔

ہماری فقہ کی کتابوں میں جنسیات کے متعلق اس کثرت اور تفصیل کے ساتھ مسائل درج ہوتے ہیں کہ کوئی سلیم الطبع انسان انہیں پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اور یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان طالب علموں کو جو نوجوان بھی ہوتے ہیں اور (بالعموم) غیر شادی شدہ بھی۔ جن مقامات میں لونڈیوں کا ذکر آتا ہے وہاں یہ تفاصیل فحاشی کی ہر حد کو پھاند جاتی ہیں۔ ہم

۷۔ حیا مانع ہے کہ ہم ان الفاظ کا اردو ترجمہ پیش کریں۔ امام ابن رشد نے تو پھر بھی قدرے محتاط انداز میں بات کی ہے۔ دیگر فقہا نے اس کی جزئیات تک کو جس صراحت سے بیان کیا ہے' ان کے ترجمے سے ان صفحات کو مکدر کرنے کی تو ہم جرات نہیں کرسکتے۔

لیکن حالیہ نافذ کردہ قوانین میں اس کی صراحت کی گئی ہے کہ شہادت کے سچے ہونے کی شرط یہ ہے کہ چاروں گواہوں نے "عمل دخول" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ (طلوع اسلام مارچ ۱۹۷۹ء)

اپنے دل پر جبر کرکے یہاں دو ایک مثالیں پیش کریں گے۔ ہدایہ مجیدی اولین' ص۴۸۹ پر لکھا ہے کہ "اگر کوئی "من چلا" اپنے بیٹے یا پوتے کی لونڈی سے زنا کا ارتکاب کرلے اور یہ بھی کہے کہ اسے اس کا علم تھا کہ ایسا کرنا شرعاً" حرام ہے' اس کے باوجود اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی"۔ دوسری مثال تو خود ہدایہ ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے

ومن وطی اجنبیۃ فیما دون الفرج یعزر

(ایضاً' صفحہ ۴۹۰)

اگر کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ' شرمگاہ کے علاوہ کہیں اور اختلاط کرلے تو اسے جرم زنا کی سزا تو نہیں دی جائے گی' البتہ کوئی اور چھوٹی موٹی سزا دی جاسکتی ہے۔

پھر حیا مانع ہے ورنہ ہم بتاتے کہ "کسی دوسری جگہ اختلاط" کی تفاصیل میں ہماری کتب فقہ میں کیا کیا کچھ کہا گیا ہے اور ہمارے بڑے بڑے ائمہ نے ناواقف عورت تو ایک طرف' خود اپنی بیوی کے سلسلے میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ تفصیل کے لئے حافظ ابن حجر عسقلانی کی شرح بخاری (فتح الباری) کے علاوہ علامہ عینی کی شرح (عمدۃ القاری) میں دیکھئے کہ اس باب میں اور تو اور' امام مالکؒ تک کا کیا مسلک بیان کیا گیا ہے۔ (یہ بحث ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقام حدیث" میں دی گئی ہے)۔

یہ ہے رجم کی سزا کے متعلق اس حکم کا اجمالی سا تعارف جسے نافذ کرنے سے' کہا جاتا ہے کہ' مملکت اسلامی بن جائے گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں نے اس باب میں اپنی طرف سے ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ ہر بات مستند کتب احادیث اور کتب فقہ کے حوالوں سے لکھی گئی ہے۔

یہ ہیں چند ایک مثالیں ان احکام کی جنہیں "احکام شریعت" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (ستمبر۱۹۷۹ء)

۱۰۔ اسلامی قوانین کی تفاصیل میں اختلاف

(فرقہ اہل حدیث کے مطالبات)

فرقہ اہل حدیث کے ترجمان' الاسلام (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت (۱۴) اپریل ۱۹۷۸ء میں' حکومت سے کچھ مطالبات پیش کئے ہیں۔ "رضائے مصطفیٰؐ" (گوجرانوالہ) نے اپنی اشاعت بابت مئی ۱۹۷۸ء میں دہرا کر ان کی سخت مخالفت کی ہے۔ "رضائے مصطفیٰؐ" کے نام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ جریدہ' بریلوی فرقہ کا ترجمان ہے جس کے مشہور نمائندہ (مولانا) نورانی ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں (یعنی فرقہ اہل حدیث اور بریلوی فرقہ کے نمائندگان) جو (منجملہ دیگر علماء) مملکت پاکستان کے لئے ایک متفق علیہ اسلامی قوانین کا ضابطہ مرتب کرنے کے ذمہ دار تصور کئے جاتے ہیں۔ آپ ان مطالبات اور ان کی مخالفت پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر سوچئے کہ ان حضرات سے اسلامی قوانین مرتب کرنے کی توقعات وابستہ کرنے سے' قوم اپنے آپ کو کتنے بڑے فریب میں مبتلا رکھ رہی ہے۔ مطالبات حسب ذیل ہیں :-

۱۔ بے نماز کافر ہیں۔ انہیں کوڑوں اور جرمانہ کی سزا دی جاوے۔
۲۔ قبر پرستی' بت پرستی سے بڑا شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو سزا ملنی چاہئے۔
۳۔ قبروں پر نذر نیاز' چڑھاوے حرام ہیں۔ انہیں قانوناً" بند کردیا جائے۔
۴۔ عرسوں کو سنگین جرم قرار دیا جائے۔ عرس' قتل اور زنا سے سخت تر گناہ ہے۔
۵۔ پختہ قبریں گرا دی جائیں اور ایسے لوگوں کو قید کی سزا دی جائے۔
۶۔ میلاد' گیارھویں شریف اور صلوٰۃ قبل اذان کو خلاف قانون قرار دے کر کوڑوں کی سزا دی جائے۔
۷۔ تقلید پر عمل پیرا مقلدین آئمہ کو سزائے موت دی جائے۔

(اگست ۱۹۷۸ء)

۱۱۔ ان قوانین کی سند کیا ہے؟

ہم سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ملک میں اسلام کے نام سے جو کچھ کہا اور کیا جاتا ہے اس سے قوم میں وحدت فکر و عمل پیدا ہونے کے بجائے تشتت و انتشار کیوں بڑھ جاتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور گہرے غور و فکر کا متقاضی۔ اسے دو ایک مثالوں سے سمجھئے۔ آپ دس ہزار کے مجمع میں بھی جب "پانی" کا لفظ بولتے ہیں تو ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو نہ سمجھے کہ آپ نے کیا کہا ہے یا باقی لوگوں سے کچھ مختلف سمجھے۔ یا مثلاً" جب آپ "مثلث" کہتے ہیں تو ریاضی کا ہر طالب علم سمجھ جاتا ہے کہ آپ کا مطلب کیا ہے اور کوئی دو طالب علم بھی ایسے نہیں ہوتے جنہیں اس کے مفہوم میں اختلاف ہو۔ یہ اس لئے کہ ان الفاظ کے معانی متعین ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب آپ اسلام' اسلامی نظام یا شریعت کے الفاظ بولتے ہیں تو کیا ان کا بھی کوئی متعین مفہوم آپ کے ذہن میں آتا ہے؟ اور اگر آتا ہے تو کیا تمام افراد امت کے ذہن میں ان کا وہی مفہوم ہوتا ہے؟ ایسا قطعاً" نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کا یا تو کوئی متعین مفہوم ذہن میں نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو ہر شخص کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرقہ سے منسلک افراد کے ذہن میں ان کا کم و بیش ایک ہی مفہوم ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر' یہ اسلام' اسلامی نظام یا شریعت کا فرقے وارانہ مفہوم ہوتا ہے' ان کا حقیقی مفہوم نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے جو ان الفاظ سے وحدت فکر و عمل پیدا ہونے کے بجائے تشتت اور انتشار میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حالیہ "قوانین حدود" کو لے لیجئے۔ انہیں اسلامی قوانین کہہ کر ملک میں نافذ کیا گیا لیکن قدم اول پر ہی ایک فرقہ (شیعہ) نے کہہ دیا کہ یہ فقہ حنفی پر مبنی قوانین ہیں جنہیں ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تو ان قوانین کی قسط اول کی صورت میں ہوا ہے۔ آپ دیکھئے گا کہ ان کی مزید قسطیں نافذ ہونے پر یہ اختلافات کس قدر بڑھ جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کے قوانین کو اسلامی کہنا ہی غلط ہے۔ اسلامی قوانین وہ ہوں گے جنہیں تمام امت اسلامی تسلیم کرے اور اس طرح ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں

ہو۔ لیکن کسی ایک فرقہ کی فقہ کو پبلک لاز کا ضابطہ قرار دے کر اسے اسلامی قوانین کی حیثیت سے' تمام فرقوں پر نافذ کرنا' ملک میں مستقل نزاع کا دروازہ کھول دے گا اور اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے' ظاہر ہیں۔ اسی دشواری کے پیش نظر ہم نے ہمیشہ یہ مشورہ دیا ہے کہ بجائے اس کے کہ آپ یہ کہیں کہ اسلام نے یہ کہا ہے' شریعت کا یہ فیصلہ ہے' آپ متعین طور پر کہئے کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے' فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ اس سے بات متعین اور واضح ہو جائے گی اور اسلام یا شریعت کے متعلق نہ کوئی ابہام پیدا ہوگا' نہ غلط فہمی۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ طلوع اسلام' اسلامی نظام' اسلامی احکام' شرعی قوانین کے بجائے قرآنی نظام' قرآنی احکام اور قرآنی قوانین کیوں کہتا ہے۔ قرآن ایک واحد' متعین' منفرد کتاب ہے۔ "قرآن" کے لفظ سے' کتاب اللہ کے سوا کسی کے ذہن میں کچھ اور آ ہی نہیں سکتا۔ اور جب ہم اس کے ساتھ اس کی سورت اور آیت کا حوالہ بھی دے دیتے ہیں' تو ہر شخص پرکھ سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ صدر اول میں "اسلامی" سے مراد تھی وہ بات (فیصلہ۔ حکم۔ قانون) جو قرآن کے مطابق ہو۔ یہی وجہ تھی کہ امت میں اختلاف پیدا نہیں ہوتا تھا۔ (فروری ۱۹۷۹ء)

۱۲۔ کوڑوں کی سزا

(کوڑا کس قسم کا ہونا چاہئے)

ہمارے ہاں آج کل کوڑوں کی جو سزا دی جاتی ہے' اس میں کوڑوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر' کڑیل جوان بھی پانچ سات کوڑوں سے زیادہ کی تاب نہیں لاسکتے اور اکثر و بیشتر بے ہوش ہو جاتے ہیں اور ڈاکٹری مشورہ کے مطابق ان کے باقی ماندہ کوڑوں کو منسوخ کردینا پڑتا ہے اور ان کے زخموں کے مندمل ہونے میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ پچھلے ماہ اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ سعودی عرب میں (جہاں جرائم کی "اسلامی سزائیں" دی جاتی ہیں) بعض برطانوی باشندوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

> لندن' ۱۵ جون (رائٹر)۔ شراب کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سعودی عرب میں مزید دو برطانوی باشندوں کو سرعام کوڑے لگائے گئے اور سزائے قید دی گئی ہے۔ ان دو برطانوی باشندوں کو سزائے قید اور کوڑوں کی سزا کا انکشاف برطانوی دفتر خارجہ نے کیا ہے۔ اس سے پہلے جن دو باشندوں کو شراب تقسیم کرنے پر سرعام کوڑے لگائے گئے تھے برطانیہ واپس چلے گئے ہیں۔ میڈمنٹ اور کوپر کو ستر ستر کوڑے لگائے گئے تھے اور چھ چھ ماہ سزائے قید دی گئی تھی۔ میڈمنٹ اور کوپر نے ہیتھ رو کے ہوائی اڈے پر بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تاہم انہوں نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ جن دو مزید افراد کو

سزائے قید اور کوڑے لگائے گئے ہیں ان میں ۲۰ سالہ پیرسن اور ۵۰ سالہ پیڈی والش ہیں اور دونوں امریکی فرم لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کارپوریشن کے ملازم ہیں۔ پیرسن کو دو سو کوڑے اور دو سال قید اور پیڈی کو ڈیڑھ سو کوڑے اور اٹھارہ ماہ قید کی سزا دی گئی۔
(نوائے وقت ۷۸-۶-۱۶)

معلوم نہیں کہ وہاں کوڑے کس قسم کے ہوتے ہیں کہ پچاس پچاس سالہ بوڑھے' ڈیڑھ ڈیڑھ' دو دو سو کوڑے کھا کر بھی ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس کی متعینہ تفصیل بتاسکیں تو طلوع اسلام ان کا شکر گزار ہوگا۔
(اگست ۱۹۷۸ء)

۱۳۔ کوڑوں کی وضاحت

(فقہی تحقیق)

قرآن مجید میں کوڑے کے لئے "جلدۃ" کا لفظ آیا ہے جو اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مجرم کو کسی ایسی چیز سے سزا دی جائے جس کا اثر صرف اس کی کھال تک محدود رہے۔ اسلامی فقہ کی تفصیلات کے مطابق اگر کوڑے لگانے سے مجرم کے کسی حصے کا گوشت اڑ گیا' یا کھال پھٹ گئی' یا زخم کھال کے اندر تک پہنچ گیا تو ایسی سزا جائز نہیں ہوتی۔ چنانچہ حفظ ماتقدم کے طور پر ایسے طریقے اختیار کئے جاتے تھے جن سے اس قسم کے زخم وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تھی۔

دور نبویؐ میں تو جرائم کی تعداد بڑی محدود تھی اور شاذ و نادر ہی کوڑوں کی سزا تک نوبت پہنچتی تھی۔ اس لئے اس دور میں کوئی مخصوص قسم کا کوڑا تیار نہیں کیا گیا تھا۔ جب کوئی مجرم پکڑا جاتا تو اسے جوتوں یا کھجور کی چھال سے سزا دی جاتی۔ قاضی ابوبکر جصاص دور نبویؐ کی سزا کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

کان من ضرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالجرید والنعال

(احکام القرآن' جلد سوم' ص۲۶۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوڑے مارنے کا کام جوتوں یا کھجور کی چھال سے لیا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ دور نبویؐ میں چمڑے سے بنے ہوئے کوڑے سے سزا دینے کا رواج نہیں تھا۔ یہی صورت حالات حضرت ابوبکرؓ کے دور میں رہی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں اس مقصد کے لئے مخصوص کوڑا تیار کرایا تھا جس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

اتی عمر بسوط فیہ شدۃ فقال ارید الین من ھذا۔ فاتی بسوط فیہ لین۔

فقال اريد اشد من هذا فاتی بسوط بين السوطين فقال اضرب- ولا يری ابطلک واعط کل عفرحقه (ایضاً' ص۲۶۱)

حضرت عمرؓ کے پاس ایک کوڑا لایا گیا جو بہت سخت تھا- آپؓ نے فرمایا' اس سے ذرا نرم ہونا چاہئے- اس پر آپ کے پاس دوسرا کوڑا لایا گیا جو پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ نرم تھا- آپ نے فرمایا کہ مجھے اس سے ذرا سخت چاہئے- چنانچہ آپ کے پاس ان دونوں کوڑوں کے درمیانی معیار کا کوڑا لایا گیا تو آپ نے مارنے والے سے فرمایا کہ اس سے اس طرح ضرب لگائی جائے کہ تیری بغل (ARMPIT) نظر نہ آئے- اور پھر یہ کہ یہ کوڑے جسم کے ہر حصے پر لگائے جائیں-

خیال رہے کہ کوڑوں کی سزا وہ اہل علم صحابہؓ دیتے تھے جنہیں شرعی احکامات و اصول کا پورا پورا علم ہوتا تھا- اور پھر یہ کہ یہ سزا کپڑے اتار کر نہیں بلکہ موسم کے مطابق مجرم نے جو کپڑے پہن رکھے ہوتے تھے' ان کو اتارے بغیر دی جاتی تھی' بلکہ اگر کوئی مجرم خود بھی کپڑے اتارنا چاہتا تو اسے کپڑے اتارنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی-

حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح سے روایت ہے :-

ان ابا عبيدة بن الجراح اتی برجل فی حد فذهب الرجل ينزع قميصه وقال ينبغی لجسدی هذا المذهب ان يضرب وليس عليه قميص- فقال ابو عبيدة لا تدعوه تنزع قميصه فضربه عليه (ایضاً'' ص۲۶۲)

حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کے پاس شرعی سزا کا ایک مجرم لایا گیا تو اس نے اپنی قمیض اتارنی شروع کردی اور کہنے لگا کہ اس گنہگار جسم کو اس حالت میں کوڑے پڑنے چاہئیں کہ اس پر قمیض نہ ہو- لیکن حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا کہ اسے قمیض نہ اتارنے دو- پس اسے قمیض کے اوپر کوڑے مارے گئے-

یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جلد کو زخمی ہونے سے بچانے کے لئے مجرم کو بھیڑ یا بکری کی کھال پہنا دی جاتی تھی' تاکہ کوڑوں کا اثر جلد کے اندر تک نہ پہنچنے پائے- حضرت سعد بن ابراہیم سے روایت ہے:-

ولقد حدثنی ابی انه ام کلثوم امرت بشاة فسلخت حين جلد ابوبکر فالبسه مسکها- فهل کان ذالک الا من ضرب شديد (ایضاً''' ص۲۶۰)

مجھ سے میرے باپ نے روایت بیان کی کہ ان کی والدہ ام کلثوم نے ایک بھیڑ ذبح کرنے کو کہا- اور جب ابوبکرہ کو کوڑے لگائے گئے تو وہ کھال انہیں پہنا دی' تو کیا یہ ضرب شدید سے بچنے کے لئے نہ تھا (دوسری روایت میں ضرب خفیف آیا ہے)-

(پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

عینی شاہد کی روئداد

گزشتہ سال مجھے چند ماہ سعودی عرب کے ایک شہر "الخرج" میں گزارنے کا موقع ملا جہاں میں نے ایک بار کوڑوں کی سزا کے نفاذ کا منظر بھی دیکھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سو' دو سو کوڑے بیک وقت نہیں لگائے جاتے' بلکہ چالیس چالیس کوڑے ایک وقت میں لگاتے ہیں۔ یہ سزا نماز جمعہ کے بعد جامع مسجد کے باہر میدان میں دی جاتی ہے۔ ایک سو کوڑے سزا ہو تو چار ہفتوں میں پوری کی جاتی ہے۔

اس روز دو مجرموں کو سزا دی گئی جن میں سے ایک پاکستانی اور ایک سعودی تھا۔ نماز جمعہ کے بعد لوگ میدان میں حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ پہلے پاکستانی کو زمین پر منہ کے بل لٹا دیا گیا۔ دونوں ہاتھ سر سے اوپر آگے کر رکھے تھے۔ ایک قاضی کا نمائندہ اور ایک اور افسر سرہانے کھڑے ہوگئے اور دو پولیس کے سپاہی ہاتھوں میں بید کی چھڑیاں لئے مجرم کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ بید کی چھڑی تقریباً" چار فٹ لمبی ہوگی۔ مجرم کے کپڑے نہیں اتروائے گئے تھے۔ دونوں سپاہیوں نے کھڑے کھڑے' باری باری' بید مارنے شروع کردیئے۔ بید مارتے وقت نہ تو انہوں نے گھٹنے جھکائے اور نہ کوئی زور لگایا۔ میرا خیال ہے کہ ۳۰ کوڑے لگانے میں انہیں ۳۰ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ مجرم کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی طرح سعودی بھی چالیس کوڑے کھا کر اٹھ گیا اور دونوں پولیس کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ ان میں سے نہ کسی کا کپڑا پھٹا اور نہ ہی کسی ضرب پر ان کے منہ سے آہ نکلی۔

تو محترمی! یہ ہے سعودی عرب میں کوڑوں کی سزا۔۔۔۔ میرا خیال ہے دوسرے شہروں میں بھی یونہی کوڑے لگائے جاتے ہوں گے۔

طلوع اسلام

کوڑوں کے متعلق ہماری الجھن اس لئے تھی کہ قرآن کریم نے زانی اور زانیہ کی سزا سو سو کوڑے (جلد) تجویز کی ہے اور جھوٹی تہمت لگانے والے کی اسی کوڑے۔ ہم سوچتے تھے کہ جب (یہاں کے) پانچ سات کوڑوں سے مجرم کی یہ حالت ہوجاتی ہے تو اسی یا سو کوڑوں سے تو اس کا قیمہ ہو جائے گا۔ قرآن کریم کا یہ مقصد نہیں ہوسکتا۔ کوڑوں کی زیر نظر وضاحت سے بات صاف ہوگئی کہ کوڑوں سے مقصد مجرم کو مضروب کرنا نہیں بلکہ اس کے اندر احساس ندامت کا بیدار کرنا ہے۔

ویسے' جلدۃ کی جملہ تفاصیل کا تعین' قرآنی مملکت کرے گی۔ کیونکہ خود قرآن نے اس کی تفاصیل متعین نہیں کیں۔ (ستمبر ۱۹۷۸ء)

۱۴۔ فقہ کی کتاب الحیل

(قوانین سے بچنے کی تدابیر)

ہمارے زمانے میں نظام سرمایہ داری کے خلاف جو نفرت پھیلی تو اس کی سب سے بڑی زد سود پر پڑی۔ اس سے ہماری مذہبی پیشوائیت بلبلا اٹھی۔ آپ پوچھیں گے کہ مذہبی پیشوائیت کا سود سے کیا تعلق جو اس پر زد پڑنے سے یہ حضرات بلبلا اٹھے ہیں؟ لیکن بات صاف اور سیدھی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا سارا دار و مدار سرمایہ داروں کے سہاروں پر ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی ضروریات' ان کی نام نہاد "دینی خدمات" ان کی مذہب کے لبادوں میں لپٹی ہوئی سیاسی تحریکات' سب سرمایہ داروں کے سہارے چلتی ہیں۔ اس لئے سرمایہ داروں پر کسی قسم کی زد پڑنے سے ان کا پریشان ہو جانا لازی ہے۔ یہ وجہ ہے جو یہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ سود کا اقتصادی نظام مٹنے نہ پائے۔ مثلاً" بلاسود بینکاری کے سلسلے میں مودودی صاحب نے یہ تدبیر بتائی ہے۔

> روپیہ جمع کرانے والوں کو سود دینے کے بجائے' بینک ایسے اقتصادی منصوبے تیار کریں گے جنکے منافع میں روپیہ جمع کرانے والے' برابر کے حق دار ہوں۔ گر۔
>
> (ایشیاء' ۵ نومبر ۱۹۷۸ء)

یعنی ہینگ' اس وقت جو کچھ سود کے نام سے دیتے ہیں اسے منافع کہہ دیا جائے تو یہ حلال و طیب ہو جائے گا۔

یہ تو رہا کاروباری سلسلے کا سود۔ جو لوگ انفرادی طور پر' اپنی احتیاج سے مجبور ہو کر' دوسروں سے قرض لیتے ہیں اور وہ سود کی شرط پر قرض دیتے ہیں ان کے لئے اس گناہ سے بچنے کے لئے بھی تدابیر بتائی جا رہی ہیں۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ فقہ کی کتابوں میں پہلے تو شرعی احکام درج ہوتے ہیں اور آخر میں ایک باب میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ان احکام سے بچ نکلنے کی کیا تدابیر ہیں۔ اسے "کتاب الحیل" کہا جاتا ہے یعنی EVASION کی تدابیر۔

ہمارے سامنے ایک کتاب آئی ہے جس کا نام ہے "معاشیات نظام مصطفیٰ"۔ مصنف ہیں' مفتی محمد ابو سعید غلام سرور قادری' ایم اے اسلامک لاء ہمارے پیش نظر اس کتاب پر تبصرہ نہیں۔ ہم صرف اس کے "باب الحیل" کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں پہلے سود کے خلاف اسلامی احکامات کا ذکر ہے اور اس کے بعد سود سے بچنے کی تدابیر درج ہیں۔ انہیں آپ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

پہلی تدبیر

ایک شخص کسی کو دس روپے قرض دے کر اس سے دو روپے زائد لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دو روپے سود ہوں گے۔ لیکن اس جرم اور گناہ سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ قرض دینے والا' قرض لینے والے کی کوئی چیز دس روپے میں نقد خرید لے اور اسے قرض لینے والے کے ہاتھ مدت معینہ کے لئے بارہ روپے میں ادھار بیچ دے۔ اس مدت کے بعد قرض لینے والا' قرض دینے والے کو بارہ روپے ادا کردے۔ اس فقہی حیلہ سے یہ زائد دو روپے حلال و طیب قرار

پا جائیں گے۔

دوسری تدبیر

قرض دینے والا اپنی کوئی چیز ایک سو دس روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ ایک سو روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس چیز کو اس شخص سے سو روپے میں خرید لے۔ اس طرح وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض لینے والے کے ذمے ایک سو دس روپے واجب الادا ہو گئے۔

تیسری تدبیر

قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز دو سو روپے میں ادھار بیچ دے۔ پھر اسے اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا معینہ مدت کے بعد اس شے کی قیمت کے طور پر اسے دو سو روپیہ ادا کردے گا۔ اس طرح اسے ایک سو روپیہ زائد مل جائے گا جو بالکل حلال اور طیب ہوگا۔

چوتھی تدبیر

قرض دینے والا کوئی چیز ایک مدت معینہ کے لئے بیس روپے میں ادھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اسے کسی اور کے پاس پندرہ روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس سے وہ چیز پندرہ روپے میں خرید لے۔ مدت معینہ کے بعد قرض لینے والا اسے بیس روپے واپس ادا کردے گا۔ قرض دینے والے کو اپنی چیز بھی مل گئی اور پانچ روپے "رزق حلال" کے طور پر زائد بھی۔۔۔۔ اس طرح' رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔۔۔۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ امام ابو یوسف علیہ الرحمتہ ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

> اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لئے ملے گا کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔ (بحوالہ فتاوٰی قاضی خان مع عالم گیری' جلد دوم' ص ۲۷۹-۲۸۰ مصری)

ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد اس کتاب کے مصنف فرماتے ہیں کہ ان تدابیر کی رو سے منافع بھی مل گیا اور سود گناہ بھی نہ ہوا۔

> لیکن افسوس کہ مسلمان دین فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود ایسی لعنت میں مبتلا ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو!
دیکھے نہ تیری آنکھ نے فطرت کے اشارے (ص ۱۷۲)

اس سے آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی کہ یہ لوگ قرآن سے کیوں بھاگتے ہیں اور فقہی قوانین کو نافذ کرنے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ (اکتوبر ۷۹ء)

۱۵۔ قوانین حدود کی ناکامی

جب فروری ۱۹۷۹ء میں' ملک میں شرعی قوانین نافذ ہوئے ہیں تو ہم نے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے' منجملہ دیگر امور' لکھا تھا کہ:

> آپ سوچئے کہ تفتیشی اور عدالتی مشینری تو ویسے کی ویسی رہے اور سزائیں کردی جائیں زیادہ سخت' تو کیا اس سے جرائم کی اصلاح ہو جائے گی؟ اصلاح تو ایک طرف' اس سے خرابی اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات واضح ہے۔ اگر کسی جرم کی سزا' (مثلاً") تین ماہ قید ہو تو اس میں رشوت کا "ریٹ" ہزار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہوگا' لیکن اگر اس جرم کی سزا ہاتھ کاٹ دینا یا سنگسار کردینا ہو تو رشوت کا ریٹ آسمان سے باتیں کرنے لگ جائے گا۔ ملزم اپنا گھر بار بیچ کر بھی رشوت کا مطالبہ پورا کرے گا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تفتیشی مشینری اور نظام عدل کی اصلاح کے بغیر سزاؤں کی سختی کیا نتائج پیدا کرے گی۸۔ (طلوع اسلام' بابت فروری ۱۹۷۹ء' ص۱۵)

اس پر مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچا دیا گیا کہ یہ لوگ چاہتے ہی نہیں کہ ملک میں شرعی قوانین نافذ ہو جائیں۔ اسی لئے یہ ان کے خلاف اس قسم کے اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ اب سنئے کہ مفتی محمود صاحب کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلہ کے۔ انہوں نے پارٹی ورکرز سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

> اسلامی قوانین کی تنفیذ سے قوم پر خدا کی رحمتوں کی بارش تو کوئی نہ ہوئی البتہ پولیس کی رشوت کا ریٹ بہت اونچا چلا گیا۔ (پاکستان ٹائمز' مورخہ ۲۹ جون ۱۹۷۹ء' ص۷)

مفتی صاحب نے اپنے اسی خطاب میں یہ بھی فرمایا کہ:

> یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ شرعی قوانین کو نافذ ہوئے قریب پانچ ماہ ہوگئے لیکن جرائم کے ارتکاب میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ یہ اس لئے کہ شرعی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ مقدمات کو شرعی قوانین کے بجائے جہاں سے زیادہ سخت سزائیں مل سکتی ہیں' انہیں عام عدالتوں میں دائر کیا جاتا ہے۔ جرائم کا انسداد اس صورت میں ممکن ہے کہ صرف شرعی عدالتیں رکھی جائیں اور دوسری سب عدالتیں بند کردی جائیں۔ (ایضاً")

۸۔ سابقہ صفحات میں مکمل تبصرہ شائع ہوچکا ہے۔

ان حضرات کی مشکل یہ ہے کہ ان پر ہمیشہ جذبات غالب رہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ حقائق کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کا پہلا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ ہر خرابی کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر عوام کو ان کے خلاف مشتعل کردیا جائے اور خود بری الذمہ ہو جائیں۔ مفتی صاحب محترم اگر حقائق کو اپنے سامنے رکھتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جس خرابی کی انہوں نے نشاندہی کی ہے' وہ خود ان شرعی قوانین کے اندر موجود ہے جو ملک میں نافذ کئے گئے ہیں۔ حکومت کے اعلامیہ میں جہاں شرعی حدود نافذ کئے گئے ہیں' ان کے ساتھ ہی موجودہ فوجداری قوانین بھی درج ہیں اور کہا گیا ہے کہ اگر کوئی جرم شرعی قوانین کی شرائط کی رو سے ثابت نہ ہوسکے تو اس کا فیصلہ ملک کے رائج الوقت قانون کی رو سے کیا جائے۔ شرعی قوانین میں اثبات جرم کے لئے جو شرائط رکھی گئی ہیں ان کے مطابق شاید ہی کوئی جرم ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کا اعتراف اور اظہار خود صدر مملکت نے اپنے ایک انٹرویو میں فرمایا تھا۔ پولیس کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی تفتیش کی رو سے جس قانون کے مطابق جرم کا ثابت ہونا ممکن ہو اسی قانون کے تحت وہ عدالت میں چالان پیش کریں۔ یہ بات ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ جرم زنا کے ثبوت کے لئے قانون شریعت کی رو سے چار ایسے گواہوں کی ضرورت لابدی ہے جنہوں نے اس فعل کے ارتکاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور تزکیۃ الشہود کی شرط کی رو سے یہ عینی شاہد بھی پاکیزہ سیرت کے حامل ہونے چاہئیں۔ ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا ان شرائط کی رو سے کسی تفتیشی افسر کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنے چالان میں اس جرم کا ثبوت پیش کرسکے؟ ان حالات میں اس کے لئے اس کے سوا چارۂ کار کیا رہ سکتا ہے کہ وہ اس مقدمہ کو ملک کی عام عدالت میں پیش کرے جہاں اثبات جرم کا امکان ہوسکتا ہے۔

کیا محترم مفتی صاحب ارشاد فرمائیں گے کہ ان مقدمات کو شرعی عدالتوں کے بجائے عام ملکی عدالتوں میں دائر کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ پولیس اور بیوروکریسی پر یا خود ان شرعی قوانین پر؟ مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انسداد جرم کے لئے ضروری ہے کہ عام عدالتیں بند کردی جائیں اور مقدمات کے فیصلے صرف شرعی عدالتوں میں ہوں۔ کیا مفتی صاحب فرمائیں گے کہ صدیوں پر مشتمل فقہی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ملتا ہے جس میں کسی شرعی عدالت میں چار عینی شہادتوں کی بناء پر جرم زنا ثابت ہوا ہو؟ یہ تو غنیمت ہے کہ یہاں ملکی عدالتیں موجود ہیں جہاں سے اب بھی ملکی قانون کی رو سے مجرموں کو سزا مل جاتی ہے۔ اگر یہ عدالتیں بند ہو جائیں تو نہ کوئی جرم ثابت ہوسکے نہ کسی مجرم کو سزا مل سکے! (اگست ۱۹۷۹ء)

اہل حدیث کی طرف سے

جب زکوٰۃ اور عشر کے مجوزہ قوانین کے خلاف شیعہ حضرات نے احتجاج کیا تھا تو ہم نے لکھا تھا کہ ابھی تک تو یہ اختلاف شیعہ حضرات اور سنیوں میں ہے۔ آگے چل کر آپ دیکھئے گا کہ خود سنیوں میں سے اہل حدیث کی طرف

سے اس سے بھی زیادہ سخت احتجاج ہوگا۔ ان سطور کی تسوید کے وقت تک زکوۃ اور عشر سے متعلق ضابطہ قوانین کا اعلان نہیں ہوا لیکن جماعت اہل حدیث کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوگئی ہے۔ روزنامہ مساوات' مورخہ ۲۱ جون ۱۹۷۹ء میں شائع شدہ ذیل کی خبر ملاحظہ فرمایئے:۔

> مرکزی جمعیت اہل حدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے تو تقریباً" ایک کڑور اہل حدیث افراد اہل تشیع کی طرح بنکوں سے رقوم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے استفسار کیا کہ آیا صدر مملکت اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ عشر و زکوۃ کی شرائط نصاب اور مصارف کے سلسلہ میں جس طرح اہل تشیع کو اہل سنت سے اختلاف ہے' اسی طرح زکوۃ و عشر کے بیسیوں مسائل میں اہل حدیث کو فقہ حنفی سے اختلاف ہے۔ صدر نے مرکز و صوبائی زکوۃ و عشر کونسلوں کا جو اعلان کیا ہے اس میں عدالت ہائے عالیہ کے ججوں کے تحت قانونی اور فنی ماہرین کے ساتھ شیعہ' بریلوی اور دیو بندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہل حدیث کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ان کونسلوں میں مسلک اہل حدیث کی نمائندگی کوئی نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا حنفی علماء' چاہے بریلوی ہوں یا دیو بندی' فقہ حنفی سے ہی رہنمائی حاصل کریں گے اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے۔ لیکن اہل ہدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف قرآن اور حدیث واجب التعمیل ہیں۔ ان حالات میں کونسلوں کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے اہل حدیث کے نزدیک نہ تو کسی اہمیت کے حامل ہوں گے اور نہ کسی اعتماد کے قابل۔ (اگست ۷۹ء)

۱۲۔ اس ناکامی کی بنیادی وجہ

ملک میں' مذہبی پیشوائیت کی طرف سے شور مچایا جا رہا ہے کہ "حکومت نے بادل نخواستہ شرعی قوانین (یعنی قوانین حدود) نافذ تو کردیئے ہیں لیکن ان کے مطابق مجرموں کو سزائیں نہیں دی جا رہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت بدنیت ہے۔ وہ یہاں اسلام رائج ہی نہیں کرنا چاہتی۔ حکومت کی اس سازش میں پولیس بھی برابر کی شریک ہے اور عدلیہ بھی ملوث"۔ ہم اس موضوع پر مختصر طور پر طلوع اسلام میں پہلے بھی لکھ چکے ہیں لیکن چونکہ ان کی طرف سے پروپیگنڈہ بڑی شد و مد سے جاری ہے اور غالباً" یہ حضرات اپنی انتخابی مہم میں اس نکتے کا سہارا لینا چاہتے

ہیں' اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ان قوانین کا تجزیہ کرکے یہ دکھایا جائے کہ اس کے حقیقی ذمے دار کون ہیں۔ واضح رہے کہ ہمیں نہ تو پولیس یا عدلیہ کی صفائی مقصود ہے اور نہ ہی ہمارے پاس حکومت کا وکالت نامہ ہے۔ ہمارا مقصد اصل حقیقت کو بے نقاب کرکے یہ بتانا ہے کہ یہ حضرات دوسروں کے خلاف الزام دھرتے ہیں حالانکہ اس کے ذمہ وار یہ خود ہیں اور اپنے پروپیگنڈے سے عوام کو مغالطہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ مذہب کے نام پر اس قسم کے کھیل آئے دن کھیلے جاتے ہیں۔

یہ قوانین صرف چار جرائم کو محیط ہیں' یعنی جرم زنا' جرم قذف (کسی پر زنا کی جھوٹی تہمت لگانا)' جرم سرقہ (چوری) اور جرم شراب نوشی۔ ان کے متعلق حکومت کی طرف سے ۹ فروری ۱۹۷۹ء کو آرڈیننس جاری ہوا تھا۔ ہم اس باب میں جو کچھ لکھیں گے وہ اس آرڈیننس پر مبنی ہوگا لیکن ہم شروع ہی میں واضح کردینا چاہتے ہیں کہ قانونی سند بہرحال' اصل آرڈیننس ہوگا نہ کہ ہماری تشریحات۔ اس کے بعد آیئے موضوع زیر بحث کی طرف۔

۱۔ یہ واضح ہے کہ کسی جرم کی سزا اسی صورت میں دی جاسکتی ہے جب وہ جرم ثابت ہو جائے۔

۲۔ اثبات جرم کا بنیادی مدار شہادات (گواہوں) پر ہوتا ہے۔ عدلیہ کے نظام میں شہادت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ضوابط قوانین میں قانون شہادت کو سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اب دیکھئے کہ زیر نظر شرعی حدود کے سلسلے میں شہادت کی کیفیت کیا ہے۔ ان تمام جرائم کے متعلق اصولی طور پر کہا گیا ہے کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ "تزکیۃ الشہود" کی شرائط پر پورا اترے۔ یہ شرائط یہ ہیں کہ وہ صداقت شعار (سچ بولنے والا اور راست باز) ہو اور اس سے گناہ کبیرہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔ اگر کسی مقدمہ میں یہ ظاہر ہو جائے کہ گواہ ان شرائط پر پورا نہیں اترتا تو اس کی گواہی قابل اعتماد نہیں سمجھی جائے گی اور مجرم بری ہو جائے گا۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ ہمارے معاشرے میں کتنے فیصد لوگ ایسے نکلیں گے جو ان شرائط پر پورے اتریں؟ اور تو اور' ہم ان پروپیگنڈہ کرنے والے حاملان دین متین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ ان شرائط پر پورے اترتے ہیں؟ ان قوانین کا یہ بنیادی سقم ہے جس کی وجہ سے صدر مملکت نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ ان جرائم کے اثبات کے لئے جو شرطیں رکھی گئی ہیں ان کی رو سے شائد ہی ہزار ایک مجرم کو بھی سزا نہ مل سکے"۔ واضح رہے کہ ان قوانین میں نہ تو گواہوں کی تعداد کم ہوسکتی ہے اور نہ ہی قرائنی شہادت یا سائنٹیفک پروف قابل قبول۔

(۱) جرم زنا

جرم زنا کے اثبات کے لئے شرائط یہ ہیں کہ:

۱۔ مجرم خود اقبال جرم کرے۔

۲۔ چار مسلم' بالغ گواہ جو "تزکیۃ الشہود" کی شرط پر پورا اتریں' اس امر کی گواہی دیں کہ انہوں نے زنا کے سلسلہ میں "عمل دخول" کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اگر گواہوں کی تعداد چار سے کم ہو یا شہادت کی جزئیات

میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے تو جرم ثابت نہیں ہوسکے گا۔
جہاں تک اقبال جرم کا تعلق ہے' ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے زمانے میں کوئی بھی ایسا مجرم نکلے جو اقبال جرم کرکے سنگسار ہونے یا سو کوڑے کھانے کے لئے اپنے آپ کو انتظامیہ کے حوالے کردے۔ باقی رہا چار عینی گواہوں کا سوال' سو ہم پوچھتے ہیں ارباب خرد و ہوش سے کہ کیا ایسا ممکن بھی ہے کہ اس عمل اختلاط ہی کو نہیں' عمل دخول کو پوری باریک بینی کے ساتھ ایک بھی نہیں' چار اشخاص نے دیکھا ہو۔ حیوانات میں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جنسی اختلاط کے عمل میں کسی قسم کا حجاب نہیں رکھتے' لیکن انسانوں کی دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ' ناجائز عمل اختلاط تو ایک طرف' کوئی شخص اسے بھی گوارا نہیں کرسکتا کہ اس کی اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط کی بھنک تک بھی کسی کے کان میں پڑ جائے۔
ان حالات میں فرمایئے کہ اس جرم کی پاداش میں شرعی سزا کس طرح دی جائے؟ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ عدالت کو چاہئے کہ زنا کے کسی مقدمہ میں' وہ ان پروپیگنڈہ کرنے والے مفتیان عظام سے کہے کہ وہ چار چشم دید گواہ تلاش کرکے عدالت میں پیش کردیں۔ اس طرح انہیں ان کے پروپیگنڈے کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

(۲) قذف: یعنی کسی کے خلاف زنا کی تہمت لگانا

زنا کی تہمت کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ جس شخص کے خلاف تہمت لگائی جا رہی ہے اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ اور زنا کے جرم کے ثبوت کے لئے جو شرائط اوپر بیان کی گئی ہیں ان کی رو سے یہ جرم ثابت ہی نہیں ہوسکے گا۔ اس سے تہمت لگانے والا جھوٹا ثابت ہوگا اور اسے اسی کوڑوں کی سزا ملے گی۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں کوئی شخص بھی اس کی جرات کرے گا کہ کسی کے خلاف زنا کی تہمت لگائے خواہ اس کے لئے اس کے پاس قرائن کی کتنی شہادات بھی موجود کیوں نہ ہوں۔ اس کی ایک بین مثال پر غور کیجئے۔ کسی شریف عورت کے ساتھ کسی بدمعاش نے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا اور اس مظلومہ نے اس ظالم کے خلاف مقدمہ دائر کردیا۔ ظاہر ہے کہ وہ جرم زنا کی شرائط کی رو سے اس ظالم کے خلاف اس جرم کو ثابت نہیں کرسکے گی اور جب وہ اسے ثابت نہیں کر سکے گی تو وہ جرم قذف (جھوٹی تہمت لگانے کے جرم) کی مجرم قرار پا جائے گی جس کی سزا اسی کوڑے ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کوئی عفت مآب خاتون اس ظالم کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر لانے کی بھی جرات نہیں کرسکے گی کیونکہ اس کے خلاف ایسا کہنا بھی تو قذف کے زمرے میں آجائے گا۔
ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ ان حضرات کے اس شرعی قانون کی رو سے نہ صرف زنا بالرضا بلکہ زنا بالجبر کے بھی پھاٹک کھل جاتے ہیں۔

(۳) سرقہ (چوری)

جرم سرقہ کے ثبوت کے لئے ضروری ہے کہ:
۱۔ مال حرز کے اندر سے چرایا گیا ہو۔ حرز سے مراد ہے کوئی مکان یا کوئی الماری یا بکس جو کسی شخص کے قبضہ میں

ہو۔ جو مال حرز کے اندر نہ ہو اس کی چوری مستوجب حد نہیں ہوسکتی' مثلاً" تار یا ٹیلیفون کی تاریں' ریلوے کی پٹریاں' پلیٹ فارموں پر پڑا ہوا مال یا کھلے میدانوں میں رکھا ہوا ساز و سامان وغیرہ۔ اس قسم کے مال کی چوری "حد" کے اندر نہیں آتی۔

۲۔ وہ مال مسروقہ نہ ہو۔

۳۔ وہ مال جو (SURREPTITIOUSLY) چرایا گیا ہو۔ اس شرط کا مفہوم کچھ عجیب سا ہے جسے شاید ہم اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ چور کو اس کا یقین ہو کہ جس کا مال چرایا جارہا ہے اسے اس سرقہ کا علم نہیں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر یہ واردات دن کے وقت کی جائے جس میں طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے اور غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد تک کا وقت شامل ہے تو واردات کا اس عرصے میں مکمل ہونا ضروری ہے۔

۴۔ نصاب ـــــ مال مسروقہ کی قیمت (۴.۴۵۷) گرام سونے کی قیمت کے برابر ہو۔ اگر ایک چور چوری کی بیس وارداتیں کرتا ہے لیکن ہر واردات میں مال مسروقہ کی قیمت نصاب سے کم ہے تو وہ سرقہ کے جرم کا مرتکب قرار نہیں پائے گا' خواہ مجموعی طور پر اس مال کی قیمت کتنی ہی ہو۔

۵۔ اس کے لئے دو مسلمان چشم دید گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ گواہوں میں وہ شخص شامل نہیں ہوگا جس کا مال چرایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ "چوری" کی واردات کے لئے بھی چشم دید گواہی کی شرط رکھی گئی ہے۔

۶۔ اگر مجرم اور مستغیث باہمی رشتہ دار ہوں تو بھی حد کی سزا نہ دی جاسکے گی' مثلاً" میاں بیوی (۲) ماں باپ ـــ اوپر اور نیچے تک (۳) ماں یا باپ کے بھائی بہن یا ان کے بچوں کے بھائی بہن (۴) مہمان (۵) ملازم یا کارندے۔

۷۔ اکراہ یا اضطراری حالات میں چوری۔ اکراہ کے معنے یہ ہیں کہ کسی نے اس سے زبردستی واردات کرادی اور اضطرار کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو بھوک یا پیاس کی وجہ سے موت کا خطرہ لاحق ہو۔

یہ ہیں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے سرقہ کا جرم حد کا مستوجب ہوسکتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ ہمارے ہاں کتنی وارداتیں ہوں گی جن میں اثبات جرم کی یہ شرائط پوری ہوسکیں گی؟

(۴) شراب نوشی

اس جرم کے اثبات کے لئے دو مسلمان گواہوں کی ضرورت ہوگی جو تزکیتہ الشہود کی شرائط پوری کریں۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ شرائط جن کے پورا ہونے سے یہ وارداتیں ان جرائم کے زمرے میں آسکتی ہیں جن کی سزا "شرعی حد" ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں ملک کے ارباب علم و بصیرت سے کہ ان شرائط کی رو سے ایک آدھ کو

چھوڑ کر کوئی واردات بھی ایسی ہو سکتی ہے جس میں جرم ثابت ہو جائے؟ لہٰذا' اگر ان قوانین کی رو سے کسی مجرم کو حد کی سزا نہیں دی گئی تو اس میں پولیس کی کون سی سازش ہے اور عدلیہ کا کون سا قصور؟ یہ غنیمت ہے کہ متعلقہ آرڈیننس میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اگر جرم' حد کی سزا کا مستوجب نہ قرار پاسکتا ہو تو پاکستان کے ضابطہ فوجداری کے تحت اس کا فیصلہ کردیا جائے۔ یہ وجہ ہے کہ پولیس اس قسم کی وارداتوں کا چالان بھی ضابطہ فوجداری کے تحت کرتی ہے اور عدالت اس کی سزا بھی اسی ضابطہ کے مطابق دیتی ہے۔ اگر آرڈیننس میں یہ گنجائش نہ رکھی جاتی تو کسی مجرم کو کسی قسم کی سزا نہ مل سکتی۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اسے بھی اپنے پروپیگنڈے کا حصہ بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پولیس جان بوجھ کر (بلکہ رشوت لے کر) وارداتوں کا چالان ضابطہ فوجداری کے تحت کرتی ہے کیونکہ اس سے سزا کم ملتی ہے۔ ان حضرات کا مطالبہ یہ ہے کہ ضابطہ فوجداری کی متعلقہ دفعات کو منسوخ کردینا چاہئے اور جو عدالتیں ان دفعات کے تحت مقدمات کی سماعت کرتی ہیں' ان عدالتوں کو بند کردینا چاہئے۔

تجویز نہایت "معقول" ہے۔ مجرمین کو ضابطہ فوجداری کے تحت سزائیں نہیں مل سکیں گی اور شرعی حدود کی شرائط پوری نہیں ہوسکیں گی تو ملک میں وارداتوں کے پھاٹک کھل جائیں گے اور مجرم "قانون شریعت زندہ باد" کے نعرے بلند کرتے دندناتے پھریں گے۔

اس ضمن میں ہم دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ ایک سوال سامنے لانا چاہتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ قوانین ناممکن العمل بھی ہیں اور بعض جزئیات میں (معاف فرمائیے) اسلام کے لئے باعث تضحیک بھی۔ یہ قوانین فقہ حنفی پر مشتمل ہیں اس لئے اس فقہ کے ماننے والوں کی مجبوری قابل فہم ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ فقہی قوانین میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا ہے۔

لیکن ان قوانین کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل میں زیر بحث آیا۔ اس کے تمام کے تمام ارکان تو قدامت پرست نہیں۔ پھر یہ وفاقی حکومت کی وزارت امور مذہبیہ کے بھی زیر غور آیا ہوگا۔ وہ وزارت بھی مولانا حضرات پر مشتمل نہیں۔ اس کے بعد یہ وزارت قانون میں زیر بحث آیا ہوگا۔ وہ وزارت تو بہرحال قانون دان حضرات پر مشتمل ہے۔ پھر یہ کابینہ میں بھی زیر غور آیا ہوگا۔ یہ کہنا تو ہمارے نزدیک ان حضرات کی عقل و بصیرت کی توہین ہے کہ وہ اتنا سا فہم و شعور بھی نہیں رکھتے کہ وہ ان قوانین کے اسقام کو سمجھ نہ سکے ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے ایسے قوانین کو کس طرح نافذ کردیا' اس کا جواب وہی حضرات دے سکتے ہیں۔

ان کا جواب کچھ بھی ہو' اس سے ہمارے علماء کرام کا حربہ ضرور کامیاب ہوگیا۔ انہوں نے پہلے اس قسم کے ناممکن العمل قوانین نافذ کرادیئے اور پھر یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ ان پر عمل نہیں کرایا جا رہا۔ اس سے خود تو عوام کی نظروں میں اسلام کے سب سے بڑے مجاہد بن گئے اور انتظامیہ' عدلیہ' بلکہ خود حکومت کے متعلق مشہور کردیا کہ یہ اسلام کو رائج ہی نہیں کرنا چاہتے۔ ان کے پروپیگنڈے کا سیدھا سا جواب یہ تھا کہ یہ قوانین ایسے ہیں ہی نہیں جن

پر عمل کیا جاسکے لیکن ارباب اقتدار یہ جواب بھی نہیں دے سکتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنے سے پبلک کی طرف سے پوچھا جائے گا کہ اگر یہ قوانین ایسے ہی ناممکن العمل تھے' تو آپ نے انہیں نافذ کیوں کیا؟

یہ ادنیٰ سی مثال ہے اس تذبذب اور خلفشار کی جس کا شکار وہ ملک ہوتا ہے جس میں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہو۔ اس کے بعد اب سوچئے کہ اگر (خدانکردہ) کہیں اقتدار بلاواسطہ ان لوگوں کے ہاتھ آجائے تو انسانیت کا حشر کیا ہوگا؟ یہ وجہ تھی جو بانیان پاکستان (علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ) بار بار اعلان کرتے تھے کہ کچھ بھی ہو' پاکستان میں تھیاکریسی قائم نہیں ہونے دی جائے گی۔

کار ملائی سبیل اللہ فساد

تو اس کے پیش نظر یہی حقیقت تھی۔ (اکتوبر ۱۹۷۹ء)

۱۷۔ چور کا کٹا ہوا ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا؟

ملک میں شرعی قوانین کے نفاذ کے بعد' ان کے تضمنات کے طور پر' کس قسم کے مسائل پیدا ہوں گے' اس کا اندازہ اس بحث سے لگائیے جو ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن اور مفتی محمد حسین نعیمی صاحب کے مابین شروع ہوئی ہے۔ واضح رہے کہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب ادارۂ تحقیقات اسلامی کے مشیر قانون ہیں اور مفتی نعیمی صاحب اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن۔ یعنی دونوں کا تعلق اس ادارے سے ہے جہاں قوانین شریعت مدون ہوتے ہیں۔ اس بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک بیان میں فرمایا:

> پچھلے دنوں چور کے ہاتھ کی ملکیت کے مسئلہ پر اسلام آباد کے ایک جلسہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ریٹائرڈ جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب سے ایک شخص نے حد سرقہ میں قطع ید کے بارے میں استفسار کیا کہ آخر وہ قطع شدہ ہاتھ کس کی ملکیت ہوگا اور کیا وہ چور کو واپس مل جائے گا..... اور کیا وہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ جڑوا سکتا ہے؟ موصوف اس مسئلہ پر کوئی جواب نہ دے سکے اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جب تک کسی دینی مسئلہ میں صحیح اور اطمینان بخش معلومات نہ ہوں' لب کشائی نہ کی جائی۔ بہرکیف' اسلامی کونسل کے ایک رکن مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب نے چند روز ہوئے نمائندہ جنگ کو بتایا کہ وہ ہاتھ اس چور کی ملکیت ہوگا اور اس کو واپس کیا جائے گا اور وہ اس کو دوبارہ جڑوا سکتا ہے..... اس ناچیز کی رائے میں مفتی صاحب کا یہ ارشاد درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حد دراصل ایک سزائے محرومی ہے' یعنی چور کو اس ہاتھ سے محروم کردینا ہے جس ہاتھ نے (مروجاً

اور معروفاً") چوری کی- اب وہ ہاتھ اس کی ملکیت نہ رہے گا- اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کی تائید میں فقہ اور احادیث کے حوالے دیئے ہیں-

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون روزنامہ جنگ (کراچی) بابت ۱۱ مارچ ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا- اس سے اگلے ہی دن (یعنی ۱۲ مارچ کو) اسی اخبار میں مفتی صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں تفصیلی بیان شائع کیا اور کہا کہ:

جب چور پر حد واجب ہو اور اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے تو اس سے قرآنی حکم مکمل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن حکیم میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے اور حکم تکرار نہیں چاہتا- بلکہ ایک مرتبہ کے عمل سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے اور منشا پورا ہو جاتا ہے- تاہم فقہا نے ہاتھ کاٹنے کے بعد اس کو داغنے کی تجویز بیان کی ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ خون بہنے سے اس کی موت واقع نہ ہو-

اس قسم کے ہیں وہ مسائل جو شرعی قوانین کے عواقب میں پیدا ہوں گے اور اس قسم کی ہوں گی وہ بحثیں جو اس ضمن میں اٹھیں گی- (مئی ۱۹۷۹ء)

تیسرا باب

علماء کی باہمی سر پھٹول

۱۔ مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑے

ماہنامہ "محدث" (لاہور) کی شوال المکرم ۱۳۹۶ھ کی اشاعت میں' پروفیسر محمد سلیمان اظہر' ایم۔ اے' کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کے شروع میں لکھا گیا ہے :۔

ان دنوں بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ناخوشگوار بحث چل نکلی ہے کہ وہابی (نجدی) یا اہل حدیث کی اقتداء میں حنفی خصوصاً" بریلوی نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں۔ حرمین شریفین کے عالی قدر اماموں کی پاکستان میں آمد اور عوام کی طرف سے ان کی بے پناہ پذیرائی سے بوکھلا کر ہمارے کرم فرماؤں نے یہ بحث شروع کر رکھی ہے اور فتویٰ بازی کا بازار گرم ہے۔

برصغیر کے اہل حدیث حضرات کے لئے یہ بحث کوئی نئی نہیں ہے۔ جب بھی حضرات مقلدین دلائل کی جنگ ہار جاتے ہیں تو پھر اسی قسم کی صورت حال پیدا کر کے اپنے مکتب فکر کی بقا کا سامان کیا جاتا ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا آیا ہے۔ اہل حدیث پر مساجد کے دروازے بند کرنے' ان کے مسجد میں آجانے پر مساجد دھلوانے' رفع الیدین و آمین بالجہر کہنے پر زد و کوب' ان کی لا مذہبیت کے فتوے' ان کے مقاطعتی بائیکاٹ کی تحریکیں' ان کے قتل کے سامان اور عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمات کا کھیل بہت پرانا ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہم (مقلدین) سواد اعظم ہیں (جو سراسر غلط دعویٰ ہے)' اس لئے ان قلیل التعداد اہل حدیثوں کو دبا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن ہوتا ہمیشہ ان کے برعکس رہا **کم من فئة قليلة** ۲/۲۴۹ اس نام نہاد سواد اعظم پر کتنی ہی بار فتح یاب ہوا ہے' خواہ وہ تحریر و تقریر کا میدان ہو یا عدالتی کاروائیوں کا سلسلہ ہو۔

برصغیر پاک و ہند میں جب مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے وہ مشہور اشتہار شائع کیا جس میں مقلدین سے دس (۱۰) سوال کئے گئے تھے تو ان کے جواب دینے عاجز

آکر حضرات مقلدین نے ہلڑ بازی شروع کردی (یہ ۱۸۷۷ء کے گرد و پیش کی بات ہے)۔ مساجد میں عاملین سنت کا داخلہ بند کیا گیا' ان کی اقتداء میں نماز پڑھنے کو ناجائز کہا۔ جن مساجد میں اہل حدیث امام و خطیب تھے' انہیں نکالنے کی کوشش کی گئی۔ غرض ملک ایک عجیب ہنگامے کی نذر ہوگیا۔ کہیں مساجد دھلوائی جارہی ہیں' اس لئے کہ عاملین سنت کے قدم اس میں پڑ گئے ہیں۔ کہیں مار پیٹ ہو رہی ہے اس لئے کہ آمین و رفع الیدین کی سنت کیوں ادا کی جا رہی ہے۔ کہیں عدالتوں میں مقدمات دائر ہیں کہ امام طریق سنت کے مطابق نماز کیوں پڑھاتا ہے۔ اسے برطرف کیا جائے۔

ایسا ہی ایک مقدمہ جو پریوی کونسل تک پہنچا' ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ مقدمہ منصف' سب جج' ہائی کورٹ اور پھر پریوی کونسل لندن میں سماعت ہوا۔ مقدمے کی بنا یہ تھی کہ امام مسجد اہل حدیث ہوگیا ہے۔ اب وہ آمین اور رفع الیدین کا عامل ہے۔ مسجد احناف کی چلی آرہی ہے۔ امام کے اس فعل سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے امام کو امامت سے برطرف کیا جائے۔ ہماری اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

اس کے بعد' قریب بارہ صفحات میں اس مقدمہ کی تفاصیل درج کی گئی ہیں' جس کا فیصلہ پریوی کونسل نے اہل حدیث کے حق میں دے دیا تھا۔ اس کے بعد لکھا ہے :۔

قارئین کرام! یہ طویل فیصلہ جو برٹش ایمپائر کی سب سے بڑی عدالت سے بنگال ہائی کورٹ کے انگریز ججوں کے فیصلے کے خلاف صادر ہوا' بغور ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ اہل حدیث کو اہل سنت قرار دیا گیا ہے۔ اہل حدیث کی اقتداء میں مقلدین کے دلائل سننے کے بعد مقلدین کی نماز کو درست قرار دیا گیا ہے۔ ہم اپنے ان کرمِ فرماؤں سے پوچھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ اپنے تازہ موقف میں سچے ہیں تو پریوی کونسل میں پیش ہو کر یہ موقف کیوں نہ پیش کیا۔ وہاں سے بھاگ کیوں گئے تھے۔ آخر وہ نئے دلائل کون سے ہیں جو اس فیصلے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ آئے ہیں۔ وہ دلائل لے کر یہ کسی عدالت میں کیوں نہیں جاتے اور پریوی کونسل کا یہ فیصلہ کالعدم کیوں نہیں کرواتے۔ عوام کالانعام کو ایسی باتوں سے بے خبر رکھ کر کیوں غلط راستے کی طرف ہانک رہے ہیں۔ حقائق کو پس پشت ڈال کر تعصب اور ہٹ دھری سے کیوں اپنی عاقبت خراب کی جارہی ہے۔ حرمین کے ائمہ اور عاملین سنت کو کیوں مورد طعن بنایا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ نشست میں علمائے احناف کے دو فتوے آپ کے سامنے پیش کریں گے اور بتائیں گے کہ جن امور کے باعث آج مقلدین حضرات اہل حدیث کو مطعون کرتے

ہیں' جب آج سے ۹۰ سال قبل انہی امور پر بحث و نظر کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو علمائے احناف نے کس طرح اہل حدیث کے مسلک حق کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔

غور فرمایئے کہ اتباع و خلاف سنت جیسے مسئلہ میں کفار کی عدالت عالیہ کے فیصلہ کو کس فخر و مسرت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے! دوسرے یہ کہ ایک فرعی مسئلہ میں ان حضرات کی شدت کا یہ عالم ہے' اور اس کے باوجود' دعویٰ یہ کہ یہ مکاتب فکر ہیں فرقے نہیں۔

اور سب سے دلچسپ یہ کہ مقالہ ختم ہوجانے کے بعد' (غالباً) ادارہ کی طرف سے جلی حروف میں لکھا ہے:۔

امت ایک غیر منقسم وحدت ہے جسے فرقہ بندی اور انتشار سے محفوظ رکھنا سب کا اولین فریضہ ہے۔

اور امت کو فرقہ بندی اور انتشار سے محفوظ رکھنے کا طریقہ وہ ہے جسے مقالہ میں بیان کیا گیا ہے! یا للعجب! (جنوری ۱۹۷۷ء)

۲۔ اہل حدیث اور فقہ حنفی

مسلک اہل حدیث کے ترجمان' ہفت روزہ معاصر الاعتصام کی ۲۷ جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں' مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:۔

مولانا مفتی محمود صاحب کا ایک بیان روزنامہ "جسارت" ۱۰ جنوری ۱۹۷۸ء میں پڑھ کر میری حیرت کی حد نہ رہی۔

حیراں ہوں' دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں؟

مفتی صاحب فرماتے ہیں' "پاکستان میں حنفی مسلک کو بطور متن نافذ کردیا جائے اور اگر کوئی معاملہ حل نہ ہو تو پھر کسی اور مسلک سے مدد لی جائے۔ اسلام ترقی کا دین ہے"۔

حنفیوں کو حنفی مسلک چاہئے' شافعیوں کو شافعی مسلک' مالکیوں کو مالکی مسلک' حنبلیوں کو حنبلی مسلک' بریلویوں کو بریلوی مسلک مطلوب ہے۔ میں مفتی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ رسول اللہ (صلعم) نے تیرہ سال مکہ مکرمہ میں لرزہ خیز مصائب جھیل کر اور دس برس مدینہ منورہ میں ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر جو مذہب صحابہؓ اور قیامت تک کے مسلمانوں کو دیا تھا' وہ کیا تھا' اور اس کا نام کیا ہے..... حنفی مذہب کا نام رسول اللہ کے اسلامی نظام سے چار سو سال بعد ظہور پذیر ہوا۔ حنفی مذہب کا نام نہ صحابہؓ نے سنا نہ تابعینؒ نے نہ تبع تابعینؒ نے سنا۔ سلف صالحین کے نیک زمانوں میں

حنفی مذہب کا نام و نشان نہ تھا۔
(اور اہل حدیث کا بھی تو نام نہ تھا۔ اس زمانے میں کسی فرقے کا بھی نام نہیں تھا۔ طلوع اسلام) (مارچ ۱۹۷۸ء)

۳۔ ہم تو حرمین الشریفین کے امام کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے!

بریلوی فرقہ کے راہ نما اور جمعیت العلماء پاکستان کے صدر' مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک تقریر کا حسب ذیل اقتباس غور طلب ہے۔ اسے ہم' ہمعصر ایشیا (بابت ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء) کے حوالہ سے نقل کر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں اور مولانا عبدالستار نیازی' مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب یہ ابھی تین چار روز پہلے (۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات) کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لئے گئے تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کا سنگ بنیاد ان سے رکھوایا جائے۔ تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں' انہوں نے یہ فرمایا' میں نے سنا ہے آپ بڑے وسیع القلب ہیں۔ آپ میں بڑی رواداری ہے۔ آپ میں بڑی فراخدلی ہے۔ اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سالہ میں تھے' قید کے ان لمحات میں رواداری و وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فلاں صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہوگئی تو میں نے جواباً" عرض کیا' جنرل صاحب بڑا افسوس ہے۔ آپ کو غلط اطلاعات دی گئیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعت قلبی ہے لیکن گستاخ رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضورؐ پر نور کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لئے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتاویٰ موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمد للہ! اس فتوے پر عمل کرتے ہوئے کوئی بھی شخص ہو خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں کا ہو' ملتان کا ہو' اچھرہ کا ہو' کسی شاتم رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اور میں نے کہا' جناب والا! یہ چار چار ٹکے کے لوگ ہیں' ہم تو حرمین شریفین کے نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ یہ ملا جو چار چار ٹکے کے ہیں' ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ اطلاع غلط ملی ہے۔ آپ مطمئن رہیں' ہمارے مسلک میں ایسی رواداری' فراخدلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتم رسولؐ کے لئے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی۔ اور اس کے لئے لوگ بہت سی باتیں کہتے ہوں گے۔ قومی اسمبلی میں بھی اذان ہوتی تھی۔ علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رخ ان سے دوسری طرف۔ اس کے دیکھنے والے ایک نہیں' دو نہیں' بے شمار لوگ ہیں۔

نورانی صاحب کو ان کا عقیدہ مبارک! لیکن ہم ان سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ جن "گستاخان رسولؐ" اور "شاتمان رسولؐ" کے پیچھے نماز پڑھنا آپ حرام سمجھتے ہیں' انہی کے ساتھ مل کر "نظام مصطفیٰؐ" قائم کرنے کی کوششیں آپ کے نزدیک کس طرح جائز قرار پاسکتی ہیں؟ کیا دنیا میں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ "شاتمان رسولؐ" نے نظام مصطفیٰؐ قائم کیا ہو؟ اور اگر یہ نظام قائم ہوگیا تو اس کی شکل کیا ہوگی؟ اس میں آپ اکیلے ہوں گے اور اکثریت انہی "شاتمان رسولؐ" کی ہوگی! کیا نظام مصطفیٰؐ ایسا ہی ہوتا ہے؟ (فروری ۱۹۷۸ء)

۴۔ تبلیغی جماعت اور حنفیوں میں سر پھٹول

ہم نے اس سے پہلے ایک بار لکھا تھا کہ انگلستان میں بریلویوں اور دیو بندیوں کے جھگڑے اور فسادات کیا شدت اختیار کر رہے ہیں ..... (طلوع اسلام جنوری ۱۹۷۶ء).... اب وہاں "جمعیت تبلیغ اسلام" اور حنفیوں میں فسادات شروع ہوگئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل خبر قابل توجہ ہے جسے ہم' ہمعصر المنبر (لائل پور) کی اشاعت بابت ۱۴--- ۲۱ جنوری ۱۹۷۷ء کے حوالے سے درج کرتے ہیں:

بریڈ فورڈ (نمائندہ جنگ) : بریڈ فورڈ کے مجسٹریٹ نے آج "جمعیت تبلیغ اسلام" کے جلسہ میں چاقو زنی کے الزام میں گرفتار..... کو ضمانت پر رہا کرنے کی درخواست مسترد کردی ہے اور انہیں ہفتہ کے لئے پولیس کی تحویل میں دینے کا حکم دیا ہے۔

.....اور ..... کو گزشتہ اتوار کو گرین لین اسکول میں مرکزی جمعیت تبلیغ الاسلام کے جلسہ میں جمعیت اور مسجد حنفیہ کے حامیوں کے درمیان مسجد کی تعمیر کے جھگڑے پر گرفتار کیا گیا تھا جس میں چاقو اور کرسیاں چل گئی تھیں جس سے پانچ افراد زخمی ہوگئے تھے۔

اس جلسہ میں (جو جمعیت تبلیغ الاسلام کی مذہبی خدمات کا جائزہ لینے کے لئے بلایا گیا تھا) ایک قرارداد پیش کی گئی کہ:

بریڈ فورڈ کونسل نے ایک مسجد تعمیر کرنے کے لئے جو زمین مسجد حنفیہ کو دینے کا وعدہ کیا ہے' اس کی اصل حق دار "جمعیت تبلیغ الاسلام" ہے۔

اس قرارداد میں بریڈ فورڈ کے پاکستانی کونسلیٹ پر چند الزامات عائد کئے گئے تھے جس پر ہنگامہ ہوگیا اور چاقو اور چھریاں چل گئیں (۲۴۔ نومبر ۷۶ء)۔ اور یہ ہے اس خبر پر ہفتہ وار "آزاد" لندن کا تبصرہ:

بریڈ فورڈ (نمائندہ آزاد): یہ بات انتہائی دکھ' کرب اور افسوس کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ بریڈ فورڈ جو پر امن پاکستانیوں کا گڑھ ہے وہاں گرین لین اسکول میں مسجد حنفیہ اور تبلیغ الاسلام کے حامیوں کے درمیان تشدد اور مار کٹائی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہ بات قابل مذمت ہے جبکہ دونوں تنظیمیں ایک ہی علاقے کے افراد پر مشتمل ہیں جو ایک خدا' ایک رسولؐ اور ایک قرآن پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی جانب سے تشدد کے ایسے گھٹیا مظاہرے سے نہ صرف پاکستان اور پاکستانیوں کے وقار کو نقصان پہنچا ہے بلکہ اسلام کے بارے میں غیر مسلمانوں کے نظریات بھی متزلزل ہوئے ہیں۔

ایک مذہبی تقریب جس کے شرکاء دین مبین اور اسلام کی سربلندی کے نام لیوا ہیں' وہاں کرسیوں اور چاقوؤں سے ایک دوسرے کو گھائل کرنے کا کھیل کھیلا جائے تو اسلام کی عظمت اور تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہے جبکہ اسلام صلح جوئی' امن' رواداری' ہمدردی اور تعاون کا درس دیتا ہے۔

ہنگامے کو فرو کرنے کے لئے پولیس آئی' گرفتاریاں ہوئیں۔ اس سانحہ سے پاکستانیوں کا سر ندامت سے جھک جانا چاہئے۔ بریڈ فورڈ کے پاکستانیوں کو اتحاد و یگانگت کی مثال قائم کر کے اپنی روایات کو زندہ رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن انتہائی دکھ اور کرب کے ساتھ کہنا پڑا ہے کہ

یہ ملت خرافات میں کھو گئی

بریڈ فورڈ کے گرین لین اسکول میں عموماً" پاکستانیوں کی تقریبیں ہوتی ہیں۔ لیکن اس افسوسناک واقعہ کے بعد اندیشہ پیدا ہوگیا ہے کہ پاکستانیوں کو اپنی تقریبات کے انعقاد کے لئے یہ جگہ نہیں ملا کرے گی۔ (مارچ ۱۹۷۷ء)

۵۔ فرقہ اہلِ قرآن

فرقہ اہل قرآن کے ترجمان بلاغ القرآن کی نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں' ایک سوال کے جواب میں کہا گیا

ہے کہ:

فرقہ بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے سے الگ مکتب فکر والوں کا نہ جنازہ پڑھتے ہیں اور نہ اپنی لڑکیوں کے رشتے دیتے ہیں (ص ۳۰)۔

بلاغ القرآن نے قصداً" یہ نہیں لکھا کہ "نہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے ہیں"' کیونکہ اس کی زد' اور شدید ترین زد' خود ان پر پڑتی تھی جو حرم کعبہ میں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے---

انہوں نے باقی مسلمانوں سے الگ ایک نئی نماز وضع کر رکھی ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ یہ خدا کی متعین فرمودہ (قرآنی) نماز ہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے۔ (جنوری ۱۹۷۷ء)

۶۔ مذہب میں مصلحت بینی

(دیو بندیوں کے خلاف اہل حدیث کا اعتراض)

سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے دینی امور میں لچک روا رکھنے کے سلسلہ میں جماعت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام' (لاہور) کی ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع شدہ حسب ذیل شذرہ' دل چسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان ہے "سیاسی علماء سے"۔ شذرہ ملاحظہ فرمایئے:

سیاسی علماء کے متعلق ہم نے پہلے بھی بعض اہم موقعوں پر لکھا ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے دینی عقائد و معاملات میں لچک اور مداہنت روا رکھنا سخت نقصان دہ ہے۔ اس سے جہاں علمائے حق کا کردار داغدار ہوتا ہے اور اس تاریخ پر حرف آتا ہے جو علمائے حق نے نازک سے نازک حالات میں بھی حق کا علم بلند کرکے اپنے خون جگر سے رقم کی ہے' وہاں دوسری طرف اہل زیغ کے مسلک ضلال کے لئے "سہارا" مہیا ہوجاتا ہے۔

سیاسی معاملات میں زیادہ سے زیادہ ہمنوائی اور اشتراک فکر و عمل کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں' بلکہ بعض حالات میں یہ ناگزیر ہوجاتا ہے جس طرح کہ جنوری ۷۷ء سے اب تک کے حالات اس کے متقاضی رہے اور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینی معاملات میں بھی ہم اس کا مظاہرہ کریں اور ایک شخص جس بات کو یکسر غلط سمجھتا آرہا ہو' سیاسی اشتراک کی وجہ سے' وہ اس غلط بات کو کرنے میں بھی کوئی شرعی قباحت محسوس نہ کرے۔

اس تمہید کی ضرورت مولانا مفتی محمود صاحب صدر' پاکستان قومی اتحاد اور مولانا

عبیداللہ انور کے اس طرزِ عمل سے محسوس ہوئی ہے کہ ان ہر دو حضرات نے خواجہ علی ہجویریؒ کی قبر پر آستانہ بوسی کا "شرف" حاصل کیا ہے۔ حالانکہ بزرگان دین کی قبروں پر اس طرح کی حاضری ان کے مسلک و عقیدے کی رو سے غلط ہے بلکہ موخر الذکر مولانا کے مرحوم والد مولانا احمد علی صاحب تو حضرت علی ہجویریؒ کی موجودہ قبر کو ہی مصنوعی بتاتے تھے اور اول الذکر نے (اخباری اطلاع کے مطابق) قبر پر "دستار بندی" کا شغل فرمایا اور حلوہ تقسیم کیا جو غالباً چڑھاوا ہونے کی وجہ سے اہل بہ لغیر اللہ کے ضمن میں آتا ہے۔

بہرحال، ہم علمائے دیوبند کے اس طرزِ عمل کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے شرک و بدعت کو تقویت پہنچتی ہے اور اس توحید کو نقصان پہنچتا ہے جس کی تبلیغ و تلقین علمائے حق کرتے آئے ہیں اور مذکورہ دیوبندی علماء بھی اپنے آپ کو انہی علماء کے سلسلے کی کڑی سمجھتے ہیں۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

۷۔ غریب مسلمان کی میّت

(مولوی صاحبان کی پیشہ ورانہ ذہنیت)

ذیل کی خبر پڑھیے اور خون کے آنسو روئیے۔

دولت گیٹ (ملتان) میں ایک مسلمان خاکروب کی میت صرف اس وجہ سے ۲۴ گھنٹے تک رکھی رہی کہ میت کو غسل دینے کے لئے جس مولوی کو بھی بلایا گیا، وہ نہ آیا۔ مرحوم کے ورثاء نے مردوں کو غسل دینے والے تمام لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ ہر مولوی نے آنے کا وعدہ کیا مگر رات گئے تک کوئی نہ آیا۔ مرحوم کا صبح آٹھ بجے انتقال ہوا اور بالآخر دس بجے رات کو ضلع مظفر گڑھ کے ایک مزدور کو پچاس روپے دے کر میت کو غسل دینے کے لئے لایا گیا اور تدفین عمل میں آئی۔

(امروز، ملتان، مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۷۶ء)

مذہب جب پیشہ بن جائے تو اس میں اس قسم کے واقعات نہ غیر متوقع ہوتے ہیں، نہ غیر معمولی۔ ہر پیشہ ور یہی دیکھتا ہے کہ مجھے اس کام کی اجرت کیا ملے گی۔ "غسل دینے کی اجرت" کا ایک حالیہ واقعہ خود ہمارا چشم دید ہے۔ میت کے مکان کے قریب ایک جامع مسجد ہے۔ وہاں کے غسال سے رابطہ قائم کیا تو اس نے سو روپیہ طلب فرمایا۔ کہا کہ کچھ کم کر دیجئے تو اس نے نہایت رعونت سے جواب دیا کہ کم پیسوں میں غسل دلانا ہو تو وہ سامنے چھوٹی مسجد ہے وہاں کے

مولوی صاحب کو بلا لیجئے۔ چنانچہ چھوٹی مسجد کے مولوی صاحب پچاس روپے پر رضامند ہوگئے۔ وہ غسل بھی دیتے جاتے تھے اور بڑی بڑی مساجد والوں کو ملاحیاں بھی سناتے جاتے۔

غسل تو میت کے تجہیز و تکفین کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہوتا ہے۔ اس کے بعد کفن کا مسئلہ آتا ہے' جس کے لئے "از روئے شریعت" اٹھارہ گز نئے کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر کفن سینے والے کی اجرت' جس کے نزدیک مشین سے کفن سینا مکروہ ہوتا ہے۔ اسے ہاتھ سے سیا جاتا ہے اس لئے اجرت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ازاں بعد گورکن اور ان کے بھائی بند' جنازہ پڑھانے والے مولوی صاحب' پھر قبر کے سرہانے' "اسقاط کرانے والے" اس کے بعد' قل' جمعراتیں' چالیسواں' اور اگر میت کسی امیر آدمی کی ہے تو چالیس دن تک قبر پر "قرآن خوانی"۔۔۔ ان تمام مراحل میں مولوی کی ضرورت لاینفک!

یہ سب کچھ "از روئے شریعت" اس لئے ضروری ہے کہ مولوی صاحبان کا ذریعہ معاش کوئی اور نہیں۔

اور اگر ملتان کے مولوی صاحبان اس لئے غسل دینے کے لئے نہیں آئے کہ میت مسلمان "خاکروب" کی تھی' تو اس ذہنیت پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ہماری یہی ذہنیت تھی جس کی وجہ سے پاکستان کے تمام خاکروب' عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔ ہم انہیں "نیچ" ذات قرار دیتے رہے اور پادریوں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لیا۔

(جنوری ۱۹۷۷ء)

چوتھا باب

تحریک پاکستان اور علماء حضرات

(صرف دو ایک مثالیں)

۱۔ نیشنلسٹ علماء مسلم لیگ سے کیوں الگ ہوئے تھے!

(دین فروشی کی عبرت انگیز مثال)

ابو سعید انور صاحب' تحریک پاکستان کے عینی شاہدوں میں سے ہیں۔ وہ گاہے بگاہے اس تحریک سے متعلق اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ وہ ان کی "دید" ہوتی ہے نہ کہ "شنید" اس لئے ان کے پیش کردہ واقعات اکثر و بیشتر حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کے نوائے وقت (لاہور) میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "تحریک پاکستان کو ناکام بنانے کے لئے بعض مسلمان جماعتوں کا کردار"۔ اس میں انہوں نے مختصر الفاظ میں نیشنلسٹ علماء' آزاد کانفرنس' احرار' بنگال کی کرشک پرجا پارٹی' پنجاب کی یونینسٹ پارٹی' خدائی خدمت گار اور جماعت اسلامی کے متعلق بتایا ہے کہ انہوں نے کس طرح اس تحریک کی مخالفت کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے جمعیت العلمائے ہند کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> یہ حضرات ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں ایک مرحلہ پر مسلم لیگ سے پورا تعاون کرنے کے لئے تیار ہوگئے' مگر پھر کانگرس کے طرفدار ہوگئے۔ یہ کیوں ہوا' اس کی تفصیل جمعیت علمائے ہند کے لئے تکلیف دہ ہوگی' اس لئے اس کا تذکرہ ضروری نہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ محترم ابو سعید انور صاحب کی یہ "رعایت" اصول وقائع نگاری کے مطابق نہیں۔ ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ تاریخ لکھنے بیٹھے تو واقعات کو بے کم و کاست بیان کردے خواہ وہ کسی کے لئے تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہوں۔ نیشنلسٹ علماء مسلم لیگ سے کیوں الگ ہوئے تھے' اس کا علم کم از کم اہل پاکستان کو ضرور ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں محترم ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی اپنی کتاب (QUAID-E- AZAM M. ALI JINNAH AS I KNEW HIM) میں ۳۷-۱۹۳۶ء کے انتخابات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

> پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ میں ہماری قدیم روایت اور ہوس تقریر بازی کی کمزوری کے مطابق بہت سی تقاریر ہوئیں۔ اجلاس میں پہلے دن مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد

مدنی نے مسٹر جناح کی تائید کی اور ان کے اس اقدام کو خوش آمدید کہا کہ وہ مسلم لیگ کو زندہ تحریک کے میدان میں لے آئے ہیں۔ لیکن اجلاس کے آخری دن' ان بزرگوں میں سے ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ انتخابات لڑنے کے لئے لیگ کو وسیع پیمانے پر پروپیگنڈہ کرنا پڑے گا۔ دیو بند اپنی پروپیگنڈہ مشینری کو لیگ کی تفویض میں دینے کے لئے آمادہ ہے' بشرطیکہ اس کے جملہ اخراجات مسلم لیگ برداشت کرے۔ آغاز کار کے لئے انداز" پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا گیا لیکن لیگ کے خزانہ میں تو اس زمانہ میں پچاس پیسے بھی نہیں تھے۔ لیگ کا صدر اور اس کا سیکرٹری اعزازی طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ان مولانا صاحبان کو لیگ کی مالی پوزیشن کا اچھی طرح علم تھا۔ جناح صاحب نے اس کی وضاحت کی تو مولانا حضرات مایوس ہوگئے اور لیگ سے نکل کر سیدھے کانگرس کی طرف چلے گئے اور اس کے حق میں پروپیگنڈہ شروع کردیا کیونکہ کانگریس نے ان کا مطالبہ پورا کردیا تھا۔ (ص۴۲-۴۳)

اور اس کے بعد ان علماء حضرات نے فتووں پر فتوے شائع کرنے شروع کردیئے کہ تحریک پاکستان' اسلام کے خلاف ہے اور کانگریس کی حمایت خدا اور رسولؐ کے ارشاد کے عین مطابق۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حقیقت کو تاریخ کے ریکارڈ پر ثبت رہنا چاہئے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ ان حضرات کے نزدیک دین کی قیمت کتنی ہوتی ہے۔

اور یہ تو صرف جمعیت العلماء کی نقاب کشائی ہے۔ کیا معلوم کہ تحریک پاکستان کی دیگر مسلم جماعتوں کے چہرے سے نقاب اٹھنے کے بعد کس کس قسم کے حقائق سامنے آئیں؟ (جنوری ۱۹۷۷ء)

۲۔ مفتی محمود صاحب اور نظریہ پاکستان

(قائداعظمؒ کو کافر اعظم کہا گیا)

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود بھی اس معاصر (نوائے وقت) سے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری میں مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر محفوظ سمجھتے تھے' اس لئے تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ (نوائے وقت' مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۷۷ء)

مفتی محمود صاحب نے' خان عبدالقیوم خان کے ایک الزام کے جواب میں کہا کہ:

میں نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔۔۔۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد میں نے گزشتہ تیس سال میں پاکستان کی خدمت کی ہے۔

ملک میں سیاسی جدوجہد نظریات اسلام اور سوشلزم کی جدوجہد ہے.....

پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا ورنہ پاکستان کے قیام کی ضرورت کیا تھی!
(نوائے وقت' ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)

آپ لگے ہاتھوں اس خبر کو بھی نوٹ کر رکھئے جو تقسیم ہند سے پہلے' حیدر آباد (دکن) کے اخبار رہبر' دکن' کی ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

مولانا حسین احمد صاحب نے مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت کو حرام قرار دیتے اور قائداعظمؒ کو "کافر اعظم" کا لقب دیتے ہوئے حال ہی میں جو فتویٰ دیا تھا اس کا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیو بندی نے اپنے مکتوب میں جو دہلی کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا' حسب ذیل جواب دیا ہے..... (ہم یہ جواب درج نہیں کر رہے)
(بحوالہ "تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" ص ۱۰۱۲)

قارئین کو اتنا تو ضرور معلوم ہوگا کہ مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) اس دارالعلوم' دیو بند کے شیخ الحدیث تھے جس سے مفتی محمود صاحب نے سند فضیلت حاصل کی تھی اور مولانا مدنی اس جمعیت العلماء ہند کے صدر بھی تھے جو نیشنلسٹ علماء کی نمائندہ جماعت تھی اور مفتی صاحب جس کے اہم رکن تھے۔ (جنوری ۱۹۷۸ء)

۳۔ مفتی محمود نے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا

جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے ملتان میں فرمایا:

قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود نے ابھی تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ مملکت مستحکم ہو۔ مفتی صاحب نے تحریک نظام مصطفیٰؐ کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ (پاکستان ٹائمز' مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

(ستمبر ۱۹۷۸ء)

۴۔ پاکستان قائم کرنے کا گناہ

جمعیت علماء پاکستان کے سینئر نائب صدر' سید محمود شاہ گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ مولانا مفتی محمود نے خود پی این اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔ (روزنامہ مشرق' مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء)

(فروری ۱۹۷۸ء)

پانچواں باب

اسلامی نظام و نظام مصطفیٰؐ

۱۔ نظام مصطفیٰؐ کی اصطلاح

نظام مصطفیٰؐ کی اصطلاح کے متعلق جو کچھ طلوع اسلام بابت جنوری ۱۹۷۸ء (ص۱۵) میں لکھا گیا تھا' اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ ہم نے کہا تھا:۔

> اس سلسلہ میں (ضمناً) ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ ہمارے ہاں آج کل "نظام مصطفیٰؐ" کی اصطلاح رائج ہو رہی ہے۔ اگر اس سے مراد ہے دین خداوندی کا وہ عملی نظام ہے جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا' تو پھر اس میں اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن اگر اس میں نظام کا لفظ خود دین کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے' تو قرآن کریم کی رو سے' یہ درست نہیں۔ قرآن کریم میں اسلام کو دین اللہ کہا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر' دین خدا کی طرف سے ملتا تھا جسے حضرات انبیاء کرامؑ دنیا میں رائج کرتے تھے۔ دین' خود کسی رسول کا وضع کردہ نہیں ہوتا تھا۔ مستشرقین نے اسلام کے لئے (MUHAMMADANISM) اور مسلمانوں کے لئے (MUHAMMADANS) کی اصطلاحات وضع کیں۔ چونکہ ان سے اسلام کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی تھی اس لئے انہیں کافی تگ و تاز کے بعد بدلوایا گیا۔ چونکہ "نظام مصطفیٰؐ" کی اصطلاح سے' اسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان ہے' اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بجائے دین خداوندی یا قرآنی نظام کہنا بہتر ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس باب میں کیا کہا جا رہا ہے۔ موقر جریدہ "الاعتصام" کی اشاعت بابت ۱۷ دسمبر ۱۹۷۷ء میں تحریر ہے:

> تفصیلات میں جانا اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ مقصد یہ گزارش کرنا ہے کہ سالہا سال کی اس طویل مدت میں "صحیح اسلامی حکومت کو قرآنی نظام" "اسلامی نظام" "نفاذ شریعت" "حکومت الہیہ" "خلافت الہیہ" "اللہ کا قانون" سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ حتیٰ کہ پاکستان بنانے کے لئے جو نعرہ عوام کو دیا گیا تھا وہ بھی یہ تھا

"پاکستان کا مطلب کیا! لا الہ الا اللہ"

لیکن معلوم نہیں اس کا پس منظر کیا ہے کہ ان معروف اصطلاحوں کی بجائے اب کچھ عرصہ سے ایک نئی اصطلاح "نظام مصطفیٰ" مخصوص ذہن کے ایک طبقے نے چلا دی ہے جس کے متعلق خود یہ اعتراف اس کے موجد کر رہے ہیں کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی چند ماہ قبل جب بھٹو ازم کے خلاف ملک گیر پیمانے پر تحریک چل رہی تھی تو پروپیگنڈے کے زور پر یہ اصطلاح خوب چلی اور اختلاف و نزاع سے بچنے کے لئے عوام و خواص میں اس کا عام استعمال ہوتا رہا۔ لیکن اب جبکہ حالات کچھ معمول پر آئے ہیں تو بعض وسیع المطالعہ اہل فکر نے اس پر غور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ ملک کے نامور قانون دان مسٹر اے کے بروہی نے کہا ہے کہ چونکہ "نظام مصطفیٰ" کی اصطلاح بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے اس لئے اس کی بجائے "نظام الٰہی" کہا جانا چاہئے۔ اس پر اس اصطلاح کے موجد اور ان کا حلقہ ارادت چیں بہ جبیں ہو رہا ہے اور اس کو غلط مفہوم پہنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات یہ درست ہے اور سنجیدگی سے غور و فکر کی مستحق۔ "نظام مصطفیٰ" کی اصطلاح اس معنی میں درست سہی کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپؐ ہی اس کے پیامبرؐ اول اور اولین داعی تھے۔ اس وجہ سے آپؐ کے لائے ہوئے نظام اسلام کو "نظام مصطفیٰ" کہا جاسکتا ہے۔ لیکن جب کوئی اصطلاح مبہم، ذو معنی اور غلط فہمی کا موجب بنتی نظر آتی ہو تو اس سے احتراز کا حکم ہے جیسا کہ صحابہؓ کو راعنا کہنے سے روک دیا گیا تھا، کیونکہ اس سے یہود غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ اس اصطلاح میں بھی خرابی کے پہلو ہیں۔ مثلاً" غیر مسلم (مغربی اور عیسائی مستشرقین) اسے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ یہ تاثر دیتے آئے ہیں کہ یہ قرآن منزل من اللہ نہیں ہے۔ خود محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی (معاذ اللہ) تصنیف ہے اور یوں وہ اسلام کو دین الٰہی کے بجائے دین محمدیؐ اور آسمانی مذہب کے بجائے انسانی مذہب باور کراتے ہیں۔ اسی لئے وہ اسلام کو اسلام نہیں بلکہ محمڈن ازم لکھتے ہیں اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معنی میں بانی اسلام کہتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ بروہی صاحب کی رائے درست ہے۔ یہ اصطلاح واقعی دشمنان اسلام کے نقطہ نظر کے فروغ کا باعث بن سکتی ہے جو اس کو اپنے مخصوص اور مکروہ

پروپیگنڈے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں۔ بنا بریں' اسلام کے لئے اسلامی نظام' شریعت اسلامیہ اور خلافت اسلامیہ ہی موزوں تر نام ہیں۔ اور یہی اصطلاحات تحریر و تقریر میں استعمال ہونی چاہئیں' جیسا کہ مدتوں سے یہی اصطلاحات زبان زد خاص و عام چلی آرہی ہیں۔ (فروری ۱۹۷۸)

۲۔ اسلامی نظام میں رسولؐ اللہ کا مقام

(قانون سازی کا اہم سوال)

مارچ ۱۹۷۸ء میں' ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کا ایک انٹرویو' ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ اس کا تعارف تو انٹرویو کہہ کر ہی کرایا گیا تھا لیکن وہ ایک مسلسل تقریر تھی۔ اس کا متن مختلف جرائد میں شائع ہوا۔ ہمارے سامنے اس کا وہ متن ہے جو خود مودودی (مرحوم) کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اپریل (۱۹۷۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ لہٰذا' اس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس تقریر کے بعض نکات کے خلاف مختلف گوشوں سے اعتراضات بھی ہوئے ہیں۔

اس تقریر کے موضوع کا نقطہ ماسکہ یہ تھا کہ اسلامی نظام حکومت میں خود رسولؐ اللہ کی پوزیشن کیا تھی۔ اس ضمن میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ:

> حضورؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ملتا تھا اس میں تو آپ لوگوں سے بے چوں و چرا اطاعت کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس میں کسی کے لئے کلام کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جس معاملہ میں اوپر سے کوئی حکم آیا ہوا نہ ہوتا تھا' اس میں آپؐ صحابہؓ سے خود بھی مشورہ فرماتے تھے' صحابہؓ کو بھی یہ حق دیتے تھے کہ وہ آپؐ کی رائے سے اختلاف کریں۔ اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ آپؐ نے اپنی رائے چھوڑ کر ان کی رائے قبول فرمائی ہے۔ (ترجمان القرآن' اپریل ۱۹۷۸ء' ص ۱۳)

آگے چل کر کہتے ہیں:

> اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دو طرح کی تربیت دے رہے تھے۔ ایک اس بات کی تربیت کہ جب خدا کی طرف سے کوئی حکم آئے تو اس کی بے چوں و چرا اطاعت کرو۔ دوسری تربیت اس بات کی کہ جس معاملہ میں خدا کا حکم نہ ہو اس میں اہل الرائے سے مشورہ بھی کیا جائے۔ لوگوں کو بحث کا کھلا حق بھی دیا جائے۔ حضورؐ کی اپنی رائے تک سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری رائے پیش کی جاسکے اور مشورہ کے بعد جو بات طے ہو اس پر عمل کیا جائے۔ (ص ۱۴)

اور آخر میں کہا:

اس مثال سے بھی آپ رسولؐ اللہ کے طرز حکومت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جن معاملات میں اللہ کا حکم ہوتا تھا وہاں کوئی جمہوریت نہ تھی۔ جن معاملات میں اوپر کا حکم نہ ہوتا تھا ان میں پوری جمہوریت تھی۔ (ص ۱۴)

بات صاف، واضح اور دوٹوک ہے، یعنی

۱۔ جن امور سے متعلق خدا کی طرف سے احکام نازل ہوجاتے تھے، ان میں کسی قسم کی دخل اندازی کی گنجائش نہ تھی۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ان احکام کو نافذ کرنا تھا۔ یہ احکام اب قرآن حکیم میں محفوظ ہیں، جو منزل من اللہ کتاب خداوندی ہے۔۔۔۔ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور محفوظ۔

۲۔ جن امور میں وحی خداوندی نازل نہیں ہوتی تھی، وہ باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ اس مشورہ میں حضورؐ اپنی رائے بھی دیتے تھے اور صحابہ کرامؓ بھی۔ اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ فیصلہ حضورؐ کی رائے کے خلاف ہو۔ اسی کا نام اسلامی جمہوریت تھا۔ ظاہر ہے کہ جو فیصلے اس طرح باہمی مشورے سے ہوتے تھے وہ وحی منزل من اللہ کی طرح ہمیشہ کے لئے غیر متبدل نہیں ہوتے تھے۔ مشورہ سے طے کردہ امور میں، حالات کے بدل جانے سے، مشورہ سے تبدیلی ہوسکتی تھی۔

لیکن جب اسلامی نظام حکومت کا یہی نقشہ (پہلے) علامہ اسلم جیراجپوریؒ اور ازاں بعد پرویز صاحب کی طرف سے پیش کیا گیا تو مودودی مرحوم نے طوفان برپا کردیا کہ یہ انکار حدیث ہے، انکار رسالتؐ ہے، الحاد ہے، بے دینی ہے، ارتداد ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ اس موضوع پر طول طویل بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

لیکن یہ تفریق جو انہوں نے (علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے) محمدؐ بن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمدؐ رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسولؐ اور نبیؐ ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا، اس وقت سے لے کر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسولؐ تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولؐ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربی اور مزکی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ کی نجی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آگئے تھے..... قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ

بھی ایسا نہیں..... ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اور حیثیت امارات میں کوئی فرق کیا گیا ہو..... رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے (ہوتی تھی)..... آنحضرتؐ جس وقت' جس حالت میں' جو کچھ بھی کرتے تھے رسولؐ کی حیثیت سے کرتے تھے۔

(تفہیمات' حصہ اول' ۱۹۵۹ء ایڈیشن' ص۴۳-۲۴۱)

اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

(رسول کی) زندگی کے معاملات' عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے یا معلم اخلاق کی حیثیت سے' شہری اور سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر' باپ' بھائی' رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے' سب پر اس کی حیثیت رسالت اس طرح حاوی ہوتی ہے کہ کسی حال میں' ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے منفک نہیں ہوتی۔ حتی کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی بیوی کے پاس ہوتا ہے اس وقت بھی اسی طرح خدا کا رسولؐ ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ (ایضاً ص۲۶۰)

آپ غور فرمایئے کہ جو کچھ مودودی (مرحوم) نے اب اپنی تقریر میں کہا ہے اور جو کچھ تفہیمات میں لکھا تھا' ان میں کس قدر تضاد ہے۔ اور یہ تضاد بھی کسی فروعی مسئلہ میں نہیں' حضورؐ نبی اکرم کی پوزیشن کے متعلق ہے یعنی اس سوال کے متعلق جس پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے اور جس کے مطابق اسلامی نظام حکومت کو قیامت تک قائم ہونا ہے۔

مودودی مرحوم نے جو کچھ تفہیمات میں لکھا تھا اس کی رو سے حضورؐ کے لئے کسی وقت اور کسی معاملہ میں بھی دوسروں سے مشورہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ ایک رسولؐ کا عام لوگوں سے مشورہ کرنے کا کیا مطلب؟ لیکن اس باب میں مودودی مرحوم کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ قرآن کی وہ آیت تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم دیا تھا کہ **وشاورھم فی الامر** (۳/۱۵۸) "اور ان امور میں' ان لوگوں (اپنے ساتھیوں) سے مشورہ کیا کرو"۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا تھا:

لیکن رسولؐ اللہ کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمالیں تو خدا پر بھروسا کرکے عمل کا اقدام فرمایئے۔ **فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** (۳/۱۵۸)۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے بلکہ آپ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے (ایضاً ص۲۴۵)۔

ہم مودودی مرحوم کی اس مضحکہ انگیز تاویل پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی حالیہ تقریر میں فرمایا ہے کہ جن امور میں خدا کی طرف سے حکم نازل نہیں ہوتا تھا' ان میں آپ اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس مشورہ میں آپ کی بھی ایک رائے ہوتی تھی اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ فیصلہ آپ کی رائے کے خلاف ہو۔ آپ اس فیصلہ پر عمل بھی فرماتے تھے۔ اس کا نام اسلامی جمہوریت تھا؟

سوال یہ ہے کہ رسول اللہ کی حقیقی حیثیت وہ تھی جس کا اظہار تفہیمات میں کیا گیا تھا یا وہ جسے حالیہ تقریر میں بیان کیا گیا ہے۔

قانون سازی کا سوال

اگلا اہم ترین سوال' اسلامی نظام حکومت میں قانون سازی کا ہے۔ اس باب میں مودودی مرحوم نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

> اس کے بعد مقننہ کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو دین رسولؐ اللہ لائے تھے اس میں چونکہ بنیادی طور پر قانون اللہ تعالیٰ کا تھا اور وہی قانون بنانے کا حق رکھتا تھا اس لئے رسول اللہ کی حیثیت قانون ساز کی نہ تھی' بلکہ قانون کو نافذ کرنے والے' اس کی تشریح کرنے والے اور لوگوں کو اس کے مطابق عدل و انصاف کا نظام چلانے کی تربیت دینے والے کی تھی..... اس لئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضورؐ خود قانون ساز نہیں تھے بلکہ اصل قانون اللہ تعالیٰ کا تھا اور آپ اس کے مقرر کردہ سرکاری شارح تھے۔ (ترجمان القرآن' بابت اپریل ۱۹۷۸ء' ص۱۵)

بات بالکل واضح ہے۔ لیکن جب یہی بات پرویز صاحب نے کہی تھی تو مودودی مرحوم نے لکھا تھا:

> حدیث کے مستقل ماخذ ہونے کی نفی سے اگر یہ مراد ہے کہ' اس کی حیثیت صرف شارح اور مفسر کی ہے' یعنی وہ انہی مسائل و وقائع کی وضاحت کرتی ہے جن کا مجملاً قرآن میں ذکر آگیا ہے اور خود اس کی اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں ہے تو یہ دعویٰ واقعہ کے خلاف ہے..... مسائل و احکام کے باب میں حدیث ایک مستقل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ (ترجمان القرآن' بابت جولائی' اگست' ستمبر ۱۹۵۰ء)

دوسرے مقام پر لکھا:۔

> حضورؐ نے استاد کی حیثیت سے جو کچھ بتایا اور سکھایا ہے وہ اسی طرح خدا کی طرف سے ہے جس طرح قرآن خدا کی طرف سے ہے۔ اس کو "غیر از قرآن" کہنا صحیح نہیں ہے۔

(تفہیمات، حصہ اول، ص۳۳۶)

آپ غور فرمایئے کہ اس باب میں مودودی مرحوم نے جو کچھ پہلے لکھا تھا اور جو کچھ اب فرمایا ہے، ان میں کس قدر تضاد ہے۔ اور (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) تضاد بھی کسی فرعی مسئلہ میں نہیں۔۔۔۔۔ ایسے اہم سوال میں ہے جس کا تعلق نظام حکومت اسلامی کی اساس و بنیاد پر ہے۔ (جون ۱۹۷۸ء)

۳۔ مرکز ملت کا مفہوم

(اعتراضات کا جواب)

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک صاحب جماعت اسلامی سے متعلق ہیں جو حسب معمول ہر وقت کوئی نہ کوئی بحث چھیڑے رہتے ہیں اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے ان کا موضوع پرویز صاحب اور طلوع اسلام کی مخالفت ہوتا ہے۔ انداز ان کا یہ ہے کہ وہ یکسر جھوٹے الزامات عائد کرتے ہیں اور لطف یہ کہ جب ان کا جھوٹ ثابت ہو جائے تو انہیں نہ اس پر خفت ہوتی ہے نہ ندامت۔ وہ بلکہ اس جھوٹ پر ایک اور جھوٹ کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ اس وقت آپ کے لئے باعث زحمت ان کا ایک سنگین سا الزام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب نے (گورنر جنرل مرحوم) غلام محمدؒ جیسے فاسق و فاجر کو (یہ ان کے الفاظ ہیں) "مرکز ملت" قرار دے کر، اس کی اطاعت کو بمنزلہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیا تھا۔ چونکہ اس کے متعلق ہمیں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں اور ہم کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس کا ہمیں یقینی طور پر علم نہ ہو، اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس مبینہ واقعہ پر بھی روشنی ڈالیں اور "مرکز ملت" کی اصطلاح کے مفہوم کی بھی وضاحت فرما دیں تاکہ بات ہمیشہ کے لئے صاف ہو جائے۔

طلوع اسلام

آپ ان حضرات کے جھوٹ پر نہ خفا ہوا کریں نہ متعجب..... انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ زندگی کی بعض اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے (مودودی مرحوم)۔ اور یہ تو غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ شریعت کی رو سے، واجب کا ترک کرنا گناہ کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے یہ بیچارے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جہاں تک "مرکز ملت" کی اصطلاح اور اس کے مفہوم کا تعلق ہے، انہیں اس کا اچھی طرح سے علم ہے۔ اس لئے یہ حضرات اگر اس قسم کا الزام تراشتے ہیں تو وہ لاعلمی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ وہ دیدہ دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ ہم اسے یہاں دہرا دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

طلوع اسلام کا پہلا پرچہ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ آپ اس دور کے پرچوں کے ٹائٹل کی لوح جبیں پر مرکز ملت

اور اس کی اطاعت کے الفاظ نمایاں طور پر منقوش پائیں گے۔ اس کی اکتوبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں علامہ اسلم جیراجپوریؒ کا مقالہ "اسلامی نظام" کے عنوان سے' اور نومبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں پرویز صاحب کا ایک مقالہ "مرکزیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان میں انہوں نے بتایا کہ اسلامی نظام' خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دوسرا نام ہے اور اس نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت امت کا فریضہ۔ اس سنٹرل اتھارٹی کے لئے "مرکز ملت" کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ تشکیل پاکستان کے بعد' جولائی ۱۹۴۸ء اور ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعتوں میں پرویز صاحب کے مبسوط مقالات شائع ہوئے جن میں اس اصطلاح کے تمام گوشوں پر میر حاصل بحث کی گئی۔ ان تمام مقالات کو اس کتابچہ میں یکجا کرکے شائع کردیا گیا جس کا نام ہے "اسلامی نظام"۔ اس کے بعد بھی وقتاً" فوقتاً" ان الفاظ کا صحیح مفہوم سامنے لایا جاتا رہا ہے۔ جب جماعت اسلامی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ طلوع اسلام' ملک غلام محمدؒ (مرحوم) کو مرکز ملت قرار دے کر اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے تو اس کی تردید میں متعدد بار اس کی وضاحت کی گئی۔ ہم اس ضمن میں اس شذرہ کو شائع کرتے ہیں جو جولائی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔۔۔۔۔ بالخصوص اس لئے کہ اس میں ملک غلام محمدؒ (مرحوم) کا بھی نام آگیا تھا۔ وہ شذرہ حسب ذیل ہے جو ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

۱۔ نبی اکرمؐ کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضورؐ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ حضورؐ کی یہ حیثیت منفرد تھی جس میں نہ اس وقت کوئی اور شریک ہوسکتا تھا' نہ اس کے بعد۔ اس لئے کہ حضورؐ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ حضورؐ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا' جب تک وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاءؑ پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

۲۔ حضورؐ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً" نافذ کیا جائے۔ اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔ اس مرحلہ میں حضورؐ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔ دوسراہ مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہوگیا تھا۔ اس میں حضورؐ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔ دور حاضر کی اصطلاح کے مطابق' اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (STATE) اور اس اتھارٹی کو (HEAD OF THE STATE) کہا جاتا ہے۔ ان ہر دو مراحل میں' حضورؐ کی اطاعت جماعت مومنین پر فرض تھی۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد' وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اسے غلاف علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔ اب مرکز ملت' حضورؐ کا جانشین' خلیفۃ الرسولؐ' یا امیرالمومنین تھا' اور امت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

۴۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینان رسالت مابؐ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رک گیا اور غلافت' سلطنت میں تبدیل ہوگئی جس میں احکام خداوندی کے بجائے سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔ چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا تھا اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اسی قسم کی تھی' جس قسم کی دنیا

کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان سلاطین کو "مرکز ملت" کہنا ہی غلط ہے۔ "مرکز ملت" صرف اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکام خداوندی کو نافذ کرے اور امور مملکت امت کے مشورہ سے طے پائیں۔ جو نظام' خدا کی عائد کردہ علال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پرواہ نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے کیا تعلق؟ اس کی اطاعت' طاغوت کی اطاعت ہے۔ یہ طلوع اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوع اسلام (مثلاً") غلام محمد مرحوم یا اسکندر مرزا کو مرکز ملت اور ان کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ **هذا افک عظیم۔** طلوع اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس نے مرکز ملت کی تشریح ہمیشہ "خلافت علیٰ منہاج رسالت" کے الفاظ سے کی ہے' یعنی اس قسم کا نظام جو **محمد رسول اللہ والذین معہ** کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا' جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

۵ - جب صحیح اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) باقی نہ رہے تو پھر دین عملاً" موجود نہیں رہتا' مذہب رہ جاتا ہے' جس میں سیاسی امور کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور شخصی امور میں لوگوں کو اجازت دے دیتی ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے عمل کریں۔ سابقہ امتوں میں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتی تھی اور اب ہمارے ہاں صدیوں سے یہی شومیت کارفرما ہے۔ شخصی امور میں لوگ اپنی صوابدید کے مطابق' اس طریق پر چلنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں جو حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھا۔ اس میں بھی جس قدر اختلاف پائے جاتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس طریق کار میں اختلافات ناگزیر ہیں۔ یہی وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے یہ روایت وضع کرلی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔ "مرکز ملت" کی موجودگی میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (واضح رہے کہ اب خود اہل حدیث حضرات نے بھی اس کا اعتراف کرلیا ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے)۔

۶ - ایسا نظام' جس میں امت کو احکام خداوندی کے مطابق چلایا جائے' پھر سے قائم ہوسکتا ہے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو وہ "مرکز ملت" کہا جائے گا جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکز سب سے پہلے خود احکام خداوندی کی اطاعت کرے گا۔

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو' جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے' اس میں اس کے سابقہ ادوار کے فیصلے علیٰ حالہ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو' ان میں اس دور کی حکومت ضروری تبدیلی کرلیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم رہی' اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآن کریم نے جب امور مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہی منشا تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں جس میں نبی اکرمؐ نے

فرمایا کہ "تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت واجب ہے" تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ "خلفائے راشدینؓ" کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے۔ اگر خلافت راشدہ' مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے لے کر آج تک کے خلفاء' خلفائے راشدینؓ ہوتے۔ اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہوگیا ہے تو اسے پھر جاری کیا جاسکتا ہے۔ جب وہی سلسلہ پھر قائم ہو جائے گا تو ان نئے خلفائے راشدینؓ کی سنت کی اطاعت واجب ہو جائے گی۔ اس سے مراد ہوں گے وہ فیصلے جو یہ نظام قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں باہمی مشاورت سے کرے گا۔

یہ ہے اس باب میں طلوع اسلام کا مسلک' جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھ سکے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ طلوع اسلام کے نزدیک "مرکز ملت" کا مفہوم کیا ہے؟ لیکن جماعت اسلامی والے اس کے بعد بھی یہی رٹ لگاتے جائیں گے کہ پرویز صاحب ملک غلام محمد (مرحوم) جیسے فاسق و فاجر کو مرکز ملت قرار دے کر اس کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتے تھے! سوتے کو تو جگایا جاسکتا ہے' جاگتے کو کون جگا سکتا ہے۔

(جولائی ۱۹۷۸ء)

چھٹا باب

زکوٰۃ کا مفہوم اور نصاب زکوٰۃ میں تبدیلیاں

۱۔ نصاب اور عشر کا قرآنی مفہوم

(نصاب میں تبدیلیاں۔۔۔۔ تفصیلی بحث)

"قوانین حدود" کے بعد حکومت پاکستان' زکوٰۃ کے متعلق قوانین نافذ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی طرف سے رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے ان قوانین کا مسودہ ملک میں شائع کردیا گیا ہے۔ قارئین طلوع اسلام کی طرف سے ہم سے ان قوانین پر تبصرہ یا تنقید کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ قوانین بھی فقہ پر مبنی ہیں' اور فقہی قوانین کے متعلق ہمارا نقطہ نظر طلوع اسلام کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اس کی روشنی میں ان قوانین پر تنقید یا تبصرہ ہمارے دائرۂ فکر و تحقیق سے باہر ہے۔ البتہ ہم یہ بتاسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور ایسا بتانا ضروری بھی سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید کی رو سے زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن یہ مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک قرآن کریم کے معاشی نظام کا تصور ذہن میں نہ ہو۔ یہ نظام تفصیل طلب ہے اور اس کے متعلق طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ جامع طور پر اس نظام کی تفاصیل پرویز صاحب کی کتاب۔۔۔۔ نظام ربوبیت۔۔۔۔ میں درج ہیں' جسے ادارہ کی طرف سے حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مقام پر ہم اس کے نمایاں خط و خال پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں' جن کی روشنی میں زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم سمجھ میں آجائے گا۔

---------- (۱) ----------

قرآن کے معاشی نظام کا نقطہ ماسکہ' ماحصل یا مقصود ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/۶)

روئے زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

انسانوں کو بالخصوص مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

نحن نرزقکم وایاھم (۱۵۳/۶)

تمہارے رزق کی ذمہ داری بھی ہم پر ہے اور تمہاری اولاد کے رزق کی بھی۔

ان آیات (اور اس نوع کی دیگر متعدد آیات) میں یہ کہا گیا ہے کہ تمام انسانوں کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر

لے رکھی ہے۔ اس مقام پر یہ بنیادی نکتہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ انسانوں کے بارے میں خدا نے جو ذمے داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں وہ اس حکومت کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہیں جو خدا کے نام پر قائم کی جائے۔ اسے نظام خداوندی کہئے یا اسلامی مملکت' مطلب اس سے ایسی مملکت ہے جو خدائی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ اس اجمال کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ یہ کہنے کے ساتھ ہی (کہ تمام افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے) جماعت مومنین سے بار بار تاکید کی گئی ہے کہ وہ افراد معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کا انتظام کریں۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے:

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا (۷۶/۸)

یہ لوگ ان تمام افراد کے رزق کا انتظام کرتے ہیں جو کسی وجہ سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہ ہوں۔

وہ اس ذمہ داری کو اپنا فریضہ زندگی سمجھ کر پورا کرتے ہیں' اور جن کی ضروریات پوری کرتے ہیں ان سے کہتے ہیں:۔

انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا (۷۶/۹)

ہم تمہارے رزق کا انتظام فریضہ خداوندی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کے لئے ہم تم سے معاوضہ تو ایک طرف' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔

جو لوگ ایمان کا دعویٰ تو کریں لیکن اس فریضہ خداوندی کو پورا نہ کریں' ان کے متعلق کہا کہ وہ دین کی تکذیب کرتے ہیں۔

سورۃ الماعون میں ہے:۔

ارء یت الذی یکذب بالدین (۱۰۷/۱)

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتا ہے؟ یہ شخص وہ ہے

لا یحض علی طعام المسکین (۱۰۷/۳)

جو ضرورت مندوں کی ضروریات نہ خود پوری کرتا ہے' نہ دوسروں کو ان کے پورا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ جب اس قسم کے لوگ ذلیل و خوار ہوتے ہیں (یعنی ایسا نظام تباہ و برباد ہوتا ہے) تو یہ واویلا مچا دیتے ہیں کہ خدا نے ہمیں خواہ مخواہ' بلا جرم و تقصیر' ذلیل اور تباہ کردیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ خدا کسی کو یونہی تباہ اور ذلیل نہیں کیا کرتا۔ تمہاری یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ:

ولا تحضون علی طعام المسکین (۸۹/۱۸)

تم لوگوں کو اس کی ترغیب نہیں دیا کرتے تھے کہ وہ ضرورت مندوں کے رزق کا سامان

فراہم کریں۔

ان (اور اسی قسم کی دیگر متعدد آیات) سے یہ واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رزق فراہم کرنے کی جو ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے وہ اسے براہ راست پورا نہیں کرتا۔ وہ انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے جو اسے فریضہ خداوندی سمجھ کر پورا کرتے ہیں۔ اس حقیقت کو سورۂ یٰسین میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جب کہا:۔

واذا قیل لھم انفقوا مما رزقکم اللہ

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا ہے اسے دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کھلا رکھو۔

قال الذین کفروا للذ ین امنوا

تو جو لوگ نظام خداوندی سے انکار کرتے ہیں وہ ان لوگوں سے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں، کہتے ہیں:۔

انطعم من لو یشاء اللہ اطعمہ

کیا تم یہ کہتے ہو کہ جو ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لی ہے، اسے ہم پورا کریں؟ خدا ان لوگوں کو خود رزق کیوں نہیں دیتا؟

اس کے جواب میں کہا کہ:

ان انتم الا فی ضلال مبین (۳۶/۴۷)

تم لوگ کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں ہو جو یہ کہتے ہو کہ خدا کو چاہئے کہ وہ انسانوں تک براہ راست رزق پہنچائے۔ یہ ذہنیت کافرانہ ہے۔ خدا اپنی ذمہ داریاں خود نہیں پوری کیا کرتا۔

اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا:۔

تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا رہے کہ یا اللہ مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے ہن نہیں برسا کرتا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔ (شاہکار رسالت)

اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری کس قدر اہم اور بنیادی ہوتی ہے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے اس اعلان سے لگ سکتا ہے جس نے گویا ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:۔

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ (شاہکار رسالت)

نیز، نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ:

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہوگیا۔ (نظام ربوبیت)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ

تمام افراد معاشرہ کو ضروریات زندگی بہم پہنچانا اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔

---------- (۲) ----------

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی مملکت اس ذمہ داری کو پورا کس طریق سے کرے! اس کے لئے پہلا اقدام یہ ہے کہ یہ مملکت تمام افراد معاشرہ کو ان کی استعداد کے مطابق کام مہیا کرے اور یہ افراد اس کام کو فریضہ خداوندی سمجھ کر سرانجام دیں کیونکہ وہ اسی صورت میں رزق خداوندی کے حقدار تصور کئے جاسکیں گے۔ قرآن کے معاشی نظام کا دوسرا نکتہ ماسکہ یہ ہے کہ

وان لیس للانسان الا ما سعی و ان سعیہ سوف یری۔ ثم یجزہ الجزاء الاوفی (۵۳/۳۹-۴۱)

انسان صرف اسی کا حق دار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ اس نظام میں کسی کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

یعنی اس نظام میں ہر فرد کاسب ہوگا' محنت کش ہوگا' کام کرے گا۔ اس میں استثنا صرف ان کی ہوگی جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوں یا وہ اتنا کام نہ کرسکیں جن سے ان کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (۷۰/۲۴-۲۵)

ان لوگوں کی کمائی میں ان لوگوں کا حق ہے جو صاحب احتیاج ہیں یا جو بالکلیہ کام کرنے سے معذور ہیں۔ ان کا یہ حق ایسا ہے جس کا ہر ایک کو علم ہونا چاہئے۔

یعنی ان لوگوں کو سامان رزق بطور خیرات نہیں ملے گا۔ وہ اسے اپنے حق کے طور پر (AS OF RIGHT) لے سکیں گے کیونکہ یہ اس مملکت کا فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں انتظام یہ ہوگا کہ افراد کاسب اپنی کمائی میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لے لیں گے اور اس سے زیادہ جو کچھ بچے گا اسے بطیب خاطر مملکت کی تحویل میں دے دیں گے۔ اور یہ اس ارشاد خداوندی کی تعمیل میں ہوگا جس میں کہا گیا ہے:۔

ویسئلونک ما ذا ینفقون قل العفو۔ (۲/۲۱۹)

اے رسول! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زیادہ ہے' سب کا سب۔

واضح رہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس نظام کو فریضہ خداوندی سمجھ کر بطیب خاطر قبول کیا ہے۔ اس لئے وہ زائد

از ضرورت اپنے قلب و دماغ کی پوری رضا مندی سے مملکت کی تحویل میں دے دیتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے جبر اور اکراہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عقل و فکر کی رو سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ جب ہر فرد کو اس کی ضمانت حاصل ہو کہ اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی رہیں گی' تو وہ فالتو روپیہ (SURPLUS MONEY) اپنے پاس رکھے گا کاہے کے لئے؟ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے دولت جمع کرنے کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ اس باب میں اس میں بکثرت آیات آئی ہیں۔ مثلاً" ایک جگہ کہا ہے:

۔

تدعوا من ادبر تولی وجمع فاوعی (۱۸-۱۷/۷۰)

جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے اسے جو نظام خداوندی کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے یا اس میں گریز کی راہیں تراشتا ہے' یعنی وہ جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اس تھیلی کا منہ اس طرح بند کرتا ہے کہ اس میں سے کچھ نکلنے نہ پائے۔

سورۃ الھمزۃ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

اے رسول!' تم اعلان کردو کہ وہ شخص تباہ و برباد ہو کر رہے گا جس کی زندگی کا مقصد یہ ہو کہ وہ دولت اکٹھی کرتا رہے اور پھر گنتا رہے کہ وہ کتنی ہوگئی..... اس سے پوچھو کہ کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ مصیبتوں سے بچاتا رہے گا۔ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کا زعم باطل ہے۔ اس کے اس مال کو ناکارہ شے کی طرح اس تباہی کے جہنم میں جھونک دیا جائے گا جو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا اور یوں وہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس جہنم میں خدا کے قانون مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (۷-۱/۱۰۴)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ دولت کا جمع کرنا نظام خداوندی کے خلاف گویا بغاوت ہے اور اس کی سزا جہنم۔ یہ اس لئے کہ قرآن کا معاشی نظام اور نظام سرمایہ داری ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قرآن کریم نے اپنے نظام کو ان مختصر الفاظ میں سمٹا کر بیان کردیا ہے:۔

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ (۹/۱۱۱)

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین سے ان کی جان اور ان کا مال خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے میں جنت کی زندگی عطا کردیتا ہے' جس میں ہر قسم کے رزق کی فراوانیاں ہوتی ہیں (اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)۔

لہٰذا' قرآن کے معاشی نظام کی دوسری شق یہ ہے کہ:

اس میں ہر فرد محنت کرتا ہے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے

کر' باقی سب' بطیب خاطر نظام مملکت کی تحویل میں دے دیتا ہے تاکہ وہ اس سے عالم گیر ربوبیت کا فریضہ سرانجام دے۔

---------- (۳) ----------

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی پوری کرے۔ ضروریات زندگی میں صرف روٹی' کپڑا' مکان" شامل نہیں۔ ان میں وہ تمام اسباب و ذرائع شامل ہیں جن سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما (DEVELOPMENT)ہوتی ہے۔ عربی زبان میں نشوونما کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔ لہٰذا' ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوں گے سامان نشوونما مہیا کرنا۔ قرآن کریم نے اسے اسلامی مملکت کا فریضہ قرار دیا ہے جہاں فرمایا ہے :۔

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ.... (۲۲/۴۱)

یہ (مومن) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ نظام زکوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

اس آیہ جلیلہ میں **اتوا الزکوۃ** کے الفاظ سارا مفہوم واضح کر دیتے ہیں' یعنی یہاں یہ نہیں کہا کہ جب ان کی حکومت قائم ہوگی تو یہ لوگوں سے زکوٰۃ لیں گے۔ کہا یہ گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے اور یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ زکوٰۃ کے معنی "سامان نشوونما" ہیں۔ اس سے یہ مفہوم واضح ہے کہ ان کی حکومت قائم ہوگی تو ان کا فریضہ یہ ہوگا کہ افراد معاشرہ کی نشوونما کا سامان فراہم کریں۔

دوسری جگہ ہے:۔

والذین ھم للزکوۃ فاعلون (۲۳/۴)

ان لوگوں کا نظم و نسق سامان نشوونما فراہم کرنے کے لئے ہوگا۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے زکوٰۃ کا مفہوم۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ان نصوص صریحہ کی موجودگی میں زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم کیسے پیدا ہوگیا' یعنی یہ مفہوم کہ انسان جس قدر جی چاہے مال و دولت جمع کرلے اور سال کے بعد اس میں سے کچھ پیسے خیرات کے طور پر نکال کر دے تو یہ سارا کاروبار اسلام کی رو سے جائز قرار پا جائے گا۔ یہ کیسے ہوگیا' اس کی داستان بڑی غور طلب ہے۔ قرآن کریم میں حسب ذیل آیت بڑی اہم اور قرآن کے معاشی نظام میں اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا:۔

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقو نھا فی سبیل اللہ فبشر ھم بعذاب الیم۔ یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لا نفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون،
(۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں نہیں دے

دیتے' اے رسول! تو انہیں الم انگیز عذاب کی "بشارت" سنا دے۔ جب چاندی سونے کے ان جمع کردہ سکوں کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں' پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب ان جمع شدہ مال کے لائے ہوئے عذاب کا مزہ چکھو!

یہ آیہ جلیلہ اپنے معانی میں بالکل واضح ہے۔ مال و دولت جمع کرنے کے خلاف اس سے واضح تر الفاظ کون سے لائے جاسکتے تھے؟ لیکن احادیث کے ایک مجموعہ ابوداؤد کی روایت ہے:۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا' یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کردوں گا اور اس مشکل کو حل کردوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا' یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ نے فرمایا' خدائے تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کردے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوش مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

(ابوداؤد' بحوالہ مشکوۃ' کتاب الزکوٰۃ' اردو ترجمہ
شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب' ص۱۰-۳۰۹)

بادنیٰ تدبر یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ یہ روایت وضعی ہے اور اس زمانہ کی وضع کردہ جب مسلمانوں میں (دور ملوکیت میں) نظام سرمایہ داری رائج ہوچکا تھا۔ اس میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم نازل ہوتا ہے اور وہ (معاذ اللہ) صحابہؓ پر گراں گزرتا ہے۔ خدا کا حکم تو ایک طرف' نبی اکرمؐ کے فیصلوں کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ:

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (۴/۶۵)

اے رسول! تیرا رب اس پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی صاحب ایمان نہیں ہوسکتے جب تک یہ اپنے ہر متنازع معاملے میں تجھے حکم مقرر نہ کریں۔ اور اس کے بعد تیرے فیصلہ کے خلاف اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں' بلکہ [illegible] کے سامنے بطیب خاطر سر تسلیم خم کردیں۔

آپ سوچئے کہ جن مومنین کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے تو کیا ان کی حالت یہ ہوگی کہ [illegible] یک حکم نازل ہو اور وہ ان پر گراں گزرے! (معاذ اللہ)۔

پھر ان "کبیدہ خاطر" صحابہؓ کی نیابت کے لئے اپنے آپ کو پیش کون کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ جن کی حالت یہ تھی کہ ان کی خلافت کے زمانے میں بھی ان کے تہبند پر بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ وہ خدمت نبویؐ میں حاضر ہوتے ہیں تو کیا کہنے کے لئے؟ یہ کہنے کے لئے کہ خدا کے اس حکم سے آپؐ کے صحابہؓ ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ آپ اس مشکل کا کوئی حل تجویز فرمادیجئے' یعنی رسولؐ اللہ کا فریضہ احکام خداوندی کی اطاعت کرانا نہیں تھا' ان کی پیدا کردہ مشکلات کا حل تجویز کرنا تھا (معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ)۔

اور یہ وہ رسولؐ تجویز فرماتے ہیں جنہوں نے ساری عمر زائد از ضرورت ایک پیسہ بھی اپنے ہاں نہیں رکھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ (مروجہ مفہوم کے مطابق) زکوٰۃ بھی نہیں دی!

یہ ہے وہ روایت جس کی رو سے قرآن کریم کا پورا معاشی نظام' نظام سرمایہ داری میں بدل گیا۔ بے حد و نہایت مال جمع کرنا عین مطابق اسلام قرار پاگیا بشرطیکہ اس میں سے کچھ پیسے خیرات کے طور پر الگ کردیئے جائیں۔ ان پیسوں کا نام زکوٰۃ قرار پاگیا۔ فقہ نے اس کے لئے قوانین مرتب کئے۔ زکوٰۃ کا نصاب' اس کی شرح اور مصارف سے متعلق قوانین' فقہ کے مرتب کردہ ہیں۔ جب ہماری اپنی مملکت نہیں تھی تو ان قوانین پر انفرادی طور پر عمل ہوتا تھا' یعنی ہندوستان میں ہم اسی نصاب اور شرح کے مطابق اپنے طور پر زکوٰۃ نکالتے اور خرچ کرتے تھے۔ اب ہماری اپنی مملکت ہے تو یہی قوانین اس کی طرف سے نافذ کردیئے جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے جسے ہم آخر میں سامنے لائیں گے۔

---------- (۴) ----------

زکوٰۃ کے سلسلے میں متفقہ طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کے مصارف خود قرآن کریم نے متعین کردیئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے مصارف قرآن کریم نے متعین کردیئے ہیں تو پھر اس کا مفہوم وہ نہیں ہوسکتا جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے مصارف کہیں بیان نہیں کئے۔ اس کے لئے جس آیت کو بطور سند پیش کیا جاتا ہے اس میں کہا یہ گیا ہے کہ:

انما الصدقات للفقراء والمسکین (۹/۶۰)

یعنی یہ مصارف صدقات کے ہیں' زکوٰۃ کے نہیں۔ ان دونوں کے فرق کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ صدقات کے معنی "عطیات" کے ہیں۔ ان عطیات کی دو شکلیں ہوسکتی ہیں۔

۱۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب جماعت مومنین کی اپنی مملکت قائم ہو جائے گی تو یہ افراد معاشرہ کو سامان نشوونما فراہم کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لے گی اور اس مقصد کے لئے تمام کاسب افراد زائد از ضرورت کمائی مملکت کی تحویل میں دے دیں گے۔ جب یہ مملکت ہنوز قائم نہیں ہوگی تو افراد معاشرہ اپنی ضروریات آپ پوری کرنے کے ذمے دار ہوں گے۔ لیکن اس زمانے میں بھی معاشرہ میں ایسے افراد ہوں گے جو اپنی ضروریات کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں گے۔ اس مقصد کے لئے کاسب افراد سے عطیات کی اپیل کی جائے گی۔ انہیں صدقات کہہ کر پکارا

گیا ہے۔

۲۔ اپنی مملکت کے قائم ہونے کے بعد بھی ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوسکتے ہیں' جن میں افراد معاشرہ سے اپیل کی جائے گی کہ جو کچھ انہوں نے اپنی ضروریات کے لئے رکھا ہے' اس میں سے بھی کچھ ان ہنگامی ضروریات کے لئے عطیہ کے طور پر دیدیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کہا گیا ہے:

ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ (۵۹/۹)

یہ لوگ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیں گے اور اس مقصد کے لئے خود تنگی ترشی میں گزارہ کرکے زیادہ سے زیادہ بطور عطیہ دوسروں کے لئے دے دیں گے۔

یہ عطیات بھی صدقات کہلائیں گے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے' زکوٰۃ کے مصارف قرآن کریم میں متعین نہیں کئے گئے۔ زکوٰۃ کا تو مطلب اسلامی مملکت کی طرف سے اور افراد معاشرہ کے لئے سامان نشوونما مہیا کرنا ہے۔ یہ کسی خاص فنڈ کا نام نہیں جس کے مصارف کے تعین کی ضرورت لاحق ہو۔

---------- (۵) ----------

زمین

سامان نشوونما کا بنیادی ذریعہ زمین ہے۔ ظاہر ہے کہ جب افراد معاشرہ کو سامان نشوونما فراہم کرنا اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوگا تو زمین بھی اسی کی تحویل میں رہے گی۔ اس نظام کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں متعدد آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ زمین کا مقصد تمام نوع انسانی کی ضروریات زندگی پورا کرنا ہے۔ **والارض وضعھا للانام** (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم نے اپنی مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے"۔ **سواء للسائلین** (۴۱/۱۰) "اس لئے اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے"۔ حضور نبی اکرمؐ نے اس اصول کو مختصر لیکن بڑے جامع انداز میں بیان فرمایا جب کہا کہ:

ان الارض ارض اللہ والعباد عباد اللہ

(ابوداؤد)

زمین اللہ کی ملکیت ہے اور انسان اللہ کے بندے ہیں' اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

لہٰذا' جو اصول دوسری دولت کے سلسلے میں کار فرما ہوگا وہی زمین کی پیداوار پر بھی منطبق ہوگا' یعنی کاشت کرنے والوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی فصل حکومت کی تحویل میں آجائے گی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:۔

یایھا الذین امنوا انفقوا من طیبٰت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من

الا رض

(۲/۲۶۷) ز (۶/۱۴۲)

یعنی جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اور جو کچھ زمین سے حاصل کرو' اسے بطیب خاطر' ربوبیت عالمینی کے لئے کھلا رکھو۔

قل العفو کا اصول دونوں پر یکساں لاگو ہوگا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے' زرعی پیداوار کے محصل سے کہا تھا کہ کاشتکار کی ضروریات سے جس قدر زائد ہو' وہ ہمارا حق ہے۔ اس پر اس نے کہا کہ اس طرح تو شاید ہمیں کچھ بھی نہ مل سکے تو آپؓ نے فرمایا:۔

وان رجعت کما ذھبت۔ ربحک انا امرنا ان ناخذا العفو۔ یعنی الفضل (لخراج الیحی ص۷۵)

جس طرح تو گیا تھا چاہیے اسی طرح خالی واپس آنا پڑے' تجھ پر افسوس ہے۔ (کیا تجھے یاد نہیں کہ) ہمیں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہو ہم وہ وصول کریں۔

لیکن جب دین مذہب میں بدل گیا اور خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو نظام سرمایہ داری کی دوسری شقوں کی طرح زمین کو بھی ذاتی ملکیت میں دے دیا گیا اور روپے پر زکوٰۃ کی طرح فصل کے ایک متعین حصے کو زکوٰۃ قرار دے دیا گیا۔ اصطلاح میں اسے عشر سے تعبیر کیا جاتا ہے' یعنی پیداوار کا دسواں حصہ۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم کے معاشی نظام کی رو سے' نہ کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے نہ زمین پر ذاتی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے دور ملوکیت میں جو معاشی نظام وجود میں لایا گیا اس کی رو سے کہا گیا کہ:

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں' بلا حد و نہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ' پیسہ' جانور' استعمالی اشیاء' مکانات' سواری' غرض کسی چیز کے معاملے میں بھی قانوناً" ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ' اتنے مکان' اتنا تجارتی کاروبار' اتنا صنعتی کاروبار' اتنے مویشی' اتنی موٹریں' اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو' اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہوسکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین' از سید ابوالاعلیٰ مودودی' پہلا ایڈیشن' صفحات نمبر ۷۳ ز ۵۲)

اس میں جو کہا گیا ہے "شرعی حقوق و واجبات ادا کرنے کے بعد" تو ان سے مراد مال و دولت پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار میں عشر ہے۔ زکوٰۃ کی شرح عام طور پر اڑھائی فی صد اور عشر کے معنی ہیں دس فی صد۔ یہ ہے مروجہ فقہی قوانین کی رو سے اسلام کا معاشی نظام۔

---------- (۶) ----------

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ زکوٰۃ اور عشر کے قوانین کے سلسلے میں ایک بڑا اہم سوال سامنے آجاتا ہے جس سے بہت بڑی دشواری پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عقیدہ یہ چلا آرہا ہے کہ فقہ نے جو شرح تجویز کر رکھی ہے' (یعنی سونا چاندی میں اڑھائی فی صد اور زرعی پیداوار میں دسواں حصہ) اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور حکومت زکوٰۃ اور عشر کے سوا کوئی ٹیکس عائد نہیں کرسکتی۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ زکوٰۃ اور عشر کی آمدنی سے حکومت کا کاروبار کیسے چل سکے گا؟ اس مشکل کے حل کے لئے کہا یہ گیا کہ نظام زکوٰۃ پر نظر ثانی کی جائے اور اس کی شرح وغیرہ میں تبدیلی کی جائے گی۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان' ہفت روزہ' اہل حدیث (لاہور) کی ۱۶ اگست ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا:۔

> خوشحال معاشرہ کا قیام اسلام کا بنیادی نظریہ ہے..... زکوٰۃ کی فرضیت بھی اسی نقطہ نظر سے ہوئی ہے۔ تاہم جس معاشرہ اور ماحول میں اس عمل کو فرض کیا گیا ہے وہ آج کل کے ماحول اور معاشرہ سے قدرے مختلف تھا..... اس سلسلے میں "قانون ضرورت" کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ شرعی قوانین کی رو سے زکوٰۃ چار اشیاء پر فرض ہے۔ (۱) مویشی (۲) غلہ اور پھل (۳) نقدی (سونا چاندی) اور (۴) تجارت۔ پہلی تین مدات تو بحالہ قائم ہیں' مگر جہاں تک مال کی تجارت کا تعلق ہے' اس کا میدان اب بہت وسیع ہوچکا ہے۔ لہٰذا' اس معاملہ میں اب مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ نصاب زکوٰۃ بھی اسلام میں مقرر ہے لیکن اس معاملہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ کی کم از کم حد ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام جب رائج کیا گیا تو اس وقت کی طلب اور ضرورت کے مطابق تھا..... زکوٰۃ کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مقررہ اموال میں سے معینہ مقدار ادا کردی جائے خواہ وہ معاشرتی ضروریات کا ایک فی صد ہی پورا کرے..... زکوٰۃ کو فقراء اور محتاج لوگوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونا چاہئے۔ لہٰذا' آج کل اس امر کی ضرورت ہے کہ ضرورت کا اندازہ لگا کر نظام زکوٰۃ کو از سر نو منظم کیا جائے۔
>
> (طلوع اسلام' بابت اگست ۱۹۷۸ء' ص ۶۳)

آگے بڑھنے سے پہلے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ یہ تجویز اہل حدیث حضرات کی طرف سے پیش کی جارہی ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ احادیث نبویؐ قرآن مجید کی طرح ناقابل تغیر و تبدل ہیں اور ان کا بعینہٖ اتباع اسلام کا تقاضا ہے۔ اب یہ

حضرات بھی اس کے قائل ہو رہے ہیں کہ زمانے کی ضروریات کے پیش نظر سنت نبویؐ میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ طلوع اسلام نے یہی بات کہی تو اسے منکر حدیث' منکر شان رسالت قرار دے کر دائرۂ اسلام سے خارج کردیا گیا۔ اب وہی بات اہل حدیث حضرات کی طرف سے کہی جارہی ہے!

آگے بڑھئے۔ اتباع حدیث سعودی عرب کا سرکاری مذہب ہے' اور را بطۃ العالم الاسلامی ایک طرح حکومت کا تنظیمی ادارہ ہے۔ اس ادارہ کے ترجمان' را) العالم الاسلامی کے رجب ۱۳۹۸ھ (جون ۱۹۷۸ء) میں اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ کیا زکوٰۃ کے متعلق رسولؐ اللہ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلی کی جاسکتی ہے یا نہیں..... لکھا تھا:-

> زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے۔ اگر موجودہ شرح سے حاجت مندوں کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں تو پھر اس شرح سے زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی..... زکوٰۃ کا انتظام کرنے والوں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب نصاب لوگوں سے زیادہ شرح سے زکوٰۃ وصول کریں کیونکہ رسولؐ اللہ نے جو شرح مقرر کی تھی وہ آپؐ کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی اور قرآن مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اس کے لئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔
> (طلوع اسلام' بابت ستمبر ۱۹۷۸ء' ص ۱۲)

لیکن ہمارے ہاں کے اہل فقہ حضرات نے اس سوال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ زکوٰۃ کے مروجہ نظام میں اس قسم کی کتر بیونت سے بھی اتنی آمدنی نہیں ہوسکتی کہ جس سے حکومت کا کاروبار چل سکے۔ چنانچہ انہوں نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور حقوق اللہ میں شامل------ یہ حکومت کے ٹیکسوں سے بالکل الگ رہے گی۔ (مفتی محمود صاحب کا بیان' شائع شدہ نوائے وقت بابت ۱۲ جون ۱۹۷۸ء)

دیو بندی مسلک کے ترجمان ماہنامہ البلاغ (کراچی) کی اشاعت بابت مارچ ۱۹۷۹ء میں اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

> زکوٰۃ کے سلسلے میں ایک خلش عام طور پر یہ پائی جارہی ہے کہ زکوٰۃ کے قانون کے نفاذ کے بعد انکم ٹیکس کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے اور اسے کیوں منسوخ نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ زکوٰۃ اور انکم ٹیکس دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں اور زکوٰۃ کو انکم ٹیکس کا بدل بنانا ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف ازروئے قرآن کریم[1] متعین ہیں اور اس کا اصل منشا غریبوں اور مفلسوں کی حاجت روائی ہے۔ اس کے برعکس' انکم ٹیکس کی رقم حکومت کے دوسرے کاروبار چلانے میں

---

[1] جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ قرآن کریم میں زکوٰۃ کے مصارف کا کوئی ذکر نہیں۔ جنہیں یہ حضرات زکوٰۃ کے مصارف سمجھ رہے ہیں۔ وہ صدقات کے مصارف ہیں۔

صرف ہوتی ہے۔ اگر زکوٰۃ کو انکم ٹیکس کے مصارف میں خرچ کردیا جائے تو نہ صرف یہ شرعاً" جائز نہیں بلکہ اس سے زکوٰۃ کا اصل منشا ہی پورا نہیں ہوتا۔ لہٰذا' نظام زکوٰۃ کو نافذ کرنے کا انکم ٹیکس کے خاتمے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

مودودی صاحب کا بھی یہی نظریہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں جو ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اپریل ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا ہے' سوال اور جواب کی شکل میں کہا ہے :۔

سوال : زکوٰۃ اور عشر کے نفاذ کے بعد دوسرے ٹیکس' مثلاً انکم ٹیکس' پراپرٹی ٹیکس' سیلز ٹیکس اور اکسائز ڈیوٹی وغیرہ کا کوئی جواز رہ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب : اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ زکوٰۃ اور عشر تو صرف معاشرے کے غریب اور پسماندہ لوگوں کی مدد کے لئے ہیں' حکومت کا کام چلانے کے لئے نہیں۔ حکومت کا کام چلانے کے لئے دوسرے ٹیکسز عائد کئے جائیں گے۔ البتہ چونکہ اب زکوٰۃ اور عشر کا حکم نافذ ہو رہا ہے اس لئے سارے ٹیکسیشن کے نظام پر نظر ثانی کرنا ہوگی تاکہ اس کے اندر زکوٰۃ اور عشر کی گنجائش نکل سکے۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ زکوٰۃ اور عشر سے ہی حکومت کا پورے کا پورا نظام چلایا جائے گا' صحیح بات نہیں ہے۔ دو ، ٹیکس [illegible] ئیں گے اور لگانا ناگزیر[۲] ہے۔

یہ حضرات اٹھتے بیٹھتے پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ اسلامی نظام میں یہ دونوں چیزیں یکجا ہوجاتی ہیں۔ لیکن ان کی ذہنی کیفیت یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کو مذہبی فریضہ قرار دے رہے ہیں اور ٹیکسز کو حکومت کی آمدنی کا ذریعہ۔ زکوٰۃ سے مقصد غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنا ہے اور ٹیکسز کا مقصد حکومت کا کاروبار چلانا۔ یعنی ان کے نزدیک غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنا حکومت کے کاروبار میں داخل نہیں۔ سوچئے کہ کیا یہ ذہنیت مذہب اور سیاست میں اسی ثنویت کی غماز نہیں جو ہمارے دور ملوکیت میں پیدا ہوئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات بر بنائے مصلحت زبان سے کچھ ہی کہیں' ان کے ذہنوں میں اسی اسلام کا نقشہ منقوش ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس اسلام کی حیثیت پرائیویٹ عقیدے کی سی تھی لیکن اب اس کا احیاء حکومت کے قوانین کی حیثیت سے کیا جا رہا ہے۔

اس سلسلہ میں ہم صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اس سے ایسی الجھنیں پیدا ہوجائیں گی جن سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جو قوانین ہزار سال پہلے کے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر مرتب کئے گئے تھے وہ آج کے زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کو کسی صورت میں بھی پورا نہیں کرسکتے۔ اگر اس پر اصرار کیا گیا

۲۔ اس کے برعکس مولانا نورانی صاحب کا ارشاد ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ کے سوا کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا۔ اور شیعہ حضرات کا ارشاد ہے کہ فقہ جعفری کی رُو سے زکوٰۃ کی پوزیشن سُنّی نظامِ زکوٰۃ سے مختلف ہے۔

تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ہاں کی نئی نسل سرے سے اسلام ہی سے برگشتہ ہو جائے گی اور اقوام عالم اس نتیجے پر پہنچ جائیں گی کہ اسلام زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔

جہاں تک اسلام کے احیاء کا تعلق ہے اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید کے غیر متبدل احکام' اصول اور اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اسلامی مملکت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین و ضوابط خود وضع کرے۔ اس مملکت کی جس سنٹرل اتھارٹی کی طرف سے یہ قوانین و ضوابط نافذ ہوں گے اسے ہم مرکز ملت کہہ کر پکارتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں اسلامی نظام کی یہی شکل تھی۔ ان کے نزدیک' حکومت کا فریضہ زکوٰۃ دینا تھا' زکوٰۃ لینا نہیں۔ اور وہ افراد معاشرہ سے اس وقت تک کچھ نہیں لیتے تھے[۳]۔ جب تک مملکت انہیں کچھ دے نہ۔

ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں اپنی آزادی حاصل کرنے کے بعد' حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا' پھر اپنی رقم واپس لے جا۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لے کر آنا۔

(شاہکار رسالت' ص ۳۶۸ ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

آخر میں ہم اس کی وضاحت کردیں کہ جو کچھ ہم نے گزشتہ صفحات میں لکھا ہے وہ قرآنی نظام مملکت سے متعلق ہے۔ حکومت پاکستان جن قوانین کو نافذ کرے گی ان کی فرماں پذیری اسی طرح لازم ہوگی جس طرح حکومت کے دیگر قوانین کی۔

یہاں تک لکھا جاچکا تھا کہ ہمارے سامنے دو ایسی شہادات آئیں جن سے ہمارے ان خدشات کی مزید تصدیق ہوگئی جن کی طرف ہم شروع سے اشارہ کرتے چلے آرہے ہیں' یعنی یہ کہ اگر کسی ایک فرقہ کے فقہی قوانین کو مملکت کے پبلک لاز کی حیثیت سے نافذ کردیا گیا تو اس سے ایسے فرقہ وارانہ اختلافات رونما ہو جائیں گے جن کا ازالہ ناممکن ہوگا۔ لاہور سے شائع ہونے والا ماہنامہ "محدث" فرقہ اہل حدیث کا ترجمان ہے۔ اس کی ربیع الاول و الاخر ۱۳۹۹ھ کی اشاعت میں سید بدیع الدین شاہ صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے' جس کا عنوان ہے "اسلام کا دستور صرف قرآن و سنت ہے' فقہی اور وضعی روایات نہیں"۔ اس میں انہوں نے مسلک اہل حدیث کی روشنی میں حالیہ نافذ شدہ "قوانین حدود" اور

۳۔ مملکت جو کچھ افرادِ معاشرہ سے لیتی تھی (یا بالفاظِ صحیح' جو کچھ افرادِ معاشرہ مملکت کو دیتے تھے) اس کا مقصد' افراد کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا تھا۔ اس مقصد کی روشنی میں دیکھا جائے' تو حکومت کے تمام محاصل (آمدنی) کو زکوٰۃ کہا جائے گا۔ یعنی سامانِ نشوونما پہنچانے کا ذریعہ۔

زیر تجویز زکوٰۃ اور عشر سے متعلق قوانین کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ زنا اور سرقہ کے متعلق جو قوانین نافذ ہوئے ہیں وہ ناقص اور نظر ثانی کے مستحق ہیں۔ جہاں تک زکوٰۃ اور عشر کا تعلق ہے' انہوں نے لکھا ہے کہ:

> مغرب کے تصور تدوین قانون یا فقہی جمود و تقلید کو اپنانے سے الجھنیں بڑھ جائیں گی۔ ٹیکسوں کا مسئلہ "مکس ٹیکس" کے جواز پر مبنی ہے۔ اسلامی نظام معیشت میں اس کی حرمت اور وعید زنا سے بھی شدید تر ہے۔ نیز جب زکوٰۃ و عشر کو اسلامی معیشت و کفالت میں رکھ کر دیکھا جائے تو ٹیکس کی ضرورت ہی ختم ہوجاتی ہے۔ موجودہ ٹیکس کی بنیاد دین و دولت (مذہب و سیاست) کی تقسیم پر ہے۔ لہٰذا' علماء دین کو مرعوبیت کی بجائے اصل اسلام کی تفصیلات کو سامنے رکھنا چاہئے۔ (فٹ نوٹ ص ۳)

یہ تو رہے اہل حدیث حضرات۔ جیسا کہ معلوم ہے' تیرہ۔ چودہ اپریل کو بھکر میں "آل پاکستان شیعہ کنونشن" کا انعقاد ہوا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ:

> شیعان علیؓ کے لئے فقہ جعفریہ کے مطابق قوانین نافذ کئے جائیں۔ زکوٰۃ کا نظام علحدہ کیا جائے۔ اوقاف بورڈ علحدہ کئے جائیں۔ شریعت بنچوں میں نمائندگی دی جائے۔
>
> (مساوات و پاکستان ٹائمز' مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۷۹)

یہ واضح ہے کہ شخصی قوانین (پرسنل لاز) میں تو یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر فرقہ کے معاملات اس فرقہ کی فقہ کے مطابق طے پائیں۔ لیکن پبلک لاز میں یہ ممکن ہی نہیں ہوتا۔ پبلک لاز تو کہتے ہی ان قوانین کو ہیں جن کا اطلاق' تمام افراد مملکت پر یکساں ہو۔ آپ سوچئے کہ کسی ایک فرقہ کے فقہی قوانین کو پبلک لاز کی حیثیت سے' اسلامی قوانین کے طور پر نافذ کروینے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ دوسرے فرقے انہیں اسلامی تسلیم کرنے سے انکار کردیں گے اور اپنی فقہ کے قوانین کے نفاذ پر اصرار کریں گے۔ حکومت کے لئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ان کے مطالبہ کو تسلیم کرلے۔ کیونکہ مملکت میں' مختلف فرقوں کے لئے مختلف پبلک لاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے جو صورت حالات پیدا ہوسکتی ہے' ظاہر ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں' اہل حدیث اور شیعہ حضرات کی طرف سے حنفی فقہ کے نفاذ کے خلاف یہ احتجاج نیا نہیں۔ جب ۱۹۷۰ء میں مودودی مرحوم نے یہ کہا تھا کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جسے اہل حدیث اور شیعہ حضرات اسلامی تسلیم کرلیں' اس لئے مناسب ہوگا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کردی جائے۔ تو ان حضرات کی طرف سے اس تجویز کے خلاف شدید احتجاج ہوا تھا۔ اسی کا اعادہ اب ہو رہا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں ہم ارباب حکومت کی خدمت میں پوری دل سوزی کے ساتھ عرض کریں گے کہ وہ اس فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں اور اسلامی نظام کا آغاز اختلافی قوانین کے بجائے ان قرآنی اقدار سے کریں جو تمام افراد کے لئے منفعت بخش ہیں اور جن میں کسی کو اختلاف نہیں۔ مثلاً" یہ کہ ملک میں کوئی شخص بھوکا نہ رہے۔ ہر ایک کی

ضروریات زندگی پوری ہوتی جائیں۔ کوئی شخص بلا علاج نہ مرجائے اور مرنے کے بعد اس کے پس ماندگان بلا سہارا نہ رہ جائیں۔ کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہ جائے اور ہر ایک کو اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ ہر ایک کو بلا قیمت عدل مل سکے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ لاکھوں مقدمات عدالتوں کے ریکارڈ کے نیچے دبے ہوئے' فیصلوں کے منتظر ہیں۔ ہزار ہا ملزم جیلوں میں سڑ رہے ہیں کہ ان کے مقدمات کی سماعت کی باری نہیں آتی۔ وہ جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں اور ان کے لواحقین بھوکوں مر رہے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے بھی ہیں جو بالآخر بے گناہ ثابت ہوں گے۔ وہ جیلوں میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اور مسائل ہیں جن کے حل کے لئے اسلامی نظام کا آغاز کیا جانا چاہئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ ملک باہمی اختلافات کے خطرات سے محفوظ رہ جائے گا' بلکہ اقوام عالم' اسلام عطا کرنے والے خدا کی رب العالمینی اور اس کے رسولؐ کی رحمتہ اللعالمینی کے انسانیت ساز اور زندگی بخش نتائج کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کرسکیں گی۔ اسے کہا جائے گا۔۔۔۔۔۔ اسلامی نظام۔۔۔۔ خدا کرے کہ ہماری اس استدعا کو شرف باریابی حاصل ہو اور اسے درخور اعتنا سمجھا جائے۔ والسلام (المرقوم ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء)

(مئی ۱۹۷۹ء)

۲۔ اس پر اہل حدیث کی طرف سے اعتراض

چونکہ ہمارا مروجہ معاشی نظام جسے بدقسمتی سے اسلامی نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے' ہمارے دور ملوکیت کا وضع کردہ ہے' لہٰذا انتہائی سرمایہ دارانہ ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں کسی نے "روٹی" کا نام لیا انہیں خطرہ لاحق ہوگیا کہ یہ کمیونزم کے سیلاب کی علامت ہے جو اسلام کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ چنانچہ ایسا کہنے والے کے خلاف یہ دہائی مچا دیں گے کہ وہ کمیونسٹ ہے' ملحد ہے' بے دین ہے۔ اور اگر کہیں اس نے یہ کہہ دیا کہ قرآن مجید میں روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے تو یہ شور مچا دیں گے کہ یہ اسلام کی تحریف ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم کو مسخ کرنا ہے وغیرہ **ذالک**۔

اس کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ہے۔ طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی میں زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اس کے معاشی نظام کے نمایاں خط و خال کو بھی سامنے لایا گیا تھا۔ اس میں کہا یہ گیا تھا کہ قرآنی نظام کی رو سے تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس نظام میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا اور یہ حقیقت حضور نبی اکرمؐ کی اس حدیث کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' اس بستی سے خدا کی حفاظت اور نگرانی کا ذمہ ختم ہوگیا۔

جماعت اہل حدیث کے ترجمان' ہفت روزہ "الاعتصام" کو اس قرآنی نظام میں کمیونزم کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آیا اور اس نے اپنی ۲۵ مئی اور یکم جون کی اشاعتوں کے اداریہ میں انتہائی غیظ و غضب کا اظہار فرمایا ہے۔ اداریہ کا عنوان ہے:۔

"طلوع اسلام" کا اشتراکی نظریہ

(حدیث سے انحراف اور قرآن میں تحریف)

اس میں قرآن کے معاشی نظام کے خلاف کس قسم کے دلائل دیئے گئے ہیں' اس کی صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔ کہا گیا ہے کہ "طلوع اسلام" میں قرآن کی متعدد آیات میں تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً" **وان لیس للانسان الا ما سعی وان سعیہ سوف یری ثم یجزہ الجزاء الاوفی** (۵۳/۳۹-۴۱) انسان کو وہی ملے گا جو اس کی سعی ہے اور اس کی سعی ضرور دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو بدلہ ملنا ہے اس کا پورا بدلہ"۔

اس کے بعد لکھا ہے:۔

> یہ آیت آخرت کے متعلق ہے کہ وہاں انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کمایا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کسی کا بوجھ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ نیز ہر ایک کی سعی و کوشش اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور اس کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (الاعتصام ۲۵ مئی ۱۹۷۹ء' ص ۴)

یعنی ان حضرات کے نزدیک قرآن کریم میں بیان کردہ عدل و انصاف کے تمام اصولوں کا تعلق آخرت سے ہے' اس دنیا سے نہیں۔ بالفاظ دیگر:۔

۱۔ آخرت میں تو ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ ملے گا' لیکن اس دنیا میں ہر ایک کو چھٹی ہوگی کہ وہ دوسروں کی محنت کا جس قدر استحصال کر سکتا ہے' کرے۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

۲۔ آخرت میں تو یہ اصول کار فرما ہوگا کہ کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں لادا جائے گا لیکن اس دنیا میں ہر صاحب قوت کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ جس قدر جی چاہے اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسروں پر لادتا چلا جائے۔

اس ایک مثال سے آپ قرآن کریم میں بیان کردہ دیگر اصول اور قوانین کا اندازہ لگا لیجئے یعنی قانون کی حکمرانی' ہر ایک سے عدل و انصاف کی تاکید' مظلوم کی داد رسی' کمزور کی حفاظت' طبقاتی ناہمواریوں کا استیصال' احترام انسانیت وغیرہ تمام اصولوں کا اطلاق اخروی زندگی میں ہوگا' اس دنیا کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ ہے ان حضرات کے پیش کردہ اسلام کا تصور۔

ہم نے لکھا تھا:۔

> قرآن کے معاشی نظام میں ہر فرد محنت کرتا ہے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب بطیب خاطر نظام مملکت کی تحویل میں دے دیتا ہے'

تاکہ وہ اس سے عالمگیر ربوبیت کا فریضہ سر انجام دے۔

یہ تو ان حضرات کے نزدیک خلاف اسلام ہے اور مطابق اسلام یہ ہے کہ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ بے حد و نہایت دولت جمع کرے' بلا تحدید جائدادیں کھڑی کرے' کارخانے تعمیر کرے' ہزاروں ایکڑ زمین کے رقبوں کا مالک بن جائے اور سال کے بعد اس میں سے چند ٹکے خدا کے نام پر الگ کردے۔

ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ بتائیں کہ خود نبیؐ اکرم کی حیات طیبہ کون سے اسلام کی حامل تھی؟

۱۔ کیا حضورؐ بے حد و نہایت دولت کے مالک تھے یا ضرورت سے زیادہ ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے؟

۲۔ کیا حضورؐ نے اپنی زندگی میں کبھی وہ زکوٰۃ ادا کی تھی جو ہمارے ہاں مروجہ چلی آرہی ہے؟

۳۔ کیا حضورؐ نے اپنے لئے جائدادیں کھڑی کر رکھی تھیں اور آپ لا محدود زمین کے رقبوں کے مالک تھے' یا سکنی حجروں کے سوا... حضورؐ کا کوئی مکان نہیں تھا۔ اور ایک مرلہ زمین بھی حضورؐ کی ملکیت میں نہیں تھی؟

۴۔ کیا حضورؐ نے اپنے ترکہ میں مال و دولت' زمینیں اور جائدادیں اپنے ورثاء کے لئے چھوڑی تھیں یا اس ترکہ میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا؟

ان سوالات کا جو جواب آپ کی طرف سے ملے گا' ظاہر ہے کہ وہی صحیح اسلام ہوگا اور اسی کا اتباع' اتباع سنت نبویؐ۔ دنیا دیکھے گی کہ یہی وہ اسلام ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے اور آپ اسے محرف قرآن اور منکر سنت رسولؐ اللہ قرار دیتے ہیں۔

ضمناً" "الاعتصام" نے یہ بھی لکھا ہے:۔

> حدیث شریف کی رو سے تو صلوٰۃ کا مفہوم بھی متعین ہے اور زکوٰۃ کی صورت بھی مقرر جس کی پشت پر امت مسلمہ کا چودہ سو سالہ عملی تواتر بھی موجود ہے۔ ان کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ اس کے بعد اسلام کو مسخ کرنے کا راستہ کھل گیا ہے۔ اب پرویزی "قرآنی مفہوم" کی رو سے نہ نماز کا مطلب وہ ہے جس پر چودہ سو سال سے مسلمان عمل کرتے آرہے ہیں اور نہ زکوٰۃ کا وہ مطلب جو مسلمان انفاق مال کی ایک متعین صورت سمجھتے آئے ہیں۔

زکوٰۃ کے متعلق آگے چل کر بات ہوگی۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے کیا آپ پرویز صاحب کی ہزارہا صفحات پر مشتمل تحریروں میں کسی ایک مقام پر بھی یہ دکھا سکتے ہیں کہ انہوں نے نماز کے اس طریق سے الگ کوئی طریقہ تجویز کیا ہو' جو امت میں مسلسل چلا آرہا ہے (یا چلے آرہے ہیں) یا کوئی نیا طریقہ وضع کیا ہو۔ اس کے برعکس' ہم بکثرت ایسے مقامات دکھا سکتے ہیں جس میں انہوں نے ان طریقوں میں کسی قسم کے رد و بدل یا کسی نئے طریقے کے وضع کرنے کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں سوچئے کہ آپ نے پرویز صاحب کے خلاف کس قدر سنگین بہتان کا افترا کیا ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی بارگاہ سے اس قسم کے بہتان کی جو وعید ملتی ہے اس سے یقیناً" آپ واقف ہوں گے۔

خدا کے لئے جوش مخالفت میں اپنی عاقبت تو خراب نہ کیجئے۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے' الاعتصام نے کہا یہ ہے کہ اس کے نصاب وغیرہ کی جو متعین شکل چلی آرہی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی' خلاف سنت رسولؐ اللہ اور اسلام میں تحریف ہے۔ الاعتصام نے طلوع اسلام کی جس اشاعت کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے (یعنی مئی ۱۹۷۹ء) اس کے ص۱۱ پر' خود جماعت اہل حدیث کے دوسرے ترجمان اہلحدیث کا ایک اقتباس دیا گیا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ جس زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا' موجودہ زمانے کے حالات اس زمانے کے حالات سے مختلف ہیں' اس لئے ان میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اسی صفحہ پر رابطہ عالم اسلامی (جو ایک اہل حدیث حکومت کا تنظیمی ادارہ ہے) کے ایک مقالہ کا اقتباس شائع ہوا ہے جس میں زکوٰۃ کی مروجہ تفصیلات میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

جریدہ الاعتصام کو نہ تو اہلحدیث کی تجویز میں تحریف دین یا اختلاف سنت رسولؐ اللہ کی کوئی جھلک دکھائی دی ہے اور نہ ہی رابطہ عالم اسلامی کے نظریہ میں کمیونزم کی کوئی رمق۔ اسے تحریف دین' اختلاف سنت نبویؐ اور کمیونزم کی شعلہ فشانیاں دکھائی دی ہیں تو صرف طلوع اسلام میں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اہل حدیث اور رابطہ عالم اسلامی کا تعلق الاعتصام کی اپنی برادری سے ہے اور طلوع اسلام' قرآن مجید کی روشنی میں' فرقہ ورانہ عصبیت کو شرک سمجھتا ہے۔

الاعتصام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس مفہوم کی پشت پر امت مسلمہ کا چودہ سو سالہ عملی تواتر بھی موجود ہے اس کا انکار کیونکر کیا جاسکتا ہے۔

ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر امت کا عملی تواتر دین میں سند کی حیثیت رکھتا ہے تو آپ مسلک اہل فقہ سے اختلاف کیوں رکھتے ہیں جسے امت کی اکثریت کا عملی تواتر حاصل ہے؟ (جولائی ۱۹۷۹ء)

(اس کا کوئی جواب ان کی طرف سے شائع نہیں ہوا)

۳۔ زکوٰۃ کے مروجہ نظام کے خلاف اعتراضات

(خود مذہب پرست طبقہ کی طرف سے)

زکوٰۃ اور عشر کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں' مذہبی جماعتوں کی طرف سے ان کا بڑا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں زکوٰۃ کے صحیح مفہوم کے متعلق طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی' میں تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے مروجہ زکوٰۃ کے متعلق جماعت اسلامی کا کیا خیال تھا۔ ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شیخ یوسف القرضاوی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "اسلامی معیشت کی کامیابی کے لئے چند ناگزیر شرائط"۔ اس کا ترجمہ عبدالحمید صدیقی

(مرحوم) نے کیا تھا۔ اس میں زکوٰۃ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ غور طلب ہیں:۔

"فرض کیجئے آج کوئی معاشرہ جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتا ہے' نظام زکوٰۃ کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ میری رائے میں اس کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہوگا:۔

۱۔ اتنی کم مقدار میں زکوٰۃ جمع ہوگی کہ وہ افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہوگی۔ اس کمی کے کئی اسباب ہیں جن میں مندرجہ ذیل دو بڑے اہم ہیں:۔

اولاً" : لوگ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے کترائیں گے۔ کیونکہ حکومت نے پہلے ہی بہت سے ناقابل برداشت قسم کے ٹیکس لگا رکھے ہیں۔ اور حکومتیں جو زکوٰۃ جمع کریں گی اور کتاب و سنت کی عملداری کا اہتمام نہیں کریں گی' ان پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ چکا ہوگا۔ نیز انہیں یہ خیال ہوگا کہ زکوٰۃ کی رقم شریعت کی رو سے جائز کاموں پر خرچ ہونے کے بجائے' محض سیاسی مقاصد کے حصول پر صرف کی جائے گی جیسا کہ اکثر ٹیکسوں کی رقم کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد کی کثیر تعداد دینی احکام کی پابندی قبول کرنے کے جذبے اور شعور اسلامی سے غیر اسلامی فکری یلغار کے باعث محروم ہو چکی ہے۔

ثانیاً" : قوم مسلم کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت یا آمدنی نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو سکے۔ اور یہ اثر ہے اس طرز حیات کا جسے دور حاضر کے مسلمان اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ طرز حیات ہے ان غیر ملکی کفار کا جن کی مسلمان اندھی تقلید کر رہے ہیں' یہاں تک کہ اگر وہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالیں گے تو یہ بھی ڈالیں گے۔ اور وہ طرز زندگی تعیشات' ظاہری ٹیپ ٹاپ اور ناجائز اور حرام لہو و لعب میں فضول خرچی اور اسراف پر قائم ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی اس تھوڑی سی مقدار کا ایک حصہ انتظامی پیچیدگیوں اور ظاہری نمود و نمائش پر توجہ دینے کے باعث دفاتر زکوٰۃ' سامان نوشت و خواند اور زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے لئے رکھے گئے ملازموں پر خرچ ہو جائے گا۔ یوں زکوٰۃ فقراء و مساکین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ چونکہ حکام اور عوام کو اسلامی طرز زندگی کی کوئی تربیت نہیں دی گئی اور ان کے قلب و ضمیر کو مسلمان نہیں کیا گیا' لہٰذا تقسیم زکوٰۃ کے وقت گڑبڑ اور دھاندلی ہوگی' جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر مستحقین زکوٰۃ تو زکوٰۃ سے محروم رہ جائیں گے اور غیر مستحق لوگ زکوٰۃ لے جائیں گے۔

۴۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف زکوٰۃ سے معاشرے کے جملہ فقراء و مساکین کی ضروریات زندگی پوری نہیں ہو سکیں گی بلکہ ان میں سے صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہی زکوٰۃ سے فائدہ اٹھا سکیں گے جنہیں تقسیم زکوٰۃ کے وقت کچھ رقم مل جائے گی۔ اس کے بعد نظام زکوٰۃ کے بارے میں عام لوگ شکوہ و شکایت کرتے ہوئے اس کی عدم افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اور یوں اسلام کے پورے نظام زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات کی راہیں کھل جائیں گی"۔ (جولائی ۱۹۷۹ء)

ساتواں باب

ارکان اسلام کے مقاصد

۱- حج کا مقصد

(جب حج کا زمانہ قریب آتا ہے تو تقاضے موصول ہونے لگ جاتے ہیں کہ حج کے مقصد کے متعلق لکھا جائے۔ ہم اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن احباب کے مطالبہ کے پیش نظر ہم ذیل میں پرویز صاحب کی وہ تقریر درج کرتے ہیں جو انہوں نے نومبر ۱۹۴۸ء میں ریڈیو پاکستان سے نشر فرمائی تھی)

اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں اٹھتی ہیں جو ان کے خرمن امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں۔ وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بے قرار رکھا ہے یہ ہے کہ کون سی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اسے کس طرح غلط ثابت کردیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کردیا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

ولا تکونوا کالتی نقضت غزلها من بعد قوة انکاثا (۱۶/۹۲)

تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور (پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کرکے دیکھئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظام تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا

ہے لیکن ابھی وہ عمارت' تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیث الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا' مصر اور یونان' چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھئے اور سوچئے کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔

ادوار سابقہ کی طرح عصر حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کلوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا جس پر اقوام مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوام عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخہ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ ان کے آئینہ فکر میں قومی محبت (PATRIOTISM) کو شرف انسانیت کی انتہا تصور کرلیا گیا ہے۔ لیکن جنگ اول نے بالعموم اور اس کے بعد جنگ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کردیا کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا وہ انسانیت کے لئے زہر قاتل ہے۔ چنانچہ دانایان مغرب اپنی اس سوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر بکسلے نے ۱۹۴۷ء میں کہا تھا:۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے' انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے' باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں۔ حتی کہ تمام اقوام عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوام یورپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلس اقوام متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا ونڈل ولکی کا ONE WORLD کا تصور اسی انتہا کا نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال' اقوام مغرب کے موجودہ تصور حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو' نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصور کرکے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر (GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں لکھتا ہے:۔

> اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوع انسانی کی منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہن انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جبکہ دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی بمشکل واقف ہوسکتے تھے' قرآن نے یہ

بتایا کہ:

کان الناس امتہ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین ص(۲/۲۱۳)

چونکہ تمام نوع انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے--- اس لئے اس مقصد کے پیش نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں' خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ اس نے حضرات انبیاءؑ کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے' فرمایا کہ:

ان ھذہ امتکم امتہ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون (۲۱/۹۲)

تمہاری یہ امت' ایک امت واحدہ ہے اور اس کی وجہ جامعیت اس حقیقت پر ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے۔

اس وحدت انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو۔ سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کریم کی رو سے انسانوں تک پہنچی جس کا مقصود تمام نوع انسانی کو ایک برادری تصور کرکے جمعیت اقوام کے بجائے جمعیت آدم کی عملی شکل میں تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلامی نظام کا اہم رکن ہے۔

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز زبان' جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں' محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے' اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت' مرکز وحدت انسانیت یعنی کعبتہ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامرا کا انتخاب کرلیں اور مختلف ممالک کے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کرلیں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن و سلامتی' انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادت آدمیت کا کفیل ہو۔ ان کا منتخب کردہ امام اپنے خطبہ حج میں اس پروگرام کا اعلان کردے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان' مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات و جزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور رد عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی' جس کے لئے "قربانی" تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں کو واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ جو قرآن کریم نے تمام نوع انسانی کو ایک امت واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کردیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند' اور کوئی انداز

بیان اس سے بلیغ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے کہ..... **لیشھدوا منافع لھم** (۲۲/۲۸) تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں ان کے لئے کس قدر فائدے ہیں۔ اور اس کی غایت؟ **قیاما للناس** (۵/۹۷) یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے! کیا دنیا میں کسی کانفرنس' کسی اسمبلی' کسی پارلیمنٹ' کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند ہو سکتا ہے کہ وہ اجتماع دنیا میں شرف انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ کسی خاص قوم' خاص جماعت' خاص ملک' خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کے قیام کا باعث! یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد یعنی **قیاما للناس**۔

کہا جاسکتا ہے کہ آج اقوام متحدہ کی مجلس (U. N. O) کے اجتماعات میں تمام دنیا کی قوموں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ دنیا میں امن و سلامتی رہے۔ پھر یہ اجتماعات اپنے مقصد پیش نظر میں کیوں کامیاب نہیں ہوتے اور حج کے اجتماع میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر وہ اجتماع ایسے بلند اور درخشندہ مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے؟ حج کے اجتماع میں فی الواقع ایک خصوصیت ہے اور وہ خصوصیت ہے ایک بندۂ مومن کے اس عہد و پیماں کی جو وہ اپنے خدا سے باندھتا ہے اور جس کی تجدید حج کا نقطہ آغاز ہے۔ ایک عبد مسلم اپنے خدا سے اقرار کرتا ہے کہ **ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین** (۶/۱۶۳) میری صلوٰۃ اور میرے مناسک' میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ فقط اللہ کے لئے ہے' کسی اور غرض کے لئے نہیں' یعنی اس مقصد کے حصول کے لئے جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ یہ ہے وہ اقرار جس کی تجدید اس اجتماع عظیم سے پہلے تمام نمائندگان فداکارانہ انداز سے خدا کے گھر' یعنی ملت حنیفہ کے مرکز محسوس' کے گرد گھوم کر کرتے ہیں اور طرح زمین و آسمان کو اپنے اس عہد پر گواہ ٹھہراتے ہیں۔ ان نصب العین کو دل میں لئے ہوئے' یہ نمائندگان نوع انسانی' انسانیت کی فلاح و سعادت کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا عہد باندھتے ہیں۔ یہ ہے وہ خصوصیت جو دنیا میں کسی اور اجتماع کو حاصل نہیں۔ فلہذا' وہ اجتماعات' بلند آہنگ دعووں کے باوجود' انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نہ آج تک کچھ کرسکے ہیں نہ آئندہ کرسکیں گے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد' اقوام مغرب نے جمعیۃ الاقوام (LEAGUE OF NATIONS) کی طرح ڈالی۔ لیکن علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں "کفن چوروں" کی یہ جماعت جس بری طرح ناکام ہوئی' واقعات اس پر شاہد ہیں۔ اس کے متعلق (MR. REEVES) اپنی کتاب (ANATOMY OF PEACE) میں لکھتا ہے کہ "لیگ آف نیشنز" کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بین الاقوامیت کے غلط تصور پر قائم کی گئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ "دنیا کے مختلف قوموں کے نمائندوں کو یکجا کرکے باہمی بحث و تمحیص سے دنیا کا امن قائم رکھا جاسکتا ہے"۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد اقوام مغرب نے پھر اپنے ناکام تجربے کو دہرایا اور سمجھ لیا کہ لیگ آف نیشنز کا نام (UNITED NATIONS ORGANIZATION) رکھ دینے سے کامیابی ہو جائے گی۔ یہ جمعیت اقوام متحدہ کس بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے' اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ابھی دو ہفتے ہوئے لندن کے اخبار "ڈیلی میل" نے کہا ہے کہ "جمعیت اقوام متحدہ اپنی موجودہ ہیئت میں امن عالم کے لئے سخت خطرے کا موجب ہے' اس لئے اسے فوراً

ختم کردینا چاہیئے"۔ اور اس کی وجہ (MR. REEVES) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ قوموں کے باہمی تعلقات کا مسئلہ نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم نے انسانی معاشرہ میں جو خلجان پیدا کر رکھا ہے اسے کس طرح دور کیا جائے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خلجان نیشنلزم یا انٹرنیشنلزم کے ذریعہ دور نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ نوع انسانی کی برادری ہے نہ کہ بین الاقوامیت۔

یعنی وہی چیز جسے علامہ اقبالؒ نے آج سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہا تھا کہ: ۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود!
اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام
جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

ر سے مقصود اسی "جمعیت آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج پر نگاہ رکھئے اور پھر اس حج پر جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئین کہن میں آج بھی وہی روح پیدا کی جاسکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالم اسلامی چاروں طرف سے مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نام نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن، کسی کی نگاہ اس طریق ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا، جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے ایک بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجوز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوام عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ناپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کرلیا اور پھر اس مرکز کو زندہ کردیا جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوام عالم کی امامت ہمارے حصہ میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفات کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانان عالم کو حج کا فریضہ پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ: ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

(نومبر ۱۹۷۸ء)

۲- حج بدل کی شرعی حیثیت

حج اسلامی عبادات کا پانچواں رکن ہے اور وہ ہر ایسے بالغ عاقل مسلمان پر' جو اس کے لئے سفر کے اخراجات برداشت کرسکتا ہو' پوری عمر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے۔ خود رسول اللہ نے ملک عرب میں رہنے کے باوجود' زندگی میں صرف ایک بار حج ادا کیا تھا۔ لیکن آج کل مختلف اسباب کی بنا پر ہمارے معاشرے کے ایک طبقہ میں دولت کی فراوانی ہوگئی ہے۔ اور اگرچہ حج کا اصل مقصد ہماری نظروں سے اوجھل ہوچکا ہے' لیکن دولت مند لوگ زیادہ حجوں کی تعداد پر فخر کرنے کے لئے ہر سال حج کرنے پر مصر ہوتے ہیں (انہیں نفلی حج کہا جاتا ہے)۔ چونکہ ہر سال حج کے موقع پر حجاج کرام کا اژدھام بڑھتا جاتا ہے جس سے فریضہ حج ادا کرنے (اور اس کا انتظام کرنے) والوں کو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے' اس لئے سعودی عرب کے مشہور دینی ادارہ را بطتہ العام الاسلامی نے یہ اپیل کی' کہ نفلی حج کرنے کے بجائے متعلقہ رقم کسی دوسرے دینی مقصد کے لئے خرچ کی جائے تو زیادہ ثواب ہوگا۔ اس اپیل کی روشنی میں بہت سے اسلامی ممالک نے نفلی حج پر پابندی لگادی ہے۔ لیکن دولت مند حضرات نے اس پابندی کو غیر موثر بنانے کے لئے ایک اصطلاح یعنی حج بدل کا سہارا لے لیا ہے جس کے ذریعے ہزاروں لوگ حج پر جانے کا ذریعہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

فقہ میں حج بدل کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ کوئی دولت مند مسلمان کسی خاص وجہ سے ( )" سخت بیماری یا حادثے کی وجہ سے) فریضہ حج ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو وہ کسی دوسرے مسلمان کو اس مقصد کے لئے بھیج کر اپنا فریضہ پورا کرسکتا ہے۔ یا کوئی ایسا مالدار آدمی جو اپنی زندگی میں فریضہ حج ادا نہ کرسکا ہو' اور وفات کے وقت یہ وصیت کر جائے کہ اس کے مال سے حج بدل کرایا جائے۔ لیکن آج کل جس حج بدل کا رواج پڑگیا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے لئے ایسے فوت شدہ رشتہ داروں کے نام پر حج بدل کیا جاتا ہے جن کی نہ تو حج کرنے کی استطاعت تھی اور نہ ہی انہوں نے حج بدل کے بارے میں کوئی وصیت کی تھی۔ واضح رہے کہ خود حج بدل کی شرعی حیثیت کے بارے میں سخت اختلاف ہے اور علمائے امت کا ایک گروہ اسے قرآن حکیم کے واضح ارشادات کے خلاف قرار دیتا ہے۔ وہ اسے عیسائیوں کے مشہور کفارہ کے عقیدے کا عکس قرار دیتے ہیں جو قرآن مجید کے اس ارشاد کے خلاف ہے کہ:

الا تزر وازرة وزر اخرى و ان ليس للانسان الا ما سعى (۳۹-۳۸/۵۳)

کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور انسان کے لئے اس کی اپنی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جو علماء حج بدل کا جواز ثابت کرنے پر مصر تھے' انہوں نے مذکورہ علماء پر معتزلہ ہونے کا فتویٰ جڑ دیا۔ خیال رہے کہ

معتزلہ ان علماء کو کہا جاتا ہے جو ہر دینی معاملہ میں قرآن کو سند قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن حکیم میں کوئی بات خلاف عقل نہیں۔ یہ لوگ احادیث رسول اللہ سے بھی استدلال کرتے تھے لیکن جو حدیث قرآن حکیم کے ارشادات سے ٹکراتی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ایسی حدیث رسول اللہ صلعم کا ارشاد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علامہ آلوسی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

ان استدلال المعتزلہ بالایہ علے ان العبد اذا جعل ثواب عملہ۔ ای عمل کان بغیرہ لا یجعل ویلغوا جعلہ

(تفسیر روح المعانی' جلد ۲۷' صفحہ ۶۷' مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ لاہور)

اس آیت سے معتزلہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی عبادت کا ثواب کسی دوسرے کو منتقل کردے تو وہ ثواب منتقل نہیں ہوتا' بلکہ ضائع ہوجاتا ہے۔

خود علامہ آلوسی معتزلہ کے استدلال کے مخالف ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ صرف معتزلہ کا مسلک نہیں' بلکہ امت مسلمہ کے کئی دوسرے ائمہ بھی حج بدل کے عدم جواز کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

بل قال الامام ابن الھمام ان مالک و الشافی لا یقولون بوصول العبادات البد نیتہ المحضتہ کالصلوۃ والتلاوۃ بل غیرھا کا الصدقتہ والحج (ایضاً)

بلکہ امام ابن ہمام (مصنف شرح فتح القدیر) نے فرمایا ہے کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نہ صرف یہ کہ بدنی عبادات کے ثواب کی منتقلی کے قائل نہیں بلکہ صدقات اور حج کے بارے میں بھی ان کا یہ مسلک ہے کہ اس کا ثواب دوسرے کو نہیں پہنچ سکتا۔

صدر اسلام میں کوئی ستر کے قریب فقہی مذاہب وجود میں آگئے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان میں سے بیشتر نسیاً منسیاً ہوگئے اور صرف چار فقہی مذاہب باقی رہ گئے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ انہی (چار) میں سے دو فقہی مذاہب کے بانی تھے۔ ان کا شمار ائمہ حدیث میں بھی ہوتا ہے۔ اس لئے ان پر کسی مخالف تک نے بھی معتزلہ ہونے کا امکان نہیں لگایا۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ امام مالکؒ کے استدلال کا بھی وہی طریقہ تھا جسے عام طور پر معتزلہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' یعنی یہ کہ وہ ہر دینی معاملے میں قرآن مجید کو سند قرار دیتے تھے۔ چنانچہ حج بدل کے جواز کے ثبوت کے لئے ان کے سامنے خشعمی عورت کے متعلق یہ حدیث پیش کی گئی۔

عن ابن عباس ان امراۃ من خشعم قالت یا رسول اللہ ان ابی ادرکتہ فریضہ اللہ فی الحج شیخا کبیرا الا یستطیع ان یستو فی علے ظھر بصیرہ قال فحجی عنہ

(نیل الاوطار' جلد چہارم' ص۳۰۰' مطبوعہ مصر ۱۹۶۱ء ایڈیشن)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ خشعم کی ایک عورت نے حضور صلعم سے دریافت کیا کہ جس وقت اس کے باپ پر حج فرض ہوا تو وہ بہت بوڑھا ہوچکا تھا اور اس میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس کی طرف سے حج کرلو۔

امام مالکؒ نے اس حدیث کو اپنے مجموعہ حدیث (موطا) میں شامل کیا ہے۔ لیکن اس کے خلاف جس طرح فیصلہ دیا ہے اسے امام قرطبی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:۔

وقال القرطبی رانی مالک ان ظاھر حدیث الختعمیہ مخالف للقران فیر حج ظاھر القران

(ایضاً" صفحہ ۳۰۲)

امام قرطبی نے کہا کہ قبیلہ خشعم کی عورت والی حدیث' قرآن مجید کے واضح ارشادات کے خلاف ہے' اس لئے حدیث کے مقابلے میں قرآن کو ترجیح دی جائے گی۔

اس طرح امام مالکؒ علمائے اسلام کے اس گروہ کے استدلال کو صحیح قرار دیتے ہیں جن پر معتزلہ کی پھبتی کس کر ان کے استدلال کی وقعت کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیال رہے کہ امام مالکؒ اس وقت تک کوئی فتویٰ صادر نہیں فرماتے تھے جب تک کہ وہ اس کا اطمینان نہ کرلیتے تھے کہ مدینہ منورہ کے کم از کم ستر علماء ویسی ہی رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں علمائے مدینہ کی اکثریت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کردہ مندرجہ ذیل حدیث بھی پیش کرتے تھے:۔

وروی سعید بن منصور وغیرہ عن ابن عمر باسناد صحیح انہ لا عن احد

(ایضاً")

سعید بن منصور اور کچھ دوسرے راوی صحیح اسناد کے ذریعے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی جانب سے حج نہ کرے۔

سلف صالحین نے متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن عمر کو امت مسلمہ کا سب سے بڑا متبع سنت قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ چھوٹی سے چھوٹی سنت پر عمل کا اہتمام اس طرح کرتے تھے جس طرح فرائض کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ کے تمام علماء حج بدل کو خلاف اسلام قرار دیتے تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام مالکؒ کی فقہ میں حج بدل کے خلاف جو تفصیلی احکامات ہیں ان کا متعلقہ حصہ بھی مختصراً" قارئین کی خدمت میں پیش کردیا جائے۔

قالوا الحج و ان کان عبادۃ مرکبہ من بدنیہ و مالیۃ ولکن غلب فیہ

جانب البد نته فلا یقبل النیابته فمن کان علیه حجته الاسلام وهی حجته الفریضته فلا یجوزله ان ینیب من یحج عنه

(الفقر علی المذاہب الار بعتہ ۱۹۵۰ء ایڈیشن' جلد اول' ص۵۶۵)

مالکیہ کے نزدیک اگرچہ حج بدنی اور مالی عبادات کا مرکب ہے' لیکن اس میں بدنی عبادات کا حصہ غالب ہے' اس لئے اس میں کسی کو قائم مقام نہیں بنایا جاسکتا۔ پس جس پر حج فرض ہے اس کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنی طرف سے کسی کو حج بدل کے لئے مقرر کرے۔

یہی نہیں بلکہ مالکی مذہب میں ایسے شخص کے لئے سرے سے حج بدل کی نوبت ہی نہیں آتی۔ کیونکہ ان کے نزدیک جو شخص حج کرنے سے معذور ہوجائے' اس سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ومن عجز عن الحج بنفسه ولم یقدر علیه فی الی عام من حیاته فقد سقط عنه الحج بتا تا۔ (ایضاً صفحہ ۵۶۶)

جو خود حج کرنے سے عاجز ہوگیا اور زندگی کے کسی سال میں بھی اسے اس کی قدرت حاصل نہ ہوئی تو (استطاعت کے باوجود) حج اس سے ساقط ہوگیا۔

قبیلہ خشعم کی عورت والی روایت

قبیلہ خشعم کی عورت والی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ امام مالک نے اس روایت کو صحیح قرار دینے کے باوجود خلاف قرآن ہونے کی وجہ سے اسے مسترد کردیا۔ لیکن احناف کا استدلال عجیب ہے۔ ان کا ایک گروہ حج بدل کا قائل ہے' لیکن اس کے باوجود وہ اس حدیث کے ایک حصے پر عمل کرنے کو مکروہ قرار دیتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں اس بارے میں یہ فتویٰ سامنے آتا ہے:۔

اگر کسی کی طرف سے عورت نے حج کیا تو جائز ہے اور مکروہ ہے۔ یہ محیط سرخسی میں ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری اردو' مطبوعہ لاہور' جلد دوم' ص۱۱۷)

معاف بفرمائیے۔ یہ سنت نبویؐ کا عجیب انداز کا احترام ہے کہ اس کے مطابق عمل جائز بھی ہے اور مکروہ بھی! اس کے علاوہ اس حدیث میں کافی اضطراب ہے۔ کسی روایت میں سائل عورت ہے اور کسی میں مرد۔ اسی طرح جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ بھی کہیں باپ ہے..... اور کہیں بہن۔ اور بعض کے نزدیک حضور صلعم کا یہ ارشاد خاص اس عورت کے لئے تھا اور اس کی تائید میں وہ اس حدیث کا یہ آخری ٹکڑا پیش کرتے ہیں:۔

حجی عنه ولیس للحد بعده

(نیل الاوطار' جلد چہارم' ص۳۰۱)

اس کی جانب سے حج کرلو' لیکن اس کے بعد کسی کے لئے جائز نہیں۔

حدیث میں اس اضطراب کی وجہ سے علمائے احناف نے ایک دوسری غیر متعلقہ حدیث سے استدلال کیا ہے۔ لیکن اگر اس استدلال کو تسلیم کیا جائے' تو پھر دوسرے بہت سے مسائل میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے نتیجے میں ایسے تضادات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں' جن سے حج بدل کا جواز مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے پہلے انہوں نے یہ اصول قائم کیا:۔

الاصل فی هذا الباب ان الانسان له ان یجعل ثواب عمله لغیره صلوة و صوما او صدقته اوغیرها۔ عند اهل السنته والجماعته لعاوری عن النبی علیه سلام انه ضحی بکبشین املحین احدهما عن نفسه والاخرعن امته

(شرح فتح القدیر مع ہدایہ' مطبوعہ مصر' جلد دوم' صفحہ ۳۰۸)

اس بارے میں اصل یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایک انسان اپنی عبادات مثلاً" نماز' روزہ' یا صدقہ وغیرہ کا ثواب دوسرے شخص کو منتقل کرسکتا ہے۔ اس کی سند وہ حدیث نبویؐ ہے کہ جس میں حضور صلعم نے دو ڈبڈے مینڈھے عید قربان کے دن ذبح کئے' ایک اپنی طرف سے اور دوسرا ساری امت کی جانب سے۔

اس اصول کی تائید میں قربانی والی جو حدیث پیش کی گئی ہے' اس پر گفتگو تو بعد میں ہوگی' لیکن یہاں ایک اور نکتہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان علماء سے جب یہ استدلال کیا گیا کہ جب اس اہم مسئلہ میں خود قرآن حکیم اور حضور صلعم کے واضح ارشادات موجود ہیں' اور فقہاء کی ایک کثیر تعداد بھی اس قرآنی حکم کو تسلیم کرتی ہے اور اس کے خلاف جو احادیث پیش کی جاتی ہیں ان کو مسترد کرتی ہے' تو آپ حضرات قرآن و سنت کے واضح احکامات کو ترک کرکے ایک غیر متعلق حدیث سے حج بدل کا جواز ثابت کرنے پر کیوں مصر ہیں۔ تو انہوں نے سرے سے قرآن حکیم کی اس آیت پر ہی ہاتھ صاف کردیا اور اس کے ثبوت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب یہ قول پیش کیا۔

وعن ابن عباس ان الایته منسوخته

(تفسیر روح المعانی' جلد ۲۷' ص ۶۶)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت (**لا تزر وازرة.....** الخ) منسوخ ہے۔

جب علمی دلائل سے یہ واضح کیا گیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں' تو پھر ایک نئی تاویل کا سہارا لیا گیا کہ قرآن مجید کا یہ

حکم بے شک واضح ہے لیکن اس کا تعلق امت مسلمہ سے نہیں بلکہ پہلی امتوں سے ہے۔ اور اس کی تائید میں عکرمہ کا یہ قول نقل کیا

وقال عکرمته کان هذا الحکم فی قوم ابراهیم وموسی علیهما السلام

(ایضاً)

عکرمہ نے کہا ہے کہ قرآن کا یہ حکم (کہ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا) حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی امتوں کے بارے میں ہے۔

یہ تو تھا ایک خلاف قرآن عقیدہ اور عمل کا جواز ثابت کرنے کے لئے قرآن کریم کے واضح ارشادات کے ساتھ سلوک۔ اب صحیح احادیث کے ساتھ ان کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیں۔ ان حضرات سے جب یہ کہا گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کردہ صحیح حدیث کے مطابق حج بدل کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں رہتی' تو انہوں نے اس بنیاد پر اس صحیح حدیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کے مقابلے میں دوسری بہت سی احادیث ہیں۔ ان احادیث میں سرفہرست خثعمی عورت والی حدیث ہے۔ اس حدیث کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ اس میں جہاں دوسرے علماء کے نزدیک اضطراب ہے وہاں خود احناف اس کے آخری حصے پر عمل کرنے کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری غیر متعلقہ قربانی والی حدیث ہے۔ لیکن اس کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہم حنفی فقہ کے ایک بنیادی اصول' یعنی قیاس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اہل حدیث علماء کا حنفی فقہ اور فقہاء پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اکثر مسائل میں احادیث کو ترک کر کے قیاس یا رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ائمہ اہل حدیث کی کتابوں میں احناف کو اہل الرائے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ یہ حضرات قیاس کے بادشاہ تھے۔ اور بعض اوقات اس سلسلے میں ایسی ایسی نکات آفرینیاں کرتے تھے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بایں ہمہ' حج بدل کے معاملہ میں انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:۔

کان مقتضی القیاس ان لا تجری النیابته فی الحج لتضمنه المشقین البدنیته والمالیته۔ (شرح فتح القدیر' جلد ۲' ص ۱۰)

قیاس کا اقتضاء یہ ہے کہ بدنی اور مالی عبادتوں کے اجتماع کی وجہ سے حج بدل جائز قرار نہیں پاتا۔

لیکن یہ قیاس چونکہ ان کے خود ساختہ مسلک کے خلاف پڑتا تھا' اس لئے انہوں نے اپنی ہی فقہ کی اس اہم بنیاد کو ترک کر کے ایسی احادیث کا سہارا لیا کہ جو ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف قرار پاتی ہیں۔ خثعمی عورت والی حدیث کی تفصیلات پیش کی جا چکی ہیں۔ اب دوسری غیر متعلقہ حدیث (بابت قربانی) کو لیجئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ علمائے حدیث مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر اسے ضعیف قرار دیتے ہیں:۔

هذا حدیث غریب من هذا الوجه و قال المطلب بن عبدالله بن حنطب۔

یقال انہ لم یسمع من جابر

(نیل الاوطار' جلد پنجم' ص ۱۱۷)

یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے کہ (حدیث کے ایک راوی) مطلب نے حدیث کے آخری راوی حضرت جابرؓ سے اسے نہیں سنا تھا۔

اور جب علمائے حدیث کی صحیح قرار دادہ احادیث موجود ہوں' تو پھر اصولاً" ضعیف حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر بالفرض اس حدیث کو صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے ایک عجیب و غریب چونکا دینے والا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ حدیث یہ (بیان کی جاتی) ہے کہ حضورؐ نے دو مینڈھوں کی قربانی دی' ایک اپنی طرف سے اور دوسری ساری امت کی طرف سے۔ سو جب حضورؐ ساری امت کی طرف سے قربانی دے چکے ہیں تو پھر امت کے کسی فرد کے لئے بھی قربانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی! سوچئے کہ یہ گہرا سوچنے کا مقام ہے۔

اپنے استدلال کی ان کمزوریوں کی وجہ سے حنفی فقہاء نے کچھ اس قسم کا فتویٰ دیا کہ حج بدل کا جواز بے معنی ہو کر رہ گیا۔ امام محمد حنفی فقہ کے بانی ثانی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ فقہ حنفی انہی کے توسط سے آگے پہنچی ہے۔ انہوں نے اس بارے میں یہ فتویٰ صادر فرمایا:

وعن محمد رحمتہ اللہ ان الحج یقع عن الحاج والامر ثواب النفقتہ للانہ عبادۃ بدنیتہ وعند الفجر اقیم الانفاق مقامہ کالفدیتہ فی باب الصوم (ہدایہ مع شرح فتح القدیر' جلد دوم' ص ۳۱۸)

امام محمد سے روایت ہے کہ حج بدل میں حج تو حج کرنے والے کا ہوتا ہے البتہ جس کی طرف سے حج کیا جاتا ہے اسے ان اخراجات کا ثواب ملتا ہے جو اس نے اس حج کے لئے مہیا کئے تھے۔ اس کی معذوری کی وجہ سے حج کے یہ اخراجات اصل حج کے قائمقام ہو جاتے ہیں جس طرح روزے کا فدیہ۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب حج بدل کرانے والے کا فریضہ حج ادا ہی نہیں ہوتا تو پھر ایسے حج بدل کا فائدہ کیا؟ اور متاخرین علمائے احناف کا بھی اسی فتویٰ کے مطابق عمل رہا ہے۔ علامہ ابن الہمام فرماتے ہیں:۔

وعلیہ جمع من المتاخرین' صدر اسلام' الاستیجانی وقاضی خاف حتی نسب شیخ الاسلام ھذا الاصحابنا فقال علی قول اصحابنا اصلی الحج عن المامور۔

(ایضاً"۔ ص ۲۱۱)

اور متاخرین علمائے حنفیہ کی ایک جماعت کا یہی مسلک ہے جن میں امام صدر اسلام الاستیجانی اور قاضی خاف شامل ہیں۔ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ حنفی فقہ کے تمام ائمہ

کا یہی مسلک ہے اور ان کے اس مسلک کے مطابق حج بدل میں صرف اسی کا حج ادا ہوتا ہے جو دوسرے کے اخراجات پر حج ادا کرتا ہے (یعنی حج بدل کرانے والے کا حج ادا نہیں ہوتا)۔

حنفی فقہ کے ایک دوسرے استدلال کی روشنی میں بھی حج بدل کا جواز مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ یوں کہ ان کے نزدیک کسی قسم کی عبادت اجرت پر کرانی جائز نہیں۔ امام کاسانی فرماتے ہیں۔

الا ستیجار علی الصوم والصلوۃ والحج انہ لا یصح لانہا من فروض الاعیان۔

(البدائع والصنائع' جلد چہارم' کتاب الاجارۃ' ص ۱۹۱ مطبوعہ مصر)

اجرت پر نماز' روزہ یا حج کی عبادات صحیح نہیں کیونکہ یہ عبادات فرض عین ہیں۔

حرف آخر مختصراً یہ کہ قران مجید' حدیث نبویؐ اور فقہا کے اقوال کے مطابق شریعت اسلامی میں حج بدل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور دوسرے علمائے اسلام کی اکثریت کا فیصلہ واضح اور دو ٹوک ہے۔ اس کے برخلاف بعض علمائے احناف نے جو اس کا جواز ثابت کرنے کی کوششیں کی ہے تو اس سے قرآن حکیم کی ایک واضح آیت کو منسوخ قرار دینے کی نوبت آگئی۔ پھر انہیں اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے کئی تضادات کا سامنا کرنا پڑا۔ حتی کہ انہیں اس قسم کا فتویٰ دینا پڑا جس سے حج بدل کا جواز بے اثر ہو کر رہ گیا اور اس طرح حقیقت پر پردے ڈالنے کے باوجود قرآن حکیم کی یہ سچائی ابھر کر سامنے آگئی کہ کوئی انسان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور ہر ایک کے لئے اس کے اپنے عمل کے سوا کچھ نہیں۔ (پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

طلوع اسلام

دین (یعنی قرآنی نظام) کی رو سے "حج" امت کے نمائندگان اور مبصرین کے اجتماع کا نام ہے جس میں امت کے اجتماعی امور کے متعلق غور و فکر اور مشاورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے تین الفاظ میں جامع طور پر اس اجتماع کا مقصد واضح کر دیا ہے جب کہا کہ: **لیشھدوا منافع لھم** (۲۲/۲۸) اس اجتماع سے مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی

آنکھوں سے دیکھ لیں (مشاہدہ کر لیں) کہ ان کا نظام اس کی منفعت (مفاد) کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ حج کے اس مفہوم و مقصود کے پیش نظر "کسی کا کسی کی طرف سے حج کرنے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن جب اسلام' دین کی جگہ مذہب بن گیا تو پھر اسلامی نظام (کے پروگرام) کے ان اجزاء کا مقصد "ثواب حاصل کرنا" رہ گیا اور پھر ثواب کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اسے دوسروں کی طرف منتقل بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسے "ایصال ثواب" کہا جاتا ہے۔ "حج بدل" بھی اسی اصل کی ایک شاخ ہے۔ اس میں حج کرنے والا' حج کے ثواب کو' اس شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس نے اسے حج کرایا تھا۔ یعنی حج کا ثواب تو وہ لے جاتا ہے اور حاجی کہلاتا یہ ہے۔ یہ درحقیقت سرمایہ داروں کے چونچلے ہیں۔ سرمایہ دار' محنت کئے بغیر محض سرمایہ پر منافع حاصل کرتا ہے۔ جو کچھ وہ دنیاوی معاملات میں کرتا ہے' وہ کچھ "اخروی معاملات" میں بھی کرنا چاہتا ہے۔ وہ حج کرنے کی محنت اور مشقت سے بچتا ہے اور کسی دوسرے کو روپیہ دیکر' اس کے بدلے میں حج کا ثواب حاصل کر لیتا ہے۔ وہ "جنت خریدنے" کے بیشتر معاملات میں ایسا ہی کرتا ہے۔ یہاں مسجد بنوادی اور بلا محنت و مشقت' محض سرمایہ کے بدلے جنت میں گھر حاصل کر لیا **وقس علی ذالک**۔ ایصال ثواب کا عقیدہ اسی ذہنیت کا وضع کردہ ہے۔ روپیہ لگا کر دیگیں پکوائیں' اجرتوں پر حافظوں سے قرآن پڑھوایا اور مولوی صاحبان سے ختم دلوایا اور اس سرمایہ پر منافع (یعنی ثواب) یا تو جیتے جی وصول کر لیا اور یا مرنے کے بعد' اگلی دنیا میں منگوا لیا۔

ایصال ثواب کا عقیدہ تو اپنی اصل کے اعتبار سے قران کریم کے قانون مکافات عمل کے یکسر خلاف ہے۔ قانون مکافات کا ملخص یہ ہے کہ:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اساتم فلھا - (۱۷/۷)

اگر تم کوئی اچھا (نیک) کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہارے اپنے لئے ہوگا اور اگر کوئی برا کام کرو گے تو اس کا نقصان بھی تمہیں ہی اٹھانا پڑے گا۔

بات بالکل واضح ہے۔ آپ صبح کے وقت چار میل کی سیر کرتے ہیں۔ اس سے آپ کی صحت پر نہایت اچھا اثر پڑتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی سیر کا یہ اثر اپنے بھائی کی طرف منتقل کر دیں جو اس دوران میں پڑا سوئے رہتا ہے۔ آپ اپنی سیر (عمل) کا نتیجہ (خوشگواری صحت) کسی دوسرے کی طرف منتقل کر ہی نہیں سکتے۔ **لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت** (۲/۲۸۶) جو اچھا کام کرتا ہے اس کا فائدہ اسی کے لئے ہے۔ جو غلط کام کرتا ہے اس کا نتیجہ بھی اسی کو

بھگتنا پڑتا ہے۔ **ولا تزر وازرة وزر اخری** (۶/۱۶۵) کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ہے قانون مکافات عمل۔ اپنی محنت کی (زاید از ضرورت) کمائی کو دین کے اجتماعی نظام (فی سبیل اللہ) کے لئے دے دینا ایک ایسا عمل ہے جس کا اجر (معاوضہ) خود اس عمل کے اندر مضمر ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ کسی دوسرے کو روپیہ دے دیتے ہیں۔ وہ کچھ کام کرتا ہے اور اس کام کا اجر (ثواب) آپ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اجر (کام کا نتیجہ) کام کرنے والے ہی کو ملتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے قانون مکافات عمل جو دین کی اصل اور اساس ہے (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کی کتاب "جہان فردا" میں ملے گی)۔

پروفیسر شہاب، مروجہ مذہب (اسلام) کے عقائد اور رسوم کا جائزہ، خود انہی حضرات کی مستند کتب کی روشنی میں لیتے ہیں اور اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ یہ کس طرح قرآن کے خلاف ہیں۔ ان کی اس قسم کی تحقیق و تدقیق اور سعی و کاوش کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قارئین کو معلوم ہو جاتا ہے کہ (وضعی) روایات اور فقہ کی رو سے کس طرح غلط عقائد و اعمال کو مستند بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حتی کہ جب کوئی اور چارہ کار نہ رہے تو قرآن کی آیات کو منسوخ قرار دینے میں باک نہیں سمجھا جاتا۔

خدا ایں سخت جاں را یار باداً !
کہ افتاد است از بام بلندے

(جون ۱۹۷۸ء)

۳۔ روزوں کا مقصد

(خدا کی کبریائی کا قیام)

(پرویز صاحب کا خصوصی درس قرآن)

عزیزان گرامی قدر! درس قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورہ النمل کی اگلی آیت سے یہ سلسلہ کلام شروع ہونا چاہیے تھا۔ لیکن احباب کے تقاضا کے پیش نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورہ بقرہ کی تین چار آیات (۱۸۳-۱۸۷/۲) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں، اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآن کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے، اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا

ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً" اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی۔ **وانزل اللہ علیک الکتاب والحکمتہ** '(۴/۱۱۳) "اے رسولؐ !اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے"۔ کتاب کے معنی احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد 'ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمت بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے' یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے' تو وہ اس کی تعمیل طوعاً" و کرہاً" کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرمجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا' اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں' تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے یکسکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر بھی لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سر نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کے استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ..... ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا .... **کتب علیکم الصیام** (۲/۱۸۳) "اے جماعت مومنین ! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں"۔ یہ "کتاب" یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا **لعلکم تتقون** (۲/۱۸۳)' **لعلکم تشکرون** (۲/۱۸۵) اور **ولتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵)۔ تتقون سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانین خداوندی

کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ رہو۔ تشکرون سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دوغایات کے متعلق سردست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا۔ اور وہ غایت الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ' یعنی خدا کی کبرائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم**۔

سب سے پہلے لفظ "کبریائی" کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہل فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں' یعنی یہ کہ **تکون لکما الکبریاء فی الارض** (۱۰/۷۸) "یعنی تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے' اقتدار تمہارے ہاتھ میں آجائے"۔ اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے' اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہ راست قائم ہے۔ تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجال انحراف نہیں' یارائے سرکشی نہیں۔ **ولہ الکبریاء فی السموت والارض وھو العزیز الحکیم** (۴۵/۳۷) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔ دوسری جگہ ہے **وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ** (۴۳/۸۴) "وہی آسمانوں میں بھی صاحب اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحب اقتدار" (الہ کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ **یا یھا المدثر** (۷۴/۱) "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشن کائنات بہار نور کا مظہر بن جائے گا (المدثر کے یہی معنی ہیں)' **قم فانذر** (۷۴/۲) "اٹھ اور نوع انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے"۔ **وربک فکبر** (۷۴/۳) "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو"۔ یہ تھا منصب رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے' لیکن میں ان سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ **ولم یکن لہ شریک فی الملک** "حکومت صرف اس کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا"۔ اور اس کے آگے ہے **وکبرہ تکبیرا** (۱۷/۱۱۱) لہٰذا' تم اس کی

کبریائی قائم کرو"۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ "المتکبر" (۵۹/۲۳) کہا ہے' کہیں الکبیر المتعال (۱۳/۹) اور کہیں العلی الکبیر (۲۲/۶۲)۔ ہماری دنیا میں وہ العلی الکبیر کیسے قرار پاتا ہے' اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فالحکم للہ العلی الکبیر (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے نہ وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے' نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہو گی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (۵/۴۴)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان کو ہی کافر کہا جاتا ہے۔

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظام خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعت مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے وجعل کلمتہ الذین کفروا السفلی وکلمتہ اللہ ھی العلیا (۹/۴۰) "اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے' عملاً" مسلط ہو جائے"۔ اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و د ین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے' خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومت خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعت مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہو گی' یعنی یہ فریضہ محمد رسول اللہ والذین معہ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعت مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے اس نے انہیں الاعلون کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا **وانتم الاعلون ان کنتم مومنین** (۳/۱۳۸) اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے **ان کنتم مومنین** کی شرط عائد کر دی ہے' "یعنی اگر تم مومن ہوئے تو"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا' مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ **ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا** (۴/۱۴۱) خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعت مومنین پر غالب آنے دے۔ لہٰذا' یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ **انتم الاعلون**' لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبہ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سرزمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ **الاعلی** میں نہیں' **سبحن ربی الاعلی**------ **الاعلی** کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں جو ہمیں **الاعلون** کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرانیت ہے' مومن کی علو شان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:۔

> **ما صرف عن ایتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق** (۷/۱۴۶)
> جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہی کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعت مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵) صدر اول کی جماعت مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً" مساعد فضا میں نظام خداوندی کی بنیادی رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے۔ اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے

گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا۔ اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم** (۲/۱۸۵) خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آجکل مستقل فوج سے الگ (RESERVISTS) ہوتے ہیں' وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقت ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضورؐ نبی اکرم سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے' تو آپؐ نے فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہی دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ **شھر رمضان الذی انزل فیہ القران** (۲/۱۸۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

> **قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا۔ ھو خیر مما یجمعون** (۱۰/۵۸)
> اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاع گراں بہا بلامزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشن نزول قرآن ہے۔ قرآن خدا کی کبریائی کا ضابطہ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد **لتکبروا اللہ علی ما ھدکم** تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں' اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو۔" یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا' مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس بڑائی بیان کرنے کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان'

نماز اور عیدین کی تکبیریں' اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ' یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں' یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر' اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے بصد آہ و فغاں کہا تھا کہ:۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور ' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ:

اللہ اکبر!

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ:

اشھد ان لا الہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا ہے کہ میں اس حقیقت کی "شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابل قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو' جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور تو علم نہیں' میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت قابل قبول ہونا تو درکنار' اسے درخور سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا' اشہد ان لا الہ اسی کا قابل قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا عینی شاہد ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں' یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا عینی شاہد نہیں' اسے اشہد ان لا الہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: **شھد اللہ انہ لا الہ الا ھو** "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں ہے"۔ **والملئکتہ** "اور ملا ئکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی شہادت دیں' کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے **واولوا العلم قائما بالقسط** "ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزان عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ **لا الہ الا ھو العزیز الحکیم** (۳/۱۷) "خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں' بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے"

آپ نے غور فرمایا کہ---- قرآن کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعت مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزان من! میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہی۔ والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

(اکتوبر ۱۹۷۸ء)

صلوٰۃ اور دیگر ارکان کے مقاصد پر نگہ بازگشت

طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۹ء میں جو میرا مقالہ بعنوان---- دین اور مذہب میں کش مکش---- شائع ہوا تو اس سلسلے میں مجھے بہت سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب ملک میں ایسی فضا عام ہو رہی ہے جس میں دین سے متعلق بنیادی مسائل سے اس قدر دلچسپی لی جا رہی ہے۔ ان استفسارات میں بعض نکات ایسے ہیں جن کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ وضاحت بعض مثالوں کی رو سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آئے گی۔

قرآن کریم کی یہ آیت بڑی مشہور ہے اور اسے اکثر و بیشتر دہرایا جاتا ہے' یعنی :-

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر (۲۹/۴۵)

عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "بے شک نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روک دیتی ہے"۔ لغت کی رو سے فحشا کے معنی بخل اور خودغرضی کے بھی ہیں اور منکر کے معنی عقل خودبیں کی فریب کاریوں کے۔ لہٰذا' اس آیت کا مفہوم یہ بھی ہوگا کہ یہ یقینی بات ہے کہ "**الصلوۃ**" خود غرضیوں اور فریب کاریوں سے روک دیتی ہے۔ مفہوم یہ ہو یا وہ' اس آیت میں حتمی اور یقینی طور پر کہا گیا ہے کہ "**الصلوۃ**" کا لازمی اور فطری نتیجہ یہ ہے کہ اول تو پورے کا پورا معاشرہ ورنہ کم از کم معلی (نمازی) ہر قسم کی برائیوں' بے حیائیوں' خود غرضیوں اور فریب کاریوں سے رک جاتا ہے۔ اس سے ایسی حرکات سرزد ہی نہیں ہو سکتیں۔

یہ تو **الصلوۃ** کا منفی پہلو ہے۔ مثبت پہلو کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ جب نماز کے لئے بلایا جاتا ہے (یعنی اذان دی جاتی ہے) تو باواز بلند کہا جاتا ہے--- **حی علی الصلوۃ**------ "آؤ صلوٰۃ کی طرف" اور اگلے ہی سانس میں اس کی تشریح یہ کہہ کر دی جاتی ہے کہ **حی علی الفلاح** ------ "آؤ کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف"۔ یہ اعلان درحقیقت قرآن مجید کی ان آیات کا مخفف یا ملخص ہے جن میں کہا گیا ہے : **قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون** اور **ھم علی صلوٰتھم یحافظون** (۲۳/۱'۲'۹) یعنی یہ حقیقت ہے کہ مومنین جو صلوٰۃ

کی پابندی کرتے ہیں وہ بڑی کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں ہر قسم کی فلاح و بہبود حاصل ہوتی ہے۔ ان کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں (فلاح کے یہی معنے ہیں)۔

ان آیات۔۔۔ اور انہی جیسی متعدد دیگر آیات۔۔۔ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ الصلوۃ کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ ہر قسم کی برائیوں' بے حیائیوں' فریب کاریوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا اور اسے فلاح و بہبود حاصل ہوگی۔ اجتماعی معاشرہ سے قطع نظر' کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ نمازیوں کی سیرت اس قسم کی تمام برائیوں سے پاک اور صاف ہوگی اور انہیں ہر قسم کی فلاح و بہبود حاصل ہوگی۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں یعنی جو لوگ نماز پڑھتے ہیں کیا ان کی زندگی واقعی ایسی ہوتی ہے؟ اس کا جواب ہم سے نہیں ' خود اس امام یا خطیب سے مانگئے جو نماز کے ہر اجتماع میں نمازیوں سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ "ہم میں برائیاں اور بے حیائیاں عام ہو رہی ہیں۔ ہم میں سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی نہیں رہی۔ اگر ہم ان فحشاء و منکرات سے باز نہ آئے تو ہم پر خدا کا غضب نازل ہو جائے گا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان نمازیوں کی نماز انہیں فحشاء و منکر سے نہیں روکتی۔ اس کے لئے انہیں الگ وعظ اور نصیحت کرنی پڑتی ہے۔ اور یہ وعظ و نصیحت بھی اکثر و بیشتر بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے سامنے ہے' یعنی:۔

۱۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے **الصلوۃ فحشاء** اور منکر سے روکتی ہے، اور فلاح و بہبود کی ضامن ہوتی ہے۔

۲۔ جو نمازیں ہم پڑھتے ہیں وہ یہ نتائج پیدا نہیں کرتیں۔ اس سے انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

i)۔ یا تو (معاذ اللہ) خدا کا یہ وعدہ (بلکہ دعویٰ) غلط ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر سے روکتی ہے۔ اور یا

ii)۔ جو کچھ ہم صلوٰۃ کے نام سے کرتے ہیں وہ' وہ صلوٰۃ نہیں جسے خدا نے متعین فرمایا ہے۔

اسلام کے متعلق ہم ساری دنیا میں اعلان کرتے ہیں کہ یہ سائنٹیفک نظام زندگی (دین) ہے۔ سائنٹیفک کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ "اگر یوں کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا"۔۔۔۔۔۔ اگر ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ایک خاص تناسب کے ساتھ ملایا جائے تو اس سے پانی بن جائے گا۔ اگر پانی کو آگ پر رکھو گے تو وہ ایک خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جائے گا اور پھر بھاپ بن کر اڑ جائے گا۔ اگر تندرست بیج کو مناسب زمین (SOIL) میں بو کر قاعدے کے مطابق پانی' روشنی اور حرارت کا انتظام کرو گے تو اس سے یقیناً" کھیتی اگے گی۔

اللہ تعالیٰ نے دین کے ہر حکم کے سلسلے میں کہا ہے کہ اس پر عمل کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ سائنس کی زبان میں یوں کہا جائے گا کہ خدا کا ہر حکم ایک "فارمولا" ہوتا ہے جسے عمل میں لانے سے متعین نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ اگر الصلوۃ کے "فارمولے" پر عمل کرو گے تو اس کا لازمی نتیجہ فحشاء و منکر کا انسداد اور فلاح و بہبود کا ضامن ہوتا ہے۔

اب اس مثال کو آگے بڑھائیں۔ بخار کے ایک مریض کے متعلق ڈاکٹر کی تشخیص یہ ہے کہ اسے ٹائیفائیڈ ہے۔

اس کے لئے وہ دوائی کے کیپ شولز تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ چھ چھ گھنٹے کے بعد ایک کیپ شول دیتے چلے جاؤ۔ اول تو چوبیس گھنٹے کے بعد' ورنہ زیادہ سے زیادہ چھتیس گھنٹے کے بعد' بخار نارمل ہو جائے گا۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ٹھیک ٹھیک عمل کیا جاتا ہے لیکن بخار ہے کہ نارمل تو ایک طرف' کم ہونے کا بھی نام نہیں لیتا۔ اس سے آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ اس نتیجے پر کہ:

(۱) یا تو ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہے۔

(۲) یا جو علاج تجویز کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں۔ اور

(۳) یا کیپ شولز میں صحیح دوائی نہیں۔

آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ بخار بدستور رہے اور آپ وہی کیپ شولز دیتے چلے جائیں۔ آپ مرض کی دوبارہ تشخیص کراتے ہیں۔ مرض وہی تشخیص ہوتا ہے لیکن پتہ چلتا ہے کہ کیپ شولز کی شکل و صورت تو اصل جیسی تھی لیکن ان میں دوائی جعلی تھی اور بعض بالکل خالی تھے۔ آپ کبھی ایسا نہیں کرتے کہ انہی سابقہ کیپ شولز کو دہراتے چلے جائیں۔ آپ صحیح کیپ شولز حاصل کرتے ہیں اور ان کے صحیح ہونے کا معیار یہ قرار دیتے ہیں کہ ان سے مقررہ مدت کے اندر بخار اتر جائے۔

لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مرض کا سبب فحشاء اور منکر بتایا۔ اس کا علاج الصلوۃ تجویز کیا اور حتمی طور پر کہا کہ اس سے فحشاء و منکر کا سدباب ہو جائے گا اور تمہیں فلاح و بہبود حاصل ہو جائے گی۔ لیکن ہم جس عمل کو صلوٰۃ (نماز) کہہ کر اس پر اس شدومد سے کاربند ہوتے ہیں' اس سے یہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا' اس سے فحشاء و منکر نہیں رک رہے۔ بایں ہمہ' ہم ہیں کہ بجائے اس کے کہ کھڑے ہو کر سوچیں کہ غلطی کہاں ہے' اسی عمل کو دہرائے چلے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں' جب کہا جائے کہ معاشرہ میں فحشاء و منکر عام ہو رہے ہیں تو جواب دیا جاتا ہے کہ. اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں نماز پڑھیں۔ یعنی کمی تعداد کی ہے کیپ شولز میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن جس خدا نے یہ کہا تھا کہ: **ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر** اسی نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ **واللہ یعلم ما تصنعون** (۲۹/۴۵) "جو کچھ تم مصنوعی طور پر کرتے ہو' رسمی طور پر کرتے ہو' میکانکی طور پر کرتے ہو اور مطمئن ہو جاتے ہو کہ ہم نے فریضہ صلوٰۃ ادا کر دیا ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے"۔ وہ جانتا ہے کہ مصنوعی کیپ سے مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس سے تو بلکہ موت واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ **فویل للمصلین** ان نمازیوں کے لئے تباہی ہے۔ **الذین ھم عن صلاتھم ساھون۔ الذین ھم یراء ون** (۱۰۷/۴-۶) جو صلوٰۃ کے مقصد کو تو فراموش کر دیتے ہیں اور اس کی مرئی اور محسوس حرکات کو صلوٰۃ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے منشاء خداوندی کو پورا کر دیا۔

میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ الصلوۃ کی شکل و صورت کس قسم کی ہونی چاہیے' اس کی تفاصیل و جزئیات کیا ہونی چاہئیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس صلوٰۃ کا عملی نتیجہ **تنھی عن الفحشاء والمنکر** ہو گا وہ صلوٰۃ منشاء

خداوندی کے مطابق ہوگی۔ جس سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا وہ "ماتصنعون" کے زمرے میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک جدید فرقہ (اہل قرآن) نے نماز کے اوقات اور دیگر جزئیات میں تبدیلیاں کیں۔ لیکن ان سے کونسا قرآنی مقصد حاصل ہو گیا؟ یاد رکھئے! جن کیپ شولز سے شفا نہ ہوتی ہو' انہیں تین بار دیجئے یا چھ بار' اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جو دوائی کیپ شولز کے اندر ہے وہ اصلی ہے یا نہیں۔ اور اس کے پرکھنے کا پیمانہ یہ ہے کہ اس سے وہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں جسے خدا نے خود متعین فرمایا ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ جس نماز کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اس سے فحشاء و منکر کا سدباب نہیں ہوتا۔ نمازیوں کی میرت اور ان کا کردار اس کا بین ثبوت ہوتا ہے۔ آپ ایسی صلوٰۃ کا نظام قائم کیجئے جس سے فحشاء و منکر کا سدباب ہو اور فلاح و بہبود کی فراوانیاں میسر۔ پھر دیکھئے کہ لوگ کس طرح فوج در فوج اس کی طرف آتے ہیں (۲/۱۱۰)۔ جس دوائی سے مریض کو آرام آتا ہو وہ اس کے استعمال سے کبھی کوتاہی نہیں کرے گا۔ وہ تو اس کے وقت پر آوازیں دے دے کر دوائی مانگے گا۔

اس کے جواب میں مذہبی پیشوائیت کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو خدا کے احکام ہیں جن کی بلاچوں و چرا تعمیل ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ ان کے متعلق اس قسم کے سوالات اٹھانے ہی نہیں چاہئیں۔ ایسا کرنا ایمان کی کمزوری ہے۔

یہ درست ہے کہ یہ خدا کے احکام ہیں جن کی تعمیل ضروری ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مذہب کے خدا کے تصور اور دین کے خدا کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک ڈکٹیٹر کا سا ہوتا ہے۔ وہ' جو جی میں آئے حکم دیتا ہے۔ نہ اس کی کوئی علت بتاتا ہے نہ غایت۔ بس اتنا کہتا ہے کہ تمہیں یہ حکم ماننا ہوگا۔ جو نہیں مانے گا اس کی کھال ادھیڑ دی جائے گا۔

اس کے برعکس' دین (قرآن) کا خدا ہے جو ایک ناصح مشفق کی طرح نوع انسان سے کہتا ہے کہ تمہارے ہاں اس قسم کی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کے ازالہ کی یہ تدبیر ہے۔ اس کے مطابق عمل کرو گے تو اس سے تمہارا بھلا ہوگا' یعنی یہ خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارا نقصان ہوگا۔ اب دیکھئے قرآن کریم میں احکام خداوندی کے ساتھ کہا جاتا ہے **لعلکم**" تم ایسا کرو تاکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے **ذلکم خیر لکم ان کنتم مومنین** (۷/۸۵) اس میں تمہارا اپنا ہی بھلا ہے۔ جامع طور پر ان الفاظ میں کہ:

ان احسنتم احسنتم لانفسکم - وان اساتھم فلھا (۷/۱۷)

اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کو پہنچے گا۔ اور اگر برے کام کرو گے تو اس کا خمیازہ بھی تم ہی بھگتو گے۔

اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ حتیٰ کہ:

ان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعا - فان اللہ لغنی حمید (۸/۱۴)

اگر تم' اور تمہارے ساتھ تمام ساکنان ارض کفر اختیار کر لیں' تو اس سے خدا کا کوئی

نقصان نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے کفر و ایمان سے مستغنی ہے۔

خدا کے احکام کی تعمیل ایسے ہی ہے جیسے (بلا تمثیل) ڈاکٹر کی ہدایات کی پابندی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے احکام و ارشادات کو ہدایت سے تعبیر کیا ہے۔

لہٰذا' جب حکم دینے والے خدا نے کہہ دیا ہے کہ اگر تم اس کی تعمیل کرو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے لئے منفعت بخش ہوگا۔ تو جب اس کے احکام کی تعمیل کے منفعت بخش نتائج سامنے آئیں گے تو دنیا لپک کر ان کی طرف آئے گی۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: **اذا جاء نصر اللہ والفتح۔ و رایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا** (۲-۱/۱۱۰) "جب (تمہارے ایمان اور اعمال کے نتیجہ میں) خدا کی نصرت تمہارے شامل حال ہوگی اور فتح اور کامرانی تمہارے قدم چومے گی تو تم دیکھو گے کہ اقوام عالم کس طرح جوق در جوق دین خداوندی میں داخل ہوتی ہیں"۔ اور اگر تمہارے رسمی اور مصنوعی اعمال یہ نتیجہ پیدا نہیں کریں گے تو پھر نہ تمہارے وعظ و تلقین سے لوگ احکام خداوندی کی پابندی کریں گے' نہ دنیا فوج در فوج حلقہ بگوش اسلام ہوگی۔

یہاں تک ہم نے صلوٰۃ کی بات کی تھی۔ اس کے بعد' حج کی طرف آیئے جو ہمارا سب سے بڑا اور عالمگیر اجتماع ہے۔ اس اجتماع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دو۔

لیشھدوا منافع لھم (۲۲/۲۸)

تاکہ وہاں جاکر یہ اپنی منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ یہ بتائی گئی ہے حج کی غایت ---- اس اجتماع عظیم کا مقصد ---- بلکہ اگر غور سے دیکھیں تو بات اس سے بھی زیادہ اہم سامنے آتی ہے۔ آیت کے شروع میں کہا گیا ہے:۔

واذن فی الناس بالحج (۲۲/۲۷)

تو لوگوں کو حج کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دے۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہ تھا کہ اس اجتماع کا انصرام و اہتمام تو امت مسلمہ کی طرف سے ہو لیکن اس میں دیگر اقوام عالم کے نمائندوں کو بھی مبصرین کی حیثیت سے دعوت شرکت دی جائے' تاکہ وہ اس امر کا مشاہدہ کریں کہ نظام خداوندی عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ بہرحال' اگر اسے اس طرح پھیلا کر نہیں بلکہ سمٹا کر بھی دیکھا جائے تو اتنا تو بالکل واضح ہے کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا حج کے اجتماع میں یہ نظر آتا ہے کہ عالم انسانیت نہیں تو کم از کم امت مسلمہ کی منفعت کے لئے کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کا جواب ہر حاجی دے سکتا ہے۔ وہ محض اپنی عقیدت مندی سے اس فریضہ کو رسمی طور پر ادا کر کے چلا آتا ہے۔ اسے وہاں **منافع لھم** کی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ قرآن کریم نے **لیشھدوا منافع لھم** کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ کوئی نظری یا محض اقتصادی شے نہیں ہوتا۔ ایسا تو منفعتوں کے مرئی اور محسوس طور پر سامنے

آنے کے لئے کہا جائے گا۔

اس سے واضح ہے کہ ہمارے موجودہ حج سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا جسے اللہ تعالیٰ نے اس کی غایت بتایا ہے۔ ہم ہر سال بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ امسال اتنے لاکھ حاجیوں نے اس فریضہ کو ادا کیا۔ لیکن اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ اس کا جو مقصد اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کیا وہ بھی حاصل ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو یہ بھی صلوٰۃ کی طرح محض ایک رسمی عمل بن کر رہ گیا ہے۔ یہ دس لاکھ کے بجائے پچاس لاکھ پر بھی مشتمل ہو جائے تو بھی ایک رسم کی ادائیگی ہوگا۔ منشاء خداوندی کے مطابق تو وہ صحیح ہوگا جس میں عالمگیر انسانیت' یا برسبیل تنزل' امت مسلمہ کی منفعت مشہود طور پر سامنے آجائے۔

اسلام کا تیسرا رکن صوم ہے جسے روزہ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فریضہ کی ادائیگی کا نتیجہ یہ بتایا:۔

لتکبروا اللہ علی ما ھدکم (۲/۱۸۵)

تاکہ تم اس راہ نمائی کی رو سے جسے اللہ نے عطا کیا ہے' اس کی کبریائی کو دنیا میں ثبت کر سکو۔

کبریائی کے معنی ہیں غلبہ' حکومت' اقتدار مطلق وغیرہ۔ قرآن کریم میں ہے:۔

ولہ الکبریاء فی السموت والارض وھو العزیز الحکیم (۴۵/۳۷)

خارجی کائنات اور انسانی دنیا میں کبریائی اسی کو حاصل ہے۔ وہی صاحب غلبہ ہے اور اس کا غلبہ حکمت پر مبنی ہے' دھاندلی پر نہیں۔

خارجی کائنات میں اس کی کبریائی از خود قائم ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں یہ کبریائی انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوگی۔ چنانچہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا گیا کہ **وربک فکبر** (۷۴/۳) اٹھو (قم) اور دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کرو۔ خدا کی کبریائی قائم ہونے کا عملی مفہوم کیا ہے' اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ **فالحکم للہ العلی الکبیر (۴۰/۱۲)** "ہر قسم کا غلبہ اور کبریائی کا مستحق خدا ہے' اس لئے حکومت صرف اسی کی قائم ہونی چاہیے۔ اور خدا کی حکومت کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ **فاحکم بینھم بما انزل اللہ (۵/۴۸)** "ان کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو"۔ بالفاظ دیگر' خدا کی کبریائی کا عملی مفہوم یہ ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں قوانین خداوندی کی حکمرانی ہے اسی طرح انسانی دنیا میں بھی اسی کے قوانین کی حکمرانی ہو۔ اسی کو **الدین** یا نظام خداوندی کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس نظام کے متعلق کہا گیا ہے **لیظھرہ علی الدین کلہ (۹/۳۳)** "یہ نظام انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاموں پر غالب آکر رہے گا"۔

یہ تھی غایت صیام کی' یعنی کتاب اللہ کی حکمرانی کو اس طرح قائم کرنا کہ کوئی اور نظام اس پر غالب نہ آسکے۔ صیام ۲ھ میں فرض ہوئے اور جماعت مومنین نے ہنوز سترہ روزے رکھے تھے کہ انہیں بدر کی رزم گاہ میں اترنا پڑا۔ مقصد

اس سے کیا تھا۔۔۔۔۔۔جعل کلمتہ الذین کفروا السفلی وکلمتہ اللہ ھی العلیا (۹/۴۰) "تاکہ مخالفین کا نظام مغلوب ہو جائے اور اللہ کا نظام غالب آجائے۔ یہ باطل کے نظام کے خلاف پہلا تصادم تھا اور اس پر غلبہ۔ اس کے بعد صیام پر عمل کرنے والی اس امت نے اس دور کے ہر نظام پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اور اس طرح: ولتکبروا اللہ علی ماھدکم (۲/۱۸۵) کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ "اللہ اکبر" اس نظام کا ماٹو یا منشور تھا اور ساری دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے۔

ذرا سوچئے کہ کیا ہمارے روزوں سے یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ دنیا میں کتاب اللہ کی حکمرانی غالب ہو اور جب ہمارا موذن مینارہ پر کھڑا ہو کر دن میں لاکھوں' کروڑوں مساجد سے کم از کم تیس مرتبہ اعلان کرے کہ اللہ اکبر' تو وہ ایک واقعہ کا اعلان ہو نہ کہ محض چند الفاظ کا دہرا دینا۔ ان ملکوں کو تو چھوڑیئے جہاں غیر مسلموں کی حکومت قائم ہے۔ کیا مسلم ممالک میں کوئی ایک ملک بھی ایسا ہے جہاں اللہ اکبر ایک حقیقت کا اعلان ہو' جہاں کبریائی واقعی خدا کی ہو' جہاں حکمرانی اس کتاب کی ہو۔ کیا یہ اللہ اکبر کی محض لفظی تکرار اور اس کی عملاً" نفی نہیں؟

یہاں تک تو دین خداوندی کے دو تین ارکان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہ ہیئت مجموعی اس دین کے پیروؤں کے متعلق فرمایا ہے۔

۱۔ حقا علینا ننج المومنین (۱۰/۱۰۳) "انہیں ہر قسم کی مصیبت اور پریشانی سے محفوظ رکھنا خدا پر واجب ہے"۔ خدا نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ (ضمناً") "حقا علینا" کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم ہمیشہ حقوق اللہ کا ذکر کرتے ہیں' یعنی اللہ کے حقوق جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں خدا نے مومنین کے ایک حق کا ذکر کیا ہے جسے خود خدا نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں' بڑی اہم بات ہے۔

۲۔ وکان حق علینا نصر المومنین (۳۰/۴۷) یعنی مومنین کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے اس فریضہ کو ادا کرے گا تو اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ فرمایا:۔

۳۔ ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا (۴/۱۴۱) "یہ ناممکن ہوگا کہ غیر مسلم مسلمانوں پر غالب آسکیں"۔ مومنین کی تو کیفیت یہ ہوگی کہ:

۴۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین (۳/۱۳۸) "تم کیوں گھبراتے ہو' کیوں افسردہ خاطر ہوتے ہو۔ تم تو مومن ہو اس لئے تمہیں تمام اقوام عالم پر غلبہ حاصل ہوگا۔ فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲/۳۸) تمہیں نہ کسی سے خوف کھانے کی کوئی وجہ ہے نہ ہی ملول خاطر ہونے کی۔

یہ ہیں معیار اس بات کے پرکھنے کے کہ ہم اسلام کے پیرو (مومن) ہیں یا نہیں۔ قرآن کریم نے یہ دعا دی محض نظری طور پر پیش نہیں کئے تھے' ان کی صداقت کا ثبوت عملاً" سامنے آگیا تھا۔۔۔۔ صدر اول کے مسلمانوں کے اجزاء ایمان

وہی تھے جو ہمارے ہیں' یعنی اللہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان' ملا ئکہ پر ایمان اور حیات آخرت پر ایمان۔ ان کا پروگرام بھی انہی ارکان پر مشتمل تھا جو ہمارے ہاں رائج ہیں۔۔۔۔ یعنی صلوٰۃ' صیام' حج' زکوٰۃ وغیرہ۔ اس ایمان اور ان ارکان پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا تھا' اسے ایک ایرانی گورنر نے ایسے جامع اور مانع الفاظ میں بیان کیا تھا جس پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جب ایران فتح ہوا تو تستر کا گورنر' ہرمزان' قیدی کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ ہرمزان! قید و بند کی بات تو بعد میں ہوگی۔ تم پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو جو بڑا اہم اور بنیادی ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ:

> اس سے پہلے تم ایرانی' ہم عربوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ تم ہمیں اس قدر ذلیل اور حقیر سمجھا کرتے تھے کہ دوستی تو ایک طرف' تم ہمارے ساتھ جنگ کرنے کو بھی اپنے لئے باعث ننگ سمجھا کرتے تھے۔ اب وہی تم ہو اور وہی ہم۔ تو پھر یہ کیا ہوا' جو تم نے ہمارے ہاتھوں اس قدر ذلت آمیز شکست کھائی ہے۔ ملک تمہارا ختم ہو گیا۔ مملکت تمہاری تباہ ہوگئی۔ تمہاری تہذیب اور تمدن جس پر تمہیں اس قدر ناز تھا خاک میں مل گئے۔ تم (گورنر) میرے سامنے پابجولاں کھڑے ہو اور تمہارا شہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔ یہ انقلاب کیسے ہو گیا؟ اس کی وجہ کیا ہوئی؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب ہرمزان کا جواب سنئے۔ اس نے کہا:۔

> عمرؓ! بات یہ ہے کہ اس سے پہلے تم اور ہم اکیلے ایک دوسرے سے نمٹتے تھے۔ اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آجاتے تھے۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت ہم تو بدستور اکیلے ہوتے ہیں لیکن تمہارے ساتھ تمہارا خدا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے لئے کیا' دنیا کی کسی طاقت کے لئے بھی ممکن نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکے۔

(شاہکار رسالت' ص ۱۳۳' ایڈیشن چہارم (بلا ترمیم) ۱۹۸۷ء)

یہ تھا عملی ثبوت خدا کے ان دعوؤں کی صداقت کا جن کی رو سے اس نے کہا تھا کہ اگر تم ہماری ہدایات کے مطابق عمل کرو گے تو تمہاری نصرت ہم پر واجب ہو جائے گی اور دنیا کی کوئی قوم تم پر غالب نہیں آسکے گی۔ آج ہمارے اجزاء ایمان بھی وہی ہیں اور اسلام کے ارکان و شعائر بھی وہی۔ اگر تمام کے تمام مسلمان نہیں تو بھی اس کا ایک معتدبہ حصہ ان کی پابندی کرتا ہے۔ ان کی مجموعی تعداد ابتدائی دور کے تمام مسلمانوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود' ہماری جو حالت ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اقوام عالم پر غلبہ تو ایک طرف' ہم بعض قوموں کے دست نگر لہٰذا' ان کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہیں اور بعض سے اس قدر خائف کہ قرآن کریم کے الفاظ میں **یحسبون کل صیحۃ علیھم**(۶۳/۴) کہیں کوئی پتا بھی کھٹکے تو ہماری ان پر بن جاتی ہے۔ اس وقت دنیا کی کوئی قوم

اس قدر خوف اور حزن' پریشانی اور مایوسی کا شکار نہیں جتنی مسلم قوم ہے۔ (معاف فرمایئے) مسلم کے ساتھ اقوام کا لفظ واقعہ کے طور پر لکھنا پڑتا ہے' ورنہ مسلم قوم تو امت واحدہ ہوتے ہیں' اقوام میں بٹے ہوئے نہیں ہوتے۔

ایسا کیوں ہے ؟ اس لئے ہم نے اجزاء ایمان (یعنی بنیادی نظریات زندگی) کے صرف الفاظ دہرانے اور ارکان دین کی صرف رسمی شکلیں (RITUALS) قائم رکھنے کا نام اسلام رکھ چھوڑا ہے۔ ہم نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ یہ دیکھیں کہ اس ایمان اور ان اعمال کا جو حتمی اور یقینی نتیجہ خود خدا نے بتایا تھا وہ برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ وہ برآمد نہیں ہو رہا' لیکن ہم انہیں برابر دہرائے چلے جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے بہت پہلے ہمارا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔ **قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالا** (۱۸/۱۰۳) "اے رسولؐ ! ان سے کہو کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ سب سے زیادہ نقصان میں کون لوگ رہتے ہیں۔" یہ وہ لوگ نہیں جو کچھ کرتے نہیں۔ کرنے کو تو یہ بہت کچھ کرتے ہیں۔ لیکن **الذين ضل سعيهم فى الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعا** (۱۸/۱۰۴) ان کی ساری کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ وہ یہ سب کچھ محض رسمی طور پر کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے ان کاموں کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ **فحبطت اعمالهم** "ان کا تمام کیا کرایا رائیگاں چلا جاتا ہے۔ وہ عبث اور بے کار ہوتا ہے' اس قدر عبث اور بے کار کہ **فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنا** (۱۸/۱۰۵) اس جنس کاسد کے تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

لہٰذا' قرآن کریم نے ہماری تباہی کا بنیادی سبب خود ہی واضح کر دیا' یعنی اسلامی احکام کو محض رسمی طور پر بجا لاتے چلے جانا اور کبھی اس پر غور نہ کرنا کہ ان سے وہ نتائج بھی مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جنہیں ان کا لازمی حصہ قرار دیا گیا تھا۔ دین میں یہی اعمال اپنا متعینہ نتیجہ مرتب کرتے چلے جاتے ہیں اور مذہب میں محض یہ رسم بن کر رہ جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایک مذہب پرست قوم میں دین کے نظریات از سر نو زندگی اور توانائی حاصل کر سکتے ہیں ؟ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں اس موضوع پر بڑی عمیق' فکر انگیز اور عبرت آموز بحث کی ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ اس قسم کی قوم کے مذہبی پیشوا' اس دور کی درخشندہ داستانیں جس میں دین کے اعمال نتیجہ خیز ہوتے تھے' دھرا دھرا کر قوم کو سہانے خوابوں میں سلائے رکھتے ہیں لیکن یاد رکھئے:۔

> قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔ (آکسفورڈ ایڈیشن' ص ۱۴۳)

اس کے بعد انہوں نے ایک ایسی بات کہی ہے جو ہر صاحب فکر و احساس کیلئے نہایت گہرے غور و تدبر کی متقاضی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میں اسے ان کے اصل الفاظ میں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

> THE VERDICT OF HISTORY, AS A MODERN WRITER HAS HAPPILY PUT IT, IS THAT WORN OUT IDEAS

HAVE NEVER RISEN TO POWER AMONG A PEOPLE WHO HAVE WORN THEM OUT.

(P. 144)

یعنی عصر حاضر کے ایک مصنف نے کیسی پتے کی بات کہی ہے کہ:

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن نظریات اور تصورات کو کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو--- وہ اس قوم میں پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے--- (ص ۱۴۴)

یہ کونسی قومیں ہیں جن کی طرف اس دیدہ ور مصنف نے اشارہ کیا ہے ؟ یہ وہی قومیں ہیں جو دین کو مذہب میں تبدیل کر دیتی ہیں- دین کے بنیادی نظریات اور تصورات بے پناہ قوتوں کے حامل ہوتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے والی قوم میں ان قوتوں کا اس طرح مظاہرہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا اس کا مشاہدہ کرتی ہے- اس لئے اس قوم کے اخلاف ان نظریات کے الفاظ کو دہراتے رہتے اور دین کے ارکان پر محض رسمی طور پر عمل پیرا رہتے ہیں- اس سے یہ نظریات اپنی توانائی کھو دیتے اور چلے ہوئے کارتوس بن کر رہ جاتے ہیں- یہ دیدہ ور' بالفاظ دیگر' کہتا یہ ہے کہ:

تاریخ کا فیصلہ ہے کہ مذہب پرست اقوام میں دین کا احیاء نہیں ہو سکتا-

اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے- قرآن کریم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے- ہوتا یہ کہ ایک رسول آتا اور اپنی قوم کو زندگی بخش نظریات دیتا اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق بتاتا- وہ ان کے مطابق عمل کرتے تو زندگی کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں ان کے قدم چومتیں- اسے دین یا نظام خداوندی کہا جاتا- اس نظام میں نہ انسانوں کی حکمرانی کے لئے کوئی گنجائش ہوتی نہ سرمایہ داری کے لئے اور نہ ہی اس میں مذہبی پیشوائیت کا عمل دخل ہوتا- اس میں اطاعت صرف احکام و قوانین خداوندی کی ہوتی- وہ رسول چلا جاتا تو طاغوتی قوتیں پھر سر اٹھاتیں اور مذہبی پیشوائیت ان کی سرخیل ہوتی- اس کی ٹیکنیک یہ ہوتی کہ وہ دین کے نظریات کے الفاظ اور اس کے ارکان کی شکل و صورت (FORM) بدستور قائم رکھتی لیکن ان کے معانی اور مفہوم یکسر بدل دیتی- مفہوم کے بدلنے میں بنیادی حربہ یہ استعمال کیا جاتا کہ ان نظریات اور اعمال کو ان کے نتائج سے پرکھنے کا تصور ختم کر دیا جاتا اور انہیں رسمی طور پر ادا کئے جانے کو مقصد قرار دے دیا جاتا- اکثر و بیشتر رسولؐ کی عطا کردہ وحی کے الفاظ میں بھی تحریف کر دی جاتی یا آمیزش- اس طرح دین' مذہب میں بدل جاتا-

اس کے بعد ایک اور رسول آتا اور دین کے حقیقی نظریات اور ان کے عوامل ان کے سامنے پیش کرتا- مذہبی پیشوائیت اچھی طرح جانتی کہ یہ مذہب کو دین میں تبدیل کر دینے کی کوشش ہے- لہٰذا' اس کی طرف سے اس دعوت کی سخت مخالفت ہوتی- وہ اس (رسول) سے کہتے کہ آپ کونسی ایسی بات لے کر آئے ہیں جو ہمارے پاس پہلے سے موجود نہیں؟ ہم خدا کو مانتے ہیں' اس کے رسولوں کو مانتے ہیں' وحی کو مانتے ہیں' آخرت کو مانتے ہیں- تم بھی انہی پر ایمان لانے کے لئے کہتے ہو- ہم خدا کی پرستش کرتے ہیں- یہی تعلیم تم دیتے ہو- پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اپنی اس

روش کو چھوڑ کر جو ہمارے اسلاف سے مسلسل چلی آرہی ہے' تمہارے پیچھے لگ جائیں؟ اس رسول اور اس کی قوم میں یہ کش مکش جاری رہتی۔ ان میں سے بعض سعادت مند افراد جو دین اور مذہب کے فرق کو پہچان لیتے' اس رسول کی دعوت کو قبول کر لیتے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا کہ یہ رسول اپنی اس مختصر سی جماعت کو اپنے ساتھ لے کر کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر جاتا جو نظام خداوندی کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہوتی۔ اس طرح وہاں دین مستقل ہو جاتا۔

اور جب وہ رسول چلا جاتا تو اس قوم کی بھی وہی حالت ہو جاتی' یعنی ان پر بھی مذہب مسلط ہو جاتا۔ اس تبدل و تحول کی بین مثال حضور نبی اکرمؐ کی دعوت ہے۔ حضورؐ کے مخاطب قریش بھی تھے جو کسی مذہب کے پیرو نہیں تھے' اور یہودی' نصرانی اور (کسی حد تک) مجوس بھی جن کے ہاں دین کی جگہ مذہب رائج تھا۔ انہیں قرآن' اہل کتاب کہہ کر پکارتا ہے۔ حضورؐ کی دعوت کی مخالفت تو ان سب کی طرف سے ہوئی لیکن اس مخالفت کے اسباب و وجوہ مختلف تھے۔ قریش کی مخالفت بر بنائے مذہب نہیں تھی۔ (لیکن اہل کتاب کی مخالفت مذہب کی بنا پر تھی) نتیجہ یہ کہ (شدید مخالفت کے بعد ہی سہی) قریش تو اس ..... دعوت کے پیرو ہو گئے' لیکن اہل کتاب میں سے (باستثناء چند) کسی نے اسے قبول نہ کیا اور اپنے اپنے مذہب کے پابند رہے۔ دین کا قیام اسی طبقہ میں ہوا جو مذہب پرست نہیں تھا۔ یوں دین کے نظریات اس قوم میں توانائی حاصل نہ کر سکے جس نے انہیں فرسودہ کر دیا تھا۔

نبی اکرمؐ اس جماعت مومنین کو' دین پر کاربند ہونے کی بنا پر' دولت کونین کے وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد' مفاد پرست قوتوں (ملوکیت' سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت) نے سر ابھارا اور آہستہ آہستہ دین کو مذہب میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح دین کے آثار مدھم پڑتے چلے گئے اور مذہب کی گرفت محکم سے محکم تر ہوتی گئی' کیونکہ اس کی پشت پر ملوکیت اور سرمایہ داری کی تائید اور قوت تھی۔ صدر اول کے چند لمحات کو چھوڑ کر ہماری ساری تاریخ مذہب کی تاریخ ہے اور جس جدوجہد کو اسلامی کہہ کر پکارا جاتا ہے' وہ درحقیقت مذہب کی گرفت کو محکم کرنے کی کوششیں ہیں۔ یہ کیفیت آج تک چلی آرہی ہے۔

رسول اللہؐ کے بعد کسی رسول نے آنا نہیں کیونکہ حضورؐ پر سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے۔ سلسلہ نبوت کو جاری رکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ دین کا ضابطہ اپنی مکمل اور غیر متبدل شکل میں خدا کی کتاب کے اندر محفوظ ہے اور تمام اقوام عالم کے لئے یکساں آئین حیات۔ جو قوم چاہے' اسے اختیار کر کے اس کے زندگی بخش نتائج سے متمتع ہو سکتی ہے۔ یعنی جو قوم چاہے اس کے ہاں دین کا احیاء ہو سکتا ہے۔ اس لئے اجرائے نبوت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ کسی مذہب پرست قوم میں دین کا احیاء نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ ہندو مت کے متعلق تو کہا نہیں جا سکتا کہ اس کی عمر کتنی ہے۔ اس کے پیرو اسے ازلی قرار دیتے ہیں۔ اس کی عمر کتنی ہی ہو' ان کے ہاں دین کا احیاء نہیں ہو سکا۔ چین اور جاپان کے مذاہب کی بھی یہی کیفیت ہے۔ بدھ مت اور جین مت ان سے کم عمر ہیں لیکن ہیں یہ بھی قدیم مذاہب۔ ان میں بھی کہیں زندگی کی نمود نظر نہیں آتی۔ سامی مذاہب میں یہودیت قدیم اور عیسائیت اس سے عمر میں کم ہے لیکن ان کے ہاں بھی دین کا احیاء نہیں ہوا۔ قدیم مذاہب میں سے

اکثر' زمانے کے تقاضوں کی تاب نہ لا کر مٹ چکے ہیں۔ باقی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر قبروں کی جانب گھسٹتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں پھر سے زندگی اور توانائی نصیب نہیں ہو سکی۔ یوں تاریخ کا یہ فیصلہ ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے کہ:

جن نظریات اور تصورات کو کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو وہ اس قوم میں پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے۔

مذاہب عالم میں اسلام کی عمر سب سے کم ہے لیکن تاریخ کے مذکورہ بالا فیصلہ کا اس پر بھی یکساں اطلاق ہو رہا ہے۔ اس مذہب کے پیروؤں (یعنی ہم مسلمانوں) کو زندگی کی وہ سرفرازیاں نصیب ہی نہیں ہوئیں جن کا مظاہرہ دین کے اتباع کے زمانے میں ہوا تھا۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے 'ہماری طرف کسی نبی نے آنا نہیں تھا۔ دین کی طرف دعوت کا فریضہ (جسے دعوت الی القرآن کہئے) غیر نبی انسانوں کی طرف سے ادا ہونا تھا۔ لیکن جیسا کہ دیگر مذاہب کے سلسلہ میں ہوا' جس نے بھی انہیں قرآن کی دعوت دی' مفاد پرست قوتوں نے اسے کچل کر رکھ دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا بڑا درد انگیز اور الم ناک باب ہے' لیکن اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے احیاء دین کی ایک اسکیم سوچی یعنی انہوں نے سوچا کہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل کیا جائے جہاں مذہب کی حکمرانی نہ ہو۔ اس خطہ زمین میں قرآنی نظام نافذ کر دیا جائے اور اس طرح دین کا احیاء عمل میں آجائے۔ غور سے دیکھئے تو یہ اسکیم' زمانہ حاضرہ کے احوال و ظروف کی روشنی میں' ہندی مسلمانوں کے لئے "ہجرت" کے مترادف تھی۔ قائداعظم کی کوششوں نے اس خطہ زمین کے حصول کو ممکن بنا دیا۔ آپ علامہ اقبالؒ اور قائداعظم کے ارشادات پر غور کیجئے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم کیا جائے گا۔ اس میں تھیوکریسی کو کسی صورت میں بھی روبہ عمل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ ان کی عمروں نے ایفا نہ کیا اور پاکستان میں نتیجہ اس کے بالکل برعکس برآمد ہو گیا یا ہو رہا ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اسلام ایک انفرادی مذہب کی حیثیت میں رائج تھا۔ یہاں وہی مذہب تھیاکریسی کی شکل اختیار کئے جا رہا ہے۔

خواستم پیکاں برارم' در جگر نشتر شکست!

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے بعد' دین اور مذہب کے فرق کو نمایاں طور پر پیش کرنے کا فریضہ میں نے اپنے ذمے لیا' لیکن جس انداز سے اور جس ملک گیر پیمانے پر مذہبی پیشوائیت کی طرف سے میری مخالفت ہوئی اور ہو رہی ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نہ کوئی "مامور من اللہ" نہ میرا کسی قسم کا دعویٰ ہے۔ میں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور قوم سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ:

جو کچھ آپ اسلام کے نام سے کہتے اور کرتے ہیں' اس کے متعلق یہ دیکھ لیجئے کہ اس کے جو نتائج اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتائے ہیں' وہ برآمد ہو رہے ہیں یا نہیں! اگر نہیں ہو رہے (اور ہم سب اس کا رونا روتے رہتے ہیں) تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ منشاء خداوندی کے مطابق نہیں۔ لہٰذا' اسے منشاء

خداوندی کے مطابق بنایئے۔

یہ ہے جو کچھ میں کہتا ہوں۔ لیکن چونکہ مروجہ اسلام کو اس معیار کے مطابق پرکھنے سے مذہب کی شکست ہی نہیں' اس کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ یعنی اس کی جگہ دین لے لیتا ہے۔۔۔۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی مخالفت تاریخ کا فطری عمل ہے۔ لیکن میری اس مخالفت سے حقائق تو نہیں بدل سکتے۔ مذہب نے جو کچھ دوسری قوموں کے ساتھ کیا ہے وہی کچھ ہمارے ساتھ ہوگا (اور ہو رہا ہے)۔

جب مذہب کے پیدا کردہ اسباب کی رو سے قوم کی حالت ابتر ہو جاتی ہے' تو مذہبی پیشوائیت شور مچا دیتی ہے کہ:

(۱) مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑ دیا ہے' اس لئے ان کی یہ حالت ہو گئی ہے اور

(۲) الحاد اور بے دینی کی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں جس سے اسلام خطرے میں ہے۔

جہاں تک الحاد اور بے دینی کی قوتوں کے زور پکڑنے کا تعلق ہے' اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا: **ولن یجعل اللہ للکفرین علی المومنین سبیلا** (۴/۱۴۱) "یہ ناممکن ہے کہ اللہ غیر مسلموں کو مومنین پر غالب آجانے دے۔" اگر آپ مومن ہیں تو پھر الحاد و بے دینی کی قوتوں سے اس قدر خائف کیوں ہیں؟ اور اگر آپ خائف ہیں تو' بجائے اس کے کہ یہ دہائی مچائیں کہ الحاد اور بے دینی کی قوتیں زور پکڑ رہی ہیں' دیانتداری سے اعلان کیجئے کہ ہم مومن نہیں ہیں۔ لیکن مذہبی پیشوائیت دوسروں کو کافر قرار دے دے گی' اپنے متعلق اس اعتراف اور اعلان کی جرات کبھی نہیں کرے گی۔ اقبالؒ کے نشتر انہ الفاظ ۔

ز دوزخ واعظ کافر گرے گفت!
حدیثے خوشتر ازوئے کافرے گفت
"نداند آں غلام احوال خودرا!
کہ دوزخ را مقام دیگرے گفت"

(ارمغان حجاز)

اب رہا ان کا یہ کہنا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ مذہب پرست بن جائیں' یعنی جو کچھ مذہب کے نام سے اس وقت ہو رہا ہے' اس پر اور کثرت اور شدت سے عمل کیا جائے۔ بالفاظ دیگر' ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر میدان کارزار میں ایک سو چلے ہوئے کارتوسوں سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی تو ان کی تعداد بڑھا کر ہزار تک پہنچا دی جائے۔ انہیں کون بتائے کہ عرصہ کارزار میں ایک بھرا ہوا کارتوس دس ہزار خالی کارتوسوں پر بھاری ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے جب کہا تھا تمہارا ایک سو مجاہد فریق مخالف کے ایک ہزار پر غالب آجائے گا (۸/۶۵) تو اس سے یہی بتانا مقصود تھا۔ یاد رکھیئے! مذہب کی نشرواشاعت سے دین کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس' مذہب جتنا زیادہ پھیلے گا قوم اتنی ہی زوال پذیر ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کی ساری عمر مذہب اور دین کے فرق کو نمایاں کرنے میں بسر ہو گئی۔ انہوں نے جو کچھ ملا کے خلاف لکھا ہے' وہ درحقیقت اس کے رسمی اسلام (یعنی مذہب) کے خلاف تنقید ہے۔ کبھی وہ

کہتے ہیں کہ:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور ' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور

اور کبھی یہ کہ:

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل!
یاخاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدامست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اور کبھی یوں نکھار اور ابھار کر کہ:

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

اس احساس سے ان کے قلب درد آگیں میں ایسی ٹیس اٹھتی ہے کہ وہ بصد نالہ و فغاں پکارتے ہیں کہ:

حرم کے دل میں سوز آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تیری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

یہ "حجاب آمیزی" دین کے حقائق پر پڑے ہوئے مذہب کے دبیز پردوں کا دوسرا نام ہے۔

ظاہر ہے کہ اقبالؒ کی اس قسم کی پردہ دری مذہبی پیشوائیت کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ان کے خلاف کفر کے فتوے لگانے تک سے بھی احتراز نہ کیا۔ لیکن انہوں نے اس پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو بس اتنا کہ:

گر قسم حضرت ملا ترش روست
نگاہش مغز رانشاسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم !!
مرا از کعبہ می راند حق اوست
(ارمغان حجاز)

چونکہ تاریخ کا وہ فیصلہ جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے اور قرآن کریم میں بیان کردہ مذہب پرست اقوام کا عبرت ناک انجام ان کے سامنے تھا' اس لئے وہ علی وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ اسلام' الدین کی شکل میں موجودہ

مسلمانوں میں جن پر مذہبی پیشوائیت اس بری طرح مسلط ہے' زندہ نہیں ہو سکتا' اس لئے انہوں نے' بصد حسرت و یاس' لیکن اس کے ساتھ ہی دین کے مستقبل کے متعلق بہ ہزار امید اور یقین کہا کہ:

محفل ما بے مے و بے ساقی است
ساز قرآں نواہا باقی است!
زخمہ ما بے اثر افتد اگر!
آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
حق اگر از پیش ما بردارد ش
پیش قومے دیگرے بگذارد ش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بلرزد دربدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتش خود بر دل دیگر زنند!

(جاوید نامہ)

اور یہ خود قرآن کی اس آیت کی ترجمانی ہے جس میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا تھا کہ:

وان تتولوا یستبدل قوما غیر کم ثم لا یکونوا امثالکم (۴۷/۳۸)

اگر تم نے قرآن سے روگردانی کی تو وہ تمہاری جگہ ایک اور قوم لے آئے گا جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔

یہ وہ قوم ہوگی جس میں قرآنی نظریات کے الفاظ دہرانے کا نام ایمان نہیں ہوگا۔ اس کے نزدیک ان نظریات کے نتائج کی صداقت پر یقین محکم کا نام ایمان ہوگا۔ اس کے ہاں اسلام کے ارکان اور شعائر کی رسمی پابندی فریضہ خداوندی کی ادائیگی نہیں ہوگی۔ وہ قدم قدم پر رک کر دیکھے گی' سوچے گی اور اس امر کا جائزہ لے گی کہ ان سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جن کا وعدہ خدا نے کر رکھا ہے۔ وہ اسلام کی اشاعت' لفظی مناظروں اور نظری کانفرنسوں کے ذریعے نہیں کرے گی بلکہ اقوام عالم کو چیلنج دے گی کہ:

اعملوا علی مکانتکم انی عامل ج فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبتہ الدار ط انہ لا یفلح الظلمون (۶/۱۳۶)

تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو' ہمیں اپنے نظام کو روبہ عمل لانے دو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ آخر الامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔ اور اس بات کو تو ابھی سے سن رکھو کہ جس نظام کی بنیاد ظلم و استبداد پر ہوگی اسے کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکے

گی۔

اس عملی پروگرام کی رو سے یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ نظاموں پر غالب آجائے گا' خواہ وہ مذہب پرست طبقہ کے مسالک ہوں اور خواہ لامذہب اقوام کے نظام۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے' میری زندگی کا مشن بھی دین کا احیاء ہے۔ میری سوچ کا رخ کچھ اس طرف جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ وہ' دین سے روگردانی کرنے والی قوم کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا' تو اس سے بالضرور ایسی قوم مقصود نہیں جو کسی دوسرے ملک سے اٹھے یا کسی دوسری نسل سے متعلق ہو۔ اصل سوال ملک اور نسب کا نہیں' ذہنیت کا ہے۔ اگر کسی مذہب پرست قوم کی اگلی نسل زمانے کے تقاضوں سے مذہب سے برگشتہ ہو جائے اور اس کی تعلیم و تربیت قرآنی خطوط پر کر دی جائے تو یہ بھی وہ قوم ہو سکتی ہے جو مذہب کی جگہ دین کا نظام قائم کرے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی توجہات کو "شاہین بچوں" پر مرکوز کر رکھا تھا اور میں نے بھی اپنے پیغام کا اولین مخاطب اپنی قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو قرار دے رکھا ہے۔ اس میں مجھے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے اور میں اس پروگرام کے مستقبل کے متعلق پرامید بھی ہوں۔ اس وقت تک میں تنہا اس آواز کو بلند کرتا چلا آرہا ہوں۔ اگر اس نہج پر سوچنے والے ارباب ہمت اجتماعی طور پر اس پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس میں کامیابی نہ ہو۔ مذہب تو زمانے کے تقاضوں کی تاب نہ لا کر مٹتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے دین کے لئے فضا خود بخود ہموار ہو رہی ہے۔ اگر ذرا ہمت کر کے اسے صحیح رنگ میں پیش کر دیا جائے' تو مادی دنیا سے مایوس اور متجسس انسان لپک کر اس کی طرف آجائے گا۔

(اگست ۱۹۷۸ء)

آٹھواں باب

جنسیات

۱۔ غلام اور لونڈیاں

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ارشاد ہے کہ جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ انہیں بلا نکاح اور بلا حد تعداد اپنے استعمال میں لائیں گے۔ اس کے بعد جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دیں گے۔ حتیٰ کہ انہیں فروخت بھی کر سکیں گے۔ اس کی پوری تفصیل ان کی کتاب۔ تفہیمات' حصہ دوم' اگست ۱۹۵۱ء ایڈیشن' صفحات ۲۹۔۳۲۴ میں "غلامی کا مسئلہ" کے عنوان کے تحت درج ہے۔ نیز انہوں نے اسے اپنی تفسیر' تفہیم القرآن کی پہلی جلد میں بھی دہرایا ہے۔ (۱۹۵۱ء ایڈیشن ص ۳۴۰)۔

(جون ۱۹۷۸ء)

۲۔ کم از کم ایک لونڈی

جمعیت العلماء اسلام کے رکن اسمبلی' مولانا نعمت اللہ صاحب نے اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا:۔

غلامی کو منسوخ کرنا خلاف اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو' ایسا انتظام کیا جائے کہ وہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔

(پاکستان ٹائمز' یکم مارچ ۱۹۷۳ء)

(جون ۱۹۷۸ء)

۳۔ غلام سربراہ مملکت کا نیلام

لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ محدث کے شمارہ' بابت محرم۔ صفر ۱۳۹۵ھ میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا۔۔۔ علماء حق کے لئے لمحہ فکریہ۔۔۔ اس کی ابتدا ان سطور سے ہوئی تھی۔

علمائے کرام' انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے وارث' دین نبی کے ترجمان' صداقت اسلام کے شاہد' طائفہ منصورہ کی جان اور ملت اسلامیہ کے اصلی نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ وہ

اعزاز ہے جو بیک وقت کسی ایک طبقہ کو ایک ساتھ مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے انہیں ناقابل تسخیر محاذ اور قابل صد رشک اعزاز تصور کیا جاتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گروہ سعید اس احترام' اکرام' اعتماد اور عزت کا اہل بھی ہے۔

کثر ھم اللہ سواد ھم

اس کے بعد علماء سے کہا گیا کہ وہ اپنے مقام کو پہچانیں اور اس کی بازیابی کے لئے متحد ہو جائیں۔ اگر انہوں نے اس مقام کو حاصل کر لیا تو مملکت میں ان کے اقتدار کا کیا عالم ہوگا' اس کی وضاحت کے لئے ایک واقعہ درج کیا گیا۔ اسے غور سے سنئے لکھتے ہیں:

مصری حکومت کا ایک نائب السلطنت اصل میں غلام تھا جو کسی طرح برسراقتدار آگیا تھا۔ غلام اصل میں' اسلامی بیت المال کی ملکیت ہوتے ہیں اس لئے حضرت امام عزالدین بن عبدالسلام نے اعلان کیا کہ یہ شخص بیت المال کی جائیداد ہے اور شرعی طریقے پر آزاد نہیں کیا گیا۔ چنانچہ اس فتوے سے بڑی کھلبلی مچ گئی۔ حکام نے بلا کر پوچھا کہ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا:

ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کو نیلام کریں گے اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا۔ انہوں نے جا کر بادشاہ سے کہا کہ یہ شیخ ہمیں ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے بڑی کوشش کی مگر شیخ نے اپنے الفاظ واپس لینے سے انکار کر دیا جس سے برہم ہو کر شاہ سے شیخ کی شان کے خلاف کوئی غیر محتاط جملہ نکل گیا۔ آپ نے سن کر وہاں سے کوچ کر دیا۔ پھر کیا تھا' سارے شہر میں کہرام مچ گیا' اور بادشاہ کو خود جا کر منتوں سے واپس لانا پڑا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ

وہ امراء سلطنت کو خود نیلام کریں۔

نائب السلطنت نے جلال میں آکر کہا کہ میں اس کی گردن اڑا دوں گا ..... تلوار لے کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا' دستک دی۔ شیخ کا بیٹا آیا۔ دیکھا کہ نائب السلطنت تلوار سونتے کھڑا ہے۔ جا کر بتایا تو شیخ نے کہا کہ:

بیٹا! آپ کا باپ اس قدر خوش نصیب کہاں کہ اس کو شہادت ملے۔ پھر باہر نکلے تو دیکھتے ہی نائب السلطنت کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور بدن پر رعشہ طاری ہو گیا اور پاؤں میں گر گیا اور کہا' آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا آپ کا نیلام! پھر فرمایا رقم کس مد میں ڈالیں گے؟ فرمایا مسلمانوں کے کاموں میں۔ پوچھا' قیمت کون وصول کرے گا؟ فرمایا' میں خود۔ اس نے کہا' بہت اچھا! چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک ایک اسیر کو نیلام کیا کیا اور ہر

ایک کی بولی بولی گئی اور قیمت وصول کر کے وہ خیر کے کاموں میں صرف کی گئی۔
طبقات الشافعیہ ' ماخوذ از تاریخ دعوت و عزیمت)
(جون ۱۹۷۸ء)

۴۔ تمام فتنوں کی جڑ ـــــ عورت

جنسیات ان حضرات کا خاص موضوع ہوتا ہے اور اس کے متعلق وہ بڑی تفصیل سے تصریحات بیان کرتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ عورت کی ان حضرات کے نزدیک حیثیت کیا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے ایک ترجمان' ہفتہ وار منہاج کی ۲۱/۱۷ ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں حضرت داتا گنج بخشؒ سے متعلق ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ عورت کے متعلق داتا صاحب فرماتے ہیں:۔

> بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا اس کا اصل سبب یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل اور قابیل کی لڑائی' اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا گیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔ (جون ۱۹۷۸ء)

۵۔ نابالغ لڑکی سے خلوت

مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر' تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص ۵۷۱ (طبع اول) پر لکھا ہے کہ نابالغ لڑکیوں سے نہ صرف نکاح جائز ہے بلکہ شوہر کا ان کے ساتھ خلوت کرنا بھی جائز ہے۔

۶۔ جنت کی حوریں

(کفار کی کم سن لڑکیاں)

مودودی مرحوم سے دریافت کیا گیا کہ جنت کی حوریں کون ہوں گی تو آپ نے جواب دیا:۔

> کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پا گئی ہوں گی' انہیں جنت میں حوریں بنا دیا جائے گا۔
(ایشیاء ۱۴ جون ۱۹۶۹ء)

انہوں نے اپنی تفسیر' تفہیم القرآن' جلد پنجم' طبع اول' ص ۲۷۱ میں اس پر اضافہ فرمایا ہے:۔

اہل جنت کی بیویاں ان کے ساتھ قصروں میں رہیں گی اور ان کی سیر گاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لئے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔

(جون ۱۹۷۸ء)

۷۔ جنت میں جنسیات

(قوت ' رجولیت اور عورتوں کی بارش)

جنت کی عورتوں کے متعلق کتب روایات و تفاسیر میں اس سے بھی زیادہ "دلچسپ" کوائف درج ہوتے ہیں۔ مشکوۃ المصابیح حدیث کا مشہور اور بڑا مستند مجموعہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ' مولوی نور محمد' کارخانہ تجارت کتب' کراچی نے چھاپا تھا۔ اس کی دوسری جلد میں جنت کی تفاصیل بڑی وضاحت سے دی گئی ہیں۔ اس میں ایک حدیث شریف میں ہے:۔

(حضرت) انسؓ کہتے ہیں نبی صلعم نے فرمایا ہے' جنت میں مومن کو جماع کی اتنی قوت عطا کی جائے گی (یعنی مثلاً" دس عورتوں سے جماع کرنے کے وقت)۔ پوچھا گیا' یارسول اللہ (صلعم) کیا مرد کو اتنی عورتوں سے جماع کرنے کی قوت ہوگی؟ ..... فرمایا جب مرد کو سو مردوں کے برابر قوت عطا کی جائے گی تو پھر وہ کیوں اتنی عورتوں سے جماع کی قوت نہ رکھ سکے گا۔ (ترمذی)

(مشکوۃ' جلد دوم ' ص ۳۲۹)

ابن کثیر' تفسیر کی ایک نہایت مستند کتاب ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

حضرت ابو طیبہؓ فرماتے ہیں کہ جنتیوں کے سروں پر ابر آئے گا اور انہیں ندا ہوگی کہ بتلاؤ کس چیز کا برسنا چاہتے ہو؟ پس جو لوگ جس چیز کا برسنا چاہیں گے وہی چیز ان پر اس بادل سے برسے گی۔ یہاں تک کہ کہیں گے کہ ہم پر ابھرے ہوئے سینے والی ہم عمر عورتیں برسائی جائیں۔ چنانچہ وہی برسیں گی' اس لئے فرمایا کہ فضل کبیر یعنی زبردست کامیابی کامل نعمت یہی ہے۔

(اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر از مولانا محمد جوناگڑھی۔۔ پارہ پچیسواں ص ۱۱)

(جون ۱۹۷۸ء)

نواں باب

تحفظ ناموس رسالت

۱۔ ہماری وضعی روایات کی چیرہ دستیاں

تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

۲۔ غیر مسلموں کی دریدہ دہنیاں

(پرویز کا جذبہ تحفظ ناموس رسالتؐ)

تقسیم ہند سے بہت پہلے کا ذکر ہے۔ امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضور ختمی مرتبت سرور کائنات علیہ الصلوۃ والسلام کی ذات اقدس کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے جس کے خلاف عبدالحلیم غزنوی صاحب نے اسمبلی میں تحریک التوا پیش کی تھی۔ اس پر دسمبر ۱۹۴۱ء کے طلوع اسلام کے صفحہ ۵۰' ۵۱ پر پرویز صاحب نے لکھا:۔

> دنیا کو شاید معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن بھی موجود ہے' حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرو منزلت کیا ہے ؟ وہ ذات گرامیؐ (فداہ' امی و ابی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعث نجات و سعادت اور جن کی محبت سرمایہ زندگی و متاع حیات ہے' ہمارے نزدیک معراج انسانیت کا مظہراتمؐ اور دنیا و آخرت کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکر مقدس ہے۔ اس ذات فخر موجوداتؐ کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا' ہم تو ان کوچوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے' جن کے ذرات کو اس پیکر رفعت و عظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہو گئی۔ خوشابخت ہیں وہ راہیں جن میں وہ شمع فروزاں ضیا بار و جلوہ ریز ہوئی اور زہے نصیب خاک کے ان ذروں کے جوان درخشندہ و تابناک نقوش قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ دنیا کیا جانے کہ اس پیکر محبوبیت کے ساتھ ہمارے قلوب کا کیا رشتہ ہے !..... ایک زندگی کیا ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شہنشاہ کونینؐ کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو پھر بھی دل کی تمنا بر نہ آئے۔ جس سینے میں عشق رسولؐ کا سوز نہیں وہ سینہ نہیں' بدبختیوں اور تاریکیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموس محمدؐ پر مرمٹنے کی تمنا نہیں وہ دل نہیں' بوم و کرگس کا وحشت انگیز کاشانہ ہے۔

دوسرے مقام پر کہا ہے:-
جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے' وہ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے کہ ہم مسلمانوں کے نزدیک حضور ختمی مرتبت (فداہ امی و ابی) نبی اکرمؐ کے شرف و مجد کا مقام بلندو بالا کیا ہے اور ہمارے قلوب میں اس ذات گرامی کی رفعت و عظمت کس شدت کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام جانتی ہی نہیں کہ ایک نبی کا صحیح مقام کیا ہوتا ہے اور وہ کس طرح اپنے متبعین کی زندگی کا جزو بن چکا ہوتا ہے۔ جزو زندگی ہی نہیں' بلکہ زندگی سے بھی عزیز۔ ماں باپ' بہن بھائی' اعزہ اقارب' مال و دولت' غرضیکہ دنیا کے حبیب سے حبیب تر رشتہ اور عزیز سے عزیز تر متاع سے کہیں زیادہ حبیب اور عزیز——— اور یہ چیز کسی فرد کے ذاتی جذبات کی نہیں' بلکہ قرآن کریم کی رو سے مومن ہونے کی شرط ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ:

النبی اولی بالمومنین من انفسھم و ازواجہ امھٰتھم(۶/۳۳)

مومنین کو نبی سے' اپنی جان سے بھی زیادہ لگاؤ ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

(جنوری ۱۹۷۷ء)

۳۔ حدیث کے متعلق پرویز صاحب کا مسلک

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب کہتے ہیں:-

میں نے آپ کے لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے اور حدیث کے متعلق آپ کے مسلک سے بخوبی واقف ہوں۔ لیکن معترضین کو جواب دینے کے سلسلے میں ایک دقت پیش آتی ہے۔ آپ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی متعدد کتابوں میں مختلف مقامات پر بکھرا ہوا ہے۔ جواب دینے کے لئے ایک تو آپ کی متعلقہ کتاب کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور پھر اس میں متعلقہ مقام کو۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اپنے مسلک کو نہایت مختصر الفاظ میں طلوع اسلام میں شائع کر دیں جسے معترضین کو باسانی دکھایا جائے۔

جواب

حدیث کے متعلق "نہایت مختصر الفاظ میں" میرا مسلک یہ ہے کہ

۱۔ جو حدیث قرآن کریم کے خلاف ہو' میں اسے صحیح نہیں تسلیم کرتا۔ حضور نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد یا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا تھا۔ ایسی حدیث کے متعلق میں کہتا ہوں کہ وہ حضورؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ اسے آپ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ میں حضورؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا' خلاف قرآن حدیثوں کے متعلق کہتا یہ ..... ہوں کہ حضورؐ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں——— جو حدیثیں قرآن کریم

سے نہیں ٹکراتیں' میں انہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں۔ میری متعدد تصانیف میں اس قسم کی سیکڑوں حدیثیں موجود ہیں۔

۲۔ قرآن کریم کے ایسے احکام جن کی جزئیات خود قرآن میں متعین نہیں کی گئیں' امت کے مختلف فرقے ان پر جس طرح عمل پیرا ہیں' (مثلاً" نماز وغیرہ) ان کے متعلق میں کہتا ہوں کہ کسی فرد یا فرقہ کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردو بدل کرے یا کوئی نیا طریق وضع کرے۔ خود میں نے بھی ان میں نہ کسی قسم کا ردو بدل کیا ہے نہ ہی کوئی نیا طریق وضع کیا ہے۔ اگر کبھی اسلامی مملکت (علیٰ منہاج رسالت و خلافت راشدہ) قائم ہو گئی تو وحدت امت کے لئے جس طریق کا وہ فیصلہ کرے' اس کا اطلاق سب پر ہونا چاہیے۔

یہ ہے حدیث کے متعلق میرا مسلک۔ لیکن میں اپنے اس دوست سے کہوں گا کہ جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں' اس سے آپ ان کا اطمینان تو کرا سکیں گے لیکن جو لوگ ایک خاص مقصد کے تحت میرے خلاف پروپیگنڈہ میں مصروف رہتے ہیں' انہیں آپ لاکھ اس قسم کی تحریریں دکھایئے' وہ آپ سے متفق نہیں ہوں گے۔ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے الزام تراشتے رہتے ہیں۔ ان کا علاج نہ آپ کے پاس ہے نہ میرے پاس۔

(اپریل ۱۹۷۸ء)

متفرق سوالات و جوابات

۱۔ انسان سے افضل مخلوق

(کیا انسان خدا کا خلیفہ ہے)

لاہور سے ایک طالب علم نے ایک سوال پوچھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے کہ **وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا** (۱۷/۷۰) "ہم نے انسان کو اپنی مخلوق میں سے اکثر پر فضیلت دی ہے"۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ایسی مخلوق بھی ہے جس سے انسان افضل نہیں۔ لیکن زمین پر تو ایسی مخلوق کوئی نہیں ہوتی۔ کیا کسی اور جگہ بھی مخلوق ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق ارتقائی طور پر انسان سے آگے ہو۔ لیکن انسان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اسے اس نے اپنا خلیفہ (نائب) بنایا ہے' تو خدا کے خلیفہ سے زیادہ افضل کون ہو سکتا ہے۔

جواب :۔ قرآن کریم اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ ارض کے علاوہ سموت (اجرام فلکی) میں بھی ذی حیات مخلوق ہے۔ **ومن ایتہ خلق السموت والارض وما بث فیھما من دابتہ** (۴۲/۲۹) اس کی تائید (۱۶/۴۹) سے بھی ہوتی ہے' یعنی زمین اور آسمانوں میں ذی حیات پھیلے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی اور کرے میں ایسے ذی حیات ہوں جو ارتقائی سلسلہ میں انسان سے بھی آگے ہوں۔ وہ مخلوق انسان سے افضل ہوگی۔ ضمناً" آیت (۴۲/۲۹) کا آخری حصہ یہ ہے **وھو علی جمعھم اذا یشاء قدیر** خدا کے قانون مشیت کی رو سے یہ بھی ممکن ہے کہ زمین اور آسمانی کروں کی یہ مخلوق کبھی آپس میں مل جائے۔ اس وقت جو کوششیں دوسرے کروں تک پہنچنے کی ہو ..... رہی ہیں' ہو سکتا ہے کہ انہیں سے یہاں اور وہاں کی مخلوق کے یک جا ہو جانے کا امکان عملی شکل اختیار کر لے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مخلوق ہم سے آگے ہو۔

باقی رہا انسان کا خلیفتہ اللہ ہونا' تو یہ تصور ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ہم نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا ہے کہ آدم کو خلیفہ فی الارض بنایا گیا ہے۔ خلیفہ کے معنی کسی کا جانشین ہوتے ہیں۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ انسان سے پہلے دنیا میں کوئی مخلوق تھی جس میں گرمی برداشت کرنے کی صلاحیت زیادہ تھی۔ وہ مخلوق ناپید ہو گئی اور اس کا جانشین انسان کو بنایا (۱۵/۲۷)۔ انسان خدا کا خلیفہ (جانشین) نہیں ہو سکتا۔ تفصیل ان امور کی۔۔۔ مطالب الفرقان۔۔۔۔ جلد دوم میں دیکھئے یا ابلیس و آدم میں۔۔۔ (مارچ ۱۹۶۵ء)

۲۔ کفن کے لئے نیا کپڑا

(قل' جمعراتیں' چالیسواں' ختم وغیرہ رسومات)

سوال :۔ آج کل چیزوں کی گرانی ہوش ربا حد تک پہنچ چکی ہے۔ بیشتر آبادی ایسی ہے جسے دو وقت کی روٹی بھی نصیب

نہیں ہوتی اور غریب آدمی کے پاس علاج کے لئے پیشہ تک نہیں ہوتا۔ وہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے لاعلاج مر جاتا ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد اس کے کفن دفن اور بعد کی رسومات کے لئے اس قدر خرچ کی ضرورت ہوتی ہے کہ مرنے والے کے پس ماندگان اس بوجھ کے تلے دب کر مر جاتے ہیں۔ کفن کے لئے اٹھارہ گز لٹھے کی قیمت کا ہی اندازہ لگائیے۔ مرنے والے کو برسوں سے نیا کرتہ نصیب نہیں تھا۔ لیکن مرنے کے بعد اٹھارہ گز کپڑا اسے دفن کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ پھر قل' جمعراتیں' چالیسواں اور ان پر "ختم" غریب لوگ کیا' متوسط طبقے کے لوگ بھی ان اخراجات کی استطاعت نہیں رکھتے' لیکن بایں ہمہ' انہیں یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ سب کچھ واقعی ضروری ہے ؟ کیا اس خرچ میں تخفیف نہیں ہو سکتی؟ لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ازروئے شریعت ضروری ہے۔ اور وہ اس ڈر سے یہ تمام اخراجات برداشت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں خواہ اس کے لئے انہیں گھر کے برتن بھی کیوں نہ بیچنے پڑیں؟

جواب :۔ ضروری صرف اس قدر ہے کہ مردے کو سپرد خاک کیا جائے اور اس کے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کیا جائے اور انسانی جذبات کا تقاضا ہے کہ یہ کچھ احترام اور سنجیدگی کے ساتھ کیا جائے۔

جہاں تک کفن کے لئے اٹھارہ گز نئے لٹھے کی ضرورت کا سوال ہے' ہمارے اس بھائی کی نگاہ صرف غریبوں کی ناداری تک پہنچی ہے' لیکن ذرا گہرائی تک جانے سے نظر آئے گا کہ اس سوال کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک شہر لاہور میں' ایک دن میں کتنی میتیں ہوتی ہیں۔ پھر اس تعداد کو پورے پاکستان پر پھیلائیے اور پھر تمام ممالک اسلامیہ میں مرنے والوں کی تعداد سامنے لائیے اور اسے اٹھارہ سے ضرب دیجئے۔ آپ کی قوم ـــــ نہایت غریب اور پسماندہ قوم ـــــــ اتنے گز نیا کپڑا ہر روز زمین کے نیچے دباتی رہتی ہے ـــــــ ہر روز ـــــ سال کے تین سو پینسٹھ دن ـــ لاکھوں گز نیا کپڑا جسے تیار کرنے کے لئے کتنے ہی کارخانے درکار ہیں ـــــ زمین کے نیچے چلا جاتا ہے۔ آپ نے کبھی اس کا بھی اندازہ لگایا ہے کہ اگر یہی کپڑا زندہ انسانوں کو میسر آجائے تو کتنوں کا تن ڈھنپ جائے؟

اس باب میں صحیح مسلک کیا ہونا چاہیے' اس کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ارشاد گرامی سنئے۔ روایت میں ہے کہ آپ نے اپنی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں وصیت فرمائی کہ:

> انہیں ان دو کپڑوں میں کفن دیا جائے جو وہ بالعموم پہنا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابا جان! ہم میں اتنی استطاعت ہے کہ ہم نئے کپڑوں میں آپ کو کفن دے سکیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اے میری بیٹی! زندہ شخص نئے کپڑے کا زیادہ حقدار ہے۔ کفن تو اس لئے ہوتا ہے کہ پیپ وغیرہ اس میں جذب ہو جائے۔
>
> (طبقات ابن سعد' بحوالہ ابوبکر از محمد حسنین ہیکل)

چنانچہ طبقات میں ہے کہ آپ کی انہی دو چادروں کو دھو کر اور ان کے ساتھ ایک اور چادر ملا کر آپ کو دفنایا گیا۔

باقی رہا قل' جمعراتیں' چالیسواں اور ان کے ختم' تو یہ سب رسومات غیر قرآنی ہیں۔ جو کچھ ان پر صرف کیا جاتا ہے

اس میں سے حبہ بھر بھی مردے تک نہیں پہنچتا۔ وہ سب ختم پڑھنے والے مولوی صاحبان کے ہاں چلا جاتا ہے۔
(مارچ ۱۹۶۵ء)

۳۔ رشوت کس طرح ختم کی جاسکتی ہے؟

سوال :۔ ہمارے معاشرے میں رشوت اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اس کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ خرابی کسی طرح ختم بھی ہو سکتی ہے؟ اس وقت تک اسے روکنے کے لئے جس قدر اقدامات کئے گئے ہیں وہ تو کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ ان سے تو مرض بلکہ اور بڑھ گیا ہے۔

جواب:۔ رشوت ختم کرنے کے لئے جس قدر اقدامات کئے گئے ہیں وہ نہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں نہ کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ اقدامات اس کے سوا کیا ہیں کہ انسداد رشوت ستانی کا ایک نیا محکمہ قائم کر دیا جاتا ہے۔ یہ اقدامات کیوں ناکام رہتے ہیں ' اس کی وجہ ظاہر ہے------ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ دو بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک' کسی مجسٹریٹ کا اہل مد ہو جاتا ہے اور وہ رشوت لیتا ہے۔ دوسرا بھائی محکمہ انسداد رشوت ستانی میں سپاہی بھرتی ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو محرکات اس اہلمد کو رشوت لینے پر آمادہ کرتے ہیں وہی محرکات اس دوسرے بھائی کو رشوت لینے پر آمادہ کیوں نہیں کریں گے؟ قانونی ممانعت دونوں کے لئے یکساں ہے۔ اگر وہ ایک کے لئے موثر ثابت نہیں ہوتی تو دوسرے کے لئے کس طرح موثر ہو جائے گی۔ باقی رہا گرفتاری کا خطرہ' سو وہ دوسرے بھائی (سپاہی) کے لئے اور بھی کم ہے۔ لہٰذا' اس قسم کے اقدامات ایسے جرائم کے انسداد کے لئے موثر نہیں ثابت ہو سکتے ..... تاوقتیکہ ہم محکمہ انسداد رشوت کے لئے کہیں سے ایسے افراد نہ لے آئیں جن کا خمیر کسی اور ہی مٹی سے اٹھا ہو۔ اور یہ بات ہمارے معاشرہ میں مشکل ہی سے میسر آسکتی ہے۔

اس خرابی (اور اس قسم کی دوسری خرابیوں) کے انسداد کے لئے دو تدبیریں ہیں: ایک خارجی اور دوسری داخلی۔ خارجی پر عملدرآمد فوری طور پر کیا جا سکتا ہے اور اسی کو ہم پہلے لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ انسان رشوت کیوں لیتا ہے؟ ان افراد کو چھوڑ کر' جو روپیہ اکٹھا کرنے کی نفسیاتی بیماری کے مریض ہیں (اور جن کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی)' ناجائز طریق سے روپیہ حاصل کرنے کا جذبہ محرکہ مستقبل کے متعلق عدم حفاظت (INSECURITY) کا احساس ہوتا ہے---- شروع میں شعوری طور پر اور بعد میں غیر شعوری طور پر------ غلط معاشرہ میں ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ آج تو کسی نہ کسی طرح وقت گزر رہا ہے' اگر کل کو خدانہ کردہ کوئی افتاد پڑ گئی تو میں کیا کروں گا۔ میری اولاد کیا کرے گی۔ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہوگا۔ ہم فاقوں مر جائیں گے۔ میری اولاد تباہ ہو جائے گی۔ یہ احساس اسے چھلاوے کی طرح ڈراتا ہے۔ یہ ہر وقت اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ جائز' ناجائز ہر طریقے سے زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ برے

وقت کے لئے کچھ بنا لے۔ عدم حفاظت کا یہ وہ جذبہ ہے جو اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ جب تک آپ اس کے دل میں مستقبل کی حفاظت کا یقین نہ پیدا کر دیں' وہ روپیہ حاصل کرنے کے جذبہ کو روک ہی نہیں سکتا۔ یہ تھا وہ شافی علاج جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور نظام معاشرہ سے کہا تھا کہ تم انہیں یقین دلا دو کہ **نحن نرزقکم و ایاھم** (۱۵۲/ ۶) ہم تمہارے سامان زیست کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے بھی۔ یہ گارنٹی اس قدر محکم' متقین' قابل اعتماد اور قابل تغیر ہونی چاہیے کہ انسان اس پر دل کے پورے اطمینان سے بھروسا کر سکے۔ حکومت کے ملازمین کو یہ ضمانت آئینی طور پر ملنی چاہیے' ایسی آئینی طور پر کہ حکومتیں آئیں اور حکومتیں جائیں لیکن ان کی اس ضمانت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ تازیست ان کی تمام ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر پر ہو' اور جب تک ان کی اولاد خود کفیل نہ ہو جائے ان کی ذمہ داری بھی حکومت کے سر پر۔ حکومت انہیں یہ ضمانت دے اور اس کے بعد انہیں کسی نوع کی ذاتی جائداد بنانے کی اجازت نہ ہو۔ اگر اتنا کچھ کر دینے کے بعد بھی کوئی شخص ناجائز طور پر کچھ حاصل کرے تو اس کی سزا سنگین ترین دی جائے۔ یاد رکھیے! قرآن کریم نے بعض جرائم کی سزائیں جو اس قدر سنگین بتائی ہیں تو وہ اس بات سے مشروط ہیں کہ پہلے ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں انسان کو اس قسم کے جرم کے ارتکاب کی ضرورت پیش نہ آئے اور جو اس کے بعد ایسا کرے' اسے سخت سزا دی جائے (بشرطیکہ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نہ ہو)۔

اس وقت حکومت کے ملازمین کی کیفیت اس قسم کی ضمانت کے بالکل برعکس ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ ان کی تنخواہ' ان کی ضروریات زندگی کے پیش نظر مقرر نہیں کی جاتی۔ ایک اسکیل مقرر کر دیا جاتا ہے جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری کسی کی بھی نہیں ہوتی کہ وہ دیکھے کہ اس تنخواہ میں اس ملازم حکومت کی بنیادی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اگر سروس کے دوران' اس کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کے پسماندگان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ جب اس کی عمر پچاس ساٹھ سال کی ہوتی ہے (جبکہ اس کی اولاد کی ذمہ داریاں پورے شباب پر ہوتی ہیں) تو اسے ریٹائر کر کے اس کی آمدنی ایک ہی دن میں آدھی کر دی جاتی ہے۔ پھر اسے سرکاری مکان سے بھی نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جس عسرت اور بدحالی کی زندگی بسر کرتا ہے اسے دیکھ کر ہر شخص کے دل میں یہ احساس بیدار ہو جاتا ہے کہ اگر میں نے ایسے وقت کے لئے کچھ جمع نہ کر لیا تو میری بھی یہی حالت ہو جائے گی۔ مستقبل کا یہ بھیانک نقشہ ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اور اسے' جائز اور ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کر لینے پر آمادہ کرتا رہتا ہے (**الا ماشاء اللہ**)۔ انہیں اس کا یقین دلایئے کہ ان کی ایسی حالت نہیں ہوگی۔ اور اس کے بعد اگر کوئی ایسی ناجائز حرکت کرے تو اس کی کھال کھنچوا دیجئے۔

یہ ہے خارجی طریق عمل رشوت بند کرنے کا ـــــ صرف رشوت بند کرنے ہی کا نہیں' بلکہ معاشرہ کی بہت سی خرابیاں دور کرنے کا ـــــ لیکن چونکہ اس وقت سوال صرف رشوت کا زیر نظر ہے اس لئے ہم دوسری خرابیوں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے ہیں۔ قرآن کا معاشی نظام' جس میں ہر فرد کو اپنی بنیادی ضروریات زندگی کی طرف سے پورا پورا اطمینان حاصل ہوتا ہے' معاشرہ کی بیشتر خرابیوں کا علاج ہے۔

اب رہا داخلی طریق' سو اس کا ذریعہ تعلیم ہے—— جیسا کہ طلوع اسلام کے صفحات پر اس سے پہلے متعدد بار یہ مثال پیش کی جا چکی ہے' ہم انتہائی بھوک کے عالم میں بھی وہ کھانا کیوں نہیں کھاتے جس میں زہر ملا ہوا ہو؟ اس لئے کہ ہمیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ اس سے ہماری ہلاکت ہو جائے گی' اس سے ہمیں نقصان پہنچے گا۔ اگر ہم اپنے بچوں کے دل میں شروع ہی سے یہ یقین پیدا کر دیں—— اور اس یقین کی بنیاد رسمی عقیدہ پر نہ ہو بلکہ عقل و بصیرت پر ہو' کہ جس طرح زہر آلود کھانے سے ہمارے طبیعی جسم کی ہلاکت ہوتی ہے' اسی طرح ناجائز کمائی سے ہماری وہ متاع گراں بہا ضائع ہو جاتی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے' تو وہ ناجائز کمائی سے اسی طرح اجتناب کریں گے جس طرح زہر آلود کھانے سے اجتناب کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' اگر ہم اپنی آنے والی نسلوں کے دل میں قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی قدر و قیمت اور اہمیت جاگزیں کر دیں' تو وہ کسی شجر ممنوعہ کے پاس تک بھی نہیں پھٹکیں گے۔ یوں رشوت (اور اس قسم کے دیگر جرائم) کے خلاف' جذبہ نفرت ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔ پھر یہی طبقہ قرآن کا معاشی نظام از خود قائم کر دے گا اور اسے مستحکم رکھنا ان کا اندرونی تقاضا ہو گا۔

یہ ہے رشوت بند کرنے کا وہ موثر طریقہ جس کی طرف ہماری قرآنی بصیرت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے "توکل علی اللہ" پر جو اس قدر زور دیا ہے اور اسے تمام اخلاق حسنہ کا سرچشمہ بتایا ہے' تو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے نظام خداوندی (یعنی قرآنی نظام معاشرہ) کی طرف سے کئے گئے وعدوں (یعنی ان کی طرف سے دی گئی ضمانت) پر غیر متزلزل یقین رکھنا' ان پر پورا پورا اعتماد کرنا۔ قرآن کی رو سے تو مملکت کی ضرورت ہی افراد کے دل میں اس قسم کا اعتماد اور یقین پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ جس قدر یہ اعتماد بڑھتا جائے گا خرابیاں کم ہوتی جائیں گی۔ اور کامل اعتماد حاصل ہو گا دلوں میں مستقل اقدار کے احترام اور قرآن کے معاشی نظام کے قیام سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ غلط نظام معاشرہ میں بھی مستقل اقدار کا احترام کرتے ہیں اور ان پر پابند رہتے ہیں' وہ بڑی عزیمت کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن ان کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ اور اس وقت زیر غور سوال یہ ہے کہ وہ کونسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے معاشرہ کی عام روش صحیح ہو جائے۔ یہ تدبیر وہی ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

(اپریل ۱۹۶۵ء)

۴۔ حاجیوں کا کردار

روزنامہ "مشرق" (لاہور) کے عید نمبر میں خانہ کعبہ کی ایک تصویر شائع ہوئی تھی جس کے نیچے لکھا تھا:۔

یوم عرفہ کو خانہ کعبہ کا غلاف بدل کر اونچا کر دیا گیا ہے تاکہ کوئی اسے کلٹ نہ سکے۔

یعنی مسجدوں میں نمازی جوتے چور اور کعبہ میں حاجی غلاف تراش! جب دین کے ارکان رسم بن کر رہ جائیں تو ان سے اسی قسم کا کردار وجود میں آتا ہے۔

اس کے نیچے ایک اور تصویر ہے جس پر لکھا ہے:۔
ذوالحجہ کی دسویں تاریخ کو شیطان کو کنکریاں مارنے والوں کا ہجوم۔
اگر انہیں' شیطان کو کنکریاں مارنے کے بجائے' خود اپنے آپ کو کنکریاں مارنے کی تعلیم دی جائے تو پھر جوتی چوروں اور غلاف تراشوں کا وجود باقی نہ رہے۔

(جون ۱۹۶۶ء)

۵۔ زر' زمین اور زن سے متعلق مسائل

(اور ان کا قرآنی حل)

سوال :۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ دنیا میں فساد کی جڑ تین ہی چیزیں ہیں------ یعنی زر۔ زمین۔ اور زن---- قرآن مجید نوع انسانی کی مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ اس نے ان معاملات کا حل کیا تجویز کیا ہے جن کا تعلق زر------ زمین اور زن سے ہے۔

جواب:۔ اس بحث میں الجھے بغیر کہ دنیا میں فساد کا سرچشمہ یہی تین چیزیں ہیں یا کچھ اور بھی' مختصر الفاظ میں یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ انہیں فساد کا سرچشمہ کس طرح بنا لیا گیا ہے اور قرآن کریم کی رو سے ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ پہلے زر کو لیجئے (زر سے مفہوم ہے دولت' جو عام طور پر سکوں کی شکل میں سامنے آتی ہے)۔

انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں سکہ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ زندگی کی ضروریات کے لئے اشیاء کا تبادلہ ہوتا تھا (جسے (BARTER SYSTEM) کہا جاتا ہے)۔ زید کے پاس گندم ہے' بکر کے پاس تیل۔ زید نے بکر کو کچھ گندم دے دیا اور اس سے تیل لے لیا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے (اور اب بھی اکثر مقامات پر) دیہات میں یہی رواج ہے۔ وہاں سکہ کے مقابلہ میں اشیاء ہی کا تبادلہ ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اب تو بیع کا لفظ بیچنے اور شری کا لفظ خریدنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ دونوں لفظ خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں استعمال ہوتے تھے۔ یعنی بیع کے معنی صرف فروخت کرنا نہیں تھے۔ اس کے معنی "بیچنا اور خریدنا" تھے' اسی طرح شریٰ کے معنی۔ جب جنس کا تبادلہ جنس سے ہو' تو اس میں بیچنا اور خریدنا بیک وقت ہوتا ہے۔ زید جب گیہوں دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تیل لیتا بھی ہے۔ اور بکر جب تیل دیتا ہے تو گندم لیتا بھی ہے۔ اس نہج زندگی میں کسی شے کے ذخیرہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب تمدنی ضروریات ذرا آگے بڑھیں اور آبادی کی وسعتیں پھیلیں' تو بغرض سہولت سکہ ایجاد کیا گیا۔ اب زید' عمر کے ہاتھ کچھ گیہوں بیچ کر کچھ سکے لیتا تھا اور ان سکوں کے عوض بکر سے تیل خریدتا تھا اور فاضلہ سکے اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ یہ "فاضلہ سکے" (جسے SURPLUS MONEY کہا جاتا ہے) بنیاد ہے اس فساد کی جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اور جس کا رونا ساری دنیا روتی ہے۔ اس فاضلہ دولت سے سامان معیشت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ کیا جاتا ہے' تاکہ دوسروں کی محنت کو غصب کیا جائے۔ حتی کہ یہی فاضلہ دولت دوسروں کو بطور قرض دے کر' ہاتھ

پاؤں ہلائے بغیر' ان کی کمائی میں شرکت کر لی جاتی ہے۔ اس سے ان غریبوں کی کمائی ہی دوسروں کے ہاں نہیں چلی جاتی' ان کی آزادی بھی سلب ہو جاتی ہے' ان کی حمیت و غیرت تک بک جاتی ہے' ان کی عزت و آبرو تک کے سودے ہونے لگتے ہیں۔ ادھر سے افراط زر سے وہ تمام خرابیاں ابھرتی چلی جاتی ہیں جو سرمایہ دار طبقہ میں ہر جگہ پائی جاتی ہیں یعنی وہ غریبوں کی اس تمام متاع کا خریدار بن جاتا ہے۔ ان ناہمواریوں سے وہ فساد رونما ہوتا ہے جو دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے۔

قرآن کریم ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہنے پاتی۔ لفظ "دولت" کے معنی گردش کرنے کے ہیں۔ فاضلہ دولت گردش نہیں کرتی' بلکہ ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم' دولت کے ایک جگہ جمع ہو جانے کا نتیجہ "جہنم قرار دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو انسانیت کا بدترین مجرم ٹھہراتا ہے۔ **والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقو نھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم** (۹/۳۴) جو لوگ چاندی سونے کے سکے دبا کر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ (نوع انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے' ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اس عذاب کے متعلق اگلی آیت میں ہے کہ ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان دولت جمع کرنے والوں کی پیشانی' پہلو اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا' یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے دبا کر رکھ دیا تھا۔ اب اپنے اس طرز عمل کا نتیجہ دیکھو۔ "وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ "جہنم آوازیں دے دے کر بلاتی ہے"۔ وہ کسے بلاتی ہے؟ اسے کہ۔۔۔۔۔ **جمع فاوعی** (۱۸/۷۰) جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اپنی میانی کا منہ کس کر باندھ رکھتا ہے۔ سورہ الھمزہ میں ہے' تباہی اور بربادی ہے اس کے لئے جس کی روش یہ ہو کہ **جمع مالا وعددہ** (۱۰۴/۲) جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر حساب کرتا رہتا ہے کہ یہ کتنی ہو گئی ہے اور کتنی کسر رہ گئی۔ اس کے بعد' اس "آتش سوزاں" کا ذکر ہے جو اس ذہنیت کا فطری نتیجہ ہے اور "جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں"۔

یہ تو رہا دولت کے جمع کرنے کے متعلق۔ اس کے گردش کرنے کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اس کا انداز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ **کی لا یکون دولتہ بین الاغنیاء منکم** (۵۹/۷) اس کی گردش' خون زندگی کی طرح معاشرہ کی رگ رگ میں ہونی چاہیے' تاکہ ہر ایک کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔

ان اصولی ہدایات کے بعد' اس نے اس کی عملی تدبیر یہ بتائی کہ **یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو** (۲/۲۱۹) یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دولت کھلی رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے' سب کی سب۔ اس سے قرآن کریم نے فاضلہ دولت کے تصور کو عملاً" ختم کر دیا۔ یہ قرآن کریم کے عطا کردہ نظام کا نقطہ ماسکہ ہے اور اس سے ان تمام خرابیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو "زر" کی بنا پر پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نظام میں نہ کسی کی ضرورت رکی رہتی ہے (کہ ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری خود نظام معاشرہ پر ہوتی ہے۔ اسی کو نظام ربوبیت کہا جاتا ہے) اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ دولت رہتی ہے۔ اس سے ان خرابیوں کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جو

مفلسی اور ناداری (ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکنے) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور ان خرابیوں کا بھی جو افراط زر (فاضلہ دولت) کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

زمین

اب آیئے زمین کی طرف۔

خدا نے انسان (بلکہ ہر ذی حیات) کو پیدا کیا' تو جن چیزوں پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا انہیں بھی ساتھ ہی (بلکہ ان سے بھی پہلے) مہیا کر دیا۔ ہوا' پانی' روشنی' حرارت' اور زمین--- جس میں غذا کا "ذخیرہ" جمع رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں (ذرائع زیست) تمام ذی حیات کے لئے سامان زندگی کے طور پر دی گئی تھیں نہ کہ کسی فرد یا افراد کے مجموعہ کے لئے جاگیریں کھڑی کرنے کے لئے--- انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں' ان اشیاء میں سے کسی شے پر "ملکیت" کا تصور ہی نہیں تھا---- ان کی زبان میں "ملکیت" کا لفظ ہی نہیں ملتا' "متاع" (فائدہ حاصل کرنے) کا لفظ ملتا ہے---- ضمناً" یہی لفظ---- "متاع" قرآن کریم نے استعمال کیا ہے جب کہا ہے کہ---- **ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین** (۲/۳۶) تمہارے لئے زمین میں ایک مدت کے لئے رہنا اور اس سے فائدہ اٹھانا (یعنی سامان زیست حاصل کرنا) ہے۔

انسانوں کو زمین سے سامان زیست حاصل کرنے کے لئے کچھ محنت کرنی پڑتی ہے۔ ابتدائی تمدنی زندگی میں ہر شخص اپنے لئے آپ ہی محنت کرتا تھا۔ اس سے اگلے دور میں' طاقتور انسانوں نے' کمزور انسانوں کو اپنا غلام بنا کر ان سے محنت کرانے کا کام شروع کر دیا۔ وہ ان سے محنت کراتے تھے اور انہیں روٹی دیتے تھے۔ وہ دن نوع انسانی کی زندگی میں انتہائی بدبختی کا دن تھا جب ان غلاموں نے زمین سے اتنا پیدا کر کے اپنے آقا کو دیا جو ان کی روٹی کے خرچ سے زیادہ تھا۔ اس سے زمین' سامان زیست حاصل کرنے کا ذریعہ ہونے کے بجائے' دولت کمانے کا ذریعہ بن گئی اور اسی سے اس پر ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ بس' پھر کیا تھا؟ ہر طاقتور نے زمین کے رقبوں پر لکیریں کھینچ کر انہیں اپنی ملکیت بنا لیا۔ اور پھر یہی ملکیت' اس کی اولاد میں وراثتاً" منتقل ہونے لگی۔ یوں زمین' سامان زیست کی برکات کا سرچشمہ بننے کی بجائے' مرگ آور فسادات کا موجب بن گئی۔

قرآن کریم نے زمین کو ملکیت کی شے قرار دینے کے بجائے' متاع---- یعنی سامان زیست حاصل کرنے کا ذریعہ قرار دیا ہے جس پر تمام نوع انسان کا' اسی طرح یکساں حق ہے جس طرح ہر سانس لینے والے کا ہوا پر یکساں حق ہوتا ہے۔ **والارض وضعھا للانام** (۵۵/۱۰) زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے ---- **سواء للسائلین** (۴۱/۱۰) اسے ہر ضرورت مند کی ضرورت پورا کرنے کے لئے یکساں طور رکھلا رہنا چاہئے۔ **متاعا لکم ولانعامکم** (۷۹/۱۰) تمہارے اور تمہارے مال مویشیوں کے لئے سامان زیست کا ذریعہ۔

چونکہ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں تقسیم کار کا اصول کارفرما ہوتا ہے جس کی رو سے یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد اپنے اپنے طور پر زمین سے رزق حاصل کرے' اس لئے قرآن کریم نے انسانی معاشرہ کا فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کا اس قسم کا انتظام کرے جس سے یہ چند افراد کی ملکیت بننے کے بجائے' تمام افراد انسانیہ (بلکہ ہر متنفس) کو سامان زیست بہم پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ جب اس نے کہا ہے کہ **وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا** (۱۱/۶) زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر نہ لی ہو' تو اس سے مطلب یہی ہے کہ ذرائع رزق خدا نے پیدا کر دیئے ہیں۔ انسانی معاشرہ کا کام یہ ہے کہ وہ ان کا نظم و نسق اس طرح کرے کہ ان سے ہر ذی حیات کو سامان زندگی ملتا رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب آپ ذرائع رزق کو انفرادی ملکیت میں دے دیں گے تو یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ ان کا مالک' انہیں تمام افراد انسانیہ کی ضروریات پورا کرنے کا ذریعہ بننے کے بجائے' اپنے مفاد حاصل کرنے کا وسیلہ بنا کر بیٹھ جائے گا۔

چنانچہ قرآن کریم نے (کافروں' ملحدوں' بے دینوں کے لئے ہی نہیں بلکہ) ان نمازیوں (مصلین) کے لئے تباہی اور بربادی بتائی ہے جو **یمنعون الماعون** (۱۰۷/۷) کرتے ہیں' یعنی رزق کے ان ذرائع کو جنہیں چشموں کے بہتے پانی کی طرح ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہیے' بند لگا کر روک لیتے ہیں۔ اور ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ دین کی تکذیب کرتے ہیں' یعنی دین سے انکار کر کے' غیر مسلموں کی صف میں نہیں چلے جاتے۔ زبان سے تو اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن رزق کے سرچشموں پر بند لگا کر عملاً" اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہاں "تکذیب" کا لفظ غور طلب ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو جھوٹا ثابت کرنا۔ دین کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں ہر فرد معاشرہ کو سامان زیست بہم پہنچتا رہتا ہے۔ دین سچا اسی صورت میں ثابت ہو سکتا ہے کہ جو معاشرہ دین کا مدعی ہو اس میں سامان زیست ہر ایک تک پہنچتا رہے۔ لیکن اگر ایک معاشرہ دین کا مدعی بھی ہو اور اس کی کیفیت یہ ہو کہ رزق بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات پورا کرنے کا موجب نہ رہے' تو اس سے دنیا لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچے گی کہ اس دین کا یہ دعویٰ کہ اس میں کوئی فرد رزق سے محروم نہیں رہ سکتا' جھوٹا ہے۔ یوں یہ دین کے مدعی (مصلین) اپنے طرز عمل سے' دین کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں۔

یوں قرآن کریم نے "زمین" کو موجب فساد بننے کے بجائے باعث رحمت بنا دیا۔

زن

اب "زن" کے سوال کو لیجئے۔

"زن" سے مراد ہے جنسی مسئلہ (SEX PROBLEM)۔ انسان نے اپنی زندگی میں جس قدر بدنہادیاں (PERVERSIONS) پیدا کی ہیں' ان میں سب سے زیادہ شدید' سنگین' فساد انگیز اور تباہ کن بدنہادی' جنسیات (SEX) سے متعلق ہے۔

سیدھے سادے' کھلے کھلے' واضح' غیر مبہم الفاظ میں' نر اور مادہ کا جنسی اختلاط' افزائش نسل کا ذریعہ ہے۔ اس سے فطرت کا مقصود ہی یہ تھا۔ افزائش نسل کے سلسلہ میں بہت سی مشقتیں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اس سے فطرت کو خدشہ لاحق ہوا کہ ان کی وجہ سے افزائش نسل کا سلسلہ ہی نہ رک جائے۔ اس اندیشہ کے پیش نظر اس نے اس اختلاط میں ایک خاص حظ و کیف پیدا کر دیا' ایک لذت رکھ دی۔۔۔۔۔۔۔۔ یعنی اس نے اس کڑوی گولی کو (SUGAR COATED) بنا دیا۔

حیوانات کو چونکہ اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا' اس لئے ان کی صورت میں جنسی اختلاط پر فطرت نے اپنا کنٹرول رکھا۔ وہ انہیں اس اختلاط کی اجازت اس وقت دیتی ہے جب افزائش نسل کے عمل کا وقت آتا ہے۔ وہ اس وقت اس کی اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ انہیں اس پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایک سانڈ صبح شام گایوں کے گلے میں چرتا پھرتا رہتا ہے۔ نہ کوئی گائے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے نہ وہ اس کے پیچھے مارے مارے پھرتا ہے۔ لیکن جب (MATING SEASON) آتا ہے تو فطرت کی طرف سے "چاک اے دامان" کے ادنیٰ سے اشارے پر وہ دونوں مضطرب و بیتاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو ان میں پھر وہی بے رغبتی اور بے گانگی پیدا ہو جاتی ہے' یعنی ان کے ہاں اس "آتش" کی کیفیت (غالب کے الفاظ میں) یہی ہوتی ہے۔

.کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

لیکن انسان کو خدا نے صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ یہی اس کے مقام بلند کا تقاضا تھا۔ اسی میں اس کے شرف و مجد کا راز تھا۔

لیکن اسی اختیار و ارادہ کے غلط استعمال سے' یہ حیوانات سے بھی پست سطح پر پہنچ جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ **کالانعام بل ھم اضل** ۷/۱۷۹۔۔۔۔۔ یعنی اس نے جنسی اختلاط کے مقصد۔۔۔۔۔ افزائش نسل۔۔۔ کو تو پس پشت ڈال دیا اور اس کے حظ و لذات کو مقصود بالذات سمجھ لیا۔ اور اس کے بعد' اپنے اس اختیار و ارادہ سے اس جذبہ کو جب چاہے بیدار کر لیا۔ ۲۔ اب سوچئے کہ اگر جنسی اختلاط کی لذت کو (جو شدت اور ارتکاز میں اپنی مثال نہیں رکھتی) مقصود بالذات قرار دے لیا جائے اور یہ چیز انسان کے اپنے اختیار میں ہو کہ وہ جب جی چاہے جنسی جذبہ کو بیدار کر کے' یہ لذت

۱۔ چاک مت کر جیب بے ایام گل!
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے (غالب)

۲۔ جنسی جذبہ کی کیفیت بھوک یا پیاس کے تقاضوں کی طرح نہیں جو جسم کی ضرورت کے لئے از خود بیدار ہوتے اور شدت اختیار کئے چلے جاتے ہیں۔ جنسی جذبہ انسان کے اپنے خیال کے ماتحت بیدار ہوتا ہے۔ بھوک اور پیاس حیاتیاتی تقاضے (BIOLOGICAL NECESSITIES) ہیں۔ لیکن جنسی جذبہ نفسیاتی تحرک (PSYCHOLOGICAL URGE) ہے۔ اس لئے اس کا بیدار کرنا یا خوابیدہ رہنے دینا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے خوابیدہ رکھنے سے کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا۔ (تفصیل ان امور کی پرویز صاحب کے مقالات "جنسیات کا اثر تمدن پر" اور "ضبطِ ولادت" میں دیکھئے جو "سلیم کے نام خطوط" جلد سوم میں شائع ہو چکے ہیں۔

حاصل کر لے' تو اس دوہری غیر فطری روش کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا اور کیا ہوگا۔

اس بدنہادی کا پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ مرد نے' عورت کو اپنے جیسا انسان سمجھنے کے بجائے' اسے اپنی لذت یابی کا ذریعہ قرار دے لیا۔ وہ انسان (HUMAN BEING) ہونے کے بجائے' ایک جنس (COMMODITY) یا استعمال کی شے متصور ہونے لگی' جسے خریدا جا سکتا ہے' بیچا جا سکتا ہے' کرائے پر لیا جا سکتا ہے۔ (بصد معذرت) "استعمال کے قابل" نہ رہنے کی صورت میں اٹھا کر پھینک دیا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ اور "جنس" لائی جا سکتی ہے۔ عورت کو جنسی لذت کے حصول کا آلہ (INSTRUMENT) سمجھنے کا تصور اس قدر عالم گیر اور انسان کے تحت الشعور میں جاگزین ہو چکا ہے کہ (وقتی طور پر اختلاط تو ایک طرف رہا) دنیا کی ہر قوم میں (کم از کم ہر "مہذب" قوم میں) نکاح' شادی یا (MARRIAGE) اور شب عروسی' شب زفاف (HONEY MOON) لازم و ملزوم قرار پا چکے ہیں۔ اگر کہیں شادی کی تاریخ ایسی مقرر ہو جاتی ہے جبکہ لڑکی (دلہن) ایام سے ہو (اور ایام میں اختلاط کو جائز نہ سمجھا جاتا ہو) تو اسے انتہائی بدتہذیبی اور بے تمیزی سمجھا جاتا ہے۔ اور اگر شب اول اختلاط کا عمل سرزد نہ ہو تو قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگ جاتی ہیں۔ کیا انسانیت کی اس سے بڑی تذلیل تصور میں بھی آسکتی ہے؟

یہ ہے "زن" کا وہ مسئلہ' جس نے عالم انسانیت میں فساد ہی فساد برپا کر رکھا ہے۔ ہر شخص اس "ذریعہ حصول "لذت" کو اپنے تصرف میں رکھنا اور اس سے زیادہ سے زیادہ لذت گیر ہونا چاہتا ہے۔

قرآن آیا اور اس نے یہ اعلان عظیم کیا کہ:

۱۔ مرد اور عورت دونوں' نوع انسان (HUMANITY) کے اجزاء ہیں اور مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام عالم انسانیت ہے۔ انسانیت (HUMANITY) صرف (MANKIND) نہیں' وہ (MAN AND WOMAN KIND) ہے۔

۲۔ عورت اور مرد مصاف زندگی میں دوش بدوش چلنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ۔ (سورہ احزاب نمبر ۳۳ کی آیت نمبر ۳۵ میں دیکھئے۔ وہ کس طرح شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں)۔

۳۔ مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی الگ انفرادیت ..... (INDIVIDUALITY) رکھتے ہیں۔ اس لئے ان میں سے کوئی ایک' دوسرے کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

۴۔ افزائش نسل کے سلسلہ میں مرد اور عورت کی طبیعی ساخت اور وظائف میں فرق ہے۔ لیکن اس سے ان کی انسانیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۵۔ حیوانات میں صرف بچہ پیدا کرنا یا اس کی طبیعی پرورش مقصود ہوتی ہے لیکن انسان کی صورت میں بچے کی ولادت اور طبیعی پرورش کے علاوہ اس کی تربیت بھی نہایت ضروری ہوتی ہے جس کی ذمہ داری ماں اور باپ دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس لئے اس جوڑے کا باہمی تعلق جنسی اختلاط کا نہیں بلکہ رفاقت (COMPANION SHIP) کا ہوتا ہے۔ اس رفاقت کے لئے وہ باہمی معاہدہ کرتے ہیں جسے نکاح کہا جاتا ہے۔

اس سے مقصد محض جنسی اختلاط کا جائز قرار پا جانا نہیں ہوتا' بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مساوی رفاقت کا اقرار ہوتا ہے۔

۶۔ جنسی اختلاط کا مقصد حصول لذت نہیں بلکہ افزائش نسل ہے۔

۷۔ افزائش نسل کے لئے جنسی اختلاط بھی صرف اس جوڑے میں جائز قرار پا سکتا ہے جس نے زندگی کی رفاقت کا معاہدہ کیا ہو۔

۸۔ اور جب صورت یہ ہو تو پھر (اس جوڑے سے باہر) کسی مرد یا عورت کے ساتھ جنسی اختلاط تو ایک طرف' اس کے تصور تک کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے تحفظ عصمت (CHASTITY) کا تقاضا' مرد اور عورت دونوں سے یکساں کیا ہے اور اس کی خلاف ورزی کی سزا دونوں کے لئے ایک جیسی مقرر کی ہے۔ یہ نہیں کہ (جیسا کہ دنیا میں عام طور پر ہو رہا ہے) مردوں کے لئے فحش کاری معاشرہ کا عام معمول سمجھ لیا جائے اور عورت سے اس کا تقاضا سخت ترین ہو۔ فحش کاری تو ایک طرف' قرآن تو نگاہ کی خیانت بھی مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں جرم قرار دیتا ہے۔

۹۔ لڑکے اور لڑکی ـــــ مرد اور عورت کے متعلق گفتگو اسی انداز سے ہوگی جس انداز سے دو انسانوں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ ان میں جنس (SEX) کی تفریق اس وقت سامنے آئے گی جب ان کے حیاتیاتی خصائص (BIOLOGICAL CHARACTERISTICS) کے ذکر کرنے کی ضرورت ہو۔

یہ ہے وہ انداز نگاہ' جسے پیدا کرنے سے قرآن کریم "زن" کے مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ جب تک یہ انداز نظر پیدا نہیں ہوتا' یہ دنیا بدستور جہنم بنی رہے گی۔

یہ ہیں "زر' زمین اور زن" کے پیدا کردہ مسائل حیات کے متعلق قرآن کریم کے پیش کردہ حل۔ آپ ان پر غور کیجئے اور سوچئے کہ کیا ان سے وہ تمام مفسدات مٹ نہیں جاتے جو ان کے متعلق انسانوں کے خود ساختہ انداز نگاہ اور طرز زندگی کے پیدا کردہ ہیں اور جن کی وجہ سے پورے کا پورا عالم انسانیت جہنم کی آگ میں جھلس رہا ہے اور ہزاروں کوششوں کے باوجود اس سے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نہیں ملتا۔ یہ راستہ قرآن کریم کی تجویز کردہ "صراط مستقیم" کے سوا اور کوئی نہیں۔

واللہ علی ما نقول شھید !

(اکتوبر ۱۹۶۶ء)

۶۔ لِمَ تقولون مالا تفعلون کا صحیح مفہوم

فکر طلوع اسلام سے متعلق ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہم قرآن مجید کے نظام ربوبیت کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے

ہیں کہ اس میں کوئی شخص اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہے گا' کیونکہ اس وقت دولت کی تقسیم ناہموار نہیں ہوگی' تو اس کے خلاف اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ پہلے تم لوگ اپنے مکانات' کاروبار' روپیہ پیسہ' دوسروں کو دے دو پھر اس قسم کی باتیں کرو اور اس کے لئے قرآن شریف کی یہ آیت بھی پیش کرتے ہیں کہ--- **لِمَ تقولون مالا تفعلون** ۶۱/۲ ---- تم جو کچھ خود نہیں کرتے اسے دوسروں کو کیوں کہتے ہو۔ اس کے متعلق طلوع اسلام میں لکھنے کی ضرورت ہے' کیونکہ یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام

یہ اعتراض اگر نیک نیتی سے کیا جاتا ہے تو معترض کی کم فہمی کی دلیل ہے' اور اگر بدنیتی سے کیا جاتا ہے تو منافقت کی نشانی ہے اور--- **یصلون عن سبیل اللہ** (خدا کی راہ سے روکنے) کی سعی مذموم۔

ہم کہتے یہ ہیں کہ جب ملک میں غلط معاشی نظام رائج ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت چند مراکز میں جمع ہونی شروع ہو جاتی ہے اور عام آبادی اپنی بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔ اس تباہی سے بچنے کی صورت' ملک میں صحیح معاشی نظام کی ترویج ہے' جسے قرآنی نظام ربوبیت کہتے ہیں۔ اس نظام کی رو سے' وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے' امت کی تحویل میں رہتے ہیں' تاکہ نظام مملکت اس پیداوار کی تقسیم ہر ایک کی ضروریات کے مطابق کرے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ غلط نظام کی جگہ' صحیح قرآنی نظام رائج کرنا' کسی ایک فرد کا کام نہیں۔ یہ تو مملکت کے کرنے کا کام ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم ملک کے ارباب دانش و بینش تک قرآن کا یہ پیغام پہنچاتے جائیں تاکہ آئینی طور پر اس نظام کے قائم ہونے کے لئے فضا سازگار ہو جائے۔ ایسا کہنے والے سے یہ کہنا کہ---- **لِمَ تقولون مالا تفعلون** یا جہالت ہے یا شرارت۔ اس آیت سے اگر یہی مفہوم لیا جائے جس کے لئے یہ حضرات اسے پیش کر دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص کسی نظام کو غلط کہے تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جائے کہ میاں! پہلے خود صحیح نظام قائم کرو اس کے بعد اس نظام کو غلط کہو۔ جب تم صحیح نظام قائم نہیں کرتے تو موجودہ نظام کو غلط کیوں کہتے ہو۔ اس منطق کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے تدبر و فراست کی بنا پر کہے کہ مجھے خدشہ نظر آتا ہے کہ فلاں سمت سے دشمن ہمارے ملک پر حملہ کر دے گا اس لئے ہمیں چاہئے کہ سرحد پر ایک لشکر جرار بھیج دیں۔ تو اس کے جواب میں اس سے کہا جائے کہ آپ پہلے خود رائفل لے کر اس سرحد پر جا کر کھڑے ہو جائیے اور پھر قوم سے کہئے کہ وہاں فوج بھیج دے۔ تمہیں خدا کا یہ ارشاد یاد نہیں کہ **لِمَ تقولون مالا تفعلون**۔

غلط معاشی نظام میں' آپ حسب استطاعت' کسی غریب کی کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ملک کی کثیر آبادی کے افلاس اور محتاجی کا علاج نہیں۔ اول تو یہ دیکھئے کہ اس سے آپ کتنے لوگوں کی ضروریات پوری کر سکیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے ان کی کوئی ہنگامی ضرورت پوری ہو جائے تو ہو جائے' ان کی احتیاج کا مستقل علاج نہیں ہو سکے

گا۔ غلط معاشی نظام کا علاج' خیرات نہیں' (خواہ اس کا نام زکوٰۃ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) اس کا علاج صحیح قرآنی نظام کا قیام ہے۔ اگر غلط نظام میں آپ اپنا سب کچھ دوسروں کو دے دیں گے تو ملک کا افلاس تو دور نہیں ہو سکے البتہ اس سے محتاجوں کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا (یعنی آپ کا شمار بھی ملک کے محتاجوں میں ہو جائے گا)۔ قرآن کا یہ حکم کہ **یسئلونک ماذا ینفقون---- قل العفو** ۲/۲۱۹ (یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے' سب کا سب) صحیح معاشی نظام کا حکم ہے جس میں کسی کو اس کی فکر نہیں ہوتی کہ کل کو مجھ پر اگر کوئی مصیبت آپڑی تو میرا کیا بنے گا؟ غلط معاشی نظام میں آپ اس حکم پر عمل کیجئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کل کو آپ کو (خدا نکردہ) کوئی حادثہ پیش آجائے تو آپ بھیک مانگتے پھریں گے۔ غلط نظام میں قرآن کی ہدایت یہی ہے کہ تم نہ تو اس قدر بخل کرو کہ بالکل ہاتھ سکیڑ لو اور نہ ہی اس قدر ہاتھ کشادہ کر دو کہ کل کو تمہیں خود دوسروں کا دست نگر ہونا پڑے (۱۷:۲۹)۔ ہاں' اگر صحیح نظام قائم ہو رہا ہو تو پھر اس کے لئے جان اور مال دونوں پیش کر دینے چاہئیں۔ یہ وجہ ہے کہ' اس وقت ہم نہ تو ذی استطاعت حضرات سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنا سب کچھ غریبوں کو دے دیں اور نہ ہی غریبوں اور محتاجوں سے یہ کہتے ہیں کہ وہ اٹھ کر' امیروں کا سب کچھ لوٹ لیں۔ یہ دونوں انداز غلط ہیں۔ ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ آئینی طور پر صحیح قرآنی نظام کے قیام کے لئے ذہنی فضا کو سازگار بنانا چاہیے اور اس دوران میں جس قدر کسی سے ہو سکے' غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنی چاہئے تاکہ ان کی وقتی مشکلات کسی حد تک دور ہو جائیں۔

یاد رکھئے! غلط کار اور غلط اندیش لوگ' جو خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑے رہنا چاہتے ہیں' اس قسم کی آیات (مثل **لِمَ تقولون مالا تفعلون**) سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس اپنی غلط روش کے جواز کے لئے کوئی سند اور دلیل نہیں ہوتی تو وہ ان حربوں پر اتر آتے ہیں اور اس قسم کی باتوں سے لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایک شخص جس بات کی دعوت دوسروں کو دیتا ہے' اس سلسلے میں جو کچھ اسکے اپنے اختیار اور استطاعت میں ہے' اگر وہ اس پر عمل نہیں کرتا' تو وہ اس حد تک واقعی مورد الزام ہے۔ (مثلاً") اگر کسی ملک کا ذی اقتدار حاکم یہ کہتا ہے کہ ملک میں نظام عدل قائم کرنا چاہئے اور وہ (باوصف اختیار) ایسا نظام قائم نہیں کرتا تو اسے ہم کہہ سکتے ہیں کہ **لِمَ تقولون مالا تفعلون**۔ لیکن اگر اس ملک کی رعایا کا کوئی مظلوم یہ کہتا ہے کہ یہاں نظام عدل قائم ہونا چاہئے' تو اس سے یہ کہنا کہ "تم جو کچھ کہتے ہو وہ کر کے کیوں نہیں دکھاتے"' حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

اور پھر اسے بھی سمجھ لیجئے کہ اگر کوئی شخص اپنی استطاعت کے باوجود وہ کچھ نہیں کرتا جس کی تلقین وہ دوسروں کو کرتا ہے' تو اسے اس جرم کا خمیازہ خود بھگتنا پڑے گا۔ آپ اسے یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے کہ "جب تم خود ایسا نہیں کرتے تو تمہیں مجھے تلقین کرنے کا کیا حق ہے"۔ آپ یہ دیکھئے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے' وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر وہ صحیح ہے تو آپ اسے اختیار کر لیجئے۔ اس کا غلط عمل آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا---- **لِمَ تقولون مالا تفعلون**------ اس کے لئے خدا کا حکم ہے اور آپ کے لئے خدا کا ارشاد یہ ہے کہ:

علیکم انفسکم ج لا یضر کم من ضل اذا اھتد یتم (۵/۱۰۵)

تم یہ دیکھو کہ تمہاری ذات کی اصلاح کس طرح ہوتی ہے۔ اگر تم صحیح راستہ اختیار کر لو گے' تو کسی دوسرے کا غلط راستے پر چلنا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

اپنی اصلاح کرو اور دوسروں کو صحیح راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص تمہاری راہنمائی صحیح راستے کی طرف کرتا ہے' لیکن خود غلط راستے پر چلتا ہے' تو تم یہ کہہ کر غلط راستے پر نہ چلتے جاؤ کہ جب تم خود صحیح راستے پر نہیں چلتے تو تمہیں کیا حق حاصل ہے کہ تم مجھ سے کہو کہ میرا راستہ غلط ہے۔ اگر تم اس کے کہنے پر صحیح راستہ اختیار کر لو گے تو اس شخص کا غلط راستے پر چلنا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ تم صحیح منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

یاد رکھئے! یہ انسانی نفس کی بڑی مکاری ہے کہ وہ غلط راستہ چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرنے والے کو یہ کہہ کر کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے' تو مجھے غلط راستہ چھوڑنے کو کیوں کہتے ہو' اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ میں نے بڑا تیر مارا ہے جو دوسرے کو لاجواب کر دیا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو دوسروں کو صحیح راستے کی طرف آنے سے یہ کہہ کر روکتے ہیں کہ جو شخص صحیح راستے کی نشاندہی کر رہا ہے' اس کا اپنا عمل تو دیکھو' ان کا خبث باطن انہیں اس پر اکساتا ہے۔ نیک نیت لوگوں کا شیوہ یہی ہونا چاہئے کہ وہ دوسروں سے کہیں کہ:

علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتد یتم (۵/۱۰۵)

صحیح بات کی طرف دعوت دینے والا لیکن استطاعت کے باوجود اس پر عمل نہ کرنے والا' غلط عمل کا خمیازہ بھگتے گا اور صحیح بات سن کر اس پر عمل نہ کرنے والا' اپنی غلط روش کا نقصان خود اٹھائے گا۔

لہٰذا' اس سلسلہ میں صحیح روش یہ ہے کہ:

۱۔ صحیح راستے کی طرف دعوت دینے والے کو چاہئے کہ جس حد تک اس کے لئے ممکن ہو' اپنی دعوت پر خود بھی عمل کرے۔

۲۔ اگر وہ دعوت کسی ایسے پروگرام کی ہے' جسے بروئے کار لانا اس کے بس کی بات نہیں' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اس کی طرف دعوت ہی نہ دے۔

۳۔ اگر اس کی دعوت صحیح ہے اور وہ خود اس پر عمل نہیں کرتا تو آپ یہ کہہ کر غلط راستے پر نہ چلتے جایئے کہ جب وہ اپنی دعوت پر خود عمل نہیں کرتا' تو اسے دوسروں کو ایسا کہنے کا کیا حق حاصل ہے۔ نہ ہی کسی صحیح دعوت کی اس لئے مخالفت کرو کہ اس کا داعی اس پر خود عمل پیرا نہیں۔ بات کو پرکھو۔ کہنے والے کے عمل کو اپنے لئے دلیل مت بناؤ۔ صحیح بات' صحیح ہوتی ہے خواہ اس پر دنیا کا کوئی انسان بھی عمل نہ کر رہا ہو۔ (نومبر ۱۹۶۶ء)

۷۔ زنا کی سزا ــــــــ رجم یعنی سنگساری

(آیہ رجم کہاں گئی؟)

ایک صاحب گجرات سے لکھتے ہیں کہ "اخبار مشرق (لاہور) میں حال ہی میں یہ خبر چھپی تھی کہ اسلامی مشاورتی کونسل نے اسلامی قوانین کے نفاذ کی نسبت جو سفارشات حکومت کو بھیجی ہیں ان میں ایک سفارش یہ ہے کہ زنا کی سزا موت بذریعہ سنگساری یعنی رجم ہونی چاہئے۔ میرا خیال تھا کہ اکتوبر کے طلوع اسلام میں اس سوال کو اٹھایا جائے گا کہ رجم کی سزا کا قرآن مجید میں مطلقاً" ذکر نہیں ہے۔ اور چونکہ مروجہ آئین کتاب و سنت کے مطابق احکام نافذ کرنے کا پابند ہے' اس لئے یہ سفارش حکومت کو قابل قبول نہیں ہونی چاہئے۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ کے پرچہ میں یہ سوال ضرور زیر بحث آئے گا۔"

طلوع اسلام

ہم نے اس سوال کو اس لئے نہیں اٹھایا تھا کہ (اول تو) ہم اس موضوع پر اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں' اس لئے ہم نے اسے دہرانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اور دوسرے اس لئے کہ ملک میں قانون سازی کا کام جس انداز سے سرانجام پا رہا ہے وہ ہمارے نزدیک کسی سنجیدہ توجہ کا سزاوار ہی نہیں۔ قانون سازی کے سلسلہ میں' سب سے پہلا اور بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو متعین کیا جائے جن کے مطابق قوانین مرتب کئے جائیں گے۔ اس کے لئے آئین پاکستان میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ملک کے قوانین کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوں گے۔ کتاب (قرآن کریم) تو بہرحال ایک متعین کتاب ہے۔ اس لئے اس کا طے کرنا مشکل نہیں کہ کوئی قانون' قرآن کے خلاف ہے یا نہیں ــــــ لیکن "سنت" کی اصطلاح ایسی ہے جس کا آج تک کوئی متفق علیہ مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا اور نہ ہی یہ طے پا سکا ہے کہ متفق علیہ سنت' کس کتاب میں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر فرقہ اپنے ہر عمل کو عین مطابق سنت قرار دیتا ہے اور دوسرا فرقہ اسی عمل کو خلاف اسلام۔ جب تک بات فرقوں تک محدود تھی' اس کا نتیجہ باہمی بحث و جدل اور سر پھٹول تھا۔ لیکن جب بات کسی مملکت کی قانون سازی تک پہنچ جائے تو اس وقت اس بنیادی معیار کو جس کے مطابق قوانین مرتب کرنے چاہئیں' اس طرح غیر متعین رہنے دینے کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے' ظاہر ہے۔ اس سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو ملک کے تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر "کتاب و سنت" کے مطابق ہو۔ ۳؎ اور اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر گیا' ملک کے لئے اس معیار کے مطابق کوئی ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکا ــــــ نہ ہی ایسا ضابطہ اس وقت تک مرتب ہو سکتا ہے جب تک آپ سنت کا ایک متفق علیہ مفہوم متعین نہ کریں اور یہ نہ طے کر لیں کہ یہ سنت آپ کو ملے گی کہاں سے۔ اوروں کو تو چھوڑیئے' آپ اسلامی مشاورتی کونسل کے ارکان سے کہیے کہ وہ کسی ایسی کتاب کی نشاندہی کر دیں جو اس کے نزدیک متفق علیہ

۳؎ مودودی (مرحوم) نے اس کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ (ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

سنت کا مجموعہ ہو۔ کونسل کے ارکان کو بھی چھوڑیئے۔ اس کے چیئرمین سے کہئے کہ وہی کسی ایسی کتاب کی نشاندہی کردیں۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ قیامت تک ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اب آپ سوچئے کہ جس کونسل کی اپنی یہ حالت ہو کہ اس نے اس بات کا ذمہ لے رکھا ہو کہ وہ بتائے گی کہ کونسا قانون 'کتاب و سنت کے خلاف ہے' لیکن ان کے ہاں یہ بھی طے نہ ہو کہ متفق علیہ سنت کا مجموعہ کہاں سے ملے گا' وہ سفارشات کیا کرے گی اور اس کی سفارشات درخور اعتنا کس حد تک ہوں گی؟ دوسری طرف حکومت ہے جس نے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کونسل کی کونسی سفارش قابل قبول ہے اور کونسی مسترد کر دینے کے قابل۔۔۔۔۔ یہ فریضہ مرکزی حکومت کی وزارت قانون (منسٹری اوف لا) سے متعلق ہے۔ آپ مرکزی وزیر قانون سے کہیے کہ وہی بتا دیں کہ آئین میں جو لکھا ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا تو اس میں سنت کا متعینہ مفہوم کیا ہے اور اس سنت کا مجموعہ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو' کہاں سے ملے گا۔ اور اگر وہ یہ نہ بتا سکیں (اور وہ کبھی نہیں بتا سکیں گے) تو ان سے بادب دریافت کیجئے کہ جب آپ کے پاس کونسل کی کوئی سفارش آئے گی تو آپ کس معیار کے مطابق یہ فیصلہ کریں گے کہ وہ "کتاب و سنت" کے مطابق ہے یا نہیں' جب آپ کے پاس "سنت" کا کوئی متفق علیہ مجموعہ ہی نہیں۔

۲۔ اب آیئے جرم زنا کی سزا کی طرف۔ یہ واضح ہے کہ صرف چند جرائم ایسے ہیں جن کی سزا بھی قرآن نے خود متعین کر دی ہے۔ ان میں ایک زنا ہے۔ اس کی سزا کے متعلق سورہ نور میں ہے۔

الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ (۲۴/۲)

"زانیہ عورت اور زانی مرد' ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو"

اور سورہ نساء میں ہے' کہ لونڈی کے جرم زنا کی سزا' آزاد عورت سے نصف ہے (۴/۲۵) یعنی پچاس کوڑے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں اس جرم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ لیکن ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ سزا بن بیاہی عورت اور کنوارے مرد کی ہے۔ شادی شدہ عورت اور مرد کی سزا رجم ۴؎ یا سنگسار کرنا ہے۔ اس کی سند بڑی دلچسپ ہے۔ غور سے سنئے:۔

موطا امام مالکؒ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کیا' یاد بھی کیا' اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپؐ کے بعد رجم ۵؎ کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ "حدیث کی ایک دوسری کتاب (مسند امام احمد) میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:

۴؎ رجم کی سزا یہودیوں کے ہاں تھی۔

۵؎ معلوم نہیں کہ لونڈیوں کے سلسلہ میں رجم کی نصف سزا کس طرح دی جاتی تھی؟

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا' عمرؓ نے لکھ دیا' تو میں آیہ رجم کو اسی طرح لکھ دیتا جس طرح نازل ہوئی تھی۔

اب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں گے کہ وہ آیہ رجم' جو قرآن میں موجود تھی' جس کی صحابہؓ تلاوت کیا کرتے تھے' حفاظ نے جسے حفظ کیا تھا' جس کے مطابق رسول اللہؐ اور بعد کے زمانے میں عمل ہوتا رہا' وہ اس قرآن میں نہیں تھی جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھا (اور جو اس قرآن میں بھی نہیں جو اس وقت ہمارے پاس ہے) تو وہ آیت گئی کہاں؟ اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔ سنن ابن ماجہ میں (جو صحاح ستہ کی ایک کتاب ہے) حضرت عائشہؓ کی طرف یہ روایت منسوب کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

آیت رجم اور رضاعت کبیر (جس میں یہ کہا گیا تھا کہ دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے) ایک صحیفے میں میرے تخت کے نیچے تھی۔ جب رسول اللہؐ کا انتقال ہوا تو ہم لوگ اس حادثے میں مشغول ہو گئے اور گھر کی پالتو بکری آئی اور اس صحیفے کو کھا گئی۔

یوں آیہ رجم قرآن کریم میں نہ رہی۔ اور نہ ہی پھر بعد میں حضرت عمرؓ نے اسے قرآن میں درج کرنا مناسب سمجھا۔ البتہ اس کا حکم بدستور باقی رہا۔

یہ ہے وہ سند جس کی رو سے اسلام میں زنا کی سزا رجم بتائی جاتی ہے اور جس کی سفارش اب اسلامی مشاورتی کونسل نے کی ہے۔ آپ فرمایئے کہ یہ مقام کچھ لکھنے کا تھا یا سر پیٹ کر بیٹھ جانے کا؟ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ حکومت اس سفارش کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے؟ وہ اسے منظور کرتی ہے یا مسترد۔ اور اگر مسترد کرتی ہے تو کس دلیل اور سند کی بنا پر؟

(نومبر ۱۹۶۶ء)

۸۔ کیا مشینوں کے ذریعے ذبیحہ حلال ہو گا؟

(اہل کتاب کے ہاں کا کھانا!)

آجکل اخبارات میں یہ بحث چلی ہوئی ہے کہ انگلستان میں مشینوں کے ذریعے جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں' ان کا گوشت حلال ہے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس بھی بہت سے استفسارات آئے ہیں۔ ہم اس تفصیل سے درگزر کرتے ہوئے کہ اس بحث میں فلاں صاحب نے کیا کہا اور فلاں نے کیا فرمایا' اتنا بیان کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا حکم ہے۔

۱۔ حلال جانوروں کا گوشت کھانے کے متعلق پہلا حکم یہ ہے کہ **فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ان کنتم بایتہ**

مومنین (۶/۱۱۹) "سو تم کھاؤ (اس جانور کے گوشت) میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے' اگر تم احکام خداوندی پر ایمان رکھتے ہو"۔

۲۔ اسی کی تائید میں منفی طور پر فرمایا **ولا تاکلوا مما لم یذکر سم اللہ علیہ** (۶/۱۲۲) اور اس میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

لہٰذا' ذبیحہ کے حلال ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ اس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔

۳۔ سورہ مائدہ میں ہے۔

حرمت علیکم المیتۃ والد م ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ والمنخنقۃ والموقوذۃ والمتردیۃ والنطیحۃ وما اکل السبع الا ما ذکیتم..... (۵/۳)

حرام ہوا تم پر مردہ جانور اور (بہتا ہوا) لہو اور خنزیر کا گوشت اور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جس کا گلا گھٹ جائے یا چوٹ لگ جائے یا اوپر سے گر جائے یا سینگ لگنے سے زخمی ہو جائے' یا جسے درندوں نے کھایا ہو۔ ہاں اگر تم ایسے جانور کو مرنے سے پہلے ذبح کر لو (تو وہ حرام نہیں ہوگا)۔

اس آیت میں مردار اور ذبیحہ کا فرق بتا دیا گیا ہے اور وہ فرق ہے **ما ذکیتم**۔ تزکیتہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں حرارت غریزی کا خارج کر دینا (امام راغب) اور مطلب ہوتا ہے جانور کا خون بہا کر اس کی حرارت غریزی کا ختم کر دینا۔ جب کسی جانور کا اس طرح خون بہا دیا جائے تو اس کے بعد وہ بھی مردہ ہو جائے گا لیکن یہ حلال ہوگا اور وہ جانور جو خون بہائے بغیر مر جائے' حرام ہوگا۔

لہٰذا' کسی جانور کے حلال ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا خون بہا دیا جائے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مشین سے ذبح کرنے میں جانور کا خون بہتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کا خون نکل جاتا ہے تو پھر (قرآن کریم کی عائد کردہ) دوسری شرط پوری ہو جائے گی۔

لہٰذا' اگر حلال جانور کو ذبح کرتے وقت' اللہ کا نام لیا جائے اور جانور کا خون خارج ہو' تو اس کا گوشت حلال ہوگا' خواہ اسے قصاب کی چھری سے ذبح کیا جائے یا مشین سے۔ اور اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی ساقط ہو جائے تو اس کا گوشت حرام ہوگا (سدھائے ہوئے جانوروں کے شکار کا ذکر سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴ میں ہے)۔

۴۔ سورہ المائدہ کی آیت نمبر ۵ میں ہے:

الیوم احل لکم الطیبت۔ وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم (۵)

آج تمہارے لئے تمام طیب چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہل کتاب کے ہاں کا کھانا بھی بشرطیکہ وہ تمہارے ہاں کا کھانا اپنے لئے حلال سمجھیں۔

اہل کتاب کے طعام کے حلال ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ان کے ہاں کی ہر چیز ہمارے لئے حلال ہے۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہوگا۔ یعنی ایک حرام شے مسلمانوں کے ہاں سے لی جائے تو حرام ہوگی' لیکن وہی شے اہل کتاب کے ہاں

سے لے لی جائے' تو حلال ہو جائے گی (یا للعجب)۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو چیزیں تمہارے ہاں حلال ہیں' ان کا اہل کتاب کے ہاں سے لے کر کھالینا بھی حلال ہے۔ نزول قرآن کے زمانے میں عام متعارف اہل کتاب یہودی اور نصرانی تھے۔ عیسائیوں کے متعلق تو معلوم نہیں لیکن یہودی اب تک ذبیحہ پر خدا کا نام لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نزول قرآن میں نصرانی بھی ذبیحہ پر خدا کا نام لیتے ہوں گے۔ اسی لئے ان کے ذبیحہ کو مشرکین کے ذبیحہ سے متمیز کر دیا گیا۔ لیکن اگر اب عیسائی ذبیحہ پر خدا کا نام نہیں لیتے تو ان کا ذبیحہ بھی ہمارے لئے حلال نہیں ہوگا۔

انگلستان (اور دیگر غیر مسلم بیرونی ممالک) میں مسلمانوں کے لئے گوشت کا مسئلہ آج سے نہیں' شروع ہی سے بڑا پریشان کن چلا آرہا ہے۔ پاکستان سے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ولایت جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر کی طرف سے یہ شکایات موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں گوشت کا مسئلہ بڑی مشکلات پیدا کرتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صرف ایک انگلستان میں اب مسلمانوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہوگی۔ لیکن حیرت ہے کہ نہ تو وہ خود ہی اس کا کوئی تسلی بخش انتظام کر سکے ہیں اور نہ ہی ہمارے ہائی کمشنر کی طرف سے اس ہر روز کی مشکل کا کوئی حل تجویز کیا گیا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی ایسا ہی عقدہ لاینحل ہے۔ سوال صرف اس کی اہمیت کے احساس کا ہے۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ جہاں' ملک سے باہر جانے والے اہل پاکستان کی دیگر مشکلات کا خیال رکھتی ہے' اس سوال کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔

باقی رہا خود پاکستان میں مشین کے ذریعے ذبیحہ کا سوال' سو اگر مشین کے ذریعہ ذبیحہ سے جانور کے خون کا اخراج ہو جاتا ہے' تو ان مشینوں سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یہاں' ان مشینوں کے ذریعے ذبح کرنے والے تو بہرحال مسلمان ہی ہوں گے اور وہ جانور پر اللہ کا نام بھی لیں گے۔

(نومبر ۱۹۶۷ء)

۹۔ کیا انسان کی کوئی فطرت ہے

ایک درس میں' مودودی صاحب سے یہ سوال پوچھا گیا کہ:

جب انسان کی فطرت میں چھچھورا پن ہے تو وہ سلیم الطبع کیسے ہو سکتا ہے۔

اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ:

انسان کے اندر چھچھوراپن تو کم و بیش موجود ہوتا ہے۔ یہ منجملہ انہی اوصاف کے ہے جو اس کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ انسان سے انہی عادات و خصائل کا اظہار ہوتا ہے جو اس کی فطرت میں پوشیدہ ہیں۔ اب انسان کی آزمائش دراصل اس بات میں ہے کہ وہ فطری اوصاف میں سے کن اوصاف کو ابھارے اور کن اوصاف کی حوصلہ

شکنی کرے۔ اپنے اندر بھلائیاں پرورش کرنے کا جو طریقہ اللہ کی شریعت نے بتایا ہے
اگر اس کے مطابق انسان چلتا رہے تو اس کے نفس کی خرابیاں کم ہوتی جائیں گی اور
اس کے اندر اعلیٰ صفات تقویت پکڑ لیں گے۔

اس جواب کی رو سے یہ ثابت ہوا کہ انسان کی فطرت میں کچھ خراب باتیں بھی ہیں اور ان خرابیوں کی اصلاح دین کی پابندی سے ہو سکتی ہے۔

یہ حضرات ہمیں یہ بھی بتاتے رہتے ہیں کہ:

(۱) اسلام' دین فطرت ہے اور

(۲) خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ (معاذ اللہ) خود خدا میں بھی وہ خرابیاں موجود ہیں جو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہیں۔ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ خرابیاں انسان کی فطرت میں ہیں' تو "ان کی اصلاح کرنا خلاف فطرت" ہوگا۔ اور اگر اسلام' دین فطرت ہے تو اس کا فریضہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان خرابیوں کے حفاظت کرے اور انہیں اور جلا دے نہ کہ ان کا استیصال کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کے تصور کی رو سے اسلام کا کیا نقشہ سامنے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں نہ یہ معلوم ہے کہ فطرت کسے کہتے ہیں اور نہ یہ کہ اسلام کیا ہے اور اپنی جہالت کی بنا پر خدا کے دین حقہ کو بدنام کرتے رہتے ہیں۔

فطرت' اشیائے کائنات کی ان بنیادی خصوصیات کو کہتے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے وہ مجبور ہیں اور جنہیں وہ بدل نہیں سکتیں۔ مثلاً" آگ کی فطرت ہے کہ وہ جلائے۔ مچھلی کی فطرت ہے کہ وہ پانی میں رہے۔

انسان' اشیائے کائنات کی طرح مجبور نہیں' صاحب اختیار ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو صاحب اختیار ہو' اس کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔

انسان کی طبیعی زندگی کے کچھ تقاضے ہیں (مثلاً" کھانا' پینا' سانس لینا وغیرہ) اور یہ تقاضے وہی ہیں جو دیگر حیوانات کے ہیں۔

لیکن حیوانی زندگی سے اوپر' انسان کی "انسانی زندگی" بھی ہے اور اسی زندگی کی راہنمائی کے لئے خدا کی طرف سے اقدار اور قوانین عطا ہوئے ہیں۔ انہیں دین کہا جاتا ہے۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی طبیعی زندگی کے تقاضوں کو ان قوانین و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کرے' یا ان حدود و قیود سے بے باک ہو کر' حیوانی سطح پر زندگی بسر کرے۔

قرآن نے جہاں کہا ہے کہ انسان کو ایسا پیدا کیا گیا ہے اور ویسا' تو اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اگر وحی کی راہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگا رہے تو اس کا نتیجہ اس قسم کا ہوتا ہے۔ لیکن دین چاہتا ہے کہ وہ اپنے تقاضوں کو

اس کی معین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے پورا کرے اور اس طرح وہ حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرے۔

اس سے واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں (کہ فطرت' مجبور اشیاء کی ہوتی ہے)۔ اس کے اندر کچھ طبعی زندگی کے تقاضے ہیں اور کچھ صلاحیتیں جنہیں یہ جس طرح جی چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ ان کے صحیح استعمال کے لئے وحی کی رو سے راہنمائی ملی ہے۔

اور جب انسان کی کوئی فطرت ہی نہیں تو یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اسلام' دین فطرت ہے یا خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے (ان امور کی مزید وضاحت کے لئے "سلیم کے نام خطوط" (جلد سوم) یا لغات القرآن میں عنوان "فطر" دیکھئے)۔

(جون ۱۹۶۸ء)

۱۰۔ کیا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت میں موجود ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے درس قرآن مجید میں (جس کی رپورٹ' ایشیا' بابت ۲۵ مئی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے) فرمایا۔

> دوسرے معنی اسکے یہ ہیں کہ انسان کے اندر اخلاقی حس رکھ دی گئی ہے۔ اس کی فطرت میں یہ بات اتار دی گئی ہے کہ برا کیا ہے اور بھلا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے' ہدایت نہ بھی آئے تو بھی وہ برے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر برے اور بھلے کی تمیز انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے اور اگر خدا کی طرف سے ہدایت نہ بھی آئے تو بھی وہ ان میں تمیز کر سکتا ہے' تو پھر خدا کی طرف سے ہدایت بھیجنے کا فائدہ کیا ہے؟ جو لوگ وحی کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ دلیل ہی یہ دیتے ہیں کہ برے بھلے کی تمیز انسانی فطرت میں موجود ہے' اس لئے اسے کسی خارجی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز بکری کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ گھاس اس کے لئے "حلال" ہے اور گوشت "حرام"۔ وہ مرتی مرجائے گی لیکن گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گی۔ جنگل کا بادشاہ' شیر' اتنی مہیب قوت کا مالک ہوتے ہوئے بھوکا مرجائے گا لیکن گھاس پات کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ یہ بات اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ وہ گوشت خور ہے۔ مرغی کے چوزے کو لاکھ گھیر کر لاؤ' وہ پانی کے حوض میں کبھی نہیں اترے گا' کیونکہ یہ بات اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ پانی اس کے لئے ہلاکت آفریں ہے۔ بط کا بچہ' لپک کر پانی کی طرف جائے گا۔ انہیں' ان کی فطرت کے تقاضوں کو بتانے کے لئے' نہ کوئی رسول آتا ہے نہ کتاب۔ وہ پیدائش کے ساتھ ہی فطرت کی مقرر کردہ راہ پر چل نکلتے ہیں اور ساری عمر اسی راہ پر چلتے رہتے ہیں۔ اس لئے کہ جو بات کسی کی

فطرت میں داخل ہو' وہ نہ بدلی جا سکتی ہے نہ بھلائی' نہ کسی کو اس کی یادہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر کسی جانور سے اس کی فطرت کے خلاف کوئی کام کرانا ہو تو ہزار جتن کر کے' اسے اس کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور جونہی یہ جبر کی زنجیر ٹوٹتی ہے تو وہ بھاگ کر فطرت کے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔

یہ ہے اشیائے کائنات اور جانوروں کی کیفیت جن کی فطرت کے اندر' ان کے برے اور بھلے کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ لیکن انسانوں کی تو یہ کیفیت نہیں۔ ان کی طرف آسمانی راہنمائی آتی تھی (جواب قرآن میں محفوظ ہے) جو برے اور بھلے کی تمیز بتاتی تھی۔ رسول اگر ان سے کہتا یہ تھا کہ **واعلم من اللہ مالا تعلمون** (۷/۶۲) میں خدا کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اگر یہ تمیز ان (انسانوں) کے اندر موجود ہوتی تو ان سے یہ کس طرح کہا جا سکتا تھا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جس کا تمہیں علم نہیں۔ وہ رسول کی آمد سے پہلے **فی ضلل مبین** ہوتے تھے (۳/۱۶۴) یعنی بالکل کھلی ہوئی گمراہی میں۔ کیا کوئی حیوان بھی (جس کے اندر برے اور بھلے کی تمیز موجود ہوتی ہے) ضلال مبین ---- گمراہی ---- میں ہوتا ہے؟ وہ تو کبھی گمراہ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور فرمایا کہ "انسانی فطرت" کے غلط تصور نے کس قدر گمراہیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اگر انسانی فطرت کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر انسان اپنے کسی عمل کے لئے ذمہ دار قرار نہیں پاتا ---- ہم کبھی شیر کو پھانسی پر نہیں لٹکاتے کہ اس نے فلاں انسان کو مار کیوں ڈالا تھا ---- نہ ہی اس کی طرف خدا کی طرف سے وحی ---- نبی اور رسول ---- آنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فطرت انسانی کا عقیدہ' وحی کے منکرین نے وضع کیا۔ لیکن اس کی تبلیغ ان لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے جو وحی پر ایمان رکھنے کے دعویٰ سے مسلمان کہلاتے ہیں۔ حرام' جو یہ لوگ کبھی کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور ایسا کہنے کے نتائج اور اثرات کیا ہیں۔ بس بھیڑوں کی ایک قطار ہے جو صدیوں سے اس راستے پر چلی جا رہی ہے جس پر کبھی کوئی پہلی بھیڑ چلی تھی ---- **کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء و نداء صم بکم عمی فھم لا یعقلون** (۲/۱۷۱)

(جولائی ۱۹۶۹ء)

۱۱۔ کیا ٹیکسوں کی چوری جائز ہے؟

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

"پاکستان میں بڑے بڑے پرہیز گار' پارسا اور شرع کے پابند لوگ بھی سرکاری محاصل وغیرہ مثلاً" کسٹم ڈیوٹی' انکم ٹیکس' پراپرٹی ٹیکس اور چونگی وغیرہ کی چوری کو چوری نہیں سمجھتے اور ان محاصل کی تشخیص کے وقت ہر قسم کی غلط بیانی اور ہیرا پھیری کو جائز سمجھتے ہیں۔ جب کبھی ان کے اس طرز عمل پر نکتہ چینی کی جائے تو یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جب تک ہمارا ملکی نظام کتاب و سنت کے وضع کردہ اصولوں پر استوار نہیں کیا جاتا' ٹیکسوں کی چوری شرعاً" قابل احتساب

نہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ کو بھی شرعاً" اور اخلاقاً" ناجائز نہیں سمجھتے ہیں۔
براہ مہربانی قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے طرز عمل کا تجزیہ فرمائیں۔ نوازش ہوگی۔"

طلوع اسلام

ہم "ارباب شریعت" کے متعلق تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے جواز کے لئے کوئی راستہ نکال دیں۔ کیونکہ فقہ کی کتابوں کے ساتھ ایک "کتاب الحیل" بھی ہوتی ہے جس میں وہ طریقے بتائے جاتے ہیں' جن سے' جرائم کا ارتکاب بھی کیا جائے اور اس پر مواخذہ بھی نہ ہو سکے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی چوری کیسے جائز قرار پا سکتی ہے؟ اور اس کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں ---- بات صاف ہے ---- غلط بیانی' فریب دہی' خیانت وغیرہ موجودہ حکومت کے قوانین کی رو سے بھی جرائم ہیں اور یہ چیزیں کتاب و سنت کی رو سے بھی ناجائز ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کے ان قوانین کی خلاف ورزی خود کتاب و سنت کی خلاف ورزی قرار پائے گی یا نہیں؟

اگر دلیل یہ لائی جائے کہ جن امور کو کتاب و سنت نے ناجائز قرار دیا ہے ان کا ارتکاب اسی صورت میں ناجائز ہوگا جب ملک میں کتاب و سنت کا نظام قائم ہو' تو بات بہت دور تک جا پہنچے گی۔ (مثلاً") زنا کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے۔ کیا ہمارے یہ "بڑے بڑے پرہیز گار' پارسا اور شرع کے پابند" حضرات آج اس بنا پر زنا کو جائز قرار دے دیں گے کہ یہاں کتاب و سنت کا نظام قائم نہیں۔ یہاں تو ایک طرف' یہ ہندوستان کی حکومت میں بھی (جہاں کتاب و سنت کے مطابق نظام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا) حرام ہی ہوگا۔

اگر ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو (مذکورہ صدر دلیل کی بنا پر) فی الواقع ان امور کو جائز سمجھتے ہیں تو ان کی ذہنیت ان لوگوں کی سی ہو چکی ہے جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **زین لہ سوء عملہ فراہ حسنا** (۳۵/۸) "ان کی نگاہوں میں' ان کے برے کام بھی نہایت مزین ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں حسن عمل بن کر دکھائی دیتے ہیں" اس کی وجہ یہ ہے کہ **واتبعوا اھواء ھم** (۴۷/۱۴) وہ اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور اس طرح انہیں برا کام' برا کام دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس قسم کی خود فریبی انسان کی تباہی کی آخری منزل ہوتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ جو برائی کرے لیکن اسے برائی سمجھے' اس کی اصلاح کا تو امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن جسے برائی' اچھائی بن کر دکھائی دینے لگ جائے' اس کی اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ آپ ان حضرات سے کہئے کہ اگر آپ کی مفاد پرستیاں آپ کو اس قسم کے جرائم پر آمادہ کرتی ہیں اور آپ ان سے رک نہیں سکتے' تو ہم اس میں کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس قسم کی جھک مارنے کے بعد' کتاب و سنت کو تو بدنام نہ کیجئے۔

(جولائی ۱۹۶۸ء)

۱۲۔ کیا انشورنس جائز ہے؟

جوں جوں معاشی تقاضے بڑھتے جاتے ہیں' اس قسم کے استفسارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ بینک کا سود جائز ہے یا ناجائز' زمین بٹائی پر دی جا سکتی ہے یا نہیں' روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار بننا کیسا ہے' پراویڈنٹ فنڈ کا منافع لیا جا سکتا ہے یا نہیں' انشورنس جائز ہے یا نہیں---- ہم وقتاً فوقتاً ان استفسارات کا جواب ان صفحات میں دیتے رہتے ہیں۔ اور قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اپنی کتاب ----- خدا اور سرمایہ دار (ایڈیشن اول' اکتوبر ۱۹۶۷ء) میں تفصیلی بحث بھی کر چکے ہیں۔ لیکن پچھلے ماہ انشورنس کے متعلق دو تین استفسارات موصول ہوئے ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ اس پر متعین طور پر لکھا جائے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل متعدد بار لکھ چکے ہیں' بات بینک کے سود' مضاربت' مزارعت' انشورنس وغیرہ کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام ہی غیر قرآنی ہے اور ہم چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح اس غیر اسلامی نظام میں "اسلام" کا پیوند لگا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیں۔ یہ اطمینان فریب نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کوئی غیر اسلامی نظام' پیوند سازی سے اسلامی نہیں بن سکتا۔ لہٰذا' غیر اسلامی نظام معیشت کو علیٰ حالہ رکھتے ہوئے' اس قسم کی بحثیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ اگر قرآن کا معاشی نظام قائم ہو جائے تو اس میں' ان میں سے کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوگا۔ آج ان سوالات کی نوعیت اسی قسم کی سمجھئے جیسے (مثلاً) ایک کمیونسٹ' نظام سرمایہ داری کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے پوچھے کہ میں ذاتی جائداد بنا سکتا ہوں یا نہیں؟

آپ انشورنس ہی کو لیجئے۔ اس کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ایک شخص سوچتا ہے کہ اگر کل کو اس پر کوئی حادثہ گزر جائے تو اس کا (یا اس کی موت کے بعد' اس کے بچوں کا) کیا بنے گا؟ قرآن کے معاشی نظام میں کسی شخص کو اس قسم کا خطرہ لاحق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نظام میں ہر ذی حیات کے سامان زیست (بنیادی ضروریات زندگی) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے' اس لئے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو جائے تو اسے اس کی فکر ہی نہیں ہوگی کہ وہ کھائے گا کہاں سے یا اگر وہ وفات پا جائے تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا۔ لہٰذا' اس نظام میں انشورنس کی نہ ضرورت لاحق ہوتی ہے' نہ ہی اس کے جائز اور ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ہر فرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کے متعلق ہر طرح سے (ASSURED) ہوتا ہے۔

لیکن آج (غیر اسلامی نظام معیشت میں) صورت یہ ہے کہ اگر کوئی فرد کاسب' کسی وجہ سے کام کاج کرنے سے معذور ہو جاتا ہے' یا اس کی موت ایسے حالات میں ہو جاتی ہے کہ اس کے پاس اثاثہ کوئی نہیں ہوتا' تو وہ خود اور اس کے بیوی بچے نان شبینہ تک کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان بیچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ غیر قرآنی نظام معیشت (یعنی نظام سرمایہ داری) میں اس صورت حال سے بچنے کے لئے انشورنس کی اسکیم رائج کی گئی۔ اس سے' بہرحال' اس قسم کے واقعات میں' زندگی کے دن بسر کرنے کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اندریں حالات' موجودہ نظام

میں' اس اسکیم کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ لیکن

شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

یعنی یہ حضرات (ہمارے مذہبی پیشوا) بجائے اس کے کہ موجودہ نظام کو حرام قرار دیں' اس کے اندر اس قسم کی سہولتوں کو حرام قرار دے دیتے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے کہ صاحب! اگر یہ شخص انشورنس نہ کرائے اور کل کو اس پر اس قسم کا حادثہ گزر جائے تو اس کا اور اس کے بال بچوں کا کیا بنے گا' تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بتانا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام تو فتویٰ دینا ہے------ یہی سوال قرآن کریم نے بھی اٹھایا تھا جب کہا تھا کہ:

ایود احدکم ان تکون لہ جنۃ من نخیل واعناب تجری من تحتھا الانھار لہ فیھا من کل الثمرات و اصابہ الکبر ولہ ذریۃ ضعفاء فاصابھا اعصار فیہ نار فاحترقت کذالک یبین اللہ لکم الایات لعلکم تتفکرون (۲/۲۶۶)

کیا تم میں سے کوئی شخص بھی یہ چاہے گا کہ:

(۱) اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا سرسبز و شاداب باغ ہو جس میں پھل بکثرت آئیں۔

(۲) وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔

(۳) کہ ایسے میں ایسی باد سموم چلے کہ اس باغ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے (اور اس طرح وہ پورے کا پورا کنبہ سامان زیست سے محروم رہ جائے)۔

(۴) کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کی ایسی حالت ہو جائے؟ اگر ایسا نہیں چاہتے تو پھر فکر و تدبر کی رو سے دیکھو کہ وہ کونسا قدم اٹھایا جائے جس میں ایسی صورت پیدا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ قرآن نے اس کا اعتراف کرانے کے بعد (کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہے گا) کہا کہ پھر تم ایسی آفت سے بچنے کا انتظام کیوں نہیں کرتے! اور وہ انتظام یہ ہے کہ تم قرآن کا تجویز کردہ معاشی نظام اپنے ہاں رائج کر لو۔ اس نظام میں کبھی ایسی شکل پیدا نہیں ہوگی۔

قرآن کریم نے اس کا یہ حل بتایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نظام قائم کر کے دکھا دیا کہ یہی ان مشکلات کا قرار واقعی حل ہے۔

وہ نظام باقی نہ رہا اور دنیا میں نظام سرمایہ داری کا چلن عام ہو گیا۔ اس نظام میں بھی وہی سوال سامنے آیا جسے قرآن سامنے لایا تھا۔ اس نظام کے حاملین نے اس کا حل انشورنس کی صورت میں تجویز کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حل ویسا نہیں جیسا قرآن کریم نے تجویز کیا تھا' لیکن موجودہ غلط نظام میں یہ حل' جب تک قرآنی حل ممکن نہ ہو بہرحال غنیمت

ہے اور دنیا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں قرآنی حل رائج نہیں کرتے اور دنیا نے جو حل تجویز کیا ہے' اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

قرآن نے (مندرہ بالا آیت میں) کہا تھا کہ تم سوچو کہ تمہیں کیا انتظام کرنا چاہیے' جس سے ایسی صورت پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ شریعت کے معاملہ میں سوچنا حرام ہے۔

انشورنس کو ناجائز قرار دینے کے لئے' ان حضرات کی طرف سے دو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ چیز "توکل علی اللہ" کے خلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں سود شامل ہوتا ہے۔

جہاں تک "توکل علی اللہ" کا تعلق ہے' ان حضرات نے توکل کا ایسا غلط مفہوم پیش کر رکھا ہے جس سے یہ قوم اپاہجوں اور مفلوجوں کا گروہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کے پیش کردہ توکل علی اللہ کے مفہوم کی تردید تو روزمرہ کے واقعات کر رہے ہیں۔ اگر توکل علے اللہ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے لئے کوئی حفاظتی تدبیر نہ کرو' کیونکہ رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے' تو ان سے پوچھئے کہ یہ جو اس وقت دنیا کی آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے اور ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے مرجاتے ہیں یا فرد کا سب کی موت کے بعد ' اس کے بیوی بچوں پر فاقے آنے شروع ہو جاتے ہیں' تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟

یاد رکھئے! توکل علے اللہ کے یہ معنی نہیں۔ اس کے معنی ہیں خدا کے تجویز کردہ نظام کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد۔ یہ بھروسا کہ اس نظام میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ذی حیات بھوکا رہ جائے۔ یہ اسی نظام کی محکمیت تھی جس کے پیش نظر حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ:

> اگر کسی بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

یا جس "ذمہ داری" کی حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں تشریح کی تھی کہ:

> اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرجائے تو بخدا! عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

یہ تھا وہ نظام جس پر کامل بھروسا کو "توکل علے اللہ" کہا گیا تھا۔

باقی رہا سود کا معاملہ۔۔۔ سو ان حضرات سے پوچھئے کہ آپ' لوگوں سے "کار خیر" کے لئے جس قدر عطیات لیتے ہیں (حتی کہ جس وظیفہ یا تنخواہ پر آپ کی بسر اوقات ہوتی ہے) کبھی سوچا بھی ہے کہ اس میں کس قدر حصہ سود کا ہوتا ہے؟ سود' موجودہ نظام سرمایہ داری کا خون رگ حیات ہے۔ اس سے (اس نظام میں زندگی بسر کرنے والوں میں سے) کس کو مفر ہو سکتا ہے؟

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ نظام معیشت سراسر غیر اسلامی ہے اور سود' انشورنس وغیرہ قسم کی اسکیمیں اس نظام کا لازمی جزو ہیں۔ لہٰذا' جب تک آپ اس نظام کو گوارا کئے ہوئے ہیں' آپ کو اس شجرۃ

الذقوم کے برگ و بار کو بھی گوارا کرنا ہوگا۔

اور اگر آپ انہیں گوارا نہیں کر سکتے اور رزق حلال کے متمنی ہیں تو اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ' قرآنی نظام معیشت رائج کریں۔ لیکن اگر ہماری روش یہی رہی کہ موجودہ نظام سرمایہ داری کو تو عین مطابق اسلام قرار دیتے رہے اور اس کے برگ و بار کو حرام' (اور قرآنی نظام کی طرف دعوت دینے والوں کو مرتد قرار دے کر مطعون کرتے رہے) تو یہ فریب نفس ہے جس سے عملی مشکلات کا حل نہیں مل سکتا۔

اگست ۱۹۶۸ء

۱۳۔ مرتد کی سزا

(ہائی کورٹ کا قرآن کے مطابق فیصلہ)

ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی چلا آرہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان' اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے' تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک' "اسلام چھوڑ دینے" سے مراد یہی نہیں کہ وہ مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں کہ اس کے عقائد صحیح نہیں رہے اور اس طرح اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیں' تو اسے بھی مرتد سمجھا جائے گا اور وہ واجب القتل ہوگا۔ مودودی صاحب اس باب میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے (اپنے کتابچہ ------ مرتد کی سزا ------ میں) لکھ دیا کہ جب پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو موجودہ مسلمانوں کو نوٹس دے دیا جائے گا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر صحیح اسلامی عقائد اختیار کر لیں (یعنی وہ عقائد جنہیں مودودی صاحب "اسلامی" قرار دے دیں) ورنہ انہیں (سب کو) قتل کر دیا جائے گا۔

طلوع اسلام نے اس عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل) کے خلاف شروع سے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ یہ مسلک قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہے---- قرآن کے نزدیک' ایمان نام ہے حق و صداقت پر دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ یقین رکھنے کا۔ اس لئے اس میں مذہب کی پوری آزادی ہے۔ اگر کوئی مسلمان (بدقسمتی سے) اسلام چھوڑ کو کوئی اور مذہب اختیار کر لے گا تو وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہے گا۔ یہ چیز قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے کہ ایک غیر مسلم کو تو اجازت ہو کہ وہ جی چاہے تو غیر مسلم رہے اور جی چاہے تو اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کر لے' لیکن ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ یعنی جو مذہبی آزادی کافر کو حاصل ہے' مسلمان پر اس کے دروازے بند ہو جائیں---- ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے طلوع اسلام کے خلاف جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں' ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ مرتد کو واجب القتل قرار نہیں دیتا۔

مغربی پاکستان کی ہائی کورٹ نے چٹان پریس سے متعلق رٹ درخواست ۶ے کے فیصلہ (مورخہ ۲۲ جولائی ۶۸ء) میں' ضمناً" اس سوال کو بھی لیا ہے (کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں) اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے۔ فیصلہ کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے (واضح رہے کہ ہم اس وقت احمدیوں کے عقائد اور ان کے کفرو اسلام کے متعلق بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف فیصلہ کے اس حصہ کو سامنے لا رہے ہیں جس میں "مرتد کی سزا" کے سوال سے بحث کی گئی ہے)۔

جہاں تک ان واقعات کا تعلق ہے جس میں احمدیوں کو مرتد قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا' ہم اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مذہبی استبداد کی تاسف انگیز مثالیں ہیں اور اگر انسانی معاملات میں کوئی خوبی اور شرافت (DECENCY) باقی ہے تو انسانی ضمیر کو اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیے۔ یہ واقعات' صحیح اسلامی تعلیم اور احکام کے کس قدر خلاف ہیں' اس کی وضاحت' سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۶ میں موجود ہے جو نہایت واضح طور پر مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے ---- **لا اکراہ فی الدین** ۷ے---------- دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبرو اکراہ نہیں۔ اسی طرح (اسی سورہ کی) آیت نمبر ۶۲ میں بھی تمام اہل مذاہب کو (مذہبی) آزادی کی ضمانت دی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ------ **ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصاری والصابئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون** جو لوگ (قرآن پر) ایمان لائے اور جو یہودی کتب مقدسہ کا اتباع کرتے ہیں اور عیسائی اور صابئین--- اور جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں' ان کا اجرا ان کے رب کے ہاں ملے گا۔ ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا------ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۷۹ میں' ایک ایسا متعین حکم ہے جس کی رو سے کسی انسان کو----- حتی کہ پیغمبر کو بھی----- اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر زبردستی ٹھونسے۔ (وہ آیت یہ ہے)----- **ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربّنین بما کنتم تُعلّمون الکتب وبما کنتم**

۶ے (WRIT PETITION NO : 937 ——— 1968)

۷ے اصل فیصلہ میں صرف انگریزی ترجمہ (علامہ یوسف علی) دیا گیا ہے۔ آیات ہم نے خود درج کردی ہیں۔ ترجمہ وہی دیا گیا ہے جو فیصلہ میں درج ہے۔

تلمسون------ کسی انسان کے لئے جسے خدا نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی ہو' یہ ممکن نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے پرستار بن جاؤ- (اس کے برعکس وہ کہے گا کہ) تم اس خدا کے پرستار بنو جو سب کا پروردگار ہے کیونکہ تم نے کتاب کی تعلیم دی ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا ہے-

فکر و ضمیر کی آزادی کی ضمانت اس سے واضح تر الفاظ میں دی نہیں جا سکتی تھی-

ہم قرآن کریم کی سند و حجت کی بنیاد پر فیصلہ دینے والے ان جج صاحبان کو مستحق تحسین و تبریک قرار دیتے ہیں- کس قدر واجب الطمینان ہے یہ امر کہ مسلمان اب رفتہ رفتہ پھر سے قرآن کے قریب آرہا ہے- فالحمد للہ علیٰ ذالک !

(دسمبر ۱۹۶۸ء)

۱۴- عوام کی آواز--- خدا کی آواز نہیں ہوتی

علامہ اقبالؒ کے صاحبزادہ' ڈاکٹر جاوید اقبال نے' لاہور میں یوم اقبال کی تقریب پر' تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

علامہؒ کے نزدیک لا الہ الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنے دل و دماغ سے غیر اللہ کا تسلط ختم کر کے' صرف اللہ کی حاکمیت تسلیم کرے ... ...اللہ کی حاکمیت سے مراد عوام کی حاکمیت ہے- کیونکہ اللہ کی رضا کا اظہار ہمیشہ عامتہ الناس کی آواز کے ذریعے ہوتا ہے-

(چٹان ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ء)

یہ وہی "عامتہ الناس" کی آواز ہے جس کے متعلق خدا نے اپنے رسول سے کہا تھا کہ:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون (۶/۱۱۷)

اگر' تو دنیا میں بسنے والوں کی اکثریت کا کہنا مانے گا تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے- وہ (حق و یقین کی نہیں بلکہ) ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں اور اٹکلیں دوڑاتے رہتے ہیں-

اور جن کے متعلق' ان کے (مقرر کے) والد ماجد کا ارشاد ہے:

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

خدا کی آواز' عامتہ الناس کی آواز نہیں ہوتی- اس کی آواز صرف اس کی کتاب------ (قرآن کریم)------ میں محفوظ ہے اور اسی (کتاب) کی حاکمیت کا نام خدا کی حاکمیت ہے-

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)
جو لوگ کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں کرتے' تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔
(جون ۱۹۶۹ء)

۱۵۔ حادثوں میں مرنے والے شہید نہیں ہوتے

اگلے دنوں لاہور میں ایک بہت بڑے کاروباری کی موت حادثہ سے واقع ہو گئی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اس موت کا سبب زہر خورانی تھا۔ ان صاحب کا تعلق جماعت اہل حدیث سے تھا۔ ان کی اس حسرتناک وفات پر تبصرہ کرتے ہوئے' اخبار المنبر نے (جس کا مسلک اہل حدیث ہے) اپنی ۵/۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ:

> ..... کی رحلت کا یہ پہلو حددرجہ الم انگیز ہے کہ یہ سانحہ انتہائی تیز اثر زہر "سائناڈائڈ" کھلانے سے ہوا۔ اس واقعہ نے اس صدمہ کو کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ لیکن اس "شر" میں "خیر" کا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ توقع ہے کہ ..... سے جو غلطیاں' لغزشیں بالخصوص بعض نامناسب قسم کے کاروبار کی صورت میں رونما ہوئیں' اللہ تعالیٰ اس حادثہ کو ان کا کفارہ بنا دیں اور انہیں اپنی مغفرت تامہ سے نوازیں۔

یعنی حادثہ سے موت واقع ہو جائے تو بلیک مارکیٹنگ' سمگلنگ اور اسی قسم کی دیگر کاروباری بددیانتیاں سب معاف ہو جاتی ہیں!

قرآن کریم کی رو سے' شہید کا مرتبہ سب سے بلند ہوتا ہے' اتنا بلند کہ انہیں مردہ کہنا یا مردہ سمجھنا بھی معصیت خداوندی میں داخل ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ روایات کی رو سے' شہیدوں کے زمرے میں کون کون داخل ہو جاتا ہے۔ غور سے سنئے۔ مسلم کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ تم کن لوگوں کو شہید سمجھتے ہو؟ حاضرین نے عرض کیا کہ جو خدا کی راہ میں مارا جائے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس طرح تو میری امت میں شہداء کی تعداد بہت کم رہ جائے گی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ پھر شہید کون ہے؟ فرمایا جو خدا کی راہ میں مارا گیا وہ شہید' جو طاعون سے مرگیا وہ شہید' جو اسہال (دستوں کی وجہ) سے مرگیا وہ شہید' جو پانی میں ڈوب کر مرگیا وہ شہید' جو مکان کے گرنے سے مرجائے وہ شہید۔ اسی طرح ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ جو نمونیہ سے مرجائے وہ شہید' جو آگ میں جل کر مرجائے وہ بھی شہید' جو عورت وضع حمل سے مرجائے وہ بھی شہید۔

المنبر نے غالباً" اسی پر مستنبط کر کے' حادثہ (زہر خورانی) کی موت کو مغفرت کا موجب قرار دیا ہے؟ ہمیں ان حضرات پر نہ کوئی افسوس ہے نہ حیرت۔ تاسف اور حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس قسم کی روایات اس ذات اقدس و اعظمؐ کی طرف منسوب کر دی جاتی ہیں جس کی زبان مبارک سے یہ اعلان کرایا گیا کہ:

قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم (۶/۱۵)

اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے کسی حکم کی خلاف ورزی کروں' تو یوم مکافات سے مجھے بھی خائف رہنا ہوگا۔

غور کیجئے کہ خدا کے اس دین کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ یاد رکھئے! حادثوں سے مرنے والے شہید نہیں ہو جاتے۔ شہید وہی ہے جو دین کی محافظت میں برضاو رغبت اپنی جان دے دے۔ قرآن کی اصطلاح میں انہیں مقتولین فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ (نومبر ۱۹۶۹ء)

۱۲۔ قرآن کریم اور زمانے کے تقاضے

(ثبات و تغیر کا حسین امتزاج)

خرم ایجنسی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر (۲) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ' اس میں جناب ..... کا ایک مفید مضمون بعنوان "قرآن کی تصویر" (؟) نظر سے گزرا۔ وہاں پر انہوں نے ایک محترم بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے الحق کے یہ معنی کئے ہیں کہ حق وہ جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ لغات القرآن جلد دوم میں نے نکالی تو وہاں پر بھی یہ عبارت ملی۔ معلوم ہوا کہ محترم بزرگ سے ان کا مطلب آپ ہیں۔ یہ سطور اس شبہ کو دور کرنے کا باعث بنے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن الحق ہے اور زمانے کے تقاضے تو کبھی غلط اور کبھی درست ہوتے ہیں۔ تو غلط تقاضے قران کس طرح پورے کرے گا۔ صاحب مضمون نے کہا ہے کہ حق زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا' بلکہ زمانہ مجبور ہوتا ہے کہ حق کے مطابق چلے۔ لہٰذا' بذریعہ طلوع اسلام اس اہم بات کو واضح کر دیں۔

جواب:۔ میں نے' نہ تو سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر دیکھا ہے اور نہ ہی محولہ بالا مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن صاحب مکتوب نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے' اس کا ازالہ ضروری ہے --- ان امور کی وضاحت پہلے بھی متعدد بار کی جا چکی ہے۔ بایں ہمہ' ان کی مزید وضاحت فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔

لغات القرآن کے بارے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ میں نے اس میں کسی لفظ کے معنی اپنی طرف سے نہیں دیئے۔ تمام معانی عربی زبان (بالخصوص قرآن کریم) کی مستند کتب لغت کی رو سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے ساتھ ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں تک لفظ حق کا تعلق ہے' میں نے اس کے معانی صرف یہی نہیں دیئے کہ وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا کرتا ہے' بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ حق اپنے مقام پر محکم' اٹل اور امٹ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ حق باطل کی ضد ہوتا ہے۔ اتنی سی بات سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو چیز باطل کی ضد ہو وہ باطل کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔

امام راغب نے حق کے معانی کی ابتداء ان الفاظ سے کی ہے۔

الحق (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں' جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مثال ایسی برجستہ ہے کہ اس سے اصل مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ دیوار اپنے مقام پر محکم ہوتی ہے لیکن وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس' دروازے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اصل مقام پر محکم بھی ہوتا ہے' لیکن دیوار کی طرح جامد نہیں ہوتا۔ جب آپ اندر آنا یا باہر نکلنا چاہیں تو وہ کھل جاتا ہے اور جب آپ چاہیں کہ نہ کوئی اندر آسکے اور نہ باہر جاسکے تو وہ بند کیا جاسکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا پورا کرنا۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی نسبت سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اسے دو تین مثالوں سے سمجھئے۔

۱۔ قرآن کریم میں ہے کہ نماز سے پہلے وضو کرو۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا بیماری کی حالت میں ہو' تو وضو کی بجائے تیمم کرو۔ آپ نے دیکھا کہ بدلنے والے حالات کے مطابق قرآن کریم نے خود ہی دو الگ الگ حکم دے دیئے۔ اپنے اپنے حالات میں دونوں احکام حق ہیں۔

۲۔ قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق کہیں یہ کہا گیا ہے **فاعف عنهم واصفح**(۵/۱۳) انہیں معاف کر دو' ان سے درگزر کرو۔ اور کہیں کہا گیا ہے **واقتلوهم حيث ثقفتموهم**(۲/۱۹۱) انہیں جہاں پاؤ قتل کرو۔ یہ دو احکام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن اپنے اپنے مقام پر دونوں حق ہیں۔ جہاں حالات کا تقاضا درگزر کرنے کا ہو' وہاں درگزر کرنا حق ہے اور جہاں ان کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہو' وہاں جنگ کرنا حق کا تقاضا ہے۔

۳۔ اپنی مملکت کی سرحدوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ "امکان بھر اپنی تیاری رکھو اور سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے متعین کر کے ان کی حفاظت کرو" (۸/۶۰)۔

ظاہر ہے کہ یہاں اصل مقصد اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ جب تک یہ حفاظت گھوڑوں کے رسالوں سے ممکن تھی' یہی طریق' حق کا تقاضا تھا۔ آج کے زمانے میں یہ تقاضا توپوں' ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ اب یہ طریق اختیار کرنا حق ہے۔

۴۔ اوپر کی مثال میں ایک طریق کار (گھوڑوں کے رسالوں) کا تعین قرآن نے خود کر دیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے بیشتر احکامات ایسے ہیں' جن میں صرف ایک اصول دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کی عملی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ مثلاً" اسلامی نظام کے متعلق اس نے اصولاً" کہا ہے **وامرهم شورى بينهم**(۴۲/۳۸) یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے۔ مشاورت کا کوئی طریقہ قرآن نے متعین نہیں کیا۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ یہ طریقہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق' امت خود تجویز کرے گی۔ اور ہر وہ طریق جس سے مشاورت کا مقصد حاصل ہو جائے' حق کا تقاضا پورا کر دے گا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے انتخاب میں

مشاورت کا طریق اور تھا' آج اس کا طریقہ اور ہوگا۔ بالفاظ دیگر' جس طریق سے مشاورت کا مقصد پورا ہوگا وہ الحق ہوگا اور جس طریق سے مشاورت کی نفی ہوگی وہ باطل ہوگا۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہے کہ حق بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق باطل کا ساتھ دیتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حق ایک اصول دیتا ہے اور اس اصول پر عمل درآمد زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وقت اس اصول کو نظرانداز کر دیا جائے یا بدل دیا جائے تو وہ پروگرام باطل ہو جائے گا۔ اس کے برعکس' اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس اصول پر عمل کرنے کے لئے جو طریق کسی زمانے میں وضع ہوا تھا وہ غیر متبدل ہے اور خواہ وہ زمانے کے تقاضے پورے کرے یا نہ کرے' ہمیں اسی کے مطابق عمل کرنا ہوگا' تو یہ تصور بھی حق کے مفہوم کے خلاف ہے۔ قرآن کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو جزئی قوانین وضع اور اختیار کئے جائیں گے' جب زمانے کے حالات مقتضی ہوں' تو ان میں تبدیلی کی جا سکے گی۔ دروازہ اپنے مقام پر قائم رہے گا' حالات کے مطابق اسے بند کیا جائے گا اور جب ضرورت پڑے' کھولا جائے گا۔ اگر دروازہ جامد ہو جائے تو وہ دروازہ ہی نہیں رہتا۔ یوں اسلام کا نظام اپنے مقام پر اٹل اور محکم بھی ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ زمانے کو بے شک پھر پھرا کر قرآنی اصولوں کی طرف آنا ہے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہی ہوا جائے گا۔ اقبالؒ نے اسی کو ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے تعبیر کیا ہے۔ دروازہ کی مثال سے یوں سمجھئے کہ دین کھلنے اور بند ہونے والا دروازہ ہوتا ہے اور جب وہ بند ہو کر منجمد ہو جاتا ہے تو اسے مذہب کہا جاتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہوگی۔ میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں' لیکن یہ چیز فرصت کی محتاج اور منتظر ہے۔ (پرویز)

(جولائی ۱۹۷۰ء)

نوٹ :۔ میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب "شاہکار رسالت" باب "اسلامی نظام" میں وضاحت سے لکھا ہے۔
اس سلسلہ میں "قرآنی فیصلے" جلد اول ص ۵۰۳ ایڈیشن سوم ۱۹۹۲ء بھی دیکھئے۔

۱۷۔ "مادر وطن" کی اصطلاح غیر اسلامی ہے

طلوع اسلامی گزشتہ چوبیس سال سے اس بات کو برابر دہرائے چلا آرہا ہے کہ جب تک ہم اپنی قوم کے نوجوانوں کے دل میں اس حقیقت کو راسخ نہیں کر دیں گے کہ نہ سرزمین پاکستان عام وطنوں کی طرح ایک وطن ہے اور نہ یہاں کی مملکت عام مملکتوں کی سی ایک مملکت --- اس وقت تک یہاں کے ملی مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل نہیں مل سکے گا۔ اس سلسلے میں پرویز صاحب کا وہ مقالہ جو طلوع اسلام کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا اور ان کا وہ

خطاب' جو زیر نظر اشاعت (اکتوبر ۱۹۷۱ء) میں شائع ہو رہا ہے' خاص طور پر درخور توجہ ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہی نہیں' تاسف ہوا کہ ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء کے یوم دفاع کے سلسلے میں اکابرین ملت کی طرف سے جس قدر پیغامات' اعلانات' بیانات' خطابات' تقاریر وغیرہ فضا میں پھیلیں ان سب میں ان شہداء کو وطن کی حفاظت میں جان دینے والے کہہ کر پکارا گیا۔ کوئی بھی اس سے آگے نہ بڑھا۔ کسی نے بھی انہیں اسلام کا محافظ اوردین کا پاسبان کہہ کر نہ پکارا۔ اس سلسلے میں ایک بیان مفتی محمود صاحب کا بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ بزرگوار اپنے آپ کو بہت بڑا عالم اور اسلام کا بہت بڑا محافظ قرار دیتے ہیں۔ سنئے کہ انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے اپنے پیغام میں کہا:

> شہدائے ستمبر کو خراج عقیدت پیش کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس مادر وطن کی ناموس کی خاطر ملک کے ان جانبازوں نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کی تھی' ہم اس ناموس پر کوئی حرف نہ آنے دیں۔ (امروز' بابت ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء' ص ۶)

آپ "مادر وطن" کی اصطلاح پر غور فرمایئے۔ یہ خالص مشرکانہ تصور ہے۔ ہندوؤں کے ہاں گئو ماتا' گنگا ماتا' بھارت ماتا' دھرتی ماتا' ان کے معبودان باطل کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ تصور زمانہ قدیم کے اصنامیات کا پیدا کردہ ہے جس کی جڑ کاٹنے کے لئے اسلام دنیا میں آیا تھا۔ قرآن نے وطن کو صرف اس قدر اہمیت دی ہے کہ یہ قرآنی قوانین و احکام کی تنفیذ کا محسوس ذریعہ بنتا ہے اور اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ جس وطن میں اس کا امکان نظر نہ آتا ہو' وہاں سے ہجرت کر جانا مومن کا فریضہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا تھا اور قرآن نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جن مسلمانوں نے بلا کسی عذر کے مکہ سے ہجرت نہیں کی' ان کے ساتھ جماعت مومنین کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسلام میں وطن کی اس حیثیت کے بعد ـــــ اسے مادر وطن کہنا' بت پرستی نہیں تو اور کیا ہے۔ وطن کی یہی حیثیت تھی جسے خلاف اسلام قرار دیتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

حتی کہ انہوں نے مسلمانوں سے بڑی سختی کے ساتھ کہا کہ:

اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

ان کی زندگی کے آخری لمحات میں ان کا جو مباحثہ' (مولانا) حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ ہوا تھا' اس کا موضوع بھی یہی تھا۔ اس بحث و نزاع کا عنوان انہوں نے "معرکہ دین و وطن" رکھا تھا۔ اس میں اسلام کی رو سے وطن کا صحیح مقام متعین کیا گیا تھا۔ اس لئے ہمیں وطن کے لئے اس قسم کی اصطلاحات استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

ہم مفتی صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن و حدیث یا صدر اول کی تاریخ میں کہیں بھی اپنے ملک کو مادر وطن کہا گیا ہے۔ (اکتوبر ۱۹۷۱ء)

۱۸۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ

(انہیں اسلامی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں)

روزنامہ مساوات کی ۲۴ جنوری ۷۲ء کی اشاعت کے ایک زیر اداریہ میں' موہنجوڈارو کے آثار قدیمہ کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

> محققین کا کہنا ہے کہ مزید کھدائی سے پانچ ہزار سالہ پرانی تہذیب کے آثار ملیں گے لیکن اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی کہ سابقہ حکومتوں کو صرف اپنی کرسیوں سے دل چسپی تھی اور پاکستانی تہذیب ان کے لئے بے معنی شے ہے۔

کیا ہم مدیر مساوات سے دریافت کر سکتے ہیں کہ موہنجوڈارو سے پانچ ہزار سال پہلے کے جو آثار ملیں گے انہیں "پاکستانی تہذیب" سے کیا واسطہ ہوگا؟ یہ محض اتفاق ہے کہ تقسیم ہند کے وقت رقبوں کی جو لکیریں کھینچی گئیں' ان کی رو سے موہنجوڈارو یا ہڑپہ وغیرہ مملکت پاکستان کی حدود کے اندر آگئے۔ اگر یہ لکیریں ذرا آگے بڑھ آتیں تو یہ مقامات ہندوستان کا حصہ ہوتے۔ اور اگر آپ کا معیار یہ ہے کہ جو کچھ پاکستانی علاقہ کے اندر آگیا ہے وہ پاکستانی تہذیب کا مظہر ہے تو پھر ہندوؤں کے مندر' بدھوں کے اسٹوپے' سکھوں کے گوردوارے' جو پاکستانی حدود کے اندر آگئے ہیں' سب پاکستانی تہذیب کے مظاہر قرار پا جائیں گے!

آپ نے دیکھا کہ جب انسان کا پاؤں اپنے مرکز سے اکھڑ جائے تو پھر اس کی زندگی کا دائرہ کس طرح ٹیڑھا میڑھا ہو جاتا ہے۔ حضرت! پاکستانی تہذیب کے ڈانڈے ملانے ہیں تو بدروحنین کے ریگزاروں سے ملایئے' موہنجوڈارو اور ہڑپہ کے صنم کدوں سے نہیں۔

(مارچ ۱۹۷۲ء)

۱۹۔ وصیت کے حکم کی وضاحت

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

"کئی دن سے میں وصیت کے بارہ میں قرآنی آیات پر غور کر رہا ہوں۔ اس دوران میں میرے سامنے مفہوم القرآن بھی ہے لیکن اس سے بات واضح نہیں ہوئی' اس لئے آپ کے پاس یہ پرچہ ارسال ہے۔ امید ہے آپ اس کے جواب سے ضرور نوازیں گے۔

۱۔ آیت ۲/۱۸۰ میں آپ نے لکھا ہے کہ والدین اور اقربین کے لئے قاعدہ کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ اس آیت میں جس قاعدہ کا ذکر ہے وہ کیا ہے؟

۲۔ آیت ۲/۱۸۲ میں ہے کہ اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا'

بلکہ وہ کسی کی طرف بے جا طور پر جھک گیا ہے تو اسے چاہئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ (موص کی موت کے بعد یا پہلے) یہ وصیت بدلنے کے مترادف نہ ہوگا۔ یہاں یہ بات قابل وضاحت ہے کہ جب موص کو اختیار ہے کہ وہ جس قدر جس کو چاہے وصیت کر دے تو پھر اس کی وصیت پر یہ پابندی کیسی کہ ہر وارث یہ کہے گا کہ' موص نے ناانصافی کی ہے' اس کا فیصلہ کرایا جائے اور موص کی موت کے بعد تو یہ وصیت کو بدلنا ہی ہوگا۔

۳۔ آیت ۴/۱۱ کے آخری حصہ میں ہے کہ وصیت کے بعد جو کہ کی گئی ہو' اس جملہ کے بعد ہے کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ یا تمہاری اولاد میں سے کونسا رشتہ نفع رسانی کے لحاظ سے تم سے قریب تر ہے' اس لئے یہ حصے خدا نے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ اس آیت کے مطابق یہ گمان ہوتا ہے کہ جب ہم یہ جان ہی نہیں سکتے کہ کون شخص ہم کو زیادہ نفع رسانی کے لحاظ سے قریب تر ہے تو پھر اگر ہم وصیت کل مال کی کر دیں تو ظاہر ہے وہ ایسے شخص کے پاس پہنچ سکتی ہے جو ہم سے نفع رسانی میں دور تر ہو اور یہ قریب تر والے کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اس امر کی بھی ذرا وضاحت فرما دیجئے۔

۴۔ ۴/۱۲ آیت میں وصیت اور اس کے بعد غیر مضر کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں کہ ایسی وصیت کی جائے جو غیر مضر ہو۔ دوسرے وارثوں کے حق میں جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام مال کی وصیت ایک آدمی کے حق میں کر دے تو دوسرے تمام وارث اس وصیت کی رو سے مضرت رساں ہوئے' یعنی ان کو ضرر پہنچا۔

ان چاروں مقامات سے یہ اشکال ہوتا ہے کہ ان آیتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے بندہ کو اختیار دیا ہے کہ جس قدر اور جس کو چاہے وصیت کرے' اس پر کچھ شرطیں لگا دی ہیں جو ان مذکورہ بالا آیتوں میں مذکور ہیں۔ امید ہے آپ ان آیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں بصیرت افروز اور اطمینان بخش جواب عنایت فرمائیں گے"

جواب :۔

قرآن کریم میں ہے **کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرن الوصیۃ للوالد ین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین** (۲/۱۸۰) تم میں سے جب کسی کے سامنے موت آموجود ہو' اور وہ مال و دولت اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہو تو اس کے ذمے فرض ہے کہ وہ اپنے والدین اور دیگر اقربا کے حق میں' قاعدے قانون کے مطابق' وصیت کرے۔ ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس آیت میں وصیت کے حکم کی کس قدر شدت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے۔ پہلے کہا گیا ہے کہ **کتب علیکم** ——— تم پر فرض قرار دیا گیا ہے ——— اور آخر میں ہے **حقا علی المتقین** ایسا کرنا متقیوں پر لازم ہے ——— کیا لازم ہے؟ اپنے ترکہ کے لئے اپنے والدین اور دیگر اقربا کے حق میں وصیت کرنا۔

یہ قرآن کریم کا حکم ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ہماری موجودہ شریعت کا حکم کیا ہے؟ یہ کہ وصیت ۱/۳ ترکہ سے زائد میں جائز نہیں' اور یہ بھی والدین اور اقربا (یعنی وارثوں) کے حق میں نہیں ہو سکتی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ حکم' قرآن کریم کے اس قدر تاکیدی حکم کے یکسر خلاف ہے۔ اس حکم شریعت کی بنیاد کیا ہے؟

ایک روایت ------ کہا یہ جاتا ہے کہ روایات کے پرکھنے کے جو معیار مقرر ہیں' ان میں سب سے پہلا معیار یہ ہے کہ وہ روایت قرآن کے خلاف نہ ہو۔ یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک روایت' قرآن کریم کے اس قدر واضح اور تاکیدی حکم کے صریحاً" خلاف ہے' لیکن اسے صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوا کہ جب کسی روایت اور قرآن کریم کی آیت میں تضاد واقع ہو تو اس وقت کیا کیا جائے! آپ کہیں گے کہ اس کا جواب آسان ہے۔ روایت کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکتی' اس لئے غلط ہے۔ قرآن کا حکم اٹل ہے۔ لیکن نہیں! ارباب شریعت کا جواب یہ نہیں۔ ان کا جواب یہ ہے کہ ایسی صورت میں سمجھ لیا جائے کہ قرآن کی آیت منسوخ ہے اور روایت کا حکم' واجب التعمیل۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے :-

> نبیؐ کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت رہے اور مطابق نہ رہے تو حجت نہ رہے۔ ..... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے **کتب علیکم** ..... (۲/۱۸۰) اور رسول اللہؐ نے فرمایا **لا وصیتہ للوارث** وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اس حدیث پر رہا ہے' یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قول رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجب عمل رہا۔
>
> (فتنہ انکار حدیث از علامہ حافظ محمد ایوب مرحوم)

اس تمہید کے بعد' مذکورہ بالا خط کی طرف آیئے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جو مال کسی شخص کی ملکیت ۸؎ میں ہو' اس میں سے کوئی شخص بطور حق کچھ مطالبہ نہیں کر سکتا ۹؎۔ وہ اس مال کا مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق' جسے چاہے اور جتنا چاہے' دے دے۔ اپنی زندگی میں دے دے تو اسے اس کا بھی اختیار ہے اور اگر وہ اسے اپنی موت کے بعد دینا چاہے تو اس کے لئے وصیت کر دے۔ وصیت کرنا قرآن کی رو سے فرض ہے لیکن اگر ایسا ہو کہ کوئی شخص وصیت کر نہیں سکا یا اس کی وصیت اس کے پورے ترکہ کو محیط نہیں (COVER نہیں کرتی) تو پھر اس کی تقسیم ان حصوں کے مطابق کی جائے گی جنہیں خدا نے خود مقرر کر دیا ہے۔ اس لئے اس نے ہر حصہ کے بعد کہا ہے کہ **من بعد وصیتہ توصون بھا اودین** (۴/۱۲) یہ تقسیم' متوفی کا قرضہ ادا کرنے اور اس کی وصیت پوری کرنے کے بعد ہوگی۔ اس تقسیم کے سلسلہ میں کہا کہ اس کا اختیار لوگوں کو اس

۸؎ یعنی اسلامی مملکت اسے ایک فرد کی ملکیت قرار دے دے۔

۹؎ سائل و محروم کے حق کی بات اور ہے۔ یہ حق اسلامی مملکت کے ذمے واجب ہوتا ہے۔

لئے نہیں دیا گیا کہ متوفی تو جانتا تھا کہ کون کتنے کا مستحق تھا' لیکن دوسرے لوگ نہیں جان سکتے۔ اس لئے اگر اس تقسیم کا اختیار انہیں دے دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ اس میں ناانصافی ہو جائے۔ لہٰذا' اس کا اختیار خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ **لا تدرون ایھم اقرب لکم نفعا** (۴/۱۱) کا یہی مطلب ہے۔ یہ بات متوفی سے نہیں کہی گئی' اس کی وفات کے بعد' دوسرے لوگوں سے کہی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک' وصیت کی اہمیت کس قدر ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے صرف ایک اصولی حکم دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آیات (۱۰۸-۱۰۶/۵) میں پوری تفصیل سے بتا دیا کہ وصیت کس طرح کرنی اور لکھوانی چاہیے۔ یہ ہے وہ قاعدہ اور قانون جس کی طرف (۲/۱۸۰) میں اشارہ کیا گیا ہے (یعنی بالمعروف کہہ کر)۔

سورۂ بقرہ میں' وصیت کے متعلق حکم دینے کے بعد ہے **فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینھم فلا اثم علیہ** (۲/۱۸۲) اگر کوئی شخص دیکھے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا' بلکہ وہ کسی کی طرف بے جاطور پر جھک گیا ہے' تو اسے چاہئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ اس میں وصیت کرنے والے کے اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی نہ ہی کسی کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس کی وصیت میں تبدیلی کر دے۔ کہا صرف یہ گیا ہے کہ اگر کوئی شخص محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے شدت جذبات یا عدم علم کی بنا پر کسی ایسے شخص کو محروم کر دیا ہے یا کم دیا ہے جو اس کی امداد کا زیادہ مستحق ہے ------ اور ایسا ممکن ہے ---- تو وہ کوشش کرے کہ ان کے درمیان مصالحت ہو جائے۔ دیکھئے یہاں "مصالحت کرانا" کہا گیا ہے' اور مصالحت تو محض مشورہ ہوتا ہے۔ کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وصیت کرنے والا زندہ ہے تو اسے سمجھایا جائے اور اگر وہ فوت ہو جائے تو جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو' اس سے کہا جائے کہ بھائی! حق تو اس پر تمہارا ہی ہے لیکن تمہارا فلاں رشتہ دار بڑا محتاج ہے' کچھ اسے بھی دے دو۔ یہ وجہ ہے کہ اس آیت کے اخیر میں کہا گیا ہے کہ **ان اللہ غفور رحیم** (۲/۱۸۲) خدا چاہتا ہے کہ جو غیر محفوظ ہے اس کی حفاظت ہو جائے' اور جو محتاج پرورش ہے اسے پرورش کا سامان میسر آجائے۔ مصالحت کی کوشش سے یہی مقصود ہے۔ آیت (۴/۱۲) میں جو **غیر مضار** کہا گیا تو یا تو اس کا تعلق صرف **دین** سے ہے۔ اس صورت میں اس چیز کو صرف عدالت متعین کرے گی کہ متوفی نے جو قرض لیا تھا اس سے اس کا منشاء کسی کو ضرر پہنچانا تو نہیں تھا۔ اور اگر اس کا تعلق وصیت سے بھی ہے تو اس کی وہی صورت ہوگی جسے ہم نے اوپر مصالحت کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ اگر مصالحت کی کوشش ناکام رہے تو وصیت برقرار رہے گی۔ اس ضمن میں اس نکتہ کو پھر سے سامنے لے آنا چاہیے کہ کسی شخص کے مال میں سے دوسرا شخص اپنے حق کے طور پر کچھ مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے وصیت پر قانونی پابندی کوئی نہیں' پابندی اخلاقی ہے اور اخلاقی پابندیاں تو قرآن' مومن کی زندگی کے ایک ایک سانس پر عائد کرتا ہے۔

واضح رہے کہ وصیت یا وراثت وغیرہ کے احکام' اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب ہنوز اسلامی نظام اپنی آخری شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔ اس وقت نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت مال ہوگا نہ اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوگا۔ آپ

دیکھتے نہیں کہ قرآن نے خود وصیت کے حکم میں **ان ترک خیرا** (۲/۱۸۰) کی شرط لگا رکھی ہے' یعنی اگر وہ مال چھوڑے تو۔ اسلامی نظام میں جب کسی کے پاس زائد از ضرورت مال رہے گا ہی نہیں تو یہ حکم خود بخود ساقط ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کی مکمل صورت کا نقشہ حضور نبی اکرمؐ نے اپنی مثالی زندگی میں پیش فرما دیا تھا جب کہا تھا کہ ہمارا وارث کوئی نہیں ـــــ اور حضورؐ نے اپنے ترکہ میں کوئی مال چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ہاں! اسلامی مملکت جو کچھ کسی فرد کی ملکیت میں دے دے' وہ اسی کی ملک ہو جائے گا۔

(اپریل ۱۹۷۲ء)

۲۰۔ جمعہ کی چھٹی

پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں یہ "اہم ترین" مسئلہ زیر بحث ہے کہ ہفتہ وار تعطیل کس دن کی جائے۔ جن لوگوں کی نگاہیں ملی اور بین الاقوامی تقاضوں پر ہیں ان کی تجویز ہے کہ چھٹی حسب معمول اتوار کے دن رکھی جائے لیکن مولوی صاحبان کا ارشاد ہے کہ یہ چیز خلاف شریعت ہے۔ دین کا تقاضا ہے کہ جمعہ کے دن کاروبار بند رکھا جائے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مولوی صاحبان کا وہ کونسا دین ہے جس کا یہ تقاضا ہے' ورنہ خدا کے عطا کردہ دین میں جمعہ کے متعلق کچھ اور ہی آیا ہے۔ سورہ الجمعۃ میں ہے۔

یایھا الزین امنوا اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ و ذروا البیع ذ لکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ○ فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ ..... (۱۰-۹/۶۲)

اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن صلوٰۃ کے لئے آواز (اذان) دی جائے تو کاروبار چھوڑ دیا کرو اور اللہ کے ذکر کی طرف لپک کر آجایا کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو تو ـــــ

اور جب صلوٰۃ ختم ہو جائے تو پھر ملک میں پھیل جاؤ اور رزق خداوندی کی تلاش کرو۔

ان آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم' جمعہ کو سارا دن کاروبار بند رکھنے کا تصور نہیں دیتا۔ اس کے برعکس' وہ بتاتا ہے کہ کاروبار صرف صلوٰۃ کے وقت کے لئے بند کیا جائے گا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد 'کاروبار جاری رکھا جائے گا۔

واضح رہے کہ اس قسم کے مسائل (کہ ہفتہ میں کونسے دن کاروبار بند رکھا جائے) کا تعلق دین سے نہیں' ملی تقاضوں سے ہے۔ ہم نے جو قرآن کریم کی (مندرجہ بالا) آیات پیش کی ہیں تو وہ یہ بتانے کے لئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت کا یہ جو مطالبہ ہے کہ جمعہ کی چھٹی' دین کا تقاضا ہے' یہ غلط ہے۔ اگر انہوں نے یہ تقاضا قرآن سے ثابت کرنا

ہے تو پھر قرآنی تصریحات خود ان کے مطالبہ کے خلاف جاتی ہیں۔ اگر ہم ہفتہ میں کسی روز بھی چھٹی نہ کرنا چاہیں تو یہ بھی دین کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور اگر ہفتہ کے کسی ایک روز چھٹی کرنا چاہیں تو دین اس سے بھی نہیں روکتا۔

(اکتوبر ۱۹۷۲ء)

۲۱۔ دو قومی نظریہ ——— قوم اور امت

ہمارا دور بھی عجیب و غریب ہے۔ اس میں لوگ مسلمان ہونے کے مدعی بھی ہوتے ہیں اور اسلام کے (فروعات نہیں بلکہ) مسلمات سے انکار بھی کرتے ہیں ——— انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس انکار پر اصرار کرتے ہیں اور اپنے اس انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث بھی کرتے ہیں۔

(۲) اسلام کے بنیادی مسلمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے پوری نوع انسان کی تقسیم دو گروہوں میں کی ہے اور اس تقسیم کا معیار کفر اور ایمان ہے **هو الذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مومن** (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کفار کا ہے اور ایک گروہ مومنین کا ——— اس معیار تقسیم و تفریق کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام مسلم ایک گروہ کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسرے گروہ کے افراد۔ اسی کو (دور حاضر کی اصطلاح میں) دو قومی نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے' دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔

جب ہم اس قرآنی نظریہ تقسیم کو پیش کرتے ہیں تو اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (مثلاً") پاکستان اور افغانستان میں دو الگ الگ قومیں نہیں بستیں۔ یہ ایک ہی قوم ہے۔ اور اس سے آگے یہ کہ پاکستان اور افغانستان کیا' اس نظریہ کی رو سے' تمام مسلم ممالک میں بسنے والے افراد ایک قوم ہیں۔ اور یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ مختلف اسلامی ممالک کے مسلمان الگ الگ قومیں ہیں' اس لئے اس سے واضح ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار' ایمان کا اشتراک نہیں' وطن کا اشتراک ہے۔ لہٰذا' یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار' ایمان کا اشتراک ہے۔

آپ نے اس منطق کے صغریٰ کبریٰ پر غور فرمایا؟ وہ صغریٰ کبریٰ یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قوم سمجھتے ہیں' اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام کی رو سے معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے۔

یعنی ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی نص صریح کی رو سے' معیار قومیت کفر اور اسلام کا اختلاف ہے۔ اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ چونکہ موجودہ مسلمانوں کا عمل اس کے خلاف ہے' اس لئے یہ دعویٰ غلط ہے کہ اسلام کی رو سے معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے! ذرا اس دلیل کو آگے بڑھایئے اور دیکھئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے! قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم ..... الخ (۳۲-۳۱/۳۰)

مسلمانو! تم اسلام لانے کے بعد پھر سے مشرکین میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا' جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے۔

اور آپ اس کی تردید میں کہتے ہیں کہ نہیں! چونکہ مسلمانوں میں ہر جگہ فرقے موجود ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں فرقہ سازی شرک ہے۔

یا یہ کہ قرآن کریم میں ہے کہ :

من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' وہ کافر ہیں۔

اور آپ کہتے ہیں کہ اس وقت کوئی اسلامی مملکت بھی ایسی نہیں جہاں حکومت کتاب اللہ کے مطابق قائم ہو۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

یہ ہے منطقی نتیجہ اس دلیل کا۔ چونکہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ الگ قومیں سمجھتے ہیں اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں معیار قومیت' ایمان کا اشتراک ہے' یعنی ان حضرات کے نزدیک' صحیح اور غلط کا معیار' مسلمانوں کا موجودہ عمل ہے نہ کہ قرآن کریم کا فیصلہ۔ اس دلیل کا بودا پن کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رو سے' نوع انسان کے دو ہی گروہ ہیں' کافر اور مومن۔ سوال یہ ہے کہ اس معیار تقسیم کی رو سے ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو "گروہ" وجود میں آتا ہے اس کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :

(i) **وکذالک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (۲/۱۴۳)**

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا تاکہ تم نوع انسان کے اعمال کے نگران ہو اور رسول تمہارے اعمال کا نگران رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح سے جو امت وجود میں آئی تھی' وہ کسی خاص خطہ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی یا ساری دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس آیت میں **جعلنکم** اور **علیکم** میں (کم) کی ضمیر کا اطلاق کسی خاص وطن کے مسلمانوں پر ہوتا تھا یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں پر؟ اس میں **شھداء علی الناس** کا فریضہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا تھا یا کسی خاص خطہ ارض میں بسنے والے مسلمانوں کا! اس میں رسول کی نگرانی کسی خاص ملک کے مسلمانوں تک محدود تھی یا ساری دنیا کے مسلمان اس کے احاطہ میں آجاتے تھے! فرمایئے کہ اس میں وہ کونسا جزو تھا جو کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمانوں کو دوسرے مسلمانوں سے الگ کرتا تھا۔ اس آیت کی رو سے' خدا نے ایک امت متشکل کی تھی' امم متشکل نہیں کی تھیں۔ اس نے کہیں بھی امت عربیہ' امت مصریہ' امت ایرانیہ' امت عراقیہ وغیرہ نہیں کہا تھا۔

(ii) اس نے دوسری جگہ کہا ہے **کنتم خیر امۃ اخرجت للناس .....** (۳/۱۰۹) تم ایک بہترین امت ہو جسے

نوع انسان کی بہبود کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔ اس میں بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کنتم (تم) کی ضمیر کسی خاص خطہ زمین کے مسلمانوں کے لئے ہے یا تمام دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے! یہ جو الناس کی منفعت کے لئے امت کی تشکیل کی گئی تھی وہ کسی خاص وطن میں محصور تھی یا ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی!

(iii) قرآن کریم کہتا ہے کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر جو امت وجود میں آتی ہے' وہ مکان کے اعتبار سے ہی حدود فراموش نہیں ہوتی' زمان کے اعتبار سے بھی قیود نا آشنا ہوتی ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کسی ایک زمانے میں مختلف ممالک میں بسنے والے مومن' ایک امت کے افراد ہوتے ہیں' بلکہ اس نظریہ پر ایمان رکھنے والے دنیا میں جب اور جہاں بھی ہو گزرے ہیں' وہ سب ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس نے تاریخ کے مختلف ادوار میں' مختلف ممالک میں پیدا ہونے والے حضرات انبیاء کرامؑ کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ **ان هذه امتكم امة واحدة وانا ربكم فاعبدون** (۲۱/۹۲ : ۲۳/۵۲) یہ سب ایک ہی امت تھے اور ان کے ایک امت ہونے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوئے تھے۔ واضح رہے کہ چونکہ امت کی تشکیل اس کے نبی کی نسبت سے ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم نے جو مختلف انبیاء کرام کا ذکر کر کے انہیں امت واحدہ قرار دیا ہے تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ ان کے متبعین ایک ہی امت کے افراد تھے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی ایک خطہ زمین کے' ایک ہی زمانہ کے مومن ہی ایک امت نہیں' اس اصول کو ماننے والے' شروع سے آج تک' ایک ہی امت کے افراد ہیں۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس امت کا نام بھی شروع سے آج تک ایک ہی رہا ہے۔ **هو سمكم المسلمين من قبل وفي هذا** (۷۸/۲۲) اس نے اس سے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی یہی نام رکھا گیا ہے۔ لہٰذا' حضرت نوحؑ سے لے کر آج تک جن لوگوں نے بھی ایمان کے اشتراک کو معیار قومیت تسلیم کر لیا' وہ امت مسلمہ کے افراد قرار پا گئے' بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کس زمانے میں گزرے ہیں اور کونسے ملک میں بستے تھے۔

(iv) قرآن کریم نے انہیں امت کہہ کر ہی نہیں پکارا' وہ ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب **اخوة** (بھائی بھائی) ہیں۔ سورۂ آل عمران میں ہے کہ :

> تم حبل اللہ (کتاب اللہ) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ **فاصبحتم بنعمته اخوانا** اور یوں اپنی نعمت سے تمہیں باہمی بھائی بھائی بنا دیا۔ (۳/۱۰۲)

ظاہر ہے کہ اس رشتہ اخوت سے کسی ایک وطن کے مسلمان ہی پیوست نہیں۔ اس میں ساری دنیا کے مسلمان منسلک ہیں۔ اور یہ رشتہ' اعتصام بہ حبل اللہ (قرآن سے وابستگی) ایمان ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ **انما المومنون اخوة** (۴۹/۱۰) حقیقت یہ ہے کہ (کسی ایک خطہ زمین کے نہیں بلکہ ساری دنیا میں بسنے والے) مومن' ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اخوت کا رشتہ قومیت کے رشتہ سے کہیں زیادہ عمیق اور

مستحکم ہوتا ہے۔ یہاں یہ کہا کہ مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں جس کا مطلب واضح ہے کہ اخوت کے اس رشتہ کی بنیاد' ایمان کا اشتراک ہے۔ جو لوگ ایمان میں ان سے مشترک نہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ اس میں شامل ہونا چاہیں تو صرف ایمان لانے سے ہی ایسا کر سکتے ہیں۔ غور کیجئے عرب کے رہنے والے غیر مسلم (مشرکین قریش) اور مسلمان' وطن' نسل' رنگ' زبان کے اشتراک کے باوجود' ایک امت کے افراد قرار نہیں پا سکے۔ ان کے متعلق واضح الفاظ میں کہا گیا کہ **فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین.....(۹/۱۱)** اگر یہ اپنی موجودہ کفر کی روش سے تائب ہو کر تمہارے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ میں شریک ہو جائیں تو پھر یہ "دین میں تمہارے بھائی" بن سکتے ہیں' یعنی ان کے اور تمہارے درمیان تمام مشترک عناصر (نسل' رنگ' زبان' وطن وغیرہ کا اشتراک) انہیں تمہارا بھائی نہیں بنا سکتے------ حالانکہ ان میں سے اکثر و بیشتر خونی رشتہ کی بنا پر بھی بعض مسلمانوں کے بھائی تھے۔ یہ دین کے اشتراک کی بنا پر تمہارے بھائی بن سکتے ہیں۔

اور یہ رشتہ اخوت کسی ایک دور کے مومنین تک ہی محدود نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' یہ گزرے ہوئے زمانے کے مومنین تک کو بھی محیط ہے۔ چنانچہ قرآن نے ہر دور کے مسلمانوں سے کہا ہے کہ ان کی دعا یہ ہونی چاہئے کہ **ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان (۵۹/۱۰)** اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی مغفرت عطا فرما اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی' جو ایمان کے ساتھ ہم سے پہلے گزرے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ایمان کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہونے والی امت' کس طرح زمان اور مکان کے حدود سے ماوراء ہوتی ہے اور ان میں باہمی رشتہ قومیت ہی کا نہیں ہوتا' اس سے کہیں گہرا اخوت کا رشتہ ہوتا ہے۔

آپ یقیناً" حیران ہوں گے کہ قرآن کریم کی اس قدر واضح تعلیم کی موجودگی میں' وطنیت کو معیار قومیت قرار دینے والے "مسلمان" اپنے دعویٰ کی تائید میں دلیل کیا لاتے ہیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ قرآن نے' ایمان کے اشتراک کی بناء پر امت بنائی ہے' قوم نہیں بنائی۔ ایمان کے اشتراک سے امت وجود میں آتی ہے اور وطن کے اشتراک سے قوم۔ تحریک پاکستان کے دوران' دو قومی نظریہ کے مخالف یہی دلیل لایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان' مذہب کی بنا پر ایک امت ہیں۔ لیکن ہندوستان میں بسنے کی بنا پر' وہ اور غیر مسلم' سب ایک (ہندوستانی) قوم کے افراد ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر وہ کہا کرتے تھے کہ تمام دنیا کے مسلمان' مذہب کی بنا پر ایک امت ضرور ہیں' لیکن مختلف ملکوں کے باشندے ہونے کی بنا پر ان کی قومیتیں الگ الگ ہیں۔ اور امت اور قوم کی یہ تفریق درحقیقت مذہب اور دین کی تفریق پر مبنی ہے۔ مذہب میں واقعی یہ ہوتا ہے کہ ایک ملک کے باشندے اپنا الگ الگ مذہب رکھتے ہیں' لیکن قومیت ان سب کی ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن دین میں اس قسم کی ثنویت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثنویت سیکولرازم کی پیدا کردہ ہے۔ دین میں امت اور قوم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں متحدہ قومیت کے حامی مسلمانوں کی فریب خوردگی یا مغالطہ آفرینی کی وجہ یہ تھی کہ مغرب سے آمدہ نیشن (NATION) کے لفظ کا

ترجمہ قوم کیا گیا اور اس کے بعد کہا گیا کہ قرآن نے مسلمانوں کو جداگانہ امت قرار دیا ہے' جداگانہ قوم نہیں قرار دیا۔ مذہب کے اعتبار سے' وہ غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں۔ لیکن سیاسی نقطہ نگاہ سے' وہ اور غیر مسلم' مل کر ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ یہی وہ سیکولرازم یا ثنویت ..... (DUALITY) تھی جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ :

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا) اور زمانہ نزول قرآن میں' قوم کے لفظ نے وہ سیاسی مفہوم اختیار نہیں کیا تھا جو عصر حاضر میں مغربی تصور قومیت کی رو سے' آجکل رائج ہے (وہ تو بلکہ قوم میں عورتوں کو بھی شامل نہیں کیا کرتے تھے) لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اس مقصد کے لئے امت کا لفظ ہی نہیں قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ قرآن کریم میں ہدایت و رحمت ہے **لقوم یومنون** (۵۲/۷) ایمان لانے والی قوم کے لئے (دیگر کئی ایک مقامات پر بھی یہ الفاظ آئے ہیں)۔ اس کے برعکس' سورۂ یونس میں ہے کہ خدا کی آیات اور تنبیہات کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں **عن قوم لا یومنون** (۱۰/۱۰۱) اس قوم کو جو ایمان نہیں لاتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے مسلم اور غیر مسلم کے لئے قوم کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ پھر' ان کے لئے دو الگ الگ اصطلاحات ہی استعمال نہیں کیں بلکہ یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان میں باہمی تعلقات کس قسم کے ہوں گے۔ غور سے دیکھئے۔ فرمایا:

> **لا تجدو قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوا دون من حاداللہ ورسولہ ولو کانوا اباء ھم اوابناء ھم او اخوانھم او عشیرتھم .....(۵۸/۲۲)**
>
> تم کبھی ایسا نہیں دیکھو گے کہ جو قوم خدا اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے' وہ ان لوگوں سے دوستی کے تعلقات قائم کرے جو خدا اور رسول (یعنی اسلامی نظام) کی مخالفت کریں' خواہ وہ ان کے ماں باپ' اولاد' بھائی اور دیگر افراد خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔

یہ ہے ان دونوں قوموں میں اختلاف کی نوعیت! آپ محض اشتراک وطن کی بنا پر انہیں ایک قوم قرار دیتے ہیں اور قرآن کریم' ایمان کے اختلاف کی وجہ سے' باہمی رشتہ داریوں تک کے تعلقات بھی منقطع کر دیتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اس کے بعد' ان دو متضاد نظریات زندگی کے حامل افراد' ایک قوم کے افراد بن سکتے ہیں؟ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے' ہر غیر مسلم "خدا و رسول" (اسلامی نظام) کا مخالف ہوتا ہے۔ کافر و مومن کا ایک قوم کے افراد قرار پانا تو ایک طرف' قوم مومنین کو دعا یہ سکھائی گئی ہے کہ **فانصرنا علی القوم الکافرین** (۲/۲۸۶) ہمیں قوم کافرین پر غلبہ و نصرت عطا فرما۔ سینہ میں اس قسم کی آرزوئیں رکھنے اور ان کا اس طرح اعلان کرنے والے' غیر مسلموں کے ساتھ مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں ایک دلیل اور بھی دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ اگر ایک مومن سہواً یا نادانستہ کسی مومن

کو قتل کر دے' تو اس کی دیت (خون بہا) دی جائے گی۔ قرآن نے اس خون بہا کی ادائیگی کا طریق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ **فان کان من قوم عدو نکم وھو مومن فتحریر رقبۃ مومنۃ وان کان من قوم بینکم وبینھم میثاق .....** (۴/۹۲) اگر مقتول مومن ہو لیکن اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہاری عداوت ہے تو پھر دیت یوں دی جائے گی۔ اور اگر اس قوم سے متعلق ہو جس کے ساتھ تمہارے معاندانہ تعلقات ہیں تو پھر اس طرح ....." ۔ اس سے استدلال یہ کیا جاتا ہے کہ دیکھئے قرآن اس کا امکان تسلیم کرتا ہے کہ ایک مومن' اس قوم کا فرد بھی ہو سکتا ہے جس کے ساتھ تمہارے دشمنی کے تعلقات ہوں یا میثاقی تعلقات۔ یہ قوم بہرحال غیر مسلموں کی ہوگی۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمان' غیر مسلموں کی قوم کے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ دلیل' یونہی سمجھئے' جیسے کوئی شخص ہاتھی گزارنے کے لئے تنکوں کے پل بنائے۔ ایسا کہنے والے یہ قطعاً" بھول جاتے ہیں کہ وہ حالات کیا تھے جن میں قرآن نے ایسا کہا تھا؟ ابتدائے اسلام میں کیفیت یہ تھی کہ مختلف قبائل میں اکا دکا لوگ ایمان لے آتے تھے۔ وہ مسلمان تو ہو جاتے تھے لیکن رہتے تھے اپنے ہی قبیلہ میں۔ ان کے لئے ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں تھا۔ خود مکہ کے مسلمان اسی مکہ میں اسی قوم قریش میں رہتے تھے' اور مدینہ کے مسلمان بھی مدینہ کی مخلوط آبادی کے افراد تھے۔ یہی کیفیت مختلف قبائل میں رہنے والے مسلمانوں کی تھی۔ مندرجہ بالا آیت میں دیت کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں' وہ ایسے ہی مسلمانوں کے متعلق ہیں۔

اس کے بعد جب ایک ایسا مقام میسر آگیا جہاں اسلامی مملکت کے قیام کے امکانات روشن تھے (یعنی مدینہ) تو مکہ کی جماعت ہجرت کر کے وہاں منتقل ہو گئی۔ جب وہاں اپنی آزاد مملکت قائم ہو گئی تو جہاں جہاں بھی مسلمان بستے تھے ان سے کہہ دیا کہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ان میں بعض ایسے تھے جنہیں دشمنوں نے اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ انہیں اس حکم سے مستثنےٰ قرار دے کر کہا گیا کہ وہ انتظار کریں تا آنکہ ان کے وہاں سے منتقل کرانے کا انتظام کیا جا سکے۔ اس دوران میں ان کی ہر ممکن اعانت اور خبر گیری کا خیال رکھا جائے گا۔ یعنی یہ وہ لوگ تھے جو وہاں سے نکلنے کے لئے ہر وقت مضطرب و بیقرار رہتے تھے' لیکن بامر مجبوری ایسا کر نہیں پا سکتے تھے (۲/۲۷۳ : ۴/۹۸)۔ اور یہی تھے جنہیں وہاں سے نکالنے کے لئے آخرالامر مملکت اسلامیہ کو جنگ کا حکم دیا گیا۔(۷۵/۴)

کچھ لوگ (مسلمان) ایسے بھی تھے جنہیں ہجرت کے امکانات حاصل تھے لیکن وہ وہاں سے آنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں آپ (عصر حاضر کی اصطلاح میں) "متحدہ قومیت" کے حامی کہہ سکتے ہیں' یعنی یہ "مذہب" کی حیثیت سے تو مسلمان رہنا چاہتے تھے لیکن اپنی قومی حیثیت وطنی یا نسلی رکھنا چاہتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن کریم نے ان کے متعلق کیا کہا؟ یہ کہا کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ چاہتے یہ ہیں کہ یہ جس طرح خود دعوئ ایمان کے باوجود کافر کے کافر رہنا پسند کرتے ہیں' تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ **فلا تتخذوا منھم اولیاء حتی یھاجروا فی سبیل اللہ** (۴/۸۹) انہیں کبھی اپنا دوست نہ سمجھو تاوقتیکہ یہ وہاں کے لوگوں سے قطع تعلق کر کے تمہارے ہاں نہ آجائیں۔ اور اگر یہ

یہاں آنے کے بعد ' پھر اپنی سابقہ قومیت کی طرف پلٹنا چاہیں تو ان سے بھی اسی طرح جنگ کرو جس طرح دوسرے دشمنوں سے جنگ کی جاتی ہے (۴/۸۹)۔ اس سے ذرا آگے جا کر کہا کہ موت کے وقت ان لوگوں سے ملا کہ پوچھیں گے کہ تم ان لوگوں میں کیوں رہے' تو یہ جواب میں کہیں گے کہ ہم کیا کرتے۔ ہم مجبور تھے۔ جواب دیا جائے گا کہ تم مجبور کیوں تھے! خدا کی زمین وسیع تھی اور تمہیں نقل مکانی کے امکانات حاصل تھے۔ پھر یہ عذر کیسا؟ چنانچہ انہیں جہنم میں دھکیل دیا جائے گا (۴/۹۷)۔

ہم ان حضرات سے' جو یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کو مذہبی آزادی حاصل ہو تو وہ اشتراک وطن کی بنا پر غیر مسلموں کی قوم کا فرد بن کر رہ سکتا ہے' یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس پر غور کریں کہ جن مسلمانوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے' وہ مسلمان رہنا چاہتے تھے اور مسلمان رہنے میں انہیں کسی قسم کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر وہ کونسی بات تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں جہنمی قرار دے رہا ہے اور مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ ان سے دوستانہ تعلقات ہرگز روا نہ رکھیں' اور اگر وہ اپنی روش پر اصرار کریں تو ان سے جنگ بھی کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ (ان حضرات کے تصور کے مطابق) امت اور قوم میں فرق کرتے تھے۔ وہ امت کے اعتبار سے مسلمان رہنا چاہتے تھے' لیکن قومیت کے لئے وطن یا نسل کو معیار قرار دیتے تھے۔ یہ وہ ثنویت تھی جس کی بنا پر قرآن انہیں مسلمان ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔

یہ ہے معیار قومیت کی اہمیت قرآن کی رو سے جسے آج کل محض ایک سیاسی مسئلہ تصور کر کے درخور اہمیت ہی نہیں سمجھا جاتا۔ اب رہا یہ سوال کہ آجکل ساری دنیا کے مسلمانوں نے وطن یا نسل کو معیار قومیت قرار دے رکھا ہے۔ دین' معیار قومیت کہیں نہیں' تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے قرآن کا نہیں۔ تحریک پاکستان کا مقصود یہ تھا کہ آج جبکہ دنیا میں کہیں بھی اسلام کو معیار قومیت نہیں قرار دیا جا رہا' ایک مختصر سے خطہ زمین ہی میں سہی' ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کی بنیاد اسلام کے معیار قومیت پر ہو اور جس میں تمام فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کئے جا سکیں۔ مقصد یہ تھا کہ یہ مملکت اسلام کے احیاء کے لئے ذرۂ اولین (FIRST CRYSTAL) کا کام دے۔ جب اسلامی معیار قومی کو یہاں عملاً" نافذ کر دیا جائے تو پھر اس تجربہ کو آگے بڑھایا جائے اور رفتہ رفتہ دیگر اسلامی ممالک کو بھی اس راستے پر لایا جائے۔ منتہی اس اسکیم کا یہی تھا کہ پھر سے ساری دنیا کے مسلمان امت واحدہ (یعنی ایک قوم) کی حیثیت سے زندگی بسر کریں۔

لیکن وائے بد نصیبی کہ ہم نے ایک مملکت تو حاصل کر لی لیکن زندگی یہاں بھی قرآنی قالب میں نہ ڈھل سکی۔ ہمارے لبوں پر الفاظ تو دو قومی نظریہ کے رہے لیکن عملاً" معیار قومیت' وطن کا اشتراک ہی رہا۔ پاکستان کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایمان کے اختلاف و افتراق کی بنا پر دو قومیں نہیں بلکہ وطن کے اشتراک کی بنا پر ایک ہی قوم تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ حالت ان کی ہے جو (زبان سے ہی سہی' بہرحال) دو قومی نظریہ کے مدعی ہیں۔ جو لوگ تقسیم سے پہلے وطن کے اشتراک کی بنا پر قومیت کے قائل تھے' یہاں آکر ان کا "کفر" پہلے سے بھی زیادہ متشدد اور اجدر ہو گیا ہے یعنی وہاں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے تھے' لیکن یہاں خود مسلمانوں کو چار قومیتوں

میں تقسیم کر رہے ہیں! یا للعجب۔ یعنی ہندوستان میں وطن کے اشتراک کی بنا پر' مسلم اور غیر مسلم ایک قوم' اور یہاں اسی اشتراک وطن کے باوجود' خود مسلمانوں کی چار قومیتیں! اور اس پر اصرار یہ کہ یہ عین مطابق اسلام ہے۔ مطابق اسلام تو ایک طرف' یہ تو خود ان کے نظریہ قومیت کے بھی مطابق نہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ایک ملک کے باشندے ایک قوم تو قرار پاتے ہیں۔ اپنی اس روش (چار قومیتوں) کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اسلام مسلمانوں کو امت واحدہ قرار دیتا ہے' واحد قوم نہیں قرار دیتا۔ مسلمان خواہ چار چھوڑ' چار سو قوموں میں بھی منقسم ہو جائیں' ان کی امت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے کہ یہ "امت کی وحدت" ہے کیا بلا جو اختلاف قومیت کے باوجود بدستور قائم رہتی ہے اور اس کا عملی ماحصل کیا ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ اگر ایک مومن کسی دوسرے مومن کو عمداً" قتل کر دے تو وہ سیدھا جہنم میں چلا جاتا ہے۔ یہ تھا وحدت امت کا عملی نتیجہ۔ اب حالت یہ ہے کہ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک کے مسلمانوں کا بلا دریغ قتل عام کرتے ہیں' بلکہ ایک ہی ملک کے مسلمان' نسلی' صوبائی' لسانی حتی کہ سیاسی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں' اور اس کے باوجود ان کے امت واحدہ ہونے کے "عقیدہ" پر کوئی حرف نہیں آتا۔

یاد رکھیے! آج کی اصطلاح میں جو مفہوم لفظ قوم (نیشن) کا ہے قرآنی اصطلاح میں وہی مفہوم لفظ امت کا ہے جب اسے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک امت (یعنی ایک قوم) قرار دیتا ہے اور جغرافیائی یا نسلی اور لسانی اختلافات ان کے ایک قوم ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتے۔ اس اعتبار سے امت اور قوم میں فرق کرنا خلاف اسلام ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمان مختلف ممالک میں آباد تھے۔ ان کی نسلیں بھی الگ الگ تھیں اور زبانیں بھی جدا جدا۔ حتی کہ ان کا "کلچر" بھی ایک دوسرے سے الگ تھا۔ لیکن اس کے باوجود' وہ سب ایک قوم (امت) کے افراد تھے۔ ان کی قومیتیں مختلف نہیں تھیں۔ جو حضرات آج کل جغرافیائی یا نسلی' لسانی یا صوبائی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کو الگ الگ قومیں قرار دیتے ہیں' انہیں اس سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن ان کی خدمت میں اتنا تو عرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی اخلاقی جرات پیدا کریں کہ اپنے اس تصور یا عمل کے متعلق اعتراف کریں کہ یہ خلاف اسلام ہے۔ کسی نظریہ یا عمل کے خلاف یا مطابق اسلام ہونے کے لئے کوئی خارجی معیار ہونا چاہیے اور مسلمانوں کے لئے وہ معیار کتاب اللہ کے سوا اور کونسا ہو سکتا ہے۔ کتاب اللہ کی رو سے ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی قوم میں کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کے مسلمات میں سے ہے۔

(جولائی ۱۹۷۳ء)

۲۲۔ سیکولر نظام کسے کہتے ہیں؟

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں سیکولر حکومت کی اصطلاح عام ہو رہی ہے لیکن اس کا کوئی متعین

مفہوم سامنے نہیں آتا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ اس کا ترجمہ عام طور پر لادینی حکومت کیا جاتا ہے۔ لیکن سیکولرازم کے حامی کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ سیکولر حکومت میں خدا یا مذہب کا انکار نہیں ہوتا۔

کیا آپ بتائیں گے کہ سیکولر حکومت سے کیا مراد ہے اور دینی حکومت سے کس طرح مختلف ہوتی ہے؟

طلوع اسلام

قرآنی نقطہ نگاہ سے ایک مملکت وہ ہے جس میں جملہ کاروبار حکومت' خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام پاتا ہے۔ یہ وہ نظام حکومت تھا جسے قائم کرنے کے لئے حضورؐ نبی اکرمؐ سے ان الفاظ میں کہا گیا تھا کہ **فاحکم بینھم بما انزل اللہ** (۵/۴۸) ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔ اس نظام میں انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی کتاب اللہ کی حدود سے باہر نہیں رہتا۔ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہوتی ہے۔ اسے اسلام کے عقیدۂ توحید پر مبنی دینی ریاست کہا جاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے یہ تھیاکریسی سے بھی مختلف ہوتی ہے۔

(۲) دوسرا نظام حکومت وہ ہے جس میں کتاب اللہ تو ایک طرف' خدا کا نام تک بھی نہیں آنے پاتا۔ یہ کافرانہ نظام ہوتا ہے جس کے متعلق کہا کہ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون** (۵/۴۴) جو ماانزل اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ اشتراکی حکومتوں کا یہی نہج ہوتا ہے کیونکہ مارکس کے فلسفہ کی بنیاد خدا کے انکار پر ہے (اگرچہ سردست وہ' بنا بر مصلحت' مسلمانوں کو نماز' روزہ وغیرہ کی اجازت دے دیتے ہیں)۔ اسے سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اس کی ایک قسم ہے۔ اس کی دوسری قسم کا ذکر آگے آتا ہے۔

(۳) تیسری قسم کا نظام حکومت وہ ہے جس میں مذہب پرست لوگوں کو اعتقادات' عبادات اور پرسنل لاز اپنی مرضی سے اختیار کرنے کی اجازت ہوتی ہے' لیکن امور مملکت میں مذہب کو دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔ اسے مذہب اور سیاست کی ثنویت (DUALISM) کہا جاتا ہے۔ قرآن اسے مشرکانہ انداز حکومت قرار دیتا ہے' یعنی زندگی کے ایک دائرہ میں خدا کو ماننا اور دوسرے دائرہ (سیاست) میں انسانوں کو صاحب اختیار (AUTHORITIES) تسلیم کرنا۔ سورۂ زمر میں ہے۔

> **واذا ذکر اللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لا یومنون بالاخرۃ واذا ذکر الذین من دونہ اذا ھم یستبشرون** ○ (۳۹/۴۵)
>
> جب ان سے خدائے واحد کا ذکر کیا جاتا ہے (یعنی کہا جاتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں صرف خدا کے احکام کا اتباع کرو) تو جو لوگ آخرت کے منکر ہیں' انہیں یہ بات بے حد ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب خدا کے علاوہ اوروں کو بھی ساتھ شامل کر لیا جاتا ہے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

یہ ہے توحید کے مقابلہ میں ثنویت کا شرک۔ مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ تم ایسا نہ کرنا۔ تمہارا دعویٰ یہی ہونا

چاہیے کہ :

قل اللھم فاطر السموت والارض علم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک فی ما کانوا فیہ یختلفون (۳۹/۴۶)

اے اللہ ! تو فاطر ارض و سما ہے' عالم الغیب والشہادۃ ہے اور تجھے اور صرف تجھے یہ حق اور اختیار حاصل ہے کہ جن امور میں انسان اختلاف کریں' ان میں فیصلہ کرے۔

ثنویت کا نظام جسے قرآن نے مشرکانہ انداز حکومت کہا ہے' آجکل کی جمہوریت میں رائج ہے۔ وہ اسے سیکولر کہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ سیکولر نظام دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس میں خدا کا نام تک نہیں آنے پاتا اور دوسرا وہ جس میں مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے' لیکن کاروبار مملکت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق طے پاتا ہے۔ اس دائرہ میں خدا کو دخیل نہیں ہونے دیا جاتا۔ قرآن کریم کی رو سے سیکولر نظام دونوں قسم کے باطل ہیں' یعنی کافرانہ بھی اور مشرکانہ بھی۔ لیکن چونکہ شرک کو بھی سنگین ترین جرم (ظلم عظیم ۳۱/۱۳) قرار دیتا ہے' اس لئے وہ سیکولر نظام جس میں صرف "مذہبی" آزادی ہوتی ہے اس کے نزدیک سب سے زیادہ مردود قرار پاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کافرانہ سیکولر نظام میں مسلمانوں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا لیکن مشرکانہ سیکولر نظام میں مسلمانوں کو مطمئن کرا دیا جاتا ہے کہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے اور یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ یہی وہ فریب خوردگی یا فریب آفرینی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ :

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض (۲/۸۵)

کیا تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم کتاب کے ایک حصہ (اعتقادات' عبادات' شخصی قوانین) پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ (متعلقہ امور مملکت) سے انکار کرتے ہو۔

فما جزاء من یفعل ذالک منکم الا خزی فی الحیوۃ الدنیا ویم القیمۃ یردون الی اشد العذاب وما اللہ بغافل عما تعملون (۲/۸۵)

یاد رکھو ! تم میں سے جو ایسا کرے گا' تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگا اور قیامت میں بھی شدید ترین عذاب میں مبتلا۔ خدا تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

یہ ہے وہ نظام ہے جس میں مسلمانوں کی حالت وہ ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ :

وما یومن اکثر ھم باللہ الا وھم مشرکون (۱۲/۱۰۶)

وہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود مشرک رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ سیکولر نظام جسے ہندوستان میں ہندو قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس' تحریک پاکستان کا مطالبہ دینی نظام کے

قیام کے لئے جداگانہ مملکت کا تھا۔ ہمارے نیشنلسٹ علماء کرام وہاں' ہندو کی تائید و حمایت کرتے تھے اور تحریک پاکستان کی مخالفت۔ یہی حالت دوسرے قومیت پرست مسلمانوں کے لیڈروں کی تھی' یعنی یہ سب سیکولر نظام کے داعی تھے۔ یہی وہ لیڈر ہیں جو پاکستان میں بھی سیکولر نظام کے لئے کوشاں ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن اسی نظام کا حامی تھا جس کے لئے اس نے پاکستان سے علحدگی اختیار کرلی۔ اب بقیہ حصہ ملک میں بھی ایسی سیاسی جماعتیں ہیں' جن کے منشور میں سیکولر نظام کے قیام کا مطالبہ شامل ہے۔ اور اس دور کے نیشنلسٹ علماء (جو یہاں آگئے ہیں) یا ان کے متبعین اور عقیدت مند' ان کی تائید کرتے ہیں۔ جو مذہب پرست بظاہر سیکولر نظام کے مخالف ہیں اور اقامت دین کی تحریک کے مدعی' یہاں تھیاکریٹک نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں نظام حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ماانزل اللہ کے مطابق قیام حکومت ان میں سے کسی کا بھی مطالبہ یا نصب العین نہیں۔ جہاں تک مملکت پاکستان کا تعلق ہے' اس نے نظری اور آئینی طور پر تو اپنے دینی ہونے کا اعلان کر رکھا ہے' لیکن عملاً" یہاں بھی ہنوز سیکولر نظام ہی رائج ہے۔ پاکستان تو ایک طرف' کتاب اللہ کی حکومت اس وقت دنیا میں کہیں بھی نہیں ۔

مغرب رَ تو بیگانہ' مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم' نقش دگر انگیزی

(ستمبر ۱۹۷۴ء)

۲۳۔ مسجد اقصیٰ سے کونسی مسجد مراد ہے

سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے :-

سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی..... (۱/۱۷)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:-

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کو لے گئی۔

اس آیت میں مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے جب حضورؐ پہلے مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

میں نے مفہوم القرآن میں لکھا کہ یہ درحقیقت واقعہ ہجرت کا بیان ہے اور اس میں مسجد اقصیٰ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس پر (حسب عادت) شور مچا دیا گیا اور اس کے خلاف دلیل یہ دی گئی کہ یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے' متقدمین میں سے (غالباً") کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ

دلیل ہی بے معنی ہے۔ صحیح بات صحیح ہے خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ کہی گئی ہو۔ اور غلط بات غلط ہے' خواہ اسے ہزار بار ہی کیوں نہ دہرایا گیا ہو (میں نے اس کے بعد اپنی کتاب "شاہکار رسالت" میں موجودہ مسجد اقصیٰ کی تاریخ بھی بیان کر دی تھی)۔

اگلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مجھے مولانا عنایت اللہ اثری (وزیر آبادی - ثم گجراتی) کی کتاب "حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر (حیرت اور) خوشی ہوئی کہ اس میں انہوں نے اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے میں نے مفہوم القرآن میں لکھا تھا۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مجھے مولانا صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن اس کا مجھے علم ہے کہ وہ فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم ہیں۔ ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو' واقعی باعث تعجب (اور چونکہ وہ مفہوم میرے نزدیک قرآن کے منشا کے مطابق ہے' اس لئے وجہ حیرت) ہے۔ مولانا صاحب اگر بقید حیات [۱۰] ہوں (خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور خدا ان کی عمر دراز کرے) تو وہ میری طرف سے اس تحقیق اور حق گوئی کی جرات پر ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔ ان کی تحقیق کے ضروری مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن

(از مولانا عنایت اللہ اثری' وزیر آبادی' گجرات' شائع کردہ اپریل ۱۹۵۵ء)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ **سبحان الذی اسری بعبدہ ..... عبد شکورا** (بنی اسرائیل ۱۷)

اللہ رحمٰن و رحیم کا نام لے کر پڑھو۔ چرچا کرو (اور) وعدہ خلافیوں اور غلط پیش گوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرو تاکہ وہ اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام سے (جو کہ اس کی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی طرف کسی نہ کسی رات روانہ کر دے گا جو کہ یہاں سے بہت دور ہے اور کہ تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے اس کے اردگرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقہ اسلام دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے وہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے کہ اس کے توسط سے اب تک ہماری وہ آیتیں جو کہ پیشگوئیوں سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور اس کے مخالف سب ناکام ہوں گے' ہم انہیں صاف طور پر پورا کر کے دکھا دیں اور مخالفوں کی طرف سے جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ فلاں فلاں پیش گوئی پوری نہیں ہوئی' اسے اللہ پاک سنتا رہا ہے اور جو کسی پیش گوئی کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا تاکہ وہ پوری نہ ہو سکے' اسے اللہ دیکھتا رہا۔ اب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ روانہ کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح پر موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے توسط سے بھی ہم نے فرعونی ناکامی اور موسوی کامیابی کی بابت بھی بہت سی پیش گوئیاں شائع فرمائیں جن کا ذکر اسی سورۃ میں آگے چل کر آ رہا ہے۔ جب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے

[۱۰] وہ بحمد اللہ زندہ ہیں (۱۹۸۶)۔

مصر چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا جہاں پر اسرائیلیوں کو ہماری دی ہوئی کتاب پر آزادانہ طور پر عمل کا موقع ہاتھ آیا کہ وہ اللہ پاک کے سوا کسی دوسرے کی طرف مائل نہ ہوں۔ قبل ازیں اسی طرح پر نوح علیہ الصلوۃ والسلام کی پیش گوئیاں بھی کہ وہ اور ان کے اعوان و انصار کامیاب اور دشمن سب ناکام ہوں گے' پوری ہوئیں کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر بچایا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ پھر بعد میں بچے ہوئے لوگوں کا سلسلہ نسل چلا۔ اور آج ہم تمہیں اس بندۂ شکر گزار کی سنت پر دعوت دے کر شکر گزاری کے لئے خطاب کر رہے ہیں (صفحہ ۱۱۱- ۱۱۳)۔ ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً" اس اسراء نبویؐ کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور صحیح حدیثوں میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اس آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان حدیثوں کو بیان فرمایا ہے مگر متون حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی حدیثوں میں ذکر ہے اور جو کتب زرائد میں قتادہ اور زربن جیش سے مقطوعاً" اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور ابو ہریرہ سے موقوفاً" اور ابو سعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے مرفوعاً" اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مسترد نہیں کہ وہ قرآنی لفظوں کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے۔ علاوہ اس کے اسراء کی جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہاب کا ذکر ہے' ان میں آپ کے ایاب کی بھی تصریح ہے مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اس میں واپسی کا کوئی ذکر کیا' اشارہ تک بھی نہیں (صفحہ ۱۱۴)۔

(سورۂ الانفال میں جو عدوۃ الدنیا اور عدوۃ القصویٰ کا ذکر آیا ہے' اس پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ) بدا کہ سے قصویٰ ہوا اور جب یہ قصویٰ ہے تو مدینہ بالادلیٰ قصویٰ ۱۱؎ ٹھہرا اور اس کی مسجد (نبوی) اقصیٰ ہوئی۔ بلکہ وفاء الوفا جلد نمبرا صفحہ ۱۶ میں مطالع وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا اقصیٰ بھی ہے (ص ۱۲۱)۔ صحیح بخاری (پارہ ۱۵ صفحہ ۴۷۶) میں ہے کہ مسجد نبویؐ جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری (پارہ ۱۵ صفحہ ۴۷۷) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ رسول ۱۲؎ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ پر اسعد نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اور وفاء الوفاء (جلد ا' صفحہ ۲۳۲) میں بحوالہ ابن اسحق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبویؐ کی جگہ میں اسعد بن زرارہ پنج وقتہ نماز پڑھتے اور پڑھایا کرتے تھے بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پر ہی نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی جو کہ آج تک مسجد نبوی کے نام سے موسوم

۱۱؎ (حاشیہ از مصنف) یہ عجیب بات ہے کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت طے فرمایا وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر مسجد نبویؐ کی جگہ میں بحکم خداوندی بیٹھ گئی اور اس کا نام قصویٰ (قصواء) قرار پایا۔ (زاد المعاد۔ عمدۃ القاری۔ وفاء الوفاء)۔ (اسی قصویٰ پر حضورؐ نے بڑے بڑے اہم سفر طے فرمائے)۔

۱۲؎ ان مقامات پر اردو ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں۔ (طلوع اسلام)

ہے۔ اور جہاں پر مسجد قبا تعمیر ہوئی' وہاں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالم تھے اور خطیب مصعب تھے..... فتح الباری (پارہ ۱۵ صفحہ ۴۷۶) میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں پر تبلیغ و اشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے وہاں پر مسجد بنا کر نماز شروع کر دی گئی (صفحہ ۲۴۴-۱۲۲)۔

(اس کے بعد محترم مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جو آیا ہے **ولیدخلوا المسجد کما دخلوہ اول مرۃ** (۱۷/۷) تو اس المسجد سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے بدلائل و براہین واضح کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مسجد اقصیٰ نہیں جس کا ذکر آیت اسریٰ میں آیا ہے۔ جس مسجد کا ذکر آیتہ اسریٰ میں آیا ہے اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجد اقصیٰ بعد میں رکھا گیا تھا (صفحہ ۲۴۴ - ۱۲۵) -

---

مولانا صاحب نے اپنے مقالہ میں اسریٰ کا ترجمہ "لے گیا" کے بجائے "لے جائے گا" (روانہ کر دے گا) کیا ہے' یعنی ماضی کے بجائے مستقبل ---- اس کی تائید میں بھی انہوں نے دلائل دیئے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

(پرویز)

(جنوری ۱۹۷۵ء)

۲۴۔ حج بدل کی حیثیت

ہم سے پوچھا گیا ہے کہ حج بدل کی حیثیت کیا ہے اور اگر اسے کسی فوت شدہ کی طرف سے ادا کیا جائے تو کیا اسے اس سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے؟

طلوع اسلام

حج بدل کا قرآن کریم سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ ہمارے ہاں کے مروجہ عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔ باقی رہا مردہ کو اس سے کچھ فائدہ' تو حج بدل ہی نہیں' جو کچھ بھی مردے کے لئے ہمارے ہاں کیا جاتا ہے اس سے اسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اسے فائدہ انہی اعمال سے ہوتا ہے جو اس نے خود کئے ہوں۔ **لا تزر وازرۃ وزر اخری** (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ خدا کے قانون مکافات کا واضح اور اٹل فیصلہ ہے۔

(جون ۱۹۷۵ء)

(اس کی تفصیلی تشریح باب ہفتم میں آچکی ہے)

۲۵۔ نفلی حج یعنی دوسرے حج کی شرعی حیثیت

سال رواں کے لئے حج کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے' وزیر امور مذہبیہ' محترم کوثر نیازی صاحب نے بتایا کہ اس بار نفلی حج کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ اقدام زرمبادلہ کی بچت کے پیش نظر کیا جا رہا ہے۔

(نوائے وقت' بابت ۷۶۔۷۔۱۹)

تمہیداً" یہ وضاحت ضروری ہے کہ مروجہ احکام شریعت کی رو سے' پہلی بار کا حج "فرض" قرار دیا جاتا ہے' اور اس کے بعد کا حج "نفلی" ——— نیازی صاحب نے نفلی حج پر پابندی کی وجہ "زرمبادلہ کی بچت" بیان کی ہے۔ لیکن اسلامی ممالک کے بعض علماء کے نزدیک ایسی پابندی شرعاً" ضروری ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس موضوع پر ہمیں کچھ عرصہ پہلے محترم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۷۵ء میں راقم نے علمائے الجزائر کا ایک فتویٰ پیش کیا تھا جس میں یہ فیصلہ درج تھا کہ حج کے دنوں میں چونکہ سخت اژدھام ہوتا ہے اور قربانی کرنے والے کو اپنے قربانی کے جانور کا علم تک نہیں ہوتا اور پھر اس کا گوشت عام طور پر ضائع ہو جاتا ہے' اس لئے اگر قربانی کے جانور کے بجائے اس کی قیمت خیرات میں دے دی جائے تو جائز ہے۔ یہ فتویٰ دراصل وہاں کے مشہور عالم دین علامہ بشیر الابراہیمی مرحوم نے دیا تھا جس کی تصدیق بعد میں الجزائر کے علماء کی مجلس نے کر دی۔ الجزائر والے حجاج اپنے علماء کے اس فتویٰ پر کئی سالوں سے عمل کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر دوسرے حجاج پر بھی پڑنا تھا۔ چنانچہ جب اس فتویٰ کا دائرۂ اثر پھیلنا شروع ہوا' تو رابطۃ العالم الاسلامی' مکۃ المکرمہ' نے اس کا نوٹس لیا اور اپنے سترہویں سالانہ اجلاس میں علمائے الجزائر کے مذکورہ بالا فتویٰ کو رد کر دیا۔ ہمارے ہاں علمائے الجزائر کا فتویٰ طلوع اسلام کے سوا کہیں شائع نہیں ہوا۔ لیکن رابطۃ العالم الاسلامی نے اس کی جو تردید کی تو اس کی خوب خوب پبلسٹی کی گئی اور ہمارے ملک کا شاید ہی کوئی اخبار یا رسالہ ایسا ہو جس نے اسے نقل نہ کیا ہو۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔

حج کے بارے میں علمائے الجزائر نے مذکورہ بالا مسئلے کے بارے ہی میں فتویٰ نہیں دیا تھا' اس کے ساتھ ایک دوسرا مسئلہ بھی تھا اور وہ نفلی حج کی شرعی حیثیت کے بارے میں تھا کہ موجودہ حالات میں اس کا ادا کرنا کہاں تک جائز ہے۔ کیونکہ فرض حج ادا کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ آسانی اور سہولت سے یہ فریضہ ادا نہیں کر سکتے' تو نفلی حج میں شمولیت' فرض حج والوں کے لئے رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ نفلی حج والے تو کئی کئی حج ادا کر لیتے ہیں اور فرض ادا کرنے والوں کو اپنا فریضہ ادا کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

بنا بریں' جس طرح قربانی کے جانور کے بارے میں علمائے الجزائر نے یہ فتویٰ دیا کہ اس کی قیمت خیرات میں دے

دینا جائز ہے' اسی طرح نفلی حج کے بارے میں بھی انہوں نے یہ رائے دی کہ اس پر ہونے والے اخراجات نیکی کے دوسرے کاموں پر خرچ کر دیئے جائیں تو وہ نفلی حج سے افضل ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں میں بھی الجزائر میں تھا۔ ہم جمعہ کی نماز کے لئے الجزائر کی مشہور تاریخی مسجد کتشاوہ میں جمع تھے۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چنانچہ ایک صاحب علم نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے نفلی حج کے سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ فرض نماز ادا کرنے والوں سے اس طرح بھری ہوئی مسجد میں کوئی "نیک بخت" زبردستی گھس کر نفل نماز ادا کرنا چاہے یا کسی فرض نماز پڑھنے والے کو نکال کر اس کی جگہ پر نفل نماز ادا کرے' تو اس بارے میں شریعت اسلامی کا یہی فیصلہ ہوگا کہ ایسا کرنے سے یہ شخص گناہ کا مرتکب ہوگا ---------- سرمایہ دار حضرات اس سلسلے میں یہی کچھ کر رہے ہیں اور علماء حضرات نے انہیں کبھی اس زیادتی پر ٹوکا نہیں۔ یہ حضرات اپنے زائد سرمائے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کو ان کے فرض سے روکنے کا موجب بن رہے ہیں' جو بہرحال نیکی شمار نہیں ہوگی۔ اس کے بجائے اگر وہ نفلی حج پر خرچ ہونے والی یہی رقم اللہ کی راہ میں نیکی کے دوسرے کاموں پر خرچ کریں تو عنداللہ ماجور ہوں گا۔

رابطہ العالم الاسلامی نے اس فیصلے کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار اسی قرار داد (نمبر ۲۳) میں کیا جس میں اس نے قربانی کے متعلق الجزائر کے موقف کو مسترد کیا تھا۔ قرار داد کی جز (ب) میں قربانی کے بارے میں یہ فیصلہ تھا اور اس سے چند سطور آگے' بلکہ بالکل متصلاً" جز (ج) میں نفلی حج کے بارے میں علمائے الجزائر کے مذکورہ بالا فیصلے کی تائید کی گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسی مصلحتیں تھیں کہ ہمارے علماء حضرات نے آدھی بات (یعنی قربانی کے متعلق) نقل کر کے اس کے دوسرے حصّہ پر پردہ ڈال دیا۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ (عربی عبارت حذف کر کے ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے)۔

> (ترجمہ) حج ان ارکان اسلام میں سے ہے جو ساری عمر میں صرف ایک دفعہ فرض ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو زائد حج ادا کیا جائے گا وہ نفل شمار ہوگا۔ نیکی اور تقرب الٰہی کے حصول کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں اور یہ نیکیاں صرف حج یا عمرہ ادا کرنے تک محدود نہیں۔ جس نے ایک دفعہ یہ فرض پورا کر لیا یا اس کے بعد نفلی حج بھی ادا کیا ہے' اگر وہ آئندہ اس نیت سے مزید نفلی حج پر جانے سے باز رہے گا کہ اس کے ان مسلمان بھائیوں کو موقع مل سکے جنہوں نے ابھی تک اصل فریضہ ادا نہیں کیا اور اس کے نہ جانے سے وہ سہولت اور آسانی سے یہ عبادت سرانجام دے سکیں' تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بہت بڑا اجر دے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علمائے الجزائر اور رابطہ العالم الاسلامی کے فیصلوں کا نتیجہ ایک ہی ہے' صرف الفاظ کا معمولی سا فرق ہے۔ علمائے الجزائر کے نزدیک فرض عبادت میں نفل عبادت کے ذریعے خلل ڈالنے والا گنہگار ہوگا۔ رابطہ والوں نے بھی یہی بات کہی ہے لیکن الفاظ ذرا نرم استعمال کئے ہیں' کہ اگر نفلی حج والا فرض حج والوں کی سہولت و آسانی کے لئے

اس نفلی عبادت سے باز رہے، تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے اجر عظیم ملے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس اجر عظیم کو چھوڑ کر نفلی حج پر اصرار کرے گا تو وہ ضرور گنہگار ہوگا۔

نفلی حج کے متعلق آپ نے ارباب شریعت کا فیصلہ ملاحظہ فرما لیا۔ ہم وزارت امور مذہبیہ سے گزارش کریں گے کہ انہوں نے نفلی حج پر جو پابندی محض زرمبادلہ میں بچت کے لئے عائد کی ہے' اسے اس شرعی فیصلہ کی رو سے عائد کریں۔ یہ پابندی مستقلاً" ہوگی' ہنگامی نہیں ہوگی اور قوم کے بیشتر اجتماعی مفاد کا موجب۔

واضح رہے کہ دین کے نظام میں تو حج کی حیثیت اور اہمیت ہی کچھ اور ہے۔ لیکن اس وقت حج ایک "مذہبی فریضہ" کے طور پر ادا کیا جاتا ہے' اس لئے ہماری اگلی گفتگو کا تعلق اسی سے ہے۔

(دسمبر ۱۹۷۶ء)

۲۶۔ فطرانہ کی شرح کیا ہے؟

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے چاہا کہ معلوم کروں کہ شریعت کی رو سے امسال ہمیں فطرانہ کے پیسے کتنے دینے چاہئیں۔ اتفاق سے میں نے اخبار میں ایک خبر دیکھی جس کا عنوان تھا "فطرے کی رقم"۔ خوش ہوا کہ سوال کا جواب گھر بیٹھے مل گیا۔ لیکن اس کے نیچے جو کچھ لکھا ہوا ملا وہ یہ تھا۔

"فطرے کی رقم"

فطرہ نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرنا چاہئے۔ فطرے کی رقم اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق سوا دو سیر گندم کی قیمت کے برابر ہونی چاہیے' جس کا اندازہ ایک روپیہ ۲۵ پیسہ لگایا گیا ہے۔ اہل حدیث کے عقیدے کے مطابق پونے تین سیر گندم کی قیمت کے برابر فطرہ ادا کرنا چاہئے۔ رقم کے متعلق اہل حدیث علماء نے یہ مشورہ دیا ہے کہ جس قیمت پر گندم آپ خرید کرتے ہوں اسی حساب سے پونے تین سیر گندم کی قیمت ادا کریں۔ ناظم جمعیت اہل حدیث مولانا ابوبکر غزنوی نے مشورہ دیا ہے کہ احتیاطاً" ڈیڑھ روپیہ فی کس ادا کیا جائے۔ شیعہ علماء نے فطرے کی رقم دو روپے مقرر کی ہے۔

یعنی اہل سنت کا حکم یہ ہے کہ فطرے کی رقم سوا روپیہ ہے۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں! یہ رقم (اہل حدیث کی شریعت کے مطابق) ڈیڑھ روپیہ ہے اور شیعہ حضرات کے فیصلے کے مطابق دو روپے فی کس ـــــ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ ہمارے مذہبی پیشوا حضرات ایسی چھوٹی سی بات پر بھی متفق فیصلہ نہیں دے سکتے۔ کیا یہ کسی بات پر متفق ہوتے بھی ہیں؟

طلوع اسلام

آپ تو ایک فطرے کی رقم پر اختلاف کو دیکھ کر ہی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آپ نگاہ کو ذرا دور لے جاتے تو دیکھتے کہ وہاں کیا کیا نظر آتا ہے۔ روزہ کس وقت کھولنا چاہئے' اس میں اختلاف۔ تراویح کی رکعت کتنی ہیں' اس میں اختلاف۔ عید کی نماز کا وقت کونسا ہے' اس میں اختلاف۔ نماز عید مساجد میں پڑھنی چاہئے یا کھلے میدان میں' اس میں اختلاف۔ نماز عید کی زائد تکبیریں کتنی ہوتی ہیں' اس میں اختلاف۔ ہاتھ باندھنے میں اختلاف' آمین کہنے میں اختلاف۔ غرضیکہ قدم قدم پر اختلاف۔ کوئی جزئی سا معاملہ بھی ایسا نہیں جس میں یہ حضرات متفق ہوں۔ ہاں! ایک بات ضرور ایسی ہے جس میں یہ متفق ہو جاتے ہیں اور وہ ہے اس شخص کے خلاف کفر کا فتویٰ لگانا جو ان اختلافات کو مٹانے کے لئے انہیں قرآن کی طرف دعوت دے۔ اور یہ اس لئے کہ اگر یہ اختلافات مٹ جائیں تو ان کی مختلف دکانیں کس طرح سے چلیں؟ آپ ذرا اس کھلی ہوئی حقیقت پر غور کریں' بات واضح ہو جائے گی۔ ایک محلہ میں ایک مسجد موجود ہے اور وہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں محلے کے سب نمازی سما سکتے ہیں۔ اتنے میں ایک اور مولوی صاحب "فارغ التحصیل" ہو کر آجاتے ہیں۔ اس مسجد میں پہلے سے امام صاحب موجود ہیں۔ اب یہ نووارد بیچارا کیا کرے؟ اس کی روٹی کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں کہ ایک اور مسجد بنے۔ لیکن یہ مسجد کیسے بنے؟ اس کے لئے نہایت آسان طریقہ ہے۔ وہ یہ وعظ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ اس مسجد کا امام' ہاتھ زیر ناف باندھتا ہے۔ لیکن شریعت حقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔ لہٰذا' اس امام کے پیچھے نماز ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ بار بار اس آواز کو دھراتا ہے اور اس کے بعد ایک کھلی جگہ پر دس اینٹیں اور پانچ لوٹے رکھ کر اذان دے دیتا ہے۔ سینے پر ہاتھ رکھنے کی شریعت حقہ ماننے والے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور یوں اس کے لئے امامت کی اسامی نکل آتی ہے۔ اس کے بعد وہ اٹھتے بیٹھتے اس "محکم عقیدہ" کی تبلیغ کرتا رہتا ہے کہ جو لوگ زیر ناف ہاتھ رکھنے والے امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں ان کی نماز نہیں ہوتی۔ آپ سوچئے کہ اگر یہ اختلاف پیدا نہ کیا جاتا تو اس کے لئے نیا ٹھکانا کیسے بن سکتا تھا! یہ وجہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے اختلافات کو اس شدت سے قائم رکھتے ہیں اور ہر اس آواز کو جو اختلافات مٹانے کے لئے اٹھے' کفر و الحاد کی آواز قرار دے کر' اسے دبانے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہؐ کے زمانے میں بھی یہ اختلافات موجود تھے؟ اس کا جواب ان حضرات سے مانگئے!

(مارچ ۱۹۹۵ء)

۲۷۔ معجزہ اور کرامت میں کچھ فرق نہیں

ذیل کا اقتباس غور سے پڑھئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح معجزہ میں اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ

براہ راست حق تعالیٰ کا فضل ہوتا ہے' جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے **وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی** (۸/۱۷) اسی طرح کرامت میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا' براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے کوئی کام ہو جاتا ہے۔ اور معجزہ اور کرامت دونوں خود صاحب معجزہ و کرامت کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے ------

ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایسا کوئی خارق عادت کام اگر کسی صاحب وحی نبی کے ہاتھ پر ہو تو معجزہ کہلاتا ہے' غیر نبی کے ذریعہ اس کا ظہور ہو تو کرامت کہلاتی ہے۔

یہ اقتباس ہے (مولانا) مفتی محمد شفیع (مرحوم) کی تفسیر (معارف القرآن) کا جو ماہنامہ البلاغ (کراچی) میں بالا قساط شائع ہو رہی ہے۔ اس کا حوالہ ہے (البلاغ بابت مارچ ۱۹۷۷ء' ص ۱۶)۔ اس وقت بحث معجزہ کے متعلق نہیں۔ نکتہ زیر غور صرف یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے' یعنی مدعی نبوت کے دعویٰ کی صداقت کا ثبوت۔ لیکن (مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ) اولیاء کرام سے جو کرامات سرزد ہوتی ہیں ان میں بھی اسباب طبعیہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے معجزہ اور کرامت کی کنہ اور حقیقت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے تو کرامت دلیل نبوت کیوں نہیں ہو سکتی جبکہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہوتے ہیں۔

لیکن مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں۔ دونوں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ نبی کے ہاتھ سے جو خارق عادت واقعہ ظہور میں آئے اسے معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور غیر از نبی کے ہاتھ سے جو خارق عادت واقعہ رونما ہو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

کیا یہ وہی بات نہیں جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا تھا کہ :

اسماء سمیتموھا انتم وابا وکم (۱۲/۴۰)

ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ لئے ہیں!

کیا (مفتی صاحب مرحوم کے ارشاد کے مطابق) معجزہ اور کرامت میں یہی فرق نہیں کہ ایک کو معجزہ کہہ کر پکارا جاتا ہے اور دوسرے کو کرامت۔

ما انزل اللہ بھا من سلطن (۱۲/۴۰)

خدا نے ان ناموں کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔

محض ناموں کی تفریق سے یہ امت ہزار برس سے ایسی ایسی الجھنوں میں گرفتار چلی آرہی ہے جن سے نکلنا اس کے بس میں نہیں۔ (مثلاً") اللہ تعالیٰ نے کسی منتخب ہستی کو اپنی طرف سے براہ راست علم عطا کرنے کا نام وحی رکھا تھا اور جسے یہ علم عطا ہوتا تھا اسے نبی یا رسول کہہ کر پکارا تھا۔ ختم نبوت سے' خدا کی طرف سے اسطرح علم حاصل ہونے کا سلسلہ

ختم ہو گیا۔

لیکن بعد ازاں امت میں ایک عقیدہ رائج ہوا کہ (رسول اللہؐ کے بعد بھی) خدا کے، برگزیدہ بندوں کو خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ جب کہا گیا کہ یہ عقیدہ تو ختم نبوت کی نقیض ہے، تو کہا کہ نہیں۔ اس سے ختم نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس لئے کہ نبی کو جو علم حاصل ہوتا تھا اسے وحی کہا جاتا ہے اور غیر نبی کو جو اسی نوع کا علم حاصل ہوتا ہے اسے کشف والہام کہا جاتا ہے اور جن برگزیدہ ہستیوں کو یہ علم حاصل ہوتا ہے' انہیں نبی نہیں' اولیاء کہا جاتا ہے' یعنی خدا کی طرف سے علم حاصل ہونے کی کیفیت اور نوعیت ایک ہی ہے' لیکن اس کا نام الگ رکھ لیا گیا ہے۔ اس لئے اس سے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وہ جو "احمدیوں" اور ہمارے علماء میں نوے برس تک بحث کا سلسلہ جاری رہا اور بات، کسی فیصلہ کن مرحلہ تک پہنچ نہ سکی تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خود علماء حضرات' کشف والہام پر عقیدہ رکھتے تھے اور کرامات اور پیش گوئیوں کے امکان کو تسلیم کرتے تھے۔ ان عقائد کے بعد فرق صرف ناموں کا رہ جاتا ہے۔ ان تمام الجھنوں کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ما انزل اللہ کو سلطان تسلیم کیا جائے یعنی جملہ عقائد و مسالک میں سند قرآن کریم کی قابل قبول قرار پائے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ کوئی پیچیدگی بھی باقی رہ جاتی ہے۔

(اپریل ۱۹۷۷ء)

۲۸۔ پیشۂ وکالت

مسٹر اے کے بروہی نے سپریم کورٹ کے حالیہ مقدمہ میں' آئین کی عظمت کے ضمن میں جو دلائل دیئے وہ ان دلائل کی تردید کرتے تھے جو خود انہوں نے اس سے پہلے سپریم کورٹ ہی کے ایک مقدمہ میں پیش کئے تھے۔ اگلے دنوں وہ لندن تشریف لے گئے تو وہاں ان کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے خود اپنے ہی دلائل کی تردید کس طرح کر دی۔ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ :

> ..... کی درخواست کے سلسلہ میں پاکستان کے سپریم کورٹ کے سامنے پاکستان کے آئین کے ضمن میں انہوں نے جس موقف کی حمایت کی وہ محض ایک وکیل کا پیشہ وارانہ فرض تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر دوسرا فریق ان سے رابطہ قائم کرتا اور ان کی فیس ادا کرتا تو وہ اسی شدومد کے ساتھ یہ کہتے کہ دوسرے فریق نے غلطی کی ہے۔

(چٹان' مورخہ ۲۸ نومبر ۱۹۷۷ء)

۲۹۔ ایرانی شہنشاہیت اور ولی عہدی

(طلوع اسلام بابت اپریل' مئی ۱۹۵۸ء میں ذیل کا شذرہ شائع ہوا تھا)

"اس ماہ کی ایک اہم خبر ایران کی ملکہ ثریا کی طلاق ہے۔ یہ خبر اس لئے اہم نہیں کہ طلاق کسی ملک کی ملکہ کو ملی ہے۔ ہمارے نزدیک عورت ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ہر عورت یکساں ہے۔ اور ملکہ ہونے کی جہت سے' ہر عورت اپنے گھر کی ملکہ ہوتی ہے۔ اس خبر کی اہمیت ان خصوصی حالات کی بنا پر ہے جن کی وجہ سے نوبت طلاق تک پہنچی ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ شاہ اور ملکہ (میاں اور بیوی) ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے تعلقات نہ صرف خوشگوار بلکہ محبت و مودت کے مظہر تھے۔ ان میں کسی قسم کی کوئی ناچاقی یا بدمزگی نہیں تھی۔ لیکن ان کی سات سالہ ازدواجی زندگی میں ملکہ کے ہاں اولاد نہیں ہوئی اور چونکہ نرینہ اولاد کے بغیر تخت شہنشاہی بغیر ولی عہد کے رہا جاتا تھا' ۱۳؎ اس لئے بادشاہ کو بادل نخواستہ ملکہ کو طلاق دینی پڑی اور ملکہ کو بصد حسرت و یاس اس فیصلہ کو قبول کرنا پڑا۔۔۔۔۔ وہ فیصلہ جس سے ایران کے بہت سے گھرانوں میں صف ماتم بچھ گئی۔

اس سے دو اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک عام انسانی حیثیت سے' دوسرا قرآنی نقطہ نگاہ سے۔

عام انسانی حیثیت سے یہ کہ' کیا کسی عورت کے ہاں اولاد نہ ہونا' واقعی ایسا جرم ہے جس سے وہ اس قسم کی انتہائی سزا کی مستحق قرار پا جاتی ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ جو لوگ اس سوال کا جواب مثبت میں دیں' انہیں اس کا قطعاً حق حاصل نہیں کہ وہ صف انسانیت میں کھڑے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ (قرآن کریم کے تمثیلی انداز میں بیان کردہ قصہ آدم کی رو سے) جب آدم کے دل میں حیات جاوید کی آرزو پیدا ہوئی تو ابلیس نے اس کے کان میں یہ افسوں پھونکا کہ وہ اولاد کے ذریعے حیات جاوید حاصل کر سکتا ہے۔ اسی سے اس کا نام ہمیشہ کے لئے روشن رہ سکتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن' اولاد کی آرزو انسان کی ناک میں نکیل ڈالے نہ معلوم اسے کہاں کہاں لئے پھرتی ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس ناکردہ گناہ کی سزا اکثر و بیشتر بیچاری "حوا کی بیٹی" کو بھگتنی پڑتی ہے۔ خدا جانے آدم کا شعور کب بیدار ہوگا اور وہ کب ابلیس کے اس فریب سے نکل سکے گا کہ وہ حیات جاوید اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتا ہے۔ حیات جاوید انسانی ذات کی نشوونما اور پختگی سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ اولاد کے ذریعے بقائے نسل سے۔

قرآنی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ اور بھی زیادہ تاسف انگیز اور عبرت ناک دکھائی دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اولاد کا ہونا یا نہ ہونا طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے جس پر مرد یا عورت کسی کا بھی اختیار نہیں ہوتا۔ (اگر مرد یا عورت میں سے کسی میں) اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں (اور مناسب علاج کے باوجود یہ صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی) تو اس میں فرد متعلقہ کا کوئی قصور نہیں جس کی وجہ سے اسے مستحق سزا قرار دیا جائے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے:۔

۱۳؎ شاہنشاہ ایران کی پہلی بیوی (جسے اس نے چھوڑ دیا تھا) کے ہاں نرینہ اولاد نہیں ہوئی تھی۔

یھب لمن یشاء اناثا ویھب لمن یشاء الذکورا ۙ او یزوجھم ذکرانا واناثا ویجعل من یشاء عقیما ۔۔۔۔۔ (۴۲/۴۹-۵۰)

وہ جسے چاہتا ہے (اپنے قانون مشیت کے مطابق) بیٹیاں دیتا ہے' جسے چاہتا ہے بیٹے' یا بیٹے اور بیٹیاں دونوں' اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے (یہ سب اس کے مقرر کردہ قانون طبیعی کے مطابق ہوتا ہے)۔

جہاں تک طلاق کا تعلق ہے قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ عورت کا بے اولاد ہونا طلاق (یا نکاح ثانی) کے لئے وجہ جواز ہو سکتا ہے۔ نکاح کا مقصد میاں بیوی میں سکون اور مودت و رحمت ہے (۳۰/۲۱) اور جب تک ازدواجی زندگی میں یہ حسین عناصر موجود ہیں' انقطاع تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگلی (اور سب سے اہم) چیز "ولی عہد" کا سوال ہے۔ کون مسلمان اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ اسلام کی گاڑی اس دن سے دوسری پٹڑی پر جا پڑی جس دن خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہوگئی۔ ملوکیت کے عام معنی ہیں' سلطنت کا باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً" منتقل ہونا۔ یہ وہ آواز ہے جو گزشتہ تیرہ سو برس سے ہر محراب و منبر سے اٹھتی اور مسلسل فضا میں پھیلتی رہی ہے کہ سلطنت میں وراثت اور ولی عہدی کا تصور شجر اسلام کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ لیکن کس قدر بدبختی ہے کہ جہاں تیرہ سو سال سے ہر محراب و منبر سے یہ آواز اٹھ رہی ہے' اس کے ساتھ ہی تیرہ سو برس سے' مسلمانوں کے ہر ملک میں' سلطنت باپ سے بیٹے کی طرف وراثتاً" منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ حتیٰ کہ آج جبکہ دنیا کی قریب قریب تمام غیر مسلم سلطنتیں زمانے کے تقاضے سے مجبور ہو کر' ملوکیت کو اپنے ہاں سے ختم کر چکی ہیں' ملوکیت اگر کہیں باقی ہے تو مسلمانوں کے ممالک میں باقی ہے۔ اور یہی ملوکیت ہے جس نے ایران میں ولی عہد سلطنت کی ضرورت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کے لئے ایک بے گناہ (خاتون) کو حوالہ قربان گاہ کر دیا گیا ہے۔

اس سے آگے بڑھئے تو ایک چیز بالکل واضح ہے' یعنی یہ کہ اس کی ضمانت کیا ہے کہ شاہ ایران کے ہاں کسی اور بیوی سے ضرور ضرور اولاد پیدا ہوگی' اور وہ لڑکا ہی ہوگا۔

اور سب سے آخر یہ کہ' شاہ ایران (ماشاء اللہ) ابھی جوان ہیں اور قانون طبیعی کے مطابق ان کے کافی مدت تک زندہ رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ جس سرعت سے آجکل مزاج روزگار بدل رہا ہے اس کے پیش نظر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے کہ جب آج کے ولی عہد کی تخت نشینی کا دور آئے گا' اس وقت انداز ملوکیت دنیا میں باقی ہوگا؟"

(طلوع اسلام' بابت اپریل- مئی ۱۹۵۸ء' ص ۴۸-۴۷)

چنانچہ وہاں ایسا انقلاب آیا کہ ولی عہدی تو ایک طرف' شہنشاہیت ہی باقی نہ رہی۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے کہ ۔

الٹ جائیں گی تدبیریں' بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے' نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

(فروری ۱۹۷۹ء)

۳۰۔ "عزیر" کے متعلق غلط فہمی

ایک صاحب نے ہمیں' اردو انسائیکلو پیڈیا (فیروز سنز) کے ص ۹۸۹ کی فوٹو سٹیٹ کاپی بھیجی ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔
عزیرؑ (حضرت) (۵۰۰ - ق-م) حضرت ہارون بن عمران کی نسل سے تھے۔ قرآن اور احادیث کے مطابق عزیرؑ نبی تھے۔ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے تمام یہودیوں کو گرفتار کر لیا..... اور انہیں بابل لے آیا۔ اس وقت عزیر کم عمر تھے۔ چالیس برس کی عمر میں آپ بنی اسرائیل کے فقیہ بنے اور رشد و ہدایت کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ اردشیر کے زمانے میں جب بنی اسرائیل نے بیت المقدس کو از سر نو تعمیر کرنا چاہا تو اس سلسلہ میں حضرت عزیر نے شاہی دربار میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا شروع کیا' اور بیت المقدس کی تعمیر میں بنی اسرائیل کو مدد دی۔ بیت المقدس کی تباہی کے وقت تورات کے تمام نسخے ناپید ہو چکے تھے۔ حضرت عزیر نے یہ نسخے از سر نو مرتب کرائے (اس کے بعد اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جسے درج کرنے کی ہم ضرورت نہیں سمجھتے)۔

اس میں کئی بنیادی غلطیاں ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآن مجید نے عزیر نامی کسی شخص کو زمرہ انبیاءؑ میں شامل نہیں کیا۔ اس لئے انہیں قرآن کی رو سے بالتصریح نبی نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ قرآن مجید میں عزیر کا نام ایک ہی مقام پر آیا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ یہودی اسے ابن اللہ (خدا کا بیٹا) کہتے تھے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ اہل مصر کا ایک دیوتا تھا (OSIRIS) جس کی شکل بیل کی سی تھی۔ وہ اسے خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ اہل مصر کی دیکھا دیکھی بنی اسرائیل نے بھی اس دیوتا کی پرستش کرنی اور اسے خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہی (OSIRIS) عزیر ہے جس کا ذکر قران مجید میں آیا ہے۔

دوسرے یہ کہ جس فقیہ نے تورات کو از سر نو مرتب کیا تھا اس کا نام عذرا تھا (نہ کہ عزیر)۔ توریت میں اس کا نام اور ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔

ہم اپنے ہاں کے انسائیکلوپیڈیا قسم کی تالیفات کے مصنفین اور ناشرین سے درخواست کریں گے کہ وہ (کم از کم) اسلام اور حضرات انبیاء کرامؑ کے ضمن میں کچھ درج کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا کریں۔ ان کی یہ تالیفات عوام میں "سند" بن جایا کرتی ہیں۔

(فروری ۱۹۷۷ء)

۳۱۔ محنت کشوں کے مسائل

(اجرتوں کے نظام کی خرابی)

ایک صاحب نے لکھا ہے کہ آجکل محنت کشوں کی فلاح و بہبود کا سوال بڑی اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق کیا ہدایات آئی ہیں؟

طلوع اسلام

بات ذرا سطح سے نیچے اتر کر سمجھنے کی ہے۔ اس باب میں دو فریق ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک فریق محنت کش

یا ورکرز (WORKERS) یعنی کام کرنے والوں کا اور دوسرا فریق وہ جوان کام کرنے والوں کی فلاح اور بہبود کی تدبیریں سوچتا یا کرتا ہے۔ پہلا فریق تو ہوا ورکرز یا کام کرنے والوں کا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوسرا فریق کن لوگوں کا ہے؟ جب پہلا فریق کام کرنے والوں کا ہے تو لامحالہ دوسرا فریق ان لوگوں کا ہوگا جو کام نہیں کرتے۔ تو اب مسئلہ کی شکل یوں بنی کہ جو لوگ کام نہیں کرتے ہیں وہ ان لوگوں کی فلاح و بہبود کی فکر کرتے ہیں۔ اور اگلا سوال یہ کہ ان کام نہ کرنے والوں کے پاس وہ پیسہ کہاں سے آتا ہے جس سے وہ ان کام کرنے والوں کی فلاح و بہبود کی تدبیریں کرتے ہیں؟ پیسہ تو لامحالہ کام کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ تو جو کام نہیں کرتے ان کے پاس' دوسروں کی فلاح و بہبود تو ایک طرف' خود اپنے کھانے کے لئے بھی کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ان حقائق کی روشنی میں بات یوں ہوئی کہ کام نہ کرنے والے' کام کرنے والوں کی کمائی میں سے خود بھی کھاتے ہیں اور اسی میں سے تھوڑا بہت' کام کرنے والوں کی حالت بہتر بنانے کے لئے صرف کرتے ہیں اور اسے بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے اور ثواب کا کام تصور کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ انسان آج تک دور غلامی سے نکلا ہی نہیں۔ اس نے کیا صرف اتنا ہے کہ فریب دہی کی خاطر کچھ لباس نئے تجویز کر دیئے اور کچھ نئی اصطلاحات وضع کر لی ہیں۔ جسے ہم دور جہالت کہتے ہیں اس میں انسان جو کچھ کرتا تھا اسے کھلے بندوں کرتا تھا۔ اس دور تہذیب میں یہ کرتا وہی کچھ ہے لیکن دوسروں کی بہبود کے نگاہ فریب پردوں میں لپیٹ کر۔ دور جہالت میں کام کرنے والے کو غلام کہا جاتا تھا اور اس سے کام کرانے والا اس کا آقا یا ماسٹر کہلاتا تھا۔ یہ آقا' غلام کی کمائی کا مالک ہوتا تھا اور اس میں سے اتنا غلام کو دے دیتا تھا جس سے وہ کام کرنے کے قابل رہے۔ بات آج بھی وہی ہے۔ فرق صرف الفاظ کا ہے۔

قرآن کریم نے اس تفریق کو ختم کر دیا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ: **لیس للانسان الا ما سعی** (۵۳/۳۹) دنیا میں ہر انسان کو کام کرنا ہوگا۔ جو کام نہیں کرتا اسے کچھ نہیں مل سکتا' (بجز ان کے جو کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہوں) بلکہ یوں کہیئے کہ وہ انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ اس نے اس بنیادی اصول کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی کہ **الا تزر وازرۃ وزر اخری** (۵۳/۳۸) کام کرنے والے' کام نہ کرنے والوں کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔ کام نہ کرنے والوں کو اس نے مترفین کہہ کر پکارا اور انہیں بارگاہ انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیا ہے۔ لہٰذا' قرآنی معاشرے میں تمام افراد کا سب یعنی کام کرنے والے ہوں گے۔ اس میں کام نہ کرنے والوں کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ تقسیم کار کے اصول کے مطابق کام کی نوعیت میں فرق ہوگا۔ اسے باہمی تعاون کہا جائے گا۔ اس میں نہ کوئی کام گھٹیا ہوگا نہ بڑھیا۔ گھڑی کا اونی سا پیچ بھی اپنے مقام پر اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت اس کا مرکزی پرزہ' سپرنگ۔ اس اعتبار سے ان کام کرنے والوں کی اونچ نیچ کا بھی فرق نہیں ہوگا۔ اگر سو سو روپے کے پچاس نوٹوں کو اوپر تلے رکھ دیا جائے تو سب سے نچلے نوٹ کی بھی وہی قیمت ہوگی جو سب سے اوپر کے نوٹ کی ہوگی۔ مدارج میں فرق کام کی نوعیت کے مطابق نہیں ہوگا حسن کارکردگی کی بنا پر ہوگا یعنی جو کام اس کے سپرد تھا اسے اس نے کس قدر خوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کی رو سے آجر اور مستاجر (کام کرنے والوں اور لینے والوں) کے دو گروہوں کا وجود ہی نہیں رہتا۔ اس میں تمام افراد معاشرہ کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' وہ معاشرہ محنت کشوں یا ورکرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں سب مل کر کام کرتے ہیں اور ان کی محنت کے نتیجے میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس سے ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے اس معاشرے میں "مزدوروں" کا بھی وجود نہیں ہوتا۔ مزدور کے معنی ہیں "مزد + ور" یعنی جسے کام کی مزد' اجرت دی جائے۔ اجرت (یا WAGES) کا تصور بھی نظام سرمایہ داری کا پیدا کردہ ہے۔ کام نہ کرنے والے' کام کرنے والوں کے کام کی اجرت مقرر کرتے ہیں اور اسے اس کی محنت کے ماحصل میں سے مقررہ اجرت ادا کر کے باقی سب خود سمیٹ لیتے ہیں۔ اجرت مقرر کرنے میں معیار یہ نہیں ہوتا کہ اس سے مزدور اور اس کے بال بچوں کی ضرورتیں بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ معیار' اجرت مقرر کرنے والوں کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ قرآنی معاشرہ میں کام کی اجرتیں مقرر نہیں ہوتیں' ہر ایک کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔

یہ ہے قرآن کریم کی رو سے' محنت کشوں کے مسائل کا حل۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان' اس قسم کا معاشرہ قائم نہیں کرتا' وہ دور غلامی سے نکل نہیں سکتا' خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی مہذب اور آزاد تصور کیوں نہ کرے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے
(مئی ۷۹ء)

۳۲۔ تصویر کی شرعی حیثیت

(مودودی مرحوم کے تضادات)

سوال :۔ سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے مودودی صاحب کو حال ہی میں جو ایوارڈ ملا ہے' میں اس کے دوسرے گوشوں کے متعلق گفتگو کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھنا چاہتا ہوں۔ سردست اس کا صرف وہ گوشہ سامنے لانا چاہتا ہوں جس کا تعلق شاہ فیصل (مرحوم) کی اس تصویر سے ہے جو اس میڈل (تمغہ) پر ڈھلی ہوئی شکل میں منقوش ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مودودی صاحب نے انسانوں کی ہر قسم کی تصاویر کو حرام مطلق قرار دیا تھا۔ براہ کرم بذریعہ طلوع اسلام مطلع فرمایئے کہ کیا یہ صحیح ہے؟ اور اگر صحیح ہے تو پھر مودودی صاحب اس مصور تمغہ کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

جواب:۔ تصویر کے متعلق مودودی صاحب نے ترجمان القرآن بابت جولائی ۱۹۶۲ء میں سورۃ النساء کی تفسیر کے سلسلے میں' بڑی تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

"اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی

حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی اکرمؐ کے صحیح ارشادات' صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہاء اسلام کے متفق فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثرہ لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں' حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقہ کو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں' یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو۔ باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں' ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے' اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں' تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علت حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں (صفحات ۳۰-۲۸)۔

اس مطلق ممانعت میں استثنائی صورتوں کے متعلق انہوں نے لکھا ہے :-

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثنا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو یا جبکہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لئے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہے۔ مثلاً پاسپورٹ' پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لئے تصویریں محفوظ کرنا' ڈاکٹروں کا علاج کے لئے یا فن طب کی تعلیم کے لئے مریضوں کی تصویریں لینا اور جنگی اغراض کے لئے فوٹوگرافی کا استعمال ..... لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی

ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ خصوصاً" لیڈروں کی تصویریں تو بندگان خدا کو اس خطرے سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں' جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے..... سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامت حاکمیت ثبت کیا جانا' کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں؟ ..... میں تو چھوٹے بچوں کی تصویر لینے کو بھی اسی لئے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنالیا جائے۔ (رسائل و مسائل' حصہ اول' ستمبر ۱۹۵۱ء' صفحہ ۹۱-۱۹۰)

تصویر کے متعلق مودودی صاحب کا عقیدہ واضح ہے۔ وہ انسانوں کی تصویر کو حرام مطلق قرار دیتے ہیں۔ اور انہوں نے جو استثنائی صورتیں بتائیں ہیں' ظاہر ہے کہ فیصل ایوارڈ پر شاہ مرحوم کی تصویر (جسے مجسمہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا) ان میں سے کسی شق کے تابع بھی نہیں آتی۔

(جون ۱۹۷۹ء)

۳۳۔ استیذان کی اہمیت

(اجازت لے کر آؤ)

قرآن مجید ایک عظیم' محیط کل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں جہاں کائنات کے مستور حقائق اور قوموں کے عروج و زوال کے غیر متبدل قوانین دیئے گئے ہیں وہاں انسانی معاشرتی زندگی سے متعلق ایسی ہدایات بھی بیان کی گئی ہیں جو سطحی نگاہوں سے دیکھنے والوں کے نزدیک بڑی معمولی سی ہیں ——— ایسی معمولی کہ ان کے نزدیک انہیں وحی کی رو سے عطا کئے جانے کی چنداں ضرورت نہ تھی ——— لیکن اگر انہیں روزمرہ زندگی کے تجربہ کی روشنی میں ذرا گہری نظروں سے دیکھا جائے تو ان کی اہمیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آج کی نشست میں ہم ان میں سے دو ایک ہدایات کو سامنے لاتے ہیں جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرہ میں بہت سی الجھنیں اور بدمزگیاں پیدا' اور پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں۔ جن حضرات کو ان پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ ان کی اہمیت کو نمایاں کرنا بڑا ضروری ہے۔

ان میں سے پہلی ہدایت یہ ہے:۔

یایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا ...(۲۴/۲۷)

اے جماعت مومنین! جب تم اپنے گھر کے علاوہ کسی اور کے ہاں جاؤ تو پہلے ان سے اجازت طلب کرو اور جب وہ اجازت دیں تو پھر اندر جاؤ۔

اس کے بعد ہے:۔

فان لم تجد وا فیھا احدا فلا تدخلوھا حتی یوذن لکم ج وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ..... (۲۴/۲۷)

اور اگر تم دیکھو کہ اس گھر میں کوئی نہیں تب بھی اس کے اندر نہ جاؤ۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ آپ اس وقت واپس تشریف لے جائیں تو (دل میں کوئی گرانی لئے بغیر) واپس آجاؤ۔

ان ہدایات میں کہا تو یہ گیا ہے کہ کسی کے ہاں بلا اجازت مت جاؤ' لیکن وسیع پیمانے پر اس سے مراد یہ ہے کہ کسی سے ملنے کے لئے جانا ہو تو پہلے وقت مقرر کرو' یعنی (BY APPOINTMENT) جاؤ۔ یونہی' جب جی چاہے کسی سے ملنے کے لئے نہ چلے جاؤ۔ اگر کسی کے ہاں اتفاقیہ جانا پڑے تو بھی اہل خانہ سے پہلے پوچھ لو کہ انہیں ملنے کے لئے وقت ہے۔ اور اگر وہ معذرت کر دیں تو اس کا برا نہ مناؤ۔ واپس چلے جاؤ۔

مغربی ممالک میں چونکہ وقت کی قیمت کا بڑا احساس ہے اس لئے انہوں نے اپنے اوپر اس پابندی کو بڑی شدت سے عائد کر رکھا ہے۔ وہاں پہلے سے وقت مقرر کئے بغیر کوئی کسی کے ہاں نہیں جاتا۔ لیکن ہمارے ہاں (جنہیں خدا کے ہاں سے یہ ہدایت ملی تھی) کیفیت یہ ہے کہ جب کسی کا جی چاہے ملنے کے لئے چلا آتا ہے۔ اس سے دوسرے کے کام' وقت اور مصروفیات میں جس قدر حرج واقع ہوتا ہے' اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں اس قسم کے ملاقاتیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اول تو وہ اس کی جرات نہیں کر سکتے کہ اس آنے والے سے کہہ دیں کہ اس وقت معاف فرمایئے۔ اور اگر وہ کہیں اس کی جرات کر لیں تو آنے والے صاحب اس کا اتنا برا مناتے ہیں کہ بعض اوقات ہمیشہ کے لئے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس بدمزگی سے بچنے کے لئے اہل خانہ کو اکثر اوقات جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ یہ وبا ہمارے ہاں عام ہے اور نتیجہ ہے اس قرآنی ہدایت کو نظرانداز کر دینے کا۔

۲۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آنے والے صاحب بلا اطلاع چھپا چھپ گھر کے اندر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے اہل خانہ کی پرائیویسی میں جس قدر خلل واقع ہوتا ہے' ظاہر ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے :۔

واذا سالتموھن متاعا فسئلوھن من وراء حجاب ..... (۳۳/۵۳)

اور اگر تمہیں نبی کے گھر سے کوئی چیز لینی ہو تو اس کے لئے بھی یونہی بے محابا اندر نہ چلے جایا کرو۔ قاعدے کے مطابق پردے کے باہر سے اسے مانگا کرو۔

ظاہر ہے کہ اس حکم کا اطلاق بھی عام ہے کہ بلا اطلاع دیئے اور اجازت لئے' کسی کے مکان کے اندر نہ چلے جایا کرو۔ اہل یورپ کے ہاں اس کی بھی پابندی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی خیال نہیں کرتا (ہم سے ہمارے بڑے بوڑھے اچھے تھے کہ وہ خود اپنے گھر میں بھی آتے تو ڈیوڑھی میں کھنکار کر اندر جاتے تھے)۔

(۳) ہمارے ہاں اگر دو چار دوستوں یا عزیزوں کو کھانے پر بلایا جائے تو اہل خانہ کا پورے دن کا پروگرام تلپٹ ہو جاتا ہے۔ کچھ تو (دوپہر کے کھانے کے لئے) بارہ ہی بجے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض تین تین بجے تک تشریف نہیں

لاتے اور باقی سب ان کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر کھانے کے بعد جو محفل جمتی ہے تو کوئی اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اس سلسلے میں قرآن مجید میں یہ ہدایت دی گئی:۔

یایھا الذین امنوا لا تدخلوا بیوت النبی الا ان یوذن لکم الی طعام غیر نظرین اِنٰہ ولکن اذا دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستانسین لحدیث ..... (۳۳/۵۳)

اے جماعت مومنین! تم یونہی بن بلائے اور بغیر اجازت لئے رسول کے گھر نہ چلے جایا کرو۔ اگر وہ تمہیں کھانے کے لئے بلائے تو اس کے ہاں جاؤ۔ لیکن وہ بھی اس طرح نہیں کہ تم کھانا پکنے سے پہلے ہی وہاں جا بیٹھو اور کھانے کا انتظار کرتے رہو۔ جب کھانا تیار ہو جائے اور وہ تمہیں بلائے تو پھر اندر جاؤ۔ اور جب کھانا کھا چکو تو وہاں سے چلے جاؤ۔ وہیں بیٹھے باتوں میں نہ لگ جاؤ۔

اہل مغرب اس پابندی پر بھی عمل کرتے ہیں اور بڑے سکھ میں رہتے ہیں۔ انہوں نے تو خود اپنے گھروں میں بھی کھانے کے اوقات مقرر کر رکھے ہیں اور اس کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی بات کہی ہے جو متعین طور پر تو رسولؐ اللہ سے متعلق ہے' لیکن وہ ترجمانی کرتی ہے ہم میں سے ہر ایک کے دل کی۔ فرمایا:۔

ان ذالکم کان یوذی النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق ..... (۳۳/۵۳)

تمہاری موجودہ روش سے رسولؐ کو بڑی اذیت پہنچتی ہے لیکن وہ شرم کی وجہ سے تمہیں کچھ کہتا نہیں' لیکن اللہ تو حق بات کہنے سے نہیں شرماتا (اس لئے اس نے یہ بات صاف صاف کہہ دی ہے)۔

ان ہدایات خداوندی کی مزید تشریح اور تصریح کی ضرورت نہیں۔ اے کاش ہم قرآن مجید کی ان چھوٹی چھوٹی ہدایات پر ہی عمل پیرا ہوتے تو کتنے آرام سے رہتے!

(جون ۱۹۷۹ء)

۳۴۔ میں نے جماعت کیوں نہیں بنائی! میں نماز کیسے پڑھتا ہوں؟

قارئین طلوع اسلام میں سے ایک صاحب کا میرے نام ایک طویل مراسلہ موصول ہوا ہے۔ اس کا جواب تو انہوں

نے براہ راست مانگا ہے' لیکن جو سوالات اس میں اٹھائے گئے ہیں ان کا تعلق کسی ایک فرد سے نہیں' نفس اسلام سے اور اس کے بعد تحریک طلوع اسلام سے ہے۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ (نام اور مقام کے حوالے حذف کر دینے کے بعد) وہ خط اور اس کا جواب طلوع اسلام میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے قارئین اس کے مطالعہ کو مفید پائیں گے۔ پہلے وہ خط ملاحظہ فرمایئے:۔

خط

"میں تقریباً ۷۶ء کے اوائل سے آپ کے ماہنامہ "طلوع اسلام" کا مطالعہ کر رہا ہوں ..... کے چھوٹے سے قصبے میں قرآنی نظریات کو اپنی حد تک پھیلانے کی کوشش بھی کرتا رہا ہوں۔ آپ سے تعارف میرے دوست ..... نے کرایا۔ آپ کی قرآنی تفسیر پسند آئی۔ گو نہ میں آپ کی کوئی ضخیم کتاب پڑھ سکا ہوں اور نہ ہی "طلوع اسلام" کو باقاعدگی سے زیر مطالعہ رکھ سکا ہوں' لیکن طلوع اسلام کی روشنی نے مجھے متاثر ضرور کیا ہے۔ لہٰذا' باقاعدگی سے اس کا خریدار ہوں۔ کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے رابطہ قائم کر کے آپ سے ان سوالات کا جواب حاصل کروں جو میرے اپنے ذہن میں ابھرتے ہیں یا دوسروں کی جانب سے پوچھے جاتے ہیں۔ دیگر حضرات کی قسم مختلف ہے۔ ان میں کچھ متاثرین جماعت اسلامی ہیں۔ کچھ کمیونسٹ' سوشلسٹ اور اکثریت دہریوں کی ہے۔ سب سے زیادہ مقابلہ جماعت اسلامی سے ہے۔ اکثریت دوستوں کی ہے۔ لیکن اکثر اور ہر وقت کی بحث ..... کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ آپ کی اکثر باتوں خصوصاً" معاشی نظام کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن کچھ باتیں مولویانہ اور مذہبی سی ہوتی ہیں اور کچھ کا وزن میں خود بھی محسوس کرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میرا مطالعہ ناقص اور نامکمل ہے۔ میں ..... طالب علم (پرائیویٹ) ہوں۔ کافی وقت ادھر لگتا ہے۔ ملازمت کے دھندے بھی ہیں۔ لیکن خیال آتا ہے کہ زندگی تو انہیں دھندوں میں صرف ہوگی۔ کچھ مطالعہ دائمی (ETERNAL) حیثیت و فوائد رکھنے والا بھی کیا جائے۔ لہٰذا' جن سوالات کا جواب آپ سے لینا ہے وہ درج کر کے اپنے مطالعہ میں اضافے کے لئے جواب چاہتا ہوں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے۔ کچھ جوابات ذاتی قسم کے ہوں گے۔ ان کا جواب بھی ضرور عطا فرمائیں کیونکہ آپ کی اپنی ذات بھی خاصی زیر بحث رہتی ہے۔ آپ کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے سبب صرف فرضی باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اطمینان نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو اعتماد سے جواب نہیں دیا جا سکتا۔ صرف ذاتی دلائل پر بھروسہ کرتا ہوں مگر خود مطمئن نہیں رہتا۔ سب سے بڑا اعتراض ..... یہ کرتے ہیں اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ لیکن پرویز صاحب' اس حکم قرآنی کی تعمیل میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں نہیں لائے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کو لوگ فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں (RESTLESS SOULS) کو تو کوئی جائے سکون نظر آ سکے گی۔ جماعت نہ ہونے کا مطلب تو یہ لیتے ہیں کہ پرویز صاحب صرف دوسری جماعتوں پر تنقید ہی تنقید کرتے رہتے ہیں' خود کوئی آئیڈیل پارٹی پیش نہیں کرتے۔

جماعت سازی

ایک ایسی جماعت ہونا چاہیے تھی جو سیاسی' مذہبی یا دینی طور پر (IDEAL) پیش کرتی تاکہ حکومت الہیہ کے قیام کا مقصد حاصل ہو سکتا۔ میں خود بھی یہی سوچتا ہوں کہ فرقہ تو پہلے بھی آپ کے عقائد کو کہا جاتا ہے۔ کیوں نہ ایک جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے جو صحیح قرآنی نظریات پیش کرے اور آہستہ آہستہ اپنا دائرہ وسیع کر کے' مخلص اور بے لوث قیادت مہیا کر کے نظام الٰہی کے قیام کی جانب قدم اٹھائے۔ مشکلات کا سامنا تو بہرحال کرنا پڑے گا۔ اس مرتبہ اگست کے طلوع اسلام میں آپ کے توضیحی مقالہ بہ سلسلہ "دین و مذہب کی کش مکش" کے آخر پر آپ نے دبے الفاظ میں اجتماعی کوشش کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس میں مشکلات کے ساتھ ساتھ کامیابی کے امکانات بھی کافی ہیں۔ ایسا راستہ اختیار کرنا جس میں "ہوس زر" جیسی میٹھی بیماری کو ترک کرنا پڑتا ہے' دولت محفوظ نہیں رہ سکتی' بہت مشکل اور کٹھن ہے۔ اس میں تو لوگ چندہ دینے سے بھی کترائیں گے۔ عہدوں اور ناموری کا لالچ تنظیم اور جماعت میں رکاوٹ بن جائے گا' اور پھر وہاں جہاں سے کسی منافع دنیوی کی امید بھی نہ ہو۔ پھر ممکن ہے کہ لوگ تعلیم یافتہ طبقے میں اسے مقبول سمجھ کر ادھر دوڑیں اور اسے بھی دوسری جماعتوں کی طرح مختلف حربوں سے بدنام کرنے کی کوشش کریں اور انجام پھر وہی نکلے۔ لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو وہ کام مکمل نہیں ہو سکے گا جسے مکمل ہونا چاہیے۔ آپ نے لٹریچر کی صورت میں قابل تعریف کام خاصی حد تک مکمل کر دیا ہے۔ اب اگلا قدم اجتماعی کوشش ہونا چاہیے۔

نماز

۲۔ جب اجتماعی کوشش کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے تو دین کے اہم ترین رکن "نماز" کے بارے میں آپ کو بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی یقیناً" ریسرچ ہوگی کہ حضورؐ پاک اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی۔ نماز باجماعت کا حکم بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن آپ قرآنی کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے مختلف عقائد کے لوگ جو آپ سے متاثر ہوں گے' ایک دوسرے کے پیچھے قرآنی کنونشن سے نماز پڑھنے سے کتراتے ہوں گے اور آپ کو کہنا چاہیے کہ وہ اپنے اپنے طریقوں کے مطابق جا کر نماز ادا کر لیں لیکن آپ خود بھی تو کسی نہ کسی طریقے پر نماز پڑھتے ہوں گے اور یقیناً" (جہاں تک میرا اپنا خیال ہے) وہ طریقہ آپ کی تحقیقات کا نچوڑ ہوگا۔ اور میری نظر میں آپ کی ریسرچ موجودہ دور کے دیگر محققین سے زیادہ صائب ہے۔ آپ صرف ان لوگوں سے علحدہ نماز پڑھنے کا کہتے ہیں جن کی نماز آپ کی نماز (بہ لحاظ ادائیگی وغیرہ) سے نہیں ملتی یا تمام لوگوں سے ؟ ------ آپ نے عبادات کے فلسفے کے علاوہ ان کی ادائیگی پر بھی ضرور ریسرچ کی ہوگی۔ کیا آپ نے مختصراً" ہی سہی' کوئی ایسی تحریر چھوڑی ہے جس میں عبادات کی ادائیگی کا صحیح ذکر ہو؟ جس میں رسول پاکؐ کے طریقہ کا مدلل ثبوت درج ہو اور عبادات میں جہاں جہاں تبدیلی کی اجازت ہو' وہ بھی درج ہو؟ آخر فلسفہ تو انہی کی سمجھ میں آسکتا ہے جو علمی لحاظ سے بہت اعلیٰ طبقہ ہے۔ ادائیگی سے فوائد تو ہر ایک کو پہنچتے

ہیں' پھر ادائیگی کا کوئی نہ کوئی طریقہ بھی تو ہوگا۔ ان دو سوالات کے علاوہ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب بھی عطا فرمائیں۔ تمام سوالات درج کرتا ہوں جن کے جوابات آپ کی کتب کی صورت میں ہیں۔ کتب کے نام لکھ کر بھیج دیں۔ میں منگوالوں گا' انشاء اللہ۔ باقیوں کے جواب تحریری طور پر دیے دیں۔ شکریہ۔

سوالات

۱۔ آپ نماز باجماعت کا اہتمام کیوں نہیں کرتے؟ آپ خود کون سے طریقے پر نماز پڑھتے ہیں؟
۲۔ آپ نے اب تک کوئی سیاسی یا تبلیغی جماعت کیوں قائم نہیں کی' جبکہ قرآن مجید اس کا حکم دیتا ہے؟
۳۔ کیا آپ نے کبھی حج فرمایا؟ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے دورے پر برائے تعلیم یا ریسرچ بھی تشریف لے گئے؟
۴۔ اسلام میں خلافت کا معیار اور طریق انتخاب کیا ہے جو قرون اولیٰ یا زمانہ خلفائے راشدین میں اختیار کیا گیا؟ قرآن کیا کہتا ہے اور اب موجودہ دور میں کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟ صحابہ ثلاثہؓ کا طریقہ درست تھا؟
۵۔ کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے' فقط زیارت کے لئے؟

اگر آپ کے پاس اجتماعی کوشش کا کوئی پروگرام ہے تو اسے نشر فرمائیں' تاکہ کام کچھ آگے بڑھ سکے۔ جس طرح اسلام نے ارتقائی منازل طے کی ہیں اسی طرح احیاء اسلام کا بھی اپنی منزل پر پہنچنا ضروری ہے۔ لٹریچر تیار ہے تو اگلا قدم اٹھایا جائے مگر احتیاط سے' کہیں انجام "مصلحت پسندی" اور پھر جماعتی مفادات کی خاطر قرآن کے مفہوم میں تغیر و تبدل نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ انشاء اللہ قرآنی مشعل کو روشن رکھا جائے گا' آندھیوں میں بھی اور تاریک راتوں میں بھی۔ حقیقی اسلام غلبہ ضرور حاصل کرے گا مگر ابھی دولت' موجودہ سیاست اور مذہبی پیشوایانہ ذہنیت رکاوٹ ہے۔ اب ان سب کے خلاف نفرت پھیل رہی ہے۔ تبادل حقیقی کی ضرورت ہے"۔

والسلام

جواب

اس خط میں بنیادی اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ :

> اسلام میں ایک ایسی جماعت کا قیام ضروری ہے جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے لیکن پرویز صاحب اس حکم قرآنی کی تعلیم میں ابھی تک کسی باقاعدہ جماعت کا قیام عمل میں نہیں لائے۔

یعنی اتنا ہی نہیں کہ اس قسم کی جماعت کا قیام مناسب یا مفید رہے گا' بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے اور چونکہ میں نے اس حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کی اس لئے میں معصیت خداوندی کے جرم کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ حقیقت

اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا نے امت کے اندر مذہبی فرقے یا جماعتیں بنانے کا حکم تو چھوڑ' اس کی اجازت بھی نہیں دی۔ اس نے اسے بڑی سختی سے روکا ہے اور اسے شرک قرار دیا ہے۔ میں اس موضوع پر کافی کچھ لکھ چکا ہوں لیکن چونکہ مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی طرف سے اس گمراہ کن نظریے کی بڑی شدومد سے اشاعت کی جا رہی ہے' (اور اسی وجہ سے مراسلہ نگار بھی اس سے متاثر ہیں) اس لئے ضروری نظر آتا ہے کہ اس باب میں قرآنی احکام اور تعلیم کی ایک بار پھر وضاحت کر دی جائے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

ان لوگوں کی طرف سے اس قسم کی گمراہ کن مغالطہ آفرینی سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ کی تاویل کی آڑ میں کی جاتی ہے۔ اس آیت کو تو ہم بعد میں پیش کریں گے' پہلے یہ دیکھئے کہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" (نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے) کے فریضہ کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد کیا ہے؟

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو مبعوث فرمایا تو حضورؐ کا ایک اہم فریضہ یہ قرار دیا کہ :

یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر (۷/۱۵۷)

وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے گا اور منکر سے روکے گا۔

ہم اس مقام پر معروف او منکر کی تشریح میں نہیں جانا چاہتے۔ اتنا کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ جن امور کو قران کریم جائز اور درست قرار دیتا ہے' وہ معروف ہیں اور جنہیں وہ غلط اور ناجائز ٹھہراتا ہے' وہ منکر ہیں۔ رسول اللہؐ کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تھا۔

(۲) لیکن امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ فریضہ تنہا رسولؐ کا نہیں تھا۔ رسولؐ کے ساتھ ایک امت کی تشکیل بھی ہوئی تھی اور اس امت کا بھی یہی فریضہ قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے کہ :

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (۳/۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ ساری کی ساری امت کا تھا' نہ کہ امت میں سے کسی خاص گروہ کا۔ رسول اللہؐ کی حیات طیبہ میں امت یہ فریضہ حضورؐ کی سرکردگی میں سرانجام دیتی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اسے یہ فریضہ تنہا سرانجام دینا تھا۔

(۳) قرآن کریم نے اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ یہ فریضہ پوری کی پوری جماعت مومنین کا ہے' کسی خاص گروہ کا نہیں۔ سورۂ التوبہ میں مومنین کی مختلف خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہیں :- **الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر (۹/۱۱۲)** کہا گیا ہے' یعنی "امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے"۔

(۴) دوسرے مقام پر مومنین کے ساتھ مومنات کا بھی اضافہ کر کے اس کی وضاحت کر دی کہ یہ فریضہ امت کے مرد اور عورتیں سب کے سب سرانجام دیں گے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

والمومنون والمومنت بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر (۹/۷۱)

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ وہ امربالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

ان تمام آیات میں امربالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔ امر کے معنی کسی بات کا حکم دینا ہیں اور نہی کے معنی کسی کام سے حکماً" روک دینا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ فریضہ اسی صورت میں سرانجام دیا جا سکتا ہے جب یہ امت صاحب اقتدار ہو۔ چنانچہ سورۂ الحج میں ہے کہ :

الذين ان مكنهم فى الارض اقاموا الصلوة واتوا الزكوة وامروا بالمعروف ونهو عن المنكر (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامت صلوۃ' ایتائے زکوۃ اور امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض سرانجام دیں گے۔

اس سے واضح ہے کہ امربالمعروف و نہی عن المنکر' اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ واضح رہے کہ اسلامی مملکت میں اقتدار پوری کی پوری امت کو حاصل ہوتا ہے' کسی خاص گروہ کو نہیں دیکھئے (۲۲/۴۱)۔ لہٰذا' اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ امربالمعروف و نہی عن المنکر' وعظ و نصیحت کی بات نہیں۔ اس فریضہ کو اسلامی مملکت احکام و قوانین کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ امربالمعروف و نہی عن المنکر پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے نہ کہ کسی خاص گروہ کا۔ اور امت اس فریضہ کو اقتدار مملکت کی رو سے سرانجام دیتی ہے نہ کہ وعظ و نصیحت کے ذریعے۔ اسلام کے صدر اول میں اس فریضہ کی ادائیگی کی یہی شکل تھی' یعنی امت اس فریضہ کو اسلامی مملکت کے ذریعے سرانجام دیتی تھی۔ اس زمانے میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔

صدر اول کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی تو دین میں ثنویت پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں مذہبی پیشوائیت وجود میں آگئی۔ انہوں نے کہا کہ سیاسی امور تو حکومت کے متعلق ہیں اور "امربالمعروف و نہی عن المنکر" ہمارا فریضہ ہے۔ اس کے لئے انہیں کسی سند کی ضرورت تھی۔ انہوں نے یہ سند تلاش کر لی اور وہ بھی خود قرآن سے۔ آپ حیران ہوں گے کہ قرآن کریم جو مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا' اس سے اس کی سند کیسے مل سکتی تھی۔ لیکن جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو اسے اس سے اپنی کونسی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی؟ سنئے کہ انہوں نے یہ سند کیسے حاصل کی۔

سورۂ آل عمران کی ایک آیت پہلے درج کی جا چکی ہے جس میں جماعت مومنین سے کہا گیا ہے کہ "تم وہ امت ہو جس کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے" (۳/۱۱۰)۔ اسی سورۃ میں اس سے ذرا پہلے ہے **ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر** (۳/۱۰۴) اس کا ترجمہ یوں کر لیا گیا کہ "تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے"۔ اس سے یہ سند لے آئے کہ یہ فریضہ امت میں سے ایک خاص گروہ کا ہے اور وہ گروہ علماء یا مذہبی پیشواؤں کا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قران کریم میں جہاں جہاں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر آیا ہے اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ بتایا گیا ہے۔ اگر آیت (۳/۱۰۴) کا وہ مفہوم لیا جائے جس کے سہارے مذہبی پیشوائیت نے اپنے وجود کی سند مہیا کی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان تمام چیزوں کو منسوخ قرار دے دیا جائے گا جن میں اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر انہیں منسوخ نہ سمجھا جائے تو پھر قرآن کریم میں تضاد لازم آئے گا' یعنی وہ متعدد آیات میں اسے پوری کی پوری امت کا فریضہ قرار دیتا ہے اور ایک آیت میں امت میں سے ایک گروہ کا فریضہ۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے جو خود قرآن کریم کے دعویٰ کے خلاف ہے (۴/۸۲) اور جس سے قرآن مجید کی محکمیت ختم ہو جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان حضرات نے یہ مفہوم لے کس طرح سے لیا' جو قرآن کریم کی پوری کی پوری تعلیم کے خلاف ہے۔ آیت کے الفاظ ہیں "**ولتکن منکم امۃ**" انہوں نے منکم سے فائدہ اٹھایا اور اس کا مفہوم یہ لیا کہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے"۔ عربی زبان کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ حرف من کے متعدد معانی میں سے دو معانی نمایاں ہیں' یعنی تبعیض اور تبئین۔ تبعیض کے معنی ہوتے ہیں "میں سے" اور تبئین سے مراد ہوتی ہے "پورے کا پورا"۔ عربی لغت کے ماہرین کا قول ہے کہ حرف من کو تبعیض (میں سے) کے معنوں میں صرف اس مقام پر لینا چاہیے جہاں اس کی جگہ لفظ "بعض" کو بلا تکلف لا سکیں۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں اس کے معنی تبئین کے لینے چاہئیں (یعنی پورے کا پورا)۔ حوالہ کے لئے دیکھئے اتقان۔ میں اس مقام پر مثال کے طور پر صرف دو آیات پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

(۱) سورۂ التغابن میں ہے: **ھو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن** (۶۴/۲) "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تم میں سے بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن"۔ ظاہر ہے کہ یہاں من کے معنی تبعیض ہی کے لئے جائیں گے۔ دوسری طرف سورۂ فاطر میں ہے **والذی اوحینا الیک من الکتب ھو الحق** (۳۵/۳۱) "اللہ وہ ہے جس نے تیری طرف وہ کتاب نازل کی جو حق پر مبنی ہے"۔ اگر یہاں من کے معنے "بعض" لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کا صرف کچھ حصہ رسول پر نازل کیا۔ اس مفہوم کی رو سے اسلام کی اصل و اساس پر پانی پھر جاتا ہے۔ لہٰذا' اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہاری طرف پوری کی پوری کتاب نازل کی۔ اس میں "منکم" کے یہی معنی ہیں اور یہی معنی آیت (۳/۱۰۴) میں لئے جائیں گے کیونکہ سارے قرآن میں امر بالمعروف اور نہی عن

المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا قرار دیا گیا ہے نہ کہ امت میں سے کسی ایک گروہ کا۔ اس سے واضح ہے کہ اس آیت کی وہ تاویل جو یہ حضرات کرتے ہیں منشاء و مقصود قرآنی کے یکسر خلاف ہے۔

ایک اور پیچیدگی

لیکن اگر ان حضرات کی اس تاویل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے ولتکن منکم امتہ "تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو یہ فریضہ ادا کرے۔ اس سے (ان حضرات کی تاویل کی رو سے بھی) امت میں اس قسم کی صرف ایک جماعت کے وجود کا جواز نکل سکتا ہے' ایک سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن امت میں اس فریضہ کی ادائیگی کے مدعی جس قدر فرقے اور جماعتیں ہیں ان کا حدو شمار ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قدر کثیر تعداد کے گروہ اپنے جواز کے لئے اس آیت سے کس طرح سند لیتے ہیں؟ اس کا طریق بڑا آسان ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کا دعویٰ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والی جماعت ہم ہیں' باقی تمام فرقے اور جماعتیں اپنے دعوے میں جھوٹی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب کوئی شخص ایک نئی جماعت کی تشکیل کا ارادہ کرتا ہے تو اسے پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں کو (CONDEMN) کرنا پڑتا ہے' یعنی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان جماعتوں میں سے کوئی بھی اس فریضہ خداوندی کو ادا نہیں کر رہی' اس لئے ایک نئی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے۔

ایک اور جماعت

مثال کے طور پر جماعت اسلامی ہی کو لیجئے جو اس دعویٰ کی سب سے بڑی مدعی ہے۔ مودودی کسی جماعت کے بغیر اپنے خیالات کی اشاعت کرتے چلے آرہے تھے اور جماعت سازی کو تفرقہ پردازی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا تھا:۔

> مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں' تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔
>
> (مسلمان اور سیاسی کشمکش' جلد ۱ ص ۵۷)

اس کے بعد جب ان کے دل میں اپنی الگ جماعت کے قیام کا خیال ابھرا تو یہ "تفرقہ پردازی اور گروہ بندی" نہ رہی بلکہ عین تقاضائے اسلام قرار پا گئی۔ اس کے لئے' جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے' یہ ضروری تھا کہ پہلے باقی جماعتوں کو

(CONDEMN) کیا جائے' چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں لکھا:۔

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات' مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علماء دین اور مفتیان شرع متین' دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں..... انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت کا برسرکار آنا ہے..... اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے' صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔

(سیاسی کشمکش' حصہ سوم' ص ۲۰۱' ۱۹۷' ۹۵)

اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور اس کے جواز میں سند اسی آیت کی پیش کر دی۔ اس سے یہ نہیں ہوا کہ پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں نے کہہ دیا ہو کہ ہم سب واقعی راہ گم کردہ ہیں اس لئے ہم اپنے وجود کو ختم کرتے ہیں۔ اس فریضہ خداوندی کی ادائیگی کے لئے یہی نئی جماعت موجود رہے گی۔ مودودی صاحب نے انہیں راہ گم کردہ قرار دیا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو برسرحق اور جماعت اسلامی کو راہ گم کردہ قرار دے دیا اور اس طرح یہ سب اپنی اپنی جگہ قائم اور مطمئن رہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ یہی وہ فرقہ بازی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن کریم شرک کہہ کر پکارتا ہے' جب کہتا ہے کہ **ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا کل حزب بما لدیھم فرحون** (۳۲-۳۱/۳۰) "مسلمانو' دیکھنا!..... تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود بھی ایک فرقہ یا جماعت بن گئے۔ اس تفرقہ بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر گروہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔" جب تک کوئی فرقی یا جماعت (حزب) یہ ذہنیت نہ پیدا کرے' اس کا جداگانہ تشخص باقی نہیں رہ سکتا۔ الگ تشخص کے لئے دو شرائط لازمی ہیں۔ جماعت کے اندر عصبیت اور دوسروں کے خلاف نفرت اور یہ دونوں چیزیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب آپ اپنے کو برسرحق اور دوسروں کو باطل پرست قرار دیں۔ ہر فرقہ اور ہر جماعت کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

عقیدتاً" تو ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ذاتی مصلحتیں انہیں بعض دوسری جماعتوں کے برسرحق ہونے کے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مثلاً" ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی طرح ڈالی تو یہ کہہ کر کہ ملک کے تمام علمائے دین اور مفتیان شرع متین سب کے سب راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں

بھٹک رہے ہیں اور تمام فرقے اور جماعتیں جنس کا سد ہیں۔ لیکن جب یہاں انہوں نے ان ہی علماء دین اور مفتیان شرع متین کے اتحاد سے متحدہ محاذ قائم کیا تو فرمایا:۔

> موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش کریں اور ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں..... یہ وہ تفرقہ نہیں جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے بلکہ یہ اس آیت قرآنی کے منشاء کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے۔ (نوائے وقت بابت ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

چلتے چلتے یہ بھی دیکھئے کہ مودودی صاحب نے قرآنی آیت کا ترجمہ تو یہ کیا ہے کہ "تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیے" لیکن کہا یہ ہے کہ "موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے"۔ آپ نے غور فرمایا کہ جب انسان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب آجاتے ہیں تو وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کی متضاد باتیں کرتا ہے۔

یہ ہے' میرے عزیز! جماعت سازی کے متعلق قرآن کریم کی واضح تعلیم۔ وہ امت میں مختلف جماعتوں اور فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیتا ہے۔ میری زندگی کا مشن امت میں اس احساس کا بیدار کرنا ہے کہ اسلام اور وحدت امت لازم و ملزوم ہیں اور اس کے لئے قرآنی مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ میں اس فکر کو' الگ فرقہ' پارٹی یا جماعت بنائے بغیر' عام کئے چلا جا رہا ہوں۔

میرا مشن

مختلف مقامات پر جو لوگ اس فکر سے متفق ہوتے ہیں وہ مل بیٹھتے ہیں' یہ سوچنے کے لئے کہ اس فکر کو باہمی تعاون سے عام کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس تعاونی شکل کا نام بزم طلوع اسلام ہے اور اسی کو میں اجتماعی کوشش سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ اس قرآنی فکر کی کامیابی سے مختلف فرقوں اور جماعتوں کا وجود باقی نہیں رہتا اس لئے ان کی طرف سے اس کی مخالفت لابدی ہے۔ مجھے ان کی اس مخالفت کا نہ کوئی گلہ ہے نہ افسوس۔ افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اس مخالفت میں جھوٹے پروپیگنڈے اور بہتان تراشیوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں بتایا گیا ہے کہ "زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہوتا ہے" (مودودی صاحب)۔ ان ہی بہتان تراشیوں میں ایک شاخسانہ پرویزی فرقہ کا بھی ہے۔ آپ سوچئے کہ جو پرویز فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہو وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟ لیکن یہ اس کی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک جماعت ضرور قائم کروں:۔

> لوگ اسے فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں کو تو کوئی جائے سکون نظر آسکے گی۔

لوگوں کی تسکین کی خاطر ہی سہی

مجھے آپ کی اس سادگی پر رحم بھی آیا اور ہنسی بھی۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ سازی شرک ہی سہی لیکن اس سے کچھ بے چین روحوں کی تسکین کا سامان تو مہیا ہو جائے گا۔ یہ اسی قسم کی فرمائش ہے جیسی فرمائش بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے یہ کہہ کر کی تھی کہ ہمیں ایک بت بنوا دیجئے تاکہ ہم اپنے جذبہ صنم پرستی کی تسکین کر سکیں۔ اس قسم کی تسکین کا سامان کوئی سامری تو بہم پہنچا سکتا ہے' وحی خداوندی کا متبع ایسا نہیں کر سکتا۔ یاد رکھیے! اس قسم کا سکون وہ فریب نفس ہوتا ہے جو مذہبی افیون سے پیدا ہوتا ہے ——— یہ دیر' کنشت' صومعے' بتکدے' درگاہیں' خانقاہیں' تکیے' زاویے ——— سب اسی فریب سکون کی تلاش کے مظاہر ہیں۔ غالب کے الفاظ میں ۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا!
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

اسلام انہیں مٹا کر' وہ اطمینان دلانے کے لئے آیا تھا جو علیٰ وجہ البصیرت' دل و دماغ کے مطمئن ہو جانے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

نماز کیسے پڑھی جائے

آپ نے جماعت سازی کے سلسلہ میں نماز کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ بالکل فطری امر تھا۔ اس لئے کہ وہ نماز جو وحدت امت کا محسوس مظہر تھی' آج امت میں تفرقہ کی بین علامت بن گئی ہے۔ دس ہزار مسلمان ایک جلسے میں بیٹھے مقرر کی تقریر سن رہے ہوں گے اور ان میں باہمی تفرقہ کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن جونہی اذان کی آواز کانوں تک پہنچے گی وہ اجتماع مختلف ٹولیوں میں بٹ جائے گا اور اپنے اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھے گا۔ اس قسم کی تشتت خیز نمازوں کا نقشہ آپ متحدہ محاذ میں شامل ان جماعتوں میں دیکھ چکے ہیں جنہیں مودودی صاحب دین کی تبلیغ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں:

> جب اجتماعی کوشش کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو دین کے اہم ترین رکن نماز کے بارے میں بھی آپ کو بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی یقیناً" ریسرچ ہوگی کہ حضور پاکؐ اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی تھی۔

ریسرچ

میرے عزیز! اگر آج کسی طرح بھی حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ حضورؐ نبی اکرم اور آپ کے صحابہؓ نے

کس طرح نماز پڑھی تھی (اور دیگر ارکان اسلام ادا فرمائے تھے) تو امت کے کس قدر اختلافات مٹ جائیں؟ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ سن کر آپ کو حیرت تو ضرور ہو گی لیکن جب یہ حقیقت ہے تو (بادل ناخواستہ ہی سہی) مجھے یہ کہنا اور آپ کو سننا پڑے گا۔ آج کوئی ذریعہ تحقیق ایسا نہیں جس سے حتمی طور پر یہ معلوم کیا جا سکے۔ یہ بڑا اہم اور نازک معاملہ ہے۔ اس لئے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضورؐ نبی اکرم نے اپنے عرصہ نبوت میں نمازیں پڑھیں اور تنہا اور خلوت میں نہیں پڑھیں' ہزارہا صحابہؓ کی معیت میں پڑھیں۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں تھا جس کے مفہوم کے سمجھنے میں اختلاف ہو جاتا۔ یہ ایک محسوس عمل تھا جسے' صحابہؓ نے رسولؐ اللہ کو کرتے ہوئے دیکھا اور خود بھی حضورؐ کی اقتداء میں ویسے ہی کیا۔ پھر حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے بھی اس عمل کو جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام دوران میں نماز کی ایک ہی شکل ہوگی۔ عمل محسوس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک اسی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ صحابہؓ کے زمانے سے آج تک امت کا سلسلہ متواتر چلا آرہا ہے' یعنی ایسا نہیں ہوا کہ کسی زمانے میں سابقہ امت پوری کی پوری ختم ہو گئی ہو اور پھر کچھ عرصہ کے خلاء کے بعد ایک نئی امت وجود میں آئی ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ امت کا تواتر اور تسلسل برابر قائم رہا۔ اس حقیقت کے پیش نظر نماز کی وہ شکل جو عہد رسالت مابؐ میں قائم ہوئی تھی' اسے اسی شکل میں آج تک قائم رہنا چاہیے تھا۔

تواتر محسوس

لیکن آج ہی نہیں ہمارے ہاں صدیوں سے یہ حالت ہے کہ مختلف فرقوں کی نمازیں مختلف ہیں۔ اور ان اختلافات کی شدت کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقے کا پیرو دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتا۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اس نماز کا کیا ہوا جو صدر اول میں قائم ہوئی تھی اور اس کی جگہ یہ مختلف نمازیں کہاں سے آگئیں؟ ہمارے ہاں کے لٹریچر میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ آپ فرمایئے کہ ہمارے پاس وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے یقینی طور پر کہا جا سکے کہ اس نماز کی یہ شکل تھی۔

احادیث

اب آگے بڑھیے! ہر فرقہ اپنی نماز کی تائید میں احادیث پیش کرتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے ہاں احادیث کے ان مجموعوں میں بھی جنہیں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے' نماز کی مختلف شکلیں ملتی ہیں' اور ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے اپنی نماز کی شکل صحیح حدیثوں پر قائم کر رکھی ہے۔ آپ فرمایئے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے حتمی طور پر یہ کہا جا سکے کہ ان میں سے فلاں احادیث کی رو سے نماز کی جو شکل قائم ہوتی ہے وہ رسول اللہؐ کی نماز تھی۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں۔

تاریخ

احادیث سے آگے بڑھ کر تاریخ کی طرف آیئے۔ اسے بھی ہم دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا حقائق کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ مدینہ منورہ عہد رسالت مابؐ میں اولین تین خلفاءؓ راشدین کے زمانے تک اس مملکت کا دارالخلافہ رہا جس کی حدود مختلف براعظموں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض مملکت کے نظم و نسق کے لئے کوئی سیکریٹریٹ ہوگا۔ تحریری احکام جاری ہوتے ہوں گے..... دستاویزات ضبط تحریر میں لائی جاتی ہوں گی۔ مختلف ولایات کے گورنروں کے ساتھ خط و کتابت ہوتی ہو گی۔ دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاہدات ہوتے ہوں گے۔ حکومت کی آمدنی اور خرچ کے حسابات رکھے جاتے ہوں گے۔ اس سیکریٹریٹ میں ان سب کا ریکارڈ ہوگا۔ لیکن کیا یہ حقیقت موجب صد حیرت نہیں کہ ان میں سے کاغذ کی ایک چٹ تک بھی ہمارے ہاں موجود نہیں۔ مدینہ منورہ اس زمانے سے آج تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور آباد و شاداب رہا۔ اس پر باہر سے نہ کوئی حملہ ہوا جس کی بدولت وہ ریکارڈ ضائع ہو گیا ہو۔ نہ کوئی زلزلہ آیا کہ وہ عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔ نہ کوئی ایسی آگ لگی نہ کوئی سیلاب آیا۔

وہ ریکارڈ کہاں گیا؟

اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ اتنا ذخیرہ بالآخر گیا کہاں؟ اس کے متعلق نہ کسی نے کوئی تحقیق کی نہ اس سوال کا کوئی جواب دیا۔ اس دور کی پہلی مفصل تاریخ تیسری صدی میں جا کر مرتب ہوئی اور وہ بھی احادیث کی طرح زبانی روایت کی بنا پر۔ کسی مورخ نے یہ نہیں لکھا کہ میں نے اپنی تاریخ کو اس دور کی اصل (ORIGINAL) دستاویزات سے مرتب کیا ہے۔ یہ جو حضورؐ نبی اکرم کے دو چار نامہ مبارک (خطوط) شائع ہوئے ہیں وہ باہر کے علاقوں کے غیر مسلموں کے ہاں سے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ہے ہمارے اس دور کی تاریخ کی حالت! آپ فرمایئے کہ کیا اس کی رو سے اس دور سے متعلق حتم و یقین کے ساتھ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے ؟ اس پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ اس دور کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا ! اس اعتراض کا جواب میرے ذمے نہیں۔ میرے متعلق تو آپ صرف یہ دیکھئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ حقیقت ہے یا نہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ فرمایئے کہ ہمارے ہاں ریسرچ کے وہ کونسے ذرائع ہیں جن کی بناء پر کوئی حتم و یقین کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جو نماز ادا فرمائی تھی اس کی ہیئت اور تفصیلات یہ تھیں۔ "حتم و یقین" کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف کچھ ثابت نہ کیا جا سکے۔ نماز کی دیگر تفاصیل کو تو چھوڑیئے' ہمارے ہاں اس ہزار سال میں یہ بھی طے نہیں پا سکا کہ حضورؐ نے تراویح کی آٹھ رکعت ادا فرمائی تھیں یا بیس رکعت' حالانکہ اس کا تعلق محسوس گنتی سے ہے۔ ان حالات کے پیش نظر میں یہ کہتا چلا آرہا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ارکان اسلام کو جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آرہے ہیں' ادا کرتے رہیں لیکن ایک

دوسرے سے جھگڑیں نہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا طریق سنت نبویؐ کے مطابق ہے' کوئی بھی حتم و یقین کے ساتھ ایسا ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر ثابت کیا جا سکتا تو یہ اختلافات کیوں پیدا ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ ان طریقوں میں کوئی ردو بدل کر سکے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے کیونکہ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی اتھارٹی نہیں ہوگی۔ اگر کبھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے انداز کی قرآنی مملکت قائم ہو گئی تو اسے یہ اتھارٹی حاصل ہوگی کہ وہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کوئی متفقہ طریق متعین کرے۔ اتھارٹی کے بغیر فرقہ اہل قرآن نے ایک نئی وضع کی نماز ایجاد کی تھی۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوا کہ "کل حزب بما لدیھم فرحون" (۳۰/۳۲) کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

میں نے اپنے جس مسلک کا اوپر ذکر کیا ہے' میں خود بھی اس پر کاربند ہوں۔ میں حنفی گھرانے میں پیدا ہوا اور اس لئے اسی مسلک کے مطابق نماز پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ اگرچہ میں کسی دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے ساتھ نماز پڑھنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

کنونشن میں نماز

آپ پوچھتے ہیں کہ میں طلوع اسلام کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام کیوں نہیں کرتا۔ طلوع اسلام کنونشن میں مختلف مسالک کے پیروکار جمع ہوتے ہیں۔ آپ فرمایئے کہ اس میں کس مسلک کے مطابق نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے؟ انہیں کسی ایک مسلک کے مطابق نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر ہر مسلک کے متبعین کو اجازت دی جائے کہ پنڈال میں اپنی اپنی الگ جماعت کھڑی کر لیں تو اس سے تشتت اور انتشار کا جو عبرت ناک منظر سامنے آئے گا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات کے تابع مناسب یہی ہے کہ مختلف مسالک کے لوگ مختلف مساجد میں جا کر اپنے اپنے طریق کے مطابق نماز ادا کر لیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے کنونشنوں میں آج تک کسی قسم کا کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ وہ وحدت فکر و نظر کی بنا پر باہمی اخوت اور مساوات کے مثالی اجتماعات ہوتے ہیں۔ مقصد ان سب کے سامنے ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ امت میں خلافت اعلیٰ منہاج النبوۃ (قرآنی مملکت) کا قیام کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ اسی مملکت کی سنٹرل اتھارٹی کو میں مرکز ملت کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس کے لئے منزل اول یہ ہے کہ مسلمانوں کی ذہنیت میں قرآن کے مطابق تبدیلی پیدا کی جائے۔ اور یہ چیز قرآن کریم کے بتائے ہوئے طریق کے عین مطابق ہی نہیں بلکہ لاینفک ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کسی قوم کی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ کی جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے قوم کے دل و دماغ میں اس حقیقت کا راسخ کرنا ہے کہ وحدت امت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمانوں میں مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں' یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی داعی جماعتیں' یہ سب تفرقہ کا موجب ہیں اور تفرقہ قرآن مجید کی رو سے شرک ہے۔ اگر' جیسا کہ آپ نے کہا ہے' میں بھی ایک الگ جماعت بنالوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں مذہب کے بتکدے میں

ایک اور بت کا اضافہ کر دوں۔ میں اس تصور سے ڈرتا اور کانپتا ہوں۔ میں نے پارٹی بنائے بغیر قرآنی مفہوم کے عام کرنے کی طرح ڈالی اور توفیق ایزدی سے اس میں مجھے اپنے اندازہ سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگر مذہب پرست طبقہ' جو قرانی مملکت کے قیام میں اپنے وجود کی نفی دیکھا ہے' اس کی مخالفت نہ کرتا اور جھوٹے پروپیگنڈے کی بنا پر اس کے راستے میں روڑے نہ انکاتا تو یہ کامیابی اور بھی زیادہ ہوتی۔ آپ سوچئے کہ ایک طرف ان کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات اور دوسری طرف میرا یہ اصول کہ اس مقصد کے لئے نہ صدقہ نہ خیرات' نہ نذر نہ نیاز' نہ فطرانہ نہ زکوۃ یا قربانی کی کھالوں کی رقوم جمع کرنی ہیں اور نہ ہی ' کسی بیرونی ملک سے امداد حاصل کرنا تو ایک طرف' خود اپنی پبلک سے بھی چندہ نہیں مانگنا------ جو کچھ کرنا ہے خود اپنے وسائل ہی سے کرنا ہے------ ان مانعات اور اس کوتاہ دامانی کے باوجود اس باب میں اس قدر کامیابی کا سبب اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حق کی آواز ہے اور حق کی آواز کو اگر تھوڑا سا بھی محسوس سہارا میسر آجائے تو وہ اپنے زور دروں سے بڑی تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ ہے عزیز من! میرا مقصد' میری زندگی کا مشن اور میرا طریق کار۔ جو احباب اس سے بطیب خاطر متفق ہوتے ہیں وہ اس فکر کو آگے بڑھانے میں باہمی تعاون سے کام لیتے ہیں۔ اس مشن کو اور آگے بڑھانے اور اس سے اپنی زندگی کے بعد بھی اس چراغ کو زندہ رکھنے کے لئے قرآنک ریسرچ سنٹر اور درس گاہ کے قیام کا پروگرام میرے سامنے ہے۔ اس کے راستے میں جو روڑے انکائے گئے اور جو مشکلات پیدا کی گئیں انہیں

کسی بتکدہ میں کروں بیاں تو صنم بھی کہدے ہری ہری

لیکن بفضلہ تعالیٰ ان مشکلات پر قابو پا لیا گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں عملی پیش رفت جلد سامنے آجائے گی۔ اگر میری زندگی نے ایفا کی تو میں امید کرتا ہوں کہ میں اسے اپنے سامنے بار آور ہوتا دیکھ لوں گا۔

وبیدہ التوفیق

سوالات کے جوابات

آپ نے اپنے خط کے آخیر میں کچھ متعین سوالات پوچھے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کا جواب تو تصریحات بالا میں آگیا ہے------ یعنی نماز کے طریق اور الگ پارٹی کے قیام کے متعلق۔ آپ کا تیسرا سوال ہے۔

۳۔ کیا آپ نے کبھی حج فرمایا۔ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک کے دورے پر برائے تعلیم یا ریسرچ بھی تشریف لے گئے۔

جواب ------ جی نہیں------ ذاتی طور پر مجھے اس کی استطاعت نہیں اور عوام کے پیسوں پر ایسا کرنا میرے لئے قابل قبول نہیں۔

آپ کا چوتھا سوال یہ ہے:۔

۴۔ اسلام میں خلافت کا معیار اور طریق انتخاب کیا ہے۔ جو قرون اولیٰ یا زمانہ خلفاء

راشدینؓ میں اختیار کیا گیا تھا؟ قرآن کیا کہتا ہے اور اب موجودہ دور میں کونسا طریقہ اختیار کیا جائے۔ کیا صحابہؓ ثلاثہ کا طریق درست تھا۔

جواب معلوم نہیں "خلافت" سے آپ کی مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مراد اسلامی حکومت ہے تو جو حکومت اپنے جملہ معاملات میں قرانی اقدار کی پابند ہو اسے اسلامی حکومت یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائے گا۔ جہاں تک انتخاب یا حکومت کے کسی اور طریق کار کا تعلق ہے' اس باب میں ایک اصول کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اصول اور تفصیلات

قرآن مجید نے جن امور کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور ابدی قرار دینا منشاء خداوندی نہیں تھا۔ اس نے اصول اور حدود متعین کر دیئے اور اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود متعین کرے۔ یہ حدود اور اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کی جزئیات اور انہیں روبہ عمل لانے کا طریق کار ضروریات زمانہ کے مطابق بدلتا رہے گا۔ بنا بریں' کسی ایک زمانے میں اختیار کردہ طریق' آنے والے زمانوں کے لئے لازی نہیں قرار پاتا۔ لہٰذا ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ صحابہؓ نے کیا طریق عمل اختیار کیا تھا۔ اول تو' جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا' ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس کی رو سے ہم حتمی اور یقینی طور پر کہہ سکیں کہ انہوں نے کیا طریق کار اختیار فرمایا تھا------ چونکہ قرآن کریم نے انہیں مومن حقہ قرار دیا ہے اس لئے یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے جو طریق بھی اختیار فرمایا ہوگا وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے اختیار کیا ہوگا (اس کی تفصیل آپ کو میری کتاب "شاہکار رسالت" میں ملے گی)۔ دوسرے یہ کہ ہم پر اس کی من و عن پابندی لازی نہیں۔ انہوں نے وہ طریق اپنے حالات کے مطابق اختیار کیا ہوگا۔ قرآن نے اصول یہ بیان فرمایا ہے کہ امور مملکت باہمی مشاورت سے طے کرو۔ اس مشاورت کا طریقہ کیا ہوگا' اسے اس نے ہم پر چھوڑا ہے کہ ہم اپنے حالات کے مطابق جو طریق کار مناسب سمجھیں' اختیار کر لیں------ شرط وہی ہوگی کہ یہ طریق کار قرآن مجید کے اصول' اقدار اور حدود سے متصادم نہ ہو۔

آپ پوچھتے ہیں کہ "موجودہ دور میں کونسا طریقہ اختیار کیا جائے"۔ میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے وہ قرآنی حکومت کے متعلق ہے' یعنی اس حکومت کے متعلق جو قرآنی اصول و حدود کی پابند ہو۔ اس وقت دنیا میں کوئی حکومت بھی ایسی نہیں۔ جب کوئی اسلامی حکومت قائم ہوگی' تو وہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے جو طریق کار بھی اپنے لئے متعین کرے گی وہ اسلامی قرار پا جائے گا۔ ہماری حالت بھی عجیب ہے۔ اسلامی حکومت تو کہیں موجود نہیں اور ان بحثوں پر لٹھم لٹھا ہوتے رہتے ہیں کہ حکومت سے متعلق اسلامی احکام کیا ہیں۔ اس وقت جن طرق و احکام کو اسلامی یا شرعی کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ کسی فرقہ کے فقہی احکام ہوتے ہیں۔ انہیں اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ یوں بھی وہ احکام کسی خاص زمانہ کے حالات کے مطابق مدون ہوئے تھے جو آج کے حالات میں فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ اگر کوئی حکومت اسلامی بننا چاہتی ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے فیصلہ کرے کہ اس کا جملہ کاروبار حدود قرآنی کے اندر رہتے ہوئے بروئے

کار آئے گا۔ اس کے بعد وہ جو فیصلے قرآن کریم کے مطابق کرے گی وہ اسلامی کہلائیں گے۔ اس وقت امت میں جو خلفشار ہے وہ ان حقائق کو نظرانداز کر دینے کا نتیجہ ہے۔

باقی رہا آپ کا یہ سوال کہ "کیا صحابہؓ ثلاثہ کا طریق درست تھا" سو اول تو (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے) ہم یقینی طور پر کہہ نہیں سکتے ہیں کہ ان کا طریق کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمیں ان کے اعمال و کردار کو موضوع بحث بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ حضرت عمرؓ یا حضرت صدیق اکبرؓ کا طریق درست تھا یا نہیں۔ وہ ہم سے ہمارے طریق ہی کے متعلق پوچھے گا۔ اس نے یہ بنیادی اصول بیان کر دیا ہے کہ:

تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون(۲/۱۴۱)

یہ لوگ اپنے اپنے وقتوں میں دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا' جو کچھ تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

چونکہ قرآن مجید نے جملہ صحابہؓ کے متعلق کہا ہے کہ وہ سچے اور پکے مومن تھے (۸/۷۴) ان کے لئے جنت کی بشارت ہے (۹/۱۰۰)۔ تفصیل' "شاہکار رسالت" میں ملے گی۔ لہٰذا' قرآن مجید کی اس شہادت کی بنا پر ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ صحابہؓ کبار کی سیرت قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ عہد رسالت مابؐ اور زمانہ صحابہؓ کی تاریخ اور احادیث کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے خلاف ہیں انہیں غلط قرار دیتا ہوں۔ اسی قسم کی احادیث کے صحیح ہونے کا انکار ہے جس کی بناء پر مجھے منکر حدیث' لہٰذا کافر قرار دیا جاتا ہے۔

آپ کا آخری سوال یہ ہے:

کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے' فقط زیارت کے لئے!

جواب: جی ہاں! میرے درویش خانہ کا دروازہ ہر متلاشی حق کے لئے کھلا ہے۔ جب کسی کا جی چاہے (وقت مقرر کر لینے کے بعد) ملاقات ہو سکتی ہے لیکن محض زیارت کے لئے نہیں۔ زیارت تو قبروں ہی کی کی جاتی ہے۔ زندہ انسانوں سے تو کچھ سیکھنے سکھانے کے لئے ملا جاتا ہے۔

آخر میں میں اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا خط جس حسن نیت کا آئینہ دار ہے وہ درخور تحسین ہے۔ دعا ہے' اللہ تعالیٰ آپ کے قرآنی ذوق میں برکت عطا فرمائے۔

والسلام

پرویز